سیرتِ سرورِ عالم

صلی اللہ علیہ وسلم

جلد اوّل

—— تالیف ——

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

—— مرتبین ——

نعیم صدیقی ۔ عبدالوکیل علوی

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

ناشر ——— ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور
مطبع ... ایچ، وائی، پرنٹرز، لاہور

اشاعت

اوّل : ذیقعدہ ۱۳۹۸ھ، مطابق اکتوبر ۱۹۷۸ء ——— ۶۰۰۰
دوم : رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ، مطابق اگست ۱۹۷۹ء ——— ۷۰۰۰
سوم : محرم الحرام ۱۴۰۱ھ، مطابق دسمبر ۱۹۸۰ء ——— ۵۰۰۰
چہارم : ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ، مطابق فروری ۱۹۸۳ء ——— ۶۰۰۰
پنجم : رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ، مطابق اپریل ۱۹۸۹ء ——— ۶۰۰۰

قیمت : ۱۵۰/- روپے

——— باہتمام ———
چودھری بشیر احمد خاں

اِفتتاح

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ○

"کوئی قوم ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔" (فاطر۔۲۴)

○

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ

"اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا جس نے پیغام دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے پرہیز کرو۔" (النحل۔۳۶)

○

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ○

"یہ ایک ڈرانے والا ہے اگلے ڈرانے والوں میں سے۔" (النجم۔۵۶)

○

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یقیناً تم پیغمبروں میں سے ہو۔" (یٰس۔۳)

○

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہو میں کوئی نرالا رسول نہیں ہوں۔" (احقاف۔۹)

○

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کچھ نہیں ہیں مگر ایک رسُول ہیں اور ان سے پہلے بھی رسُول گزر چکے ہیں۔" (آل عمران - ۱۴۴)

○

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ

"کہو، ہم ایمان لائے اللہ پر اور اُس تعلیم پر جو ہماری طرف اُتاری گئی ہے اور اُس تعلیم پر جو ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، اور اُن کی اولاد پر اُتاری گئی تھی اور جو موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دُوسرے نبیوں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مُطیعِ فرمان ہیں پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم لاتے ہو تو وہ سیدھے راستے پر ہیں۔" (بقرہ: ۱۳۶-۱۳۷)

○

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝

"درحقیقت ایمان لانے والوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اُس نے اُن کے

درمیان خود اُنہی میں سے ایک ایسا رسُول اُٹھایا جو اُنہیں اُس کی آیات سُناتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور اُنہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو وہ صریح گمراہی میں پڑے ہُوتے تھے۔" (آلِ عمران-۱۶۴)

○

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

"آج مَیں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمّل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کے طریقے کو پسند کیا۔" (المائدہ-۳)

○

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

"بخدا ہم نے (اے محمدؐ) تم سے پہلے مختلف اُمتوں کی طرف ہدایت بھیجی مگر اس کے بعد شیطان نے اُن کے غلط اعمال کو اُن کے لیے خوشنما بنا دیا چنانچہ آج وہی ان کا سرپرست بنا ہُوا ہے اور وہ دردناک عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں۔ اور ہم نے تم پر یہ کتاب صرف اِس لیے نازل کی ہے کہ تم اُس حقیقت کو اُن کے سامنے واضح کر دو جس میں اُن کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے، اور اس لیے کہ یہ کتاب ہدایت اور رحمت ہو اُن لوگوں کے لیے جو اِس کی پیروی قبول کر لیں۔" (النحل-۶۳-۶۴)

○

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ○

"اے اہل کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے جو تمہارے سامنے بہت سی اُن چیزوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جنہیں تم کتاب میں سے چھپاتے ہو اور بہت سی باتوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کتاب آگئی ہے جس کے ذریعہ وہ اُن لوگوں کو جو اس کی پسند کے مطابق چلتے ہیں امن و سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور اپنے اِذن سے انہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔" (المائدہ - ۱۵-۱۶)

○

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيۡرًا ○

"اے نبی، ہم نے تم کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔" (الاحزاب ۴۵-۴۶)

○

يَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهٰٮهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ

عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

"وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، اُن کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے اور اُن بندشوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ دبے اور جکڑے ہوئے تھے پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی تائید وحمایت کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وُہی فلاح پانے والے ہیں۔" (الاعراف۔۱۵۷)

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ○

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم پر حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر لوگوں کے درمیان فیصلے کرو اور خیانت کرنے والوں کے وکیل نہ بنو۔" (النساء۔۱۰۵)

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے۔" (الفتح۔۲۸)

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْیٖ وَيُمِيْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہدو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اُس خدا کا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، جو مارنے اور جلانے والا ہے، پس ایمان لاؤ خدا پر اور اُس کے رسول نبیِ اُمّی پر جو خدا اور اُس کے فرامین پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہِ راست پالو" (اعراف . ۱۵۸)

○

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ ط

"اور کہو میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اِس کے ذریعہ سے تم کو اور ہر اُس شخص کو خبردار کردوں جسے یہ پہنچے" (انعام . ۱۹)

○

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ○

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسُول اور نبیوں کے سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں" (احزاب . ۴۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ایک کارِ عظیم جس کو ہاتھ میں لیا گیا تھا، وہ بڑی حد تک تکمیل کو پہنچا اور توقع ہے کہ اُسی کی مدد سے بقیہ کام بھی سرانجام پا جائے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے جو جماعتی تعلق مجھے رہا ہے اُس سے بالکل ہٹ کر بھی اگر دیانتداری سے اُن کی خدمات پر نظر ڈالی جائے تو بغیر کسی اندھی عقیدت کے یہ احساس اُبھرتا ہے کہ اِس دَور میں جس زورِ استدلال کے ساتھ نئی زبان میں، اور جس بڑے پیمانے پر موصوف نے اسلام کی بنیادی صداقتوں اور اس کے مکمل نظامِ تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے، اس کی مثال دُور دُور تک نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس دَور میں مغرب کی ملحدانہ اور مادہ پرستانہ فکر کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ کرنے میں جو حصہ مولانا موصوف نے لیا ہے اُس نے صدہا افراد کی زندگیوں کا نقشہ بدل ڈالا ہے اور یہ چیز مولانا کے لیے ایک گراں بہا سرمایۂ آخرت ہے۔

مجھے مولانا موصوف سے متعارف ہونے کے وقت سے لے کر اب تک جس طرح کا مخلصانہ تعلق رہا ہے اُس کے ہوتے ہوئے جہاں میری یہ تمنا رہی ہے کہ مولانا کے علم و فکر کو فروغ دینے کے لیے مختلف اسالیب اختیار کیے جائیں، وہاں مجھے اِس بات سے بھی سخت اجتناب رہا ہے کہ کبھی مولانا کی ذات، اُن کے اسمِ گرامی، یا اُن کے کیے ہوئے کام کو حصولِ مفاد کا ذریعہ بنایا جائے۔

اب سے کوئی دس بارہ برس پہلے کی بات ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے گھر میں چند قریبی احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے برسبیلِ تذکرہ میں نے اِس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اگر مولانا پسند فرمائیں تو موصوف کی اپنی تحریروں سے سیرتِ نبویؐ مرتب کی جا سکتی ہے۔ اِس پر میرے ایک نہایت ہی مخلص اور فاضل رفیق نے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ کام میں اُن کے لیے چھوڑ دوں۔ چنانچہ میں نے اُن کی اِس خواہش کو قبول کر لیا۔ لیکن جب کئی سال گزرنے کے بعد بھی وہ رفیق اِس کام کی انجام دہی کا موقع نہ پا سکے

تو اُن کی اجازت سے میں نے ایک بار پھر مولانا کے سامنے اس تجویز کا ذکر کیا تو انھوں نے اس تجویز کے علاوہ بعض اور موضوعات پر بھی کام کرنے کے لیے مجملاً چند ہدایات دیں۔

بالآخر کام شروع کر دیا گیا تو اندازہ ہُوا کہ بہ نسبت ایک ٹھوس اور تحقیقی کتاب اپنی طرف سے مُرتّب کرنے کے، مولانا کے پورے لٹریچر میں سے عبارات نکال کر ایک کتاب مُرتّب کرنے کا کام بڑا بھاری اور محنت طلب ہے، کیونکہ تفہیم القرآن کی چھ جلدوں کے علاوہ ان کے وسیع لٹریچر کو پڑھنا، اس میں موضوع کے مُطابق ضروری اور مفیدِ مطلب عبارات کو نشان زد کرنا، پھر ان کی نقول تیار کرنا، اور پھر سب سے آخر میں ان کو ابواب اور فصول میں مرتّب کرنا اور اُن کی عنوان بندی کرنا، یہ سارا کام اتنا کٹھن تھا کہ بار بار دامنِ ہمت تار تار ہو جاتا کہ اس بھاری منصوبے کو رُو بہ تکمیل لانا شاید اپنے بس میں نہ ہی ہو۔

خوش قسمتی سے مجھے اس کام میں متعدد رُفقاء کا تعاوُن حاصل ہو گیا اور خصوصیت سے مولانا عبدالوکیل علوی ایم اے نے تقریباً ڈیڑھ سال میرے ساتھ اس طرح کام کیا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس خدمت میں سب سے زیادہ حصہ اُنہی کا ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

خاموشی سے ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں انجام پانے والے اس کام کو جب تکمیل مرحلے پر پہنچنے کے بعد مولانا محترم کی خدمت میں لے جا کر پیش کیا گیا، تو ایک حد تک اُن کو بھی اس پر حیرت ہُوئی کہ اُنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور سیرت کے متعلق اتنا وسیع مواد اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے، اور پھر یہ چیز بھی اُن کے لیے کسی نہ کسی حد تک مسرت کا باعث ہُوئی کہ ہمارے ناچیز ہاتھوں سے تقریباً تین مجلدات کی ابتدائی ترتیب مکمل ہو چکی ہے۔ ان میں سے پہلی جلد کا تعلق بنیادی مباحث، منصبِ نبوّت اور نظامِ وحی، بعثتِ آنحضورؐ اور ماقبلِ بعثت کے ماحول، اور دعوت کی مخاطب قوم اور عرب کے مختلف گروہوں کے احوال سے ہے۔ دوسری جلد حضورؐ کی پیدائش سے لے کر ہجرتِ مدینہ تک کے احوال و واقعات پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد میں اُس انتہائی سرگرم تحریکی زندگی کا مُرقّع سامنے آتا ہے جو ہجرت سے وصال تک حضورؐ نے مدینے میں گزاری۔ چوتھی جلد جو ابھی باقی ہے اس میں حضورؐ کی اصلاحات، تعلیمات، اور نظامِ زندگی کے مختلف شعبوں میں لائے جانے والے تغیّرات کا نقشہ پیش کرنا مطلوب ہے۔ خدا کرے کہ ہم اسے بھی جلد مکمل کر سکیں۔

اس کتاب کو اس طرز پر مرتّب کیا گیا ہے کہ جنابِ موصوف کے مقالات اور مختلف عبارات

کو مختلف عنوانات کے تحت ایسی شکل سے ترتیب دیا جائے کہ مضمون پوری طرح مربوط ہو اور ضروری معلومات مناسب ترتیب کے ساتھ سامنے آتی جائیں۔ تھوڑے سے مقامات ایسے بھی ہیں جہاں مرتبین کو اپنی طرف سے یا کسی کتاب سے اخذ کر کے کوئی زائد عبارت شامل کرنی پڑی (اس کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے)۔ حواشی دو قسم کے ہیں: ایک وہ جو محترم مؤلف کی اپنی ہی تحریروں پر مشتمل ہیں، اور دوسرے وہ ہیں جو مرتبین کی طرف سے لکھے گئے ہیں۔ ان دونوں صورتوں کو الگ الگ واضح کر دیا گیا ہے۔ ابواب اور فصول میں جو مختلف اقتباسات مؤلف کی تحریروں سے لے کر استعمال کیے گئے ہیں ان کے حوالے کتاب کے آخر میں یکجا دیئے جا رہے ہیں۔

یہ امر ہمارے لیے نہایت مسرت و اطمینان کا موجب ہے کہ خود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی علالت اور عدیم الفرصتی کے باوجود ہمارے کیے ہوئے کام کو پڑھ ڈالا۔ اور مختلف مقامات پر ترامیم بھی کیں۔ اور اپنی بعض عبارات کو شامل کرنے کے لیے نشاندہی بھی کی۔ اس کے باوجود اس کتاب کی ترتیب میں جہاں کہیں کوئی غلطی یا کوتاہی پائی جاتی ہے اس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔

اب یہ خدمت جو کچھ بھی ہے اور جیسی بھی ہے، اسے پیش کرتے ہوئے ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ قبول ہو اور پڑھنے والوں کے لیے باعث رشد و ہدایت ہو۔ آخر میں ہم کتاب کے قارئین سے یہ درخواست بھی کریں گے کہ وہ ہمارے لیے دعائے خیر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کام میں جہاں کہیں بھی غلطیاں اور کوتاہیاں پائیں، یا کسی مفید حذف و اضافہ کی نشاندہی کر سکیں تو وہ ہمارے ساتھ ضرور تعاون کریں۔ ہم انشاء اللہ ان کے مشوروں کی روشنی میں اگلے ایڈیشن سے پہلے مسودے کی نظرثانی کر کے اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

نعیم صدیقی

عرضِ مُرتّبین

— بسلسلۂ ترتیب جلد اوّل —

جلد اوّل کے سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس میں بنیادی مباحث کے زیرِ عنوان مولانا مرحوم کی اُن تمام تحریروں اور تقریروں اور ضروری اقتباسات کو جمع کیا گیا ہے جو ایک طرف منصبِ نبوّت، نظامِ وحی، تصوّرِ دین اور دوسرے متعلقہ موضوعات پر روشنی بہم پہنچاتے ہیں اور دوسری طرف بعثت کے دور اور اُس سے پہلے کے تہذیبی، تاریخی، مذہبی اور سیاسی ماحول کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ مباحث اگرچہ براہِ راست سیرتِ پاک کے سلسلۂ واقعات کو پیش نہیں کرتے، لیکن حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شخصیت، آپؐ کے منصب اور آپؐ کی جدّوجہد کو سمجھنے میں ان سے بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے ضروری سمجھا کہ واقعاتِ سیرت کا مطالعہ کرنے سے پہلے قارئین ان مباحث سے گزر جائیں۔

مُرتّبین

اسلام

در اصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے رہنما وہ لوگ تھے جن کو رسل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی رہنماؤں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی کیونکہ اس کے سوا کوئی اور طرزِ عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گزرے ہیں ان کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل اسکیم نہیں بن سکتی۔ بائیبل کے عہدِ جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلے میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے اسی طرف رجوع کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام رہنماؤں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا رہنما ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اُس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی اور نظمِ مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ ۔۔۔

فہرست

جلد اوّل ۔ حصہ ۱

سلسلۂ نبوّت سے متعلق اُصولی حقیقتیں

جلد اوّل — حصہ ۲

بعثت سے پہلے کا ماحول

۱۔ اقوامِ ماضیہ

باب ۱۳ — سابق اُمّتوں کی تباہی اور اُنکے آثار ۴۸۹ تا ۵۶۶

جلد اوّل — حصّہ ۲

بعثت سے پہلے کا ماحول

(ب) مروّجہ مذاہب

باب ۱۴ — مشرکین ۵۶۹ تا ۵۹۴

جلد اوّل — حصہ ۳

بعثت سے پہلے کا ماحول

ج - جزیرۃ العرب کی جغرافی و تمدنی اہمیت

مُقدمہ

(از مُولّف)

اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے۔ ایک اللہ کا کلام، دُوسرے انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں، جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ اور تعلیم اور تفہیم کا واسطہ بنایا، بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا، تاکہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشا پورا کرنے کے لیے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہُوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیرِ صالح کر دکھائیں۔

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم و ملزوم رہی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہو سکا اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہو سکا۔ کتاب کو نبی سے الگ کر دیجیے تو وہ ایک کشتی ہے ناخدا کے بغیر جسے لے کر اناڑی مُسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں، منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور نبی کو کتاب اللہ سے الگ کر دیجیے تو خدا کا راستہ پانے کے بجائے آدمی ناخدا ہی کو خدا بنا بیٹھنے سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ یہ دونوں ہی نتیجے پچھلی قومیں دیکھ چکی ہیں۔ ہندوؤں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو گم کر دیا اور صرف کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ انجام یہ ہُوا کہ کتابیں ان کے لیے لفظی گورکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں حتیٰ کہ آخر کار خود کتابوں کو بھی وہ گم کر بیٹھے۔ عیسائیوں نے کتاب کو نظر انداز کر کے نبی کا دامن پکڑا اور اُس کی شخصیت کے گرد گھومنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ کوئی چیز اُنہیں نبی اللہ کو ابنُ اللہ بلکہ عینِ اللہ بنانے سے باز نہ رکھ سکی۔

پُرانے اَدوار کی طرح اب اِس نئے دَور میں بھی انسان کو نعمتِ اسلام میسر آنے کے دو ہی ذرائع ہیں جو اَزل سے چلے آ رہے ہیں۔ ایک خُدا کا کلام، جو اَب صرف قرآن پاک کی صُورت ہی میں مل سکتا ہے۔ دُوسرے اُسوۂ نبوّت جو اب صرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک ہی میں محفوظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی صُورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے سمجھے۔ اِن دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا اس نے اسلام کو سمجھا، ورنہ فہمِ دین سے بھی محروم رہا اور نتیجۃً ہدایت سے بھی۔

پھر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں چونکہ ایک مشن رکھتے ہیں، ایک مقصد و مُدّعا کو لیے ہوئے آتے ہیں،

...اس لیے ان کو سمجھنے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ان کے مشن اور مقصد و مدعا کو کس حد تک سمجھتے ہیں۔ اس چیز کو نظر انداز کر کے دیکھیے تو قرآن عبارتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرتِ پاک، واقعات و حوادث کا ایک مجموعہ ہے۔ آپ لغت و روایات؛ علمی تحقیق و کاوش کی مدد سے تفسیروں کے انبار لگا سکتے ہیں۔ اور تاریخی تحقیق کا کمال دکھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے عہد کے متعلق صحیح ترین اور وسیع ترین معلومات کے ڈھیر لگا سکتے ہیں، مگر رُوحِ دین تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ یہ عبارات اور واقعات سے نہیں بلکہ اُس مقصد سے وابستہ ہے جس کے لیے قرآن اُتارا گیا اور جس کی علمبرداری کے لیے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کیا گیا۔ اس مقصد کا تصور جتنا صحیح ہو گا اتنا ہی قرآن اور سیرت کا فہم صحیح، اور جتنا ناقص ہو گا اتنا ہی ان دونوں کا فہم ناقص رہے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دونوں ہی بحرِ ناپیدا کنار ہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کرے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی ان کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے رُوحِ دین تک رسائی پائے۔

مَیں اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا بے حد شکر گزار ہوں کہ قرآن پاک کو سمجھانے کے لیے جو کوشش میرے بس میں تھی اُسے انجام دینے کے لیے اُس نے مجھے "تفہیم القرآن" مکمل کرنے کی توفیق عطا فرما دی۔ اس کے بعد میری دلی تمنا تھی کہ سیرتِ رسول پاکؐ پر بھی ایک کتاب لکھوں لیکن پہلے کام ہی میں عمر کے ۳۰ سال صرف ہو گئے اور اب مَیں اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتا کہ دوسرا کام شروع کر سکوں۔ میرے دل میں اس کی حسرت ایک مستقل خلش بنی ہوئی تھی کہ یکا یک جناب نعیم صدیقی اور جناب عبدالوکیل علوی نے میری ہی مختلف کتابوں اور مضامین سے مرتب کیا ہُوا مقالاتِ سیرت کا یہ مجموعہ میرے سامنے لا کر رکھ دیا جسے دیکھ کر مَیں خود بھی حیران رہ گیا کہ اس عظیم الشان موضوع پر میری تحریروں میں اتنا کچھ مواد موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں حضرات کی اس محنت و جانفشانی پر بے اختیار دل سے داد بھی نکلی اور دُعائے خیر بھی کہ انہوں نے جگہ جگہ بکھرے ہُوئے اس مواد کا نہایت باریک بینی اور تجسس کے ساتھ جائزہ لیا اور اس کو بہترین طریقے سے مرتب کر دیا۔ اگرچہ یہ مجموعہ سیرت پر ایک مستقل کتاب کی ضرورت کو تو پورا نہیں کرتا، لیکن اس میں جو مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں وہ ان شاء اللہ لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور آپؐ کے کارنامۂ عظیم کو سمجھنے میں کافی مدد دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ جو کچھ اس کتاب میں درج کیا گیا ہے، میری کتابوں اور تحریروں کے ناظرین کی نگاہ سے وہ یا اس کا کم و بیش اچھا خاصا حصہ پہلے ہی گزر چکا ہے، اور بڑی بڑی چیزوں کو دوبارہ پڑھنا ایک حد تک آدمی کو ناگوار گزرتا ہے، مگر پڑھنے والے جب اس کتاب کو پڑھیں گے تو خود محسوس کریں گے کہ سیرتِ پاک کے متعلق جو مضامین مختلف مقامات

پر چھپے ہوتے تھے، اور تیس چالیس سال کے دوران میں مختلف مواقع پر لکھے گئے تھے، وہ یہاں ان کے سامنے یکجا ایک مرتب صورت میں آ گئے ہیں، اور اِس مجموعی صورت میں ان کا مطالعہ اُس مطالعہ کی بہ نسبت اپنا ایک جُداگانہ فائدہ رکھتا ہے جو منتشر صورت میں حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اِس کتاب کو بھی اپنے بندوں کی ہدایت اور میرے لیے اجرِ آخرت کا ذریعہ بنائے۔

لاہور - ۱۹ ذی القعدہ ۱۳۹۲ھ
۲۵ دسمبر ۱۹۷۲ء

ابوالاعلیٰ

جلد اوّل — حصّہ ۱
سلسلۂ نبوّت سے متعلق چند اصولی تحقیقیں

باب (۱)

حقیقتِ نبوّت

فصل ۱

انسانیّت کے لیے خدائی سلسلۂ ہدایت

خداوندِ عالم نے جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمانروا ہے، اپنی بے پایاں حکمت کے اس حصّے میں جسے ہم زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا۔ اُسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں، بھلائی اور بُرائی کی تمیز دی، انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی، تصرّف کے اختیارات بخشے اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوندِ عالم نے اچھی طرح اُس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمہارا اور تمام جہان کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں، میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو، نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل تمہارے لیے ایک امتحان کی مدّت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس آنا ہوگا اور میں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمہارے لیے صحیح رویّہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرو، جو ہدایات میں بھیجوں اُس کے مطابق دنیا میں کام کرو، اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمہارے لیے ہر وہ رویّہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویّہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمہیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہوگا، اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمہیں ابدی راحت و مسرّت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنّت ہے۔ اور اگر دوسرے کسی رویّہ پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا اور دنیا سے گزر کر عالمِ آخرت میں جب آؤ گے تو ابدی رنج و مصیبت کے اُس گڑھے میں پھینک دیئے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

"مُسلم" بن کر رہنے کی ہدایت

یہ فہمائش کر کے مالکِ کائنات نے نوعِ انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نوع کے اوّلین افراد (آدمؑ و حوّا)

کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق انہیں اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اوّلین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پُوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انہیں اُن کا قانونِ حیات بتا دیا گیا تھا۔ اُن کا طریقِ زندگی خدا کی اطاعت (یعنی اسلام) تھا اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ مُطیعِ خدا (مُسلم) بن کر رہیں۔

اِنحرافات

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریقِ زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف قسم کے غلط رویّوں کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے غفلت سے اُس کو گُم بھی کیا اور شرارت سے اس کو مسخ بھی کر ڈالا۔ انہوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی، خیالی اور مادّی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھیرا لیا۔ انہوں نے خدا کے دیئے ہوئے علمِ حقیقت (العلم) میں طرح طرح کے اوہام اور نظریّوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے تعصّبات کے مطابق ایسے قوانینِ زندگی گھڑ لیے جن سے خدا کی زمین ظلم سے بھر گئی۔

خدا نے جو محدود خود اختیاری انسانوں کو دی تھی اس کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان بگڑنے ہوئے انسانوں کو زبردستی صحیح رویّہ کی طرف موڑ دیتا۔ اور اس نے دنیا میں کام کرنے کے لیے جو مُہلت اس نوع کے لیے اور اس کی مختلف قوموں کے لیے مقرر کی تھی اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اس بغاوت کے رونما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ پھر جو کام ابتدائے آفرینش سے اُس نے اپنے ذمّہ لیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے، اُس کی مُہلتِ عمل کے دوران میں، اُس کی رہنمائی کا انتظام وہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی اس خود عائد کردہ ذمّہ داری کو ادا کرنے کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اُس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیروی کرنے والے تھے۔ اُس نے اُن کو اپنا نمائندہ بنا دیا۔ اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے۔ اُن کو علمِ حقیقت بخشا۔ انہیں صحیح قانونِ حیات عطا کیا۔ اور انہیں اس کام پر مامور کیا کہ ابنِ آدم کو اُسی راہِ راست کی طرف پلٹنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

یہ پیغمبر مختلف قوموں اور ملکوں میں اُٹھتے رہے، ہزار ہا برس تک اُن کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزار ہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے۔ اُن سب کا ایک ہی دین تھا، یعنی وہ صحیح رویّہ جو اوّل روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرو تھے، یعنی اخلاق و تمدّن کے وہ ازلی و ابدی اُصُول جو آغاز ہی میں انسان کے لیے تجویز کر دیئے گئے تھے۔ اور اُن سب کا ایک ہی مشن تھا، یعنی یہ کہ اس دین اور اس ہدایت کی طرف اپنے ابنائے نوع کو دعوت دیں، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں ان کو منظّم کر کے ایک ایسی اُمّت بنائیں جو خود اللہ کے قانون

کی پابند ہو اور دُنیا میں قانونِ الٰہی کی اطاعت قائم کرے اور اس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لیے جدوجہد کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے اپنے دَور میں اپنے اس مشن کو پوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی، اور جنہوں نے اسے قبول کر کے اُمتِ مُسلمہ کی حیثیت اختیار کی وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے، حتیٰ کہ ان میں سے بعض اُمتیں ہدایتِ الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں، اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مسخ کر دیا۔

آخر کار خداوندِ عالم نے سرزمینِ عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُسی کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیاء آتے رہے تھے۔ اُن کے مخاطب عام انسان بھی تھے اور پچھلے انبیاء کے بگڑے ہوئے پیرو بھی۔ سب کو صحیح سیدھے کی طرف دعوت دینا، سب کو از سرِ نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا، اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں انہیں ایک ایسی اُمت بنا دینا اُن کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف دُنیا کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرے۔ ؎

نبوّت اور ازلی میثاق

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ○ أَوْ تَقُولُوٓا إِنَّمَآ أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ○

(الاعراف: ۱۷۲، ۱۷۳)

اور اے نبیؐ، لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اُوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" تو انہوں نے کہا "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔" یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم تو اس بات سے بے خبر تھے" یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اُس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا۔"

اس آیت میں وہ غرض بیان کی گئی ہے جس کے لیے ازل میں پُوری نسلِ آدم سے اقرار لیا گیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت اختیار کریں وہ اپنے اس جُرم کے پُورے طرح ذمہ دار قرار پائیں۔ انہیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ ہو سکیں۔ گویا بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ اس ازلی عہد و میثاق کو اس بات پر دلیل قرار دیتا ہے

کہ نوعِ انسانی میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہِ واحد اور ربِّ واحد ہونے کی شہادت اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے، یا ایک گمراہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمہ داری سے بالکلیہ بری ہو سکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ازلی میثاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شعور اور حافظہ میں محفوظ ہے؟ کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغازِ آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا سوال ہوا تھا اور اس نے بَلٰی کہا تھا؟ اگر نہیں تو پھر اس اقرار کو جس کی یاد ہمارے شعور و حافظہ سے محو ہو چکی ہے ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اُس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظہ میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہو جاتا کیونکہ اس کے بعد تو اس آزمائش و امتحان کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہ جاتے۔ لہٰذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تو تازہ نہیں رکھا گیا، لیکن وہ تحت الشعور (Sub-Conscious mind) اور وجدان (Intuition) میں یقیناً محفوظ ہے۔ اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشعوری اور وجدانی علوم کا حال ہے۔ تہذیب و تمدّن اور اخلاق و معاملات کے تمام شعبوں میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا ہے وہ سب درحقیقت انسان کے اندر بالقوّہ (Potentially) موجود تھا۔ خارجی محرکات اور داخلی تحریکات نے مل جل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بالقوّہ تھا اسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربیت، کوئی ماحولی تاثیر اور کوئی داخلی تحریک انسان کے اندر کوئی چیز بھی، جو اس کے اندر بالقوّہ موجود نہ ہو، ہرگز پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اسی طرح یہ سب مؤثرات اگر اپنا تمام زور بھی صرف کر دیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اُن چیزوں میں سے، جو انسان کے اندر بالقوّہ موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اسے اصل فطرت سے منحرف (Pervert) کر دیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریفات و تمسیخات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اپیل کا جواب دینے کے لیے مستعد رہے گی۔ یہ معاملہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے: وہ سب ہمارے اندر بالقوّہ موجود ہیں اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت ان چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کے ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر (یاد دہانی)، تعلیم، تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بالقوّہ موجودات

کی طرف سے ملتا ہے۔

ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر، پردہ ڈال کر، منحرف اور مسخ کرنے کا عمل کر سکتی ہیں مگر بالکل معدوم نہیں کر سکتیں۔ اور اسی لیے اندرونی احساس اور بیرونی سعی دونوں سے اصلاح اور تبدیلی (Conversion) ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت، اور خالق کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے۔

اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر دور میں، زمین کے ہر خطہ میں، ہر بستی، ہر پشت اور ہر نسل میں ابھرتا رہا ہے اور کبھی دنیا کی کوئی طاقت اسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے مطابق حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ ابھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کار فرما ہوا ہے اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو ابھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام اور کتب آسمانی اور ان کی پیروی کرنے والے داعیان حق سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ اسی لیے ان کو قرآن میں مذکّر (یاد دلانے والے)، ذکر (یاد)، تذکرہ (یاد داشت) اور ان کے کام کو تذکیر (یاد دہانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء اور [illegible] بطور داعیان حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ اسی چیز کو ابھارتے اور تازہ کرتے ہیں جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھی۔ ؎

فصل ۲

نبوّت کے متعلّق عقل کا فیصلہ

بڑے بڑے شہروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں کارخانے بجلی کی قوت سے چل رہے ہیں۔ ریلیں اور ٹرام گاڑیاں رواں دواں ہیں، شام کے وقت دفعۃً ہزاروں قمقمے روشن ہو جاتے ہیں، گرمی کے زمانے میں گھر گھر پنکھے چلتے ہیں۔ مگر ان واقعات سے نہ تو ہمارے اندر حیرت و استعجاب کی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ ان چیزوں کے روشن یا متحرک ہونے کی علّت میں کسی قسم کا اختلاف ہمارے درمیان واقع ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان قمقموں کا تعلق جن تاروں سے ہے ان کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان تاروں کا تعلق جس بجلی گھر سے ہے اس کا حال بھی ہم کو معلوم ہے۔ اس بجلی گھر میں جو لوگ کام کرتے ہیں ان کے وجود کا بھی ہم کو علم ہے۔ ان کام کرنے والوں پر جو انجینیر نگرانی کر رہا ہے اس کو بھی ہم جانتے ہیں۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ انجینیر بجلی کے کام سے واقف ہے، اس کے پاس بہت سی کلیں ہیں اور ان کلوں کو حرکت دے کر وہ اس قوت کو پیدا کر رہا ہے جس کے جلوے ہم کو قمقموں کی روشنی، پنکھوں کی گردش، ریلوں اور ٹرام گاڑیوں کی سیر، چکیوں اور کارخانوں میں نظر آتے ہیں۔ پس بجلی کے آثار کو دیکھ کر اس کے اسباب کے متعلق ہمارے درمیان اختلاف رائے واقع نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان اسباب کا پورا سلسلہ ہمارے محسوسات میں داخل ہے اور ہم اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ فرض کیجیے کہ یہی قمقمے روشن ہوتے، اسی طرح پنکھے گردش کرتے، یونہی ریلیں اور ٹرام گاڑیاں چلتیں، چکیاں اور مشینیں حرکت کرتیں، مگر وہ تار جن سے بجلی ان میں پہنچتی ہے ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوتے، بجلی گھر بھی ہمارے محسوسات کے دائرے سے خارج ہوتا، بجلی گھر میں کام کرنے والوں کا بھی ہم کو کچھ علم نہ ہوتا، اور یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اس کارخانہ کا کوئی انجینیر ہے جو اپنے علم اور اپنی قدرت سے اس کو چلا رہا ہے۔ کیا اس وقت بھی بجلی کے ان آثار کو دیکھ کر ہمارے دل ایسے ہی مطمئن ہوتے؟ کیا اس وقت بھی ہم اسی طرح ان مظاہر کی علّتوں میں اختلاف نہ کرتے؟ ظاہر ہے کہ آپ اس کا جواب نفی میں دیں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب آثار کے اسباب پوشیدہ ہوں اور مظاہر کی علّتیں غیر معلوم ہوں تو دلوں میں حیرت کے ساتھ بے اطمینانی کا پیدا ہونا، دماغوں کا اس رازِ سربستہ کی جستجو میں لگ جانا، اور اس راز کے متعلق قیاسات و آراء کا مختلف ہونا ایک فطری بات ہے۔

اب ذرا اسی مفروضہ پر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھائیے۔ مان لیجیے کہ یہ جو کچھ فرض کیا گیا ہے درحقیقت عالمِ واقعہ میں موجود ہے۔ ہزاروں لاکھوں قمقمے روشن ہیں، لاکھوں پنکھے چل رہے ہیں، گاڑیاں دوڑ رہی ہیں، کارخانے حرکت کر رہے ہیں اور ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان میں کونسی قوت کام کر رہی ہے اور وہ کہاں سے آتی ہے۔ لوگ ان مظاہر کو دیکھ کر حیران و ششدر ہیں۔

بھانت بھانت کی بولیاں

ہر شخص ان کے اسباب کی جستجو میں عقل کے گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں آپ سے آپ روشن اور متحرک ہیں، ان کے اپنے وجود سے خارج کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انہیں روشنی یا حرکت بخشنے والی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ چیزیں جن مادوں سے بنی ہوئی ہیں انہی کی ترکیب نے ان کے اندر روشنی اور حرکت کی کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس عالمِ مادہ سے ماورا چند دیوتا ہیں جن میں سے کوئی قمقمے روشن کرتا ہے، کوئی ٹرام اور ریلیں چلاتا ہے، کوئی پنکھوں کو گردش دیتا ہے اور کوئی کارخانوں اور چکیوں کا محرک ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو سوچتے سوچتے تھک گئے ہیں اور آخر میں عاجز ہو کر کہنے لگے ہیں کہ ہماری عقل اس طلسم کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتی، ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور جو کچھ ہماری سمجھ میں نہ آئے اُس کی نہ ہم تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب۔

یہ سب گروہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ مگر اپنے خیال کی تائید اور دوسرے خیالات کی تکذیب کے لیے ان میں سے کسی کے پاس بھی قیاس اور ظن و تخمین کے سوا کوئی ذریعۂ علم نہیں ہے۔

ایک جداگانہ آواز

اس دوران میں کہ یہ اختلافات برپا ہیں، ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائیو، میرے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ اُس ذریعے سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان سب قمقموں، پنکھوں، گاڑیوں، کارخانوں اور چکیوں کا تعلق چند مخفی تاروں سے ہے جن کو تم محسوس نہیں کرتے۔ ان تاروں میں ایک بہت بڑے بجلی گھر سے وہ قوت آتی ہے جس کا ظہور روشنی اور حرکت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس بجلی گھر میں بڑی بڑی عظیم الشان کلیں ہیں جنہیں بے شمار شخص چلا رہے ہیں۔ یہ سب اشخاص ایک بڑے انجینیر کے تابع ہیں۔ اور وہی انجینیر ہے جس کے علم اور قدرت نے اس پورے نظام کو قائم کیا ہے۔ اسی کی ہدایت اور نگرانی میں یہ کام ہو رہے ہیں۔

یہ شخص پوری قوت سے اپنے اس دعوے کو پیش کرتا ہے۔ لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں، سب گروہ مل کر اس کی مخالفت کرتے ہیں، اسے دیوانہ قرار دیتے ہیں، اس کو مارتے ہیں، تکلیفیں دیتے ہیں، گھر سے نکال دیتے ہیں مگر وہ ان سب روحانی اور جسمانی مصیبتوں کے باوجود اپنے دعوے پر قائم رہتا ہے۔ کسی خوف یا لالچ سے اپنے قول

ہیں وہ برابر تسلیم نہیں کرتا کسی حیثیت سے اس کے دعوے میں کمزوری نہیں آتی۔ اس کی ہر ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اپنے قول کی صداقت پر کامل یقین ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا شخص آتا ہے اور وہ بھی بجنسہٖ یہی قول اسی دعوے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں آتا ہے اور وہی بات کہتا ہے جو اس کے پیشروؤں نے کہی تھی۔ اس کے بعد آنے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز ہو جاتی ہے، اور یہ سب اسی ایک قول کو اسی ایک دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ زمان و مکان اور حالات کے اختلاف کے باوجود ان کے قول میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ سب کہتے ہیں کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ سب کو دیوانہ قرار دیا جاتا ہے، ہر طرح سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، ہر طریقہ سے ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے قول سے باز آجائیں، مگر سب کے سب اپنی بات پر قائم رہتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کو اپنے مقام سے ایک انچ نہیں ہٹا سکتی۔ اس عزم و استقامت کے ساتھ ان لوگوں کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں سے کوئی جھوٹا، چور، خائن، بدکار، ظالم اور حرام خور نہیں ہے۔ ان کے دشمنوں اور مخالفوں کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ ان سب کے اخلاق پاکیزہ ہیں، سیرتیں انتہا درجہ کی نیک ہیں، اور حسن خلق میں یہ اپنے دوسرے ابنائے نوع سے ممتاز ہیں۔ پھر ان کے اندر جنون کا بھی کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ تہذیب اخلاق، تزکیۂ نفس، اور دنیوی معاملات کی اصلاح کے لیے ایسی ایسی تعلیمات پیش کرتے اور ایسے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کے مثل بنانا تو درکنار بڑے بڑے عقلاء کو ان کی باریکیاں سمجھنے میں پوری پوری عمریں صرف کر دینی پڑتی ہیں۔

معاملہ عقل کی عدالت میں

ایک طرف وہ مختلف الخیال متکلمین ہیں، اور دوسری طرف یہ متحد الخیال مدعی۔ دونوں کا معاملہ عقل سلیم کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ جج کی حیثیت سے عقل کا فرض ہے کہ پہلے اپنی پوزیشن کو خوب سمجھ لے، پھر فریقین کی پوزیشن کو دیکھے، اور دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد فیصلہ کرے کہ کس کی بات قابل ترجیح ہے۔

جج کی اپنی پوزیشن یہ ہے کہ خود اس کے پاس امر واقعی کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ خود حقیقت کا علم نہیں رکھتا۔ اس کے سامنے صرف فریقین کے بیانات، ان کے دلائل، ان کے ذاتی حالات اور خارجی آثار و قرائن ہیں۔ انہی پر تحقیق کی نظر ڈال کر اسے فیصلہ کرنا ہے کہ کس کا برحق ہونا اغلب ہے۔ مگر اغلبیت سے بڑھ کر بھی وہ کوئی حکم نہیں دے سکتا۔ کیونکہ مسئلہ پر جو کچھ مواد ہے اس کی بنا پر یہ کہنا اس کے لیے مشکل ہے کہ امر واقعی کیا ہے۔ وہ فریقین میں سے ایک کو ترجیح دے سکتا ہے لیکن قطعیت اور یقین کے ساتھ کسی کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتا۔

مکذبین کی پوزیشن

مکذبین کی پوزیشن یہ ہے:

۱۔ حقیقت کے متعلق ان کے نظریّے مختلف ہیں۔ اور کسی ایک نکتہ میں بھی ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے، حتیٰ کہ ایک ہی گروہ کے افراد میں بسا اوقات اختلاف پایا گیا ہے۔

۲۔ وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو۔ ان میں سے کوئی گروہ اس سے زیادہ کسی چیز کا مدعی نہیں ہے کہ ہمارے قیاسات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ وزنی ہیں۔ مگر اپنے قیاسات کا قیاسات ہونا سب کو تسلیم ہے۔

۳۔ اپنے قیاسات پر ان کا اعتقاد، ایمان و یقین اور غیر متزلزل وثوق کی حد تک نہیں پہنچا ہے۔ ان میں تبدیلیِ رائے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ ان میں کا ایک شخص کل تک جس نظریّے کو پورے زور کے ساتھ پیش کر رہا تھا، آج خود اسی نے اپنے پچھلے نظریّے کی تردید کر دی اور ایک دوسرا نظریّہ پیش کر دیا۔ عمر، عقل، علم اور تجربے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اکثر ان کے نظریّے بدلتے رہتے ہیں۔

۴۔ مدعیوں کی تکذیب کے لیے ان کے پاس بجز اس کے اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی صداقت کا کوئی یقینی ثبوت نہیں پیش کیا، انہوں نے وہ مخفی تار ہم کو نہیں دکھائے جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ قمقموں اور پنکھوں وغیرہ کا تعلق انہی سے ہے، نہ انہوں نے بجلی کا وجود تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا، نہ بجلی گھر کی ہمیں سیر کرائی، نہ اس کی کلوں اور مشینوں کا معاینہ کرایا، نہ اس کے کارندوں میں سے کسی سے ہماری ملاقات کرائی، نہ کبھی انجینئر سے ہم کو ملایا، پھر ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ سب کچھ حقائق ہیں؟

مدعیوں کی پوزیشن

مدعیوں کی پوزیشن یہ ہے:

۱۔ وہ سب آپس میں متفق القول ہیں۔ دعوے کے جتنے بنیادی نکات ہیں ان سب میں ان کے درمیان کامل اتفاق ہے۔

۲۔ ان سب کا متفقہ دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

۳۔ ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم اپنے قیاس یا گمان کی بنا پر ایسا کہتے ہیں بلکہ سب نے بالاتفاق کہا ہے کہ انجینئر سے ہمارے خاص تعلقات ہیں، اس کے کارندے ہمارے پاس آتے ہیں، اس نے اپنے کارخانے کی سیر بھی ہم کو کرائی ہے اور ہم جو کچھ کہتے ہیں علم و یقین کی بنا پر کہتے ہیں، ظن و تخمین کی بنا پر نہیں کہتے۔

۴۔ ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی نے اپنے بیان میں ذرہ برابر بھی کوئی تغیّر و تبدّل کیا ہو، ایک

ہی بات ہے جو ان میں کا ہر شخص دعوے کے آغاز سے زندگی کے آخری سانس تک کہتا رہا ہے۔

۵- ان کی سیرتیں انتہا درجہ کی پاکیزہ ہیں۔ جھوٹ، فریب، مکاری، دغا بازی کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے۔ اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جو لوگ زندگی کے تمام معاملات میں سچے اور کھرے ہوں، وہ خاص اسی معاملے میں بالاتفاق جھوٹ بولیں

۶- اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ دعویٰ پیش کرنے سے ان کے پیش نظر کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ برعکس اس کے یہ ثابت ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر نے اس دعوے کی خاطر انتہائی درجے کے مصائب برداشت کیے ہیں۔ جسمانی تکلیفیں سہیں، قید کیے گئے، مارے اور پیٹے گئے، جلا وطن کیے گئے، بعض قتل کر دیے گئے حتیٰ کہ بعض کو آرے سے چیر ڈالا گیا۔ اور چند کے سوا کسی کو بھی خوش حالی و فارغ البالی کی زندگی میسر نہ ہوئی۔ لہٰذا کسی ذاتی غرض کا الزام ان پر نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ اُن کا ایسے حالات میں اپنے دعوے پر قائم رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اپنی صداقت پر انتہا درجہ کا یقین تھا، ایسا یقین کہ اپنی جان بچانے کے لیے بھی ان میں سے کوئی اپنے دعوے سے باز نہ آیا۔

۷- ان کے متعلق مجنون اور فاتر العقل ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ زندگی کے تمام معاملات میں وہ سب کے سب غایت درجہ کے دانشمند اور سلیم العقل پائے گئے ہیں۔ ان کے مخالفین نے بھی اکثر ان کی دانشمندی کا لوہا مانا ہے۔ پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ان سب کو خاص اسی معاملے میں جنون لاحق ہو گیا ہو؟ اور وہ معاملہ بھی کیسا؟ جو اُن کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گیا ہو، جس کے لیے انہوں نے دنیا بھر کا مقابلہ کیا ہو، جس کی خاطر وہ سالہا سال دنیا سے لڑتے رہے ہوں، جو ان کی ساری عاقلانہ تعلیمات کا، جن کے عاقلانہ ہونے کا بہت سے منکرین کو بھی اعتراف ہے، اصل الاصول ہو۔

۸- انہوں نے خود بھی یہ نہیں کہا کہ ہم انجینئر یا اس کے کارندوں سے تمہاری ملاقات کرا سکتے ہیں یا اس کا مخفی کارخانہ تمہیں دکھا سکتے ہیں یا تجربہ اور مشاہدہ سے اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں۔ وہ خود ان تمام امور کو "غیب" سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم پر اعتماد کرو اور جو کچھ ہم بتاتے ہیں اسے مان لو۔

عقل کی عدالت کا فیصلہ

فریقین کی پوزیشن اور ان کے بیانات پر غور کرنے کے بعد اب عقل کی عدالت اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ چند ظاہری آثار کو دیکھ کر ان کے باطنی اسباب و علل کی جستجو دونوں فریقوں نے کی ہے اور ہر ایک نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ بادی النظر میں سب کے نظریات اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ اولاً ان میں سے کسی میں استحالۂ عقلی نہیں ہے، یعنی قوانین عقل کے لحاظ سے کسی نظریے کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا

صحیح ہونا غیر ممکن ہے۔ ثانیاً ان میں سے کسی کی صحت تجربے یا مشاہدے سے ثابت نہیں کی جا سکتی۔ نہ فریقِ اوّل میں سے کوئی گروہ اپنے نظریات کا ایسا سائنٹفک ثبوت دے سکتا ہے جو ہر شخص کو یقین کرنے پر مجبور کر دے اور نہ فریقِ ثانی اس پر قادر یا اس کا مدعی ہے۔ لیکن مزید غور و تحقیق کے بعد چند امور ایسے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر تمام نظریات میں سے فریقِ ثانی کا نظریہ قابلِ ترجیح قرار پاتا ہے:

اوّلاً کسی دوسرے نظریے کی تائید اتنے کثیر التعداد لوگوں کا مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں ایسا دعوے پر متفق ہو جانا کہ ان سب کے پاس ایک غیر معمولی ذریعۂ علم ہے، اور ان سب نے اس ذریعے سے خارجی مظاہر کے باطنی اسباب کو معلوم کر لیا ہے، ہم کو اس دعوے کی تصدیق پر مائل کر دیتا ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اپنی معلومات کے متعلق ان کے بیانات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جو معلومات انھوں نے بیان کی ہیں ان میں کوئی استحالۂ عقلی بھی نہیں ہے، اور نہ یہ بات قوانینِ عقلی کی بنا پر محال قرار دی جا سکتی ہے کہ بعض انسانوں میں کچھ ایسی غیر معمولی قوتیں ہوں جو عام طور پر دوسرے انسانوں میں نہ پائی جاتی ہوں۔

ثالثاً خارجی مظاہر کی حالت پر غور کرنے سے اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کا نظریہ صحیح ہو۔ اس لیے کہ قمقمے، پنکھے، گاڑیاں، کارخانے وغیرہ نہ تو آپ سے آپ روشن اور متحرک ہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کا روشن اور متحرک ہونا ان کے اپنے اختیار میں ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نہ ان کی روشنی و حرکت ان کے مادۂ جسمی کی ترکیب کا نتیجہ ہے، کیونکہ جب وہ متحرک اور روشن نہیں ہوتے اس وقت بھی یہی ترکیبِ جسمی موجود رہتی ہے۔ نہ ان کا الگ الگ قوتوں کے زیرِ اثر ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بسا اوقات جب قمقموں میں روشنی نہیں ہوتی تو پنکھے بھی بند ہوتے ہیں، ٹرام کاریں بھی موقوف ہو جاتی ہیں اور کارخانے بھی نہیں چلتے۔ لہٰذا خارجی مظاہر کی توجیہ میں فریقِ اوّل کی طرف سے جتنے نظریات پیش کیے گئے ہیں وہ سب بعید از عقل و قیاس ہیں۔ زیادہ صحیح یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان تمام مظاہر میں کوئی ایک قوت کارفرما ہو اور اس کا سررشتہ کسی ایسے حکیم و توانا کے ہاتھ میں ہو جو ایک مقررہ نظام کے تحت اس قوت کو مختلف مظاہر میں صرف کر رہا ہو۔

باقی رہا متشککین کا یہ قول کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اور جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے اس کی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے، تو حاکمِ عقل اس کو بھی درست نہیں سمجھتا، کیونکہ کسی واقعہ کا واقعہ ہونا اس کا محتاج نہیں ہے کہ وہ سننے والوں کی سمجھ میں بھی آ جائے۔ اس کے وقوع کو تسلیم کرنے کے لیے معتبر اور متواتر شہادت کافی ہے۔ اگر بہت سے معتبر آدمی آ کر کہیں کہ ہم نے زمینِ مغرب میں آدمیوں کو لوہے کی گاڑیوں میں بیٹھ کر ہوا پر اڑتے دیکھا ہے۔ اور ہم اپنے کانوں سے لندن میں بیٹھ کر امریکہ کا گانا سن آتے ہیں، تو ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ یہ لوگ جھوٹے اور مسخرے تو نہیں ہیں؟ ایسا بیان کرنے میں ان کی کوئی ذاتی غرض تو نہیں ہے؟ ان کے دماغ میں کوئی فتور تو نہیں ہے؟ اگر ثابت ہو گیا کہ وہ

نہ جھوٹے ہیں نہ مسخرے، نہ دیوانے، نہ ان کا کوئی مفاد اس روایت سے وابستہ ہے، اور اگر ہم نے دیکھا کہ اس کو بلا اختلاف بہت سے سچے اور عقلمند لوگ پوری سنجیدگی کے ساتھ بیان کر رہے ہیں تو ہم یقیناً اس کو تسلیم کر لیں گے، خواہ لوہے کی گاڑیوں کا ہوا پر اڑنا اور کسی مادی واسطہ کے بغیر ایک جگہ کا گانا کئی ہزار میل کے فاصلہ پر سنائی دینا کسی طرح ہماری سمجھ میں نہ آتا ہو۔

یہ اس معاملہ میں عقل کا فیصلہ ہے۔ مگر تصدیق و یقین کی کیفیت جس کا نام "ایمان" ہے اس سے پیدا نہیں ہوتی اس کے لیے وجدان کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اندر سے ایک آواز آئے جو تکذیب، شک اور تذبذب کی تمام کیفیتوں کا خاتمہ کر دے اور صاف کہہ دے کہ لوگوں کی قیاس آرائیاں باطل ہیں، سچ وہی ہے جو سچے لوگوں نے قیاس سے نہیں بلکہ علم و بصیرت کی رُو سے بیان کیا ہے۔

فصل ۳

نبوّت کی ضرورت و حقیقت

انسان کی سب سے بڑی ضرورت

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ ط (النحل آیت: ۹)

اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جبکہ ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔

توحید اور رحمت و ربوبیت کے دلائل پیش کرتے ہوئے یہاں اشارۃً نبوت کی بھی دلیل پیش کر دی گئی ہے۔

اس دلیل کا مختصر بیان یہ ہے۔

"دنیا میں انسان کے لیے فکر و عمل کے بہت سے مختلف راستے ممکن ہیں اور عملاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے راستے بیک وقت تو حق نہیں ہو سکتے۔ سچائی تو ایک ہی ہے اور صحیح طریق حیات صرف وہی ہو سکتا ہے جو صحیح نظریۂ حیات پر مبنی ہو۔

اس صحیح نظریے اور صحیح راہ سے واقف ہونا انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ بلکہ اصل بنیادی ضرورت یہی ہے۔ دوسری تمام چیزیں تو انسان کی صرف اُن ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں جو ایک اُونچے درجے کا جانور ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہوا کرتی ہیں۔ مگر یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو انسان ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہے یہ اگر پوری نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی ساری زندگی ہی ناکام ہو گئی۔

اب غور کیجیے کہ جس خدا نے آپ کو وجود میں لانے سے پہلے آپ کے لیے یہ کچھ سروسامان کر رکھا اور جس نے وجود میں لانے کے بعد آپ کی حیوانی زندگی کی ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا اتنی دقیقہ سنجی کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر انتظام کیا، کیا اس سے آپ توقع رکھتے ہیں کہ اس نے آپ کی انسانی زندگی کی اِس سب سے بڑی اور اصل ضرورت کو پورا کرنے کا بندوبست نہ کیا ہو گا۔

یہی بندوبست تو ہے جو نبوت کے ذریعے کیا گیا ہے۔ اگر آپ نبوت کو نہیں مانتے تو بتایئے کہ آپ کے خیال میں خدا نے انسان کی ہدایت کے لیے اور کونسا انتظام کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپ نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ہمیں

راستہ تلاش کرنے کے لیے عقل و فکر دے رکھی ہے کیونکہ انسانی عقل و فکر پہلے ہی بے شمار راستے ایجاد کر بیٹھی ہے جو راہِ راست کی صحیح دریافت میں اُس کی ناکامی کا کھلا ثبوت ہے۔ اور نہ آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے کیونکہ خدا کے ساتھ اس سے بڑھ کر بدگمانی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ جانور ہونے کی حیثیت سے تو آپ کی پرورش اور نشو و نما کا اتنا مفصل اور مکمل انتظام کرے، مگر انسان ہونے کی حیثیت سے آپ کو یوں ہی تاریکیوں میں بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دے۔

جبری ہدایت کے بجائے الہامی ہدایت

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَہَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (النحل آیت ۹) اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔

یعنی اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس ذمہ داری کو (جو نوع انسانی کی رہنمائی کے لیے اس نے خود اپنے آپ پر عائد کی ہے) اس طرح ادا کرتا کہ سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر دوسری تمام بے اختیار مخلوقات کی طرح برسرِ ہدایت بنا دیتا، لیکن یہ اُس کی مشیت کا تقاضا نہ تھا۔ اُس کی مشیت ایک ایسی ذی اختیار مخلوق کو وجود میں لانے کی متقاضی تھی جو اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے صحیح اور غلط، ہر طرح کے راستوں پر جانے کی آزادی رکھتی ہو۔ اسی آزادی کے استعمال کے لیے اُس کو علم کے ذرائع دیئے گئے۔ عقل و فکر کی صلاحیتیں دی گئیں۔ خواہش اور ارادے کی طاقتیں بخشی گئیں۔ اپنے اندر اور باہر کی بے شمار چیزوں پر تصرّف کے اختیارات عطا کیے گئے۔ اور باطن و ظاہر میں ہر طرف بے شمار ایسے اسباب رکھ دیئے گئے جو اُس کے لیے ہدایت اور ضلالت دونوں کے موجب بن سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ بے معنی ہو جاتا اگر وہ پیدائشی طور پر راست رو بنا دیا جاتا۔ اور ترقی کے اُن بلند ترین مدارج تک بھی انسان کا پہنچنا ممکن نہ رہتا جو صرف آزادی کے صحیح استعمال ہی میں اُس کو مل سکتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے جبری ہدایت کا طریقہ چھوڑ کر رسالت کا طریقہ اختیار فرمایا تاکہ انسان کی آزادی بھی برقرار رہے، اور اس کے امتحان کا منشا بھی پورا ہو، اور راہِ راست بھی معقول طریقے سے اس کے سامنے پیش کر دی جائے۔[۱]

مادّی اور اخلاقی زندگی میں نشانات ہدایت کی ضرورت

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں۔ (النحل ۱۶)

یعنی خدا نے ساری زمین بالکل یکساں بنا کر نہیں رکھ دی بلکہ ہر خطّے کو مختلف امتیازی علامات (Land marks) سے ممتاز کیا۔ اس کے بہت سے فوائد کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے راستے اور منزلِ مقصود کو الگ پہچان لیتا ہے۔ اس نعمت کی قدر آدمی کو اُس وقت معلوم ہوتی ہے، جبکہ

ایسے کبھی ریگستانی علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہو جہاں اس طرح کے امتیازی نشانات تقریباً مفقود ہوتے ہیں اور آدمی ہر وقت بھٹک جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر بحری سفر میں آدمی کو اس عظیم نعمت کا احساس ہوتا ہے، کیونکہ وہاں نشاناتِ راہ بالکل ہی مفقود ہوتے ہیں لیکن صحراؤں اور سمندروں میں بھی اس نے انسان کی رہنمائی کا ایک فطری انتظام کر رکھا ہے اور وہ ہیں تارے جنہیں دیکھ دیکھ کر انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک اپنا راستہ معلوم کرتا رہا ہے۔

یہاں پھر توحید اور رحمت و ربوبیت کی دلیلوں کے درمیان ایک لطیف اشارہ دلیلِ رسالت کی طرف کر دیا گیا ہے۔ اس مقام کو پڑھتے وقت ذہن خود بخود اس مضمون کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جس خدا نے تمہاری مادّی زندگی میں تمہاری رہنمائی کے لیے یہ کچھ انتظامات کیے ہیں، کیا وہ تمہاری اخلاقی زندگی سے اتنا بے پروا ہو سکتا ہے کہ یہاں تمہاری ہدایت کا کچھ بھی انتظام نہ کرے؟ ظاہر ہے کہ مادّی زندگی میں بھٹک جانے کا بڑے سے بڑا نقصان بھی اخلاقی زندگی میں بھٹکنے کے نقصانات سے بدرجہا کم ہے۔ پھر جس ربِّ رحیم کو ہماری فلاح کی اتنی فکر ہے کہ پہاڑوں میں ہمارے لیے راستے بناتا ہے، میدانوں میں نشاناتِ راہ کھڑے کرتا ہے، صحراؤں اور سمندروں میں ہم کو صحیح سمتِ سفر بتانے کے لیے آسمانوں پر قندیلیں روشن کرتا ہے، اُس سے یہ بدگمانی کیسے کی جا سکتی ہے کہ اُس نے ہماری اخلاقی فلاح کے لیے کوئی راستہ نہ بنایا ہوگا، اُس راستے کو نمایاں کرنے کے لیے کوئی نشان نہ کھڑا کیا ہوگا، اور اُسے صاف دکھانے کے لیے کوئی سراجِ منیر روشن نہ کیا ہوگا؟ ؎

انسان کے لیے شعوری رہنمائی کی اہمیت

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۔ (طٰہٰ۔ آیت ۵۰)

موسیٰؑ نے فرعون کو جواب دیا "ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا۔"

یعنی دنیا کی ہر شے جیسی کچھ بھی بنی ہوئی ہے، اُسی کے بنانے سے بنی ہے۔ ہر چیز کو جو بناوٹ، جو شکل و صورت، جو قوت و صلاحیت، اور جو صفت و خاصیت حاصل ہے، اُسی کے عطیے اور بخشش کی بدولت حاصل ہے۔ ہاتھ کو دنیا میں اپنا کام کرنے کے لیے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اُس کو دے دی، اور پاؤں کو جو مناسب ترین ساخت درکار تھی وہ اُس کو بخشی۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی، روشنی، ہر ایک چیز کو اُس نے وہ صورتِ خاص عطا کی ہے جو اُسے کائنات میں اپنے حصے کا کام ٹھیک طور پر انجام دینے کے لیے مطلوب تھی۔

پھر اُس نے صرف یہی نہیں کیا کہ ہر چیز کو اس کی مخصوص بناوٹ دے کر یونہی چھوڑ دیا ہو، بلکہ اُس کے بعد وہی اِن سب چیزوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کا طریقہ اُس نے نہ سکھایا ہو۔ کان کو سننا اور آنکھ کو دیکھنا اُسی نے سکھایا ہے۔ مچھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اڑنا

اُسی کی تعلیم سے آیا ہے۔ درخت کو پھل پھول دینے اور زمین کو نباتات اگانے کی ہدایت اُسی نے دی ہے غرض وہ ساری کائنات اور اُس کی ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں ہادی اور معلّم بھی ہے۔

مزید برآں اسی ذرا سے فقرے میں حضرت موسیٰؑ نے اشارۃً رسالت کی دلیل بھی پیش کر دی جس کے ماننے سے فرعون کو انکار تھا۔ ان کی دلیل میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا ہادی ہے، اور جو ہر چیز کو اُس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہدایت دے رہا ہے، اس کے عالمگیر منصبِ ہدایت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی شعوری زندگی کے لیے رہنمائی کی وہ شکل موزوں نہیں ہو سکتی جو کھیل اور مرغی کی رہنمائی کے لیے موزوں ہے۔ اُس کی موزوں ترین شکل یہ ہے کہ ایک ذی شعور انسان اُس کی طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہو اور وہ اُن کی عقل و شعور کو اپیل کر کے انہیں سیدھا راستہ بتاتے ؓ۔

فصل سوم

پیغمبری کیا ہے؟

دنیا میں انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اللہ نے اُن سب کا انتظام خود ہی کر دیا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کتنا سامان اس کو دے کر دنیا میں بھیجا جاتا ہے؟ دیکھنے کے لیے آنکھیں، سننے کے لیے کان، سونگھنے اور سانس لینے کے لیے ناک۔ محسوس کرنے کے لیے سارے جسم کی کھال میں قوتِ لامسہ۔ چلنے کے لیے پاؤں۔ کام کرنے کے لیے ہاتھ۔ سوچنے کے لیے دماغ۔ اور ایسی ہی بے شمار دوسری چیزیں جو پہلے سے اس کی سب ضرورتوں کا لحاظ کر کے اس کے چھوٹے سے جسم میں لپیٹ کر رکھ دی گئی ہیں۔ پھر جب وہ دنیا میں قدم رکھتا ہے تو زندگی بسر کرنے کے لیے اتنا سامان اس کو ملتا ہے جس کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہوا ہے، روشنی ہے، حرارت ہے، پانی ہے، زمین ہے، ماں کے سینے میں پہلے سے دُودھ موجود ہے، ماں اور باپ اور عزیزوں حتّٰی کہ غیروں کے دلوں میں اس کے لیے محبت اور شفقت پیدا کر دی گئی ہے جس سے اس کو پالا پوسا جاتا ہے۔ پھر جتنا جتنا وہ بڑھتا جاتا ہے اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہر قسم کا سامان اس کو ملتا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا زمین و آسمان کی ساری قوتیں اس کی پرورش اور خدمت کے لیے کام کر رہی ہیں۔

دنیا میں کام کرنے کے لیے جتنی قابلیتوں کی ضرورت ہے وہ سب انسانوں کو دی گئی ہیں جیسا کہ قوت، عقل، سمجھ بوجھ، گویائی اور ایسی ہی بہت سی قابلیتیں تھوڑی یا بہت ہر انسان میں موجود ہیں لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے عجیب انتظام کیا ہے۔ ساری قابلیتیں سب انسانوں کو یکساں نہیں دیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی کسی کا محتاج نہ ہوگا۔ نہ کوئی کسی کی پروا کرتا۔ اس لیے اللہ نے تمام انسانوں کی مجموعی ضرورتوں کے لحاظ سے سب قابلیتیں پیدا تو انسانوں ہی میں کیں، مگر اس طرح کہ کسی کو ایک قابلیت زیادہ دے دی اور کسی دوسرے کو کوئی دوسری قابلیت۔ بعض لوگ جسمانی محنت کی قوتیں دوسروں سے زیادہ لے کر آتے ہیں۔ بعض لوگوں میں کسی خاص ہنر یا پیشہ کی پیدائشی قابلیت ہوتی ہے جس سے دوسرے محروم ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں میں ذہانت اور عقل کی قوت دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ بعض پیدائشی سپہ سالار ہوتے ہیں۔ بعض میں حکمرانی کی خاص قابلیت ہوتی ہے۔ بعض تقریر کی

غیر معمولی قوت لے کر پیدا ہوتے ہیں بعض میں انشا پردازی کا فطری ملکہ ہوتا ہے۔ کوئی ایسا شخص پیدا ہوتا ہے کہ اس کا دماغ ریاضی میں خوب لڑتا ہے حتیٰ کہ اس فن کے بڑے بڑے پیچیدہ سوالات اس طرح حل کر دیتا ہے کہ دوسروں کے ذہن وہاں تک نہیں پہنچتے۔ ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو عجیب عجیب چیزیں ایجاد کرتا ہے اور اس کی ایجادوں کو دیکھ کر دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک اور شخص ایسا بے نظیر قانونی دماغ لے کر آتا ہے کہ قانون کے جو نکتے برسوں غور کرنے کے بعد بھی دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتے اس کی نظر خود بخود وہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ خدا کی دین ہے۔ کوئی شخص اپنے اندر خود یہ قابلیتیں[1] پیدا نہیں کر سکتا۔ نہ تعلیم و تربیت سے یہ چیزیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ دراصل یہ پیدائشی قابلیتیں ہیں اور خدا اپنی حکمت سے جس کو یہ چیزیں چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔

انسانی تمدن کے لیے جن قابلیتوں کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، وہ زیادہ انسانوں میں پیدا کی جاتی ہیں۔ اور جن کی ضرورت جس قدر کم ہوتی ہے وہ اسی قدر کم آدمیوں میں پیدا کی جاتی ہیں۔ سپاہی بہت پیدا ہوتے ہیں۔ کسان اور بڑھئی اور لوہار اور ایسے ہی دوسرے کاموں کے آدمی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر علمی و دماغی قوتیں رکھنے والے اور سیاست اور سپہ سالاری کی قابلیتیں رکھنے والے کم پیدا ہوتے ہیں پھر وہ لوگ اور بھی زیادہ کم یاب ہوتے ہیں جو کسی خاص فن میں غیر معمولی قابلیت کے مالک ہوں۔ کیونکہ ان کے کارنامے صدیوں کے لیے انسانوں کو اپنے جیسے ماہر فن کی ضرورت سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔

انسانی زندگی کی اہم ترین ضرورت

اب سوچنا چاہیے کہ دنیا میں انسانی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے صرف یہی ایک ضرورت تو نہیں ہے کہ انسانوں میں انجینئر، ریاضی دان، سائنسدان، قانون دان، سیاست کے ماہر، معاشیات کے باکمال اور مختلف پیشوں کی قابلیت رکھنے والے لوگ ہی پیدا ہوں۔ ان سب سے بڑھ کر ایک اور ضرورت بھی تو ہے اور وہ یہ کہ کوئی ایسا ہو جو انسان کو خدا کا راستہ بتائے۔ دوسرے لوگ تو صرف یہ بتانے والے ہیں کہ اس دنیا میں انسان کے لیے کیا ہے اور اس کو کس کس طرح برتا جا سکتا ہے۔ مگر کوئی یہ بتانے والا بھی تو ہونا چاہیے کہ انسان خود کس کے لیے ہے؟ اور انسان کو دنیا میں یہ سب سامان کس نے دیا ہے؟ اور اس دینے والے کی مرضی کیا ہے تاکہ انسان اسی کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کر کے یقینی اور دائمی کامیابی حاصل کرے؟ یہ انسان کی اصلی اور سب سے بڑی

---

[1] مراد ہیں غیر معمولی درجے کی قابلیتیں۔ معمولی درجے کی قابلیتیں تعلیم و تربیت یا مشق و تمرین سے نشو و نما پا سکتی ہیں۔ غیر معمولی قابلیتیں بسا اوقات بغیر کسی تربیت کے، اور کبھی معمولی درجے کی تربیت سے ابھر آتی ہیں۔ اور اگر اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت سے ان کی آبیاری ہو تو وہ بہت بلند معیار تک پہنچ جاتی ہیں۔ (مصنف)

ضرورت ہے۔ اور عقل یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ جس خدا نے ہماری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ اُس نے ایسی اہم ضرورت کو پورا کرنے سے غفلت برتی ہوگی۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔

رسُولوں کا منصب

خدا نے جس طرح ایک ایک ہنر اور ایک ایک علم و فن کی خاص قابلیت رکھنے والے انسان پیدا کیے ہیں، اسی طرح ایسے انسان بھی پیدا کیے ہیں جن میں خود خدا کو پہچاننے کی اعلیٰ قابلیت تھی۔ اس نے ان کو دین اور اخلاق اور شریعت کا علم اپنے پاس سے عطا کیا۔ اور ان کو اس خدمت پر مقرر کیا کہ دوسرے لوگوں کو ان چیزوں کی تعلیم دیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہماری زبان میں نبی یا رسول یا پیغمبر کہا جاتا ہے۔

پیغمبر کی پہچان

جس طرح دوسرے علوم و فنون کے باکمال لوگ ایک خاص قسم کا ذہن اور ایک خاص قسم کی طبیعت لے کر پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح پیغمبر بھی ایک خاص قسم کی طبیعت لے کر آتے ہیں۔

ایک پیدائشی شاعر کا کلام سنتے ہی ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شاعری کی خاص قابلیت لے کر پیدا ہوا ہے کیونکہ دوسرے لوگ خواہ کتنی ہی کوشش کریں ویسا شعر نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح ایک پیدائشی مقرر، ایک پیدائشی انشا پرداز، ایک پیدائشی موجد، ایک پیدائشی لیڈر بھی اپنے کارناموں سے صاف پہچان لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے کام میں غیر معمولی قابلیت کا اظہار کرتا ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتی۔ ایسا ہی حال پیغمبر کا بھی ہے۔ اس کے ذہن میں وہ باتیں آتی ہیں جو دوسرے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ وہ ایسے مضامین بیان کرتا ہے جو اس کے سوا کوئی دوسرا انسان بیان نہیں کر سکتا۔ اس کی نظر ایسی باریک باتوں تک خود بخود پہنچ جاتی ہے جن تک دوسروں کی نظر برسوں کے غور و فکر کے بعد بھی نہیں پہنچتی۔ وہ جو کچھ کہتا ہے ہماری عقل اس کو قبول کرتی ہے ہمارا دل اس کی گواہی دیتا ہے کہ ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ دنیا کے تجربات اور کائنات کے مشاہدوں سے اس کی ایک ایک بات سچی ثابت ہوتی ہے لیکن اگر ہم خود ویسی بات کہنا چاہیں تو نہیں کہہ سکتے۔ پھر اس کی طبیعت ایسی پاکیزہ ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملہ میں سچا اور شریفانہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ کبھی کوئی غلط بات نہیں کہتا۔ کوئی بُرا کام نہیں کرتا ہمیشہ نیکی اور صداقت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور جو کچھ دوسروں سے کہتا ہے اس پر خود عمل کر کے دکھاتا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ وہ جو کچھ کہے اس کے خلاف عمل کرے۔ اس کے قول یا عمل میں کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کے بھلے کی خاطر خود نقصان اٹھاتا ہے اور اپنے بھلے کے لیے دوسروں کا نقصان نہیں کرتا۔ اس کی ساری زندگی سچائی، شرافت، پاک طبیعتی، بلند خیالی اور اعلیٰ درجہ کی انسانیت کا نمونہ ہوتی ہے جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ انہی چیزوں کو دیکھ کر صاف پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ شخص خدا کا سچا پیغمبر ہے۔

پیغمبر کی اطاعت

جب یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص خدا کا سچا پیغمبر ہے تو اس کی بات ماننا، اس کی اطاعت کرنا اور اس کے طریقے کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ یہ بات بالکل خلافِ عقل ہے کہ ایک شخص کو پیغمبر بھی تسلیم کیا جائے اور پھر اس کی بات بھی نہ مانی جائے۔ اس لیے کہ پیغمبر تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مان لیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے خدا کی طرف سے کہہ رہا ہے اور جو کچھ کر رہا ہے خدا کی مرضی کے مطابق کر رہا ہے۔ اب ہم جو کچھ اس کے خلاف کہیں گے یا کریں گے وہ خدا کے خلاف ہوگا۔ اور جو بات خدا کے خلاف ہو وہ کبھی حق نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کسی کو پیغمبر تسلیم کر لینے سے یہ بات خود بخود لازم ہو جاتی ہے کہ اس کی بات کو بے چون و چرا مان لیا جائے۔ اور اس کے حکم کے آگے سر جھکا دیا جائے۔ خواہ اس کی حکمت اور اس کا فائدہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جو بات پیغمبر کی طرف سے ہے اس کا پیغمبر کی طرف سے ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حق ہے اور تمام مصلحتیں اور حکمتیں اس میں موجود ہیں۔ اگر ہماری سمجھ میں کسی بات کی مصلحت نہیں آتی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس بات میں کوئی خرابی ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خود ہماری سمجھ میں کوئی خرابی ہے۔

جو شخص کسی فن کا ماہر نہیں ہے، ظاہر ہے وہ کسی فن کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن وہ کتنا بے وقوف ہوگا اگر وہ ماہرِ فن کی بات کو محض اس وجہ سے نہ مانے کہ اس کی سمجھ میں وہ بات نہیں آتی۔ دیکھو دنیا کے ہر کام میں اس کے ماہر کی ضرورت ہوتی ہے، اور ماہر کی طرف رجوع کرنے کے بعد اس پر پورا بھروسہ کیا جاتا ہے اور اس کے کام میں دخل نہیں دیا جاتا، کیونکہ سب لوگ سب کاموں کے ماہر نہیں ہو سکتے اور نہ دنیا بھر کی تمام چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں ہمیں اپنی تمام عقل اور ہوشیاری صرف یہ اطمینان حاصل کرنے میں صرف کرنی چاہیے کہ ایک شخص ماہرِ فن ہے یا نہیں۔ پھر جب کسی کے متعلق ہمیں معلوم ہو جائے کہ وہ ایک بہترین ماہرِ فن ہے تو اس پر ہم کو کامل بھروسہ کرنا چاہیے، پھر اس کے کاموں میں دخل دینا اور ایک ایک بات کے متعلق یہ کہنا کہ پہلے ہمیں سمجھا دو ورنہ ہم نہ مانیں گے، عقلمندی نہیں بلکہ سراسر بے وقوفی ہے۔ کسی وکیل کو مقدمہ سپرد کرنے کے بعد آپ ایسی بحثیں کریں گے تو وہ آپ کو اپنے دفتر سے نکال دے گا۔ کسی ڈاکٹر سے اس کی ایک ایک ہدایت پر دلیل پوچھی جانے لگے تو وہ مریض کا علاج چھوڑ دے گا۔ ایسا ہی معاملہ مذہب کا بھی ہے۔ ہمیں خدا کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ ہمارے پاس خود ان چیزوں کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ خدا کے سچے پیغمبر کی تلاش کریں۔ اس تلاش میں ہم کو بلاشبہ نہایت ہوشیاری اور سمجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے کیونکہ اگر کسی غلط آدمی کو ہم نے پیغمبر سمجھ لیا تو وہ ہمیں غلط راستہ پر لگا دے گا۔ مگر جب ہمیں خوب جانچ پڑتال کرنے کے بعد یہ یقین ہو جائے کہ فلاں شخص خدا کا سچا پیغمبر ہے تو اس پر ہمیں پورا اعتماد کرنا چاہیے اور اس کے ہر حکم

کی اطاعت کرنی چاہیے۔

پیغمبروں پر ایمان لانے کی ضرورت

جب یہ معلوم ہو گیا کہ سچا اور سیدھا راستہ وہی ہے جو خدا کی طرف سے خدا کا پیغمبر بتاتے تو یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ پیغمبر پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت اور پیروی کرنا تمام انسانوں کے لیے ضروری ہے اور جو شخص پیغمبر کے طریقے کو چھوڑ کر خود اپنی عقل سے کوئی طریقہ نکالتا ہے وہ یقیناً گمراہ ہے۔

اس معاملہ میں لوگ عجیب عجیب غلطیاں کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو پیغمبر کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر نہ اس پر ایمان لاتے ہیں نہ اس کی پیروی قبول کرتے ہیں۔ یہ صرف کافر ہی نہیں احمق بھی ہیں کہ آدمی جان بوجھ کر جھوٹ کی پیروی کرے ظاہر ہے اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں پیغمبر کی پیروی کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم خود اپنی عقل سے حق کا راستہ معلوم کر لیں گے۔ یہ بھی سخت غلطی ہے۔ جس کسی نے ریاضی پڑھی ہے وہ یہ جانتا ہے کہ ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک سیدھا خط صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنے بھی خط کھینچے جائیں گے وہ سب یا تو ٹیڑھے ہوں گے یا اس دوسرے نقطے تک نہ پہنچیں گے۔ ایسی ہی کیفیت حق کے راستے کی بھی ہے جس کو اسلام کی زبان میں صراطِ مستقیم (یعنی سیدھا راستہ) کہا جاتا ہے۔ یہ راستہ انسان سے شروع ہو کر خدا تک جاتا ہے۔ اور ریاضی کے اسی قاعدہ کے مطابق یہ بھی ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنے راستے ہوں گے یا تو سب ٹیڑھے ہوں گے یا خدا تک نہ پہنچیں گے۔ اب ذرا اس بات پر غور کریں کہ جو سیدھا راستہ ہے وہ تو پیغمبر نے بتا دیا اور اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ صراطِ مستقیم ہے ہی نہیں۔ اس راستہ کو چھوڑ کر جو شخص خود کوئی راستہ تلاش کرے گا، اس کو دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ضرور پیش آئے گی۔ یا تو اس کو خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ ملے گا ہی نہیں یا اگر ملا بھی تو بہت چکر کا راستہ ہوگا خطِ مستقیم نہ ہوگا بلکہ خطِ منحنی ہوگا پہلی صورت میں تو اس کی تباہی ظاہر ہے۔ رہی دوسری صورت تو اس کے بھی حماقت ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بے عقل جانور بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے خطِ منحنی کو چھوڑ کر خطِ مستقیم ہی اختیار کرتا ہے۔ پھر اس انسان کو کیا کہا جائے جس کو خدا کا ایک نیک بندہ سیدھا راستہ بتائے اور وہ کہے کہ نہیں میں تیرے بتائے ہوئے راستے پر نہیں چلوں گا بلکہ خود ٹیڑھے راستوں پر بھٹک بھٹک کر منزلِ مقصود تلاش کروں گا۔

یہ تو وہ بات ہے جو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر زیادہ غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو شخص پیغمبر پر ایمان لانے سے انکار کرتا ہے اس کو خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ بھی نہیں مل سکتا، نہ ٹیڑھا نہ سیدھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص سچے آدمی کی بات ماننے سے انکار کرتا ہے اس کے دماغ میں ضرور کوئی ایسی خرابی ہوگی

جس کے سبب سے وہ سچائی سے منہ موڑتا ہے۔ یا تو اس کی سمجھ بوجھ ناقص ہوگی، یا اس کے دل میں تکبر ہوگا یا اس کی طبیعت ایسی بگڑی ہوگی کہ وہ نیکی اور صداقت کی باتوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوگی، یا وہ باپ دادا کی اندھی تقلید میں گرفتار ہوگا اور جو غلط باتیں رسم کے طور پر پہلے سے چلی آتی ہیں ان کے خلاف کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا، یا وہ اپنی خواہشات کا بندہ ہوگا۔ پیغمبر کی تعلیم کو ماننے سے اس لیے انکار کرے گا کہ اس کے مان لینے کے بعد گناہوں اور ناجائز باتوں کی آزادی باقی نہیں رہتی۔ یہ تمام اسباب ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی سبب بھی کسی شخص میں موجود ہو تو اس کو خدا کا راستہ ملنا غیر ممکن ہے۔ اور اگر کوئی سبب موجود نہ ہو تو یہ ناممکن ہے کہ ایک سچا، غیر متعصب اور نیک آدمی ایک سچے پیغمبر کی تعلیم قبول کرنے سے انکار کردے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پیغمبر خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوتا ہے اور خدا ہی کا یہ حکم ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کی اطاعت کرو۔ اب جو کوئی پیغمبر پر ایمان نہیں لاتا وہ خدا کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ ہم انسان جس سلطنت کی رعیت ہوں اس کی طرف سے جو حاکم بھی مقرر ہوگا ہمیں اس کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ اگر ہم اس کو حاکم تسلیم کرنے سے انکار کریں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے خود سلطنت کے خلاف بغاوت کی۔ سلطنت کو ماننا اور اس کے مقرر کیے ہوئے حاکم کو نہ ماننا دونوں بالکل متضاد باتیں ہیں۔ ایسی ہی مثال خدا اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی بھی ہے۔ خدا تمام انسانوں کا حقیقی بادشاہ ہے۔ جس شخص کو اس نے انسان کی ہدایت کے لیے بھیجا ہو اور اس کی اطاعت کا حکم دیا ہو، ہر انسان کا فرض ہے کہ اس کو پیغمبر تسلیم کرے اور ہر دوسری چیز کی پیروی چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی اختیار کرے۔ اس سے منہ موڑنے والا بہر حال کافر ہے خواہ وہ خدا کو مانتا ہو یا نہ مانتا ہو۔

تاریخ سلسلۂ نبوت ایک نظر میں

اب دیکھیے کہ نوعِ انسانی میں پیغمبری کا سلسلہ کس طرح شروع ہوا اور کس طرح ترقی کرتے کرتے ایک آخری اور سب سے بڑے پیغمبر پر ختم ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ایک انسان کو پیدا کیا پھر اسی انسان سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اس جوڑے کی نسل چلائی، جو بے شمار صدیوں میں پھیلتے پھیلتے تمام روئے زمین پر چھا گئی۔ دنیا میں جتنے انسان بھی پیدا ہوئے ہیں وہ سب اسی ایک جوڑے کی اولاد ہیں۔ تمام قوموں کی مذہبی اور تاریخی روایات متفق ہیں کہ نوعِ انسانی کی ابتدا ایک ہی انسان سے ہوئی ہے۔ سائنس کی تحقیقات سے بھی ثابت نہیں ہوا کہ زمین کے مختلف حصوں میں الگ الگ انسان بنائے گئے تھے۔ بلکہ سائنس کے اکثر علماء بھی یہی قیاس کرتے ہیں کہ پہلے ایک ہی انسان پیدا ہوا ہوگا اور انسان کی موجودہ نسل دنیا میں جہاں کہیں بھی پائی جاتی ہے اسی ایک شخص کی اولاد ہے۔

ہماری زبان میں اُس پہلے انسان کو آدمؑ کہتے ہیں ۔ اسی سے لفظ آدمی نکلا ہے جو انسان کا ہم معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا پیغمبر حضرت آدمؑ ہی کو بنایا ۔ اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنی اولاد کو اسلام کی تعلیم دیں یعنی ان کو یہ بتائیں کہ تمہارا اور تمام دنیا کا خدا ایک ہے ۔ اُسی کی تم عبادت کرو ۔ اسی کے آگے سر جھکاؤ ۔ اسی سے مدد مانگو اور اُسی کی مرضی کے مطابق دنیا میں نیکی اور انصاف کی زندگی بسر کرو ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم کو اچھا انعام ملے گا ۔ اور اگر اس کی اطاعت سے منہ موڑو گے تو بری سزا پاؤ گے ۔

حضرت آدمؑ کی اولاد میں جو لوگ اچھے تھے وہ اپنے باپ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلتے رہے مگر جو لوگ برے تھے انہوں نے اُسے چھوڑ دیا ۔ رفتہ رفتہ ہر قسم کی برائیاں پیدا ہو گئیں ۔ کسی نے سورج اور چاند اور تاروں کو پوجنا شروع کر دیا ۔ کسی نے درختوں اور جانوروں اور دریاؤں کی پرستش شروع کر دی ۔ کسی نے خیال کیا کہ ہوا اور پانی اور آگ ، اور بیماری و تندرستی اور قدرت کی دوسری نعمتوں اور قوتوں کے خدا الگ الگ ہیں ہر ایک کی پرستش کرنی چاہیئے تاکہ سب خوش ہو کر ہم پر مہربان ہوں ۔ اسی طرح جہالت کی وجہ سے شرک اور بت پرستی کی بہت سی صورتیں پیدا ہو گئیں جن سے بیسیوں مذہب نکل آئے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حضرت آدمؑ کی نسل دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل چکی تھی ۔ مختلف قومیں بن گئی تھیں ۔ ہر قوم نے اپنا ایک نیا مذہب بنا لیا تھا ۔ اور ہر ایک کی رسمیں الگ تھیں ۔ خدا کو بھولنے کے ساتھ لوگ اس قانون کو بھی بھول گئے تھے جو حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد کو سکھایا تھا ۔ لوگوں نے خود اپنی خواہشات کی پیروی شروع کر دی ۔ ہر قسم کی بری رسمیں پیدا ہو گئیں ہر قسم کے جاہلانہ خیالات پھیلے ۔ اچھے اور برے کی تمیز میں غلطیاں کی گئیں ۔ بہت سی بری چیزیں اچھی سمجھ لی گئیں اور بہت سی اچھی چیزوں کو برا ٹھیرا لیا گیا ۔[۹]

اس سلسلے میں قرآن مجید کی یہ آیت حقیقت نبوت پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے :

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۔ (البقرہ ۔ ۲۱۳)

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں ان لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا ۔ نہیں ، اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں

حق کا علم دیا جا چکا تھا، انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔[1]

ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بنیاد پر "مذہب" کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا اُس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسلِ آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک اُمت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہشمند تھے۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور اپنی ایک نئی اُمت بنا لے۔ بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہِ حق کو واضح کر کے انہیں پھر سے ایک اُمت بنا دیں۔[2]

پیغمبروں کا کام

پیغمبروں نے اپنی اپنی قوموں کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ انہیں ایک خدا کی پرستش سکھائی۔ شرک اور بت پرستی سے روکا۔ جاہلانہ رسموں کو توڑا۔ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتایا اور صحیح قوانین بتا کر ان کی پیروی کی ہدایت کی۔ ہندوستان، چین، عراق، ایران، مصر، افریقہ، یورپ، غرض دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں خدا کی طرف سے اس کے سچے پیغمبر نہ آئے ہوں۔ ان سب کا مذہب ایک ہی تھا اور وہ یہی مذہب تھا جس کو ہم اپنی زبان میں اسلام کہتے ہیں۔[2] البتہ تعلیم کے طریقے اور زندگی کے قوانین ذرا مختلف تھے۔ ہر قوم میں جس قسم کی جہالت پھیلی ہوئی

---

[1] کان الناس امۃ واحدۃ کے بعد اختلاف کے ظہور کا ذکر محذوف ہے۔ اسے آیت کے آخر میں واضح کر دیا گیا ہے۔ (مرتبین)

[2] عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلام کی ابتدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی ہے یہاں تک کہ آنحضرت کو بانیِ اسلام تک کہہ دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جسے ذہن سے قطعی طور پر نکال دینا چاہیے ہر طالبِ علم کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اسلام ہمیشہ سے نوعِ انسانی کا ایک ہی حقیقی مذہب ہے اور دنیا میں جب اور جہاں بھی کوئی پیغمبر خدا کی طرف سے آیا ہے وہ یہی مذہب لے کر آیا ہے۔ (مؤلف)

تھی اُسی کو دُور کرنے پر زور دیا گیا جس قسم کے غلط خیالات رائج تھے انہی کی اصلاح پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ۔ تہذیب و تمدّن اور علم و عقل کے لحاظ سے جب قومیں ابتدائی درجہ میں تھیں تو ان کو سادہ تعلیم اور سادہ شریعت دی گئی جیسی جیسی ترقی ہوتی گئی تعلیم اور شریعت کو بھی وسیع کیا جاتا رہا ۔ مگر یہ اختلاف صرف ظاہری شکلوں میں تھا۔ روح سب کی ایک تھی ، یعنی اعتقاد میں توحید ، اعمال میں نیکی و سلامت روی ، اور آخرت کی جزا و سزا پر یقین ۔

پیغمبروں کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا ؟

پیغمبروں کے ساتھ بھی انسان نے عجیب معاملہ کیا ۔ پہلے تو ان کو تکلیفیں دی گئیں ۔ ان کی ہدایت کو ماننے سے انکار کیا گیا ۔ کسی کو وطن سے نکالا گیا ۔ کسی کو قتل کیا گیا ۔ کسی کو عمر بھر کی تعلیم و تلقین کے بعد مشکل سے پانچ دس پیرو میسّر آسکے ۔ مگر خدا کے یہ برگزیدہ بندے برابر کام کیے چلے گئے ، یہاں تک کہ ان کی تعلیمات نے اثر کیا اور بڑی بڑی قومیں ان کی پیرو بن گئیں ۔ اس کے بعد گمراہی نے دوسری صورت اختیار کی ۔ پیغمبروں کی وفات کے بعد ان کی اُمّتوں نے ان کی تعلیمات کو بدل ڈالا ۔ ان کی لائی ہوئی کتابوں میں اپنی طرف سے ہر قسم کے خیالات ملا دیئے ۔ عبادتوں کے نئے نئے طریقے اختیار کیے ۔ بعضوں نے خود پیغمبروں کی پرستش شروع کر دی ۔ کسی نے اپنے پیغمبر کو خدا کا اوتار قرار دیا (یعنی یہ کہ خدا خود انسان کی شکل میں اُتر آیا تھا) ۔ کسی نے اپنے پیغمبر کو خدا کا بیٹا کہا ۔ کسی نے اپنے پیغمبر کو خدائی میں شریک ٹھیرایا ۔ غرض انسان نے عجیب ستم ظریفی کی کہ جن لوگوں نے بتوں کو توڑا تھا انسان نے خود ان ہی کو بُت بنا لیا ۔ پھر جو شریعتیں یہ پیغمبر اپنی اُمّتوں کو دے گئے تھے ان کو بھی طرح طرح سے بگاڑا گیا ۔ ان میں ہر قسم کی جاہلانہ رسمیں ملا دی گئیں ۔ افسانوں اور جھوٹی روایتوں کی آمیزش کر دی گئی ۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو ان کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ۔ یہاں تک کہ چند صدیوں کے بعد یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہا کہ پیغمبر کی اصل تعلیم اور اصل شریعت کیا تھی ۔ اور بعد والوں نے اس میں کیا کیا ملا دیا ۔ خود پیغمبروں کی زندگی کے حالات

فصل ۵

انبیاءؑ کی مشترک دعوت اور اُن کا منصب

قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"

بابل کی سرزمین ہو، یا ارضِ سدوم، یا ملکِ مدین، یا حجر کا علاقہ، یا نیل کی وادی۔ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو یا بیسویں یا دسویں۔ غلام قوم ہو یا آزاد، خستہ و درماندہ ہو یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے بامِ عروج پر۔ غرض ہر جگہ، ہر دور میں، ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے رہبروں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ (معبودِ حقیقی یا خدا) نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے پاس جا کر اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ کا مطالبہ کرنے سے پہلے اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا اعلان کیا، اور هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ۔ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى کی دعوت دی، اور اسے آگاہ کیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا رَبُّنَا الَّذِيْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۔[1] حضرت عیسیٰؑ نے جن کی قوم رومیوں کی غلام ہو چکی تھی بنی اسرائیل اور آس پاس کی قوموں کو رومی امپیریلزم کے خلاف جنگِ آزادی کے جھنڈے کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی

[1] یعنی حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی دراصل اسی خدمت پر مامور ہوئے تھے جس پر حضرت نوحؑ اور ان کے بعد کے تمام انبیاء سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک مامور ہوتے رہے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ صرف اللہ رب العالمین کو اپنا رب و الٰہ مانو اور یہ تسلیم کرو کہ تم کو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں اللہ کے سامنے حاضر ہونا اور اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔ نہ صرف تمہاری فلاح کا بلکہ ہمیشہ سے تمام انسانوں کی فلاح کا انحصار اسی ایک بات پر رہا ہے کہ اس عقیدۂ توحید و آخرت کی دعوت کو جسے ہر زمانے میں خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا ہے، قبول کیا جائے اور اپنا پورا نظامِ زندگی اسی بنیاد پر قائم کر لیا جائے۔ (مؤلف)

طرف دی کہ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعات جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں کسی اور دنیا کے نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آتے ان میں سرے سے کوئی سیاسی، معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی پس جب یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر رہنما نے ہر ملک اور ہر زمانہ میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظر انداز کر کے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ اُمّ المسائل تھا اور وہ اسی کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے۔[1]

حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے ان کو بتایا کہ ان کی بعثت کی غرض کیا ہے:

وَلِاُحِلَّ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ	"اور میں اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان
عَلَیْکُمْ وَجِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ	چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں
فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ - اِنَّ اللّٰہَ	دیکھو میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے
رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ، هٰذَا صِرَاطٌ	پاس نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور
مُّسْتَقِیْمٌ۔ (آل عمران۔ ۵۰-۵۱)	میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا

رب بھی۔ لہٰذا تم اسی کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے:[2]

ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ جس کے مقابلے میں بندگی کا رویّہ اختیار کیا جاتا ہے، اور جس کی اطاعت پر اخلاق و تمدّن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلّت و حرمت اور جواز و عدمِ جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو۔ دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیئے جائیں۔[3]

---

[1] عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر خصوصی توجّہ اس لیے ضروری ہے کہ حضورؐ سے پہلے کے انبیاءؑ میں سے وہی آخری نبی تھے اور ان کے پیغام کو مسخ کر دیا گیا۔ (مرتّبین)

[2] ملاحظہ ہو آلِ عمران کی آیت ۵۱ ۔۔۔ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ۔

پس درحقیقت حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے مشن میں یک سرِ مو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیتے ہیں، اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے، انہوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا، اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدار اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔[1]

قرآن میں انبیاء کے مقصدِ بعثت کو ایک اور انداز سے بھی بیان کیا گیا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ (آیت ۱۶۵)

یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔

یعنی ان تمام پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک ہی غرض تھی، اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی پر اتمام حجت کرنا چاہتا تھا تاکہ آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم اس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور آپ نے ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اسی غرض کے لیے خدا نے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر التعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ یا تو اس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا، یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہِ راست معلوم تھی اور انہوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو انہیں آگاہ نہ کیا۔[2]

انبیاء و رسل داعی حق ہونے کے ساتھ مطاع بھی ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن نے واضح کیا ہے کہ:

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء: ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے

یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے، اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر

عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔[۱۰]

غلبۂ دین کی جدوجہد کرنا بھی انبیاء کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ملاحظہ ہو آیت:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى
وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۔ (التوبہ: ۱۹۰)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت
اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے پوری
جنسِ دین پر غالب کر دے۔

متن میں اَلدِّین کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے جنسِ دین کیا ہے۔ دین کا لفظ عربی زبان میں اُس نظامِ زندگی یا طریقِ زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مُطاع تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے۔ پس بعثتِ رسول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دینِ حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بعثت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوتی کہ جو نظامِ زندگی لے کر وہ آیا ہے وہ کسی دوسرے نظامِ زندگی کا تابع اور اس سے مغلوب بن کر اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہے۔ بلکہ وہ بادشاہِ ارض و سما کا نمائندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظامِ زندگی دنیا میں رہے بھی تو اُسے خدائی نظام کی بخشی ہوئی گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے جیسا کہ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں ذمیوں کا نظامِ زندگی رہتا ہے۔[۱۱]

ازالۂ فساد انبیاء کا کام

انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اس حقیقت پر بھی متنبہ کرتا ہے کہ زمین کے انتظام میں اصل چیز فساد نہیں ہے جس پر صلاح عارض ہوئی ہو بلکہ اصل چیز صلاح ہے جس پر فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی سے عارض ہوتا رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہاں انسان کی زندگی کی ابتدا جہالت و وحشت اور شرک و بغاوت اور اخلاقی بدنظمی سے نہیں ہوئی ہے جس کو دُور کرنے کے لیے بعد میں بتدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی الحقیقت انسان کی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے اور بعد میں اس درست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں۔ اسی فساد کو مٹانے اور نظامِ حیات کو ازسرِنو درست کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے اور انہوں نے ہر زمانے میں انسان کو یہی دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس صلاح پر قائم

کیا گیا تھا اس میں فساد برپا کرنے سے باز آ جاؤ۔[1]

دعوائے نبوت اپنے اندر خود ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دراصل پورے نظامِ زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کلی اطاعت کا مطالبہ کر رہا ہے کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لیے نہیں آتا بلکہ مُطاع اور راعی بننے ہی کے لیے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حقِ حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیتِ رسالت کے قطعاً منافی ہے۔[2]

رسُولوں کے بھیجنے کی غایت

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (القصص: ۴۷)	(اور یہ ہم نے اس لیے کیا کہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کیے کرتوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب اُن پر آئے تو وہ کہیں "اے پروردگار تو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی رسُول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہلِ ایمان میں سے ہوتے"۔

اسی چیز کو قرآن مجید متعدد مقامات پر رسُولوں کے بھیجے جانے کی وجہ کے طور پر پیش کرتا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اس غرض کے لیے ہر وقت ہر جگہ ایک رسُول آنا چاہیے۔ جب تک دُنیا میں ایک رسُول کا پیغام اپنی صحیح صورت میں موجود ہے اور لوگوں تک اس کے پہنچنے کے ذرائع موجود ہیں کسی نئے رسُول کی حاجت نہیں رہتی، اِلّا یہ کہ پچھلے پیغام میں کسی اضافے کی اور کوئی نیا پیغام دینے کی ضرورت ہو۔ البتہ جب انبیاءؑ کی تعلیمات محو ہو جائیں، یا گمراہیوں میں خلط ملط ہو کر وسیلۂ ہدایت بننے کے قابل نہ رہیں، تب لوگوں کے لیے یہ عذر پیش کرنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمیں حق و باطل کے فرق سے آگاہ کرنے اور صحیح راہ بتانے کا کوئی انتظام سرے سے موجود ہی نہیں تھا، پھر بھلا ہم کیسے ہدایت پا سکتے تھے۔ اسی عذر کو

---

[1] اس معاملہ میں قرآن کا نقطۂ نظر اُن لوگوں کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے جنہوں نے ارتقاء کا ایک غلط تصور لے کر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بنتی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر بسایا تھا اور ایک صالح نظام سے اس کی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ پھر انسان خود شیطانی رہنمائی قبول کرنے کے بعد بار بار تاریکی میں جاتا رہا اور اس صالح نظام کو بگاڑتا رہا اور خدا بار بار اپنے پیغمبروں کو اس غرض کے لیے بھیجتا رہا کہ انسان کو تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دیں۔

قطع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے حالات میں نبی مبعوث فرماتا ہے تاکہ اس کے بعد جو شخص بھی غلط راہ پر چلے وہ اپنی کجروی کا ذمہ دار ٹھیرایا جاسکے[لے]

خدا کی طرف سے رسُول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو بلکہ رسُول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے (جیسا کہ ہم صفحہ ۱۵ پر بیان کر چکے ہیں) کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے، اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی شخص نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسُول کو رسُول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا[لکہ]

فیصلے کے وقت رسُولوں کی بعثت

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْۤا اٰيٰتِيْ وَمَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا۔ (الکہف: ۵۶)

رسُولوں کو ہم اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجتے کہ وہ بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دے دیں۔ مگر کافروں کا حال یہ ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہوں نے میری آیات کو اور اُن تنبیہات کو جو انہیں کی گئیں مذاق بنا لیا۔

رسُولوں کو ہم اس لیے بھیجتے ہیں کہ فیصلے کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو فرماں برداری کے اچھے اور نافرمانی کے بُرے انجام سے خبردار کر دیں[سلکہ]

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ۔ (آلِ عمران: ۱۹)

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، یہ دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کیے جنہیں کتاب دی گئی تھی، ان کے اس طرزِ عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانہ میں آیا ہے، اس کا دین اسلام ہی تھا اور جو کتاب بھی دُنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی ہے، اُس نے اسلام ہی کی تعلیم دی ہے۔ اس اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی و بیشی کر کے جو بہت سے مذاہب نوعِ انسانی میں رائج کیے گئے، ان کی پیدائش کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حدود سے بڑھ کر حقوق، فائدے اور امتیازات

حاصل کرنے چاہیے اور اپنی خواہشات کے مطابق اصل دین کے عقائد، اُصول اور احکام میں ردوبدل کر ڈالا۔[1]

جملہ انبیاء ایک ہی دین کے علمبردار تھے۔

وَتَقَطَّعُوٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ۔ (الانبیاء:۹۳)

مگر یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ انھوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔

دنیا میں جتنے نبی بھی آئے وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے، اور وہ اصل دین یہ تھا کہ صرف ایک اللہ ہی انسان کا رب ہے اور اکیلے اللہ ہی کی بندگی و پرستش کی جانی چاہیے۔ بعد میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے وہ اسی دین کو بگاڑ کر بنا لیے گئے۔ اُس کی کوئی چیز کسی نے لی، اور کوئی دوسری چیز کسی اور نے، اور پھر ہر ایک نے ایک جُز اس کا لے کر بہت سی چیزیں اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا ڈالیں۔ اس طرح یہ بے شمار ملتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ خیال کرنا کہ فلاں نبی فلاں مذہب کا بانی تھا اور فلاں نبی نے فلاں مذہب کی بنا ڈالی، اور انسانیت میں یہ ملتوں اور مذہبوں کا تفرقہ انبیاء کا ڈالا ہوا ہے، محض ایک غلط خیال ہے محض یہ بات کہ مختلف ملتیں اپنے آپ کو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے انبیاء کی طرف منسوب کر رہی ہیں، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ملتوں اور مذہبوں کا اختلاف انبیاء کا ڈالا ہوا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء دس مختلف مذہب نہیں بنا سکتے تھے اور نہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی بندگی سکھا سکتے تھے۔[2]

بعثت سے پہلے انبیاء کا تفکر

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اُس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی۔ ان کے پاس نزولِ وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعۂ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (الشوریٰ۔۵۲) "تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔" وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ) "اور اللہ نے تم کو ناواقفِ راہ پایا، پھر تمھیں راستہ بتایا۔"

اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے علم و معرفت کے انہی عام ذرائع سے، جو دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں، ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے ہوتے تھے۔ وحی آکر جو کچھ کیا کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر ان کا دل گواہی دیتا تھا، اب انہی کے متعلق وحی یقینی اور قطعی شہادت دے دیتی تھی کہ وہ حق ہیں، اور انہی صداقتوں کا عینی مشاہدہ کرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے وثوق سے دنیا کے سامنے ان کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون سورۂ ہود میں تکرار بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے متعلق فرمایا:

أَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰى إِمَامًا وَّ رَحْمَةً ۔ (رکوع ۲)

پھر کیا وہ شخص جو پہلے اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا (یعنی عقلی و فطری ہدایت پر) اس کے بعد خدا کی طرف سے ایک گواہ بھی اس کے پاس آگیا (یعنی قرآن) اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت کے طور پر موجود تھی (کیا وہ اس صداقت کے بارے میں شک کر سکتا ہے؟)

پھر اس کے بعد یہی مضمون رکوع ۳ میں حضرت نوحؑ کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

يٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ أَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۔

اے میری قوم کے لوگو! غور تو کرو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا اور اس کے بعد اس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت (وحی و نبوت) سے بھی نوازا، اور وہ چیز تم کو نظر نہیں آتی، تو اب کیا ہم اسے زبردستی تمہارے سر چپک دیں؟

پھر اسی مضمون کو چھٹے رکوع میں حضرت صالحؑ اور آٹھویں رکوع میں حضرت شعیبؑ دہراتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے حقیقت کا براہ راست علم پانے سے پہلے انبیاء علیہم السلام مشاہدے اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر استعمال کر کے (جسے اوپر کی آیات میں بَيِّنَةٍ مِّنَ الرَّبِّ سے تعبیر کیا گیا ہے) توحید و معاد کی حقیقتوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اور ان کی یہ رسائی وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انہیں علمِ وحی عطا کرتا تھا، اور یہ چیز کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی تھی۔ یہ مشاہدۂ آثار، اور غور و فکر، اور عقلِ عام (Common Sense) کا استعمال ان قیاس آرائیوں اور اٹکل پچو تخمین (Speculation) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے جس کا ارتکاب فلاسفہ کیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر قرآن مجید ہر انسان کو خود آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اس سے کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر خدا کی قدرت کے آثار کو دیکھو اور ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرو۔

علمِ غیبِ رُسل

یہ خیال درست نہیں ہے کہ رسولوں کو بس اتنا ہی علمِ غیب دیا گیا تھا جتنا بندوں کو پہنچانا مطلوب تھا۔ یہ بات قرآن اور حدیث کی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یعقوبؑ کے متعلق ارشاد

ہُوا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا:

إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (یوسف ـ ۱۱)

"میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"

علاوہ بریں قرآن مجید کے بکثرت مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر عذاب بھیجنے سے پہلے ان کے نبیوں کو خبریں دے دی گئیں مگر انہوں نے عذاب کے وقت اور اس کی تفصیلی کیفیت سے اپنی قوم کو مطلع نہ کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو تو اتنے پہلے عذاب کی خبر دے دی گئی تھی کہ انہوں نے طوفان آنے سے پہلے کشتی بنا لی۔ لیکن انہوں نے اپنی قوم کو یہ نہیں بتایا کہ تم پر پانی کا عذاب آنے والا ہے۔ پھر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کے ایسے ایسے حالات بتائے گئے تھے جو آپ کی امت کو نہیں بتائے گئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ: يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ وَاللَّهِ لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا (بخاری ـ باب الصدقۃ فی الکسوف)۔

"اے محمدؐ کی قوم! خدا کی قسم اگر تم کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنستے اور بہت روتے۔"

ایک اور موقع پر حضورؐ نے فرمایا:

لَأَرَاكُمْ مِنْ وَرَائِي كَمَا أَرَاكُمْ ۔ (بخاری، باب عظۃ الامام الناس)

"میں تم کو پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے دیکھتا ہوں۔"

غرض بکثرت آیات اور روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسولوں کو جو علم غیب دیا گیا تھا وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو ان کے واسطے سے بندوں تک پہنچا۔ اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔ کیونکہ بندوں کو تو غیب کی صرف وہی باتیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے جن کا تعلق عقائد و ایمانیات سے ہے لیکن رسولوں کو ان کے سوا اور بہت سی ایسی معلومات حاصل ہونی چاہییں جو فرائض رسالت انجام دینے میں ان کے لیے مددگار ہوں۔ جس طرح سلطنت کی پالیسی اور اس کے اسرار سے نائب السلطنت اور گورنروں کو ایک خاص حد تک واقف ہونا ضروری ہے اور عام رعایا تک ان رازوں کا پہنچ جانا بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہوتا ہے۔ اسی طرح ملکوت الٰہی کے بھی بہت سے اسرار ہیں جو خدا کے خاص نائب اور اس کے رسول جانتے ہیں اور عام رعیت ان سے بے خبر ہے۔ یہ علم غیب رسولوں کو اپنے فرائض انجام دینے میں مدد دیتا ہے لیکن عام رعایا نہ اس علم کی ضرورت رکھتی ہے اور نہ اس کا تحمل ہی کر سکتی ہے۔ زیادہ صحت کے ساتھ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ بس اسی قدر ہے کہ نبی کا علم خدا کے علم سے کم اور بندوں کے علم سے زیادہ ہوتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ کتنا ہوتا ہے اور کتنا نہیں تو اس کو ناپنے کا کوئی پیمانہ ہمارے پاس نہیں ہے۔[1]

انبیاء کی کڑی نگرانی

انسانی معاشرے میں نبی کا مقام انتہائی نازک مقام ہے۔ ایک معمولی بات بھی جو کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پیش آئے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتی، نبی کی زندگی میں اگر پیش آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کی زندگی پر ایسی کڑی نگرانی رکھی گئی ہے کہ ان کا کوئی ادنیٰ اقدام بھی منشاء الٰہی سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ ایسا کوئی فعل بھی اگر نبی سے صادر ہوا ہے تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی ہے تاکہ اسلامی قانون اور اس کے اصول اپنی بالکل صحیح صورت میں نہ صرف خدا کی کتاب، بلکہ نبی کے اسوۂ حسنہ کی صورت میں بھی خدا کے بندوں تک پہنچ جائیں اور ان میں ذرہ برابر بھی کوئی چیز ایسی شامل نہ ہونے پائے جو منشاء الٰہی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔

براہِ راست علم و مشاہدہ

انبیاء علیہم السلام میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے ان کے منصب کی مناسبت سے ملکوتِ سموات و ارض کا مشاہدہ کرایا ہے اور مادی حجابات بیچ میں سے ہٹا کر آنکھوں سے وہ حقیقتیں دکھائی ہیں جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت دینے پر وہ مامور کیے گئے تھے، تاکہ ان کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالکل ممیز ہو جائے۔ فلسفی جو کچھ بھی کہتا ہے قیاس اور گمان سے کہتا ہے، وہ خود اگر اپنی حیثیت سے واقف ہو تو کبھی اپنی کسی رائے کی صداقت پر شہادت نہ دے گا مگر انبیاء جو کچھ کہتے ہیں وہ براہِ راست علم اور مشاہدے کی بنا پر کہتے ہیں، اور وہ خلق کے سامنے یہ شہادت دے سکتے ہیں کہ ہم ان باتوں کو جانتے ہیں اور یہ ہماری آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں۔

غیر معمولی قوتیں[1]

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ۔ (یوسف ۹۴)	جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا "میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں۔"

اس سے انبیاء علیہم السلام کی غیر معمولی قوتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی قافلہ حضرت یوسفؑ کا قمیص لے کر مصر سے چلا ہے اور اُدھر سینکڑوں میل کے فاصلے پر حضرت یعقوبؑ اس کی مہک پا لیتے ہیں۔ مگر اس سے یہ بھی

---

[1] انبیاء کی غیر معمولی قوتوں اور صلاحیتوں اور ان کی خصوصی تربیت کے اہتمام کے بارے میں چند تفصیلی عبارات زیر باب "رسالت آنحضورؐ کی شخصی اور نبوی حیثیت" کی فصل "رسالت اور اس کے احکام" میں درج ہیں۔ (مرتبین)

معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہ قوتیں کچھ ان کی ذاتی نہ تھیں بلکہ اللہ کی بخشش سے ان کو ملی تھیں اور اللہ جب اور جس قدر چاہتا تھا انہیں کام کرنے کا موقع دیتا تھا۔ حضرت یوسفؑ برسوں مصر میں موجود رہے اور کبھی حضرت یعقوبؑ کو ان کی خوشبو نہ آئی۔ مگر اب یکایک قوتِ ادراک کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ ابھی قمیص مصر سے چلا ہے اور ان کو مہک آنی شروع ہو گئی ہے[1]

بشریتِ انبیاء

تمام پچھلے انبیاء بھی بشر ہی تھے، کوئی نرالی مخلوق نہ تھے۔ تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ آج پہلی مرتبہ ہی پیش نہیں آیا ہے کہ ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔

پچھلے انبیاء بھی اسی کام کے لیے آئے تھے جو کام اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں۔ یہی ان کا مشن تھا اور یہی ان کی تعلیم تھی

انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ رہا ہے۔ بڑے بڑے مصائب سے وہ گزرے ہیں سالہا سال مصائب میں مبتلا رہے ہیں شخصی اور ذاتی مصائب میں بھی اور اپنے مخالفوں کے ڈالے ہوئے مصائب میں بھی، مگر آخرکار اللہ کی نصرت و تائید ان کو حاصل ہوئی ہے، اس نے اپنے فضل و رحمت سے اُن کو نوازا ہے، ان کی دعاؤں کو قبول کیا ہے، ان کی تکلیفوں کو رفع کیا ہے، ان کے مخالفوں کو نیچا دکھایا ہے، اور معجزانہ طریقوں پر ان کی مدد کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبولِ بارگاہ ہونے کے باوجود، اور اس کی طرف سے بڑی بڑی حیرت انگیز طاقتیں پانے کے باوجود، تھے وہ بندے اور بشر ہی۔ الوہیت ان میں سے کسی کو حاصل نہ تھی[2]

عصمتِ انبیاء کا مفہوم

انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں، اور کوئی انسان بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ہر وقت اُس بلند ترین معیارِ کمال پر قائم رہے جو مومن کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے لیکن جونہی کہ اسے یہ احساس ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے احساس کرا دیا جاتا ہے کہ اس کا قدم معیارِ مطلوب سے نیچے جا رہا ہے، وہ فوراً توبہ کرتا ہے اور اپنی غلطی کی اصلاح کرنے میں اسے ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہوتا۔ حضرت نوحؑ کی اخلاقی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی جان جوان بیٹا آنکھوں کے سامنے غرق ہوا ہے اور اس نظارے سے کلیجہ منہ کو

---

[1] انبیاء کی بشریت کے موضوع پر آگے ایک مستقل فصل دی جا رہی ہے۔ (مرتبین)

آرہا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لیے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہاری صُلب سے پیدا ہُوا ہے محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے۔ تو وہ فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پروا ہو کر اس طرزِ فکر کی طرف پلٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضا ہے۔[1]

نبی کی معصومیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ اور لغزش وخطا کی قوت و استعداد سلب کر لی گئی ہے حتیٰ کہ گناہ کا صدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن بشریت کی تمام صفات سے متصف ہونے کے باوجود، اور جملہ انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خدا ترس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر میں اپنے رب کی ایسی ایسی زبردست حجتیں اور دلیلیں رکھتا ہے جن کے مقابلہ میں خواہشِ نفس کبھی کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نادانستہ اُس سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً وحی جلی کے ذریعہ سے اُس کی اصلاح فرما دیتا ہے، کیونکہ اس کی لغزش تنہا ایک شخص کی لغزش نہیں ہے، ایک پوری اُمّت کی لغزش ہے۔ وہ بال برابر بھی راستے سے ہٹ جاتے تو دُنیا گمراہی میں میلوں دُور نکل جاتے۔[2]

اوصافِ انبیاءؑ کے متعلق چند آیات

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ (مریم - ۴۱)

اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو۔ بیشک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۔

اور ذکر کرو اس کتاب میں موسیٰؑ کا۔ وہ ایک چیدہ شخص تھا اور رسول نبی تھا۔

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا۔ (مریم ۵۱-۵۲)

اور ہم نے اُس کو طُور کے داہنی جانب سے پکارا اور راز کی گفتگو سے اس کو تقرّب عطا کیا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا۔

اور اس کتاب میں اسماعیلؑ کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا۔ (مریم - ۵۴ تا ۵۷)

اور اس کتاب میں ادریسؑ کا ذکر کرو۔ وہ ایک راستباز انسان اور رسول نبی تھا اور اسے ہم نے بلند مقام پر اٹھایا تھا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا۔

(مریم - ۵۸)

یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا آدمؑ کی اولاد میں سے، اور اُن لوگوں کی نسل سے جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا اور ابراہیمؑ کی نسل سے اور اسرائیل کی نسل سے۔ اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمان کی آیات انہیں سنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ۔ (الانبیاء-۵۱)

اس سے پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے۔

وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ۔ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ ۔ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۖ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ۔

(الانبیاء ۷۲-۷۳)

اور ہم اسے اور لوطؑ کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔ اور ہم نے اسے اسحٰقؑ عطا کیا اور یعقوبؑ اس پر مزید، اور ہر ایک کو صالح بنایا۔ اور ہم نے اُن کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔ اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَعْمَلُ الْخَبَائِثَ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فَاسِقِينَ ۔ وَأَدْخَلْنَاهُ فِي رَحْمَتِنَا ۖ إِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۔ (الانبیاء-۷۵)

اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم بخشا اور اُسے اُس بستی سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی۔ درحقیقت وہ بڑی ہی بُری فاسق قوم تھی۔ لوطؑ کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ صالح لوگوں میں سے تھا۔

وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۔ وَنَصَرْنَاهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ

اور یہی نعمت ہم نے نوحؑ کو دی۔ یاد کرو کہ ان سب سے پہلے اُس نے ہمیں پکارا تھا ہم نے اس کی دعا قبول کی، اور اسے اور اس کے گھر والو

كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔

(الانبیاء-۲۱، ۷۶-۷۷)

کو کربِ عظیم سے نجات دی اور اس قوم کے مقابلے میں اس کی مدد کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ وہ بڑے بُرے لوگ تھے پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۔ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۔ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۔ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۔

(الانبیاء: ۷۸ تا ۸۲)

اور اسی نعمت سے ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو سرفراز کیا۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ وہ دونوں ایک کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں اور ہم اُن کی عدالت خود دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا، حالانکہ دونوں کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا تھا۔ اور داؤدؑ کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے۔ اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے۔ اور ہم نے اُس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے، پھر کیا تم شکر گزار ہو؟ اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اُس کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں، ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے۔ اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ ان سب کے نگران ہم ہی تھے۔

اِس سیاق و سباق میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے اس خاص واقعے کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبی ہوتے اور اللہ کی طرف سے غیر معمولی طاقتیں اور قابلیتیں پانے کے باوجود ہوتے انسان ہی تھے، اُلوہیت کا کوئی شائبہ اُن میں نہ ہوتا تھا۔ اس مقدمے میں حضرت داؤدؑ کی رہنمائی وحی کے ذریعہ سے نہ کی گئی اور وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کر گئے، حضرت سُلیمانؑ کی رہنمائی کی گئی اور انہوں نے صحیح فیصلہ کیا، حالانکہ نبی دونوں ہی تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے جن کمالات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی یہی بات سمجھانے کے لیے ہے

کہ یہ وہبی کمالات تھے اور اس طرح کے کمالات کسی کو خدا نہیں بنا دیتے کیا۔

وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۔ (الانبیاء: ۸۳-۸۴)

اور یہی رہوشمندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوبؑ کو دی تھی۔ یاد کرو، جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے، ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا۔ اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیئے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیئے، اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے۔

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِىْ رَحْمَتِنَا ۔ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ (الانبیاء: ۸۶)

اور یہی نعمت اسماعیلؑ اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے۔ اور ان کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے۔

وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِى الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (الانبیاء: ۸۷، ۸۸)

اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا، یاد کرو جبکہ وہ بگڑ کر چلا گیا تھا اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔ آخر کو اس نے تاریکیوں میں سے پکارا ”نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا“۔ تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی اور اسی طرح ہم مومنوں کو بچا لیا کرتے ہیں۔

وَ زَكَرِيَّاۤ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَ وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ اِنَّهُمْ كَانُوْا

اور زکریاؑ کو جبکہ اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ ”اے پروردگار مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور بہترین وارث تو تو ہی ہے۔“ پس ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور [illegible] اور اس کی بیوی کو اس کے لیے

يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ

(الانبیاء: ۹۰)

درست کر دیا۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور رہبت کے ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے

حضرت زکریاؑ کے واقعے کا ذکر کرنے سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ یہ سارے نبی محض بندے اور انسان تھے، اُلوہیت کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ دوسروں کو اولاد دینے والے نہ تھے بلکہ خود اللہ کے آگے اولاد کے لیے ہاتھ پھیلانے والے تھے۔ حضرت یونسؑ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ایک نبی اولوالعزم ہونے کے باوجود جب ان سے قصور سرزد ہُوا تو انہیں پکڑ لیا گیا۔ اور جب وہ اپنے رب کے آگے جھک گئے تو ان پر فضل بھی ایسا کیا گیا کہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال لائے گئے۔ حضرت ایوبؑ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ نبی کا مبتلائے مصیبت ہونا کوئی نرالی بات نہیں ہے، اور نبی بھی جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو خدا ہی کے آگے شفا کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ وہ دوسروں کو شفا دینے والا نہیں، خدا سے شفا مانگنے والا ہوتا ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ساتھ ایک طرف یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ یہ سارے انبیاءؑ توحید کے قائل تھے اور اپنی حاجات ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ لے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ بھی جتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ غیر معمولی طور پر اپنے نبیوں کی مدد کرتا رہا ہے۔ آغاز میں خواہ کیسی ہی آزمائشوں سے ان کو سابقہ پیش آیا ہو مگر آخر کار ان کی دعائیں معجزانہ شان کے ساتھ پوری ہوئی ہیں۔

باب ۲

وحی

فصل ۱

وحی کا مفہوم، صورتیں اور اقسام

لغوی اور اصطلاحی معنی

وحی کے معنی ہیں اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات ڈالنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا یا پیغام بھیجنا۔

وحی کے لغوی معنی ہیں "اشارہ سریع" اور "اشارہ خفی" یعنی ایسا اشارہ جو سرعت کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ بس اشارہ کرنے والا جانے یا وہ شخص جسے اشارہ کیا گیا ہے۔ باقی کسی اور شخص کو اس کا پتہ نہ چلنے پائے اس لفظ کو اصطلاحاً اس ہدایت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو بجلی کی کوندکی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے کسی بندے کے دل میں ڈالی جائے۔

اللہ تعالیٰ کے کسی کے پاس آنے یا اس کے پاس کسی کے جانے اور روبرو اس سے گفتگو کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ غالب اور حکیم ہے۔ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جب بھی وہ کسی بندے سے رابطہ قائم کرنا چاہے، کوئی دشواری اس کے ارادے کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتی، اور وہ اپنی حکمت سے اس کام کے لیے وحی کا طریقہ اختیار فرما لیتا ہے۔ ؎۱

اقسامِ وحی

"وحی" کا لفظ اگرچہ اب صرف اس وحی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انبیاء پر آتی ہے لیکن قرآن میں یہ اطلاقی فرق نہیں پایا جاتا یہاں آسمانوں پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق ان کا سارا نظام چلتا ہے (وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا۔ حٰم السجدہ)۔ زمین پر بھی وحی ہوتی ہے جس کا اشارہ پاتے ہی وہ اپنی سرگزشت سنانے لگتی ہے۔ (یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا۔ الزلزال)۔ ملائکہ پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ کام کرتے ہیں۔ (اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ۔ الانفال)۔ شہد کی مکھی کو اس کا پورا کام وحی (فطری تعلیم) کے ذریعے سکھایا جاتا ہے جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت ۶۸ میں آپ دیکھتے ہیں اور یہ وحی صرف شہد کی مکھی کے لیے ہی محدود نہیں ہے۔ مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اڑنا اور نوزائیدہ بچے کو دودھ پینا بھی وحی خداوندی ہی سکھایا کرتی ہے پھر ایک انسان کو

غور و فکر اور تحقیق و تجسّس کے بغیر جو صحیح تدبیر یا صائب رائے، یا فکر و عمل کی صحیح راہ سجھائی جاتی ہے وہ بھی وحی ہے (وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ۔ القصص)۔ اور اس وحی سے کوئی انسان بھی محروم نہیں ہے دنیا میں جتنے اکتشافات ہوتے ہیں، جتنی مفید ایجادیں ہوتی ہیں، بڑے بڑے مدبرین، فاتحین، مفکرین اور مصنفین نے جو معرکے کے کام کیے ہیں اُن سب میں اس وحی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کو آئے دن اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کبھی بیٹھے بیٹھے دل میں ایک بات آئی، یا کوئی تدبیر سوجھ گئی، یا خواب میں کچھ دکھائی دیا اور بعد میں تجربے سے پتہ چلا کہ وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو غیب سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔ ان بہت سی اقسام میں سے ایک خاص قسم کی وحی وہ ہے جس سے انبیاء علیہم السلام نوازے جاتے ہیں، اور یہ وحی اپنی خصوصیات میں دوسری اقسام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی کیے جانے والے کو پورا شعور ہوتا ہے کہ یہ وحی خدا کی طرف سے آرہی ہے اُسے اس کے من جانب اللہ ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ عقائد اور احکام اور قوانین اور ہدایات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی اس کے ذریعہ سے نوعِ انسانی کی رہنمائی کرے۔

غلط فہمی

سورۂ شوریٰ کی آیت اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ میں وحی کے آنے کی وہ صورت مذکور ہے جس کے ذریعہ سے تمام کتبِ آسمانی انبیاء علیہم السلام تک پہنچی ہیں یعنی اللہ اپنے ایک فرشتے کے ذریعہ سے رسول کے پاس وحی بھیجتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس فقرے کی غلط تاویل کرکے اس کو یہ معنی پہنائے ہیں کہ "اللہ کوئی رسول بھیجتا ہے، جو اُس کے حکم سے عام لوگوں تک اُسی کا پیغام پہنچاتا ہے" لیکن قرآن کے الفاظ فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ (پھر وہ یعنی فرشتہ وحی کرتا ہے ـــ یا پہنچاتا ہے ـــ اسی کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے) اُن کی اس تاویل کا غلط ہونا بالکل عیاں کر دیتے ہیں۔ عام انسانوں کے سامنے انبیاء کی تبلیغ کو "وحی کرنے" سے نہ قرآن میں کہیں تعبیر کیا گیا ہے اور نہ عربی زبان میں انسان کی انسان سے علانیہ گفتگو کو "وحی" کے لفظ سے تعبیر کرنے کی کوئی گنجائش ہے۔ لغت میں وحی کے معنی ہی خفیہ اور سریع اشارے کے ہیں۔ انبیاء کی تبلیغ پر اس لفظ کا اطلاق صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو عربی زبان سے بالکل نابلد ہو[۳۹]۔

اقسامِ وحی کی مزید توضیح

ایک قسم کی وحی وہ ہے جسے وحی جبلّی یا طبعی کہا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کو اس کے کرنے کا کام سکھاتا ہے۔ یہ وحی انسانوں سے بڑھ کر جانوروں پر اور شاید اُن سے بڑھ کر نباتات و جمادات پر ہوتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جسے وحی جزئی کہا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ کسی خاص موقع پر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو اُمورِ زندگی میں سے کسی امر کے متعلق کوئی علم یا کوئی ہدایت دیتا ہے یا کوئی تدبیر سُجھا دیتا

ہے۔ یہ وحی آئے دن عام انسانوں پر ہوتی رہتی ہے۔ دُنیا میں بڑی بڑی ایجادیں اسی وحی کی بدولت ہوئی ہیں۔ بڑے بڑے علمی اکتشافات اسی وحی کے ذریعے سے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے اہم تاریخی واقعات میں اسی وحی کی کارفرمائی نظر آتی ہے جب کہ کسی اہم موقع پر کوئی خاص تدبیر یا غور و فکر اچانک سُوجھ گئی اور اس نے تاریخ کی رفتار پر ایک فیصلہ کن اثر ڈال دیا۔ ایسی ہی وحی حضرت موسیٰؑ کی والدہ پر بھی ہوئی تھی۔ ان دونوں قسم کی وحیوں سے بالکل مختلف وحی وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو حقائقِ غیبیہ پر مطلع فرماتا ہے، اور اسے نظامِ زندگی کے متعلق ہدایت بخشتا ہے تاکہ وہ اس علم اور اس ہدایت کو عام انسانوں تک پہنچائے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔ یہ وحی انبیاءؑ کے لیے خاص ہے۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعیت کا علم، خواہ اس کا نام القاء رکھیے، الہام رکھیے، کشف رکھیے یا اصطلاحاً اسے وحی سے تعبیر کیجیے، انبیاء و رُسل کے سوا کسی کو نہیں دیا جاتا۔ اور یہ علم صرف انبیاءؑ ہی کو اس طور پر دیا جاتا ہے کہ انہیں اس کے من جانب اللہ ہونے اور شیطان کی دراندازی سے بالکل محفوظ ہونے اور خود اپنے ذاتی خیالات، تصوّرات اور خواہشات کی آلائشوں سے بھی پاک ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ یہی علم حجتِ شرعی ہے۔ اس کی پابندی ہر انسان پر فرض ہے اور اس کے دوسرے انسانوں تک پہنچانے اور اس پر ایمان کی دعوت سب بندگانِ خدا کو دینے پر انبیاء علیہم السلام مامور ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ وحی ہے کہ جس پر ایمان لانا لازمۂ نجات اور جس سے روگردانی کرنا قطعی طور پر موجبِ خسران ہوتا ہے۔

انبیاء کے سوا دوسرے انسانوں کو اگر اس تیسری قسم کے علم کا کوئی جزو نصیب بھی ہوتا ہے تو وہ ایسے دھندلے اشارے کی حد تک ہوتا ہے جسے ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے وحیِ نبوت کی روشنی سے مدد لینا یعنی کتاب و سنت پر پیش کر کے اس کی صحت اور عدمِ صحت کو جانچنا اور بصورتِ صحت اس کا منشا متعین کرنا ضروری ہے۔ جو شخص اپنے الہام کو ایک مستقل بالذات ذریعۂ ہدایت سمجھے اور وحیِ نبوت کی کسوٹی پر اُس کو پرکھے بغیر اُس پر خود عمل کرے اور دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے۔ اس کے ایسے طرزِ عمل کو از روئے شریعت کوئی سندِ جواز نہیں دی جا سکتی۔ قرآن میں اس حقیقت کو متعدد مقامات پر صاف صاف بیان کیا گیا ہے خصوصاً سُورۂ جن کی آخری آیات میں تو اسے بالکل ہی کھول کر فرما دیا گیا ہے کہ:

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ	وہ عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں
اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ	کرتا، سوائے اُس رسول کے جسے اُس نے غیب کا
فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ	کوئی علم دینے کے لیے پسند کر لیا ہو، تو اس کے
خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا	آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جان لے

رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۔ (سورۃ جن: ۲۷-۲۸)

کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے اور وہ اُن کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے۔"

اگر ہم غور کریں تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اُمت کے صالح و مصلح آدمیوں کو نبی کا سا کشف و الہام نہ دینے اور اس سے کم تر ایک طرح کا تابعانہ کشف و الہام دیتے میں کیا مصلحت ہے پہلی چیز عطا نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی چیز نبی اور اُمتی کے درمیان مابہ الفرق ہے، اسے دور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری چیز دینے کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ نبی کے بعد اس کے کام کو جاری رکھنے کی کوشش کریں وہ اس بات کے محتاج ہوتے ہیں کہ دین میں اُن کو حکیمانہ بصیرت اور اقامتِ دین کی سعی میں ان کو صحیح رہنمائی اللہ کی طرف سے حاصل ہو۔ یہ چیز غیر شعوری طور پر تو ہر مخلص اور صحیح الفکر خادمِ دین کو بخشی جاتی ہے لیکن اگر کسی کو شعوری طور پر بھی یہ دی جائے تو یہ اللہ کا انعام ہے۔[1]

وحی بصورتِ خواب

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۔ (الصافات: ۱۰۲)

"وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس سے کہا "بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے" اس نے کہا، "ابا جان جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے۔"

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پیغمبر باپ کے خواب کو بیٹے نے محض خواب نہیں بلکہ خدا کا حکم سمجھا تھا۔ اب اگر یہ فی الواقع حکم نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ صراحۃً یا اشارۃً اس امر کی تصریح فرما دیتا کہ فرزندِ ابراہیم نے غلط فہمی سے اس کو حکم سمجھ لیا۔ لیکن پورا سیاق و سباق ایسے کسی اشارے سے خالی ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انبیاء کا خواب محض خواب نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بات سے ایک اتنا بڑا قاعدہ خدا کی شریعت میں شامل ہو سکتا ہو، وہ اگر مبنی بر حقیقت نہ ہوتی بلکہ محض ایک غلط فہمی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تردید نہ فرماتا۔ قرآن کو کلام الٰہی ماننے والے کے لیے یہ تسلیم کرنا محال ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی بھول چوک بھی صادر ہو سکتی ہے۔[1]

شہد کی مکھی پر وحی

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ

اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات

مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا (النحل: ۶۸) "وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اپنے گھر بنا۔"

گذشتہ مثالوں سے وحی کے معنی ہیں خفیہ اور لطیف اشارے کے جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا کوئی اور محسوس نہ کرے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ القاء (دل میں بات ڈال دینے) اور الہام (مخفی تعلیم و تلقین) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے وہ چونکہ کسی مکتب و درسگاہ میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیف طریقوں سے دی جاتی ہے کہ بظاہر کوئی تعلیم دیتا اور کوئی تعلیم پاتا نظر نہیں آتا، اس لیے اس کو قرآن میں وحی، الہام اور القاء کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب یہ تینوں الفاظ الگ الگ اصطلاحوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لفظ وحی انبیاء کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ الہام کو اولیاء اور بندگان خاص کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ اور القاء نسبتہً عام ہے۔[1]

اُمِّ موسیٰ پر وحی

إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ (طٰہٰ: ۳۸)

"یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا ویسا اشارہ جو وحی کے ذریعہ سے ہی کیا جاتا ہے۔"

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ (القصص: ۷)

"ہم نے موسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا کہ اس کو دودھ پلا پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف اور غم نہ کر۔"

یعنی حضرت موسیٰ کی والدہ نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ اس طریقے پر عمل کرنے میں نہ صرف یہ کہ تمہارے بچے کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے، بلکہ ہم بچے کو تمہارے پاس ہی پلٹا لائیں گے اور یہ کہ تمہارا یہ بچہ آگے چل کر ہمارا رسول ہونے والا ہے۔[2]

شیاطین کا اپنے ساتھیوں کو وحی کرنا

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ:

وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ (الانعام: ۱۲۱)

"شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القاء کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔"

حضورؐ پر وحی آنا انوکھا واقعہ نہیں

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَ

"اے محمدؐ! ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی

اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ (النساء:۱۶۳)

طرف بھیجی تھی۔ اور ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحٰقؑ یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ پر بھی وحی کی۔

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی چیز لے کر نہیں آئے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔ ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں بلکہ دراصل ان کو بھی اسی ایک منبع علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام پچھلے انبیاء کو ہدایت ملتی رہی ہے۔ اور وہ بھی اسی ایک صداقت و حقیقت کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

حضورؐ پر قرآن کا وحی کیا جانا

وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ (الانعام:۱۹)

"اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کروں۔"

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ (یونس:۱۵)

"جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ اے محمدؐ، ان سے کہو میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔"

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہنے کا حکم دیا گیا کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں بلکہ یہ وحی کے ذریعہ سے میرے پاس آتی ہے جس میں کسی ردو بدل کا مجھے اختیار نہیں۔ اور یہ بھی کہ اس معاملہ میں مصالحت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ قبول کرنا ہو تو اس پورے دین کو جوں کا توں قبول کرو ورنہ پورے کو رد کر دو۔[۱۴۶]

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَ ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ (ہود:۱۲)

"تو اے پیغمبرؐ! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں میں سے کسی چیز کو چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہیں اور اس سے دل تنگ ہو۔"

یعنی ہماری نگاہ میں قیمتی انسان وہ ہے جو نیک ہو اور نیکی کے راستے پر صبر و ثبات اور پامردی کے ساتھ چلنے والا ہو۔ لہٰذا جس تعصب سے، جس بے رخی سے، جس تضحیک و استہزاء سے اور جن جاہلانہ اعتراضات

سے تمہارا مقابلہ کیا جا رہا ہے ان کی وجہ سے تمہارے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ جو صداقت تم پر بذریعہ وحی منکشف کی گئی ہے اس کے اظہار و اعلان میں اور اس کی طرف دعوت دینے میں تمہیں قطعاً کوئی باک نہ ہو۔ تمہارے دل میں اس خیال کا کبھی گزر تک نہ ہو کہ فلاں بات کیسے کہوں جبکہ لوگ سنتے ہی اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں اور فلاں حقیقت کا اظہار کیسے کروں جبکہ کوئی اس کے سننے تک کا روادار نہیں ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے تم جسے حق پاتے ہو اسے بے کم و کاست اور بے خوف بیان کیے جاؤ آگے سب معاملات اللہ کے حوالہ ہیں۔"

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۔ (ہود: ۴۹)

"اے محمدؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں۔ جو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔"

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۔ (یوسف: ۱)

"الٓر۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم (اہل عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔ اے محمدؐ! ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں۔"

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۔ (یوسف: ۱۰۲)

"اے محمدؐ! یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں ورنہ تم اس وقت موجود نہ تھے جب یوسفؑ کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کر کے سازش کی تھی۔"

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۔ (الرعد: ۳۰)

"اے محمدؐ! اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں، تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر بذریعہ وحی نازل کیا ہے اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں۔"

حضورؐ پر وحی آنے کے مختلف طریقے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ (الشوریٰ ۔ ۵۱)

کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رُوبرُو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے۔ وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ وہ برتر اور حکیم ہے۔

یہ بات قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں طریقوں سے ہدایات دی گئی ہیں

۱۔ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی تھی (بخاری و مسلم)۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا ہے، چنانچہ احادیث میں آپؐ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپؐ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے، یا کسی بات پر مطلع کیا گیا ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی آپ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے (الفتح۔ ۲۷)۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: فلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے یا مجھے یہ بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اس سے منع کیا گیا ہے۔ ایسی تمام چیزیں وحی کی پہلی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور احادیث قدسیہ بھی زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔

۲۔ معراج کے موقع پر حضورؐ کو وحی کی دوسری قسم سے بھی مشرف فرمایا گیا۔ متعدد صحیح احادیث میں حضورؐ کو پنج وقتہ نماز کا حکم دیئے جانے، اور حضورؐ کے اس پر بار بار عرض معروض کرنے کا ذکر جس طرح آیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اللہ اور اس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ویسا ہی مکالمہ ہوا تھا جیسا کوہ طور میں حضرت موسیٰؑ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوا۔

۳۔ رہی تیسری قسم، تو اس کے متعلق قرآن خود ہی شہادت دیتا ہے کہ اسے جبریل امین کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا گیا، جیسا کہ البقرہ ۹۷، اور الشعراء ۱۹۲ تا ۱۹۵ میں ارشاد ہوا ہے۔

مزید توضیح

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی مختلف طریقوں سے آتی تھی۔ اس کی تفصیل علامہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اس طرح کی ہے:

۱۔ سچا خواب، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدائی صورت تھی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے تھے وہ اس طرح صاف آتا تھا جیسے سپیدۂ صبح۔

۲۔ فرشتہ آپؐ کے ذہن و قلب میں کوئی بات ڈالتا تھا بغیر اس کے کہ وہ آپ کو نظر آتے۔ اس کی مثال

وہ حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ رُوح القدس (جبریلؑ) نے میرے ذہن میں یہ بات ڈالی ہے (یا پھونکی ہے) کہ کوئی متنفس ہرگز نہ مرے گا جب تک کہ اپنے حصّے کا پورا رزق نہ پالے، لہٰذا اللہ سے ڈر کر کام کرو اور طلبِ رزق کا اچھا طریقہ اختیار کرو اور رزق میں تاخیر تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اسے اللہ کی نافرمانی کے ساتھ طلب کرنے لگو کیونکہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے (یعنی اس کا انعام) وہ صرف اس کی اطاعت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ فرشتہ آپؐ کے سامنے بصورتِ انسان نمودار ہو کر بات کرتا تھا اور اُس وقت تک مخاطب رہتا تھا جب تک کہ آپؐ اس کی بات پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیں۔ اس صورت میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ صحابہؓ نے بھی اُس کو دیکھا ہے۔

۴۔ وحی سے پہلے آپؐ کے کان میں ایک گھنٹی سی بجنی شروع ہوتی تھی اور اس کے ساتھ پھر فرشتہ بات کرتا تھا۔ یہ وحی کی شدید ترین شکل تھی جس سے سخت جاڑے میں بھی آپؐ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے۔ اگر آپؐ اونٹ پر سوار ہوتے تھے تو وہ بوجھ کے مارے بیٹھ جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس حال میں وحی آئی کہ آپؐ زید بن ثابتؓ کے زانو پر سر رکھے لیٹے تھے۔ اس وقت ان پر اتنا بوجھ پڑا کہ ان کی ران ٹوٹنے لگی تھی۔

۵۔ آپؐ فرشتے کو اس کی اصلی صورت میں دیکھتے تھے جس میں اللہ نے اسے پیدا کیا ہے، پھر جو کچھ اللہ کا حکم ہوتا ہے اسے وہ آپ پر وحی کرتا تھا۔ یہ شکل دو مرتبہ پیش آئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نجم میں بیان کیا ہے۔

۶۔ براہِ راست اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر وحی کی جبکہ آپؐ معراج میں آسمانوں پر تھے اور وہاں نماز فرض کی اور دوسری باتیں ارشاد فرمائیں۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کے توسط کے بغیر آپؐ سے گفتگو کی جس طرح موسیٰ علیہ السلام سے کی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے لیے تو یہ مرتبہ قرآن سے ثابت ہے۔ رہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، تو آپؐ کے حق میں اس کا ذکر معراج کی حدیث میں آیا ہے۔

ان کے علاوہ بعض لوگوں نے ایک آٹھویں شکل بھی بیان کی ہے اور وہ یہ کہ اللہ نے بے پردہ ہو کر آپؐ سے گفتگو کی۔ یہ اُن لوگوں کا مذہب ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا مگر اس مسئلے میں سلف اور خلف کے درمیان اختلاف ہے۔"

(زاد المعاد۔ ج اوّل ص ۲۴-۲۵)

سیوطیؒ نے اتقان جلد اوّل میں ایک پوری فصل اسی مضمون پر لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

"چالیس سال کی عمر میں جب آپؐ نبی ہوئے تو ابتدائی تین سال تک اسرافیل آپؐ کی تعلیم و تربیت پر مامور رہے اور اُن کے ذریعہ سے قرآن کا کوئی حصہ نازل نہیں ہوا۔ پھر جبریل وحی لانے پر مقرر ہوئے اور وہ ۲۰ سال تک قرآن لاتے رہے۔ وحی کی صورتیں حسبِ ذیل تھیں:۔

۱۔ کان میں گھنٹی سی بجنی شروع ہوتی اور پھر فرشتے کی آواز آتی۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ پہلے آپؐ سب طرف سے توجہ ہٹا کر اس آواز کو سننے کے لیے ہمہ تن متوجہ ہو جائیں۔ حضورؐ کا بیان ہے کہ یہ شکل آپؐ کے لیے سب سے زیادہ شدید تھی۔

۲۔ آپؐ کے ذہن و قلب میں ایک بات ڈالی جاتی تھی، جیسا کہ آپؐ نے خود بیان فرمایا ہے۔

۳۔ فرشتہ آپؐ سے انسانی شکل میں آ کر بات کرتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وحی کی یہ صورت میرے لیے سب سے زیادہ ہلکی ہوتی تھی۔

۴۔ فرشتہ خواب میں آ کر آپؐ سے بات کرتا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ آپؐ سے براہِ راست کلام کرتا، خواہ بیداری میں یا خواب میں۔"[۸۲]

(الاتقان۔ جلد اوّل، ص ۴۴۔ ۴۵)

قرآن کا چیلنج کہ وہ وحیِ الٰہی ہے

نبوّت سے پہلے کی پُوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم و تربیت اور صحبت نہیں پائی تھی جس سے آپؐ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوّت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھُوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپؐ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہُوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہُوئے، اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہُوئے نہیں دیکھے گئے جو اب قرآن کی پے در پے سُورتوں میں زیرِ بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پُورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپؐ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اُس عظیم الشّان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا جو دفعۃً آپؐ نے اچانک چالیسویں سال پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپؐ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خارج سے آپؐ کے اندر آئی ہُوئی چیز ہے۔[۸۳]

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَى مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ وَلَكِنَّا أَنْشَأْنَا قُرُونًا	اے محمدؐ! تم اس وقت مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا، اور نہ تم شاہدین میں شامل تھے، بلکہ اس کے بعد (تمہارے

فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۔ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (القصص ۴۴ - ۴۶)

زمانہ تک، ہم بہت سی نسلیں اٹھا چکے ہیں اور ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے۔ تم اہل مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ ان کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے، مگر (اس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور تم طور کے دامن میں بھی اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ کو پہلی مرتبہ) پکارا تھا، مگر تمہارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات) دی جا رہی ہیں، تاکہ تم ان لوگوں کو متنبہ کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہوش میں آئیں۔

یہ تینوں باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ جس وقت یہ باتیں کہی گئی تھیں اُس وقت مکہ کے تمام سردار اور عام کفار اس بات پر پوری طرح تُلے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپؐ کو غیر نبی اور معاذ اللہ جھوٹا مدعی ثابت کر دیں۔ ان کی مدد کے لیے یہود کے علماء اور عیسائیوں کے راہب بھی حجاز کی بستیوں میں موجود تھے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں عالمِ بالا سے آ کر یہ قرآن نہیں سنا جاتے تھے، بلکہ اسی مکہ کے رہنے والے تھے اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ آپ کی بستی اور آپ کے قبیلے کے لوگوں سے چھپا ہوا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت اس کھلے چیلنج کے انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے طور پر یہ تینوں باتیں ارشاد فرمائی گئیں، اس وقت مکے اور حجاز، اور پورے عرب میں کوئی ایک شخص بھی اٹھ کر وہ بیہودہ بات نہ کہہ سکا جو آج کے مستشرقین کہتے ہیں۔ اگرچہ جھوٹ گھڑنے میں وہ لوگ ان سے کچھ کم نہ تھے، لیکن ایسا دروغِ بے فروغ آخر وہ کیسے بول سکتے تھے جو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چل سکتا ہو۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمدؐ، تم فلاں فلاں یہودی عالموں اور عیسائی راہبوں سے یہ معلومات حاصل کر لاتے ہو، کیونکہ پورے ملک میں وہ اس غرض کے لیے کسی کا نام نہیں لے سکتے تھے جس کا نام بھی وہ لیتے، فوراً ہی یہ ثابت ہو جاتا کہ اس سے آنحضرتؐ نے کوئی معلومات حاصل نہیں کی ہیں۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمدؐ، تمہارے پاس پچھلی تاریخ اور علوم و آداب کی ایک لائبریری موجود ہے جس کی مدد سے تم یہ ساری تقریریں کر رہے ہو، کیونکہ لائبریری تو درکنار، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کہیں سے وہ ایک کاغذ کا پرزہ بھی برآمد نہیں کر سکتے تھے جس میں یہ معلومات لکھی ہوئی ہوں۔ مکے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھے پڑھے آدمی نہیں ہیں، اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپؐ نے کچھ مترجمین کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو عبرانی اور سریانی اور یونانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے آپؐ کو دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی بڑے سے بڑا بے حیا آدمی

بھی یہ دعویٰ کرنے کی جراٴت نہ رکھتا تھا کہ شام و فلسطین کے تجارتی سفروں میں آپ یہ معلومات حاصل کر آتے تھے کیونکہ یہ سفر تنہا نہیں ہوتے تھے، مکے ہی کے تجارتی قافلے ہر سفر میں آپ کے ساتھ لگے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس وقت ایسا دعویٰ کرتا تو سینکڑوں زندہ شاہد یہ شہادت دے دیتے کہ وہاں آپ نے کسی سے کوئی درس نہیں لیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد تو دو سال کے اندر ہی رومیوں سے مسلمان برسرِ پیکار ہو گئے تھے۔ اگر کہیں بھولے سے بھی شام و فلسطین میں کسی عیسائی راہب یا یہودی ربی سے حضورؐ نے کوئی مذاکرہ کیا ہوتا تو رومی سلطنت رائی کا پہاڑ بنا کر بے پر کی اڑانے میں ذرا دریغ نہ کرتی کہ محمد معاذاللہ سب کچھ یہاں سے سیکھ گئے تھے اور مکے جا کر نبی بن بیٹھے۔ غرض اس زمانے میں جبکہ قرآن کا یہ چیلنج قریش کے کفّار و مشرکین کے لیے پیام موت کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کو جھٹلانے کی ضرورت موجودہ زمانے کے مستشرقین کی بہ نسبت اُن لوگوں کو بدرجہا زیادہ لاحق تھی، کوئی شخص بھی کہیں سے ایسا کوئی مواد فراہم کر کے نہ لاسکا جس سے وہ یہ ثابت کر سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کے سوا ان معلومات کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود ہے جس کی نشان دہی کی جا سکتی ہو۔

یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ قرآن نے یہ چیلنج اسی ایک جگہ نہیں دیا ہے بلکہ متعدد مقامات پر مختلف قصوں کے سلسلے میں دیا ہے۔ حضرت زکریاؑ اور حضرت مریمؑ کا قصہ بیان کر کے فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۔

(آل عمران: ۴۴)

"یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعہ سے تمہیں دے رہے ہیں، تم اُن لوگوں کے پاس کہیں موجود نہ تھے جبکہ وہ اپنے قرعے یہ طے کرنے کے لیے پھینک رہے تھے کہ مریمؑ کی کفالت کون کرے۔ اور نہ تم اس وقت موجود تھے جبکہ وہ جھگڑ رہے تھے۔"

حضرت یوسفؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۔

(یوسف: ۱۰۲)

"یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعہ سے تمہیں دے رہے ہیں، تم ان کے (یعنی یوسفؑ کے بھائیوں کے) آس پاس کہیں موجود نہ تھے جب انہوں نے اپنی تدبیر پر اتفاق کیا اور جب کہ وہ اپنی چال چل رہے تھے۔"

اسی طرح حضرت نوحؑ کا مفصل قصہ بیان کر کے فرمایا:

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا	یہ باتیں غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم پر
إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا	وحی کر رہے ہیں انہیں او تمہاری قوم کو اس سے
قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَٰذَا (ہود-۴۹)	پہلے ان کا کوئی علم نہ تھا۔

اسی چیز کی بار بار تکرار سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن مجید اپنے من جانب اللہ ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے پر جو بڑے سے بڑے دلائل دیتا تھا ان میں سے ایک یہ دلیل تھی کہ سینکڑوں ہزاروں برس پہلے کے گزرے ہوئے واقعات کی جو تفصیلات ایک امی کی زبان سے بیان ہو رہی ہیں ان کے علم کا کوئی ذریعہ اس کے پاس وحی کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ چیز ان اہم اسباب میں سے ایک تھی جن کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر لوگ اس بات پر یقین لاتے چلے جا رہے تھے کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں اور آپ پر وحی آتی ہے۔ اب یہ ہر شخص خود تصور کر سکتا ہے کہ اسلامی تحریک کے مخالفین کے لیے اس زمانے میں اس تبلیغ کی تردید کرنا کیسی کچھ اہمیت رکھتا ہوگا، اور انہوں نے اس کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کی کوششوں میں کیا کسر اٹھا رکھی ہوگی۔ نیز یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر معاذ اللہ اس تبلیغ میں ذرا سی بھی کوئی کمزوری ہوتی تو اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے شہادتیں فراہم کرنا ہم عصر لوگوں کے لیے مشکل نہ تھا۔[1]

وحی کی تشبیہ بارش سے

قرآن میں دو مقامات پر اشارۃً نبی اکرم پر نازل ہونے والی وحی کو باران رحمت سے تشبیہ دی گئی ہے:

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ	اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالا اپنے
أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا (الرعد-۱۷)	ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔

اس تمثیل میں اس علم کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے سے نازل کیا گیا تھا آسمانی بارش سے تشبیہ دی گئی ہے اور ایمان لانے والے سلیم الفطرت لوگوں کو ان ندی نالوں کے مانند ٹھہرایا گیا ہے جو اپنے اپنے ظرف کے مطابق باران رحمت سے بھرپور ہو کر رواں دواں ہو جاتے ہیں، اور اسی ہنگامہ و شورش کو جو تحریک اسلامی کے خلاف منکرین و مخالفین نے برپا کر رکھی تھی۔ اس جھاگ اور خس و خاشاک سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہمیشہ سیلاب کے اٹھتے ہی سطح پر اپنی اچھل کود دکھانی شروع کر دیتا ہے۔[2]

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ	کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برسا
مَاءً فَتُصْبِحُ الْأَرْضُ مُخْضَرَّةً (الحج-۶۳)	تا ہے اور اس کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔

یہاں پھر ظاہر مفہوم کے پیچھے ایک اشارہ چھپا ہوا ہے۔ ظاہر مفہوم تو محض اللہ کی قدرت کا بیان ہے مگر لطیف اشارہ اس میں یہ ہے کہ جس طرح خدا کی برسائی ہوئی بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی تم دیکھتے ہو کہ سوکھی

بڑی ہوئی زمین لہلہا اٹھتی ہے۔ اسی طرح یہ وحی کا باران رحمت جو آج ہو رہا ہے عنقریب تم کو یہ منظر دکھانے والا ہے کہ یہی عرب کا بنجر ریگستان علم اور اخلاق اور تہذیب صالح کا وہ گلزار بن جائے گا جو چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

وحیِ رسالت خدا کی رحمت ہے

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ ۔ (ہود : ۲۸)

"اے برادران قوم! ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا؛ اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا۔"

یہ وہی بات ہے جو پچھلے رکوع میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوائی جا چکی ہے کہ پہلے میں خود آفاق و انفس میں خدا کی نشانیاں دیکھ کر توحید کی حقیقت تک پہنچ چکا تھا، پھر خدا نے اپنی رحمت (یعنی وحی) سے مجھے نوازا، اور ان حقیقتوں کا براہ راست علم مجھے بخش دیا جن پر میرا دل پہلے سے گواہی دے رہا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام پیغمبر نبوت سے قبل اپنے غور و فکر سے ایمان بالغیب حاصل کر چکے ہوتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ ان کو منصب نبوت عطا کرتے وقت، ایمان بالشہادۃ عطا کرتا تھا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً ۔ (ہود۔ ۶۳)

صالح نے کہا "اے برادران قوم تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی نواز دیا۔"

وحیِ رسالت کے لیے لفظ "روح" کا استعمال

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۔ (النحل: ۲)

"وہ اس روح کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے (اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو) آگاہ کر دو کہ میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے لہٰذا تم مجھ سے ڈرو۔"

یعنی روحِ نبوت کو جس سے بھر کر نبی کام اور کلام کرتا ہے۔ یہ وحی اور یہ پیغمبرانہ اسپرٹ چونکہ اخلاقی زندگی میں وہی مقام رکھتی ہے جو طبعی زندگی میں روح کا مقام ہے، اس لیے قرآن میں متعدد مقامات پر

اس کے لیے رُوح کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔[۳۸]

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ	یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو یہ
مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ	روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے مگر تم لوگوں
اِلَّا قَلِيْلًا ۔ (بنی اسرائیل : ۸۵)	نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہاں روح سے مراد جان ہے، یعنی لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روح حیات کے متعلق پوچھا تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے لیکن ہمیں یہ معنی تسلیم کرنے میں سخت تامل ہے۔ اس لیے کہ یہ معنی صرف اس صورت میں لیے جاسکتے ہیں جبکہ سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا جائے اور سلسلہ کلام سے بالکل الگ کر کے اس آیت کو ایک منفرد جملے کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ ورنہ اگر سلسلۂ کلام میں رکھ کر دیکھا جائے تو روح کو جان کے معنی میں لینے سے عبارت میں سخت بے ربطی محسوس ہوتی ہے اور اس امر کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جہاں پچھلی تین آیتوں میں قرآن کے نسخۂ شفا ہونے اور منکرین قرآن کے ظالم اور کافر نعمت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، اور جہاں بعد کی آیتوں میں پھر قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، وہاں آخر کس مناسبت سے یہ مضمون آگیا کہ جاندار ودں میں جان خدا کے حکم سے آتی ہے؟

ربط عبارت کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں روح سے مراد وحی یا وحی لانے والا فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔ مشرکین کا سوال دراصل یہ تھا کہ یہ قرآن تم کہاں سے لاتے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمدؐ! تم سے یہ لوگ روح یعنی ماخذ قرآن، یا ذریعہ حصول قرآن کے بارے میں دریافت کرتے ہیں انھیں بتادو کہ یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے۔ مگر تم لوگوں نے علم سے اتنا کم بہرہ پایا ہے کہ تم انسانی ساخت کے کلام اور وحی ربانی کے ذریعہ سے نازل ہونے والے کلام کا فرق نہیں سمجھتے اور اس کلام پر یہ شبہ کرتے ہو کہ اسے کوئی انسان گھڑ رہا ہے۔

یہ تفسیر نہ صرف اس لحاظ سے قابل ترجیح ہے کہ تقریر ما سبق اور تقریر ما بعد کے ساتھ آیت کا ربط اسی تفسیر کا متقاضی ہے، بلکہ خود قرآن مجید میں بھی دوسرے مقامات پر یہ مضمون قریب قریب ان ہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مومن میں ارشاد ہوا ہے۔ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ (آیت ۱۵)
"وہ اپنے حکم سے اپنے جس بندے پر چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے اکٹھے ہونے کے دن سے آگاہ کردے" اور سورۂ شوریٰ میں فرمایا: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ "اور اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک روح اپنے حکم سے بھیجی۔ تو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہے۔"

مطلب میں سے ابن عباسؓ، قتادہ اور حسن بصری رحمہم اللہ نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو قتادہ کے حوالہ سے ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا ہے۔ مگر یہ عجیب بات لکھی ہے کہ ابن عباسؓ اس بات کو چھپا کر بیان کرتے تھے۔ اور صاحب روح المعانی حسن اور قتادہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "روح سے مراد جبریلؑ ہیں اور دراصل یہ بتانا کہ وہ کیسے نازل ہوتے ہیں اور کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر وحی کا القاء ہوتا ہے۔"[۵۳]

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۔ (الشوریٰ - ۵۲) "اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔"

روح سے مراد وحی، یا وہ تعلیم ہے جو وحی کے ذریعہ سے حضورؐ کو دی گئی۔[۵۴]

وحی کردہ کلام کے شواہد و دلائل

جو کلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے (قرآن میں) چار باتیں شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں:۔

ایک یہ کہ یہ کتاب بڑی خیر و برکت والی ہے، یعنی اس میں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین اصول پیش کیے گئے ہیں، عقائد صحیحہ کی تعلیم ہے، بھلائیوں کی ترغیب ہے۔ اخلاق فاضلہ کی تلقین ہے، پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے۔ اور پھر یہ جہالت، خود غرضی، تنگ نظری، ظلم، فحش اور دوسری اُن برائیوں سے، جن کا انبار تم لوگوں نے کتب مقدسہ کے مجموعہ میں بھر رکھا ہے، بالکل پاک ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے پہلے خدا کی طرف سے جو ہدایت نامے آئے تھے یہ کتاب اُن سے الگ ہٹ کر کوئی مختلف ہدایت پیش نہیں کرتی بلکہ اُسی چیز کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو ان میں پیش کی گئی تھی۔

تیسرے یہ کہ یہ کتاب اُسی مقصد کے لیے نازل ہوئی ہے جو ہر زمانہ میں اللہ کی طرف سے کتابوں کے نزول کا مقصد رہا ہے، یعنی غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانا اور کج روی کے انجام بد سے خبردار کرنا۔

چوتھے یہ کہ اس کتاب کی دعوت نے انسانوں کے گروہ میں سے ان لوگوں کو نہیں سمیٹا جو دنیا پرست اور خواہش نفس کے بندے ہیں، بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا ہے جن کی نظر حیات دنیا کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے، اور پھر اس کتاب سے متاثر ہو کر جو انقلاب ان کی زندگی میں رونما ہوا ہے اُس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی کے اعتبار سے ممتاز ہیں کیا یہ خصوصیت اور یہ نتائج کسی ایسی کتاب کے ہو سکتے ہیں جسے کسی جھوٹے انسان نے گھڑ لیا ہو جو اپنی تصنیف کو خدا کی طرف منسوب کر دینے کی انتہائی مجرمانہ جسارت تک کر گزرے؟[۵۵]

باب ۳

نبوتِ محمدیؐ کی ضرورت

اور

اُس کے دلائل

فصل ۱

پچھلے انبیاءؑ کے بعد آپؐ کے مبعوث کیے جانے کی وجہ

وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْ بَعْدِھِمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ۔ (الشوریٰ - ۱۴)

"اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔"

ہر نبی اور اس کے قریبی تابعین کا دور گزر جانے کے بعد جب پچھلی نسلوں تک کتاب اللہ پہنچی تو انہوں نے اسے یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں لیا، بلکہ وہ اس کے متعلق سخت شک اور ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہو گئیں۔ اس حالت میں ان کے مبتلا ہو جانے کے بہت سے وجوہ تھے جنہیں ہم اُس صورتِ حال کا مطالعہ کر کے بآسانی سمجھ سکتے ہیں جو تورات و انجیل کے معاملہ میں پیش آئی ہے۔ ان دونوں کتابوں کو اگلی نسلوں نے ان کی اصلی حالت پر اُن کی اصل عبارت اور زبان میں محفوظ رکھ کر پچھلی نسلوں تک نہیں پہنچایا۔ ان میں خدا کے کلام کے ساتھ تفسیر، تاریخ اور سماعی روایات اور فقہاء کے نکالے ہوئے جزئیات کی صورت میں انسانی کلام گڈمڈ کر دیا۔ ان کے ترجموں کو اتنا رواج دیا کہ اصل غائب ہو گئی اور صرف ترجمے باقی رہ گئے۔ ان کی تاریخی سند بھی اس طرح ضائع کر دی کہ اب کوئی شخص بھی پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جو کتاب اُس کے ہاتھ میں ہے وہ وہی ہے جو حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کے ذریعہ سے دنیا والوں کو ملی تھی۔ پھر اُن کے اکابر نے وقتاً فوقتاً مذہب، الٰہیات، فلسفہ، قانون، طبعیات، نفسیات اور اجتماعیات کی ایسی بحثیں چھیڑیں اور ایسے نظاماتِ فکر کی بنا ڈالی جن کی بھول بھلیوں میں پھنس کر لوگوں کے لیے یہ طے کرنا محال ہو گیا کہ ان پیچیدہ راستوں کے درمیان حق کی سیدھی شاہراہ کونسی ہے۔ اور چونکہ کتاب اللہ اپنی اصل حالت اور قابلِ اعتماد صورت میں موجود نہ تھی اس لیے لوگ کسی ایسی سند کی طرف رجوع نہ کر سکتے تھے۔ جو حق کو باطل سے متمیز کرنے میں ان کی مدد کرتی۔ؒ

واضح رہے کہ عرب میں دینِ حق کی روشنی سب سے پہلے حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کے ذریعہ سے پہنچی تھی جو زمانۂ قبل تاریخ میں گزرے ہیں پھر حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام آئے جن کا زمانہ حضورؐ سے ڈھائی ہزار

برس قبل گزرا ہے۔ اس کے بعد آخری پیغمبر جو عرب کی سرزمین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھیجے گئے وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے[۹]

اہلِ عرب پہلے سے خود ایک نبی مانگ رہے تھے

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۔ (فاطر ۴۲)

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رو ہوتے۔

یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کے لوگ عموماً اور قریش کے لوگ خصوصاً یہود و نصاریٰ کی بگڑی ہوئی اخلاقی حالت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے[۱۰]

اسی طرح سورۂ انعام میں آیا ہے:

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۔ (الانعام: ۱۵۶، ۱۵۷)

اس کتاب کے آنے کے بعد اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی۔ اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے، اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راست رو ثابت ہوتے۔

سورۂ صافات میں اس طرح ارشاد ہے:

وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۔ (الصّٰفّٰت: ۱۶۷ تا ۱۶۹)

یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس وہ "ذکر" ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے۔

ایک "روشن دلیل" کے ظہور کی ضرورت

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۔ (البینۃ ۱، ۲)

اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیلِ روشن نہ آجائے (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔

یعنی ان کے عالمِ کفر سے نکلنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ ایک دلیلِ روشن آکر انہیں کفر کی ہر صورت کا غلط اور خلافِ حق ہونا سمجھاتے اور راہِ راست کو واضح اور مدلل طریقے سے ان کے سامنے پیش کر دے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس دلیلِ روشن کے آجانے کے بعد وہ سب کفر سے باز آجانے والے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دلیل کی غیر موجودگی میں تو ان کا اس حالت سے نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ البتہ اس کے آنے کے بعد بھی ان میں جو لوگ اپنے کفر پر قائم رہیں اس کی ذمہ داری پھر انہی پر ہے، اس کے بعد وہ اللہ سے یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ آپ نے ہماری ہدایت کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ نحل میں فرمایا: وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ "سیدھا راستہ بتانا اللہ کے ذمہ ہے" (آیت ۹)۔ سورۂ لیل میں فرمایا اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى "راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے" (آیت ۱۲)۔ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ... رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ "اے نبی، ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی ... ان رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنایا گیا تا کہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت نہ رہے" (النساء ۱۶۳ تا ۱۶۵)۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ۔ (المائدہ۔ ۱۹)	اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول حقیقت واضح کرنے کے لیے رسولوں کا سلسلہ ایک مدت تک بند رہنے کے بعد آگیا ہے تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس نہ کوئی بشارت دینے والا آیا نہ خبردار کرنے والا۔ سو لو اب تمہارے پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا آگیا۔
وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ۔ (البینہ۔ ۴)	پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں تفرقہ برپا نہیں ہوا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس راہِ راست کا بیان واضح آچکا تھا۔

یعنی اس سے پہلے اہلِ کتاب جو مختلف گمراہیوں میں بھٹک کر بے شمار فرقوں میں بٹ گئے اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ان کی رہنمائی کے لیے دلیلِ روشن بھیجنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی، بلکہ یہ روش انہوں نے اللہ کی جانب سے رہنمائی آجانے کے بعد اختیار کی تھی، اسی لیے اپنی گمراہی کے وہ خود ذمہ دار تھے، کیونکہ ان پر حجت تمام کی جا چکی تھی۔ اسی طرح اب جو نکہ ان کے صحیفے پاک نہیں رہے ہیں اور ان کی کتابیں بالکل راست اور

درست تعلیمات پر مشتمل نہیں رہی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک دلیلِ روشن کی حیثیت سے اپنا ایک رسول بھیج اور اس کے ذریعہ سے پاک صحیفے بالکل راست اور درست تعلیمات پر مشتمل پیش کر کے ان پر پھر حجت تمام کر دی ہے تاکہ اس کے بعد بھی اگر وہ متفرق رہیں تو اس کی ذمہ داری انہی پر ہے اللہ کے مقابلہ میں وہ کوئی حجت پیش نہ کر سکیں۔ یہ بات قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو البقرہ، آیات ۲۱۳، ۲۵۳۔ آل عمران، ۱۹۔ المائدہ ۴۴ تا ۵۰۔ یونس ۹۳۔ الشوریٰ، ۱۳ تا ۱۵۔ الجاثیہ، ۱۶ تا ۱۸۔ اس کے ساتھ اگر وہ حواشی بھی پیش نظر رکھے جائیں جو تفہیم القرآن میں ان آیات پر ہم نے لکھے ہیں تو بات سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی۔

رسول بھیجنے کی ضرورت اس لیے تھی کہ دنیا کے لوگ، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، جس کفر کی حالت میں مبتلا تھے اُس سے ان کا نکلنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایک ایسا رسول بھیجا جاتا جس کا وجود خود اپنی رسالت پر دلیلِ روشن ہو، اور وہ لوگوں کے سامنے خدا کی کتاب کو اس کی اصلی اور صحیح صورت میں پیش کرے جو باطل کی ان تمام آمیزشوں سے پاک ہو جن سے پچھلی کتبِ آسمانی کو آلودہ کر دیا گیا ہے اور بالکل راست اور درست تعلیمات پر مشتمل ہو۔

مقامِ بعثت کا انتخاب

دنیا کا جغرافیہ اٹھا کر دیکھو، تم ایک ہی نظر میں محسوس کر لو گے کہ تمام جہان کی پیغمبری کے لیے رُوئے زمین میں عرب سے زیادہ موزوں مقام اور کوئی نہیں ہے اور نہ کوئی ہو سکتا ہے۔ یہ ملک ایشیا اور افریقہ کے عین وسط میں واقع ہے اور یورپ بھی یہاں سے بہت قریب ہے خصوصاً اُس زمانہ میں یورپ کی متمدن قومیں زیادہ تر یورپ کے جنوبی حصہ میں آباد تھیں اور یہ حصہ عرب سے اتنا ہی قریب ہے جتنا ہندوستان ہے۔

پھر اس زمانہ کی تاریخ پڑھو۔ تم کو معلوم ہوگا کہ اس نبوت کے لیے اُس زمانہ میں عربی قوم سے زیادہ موزوں کوئی قوم نہ تھی۔ دوسری بڑی بڑی قومیں اپنا اپنا زور دکھا کر گویا بے دم ہو چکی تھیں اور عربی قوم تازہ دم تھی۔ تمدن کی ترقی سے دوسری قوموں کی عادتیں بگڑ گئی تھیں اور عربی قوم میں اُس وقت کوئی ایسا تمدن نہیں تھا جو اس کو آرام طلب اور عیش پسند اور رذیل بنا دیتا۔ چھٹی صدی عیسوی کے عرب اُس زمانے کی متمدن قوموں کے بُرے اثرات سے بالکل پاک تھے۔ ان میں وہ تمام انسانی خوبیاں موجود تھیں جو ایک ایسی قوم میں ہو سکتی ہیں جس کو تمدن کی ہوا نہ لگی ہو۔ وہ بہادر تھے۔ بے خوف تھے۔ فیاض تھے۔ عہد کے پابند تھے۔ آزاد خیال اور آزادی کو پسند کرنے والے تھے کسی قوم کے غلام نہ تھے۔ اپنی عزت کے لیے جان دے دینا ان کے لیے آسان تھا۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور عیش و عشرت سے بیگانہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں بہت سی برائیاں بھی تھیں کیونکہ ڈھائی ہزار برس سے اُن کے ہاں کوئی پیغمبر نہ آیا تھا۔[1] نہ کوئی ایسا رہنما پیدا ہوا تھا جو اُن کے اخلاق کو درست کرتا، اور انہیں

[1] حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل ... اس لمبی مدت کے اندر

تہذیب سکھانا۔ صدیوں تک ریگستان میں آزادی کی زندگی بسر کرنے کے سبب سے ان میں جہالت پھیل گئی تھی اور وہ اپنی جہالت میں اس قدر سخت ہو گئے تھے کہ ان کو آدمی بنانا کسی معمولی انسان کے بس کا کام نہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ان میں یہ قابلیت ضرور موجود تھی کہ اگر کوئی زبردست انسان ان کی اصلاح کر دے اور اس کی تعلیم کے اثر سے وہ کسی اعلیٰ درجہ کے مقصد کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں تو دنیا کو زیر و زبر کر ڈالیں۔ پیغمبر عالم کی تعلیم کو پھیلانے کے لیے ایسی ہی جوان اور طاقتور قوم کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد عربی زبان کو دیکھو۔ تم جب اس زبان کو پڑھو گے اور اس کے علم و ادب کا مطالعہ کرو گے تو تم کو معلوم ہوگا کہ بلند خیالات کو ادا کرنے اور خدائی علم کی نہایت نازک اور باریک باتیں بیان کرنے اور دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور زبان نہیں ہے۔ اس زبان کے مختصر جملوں میں بڑے بڑے مضامین ادا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان میں ایسا زور ہوتا ہے کہ دلوں میں تیر و نشتر کی طرح اثر کرتے ہیں۔ ایسی شیرینی ہوتی ہے کہ کانوں میں رس ٹپکتا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نغمہ ہوتا ہے کہ آدمی بے اختیار جھومنے لگتا ہے۔ قرآن جیسی کتاب کے لیے ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی۔

[٦٤] پس اللہ تعالیٰ کی یہ بہت بڑی حکمت تھی کہ اس نے تمام جہانوں کی پیغمبری کے لیے عرب کے مقام کو منتخب کیا۔ع

جہالت زدہ قوم کے لیے بہترین رہنما

ایک قوم صدیوں سے سخت جہالت، پستی، اور بدحالی میں مبتلا چلی آتی ہے۔ یکایک اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت اس پر ہوتی ہے اور وہ اس کے اندر ایک بہترین رہنما اٹھاتا ہے اور اسے جہالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے خود اپنا کلام اس رہنما پر نازل کرتا ہے، تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہو، جاہلانہ اوہام کے چکر سے آگاہ ہو کر زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرے۔

مگر اس قوم کے نادان لوگ اور اس کے خود غرض قبائلی سردار اس رہنما کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں اور اسے ناکام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ جوں جوں سال پر سال گزرتے جاتے ہیں ان کی عداوت و شرارت بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اسے قتل کر دینے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کیا تمہاری نالائقی کی وجہ سے ہم تمہاری اصلاح کی کوشش چھوڑ دیں؟ اس درس نصیحت کا سلسلہ روک دیں؟ اور تمہیں اسی پستی میں پڑا رہنے دیں جس میں تم صدیوں سے گرے ہوئے ہو؟ کیا تمہارے نزدیک واقعی ہماری رحمت کا تقاضا یہی ہونا چاہیے؟ تم نے کچھ سوچا بھی کہ خدا کے فضل کو ٹھکرانا اور حق سامنے آجانے کے بعد باطل پر اصرار کرنا تمہیں کس انجام سے دوچار کرے گا۔ [٦٥]

ع۔ کوئی پیغمبر عرب میں پیدا نہیں ہوا۔

فصل ۲

نبوتِ محمدیؐ کا عقلی ثبوت

تھوڑی دیر کے لیے جسمانی آنکھیں بند کرکے تصور کی آنکھیں کھول لیجیے اور ایک ہزار چار سو برس پیچھے پلٹ کر دنیا کی حالت پر نظر ڈالیے۔ یہ کیسی دنیا تھی؟

۱۴ صدیوں پہلے کی دنیا

انسان اور انسان کے درمیان تبادلۂ خیالات کے وسائل کس قدر کم تھے۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلق کے ذرائع کتنے محدود تھے۔ انسان کی معلومات کس قدر کم تھیں۔ اس کے خیالات کس قدر ناقص تھے۔ اس پر وہم اور وحشت کا کس قدر غلبہ تھا۔ جہالت کے اندھیرے میں علم کی روشنی کتنی دھندلی تھی اور اس اندھیرے کو دھکیل کر کتنی دقتوں کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ دنیا میں نہ تار تھا، نہ ٹیلیفون تھا، نہ ریڈیو تھا، نہ ریل اور ہوائی جہاز تھے، نہ مطابع اور اشاعت خانے۔ نہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت تھی۔ نہ اخبارات اور رسالے شائع ہوتے تھے، نہ کتابیں کثرت سے لکھی جاتی تھیں۔ نہ کثرت سے اُن کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے ایک عالم کی معلومات بعض حیثیات سے موجودہ زمانے کے ایک عام آدمی کی بہ نسبت کم تھیں۔ اس زمانے کی اونچی سوسائٹی کا آدمی بھی موجودہ زمانے کے ایک مزدور کی بہ نسبت کم شائستہ تھا۔ اُس زمانے کا ایک نہایت روشن خیال آدمی بھی آج کل کے تاریک خیال آدمی سے زیادہ تاریک خیال تھا۔ جو باتیں آج ہر کس و ناکس کو معلوم ہیں وہ اُس زمانے میں برسوں کی محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد بمشکل معلوم ہو سکتی تھیں۔ جو معلومات آج روشنی کی طرح فضا میں پھیلی ہوئی ہیں اور بچے کو ہوش سنبھالتے ہی حاصل ہو جاتی ہیں، ان کے لیے اُس زمانے میں سینکڑوں میل کے سفر کیے جاتے تھے، اور عمریں اس کی جستجو میں بیت جاتی تھیں۔ جن باتوں کو آج اوہام و خرافات سمجھا جاتا ہے، وہ اُس زمانے کے حقائق تھے۔ جن افعال کو آج ناشائستہ اور وحشیانہ کہا جاتا ہے وہ اُس زمانہ کے عام معمولات تھے۔ جن طریقوں سے آج انسان کا ضمیر نفرت کرتا ہے، وہ اُس زمانہ کے اخلاقیات میں نہ صرف جائز تھے بلکہ کوئی شخص یہ خیال بھی نہ کرسکتا تھا کہ ان کے خلاف بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔ انسان کی عجائب پرستی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ

وہ کسی چیز میں اُس وقت تک کوئی صداقت، کوئی بزرگی تسلیم ہی نہ کرسکتا تھا جب تک وہ فوق الفطرت نہ ہو، خلافِ عادت نہ ہو، غیر معمولی نہ ہو۔ یہی کہ انسان خود اپنے آپ کو اس قدر ذلیل سمجھتا تھا کہ کسی انسان کا خدا رسیدہ ہونا یا کسی خدا رسیدہ کا انسان ہونا اُس کے تصور کی رسائی سے بہت دُور تھا۔

سرزمینِ عرب کے احوال

اِس تاریک دور میں زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تاریکی کا تسلّط اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ جو ممالک اُس زمانے کے معیارِ تمدّن کے لحاظ سے متمدّن تھے ان کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ اس کے اِردگرد ایران، رُوم اور مصر کے ملکوں میں علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی کچھ روشنی پائی جاتی تھی، مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جُدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی مسافت طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے، اور صرف اموال کا تبادلہ کر کے واپس آجاتے تھے۔ علم و تہذیب کی کوئی روشنی ان کے ساتھ نہ آتی تھی۔ اُن کے ملک میں نہ کوئی مدرسہ تھا، نہ کتب خانہ۔ نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا، نہ علوم و فنون سے کوئی دلچسپی تھی۔ تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنہیں لکھنا پڑھنا آتا تھا، مگر وہ بھی اتنا نہیں کہ وہ اس زمانے کے علوم و فنون سے آشنا ہوں۔ ان کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی باقاعدہ زبان ضرور تھی جس میں بلند خیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ اُن میں بہترین ادبی مذاق بھی موجود تھا۔ مگر اُن کے لٹریچر کے جو کچھ باقیات ہم تک پہنچے ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کس قدر محدود تھیں، تہذیب و تمدّن میں ان کا درجہ کس قدر پست تھا، اُن پر اوہام کا کس قدر غلبہ تھا، ان کے خیالات اور ان کی عادات میں کتنی جہالت اور وحشت تھی، ان کے اخلاقی تصوّرات کتنے بھدّے تھے۔

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ کوئی ضابطہ نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا اور صرف "جنگل کے قانون" کی پیروی کی جاتی تھی۔ جس کا جس پر بس چلتا اسے مار ڈالتا اور اس کے مال پر قابض ہو جاتا۔ یہ بات ایک عرب بدوی کے فہم سے بالاتر تھی کہ جو شخص اس کے قبیلے کا نہیں ہے اُسے وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اس کے مال پر کیوں نہ متصرف ہو جائے۔

اخلاق و تہذیب و شائستگی کے جو کچھ بھی تصوّرات ان لوگوں میں تھے وہ نہایت ادنیٰ اور سخت ناتراشیدہ تھے۔ پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً ناآشنا تھے۔ ان کی زندگی نہایت گندی تھی۔ ان کے طریقے وحشیانہ تھے۔ زنا، جوا، شراب، رہزنی اور قتل و خونریزی ان کی زندگی کے معمولات تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلّف برہنہ ہو جاتے تھے۔ ان کی عورتیں تک ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ وہ اپنی

اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں زندہ دفن کر دیتے تھے محض اس جاہلانہ خیال کی بنا پر کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے۔ وہ اپنے باپوں کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ انہیں کھانے اور لباس اور طہارت کے معمولی آداب تک معلوم نہ تھے۔

مذہب کے باب میں وہ اُن تمام جہالتوں اور ضلالتوں کے حصہ دار تھے جن میں اس زمانے کی دنیا مبتلا تھی۔ بت پرستی، ارواح پرستی، کواکب پرستی، غرض ایک خدا کی پرستش کے سوا اس وقت دنیا میں جتنی پرستشیں پائی جاتی تھیں، وہ سب ان میں رائج تھیں۔ انبیاء کے قدیم اور ان کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم اُن کے پاس نہ تھا۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ ان کے باپ ہیں۔ مگر یہ نہ جانتے تھے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عاد اور ثمود کے قصے بھی ان میں مشہور تھے۔ مگر ان کی جو روایات عرب کے مؤرخین نے نقل کی ہیں ان کو پڑھ جائیے، کہیں آپ کو صالحؑ اور ہودؑ کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ ان کو یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے انبیائے بنی اسرائیل کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں۔ مگر وہ جیسی کچھ تھیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک نظر ان اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے جو مفسرین اسلام نے نقل کی ہیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہل عرب اور خود بنی اسرائیل جن انبیاء سے واقف تھے وہ کیسے انسان تھے اور نبوت کے متعلق ان لوگوں کا تصور کس قدر گھٹیا درجہ کا تھا۔

ایک شخصیت سامنے آتی ہے!

ایسے زمانہ میں، ایسے ملک میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے۔ بچپن ہی میں ماں، باپ اور دادا کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ جاتا ہے۔ اس لیے اس گئی گزری حالت میں ایک عرب بچے کو جو تھوڑی بہت تربیت مل سکتی تھی وہ بھی اس کو نہیں ملتی۔ ہوش سنبھالتا ہے تو بدوی لڑکوں کے ساتھ بکریاں چرانے لگتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو سوداگری میں لگ جاتا ہے۔ اُٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا، سب کچھ انہی عربوں کے ساتھ ہے جن کا حال اوپر آپ نے دیکھ لیا ہے۔ تعلیم کا نام تک نہیں، حتیٰ کہ پڑھنا لکھنا تک نہیں آتا۔ کسی عالم کی صحبت بھی میسر نہ ہوئی کہ عالم کا وجود اس وقت تمام عرب میں کہیں نہ تھا۔ چند مرتبہ اسے عرب سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق ضرور ہوا۔ مگر یہ سفر صرف شام کے علاقے تک تھے اور ویسے ہی تجارتی سفر تھے جیسے اس زمانے میں عرب کے تجارتی قافلے کیا کرتے تھے۔ بالفرض اگر ان اسفار کے دوران میں اس نے کچھ آثار علم و تہذیب کا مشاہدہ کیا اور کچھ اہل علم سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا تو ظاہر ہے کہ ایسے منتشر مشاہدات اور ایسی ہنگامی ملاقاتوں سے کسی انسان کی سیرت نہیں بن جاتی۔ ان کا اثر کسی شخص پر اتنا زبردست نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل آزاد، بالکل مختلف اور اتنا بلند ہو جائے کہ اس میں اور اس کے ماحول میں کچھ نسبت ہی نہ رہے۔ ان سے ایسا علم حاصل ہونا ممکن نہیں ہے جو ایک ان پڑھ بدوی کو ایک ملک کا نہیں تمام دنیا کا، اور ایک زمانہ

کا تھیں تمام نسانوں کا لیڈر بنا دے۔ اگر کسی درجہ میں اُس نے باہر کے لوگوں سے علمی استفادہ کیا بھی تو جو معلومات اُس وقت دُنیا میں کسی کو حاصل ہی تہ تھیں۔ مذہب، اخلاق، تہذیب اور تمدن کے جو تصورات اور اصول آج اس وقت دنیا میں کہیں موجود ہی نہ تھے، انسانی سیرت کے جو نمونے اُس وقت کہیں پائے ہی نہ جاتے تھے، اُن کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اُس کا کردار

صرف عرب ہی کا نہیں دُنیا کا ماحول پیش نظر رکھیے اور دیکھیے۔

یہ شخص جن لوگوں میں پیدا ہوا، جن میں بچپن گزارا، جن کے ساتھ پل کر جوان ہوا، جن سے اس کا میل جول رہا، جن سے اُس کے معاملات رہے، ابتدا ہی سے عادات میں، اخلاق میں وہ اُن سب سے مختلف نظر آتا ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا، اُس کی صداقت پر اس کی ساری قوم گواہی دیتی ہے۔ اس کے کسی بدترین دشمن نے کبھی اُس پر یہ الزام نہیں لگایا کہ اُس نے فلاں موقع پر جھوٹ بولا تھا۔ وہ کسی سے بدکلامی نہیں کرتا۔ کسی نے اس کی زبان سے کبھی گالی یا کوئی فحش بات نہیں سُنی۔ وہ لوگوں سے ہر قسم کے معاملات کرتا ہے، مگر کبھی کسی سے تلخ کلامی اور تُو تُو میں میں کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اُس کی زبان میں سختی کے بجائے شیرینی ہے اور وہ بھی ایسی کہ جو اس سے ملتا ہے گرویدہ ہو جاتا ہے۔ وہ کسی سے بدمعاملگی نہیں کرتا۔ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ برسوں سوداگری کا پیشہ کرنے کے باوجود کسی کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقہ سے نہیں لیتا۔ جن لوگوں سے اُس کے معاملات پیش آتے ہیں وہ سب اس کی ایمانداری پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ ساری قوم اس کو امین کہتی ہے۔ دشمن تک اپنے قیمتی مال اُس کے پاس رکھواتے ہیں اور وہ اُن کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ بے حیا لوگوں کے درمیان وہ ایسا حیا دار ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد کسی نے اس کو برہنہ نہیں دیکھا۔ بداخلاقوں کے درمیان وہ ایسا پاکیزہ اخلاق ہے کہ کسی بدکاری میں مبتلا نہیں ہوتا، شراب اور جوئے کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ ناشائستہ لوگوں کے درمیان وہ ایسا شائستہ ہے کہ ہر بدتمیزی اور گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کے ہر کام میں پاکیزگی اور ستھرائی پائی جاتی ہے۔ سنگدلوں کے درمیان وہ ایسا نرم دل ہے کہ ہر ایک کے دُکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتا ہے۔ مسافروں کی میزبانی کرتا ہے۔ کسی کو اس سے دُکھ نہیں پہنچتا اور وہ دوسروں کی خاطر دُکھ اُٹھاتا ہے۔ وحشیوں کے درمیان وہ ایسا صلح پسند ہے کہ اپنی قوم میں فساد اور خونریزی کی گرم بازاری دیکھ کر اس کو اذیت ہوتی ہے۔ اپنے قبیلہ کی لڑائیوں سے دامن بچاتا ہے اور مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش رہتا ہے۔ بُت پرستوں کے درمیان وہ ایسا سلیم الفطرت اور صحیح العقل ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز اُسے پوجنے کے لائق نظر نہیں آتی کسی مخلوق کے آگے اُس کا سر نہیں جھکتا بتوں کے چڑھاوے کا کھانا بھی وہ قبول نہیں کرتا۔ اس کا دل خود بخود شرک اور مخلوق پرستی سے نفرت کرتا ہے۔

اس ماحول میں یہ شخص ایسا ممتاز نظر آتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک شمع روشن ہے، یا پتھروں کے ڈھیر میں ایک ہیرا چمک رہا ہے۔

ذہنی و رُوحانی تغیّر

تقریباً چالیس سال تک ایسی پاک صاف شریفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے۔ وہ اس تاریکی سے گھبرا اٹھتا ہے جو اس کے ہر طرف چھائی نظر آ رہی تھی۔ وہ جہالت، بداخلاقی، بدکرداری، بدنظمی، شرک اور بت پرستی کے اس ہولناک سمندر سے نکل جانا چاہتا ہے جو اُسے گھیرے ہوئے تھا۔ اس ماحول میں اُس کو کوئی چیز بھی اپنی طبیعت کے مناسب نظر نہیں آتی۔ وہ سب سے الگ ہو کر آبادی سے دُور پہاڑوں کی صحبت میں جا جا کر بیٹھنے لگتا ہے۔ تنہائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گزار دیتا ہے۔ روزے رکھ رکھ کر اپنی روح اور اپنے دل و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف کرتا ہے۔ سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے۔ کوئی ایسی روشنی ڈھونڈھتا ہے جس سے وہ اس چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی کو دُور کر دے۔ ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے اس بگڑی ہوئی دُنیا کو توڑ پھوڑ کر پھر سے سنوار دے۔

پیغامِ انقلاب

یکایک اُس کی حالت میں ایک عظیم الشان تغیّر رونما ہوتا ہے۔ ایک دم سے اُس کے دل میں وہ روشنی آجاتی ہے جو پہلے اس میں نہ تھی۔ اچانک اُس کے اندر وہ طاقت بھر جاتی ہے جس سے وہ اس وقت تک خالی تھا۔ وہ غار کی تنہائی سے نکل آتا ہے۔ اپنی قوم کے پاس آتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ یہ بُت جن کے آگے تم جھکتے ہو یہ سب بے حقیقت چیزیں ہیں، انہیں چھوڑ دو۔ کوئی انسان، کوئی درخت، کوئی پتھر، کوئی رُوح، کوئی سیارہ، اس قابل نہیں کہ تم اس کے آگے سر جھکاؤ اور اس کی بندگی و عبادت کرو اور اس کی فرمانبرداری و اطاعت کرو۔ یہ زمین، یہ چاند، یہ سُورج، یہ ستارے، یہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ وہی تمہارا اور سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہی مارنے اور جلانے والا ہے۔ اُسی کی بندگی کرو۔ اسی کا حکم مانو اور اُسی کے آگے سر جھکاؤ۔ یہ چوری، یہ لوٹ مار، یہ قتل و غارت، یہ ظلم و ستم، یہ بے حیائیاں اور بدکاریاں جو تم کرتے ہو یہ سب گناہ ہیں۔ انہیں چھوڑ دو۔ خدا انہیں پسند نہیں کرتا۔ سچ بولو۔ انصاف کرو۔ نہ کسی کی جان لو نہ کسی کا مال چھینو۔ جو کچھ لو حق کے ساتھ لو۔ جو کچھ دو حق کے ساتھ دو۔ تم سب انسان ہو۔ انسان اور انسان سب برابر ہیں۔ نہ کوئی ذلت کا داغ لے کر پیدا ہوا، اور نہ کوئی عزت کا تمغہ لے کر دُنیا میں آیا۔ بزرگی اور شرف نسل اور نسب میں نہیں ہے، صرف خدا پرستی اور نیکی اور پاکیزگی میں ہے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے اور نیک اور پاک ہے، وہی اعلیٰ درجے کا انسان ہے۔ اور جو ایسا نہیں ہے وہ کچھ بھی نہیں۔ مرنے کے بعد تم سب کو اپنے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے۔ تم میں سے ہر شخص اپنے اعمال کے لیے خدا

کے سامنے جوابدہ ہے، اُس خدا کے سامنے جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔ تم کوئی چیز اُس سے چھپا نہیں سکتے۔ تمہاری زندگی کا پورا کارنامہ اُس کے سامنے بے کم و کاست پیش ہوگا، اور اسی کارنامہ کے لحاظ سے وہ تمہارے انجام کا فیصلہ کرے گا۔ اُس عادلِ حقیقی کے ہاں نہ کوئی سفارش کام آئے گی، نہ رشوت چلے گی، نہ کسی کا نسب پوچھا جائے گا۔ وہاں صرف ایمان اور نیک عمل کی پوچھ ہوگی۔ جس کے پاس یہ سامان ہوگا وہ جنت میں جائے گا، اور جس کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہ ہوگا وہ نامراد دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

یہ تھا وہ پیغام جسے لے کر وہ غار سے نکلا۔

قوم کا ردِّ عمل

جاہل قوم اُس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے۔ پتھر مارتی ہے۔ ایک دو دن نہیں، اکٹھے تیرہ برس تک اس پر سخت سے سخت ظلم توڑتی ہے۔ یہاں تک کہ اُسے وطن سے نکال باہر کرتی ہے۔ اور پھر نکالنے پر بھی دم نہیں لیتی۔ جہاں وہ جا کر پناہ لیتا ہے وہاں بھی اسے ہر طرح ستاتی ہے۔ تمام عرب کو اس کے خلاف اُبھار دیتی ہے اور کامل آٹھ برس اس کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہے۔ وہ ان سب تکلیفوں کو سہتا ہے مگر اپنی بات سے نہیں ٹلتا۔

یہ قوم اُس کی دشمن کیوں ہو گئی؟ کیا زر اور زمین کا جھگڑا تھا؟ کیا خون کا کوئی دعویٰ تھا؟ کیا وہ ان سے دنیا کی کوئی چیز بھی مانگ رہا تھا؟ نہیں، ساری دشمنی صرف اس بات پر تھی کہ وہ ایک خدا کی بندگی اور پرہیزگاری اور نیکوکاری کی تعلیم کیوں دیتا ہے۔ بت پرستی اور شرک اور بدعملی کے خلاف تبلیغ کیوں کرتا ہے۔ پجاریوں اور پروہتوں کی پیشوائی پر کیوں ضرب لگاتا ہے۔ سرداروں کی سرداری کا طلسم کیوں توڑتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان سے اونچ نیچ کا فرق کیوں مٹانا چاہتا ہے۔ قبائلی اور نسلی تعصبات کو جاہلیت کیوں قرار دیتا ہے۔ زمانۂ قدیم سے سوسائٹی کا جو نظام بندھا چلا آ رہا ہے، اسے کیوں توڑنا چاہتا ہے۔ قوم کہتی تھی کہ یہ باتیں جو تو کہہ رہا ہے، یہ سب خاندانی روایات اور قومی طریقہ کے خلاف ہیں۔ تو ان کو چھوڑ دے، ورنہ ہم تیرا جینا مشکل کر دیں گے۔

تحمل شدائد کیوں؟

اچھا تو اس شخص نے یہ تکلیفیں کیوں اٹھائیں؟ قوم اس کو بادشاہ بنانے پر آمادہ تھی، دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں ڈال دینے کو تیار تھی، بشرطیکہ وہ اپنی تعلیم سے باز آ جاتے۔ مگر انہوں نے ان سب کو ٹھکرا دیا اور اپنی تعلیم کی خاطر پتھر کھانا اور ظلم سہنا قبول کیا۔ یہ آخر کیوں؟ کیا ان کے خدا پرست اور نیکوکار بن جانے میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ تھا؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کے مقابلے میں ریاست اور امارت اور دولت اور عیش کے سارے لالچ بھی ناقابلِ التفات تھے؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کی خاطر ایک شخص سخت سے سخت جسمانی اور روحانی اذیتوں

میں مبتلا ہونا اور کامل ۱۳ سال مبتلا رہنا بھی گوارا کرسکتا ہو؟ غور کرو کیا نیک نفسی، ایثار اور ہمدردی بنی نوع کا اس سے بھی بلند تر کوئی مرتبہ تمہارے تصور میں آسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فائدہ کی خاطر نہیں، دوسروں کے بھلے کی خاطر تکلیفیں اٹھاتے، جن کی بھلائی اور بہتری کے لیے وہ کوشش کرتا ہے وہی اس کو پتھر ماریں، گالیاں دیں، گھر سے بے گھر کر دیں، غریب الوطنی میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑیں، اور ان سب باتوں پر بھی وہ ان کا بھلا چاہنے سے باز نہ آئے۔

پھر دیکھو! کیا کوئی جھوٹا شخص کسی بے اصل بات کے پیچھے ایسی مصیبتیں برداشت کرسکتا ہے؟ کیا کوئی تیر تکے لگانے والا شخص محض گمان اور قیاس سے کوئی بات کہہ کر اس پر اتنا جم سکتا ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ اس پر ٹوٹ جائیں، زمین اس پر تنگ کر دی جاتے، تمام ملک اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو، بڑی بڑی فوجیں اس پر امنڈ امنڈ کر آئیں، مگر وہ اپنی بات سے یک سر مو ہٹنے پر آمادہ نہ ہو؟ یہ استقامت، یہ عزم، یہ ثبات، خود گواہی دے رہا ہے کہ اس کو اپنی صداقت پر یقین تھا۔ اگر اس کے دل میں شک و شبہ کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو وہ مسلسل ۱۳ سال تک مصائب کے ان پے درپے طوفانوں کے مقابلہ میں کبھی نہ ٹھیر سکتا۔

یہ تو اس کے انقلابِ حال کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔

انقلابِ حال کا دُوسرا پہلو

چالیس برس کی عمر تک وہ ایک عرب تھا، عام عربوں کی طرح۔ اس دوران میں کسی نے اس سوداگر کو ایک جادو بیان مقرر کی حیثیت سے نہ جانا۔ کسی نے اس کو الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق اور قانون اور سیاسیات اور معاشیات اور عمرانیات کے مسائل پر بحث کرتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس سے خدا اور ملائکہ اور آسمانی کتابوں اور پچھلے انبیاء اور امم قدیمہ اور قیامت اور حیات بعد الموت اور دوزخ اور جنت کے متعلق ایک لفظ بھی نہ سنا۔ وہ پاکیزہ اخلاق، شائستہ اطوار اور بہترین سیرت و کردار تو ضرور رکھتا تھا، مگر چالیس برس کی عمر تک پہنچنے تک اس کی ذات میں کوئی بھی غیر معمولی بات نہ پائی گئی جس سے لوگ متوقع ہوتے کہ یہ شخص آپ کچھ بننے والا ہے۔ اس وقت تک جاننے والے اس کو محض ایک خاموش، امن پسند اور نہایت شریف انسان کی حیثیت سے جانتے تھے۔ مگر چالیس برس کے بعد جب وہ اپنے غار سے ایک نیا پیغام لے کر نکلا تو یک لخت اس کی کایا ہی پلٹی ہوئی تھی۔

اب وہ ایک حیرت انگیز کلام سنا رہا تھا جس کو سن کر سارا عرب مبہوت ہو گیا۔ اس کلام کی شدتِ تاثیر کا یہ حال تھا کہ اس کے سخت سے سخت دشمن بھی اس کو سنتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں یہ دل میں اتر نہ جائے۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان کا یہ عالم تھا کہ تمام قومِ عرب کو جس میں بڑے بڑے شاعر، خطیب اور زبان آوری کے مدعی موجود تھے، اس نے چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا کہ تم سب مل کر ایک ہی سورت اس کی مانند بنا لاؤ۔ مگر کوئی اس کے مقابلہ کی جرأت نہ کر سکا۔ ایسا بے مثل کلام کبھی عرب کے کانوں نے سنا ہی نہ تھا۔

اب یکایک وہ ایک بے مثل حکیم، ایک لاجواب مصلحِ اخلاق و تمدن، ایک حیرت انگیز ماہرِ سیاست، ایک زبردست مقنن، ایک اعلیٰ درجہ کا جج، ایک بے نظیر سپہ سالار بن کر ظاہر ہوا۔ اس نے، اس ان پڑھ صحرا نشین نے، حکمت اور دانائی کی وہ باتیں کہنی شروع کر دیں جو نہ اس سے پہلے کسی نے کہی تھیں، نہ کوئی اس کے بعد کہہ سکا۔ وہ اُمّی الٰہیات پر فیصلہ کن تقریریں کرنے لگا، تاریخِ اقوام سے عروج و زوالِ اُمم کے فلسفہ پر لیکچر دینے لگا، پرانے مصلحین کے کارناموں پر تبصرے اور مذاہبِ عالم پر تنقید اور اختلافاتِ اقوام کے فیصلے کرنے لگا۔ اخلاق اور تہذیب اور شائستگی کا درس دینے لگا۔

اس نے معاشرت اور معیشت اور اجتماعی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات کے متعلق قوانین بنانے شروع کر دیے اور ایسے قوانین بنائے کہ بڑے بڑے علما اور عقلا غور و خوض اور عمر بھر کے تجربات سے بمشکل ان کی حکمتوں کو سمجھ سکتے ہیں، اور دنیا کے تجربات جتنے بڑھتے جاتے ہیں، اُن کی حکمتیں اور زیادہ کھلتی جاتی ہیں۔

وہ خاموش پُرامن سوداگر جس نے کبھی تمام عمر تلوار نہ چلائی تھی، کبھی کوئی فوجی تربیت نہ پائی تھی، حتیٰ کہ جو عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ ایک لڑائی میں محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا، دیکھتے دیکھتے ایک بہادر سپاہی بن گیا جس کا قدم سخت سے سخت معرکوں میں بھی اپنے مقام سے ایک انچ نہ ہٹا۔ ایسا زبردست جنرل بن گیا جس نے ۹ سال کے اندر تمام ملکِ عرب کو فتح کر لیا۔ ایسا حیرت انگیز ملٹری لیڈر بن گیا کہ اس کی پیدا کی ہوئی فوجی تنظیم اور جنگی روح کے اثر سے بے سر و سامان عربوں نے چند سال میں دُنیا کی دو عظیم الشان فوجی طاقتوں کو اُلٹ کر رکھ دیا۔

وہ الگ تھلگ رہنے والا سکون پسند انسان جس کے اندر کسی نے چالیس برس تک سیاسی دلچسپی کی بُو تک نہ پائی تھی، یکایک اتنا زبردست ریفارمر اور مدبّر بن کر ظاہر ہوا کہ ۲۳ سال کے اندر اُس نے ۱۲ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہوئے ریگستان کے منتشر، جنگجو، جاہل، سرکش، غیر متمدن اور ہمیشہ آپس میں لڑنے والے قبائل کو ریل اور تار اور ریڈیو اور پریس کی مدد کے بغیر ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک قانون اور ایک نظامِ حکومت کا تابع بنا دیا۔ اُس نے اُن کے خیالات بدل دیے، ان کے اخلاق بدل دیے، اُن کی ناشائستگی کو اعلیٰ درجہ کی شائستگی میں، ان کی وحشیت کو بہترین مدنیت میں، ان کی بدکرداری اور بداخلاقی کو صلاح و تقویٰ اور مکارمِ اخلاق میں، اُن کی سرکشی اور انارکی کو انتہا درجہ کی پابندیٔ قانون اور اطاعتِ امر میں تبدیل کر دیا۔ اُس بانجھ قوم کو جس کی گود میں صدیوں سے کوئی ایک بھی قابلِ ذکر انسان پیدا نہ ہوا تھا، اُس نے ایسا مردم خیز بنا دیا کہ اس میں ہزار در ہزار اعاظمِ رجال اُٹھ کھڑے ہوئے اور دُنیا کو دین اور اخلاق اور تہذیب کا درس دینے کے لیے چار دانگِ عالم میں پھیل گئے۔

اخلاقی طریقِ کار

اور یہ کام اُس نے ظلم اور جبر اور دغا اور فریب سے انجام نہیں دیا، بلکہ دل موہ لینے والے اخلاق اور دلوں کو مسخّر

کر لینے والی شرافت اور دماغوں پر قبضہ کر لینے والی تعمیر سے انجام دیا۔ اس نے اپنے اخلاق سے دشمنوں کو دوست بنایا۔ رحم و شفقت سے دلوں کو موم کیا۔ عدل و انصاف سے حکومت کی۔ حق اور صداقت سے کبھی یک سرِ مو انحراف نہ کیا۔ جنگ میں بھی کسی سے بدعہدی اور دغا نہ کی۔ اپنے بدترین دشمنوں پر بھی ظلم نہ کیا۔ جو اس کے خون کے پیاسے تھے جنہوں نے اس کو پتھر مارے تھے۔ اس کو وطن سے نکالا تھا، اس کے خلاف سارے عرب کو کھڑا کیا تھا حتیٰ کہ جنہوں نے جوشِ عداوت میں اس کے چچا کا کلیجہ تک نکال کر چبا ڈالا تھا، ان کو بھی اس نے فتح پا کر بخش دیا۔ اپنی ذات کے لیے کبھی اس نے کسی سے بدلہ نہ لیا

ان سب باتوں کے ساتھ اس کے ضبطِ نفس، بلکہ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ تمام ملک کا بادشاہ ہو گیا اس وقت بھی وہ جیسا فقیر پہلے تھا ویسا ہی فقیر رہا۔ پھوس کے چھپر میں رہتا تھا۔ بوریے پر سوتا تھا۔ موٹا جھوٹا پہنتا تھا۔ غریبوں کی سی غذا کھاتا تھا فاقے تک کر گزرتا تھا۔ رات رات بھر اپنے خدا کی عبادت میں کھڑا رہتا تھا۔ غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت کرتا تھا۔ ایک مزدور کی طرح اسے کام کرنے میں تامل نہ تھا۔ آخر وقت تک اس کے اندر شاہانہ تمکنت اور امیرانہ نخوت اور بڑے آدمیوں کے سے تکبر کی ذرا سی بو بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ ایک عام آدمی کی طرح لوگوں سے ملتا جلتا تھا۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ عوام کے درمیان اس طرح بیٹھتا تھا کہ اجنبی آدمی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ اس محفل میں قوم کا سردار، ملک کا بادشاہ کون ہے۔ اتنا بڑا آدمی ہونے کے باوجود چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا تھا گویا وہ بھی اسی جیسا انسان ہے۔ تمام عمر کی جدوجہد کے بعد اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اپنا پورا ترکہ اپنی قوم پر وقف کر دیا۔ اپنے پیروؤں پر اس نے اپنے یا اپنی اولاد کے کچھ بھی حقوق قائم نہ کیے، حتیٰ کہ اپنی اولاد کو زکوٰۃ لینے کے حق سے بھی محروم کر دیا محض اس خوف سے کہ آگے چل کر اس کے پیرو اس کی اولاد ہی کو ساری زکوٰۃ نہ دینے لگیں۔

دورِ جدید کا بانی

ابھی اس عظیم الشان آدمی کے کمالات کی فہرست ختم نہیں ہوئی۔ اس کے مرتبہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے آپ کو تاریخِ عالم پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ آپ دیکھیں گے کہ صحرائے عرب کا یہ ان پڑھ بادیہ نشین، جو چودہ سو برس پہلے اس تاریک دور میں پیدا ہوا تھا، دراصل دورِ جدید کا بانی اور تمام دنیا کا لیڈر ہے۔ وہ صرف انہی کا لیڈر نہیں جو اس کو لیڈر مانتے ہیں بلکہ ان کا بھی لیڈر ہے جو اسے نہیں مانتے۔ ان کو اس امر کا احساس تک نہیں ہے کہ جس کے خلاف وہ زبان کھولتے ہیں اس کی رہنمائی کس طرح ان کے خیالات میں، ان کے اصولِ حیات اور قوانینِ عمل میں اور ان کے عصرِ جدید کی روح میں پیوست ہو گئی ہے۔

یہی شخص ہے جس نے دنیا کے تصورات کا رخ وہمیت اور عجائب پرستی اور رہبانیت کی طرف سے ہٹا کر

عقلیت اور حقیقت پسندی اور متّقیانہ دنیا داری کی طرف پھیر دیا۔ اس نے محسوس معجزے مانگنے والی دنیا میں عقلی معجزوں کو سمجھنے اور انہی کو معیار صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔ اُس نے خرقِ عادت میں خدا کی خدائی کے آثار ڈھونڈنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور انہیں آثارِ فطرت (Natural Phenomena) میں خدا کی نشانیاں دیکھنے کا خوگر بنایا۔ اُس نے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو قیاس آرائی (Speculation) سے ہٹا کر تعقّل اور تفکّر، مشاہدہ اور تحقیق کے راستہ پر لگایا۔ اُس نے عقل اور حِس کے امتیازی حدود انسان کو بتائے۔ مادّیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی۔ دین سے علم و عمل کا اور علم و عمل سے دین کا ربط قائم کیا۔ مذہب کی طاقت سے دنیا میں سائنٹفک اسپرٹ اور سائنٹفک اسپرٹ سے صحیح مذہبیت پیدا کی۔ اُس نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا اور علم کی طاقت سے توحید کا اعتقاد ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا کہ مشرکوں اور بُت پرستوں کے مذہب بھی وحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اُس نے اخلاق اور روحانیت کے بنیادی تصوّرات کو بدلا۔ جو لوگ ترکِ دُنیا اور نفس کُشی کو عین اخلاق سمجھتے تھے، جن کے نزدیک نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے اور دنیاوی زندگی کے معاملات میں حصہ لینے سے روحانی ترقی اور نجات ممکن ہی نہ تھی، ان کو اُسی نے تمدّن اور سماج اور دنیوی عمل کے اندر فضیلتِ اخلاق، ارتقائے رُوحانی اور حصولِ نجات کا راستہ دکھایا۔ پھر وہی ہے جس نے انسان کو اُس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ جو لوگ بھگوان اور اوتار اور ابن اللہ کے سوا کسی کو ہادی اور رہنما تسلیم کرنے کو تیار ہی نہ تھے، ان کو اُسی نے بتایا کہ انسان اور تمہارے ہی جیسا انسان آسمانی بادشاہت کا نمائندہ اور خداوندِ عالم کا خلیفہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ ہر طاقتور انسان کو اپنا خدا بنا لیتے تھے۔ اُن کو اُسی نے سمجھایا کہ انسان محض انسان ہے اور کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص تقدّس اور حکمرانی اور آقائی کا پیدائشی حق لے کر آیا ہے، اور نہ کسی پر ناپاکی اور محکومیت اور غلامی کا پیدائشی داغ لگا ہوا ہے۔ اسی تعلیم نے دنیا میں وحدتِ انسانی اور مساوات اور جمہوریّت اور آزادی کے تخیلات پیدا کیے ہیں۔

تصوّرات سے آگے بڑھیے۔ آپ کو اُس اُمّی کی لیڈرشپ کے عملی نتائج دنیا کے قوانین اور طریقوں اور معاملات میں اِس کثرت سے نظر آئیں گے کہ ان کا شمار مشکل ہو جائے گا۔ اخلاق اور تہذیب، شائستگی اور طہارت و نظافت کے کتنے ہی اصُول ہیں جو اس کی تعلیم سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ معاشرت کے جو قوانین اس نے بنائے تھے دُنیا نے کس قدر اُن کی خوشہ چینی کی، اور اب تک کیے جا رہی ہے۔ معاشیات کے جو اصول اس نے سکھائے تھے، اُن سے دنیا میں کتنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور اب تک پیدا ہوتے جا رہی ہیں۔ حکومت کے جو طریقے اس نے اختیار کیے تھے، اُن سے دنیا کے سیاسی نظریات میں کتنے انقلاب برپا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ عدل اور قانون کے جو اصُول اُس نے وضع کیے تھے، انھوں نے دنیا کے عدالتی نظامات اور قانونی افکار کو کس قدر متاثر کیا اور اب

تک ان کی تاثیر خاموشی سے جاری ہے۔ جنگ اور صلح اور بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب جس شخص نے عملاً دنیا میں قائم کی وہ دراصل یہی عرب کا اُمّی ہے۔ ورنہ پہلے دنیا اس سے نا واقف تھی کہ جنگ کی بھی کوئی تہذیب ہو سکتی ہے، اور مختلف قوموں میں مشترک انسانیت کی بنیاد پر بھی معاملات ہونے ممکن ہیں۔

جامع کمالات شخصیت

انسانی تاریخ کے منظر میں اس حیرت انگیز انسان کی بلند و بالا شخصیت اتنی اُبھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک کے بڑے سے بڑے تاریخی انسان جن کو دنیا اکابر (Heroes) میں شمار کرتی ہے جب اُس کے مقابلے میں لائے جاتے ہیں تو اس کے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے اکابر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے کمال کی چمک دمک انسانی زندگی کے ایک دو شعبوں سے آگے بڑھ سکی ہو۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے، مگر عملی قوت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل کا پُتلا ہے، مگر فکر میں کمزور ہے۔ کسی کے کمالات سیاسی تدبیر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہانت کا مظہر ہے۔ کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے ایک پہلو پر اتنی زیادہ گہری جمی ہے کہ دوسرے پہلو اوجھل ہو گئے۔ کسی نے اخلاق اور روحانیت کو لیا تو معیشت و سیاست کو بھلا دیا۔ کسی نے معیشت و سیاست کو لیا تو اخلاق و روحانیت کو نظر انداز کر دیا۔ غرض تاریخ میں ہر طرف یک رُخے ہیرو ہی نظر آتے ہیں۔ مگر تنہا یہی ایک شخصیت ایسی ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔ وہ خود ہی فلسفی اور حکیم بھی ہے اور خود ہی اپنے فلسفہ کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والا بھی۔ وہ سیاسی مدبّر بھی ہے، فوجی لیڈر بھی ہے، واضع قانون بھی ہے، معلّم اخلاق بھی ہے، مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے۔ اس کی نظر انسان کی پوری زندگی پر پھیلتی ہے اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک جاتی ہے۔ کھانے اور پینے کے آداب اور جسم کی صفائی کے طریقوں سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک ایک ایک چیز کے متعلق وہ احکام اور ہدایات دیتا ہے۔ اپنے نظریات کے مطابق ایک تہذیب (Civilization) وجود میں لا کر دکھا دیتا ہے۔ اور زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں میں ایسا صحیح توازن (Equilibrium) قائم کرتا ہے کہ افراط و تفریط کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ کیا اس جامعیت کا کوئی دوسرا شخص تمہاری نظر میں ہے۔

ماحول سے مافوق ہستی

دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو کم و بیش اپنے ماحول کی پیدا کردہ نہ ہو۔ مگر اس شخص کی شان سب سے نرالی ہے۔ اس کے بنانے میں اس کے ماحول کا کوئی حصّہ نظر نہیں آتا اور نہ کسی دلیل سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عرب کا ماحول اس وقت تاریخی طور پر ایسے ایک انسان کی پیدائش کا مقتضی تھا۔ بہت کھینچ تان کر تم جو کچھ کہہ سکتے ہو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ تاریخی اسباب عرب میں ایک ایسے لیڈر کے ظہور کا

تقاضا کر رہے تھے، جو قبائلی انتشار کو مٹا کر ایک قوم بناتا، اور ممالک کو فتح کر کے عربوں کی معاشی فلاح و بہبود کا سامان کرتا ... یعنی ایک نیشنلسٹ لیڈر، جو اُس وقت کی تمام عربی خصوصیات کا حامل ہوتا ظلم، بے رحمی، خون ریزی اور مکر و دغا، غرض ہر ممکن تدبیر سے اپنی قوم کو خوش حال بناتا، اور ایک سلطنت پیدا کر کے اپنے پسماندوں کے لیے چھوڑ جاتا۔ اس کے سوا اُس وقت کی عربی تاریخ کا کوئی تقاضا تم ثابت نہیں کر سکتے۔ ہیگل کے فلسفہ تاریخ یا مارکس کی مادی تعبیر تاریخ کے نقطۂ نظر سے تم حد سے حد یہی حکم لگا سکتے ہو کہ اس ماحول میں ایک قوم اور سلطنت بنانے والا ظاہر ہونا چاہیے تھا یا ظاہر ہو سکتا تھا مگر ہیگلی یا مارکسی فلسفہ اس واقعہ کی توجیہ کیوں کر کرے گا کہ اُس وقت اس ماحول میں ایسا شخص پیدا ہوا جو بہترین اخلاق سکھانے والا اور انسانیت کو سنوارنے اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا، اور جاہلیت کے اوہام و تعصبات کو مٹانے والا تھا جس کی نظر قوم اور نسل اور ملک کی حدیں توڑ کر پوری انسانیت پر پھیل گئی جس نے اپنی قوم کے لیے نہیں بلکہ عالم انسانی کے لیے ایک اخلاقی و روحانی اور تمدنی و سیاسی نظام کی بنا ڈالی جس نے معاشی معاملات اور سیاست مدن اور بین الاقوامی تعلقات کو عالم خیال میں نہیں بلکہ عالم واقعہ میں اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے دکھا دیا اور روحانیت اور مادیت کی ایسی معتدل اور متوازن آمیزش کی جو آج بھی حکمت و دانائی کا ویسا ہی شاہکار ہے جیسا اُس وقت تھا؟ کیا ایسے شخص کو تم عرب جاہلیت کے ماحول کی پیداوار کہہ سکتے ہو؟

تاریخ ساز شخصیت

یہی نہیں کہ وہ شخص اپنے ماحول کی پیداوار نظر نہیں آتا بلکہ جب ہم اس کے کارنامے پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اس کی نظر وقت اور حالات کی بندشوں کو توڑتی ہوئی صدیوں اور ہزاروں (Millenniums) کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ وہ انسان کو ہر زمانے اور ہر ماحول میں دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کے لیے ایسی اخلاقی و عملی ہدایات دیتا ہے جو ہر حال میں یکساں مناسبت کے ساتھ ٹھیک بیٹھتی ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جن کو تاریخ نے پرانا کر دیا ہے، جن کی تعریف ہم صرف اس حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ اپنے زمانے کے اچھے رہنما تھے۔ سب سے الگ اور سب سے ممتاز، وہ انسانیت کا ایسا رہنما ہے جو تاریخ کے ساتھ حرکت (March) کرتا ہے اور ہر دور میں ویسا ہی جدید (Modern) نظر آتا ہے جیسا اس سے پہلے دَور کے لیے تھا۔

تم جن لوگوں کو فیاضی کے ساتھ "تاریخ بنانے والے" (Makers of History) کا لقب دیتے ہو وہ حقیقت میں تاریخ کے بنائے ہوئے (Creatures of History) ہیں۔ دراصل "تاریخ بنانے والا" پوری انسانی تاریخ میں صرف یہی ایک شخص ہے۔ دنیا کے جتنے لیڈروں نے تاریخ میں انقلاب برپا کیے ہیں ان کے حالات پر تحقیقی نگاہ ڈالو تو دیکھو گے کہ اس موقع پر پہلے سے انقلاب کے اسباب پیدا ہو رہے تھے اور وہ اسباب خود ہی اُس

انقلاب کا رُخ اور راستہ بھی متعین کر رہے تھے جن کے پیدا ہونے کے وہ متقضی تھے۔ انقلابی لیڈر نے صرف اتنا کیا کہ حالات کے اقتضاء کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے اس ایکٹر کا پارٹ ادا کر دیا جس کے لیے سٹیج اور کام دونوں پہلے سے متعین ہوں۔ مگر تاریخ بنانے والوں یا انقلاب برپا کرنے والوں کی پوری جماعت میں یہ اکیلا ایسا شخص ہے کہ جہاں انقلاب کے اسباب موجود نہ تھے وہاں اس نے خود اسباب کو پیدا کیا۔ جہاں انقلاب کا مواد موجود نہ تھا وہاں اس کا مواد خود تیار کیا۔ جہاں اس انقلاب کی اسپرٹ اور عملی استعداد لوگوں میں نہ پائی جاتی تھی وہاں اس نے خود اپنے مطلب کے آدمی تیار کیے۔ اپنی زبردست شخصیت کو پگھلا کر ہزارہا انسانوں کے قالب میں اُتار دیا اور ان کو ویسا بنایا جیسا وہ بنانا چاہتا تھا۔ اُس کی طاقت اور قوتِ ارادی نے خود ہی انقلاب کا سامان کیا، خود ہی اس کی صورت اور نوعیت معین کی، اور خود ہی اپنے ارادے کے زور سے حالات کی رفتار کو موڑ کر اُس راستے پر چلایا جس پر وہ اُسے چلانا چاہتا تھا۔ اس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبے کا انقلاب انگیز تم کو اور کہاں نظر آتا ہے؟

اس کی کمال درجہ راستبازی

آیئے اب اس سوال پر غور کیجیے کہ ۱۴ سو برس پہلے کی تاریک دنیا میں، عرب جیسے تاریک تر ملک کے ایک گوشہ میں ایک گلّہ بانی اور سوداگری کرنے والے اَن پڑھ بادیہ نشین کے اندر یکایک اتنا علم، اتنی روشنی، اتنی طاقت، اتنے کمالات، اتنی زبردست تربیت یافتہ قوتیں پیدا ہو جانے کا کونسا ذریعہ تھا؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ سب اس کے اپنے دل و دماغ کی پیداوار تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اسی کے دل و دماغ کی پیداوار تھی تو اس کو نبوت کا نہیں خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر وہ ایسا دعویٰ کرتا تو وہ دنیا جس نے رام کو خدا بنا لیا جس نے کرشن کو بھگوان قرار دینے میں تامل نہ کیا جس نے بُدھ کو خود بخود معبود بنا لیا جس نے مسیح کو آپ اپنی مرضی سے ابن اللہ مان لیا، جس نے آگ اور پانی اور ہوا تک کو پوج ڈالا، وہ ایسے زبردست باکمال شخص کو خدا مان لینے سے کبھی انکار نہ کرتی۔ مگر دیکھو وہ خود کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے کمالات میں سے کسی ایک کا کریڈٹ بھی خود نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ میں ایک انسان ہوں تم ہی جیسا انسان۔ میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں، سب کچھ خدا کا ہے اور خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ کلام جس کی نظیر لانے سے تمام نوعِ انسانی عاجز ہے، میرا کلام نہیں ہے، میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے، لفظ بلفظ خدا کی طرف سے میرے پاس آیا ہے اور اس کی تعریف خدا ہی کے لیے ہے۔ یہ کارنامے جو میں نے دکھائے، یہ قوانین جو میں نے وضع کیے، یہ اصول جو میں نے تمہیں سکھائے، ان میں سے کوئی چیز بھی میں نے خود نہیں گھڑی ہے۔ میں کچھ بھی اپنی ذاتی قابلیت سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ ہر ہر چیز میں خدا کی رہنمائی کا محتاج ہوں۔ اُدھر سے جو اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں۔

دیکھو یہ کیسی حیرت انگیز صداقت ہے، کیسی امانت اور راستبازی ہے۔ جھوٹا انسان تو بڑا بننے کے لیے

دوسروں کے ایسے کمالات کا کریڈٹ بھی لے لینے میں تأمل نہیں کرتا جن کے اصل ماخذ کا پتہ بآسانی چل جاتا ہے۔
لیکن یہ شخص اُن کمالات کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا جن کو اگر وہ اپنے کمالات کہتا تو کوئی اس کو جھٹلا نہ سکتا
تھا کیونکہ کسی کے پاس ان کے اصلی ماخذ تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ سچائی کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی دلیل
اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس شخص سے زیادہ سچا اور کون ہوگا جس کو ایک نہایت مخفی ذریعہ سے ایسے بے نظیر کمالات
حاصل ہوں اور وہ بلا تکلف اپنے اصلی ماخذ کا حوالہ دے دے؟ بتاؤ کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق
نہ کریں؟

فصل ۳

نبوّتِ محمدیؐ پر قرآن میں استدلال

(چند اہم نکات[1])

قرآن کہتا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ط (العنکبوت: ۴۸-۴۹)	اے نبیؐ! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے۔

اس آیت میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے آپ کے اہلِ وطن اور رشتہ برادری کے لوگ جن کے درمیان روزِ پیدائش سے سنِ کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔

اُمّی ہونے سے نبوت پر استدلال

اس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات انبیاءِ سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل

---

[1] قرآن میں نبوتِ محمدیؐ پر بحث و استدلال کا سلسلہ اتنا وسیع ہے کہ اس کو اس کتاب کے ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ پھر قرآنی استدلال کی جو توضیحات مولانا مودودی نے کی ہیں، ان سب کو یکجا کیا جائے تو یہ مضمون خود ایک کتاب بن جائے گا۔ یہیں چند اہم نکات کے متعلق مولانا کی مختصر بحثیں یہاں درج کی جا رہی ہیں۔ (مرتب)

پرشیں یہ بیع اور گہرے علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے کبھی اسے کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا

---

[1] قرآن مجید کے اس بیان و استدلال کے بعد اُن لوگوں کی عبارت حیرت انگیز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ بیانِ قرآن صاف الفاظ میں حضورؐ کے ناخواندہ ہونے کو آپؐ کی نبوت کے حق میں ایک طاقتور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے جن روایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضورؐ سے لکھتے تھے، یا بعد میں آپؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا وہ اوّل تو پہلی ہی نظر میں رد کر دینے کے لائق ہیں کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی پھر وہ بجائے خود بھی اتنی کمزور ہیں کہ ان پر کسی استدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک بخاری کی یہ روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ جب لکھا جا رہا تھا تو کفارِ مکہ کے نمائندے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضورؐ نے کاتب (یعنی حضرت علیؓ) کو حکم دیا کہ اچھا رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر محمدؐ بن عبداللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے لفظ رسول اللہ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضورؐ نے ان کے ہاتھ سے لے کر وہ الفاظ خود کاٹ دیئے اور محمدؐ بن عبداللہ لکھ دیا۔

لیکن یہ روایت براء بن عازب سے بخاری میں چار جگہ اور مسلم میں دو جگہ وارد ہوئی ہے اور ہر جگہ الفاظ مختلف ہیں:

(۱) بخاری کتاب الصلح میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: قال لعلی امح رسول الله فقال علیؓ ما انا بالذی امحاه فمحاه رسول الله بیده۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا یہ الفاظ کاٹ دو۔ انہوں نے عرض کیا میں تو نہیں کاٹ سکتا۔ آخر کار حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے انہیں کاٹ دیا۔

(۲) اسی کتاب میں دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ثم قال لعلی امح رسول الله قال لا والله لا امحوك ابدًا فاخذ رسول الله الکتاب فکتب هذا ما قاضی علیه محمد بن عبد الله۔ پھر علیؓ سے کہا "رسول اللہ" کاٹ دو۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم میں آپ کا نام کبھی نہ کاٹوں گا۔ آخر حضورؐ نے تحریر لے کر لکھا یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبداللہ نے طے کیا۔

(۳) تیسری روایت انہی براء بن عازب سے بخاری کتاب الجزیہ میں یہ ہے: وکان لا یکتب فقال لعلیؓ امح رسول الله فقال علیؓ والله لا امحاه ابدًا قال فارنیه قال فاراه ایاه فمحاه النبی صلی الله علیه وسلم بیده۔ حضورؐ خود نہ لکھ سکتے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا رسول اللہ کاٹ دو۔ انہوں نے عرض کیا خدا کی قسم میں یہ الفاظ ہرگز نہ کاٹوں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ انہوں نے آپؐ کو جگہ بتائی اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے وہ الفاظ کاٹ دیئے۔

(۴) چوتھی روایت بخاری کتاب المغازی میں یہ ہے فاخذ رسول الله صلی الله علیه وسلم الکتاب ولیس

ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل

یحسن یکتب فکتب ھٰذا ما قاضیٰ محمد بن عبد اللہ۔ پس حضورؐ نے وہ تحریر لے لی اور آنحالیکہ آپؐ لکھنا نہ جانتے تھے اور آپؐ نے لکھا "یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبداللہ نے طے کیا۔"

(۵) انہی براءؓ بن عازب سے مسلم کتاب الجہاد میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے انکار کرنے پر حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے "رسول اللہ" کے الفاظ مٹا دیئے۔

(۶) دوسری روایت اسی کتاب میں ان سے یہ منقول ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا مجھے بتاؤ رسول اللہ کا لفظ کہاں ہے، حضرت علیؓ نے آپ کو جگہ بتائی، اور آپؐ نے اسے مٹا کر ابن عبداللہ لکھ دیا۔

روایات کا یہ اضطراب صاف بتا رہا ہے کہ بیچ کے راویوں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے الفاظ جوں کے توں نقل نہیں کیے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی ایک کی نقل پر بھی ایسا مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ یقینی طور پر یہ کہا جا سکے کہ حضورؐ نے "محمدؐ بن عبداللہ" کے الفاظ اپنے دست مبارک ہی سے لکھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ صحیح صورت واقعہ یہ ہو کہ جب حضرت علیؓ نے "رسول اللہ" کا لفظ مٹانے سے انکار کیا تو آپؐ نے اس کی جگہ ان سے پوچھ کر یہ لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا دیا ہو اور پھر ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے "ابن عبداللہ" کے الفاظ لکھوا دیئے ہوں۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صلح نامہ دو کاتب لکھ رہے تھے۔ ایک حضرت علیؓ، دوسرے محمد بن مسلمہ (فتح الباری، جلد ۵، ص ۲۱۷)۔ اس لیے یہ امر بعید نہیں ہے کہ جو کام ایک کاتب نے نہ کیا تھا وہ دوسرے کاتب سے لے لیا گیا ہو۔

دوسری روایت جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواندہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے مجاہد سے ابن ابی شیبہ اور عمر بن شبہ نے نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتٰی کتب وقرأ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے)۔ لیکن اوّل تو یہ سنداً بہت ضعیف روایت ہے، جیسا کہ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں فضعیف لا اصل لہ۔ دوسرے اس کی کمزوری یوں بھی واضح ہے کہ اگر حضورؐ نے فی الواقع بعد میں پڑھنا لکھنا سیکھا ہوتا تو یہ بات مشہور ہو جاتی، بہت سے صحابہ اس کو روایت کرتے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ حضورؐ نے کس شخص یا کن اشخاص سے یہ تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن سوائے ایک عون بن عبداللہ کے جن سے مجاہد نے یہ بات سُنی، اور کوئی شخص اسے روایت نہیں کرتا۔ اور یہ عون بھی صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں جنہوں نے قطعاً یہ نہیں بتایا کہ انہیں کس صحابی یا کن صحابیوں سے اس واقعہ کا علم ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمزور روایتوں کی بنیاد پر کوئی ایسی بات قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی جو مشہور و معروف واقعات کی تردید کرتی ہو۔

کیا گیا ہے۔ لیکن اُس کی اُمیّت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص ہٹ دھرمی کے سوا اس کی نبوت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجہ میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔[1]

ایک اُمّی کا قرآن جیسی کتاب پیش کرنا اور یکایک اُن غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کے لیے کسی سابقہ تیاری کے آثار کبھی کسی کے مشاہدے میں نہیں آئے تھے، یہی دانش و بینش رکھنے والوں کی نگاہ میں اس کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن ترین نشانیاں ہیں۔[2] دنیا کی تاریخی ہستیوں میں سے جس کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے، آدمی اس کے اپنے ماحول میں اُن اسباب کا پتہ چلا سکتا ہے جو اس کی شخصیت بنانے اور اس سے ظاہر ہونے والے کمالات کے پیدا کرنے میں کارفرما تھے۔ اُس کے ماحول اور اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ایک کھلی مناسبت پائی جاتی ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت جن حیرت انگیز کمالات کی مظہر تھی اُن کا کوئی ماخذ آپ کے ماحول میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں نہ اس وقت کے عربی معاشرے میں، اور نہ گردوپیش کے ان ممالک میں جن سے عرب کے تعلقات تھے اُن کے معاشرے میں کہیں دور دراز سے بھی وہ عناصر ڈھونڈ کر نہیں نکالے جا سکتے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے کوئی مناسبت رکھتے ہوں۔ یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر یہاں فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک نشانی نہیں بلکہ بہت سی روشن نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ جاہل آدمی کو اس میں کوئی نشانی نظر آتی ہو تو نہ آتی ہو، مگر جو لوگ علم رکھنے والے ہیں وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں قائل ہو گئے ہیں کہ یہ شان ایک پیغمبر ہی کی ہو سکتی ہے۔[3]

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے؟ کہو نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر۔ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس

---

[1] "نبوت محمدی کا عقلی ثبوت" میں بھی یہ استدلال شامل ہے مگر وہاں قرآنی استدلال کو سامنے لائے بغیر ایک حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ (مرتب)

[2] اس موقع پر قرآن اُن معترضین کو بھی جواب دے رہا ہے جو حضورؐ کی نبوت کو تسلیم کرنے کی شرط کے طور پر محیر العقول نشانی یعنی معجزہ طلب کرتے تھے۔ (مرتب)

(العنکبوت : ۵۰-۵۱)، میں رحمت ہے اور نصیحت اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"

یعنی اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا کیا یہ بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمہاری رسالت پر یقین لانے کے لیے یہ کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنہوں نے دیکھے ان کے لیے وہ معجزے تھے مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمہارے سامنے ہے، تمہیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔

نبوت سے پہلے کی زندگی سے استشہاد

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ "آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تم لوگوں کے درمیان گزار چکا ہوں" (یونس - ۱۶)

یہ ایک زبردست دلیل ہے مشرکین قریش کے اس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر دُور کی چیز تھے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو ان کے سامنے کی چیز تھی۔ آپ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے آپ کا بچپن گزرا، جوان ہوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق اُنہی کے ساتھ تھا اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو اُن سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔ آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنہیں مکہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا۔

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے اور اُن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے، جو اب قرآن کی ان پے درپے سورتوں میں زیر بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی باتوں اور آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو جو آپ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خارج سے آپ کے اندر آئی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی

عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقاء کے واضح نشانات اس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپؐ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کار انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمدؐ کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ مکہ تو درکنار پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے؟

دوسری بات جو آپؐ کی سابق زندگی میں نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپؐ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں آپؐ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اسے ہوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپؐ سے سابقہ پیش آیا تھا وہ آپؐ کو ایک نہایت سچے، بے داغ اور قابل اعتماد (امین) انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ نبوت سے پانچ ہی سال پہلے تعمیر کعبہ کے سلسلہ میں وہ مشہور واقعہ پیش آچکا تھا جس میں حجر اسود کو نصب کرنے کے معاملہ پر قریش کے مختلف خاندان جھگڑ پڑے تھے اور آپس میں طے ہوا تھا کہ کل صبح پہلا شخص جو حرم میں داخل ہوگا اُسی کو پنچ مان لیا جائے گا۔ دوسرے روز وہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو وہاں داخل ہوئے۔ آپؐ کو دیکھتے ہی سب لوگ پکار اُٹھے ھٰذا الامین رضینا، ھٰذا محمد "یہ بالکل راست باز آدمی ہے، ہم اس پر راضی ہیں، یہ تو محمدؐ ہے"۔ اس طرح آپؐ کو نبی مقرر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پورے قبیلۂ قریش سے بھرے مجمع میں آپؐ کے "امین" ہونے کی شہادت لے چکا تھا۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ، جعل اور فریب سے کام نہ لیا تھا، وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل و فریب لے کر اٹھ کھڑا ہوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور و تحدی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ۔ (الشوریٰ:۵۲)	اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔

نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضور علیہ السلام کے ذہن میں یہ تصور تک نہ آیا تھا کہ آپؐ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے یا ملنی چاہیے، بلکہ آپؐ سرے سے کتب آسمانی اور ان کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اسی طرح آپؐ کو اللہ پر ایمان تو ضرور تھا مگر یہ نہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کتب الٰہی اور آخرت کے

متعلق بھی بہت سی باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفارِ مکہ سے بھی چھپی ہوئی نہ تھیں بلکہ منکرینِ وحی کا کوئی شخص اس پر شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اس نے نبوت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضور کی زبان سے کتابِ الٰہی کا تذکرہ سنا ہو یا آپ سے اس طرح کی کوئی بات سنی ہو کہ لوگوں کو فلاں فلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے سے خود نبی بن بیٹھنے کی تیاری کر رہا ہو تو اس کی یہ حالت کبھی نہیں ہو سکتی کہ چالیس سال تک اس کے ساتھ شب و روز کا میل جول رکھنے والے اس کی زبان سے کتاب اور ایمان کا لفظ تک نہ سنیں اور چالیس سال کے بعد یکایک وہ انہی موضوعات پر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے۔ یکلخت

وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ۔ (القصص۔ ۸۶)	تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی، یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے (تم پر) نازل ہوئی ہے، پس تم کافروں کے مددگار نہ بنو۔

یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی جا رہی ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام بالکل بے خبر تھے کہ انہیں نبی بنایا جانے والا ہے اور ایک عظیم الشان مشن پر وہ مامور کیے جانے والے ہیں، اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی اس کا ارادہ یا خواہش تو درکنار اس کی توقع تک کبھی نہ گزری تھی بس یکایک راہ چلتے انہیں کھینچ بلایا گیا اور نبی بنا کر وہ حیرت انگیز کام ان سے لیا گیا جو ان کی سابق زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا ٹھیک ایسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا مکہ کے لوگ خود جانتے تھے کہ غارِ حرا سے جس روز آپ نبوت کا پیغام لے کر اترے اس سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی کیا تھی، آپ کے مشاغل کیا تھے، آپ کی بات چیت کیا تھی، آپ کی گفتگو کے موضوعات کیا تھے، آپ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں یہ پوری زندگی صداقت، دیانت، امانت اور پاکبازی سے لبریز ضرور تھی۔ اس میں انتہائی شرافت، امن پسندی، پاسِ عہد، اداۓ حقوق اور خدمتِ خلق کا رنگ بھی غیر معمولی شان کے ساتھ نمایاں تھا۔ مگر اس میں کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال گزر سکتا ہو کہ یہ نیک بندہ کل نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھنے والا ہے۔ آپ سے قریب ترین ربط ضبط رکھنے والوں میں، آپ کے رشتہ داروں اور ہمسایوں اور دوستوں میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپ پہلے سے نبی بننے کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے اُن مضامین اور مسائل اور موضوعات کے متعلق کبھی ایک لفظ تک آپ کی زبان سے نہ سنا تھا جو غارِ حرا کی اُس انقلابی ساعت کے بعد یکایک آپ کی زبان پر جاری ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے آپ کو یہ مخصوص زبان اور یہ الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتے نہ سنا تھا جو اچانک قرآن کی صورت میں لوگ آپ سے سننے لگے۔ کبھی آپ وعظ کہنے کھڑے نہ ہوئے تھے۔

کبھی کوئی دعوت اور تحریک لے کر نہ اُٹھے تھے۔ بلکہ کبھی آپؐ کی کسی سرگرمی سے یہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ آپؐ اجتماعی مسائل کے حل، یا مذہبی اصلاح یا اخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کام شروع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اِس انقلابی ساعت سے ایک دن پہلے تک آپؐ کی زندگی ایک ایسے تاجر کی زندگی نظر آتی تھی جو سیدھے سادھے جائز طریقوں سے اپنی روزی کماتا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا ہے، مہمانوں کی تواضع، غریبوں کی مدد اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرتا ہے، اور کبھی کبھی عبادت کے لیے خلوت میں جا بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کا یکایک ایک عالمگیر زلزلہ ڈال دینے والی خطابت کے ساتھ اٹھنا، ایک انقلاب انگیز دعوت شروع کر دینا، ایک نرالا لٹریچر پیدا کر دینا، ایک مستقل فلسفۂ حیات اور نظامِ فکر و اخلاق و تمدن لے کر سامنے آ جانا، اتنا بڑا تغیّر ہے جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے کسی بناوٹ اور تیاری اور ارادی کوشش کے نتیجے میں قطعاً رُونما نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ایسی ہر کوشش اور تیاری بہرحال تدریجی ارتقاء کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل اُن لوگوں سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتے جن کے درمیان آدمی شب۔ روز گزار رہا ہو۔ اگر آنحضرتؐ کی زندگی اِن مراحل سے گزری ہوتی تو مکہ میں سینکڑوں زبانیں یہ کہنے والی ہوتیں کہ ہم نہ کہتے تھے، یہ شخص ایک دن کوئی بڑا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کفّارِ مکہ نے آپؐ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر یہ اعتراض کرنے والا اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تھا۔

پھر یہ بات کہ آپؐ خود بھی نبوت کے خواہش مند، یا اس کے لیے متوقع اور منتظر نہ تھے، بلکہ پوری بے خبری کی حالت میں اچانک آپؐ کو اس معاملہ سے سابقہ پیش آگیا، اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے جو احادیث میں آغازِ وحی کی کیفیت کے متعلق منقول ہوا ہے۔ جبریلؑ سے پہلی ملاقات اور سورۂ علق کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد آپؐ غارِ حرا سے کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں۔ گھر والوں سے کہتے ہیں کہ "مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ"۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوتی ہے تو اپنی رفیقِ زندگی کو سارا ماجرا سنا کر کہتے ہیں کہ "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"۔ وہ فوراً جواب دیتی ہیں "ہرگز نہیں۔ آپؐ کو اللہ کبھی رنج میں نہ ڈالے گا۔ آپؐ تو قرابت داروں کے حق ادا کرتے ہیں۔ بے کس کو سہارا دیتے ہیں۔ بے زر کی دستگیری کرتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ ہر کارِ خیر میں مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں"۔ پھر وہ آپؐ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس جاتی ہیں جو ان کے چچا زاد بھائی اور اہلِ کتاب میں سے ایک ذی علم اور راستباز آدمی تھے۔ وہ آپؐ سے سارا واقعہ سننے کے بعد بلا تأمل کہتے ہیں کہ "یہ جو آپؐ کے پاس آیا ہے وہی ناموس (کارِ خاص پر مامور فرشتہ) ہے جو موسیٰؑ کے پاس آتا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا اور اُس وقت تک زندہ رہتا جب آپؐ کی قوم آپؐ کو نکال دے گی"۔ آپؐ پوچھتے ہیں "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" وہ جواب دیتے ہیں "ہاں، کوئی شخص ایسا نہیں گزرا کہ وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لاتے ہیں اور لوگ اس کے دشمن نہ ہو گئے ہوں"۔

یہ پُورا واقعہ اُس حالت کی تصویر کشی کر دیتا ہے جو بالکل فطری طور پر یکایک خلافِ توقع ایک انتہائی غیر معمولی تجربہ پیش آجانے سے کسی سیدھے سادھے انسان پر طاری ہو سکتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مراقبے کر کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے، تو غارِ حراء والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اُچھل پڑتے اور بڑے دم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اُتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھیرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غار کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے، مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی اُمیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے۔

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے؟ اگر ان کے تجربے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوتی کہ میاں نبوت کے امیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں، تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی۔ چلو، اب پیری کی دوکان چمکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں۔ لیکن وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپؐ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں اس کی بنا پر انہیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آسکتا، نہ اللہ اس کو کسی بُری آزمائش میں ڈال سکتا ہے، اس لئے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر حقیقت ہے۔

اور یہی معاملہ ورقہ بن نوفل کا بھی ہے۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضورؐ کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادرِ نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنّع سے ممیّز کر سکتے تھے۔ عمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپؐ کی پوری زندگی بچپن سے اس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے بھی آپؐ کی زبان سے حراء کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتا تھا۔ کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو موسیٰؑ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادھا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اس کے حصول کا تصور تک اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے، اور اچانک وہ پورے ہوش و حواس کی حالت میں علانیہ اس تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی چیز نے اُن کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تامّل اس نتیجہ تک پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریبِ نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے، بلکہ اس سچے انسان نے اپنے کسی

ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے وہ دراصل حقیقت ہی کا مشاہدہ ہے۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیلِ نبوت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں فرمایا:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (آیت: ۱۶)

اے نبیؐ ان سے کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا تو میں کبھی یہ قرآن تمہیں نہ سناتا بلکہ اس کی خبر تک وہ تم کو نہ دیتا۔ آخر میں اس سے پہلے ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو۔

اور شوریٰ میں فرمایا:

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (آیت: ۵۲)

اے نبیؐ تم تو جانتے تک نہ تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، مگر ہم نے اس وحی کو ایک نور بنا دیا جس سے ہم رہنمائی کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یونس، حاشیہ ۲۱۔ جلد سوم، عنکبوت: ۸۸ تا ۹۲، جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۸۴۔ ۸۳

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں پر آپؐ کی تعلیم و تربیت کے حیرت انگیز اثرات اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہو رہے تھے یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص انبیاء کے احوال اور کتبِ آسمانی کی طرف سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرتؐ کی نبوت میں شک کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۔ (البینہ: ۲، ۳)

یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذاتِ خود ایک دلیل روشن کہا گیا ہے، اس لیے کہ آپؐ کی نبوت سے پہلے کی اور بعد کی زندگی، آپؐ کا اُمّی ہونے کے باوجود قرآن جیسی کتاب پیش کرنا، آپؐ کی تعلیم اور صحبت کے اثر سے

ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں غیر معمولی انقلاب رونما ہو جانا، آپؐ کا بالکل معقول عقائد، نہایت ستھری عبادات، کمال درجہ کے پاکیزہ اخلاق، اور انسانی زندگی کے لیے بہترین اصول و احکام کی تعلیم دینا، آپؐ کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت کا پایا جانا، اور آپؐ کا ہر قسم کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں انتہائی اولوالعزمی کے ساتھ اپنی دعوت پر ثابت قدم رہنا، یہ ساری باتیں اس بات کی کھلی علامات تھیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔[1]

قرآن ایک معجزانہ کلام اور نبوّت کی دلیل ہے

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (السجدہ ۳:۱-۲)

اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العٰلمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔

یہاں صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے بلکہ مزید براں پورے زور کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ لا ریب فیہ، بے شک یہ خدا کی کتاب ہے۔ اس کے منزل من اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس تاکیدی فقرے کو اگر نزولِ قرآن کے واقعاتی پس منظر اور خود قرآن کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے، اور یہ دلیل مکّہ معظمہ کے باشندوں سے پوشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اس کتاب کے پیش کرنے والے کی پوری زندگی ان کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی زندگی بھی اور اس کے بعد کی بھی . . . . وہ اس کتاب کی زبان اور طرزِ بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان اور طرزِ بیان میں نمایاں فرق پاتے تھے اور اس بات کو بداہۃً جانتے تھے کہ ایک ہی شخص کے دو اسٹائل اتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ اس کتاب کے انتہائی معجزانہ ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہلِ زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ ان کے سارے ادیب اور شاعر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ ان کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور اس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے، اور جو پاکیزہ مضامین اس کلام میں پیش کیے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ انہیں اس کتاب میں، اور اس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دُور دُور بھی اس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی جھوٹے مدعی کا کام

---

[1] قرآن کو جس چیلنج کے ساتھ پیش کیا گیا ہے (فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ) وہ اس کی معجزانہ حیثیت کو نمایاں کرتا ہے اور اس چیلنج کے جواب میں عاجز رہ کر مخالفین نے بزبانِ سکوت یہ اعتراف کر لیا کہ یہ کلام انسانی کاوشوں کا ماحصل نہیں ہے۔ قرآن کی اس معجزانہ اور فوق الانسانی حیثیت کو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی نبوت کی دلیل قرار دیا ہے۔ (مرتب)

اور کلام کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ خورد بین لگا کر بھی اس امر کی نشان دہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت کا یہ دعویٰ کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم یا قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کام میں ان کی اپنی کیا غرض پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف ان کی قوم کے کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں اور اس سے وابستہ ہو کر ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے یہ ساری باتیں مل جل کر خود دلیلِ دعویٰ بنی ہوئی تھیں اسی لیے اس پس منظر میں یہ کہنا بالکل کافی تھا کہ اس کتاب کا رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

فصل ۴

بعثتِ سرورِ عالمؐ کے متعلق توراۃ و انجیل کی پیشگوئیاں

حضرتِ عیسیٰؑ کا ایک اہم قول

وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ (الصف: ۶)

اور یاد کرو عیسیٰ ابن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ "اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اُس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے۔

اس فقرے کے تین معنی ہیں اور تینوں صحیح ہیں:

ایک یہ کہ مَیں کوئی الگ اور نرالا دین نہیں لایا ہوں، بلکہ وہی دین لایا ہوں جو موسیٰ علیہ السّلام لائے تھے۔ میں توراۃ کی تردید کرتا ہُوا نہیں آیا ہوں بلکہ اس کی تصدیق کر رہا ہوں، جس طرح ہمیشہ سے خدا کے رسول اپنے سے پہلے آئے ہوئے رسُولوں کی تصدیق کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ تم میری رسالت کو تسلیم کرنے میں تامّل کرو۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ مَیں ان بشارتوں کا مصداق ہوں جو میری آمد کے متعلق توراۃ میں موجود ہیں۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ تم میری مخالفت کرو، تمہیں تو اس بات کا خیر مقدم کرنا چاہیے کہ جس کے آنے کی خبر پچھلے انبیاء نے دی تھی وہ آگیا۔

اور اس فقرے کو بعد والے فقرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے تیسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ مَیں اللہ کے رسول احمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی آمد کے متعلق توراۃ کی دی ہوئی بشارت کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی ان کے آنے کی بشارت دیتا ہوں۔ اس تیسرے معنی کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے اس قول کا اشارہ اس بشارت کی طرف ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے دی تھی۔

توراۃ کی صریح پیشگوئی

اُس میں وہ فرماتے ہیں:

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ یہ تیری اُس درخواست کے مطابق ہوگا جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سُنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ (استثناء، باب ۱۸۔ آیات ۱۵-۱۹)

یہ توراۃ کی صریح پیشین گوئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔ اس میں حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا رہے ہیں کہ میں تیرے لیے تیرے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کے "بھائیوں" سے مُراد خود اسی قوم کا کوئی قبیلہ یا خاندان نہیں ہو سکتا بلکہ کوئی دوسری ایسی قوم ہی ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اُس کا قریبی نسلی رشتہ ہو۔ اگر مُراد خود بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی آمد ہوتی تو الفاظ یہ ہوتے کہ میں تمہارے لیے خود تم ہی میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ لہٰذا بنی اسرائیل کے بھائیوں سے مراد لامحالہ بنی اسمٰعیل ہی ہو سکتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کی بنا پر اُن کے نسبی رشتہ دار ہیں۔ مزید برآں اس پیشین گوئی کا مصداق بنی اسرائیل کا کوئی نبی اس وجہ سے بھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں کوئی ایک نبی نہیں، بہت سارے نبی آئے ہیں جن کے ذکر سے بائبل بھری پڑی ہے۔

دوسری بات اس بشارت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جو نبی برپا کیا جائے گا وہ حضرت موسیٰؑ کے مانند ہوگا۔ اس سے مراد ظاہر ہے کہ شکل و صُورت یا حالاتِ زندگی میں مشابہ ہونا تو نہیں ہے، کیونکہ اس لحاظ سے کوئی فرد بھی کسی دوسرے فرد کے مانند نہیں ہوا کرتا۔ اور اس سے مُراد محض وصفِ نبوت میں مماثلت بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ وصف اُن تمام انبیاء میں مشترک ہے جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آئے ہیں، اس لیے کسی ایک نبی کی یہ خصوصیت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس وصف میں اُن کے مانند ہو۔ پس ان دونوں پہلوؤں سے مشابہت کے خارج از بحث ہو جانے کے بعد کوئی اور وجہِ مماثلت جس کی بنا پر آنے والے ایک نبی کی تخصیص قابلِ فہم ہو، اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ وہ نبی ایک مستقل شریعت لانے کے اعتبار سے حضرت موسیٰؑ کے مانند ہو۔ اور یہ خصوصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ آپؐ سے پہلے بنی اسرائیل میں جو نبی بھی آئے تھے وہ شریعتِ موسوی کے پیرو تھے، ان میں سے کوئی بھی ایک مستقل شریعت لے کر نہ آیا تھا۔

اس تعبیر کو مزید تقویت پیشین گوئی کے ان الفاظ سے ملتی ہے کہ "یہ تیری (یعنی بنی اسرائیل کی) اس درخواست

کے مطابق ہوگا جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورِب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سُننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تا کہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا۔" اس عبارت میں حورِب سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلی مرتبہ احکامِ شریعت دیئے گئے تھے۔ اور بنی اسرائیل کی جس درخواست کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ اگر کوئی شریعت ہم کو دی جائے تو اُن خوفناک حالات میں نہ دی جائے جو حورِب پہاڑ کے دامن میں شریعت دیتے وقت پیدا کیے گئے تھے۔ اُن حالات کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے اور بائیبل میں بھی۔ (ملاحظہ ہو البقرہ، آیات ۵۵-۵۶ و ۶۳، الاعراف، آیات ۱۵۵-۱۷۱- بائیبل، کتاب خروج ۱۹: ۱۷-۱۸)۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری یہ درخواست قبول کر لی ہے، اُس کا ارشاد ہے کہ میں اُن کے لیے ایک ایسا نبی برپا کروں گا جس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا یعنی آئندہ شریعت دینے کے وقت وہ خوفناک حالات پیدا نہ کیے جائیں گے جو حورِب پہاڑ کے دامن میں پیدا کیے گئے تھے، بلکہ اب جو نبی اس منصب پر مامور کیا جائے گا اُس کے منہ میں بس اللہ کا کلام ڈالا جائے گا اور وہ اسے خلقِ خدا کو سُنا دے گا۔ اس تصریح پر غور کرنے کے بعد کیا اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اس کا مصداق کوئی اور نہیں ہے؟ حضرت موسیٰؑ کے بعد مستقل شریعت صرف آپؐ ہی کو دی گئی، اس کے عطا کرنے کے وقت کوئی ایسا مجمع نہیں ہوا جیسا حورِب پہاڑ کے دامن میں بنی اسرائیل کا ہوا تھا اور کسی وقت بھی احکامِ شریعت دینے کے موقع پر وہ حالات پیدا نہیں کیے گئے جو وہاں پیدا کیے گئے تھے۔[1]

انجیل میں نبوتِ محمدی کی بشارت

حضرت عیسیٰؑ نے نبوتِ محمدیؐ کی جو بشارت دی تھی اس کا ذکر قرآن میں یوں آیا ہے:

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (الصف-۶)

اور یاد کرو عیسیٰ بن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ "اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔"

یہ قرآن مجید کی ایک بڑی اہم آیت ہے جس پر مخالفینِ اسلام کی طرف سے بڑی لے دے بھی کی گئی ہے اور بدترین نیات بھی جھرائی کی گئی ہیں کیونکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا صاف صاف نام لے کر آپ کی آمد کی بشارت دی تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔

۱۔ "محمد" اور "احمد"

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا اسمِ گرامی احمد بتایا گیا ہے۔ احمد کے دو معنی ہیں۔ ایک، وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ دوسرے، وہ شخص جس کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو، یا جو بندوں میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف ہو۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ بھی حضورؐ کا ایک نام تھا۔ مسلم اور ابوداؤد طیالسی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ انا محمد وانا احمد وانا الحاشر ... "میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور میں حاشر ہوں ..." اسی مضمون کی روایات حضرت جُبیر بن مُطعِم سے امام مالک، بخاری، مسلم، دارمی، ترمذی، اور نسائی نے نقل کی ہیں۔ حضورؐ کا یہ اسمِ گرامی صحابہ میں معروف تھا، چنانچہ حضرت حسّان بن ثابت کا شعر ہے:

صلی الالٰہ ومن یحف بعرشہ — والطیبون علی المبارک احمد

"اللہ نے اور اس کے عرش کے گرد گھیرا لگائے ہوئے فرشتوں نے اور سب پاکیزہ ہستیوں نے بابرکت احمدؐ پر درود بھیجا ہے۔"

تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ حضورؐ کا نام مبارک صرف محمد ہی نہ تھا بلکہ احمد بھی تھا۔ عرب کا پورا لٹریچر اس بات سے خالی ہے کہ حضورؐ سے پہلے کسی کا نام احمد رکھا گیا ہو۔ اور حضورؐ کے بعد احمد اور غلام احمد اتنے لوگوں کے نام رکھے گئے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ زمانۂ نبوت سے لے کر آج تک تمام اُمّت میں آپ کا یہ اسمِ گرامی معلوم و معروف رہا ہے۔ اگر حضورؐ کا یہ اسمِ گرامی نہ ہوتا تو اپنے بچوں کے نام غلام احمد رکھنے والوں نے آخر کس احمد کا غلام ان کو قرار دیا تھا؟

؎ علاوہ ازیں مجموعی طور پر بائیبل میں جا بجا حضورؐ کی بعثت کی پیشینگوئی مذکور ہے۔ اس سلسلے میں قرآن نے اجمالاً یہ بیان کر دیا کہ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ (الاعراف - ۱۵۷) مثال کے طور پر تورات اور انجیل کے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی آمد کے متعلق صاف اشارات موجود ہیں:

استثناء باب ۱۸، آیت ۱۵ تا ۱۹۔ متی، باب ۲۱، آیت ۳۳ تا ۴۶۔ یوحنا، باب ۱، آیت ۱۹ تا ۲۱۔ یوحنا، باب ۴، آیت ۱۵ تا ۱۷ و آیت ۲۵ تا ۳۰۔ یوحنا، باب ۱۵، آیت ۲۵-۲۶۔ یوحنا، باب ۱۶، آیت ۷ تا ۱۵۔ (مؤلف و مرتبین)

۲۔حضرت مسیحؑ ،حضرت الیاسؑ اور "وہ نبی"

انجیل یوحنا اس بات پر گواہ ہے کہ مسیحؑ کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ایک مسیحؑ، دوسرے ایلیاہ (یعنی حضرت الیاسؑ کی آمدِ ثانی)، اور تیسرے "وہ نبی"۔انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

"اور یوحنا (حضرت یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے، تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیحؑ نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ ....اس نے کہا میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو....انہوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ ایلیاہ نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟" (باب ۱۔آیات ۱۹۔۲۵)

یہ الفاظ اس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیحؑ اور حضرت الیاسؑ کے علاوہ ایک اور نبی کے منتظر تھے، اور وہ حضرت یحییٰؑ نہ تھے۔اس نبی کی آمد کا عقیدہ بنی اسرائیل کے ہاں اس قدر مشہور و معروف تھا کہ "وہ نبی" کہہ دینا گویا اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بالکل کافی تھا، یہ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ "جس کی خبر توراۃ میں دی گئی ہے"۔ مزید برآں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس نبی کی طرف وہ اشارہ کر رہے تھے اس کا آنا قطعی طور پر ثابت تھا، کیونکہ جب حضرت یحییٰؑ سے یہ سوالات کیے گئے تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے، تم کس نبی کے متعلق پوچھ رہے ہو۔

۳۔انجیل یوحنا کی عبارات

اب وہ پیشین گوئیاں دیکھیے جو انجیل یوحنا میں مسلسل باب ۱۴ سے ۱۶ تک منقول ہوئی ہیں:۔

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے، یعنی روحِ حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے نہ جانتی ہے تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر ہے۔" (۱۴: ۱۶۔۱۷)

"میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔" (۱۴: ۲۵۔۲۶)

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔" (۱۴: ۳۰)۔

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا" (۱۵: ۲۶)

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا" (۱۶: ۷)

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس لیے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے اور تمہیں خبریں دیگا" (۱۶: ۱۲-۱۵)

۴۔ مذکورہ عبارات کے مفہوم کا تعین

ان عبارتوں کے معنی متعین کرنے کے لیے سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کے ہم عصر اہل فلسطین کی عام زبان آرامی زبان کی وہ بولی تھی جسے سُریانی (Syriac) کہا جاتا ہے۔ مسیحؑ کی پیدائش سے دو ڈھائی سو برس پہلے ہی سلوقی (Seleucide) اقتدار کے زمانے میں اس علاقے سے عبرانی رخصت ہو چکی تھی اور سُریانی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اگرچہ سلوقی اور پھر رومی سلطنتوں کے اثر سے یونانی زبان بھی اس علاقے میں پہنچ گئی تھی، مگر وہ صرف اُس طبقے تک محدود رہی جو سرکار، دربار میں رسائی پاکر، یا رسائی حاصل کرنے کی خاطر یونانیت زدہ ہو گیا تھا۔ فلسطین کے عام لوگ سُریانی کی ایک خاص بولی (Dialect) استعمال کرتے تھے جس کے لہجے اور تلفظات اور محاورات دمشق کے علاقے میں بولی جانے والی سُریانی سے مختلف تھے، اور اس ملک کے عوام یونانی سے اس قدر ناواقف تھے کہ جب سنہ ۷۰ء میں یروشلم پر قبضہ کرنے کے بعد رومی جنرل ٹیٹس (Titus) نے اہل یروشلم کو یونانی میں خطاب کیا تو اس کا ترجمہ سُریانی زبان میں کرنا پڑا۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے شاگردوں سے جو کچھ کہا تھا وہ لامحالہ سُریانی زبان ہی میں ہو گا۔

دوسری بات یہ جاننی ضروری ہے کہ بائیبل کی چاروں انجیلیں اُن یونانی بولنے والے عیسائیوں کی لکھی ہوئی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد اس مذہب میں داخل ہوئے تھے۔ ان تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال و احوال کی تفصیلات سُریانی بولنے والے عیسائیوں کے ذریعہ سے کسی تحریر کی صورت میں نہیں بلکہ زبانی روایات کی شکل میں پہنچی تھیں اور ان سُریانی روایات کو انہوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے درج کیا تھا۔ ان میں سے کوئی انجیل بھی سنہ ۷۰ء سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہے، اور انجیل یوحنا تو حضرت عیسیٰؑ کے ایک صدی بعد غالباً ایشیائے کوچک کے شہر

افسس میں لکھی گئی ہے۔ مزید یہ کہ ان انجیلوں کا بھی کوئی اصل نسخہ اُس یونانی زبان میں محفوظ نہیں ہے جس میں ابتداءً یہ لکھی گئی تھیں۔ مطبع کی ایجاد سے پہلے کے جتنے یونانی مسودات جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ اِس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ تین صدیوں کے دوران میں ان کے اندر کیا کچھ ردّ و بدل ہوتے رہے ہوں گے۔ اس معاملہ کو جو چیز خاص طور پر مشتبہ بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ عیسائی اپنی انجیلوں میں اپنی پسند کے مطابق دانستہ تغیر و تبدل کرنے کو بالکل جائز سمجھتے رہے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون "بائبل" کا مصنف لکھتا ہے:

"اناجیل میں ایسے نمایاں تغیرات دانستہ کیے گئے ہیں جیسے مثلاً بعض پوری پوری عبارتوں کو کسی دوسرے ماخذ سے لے کر کتاب میں شامل کر دینا . . . . . یہ تغیرات صریحاً کچھ ایسے لوگوں نے بالقصد کیے ہیں جنہیں اصل کتاب کے اندر شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا، اور وہ اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھتے رہے کہ کتاب کو بہتر یا زیادہ مفید بنانے کے لیے اس کے اندر اپنی طرف سے اس مواد کا اضافہ کر دیں . . .
. . . بہت سے اضافے دوسری صدی ہی میں ہو گئے تھے اور کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ماخذ کیا تھا۔"

اس صورتِ حال میں قطعی طور پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو اقوال ہمیں ملتے ہیں وہ بالکل ٹھیک ٹھیک نقل ہوتے ہیں اور ان کے اندر کوئی ردّ و بدل نہیں ہوا ہے۔

تیسری اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد بھی تقریباً تین صدیوں تک فلسطین کے عیسائی باشندوں کی زبان سُریانی رہی اور کہیں نویں صدی عیسوی میں جا کر عربی زبان نے اُس کی جگہ لی۔ ان سُریانی بولنے والے اہلِ فلسطین کے ذریعہ سے عیسائی روایات کے متعلق جو معلومات ابتدائی تین صدیوں کے مسلمان علماء کو حاصل ہوئیں وہ اُن لوگوں کی معلومات کی بہ نسبت زیادہ معتبر ہونی چاہییں جنہیں سُریانی سے یونانی اور پھر یونانی سے لاطینی زبانوں میں ترجمہ در ترجمہ ہو کر یہ معلومات پہنچیں۔ کیونکہ مسیح کی زبان سے نکلے ہوئے اصل سُریانی الفاظ اُن کے ہاں محفوظ رہنے کے زیادہ امکانات تھے۔

۵۔ وہ دُنیا کا سردار ہو گا

ان ناقابلِ انکار تاریخی حقائق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ انجیل یوحنّا کی مذکورۂ بالا عبارات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دے رہے ہیں جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ "دُنیا کا سردار" (سرورِ عالم) ہو گا، "ابد تک" رہے گا، "سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا" اور خود اُن کی (یعنی حضرت عیسیٰ کی) گواہی دیگا۔ یوحنّا کی ان عبارتوں میں "روح القدس" اور "سچائی کی روح" وغیرہ الفاظ شامل کر کے مدعا کو خبط کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے مگر اس کے باوجود ان سب عبارتوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس آنے والے کی خبر دی گئی

ہے وہ کوئی رُوح نہیں بلکہ کوئی انسان اور خاص شخص ہے جس کی تعلیم عالمگیر و ہمہ گیر، اور قیامت تک باقی رہنے والی ہوگی۔ اس شخص خاص کے لیے اُردو ترجمے میں "مددگار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یُوحنا کی اصل انجیل میں یونانی زبان کا جو لفظ استعمال کیا گیا تھا، اس کے بارے میں عیسائیوں کو اصرار ہے کہ وہ Paracletus تھا، مگر اس کے معنی متعین کرنے میں خود عیسائی علماء کو سخت زحمت پیش آتی ہے۔ اصل یونانی زبان میں Paraclete کے کئی معنی ہیں، کسی جگہ کی طرف بلانا، مدد کے لیے پکارنا، اِنذار و تنبیہ، ترغیب و اکسانا، التجا کرنا، دُعا مانگنا۔ پھر یہ لفظ Helenic یونانی مفہوم میں یہ معنی دیتا ہے: تسلّی دینا، تسکین بخشنا، ہمت افزائی کرنا۔ بائیبل میں اس لفظ کو جہاں جہاں استعمال کیا گیا ہے، ان سب مقامات پر اس کے کوئی معنی بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اور اوریجن (Origen) نے کہیں اس کا ترجمہ Consolator کیا ہے اور کہیں Deprecator مگر دوسرے مفسرین نے ان دونوں ترجموں کو رد کر دیا کیونکہ اوّل تو یہ یونانی گرامر کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں، دوسرے تمام عبارتوں میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، یہ معنی نہیں چلتے۔ بعض اور مترجمین نے اس کا ترجمہ Teacher کیا ہے۔ مگر یونانی زبان کے استعمالات سے یہ معنی بھی اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ ترتولیان اور آگسٹائن نے لفظ Advocate کو ترجیح دی ہے۔ اور بعض اور لوگوں نے Assistant، Comforter اور Consoler وغیرہ الفاظ اختیار کیے ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، لفظ پیریکلیٹس)۔

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ یونانی زبان ہی میں ایک دوسرا لفظ Periclytos موجود ہے جس کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ یہ لفظ بالکل "محمّد" کا ہم معنی ہے، اور تلفظ میں اس کے اور Paracletus کے درمیان بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیا بعید ہے کہ جو عیسائی حضرات اپنی مذہبی کتابوں میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بے تکلف ردّ و بدل کر لینے کے خوگر رہے ہیں انہوں نے یُوحنا کی نقل کردہ پیشین گوئی کے اس لفظ کو اپنے عقیدے کے خلاف پڑتا دیکھ کر اس کے املا میں یہ ذرا سا تغیّر کر دیا۔ اس کی پڑتال کرنے کے لیے یُوحنا کی لکھی ہوئی ابتدائی یونانی انجیل بھی کہیں موجود نہیں ہے جس سے یہ تحقیق کیا جا سکے کہ وہاں ان دونوں الفاظ میں سے دراصل کونسا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔

٢ ۔ منحمنا

لیکن فیصلہ اس پر بھی موقوف نہیں ہے کہ یُوحنا نے یونانی زبان میں دراصل کونسا لفظ لکھا تھا، کیونکہ بہرحال وہ بھی ترجمہ ہی تھا اور حضرت مسیح کی زبان، جیسا کہ اُوپر ہم بیان کر چکے ہیں فلسطین کی سُریانی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی بشارت میں جو لفظ استعمال کیا ہوگا وہ لامحالہ کوئی سُریانی لفظ ہی ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے وہ اصل سُریانی لفظ ہمیں ابنِ ہشام کی سیرت میں مل جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اسی کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی

یونانی لفظ کیا ہے۔ محمد بن اسحاق کے حوالہ سے ابن ہشام نے یُحَنَّس (یُوحنّا) کی انجیل کے باب ۱۵، آیات ۲۳ تا ۲۷ اور باب ۱۶ آیت ۱ کا پُورا ترجمہ نقل کیا ہے اور اس میں یُونانی ”فارقلیط“ کے بجائے سُریانی زبان کا لفظ مُنحمنّا استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ابن اسحاق یا ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ ”مُنحمنّا کے معنی سُریانی میں محمد اور یُونانی میں برقلیطس ہیں“۔ (ابن ہشام، جلد اوّل، ص ۲۴۸)۔

اب دیکھیے کہ تاریخی طور پر فلسطین کے عام عیسائی باشندوں کی زبان نویں صدی عیسوی تک سُریانی تھی۔ یہ علاقہ ساتویں صدی کے نصفِ اوّل سے اسلامی مقبوضات میں شامل تھا۔ ابن اسحاق نے ۷۶۸ء میں اور ابن ہشام نے ۸۲۸ء میں وفات پائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کے زمانے میں فلسطینی عیسائی سُریانی بولتے تھے، اور ان دونوں کے لیے اپنے ملک کی عیسائی رعایا سے ربط پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ نیز اُس زمانے میں یُونانی بولنے والے عیسائی بھی لاکھوں کی تعداد میں اسلامی مقبوضات کے اندر رہتے تھے، اس لیے ان کے لیے یہ معلوم کرنا بھی مشکل نہ تھا کہ سُریانی کے کس لفظ کا ہم معنی یُونانی زبان کا کونسا لفظ ہے۔ اب اگر ابن اسحاق کے نقل کردہ ترجمے میں سُریانی لفظ مُنحمنّا استعمال ہوا ہے، اور ابن اسحاق یا ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ عربی میں اس کا ہم معنی لفظ محمّد اور یُونانی میں برقلیطس ہے، تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عیسیٰؑ نے حضورؐ کا نام مبارک لے کر آپ ہی کے آنے کی بشارت دی تھی، اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یوحنّا کی یونانی انجیل میں دراصل لفظ Periclytos استعمال ہوا تھا جسے عیسائی حضرات نے بعد میں کسی وقت Paracletus سے بدل دیا۔

۷۔ نجاشی کی شہادت

اس سے بھی قدیم تر تاریخی شہادت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کو جب نجاشی نے اپنے دربار میں بلایا، اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سُنیں تو اُس نے کہا: مَرْحَبًا بِکُمْ وَ بِمَنْ جِئْتُمْ مِنْ عِنْدِہٖ، اَشْھَدُ اَنَّہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ اَنَّہُ الَّذِیْ نَجِدُ فِی الْاِنْجِیْلِ وَ اَنَّہُ الَّذِیْ بَشَّرَ بِہٖ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ (مُسند احمد)۔ یعنی ”مرحبا تم کو اور اُس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسُول ہیں، اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ ابن مریمؑ نے دی تھی“۔ یہ قصّہ احادیث میں خود حضرت جعفرؓ اور اُمّ سلمہؓ سے بھی منقول ہوا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں نجاشی کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک نبی کی پیشین گوئی کر گئے ہیں، بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُس نبی کی ایسی صاف نشاندہی انجیل میں موجود تھی جس کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تأمل نہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی ہیں۔ البتہ اس روایت

نے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عیسیٰ کی اس بشارت کے متعلق نجاشی کا ذریعہ معلومات یہی انجیل تھی یا کوئی اور ذریعہ بھی اس کو جاننے کا اُس وقت موجود تھا۔

۸۔ انجیل برنباس

حقیقت یہ ہے کہ صرف رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ کی پیشین گوئیوں کو نہیں خود حضرت عیسیٰؑ کے اپنے صحیح حالات اور آپ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا بھی معتبر ذریعہ وہ چار انجیلیں نہیں ہیں جن کو مسیحی کلیسا نے معتبر و مسلّم اناجیل (Canonical Gospels) قرار دے رکھا ہے، بلکہ اس کا زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ وہ انجیل برنا باس ہے جسے کلیسا غیر قانونی اور مشکوک الصحت Apocryphal کہتا ہے۔ عیسائیوں نے اسے چھپانے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ صدیوں تک یہ دُنیا سے ناپید رہی ہے۔ سولہویں صدی میں اس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سِکٹس (Sixtus) کے کتب خانے میں پایا جاتا تھا اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ لگا۔ پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرتا ہوا ۱۷۳۸ء میں ویانا کی امپیریل لائبریری میں پہنچ گیا۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس سے شائع ہوگیا تھا مگر غالباً اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دُنیا میں یہ احساس پیدا ہوگیا کہ یہ کتاب تو اُس مذہب کی جڑیں ہی کاٹے دے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰؑ کے نام سے منسُوب کیا جاتا ہے اس لیے اس کے مطبُوعہ نسخے کسی خاص تدبیر سے غائب کر دیئے گئے اور پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔ دوسرا ایک نسخہ اسی اطالوی ترجمہ سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہُوا اٹھارویں صدی میں پایا جاتا تھا جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مگر وہ بھی کہیں غائب کر دیا گیا اور آج اس کا بھی کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ انگریزی ترجمے کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہُوا ہے اور میں نے اسے لفظ بلفظ پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے عیسائیوں نے محض تعصُّب اور ضد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

مسیحی لٹریچر میں اس انجیل کا جہاں کہیں ذکر آتا ہے، اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برنا باس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صرف اس بنا پر بول دیا گیا کہ اس میں جگہ جگہ بصراحت نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اوّل تو اس انجیل کو پڑھنے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے، اگر کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت سے پھیلی ہوئی ہوتی اور علمائے اسلام کی تصنیفات میں بکثرت اس کا ذکر پایا جاتا۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی مقدمۂ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک

کا علم نہ تھا۔ طبری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابن حزم، ابن تیمیہ اور دوسرے مصنفین، جو مسلمانوں میں مسیحی لٹریچر پر وسیع اطلاع رکھنے والے تھے، ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل برنا باس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں ان کی بہترین فہرستیں ابن ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ہیں، اور وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برنا باس کا نام تک نہیں لیا ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی دلیل اس بات کے جھوٹ ہونے کی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی ۷۵ سال پہلے پوپ گلاسیئس اول Gelasius کے زمانے میں بدعقیدہ اور گمراہ کن (Heretical) کتابوں کی جو فہرست مرتب کی گئی تھی، اور ایک پاپائی فتوے کے ذریعہ سے جن کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا، اُن میں انجیل برنا باس (Evangelium Barnabe) بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت کون سا مسلمان تھا جس نے یہ جعلی انجیل تیار کی تھی؟

۹۔ انجیل برنباس کا تعارف

قبل اس کے کہ اس انجیل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارتیں نقل کی جائیں، اس کا مختصر تعارف کرا دینا ضروری ہے، تاکہ اس کی اہمیت معلوم ہو جائے اور یہ بھی سمجھ میں آ جائے کہ عیسائی حضرات اس سے اتنے ناراض کیوں ہیں۔

بائیبل میں جو چار انجیلیں قانونی اور معتبر قرار دے کر شامل کی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسیٰ کا صحابی نہ تھا۔ اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ اس نے آنحضرتؑ کے صحابیوں سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہیں۔ جن ذرائع سے ان لوگوں نے معلومات حاصل کی ہیں ان کا کوئی حوالہ انہوں نے نہیں دیا ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ راوی نے آیا خود وہ واقعات دیکھے اور وہ اقوال سُنے ہیں جنہیں وہ بیان کر رہا ہے یا ایک یا چند واسطوں سے یہ باتیں اسے پہنچی ہیں۔ بخلاف اس کے انجیل برنا باس کا مصنف کہتا ہے کہ میں مسیحؑ کے اولین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں، شروع سے آخر وقت تک مسیحؑ کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سُنے اقوال اس کتاب میں درج کر رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت مسیحؑ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور صحیح حالات دنیا کے سامنے لانا تیری ذمہ داری ہے۔

یہ برنا باس کون تھا؟ بائیبل کی کتاب اعمال میں بڑی کثرت سے اس نام کے ایک شخص کا ذکر آتا ہے جو قبرص کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مسیحیت کی تبلیغ اور پیروانِ مسیحؑ کی مدد و اعانت کے سلسلے میں اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی گئی ہے مگر کہیں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ کب دینِ مسیحؑ میں داخل ہوا، اور ابتدائی بارہ حواریوں

کی جو فہرست تین انجیلوں میں دی گئی ہے اس میں بھی کہیں اس کا نام درج نہیں ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس انجیل کا مصنف وہی برنباس ہے یا کوئی اور۔ متی، مرقس اور لوقا نے حواریوں Apostles کی جو فہرست دی ہے، برنباس کی دی ہوئی فہرست اس سے صرف دو ناموں میں مختلف ہے۔ ایک توما جس کے بجائے برنباس خود اپنا نام دے رہا ہے، دوسرا شمعون قنانی جس کی جگہ وہ یہوداہ بن یعقوب کا نام لیتا ہے۔ لوقا کی انجیل میں یہ دوسرا نام بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ بعد میں کسی وقت صرف برنباس کو حواریوں سے خارج کرنے کے لیے توما کا نام داخل کیا گیا ہے تاکہ اس کی انجیل سے پیچھا چھڑایا جا سکے، اور اس طرح کے تغیرات اپنی مذہبی کتابوں میں کر لینا ان حضرات کے ہاں کوئی ناجائز کام نہیں رہا ہے۔

اس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصب کے بغیر کھلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ان چاروں سے بدرجہا برتر ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوتے ہیں اور اس طرح بیان ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص فی الواقع وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ان واقعات میں خود شریک تھا۔ چاروں انجیلوں کی بے ربط داستانوں کے مقابلہ میں یہ تاریخی بیان زیادہ مربوط بھی ہے اور اس سے سلسلۂ واقعات بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اس میں چاروں انجیلوں کی بہ نسبت زیادہ واضح اور مفصل اور مؤثر طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔ توحید کی تعلیم، شرک کی تردید، صفات باری تعالیٰ، عبادات کی روح، اور اخلاق فاضلہ کے مضامین اس میں بڑے ہی پُرزور اور مدلل اور مفصل ہیں۔ جن سبق آموز تمثیلات کے پیرایہ میں مسیحؑ نے یہ مضامین بیان کیے ہیں ان کا عشر عشیر بھی چاروں انجیلوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کس حکیمانہ طریقے سے فرماتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی زبان، طرز بیان اور طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر کچھ بھی آشنا ہو تو وہ اس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہ کوئی جعلی داستان نہیں ہے جو بعد میں کسی نے گھڑ لی ہو، بلکہ اس میں حضرت مسیحؑ اناجیل اربعہ کی بہ نسبت اپنی اصلی شان میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں، اور اس میں تضاد کا نام و نشان بھی نہیں ہے جو اناجیل اربعہ میں ان کے مختلف اقوال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

اس انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات ٹھیک ٹھیک ایک نبی کی زندگی اور تعلیمات کے مطابق نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، تمام پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ صاف کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے سوا معرفت حق کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور جو انبیاء کو چھوڑتا ہے وہ دراصل خدا کو چھوڑتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتے ہیں

جن کی تعلیم تمام انبیاء نے دی ہے۔ نماز، روزے اور زکوٰۃ کی تلقین کرتے ہیں۔ اُن کی نمازوں کا جو ذکر بکثرت مقامات پر برنا باس نے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا اور تہجد کے اوقات تھے جن میں وہ نماز پڑھتے تھے، اور ہمیشہ نماز سے پہلے وضو فرماتے تھے۔ انبیاء میں سے وہ حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کو نبی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کو انبیاء کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کو وہ ذبیح قرار دیتے ہیں اور ایک یہودی عالم سے اقرار کراتے ہیں کہ فی الواقع ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی تھے اور بنی اسرائیل نے زبردستی کھینچ تان کر کے حضرت اسحاقؑ کو ذبیح بنا رکھا ہے۔ آخرت اور قیامت اور جنت و دوزخ کے متعلق ان کی تعلیمات قریب قریب وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

۱۰۔ عیسائی انجیل برنباس کے کیوں مخالف ہیں؟

عیسائی جس وجہ سے انجیل برنباس کے مخالف ہیں، وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جگہ جگہ صاف اور واضح بشارتیں ہیں، کیونکہ وہ تو حضورؐ کی پیدائش سے بھی بہت پہلے اس انجیل کو رد کر چکے تھے۔ ان کی ناراضی کی اصل وجہ کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تفصیلی بحث درکار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے تھے، عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح تسلیم کر کے ان پر ایمان لائے تھے اور وہ اُن کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اس جماعت میں داخل ہوا تو اس نے رومیوں، یونانیوں اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی اور اس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد اور اصول اور احکام اُس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰؑ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی بلکہ ان کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیروؤں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہو کر اُس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا اس وقت بھی اس نے حضرت عیسیٰؑ کے کسی قول کی سند نہیں پیش کی بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا۔ اور اس نئے دین کی تشکیل میں اس کے پیشِ نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہودی (Gentile) دنیا قبول کر لے۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی شریعت یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام و حلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے ختنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا جو غیر یہودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا۔ حتیٰ کہ اُس نے مسیحؑ کی الوہیت اور اُن کے ابن خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر اولادِ آدمؑ کے پیدائشی گناہ کا کفارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت

مناسبت رکھتا تھا۔ مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے ان بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھیر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیح کی اُلوہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز (سنہ ۳۲۵ء) میں نیقیہ (Nicaea) کی کونسل نے پولوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مسلّم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈوسیس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد فطری بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں، مردود قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھیرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ سنہ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس (Athanasius) کے ایک خط کے ذریعہ معتبر و مسلّم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا، پھر اس کی توثیق سنہ ۳۸۲ء میں پوپ ڈیماسس (Damasus) کے زیر صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس (Gelasius) نے اس مجموعہ کو مسلّم قرار دینے کے ساتھ ساتھ اُن کتابوں کی ایک فہرست مرتّب کر دی جو غیر مسلّم تھیں۔ حالانکہ جن پولوسی عقائد کو بنیاد بنا کر مذہبی کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا یہ فیصلہ کیا گیا تھا، ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کر سکا ہے کہ ان میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰ کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔

انجیل برناباس ان غیر مسلّم کتابوں میں اس لیے شامل کی گئی کہ وہ مسیحیت کے اس سرکاری عقیدے کے بالکل خلاف تھی۔ اس کا مصنف کتاب کے آغاز ہی میں اپنا مقصد تصنیف یہ بیان کرتا ہے کہ "اُن لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جائے جو شیطان کے دھوکے میں آ کر یسوع کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں، ختنہ کو غیر ضروری ٹھیراتے ہیں اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں، جن میں سے ایک دھوکہ کھانے والا پولوس بھی ہے۔" وہ بتاتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ دنیا میں موجود تھے اُس زمانے میں اُن کے معجزات کو دیکھ کر سب سے پہلے مشرک رومی سپاہیوں نے ان کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا، پھر یہ چھوت بنی اسرائیل کے عوام کو بھی لگ گئی۔ اس پر حضرت عیسیٰ سخت پریشان ہوئے۔ انھوں نے بار بار نہایت شدت کے ساتھ اپنے متعلق اس غلط عقیدے کی تردید کی۔ اپنے [illegible] اُن کی دعا سے شاگردوں کے ہاتھوں بھی وہی معجزے صادر کرائے گئے جو خود حضرت عیسیٰ سے صادر ہوتے تھے تاکہ لوگ اس غلط خیال سے باز آ جائیں کہ جس شخص سے یہ معجزے صادر ہو رہے ہیں وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔ اس سلسلہ میں دو حضرت عیسیٰ کی مفصل تقریریں نقل کی گئی ہیں جن میں انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ اس غلط عقیدے کی تردید کی

تھی، اور جگہ جگہ یہ بتاتا ہے کہ آنجناب اس گمراہی کے پھیلنے پر کس قدر پریشان تھے۔ مزید براں وہ اس پولوسی عقیدے کی بھی صاف صاف تردید کرتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے صلیب پر جان دی تھی۔ وہ اپنے چشم دید حالات یہ بیان کرتا ہے کہ جب یہوداہ اسکریوتی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آنجناب کو اٹھا لے گئے، اور یہوداہ اسکریوتی کی شکل اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو حضرت عیسیٰؑ کی تھی صلیب پر وہی چڑھایا گیا تھا نہ کہ حضرت عیسیٰؑ۔ اس طرح یہ انجیل پولوسی مسیحیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور قرآن کے بیان کی پوری توثیق کرتی ہے۔ حالانکہ نزول قرآن سے ۱۱۵ سال پہلے اُس کے ان بیانات ہی کی بنا پر مسیحی پادری اسے رد کر چکے تھے۔

۱۱۔ انجیل برنباس کی مفصل پیشین گوئیاں

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انجیل برنباس درحقیقت اناجیل اربعہ سے زیادہ معتبر انجیل ہے مسیح علیہ السلام کی تعلیمات اور سیرت اور اقوال کی صحیح ترجمانی کرتی ہے، اور یہ عیسائیوں کی اپنی بدقسمتی ہے کہ اس انجیل کے ذریعہ سے اپنے عقائد کی تصحیح اور حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا جو موقع ان کو ملا تھا اسے محض ضد کی بنا پر انہوں نے کھو دیا۔ اس کے بعد ہم پورے اطمینان کے ساتھ وہ بشارتیں نقل کر سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں برنباس نے حضرت عیسیٰؑ سے روایت کی ہیں۔ ان بشارتوں میں کہیں حضرت عیسیٰؑ حضورؐ کا نام لیتے ہیں، کہیں "رسول اللہ" کہتے ہیں، کہیں آپ کے لیے "مسیح" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، کہیں "قابل تعریف" Admirable کہتے ہیں، اور کہیں صاف صاف ایسے فقرے ارشاد فرماتے ہیں جو بالکل لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ہم معنی ہیں۔ ہمارے لیے ان ساری بشارتوں کو نقل کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ اتنی زیادہ ہیں، اور جگہ جگہ مختلف پیرایوں اور سیاق و سباق میں آئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔ یہاں ہم محض بطور نمونہ ان میں سے چند کو نقل کرتے ہیں:

"تمام انبیاء جن کو خدا نے دنیا میں بھیجا جن کی تعداد ایک لاکھ ۴۴ ہزار تھی، انہوں نے ابہام کے ساتھ بات کی۔ مگر میرے بعد تمام انبیاء اور مقدس ہستیوں کا نور آئے گا جو انبیاء کی کہی ہوئی باتوں کے اندھیرے پر روشنی ڈال دے گا کیونکہ وہ خدا کا رسول ہے" (باب ۱۷)

"فریسیوں اور لاویوں نے کہا اگر تو نہ مسیح ہے، نہ الیاس، نہ کوئی اور نبی، تو کیوں نئی تعلیم دیتا ہے اور اپنے آپ کو مسیح سے بھی زیادہ بنا کر پیش کرتا ہے؟ یسوع نے جواب دیا "جو معجزے خدا میرے ہاتھ سے دکھاتا ہے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں وہی کچھ کہتا ہوں جو خدا چاہتا ہے۔ ورنہ درحقیقت میں اپنے آپ کو اُس (مسیح) سے بڑا شمار کیے جانے کے قابل نہیں قرار دیتا جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔ میں تو اُس خدا کے رسول

کے مرتبے کے سبب یا اس کی جوتی کے تسمے کھولنے کے لائق بھی نہیں ہوں جس کو تم مسیح کہتے ہو، جو مجھ سے پہلے بنایا گیا تھا اور میرے بعد آئے گا اور صداقت کی باتیں لے کر آئے گا تاکہ اس کے دین کی کوئی انتہا نہ ہو" (باب ۴۴)

"وہ بالیقین میں تم سے کہتا ہوں کہ ہر نبی جو آیا ہے وہ صرف ایک قوم کے لیے خدا کی رحمت کا نشان بن کر پیدا ہوا ہے۔ اس وجہ سے ان انبیاء کی باتیں اُن لوگوں کے سوا کہیں اور نہیں پھیلیں جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ مگر خدا کا رسول جب آئے گا، خدا گویا اس کو اپنے ہاتھ کی مُہر دے دیگا یہاں تک کہ وہ دُنیا کی تمام قوموں کو جو اس کی تعلیم پائیں گی، نجات اور رحمت پہنچا دیگا۔ وہ بے خدا لوگوں پر اقتدار لے کر آئے گا اور بُت پرستی کا ایسا قلع قمع کرے گا کہ شیطان پریشان ہو جائے گا" (اس کے آگے شاگردوں کے ساتھ ایک طویل مکالمہ میں حضرت عیسیٰؑ تصریح کرتے ہیں کہ وہ بنی اسماعیل میں سے ہو گا۔ باب ۴۳)

"اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کا رسول وہ رونق ہے جس سے خدا کی پیدا کی ہوئی قریب قریب تمام چیزوں کو خوشی نصیب ہو گی کیونکہ وہ فہم اور نصیحت، حکمت اور طاقت، خشیت اور محبت، حزم اور ورع کی روح سے آراستہ ہے۔ وہ فیاضی اور رحمت، عدل اور تقویٰ، شرافت اور صبر کی روح سے مزین ہے جو اس نے خدا سے اُن تمام چیزوں کی بہ نسبت تین گنی پائی ہے جنہیں خدا نے اپنی مخلوق میں سے یہ روح بخشی ہے۔ کیسا مبارک وقت ہو گا جب وہ دُنیا میں آئے گا۔ یقین جانو میں نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے جس طرح ہر نبی نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے۔ اس کی روح کو دیکھتے ہی سے خدا نے اُن کو نبوت دی۔ اور جب میں نے اس کو دیکھا تو میری روح سکینت سے بھر گئی یہ کہتے ہوئے کہ اے محمدؐ، خدا تمہارے ساتھ ہو، اور وہ مجھے تمہاری جوتی کے تسمے باندھنے کے قابل بنا دے، کیونکہ یہ مرتبہ بھی پا لوں تو میں ایک بڑا نبی اور خدا کی ایک مقدس ہستی ہو جاؤں گا" (باب ۴۴)۔

"(میرے جانے سے) تمہارا دل پریشان نہ ہو، نہ تم خوف کرو، کیونکہ میں نے تم کو پیدا نہیں کیا ہے بلکہ خدا ہمارا خالق جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔ رہا میں، تو اس وقت میں تو میں اُس رسولِ خدا کے لیے راستہ تیار کرنے آیا ہوں جو دُنیا کے لیے نجات لے کر آئے گا۔۔۔ اندریاس نے کہا، اُستاد ہمیں اس کی نشانی بتا دیجئے تاکہ ہم اسے پہچان لیں۔ یسوع نے جواب دیا، وہ تمہارے زمانے میں نہیں آئے گا بلکہ تمہارے کچھ سال بعد آئے گا جبکہ میری انجیل ایسی مسخ ہو چکی ہو گی کہ مشکل سے کوئی ۳۰ آدمی مومن باقی رہ جائیں گے۔ اُس وقت اللہ دُنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنے رسول کو بھیجے گا جس کے سر پر سفید بادل کا سایہ ہو گا جس سے وہ خدا کا برگزیدہ جانا جائے گا اور اس کے ذریعہ سے خدا کی

مدنیت دنیا کو حاصل ہوگی۔ وہ بے خدا لوگوں کے خلاف بڑی طاقت کے ساتھ آئے گا اور زمین پر بت پرستی کو مٹا دے گا۔ اور مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ سے ہمارا خدا پہچانا جائے گا اور اس کی تقدیس ہوگی اور میری صداقت دنیا کو معلوم ہوگی اور وہ ان لوگوں سے انتقام لے گا جو مجھے انسان سے بڑھ کر کچھ قرار دیں گے . . . . . وہ ایک ایسی صداقت کے ساتھ آئے گا جو تمام انبیاء کی لائی ہوئی صداقت سے زیادہ واضح ہوگی" (باب ۴۲)

"خدا کا عہد یروشلم میں ہیکل سلیمان کے اندر کیا گیا تھا نہ کہ کہیں اور، مگر میری بات کا یقین کرو کہ ایک وقت آئے گا جب خدا اپنی رحمت ایک اور شہر میں نازل فرمائے گا، پھر ہر جگہ اس کی سچی عبادت ہو سکے گی، اور اللہ اپنی رحمت سے ہر جگہ سچی نماز کو قبول فرمائے گا . . . . میں دراصل اسرائیل کے گھرانے کی طرف نجات کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، مگر میرے بعد مسیح آئے گا، خدا کا بھیجا ہوا، تمام دنیا کی طرف، جس کے لیے خدا نے یہ ساری دنیا بنائی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں اللہ کی عبادت ہوگی، اور اس کی رحمت نازل ہوگی" (باب ۴۳)

"یسوع نے سردار کاہن سے کہا زندہ خدا کی قسم جس کے حضور میری جان حاضر ہے، میں وہ مسیح نہیں ہوں جس کی آمد کا تمام دنیا کی قومیں انتظار کر رہی ہیں، جس کا وعدہ خدا نے ہمارے باپ ابراہیمؑ سے یہ کہہ کر کیا تھا کہ "تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی" (پیدائش، ۲۲: ۸)۔ مگر جب خدا مجھے دنیا سے لے جائے گا تو شیطان پھر یہ بغاوت برپا کرے گا کہ بے پرہیزگار لوگ مجھے خدا اور خدا کا بیٹا مانیں۔ اس کی وجہ سے میری باتوں اور میری تعلیمات کو مسخ کر دیا جائے گا یہاں تک کہ مشکل سے ۳۰ صاحب ایمان باقی رہ جائیں گے اس وقت خدا دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنا رسول بھیجے گا جس کے لیے اس نے دنیا کی یہ ساری چیزیں بنائی ہیں، جو قوت کے ساتھ جنوب سے آئے گا اور بتوں کو بت پرستوں کے ساتھ برباد کر دے گا، جو شیطان سے وہ اقتدار چھین لے گا جو اس نے انسانوں پر حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کی رحمت اُن لوگوں کی نجات کے لیے اپنے ساتھ لائے گا جو اس پر ایمان لائیں گے، اور مبارک ہے وہ جو اس کی باتوں کو مانے" (باب ۹۶)

"سردار کاہن نے پوچھا کیا خدا کے اُس رسول کے بعد دوسرے نبی بھی آئیں گے؟ یسوع نے جواب دیا اس کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے سچے نبی نہیں آئیں گے مگر بہت سے جھوٹے نبی آ جائیں گے جن کا مجھے بڑا غم ہے کیونکہ شیطان خدا کے عادلانہ فیصلے کی وجہ سے اُن کو اٹھائے گا اور وہ میری انجیل کے پردے میں اپنے آپ کو چھپائیں گے" (باب ۹۶)

"سردار کاہن نے پوچھا کہ وہ مسیح کس نام سے پکارا جائے گا اور کیا نشانیاں اس کی آمد کو ظاہر کریں گی؟ یسوع نے جواب دیا اس مسیح کا نام قابلِ تعریف ہے، کیونکہ خدا نے جب اس کی روح پیدا کی تھی اس وقت اس کا یہ نام خود رکھا تھا اور وہاں اسے ایک ملکوتی شان میں رکھا گیا تھا۔ خدا نے کہا "اے محمدؐ، انتظار کر، کیونکہ تیری ہی خاطر میں جنت، دنیا اور بہت سی مخلوق پیدا کروں گا اور اس کو تجھے تحفہ کے طور پر دوں گا، یہاں تک کہ جو تیری تبریک کرے گا اسے برکت دی جائے گی اور جو تجھ پر لعنت کرے گا اس پر لعنت کی جائے گی جب میں تجھے دنیا کی طرف بھیجوں گا تو میں تجھ کو اپنے پیغامبرِ نجات کی حیثیت سے بھیجوں گا۔ تیری بات سچی ہوگی یہاں تک کہ زمین و آسمان ٹل جائیں گے مگر تیرا دین نہیں ٹلے گا" سو اس کا مبارک نام محمدؐ ہے" (باب ۹۷)

برناباس لکھتا ہے کہ ایک موقع پر شاگردوں کے سامنے حضرت عیسیٰؑ نے بتایا کہ میرے ہی شاگردوں میں سے ایک (جو یہودا اسکریوتی نکلا) مجھے ۳۰ سکوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے گا، پھر فرمایا:

"اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ جو مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے مارا جائے گا، کیونکہ خدا مجھے زمین سے اوپر اٹھا لے گا اور اس غدار کی صورت ایسی بدل دے گا کہ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ وہ میں ہی ہوں۔ تاہم جب وہ ایک بری موت مرے گا تو ایک مدت تک میری ہی تذلیل ہوتی رہے گی مگر جب محمدؐ خدا کا مقدس رسول آئے گا تو میری وہ بدنامی دور کر دی جائے گی۔ اور خدا یہ اس لیے کرے گا کہ میں نے اس مسیح کی صداقت کا اقرار کیا ہے۔ وہ مجھے اس کا یہ انعام دے گا کہ لوگ یہ جان لیں گے کہ میں زندہ ہوں اور اس ذلت کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔" (باب ۱۱۲)

"شاگردوں سے حضرت عیسیٰؑ نے کہا: بے شک میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر موسیٰ کی کتاب سے صداقت مسخ نہ کر دی گئی ہوتی تو خدا ہمارے باپ داؤد کو ایک دوسری کتاب نہ دیتا۔ اور اگر داؤد کی کتاب میں تحریف نہ کی گئی ہوتی تو خدا مجھے انجیل نہ دیتا، کیونکہ خداوند ہمارا خدا بدلنے والا نہیں ہے اور اس نے سب انسانوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے۔ لہٰذا جب اللہ کا رسول آئے گا تو وہ اس لیے آئے گا کہ ان ساری چیزوں کو صاف کر دے جن سے بے خدا لوگوں نے میری کتاب کو آلودہ کر دیا ہے" (باب ۱۲۴)

دو شبہات کا جواب

ان صاف اور مفصّل پیشین گوئیوں میں صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو بادی النظر میں نگاہ کو کھٹکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں، اور انجیل برناباس کی متعدد دوسری عبارتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مسیح ہونے کا انکار کیا ہے۔ دوسری یہ کہ صرف انہی عبارتوں میں نہیں بلکہ اس انجیل کے بہت سے مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل

عربی نام "محمدؐ" لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ انبیاء کی پیشین گوئیوں کا عام طریقہ نہیں ہے کہ بعد کی آنے والی کسی ہستی کا اصل نام لیا جائے۔ تیسری یہ کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسیح کہا گیا ہے۔

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ صرف انجیل برنباس ہی میں نہیں بلکہ لُوقا کی انجیل میں بھی یہ ذکر موجود ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے شاگردوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ وہ آپ کو مسیح کہیں۔ لُوقا کے الفاظ یہ ہیں: "اس نے ان سے کہا لیکن تم مجھے کیا کہتے ہو؟ پطرس نے جواب میں کہا خدا کا مسیح۔ اس نے ان کو تاکید کر کے حکم دیا کہ یہ کسی سے نہ کہنا" (۹: ۲۰-۲۱) غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل جس مسیح کے منتظر تھے اس کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ تلوار کے زور سے دشمنانِ حق کو مغلوب کرے گا، اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ مسیح میں نہیں ہوں بلکہ وہ میرے بعد آنے والا ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ برنباس کا جو اطالوی ترجمہ اس وقت دنیا میں موجود ہے اس کے اندر تو حضورؐ کا نام بے شک محمدؐ لکھا ہوا ہے، مگر یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ کتاب کن کن زبانوں سے ترجمہ در ترجمہ ہوتی ہوئی اطالوی زبان میں پہنچی ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل انجیل برنباس سُریانی زبان میں ہو گی، کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی زبان تھی۔ اگر وہ اصل کتاب دستیاب ہوتی تو دیکھا جا سکتا تھا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی کیا لکھا گیا تھا۔ اب جو کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اصل میں تو حضرت عیسیٰؑ نے لفظ "مُنحمنّا" استعمال کیا ہو گا جیسا کہ ہم ابن اسحاق کے دیئے ہوئے انجیل یُوحنّا کے حوالہ سے بتا چکے ہیں، پھر مختلف مترجموں نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے کر دیئے ہوں گے۔ اس کے بعد غالباً کسی مترجم نے یہ دیکھ کر کہ پیشین گوئی میں آنے والے کا جو نام بتایا گیا ہے وہ بالکل لفظ "محمدؐ" کا ہم معنی ہے، آپؐ کا یہی اسمِ گرامی لکھ دیا ہو گا۔ اس لیے صرف اس نام کی تصریح یہ شبہ پیدا کر دینے کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے کہ پُوری انجیل برنباس کسی مسلمان نے جعلی تصنیف کر دی ہے۔

تیسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ لفظ "مسیح" درحقیقت ایک اسرائیلی اصطلاح ہے جسے قرآن مجید میں مخصوص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے لیے صرف اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ یہودی ان کے مسیح ہونے کا انکار کرتے تھے، ورنہ یہ نہ قرآن کی اصطلاح ہے نہ قرآن میں کہیں اس کو اسرائیلی اصطلاح کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لفظ مسیح استعمال کیا ہو اور قرآن میں آپؐ کے لیے یہ لفظ استعمال نہ کیا گیا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ انجیل برنباس آپؐ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرتی ہے جس سے قرآن انکار کرتا ہے۔ دراصل بنی اسرائیل کے ہاں قدیم طریقہ یہ تھا کہ کسی چیز یا کسی شخص کو جب کسی مقدس مقصد کے لیے مختص کیا جاتا تھا تو اس چیز پر یا اس شخص کے سر پر تیل مل کر اُسے متبرک (Consecrate) کر دیا جاتا تھا۔ عبرانی زبان میں تیل ملنے کے اس فعل کو مسح کہتے تھے اور جس پر یہ ملا جاتا تھا اُسے مسیح کہا جاتا تھا۔ عبادت

گاہ کے ظروف اسی طریقہ سے مسح کر کے عبادت کے لیے وقف کیے جاتے تھے۔ کاہنوں (Preasts) کو کہانت (Priest hood) کے منصب پر مامور کرتے وقت بھی مسح کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور نبی بھی جب خدا کی طرف سے بادشاہت یا نبوت کے لیے نامزد کیے جاتے تو انہیں مسح کیا جاتا چنانچہ بائبل کی رو سے بنی اسرائیل کی تاریخ میں بکثرت مسیح پائے جاتے ہیں۔ حضرت ہارون کاہن کی حیثیت سے مسیح تھے۔ حضرت موسیٰ کاہن اور نبی کی حیثیت سے، طالوت بادشاہ کی حیثیت سے، حضرت داؤد بادشاہ اور نبی کی حیثیت سے، ملک صدق بادشاہ اور کاہن کی حیثیت سے، اور حضرت الیسع نبی کی حیثیت سے مسیح تھے۔ بعد میں یہ بھی ضروری نہ رہا تھا کہ تیل مل کر ہی کسی کو مامور کیا جائے، بلکہ محض کسی کا مامور من اللہ ہونا ہی مسیح ہونے کا ہم معنی بن گیا تھا۔ مثال کے طور پر دیکھیے ۱۔ سلاطین، باب ۱۹ میں ذکر آیا ہے کہ خدا نے حضرت الیاس (ایلیاہ) کو حکم دیا کہ حزائیل کو مسح کر کے آرام (دمشق) کا بادشاہ بنا، اور نمسی کے بیٹے یاہو کو مسح کر کے اسرائیل کا بادشاہ بنا، اور الیسع (الیشع) کو مسح کر کے تیری جگہ نبی ہو۔ ان میں سے کسی کے سر پر بھی تیل نہیں ملا گیا، بس خدا کی طرف سے ان کی ماموریت کا فیصلہ سنا دینا گویا انہیں مسح کر دینا تھا۔ پس اسرائیلی تصور کے مطابق لفظ مسیح درحقیقت "مامور من اللہ" کا ہم معنی تھا اور اسی معنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس لفظ کو استعمال کیا تھا۔ (لفظ مسیح کے اسرائیلی مفہوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف ببلیکل لٹریچر، لفظ "میسایاہ")۔ شبہ

باب ۳

سرورِ عالمؐ

فصل ۱

سرورِ عالم[1]

(پوری دنیا کی مشترک میراث)

ہم مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اس کا مطلب ہے "دنیا کا سردار"۔ ہندی میں اس کا ترجمہ "جگت گرو" ہوگا اور انگریزی میں (Leader of the World)۔

بظاہر یہ بہت بڑا خطاب ہے، مگر جس بلند پایہ ہستی کو یہ خطاب دیا گیا ہے، اس کا کارنامہ واقعی ایسا ہے کہ اس کو سرورِ عالم کہنا مبالغہ نہیں عین حقیقت ہے۔

دیکھیے! کسی شخص کو دنیا کا لیڈر کہنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اس نے کسی خاص قوم یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا ہو۔ ایک محبِّ وطن یا ایک قوم پرست لیڈر کی آپ اس حیثیت سے جتنی چاہیں قدر کر لیں کہ اس نے اپنے لوگوں کی بڑی خدمت کی لیکن اگر آپ اس کے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں تو وہ آپ کا لیڈر بہرحال نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کی محبت، خیر خواہی اور کارگزاری سب کچھ چین یا ہسپانیہ تک محدود ہو، ایک ہندوستانی کو اس سے کیا تعلق کہ وہ اسے اپنا لیڈر مانے؟ اگر وہ اپنی قوم کو دوسروں سے افضل ٹھیراتا ہو اور دوسروں کو گرا کر اپنی قوم کو چڑھانا چاہتا ہو تب تو دوسری قوموں کے لوگ الٹی اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہیں۔ ساری قوموں کے انسان کسی ایک شخص کو اپنا لیڈر صرف اسی صورت میں مان سکتے ہیں جبکہ اس کی نگاہ میں سب قومیں اور سب آدمی یکساں ہوں، وہ سب کا یکساں خیر خواہ ہو، اور اپنی خیر خواہی میں کسی طرح ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔

دوسری اہم شرط جو دنیا کا لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ایسے اصول پیش

---

[1] یہ ایک نشری تقریر ہے جو تقسیم سے کئی سال پہلے سنہ [illegible] میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی گئی تھی۔ اس کے مخاطب صرف مسلمان نہ تھے، بلکہ ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی سب تھے۔ (مرتبین)

کیسے ہوں جو ساری دُنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوں اور جن میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہو۔ لیڈر کے معنی ہی رہنما کے ہیں۔ لیڈر کی ضرورت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ وہ فلاح اور بہتری کا راستہ بتائے۔ لہٰذا دنیا کا لیڈر وہی ہو سکتا ہے جو ساری دنیا کے لوگوں کو ایسا طریقہ بتائے جس میں سب کی فلاح ہو۔

تیسری لازمی شرط دُنیا کا لیڈر ہونے کے لیے یہ ہے کہ اس کی رہنمائی کسی خاص زمانے کے لیے نہ ہو بلکہ ہر حال اور ہر زمانے میں یکساں مفید، یکساں صحیح اور یکساں قابلِ پیروی ہو۔ جس لیڈر کی رہنمائی ایک زمانے میں کارآمد اور دوسرے زمانے میں بیکار ہو اس کو دنیا کا لیڈر نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کا لیڈر تو وہی ہے کہ دنیا جب تک قائم رہے اس کی رہنمائی بھی کارآمد رہے۔

چوتھی اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس نے صرف اصول پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھایا ہو اور اُن کی بنیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کر دی ہو۔ محض اصول پیش کرنے والا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر (Thinker) ہو سکتا ہے۔ لیڈر نہیں ہو سکتا۔ لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اصولوں کو عمل میں لا کر دکھائے۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ یہ چاروں شرطیں اُس ہستی میں کہاں تک پائی جاتی ہیں جس کو ہم "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔

پہلی شرط کو لیجیے۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک ہی نظر میں محسوس کریں گے کہ یہ کسی قوم پرست یا محبِ وطن کی زندگی نہیں ہے بلکہ ایک محبِ انسانیت اور ایک عالمگیر نظریہ رکھنے والے انسان کی زندگی ہے۔ اُن کی نگاہ میں تمام انسان یکساں تھے۔ کسی خاندان، کسی طبقے، کسی قوم، کسی نسل یا کسی ملک کے خاص مفاد سے انہیں دلچسپی نہ تھی۔ امیر اور غریب، اُونچ اور نیچ، کالے اور گورے، عرب اور غیر عرب، مشرقی اور مغربی، سامی اور آرین، سب کو وہ اس حیثیت سے دیکھتے تھے کہ یہ سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ اُن کی زبان سے تمام عمر کوئی ایک لفظ یا ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلا، اور نہ زندگی بھر میں کوئی کام انہوں نے ایسا کیا جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہو کہ انہیں کسی ایک طبقۂ انسانی کے مفاد سے زیادہ تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی ہی میں حبشی، ایرانی، رومی، مصری اور اسرائیلی، اُسی طرح ان کے رفیقِ کار بنے جس طرح عرب۔ اور ان کے بعد زمین کے ہر گوشے میں ہر نسل اور ہر قوم کے انسانوں نے اُن کو اُسی طرح اپنا رہنما تسلیم کیا جس طرح خود اُن کی اپنی قوم نے۔ یہ اُسی خالص انسانیت ہی کا کرشمہ تو ہے کہ آج آپ ایک ہندوستانی[1] کی زبان

---

[1] خیال رہے کہ یہ تقریر اُس زمانے میں ہوئی تھی جب ہندوستان اور پاکستان دونوں ایک ملک تھے۔ (مرتبین)

سے اُس شخص کی تعریف سن رہے ہیں جو صدیوں پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا۔

اب دوسری اور تیسری شرط کو ایک ساتھ لیجیے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص زمانوں اور مخصوص ملکوں کے وقتی اور مقامی مسائل سے بحث کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی پوری قوت دنیا میں انسانیت کے اُس بڑے مسئلے کو حل کرنے میں صرف کر دی جس سے تمام انسانوں کے سارے چھوٹے چھوٹے مسائل خود حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑا مسئلہ کیا ہے؟ وہ صرف یہ ہے کہ:

"کائنات کا نظام فی الواقع جس اصول پر قائم ہے، انسان کی زندگی کا نظام بھی اسی کے مطابق ہو کیونکہ انسان اس کائنات کا ایک جزو ہے اور جزو کی حرکت کا کل کے خلاف ہونا ہی خرابی کا موجب ہے۔"

اگر آپ اس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی نگاہ کو ذرا کوشش کر کے زمان اور مکان کی قیود سے آزاد کر لیجیے اور اوپر سے کرۂ زمین پر اس طرح نظر ڈالیے کہ ابتدا سے آج تک اور آئندہ غیر محدود زمانے تک بسنے والے تمام انسان بیک وقت آپ کے سامنے ہوں۔ پھر دیکھیے کہ انسان کی زندگی میں خرابی کی جتنی صورتیں پیدا ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں ان سب کی جڑ کیا ہے، یا کیا ہو سکتی ہے۔ اس سوال پر آپ جتنا غور کریں گے، جتنی چھان بین اور تحقیق کریں گے، ماحصل یہی نکلے گا کہ:

"انسان کی خدا سے بغاوت تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔"

اس لیے کہ خدا سے باغی ہو کر انسان لازمی طور پر دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت اختیار کرتا ہے: یا تو وہ اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھ کر من مانی کارروائیاں کرنے لگتا ہے، اور یہ چیز آپ سے آپ ظالم بنا دیتی ہے۔ یا پھر وہ خدا کے سوا دوسروں کے حکم کے آگے سر جھکانے لگتا ہے، اور اس سے دنیا میں فساد کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں خراب نتائج کیوں نکلتے ہیں؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لیے اس کا نتیجہ برا نکلتا ہے۔ یہ ساری کائنات فی الواقع خدا کی سلطنت ہے۔ زمین، سورج، چاند، ہوا، پانی، روشنی، سب خدا کی ملک ہیں اور انسان اس سلطنت میں پیدائشی بندے اور Born Subject کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پوری سلطنت جس نظام پر چل رہی ہے، اگر انسان اس کا ایک جزو ہونے کے باوجود اس سے مختلف رویہ اختیار کرے تو لامحالہ اس کا ایسا رویہ تباہ کن نتائج ہی پیدا کرے گا۔ اس کا یہ سمجھنا کہ وہ آزاد ہے اور کسی مقتدر اعلیٰ کا محکوم نہیں ہے جس کے سامنے وہ جواب دہ ہو، واقعہ کے خلاف ہے۔ اس لیے جب وہ خود مختار بن کر غیر ذمہ دارانہ طریقے پر کام کرتا ہے اور اپنا قانونِ زندگی آپ تجویز کرتا ہے تو نتیجہ برا نکلتا ہے۔ اسی طرح اس کا خدا کے سوا کسی اور کو صاحب اختیار و ذی اقتدار ماننا اور اس سے خوف یا امید رکھنا، اس کی آقائی کے آگے جھکنا بھی حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ در

یہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس کا نتیجہ بھی بُرا ہی نکلتا ہے۔ صحیح نتیجہ برآمد ہونے کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ زمین و آسمان میں جو حقیقی حکومت ہے، انسان اُس کے سامنے سر جھکا دے، اپنی خودی و خودسری کو اس کے آگے تسلیم کر دے، اپنی اطاعت اور بندگی کو اس کے لیے خالص کر دے، اور اپنی زندگی کا ضابطہ و قانون خود بنانے یا دوسروں سے لینے کے بجائے اُسی سے لے۔

یہ بنیادی اصلاح کی تجویز ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے لیے پیش کی ہے۔ یہ مشرق اور مغرب کی قید سے آزاد ہے۔ روئے زمین میں جہاں جہاں انسان آباد ہیں یہی ایک اصلاحی تجویز ان کی زندگی کی بگڑی ہوئی کل کو درست کر سکتی ہے۔ اور یہ ماضی و مستقبل کی قید سے بھی آزاد ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے یہ جتنی صحیح اور کارگر تھی اتنی ہی آج ہے اور اتنی ہی دس ہزار برس بعد بھی ہوگی۔

اب آخری شرط باقی رہ جاتی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خیالی نقشہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس نقشہ پر ایک زندہ سوسائٹی پیدا کر کے دکھا دی۔ انہوں نے ۲۳ برس کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدا کی حکومت کے آگے سرِ اطاعت جھکانے پر آمادہ کر لیا۔ ان سے خود پرستی بھی چھڑائی اور خدا کے سوا دوسروں کی بندگی بھی۔ پھر ان کو جمع کر کے خالص خدا کی بندگی پر ایک نیا نظامِ اخلاق، نیا نظامِ تمدن، نیا نظامِ معیشت، اور نیا نظامِ حکومت بنایا، اور تمام دنیا کے سامنے اس بات کا عملی مظاہرہ کر کے دکھا دیا کہ جو اصول وہ پیش کر رہے ہیں اس پر کیسی زندگی بنتی ہے اور دوسرے اصولوں کی زندگی کے مقابلہ میں وہ کتنی اچھی کتنی پاکیزہ اور کتنی صالح ہے۔

یہ وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرورِ عالم یا سارے جہان کا لیڈر کہتے ہیں۔ اُن کا یہ کام کسی خاص قوم کے لیے نہ تھا، تمام انسانوں کے لیے تھا۔ یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے جس پر کسی کا حق کسی دوسرے سے کم یا زیادہ نہیں ہے۔ جو چاہے اس میراث سے فائدہ اٹھائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے خلاف کسی کو تعصب رکھنے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ *

فصل : ۲

سرورِ عالم ﷺ کا اصلی کارنامہ

دنیا جانتی ہے کہ نبی عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے اُس برگزیدہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو قدیم ترین زمانہ سے نوعِ انسانی کو خدا پرستی اور حُسنِ اخلاق کی تعلیم دینے کے لیے اُٹھتا رہا ہے۔ ایک خدا کی بندگی اور پاکیزہ اخلاقی زندگی کا درس جو ہمیشہ سے دُنیا کے پیغمبر، رِشی اور مُنی دیتے رہے ہیں وُہی آنحضرتؐ نے بھی دیا ہے، انہوں نے کسی نئے خدا کا تصور پیش نہیں کیا ہے اور نہ کسی نرالے اخلاق ہی کا سبق دیا ہے جو اُن سے پہلے کے رہبرانِ انسانیت کی تعلیم سے مختلف ہو۔ پھر سوال یہ ہے کہ اُن کا وہ اصلی کارنامہ کیا ہے جس کی بنا پر ہم انہیں تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا آدمی قرار دیتے ہیں؟ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ بے شک آنحضرتؐ سے پہلے انسان خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت سے آشنا تھا، مگر اس بات سے پوری طرح واقف نہ تھا کہ اس فلسفیانہ حقیقت کا انسانی اخلاق سے کیا تعلق ہے۔ بلاشبہ انسان کو اخلاق کے عمدہ اصولوں سے آگاہی حاصل تھی، مگر اسے واضح طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں میں ان اخلاقی اصولوں کی عملی ترجمانی کس طرح ہونی چاہیے۔ خدا پر ایمان، اصولِ اخلاق اور عملی زندگی، یہ تینوں الگ الگ چیزیں تھیں جن کے درمیان کوئی منطقی رابطہ، کوئی گہرا تعلق، اور کوئی نتیجہ خیز رشتہ موجود نہ تھا۔ یہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے ان تینوں کو ملا کر ایک نظام میں سمو دیا اور ان کے امتزاج سے ایک مکمل تہذیب و تمدّن کا نقشہ محض خیال کی دُنیا میں نہیں بلکہ عمل کی دُنیا میں بھی قائم کر کے دکھا دیا۔

ایمان عمل انگیز قوت ہے!

انہوں نے بتایا کہ خدا پر ایمان محض ایک فلسفیانہ حقیقت کے مان لینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس ایمان کا مزاج اپنی عین فطرت کے لحاظ سے ایک خاص قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس اخلاق کا ظہور انسان کی عملی زندگی کے رویہ میں ہونا چاہیے۔ ایمان ایک تخم ہے جو نفسِ انسانی میں جڑ پکڑتے ہی اپنی فطرت کے مطابق عملی زندگی کے ایک پورے درخت کی تخلیق شروع کر دیتا ہے۔ اور اس درخت کے تنے سے لے کر اس کی شاخ شاخ اور پتّی پتّی

[1] یہ بھی ایک نشری تقریر ہے جو تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان ریڈیو سے نشر کی گئی تھی۔ (مرتبین)

(جسم میں اخلاق کا وہ جیون رس جاری و ساری ہو جاتا ہے جس کی سوتیں تخم کے ریشوں سے اُبلتی ہیں جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ زمین میں بوئی تو جائے آم کی گٹھلی اور اس سے نکل آئے لیموں کا درخت، اُسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دل میں بویا تو گیا ہو خدا پرستی کا بیج اور اس سے رونما ہو جائے ایک مادہ پرستانہ زندگی جس کی رگ رگ میں بداخلاقی کی رُوح سرایت کیے ہوئے ہو۔ خدا پرستی سے پیدا ہونے والے اخلاق اور شرک، دہریت یا رہبانیت سے پیدا ہونے والے اخلاق یکساں نہیں ہو سکتے۔ زندگی کے یہ سب نظریے اپنے الگ الگ مزاج رکھتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج دوسرے سے مختلف قسم کے اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔

پوری زندگی کے لیے خدا پرستانہ اخلاق

پھر جو اخلاق خدا پرستی سے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف ایک خاص عابد و زاہد گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہیں کہ صرف خانقاہ کی چار دیواری اور عزلت کے گوشے ہی میں ان کا ظہور ہو سکے۔ ان کا اطلاق وسیع پیمانے پر پوری انسانی زندگی اور اس کے ہر ہر پہلو میں ہونا چاہیے۔ اگر ایک تاجر خدا پرست ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی تجارت میں خدا پرستانہ اخلاق ظاہر نہ ہو۔ اگر ایک جج خدا پرست ہے تو عدالت کی کرسی پر، اور اگر ایک پولیس مین خدا پرست ہے تو پولیس پوسٹ پر اس سے غیر خدا پرستانہ اخلاق ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اگر کوئی قوم خدا پرست ہے تو اس کی شہری زندگی میں، اس کے انتظامِ ملکی میں، اس کی خارجی سیاست میں، اور اس کی صلح و جنگ میں خدا پرستانہ اخلاق کی نمود ہونی چاہیے۔ ورنہ اس کا ایمان باللہ محض ایک لفظِ بے معنی ہے۔ — م)

حضورؐ کی تعلیم کے چند اسباق

اب رہی یہ بات کہ خدا پرستی کس قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتی ہے اور اُن اخلاقیات کا ظہور کس طرح انسان کی عملی زندگی میں، انفرادی و اجتماعی رویّے میں ہونا چاہیے، تو یہ ایک وسیع مضمون ہے جسے ایک مختصر گفتگو میں سمیٹنا مشکل ہے۔ مگر نمونے کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات آپ کو سناؤں گا جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ آنحضرتؐ کے مرتب کیے ہوئے نظامِ زندگی میں ایمان، اخلاق اور عمل کا امتزاج کس نوعیت کا ہے۔

حضورؐ فرماتے ہیں:-

الایمان بضع و سبعون شعبۃ افضلھا قول لا الٰہ الا اللہ و ادناھا اماطۃ الاذی عن الطریق و الحیاء شعبۃ من الایمان -

"ایمان کے بہت سے شعبے ہیں۔ اس کی جڑ یہ ہے کہ تم خدا کے سوا کسی کو معبود نہ مانو، اور اس کی آخری شاخ یہ ہے کہ راستے میں اگر تم کوئی ایسی چیز دیکھو جو بندگانِ خدا کو تکلیف دینے والی ہو تو اُسے ہٹا دو۔ اور حیا بھی ایمان ہی کا ایک شعبہ ہے"

الطُّھُورُ شطرالایمان

"جسم و لباس کی پاکیزگی آدھا ایمان ہے"

اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ علٰی دِمائِھِمْ و اَمْوالِھِمْ۔

"مومن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنی جان و مال کا کوئی خطرہ نہ ہو"

لا ایمانَ لِمَنْ لا اَمانَۃَ لہ ولا دینَ لِمن لا عھدَ لہ۔

"اُس شخص میں ایمان نہیں ہے جس میں امانت داری نہیں اور وہ شخص بے دین ہے جو عہد کا پابند نہیں"

اذا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَائَتْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ۔

"جب نیکی کر کے تجھے خوشی ہو اور بُرائی کر کے تجھے پچھتاوا ہو تو تُو مومن ہے"

الایمانُ الصبرُ والسماحۃُ۔

"ایمان تحمل اور فراخ دلی کا نام ہے"

اَفضلُ الایمانِ ان تحبَّ للہ و تبغضَ للہ و تعملَ لسانکَ فی ذکر اللہ و ان تُحِبَّ للنّاس ما تحبُّ لنفسِکَ و تکرہَ لھم ما تکرہُ لنفسِکَ۔

"بہترین ایمانی حالت یہ ہے کہ تیری دوستی اور دشمنی خدا واسطے کی ہو، تیری زبان پر خدا کا نام جاری ہو اور تو دوسروں کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور اُن کے لیے وہی کچھ ناپسند کرے جو اپنے لیے ناپسند کرتا ہے"

اکمل المؤمنین ایمانًا احسنھم خُلُقًا والطفھم باھلہ۔

"اہلِ ایمان میں سب سے زیادہ کامل ایمان اُس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں اور جو اپنے گھر والوں کے ساتھ حسنِ سلوک میں سب سے بڑھا ہوا ہے"

مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہ ولا یؤذِ جارَہ ومن کان یؤمن باللہ والیوم الاٰخر فلیَقُلْ خیرًا اَوْ لِیَصْمُتْ

"جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہیے، اپنے ہمسائے

---

[1] واضح رہے کہ یہ عربی عبارات نشر نہیں کی گئی تھیں بلکہ ان کا صرف ترجمہ نشر کیا گیا تھا بعد میں جب یہ شائع ہوئی تو ترجمہ کے ساتھ اصل عربی عبارتیں بھی درج کر دی گئیں۔ (مرتبین)

کو تکلیف نہ دینی چاہیے اور اُس کی زبان کھلے تو بھلائی پر کھلے ورنہ چپ رہے۔"

ليس المومن بالطعّان ولا باللعّان ولا الفاحش ولا البذی۔

"مومن کبھی طعنے دینے والا، لعنت کرنے والا اور بدگو اور زبان دراز نہیں ہوا کرتا۔"

يطبع المؤمن على الخصال كلها الا الخيانة والكذب۔

"مومن سب کچھ ہو سکتا ہے مگر جھوٹا اور خائن نہیں ہو سکتا۔"

وَاللّٰهِ لَا يُؤمن، واللّٰه لا يؤمن، واللّٰه لا يؤمن الذی لا يَامَنُ جارُهٗ بَوَائِقَهٗ۔

"خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے جس کی بدی سے اُس کا ہمسایہ امن میں نہ ہو۔"

لَيْسَ الْمُؤمِنُ بِالَّذِی يَشْبَعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰی جَنْبِهٖ۔

"جو شخص خود پیٹ بھر کھالے اور اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا رہ جائے وہ ایمان نہیں رکھتا۔"

مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰی اَنْ يُنْفِذَهٗ مَلَأَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ اَمْنًا وَاِيْمَانًا۔

"جو شخص اپنا غصہ نکال لینے کی طاقت رکھتا ہو اور پھر ضبط کر جائے، اس کے دل کو خدا ایمان اور اطمینان سے لبریز کر دیتا ہے۔"

مَنْ صَلّٰی يُرَائِی فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِی فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِی فَقَدْ اَشْرَكَ۔

"جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا، جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، اور جس نے لوگوں کو دکھانے کے لیے خیرات کی اُس نے شرک کیا۔"

اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا۔ اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔

"چار صفات ایسی ہیں کہ جس میں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے۔ امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ بولے تو جھوٹ بولے۔ عہد کرے تو اُسے توڑ دے۔ اور لڑے تو شرافت کی حد سے گزر جائے۔"

عدلت الشَّهَادَةُ الزُّوْرُ بِالْاِشْرَاكِ بِاللّٰهِ۔

"جھوٹی گواہی اتنا بڑا گناہ ہے کہ شرک کے قریب جا پہنچتا ہے۔"

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَی اللّٰهُ عَنْهُ۔

"اصلی مجاہد وہ ہے جو خدا کی فرمانبرداری میں خود اپنے نفس سے لڑے اور اصلی مہاجر وہ ہے جو

اُن کاموں کو چھوڑ دے جنہیں خدا نے منع فرمایا ہے۔"

أَتَدْرُونَ مَنِ السَّابِقُونَ إِلَى ظِلِّ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ قَالُوا اللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قَالَ الَّذِينَ إِذَا أُعْطُوا الْحَقَّ قَبِلُوهُ وَإِذَا سُئِلُوهُ بَذَلُوهُ وَحَكَمُوا لِلنَّاسِ كَحُكْمِهِمْ لِأَنْفُسِهِمْ۔

"جانتے ہو قیامت کے روز خدا کے سائے میں سب سے پہلے جگہ پانے والے لوگ کون ہوں گے؟ وہ جن کا حال یہ رہا کہ جب بھی حق ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے مان لیا، اور جب بھی حق اُن سے مانگا گیا تو انہوں نے کھلے دل سے دیا، اور دوسروں کے معاملہ میں انہوں نے وہی فیصلہ کیا جو وہ خود اپنے معاملہ میں چاہتے تھے۔"

اِضْمَنُوا لِي سِتًّا مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَضْمَنْ لَكُمُ الْجَنَّةَ. اُصْدُقُوا إِذَا حَدَّثْتُمْ، وَأَوْفُوا إِذَا وَعَدْتُمْ، وَأَدُّوا إِذَا اؤْتُمِنْتُمْ، وَاحْفَظُوا فُرُوجَكُمْ، وَغُضُّوا أَبْصَارَكُمْ وَكُفُّوا أَيْدِيَكُمْ۔

"تم چھ باتوں کی مجھے ضمانت دو، میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ بولو تو سچ بولو۔ وعدہ کرو تو وفا کرو۔ امانت میں پورے اترو۔ بدکاری سے پرہیز کرو۔ بدنظری سے بچو۔ اور ظلم سے ہاتھ روکو۔"

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ خَبٌّ وَلَا بَخِيلٌ وَلَا مَنَّانٌ

"دھوکہ باز اور بخیل اور احسان جتانے والا آدمی جنت میں نہیں جا سکتا۔"

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَكُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ فَالنَّارُ أَوْلَىٰ بِهِ۔

"جنت میں وہ گوشت نہیں جا سکتا جو حرام کے لقموں سے بنا ہو۔ حرام خوری سے پلے ہوئے جسم کے لیے تو آگ ہی زیادہ موزوں ہے۔"

مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُنَبِّهْهُ لَمْ يَزَلْ فِي مَقْتِ اللهِ وَلَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تَلْعَنُهُ

"جس شخص نے عیب دار چیز بیچی اور خریدار کو عیب سے آگاہ نہ کیا اس پر خدا کا غضب بھڑکتا رہتا ہے اور فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔"

لَوْ أَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللهِ ثُمَّ عَاشَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ مَا دَخَلَ الْجَنَّةَ حَتَّى يُقْضَى دَيْنُهُ۔

"کوئی شخص خواہ کتنی ہی بار زندگی پائے اور خدا کی راہ میں جہاد کر کے جان دیتا رہے مگر وہ جنت

میں نہیں جا سکتا اگر اس پر قرض ہو اور وہ ادا نہ کیا گیا ہو۔"

اِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ وَالْمَرْأَةُ بِطَاعَةِ اللّٰهِ سِتِّيْنَ سَنَةً ثُمَّ يَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَيُضَارَّانِ فِي الْوَصِيَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ۔

"مرد ہو یا عورت، اگر انہوں نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال بھی اللہ کی فرمانبرداری میں بسر کیے ہوں لیکن جب ان کی موت کا وقت آیا تو وصیت میں کسی کی حق تلفی کر کے اُسے نقصان پہنچایا تو وہ دونوں دوزخ کے مستحق ہوں گے۔"

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ سَيِّئُ الْمَلَكَةِ۔

"وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جو اپنے ماتحتوں پر بُری طرح افسری کرے گا۔"

اَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّدَقَةِ وَالصَّلٰوةِ؟ إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، وَإِفْسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ۔

"میں تمہیں بتاؤں کہ روزے اور خیرات اور نماز سے بھی افضل کیا چیز ہے؟ وہ ہے بگاڑ میں صلح کرانا۔ اور لوگوں کے باہمی تعلقات میں فساد ڈالنا وہ فعل ہے جو آدمی کی ساری نیکیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔"

اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ أُمَّتِيْ مَنْ يَّأْتِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِصَلٰوةٍ وَصِيَامٍ وَزَكٰوةٍ وَيَأْتِيْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَكَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهُ قَبْلَ اَنْ يُّقْضٰى مَا عَلَيْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ۔

"اصل مُفلس وہ ہے جو قیامت کے روز خدا کے حضور اس حال میں حاضر ہوا کہ اس کے ساتھ نماز، روزہ، زکوٰۃ سب ہی کچھ تھا، مگر اس کے ساتھ وہ کسی کو گالی دے کر آیا تھا، کسی پر بہتان لگا کر آیا تھا، کسی کا مال مار کھایا تھا، کسی کا خون بہایا تھا، اور کسی کو پیٹ کر آیا تھا، پھر خدا نے اس کی ایک ایک نیکی ان مظلوموں پر بانٹ دی اور جب اس سے بھی حساب چکتا نہ ہوا تو ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے اور اسے دوزخ میں جھونک دیا۔"

لَنْ يَّهْلِكَ النَّاسُ حَتّٰى يُعْذِرُوْا مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔

"لوگ کبھی نجات سے محروم نہ ہوں اگر اپنی بُرائیوں کی تاویلیں کر کر کے اپنے نفس کو بُرائیوں پر مطمئن نہ کرتے رہیں۔"

اَلْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ

"جو تاجر قیمتیں چڑھانے کے لیے مال روک رکھے وہ ملعون ہے۔"

مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا أَرْبَعِينَ يَوْمًا يُرِيدُ بِهِ الْغَلَاءَ فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللّٰهِ۔

"جس نے چالیس دن غلہ اس نیت سے روک رکھا کہ قیمتیں چڑھ جائیں تو خدا کا اُس سے اور اس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں۔"

مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا أَرْبَعِينَ يَوْمًا ثُمَّ تَصَدَّقَ بِهِ لَمْ يَكُنْ لَهُ كَفَّارَةً۔

"چالیس دن غلہ روکنے کے بعد اگر آدمی اُس غلہ کو خیرات بھی کر دے تو معاف نہ کیا جائیگا۔"

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اقوال میں سے چند ہیں جو ہم نے محض نمونے کے طور پر آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ حضورؐ نے ایمان سے اخلاق کا اور اخلاق سے زندگی کے تمام شعبوں کا تعلق کس طرح قائم کیا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آپؐ نے ان باتوں کو صرف باتوں کی حد تک ہی نہ رکھا بلکہ عمل کی دنیا میں ایک بڑے ملک کے نظام تمدن و سیاست کو انہی بنیادوں پر قائم کر کے دکھا دیا۔ اور آپؐ کا یہی وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر آپؐ نوع انسانی کے سب سے بڑے رہنما ہیں۔[۵۸]

باب ۵

ختمِ نبوّت

فصل (۱)

ختمِ نبوّت کی حقیقت اور اُس کے دلائل

ختمِ نبوّت کی صحیح توجیہ

جب تک انسانی تمدّن اِس حد پر نہیں پہنچا تھا کہ کسی نبی کا پیغام عام ہو سکے اور انسانوں کی کوئی ایسی اُمّت تیار نہ ہوتی تھی کہ نبی کے پیغام اور اس کی تعلیم اور اس کے اُسوہ کو محفوظ رکھ سکے اور دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا سکے، اس وقت تک سلسلۂ نبوت جاری رہا اور مختلف قوموں اور ملکوں میں نبی بھیجے جاتے رہے۔ مگر جب ایک طرف تو تمدّن اس حد تک ترقی کر گیا کہ ایک نبی کا پیغام عالمگیر ہو سکتا تھا، اور دوسری طرف ہدایتِ حق قبول کرنے والوں کی ایک ایسی اُمّت بھی بن گئی جو کتابِ الٰہی کو اور کتاب کے لانے والے کی سیرت اور اس کی مکمل عملی رہنمائی کو جُوں کی توں محفوظ رکھنے کے قابل تھی تو نبوّت کی خدمت پر کسی مزید آدمی کو مامور کرنے کی حاجت باقی نہ رہی۔[1]

حضورؐ سے پہلے کے دَور کے مخصوص احوال

ابتداءً ہر قوم میں الگ الگ پیغمبر آتے تھے اور ان کی تعلیم ان کی قوم ہی کے اندر محدود رہتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت سب قومیں ایک دوسرے سے الگ تھیں۔ ان کے درمیان زیادہ میل جول نہ تھا۔ ہر قوم اپنے وطن کی حدود میں گویا مقیّد تھی۔ ایسی حالت میں کوئی عام اور مشترک تعلیم تمام قوموں میں پھیلنی بہت مشکل تھی۔ اس کے علاوہ مختلف قوموں کے حالات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ جہالت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس جہالت کی بدولت اعتقاد اور اخلاق کی جو خرابیاں پیدا ہوئی تھیں وہ ہر جگہ مختلف صورت کی تھیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ خدا کے پیغمبر ہر قوم کو الگ الگ تعلیم و ہدایت دیں، آہستہ آہستہ غلط خیالات کو مٹا کر صحیح خیالات کو پھیلائیں۔ رفتہ رفتہ بلا نظر تفصیل

---

[1] جو لوگ ختمِ نبوّت کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ انسانی شعور کو اس کی ضرورت نہیں رہی، وہ دراصل سلسلۂ نبوّت کی توہین اور اس پر حملہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کے معنی یہ ہیں کہ صرف ایک خاص شعوری حالت تک ہی اُس ہدایت کی ضرورت ہے جو نبی لاتے ہیں۔ اُس کے بعد انسان نبوّت کی رہنمائی سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ (مؤلف)

کو چھوڑ کر اعلیٰ درجے کے قوانین کی پیروی سکھائیں اور اس طرح ان کی تربیت کریں جیسے بچوں کی کی جاتی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس طریقہ سے قوموں کی تعلیم میں کتنے ہزار برس صرف ہوتے ہوں گے۔ بہرحال ترقی کرتے کرتے آخرکار وہ وقت آیا جب نوعِ انسانی بچپن کی حالت سے گزر کر سنِ بلوغ کو پہنچنے لگی۔ تجارت، صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ قوموں کے تعلقات ایک دوسرے سے قائم ہو گئے۔ چین و جاپان سے لے کر یورپ و افریقہ کے دور دراز ملکوں تک جہاز رانی اور خشکی کے سفروں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اکثر قوموں میں تحریر کا رواج ہوا، علوم و فنون پھیلے اور قوموں کے درمیان خیالات اور علمی مضامین کا تبادلہ ہونے لگا۔ بڑے بڑے فاتح پیدا ہوئے اور انہوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرکے کئی کئی ملکوں اور کئی کئی قوموں کو ایک سیاسی نظام میں ملا دیا۔ اس طرح وہ دوری اور جدائی جو پہلے انسانی قوموں میں پائی جاتی تھی رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی اور یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کی ایک ہی تعلیم اور ایک ہی شریعت تمام دنیا کے لیے بھیجی جائے۔ اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے انسان کی حالت اس حد تک ترقی کر چکی تھی کہ گویا وہ خود ہی ایک مشترک مذہب مانگ رہا تھا۔ بودھ مت اگرچہ کوئی پورا مذہب نہ تھا اور اس میں محض چند اخلاقی اصول ہی تھے، مگر ہندوستان سے نکل کر وہ ایک طرف جاپان اور منگولیا تک اور دوسری طرف افغانستان اور بخارا تک پھیل گیا اور اس کی تبلیغ کرنے والے دور دور ملکوں تک جا پہنچے۔ اس کے چند صدی بعد عیسائی مذہب پیدا ہوا۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسلام ہی کی تعلیم لے کر آئے تھے، مگر ان کے بعد عیسائیت کے نام سے ایک ناقص مذہب بنا لیا گیا اور عیسائیوں نے اس مذہب کو ایران سے لے کر افریقہ اور یورپ کے دور دراز ملکوں میں پھیلا دیا۔ یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ اس وقت دنیا خود ایک عام انسانی مذہب مانگ رہی تھی اور اس کے لیے یہاں تک تیار ہو گئی تھی کہ جب اسے کوئی پورا اور صحیح مذہب نہ ملا تو اس نے کچے اور ناتمام مذہبوں ہی کو انسانی قوموں میں پھیلانا شروع کر دیا۔

تکمیلِ دین اور ختمِ نبوت

یہ وقت تھا جب تمام دنیا اور تمام انسانی قوموں کے لیے ایک پیغمبر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کی سرزمین میں پیدا کیا گیا اور ان کو اسلام کی پوری تعلیم اور مکمل قانون دے کر اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ اسے سارے جہان میں پھیلا دیں۔

خوب سمجھ لیجیے کہ اس زمانہ میں اسلام کا سچا اور سیدھا راستہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور قرآن مجید کے سوا نہیں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام نوعِ انسانی کے لیے خدا کے پیغمبر ہیں۔ آپ پر پیغمبری کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو جس قدر ہدایت دینا چاہتا تھا وہ سب کی سب اس نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعہ بھیج دی۔ اب جو شخص حق کا طالب ہو اور خدا کا مسلم بندہ بننا چاہتا ہو اس پر لازم ہے کہ خدا کے آخری پیغمبر پر ایمان

لائے جو کچھ تعلیم انہوں نے دی ہے اس کو مانے اور جو طریقہ انہوں نے بتایا ہے اس کی پیروی کرے۔ ؎۱

ختمِ نبوت پر دلائل

پیغمبری کی حقیقت کو جو شخص بھی سمجھتا ہو اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ پیغمبر روز روز پیدا نہیں ہوتے، نہ یہ ضروری ہے کہ ہر قوم کے لیے ہر وقت ایک پیغمبر ہو۔ پیغمبر کی زندگی دراصل اس کی تعلیم و ہدایت کی زندگی ہے۔ جب تک اس کی تعلیم اور ہدایت زندہ ہے، اس وقت تک گویا وہ خود زندہ ہے۔ پچھلے پیغمبروں کا دور ختم ہو گیا کیونکہ جو تعلیم انہوں نے دی تھی دنیا نے اس کو بدل ڈالا۔ جو کتابیں وہ لائے تھے اُن میں سے ایک بھی آج اصل صورت میں موجود نہیں۔ خود ان کے پیرو بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہمارے پاس پیغمبروں کی دی ہوئی اصلی کتابیں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی سیرتوں کو بھی بھلا دیا۔ پچھلے پیغمبروں میں سے کسی ایک کے بھی صحیح اور معتبر حالات آج کہیں نہیں ملتے۔ یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس زمانہ میں پیدا ہوئے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ کیا کام انہوں نے کیے؟ کس طرح زندگی بسر کی؟ کن باتوں کی تعلیم دی؟ اور کن باتوں سے روکا؟ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت جاری ہے، کیونکہ ان کی تعلیم و ہدایت زندہ ہے۔ جو قرآن انہوں نے دیا تھا وہ اپنے اصلی الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں ایک حرف، ایک نقطہ، ایک زیر و زبر کا بھی فرق نہیں آیا۔ ان کی زندگی کے حالات، اُن کے اقوال، اُن کے افعال، سب کے سب محفوظ ہیں اور تیرہ سو برس سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد بھی تاریخ میں اُن کا نقشہ ایسا صاف نظر آتا ہے کہ گویا ہم خود آنحضرتؐ کو دیکھ رہے ہیں۔ دنیا کے کسی شخص کی زندگی بھی اتنی محفوظ نہیں جتنی آنحضرتؐ کی زندگی محفوظ ہے۔ ہم اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ہر وقت آنحضرتؐ کی زندگی سے سبق لے سکتے ہیں۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کسی دوسرے پیغمبر کی ضرورت نہیں۔

ایک پیغمبر کے بعد دوسرا پیغمبر آنے کی صرف تین ہی وجہیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ یا تو پہلے پیغمبر کی تعلیم و ہدایت مٹ گئی ہو اور اس کو پھر پیش کرنے کی ضرورت ہو۔

۲۔ یا پہلے پیغمبر کی تعلیم مکمل نہ ہو اور اس میں ترمیم یا اضافہ کی ضرورت ہو۔

۳۔ یا پہلے پیغمبر کی تعلیم ایک خاص قوم تک محدود ہو اور دوسری قوم یا قوموں کے لیے ایک الگ پیغمبر کی ضرورت ہو۔

یہ تینوں وجہیں اب باقی نہیں رہیں۔

؎۱ ایک چوتھی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک پیغمبر کی موجودگی میں اس کی مدد کے لیے ایک دوسرا پیغمبر بھیجا جائے لیکن ہم نے اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ قرآن مجید میں اس کی صرف دو تین مثالیں مذکور ہیں۔ اور ان مستثنیٰ مثالوں سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مددگار پیغمبر بھیجنے کا کوئی عام قاعدہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ (مؤلف)

۱۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت زندہ ہے اور وہ ذرائع پوری طرح محفوظ ہیں جن سے ہر وقت یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ حضور کا دین کیا تھا، کیا ہدایت لے کر آپ آتے تھے، کس طریق زندگی کو آپ نے رائج کیا، اور کن طریقوں کو آپ نے مٹانے اور بند کرنے کی کوشش فرمائی پس جب کہ آپ کی تعلیم و ہدایت مٹی ہی نہیں تو اس کو از سر نو پیش کرنے کے لیے کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو اسلام کی مکمل تعلیم دی جا چکی ہے۔ اب نہ اس میں کچھ گھٹانے بڑھانے کی ضرورت ہے اور نہ کوئی ایسا نقص باقی رہ گیا ہے جس کی تکمیل کے لیے کسی نبی کے آنے کی حاجت ہو۔ لہٰذا دوسری وجہ بھی دور ہو گئی۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاص قوم کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اور تمام انسانوں کے لیے آپ کی تعلیم کافی ہے۔ لہٰذا اب کسی خاص قوم کے لیے الگ نبی آنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح تیسری وجہ بھی دور ہو گئی۔

اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کہا گیا ہے، یعنی سلسلہ نبوت کو ختم کر دینے والا۔ اب دنیا کو کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر خود چلیں اور دوسروں کو چلائیں، آپ کی تعلیمات کو سمجھیں، ان پر عمل کریں، اور دنیا میں اس قانون کی حکومت قائم کریں جس کو لے کر آنحضرت تشریف لاتے تھے۔[۱۳۵]

تمام نوع انسانی کے لیے ذریعہ ہدایت

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا وَّلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ۔ (سبا: ۲۸)	(اے نبی) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

یعنی تم صرف اسی شہر، یا اسی ملک، یا اسی زمانے کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہو مگر یہ تمہارے ہم عصر اہل وطن تمہاری قدر و منزلت کو نہیں سمجھتے اور ان کو احساس نہیں ہے کہ کیسی عظیم ہستی کی بعثت سے ان کو نوازا گیا ہے۔ یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنے ملک یا اپنے زمانے کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک پوری نوع بشری کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے، مثلاً:

وَاُوۡحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ ؕ (الانعام۔ ۱۹)	اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تم کو اور ہر اس شخص کو متنبہ کروں جسے یہ پہنچے

قُلْ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (الاعراف : ۱۵۸)

اے نبی کہدو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (الانبیاء: ۱۰۷)

اور اے نبیؐ ہم نے نہیں بھیجا تم کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت کے طور پر۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ (الفرقان-۱)

بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے متنبہ کرنے والا ہو۔

یہی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بہت سی احادیث میں مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے مثلاً:

بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ۔ (مسند احمد، مرویات ابوموسیٰ اشعریؓ)

میں گورے اور کالے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

اَمَّا اَنَا فَاُرْسِلْتُ اِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ عَامَّةً وَكَانَ مَنْ قَبْلِيْ اِنَّمَا يُرْسَلُ اِلٰى قَوْمِهٖ۔ (مسند احمد، مرویات عبداللہ بن عمروؓ)

میں عمومیت کے ساتھ تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں حالانکہ مجھ سے پہلے جو نبی بھی گزرا ہے وہ اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔

وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً۔ (بخاری، مسلم، من حدیث جابر بن عبداللہؓ)

پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔

بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ يَعْنِيْ اِصْبَعَيْنِ۔ (بخاری ومسلم)

میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں یہ فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیاں اٹھائیں۔

مطلب یہ تھا کہ جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی حائل نہیں ہے اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان بھی کوئی نبوت نہیں ہے۔ میرے بعد بس قیامت ہی ہے اور قیامت تک میں ہی نبی رہنے والا ہوں۔

ساری انسانیت کے لیے بشیر و نذیر

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ (فاطر: ۲۴)

ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔

پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی تمہارا کام لوگوں کو خبردار کر دینے سے زائد کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی ہوش میں نہیں آتا اور اپنی گمراہیوں ہی میں بھٹکتا رہتا ہے تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اندھوں کو دکھانے اور بہروں کو سنانے کی خدمت تمہارے سپرد نہیں کی گئی ہے۔

اور دوسری آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ارشاد ہوئی ہے یعنی یہ کہ دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی مبعوث نہ فرمائے ہوں۔ سورۂ رعد میں فرمایا۔ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (آیت ۷)۔ سورۂ حجر میں فرمایا: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ (آیت: ۱۰)۔ سورۂ نحل میں فرمایا: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا (آیت۔ ۳۶)۔ سورۂ شعراء میں فرمایا: وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنذِرُونَ (آیت۔ ۲۰۸)۔ مگر اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینی چاہییں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اول یہ کہ ایک نبی کی تبلیغ جہاں جہاں تک پہنچ سکتی ہو وہاں کے لیے وہی نبی کافی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر بستی اور ہر ہر قوم میں الگ الگ ہی انبیاء بھیجے جائیں۔ دوم یہ کہ ایک نبی کی دعوت و ہدایت کے آثار اور اس کی رہنمائی کے نقوش قدم جب تک دنیا میں محفوظ رہیں اس وقت تک کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر نسل اور ہر پشت کے لیے الگ نبی بھیجا جائے۔ ۞

آپ نوع انسانی کے لیے خدا کی رحمت ہیں

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ	"اے محمدؐ، ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا
(الانبیاء۔ آیت: ۱۰۷)	والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔"

دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔" دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دراصل نوع انسانی کے لیے خدا کی رحمت اور مہربانی ہے کیونکہ آپ نے آکر غفلت میں پڑی ہوئی دنیا کو چونکایا ہے، اور اسے وہ علم دیا ہے جو حق اور باطل کا فرق واضح کرتا ہے اور اس کو بالکل غیر مشتبہ طریقہ سے بتا دیا ہے کہ اس کے لیے تباہی کی راہ کونسی ہے اور سلامتی کی راہ کونسی۔ کفار مکہ حضورؐ کی بعثت کو اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس شخص نے ہماری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے، ناخن سے گوشت جدا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر فرمایا گیا کہ نادانو، تم جسے زحمت سمجھ رہے ہو، یہ درحقیقت تمہارے لیے خدا کی رحمت ہے۔ ۞

آپ تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ	اے محمدؐ، کہو کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف
إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ	اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین و آسمانوں کی بادشاہی

فِی الْاَرْضِ ۔ (الاعراف : [illegible]) [illegible] مالک ہے ۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس ۔ ۴۷) ہر اُمّت کے لیے ایک رسول ہے ۔

"اُمّت" کا لفظ یہاں محض قوم کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایک رسول کی آمد کے بعد اس کی دعوت جن جن لوگوں تک پہنچے وہ سب اس کی اُمّت ہیں۔ نیز اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ رسول ان کے درمیان زندہ موجود ہو، بلکہ رسول کے بعد بھی جب تک اس کی تعلیم موجود رہے اور ہر شخص کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن ہو کہ وہ درحقیقت کس چیز کی تعلیم دیتا ہے، اس وقت تک دنیا کے سب لوگ اس کی اُمّت ہی قرار پائیں گے اور ان پر وہ حکم ثابت ہوگا جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد تمام دنیا کے انسان آپؐ کی اُمّت ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک قرآن اپنی خالص صورت میں شائع ہوتا رہے گا۔ اسی وجہ سے آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ "ہر قوم میں ایک رسول ہے" بلکہ ارشاد یہ ہوا ہے کہ "ہر اُمّت کے لیے ایک رسول ہے۔"[88]

اللہ نے ہر بستی میں ایک ایک نبی بھیجنے کے بجائے ساری دنیا کے لیے آپؐ ہی کو نبی مقرر کیا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۔ (الفرقان : ۵۱) اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک نذیر اٹھا کھڑا کرتے ۔

یعنی ایسا کرنا ہماری قدرت سے باہر نہ تھا، ہم چاہتے تو جگہ جگہ نبی پیدا کر سکتے تھے، مگر ہم نے ایسا نہیں کیا اور دنیا بھر کے لیے ایک نبی مبعوث کر دیا۔ جس طرح ایک سورج سارے جہان کے لیے کافی ہو رہا ہے اسی طرح یہ اکیلا آفتابِ ہدایت ہی سب جہان والوں کے لیے کافی ہے۔[89]

قرآن پاک میں حضورؐ کو "خبردار کرنے والا"، "متنبہ کرنے والا"، "غفلت اور گمراہی کے بُرے نتائج سے ڈرانے والا" کے خطاب سے نوازا گیا ہے اور ساتھ ہی سارے جہان والوں کے لیے نذیر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی دعوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کسی ایک ملک کے لیے نہیں، پوری دنیا کے لیے ہے اور اپنے ہی زمانے کے لیے نہیں، آنے والے تمام زمانوں کے لیے ہے۔ یہ مضمون متعدد مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا "اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں" (الاعراف، آیت ۱۵۸)۔ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۔ "میری طرف یہ قرآن بھیجا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تم کو خبردار کر دوں اور جس جس کو بھی یہ پہنچے" (الانعام، ۱۹)۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا "ہم نے تم کو سارے ہی انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے" (سبا، آیت ۲۸)۔ اور اسی مضمون کو خوب کھول کھول کر نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے احادیث میں بار بار بیان فرمایا ہے کہ بُعِثْتُ اِلَی الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ "میں کالے اور گورے سب کی طرف بھیجا گیا ہوں" اور کَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِہٖ خَاصَّۃً وَبُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ عَامَّۃً۔ "پہلے ایک نبی خاص طور پر اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ اور میں عام طور پر تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں" (بخاری ومسلم) وَاُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَّۃً وَّخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ۔ "میں ساری خلقت کی طرف بھیجا گیا ہوں اور ختم کر دیئے گئے میری آمد پر انبیاء" (مسلم)

آپؐ ہی خدا کے آخری نبی ہیں

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُھُمْ وَھُمْ فِیْ غَفْلَۃٍ مُّعْرِضُوْنَ ۔ (الانبیاء۔۱)

قریب آ گیا ہے لوگوں کے حساب کا وقت اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔

مراد ہے قربِ قیامت یعنی اب وہ وقت دور نہیں ہے جب لوگوں کو اپنا حساب پیش کرنے کے لیے اپنے رب کے آگے حاضر ہونا پڑے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس بات کی علامت ہے کہ نوعِ انسانی کی تاریخ اب اپنے آخری دور میں داخل ہو رہی ہے۔ اب وہ اپنے آغاز کی بہ نسبت اپنے انجام سے قریب تر ہے۔ آغاز اور وسط کے مرحلے گزر چکے ہیں اور آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ آپؐ نے اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے فرمایا: بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَۃُ کَھَاتَیْنِ "میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں" یعنی میرے بعد اب بس قیامت ہی ہے، کسی اور نبی کی دعوت بیچ میں حائل نہیں ہے، سنبھلنا ہے تو میری دعوت پر سنبھل جاؤ۔ کوئی اور ہادی اور بشیر و نذیر آنے والا نہیں ہے۔

آپؐ پر نبوت کے ختم ہونے کے متعلق ایک اہم اشارہ

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ ط قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا۔ (آل عمران۔ ۸۱)

یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج ہم نے تمہیں کتاب و حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی" یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا "کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو؟ اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟" انہوں نے کہا "ہاں ہم اقرار کرتے ہیں"۔

مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے ۔۔۔۔ اور جو عہد پیغمبر سے لیا گیا ہو وہ لامحالہ

اس کے پیروؤں پر بھی آپ سے آپ عائد ہو جاتا ہے ۔۔۔۔ کہ جو نبی ہماری طرف سے اُس دین کی تبلیغ و اقامت کے لیے بھیجا جائے جس کی تبلیغ و اقامت پر تم مامور رہتے ہو، اس کا تمہیں ساتھ دینا ہوگا۔ اُس کے ساتھ تعصب نہ برتنا۔ اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا۔ حق کی مخالفت نہ کرنا بلکہ جہاں جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے اٹھایا جائے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی اُمت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کوئی عہد لیا گیا ہو۔ یا آپ نے اپنی اُمت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔[لہ]

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (الاعراف: ۳۵)

اے بنی آدم، یاد رکھو، اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سُنا رہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویّہ کی اصلاح کرلیگا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

یہ بات قرآن مجید میں ہر جگہ اُس موقع پر ارشاد فرمائی گئی ہے جہاں آدم و حوا علیہما السلام کے جنت سے اُتارے جانے کا ذکر آیا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ، آیات ۳۸-۳۹۔ طٰہٰ، آیات ۱۲۳-۱۲۴) لہٰذا یہاں بھی اس کو اسی موقع سے متعلق سمجھا جائے گا یعنی نوعِ انسانی کی زندگی کا آغاز جب ہو رہا تھا اسی وقت یہ بات صاف طور پر سمجھا دی گئی تھی۔ [۹۲] ص

[لہ] نبوت کا معاملہ جیسا کچھ نازک ہے، ظاہر ہے۔ اس کو ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے ایمان و کفر اور اس کی نجات یا بربادی کا انحصار ہے۔ لیکن قرآن میں بجائے اس کے کہ حضور کے بعد کسی نبی کے آنے کی خبر دی جاتی، اُلٹا یہ فرمایا گیا کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ اپنی اُمت کو متنبہ کرتے کہ بعد کے آنے والے کسی نبی پر ایمان لانے کی ہدایت کی ہوتی، بکثرت احادیث میں آپ نے تصریح فرمائی کہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے اور آپ پر نبوت ختم ہو گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کو ہمارے دین و ایمان سے آخر کیا دشمنی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا، مگر اللہ اور رسول دونوں ایسی باتیں فرماتے جن کی وجہ سے ہم اس کو نہ مان کر کفر اور عذاب آخرت میں مبتلا ہوتے۔ (مؤلف)

منکرینِ ختمِ نبوّت کے خلاف چند آیات سے استدلال

(۱) وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ۔ (الاحزاب آیت ۷)

اور (اے نبیؐ) یاد رکھو اُس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے، تم سے بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بن مریم سے بھی۔ سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات یاد دلاتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السّلام کی طرح آپ سے بھی اللہ تعالیٰ ایک پختہ عہد لے چکا ہے جس کی آپ کو سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اِس عہد سے کونسا عہد مُراد ہے؟ اُوپر سے جو سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے اُس پر غور کرنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مُراد یہ عہد ہے کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی خود اطاعت کرے گا اور دوسروں سے کرائے گا، اللہ کی باتوں کو بےکم و کاست پہنچائے گا اور انہیں عملاً نافذ کرنے کی سعی و کوشش میں کوئی دریغ نہ کرے گا۔ قرآن مجید میں اس عہد کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے مثلاً:

(۲) شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۔ (الشوریٰ: ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تمہارے لیے وہ دین جس کی ہدایت کی تھی اس نے نوحؑ کو، اور جس کی وحی کی گئی (اے محمدؐ) تمہاری طرف اور جس کی ہدایت کی گئی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اس تاکید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ کرو۔

(۳) وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ (آلِ عمران - ۱۸۷)

اور یاد کرو اس بات کو کہ اللہ نے عہد لیا تھا اُن لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لوگ اس کی تعلیم کو بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔

(۴) وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۔ (البقرہ۔ ۸۳)

اور یاد کرو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو گے۔

(۵) أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَابِ ۔۔۔۔ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۔ (الاعراف: ۱۶۹-۱۷۱)

کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا؟ ... مضبوطی کے ساتھ تھامو اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے اور یاد رکھو اس ہدایت کو جو اس میں ہے، توقع ہے کہ تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے۔

(۲) وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۔ (المائدہ۔ ۷)

"اور اے مسلمانو، یاد رکھو اللہ کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے اور اس عہد کو جو اس نے تم سے لیا ہے جبکہ تم نے کہا ہم نے سنا اور اطاعت کی"

اس عہد کو اس سیاق و سباق میں اللہ تعالیٰ جس وجہ سے یاد دلا رہا ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شماتتِ اعداء کے اندیشے سے منہ بولے رشتوں کے معاملہ میں جاہلیت کی رسم توڑتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ آپ کو بار بار یہ شرم لاحق ہو رہی تھی کہ معاملہ ایک خاتون سے شادی کرنے کا ہے، میں خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ محض اصلاحِ معاشرہ کی خاطر یہ کام کروں، مگر دشمن یہی کہیں گے کہ یہ کام دراصل نفس پرستی کی خاطر کیا گیا ہے اور مصلح کا لبادہ اس شخص نے محض فریب دینے کے لیے اوڑھ رکھا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ حضورؐ سے فرما رہا ہے کہ تم ہمارے مقرر کیے ہوئے پیغمبر ہو، تمام پیغمبروں کی طرح تم سے بھی ہمارا یہ پختہ معاہدہ ہے کہ جو کچھ بھی حکم ہم دیں گے اس کو خود بجا لاؤ گے اور دوسروں کو اس کی پیروی کا حکم دو گے، لہٰذا تم کسی کے طعن و تشنیع کی پروا نہ کرو، کسی سے شرم اور خوف نہ کرو، اور جو خدمت ہم تم سے لینا چاہتے ہیں اسے بلا تامل انجام دو۔

ایک گروہ اس میثاق سے وہ میثاق مراد لیتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاء اور ان کی امتوں سے رسالت کے لیے لیا گیا تھا کہ وہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے۔ اس تاویل کی بنیاد پر اس گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حضورؐ سے بھی یہ میثاق لیا گیا ہے کہ آپ کے بعد جو نبی آئے آپ کی امت اس پر ایمان لائے گی۔ لیکن آیت کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ یہ تاویل بالکل غلط ہے۔ جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت آئی ہے اس میں یہ کہنے کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے کہ آپ کے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور آپ کی امت کو ان پر ایمان لانا چاہیے۔ یہ مفہوم اس کا لیا جائے تو یہ آیت یہاں بالکل بے جوڑ اور بے محل ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں کوئی صراحت ایسی نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہاں میثاق سے کونسا میثاق مراد ہے۔ لامحالہ اس کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے ہم کو قرآن مجید کے دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرنا ہوگا جہاں انبیاء سے لیے ہوئے مواثیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگر سارے قرآن میں صرف ایک ہی میثاق کا ذکر ہوتا اور وہ بعد کے آنے والے انبیاء پر ایمان لانے کے بارے میں ہوتا تو یہ خیال کرنا درست ہوتا کہ یہاں بھی میثاق سے مراد وہی میثاق ہے۔ لیکن قرآن پاک کو جس شخص نے بھی آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کتاب میں بہت سے میثاقوں کا ذکر ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں سے لیے گئے ہیں۔ لہٰذا ان مختلف مواثیق میں سے وہ میثاق یہاں مراد لینا صحیح ہوگا جو اس سیاق و سباق سے مناسبت رکھتا ہو، نہ کہ وہ میثاق جس کے ذکر کا یہاں کوئی موقع نہ ہو۔ اسی طرح کی غلط تاویلیں سے

یہ بات کھل جاتی ہے کہ بعض لوگ قرآن سے ہدایت لینے نہیں بیٹھتے بلکہ اُسے ہدایت دینے بیٹھ جاتے ہیں۔

(۷) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ۔

(یونس: ۱۷)

پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

بعض نادان لوگ "فلاح" کو طویل عمر، یا دنیوی خوشحالی، یا دنیوی فروغ کے معنی میں لے لیتے ہیں، اور پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کر کے جیتا رہے، یا دنیا میں پھلے پھولے، یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو، اسے نبی برحق مان لینا چاہیے کیونکہ اس نے فلاح پائی۔ اگر وہ نبی برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعویٰ کرتے ہی مار ڈالا جاتا، یا بھوکوں مار دیا جاتا اور دنیا میں اس کی بات چلنے ہی نہ پاتی۔ لیکن یہ احمقانہ استدلال صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاح "فلاح" کا مفہوم جانتا ہو، نہ اُس قانونِ امہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لیے مقرر فرمایا ہے، اور نہ یہی سمجھتا ہو کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ فقرہ کس معنی میں آیا ہے۔

اوّل تو یہ بات کہ "مجرم فلاح نہیں پا سکتے" اس سیاق میں اس حیثیت سے فرمائی ہی نہیں گئی ہے کہ یہ کسی کے دعوائے نبوت کو پرکھنے کا معیار ہے جس سے عام لوگ جانچ کر خود فیصلہ کر لیں کہ جو مدعی نبوت "فلاح" پا رہا ہو اس کے دعوے کو مانیں اور جو فلاح نہ پا رہا ہو اس کا انکار کر دیں۔ بلکہ یہاں تو یہ بات اس معنی میں کہی گئی ہے کہ "میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی، اس لیے میں خود تو یہ جرم نہیں کر سکتا کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کروں، البتہ تمہارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم سچے نبی کو جھٹلانے کا جرم کر رہے ہو اس لیے تمہیں فلاح نصیب نہیں ہوگی۔"

پھر فلاح کا لفظ بھی قرآن میں دنیوی فلاح کے محدود معنی میں نہیں آیا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ پائیدار کامیابی ہے جو کسی خسران پر منتج ہونے والی نہ ہو، قطع نظر اس سے کہ دنیوی زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں اس کے اندر کامیابی کا کوئی پہلو ہو یا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک داعیٔ ضلالت دنیا میں مزے سے جیے، خوب پھلے پھولے اور اس کی گمراہی کو بڑا فروغ نصیب ہو، مگر یہ قرآن کی اصطلاح میں فلاح نہیں، عین خسران ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک داعیٔ حق دنیا میں سخت مصیبتوں سے دوچار ہو، شدتِ آلام سے نڈھال ہو کر یا ظالموں کی دست درازیوں کا شکار ہو کر دنیا سے جلدی ہی رخصت ہو جائے، اور کوئی اسے مان کر نہ دے، مگر یہ قرآن کی زبان میں خسران نہیں عین فلاح ہے۔

علاوہ بریں قرآن میں جگہ جگہ یہ بات پوری تشریح کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کیا کرتا بلکہ انہیں سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے، اور اگر وہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اور زیادہ بگڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے اور بسا اوقات ان کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی تمام شرارتیں کو پوری طرح ظہور میں لے آئیں اور اپنے عمل کی بنا پر اس سزا کے مستحق ہو جائیں جس کے وہ اپنی بُری صفات کی وجہ سے فی الحقیقت مستحق ہیں۔ پس اگر کسی جھوٹے مدعی کی رسی دراز ہو رہی ہو اور اس پر "بہبود و فلاح" کی برسات برس رہی ہو تو سخت غلطی ہوگی اگر اس کی اس حالت کو اس کے برسرِ ہدایت ہونے کی دلیل سمجھا جائے۔ خدا کا قانونِ امہال و استدراج جس طرح تمام مجرموں کے لیے عام ہے اسی طرح جھوٹے مدعیانِ نبوت کے لیے بھی ہے اور ان کے اس سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ پھر شیطان کو قیامت تک کے لیے جو مہلت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس میں بھی یہ استثناء کہیں مذکور نہیں ہے کہ تیرے اور تو سارے فریب چلنے دیے جائیں گے لیکن اگر تو اپنی طرف سے کوئی نبی کھڑا کرے گا تو یہ فریب نہ چلنے دیا جائے گا۔

ممکن ہے کوئی شخص ہماری اس بات کے جواب میں وہ آیت پیش کرے جو سورۃ الحاقہ آیات ۴۴۔۴۶ میں ارشاد ہوئی ہے کہ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ۔ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ "یعنی اگر محمد نے خود گھڑ کر کوئی بات ہمارے نام سے کہی ہوتی تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگِ دل کاٹ ڈالتے"۔ لیکن اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ جو شخص فی الواقع خدا کی طرف سے نبی مقرر کیا گیا ہو وہ اگر جھوٹی بات گھڑ کر وحی کی حیثیت سے پیش کرے تو فوراً پکڑا جائے۔ اس سے یہ استدلال کرنا کہ جو مدعیٔ نبوت پکڑا نہیں جا رہا ہے وہ ضرور سچا ہے، ایک منطقی مغالطے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خدا کے قانونِ امہال و استدراج میں جو استثناء اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے وہ صرف سچے نبی کے لیے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے وہ بھی اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سرکاری ملازموں کے لیے حکومت نے جو قانون بنایا ہو اس کا اطلاق صرف انہی لوگوں پر ہوگا جو واقعی سرکاری ملازم ہوں۔ رہے وہ لوگ جو جعلی طور پر اپنے آپ کو ایک سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے پیش کریں، تو ان پر ضابطۂ ملازمت کا انطباق نہ ہوگا بلکہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو ضابطۂ فوجداری کے تحت عام بدمعاشوں اور مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں سورۃ الحاقہ کی اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ بھی اس غرض کے لیے نہیں فرمایا گیا کہ لوگوں کو نبی کے پرکھنے کا معیار بتایا جائے کہ اگر پردۂ غیب سے کوئی ہاتھ نمودار ہو کر اس کی رگِ دل اچانک کاٹ دے تو سمجھیں جھوٹا ہے ورنہ مان لیں کہ سچا ہے۔ نبی کے صادق یا کاذب ہونے کی جانچ اگر اس کی سیرت، اس کے کام اور اس چیز سے جو وہ پیش کر رہا ہو ممکن نہ ہوتی تو ایسے غیر معقول معیار تجویز کرنے

کی ضرورت پیش آسکتی تھی ۔ ؎۱۹۶۱ء

خاتم النبیّین کے بعد دعواتے نبوّت

سوال: "ترجمان القرآن" (جنوری، فروری ۱۹۶۱ء) کے ص ۲۴۳ پر آپ نے لکھا ہے کہ "میرا تجربہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی جھوٹ کو فروغ نہیں دیتا۔ میرا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ . . . . جن لوگوں کو میں صداقت و دیانت سے بے پروا اور خوفِ خدا سے خالی پاتا ہوں، ان کی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیتا . . . . خدا ہی ان سے بدلہ لے سکتا ہے . . . . . . اور ان کا پردہ ان شاء اللہ دنیا ہی میں فاش ہوگا"۔

میں عرض کروں کہ میں نے جماعت احمدیہ کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کام سے دلچسپی لی ہے۔ میرے مندرجہ ذیل استفسارات اسی ضمن میں ہیں:

۱۔ یہ صرف آپ ہی کا تجربہ نہیں، بلکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "اللہ تعالیٰ کاذبوں سے محبت نہیں کرتا" اور "اللہ کی لعنت ہے جھوٹوں پر"۔ اور پھر اس قسم کے جھوٹوں پر کہ "وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ . . . . ." ان کی سزا تو فوری گرفت اور وبال ہے (لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ، الحاقہ: ۴۶)۔ اس صورت میں اگر مرزا صاحب جھوٹے تھے تو کیا وجہ ہے کہ (الف) ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی گرفت نہیں کی؟ (ب) ان کی جماعت بڑھ رہی ہے اور مرزا صاحب کے مشن کو جو مسلمانوں کے نزدیک گمراہ کن ہے، تقویت پہنچ رہی ہے اور اب تو اس جماعت کی جڑیں بیرونی ممالک میں مضبوط ہو گئی ہیں (ج) مرزا صاحب کے پیغام کو ساٹھ سال ہو گئے ہیں۔ ہم کب تک خدائی فیصلے کا انتظار کریں؟ فی الحال تو وہ ترقی کر رہے ہیں (د) جو جماعتیں یا افراد اس گروہ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ کیوں اسے ترک نہیں کر دیتے اور معاملہ خدا پر نہیں چھوڑ دیتے؟

۲۔ صفحہ ۲۴۴ پر آپ کی جماعت کے ایک جرمنی نژاد ممبر نے برلن میں جماعت احمدیہ کے ساتھ تبلیغِ اسلام میں تعاون کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ بھی ان کی تبلیغِ اسلام کو صحیح سمجھتے ہیں تو پاکستان میں ان کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے؟

جواب: آپ سرسری نظر سے ایک مدعیٔ نبوت کے معاملے کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ طریقہ ایسے اہم معاملے پر رائے قائم کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ تو سراسر ایک جھوٹے الزام کے بارے میں تھا جو بعض خود غرض لوگوں نے میرے اوپر لگایا تھا۔ اس بات کو آپ چسپاں کر رہے ہیں ایک ایسے شخص کے معاملے پر جس نے فی الواقع نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ ایک مدعیٔ نبوت کے معاملے میں لامحالہ دو صورتوں میں سے ایک صورت پیش آتی ہے: اگر وہ سچا ہے تو اس کو نہ ماننے والا کافر، اور اگر وہ جھوٹا ہے

[illegible] کو ماننے والا کافر۔ ایک ایسے نازک معاملے کا فیصلہ آپ صرف اتنی سی بات پر کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی تک ان پر کوئی گرفت نہیں کی، اور ان کی جماعت بڑھ رہی ہے، اور یہ کہ "ہم کب تک خدا کے فیصلہ کا انتظار کریں"۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے اور اس کی جماعت ترقی کرتی نظر آئے اور آپ کی تجویز کردہ مدتِ انتظار کے اندر اس پر خدا کی طرف سے گرفت نہ ہو تو بس یہ باتیں اس کو نبی مان لینے کے لیے کافی ہیں؟ کیا آپ کے ذہن میں نبوت کو جانچنے کے یہی معیار ہیں؟

آیت وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ سے جو استدلال آپ نے کیا ہے وہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو حقیقت میں اللہ کے نبی ہیں، اگر خدا کی وحی کے بغیر کوئی بات خود تصنیف کر کے خدا کے نام سے پیش کریں تو ان کی رگِ گلو کاٹ دی جائے گی۔ اس سے یہ معنی نکالنا صحیح نہیں ہے کہ جو شخص حقیقت میں نبی نہ ہو اور غلط طور پر اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کرے اس کی رگِ گلو بھی کاٹی جائے گی۔ نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سچے اور جھوٹے نبی کی پہچان کے لیے یہ بات ایک معیار کے طور پر پیش نہیں کی ہے کہ جس مدعیِ نبوت کی رگِ گلو نہ کاٹی جائے وہ سچا نبی ہے اور جس کی رگ کاٹ دی جائے وہ جھوٹا مدعی۔ قرآن کی آیتوں میں تاویل کی یہ کھینچ تان، جو ظاہر ہے کہ آپ کی اپنی اپج کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مرزا صاحب کی جماعت سے ہی آپ نے سیکھی ہے، بجائے خود اس بات کی علامت ہے کہ یہ جماعت خوفِ خدا سے کس قدر خالی ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اس کی بات کو ان معیاروں پر نہیں جانچا جائے گا جو آپ نے پیش کیے ہیں بلکہ اسے پورے اطمینان کے ساتھ اس بنیاد پر رد کر دیا جائے گا کہ قرآن و احادیث صحیحہ اس معاملے میں قطعی ناطق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ میں ان دلائل سے بھی واقف ہوں جو مرزا صاحب اور ان کے متبعین نے بابِ نبوت کے کھلے ہونے پر قائم کیے ہیں۔ مگر آپ سے صاف عرض کرتا ہوں کہ ان دلائل سے اگر کوئی متاثر ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایک بے علم یا کم علم آدمی ہی ہو سکتا ہے، ایک صاحبِ علم آدمی کو تو ان کے دلائل دیکھ کر صرف ان کے جہل ہی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

ترجمان القرآن میں جرمنی کا جو مکتوب شائع ہوا ہے اس کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ہر بات ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ ہمارا مدعا تو یہ تھا کہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کو اپنے جرمن نو مسلم بھائیوں کی حالت سے آگاہ کیا جائے اور ان کی مدد پر اُکسایا جا سکے۔ وہ لوگ بے چارے نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، ان کو کیا خبر کہ دنیائے اسلام میں کس کس قسم کے فتنے اٹھ رہے ہیں۔ ان کو تو اسلام کے نام سے جو چیز جہاں سے بھی ملے گی وہ اس سے اپنی تشنگی بجھانے کی کوشش کریں گے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ انہیں اسلام کے متعلق صحیح لٹریچر فراہم کر دیں۔

ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ بے چارے نا واقفیت میں کسی فتنے کا شکار نہ ہو جائیں۔

سوال: آپ کا جواب ملا۔ افسوس کہ وہ میری تشفی کے لیے کافی نہیں ہے۔ میں نے آپ ہی کی زیر تحقیق حقیقت "خدا تعالیٰ خود جھوٹے کو سزا دے گا" کی روشنی میں پوچھا تھا کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی جو سب مسلمانوں کے نزدیک کاذب ہیں ان پر کیوں خدا تعالیٰ کی گرفت نہیں ہوئی۔ اور یہ کہ خدا تعالیٰ کس طرح اپنے بندوں کو اتنے عرصے سے گمراہ ہوتے دیکھ رہا ہے۔

میں مرزا صاحب کی تصنیف کردہ تقریباً ۲۵ کتب تحقیقی نظر سے دیکھ چکا ہوں، اور اس کے بعد علمائے اسلام کی بعض کتب بھی ان کے رد میں دیکھی ہیں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آپ کی کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں پڑھی۔ ویسے علماء کی کتب کے متعلق میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ:

انہوں نے مرزا صاحب کی تحریروں میں تحریف کر کے غلط مطالب ان کی طرف منسوب کیے ہیں۔ جس موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اس پر انہیں عبور نہیں تھا بعد میں میری خط و کتابت پر یہ لوگ عموماً خاموش رہے ہیں۔ مرزا صاحب کی کتب سے میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کی ذات اور اقوال یعنی ظاہر و باطن آنحضور صلعم کے عشق سے پُر ہے۔ میں اس بنیاد کو لے کر مرزا صاحب کے دعوے کی طرف بڑھا تھا اور اب مجھ پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ:

۱۔ مرزا صاحب کے دعاوی قرآن اور اقوال نبویؐ کے خلاف نہیں۔

۲۔ مرزا صاحب کی نبوت آنحضرتؐ کی شان گھٹانے کے لیے نہیں، بلکہ اگر موسوی فیضان سے تورات کے ذریعہ نبی ہو سکتے ہیں تو مقام محمدیؐ کے مطابق کاؤں کاؤں ایسے لوگ ہونے چاہییں جو بتائیں کہ ہم نے شریعت محمدیہ پر عمل کر کے مکالمہ الٰہیہ حاصل کیا ہے۔ خود مرزا صاحب نے فرمایا ہے کہ ؎

آں چشمہ رواں کہ بخلق خدا دہیم
یک قطرہ ز بحر کمال محمد است

اب آپ نے پھر مجھے مرزا صاحب کے دعوے کو پرکھنے کی اجازت دی ہے، کیا آپ براہ کرم قرآن کریم سے میری رہنمائی کے لیے مرزا صاحب کے کسی ایک دعوے کو جھوٹا ثابت کر دیں گے؟

جواب: پہلا خط آپ کی تشفی کے لیے کافی ہو جاتا، اگر آپ تشفی چاہتے۔ میں نے ترجمان القرآن میں جو کچھ لکھا تھا وہ تو ان لوگوں کے بارے میں تھا جو مجھ پر ایک جھوٹا بہتان لگا رہے ہیں، اور اس میں اللہ تعالیٰ پر یہ اعتماد ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ ضرور جھوٹوں کو سزا دے گا۔ مگر آپ اسے ایک مدعی نبوت کے دعوے کو جانچنے کے لیے معیار ٹھیرا رہے ہیں اور معیار بھی اس شان کے ساتھ کہ اگر مدعی کو سزا ملتی ہوئی نظر نہ آئے تو ضرور

سچا ہے؟ کیا واقعی لوگوں کے صادق و کاذب اور راہ یاب و گمراہ ہونے کے لیے یہ کوئی صحیح معیار ہے کہ جسے دُنیا میں سزا مل جائے وہ جھوٹا اور گمراہ، اور جسے سزا نہ ملے وہ سچا اور ہدایت یافتہ؟

آپ عجیب بات فرما رہے ہیں کہ مرزا صاحب کے دعوے کو ۷۰ سال گزر چکے ہیں، آخر کب تک کوئی انکار کرے۔ دعوائے نبوت کی صداقت کو پرکھنے کی یہ عجیب کسوٹی جو آپ نے تجویز فرمائی ہے ذرا اس کی توضیح تو فرمایئے کہ ایک جھوٹے مدعی کو آپ کے نزدیک کس قسم کی سزا ملنی چاہیے؟ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ غیب سے ایک ہاتھ بڑھے اور اس کی رگِ گلو کاٹ دے، تو میں عرض کروں گا کہ یہ سزا تو مسیلمہ کذاب کو بھی نہیں ملی جس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ جو مدعی نبوت انسانوں کے ہاتھ سے مارا جائے وہ جھوٹا ہے، تو ان انبیاء کے متعلق آپ کیا فرمائیں گے جن کی نبوت کی تصدیق خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا ہے کہ ان کی قوم نے انہیں قتل کر دیا؟ قرآن میں یہ آیات تو آپ کی نظر سے گزری ہی ہوں گی کہ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آل عمران: ۱۸۳) اور فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ (النساء: ۱۵۵)۔ ان آیات کی روشنی میں آپ کو ایک مرتبہ پھر اپنے اندازِ فکر پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ نبی کا دعویٰ اس طرح کے معیاروں پر نہیں جانچا جاتا۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ اس سے پہلے آئے ہوئے کلامِ الٰہی کی روشنی میں اُس کا مقام کیا ہے؟ وہ چیز کیا لایا ہے؟ اور اُس کی زندگی کیسی ہے؟ ان معیاروں پر کوئی شخص پورا نہ اترتا ہو تو آپ سخت غلطی کریں گے اگر اس کے دعوے کو صرف اس بنا پر مان لیں گے کہ آپ کی آنکھوں نے اسے اس دنیا میں سزا ملتے نہیں دیکھا۔

جو تین معیار میں نے اوپر بیان کیے ہیں ان میں سے مؤخر الذکر دو معیار ایسی صورت میں سرے سے قابلِ لحاظ ہی نہیں رہتے جبکہ پہلے ہی معیار سے کسی مدعی نبوت کا دعویٰ بخیریت گزر سکے۔ جب قرآن اور احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نیا نبی نہیں آسکتا تو یہ دیکھنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے کہ حضورؐ کے بعد دعوائے نبوت کرنے والا کیا لایا ہے اور کیسا انسان ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب میرے نزدیک دوسرے اور تیسرے معیار کے لحاظ سے بھی مقامِ نبوت سے اس قدر فروتر ہیں کہ باب نبوت کھلا بھی ہوتا تو کم از کم کوئی معقول آدمی تو ان پر نبوت کا گمان نہیں کر سکتا تھا، لیکن میں اس بحث کو قرآن و حدیث کے ناطق فیصلے کے بعد غیر ضروری بھی سمجھتا ہوں اور خدا و رسول کے مقابلے میں گستاخی بھی۔

یہ سوال کہ قرآن و حدیث سے باب نبوت کے قطعی طور پر بند ہونے کے دلائل کیا ہیں، اس کا متحمل نہیں ہے کہ ایک خط میں اس کا جواب دیا جاسکے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے فرصت دی تو ان شاء اللہ اس موضوع پر

ایک مفصل مضمون لکھوں گا، ورنہ سورۂ احزاب کی تفسیر میں تو یہ بحث آ ہی رہی ہے۔[1]

ختمِ نبوت کے خلاف قادیانیوں کی ایک اور دلیل

سوال: تفہیم القرآن، سورۂ آل عمران ص ۲۶۰، آیت "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ ...... الخ" کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے حاشیہ نمبر ۶۹ یوں درج کیا ہے کہ "یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے، اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نہ قرآن میں، نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد لیا گیا ہو، یا آپ نے اپنی امت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔"

اس عبارت کا مطالعہ کرنے کے بعد دل میں یہ بات آئی کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نہیں فرمایا لیکن خود قرآن مجید میں سورۂ احزاب میں ایک میثاق کا ذکر یوں آتا ہے: "وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ ...... الخ" یہاں لفظ "منک" کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے۔ یہ میثاق وہی ہے جس کا ذکر سورۂ آل عمران میں ہو چکا ہے۔ ہر دو سورتوں یعنی آل عمران اور الاحزاب کی مذکورہ بالا آیات میں میثاق کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی میثاق جو دوسرے انبیاء سے لیا گیا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی لیا گیا ہے۔

دراصل یہ سوال احمدیوں کی ایک کتاب پڑھنے سے پیدا ہوا ہے جس میں ان دونوں صورتوں کی مذکورہ بالا آیات کی تفسیر ایک دوسرے کی مدد سے کی گئی ہے اور لفظ "منک" پر بڑی بحث درج ہے۔"

جواب: آیت "وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ ...." (الاحزاب ۷) سے قادیانی حضرات جو استدلال کرتے ہیں وہ اگر مبنی بر اخلاص ہے تو ان کی جہالت پر دلالت کرتا ہے اور اگر قصداً دھوکا دینے کی نیت سے ہے تو یہ ان کی ضلالت پر دال ہے۔ وہ ایک مضمون تو سورۂ آل عمران کی آیت "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ" سے لیتے ہیں جس میں انبیاء اور ان کی امتوں سے کسی آنے والے نبی کی پیروی کا عہد لیا گیا ہے، اور دوسرا مضمون سورۂ احزاب کی مذکورہ بالا آیت سے لیتے ہیں جس میں دوسرے انبیاء کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایک عہد لیے جانے کا ذکر ہے۔ پھر دونوں کو جوڑ کر اس سے یہ تیسرا مضمون خود بنا ڈالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی آنے والے نبی پر ایمان لانے اور اس کی تائید و نصرت کرنے کا عہد لیا گیا تھا۔ حالانکہ جس آیت میں آنے والے نبی پر ایمان لانے کے میثاق کا ذکر ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ عہد ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی لیا، اور جس آیت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عہد لیے جانے کا ذکر ہے اس میں کوئی تصریح اس امر کی نہیں کہ یہ عہد کسی آنے والے نبی کی پیروی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو [illegible] کے زیر عنوان آگے آ رہی ہے۔ (مرتب)

کا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر ان دو مختلف مضمونوں کو جوڑ کر ایک تیسرا مضمون جو قرآن میں کہیں نہ تھا، کس دلیل سے پیدا کر لیا گیا؟ اس کے لیے اگر ہو سکتی تھیں تو تین ہی دلیلیں ہو سکتی تھیں: یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نزول کے بعد صحابہؓ کو جمع کر کے اعلان فرمایا ہوتا کہ "لوگو! اللہ نے مجھ سے یہ عہد لیا ہے کہ میرے بعد جو نبی آئے اس پر میں ایمان لاؤں اور اس کی تائید و نصرت کروں، لہٰذا میرے متبع ہونے کی حیثیت سے تم بھی اس کا عہد کرو" ـــــ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث کے پورے ذخیرے میں اس مضمون کا کہیں نام و نشان تک نہیں، بلکہ اُلٹی بکثرت روایات ایسی موجود ہیں جن سے یہ مضمون نکلتا ہے کہ حضورؐ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا اور آپؐ کے بعد اب کوئی نبی پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسا اہم میثاق لیا گیا ہوتا اور آپؐ نے اسے یوں نظر انداز کر دیا ہوتا، اور اُلٹی ایسی باتیں فرمائی ہوتیں جن سے حجت پکڑ کر آپؐ کی اُمت کا سوادِ اعظم خدا کے کسی فرستادہ نبی پر ایمان لانے سے محروم رہ جاتا؟

دوسری دلیل اس مضمون کو پیدا کرنے کے لیے یہ ہو سکتی تھی کہ قرآن میں انبیاؑء اور ان کی اُمتوں سے بس ایک ہی میثاق لیے جانے کا ذکر ہوتا، یعنی یہ کہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لانا۔ اس کے سوا کسی اور میثاق کا پورے قرآن میں کہیں ذکر ہی نہ ہوتا۔ اس صورت میں یہ استدلال کیا جا سکتا تھا کہ سورۂ احزاب والی آیتِ میثاق میں بھی لامحالہ یہی میثاق مراد ہوگا۔ لیکن اس دلیل کے لیے بھی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ قرآن میں ایک نہیں بلکہ متعدد میثاقوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ رکوع ۱۰ میں بنی اسرائیل سے اللہ کی بندگی اور والدین سے حسنِ سلوک اور آپس کی خونریزی سے پرہیز وغیرہ کا میثاق لیا جاتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران رکوع ۱۹ میں تمام اہلِ کتاب سے اس بات کا میثاق لیا جاتا ہے کہ خدا کی جو کتاب تمہارے حوالے کی گئی ہے اس کی تعلیمات کو چھپاؤ گے نہیں بلکہ اس کی عام اشاعت کرو گے۔ سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں بنی اسرائیل سے عہد لیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی بات نہ کہیں گے، اور اللہ کی دی ہوئی کتاب کو مضبوط ہاتھوں سے تھامیں گے، اور اس کی تعلیمات کو یاد رکھیں گے۔ سورۂ مائدہ رکوع ۱ میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو ایک میثاق یاد دلایا جاتا ہے جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ "تم اللہ سے سمع و طاعت کا عہد کر چکے ہو"۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر سورۂ احزاب والی آیت میں میثاق کے مضمون کی تصریح کے بغیر مجرد میثاق کا ذکر آیا تھا، تو اس خلاء کو ان بہت سے میثاقوں میں سے کسی ایک سے بھرنے کے بجائے بالخصوص سورۂ آلِ عمران رکوع ۹ والے میثاق ہی سے کیوں بھرا جاتا؟ اس ترجیح کے لیے خود ایک دلیل درکار ہے جو کہیں موجود نہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ دونوں جگہ چونکہ نبیوں سے میثاق لینے کا ذکر ہے اس لیے ایک آیت کی تشریح دوسری آیت سے کر لی گئی، تو میں عرض کروں گا کہ دوسرے جتنے میثاق بھی انبیاؑء کی اُمتوں سے لیے گئے ہیں وہ براہِ راست

کسی اُمت سے نہیں لیے گئے بلکہ انبیاء کے واسطے ہی سے لیے گئے ہیں۔ اور آخر قرآن میں بصیرت رکھنے والا کون شخص اس بات سے ناواقف ہے کہ ہر نبی سے کتاب اللہ کو مضبوط تھامنے اور اس کے احکام کی پیروی کرنے کا عہد لیا گیا ہے ؟

تیسری دلیل یہ ہو سکتی تھی کہ سورۂ احزاب کا سیاق و سباق یہ بتا رہا ہوتا کہ یہاں میثاق سے مراد آنے والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق ہی ہو سکتا ہے لیکن یہاں معاملہ بالکل ہی برعکس ہے۔ سیاق و سباق تو اُلٹا اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ سورۂ احزاب شروع ہی اس فقرے سے ہوتی ہے کہ "اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں سے نہ دبو، اور جو وحی تمہارا رب بھیجتا ہے اسی کے مطابق عمل کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو" اس کے بعد یہ حکم سنایا جاتا ہے کہ جاہلیت کے زمانے سے متبنّٰی بنانے کا جو طریقہ چلا آ رہا ہے اُس کو اور اُس سے تعلق رکھنے والے تمام اوہام اور رسموں کو توڑ ڈالو۔ اس کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ غیر خونی رشتوں میں صرف ایک ہی رشتہ ایسا ہے جو خونی رشتوں سے بھی بڑھ کر حرمت والا ہے، اور وہ ہے نبی اور مومنین کا رشتہ، جس کی بنا پر نبیؐ کی بیویاں ان کی ماؤں کی طرح ان پر حرام ہیں، ورنہ باقی تمام معاملات میں رحمی اور خونی رشتے ہی اللہ کی کتاب کی رُو سے حرمت اور استحقاقِ وراثت کے لیے اولیٰ اور انسب ہیں۔ یہ احکام بیان فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ میثاق یاد دلاتا ہے جو اس نے تمام انبیاء سے ہمیشہ لیا ہے اور ان کی طرح آپؐ سے بھی لیا ہے۔ اب ہر معقول آدمی خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اس سلسلۂ کلام میں آخر کس مناسبت سے ایک آنے والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق یاد دلایا جا سکتا تھا؟ یہاں تو اگر یاد دلایا جا سکتا تھا تو وہی میثاق یاد دلایا جا سکتا تھا جو خدا کی کتاب کو مضبوط تھامنے اور اس کے احکام کو یاد رکھنے اور ان پر عمل کرنے اور دنیا پر ان کا اظہار کرنے کے لیے تمام انبیاءؑ سے لیا گیا ہے۔ پھر آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صاف صاف حکم دیتا ہے کہ آپ خود اپنے متبنّٰی زیدؓ بن حارثہ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر کے جاہلیت کے اس وہم کو توڑ دیں جس کی بنا پر لوگ منہ بولے بیٹے کو بالکل صلبی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ اور جب کفار و منافقین اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو علی الترتیب تین جواب دیتا ہے :

(۱) اوّل تو محمدؐ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں کہ اس کی مطلقہ بیوی اُن پر حرام ہوتی،

(۲) اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ وہ اُن کے لیے حلال تھی بھی تو اُس سے نکاح کرنا کیا ضرور تھا، تو یہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں جن کا کام یہی ہے کہ جس چیز کو اللہ مٹانا چاہتا ہے، اُسے خود آگے بڑھ کر مٹائیں،

(۳) اور مزید برآں ان کو ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ محض رسول ہی نہیں ہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں، اگر وہ جاہلیت کی ان رسموں کو مٹا کر نہ جائیں گے تو پھر کوئی ایسا نبی آنے والا بھی نہیں ہے جو انہیں مٹائے

اس مضمونِ لاحق کو اگر کوئی شخص مضمونِ سابق کے ساتھ ملا کر پڑھے تو وہ یقین کے ساتھ یہ کہہ دے گا کہ اس سیاق و سباق میں جو میثاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلایا گیا ہے اُس سے مُراد اور جو میثاق بھی ہو، بہرحال کسی آنے والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔

دیکھ لیجیے، آیت زیرِ بحث سے قادیانیوں کے بیان کردہ معنی لینے کے لیے یہی تین دلیلیں ہو سکتی تھیں، اور یہاں ان میں سے ہر دلیل اُن کے مُدعا کے لیے غیر مفید، بلکہ اُلٹی ان کے مدعا کے خلاف ہے۔ اب اگر ان کے پاس کوئی چوتھی دلیل ہو تو وہ ان سے دریافت کیجیے، اور ان تینوں دلیلوں کا جواب بھی ان سے لیجیے ورنہ یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں کہ اس آیت سے جو معنی انہوں نے لیے ہیں وہ یا تو جہالت کی بنا پر نکالے ہیں، یا پھر خدا سے بے خوف ہو کر خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کے لیے نکالے ہیں۔ بہرحال ہم یہ پوچھنے سے قاصر ہیں کہ اگر مرزا صاحب نبی تھے تو آخر کیا معاملہ ہے کہ ابھی ان کے صحابہ کا دَور بھی ختم نہیں ہوا ہے اور اُن کی ساری اُمّت اس وقت تابعین اور تبع تابعین پر مشتمل ہے، پھر بھی حال یہ ہے کہ کتاب اللہ سے ان کی اُمّت میں علی الاعلان ایسے غلط استدلال کیے جاتے ہیں اور پوری اُمّت میں ایک آواز بھی اس جہالت یا ناخدا ترسی کے خلاف بلند نہیں ہوتی۔

آیتِ ختمِ نبوّت میں تین دلائل

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۔ (الاحزاب: ۴۰)

(لوگو!) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیّین ہیں اور اللہ ہر چیز پر علم رکھنے والا ہے۔

ختمِ نبوّت کا ذکر اس سورہ (الاحزاب) میں آیا ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ عرب میں مُنہ بولے بیٹے کو بالکل حقیقی بیٹے کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ وہ حقیقی بیٹے کی طرح میراث پاتا تھا۔ مُنہ بولے باپ کی بیوی اور بیٹیوں سے اسی طرح خلا ملا رکھتا تھا جس طرح ماں، بیٹے اور بھائی بہنوں میں ہُوا کرتا ہے۔ اور متبنّی بن جانے کے بعد وہ ساری حُرمتیں اس کے اور مُنہ بولے باپ کے درمیان قائم ہو جاتی تھیں جو نسبی رشتے کی بنا پر قائم ہُوا کرتی تھیں۔ اللہ اس رسم کو توڑنا چاہتا تھا۔ اُس نے پہلے حکم دیا کہ مُنہ سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے کوئی شخص حقیقی بیٹا نہیں ہو جاتا" (آیت ۴-۵) لیکن دِلوں میں صدیوں کے رواج کی وجہ سے حُرمت کا جو تخیّل بیٹھا ہُوا تھا وہ آسانی سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس رسم کو عملاً توڑ دیا جائے۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آ گیا کہ حضرت زیدؓ نے (جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ بولے بیٹے تھے) حضرت زینبؓ کو (جو ان کے نکاح میں تھیں) طلاق دے دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ یہ موقع ہے اس سخت قسم کی جاہلی رسم کو توڑنے کا جب تک آپ خود

اپنے متبنّیٰ کی مطلقہ بیوی سے نکاح نہ کریں گے، متبنّیٰ کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کا جاہلی تخیل نہ مٹ سکے گا لیکن آپ یہ بھی جانتے تھے کہ مدینہ کے منافقین اور اطراف مدینہ کے یہود اور مکہ کے کفار اس فعل پر ایک طوفان عظیم برپا کر دیں گے اور آپؐ کو بدنام کرنے اور اسلام کو رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ اس لیے آپؐ عملی اقدام کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود جھجکا رہے تھے۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا اور آپؐ نے حضرت زینبؓ کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس پر جیسا کہ اندیشہ تھا، اعتراضات اور بہتان طرازی اور افترا پردازی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور خود مسلمان عوام کے دلوں میں بھی طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ انہی اعتراضات اور وسوسوں کو دور کرنے کے لیے سورۂ احزاب کے پانچویں رکوع کی آیات (۳۷۔ ۴۰) نازل ہوئیں۔

ان آیات میں پہلے تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ یہ نکاح ہمارے حکم سے ہوا ہے اور اس لیے ہوا ہے کہ مومنوں کے لیے اپنے متبنّیٰ لڑکوں کی بیوہ اور مطلقہ بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے۔ پھر فرماتا ہے کہ ایک نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کا حکم بجالانے میں وہ کسی کے خوف سے جھجکا کرے۔ اس کے بعد اس بحث کو اس بات پر ختم فرماتا ہے کہ:

"محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں"۔

اس موقع پر یہ فقرہ جو ارشاد فرمایا، اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ معترضین کے جواب میں تین دلائل دینا چاہتا ہے۔ اس ایک فقرے میں اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جو مخالفین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح پر کر رہے تھے۔

ان کا اوّلین اعتراض یہ تھا کہ آپؐ نے اپنی بہو سے نکاح کیا ہے حالانکہ آپؐ کی اپنی شریعت میں بھی بیٹے کی منکوحہ باپ پر حرام ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ یہ نکاح بجائے خود قابلِ اعتراض نہیں ہے کیونکہ جس شخص کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا گیا ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعی بیٹا نہ تھا اور آپؐ اس کے حقیقی باپ نہ تھے۔ اسی لیے فرمایا: "محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں"۔ یعنی جس شخص کی مطلقہ سے نکاح کیا گیا ہے وہ بیٹا تھا کب کہ اُس کی مطلقہ سے نکاح حرام ہوتا؟ تم لوگ تو خود جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سرے سے کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اچھا، اگر منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہے، تب بھی اس کی چھوڑی ہوئی عورت سے نکاح کر لینا زیادہ سے زیادہ بس جائز ہی ہو سکتا تھا، آخر اس کا کرنا کیا ضرور تھا؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا "مگر وہ اللہ کے رسول ہیں"۔ یعنی رسول ہونے کی حیثیت سے اُن پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس حلال چیز کو تمہاری رسوم نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے اس کے بارے میں تمام تعصبات کا خاتمہ کر دیں اور اس کی حلت کے معاملے میں کسی

شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

تیسرے یہ کہ یہ کام اس لیے اور بھی ضروری تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض نبی ہی نہیں بلکہ آخری نبی ہیں اس لیے مزید تاکید کے لیے فرمایا" اور وہ خاتم النبیین ہیں" یعنی ان کے بعد کوئی رسول تو درکنار کوئی نبی تک آنے والا نہیں ہے کہ اگر قانون اور معاشرے کی کوئی اصلاح اُن کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جاتے تو بعد کا آنے والا نبی یہ کسر پوری کر دے۔ لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس رسم جاہلیت کا خاتمہ وہ خود ہی کر کے جائیں، کیونکہ اب اگر آپؐ کے ہاتھوں یہ جاہلانہ رسم نہ ٹوٹی تو پھر قیامت تک نہ ٹوٹ سکے گی۔ آپؐ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے کہ جو کسر آپؐ سے چھوٹ جاتی تھی وہ آکر پورا کر دے۔

اس کے بعد مزید زور دیتے ہوئے فرمایا کہ "اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے" یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس رسم جاہلیت کو ختم کرا دینا کیوں ضروری تھا اور ایسا نہ کرنے میں کیا قباحت تھی۔ وہ جانتا ہے کہ اب اُس کی طرف سے کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اگر اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے اُس نے اس رسم کا خاتمہ اب نہ کرا دیا تو پھر کوئی دوسری ہستی دنیا میں ایسی نہ ہوگی جس کے توڑنے سے یہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے۔ بعد کے مصلحین اگر اسے توڑیں گے بھی تو ان میں کسی کا فعل بھی اپنے پیچھے ایسا دائمی اور عالمگیر اقتدار نہ رکھے گا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں لوگ اس کا اتباع کرنے لگیں، اور ان میں سے کسی کی شخصیت بھی اپنے اندر اس تقدس کی حامل نہ ہوگی کہ کسی فعل کا محض اس کی سنت ہونا ہی لوگوں کے دلوں سے کراہت کے ہر تصور کا قلع قمع کر دے۔

افسوس ہے کہ موجودہ زمانے میں ایک گروہ نے اس آیت کی غلط تاویلات کر کے ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ کھول دیا ہے اس لیے ختم نبوت کے مسئلے کی پوری توضیح اور اس گروہ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی تردید کے لیے ہم پوری وضاحت سے مسئلہ ختم نبوت بیان کرتے ہیں ۹۶؎

فصل ۲

عقیدۂ ختمِ نبوّت پر جامع تحقیقی بحث

ایک گروہ نے اس کے ایک دوسرے ہی معنی پر زور صرف کیا ہے۔ آیت مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ میں لفظ خاتم النبیین کے معنی "نبیوں کی مُہر" کرتا ہے، اور اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو انبیاء بھی آئیں گے وہ آپ کی مُہر لگنے سے نبی بنیں گے، یا بالفاظِ دیگر جب تک کسی کی نبوت پر آپ کی مُہر نہ لگے وہ نبی نہ ہو سکے گا۔

لیکن جس سلسلۂ بیان میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کے اندر رکھ کر اسے دیکھا جائے تو اس لفظ کا یہ مفہوم لینے کی قطعاً کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، بلکہ اگر یہی اس کے معنی ہوں تو یہاں یہ لفظ بے محل ہی نہیں مقصودِ کلام کے بھی خلاف ہو جاتا ہے۔ آخر اس بات کا کیا تک ہے کہ اوپر سے تو نکاحِ زینب پر معترضین کے اعتراضات اور ان سے پیدا کیے ہوئے شکوک و شبہات کا جواب دیا جا رہا ہو اور یکایک یہ بات کہہ ڈالی جائے کہ محمد نبیوں کی مُہر ہیں، آئندہ جو نبی بھی بنے گا، ان کی مُہر لگ کر بنے گا۔ اس سیاق و سباق میں یہ بات نہ صرف یہ کہ بالکل بے تکی ہے، بلکہ اس سے وہ استدلال اُلٹا کمزور ہو جاتا ہے جو اوپر سے معترضین کے جواب میں چلا آ رہا ہے۔ اس صورت میں تو معترضین کے لیے یہ کہنے کا اچھا موقع تھا کہ آپ یہ کام اس وقت نہ کرتے تو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس رسم کو مٹانے کی ایسی ہی کچھ شدید ضرورت ہے تو آپ کے بعد آپ کی مُہر لگ لگ کر جو انبیاء آتے رہیں گے اُن میں سے کوئی اسے مٹا دے گا۔

ایک دوسری تاویل اس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ خاتم النبیین کے معنی افضل النبیین کے ہیں، یعنی نبوت کا دروازہ تو کُھلا ہوا ہے، البتہ کمالاتِ نبوت حضور پر ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ مفہوم لینے میں بھی وہی قباحت ہے جو اوپر ہم نے بیان کی ہے۔ سیاق و سباق سے یہ مفہوم بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا، بلکہ اُلٹا اس کے خلاف پڑتا ہے۔ کفار و منافقین کہہ سکتے تھے کہ حضرت، کم تر درجے کے ہی سہی، بہرحال آپ کے بعد بھی نبی آتے رہیں گے، پھر کیا ضرور تھا کہ اس رسم کو بھی آپ ہی مٹا کر تشریف لے جاتے۔

خاتم النبیین کے لغوی معنی

پس جہاں تک سیاق و سباق کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النبیین کے معنی سلسلۂ نبوت کو ختم کر دینے والے ہی کے لیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ لیکن یہ صرف سیاق ہی کا تقاضا نہیں ہے، لغت بھی اسی معنی کی مقتضی ہے۔ عربی لغت اور محاورے کی رو سے ختم کے معنی مہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے، اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔

خَتَمَ العَمَلَ کے معنی ہیں فَرَغَ مِنَ العَمَلِ "کام سے فارغ ہو گیا"۔

خَتَمَ الاِنَاءَ کے معنی ہیں "برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر مہر لگا دی تاکہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو"۔

خَتَمَ الکِتَابَ کے معنی ہیں "خط بند کر کے اس پر مہر لگا دی تاکہ خط محفوظ ہو جائے"۔

خَتَمَ عَلَی القَلْبِ "دل پر مہر لگا دی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے، نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے"۔

خِتَامُ کُلِّ مَشْرُوبٍ "وہ مزا جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے"۔

خَاتِمَۃُ کُلِّ شَیءٍ عَاقِبَتُہٗ وَ آخِرَتُہٗ "ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت"۔

خَتَمَ الشَّیءَ، بَلَغَ آخِرَہٗ "کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا"۔ اسی معنی میں ختم قرآن بولتے ہیں اور اسی معنی میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔

خَاتِمُ القَومِ آخِرُھُم "خاتم القوم سے مراد ہے قبیلے کا آخری آدمی"۔ (ملاحظہ ہو لسان العرب، قاموس اور اقرب الموارد)[1]

---

[1] یہاں ہم نے لغت کی صرف تین کتابوں کا حوالہ دیا ہے، لیکن بات انہی تین کتابوں پر منحصر نہیں ہے۔ عربی زبان کی کوئی معتبر لغت نکال کر دیکھ لی جائے، اس میں لفظ ختم کی یہی تشریح ملے گی۔ لیکن منکرین ختم نبوت خدا کے دین میں نقب لگانے کے لیے لغت کو چھوڑ کر اس بات کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی شخص کو خاتم الشعراء، یا خاتم الفقہاء یا خاتم المفسرین کہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس شخص کو یہ لقب دیا گیا ہے اس کے بعد کوئی شاعر یا فقیہ یا مفسر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فن کے کمالات اس شخص پر ختم ہو گئے۔ حالانکہ مبالغے کے طور پر اس طرح کے القاب کا استعمال یہ معنی ہرگز نہیں رکھتا کہ لغت کے اعتبار سے خاتم کے اصل معنی ہی کامل یا افضل کے ہو جائیں اور آخری کے معنی میں یہ لفظ استعمال کرنا سرے سے غلط قرار پا جائے۔ یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو زبان کے قواعد سے ناواقف ہو۔ کسی زبان میں بھی یہ قاعدہ نہیں ہے کہ کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی کے بجائے

اسی بنا پر تمام اہل لغت اور اہل تفسیر نے بالاتفاق خاتم النبیین کے معنی آخر النبیین کے لیے ہیں۔ عربی لغت و محاورے کی رُو سے خاتم کے معنی ڈاک خانے کی مُہر کے نہیں ہیں جسے لگا لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مُہر ہے جو لفافے پر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے نہ باہر کی کوئی چیز اندر جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

قرآن کے سیاق و سباق اور لغت کے لحاظ سے اس لفظ کا جو مفہوم ہے اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند صحیح ترین احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی قیادت
کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء	انبیاء کیا کرتے تھے جب کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی
کلما ھلک نبی خلفہ نبی، و انہ لا نبی	اس کا جانشین ہوتا مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا
بعدی و سیکون خلفاء (بخاری، کتاب المناقب	بلکہ خلفاء ہوں گے
باب ما ذکر عن بنی اسرائیل)	
(۲) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے

کبھی کبھی مجازاً کسی دوسرے معنی میں لیا جاتا ہو تو وہی معنی اس کے اصل معنی بن جائیں اور لغت کی رُو سے جو اس کے حقیقی معنی ہیں ان میں اس کا استعمال ممنوع ہو جائے۔ آپ کسی عرب کے سامنے جب کہیں گے کہ جَاءَ خَاتَمُ الْقَوْم، تو وہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لے گا کہ قبیلے کا فاضل و کامل آدمی آگیا، بلکہ اس کا مطلب وہ یہی لے گا کہ پورا کا پورا قبیلہ آگیا ہے حتیٰ کہ آخری آدمی جو رہ گیا تھا وہ بھی آگیا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ خاتم الشعراء، خاتم الفقہاء اور خاتم المحدثین وغیرہ القاب جو بعض لوگوں کو دیے گئے ہیں ان کے دینے والے انسان تھے اور انسان کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ جس شخص کو وہ کسی صفت کے اعتبار سے خاتم کہہ رہا ہے اس کے بعد پھر کوئی اس صفت کا حامل پیدا نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے انسانی کلام میں ان القاب کی حیثیت مبالغے اور اعترافِ کمال سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کے متعلق یہ کہہ دے کہ فلاں صفت اُس پر ختم ہو گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے بھی انسانی کلام کی طرح مجازی کلام سمجھ لیں۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی کو خاتم الشعراء کہہ دیتا تو یقیناً اس کے بعد کوئی شاعر نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس نے جسے خاتم النبیین کہہ دیا، غیر ممکن ہے کہ اس کے بعد کوئی نبی ہو سکے، اس لیے کہ اللہ عالم الغیب ہے اور انسان عالم الغیب نہیں ہیں۔ اللہ کا کسی کو خاتم النبیین کہنا اور انسانوں کا کسی کو خاتم الشعراء اور خاتم الفقہاء وغیرہ کہہ دینا آخر ایک درجے میں کیسے ہو سکتا ہے۔

ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنیٰ بیتًا فاحسنه واجمله الا موضع لبنة من زاویة فجعل الناس یطوفون به ویعجبون له ویقولون هلا وُضعت هٰذه اللبنة، فانا اللبنة وانا خاتم النبیین (بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین)

گزرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہارِ حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے، اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پُر کرنے کے لیے کوئی نبی آئے)۔

اسی مضمون کی چار حدیثیں مسلم کتاب الفضائل، باب خاتم النبیین میں ہیں اور آخری حدیث میں یہ الفاظ زائد ہیں فَجِئْتُ فَخَتَمْتُ الانبیاء "پس میں آیا اور میں نے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا"۔

یہی حدیث انہی الفاظ میں ترمذی، کتاب المناقب، باب فضل النبی، اور کتاب الآداب، باب الامثال میں ہے۔ مسند ابو داؤد طیالسی میں یہ حدیث جابر بن عبداللہ کی روایت کردہ احادیث کے سلسلے میں آئی ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: خُتِمَ بِیَ الانبیاء "میرے ذریعہ سے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا"۔

مسند احمد میں تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ اس مضمون کی احادیث حضرت اُبَیّ بن کعبؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کی گئی ہیں۔

(۳) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فُضِّلْتُ علی الانبیاء بستٍّ، اعطیت جوامع الکلم، ونصرت بالرعب، واُحِلَّت لی الغنائم، وجُعِلَت لی الارض مسجدًا وطهورًا، وارسلت الی الخلق کافة، وخُتِمَ بی النبیون۔ (مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے چھ باتوں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے (۱) مجھے جامع و مختصر بات کہنے کی صلاحیت دی گئی (۲) مجھے رعب کے ذریعہ سے نصرت بخشی گئی (۳) میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کیے گئے (۴) میرے لیے زمین کو مسجد بھی بنا دیا گیا اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی (یعنی میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں میں ہی نہیں بلکہ روئے زمین پر ہر جگہ پڑھی جا سکتی ہے اور پانی نہ ملے تو میری شریعت میں تیمم کر کے وضو کی حاجت بھی پوری کی جا سکتی ہے اور غسل کی حاجت بھی)۔ (۵) مجھے تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا (۶) اور میرے اوپر انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

(۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رسالت اور

إن الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول ولا نبي (ترمذی، کتاب الرؤیا، باب زوال النبوۃ، مسند احمد، مرویات انس بن مالک)

نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔

(۵) قال النبي صلى الله عليه وسلم انا محمد وانا احمد وانا الماحي الذي يمحى بي الكفر وانا الحاشر الذي يحشر الناس على عقبي، وانا العاقب الذي ليس بعده نبي۔ (بخاری و مسلم کتاب الفضائل، باب اسماء النبی، ترمذی کتاب الآداب، باب اسماء النبی، مؤطا، کتاب اسماء النبی، المستدرک للحاکم، کتاب التاریخ، باب اسماء النبی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں کہ میرے ذریعہ سے کفر محو کیا جائے گا۔ میں حاشر ہوں کہ میرے بعد لوگ حشر میں جمع کیے جائیں گے (یعنی میرے بعد اب بس قیامت ہی آنی ہے)۔ اور میں عاقب ہوں، اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔

(۶) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله لم يبعث نبيا الا حذر امته الدجال وانا آخر الانبياء وانتم آخر الامم وهو خارج فيكم لا محالة (ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الدجال)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے اپنی امت کو دجال کے خروج سے نہ ڈرایا ہو (مگر ان کے زمانے میں وہ نہ آیا)۔ اب میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔ لامحالہ اب اس کو تمہارے اندر ہی نکلنا ہے۔

(۷) عن عبد الرحمن بن جبير قال سمعت عبد الله بن عمرو بن العاص يقول خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما كالمودع فقال انا محمد النبي الامي ثلاثا ولا نبي بعدي۔ (مسند احمد، مرویات عبد اللہ بن عمرو بن العاص)

عبدالرحمن بن جبیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کو یہ کہتے سنا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر ہمارے درمیان تشریف لائے اس انداز سے کہ گویا آپ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ آپ نے تین مرتبہ فرمایا "میں محمد نبی امی ہوں" پھر فرمایا "اور میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔

(۸) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا نبوة بعدي الا المبشرات قيل وما المبشرات يا رسول الله قال الرؤيا الحسنة - او قال الرؤيا الصالحة۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے، صرف بشارت دینے والی باتیں ہیں۔ عرض کیا گیا کہ وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں یا رسول اللہ؟ فرمایا اچھا خواب، یا فرمایا

(مسند احمد، ترمذی، ابو داؤد طیالسی، نسائی، ابو داؤد)

صالح خواب۔ (یعنی وحی نبوت کا اب کوئی امکان نہیں ہے) زیادہ سے زیادہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اشارہ ملے گا بھی تو بس اچھے خواب کے ذریعہ سے مل سکے گا۔

(۹) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کان بعدی نبی لکان عمر بن الخطاب (ترمذی، کتاب المناقب)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب ہوتے"۔

(۱۰) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلی انت منی بمنزلة ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی (بخاری و مسلم، کتاب فضائل الصحابہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا "میرے ساتھ تمہاری نسبت وہی ہے جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے"

بخاری و مسلم نے یہ حدیث غزوۂ تبوک کے ذکر میں بھی نقل کی ہے۔ مسند احمد میں اس مضمون کی دو حدیثیں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کی گئی ہیں جن میں سے ایک کا آخری فقرہ یوں ہے: الا انہ لا نبوة بعدی "مگر میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے"۔ ابو داؤد طیالسی، امام احمد اور محمد بن اسحاق نے اس سلسلے میں جو تفصیلی روایات نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے جاتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو مدینہ طیبہ کی حفاظت و نگرانی کے لیے اپنے پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ منافقین نے اس پر طرح طرح کی باتیں ان کے بارے میں کہنی شروع کر دیں۔ انہوں نے جا کر حضورؐ سے عرض کیا "یا رسول اللہ، کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں؟" اس موقع پر حضورؐ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ "تم میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہو جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ رکھتے تھے" یعنی جس طرح حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر جاتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑا تھا اسی طرح میں تم کو مدینے کی حفاظت کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ حضرت ہارونؑ کے ساتھ یہ تشبیہ کہیں بعد میں کسی فتنے کی موجب نہ بن جائے، اس لیے فوراً آپؐ نے یہ تصریح فرما دی کہ میرے بعد کوئی شخص نبی ہونے والا نہیں ہے۔

(۱۱) عن ثوبان قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ..... وانہ سیکون فی امتی کذابون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی۔ (ابو داؤد، کتاب الفتن)

ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ..... "اور یہ کہ میری امت میں تیس کذاب ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں"

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ابوداؤد نے کتاب الملاحم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ ترمذی نے بھی حضرت ثوبانؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے یہ دونوں روایتیں نقل کی ہیں اور دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: حتی یبعث دجالون کذابون قریب من ثلاثین کلھم یزعم انہ رسول اللہ۔ "یہاں تک کہ اٹھیں گے تیس کے قریب جھوٹے فریبی جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔"

(۱۲) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لقد کان فیمن کان قبلکم من بنی اسرائیل رجال یکلّمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن من امتی احد فعمر۔ (بخاری، کتاب المناقب)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے جو بنی اسرائیل گزرے ہیں ان میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جن سے کلام کیا جاتا تھا بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں۔ میری امت میں اگر کوئی ہوا تو وہ عمرؓ ہوگا۔

مسلم میں اس مضمون کی جو حدیث ہے اس میں یُکلّمون کے بجائے مُحدَّثون کا لفظ ہے لیکن مُکلَّم اور مُحدَّث، دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی ایسا شخص جو مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہو، یا جس کے ساتھ پردۂ غیب سے بات کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کے بغیر مخاطبۂ الٰہی سے سرفراز ہونے والے بھی اس امت میں اگر کوئی ہوتے تو وہ حضرت عمرؓ ہوتے۔

(۱۳) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نبی بعدی ولا امۃ بعد امتی۔ (بیہقی، کتاب الرؤیا۔ طبرانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی امت (یعنی کسی نئے آنے والے نبی کی امت) نہیں۔

(۱۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانی آخر الانبیاء وان مسجدی آخر المساجد (مسلم، کتاب الحج، باب فضل الصلوٰۃ بمسجد مکۃ والمدینۃ)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد (یعنی مسجد نبوی) ہے۔[1]

---

[1] منکرینِ ختمِ نبوت اس حدیث سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جس طرح حضورؐ نے اپنی مسجد کو آخر المساجد فرمایا، حالانکہ وہ آخری مسجد نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی بے شمار مسجدیں دنیا میں بنی ہیں، اسی طرح جب آپؐ نے فرمایا کہ میں آخر الانبیاء ہوں تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ آپؐ کے بعد نبی آتے رہیں گے۔ البتہ فضیلت کے اعتبار سے آپؐ آخری نبی ہیں اور آپؐ کی مسجد آخری مسجد ہے۔ لیکن درحقیقت اس طرح کی تاویلیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ کے کلام کو سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ صحیح مسلم کے جس مقام پر یہ حدیث وارد ہوئی ہے اس کے سلسلے کی تمام احادیث کو ایک نظر ہی دیکھ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ حضورؐ نے اپنی مسجد کو آخری مسجد کس معنی میں فرمایا ہے۔ اس مقام پر حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ام المومنین حضرت میمونہؓ کے حوالے سے جو روایات امام مسلم نے نقل کی ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں صرف تین مساجد ایسی ہیں جن کو عام مساجد پر فضیلت حاصل ہے جن میں نماز پڑھنا دوسری مساجد میں نماز پڑھنے سے ہزار گنا زیادہ ثواب رکھتا ہے، اور اسی بنا پر صرف انہی تین مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کر کے جانا جائز ہے، باقی کسی مسجد کا یہ حق نہیں ہے کہ آدمی دوسری مسجدوں کو چھوڑ کر خاص طور پر اس میں

یہ احادیث بکثرت صحابہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بکثرت محدثین نے ان کو بہت سی قوی سندوں سے نقل کیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپؐ آخری نبی ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، نبوت کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے، اور آپؐ کے بعد جو لوگ بھی رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کریں وہ دجال و کذاب ہیں۔ قرآن کے الفاظ "خاتم النبیین" کی اس سے زیادہ مستند و معتبر اور قطعی الثبوت تشریح اور کیا ہو سکتی ہے۔ رسول پاکؐ کا ارشاد تو بجائے خود سند و حجت ہے، مگر جب وہ قرآن کی ایک نص کی شرح کر رہا ہو تب تو وہ اور بھی زیادہ قوی حجت بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن کو سمجھنے والا اور اس کی تفسیر کا حق دار اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ ختم نبوت کا کوئی دوسرا مفہوم بیان کرے اور ہم اسے قبول کرنا کیا معنی، قابل التفات بھی سمجھیں؟

صحابۂ کرام کا اجماع

قرآن و سنت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابۂ کرام کے اجماع کی ہے۔ یہ بات تمام معتبر تاریخی

نماز پڑھنے کے لیے سفر کریں۔ ان میں سے پہلی مسجد، مسجد الحرام ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ دوسری مسجد اقصیٰ ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ اور تیسری مسجد، مدینہ طیبہ کی مسجد نبوی ہے جس کی بنا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی۔ حضورؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اب چونکہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اس لیے میری اس مسجد کے بعد دنیا میں کوئی چوتھی مسجد ایسی بننے والی نہیں ہے جس میں نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مسجدوں سے زیادہ ہو اور جس کی طرف نماز کی خاطر سفر کر کے جانا درست ہو۔

۱؎ منکرین ختم نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے مقابلہ میں اگر کوئی چیز پیش کرتے ہیں تو وہ یہ روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا قولوا انہ خاتم الانبیاء ولا تقولوا لا نبی بعدہ "یہ تو کہو کہ حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں مگر یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں"۔ لیکن اوّل تو حضورؐ کے صاف صاف ارشادات کے مقابلہ میں حضرت عائشہؓ کے کسی قول کو پیش کرنا ہی سخت گستاخی و بے ادبی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ حضرت عائشہؓ کی طرف جس روایت میں یہ قول منسوب کیا گیا ہے وہ بجائے خود غیر مستند ہے۔ اسے حدیث کی کسی معتبر کتاب میں کسی قابل ذکر محدث نے نقل نہیں کیا ہے۔ تفسیر کی ایک کتاب درِ منثور اور لغت حدیث کی ایک کتاب تکملہ مجمع البحار سے اس کو نقل کیا جاتا ہے، مگر اس کی سند کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ ایسی ایک ضعیف ترین روایت اور وہ بھی ایک صحابیہ کے قول کو لا کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا ہے جنہیں تمام اکابر محدثین نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور جن لوگوں نے ان کی نبوت تسلیم کی، ان سب کے خلاف صحابۂ کرام نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔

اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ مسیلمۂ کذاب کا معاملہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر نہ تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اسے حضور کے ساتھ شریکِ نبوت بنایا گیا ہے۔ اس نے حضور کی وفات سے پہلے جو عریضہ آپ کو لکھا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

من مسيلمة رسول الله الى محمد رسول الله سلام عليك فاني أشركت في الامر معك (طبری، جلد دوم، ص ۳۹۹، طبع مصر)	مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف۔ آپ پر سلام ہو۔ آپ کو معلوم ہو کہ میں آپ کے ساتھ نبوت کے کام میں شریک کیا گیا ہوں۔

علاوہ بریں مؤرخ طبری نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ مسیلمہ کے ہاں جو اذان دی جاتی تھی اس میں اشھد ان محمداً رسول اللہ کے الفاظ بھی کہے جاتے تھے۔ اس صریح اقرارِ رسالتِ محمدی کے باوجود اسے کافر اور خارج از ملت قرار دیا گیا اور اس سے جنگ کی گئی۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ بنو حنیفہ نیک نیتی کے ساتھ (In Good Faith) اس پر ایمان لائے تھے اور انہیں واقعی اس غلط فہمی میں ڈالا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود شریکِ رسالت کیا ہے۔ نیز قرآن کی آیات کو اُن کے سامنے مسیلمہ پر نازل شدہ آیات کی حیثیت سے ایک ایسے شخص نے پیش کیا تھا جو مدینۂ طیبہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کر کے گیا تھا (البدایہ والنہایہ لابن کثیر، جلد ۵، ص ۵۱)۔ مگر اس کے باوجود صحابۂ کرام نے ان کو مسلمان تسلیم نہیں کیا اور ان پر فوج کشی کی۔ پھر یہ کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ صحابہؓ نے ان کے خلاف ارتداد کی بنا پر نہیں بلکہ بغاوت کے جرم میں جنگ کی تھی۔ اسلامی قانون کی رو سے باغی مسلمانوں کے خلاف اگر جنگ کی نوبت آئے تو ان کے اسیرانِ جنگ غلام نہیں بنائے جا سکتے، بلکہ مسلمان تو درکنار، ذمی بھی اگر باغی ہوں تو گرفتار ہونے کے بعد ان کو غلام بنانا جائز نہیں ہے۔ لیکن مسیلمہ اور اس کے پیروؤں پر جب چڑھائی کی گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے اعلان فرمایا کہ ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا جائے گا۔ اور جب وہ لوگ اسیر ہوئے تو فی الواقع ان کو غلام بنایا گیا۔ چنانچہ انہی میں سے ایک لونڈی حضرت علیؓ کے حصے میں آئی جس کے بطن سے تاریخِ اسلام کی مشہور شخصیت محمد بن حنفیہ نے جنم لیا (البدایہ والنہایہ، جلد ۶، ص ۳۱۶، ۳۲۵)۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہؓ نے جس جرم کی بنا پر ان سے جنگ کی تھی وہ بغاوت کا جرم نہ تھا بلکہ یہ جرم تھا کہ ایک شخص نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا اور دوسرے لوگ اس کی نبوت پر ایمان لائے۔ یہ کارروائی

حضورؐ کی وفات کے فوراً بعد ہوئی ہے، ابوبکرؓ کی قیادت میں ہوئی ہے، اور صحابہؓ کی پوری جماعت کے اتفاق سے ہوئی ہے۔ اجماعِ صحابہؓ کی اس سے زیادہ صریح مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

علمائے اُمت کا اجماع

اجماعِ صحابہؓ کے بعد چوتھے نمبر پر مسائلِ دین میں جس چیز کو حجت کی حیثیت حاصل ہے وہ دورِ صحابہؓ کے بعد کے علمائے اُمت کا اجماع ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے، اور پوری دنیائے اسلام میں ہر ملک کے علماء اس عقیدے پر متفق ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ جو بھی آپ کے بعد اس منصب کا دعویٰ کرے، یا اس کو مانے، وہ کافر، خارج از ملتِ اسلام ہے۔ اس سلسلے کے بھی چند شواہد ملاحظہ ہوں:

(۱) امام ابوحنیفہؒ (۸۰ھ - ۱۵۰ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا "مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں"۔ اس پر امام اعظمؒ نے فرمایا کہ "جو شخص اس سے نبوت کی کوئی علامت طلب کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ لا نبی بعدی"۔ (مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ لابن احمد المکی، ج ۱، ص ۱۶۱، مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۲۱ھ)

(۲) علامہ ابن جریر طبریؒ (۲۲۴ھ - ۳۱۰ھ) اپنی مشہور تفسیر قرآن میں آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کا مطلب بیان کرتے ہیں: الذی ختم النبوۃ فطبع علیھا فلا تفتح لاحد بعدہ الی قیام الساعۃ۔ "جس نے نبوت کو ختم کر دیا اور اس پر مہر لگا دی، اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا"۔ (تفسیر ابن جریر، جلد ۲۲، صفحہ ۱۲)

(۳) امام طحاویؒ (۲۳۹ھ - ۳۲۱ھ) اپنی کتاب "عقیدۂ سلفیہ" میں سلف صالحین، اور بخصوصاً امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمد رحمہم اللہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے نبوت کے بارے میں یہ عقیدہ تحریر فرماتے ہیں: "اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برگزیدہ بندے، چیدہ نبی اور پسندیدہ رسول ہیں اور وہ خاتم الانبیاء، امام الاتقیاء، سید المرسلین، حبیب رب العالمین ہیں، اور ان کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ گمراہی اور خواہشِ نفس کی بندگی ہے"۔ (شرح الطحاویہ فی العقیدۃ السلفیہ، دار المعارف مصر، صفحات ۱۵، ۸۷، ۹۶، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۲)

(۴) علامہ ابن حزم اندلسیؒ (۳۸۴ھ - ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: "یقیناً وحی کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف، اور اللہ عزوجل فرما چکا ہے کہ محمدؐ نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ، مگر وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں"۔ (المحلّٰی، ج ۱، ص ۲۶)

(۵) امام غزالیؒ (۴۵۰ھ - ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں:[1]

[1] امام غزالیؒ کی اس رائے کو ہم ان کی اصل عبارت کے ساتھ اس لیے نقل کر رہے ہیں کہ منکرین ختم نبوت نے ان کے حوالے کی تہمت کو بڑے زور شور سے پھیلایا ہے۔

لو فتح هذا الباب (أي باب إنكار
كون الإجماع حجة) انجر إلى أمور شنيعة
وهو أن قائلاً لو قال يجوز أن يبعث رسول
بعد نبينا محمد صلى الله عليه وسلم
فيبعد التوقف في تكفيره، ومستبعد
استحالة ذلك عند البحث تستمد من
الإجماع لا محالة، فإن العقل لا يحيله
وما نقل فيه من قوله لا نبي بعدي
ومن قوله تعالى خاتم النبيين، فلا
يعجز هذا القائل عن تأويله، فيقول
خاتم النبيين أراد به أولي العزم من
الرسل، فإن قالوا النبيين عام، فلا يبعد
تخصيص العام، وقوله لا نبي بعدي
لم يرد به الرسول، وفرق بين النبي
والرسول والنبي أعلى مرتبة من الرسول
إلى غير ذلك من أنواع الهذيان، فهذا
وأمثاله لا يمكن أن ندعي استحالته
من حيث مجرد اللفظ، فإنا في تأويل
ظواهر التشبيه قضينا باحتمالات أبعد
من هذه، ولم يكن ذلك مبطلاً للنصوص
ولكن الرد على هذا القائل أن الأمة
فهمت بالإجماع من هذا اللفظ ومن
قرائن أحواله أنه أفهم عدم نبي بعده
أبداً وعدم رسول الله أبداً وأنه ليس
فيه تأويل ولا تخصيص فمنكر هذا لا

اگر یہ دروازہ (یعنی اجماع کو حجت ماننے سے انکار
کا دروازہ) کھول دیا جائے تو بڑی قبیح باتوں تک
نوبت پہنچ جاتی ہے مثلاً اگر کہنے والا کہے کہ ہمارے
نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی رسول کی بعثت
ممکن ہے تو اس کی تکفیر میں تامل کرنا جائز نہ ہوگا، ثابت کرنا
چاہتا ہوں ہے لا محالہ اجماع سے مدد لینی پڑے گی
کیونکہ عقل اس کے عدم جواز کا فیصلہ نہیں کرتی۔ اور
جہاں تک نقل کا تعلق ہے اس عقیدے کا قائل لا نبی
بعدی اور خاتم النبیین کی تاویل کرنے سے عاجز نہ ہوگا۔
وہ کہے گا کہ خاتم النبیین سے مراد اولوالعزم رسول
کا خاتم ہونا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ نبیین کا لفظ
عام ہے تو عام کو خاص قرار دے دینا اس کے لیے کچھ
مشکل نہ ہوگا۔ اور لا نبی بعدی کے متعلق وہ کہہ
دیگا کہ لا رسول بعدی تو نہیں کہا گیا ہے، رسول
اور نبی میں فرق ہے، اور نبی کا مرتبہ رسول سے بلند
ہے۔ غرض اس طرح کی بکواس بہت کچھ کی جاسکتی
ہے۔ اور محض لفظ کے اعتبار سے ایسی تاویلات
کو ہم محال نہیں سمجھتے، بلکہ ظواہر تشبیہ کی تاویل میں
ہم اس سے بھی زیادہ بعید احتمالات کی گنجائش
مانتے ہیں۔ اور اس طرح کی تاویلیں کرنے والے کے
متعلق ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ نصوص کا انکار
کر رہا ہے لیکن اس قول کے قائل کی تردید میں
ہم یہ کہیں گے کہ اُمت نے بالاتفاق اس لفظ
(یعنی لا نبی بعدی) سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کے قرائن احوال سے یہ سمجھا ہے کہ حضور کا مطلب

يكون الا منكر الاجماع ۔ (الاقتصاد فی الاعتقاد، المطبعۃ الادبیہ، مصر، ص ۱۱۴)

یہ تھا کہ آپ کے بعد کبھی کوئی نبی آئے گا نہ رسول، نیز امت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس میں کسی تاویل اور تخصیص کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو منکرِ اجماع کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(۶) محی السنۃ بغوی (متوفی ۵۱۶ھ) اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں: "اللہ نے آپ کے ذریعہ سے نبوت کو ختم کیا، پس آپ انبیاء کے خاتم ہیں . . . . اور ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا"۔ (جلد ۳، ص ۱۵۸)

(۷) علامہ زمخشری (۴۶۷ھ - ۵۳۸ھ) تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں: "اگر تم کہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی کیسے ہوئے جبکہ حضرت عیسیٰؑ آخر زمانے میں نازل ہوں گے؟ تو میں کہوں گا کہ آپ کا آخری نبی ہونا اس معنی میں ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائے گا، اور عیسیٰ علیہ السلام اُن لوگوں میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے، اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمدیہ کے پیرو اور آپ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ گویا کہ وہ آپ ہی کی اُمت کے ایک فرد ہیں"۔ (جلد ۲، ص ۲۱۵)

(۸) قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ) لکھتے ہیں: "جو شخص خود اپنے حق میں نبوت کا دعویٰ کرے، یا اس کو جائز رکھے کہ آدمی نبوت کا اکتساب کر سکتا ہے اور صفائی قلب کے ذریعہ سے مرتبۂ نبوت کو پہنچ سکتا ہے، جیسا کہ بعض فلسفی اور غالی صوفی کہتے ہیں، اور اسی طرح جو شخص نبوت کا دعویٰ تو نہ کرے مگر یہ دعویٰ کرے کہ اس پر وحی آتی ہے . . . . ایسے سب لوگ کافر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے والے ہیں۔ کیونکہ آپ نے خبر دی ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اور آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر پہنچائی ہے کہ آپ نبوت کے ختم کرنے والے ہیں اور تمام انسانوں کی طرف آپ کو بھیجا گیا ہے۔ اور تمام اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر مفہوم پر محمول ہے، اس کے معنی و مفہوم میں کسی تاویل و تخصیص کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ان تمام گروہوں کے کافر ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں، بربنائے اجماع بھی اور بربنائے نقل بھی"۔ (شفاء، جلد ۲، ص ۲۷۰ - ۲۷۱)

(۹) علامہ شہرستانی (متوفی ۵۴۸ھ) اپنی مشہور کتاب الملل والنحل میں لکھتے ہیں: "اور اسی طرح جو کہے . . . . . کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہے (بجز عیسیٰ علیہ السلام کے) تو اس کے کافر ہونے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں ہے"۔ (جلد ۳، ص ۲۴۹)

(۱۰) امام رازی (۵۴۳ھ - ۶۰۶ھ) اپنی تفسیر کبیر میں آیت خاتم النبیین کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس سلسلہ بیان میں وخاتم النبیین اس لیے فرمایا کہ جس نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی ہو وہ اگر نصیحت اور توضیح احکام میں کوئی کسر چھوڑ جائے تو اس کے بعد آنے والا نبی اُسے پورا کر سکتا ہے۔ مگر جس کے بعد کوئی آنے والا نبی نہ ہو وہ اپنی اُمت پر زیادہ شفیق ہوتا ہے اور اس کو زیادہ واضح رہنمائی دیتا ہے کیونکہ اس کی مثال اُس باپ کی ہوتی ہے جو جانتا ہے کہ اس کے بیٹے کا کوئی ولی و سرپرست اُس کے بعد نہیں ہے۔"

(جلد ۶، ص ۵۸۱)

(۱) علامہ بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) اپنی تفسیر "انوار التنزیل" میں لکھتے ہیں: "یعنی آپ انبیاء میں سب سے آخری نبی ہیں جس نے ان کا سلسلہ ختم کر دیا، یا جس سے انبیاء کے سلسلے پر مُہر کر دی گئی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپ کے بعد نازل ہونا اِس ختمِ نبوت میں قادح نہیں ہے کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپ ہی کے دین پر ہوں گے۔" (جلد ۴، ص ۱۶۴)

(۲) علامہ حافظ الدین النسفی (متوفی ۷۱۰ھ) اپنی تفسیر "مدارک التنزیل" میں لکھتے ہیں: "اور آپ خاتم النبیین ہیں ... یعنی نبیوں میں سب سے آخری۔ آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں بنایا جائے گا۔ رہے عیسیٰ تو وہ اُن انبیاء میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے گویا کہ وہ آپ کی اُمت کے افراد میں سے ہیں۔" (ص ۴۷۱)

(۳) علامہ علاؤ الدین البغدادی (متوفی ۷۲۵ھ) اپنی تفسیر "خازن" میں لکھتے ہیں: "وخاتم النبیین یعنی اللہ نے آپ پر نبوت ختم کر دی، اب نہ آپ کے بعد کوئی نبوت ہے نہ آپ کے بعد کوئی اُس میں شریک ... وکان اللہ بکل شیء علیما، یعنی یہ بات اللہ کے علم میں ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔" (ص ۴۷۱)

(۴) علامہ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں: "پس یہ آیت اس باب میں نصِ صریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور جب آپ کے بعد نبی کوئی نہیں تو رسول بدرجہ اولیٰ نہیں ہے، کیونکہ رسالت کا منصب خاص ہے اور نبوت کا منصب عام۔ ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا ... حضور کے بعد جو شخص بھی اس مقام کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا، مفتری، دجال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے، خواہ وہ کیسے ہی خرقِ عادت اور شعبدے اور جادو اور طلسم اور کرشمے بنا کر لے آئے ... یہی حیثیت ہر اُس شخص کی ہے جو قیامت تک اس منصب کا مدعی ہو۔"

(جلد ۳، ص ۴۹۳، ۴۹۴)

(۵) علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) تفسیر جلالین میں لکھتے ہیں: "وکان اللہ بکل شیء علیما یعنی

الغرض اس بات کو جاننا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور عیسٰیؑ جب نازل ہوں گے تو آپؐ کی شریعت کے مطابق عمل کریں گے۔" (ص ۲۶۸)

(۱۶) علامہ ابن نجیم (متوفی سنہ ۹۷۰ھ) اصول فقہ کی مشہور کتاب الاشباہ والنظائر کتاب السیر، باب الردہ میں لکھتے ہیں: "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ اُن باتوں میں سے ہے جن کا جاننا اور ماننا ضروریاتِ دین میں سے ہے۔" (ص ۱۷۹)

(۱۷) ملا علی قاری (متوفی سنہ ۱۰۱۶ھ) شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: "ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے۔" (ص ۲۰۲)

(۱۸) شیخ اسماعیل حقی (متوفی سنہ ۱۱۳۷ھ) تفسیر رُوح البیان میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "عاصم نے لفظ خاتَم ت کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی ہیں آلۂ ختم کے جس سے مُہر کی جاتی ہے۔ جیسے طابع اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے ٹھپّا لگایا جاتا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں سب سے آخر تھے جن کے ذریعہ سے نبیوں کے سلسلے پر مُہر لگا دی گئی۔ فارسی میں اسے "مُہرِ پیغمبراں" کہیں گے یعنی آپؐ سے نبوت کا دروازہ سر بمُہر کر دیا گیا اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باقی قاریوں نے اسے ت کے زیر کے ساتھ خاتِم پڑھا ہے یعنی آپؐ مُہر کرنے والے تھے۔ فارسی میں اسے "مُہر کنندۂ پیغمبراں" کہیں گے۔ اس طرح یہ لفظ بھی خاتَم کا ہم معنی ہی ہے . . . . اب آپؐ کی اُمّت کے علماء آپؐ سے صرف ولایت ہی کی میراث پائیں گے، نبوت کی میراث آپؐ کی خاتمیت کے باعث ختم ہو چکی۔ اور عیسٰی علیہ السلام کا آپؐ کے بعد نازل ہونا آپؐ کے خاتم النبیین ہونے میں قادح نہیں ہے کیونکہ خاتم النبیین ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ بنایا جائے گا . . . . اور عیسٰیؑ آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ آپؐ ہی کے قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں گے۔ آپؐ کی اُمّت کے ایک فرد کی طرح ہوں گے۔ نہ اُن کی طرف وحی آئے گی اور نہ وہ نئے احکام دیں گے بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہوں گے . . . . اور اہلِ سنّت والجماعت اس بات کے قائل ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا نبی بعدی۔ اب جو کوئی کہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا، کیونکہ اُس نے نص کا انکار کیا۔ اور اسی طرح اس شخص کی بھی تکفیر کی جائے گی جو اس میں شک کرے، کیونکہ حجّت نے حق کو باطل سے ممیّز کر دیا ہے۔ اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے

بعد نبوت کا دعویٰ کرے اس کا دعویٰ باطل کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔" (جلد ۲۲، صفحہ ۸۱)

(۹) فتاویٰ عالمگیری، جسے بارہویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ہندوستان کے بہت سے اکابر علماء نے مرتب کیا تھا، اس میں لکھا ہے: "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلم نہیں ہے۔ اور اگر وہ کہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں یا میں پیغمبر ہوں تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔" (جلد ۲، ص ۲۶۳)

(۱۰) علامہ شوکانی (متوفی ۱۲۵۵ھ) اپنی تفسیر فتح القدیر میں لکھتے ہیں: "جمہور نے لفظ خاتم کو ت کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے اور عاصم نے زبر کے ساتھ۔ پہلی قراءت کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے انبیاء کو ختم کیا، یعنی سب کے آخر میں آئے۔ اور دوسری قراءت کے معنی یہ ہیں کہ آپ ان کے لیے مہر کی طرح ہو گئے جس کے ذریعہ سے ان کا سلسلہ سربمہر ہو گیا اور جس کے شمول سے ان کا گروہ مزین ہوا۔" (جلد ۴، ص ۲۷۵)

(۱۱) علامہ آلوسی (متوفی ۱۲۷۰ھ) تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں: "نبی کا لفظ رسول کی بہ نسبت عام ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے سے خود بخود لازم آتا ہے کہ آپ خاتم المرسلین بھی ہوں۔ اور آپ کے خاتم انبیاء و رسل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں وصف نبوت سے آپ کے متصف ہونے کے بعد اب جن و انس میں سے ہر ایک کے لیے نبوت کا وصف منقطع ہو گیا۔" (جلد ۲۲، ص ۳۲) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص وحی نبوت کا مدعی ہو اسے کافر قرار دیا جائے گا۔ اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔" (جلد ۲۲، ص ۳۸) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا ایک ایسی بات ہے جسے کتاب اللہ نے صاف صاف بیان کیا، سنت نے واضح طور پر اس کی تصریح کی، اور امت نے اس پر اجماع کیا۔ لہٰذا جو اس کے خلاف کوئی دعویٰ کرے اسے کافر قرار دیا جائے گا۔" (جلد ۲۲، ص ۳۹)

یہ ہندوستان سے لے کر مراکش اور اندلس تک، اور ترکی سے لے کر یمن تک ہر مسلمان ملک کے اکابر علماء و فقہاء اور محدثین و مفسرین کی تصریحات ہیں۔ ہم نے ان کے ناموں کے ساتھ ان کے سنین ولادت و وفات بھی دے دیے ہیں جن سے ہر شخص بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ پہلی صدی سے تیرھویں صدی تک تاریخ اسلام کی ہر صدی کے اکابر ان میں شامل ہیں۔ اگرچہ ہم چودھویں صدی کے علمائے اسلام کی تصریحات بھی نقل کر سکتے تھے، مگر ہم نے قصداً انہیں اس لیے چھوڑ دیا کہ ان کی تفسیر کے جواب میں ایک شخص یہ حیلہ کر سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اس دور کے مدعی نبوت کی ضد میں ختم نبوت کے یہ معنی بیان کیے ہیں۔ اس لیے ہم نے پہلے علماء کی تحریریں نقل کی ہیں جو ظاہر ہے کہ آج کے کسی شخص سے کوئی ضد نہ رکھ سکتے تھے۔ ان تحریروں سے یہ بات قطعی طور پر

ثابت ہو جاتی ہے کہ پہلی صدی سے آج تک پوری دنیائے اسلام متفقہ طور پر خاتم النبیین کے معنی آخری نبی ہی سمجھتی رہی ہے، حضورؐ کے بعد نبوت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند تسلیم کرنا ہر زمانے میں تمام مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ رہا ہے۔ اور اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کرے اور جو اس کے دعوے کو مانے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اب یہ دیکھنا ہر صاحبِ عقل آدمی کا اپنا کام ہے کہ لفظ خاتم النبیین کا جو مفہوم لغت سے ثابت ہے، جو قرآن کی عبارت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے، جس کی تصریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرما دی ہے، جس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے، اور جسے صحابہ کرامؓ کے زمانے سے لے کر آج تک تمام دنیا کے مسلمان بلا اختلاف مانتے رہے ہیں، اس کے خلاف کوئی دوسرا مفہوم لینے اور کسی نئے مدعی کے لیے نبوت کا دروازہ کھولنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کو کیسے مسلمان تسلیم کیا جا سکتا ہے جنہوں نے بابِ نبوت کے مفتوح ہونے کا محض خیال ہی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اس دروازے سے ایک صاحب حریمِ نبوت میں داخل بھی ہو گئے ہیں اور یہ لوگ اُن کی نبوت پر ایمان بھی لے آئے ہیں۔

اس سلسلے میں تین باتیں اور قابلِ غور ہیں :

ایک اہم سوال

پہلی بات یہ ہے کہ نبوت کا معاملہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے یہ اسلام کے اُن بنیادی عقائد میں سے ہے جن کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور آدمی اس کو نہ مانے تو کافر، اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے ایک نازک معاملے میں تو اللہ تعالیٰ سے کسی بے احتیاطی کی بدرجۂ اولیٰ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود قرآن میں صاف صاف اُس کی تصریح فرماتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اُس کا کھلا کھلا اعلان کراتا اور حضورؐ دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے جب تک اپنی اُمت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور تمہیں اُن کو ماننا ہو گا۔ آخر اللہ اور اس کے رسول کو ہمارے دین و ایمان سے کیا دشمنی تھی کہ حضورؐ کے بعد نبوت کا دروازہ تو کھلا ہوتا اور کوئی نبی آنے والا بھی ہوتا جس پر ایمان لائے بغیر ہم مسلمان نہ ہو سکتے، مگر ہم کو نہ صرف یہ کہ اس سے بے خبر رکھا جاتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ اور اس کا رسول، دونوں ایسی باتیں فرما دیتے جن سے تیرہ سو برس تک ساری اُمت یہی سمجھتی رہی اور آج بھی سمجھ رہی ہے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

اب اگر بفرضِ محال نبوّت کا دروازہ واقعی کھلا بھی ہوا اور کوئی نبی آ بھی جائے تو ہم بے خوف و خطر اس کا انکار کر دیں گے خطرہ ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی باز پُرس ہی کا تو ہو سکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز ہم سے پُوچھے گا تو ہم یہ سارا ریکارڈ برسرِ عدالت لا کر رکھ دیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسُول کی سُنّت ہی نے ہمیں ڈالا تھا ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ ہمیں کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالے گا لیکن اگر نبوّت کا دروازہ فی الواقع بند ہے اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اور اس کے باوجود کوئی شخص کسی مدّعی کی نبوت پر ایمان لاتا ہے تو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کفر کی پاداش سے بچنے کے لیے وہ کونسا ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش کر سکتا ہے جس سے وہ رہائی کی توقع رکھتا ہو۔ عدالت میں پیشی ہونے سے پہلے اُسے اپنی صفائی کے مواد کا یہیں جائزہ لے لینا چاہیے، اور ہمارے پیش کردہ مواد سے مقابلہ کر کے خود ہی دیکھ لینا چاہیے کہ جس صفائی کے بھروسے پر وہ یہ کام کر رہا ہے کیا ایک عقلمند آدمی اس پر اعتماد کر کے کفر کی سزا کا خطرہ مول لے سکتا ہے؟

اب نئے نبی کی آخر ضرورت کیا ہے؟

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبوّت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو ہر اُس شخص میں پیدا ہو جایا کرے جس نے عبادت اور عملِ صالح میں ترقی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی ایسا انعام ہے جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ وہ ضرورت جب داعی ہوتی ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے، اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا باقی نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیاء پر انبیاء نہیں بھیجے جاتے۔

قرآن مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاءؑ مبعوث ہوتے ہیں:

اوّل یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اُس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بُھلا دی گئی ہو، یا اس میں تحریف ہو گئی ہو اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعہ مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیلِ دین کے لیے مزید انبیاءؑ کی ضرورت ہو۔

چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اُس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔
قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضورؐ کو تمام دُنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دُنیا کی تمدنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپؐ کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپؐ کی دعوت سب قوموں کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیاءؑ آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔

قرآن اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث و سیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں مسخ و تحریف کا کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ جو کتاب آپؐ لائے تھے اس میں ایک لفظ کی بھی کمی و بیشی آج تک نہیں ہوئی، نہ قیامت تک ہو سکتی ہے۔ جو ہدایت آپؐ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اس طرح ہمیں مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپؐ کے زمانے میں موجود ہیں۔ اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی۔
پھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضورؐ کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر دی گئی۔ لہٰذا تکمیلِ دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا۔
اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضورؐ کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی۔
اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کونسی ہے جس کے لیے آپؐ کے بعد ایک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے، تو ہم اُس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اِس کام کے لیے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اُس پر وحی کی جائے، اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے، یا پچھلے پیغام کی تکمیل کرنے کے لیے، یا اُس کو تحریفات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن اور سنّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں، تو اب اصلاح کے لیے صرف مُصلحین کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیاءؑ کی۔

نئی نبوّت اب اُمّت کے لیے رحمت نہیں

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نبی جب بھی کسی قوم میں آئے گا فوراً اس میں کفر و ایمان کا سوال اُٹھ کھڑا ہو گا۔ جو اُس کو مانیں گے وہ ایک اُمّت قرار پائیں گے اور جو اُس کو نہ مانیں گے وہ لامحالہ دوسری اُمّت ہوں گے۔ اِن دونوں اُمّتوں کا اختلاف محض فروعی اختلاف نہ ہو گا بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا

ایسا بنیادی اختلاف ہوگا جو انہیں اُس وقت تک جمع نہ ہونے دیگا جب تک ان میں سے کوئی اپنا نقطۂ نظر چھوڑ دے۔ پھر ان کے لیے عملاً بھی ہدایت اور قانون کے ماخذ الگ الگ ہوں گے، کیونکہ ایک گروہ اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیش کی ہوئی وحی اور اس کی سنّت سے قانون لے گا اور دوسرا گروہ اس کے ماخذِ قانون ہونے کا سرے سے منکر ہوگا۔ اس بنا پر ان کا ایک مشترک معاشرہ بن جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا۔

ان حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھے تو اُس پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ختمِ نبوت اُمّتِ مسلمہ کے لیے اللہ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے جس کی بدولت ہی اس اُمّت کا ایک دائمی اور عالمگیر برادری بننا ممکن ہوا ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کو ایسے ہر بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے جو ان کے اندر مستقل تفرقے کا موجب ہو سکتا ہو۔ اب جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و رہبر مانے اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے سوا کسی اور ماخذِ ہدایت کی طرف رجوع کرنے کا قائل نہ ہو وہ اس برادری کا فرد ہے اور ہر وقت ہو سکتا ہے۔ یہ وحدت اس اُمّت کو کبھی نصیب نہ ہو سکتی تھی اگر نبوّت کا دروازہ بند نہ ہو جاتا کیونکہ ہر نبی کے آنے پر یہ پارہ پارہ ہوتی رہتی۔

آدمی سوچے تو اس کی عقل خود یہ کہہ دے گی کہ جب تمام دنیا کے لیے ایک نبی بھیج دیا جائے، اور جب اس نبی کے ذریعہ سے دین کی تکمیل بھی کر دی جائے، اور جب اس نبی کی تعلیم کو پوری طرح محفوظ بھی کر دیا جائے تو نبوت کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے تاکہ اس آخری نبی کی پیروی پر جمع ہو کر تمام دنیا میں ہمیشہ کے لیے اہلِ ایمان کی ایک ہی اُمّت بن سکے اور بلاضرورت نئے نئے نبیوں کی آمد سے اس اُمّت میں بار بار تفرقہ نہ برپا ہوتا رہے۔ نبی خواہ "ظلّی" ہو یا "بروزی"، اُمّتی ہو یا صاحبِ شریعت اور صاحبِ کتاب، بہرحال جو شخص نبی ہوگا اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوگا، اس کے آنے کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کے ماننے والے ایک اُمّت بنیں اور نہ ماننے والے کافر قرار پائیں۔ یہ تفریق اس حالت میں تو ناگزیر ہے جبکہ نبی کے بھیجے جانے کی فی الواقع ضرورت ہو، مگر جب اس کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے تو خدا کی حکمت اور اس کی رحمت سے یہ بات قطعی بعید ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو کفر و ایمان کی کشمکش میں مبتلا کرے اور انہیں کبھی ایک اُمّت نہ بننے دے۔ لہٰذا جو کچھ قرآن سے ثابت ہے اور جو کچھ سنّت اور اجماع سے ثابت ہے عقل بھی اسی کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اب نبوّت کا دروازہ بند ہی رہنا چاہیے۔

فصل ۳

"مسیحِ موعود" کی حقیقت احادیث کی روشنی میں

نئی نبوت کی طرف بلانے والے حضرات عام طور پر ناواقف مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ احادیث میں مسیح موعود[1] کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اور مسیح نبی تھے، اس لیے ان کے آنے سے ختمِ نبوت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ختمِ نبوت بھی برقرار رہتی ہے اور اس کے باوجود مسیح موعود کا آنا بھی برحق۔

اسی سلسلے میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "مسیح موعود" سے مراد عیسیٰ ابن مریمؑ نہیں ہیں۔ ان کا تو انتقال ہو چکا۔ اب جس کے آنے کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ مثیلِ مسیح یعنی حضرت عیسیٰؑ کے مانند ایک مسیح ہے، اور وہ فلاں شخص ہے جو آ چکا ہے۔ اس کا ماننا عقیدۂ ختمِ نبوت کے خلاف نہیں ہے۔

اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ہم یہاں پورے حوالوں کے ساتھ وہ مستند روایات نقل کیے دیتے ہیں جو اس مسئلے کے متعلق حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان احادیث کو دیکھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا اور آج اس کو کیا بنایا جا رہا ہے۔

احادیث در باب نزولِ عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام

(۱) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیوشکن	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی
ان ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلًا	جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اتریں گے
فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع	تمہارے درمیان ابنِ مریمؑ حاکم عادل بن کر، پھر
الحرب ویفیض المال حتٰی لا یقبلہٗ	وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور خنزیر کو ہلاک

[1] واضح رہے کہ مسیح موعود کے آنے یا نہ آنے کا معاملہ قرآن سے تو تعلق ہی نہیں رکھتا۔ اس کا سارا دارومدار احادیث پر ہے۔ اب اگر کوئی مسیح آنا ہے تو وہ مسیح آنا ہے جس کا ذکر صحیح و معتبر احادیث میں ہے۔ اور اگر کوئی ان احادیث کو نہیں مانتا تو سرے سے کسی مسیح کو آنا ہی نہیں ہے۔ یہ محض مسخرہ پن ہوگا کہ اس عقیدے کی بنا تو احادیث پر ہو، اور پھر اُن احادیث میں [illegible] نکال جاتے جو مسیح کی آمد کے بارے میں صحیح ترین اور معتبر ترین ہیں۔ (مؤلف)

أحدٌ حتى تكون السجدة الواحدة خيرًا من الدنيا وما فيها (بخاری کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ ابن مریمؑ۔ مسلم، باب بیان نزول عیسیٰؑ۔ ترمذی ابواب الفتن، باب فی نزول عیسیٰ۔ مسند احمد، مرویاتِ ابو ہریرہؓ)

کر دیں گے¹ اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے (دوسری روایت میں حرب کے بجائے جزیہ کا لفظ ہے یعنی جزیہ ختم کر دیں گے²) اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا اور (حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور) ایک سجدہ کر لینا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہوگا۔"

(۲) ایک اور روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ میں ہے کہ لا تقوم الساعة حتیٰ ینزل عیسی ابن مریم ... "قیامت قائم نہ ہوگی جب تک نازل نہ ہو لیں عیسیٰ ابن مریم ..." اور اس کے بعد وہی مضمون ہے جو اوپر کی حدیث میں بیان ہوا ہے (بخاری، کتاب المظالم، باب کسر الصلیب۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجال)

(۳) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم (بخاری

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیسے ہوگے تم جبکہ تمہارے درمیان ابن مریمؑ اتریں گے اور تمہارا

---

¹ صلیب کو توڑ ڈالنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ دینِ عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (یعنی حضرت عیسیٰؑ) کو صلیب پر "لعنت" کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفارہ بن گیا۔ اور انبیاءؑ کی اُمتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی حتیٰ کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا جو تمام انبیاءؑ کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ کر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دی نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بنا تو عیسائی عقیدے کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے تو اپنے پیروؤں کے لیے سؤر حلال کیا تھا اور نہ ان کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھیرایا تھا، تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

² دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ملتوں کے اختلافات ختم ہو کر سب لوگ ایک ملتِ اسلام میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح نہ جنگ ہوگی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اسی بات پر آگے احادیث نمبر ۵ اور ۱۵ دلالت کر رہی ہیں۔

کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ، مسلم، بیان نزول عیسیٰ، مسند احمد، مرویات ابی ہریرہؓ

امام اُس وقت خود تم میں سے ہوگا۔"[1]

(۴) عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ینزل عیسی ابن مریم فیقتل الخنزیر ویمحو الصلیب وتجمع لہ الصلوٰۃ ویعطی المال حتی لا یقبل ویضع الخراج وینزل الروحاء فیحج منھا او یعتمر او یجمعھما (مسند احمد بسلسلۂ مرویات ابی ہریرۃؓ، مسلم، کتاب الحج، باب جواز التمتع فی الحج والقران)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ ابن مریمؑ نازل ہوں گے پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو مٹا دیں گے اور ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا اور وہ خراج ساقط کر دیں گے اور روحاء[2] کے مقام پر منزل کر کے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے، یا دونوں کو جمع کریں گے[3] (راوی کو شک ہے کہ حضورؐ نے ان میں سے کونسی بات فرمائی تھی۔)

(۵) عن ابی ھریرۃ (بعد ذکر خروج الدجال) فبینا ھم یعدون للقتال یسوون الصفوف اذا اقیمت الصلوٰۃ فینزل عیسی ابن مریم فامھم فاذا راٰہ عدو اللہ یذوب کما یذوب الملح فی الماء فلو ترکہ لانذاب حتی یھلک ولکن یقتلہ اللہ بیدہ فیریھم دمہ فی حربتہ۔ (مشکوٰۃ، کتاب الفتن، باب الملاحم، بحوالہ مسلم)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے (دجال کے خروج کا ذکر کرنے کے بعد حضورؐ نے فرمایا) اس اثنا میں کہ مسلمان اُس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے، صفیں باندھ رہے ہوں گے اور نماز کے لیے تکبیر اقامت کہی جا چکی ہوگی کہ عیسیٰؑ ابن مریم نازل ہو جائیں گے اور نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ اور اللہ کا دشمن (یعنی دجال) ان کو دیکھتے ہی اس طرح گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام اُس کو اُس کے حال پر ہی چھوڑ دیں تو وہ آپ ہی گھل کر مر جائے مگر اللہ اُس کو اُن کے ہاتھ سے قتل کرائے گا اور وہ اپنے نیزے میں اُس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔"

---

[1] یعنی نماز میں حضرت عیسیٰؑ امامت نہیں کرائیں گے بلکہ مسلمانوں کا جو امام پہلے سے ہوگا اسی کے پیچھے وہ نماز پڑھیں گے۔

[2] مدینہ سے ۳۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

[3] واضح رہے کہ اس زمانے میں جن صاحب کو مثیل مسیح قرار دیا گیا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں نہ حج کیا اور نہ عمرہ۔

(۶) عن ابی هریرة ان النبی صلی الله علیه وسلم قال لیس بینی وبینه نبی (یعنی عیسیٰ) وانه نازل فاذا رأیتموه فاعرفوه رجل مربوع الی الحمرة والبیاض، بین ممصرتین کان رأسه یقطر وان لم یصبه بلل فیقاتل الناس علی الاسلام فیدق الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیة ویهلک الله فی زمانه الملل کلها الا الاسلام ویهلک المسیح الدجال فیمکث فی الارض اربعین سنة ثم یتوفی فیصلی علیه المسلمون۔ (ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال۔ مسند احمد، مرویات ابوہریرہؓ)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے اور اُن (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اُترنے والے ہیں، پس جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا؛ وہ ایک میانہ قد آدمی ہیں، رنگ مائل بسرخی و سپیدی ہے، دو زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر کے بال ایسے ہوں گے گویا اب ان سے پانی ٹپکنے والا ہے، حالانکہ وہ بھیگے ہوئے نہ ہوں گے۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے صلیب کو پاش پاش کر دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، اور اللہ ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام ملتوں کو مٹا دے گا، اور وہ مسیح دجال کو ہلاک کر دیں گے، اور زمین میں وہ چالیس سال ٹھیریں گے۔ پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔"

(۷) عن جابر بن عبد الله قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم ... فینزل عیسی بن مریم صلی الله علیه وسلم فیقول امیرهم تعال صل لنا فیقول لا ان بعضکم علی بعض امراء تکرمة الله هذه الامة۔ (مسلم، بیان نزول عیسیٰ ابن مریم۔ مسند احمد بسلسلہ مرویات جابرؓ بن عبد اللہ)

حضرت جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ ..... پھر عیسیٰ ابن مریمؑ نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر اُن سے کہے گا کہ آئیے، آپ نماز پڑھائیے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو۔ یہ وہ اُس عزت کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اِس اُمت کو دی ہے۔"

(۸) عن جابر بن عبد الله (فی قصة ابن صیاد) فقال عمر بن الخطاب ائذن لی فاقتله یا رسول الله فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان یکن هو فلست صاحبه

جابر بن عبد اللہؓ (قصۂ ابن صیاد کے سلسلہ میں) روایت کرتے ہیں کہ پھر عمر بن خطاب نے عرض کیا: یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اسے قتل کر دوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

انما صاحبه عیسیٰ ابن مریم علیه الصلوٰة والسلام، وان لا یکن فلیس لك ان تقتل رجلا من اهل العهد (مشکوٰة، کتاب الفتن، باب قصة ابن صیاد، بحواله شرح السنة بغوی)

فرمایا کہ اگر یہ وہی شخص (یعنی دجال) ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو بلکہ اسے تو عیسیٰ ابن مریم ہی قتل کریں گے۔ اور اگر یہ وہ شخص نہیں ہے تو تمہیں اہل عہد (یعنی ذمیوں) میں سے ایک آدمی کو قتل کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

(۹) عن جابر بن عبد الله (فی قصة الدجال) فاذا هم بعیسیٰ ابن مریم علیه السلام فتقام الصلوٰة فیقال له تقدم یا روح الله فیقول لیتقدم امامکم فلیصل بکم فاذا صلی صلوٰة الصبح خرجوا الیه قال فحین یری الکذاب ینماث کما ینماث الملح فی الماء فیمشی الیه فیقتله حتی ان الشجر والحجر ینادی یا روح الله هذا الیهودی، فلا یترك ممن کان یتبعه احدا الا قتله۔ (مسند احمد، بسلسلهٔ روایات جابر بن عبد اللہ)

جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ دجال کا قصہ بیان کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُس وقت یکایک عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام مسلمانوں کے درمیان آجائیں گے۔ پھر نماز کھڑی ہوگی اور ان سے کہا جائے گا کہ آگے تشریف لائیے اے روح اللہ، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تمہارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے، وہی نماز پڑھائے۔ پھر صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمان دجال کے مقابلے پر نکلیں گے۔ فرمایا: جب وہ کذاب حضرت عیسیٰ کو دیکھے گا تو گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھیں گے اور اسے قتل کر دیں گے اور حالت یہ ہوگی کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے کہ اے روح اللہ یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ دجال کے پیروؤں میں سے کوئی نہ بچے گا جسے وہ (یعنی عیسیٰؑ) قتل نہ کر دیں۔

(۱۰) عن النواس بن سمعان (فی قصة الدجال) فبینما هو کذالك اذ بعث الله المسیح ابن مریم فینزل عند المنارة البیضاء شرقی دمشق بین مهرودتین واضعا کفیه علیٰ اجنحة ملکین اذا طاطا راسه قطر واذا رفعه تحدر منه جمان کاللؤلؤ فلا یحل لکافر یجد ریح نفسه الا مات و

حضرت نواس بن سمعان کلابیؓ (قصۂ دجال بیان کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں: اس اثنا میں کہ دجال یہ کچھ کر رہا ہوگا، اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو بھیج دے گا اور وہ دمشق کے شرقی حصے میں، سفید مینار کے پاس، زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے، دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب

نفسه ينتهي الى حيث ينتهي طرفه فيطلبه حتى يدركه بباب لُدّ فيقتله۔
(مسلم، ذکر الدجال۔ ابوداود، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی فتنۃ الدجال۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجال)

وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں، اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی۔ اور وہ ان کی حدِ نظر تک جائے گی۔ وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابن مریمؑ دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ[1] کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔

(۱۱) عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج الدجال في امتي فيمكث اربعين (لا ادري اربعين يومًا او اربعين شهرًا او اربعين عامًا) فيبعث الله عيسى ابن مريم كانه عروة بن مسعود فيطلبه فيهلكه ثم يمكث الناس سبع سنين ليس بين اثنين عداوة (مسلم، ذکر الدجال)

عبداللہ بن عمروؓ بن عاصؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دجال میری امت میں نکلے گا اور چالیس (میں نہیں جانتا چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال)[2] رہے گا۔ پھر اللہ عیسیٰ ابن مریمؑ کو بھیجے گا۔ ان کا حلیہ عروہ بن مسعودؓ (ایک صحابی) سے مشابہ ہوگا۔ وہ اس کا پیچھا کریں گے اور اسے ہلاک کر دیں گے، پھر سات سال تک لوگ اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان بھی عداوت نہ ہوگی۔

(۱۲) عن حذيفة بن اسيد الغفاري قال اطلع النبي صلى الله عليه وسلم علينا ونحن نتذاكر فقال ما تذكرون قالوا نذكر الساعة قال انها لن تقوم حتى ترون قبلها عشر آيات فذكر الدخان

حذیفہ بن اَسید الغفاری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مجلس میں تشریف لائے اور ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ آپ نے پوچھا کیا بات ہو رہی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ فرمایا وہ ہرگز قائم

---

[1] واضح رہے کہ لُدّ (Lydda) فلسطین میں ریاست اسرائیل کے دارالسلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہودیوں نے وہاں بہت بڑا ہوائی اڈا بنا رکھا ہے۔

[2] یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کا اپنا قول ہے۔

والدجال والدابة وطلوع الشمس من مغربها ونزول عيسى ابن مريم وياجوج وماجوج وثلثة خسوف، خسف بالمشرق وخسف بالمغرب، وخسف بجزيرة العرب وآخر ذلك نار تخرج من اليمن تطرد الناس الى محشرهم (مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب امارات الساعۃ)

نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے دس نشانیاں ظاہر نہ ہو جائیں۔ پھر آپ نے وہ دس نشانیاں بتائیں (۱) دھواں، (۲) دجال، (۳) دابۃ الارض (۴) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، (۵) عیسیٰ ابن مریم کا نزول، (۶) یاجوج و ماجوج، (۷) تین بڑے خسوف[1]، ایک مشرق میں، (۸) دوسرا مغرب میں (۹) تیسرا جزیرۃ العرب میں (۱۰) سب سے آخر میں ایک زبردست آگ جو یمن سے اٹھے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔

(۱۳) عن ثوبان مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن النبي صلى الله عليه وسلم عصابتان من امتي احرزهما الله تعالى من النار، عصابة تغزو الهند، وعصابة تكون مع عيسى ابن مريم عليه السلام (نسائی، کتاب الجہاد۔ مسند احمد، بسلسلۂ روایات ثوبان)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا میری امت کے دو لشکر ایسے ہیں جن کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچا لیا۔ ایک وہ لشکر جو ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا وہ جو عیسیٰؑ ابن مریم کے ساتھ ہوگا۔"

(۱۴) عن مجمع بن جارية قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول يقتل ابن مريم الدجال بباب لد (مسند احمد۔ ترمذی، ابواب الفتن)

مجمع بن جاریہ انصاری کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ابن مریم دجال کو لُدّ کے دروازے پر قتل کریں گے۔

(۱۵) عن ابي امامة الباهلي (في حديث طويل في ذكر الدجال) فبينما امامهم قد تقدم يصلي بهم الصبح اذ نزل عليهم عيسى بن مريم فرجع ذلك الامام ينكص يمشي

ابو امامہ باہلی (ایک طویل حدیث میں دجال کا ذکر کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں کہ عین اس وقت جب مسلمانوں کا امام صبح کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکا ہوگا عیسیٰ ابن مریم ان پر اتر آئیں گے۔

---

[1] زمین میں دھنس جانا (Landslide)

القهقری لیتقدم عیسیٰ فیضع عیسیٰ یده
بین کتفیه ثم یقول له تقدم فصلّ فانها
لك اقیمت فیصلّی بهم امامهم فاذا
انصرف قال عیسیٰ علیه السلام افتحوا
الباب فیفتح ووراءه الدجّال ومعه
سبعون الف یهودی کلهم ذو سیف
محلّی وساج فاذا نظر الیه الدجال ذاب کما
یذوب الملح فی الماء وینطلق هاربًا و
یقول عیسیٰ ان لی فیك ضربة لن تسبقنی
بها فیدرکه عند باب اللُّدّ الشرقی فیهزم
الله الیهود . . . . وتملأ الارض من
المسلم کما یملأ الاناء من الماء وتکون
الکلمة واحدة فلا یعبد الا الله تعالیٰ
(ابن ماجه، کتاب الفتن، باب فتنة الدجال)

امام پیچھے ہٹے گا تاکہ عیسیٰ آگے بڑھیں، مگر عیسیٰ اس کے
شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ نہیں تم ہی
نماز پڑھاؤ کیونکہ یہ تمہارے لیے ہی کھڑی ہوئی ہے۔
چنانچہ وہی نماز پڑھائے گا۔ سلام پھیرنے کے بعد عیسیٰ
علیہ السلام کہیں گے کہ دروازہ کھولو۔ چنانچہ وہ
کھولا جائے گا۔ باہر دجّال ۷۰ ہزار مسلح یہودیوں کے
ساتھ موجود ہوگا۔ جونہی کہ عیسیٰ علیہ السلام پر اس کی
نظر پڑے گی وہ اس طرح گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی
میں گھلتا ہے اور وہ بھاگ نکلے گا۔ عیسیٰ کہیں گے میرے
پاس تیرے لیے ایک ایسی ضرب ہے جس سے تو
بچ کر نہ جا سکے گا۔ پھر وہ اسے لُدّ کے مشرقی دروازے
پر جالیں گے اور اللہ یہودیوں کو ہرا دے گا۔
. . . اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی
جیسے برتن پانی سے بھر جاتے ہیں۔ سب دنیا کا کلمہ ایک
ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔"

(۱۶) عن عثمان بن ابی العاص قال سمعت رسول
الله صلی الله علیه وسلم یقول . . . . و
ینزل عیسیٰ ابن مریم علیه السلام عند
صلوٰة الفجر فیقول له امیرهم یا روح
الله تقدم صلّ. فیقول هذه الامة
بعضهم امراء علی بعض فیتقدم امیرهم
فیصلی، فاذا قضی صلوٰته اخذ عیسیٰ
حربته فیذهب نحو الدجال فاذا یراه
الدجّال ذاب کما یذوب الرصاص فیضع
حربته بین ثندوته فیقتله ویهزم

عثمان بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے . . . .
اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام فجر کی نماز کے
وقت اُتر آئیں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے
کہے گا کہ اے رُوح اللہ! آپ نماز پڑھائیے
وہ جواب دیں گے کہ اس اُمّت کے لوگ خود ہی
ایک دوسرے پر امیر ہیں۔ تب مسلمانوں کا امیر آگے
بڑھ کر نماز پڑھائے گا۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر عیسیٰ
اپنا حربہ لے کر دجّال کی طرف چلیں گے۔ وہ جب
ان کو دیکھے گا تو اس طرح پگھلے گا جیسے سیسہ پگھلتا ہے

اصحابه لیس یومئذ شئ یواری منهم احدا حتی ان الشجر لیقول یا مومن هذا کافر (مسند احمد۔ طبرانی۔ حاکم)

عیسٰی علیہ السلام اپنے حربے سے اس کو ہلاک کر دیں گے اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگیں گے مگر کہیں انہیں چھپنے کو جگہ نہ ملے گی حتیٰ کہ درخت پکاریں گے اے مومن، یہ کافر یہاں موجود ہے۔

(۱۷) عن سمرۃ بن جندب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (فی حدیث طویل) فیصبح فیہم عیسی ابن مریم فیھزمہ اللہ و جنودہ حتی ان اجذم الحائط او اصل الشجر لینادی یا مومن ھذا کافر یستتر بی تعال اقتلہ۔ (مسند احمد۔ حاکم)

سمرہ بن جندب (ایک طویل حدیث میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: پھر صبح کے وقت مسلمانوں کے درمیان عیسٰی ابن مریم آجائیں گے اور اللہ دجال اور اس کے لشکروں کو شکست دے گا یہاں تک کہ دیواریں اور درختوں کی جڑیں پکار اٹھیں گی کہ اے مومن، یہ کافر میرے پیچھے چھپا ہوا ہے، آ اور اسے قتل کر۔

(۱۸) عن عمران بن حصین ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تزال طائفۃ من امتی علی الحق ظاھرین علی من ناواھم حتی یاتی امر اللہ تبارک وتعالی وینزل عیسی ابن مریم علیہ السلام۔ (مسند احمد)

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا موجود رہے گا جو حق پر قائم اور مخالفین پر بھاری ہوگا یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فیصلہ آجائے اور عیسٰی ابن مریم علیہ السلام نازل ہوجائیں۔

(۱۹) عن عائشۃ (فی قصۃ الدجال) فینزل عیسی علیہ السلام فیقتلہ ثم یمکث عیسی علیہ السلام فی الارض اربعین سنۃ اماما عادلا وحکما مقسطا۔ (مسند احمد)

حضرت عائشہ (دجال کے قصے میں) روایت کرتی ہیں: پھر عیسٰی علیہ السلام اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسٰی علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں ایک امام عادل اور حاکم منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔

(۲۰) عن سفینۃ مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فی قصۃ الدجال) فینزل عیسی علیہ السلام فیقتلہ اللہ تعالی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سفینہ (دجال کے قصے میں) روایت کرتے ہیں: پھر عیسٰی علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ

عند عقبة أفيق (مسند احمد)

(۲۱) عن حذیفة (فی ذکر الدجال) فلما قاموا یصلون نزل عیسی ابن مریم اماهم فصلی بهم فلما انصرف قال هکذا فرجوا بینی وبین عدو الله ... ویسلط الله علیهم المسلمین فیقتلونهم حتی ان الشجر والحجر لینادی یا عبد الله یا عبد الرحمن یا مسلم هذا الیهودی فاقتلهم فیفنیهم الله تعالی ویظهر المسلمون فیکسرون الصلیب ویقتلون الخنزیر ویضعون الجزیة (مستدرک حاکم۔ مسلم میں بھی یہ روایت اختصار کے ساتھ آئی ہے اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری جلد ۶ ص ۴۵۰ میں اسے صحیح قرار دیا ہے)۔

دجال کو افیق[1] کی گھاٹی کے قریب ہلاک کرے گا۔

حضرت حذیفہ بن یمانؓ (دجال کا ذکر کرتے ہوئے) بیان کرتے ہیں: "پھر جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوں گے تو ان کی آنکھوں کے سامنے عیسیٰ ابن مریمؑ اتر آئیں گے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے، پھر سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے کہیں گے کہ میرے اور اس دشمن خدا کے درمیان سے ہٹ جاؤ ... اور اللہ دجال کے ساتھیوں پر مسلمانوں کو مسلط کردے گا اور مسلمان انہیں خوب ماریں گے یہاں تک کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے اے عبداللہ، اے عبدالرحمٰن، اے مسلمان، یہ رہا ایک یہودی، مار اسے۔ اس طرح اللہ ان کو فنا کردے گا اور مسلمان غالب ہوں گے اور صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے اور جزیہ ساقط کر دیں گے۔"

یہ جملہ ۲۱ روایات ہیں جو ۱۴ صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے لیکن طول کلام سے بچنے کے لیے ہم نے ان سب کو نقل نہیں کیا ہے بلکہ صرف وہ روایتیں لے لی ہیں جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں۔

ان احادیث سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

جو شخص بھی ان احادیث کو پڑھے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی "مسیح موعود" یا "مثیل مسیح" یا "بروز مسیح" کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ ان میں اس امر کی کوئی گنجائش ہے کہ کوئی شخص اس زمانے میں کسی ماں کے پیٹ

---

[1] افیق جسے آج کل فیق کہتے ہیں، شام اور اسرائیل کی سرحد پر موجودہ ریاست شام کا آخری شہر ہے۔ اس کے آگے مغرب کی جانب چند میل کے فاصلہ پر طبریہ نامی جھیل ہے جس میں سے دریائے اردن نکلتا ہے، اور اس کے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے درمیان ایک نشیبی راستہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ دو ہزار فیٹ تک گہرائی میں اتر کر اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے دریائے اردن طبریہ میں سے نکلتا ہے۔ اسی پہاڑی راستے کو عقبۂ افیق (افیق کی گھاٹی) کہتے ہیں۔ (مؤلف)

اور کسی باپ کے نطفے سے پیدا ہو کر یہ دعویٰ کر دے کہ میں ہی وہ مسیح ہوں جس کے آنے کی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں ان عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں جو اب سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس مقام پر یہ بحث چھیڑنا بالکل لاحاصل ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں یا زندہ کہیں موجود ہیں۔ بالفرض وہ وفات ہی پا چکے ہوں تو اللہ انہیں زندہ کر کے اٹھا لانے پر قادر ہے[1]۔ ورنہ یہ بات بھی اللہ کی قدرت سے ہرگز بعید نہیں ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو اپنی کائنات میں کہیں ہزارہا سال تک زندہ رکھے اور جب چاہے دنیا میں واپس لے آئے۔ بہرحال اگر کوئی شخص حدیث کو مانتا ہو تو اسے یہ ماننا پڑے گا کہ آنے والے وہی عیسیٰ ابن مریمؑ ہوں گے۔ اور اگر کوئی شخص حدیث کو نہ مانتا ہو تو وہ سرے سے کسی آنے والے کی آمد کا قائل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ تو لے لیا جائے احادیث سے اور پھر انہی احادیث کی اس تصریح کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ آنے والے عیسیٰ ابن مریمؑ ہوں گے نہ کہ کوئی مثیلِ مسیح۔

دوسری بات جو اتنی ہی وضاحت کے ساتھ ان احادیث سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا یہ دوبارہ نزول نبی مقرر ہو کر آنے والے شخص کی حیثیت سے نہیں ہو گا۔ نہ ان پر وحی نازل ہو گی، نہ وہ خدا کی طرف سے کوئی نیا پیغام یا نئے احکام لائیں گے، نہ وہ شریعتِ محمدی میں کوئی اضافہ یا کوئی کمی کریں گے، نہ ان کو تجدیدِ دین کے لیے دنیا میں لایا جائے گا، نہ وہ آکر لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیں گے، اور نہ وہ اپنے ماننے والوں کی ایک الگ امت بنائیں گے[2]۔ وہ صرف ایک کارِ خاص کے لیے بھیجے جائیں گے، اور وہ یہ ہو گا کہ

---

[1] جو لوگ اس بات کا انکار کرتے ہیں انہیں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۹ ملاحظہ فرمانی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بندے کو سو برس تک مُردہ رکھا اور پھر زندہ کر دیا۔ فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ۔ (مؤلف)

[2] علمائے اسلام نے اس مسئلے کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ علامہ تفتازانی (۷۲۲ھ-۷۹۲ھ) شرح عقائد نسفی میں لکھتے ہیں:

ثبت انه آخر الانبیاء ... فان قیل قد روی فی الحدیث نزول عیسی علیه السلام بعده قلنا نعم لکنه یتابع محمداً علیه السلام لان شریعته قد نسخت فلا یکون الیه وحی ولا نصب احکام بل یکون خلیفة رسول	یہ ثابت ہے ... کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں ... اگر کہا جائے کہ آپؐ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر احادیث میں آیا ہے، تو ہم کہیں گے کہ ہاں آیا ہے، مگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے کیونکہ ان کی شریعت تو منسوخ ہو چکی ہے اس لیے نہ

دجال کے فتنے کا استیصال کر دیں۔ اس غرض کے لیے وہ ایسے طریقے سے نازل ہوں گے کہ جن مسلمانوں کے درمیان ان کا نزول ہوگا انہیں اس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ یہ عیسیٰ ابن مریم ہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیوں کے مطابق ٹھیک وقت پر تشریف لائے ہیں۔ وہ آکر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے، جو بھی مسلمانوں کا امام اس وقت ہوگا اسی کے پیچھے نماز پڑھیں گے۱؎ اور جو بھی اس وقت مسلمانوں کا امیر ہوگا اسی کو آگے رکھیں گے، تاکہ اس شبہ کی کوئی ادنیٰ

انه عليه السلام (طبع مصر، ص ۱۵۰)

ان کی طرف وحی ہوگی اور نہ وہ احکام مقرر کریں گے، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے کام کریں گے۔

اور یہی بات علامہ آلوسی تفسیر روح المعانی میں کہتے ہیں:

ثم انه عليه السلام حين ينزل باقٍ على نبوته السابقة لم يعزل عنها بحال لكنه لا يتعبد بها لنسخها في حقه وحق غيره وتكليفه باحكام هذه الشريعة اصلاً وفرعاً فلا يكون اليه عليه السلام وحي ولا نصب احكام بل يكون خليفة لرسول الله صلى الله عليه وسلم وحاكماً من حكام ملته بين امته۔ (جلد ۲۲ ص ۳۲)

پھر عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو وہ اپنی سابق نبوت پر باقی ہوں گے، بہرحال اس سے معزول تو نہ ہو جائیں گے، مگر وہ اپنی پچھلی شریعت کے پیرو نہ ہوں گے کیونکہ وہ ان کے اور دوسرے سب لوگوں کے حق میں منسوخ ہو چکی ہے اور اب وہ اصول اور فروع میں اس شریعت کی پیروی پر مکلف ہوں گے۔ لہٰذا ان پر نہ اب وحی آئے گی اور نہ انہیں احکام مقرر کرنے کا اختیار رہے گا، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اور آپ کی امت محمدیہ کے حاکموں میں سے ایک حاکم کی حیثیت سے کام کریں گے۔

امام رازیؒ اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

انتهاء الانبياء الى مبعث محمد صلى الله عليه وسلم فعند مبعثه انتهت تلك المدة فلا يبعد ان يصير عيسى ابن مريم بعد نزوله تبعاً لمحمد (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۳۴۳)

انبیاء کا دور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک تھا۔ جب آپ مبعوث ہو گئے تو انبیاء کی آمد کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نازل ہونے کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے

۱؎ اگرچہ دو روایتوں (نمبر ۵ و ۲۱) میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد پہلی نماز خود پڑھائیں گے، لیکن بیشتر اور قوی تر روایات (نمبر ۳-۷-۹-۱۵-۱۶) یہی کہتی ہیں کہ وہ نماز میں امامت کرانے سے انکار کریں گے اور جو اس وقت مسلمانوں کا امام ہوگا اسی کو آگے پڑھائیں گے۔ اسی بات کو محدثین اور مفسرین نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔

گنجائش بھی نہ رہے گی کہ وہ اپنی سابق پیغمبرانہ حیثیت کی طرح اب پھر پیغمبری کے فرائض انجام دینے کے لیے واپس آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی جماعت میں اگر خدا کا پیغمبر موجود ہو تو نہ اس کا کوئی امام دوسرا شخص ہو سکتا ہے اور نہ امیر۔ پس جب وہ مسلمانوں کی جماعت میں آکر محض ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہوں گے تو یہ گویا خودبخود اس امر کا اعلان ہوگا کہ وہ پیغمبر کی حیثیت سے تشریف نہیں لائے ہیں، اور اس بنا پر ان کی آمد سے مُہرِ نبوت کے ٹوٹنے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔

اُن کا آنا بلاتشبیہ اُسی نوعیت کا ہوگا جیسے ایک صدرِ ریاست کے دَور میں کوئی سابق صدر آئے اور وقت کے صدر کی ماتحتی میں مملکت کی کوئی خدمت انجام دے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ بات بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک صدر کے دَور میں کسی سابق صدر کے محض آجانے سے آئین نہیں ٹوٹتا۔ البتہ دو صورتوں میں آئین کی خلاف ورزی لازم آتی ہے۔ ایک یہ کہ سابق صدر آکر پھر سے فرائضِ صدارت سنبھالنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص اس کی سابق صدارت کا بھی انکار کر دے، کیونکہ یہ اُن تمام کاموں کے جواز کو چیلنج کرنے کا ہم معنی ہوگا جو اس کے دَورِ صدارت میں انجام پاتے تھے۔ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی نہ ہو تو بجائے خود سابق صدر کی آمد آئینی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ یہی معاملہ حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی کا بھی ہے کہ ان کے محض آجانے سے ختمِ نبوت نہیں ٹوٹتی۔ البتہ اگر وہ آکر پھر نبوت کا منصب سنبھال لیں اور فرائضِ نبوت انجام دینے شروع کر دیں یا کوئی شخص ان کی سابق نبوت کا بھی انکار کر دے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے آئینِ نبوت کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ احادیث نے پوری وضاحت کے ساتھ دونوں صورتوں کا سدِّباب کر دیا ہے۔ ایک طرف وہ تصریح کرتی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ اور دوسری طرف وہ خبر دیتی ہیں کہ عیسیٰ ابن مریمؑ دوبارہ نازل ہوں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کی یہ آمدِ ثانی منصبِ نبوت کے فرائض انجام دینے کے لیے نہ ہوگی۔

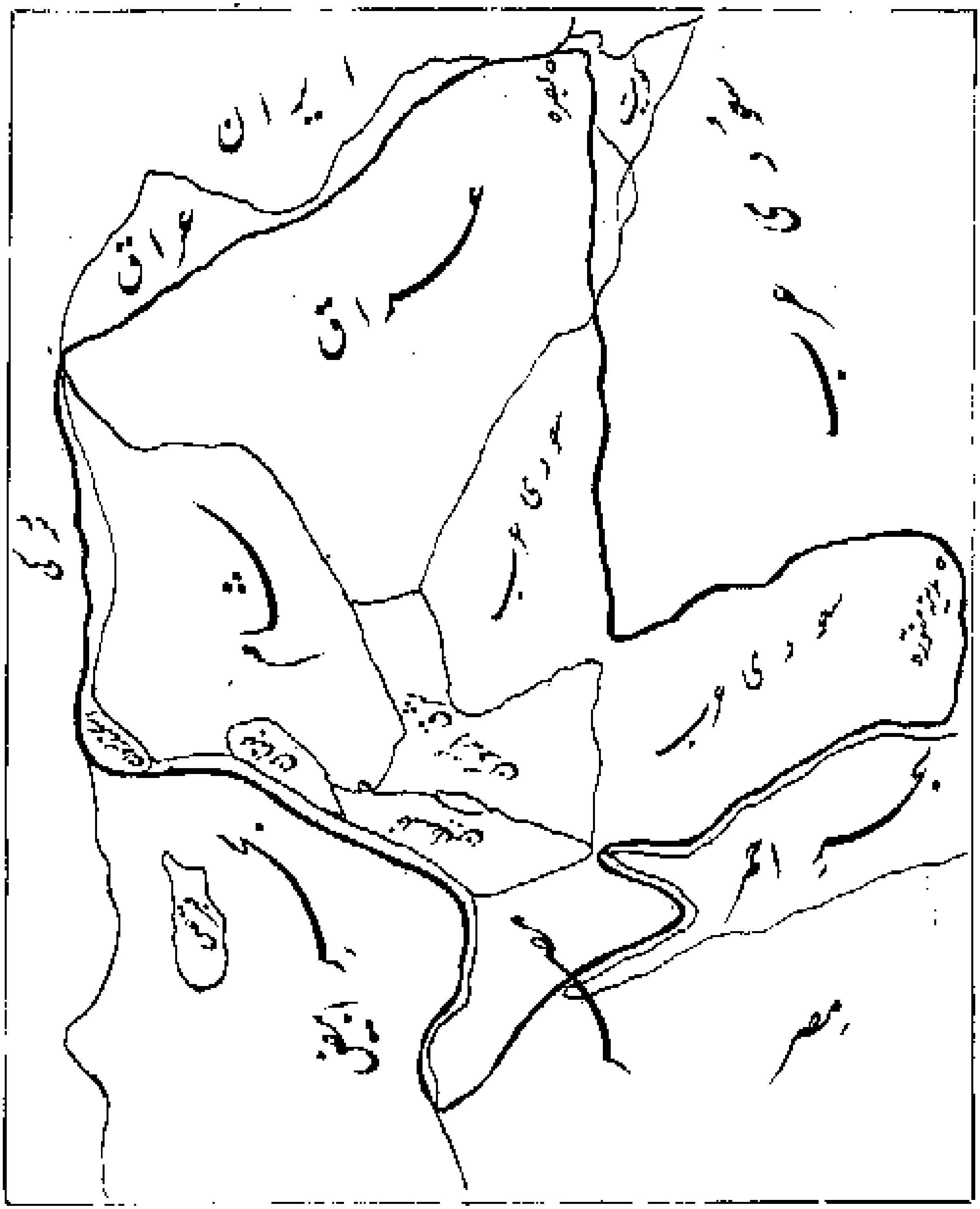
اسی طرح ان کی آمد سے مسلمانوں کے اندر کفر و ایمان کا بھی کوئی نیا سوال پیدا نہ ہوگا۔ اُن کی سابقہ نبوت پر تو آج بھی اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کافر ہو جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی اس نبوت پر ایمان رکھتے تھے اور آپؐ کی ساری اُمت ابتدا سے ان کی مومن ہے۔ یہی حیثیت اُس وقت بھی ہوگی۔ مسلمان کسی تازہ نبوت پر ایمان نہ لائیں گے بلکہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی سابقہ نبوت ہی پر ایمان رکھیں گے جس طرح آج رکھتے ہیں۔ یہ چیز نہ آج ختمِ نبوت کے خلاف ہے نہ اُس وقت ہوگی۔

آخری بات جو ان احادیث سے، اور کثرت دوسری احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دجالِ جس کے فتنۂ عظیم کا استیصال کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو بھیجا جائے گا، یہودیوں میں سے ہوگا اور اپنے آپ کو "مسیح" کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ اس معاملے کی حقیقت کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ

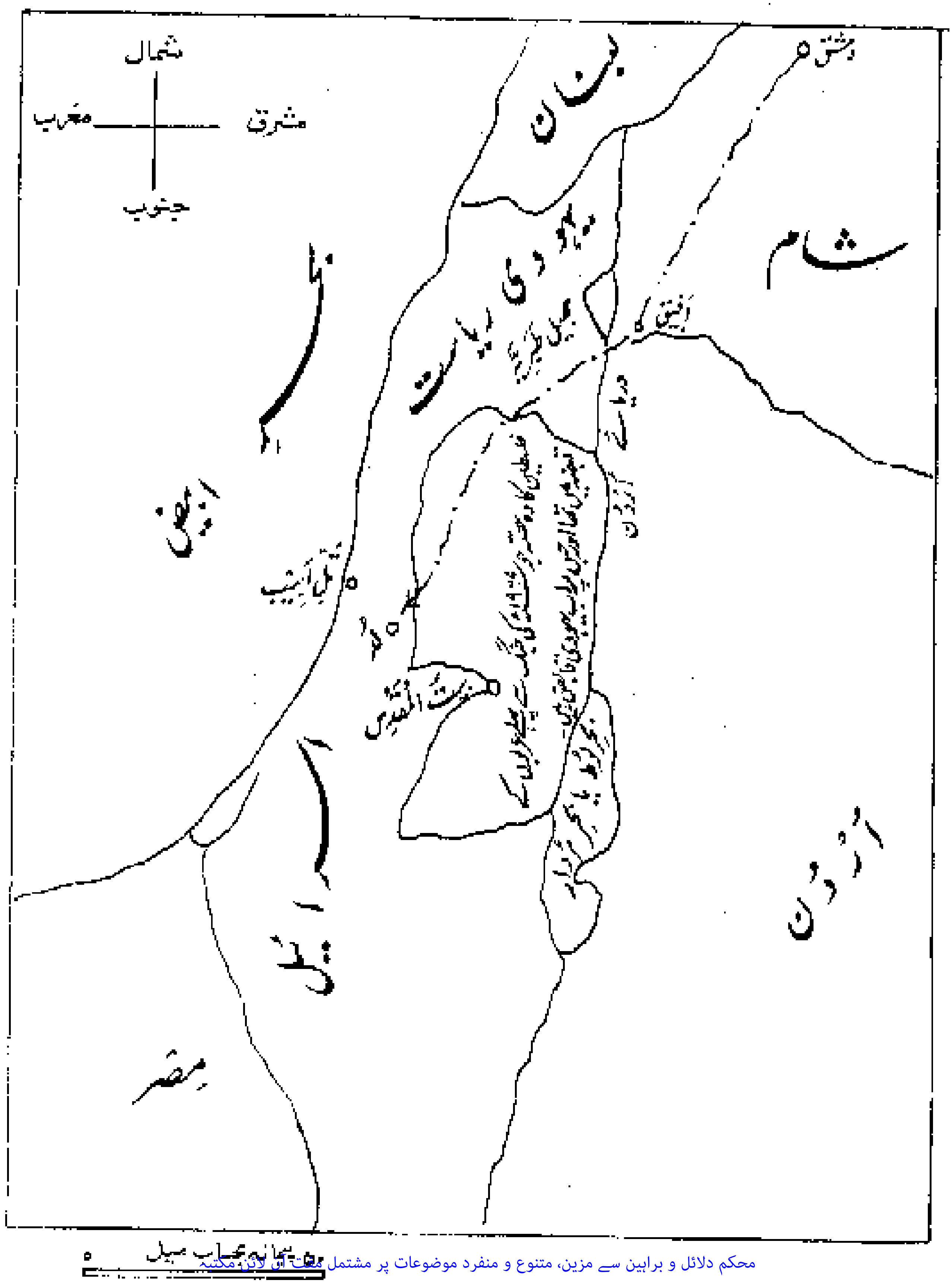
یہودیوں کی تاریخ اور ان کے مذہبی تصورات سے واقف نہ ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل پے در پے تنزل کی حالت میں مبتلا ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ آخرکار بابل اور اسیریا کی سلطنتوں نے ان کو غلام بنا کر زمین میں تتر بتر کر دیا، تو انبیائے بنی اسرائیل نے ان کو خوشخبری دینی شروع کی کہ خدا کی طرف سے ایک "مسیح" آنے والا ہے جو ان کو اس ذلت سے نجات دلائے گا۔ ان پیشین گوئیوں کی بنا پر یہودی ایک ایسے مسیح کی آمد کے متوقع تھے جو بادشاہ ہو، لڑ کر ملک فتح کرے، بنی اسرائیل کو ملک ملک سے لا کر فلسطین میں جمع کر دے، اور ان کی ایک زبردست سلطنت قائم کر دے۔ لیکن ان کی ان توقعات کے خلاف جب حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام خدا کی طرف سے مسیح ہو کر آئے اور کوئی لشکر ساتھ نہ لائے تو یہودیوں نے ان کی مسیحیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں ہلاک کرنے کے درپے ہو گئے۔ اُس وقت سے آج تک دنیا بھر کے یہودی اُس مسیح موعود (Promised Messiah) کے منتظر ہیں جس کے آنے کی خوشخبریاں ان کو دی گئی تھیں۔ اُن کا لٹریچر اس آنے والے دور کے سہانے خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔ تلمود اور ربیوں کے ادبیات میں اُس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اُس کی خیالی لذت کے سہارے صدیوں سے یہودی جی رہے ہیں اور یہ امید لیے بیٹھے ہیں کہ یہ مسیح موعود ایک زبردست جنگی و سیاسی لیڈر ہوگا جو دریائے نیل سے دریائے فرات تک کا علاقہ (جسے یہودی اپنی میراث کا ملک سمجھتے ہیں) انہیں واپس دلائے گا، اور دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لا کر اس ملک میں پھر سے جمع کر دے گا۔

اب اگر کوئی شخص مشرقِ وسطیٰ کے حالات پر ایک نگاہ ڈالے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے پس منظر میں ان کو دیکھے تو وہ فوراً یہ محسوس کرے گا کہ اُس دجالِ اکبر کے ظہور کے لیے اسٹیج بالکل تیار ہو چکا ہے جو حضورؐ کی دی ہوئی خبروں کے مطابق یہودیوں کا "مسیح موعود" بن کر اُٹھے گا۔ فلسطین کے بڑے حصے سے مسلمان بے دخل کیے جا چکے ہیں اور وہاں اسرائیل کے نام سے ایک یہودی ریاست قائم کر دی گئی ہے۔ اس ریاست میں دنیا بھر کے یہودی کھنچ کھنچ کر چلے آ رہے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اس کو ایک زبردست جنگی طاقت بنا دیا ہے۔ یہودی سرمایے کی بے پایاں امداد سے یہودی سائنس دان اور ماہرین فنون اُس کو روز افزوں ترقی دیتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اُس کی یہ طاقت گرد و پیش کی مسلمان قوموں کے لیے ایک خطرۂ عظیم بن گئی ہے۔ اس ریاست کے لیڈروں نے اپنی اس تمنا کو کچھ چھپا کر نہیں رکھا ہے کہ وہ اپنی "میراث کا ملک" حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مستقبل کی یہودی سلطنت کا جو نقشہ وہ ایک مدت سے کھلم کھلا شائع کر رہے ہیں اُسے مقابل کے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پورا شام، پورا لبنان، پورا اردن اور تقریباً سارا عراق لینے کے علاوہ ترکی سے اسکندرون، مصر سے سینا اور ڈیلٹا کا علاقہ اور سعودی عرب سے بالائی حجاز و نجد کا علاقہ لینا چاہتے ہیں جس میں مدینہ منورہ بھی شامل ہے۔ اِن

وہ یہودی ریاست جس کا خواب اسرائیل کے لیڈر دیکھ رہے ہیں:-



تحقیقِ مسیحؑ کے نزول کا مقام



حالات کو دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ کسی عالمگیر جنگ کی بھڑک سے فائدہ اٹھا کر یہود ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے اور ٹھیک اُس موقع پر وہ دجالِ اکبر اُن کا مسیح موعود بن کر اٹھے گا جس کے ظہور کی خبر دینے ہی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اکتفا نہیں فرمایا ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اُس زمانے میں مسلمانوں پر مصائب کے ایسے پہاڑ ٹوٹیں گے کہ ایک دن ایک سال کے برابر محسوس ہوگا۔ اسی بنا پر آپ فتنۂ مسیح دجال سے خود بھی خدا کی پناہ مانگتے تھے اور اپنی اُمت کو بھی پناہ مانگنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اِس مسیح دجال کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی مثیلِ مسیح کو نہیں بلکہ اُس اصلی مسیح کو نازل فرمائے گا جسے دو ہزار برس پہلے یہودیوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا اور جسے وہ اپنی دانست میں صلیب پر چڑھا کر ٹھکانے لگا چکے تھے۔ اِس حقیقی مسیح کے نزول کی جگہ ہندوستان یا افریقہ یا امریکہ میں نہیں بلکہ دمشق میں ہوگی کیونکہ یہی مقام اُس وقت عین محاذِ جنگ پر ہوگا۔ براہِ کرم دوسرے صفحے پر نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔ اِس میں آپ دیکھیں گے کہ اسرائیل کی سرحد سے دمشق بمشکل ۵۰-۶۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلے جو احادیث ہم نقل کر آئے ہیں ان کا مضمون اگر آپ کو یاد ہے تو آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہ ہوگی کہ مسیح دجال ۷۰ ہزار یہودیوں کا لشکر لے کر شام میں گھسے گا، اور دمشق کے سامنے جا پہنچے گا۔ ٹھیک اُس نازک موقع پر دمشق کے مشرقی حصے میں ایک سفید مینار کے قریب حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام بوقتِ صبح نازل ہوں گے اور نمازِ فجر کے بعد مسلمانوں کو اس کے مقابلے پر لے کر نکلیں گے۔ اُن کے حملے سے دجال پسپا ہو کر افیق کی گھاٹی سے (ملاحظہ ہو حدیث نمبر ۲۱) اسرائیل کی طرف پلٹے گا اور وہ اس کا تعاقب کریں گے۔ آخرکار لُد کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر وہ اُن کے ہاتھ سے مارا جائے گا (حدیث نمبر ۱۰-۱۴-۱۵)۔ اس کے بعد یہودی چُن چُن کر قتل کیے جائیں گے اور ملتِ یہود کا خاتمہ ہو جائے گا (حدیث نمبر ۹-۱۵-۲۱)۔ عیسائیت بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے اظہارِ حقیقت ہو جانے کے بعد ختم ہو جائے گی (حدیث نمبر ۱-۲-۴-۶) اور تمام ملتیں ایک ہی ملتِ مسلمہ میں ضم ہو جائیں گی (حدیث نمبر ۶-۱۵)۔

یہ ہے وہ حقیقت جو کسی اشتباہ کے بغیر احادیث میں صاف نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اس امر میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ "مسیح موعود" کے نام سے جو کاروبار ہمارے ملک میں پھیلایا گیا ہے وہ ایک جعل سازی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

اس جعل سازی کا سب سے زیادہ مضحکہ انگیز پہلو یہ ہے کہ جو صاحب اپنے آپ کو ان پیشگوئیوں کا مصداق قرار دیتے ہیں انہوں نے خود عیسیٰ ابن مریمؑ بننے کے لیے یہ دلچسپ تاویل فرمائی ہے:

"اُس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) براہینِ احمدیہ کے تیسرے حصے میں میرا نام مریم رکھا۔ پھر جیسا کہ براہینِ احمدیہ سے ظاہر ہے، دو برس تک صفتِ مریمیت میں مَیں نے پرورش پائی ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ۔ مریمؑ کی طرح عیسیٰؑ کی

مریمی مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھیرایا گیا، اور کئی مہینے کے بعد جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اُس الہام کے جو سب سے آخر براہین احمدیہ کے حصہ چہارم میں درج ہے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا پس اس طور سے میں ابن مریم ٹھیرا۔" (کشتی نوح ص ۸۷ - ۸۸ - ۸۹)

یعنی پہلے مریم بنے، پھر خود ہی حاملہ ہوئے، پھر اپنے پیٹ سے آپ عیسیٰ ابن مریم بن کر تولد ہو گئے! اس کے بعد یہ مشکل پیش آئی کہ عیسیٰ ابن مریم کا نزول تو احادیث کی رُو سے دمشق میں ہونا تھا جو کئی ہزار برس سے شام کا ایک مشہور و معروف مقام ہے اور آج بھی دنیا کے نقشے پر اسی نام سے موجود ہے۔ یہ مشکل ایک دوسری پر لطف تاویل سے یوں رفع کی گئی:

"واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر منجانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبے کا نام دمشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کی عادات اور خیالات کے پیرو ہیں ۔۔۔ یہ قصبہ قادیان بوجہ اس کے کہ اکثر یزیدی الطبع لوگ اس میں سکونت رکھتے ہیں دمشق سے ایک مشابہت اور مناسبت رکھتا ہے۔" (حاشیہ ازالۂ اوہام ص ۶۳ تا ۷۳)

پھر ایک اور اُلجھن یہ باقی رہ گئی کہ احادیث کی رُو سے ابن مریم کو ایک سفید منارہ کے پاس اُترنا تھا چنانچہ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ مسیح صاحب نے آ کر اپنا منارہ خود بنوا لیا۔ اب اسے کون دیکھتا ہے کہ احادیث کی رُو سے منارہ وہاں ابن مریم کے نزول سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا، اور یہاں وہ مسیح موعود صاحب کی تشریف آوری کے بعد تعمیر کیا گیا۔

آخری اور زبردست اُلجھن یہ تھی کہ احادیث کی رُو سے تو عیسیٰ ابن مریم کو لُد کے دروازے پر دجّال کو قتل کرنا تھا۔ اس مشکل کو رفع کرنے کی فکر میں پہلے طرح طرح کی تاویلیں کی گئیں۔ کبھی تسلیم کیا گیا کہ لُد بیت المقدس کے دیہات میں سے ایک گاؤں کا نام ہے (ازالۂ اوہام، شائع کردہ انجمن احمدیہ لاہور، تقطیع خورد صفحہ ۲۲۰) پھر کہا گیا کہ "لُد اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو بے جا جھگڑا کرنے والے ہوں ۔۔۔ جب دجّال کے بے جا جھگڑے کمال تک پہنچ جائیں گے تب مسیح موعود ظہور کرے گا اور اس کے تمام جھگڑوں کا خاتمہ کر دے گا۔" (ازالۂ اوہام صفحہ ۷۳۰) لیکن جب اس سے بھی بات نہ بنی تو صاف کہہ دیا گیا کہ لُد سے مراد لدھیانہ ہے اور اس کے دروازے پر دجّال کے قتل سے مراد یہ ہے کہ اشرار کی مخالفت کے باوجود وہیں سب سے پہلے مرزا صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ (الہدیٰ ص ۹۱)

ان تاویلات کو جو شخص بھی کھلی آنکھوں سے دیکھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹے بہروپ (False Impersonation) کا صریح ارتکاب ہے جو علی الاعلان کیا گیا ہے۔

فصل ۴

قادیانیوں کی مزید تاویلاتِ باطلہ

صریح نصوص سے گریز

جب کسی مسئلے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسُول نے بالکل صاف اور صریح نصوص میں کر دیا ہو تو پھر اُسی سلسلے میں اُن نصوص کو چھوڑ کر دوسری آیات و احادیث سے، جو دراصل اُس خاص مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے وارد نہیں ہوتی ہیں۔ اپنے مطلب کے معنی نکالنا اور نصوصِ قطعیہ کے بالکل خلاف عقیدہ یا عمل اختیار کر لینا درحقیقت انتہائی گمراہی بلکہ اللہ اور اس کے رسُولؐ کے خلاف بدترین بغاوت ہے۔ جو شخص فلاں غیر اللہ اور اس کے فرمان کے خلاف کوئی مسلک اختیار کرتا ہے وہ تو کمتر درجے کی بغاوت کرتا ہے۔ مگر یہ بہت بڑے درجے کی بغاوت ہے کہ آدمی اللہ اور رسُولؐ کے فیصلے کے خلاف خود اللہ اور رسُولؐ ہی کے ارشادات کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے لگے۔ یہ کام جو لوگ کرتے ہیں اُن کے متعلق ہم کسی طرح بھی یہ فرض نہیں کر سکتے کہ وہ سچے دل سے اللہ اور اُس کے رسُولؐ کو مانتے ہیں۔ یہ سوال کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبیؐ ہیں یا نہیں؟ اور آپؐ کے بعد کوئی نبی آسکتا ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم آیت وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ (النساء: ۶۹) اور آیت يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ (اعراف-۳۵) اور ایسی ہی دوسری آیتوں کی طرف صرف اُس صورت میں رجوع کر سکتے تھے جب کہ اللہ اور اُس کے رسُولؐ نے خاص طور پر اسی سوال کا جواب کسی خاص نص میں نہ دے دیا ہوتا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت خاتم النبیین میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بکثرت احادیث صحیحہ میں ہم کو خاص طور پر اسی سوال کا واضح جواب مل چکا ہے تو آیت وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ اور يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اور ایسی ہی دوسری آیات کی طرف رجوع کرنا، اور پھر اُن سے نصوصِ قطعیہ صریحہ کے خلاف مطالب نکالنا صرف اُس شخص کا کام ہو سکتا ہے جو خدا سے بالکل بے خوف ہو چکا ہو اور جسے یہ بھی یقین نہ ہو کہ کبھی مر کر خدا کے سامنے جواب دہی بھی کرنی ہوگی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تعزیراتِ پاکستان کی ایک خاص دفعہ میں ایک فعل کو بالفاظِ صریح جرم قرار دیا گیا ہو۔ اور کوئی شخص اُس دفعہ کو چھوڑ کر قانون کی دوسری غیر متعلق دفعات کا جائزہ اِس غرض کے لیے لیتا پھرے کہ کہیں سے کوئی اشارہ اور کہیں سے کوئی نکتہ نکال کر اور پھر اُنہیں جوڑ جاڑ کر اُسی فعل کو ثابت کر دے جسے قانون کی ایک صریح دفعہ جُرم قرار دے رہی ہے۔ اِس طرح

کا استدلال اگر دنیا کی پولیس اور عدالت کے سامنے نہیں چل سکتا، تو آخر یہ خدا کے ہاں کیسے چل جائے گا؟

زبردستی کا استدلال

پھر جن آیات سے قادیانی استدلال کرتے ہیں بجائے خود ان کو پڑھ کر دیکھا جائے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ان میں سے وہ مضمون آخر کہاں نکلتا ہے جو یہ لوگ زبردستی ان سے نچوڑنا چاہتے ہیں جن مختلف آیات کو یہ لوگ تختۂ مشق بناتے ہیں، ان کے صحیح مفہوم پر غور کرنا ضروری ہے:-

آیت مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (النساء ۶۹) میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرنے والے انبیاء و صدیقین اور شہداء و صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ اس سے یہ مضمون کیسے نکل آیا کہ جو لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کریں گے وہ یا تو نبی ہو جائیں گے یا صدیق یا شہید یا صالح؟ پھر ذرا سورۂ حدید کی آیت ۱۹ ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ "اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی صدیقین اور شہداء ہیں اپنے رب کے نزدیک"۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ایمان کے نتیجے میں جو دولت کسی کو مل سکتی ہے وہ صرف صدیق اور شہید ہو جانے کی ہے۔ رہے انبیاءؑ تو ان کی معیت نصیب ہو جانا ہی اہلِ ایمان کے لیے کافی ہے۔ کسی عمل کے انعام میں کسی شخص کا نبی ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اسی بنا پر سورۂ نساء کی آیت میں فرمایا کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرنے والے انبیاءؑ اور صدیقین و شہداء کے ساتھ ہوں گے۔ اور سورۂ حدید کی آیت میں فرمایا کہ اللہ اور رسولؐ پر ایمان لانے والے خود صدیق اور شہید بن جائیں گے۔

رہی آیت یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ الخ (اعراف ۔ ۳۵) تو وہ ایک سلسلۂ بیان سے تعلق رکھتی ہے جو سورۂ اعراف میں آیت ۱۱ سے ۵۳ تک مسلسل چل رہا ہے۔ اس سیاق و سباق میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی آدم سے یہ خطاب آغازِ تخلیقِ انسانی میں کیا گیا تھا، اس کو پڑھ کر یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ ان آیات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاءؑ کے آنے کا ذکر ہے۔ اس میں تو اس وقت کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے جب حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کو جنت سے نکال کر زمین پر لایا گیا تھا۔۹۹ه

سورۂ اعراف کی آیت کا صحیح مفہوم

سورۂ اعراف کی آیت ۳۵ کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے جو معنی قادیانی حضرات نکالتے ہیں وہ ان معنی کے برعکس ہے جو سلسلۂ کلام میں اسے رکھ کر دیکھنے سے نکلتا ہے۔ دراصل یہ آیت جس سلسلۂ کلام میں وارد ہوئی ہے وہ سورۂ اعراف کے رکوع دوم سے رکوع چہارم کے وسط تک مسلسل بیان ہوا ہے۔ پہلے رکوع دوم میں آدمؑ و حواؑ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر رکوع سوم و چہارم میں ان نتائج پر تنبیہ کیا گیا ہے جو اس قصے سے نکلتے ہیں۔ اس

سیاق و سباق کو ذہن میں رکھ کر آیت ۳۵ کو پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ" کے الفاظ سے مخاطب کر کے جو بات کہی گئی ہے اس کا تعلق آغازِ آفرینش کے وقت سے ہے نہ کہ نزولِ قرآن کے وقت سے۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ آغازِ آفرینش ہی میں اولادِ آدمؑ کو اس بات پر متنبہ کر دیا گیا تھا کہ تمہاری نجات اس ہدایت کی پیروی پر موقوف ہے جو خدا کی طرف سے تم کو بھیجی جائے۔

اس مضمون کی آیات قرآن میں تین مقامات پر آئی ہیں اور تینوں مقامات پر قصۂ آدمؑ و حوّا کے سلسلے ہی میں اس کو وارد کیا گیا ہے۔ پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے (آیت نمبر ۳۸)۔ دوسری آیت سورۂ اعراف میں ہے (آیت ۳۵) اور تیسری آیت سورۂ طٰہٰ میں ہے (آیت ۱۲۳)۔ ان تینوں آیتوں کا مضمون بھی باہم مشابہ ہے اور موقع و محل بھی مشابہ۔ مفسرینِ قرآن بھی دوسری آیتوں کی طرح سورۂ اعراف کی اس آیت کو قصۂ آدمؑ و حوّا ہی سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ضمن میں حضرت ابو سیار السلمی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کو یکجا اور ایک ہی وقت میں خطاب کیا ہے۔" امام رازیؒ اپنی تفسیر کبیر میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اگر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو، حالانکہ وہ خاتم الانبیاء ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ یہاں اُمتوں کے بارے میں اپنی سنت بیان فرما رہا ہے۔" علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ "یہاں ہر قوم کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہے اسے حکایۃً بیان کیا جا رہا ہے۔ یہاں بنی آدم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت مراد لینا مستبعد اور ظاہر کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہاں جمع کا لفظ "رُسُل" استعمال ہوا ہے۔" علامہ آلوسیؒ کے ارشاد کے آخری حصے کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں اُمّتِ محمدیہ سے خطاب ہو تو پھر اس اُمت کو یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ "کبھی تم میں رُسُل آئیں" کیونکہ اس اُمت میں ایک رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا مزید رسولوں کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سورۂ مومنون کی آیت کا مفہوم

آیت يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (مومنون۔ ۵۱) کو بھی اگر اس کے سیاق و سباق سے الگ نہ کیا جائے تو اس سے وہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا جو قادیانی حضرات نے نکالا ہے۔ یہ آیت جس سلسلۂ کلام میں وارد ہوئی ہے وہ رکوع دوم سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ اس میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ بن مریمؑ تک مختلف زمانوں کے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں انبیاءؑ ایک ہی تعلیم دیتے رہے ہیں، ایک ہی ان سب کا طریقہ رہا ہے، اور ایک ہی طرح سے ان سب پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوتا رہا ہے۔ اس کے برعکس گمراہ قومیں ہمیشہ خدا کے رستے کو چھوڑ کر غلط کاری میں مبتلا ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلۂ بیان میں یہ آیت اس معنی میں نہیں آئی ہے کہ "اے رسولو! جو

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے ہو، تم پاک رزق کھاؤ اور نیک عمل کرو۔" بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن تمام رسولوں کو، جو نوح علیہ السلام کے وقت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک آتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہی ہدایت فرمائی تھی کہ پاک رزق کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

اس آیت سے بھی مفسرینِ قرآن نے کبھی یہ مطلب نہیں لیا کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کی آمد کا دروازہ کھولتی ہے۔ اگر کوئی مزید تحقیق و اطمینان کرنا چاہے تو مختلف تفسیروں میں اس مقام کو دیکھ سکتا ہے۔

احادیث سے قادیانیوں کا غلط استدلال

حدیث لَوْ عَاشَ (اِبْرَاهِیْمُ) لَکَانَ نَبِیًّا (اگر ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہتے تو نبی ہوتے) سے قادیانی حضرات جو استدلال کرتے ہیں وہ چار وجوہ سے غلط ہے۔

اوّل یہ کہ جس روایت میں اسے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے اس کی سند ضعیف ہے اور محدثین میں سے کسی نے بھی اس کو قوی تسلیم نہیں کیا ہے۔

دوم یہ کہ نووی اور ابن عبد البر جیسے اکابر محدثین اس مضمون کو بالکل ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں۔ امام نووی اپنی کتاب "تہذیب الاسماء واللغات" میں لکھتے ہیں:

اما ما روی عن بعض المتقدمین لو عاش ابراھیم لکان نبیًّا فباطل وجسارۃ علی الکلام علی المغیبات ومجازفۃ وھجوم علیٰ عظیم۔

رہی وہ بات جو بعض متقدمین سے منقول ہے کہ اگر ابراہیم زندہ رہتے تو نبی ہوتے، تو وہ باطل ہے اور غیب کی باتوں پر کلام کرنے کی بے جا جسارت ہے اور بے سوچے سمجھے ایک بڑی بات منہ سے نکال دینا ہے۔

اور علامہ ابن عبد البر "تمہید" میں لکھتے ہیں:

لا ادری ما ھذا فقد ولد نوح علیہ السلام غیر نبی ولو لم یلد النبی الا نبیا لکان کل احد نبیًّا لانھم من نوح علیہ السلام۔

میں نہیں جانتا کہ یہ کیا مضمون ہے۔ نوح علیہ السلام کے ہاں غیر نبی اولاد ہو چکی ہے۔ حالانکہ اگر نبی کا بیٹا نبی ہی ہوتا ضروری ہوتا تو آج سب نبی ہوتے کیونکہ سب کے سب نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

سوم یہ کہ اکثر روایات میں اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے بعض صحابیوں کے قول کی حیثیت سے نقل کیا گیا ہے اور وہ اس کے ساتھ یہ تصریح بھی کر دیتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ کوئی نبی نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے صاحبزادے کو اٹھا لیا۔ مثال کے طور پر بخاری کی روایت یہ ہے:

عن اسمٰعیل بن ابی خالد قال قلت

اسماعیل بن ابی خالد کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ

لعبد اللہ بن ابی اوفیٰ أرأیت ابراہیم ابن النبی صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال مات صغیراً ولو قضی ان یکون بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبیٌ عاش ابنہٗ ولکن لا نبی بعدہٗ۔ (بخاری کتاب الادب۔ باب من سمی باسماء الانبیاء)

بن ابی اوفیٰ (صحابی) سے پوچھا کہ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیمؑ کو دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو تو آپؐ کا صاحبزادہ زندہ رہتا مگر حضورؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہے۔"

اسی سے ملتی جلتی روایت حضرت انسؓ سے بھی منقول ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

ولو بقی لکان نبیاً لکن لم یبق لان نبیکم آخر الانبیاء۔ (تفسیر روح المعانی جلد ۲۲ صفحہ ۳۴)

"اگر وہ زندہ رہ جاتے تو نبی ہوتے مگر وہ زندہ نہ رہے کیونکہ تمہارے نبی آخری نبی ہیں۔"

چہارم یہ کہ اگر بالفرض صحابۂ کرام کی یہ تصریحات بھی نہ ہوتیں، اور محدثین کے اقوال بھی موجود نہ ہوتے جن میں اس روایت کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے منقول ہوئی ہے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار قرار دیا گیا ہے، تب بھی وہ کسی طرح قابلِ قبول نہ ہوتی۔ کیونکہ یہ بات علمِ حدیث کے مسلّم اصولوں میں سے ہے کہ اگر کسی ایک روایت سے کوئی ایسا مضمون نکلتا ہو جو بکثرت صحیح احادیث کے خلاف پڑتا ہو تو اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اب ایک طرف وہ کثیر التعداد صحیح اور قوی السند احادیث ہیں جن میں صاف صاف تصریح کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اور دوسری طرف یہ اکیلی روایت ہے جو بابِ نبوت کے کھلے ہونے کا امکان ظاہر کرتی ہے۔ آخر کس طرح جائز ہے کہ اس ایک روایت کے مقابلے میں ان سب روایتوں کو ساقط کر دیا جائے۔ انتہیٰ

خاتمۂ کلام

قرآنِ مجید اور حدیث، دونوں کی رُو سے نبوت کا معاملہ دین میں اساسی حیثیت رکھتا ہے یعنی اس پر آدمی کے کفر و ایمان کا مدار اور آخرت میں اس کی فلاح و خسران کا انحصار ہے۔ اگر آدمی ایک سچے نبی کو نہ مانے تو کافر، اور جھوٹے نبی کو مان لے تو کافر۔ اس طرح کی اہمیت اور نزاکت رکھنے والے کسی معاملے کو بھی اللہ اور اس کے رسولؐ نے مبہم اور پیچیدہ اور مشکوک نہیں رکھا ہے، بلکہ صاف اور واضح طریقے سے رہنمائی دی ہے تاکہ انسان کا دین و ایمان خطرے میں نہ پڑے اور اُس کے گمراہ ہونے کی ذمہ داری اللہ اور اُس کے رسولؐ پر نہ عائد ہو۔ اب دیکھیے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کبھی کسی نبی کے زمانہ میں یہ نہیں کہا گیا کہ نبوت کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ انبیاء کی آمد کا دروازہ اُس وقت کھلا ہوا تھا، کوئی شخص اس بنیاد پر کسی مدعیِ نبوت

کا انکار کر دیتے میں حق بجانب نہ تھا کہ اب کسی نبی کے آنے کا امکان ہی نہیں ہے۔ پھر اُس زمانے میں انبیاء علیہم السلام اپنے بعد آنے والے نبیوں کی آمد کے لیے پیش گوئی بھی کرتے رہتے تھے اور اپنے پیروؤں سے عہد لیتے تھے کہ بعد میں جو نبی آئیں ان کی بھی وہ پیروی کریں گے۔ یہ چیز اور بھی اس بات کو مؤکد کر دیتی تھی کہ جو شخص نبی کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرے اُسے بلا تامل رد نہ کر دیا جائے بلکہ اس کی دعوت اور شخصیت اور اس کے کام اور احوال کو بنظرِ غائر دیکھ کر جاننے کی کوشش کی جائے کہ آیا وہ واقعی نبی ہے یا جھوٹا مدعی نبوت ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد یہ معاملہ بالکل اُلٹ ہو گیا۔ اب صرف یہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی نبی کی آمد کی پیش گوئی نہیں کی اور نہ اپنی اُمت سے اس کے اتباع کا عہد لیا، بلکہ اس کے برعکس قرآن میں اعلان کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دو نہیں بلکہ متعدد حدیثیں نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بکثرت مستند و معتبر واسطوں سے اُمت کو ملیں کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہے، اب کوئی نبی آنے والا نہیں، اب جو مدعی نبوت اٹھیں گے وہ دجال ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی نگاہ میں لوگوں کے کفر و ایمان کا معاملہ نازک اور اہم نہیں رہا؟ کیا حضورؐ سے پہلے ہی کے مومنین اس کے مستحق تھے کہ انہیں کفر کے خطرے میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول واضح طور پر باب نبوت کے مفتوح ہونے اور انبیاء کی آمد کے متعلق خبریں دینے کا اہتمام فرماتے رہتے، مگر اب ہمیں انہوں نے جان بوجھ کر اس خطرے میں مبتلا کیا ہے کہ ایک طرف تو نبی کے آنے کا امکان بھی ہو جس کے ماننے یا نہ ماننے پر ہمارے کافر یا مومن ہونے کا انحصار ہے، اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسولؐ نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا ہو کہ ہمیں اس کی آمد سے آگاہ نہ کیا، بلکہ اس سے گزر کر پے در پے وہ ایسی باتیں ارشاد فرماتے چلے گئے جن کی بنا پر ہم باب نبوت کو بند سمجھیں اور ہر مدعی نبوت کو ماننے سے انکار کر دیں؟ کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ اللہ اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی ہم سے ایسی دھوکہ بازی کر سکتے ہیں؟

خاتم النبیین کے معنی کی جو تاویل بھی قادیانی بیان کرتے رہیں، مگر کم از کم ایک بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے معنی سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اُمت کے ننانوے لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے فی کروڑ علماء اور عوام اس کے یہی معنی لیتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نبوت جیسے نازک معاملے میں جس پر مسلمانوں کے کفر و ایمان کا مدار ہے کیا اللہ میاں کو ایسی ہی زبان استعمال کرنی چاہیے تھی جس سے چند قادیانیوں کے سوا ساری اُمت یہی سمجھے کہ اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ارشادات تو کسی تاویل کی گنجائش بھی نہیں چھوڑتے۔ ان میں تو صاف صاف مختلف طریقوں سے اس بات کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ کے رسولؐ کو ہم سے ایسی ہی دشمنی تھی کہ

نبی تو آپ کے بعد آنے والا ہو اور آپ ہمیں اُلٹی یہ ہدایت دے جائیں کہ ہم اسے نہ مانیں اور کافر ہو کر جہنم میں جائیں! اس صورت میں کوئی چاہے کیسی ہی بھولی بھالی دل موہنے والی صورت رکھتا ہو، اور خواہ اس کی پیشین گوئیاں سو فیصد ہی درست ہوں، اور خواہ اس کے کارنامے کیسے ہی ہوں، ہم اس کے دعوائے نبوت کو قابل غور بھی نہیں سمجھتے کیوں کہ یہ چیزیں غور طلب اُسی صورت میں ہو سکتی تھیں کہ نبی کی آمد کا امکان ہوتا ہم تو پورے اطمینان کے ساتھ ہر مدعی نبوت کے دعوے کو سنتے ہی اس کی تکذیب کریں گے اور اس کے دلائل نبوت پر سرے سے کوئی توجہ نہ دیں گے۔ یہ اگر کفر بھی ہو تو ہم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، کیونکہ ہمارے پاس قیامت کے روز اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے قرآن اور ارشادات رسولؐ موجود ہیں۔ ۳۲۰

باب ۶

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی

فصل ۱

اتباع واطاعتِ رسُولؐ

جو لوگ اسلام قبول کر لیں اور اُمّتِ مُسلمہ میں داخل ہو جائیں، اُن کے لیے رسُولؐ کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے، بلکہ رسُولؐ اُن کے لیے مُعلّم اور مُربّی بھی ہے، اسلامی زندگی کا نمونہ بھی ہے اور ایسا امیر بھی ہے جس کی اطاعت ہر زمانے میں بے چون و چرا کی جانی چاہیے۔

مُعلّم، مُربّی اور نمونہ

مُعلّم کی حیثیت سے رسُولؐ کا کام یہ ہے کہ پیغامِ الٰہی کی تعلیمات اور اس کے قوانین کی تشریح و توضیح کرے (وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ)۔ مُربّی ہونے کی حیثیت سے اس کا کام یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات اور قوانین کے مطابق مسلمانوں کی تربیت کرے اور ان کی زندگیاں اسی سانچے میں ڈھالے (وَيُزَكِّيْهِمْ)۔ نمونہ ہونے کی حیثیت سے اس کا کام یہ ہے کہ خود قرآنی تعلیم کا عملی مجسّمہ بن کر دکھائے تاکہ اس کی زندگی اُس زندگی کی ٹھیک ٹھیک تصویر ہو جو کتاب اللہ کے مقصود کے مطابق ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیے، اور اس کے ہر قول اور ہر فعل کو دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ زبان کو اس طرح استعمال کرنا، اور اپنی قوتوں سے یُوں کام لینا، اور دُنیا کی زندگی میں ایسا برتاؤ رکھنا کتاب اللہ کے مقصود کے مُطابق ہے، اور جو کچھ اس کے خلاف ہے وہ منشائے کتاب کے خلاف ہے (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ اور وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى)۔ اس کے ساتھ ہی رسُولؐ کی حیثیت مسلمانوں کے امیر کی بھی ہے۔ ایسا امیر نہیں جس سے نزاع کی جاسکے، بلکہ ایسا امیر جس کے حکم کو بے چون و چرا ماننا ویسا ہی فرض ہے جیسا قرآن کی آیات کو ماننا فرض ہے (فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اور وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ)۔ ایسا امیر نہیں جو صرف اپنی زندگی ہی میں امیر ہوتا ہے، بلکہ ایسا امیر جو قیامت تک کے لیے اُمّتِ مُسلمہ کا امیر ہے جس کے احکام مسلمانوں کے لیے ہر زمانے اور ہر حال میں مرجع ہیں۔

صرف پیغام بری نہیں

جو لوگ آیت اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ اور اس کی ہم معنی آیات سے استدلال کر کے رسُولؐ کے کام کو صرف پیغام بری تک محدود کرتے ہیں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ رسُولؐ کی خالص مبلّغانہ حیثیت صرف اُس وقت

ہی رہتی ہے جب تک کہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل نہ ہوں۔ اور وہ صرف اُنہی لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے رسولؐ کی تعلیم کو ابھی قبول نہ کیا ہو۔ رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کر کے اُمّتِ مُسلمہ میں داخل ہو جائیں، تو اُن کے لیے رسولؐ کی حیثیت محض مُبلّغ کی نہیں ہے بلکہ وہ ان کا لیڈر ہے، فرماں روا ہے، مُقنّن ہے، قاضی ہے، مُعلّم ہے، مُربّی ہے اور واجب التقلید نمونہ ہے۔

جو تفریق انہوں نے محمد بن عبداللہ بحیثیتِ انسان، اور محمدؐ رسول اللہ بحیثیتِ مبلّغ کے درمیان کی ہے، یہ قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسولؐ ذی جیثیت کی حیثیت ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اُس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسولؐ تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اِسی حیثیت میں آپ مُبلّغ اور مُعلّم بھی تھے، مُربّی اور مُزکّی بھی تھے، قاضی اور حاکم بھی تھے، امام اور امیر بھی تھے، حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خانگی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اِس حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔ اور ان تمام حیثیتوں میں آپ کی پاک زندگی ایک انسانِ کامل اور مُسلمِ قانت اور مومنِ صادق کی زندگی کا ایسا نمونہ تھی جس کو حق تعالیٰ نے ہر اُس شخص کے لیے بہترین قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا تھا جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ (احزاب۔ ۲۱)۔ قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسانی اور حیثیتِ امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ اور یہ فرق کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جب آپ خدا کے رسولؐ تھے تو لازم تھا کہ آپ کی پُوری زندگی خدا کی شریعت کے ماتحت ہو، اِس شریعت کی نمائندہ ہو، اور آپ سے کوئی ایسا فعل اور کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔

ہوائے نفس سے محفوظ

اِسی بات کی طرف سورۂ النجم کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ "تمہارا صاحب (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بدراہ ہُوا، نہ گمراہ ہوا" وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ "اور جو کچھ وہ کہتا ہے ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا"۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ "اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی ہے"۔ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ "اس کو ایسے اُستاد نے تعلیم دی ہے جس کی قوتیں بڑی زبردست ہیں"۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ان آیات میں محض قرآن کے وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کُفّار انکار کرتے تھے لیکن مجھے ان آیات میں کہیں کوئی خفیف سا اشارہ بھی قرآن کی طرف نظر نہیں آتا۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ میں "ھُو" کی ضمیر نطقِ رسولؐ کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ میں کیا گیا ہے۔ اِن آیات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی

بنا پر نُطق رسُول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہو۔ ہر وہ بات جس پر نُطقِ رسُول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے، آیاتِ مذکورہ کی بنا پر وحی ہوگی اور ہوائے نفس سے پاک ہوگی۔ یہ تصریح قرآن میں اسی لیے کی گئی ہے کہ رسُول کو جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے ان کو رسُول کے بدراہی اور گمراہی اور ہوائے نفس سے محفوظ ہونے کا کامل اطمینان ہو جاتے اور وہ جان لیں کہ رسُول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے۔ ورنہ اگر اس کی کسی ایک بات کے بارے میں بھی یہ شُبہ ہو جاتے کہ وہ خواہشِ نفس پر مبنی ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہے، تو رسُول کی رسالت پر سے اعتماد اُٹھ جاتے۔ کفّار اسی چیز کے منکر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نعوذ باللہ رسُول کو جنون ہے۔ یا کوئی آدمی اس کو پڑھا جاتا ہے، یا وہ اپنے دل سے باتیں بنا کر کہتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر اس غلط خیال کی تردید کی ہے اور صاف الفاظ میں فرما دیا ہے کہ نہ تمہارا صاحب بدراہ ہے نہ گمراہ، اور نہ خواہشِ نفس کی بنا پر کچھ کہتا ہے۔ اُس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے جو خاص ہماری طرف سے ہے۔ اس کو کوئی انسان یا جن یا شیطان نہیں پڑھاتا بلکہ وہ مُعلّم سبق دیتا ہے جو شدید القویٰ ہے۔ یہی بات خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زبانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمائی کہ والّذی نفسی بیدہٖ ما یخرج منہ الّا حقّاً "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق ہی نکلتا ہے"

ہر حال میں واجب الاطاعت نمونہ

افسوس ہے کہ کچھ لوگوں کو اس حقیقت سے انکار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ اپنے گھر میں ازواجِ مطہراتؓ سے، یا باہر دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے، اُس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا نہ کفّار کو کوئی بحث تھی۔ میں کہتا ہوں کہ آنحضرتؐ جس وقت جس حالت میں جو کچھ عمل کرتے تھے رسُول کی حیثیت سے کرتے تھے سب کچھ ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس سے پاک تھا۔ اللہ نے جو فطرتِ سلیمہ آپؐ کو عنایت فرمائی تھی، اور تقویٰ و پاکیزگی کے جو حدود آپؐ کو بتائے تھے، آپؐ کے تمام اقوال و افعال اُسی فطرت سے صادر اور انہی حدود سے محدود ہوتے تھے۔ ان کے اندر تمام عالمِ انسانی کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ تھا۔ اور انہی سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز ہے، کونسی چیز حرام ہے اور کونسی حلال، کونسی باتیں حق تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہیں اور کونسی اُس کے خلاف ہیں، کن امُور میں ہم کو رائے اور اجتہاد کی آزادی حاصل ہے اور کن امُور میں نہیں ہے، کس طرح ہم اطاعتِ امر کریں، کس طرح شُوریٰ سے معاملات طے کریں، اور کیا معنی ہیں اپنے دین میں بصیرت کے۔

آپؐ خدا کے مامور کردہ امیر تھے

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے بنائے ہوئے امیر نہیں تھے، نہ خود بن گئے تھے، بلکہ آپؐ خدا کے مقرر کیے ہوئے امیر تھے۔ آپؐ کی امارت آپؐ کی رسالت سے الگ نہ تھی۔ دراصل آپؐ رسولِ خدا ہونے کی

حیثیت ہی سے امیر تھے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ آپؐ امیر نہیں بلکہ مامور من اللہ تھے۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، مگر وہ اس لیے تھا کہ آپؐ اپنی اُمّت کے لیے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے جمہوریت (Democracy) کے صحیح اصول کی طرف رہنمائی فرما دیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپؐ کی حیثیت دوسرے امیروں کی سی ہے۔ دُوسرے اُمراء کے لیے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورے سے کام کریں، وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۹)، اور یہ کہ اگر شوریٰ میں نزاع ہو تو خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء: ۵۹)، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپؐ کسی بات کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کرکے عمل کا اقدام فرمائیں۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران: ۱۵۹)۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ مشورہ کے محتاج نہ تھے، بلکہ آپؐ کو شوریٰ کا حکم صرف اس لیے دیا گیا تھا کہ آپؐ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرزِ حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔

رسول کی اطاعت بہ حیثیتِ امیر

رہی یہ بات کہ امیر کی حیثیت سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت صرف آپؐ کے عہد تک تھی، تو یہ بھی غلط ہے۔ اور جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ سورۂ انفال کی آیت ۲۰ کے الفاظ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ سے یہ مطلب لیا گیا ہے کہ اطاعتِ رسول کا حکم صرف اُن لوگوں کو دیا گیا تھا جو اُس وقت حضورؐ کا حکم سن رہے تھے۔ لیکن سورۂ انفال ہی کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ "اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو"۔ پھر آیت ۵ میں اُن لوگوں کو ڈانٹا گیا ہے جو رسولؐ اللہ کی دعوتِ جہاد پر دلوں میں کڑھتے تھے۔ پھر آیت ۱۳ میں فرمایا گیا کہ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ "اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ سے جھگڑا کرتا ہے اسے معلوم ہو جانے کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے"۔ اس کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (آیت۔ ۲۰) "اے ایمان لانے والو اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور رسولؐ کے حکم سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہو"۔ اس آیت میں اور پچھلی آیات میں رسولؐ کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ رسولؐ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ پھر ہر جگہ لفظ رسول آیا ہے، امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا اور نہ کوئی مخفی سے مخفی اشارہ ایسا موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں رسول سے مُراد رسولؐ کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو رسالت سے مختلف ہو۔ پھر رسولؐ کے حکم سے منہ موڑنے کو منع کیا گیا ہے جس پر سخت عذاب کی دھمکی اوپر دی جا چکی ہے۔

اس کے بعد وَأَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ کہنے کا منشا صاف یہ ہے کہ تم ہمارے ان تاکیدی احکام کو سنتے ہوئے بھی رسولؐ کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑو۔ یہاں أَنْتُمْ اور تَسْمَعُوْنَ کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے، بلکہ قیامت تک جو لوگ ایمان کے ساتھ قرآن کو سنیں گے اُن سب پر لازم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم ان کو پہنچے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

ایک عجیب طرزِ استدلال

یہ کہنا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ امارت اُسی طرح ہنگامی ہیں جس طرح دوسرے اُمراء کے ہوا کرتے ہیں، کیونکہ آج ہم جہاد میں بدر و اُحد کی طرح نیزہ و شمشیر سے نہیں لڑ سکتے" ایک بہت ہی عجیب طرزِ استدلال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں جن اسلحہ سے کام لیا وہ اسلحہ تو ضرور ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتے تھے، لیکن حضورؐ نے اپنی لڑائیوں میں جو اخلاقی ضوابط برتے تھے، اور جن ضوابط کو برتنے کی ہدایت آپؐ نے فرمائی تھی، وہ کسی عہد کے لیے مخصوص نہ تھے بلکہ اُنہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک دائمی قانونِ جنگ بنا دیا ہے شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ سوال اہمیت نہیں رکھتا کہ آپ تلوار استعمال کرتے ہیں یا بندوق یا توپ، بلکہ اہمیت اس سوال کی ہے کہ آپ اپنے اسلحہ کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں؟ اور کس طرح اُن سے خونریزی کا کام لیتے ہیں؟ اس باب میں جو نمونہ آنحضرتؐ نے اپنے غزوات میں پیش فرمایا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسلامی جہاد کا ایک مکمل نمونہ ہے اور معنوی حیثیت سے سرورِ عالمؐ قیامت تک کے لیے ہر مسلمان فوج کے سالارِ اعظم ہیں۔

حضورؐ کی امارت کی امتیازی شان

ایک صاحب نے امارت اور رسالت میں خود یہ فرق بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اُمراء سے نزاع اور اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے ورآنحالیکہ رسول سے نزاع نہیں کی جا سکتی۔ اب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امیرانہ حیثیت ویسی ہی ہے جیسی دوسرے اُمراء کی ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی مسلمان کو نزاع کا حق حاصل تھا؟ جس امیر کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے تک کی اجازت نہ تھی، اور جس کے مقابلہ میں محض اونچی آواز سے بولنے پر تمام عمر کے اعمال غارت ہو جانے کی دھمکی دی گئی تھی (الحجرات، آیت ۲) اور جس سے جھگڑا کرنے والے کو دوزخ میں جھونک دیئے جانے کا خوف دلایا گیا تھا (النساء۔ آیت ۱۱۵) کیا اس امیر سے منازعت کرنے کا حق کسی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کہاں اُس امیر کی امارت اور کہاں اُن اُمراء کی امارت جن سے منازعت کا حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

اطاعت کے تین مراتب

اُن تمام احکام کو جو اطاعتِ رسولؐ سے متعلق ہیں، اطاعتِ امیر کے احکام قرار دینا اور یہ کہنا کہ:

> • اللہ اور رسولؐ کے الفاظ قرآن میں اکثر جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں اُن سے مُراد امارت ہے جس کا قانون کتاب اللہ ہے اور جس کے نافذ کرنے والے رسول اللہؐ یا اُن کے جانشین ہیں۔ مثلاً يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ۔ مالِ غنیمت کا حکم عہدِ رسالت تک محدود نہ تھا بلکہ آئندہ کے لیے بھی ہے جس کی تعمیل خلافت کا فریضہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آخری اختیار اللہ و رسول یعنی امارت ہے۔ اس لیے رسول اللہ کا جو منصب بحیثیت امیر کے ہے وہی اُن کے خلفاء کا بھی ہوگا۔"

یہ بھی حد سے صریح تجاوز ہے۔ قرآن مجید میں اطاعتِ خدا، اطاعتِ رسولؐ اور اطاعتِ اولی الامر کے تین مراتب بیان کیے گئے ہیں۔ اطاعتِ خدا سے مُراد قرآن مجید کے احکام کی اطاعت ہے۔ اطاعتِ رسولؐ سے مُراد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کی پیروی ہے۔ اور اطاعتِ اولی الامر سے مُراد مسلمانوں کے اُمراء اور اربابِ حل و عقد کی اطاعت ہے۔ پہلے دونوں مراتب کے متعلق قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ خدا اور رسولؐ کے احکام میں کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کا کام سُننا اور اطاعت کرنا ہے۔ خدا اور رسولؐ کے فیصلے کے بعد کسی مسلمان کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرے۔ رہا تیسرا مرتبہ تو اس کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسولؐ کے احکام کے تابع ہے، اور نزاع کی صورت میں خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ ایسے صاف اور کھلے ہوئے احکام کے موجود ہوتے ہوئے اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا اور رسول سے مُراد امارت لی جائے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ امارت کو اُس امارت کے ساتھ ملا دیا جائے جو مسلمانوں کے عام اُمراء کو حاصل ہے۔ اس معاملہ میں قُلِ الْأَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ "اموالِ غنیمت خدا اور رسولؐ کے ہیں" کہنے کا مدّعا یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ نے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کیا ہے اُس کے مصالح میں غنائم صرف کیے جائیں۔ اِس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ اور رسول سے مُراد امارت ہے۔

مذہبی اور تمدّنی اُمور کی غلط تفریق

قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ حکم نکلتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محض مذہبی اعمال ہی دائماً قابلِ تقلید ہیں، رہے تمدّنی و اجتماعی اُمور میں آپؐ کے فیصلے اور آپ کے نافذ کردہ قوانین تو وہ صرف اُس عہد کے لیے مخصوص تھے جس میں وہ نافذ کیے گئے تھے۔ اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں موجود ہو جس سے اِن دونوں قسم کے اعمال میں فرق کیا جا سکتا ہے اور دونوں کے احکام مختلف قرار دیے جا سکتے ہیں تو اس کو پیش کیا جائے۔ مجھ کو تو قرآن میں صاف حکم یہ ملتا ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى   "کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ

اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ ۔ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا ۔ (احزاب : ۳۶)	اور اُس کا رسُولؐ کسی امر کا فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسُولؐ کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگا“

اس آیت میں زمانہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مومن مردوں اور عورتوں سے خاص عہدِ رسالت کے مومن مرد و عورت مُراد نہیں لیے جا سکتے۔ امر کا لفظ نہایت عام ہے جو ہر قسم کے معاملات پر حاوی ہے خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی۔ اللہ اور رسُولؐ سے مراد اللہ اور رسول ہی ہیں، امارت ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ امیر یا اولی الامر بھی بہرحال مومن ہی ہونگے اور یہاں تمام مومنین و مومنات سے یہ حق سلب کر لیا گیا ہے کہ خدا اور رسُولؐ نے جس معاملہ کا فیصلہ کر دیا ہو اس میں انہیں مجتمعاً یا منفرداً خود فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار باقی رہے۔ پھر فرمایا گیا کہ جو اس کے خلاف عمل کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگا۔ یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کی ہدایت سے اس کے رسُولؐ نے اپنے احکام اور اپنے قوانین سے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کر دیا ہے۔ اس کا قیام منحصر ہی اس پر ہے کہ جو احکام دیئے گئے ہیں اور جو قوانین مقرر کر دیئے گئے ہیں ان کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جائے۔ اگر خدا اور اس کے رسُولؐ کی قولی اور عملی رہنمائی سے قطع نظر کر کے لوگ خود اپنی رائے اور اپنے اختیار سے کچھ طریقے اختیار کریں گے تو یہ نظام باقی نہ رہے گا۔[۱۰۳]

فصل ۲

نبیؐ کی اطاعت اور آزادیٔ رائے کا اسلامی تصوّر

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"سورۂ احزاب میں حضرت زید بن حارثہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کے سلسلہ میں ایک اہم شبہ پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے فرمایا اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر) مگر حضرت زیدؓ نے اس حکم نبویؐ کی خلاف ورزی کی اور حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔ اس فعل کے خلاف حکم ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں اور قرآن کے انداز بیان میں صراحۃً یا کنایۃً ایسی کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زیدؓ کی اس حکم عدولی کو ادنیٰ درجہ میں بھی ناپسند کیا ہو، بلکہ بیانِ واقعہ کی ابتدا میں ان کا ذکر لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (جس پر اللہ نے انعام کیا) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ نبیؐ کے حکم کی خلاف ورزی بھی کی جا سکتی ہے اور نبی کا قول اگر ثابت بھی ہو جائے کہ وہ نبی ہی کا قول ہے تب بھی وہ اُس طرح واجب الاطاعت نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان واجب الاطاعت ہے۔"

سوال میں کوئی پیچیدگی نہیں، چند لفظوں میں شبہ کو رفع کیا جا سکتا تھا۔ لیکن دراصل شبہ جہاں سے پیدا ہوتا ہے، وہاں متعدد غلط فہمیوں کا منبع ہے، اور ان غلط فہمیوں کا سلسلہ دُور تک پہنچا ہوا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کو رفع کرنے کے ساتھ اس کی اصل اور اس کے فروع کی طرف بھی کچھ اشارات کر دیے جائیں۔

حاکم صرف اللہ ہے

"قرآن حکیم تمام آسمانی کتابوں سے زیادہ صراحت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ حاکم مطلق بجز اللہ کے اور کوئی نہیں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (خدا کے سوا حکم کسی کے لیے نہیں ہے)۔ صرف اُسی کو یہ حق ہے کہ جیسا چاہے حکم دے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (اللہ جو چاہے حکم دے)۔ وہی ایک ایسا حاکم ہے جس کے احکام میں کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ (اس کے کسی کام کے بارے میں سوال نہیں کیا جا سکتا)۔ اطاعت اسی کی فرض ہے اور اس لیے فرض ہے کہ انسان اپنی عین خلقت کے لحاظ سے اس کا بندہ ہے اور دراصل صرف اسی کی بندگی کے لیے

پیدا کیا گیا ہے، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (میں نے جن اور انسان کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں)۔ اس کے سوا انسان نہ کسی کا مخلوق ہے، نہ بندہ، نہ پروردہ۔ اسی لیے دراصل کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کی اطاعت فرض نہیں۔ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ (وہ پوچھتے ہیں کہ حکم میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہہ دو کہ حکم پورا کا پورا اللہ کے لیے ہے) کسی انسان کو نہ تو دوسرے انسان پر حاکمیت مطلقہ (Absolute Authority) حاصل ہے اور نہ کسی انسان پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے حکم کی اطاعت کرے محض اس بنا پر کہ اُس خاص شخص کا حکم ہے۔

انسانوں پر انسانوں کی حکمرانی

قرآن کے نزول کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلادہ نکال دے اور اللہ یعنی مطاع حقیقی (Real Sovereign) کا بندہ بنانے کے بعد اس کو رائے اور ضمیر کی پوری آزادی عطا کرے۔ چنانچہ انسانی غلامی کے خلاف سب سے بڑھ کر جس کتاب نے جہاد کیا ہے وہ قرآن ہی ہے۔ یہ کتاب کسی انسان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتی کہ بطور خود اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھا جائے اور اس کے حکم اور اس کی ممانعت کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ گویا وہ اپنے محکوموں کے لیے بمنزلہ خدا ہے۔ اس قسم کی اطاعت اور محکومی کو قرآن شرک کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے اور جو لوگ اپنے علماء و مشائخ کو، پیروں اور پیشواؤں کو، پیروں اور پادریوں کو اور دنیوی حاکموں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (other gods than God) بنا لیتے ہیں، انہیں مشرک ٹھہراتا ہے، کیونکہ انسان جب کبھی کسی انسان کی ایسی اطاعت کرے گا تو لامحالہ اس کی تہ میں الوہیت کا تصور اور عبودیت کا جذبہ ہی کارفرما ہوگا۔ ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں اپنے دل اور دماغ اور روح اور جسم کی آزادی سے کلیتہً دست بردار ہوتا ہی اُس وقت ہے جب وہ اس کو یا تو خطا سے بری اور عیوب و نقائص سے پاک اور جزو و کل کا عالم سمجھ لیتا ہے، یا یہ سمجھتا ہے کہ وہ ذاتی حق کی بنا پر امر و نہی کا مالک ہے اور اُسے حکومت کا طبعی حق حاصل ہے، یا یہ گمان کرتا ہے کہ وہی دراصل نفع اور نقصان پہنچانے والا اور رزق دینے اور رزق روکنے والا ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کو ان صفات کا حامل سمجھنا ہی شرک اور غلامی کی جڑ ہے اور توحید جس کا لازمی نتیجہ مخلوق کی غلامی سے انسان کی آزادی ہے، یہ ہے کہ خدا کے سوا تمام چیزوں کو ان صفات سے خالی سمجھا جائے اور ان کے حقِ حکمرانی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

نبیؐ کی اطاعت کس حیثیت سے ہے؟

یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد، اب اس امر کی تحقیق کیجیے کہ نبیؐ کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے، یہ کس حیثیت سے ہے۔ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں ہے کہ نبی وہ خاص شخص

مثلاً ابن عمران، یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے، اور یہ شخص خاص ہونے کی بنا پر اس کو حکم دینے اور منع کرنے کا، حلال کرنے اور حرام ٹھہرانے کا حق حاصل ہے۔ اگر ایسا ہو تو معاذ اللہ نبی خود بھی اربابٌ مِّن دُونِ اللہ میں سے ایک ہو جائے گا، اور اس طرح خود اسی کے ہاتھوں وہ مقصد فوت ہو کر رہے گا جس کے لیے وہ نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم بشر ہو۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (اے نبی ان سے کہو کہ پاک ہے میرا رب۔ کیا میں ان کے سوا بھی کچھ ہوں کہ ایک انسان ہوں جسے پیغمبر بنایا گیا ہے) وَقَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (اور ان سے ان کے پیغمبروں نے کہا کہ ہم تو تمہارے ہی جیسے انسان ہیں)۔ البتہ نبی ہونے کی حیثیت سے اس میں اور تم میں عظیم الشان فرق ہے۔ اس کو خدا کی طرف سے جب نبوت عطا کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ حکم بھی عطا ہوتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (یہ پیغمبر وہ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی)۔ حکم کے مفہوم میں قوت فیصلہ (Judgement) اور اقتدار حکومت (Authority) دونوں شامل ہیں۔ پس نبی کو جو اقتدار حاصل ہے وہ ذاتی اقتدار نہیں بلکہ تفویض کردہ اقتدار ہے۔ اس لیے اس کی اطاعت دراصل خدا کی اطاعت ہے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی)۔ وہ بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کے احکام نافذ کرے اور تم ان احکام کی اطاعت کرو، وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (ہم نے جو نبی بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے)۔ اس حیثیت میں اس کا حکم خدا کا حکم ہے اور کسی کو اس میں چون و چرا کرنے کا حق نہیں، وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد نبی سے جھگڑا کرے اور ایسا طریق اختیار کرے جو ایمان لانے والوں کے طریقے سے مختلف ہو تو جدھر وہ مڑے گا ہم بھی اسے اسی طرف موڑ دیں گے۔ اور اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بہت ہی بری جائے قرار ہے)۔

بے چون و چرا اطاعت

عمل تو در کنار اگر دل میں بھی اس کی نافرمانی کا خیال آ جائے تو قطعاً ایمان سلب ہو جاتا ہے، فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (خدا کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے آپس کے اختلافات میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں اور جو کچھ تو فیصلہ کرے اس پر اپنے دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں) اور اس نافرمانی کا نتیجہ ابدی خسران و نامرادی ہے: يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ (جن لوگوں نے کفر

کیا ہے اور رسولؐ کی نافرمانی کی ہے قیامت کے روز اُن پر ایسی مصیبت پڑے گی کہ وہ چاہیں گے کہ زمین اُن پر پاٹ دی جائے)۔

نبی لوگوں کو اپنا بندہ نہیں بناتا

جیسا کہ اُوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ اطاعت اور کامل پیروی جس پر دین و ایمان کا مدار رکھا گیا ہے اور جس کے متعلق صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ہدایت سراسر نبی کی اطاعت پر منحصر ہے، (وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا) اس کا مرجع نبی کی انسانی اور شخصی حیثیت نہیں ہے کسی نبی کو اللہ نے اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ لوگوں کو خدا کے بجائے اپنا غلام اور اپنا بندہ بنائے، بلکہ صرف اس لیے بھیجا ہے کہ وہ ان کو خدا کا تابع فرمان بنائے، مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ (کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت بخشے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ نہیں، بلکہ وہ کہے گا کہ تم خدا کے بندے بنو)۔ وہ اس لیے نہیں آیا کہ لوگوں کو اپنی ذاتی خواہشات کا پیرو بننے پر مجبور کرے، اپنی شخصی عظمت و برتری کا سکہ اُن پر جمائے اور اُن کو اپنے شخصی اقتدار کے شکنجہ میں کس کر اس قدر بے بس کر دے کہ وہ اس کی رائے کے مقابلہ میں خود کوئی رائے رکھنے کے حق سے بالکل دستبردار ہو جائیں اور اپنے دل و دماغ کو اس کے سامنے معطل کر دیں۔ یہ تو وہی غیر اللہ کی بندگی ہوئی جس کو مٹانے کے لیے نبی بھیجا جاتا ہے۔

انسان کی گردن میں جتنے طوق انسان نے ڈالے ہیں ان سب کو کاٹ دینا ہی نبی کی بعثت کا مقصد ہے، وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اور یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو توڑتا ہے جن میں وہ بندھے ہوئے تھے)۔ انسان نے انسان کے لیے فرائض اور حقوق مقرر کرنے اور جائز و ناجائز کی من مانی حدیں ٹھہرانے کے جن اختیارات پر قبضہ کر رکھا تھا ان کو سلب کرنے ہی کے لیے تو نبی مامور کیا جاتا ہے۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ (تم کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنی زبان سے جس چیز کو چاہو حلال کر دو اور جسے چاہو ممنوع ٹھہرا دو)۔ انسانی حکم اور فیصلے کے سامنے سر جھکانے کی جو ذلت انسان نے اختیار کر لی تھی اس سے نجات دلانے ہی کے لیے تو نبوت قائم کی جاتی ہے وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (ہم میں سے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اللہ کے بجائے اپنا خدا نہ بنائے)۔ پھر کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ نبی ان کی گردنوں سے دوسروں کا طوق اُتار کر اپنا طوق ڈال دے اور تحریم و تحلیل کے اختیارات دوسروں سے چھین کر خود اپنے قبضہ میں کر لے، اور استبداد کی مسند سے دوسروں کو ہٹا کر خود اس پر متمکن ہو جائے۔ اس نے تو یہود و نصاریٰ کو اسی پر ملامت کی تھی کہ اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے بجائے اپنا خدا بنا لیا)۔ پھر وہ کیسے کہتا کہ اب

تم خدا کو چھوڑ کر مجھ کو رب بنا لو اور میری خواہشات نفس کی پابندی کرو۔

نبیؐ بہ حیثیت نبیؐ کی اطاعت

اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے، جو اصل ایمان ہے، اور جس سے کسی مومن کو سرتابی کیا معنی ایک سرِ مُو انحراف کا بھی حق نہیں، وہ دراصل نبیؐ بحیثیت انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبیؐ بحیثیت نبی کی اطاعت ہے یعنی اُس علم، اُس ہدایت، اُس حکم اور اُس قانون کی اطاعت جسے اللہ کا نبیؐ اللہ کی طرف سے اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ پس درحقیقت اسلام جس اطاعت کی بندش میں انسان کو باندھتا ہے، وہ دراصل انسان کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ۔ (النساء: آیت ۱۰۵)	اے نبیؐ ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس حق کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تم کو دکھایا ہے۔
وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (المائدہ۔ ۴۵)	اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

اس آیت میں جس طرح دوسرے انسان بندھے ہوئے ہیں اسی طرح خود نبیؐ بحیثیت انسان بھی بندھا ہوا ہے۔

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (الانعام: ۵۰)	میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

نبی کی اطاعت خدا کے حکم کے تحت

یہ اور ایسی ہی بہت سی آیات اس امر پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ اطاعت دراصل صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کی ہے اور اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ غیر اللہ کی بندگی اور انسان پر انسان کی خداوندی کا قلع قمع کر دے۔ اسلام میں کسی انسان کی اطاعت بحیثیت انسان ہونے کے نہیں ہے۔ نبیؐ کی اطاعت ہے تو اس بنا پر ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کو حکم عطا کیا گیا ہے۔ حکام کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام کو نافذ کرنے والے ہیں۔ علماء کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ خدا اور رسولؐ کے امر و نہی اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود سے آگاہ کرنے والے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شخص خدا کا حکم پیش کرے تو مسلمان پر واجب ہے کہ اس کے آگے سر جھکا دے۔ وہ اس میں ہرگز چون وچرا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کو خدا کے مقابلے میں حریت فکر اور آزادی رائے حاصل نہیں لیکن اگر کوئی انسان خدا کا نہیں، خود اپنا کوئی خیال پیش کرے، تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کو آزادانہ اتفاق کرنے کا بھی اختیار ہے۔ اور آزادانہ

اختلاف کرنے کا بھی۔ اس معاملہ میں علماء اور حکام تو درکنار، خود نبی کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

حضورؐ کے مشن کے دو حصے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا ایک حصہ یہ تھا کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ انسان کی گردن میں ڈال دیں۔ اور دوسرا حصہ یہ تھا کہ انسان کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ اس کی گردن سے اتار پھینکیں۔ یہ دونوں کام آپؐ کے مقصدِ بعثت میں شامل تھے، اور دونوں کی اہمیت یکساں تھی۔ پہلے کام کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپؐ تمام مسلمانوں کو اپنی کامل اور غیر مشروط اطاعت پر مجبور کریں کیونکہ آپؐ کی اطاعت ہی پر خدا کی اطاعت موقوف تھی۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے کام کی تکمیل کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری تھا کہ سب سے پہلے آپؐ خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین کر دیں کہ کسی انسان کی، حتیٰ کہ خود محمد بن عبد اللہ کی بحیثیت انسان کی اطاعت بھی ان پر واجب نہیں ہے اور ان کی روحیں انسان کی بندگی سے قطعی آزاد ہیں۔ یہ دراصل ایک نہایت نازک کام تھا۔ ایک ہی ذات میں حیثیتِ نبوت اور حیثیتِ بشریت دونوں جمع تھیں۔ اور ان کو کسی واضح خطِ امتیاز کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر اللہ کے رسولِ پاکؐ نے اللہ کی بخشی ہوئی حکمت سے اس کام کو بہترین طریق پر انجام دیا۔ آپؐ نے ایک طرف نبی ہونے کی حیثیت سے اپنی ایسی اطاعت کرائی کہ تاریخِ عالم میں کبھی کسی امیر کی ایسی اطاعت نہیں کی گئی۔ اور دوسری طرف انسان ہونے کی حیثیت سے آپؐ نے اپنے جاں نثار متبعین کو ایسی آزادیٔ رائے عطا کی کہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے جمہوریت پسند سردار نے بھی اپنے ماتحتوں کو ایسی آزادی نہیں بخشی۔ اگر کوئی شخص اس امر پر غور کرے کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپؐ کو اپنے پیروؤں پر کتنا بڑا اقتدار حاصل تھا اور مسلمان کتنی گہری عقیدت آپؐ کے ساتھ رکھتے تھے، اور پھر یہ دیکھے کہ اتنا زبردست اقتدار رکھنے کے باوجود آپؐ کس طرح معاشرت اور معاملات میں ہمیشہ اور ہر وقت اپنی پیغمبرانہ حیثیت اور انسانی حیثیت کو الگ الگ رکھتے تھے، اور پیغمبرانہ حیثیت میں اپنی بے چون و چرا اطاعت کرانے کے ساتھ انسانی حیثیت میں لوگوں کو کتنی مکمل آزادیٔ رائے عطا فرماتے اور خود اپنی ذاتی آراء سے اختلاف کرنے میں کس طرح اُن کی ہمت افزائی کرتے تھے، تو اسے ماننا پڑے گا کہ یہ کمال درجہ کا ضبطِ نفس، یہ حیرت انگیز قوتِ امتیاز، اور ایسی مکمل بصیرت صرف ایک نبی ہی کو میسر آ سکتی ہے۔ اس مقام پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی کی شخصی حیثیت الگ ہونے کے باوجود اس کی پیغمبرانہ حیثیت میں گم ہو جاتی ہے۔ نبی اپنی شخصی حیثیت میں بھی پیغمبری کے فرائض انجام دیتا ہے۔ وہ جب اپنی شخصی حیثیت میں کام کرتا ہے تو اس وقت وہ اپنے پیروؤں میں آزادیٔ فکر کی روح پھونکتا ہے، انہیں سکھاتا ہے کہ انسان کے مقابلہ میں ان کو کس طرح آزادیٔ رائے

سے استعمال کرنی چاہیے، اور انہیں بتانا ہے کہ آزادی رائے کا حق ان کو ہر انسان کے مقابلہ میں حاصل ہے حتیٰ کہ اس انسانِ کامل، اس عظیم انسان شخصیت کے مقابلہ میں بھی وہ رائے کی پوری آزادی رکھتے ہیں جس کو وہ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے بلند ترین اقتدار کا درجہ دینے پر مجبور ہیں۔ نبی کے سوا کسی دوسرے کو لوگوں پر ایسا مکمل اقتدار نصیب ہو تو وہ ضرور ان کو اپنا بندہ بنا لے اور ان پر اپنے وہی حقوق جمائے جو دنیا میں پوپوں اور پیروں اور پنڈتوں اور بادشاہوں نے جما کر دکھا دیئے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ:

إنما أنا بشر إذا أمرتكم بشيء من دينكم فخذوا به وإذا أمرتكم بشيء من رأيي فإنما أنا بشر۔

میں بھی ایک انسان ہی ہوں جب میں تم کو تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے مانو، اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو بس میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔

آزادیٔ رائے کو نشوونما دینے کی چند مثالیں

ایک دفعہ حضورؐ نے مدینے کے باغبانوں کو کھجوروں کی کاشت کے متعلق ایک مشورہ دیا۔ لوگوں نے اس پر عمل کیا مگر وہ مفید ثابت نہ ہوا۔ آپؐ سے اس بارے میں عرض کیا گیا تو جواب میں آپؐ نے فرمایا:

إني إنما ظننت ظنا فلا تؤاخذوني بالظن ولكن إذا حدثتكم عن الله شيئا فخذوا به فإني لم أكذب على الله۔

میں نے تو اندازے سے ایک بات کہی تھی، تم میری باتوں کو نہ لو جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں۔ ہاں جب میں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اس کو لے لو کیونکہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا۔

جنگِ بدر کے موقع پر حضورؐ ابتداءً جہاں خیمہ زن ہوئے تھے وہ جگہ مناسب نہ تھی۔ حضرت حُبابؓ بن منذر نے آپؐ سے دریافت کیا کہ اس مقام کا انتخاب وحی کے ذریعہ کیا گیا ہے یا محض ایک تدبیرِ جنگ کے طور پر ہے؟ فرمایا وحی نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اگر ایسا ہے تو میری رائے یہ ہے کہ آگے بڑھ کر فلاں مقام پر خیمہ زن ہونا چاہیے۔ حضورؐ نے ان کی رائے کو قبول فرمایا اور اسی پر عمل کیا۔

اسیرانِ جنگِ بدر کے مسئلہ میں حضورؐ نے صحابہ کی جماعت سے مشورہ لیا اور خود بھی ایک عام رکنِ جماعت کی حیثیت سے رائے دی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے آپؐ کی اور صدیقِ اکبرؓ کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا جس کا واقعہ تمام تاریخوں میں مشہور ہے۔ اسی مجلس میں حضورؐ نے خود اپنے داماد ابوالعاص کا مسئلہ بھی پیش کیا اور صحابہؓ سے فرمایا اگر تمہاری مرضی ہو تو ان سے فدیہ میں جو ہار لیا گیا ہے وہ انہیں واپس کر دیا جائے۔ جب صحابہؓ نے بخوشی اس کی اجازت دی، تب آپؐ نے ہار انہیں واپس کیا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر حضورؐ نے بنی غطفان سے صلح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ انصار کے سرداروں نے عرض کیا کہ اگر یہ ارادہ وحی کی بنا پر ہے تو مجالِ کلام نہیں، اور اگر حضورؐ اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس تجویز سے اختلاف ہے۔ حضورؐ نے انہی کی رائے قبول فرمائی اور اپنے ہاتھ سے صلح نامہ کا مسودہ چاک کر ڈالا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام مسلمانوں کو بظاہر دب کر صلح کرنا پسند نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے علانیہ اس سے اختلاف کیا مگر جب حضورؐ نے فرمایا کہ یہ کام میں خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے کر رہا ہوں تو باوجودیکہ غیرتِ اسلامی کی بنا پر سب قلق تھے، کسی نے دم مارنے کی جرأت نہ کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مرتے دم تک اس غلطی کے کفارے طرح طرح سے ادا کرتے رہے کہ وہ ایک ایسے امر میں حضورؐ سے اختلاف کر بیٹھے جو بحیثیتِ رسولؐ کیا جا رہا تھا۔

جنگِ حنین کے موقع پر تقسیمِ غنائم میں آپؐ نے مؤلفۃ القلوب کے ساتھ جو فیاضی ظاہر فرمائی تھی اس پر انصار چیں بجبیں ہوئے۔ حضورؐ نے ان کو بلایا۔ اپنے فعل کی تائید میں یہ نہیں فرمایا کہ میں خدا کا نبی ہوں جو چاہوں کروں، بلکہ ایک تقریر کی جس طرح ایک جمہوری حکومت کا سردار اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کے سامنے کرتا ہے۔ ان کے ایمان بالرسالت سے اپیل نہیں کی بلکہ ان کی عقل اور ان کے جذبات سے اپیل کی اور انہیں مطمئن کر کے واپس فرمایا۔

یہ تو خیر اُن لوگوں کے ساتھ معاملہ تھا جو سوسائٹی میں بڑی اُونچی پوزیشن رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں اور لونڈیوں تک میں استقلالِ رائے کی رُوح پھونک دی تھی۔ بریرہ ایک لونڈی تھی جو اپنے شوہر سے متنفر ہو گئی تھی مگر شوہر اس کا عاشقِ زار تھا۔ وہ اس کے پیچھے روتا پھرتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ تو اپنے شوہر سے رجوع کر لیتی تو اچھا تھا۔ اس نے پوچھا "یا رسول اللہ کیا آپ حکم دیتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا "حکم نہیں بلکہ سفارش کرتا ہوں۔" اس نے کہا "اگر یہ سفارش ہے تو میں اُس کے پاس جانا نہیں چاہتی۔"

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب قرینہ سے یا خود حضورؐ کی تصریح سے لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپؐ کوئی بات اپنی رائے سے فرما رہے ہیں تو وہ آزادی کے ساتھ اس میں اظہارِ رائے کرتے تھے اور آپؐ خود اس آزادانہ اظہارِ رائے میں اُن کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔ ایسے موقع پر اختلاف کرنا نہ صرف جائز تھا بلکہ آپؐ کے نزدیک پسندیدہ تھا، اور آپؐ خود بسا اوقات اپنی رائے سے رجوع فرما لیتے تھے۔

حضرت زیدؓ کے واقعہ کی حقیقت

اب حضرت زیدؓ کے واقعہ کی طرف رجوع کیجیے۔ حضورؐ کے ساتھ ان کے تعلقات کئی طرح کے تھے۔ ایک تعلق یہ تھا کہ آپؐ اُن کے پیشوا تھے اور وہ آپؐ کے پیرو تھے۔ دوسرا تعلق یہ تھا کہ آپؐ ان کے برادرِ نسبتی تھے اور وہ آپؐ کے بہنوئی تھے[1]۔ تیسرا تعلق یہ تھا کہ آپؐ ان کے مُربّی تھے اور وہ آپؐ کے پروردہ تھے۔ بچپن سے اُن کو

---

[1] کیونکہ حضرت زینبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور وہ حضرت زیدؓ کے نکاح میں تھیں۔ (مؤلف)

نباہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ آپؐ نے ان کو یہی مشورہ دیا جو ہر برادرِ نسبتی اپنے بہنوئی کو اور ہر سرپرست اپنے پروردہ کو دے گا یعنی یہ کہ خدا کا خوف کرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ مگر جس اختلافِ مزاج کی بنا پر زوجین میں باہم نفرت پیدا ہو گئی تھی اس کو حضرت زیدؓ خود زیادہ محسوس کر سکتے تھے۔ یہ معاملہ ان کے دین و ایمان کا نہیں بلکہ ان کے حیاتِ نفس کا تھا۔ اس لیے انہوں نے حضورؐ کے مشورے کو قبول نہ کیا اور طلاق دے دی۔ یہ خلاف ورزی رسولؐ کے مقابلہ میں نہ تھی، نہ حضورؐ نے جو مشورہ دیا تھا وہ رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا، اس لیے نہ آپؐ ناراض ہوئے نہ خدا ناراض ہوا۔ اگر حضورؐ کی جگہ کوئی اور ایسا شخص ہوتا جس نے کسی کو بچپن سے پالا ہو اور اس پر احسانات کیے ہوں اور آخر میں غلامی سے واعذار ہونے کے باوجود اپنی بہن کی شادی اس سے کی ہو اور پھر اس نے باوجود منع کرنے کے اس کی بہن کو طلاق دے دی ہوتی تو وہ ضرور ناراض ہوتا مگر حضورؐ صرف مربی اور برادرِ نسبتی ہی نہ تھے، بلکہ رسولِ خدا بھی تھے، اور رسول ہونے کی حیثیت سے یہ بھی آپ کا فرض تھا کہ انسان کو انسان کی بندگی سے آزاد کریں اور انسان کو انسان کے مقابلہ میں آزادی کا کھویا ہوا حق واپس دلائیں اس لیے آپؐ نے حکم نہیں بلکہ مشورہ دیا اور اس مشورہ کے خلاف عمل کرنے پر قطعاً کسی ناراضی کا اظہار نہ فرمایا۔ اسی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپؐ کی ذات میں حیثیتِ نبوی اور حیثیتِ بشری الگ الگ بھی تھیں اور باہم پیوستہ بھی تھیں۔ آپؐ نے ان دونوں کے استعمال میں ایسا حیرت انگیز توازن قائم کیا تھا کہ ایک نبی ہی ایسے توازن پر قادر ہو سکتا ہے حیثیتِ بشری میں بھی آپ اس طرح عمل فرماتے تھے کہ نبوت کے فرائض اس کے ضمن میں ادا ہوتے رہتے تھے۔

حضورؐ کی تعلیم کردہ حریتِ فکر

سرکارِ رسالت مآب ﷺ نے جس حریتِ فکر کی تخم ریزی کی تھی، اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسان کے مقابلہ میں آزادیِ رائے استعمال کرنے کا جو سبق اپنے متبعین کو خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے سکھایا تھا، اسی کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرامؓ تمام انسانوں سے زیادہ احکامِ الٰہی کے اطاعت کیش اور تمام انسانوں سے زیادہ آزاد خیال و جمہوریت پسند تھے۔ وہ بڑے سے بڑے شخص کے مقابلہ میں بھی اپنی رائے کی آزادی کو قربان نہ کرتے تھے۔ ان کی ذہنیت سے یہ بات بالکل بعید تھی کہ کسی رائے کو محض اس بنا پر تنقید سے بالاتر سمجھیں کہ وہ فلاں بڑے آدمی کی رائے ہے۔ ان میں سے جو بڑے آدمی تھے جن کی بڑائی کو وہ خود تسلیم کرتے تھے اور جن کی بڑائی آج ایک دنیا تسلیم کر رہی ہے، ان کی رائے کو بھی انہوں نے محض ان کی بڑائی کی بنا پر قبول نہ کیا بلکہ آزادی کے ساتھ رد بھی کیا اور قبول بھی کیا۔ خلفائے راشدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ اس آزادیِ رائے کے حامی تھے۔ انہوں نے اپنے آقا کی پیروی میں لوگوں کی آزادی کو نہ صرف گوارا کیا بلکہ اس کی ہمت افزائی کی اور کبھی کسی

چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی یہ مطالبہ نہ کیا کہ ہم بڑے آدمی ہیں اس لیے ہماری بات بے چون وچرا تسلیم کرو۔

حریتِ فکر خلافتِ راشدہ کے بعد

خلفائے راشدین کے بعد بنی اُمیّہ اور بنی عباس نے حریتِ فکر کو خوف اور طمع، دولت، ظلم و ستم اور زر پاشی کی طاقتوں سے ہر طرح کچلنے کی کوشش کی، مگر تابعین اور تبع تابعین میں اور ان کے بعد بھی ایک مدت تک مسلمانوں میں یہ روح باقی رہی۔ ابتدائی دو تین صدیوں تک آپ کو تاریخ اسلام میں اس کے نہایت روشن نشانات نظر آئیں گے۔ اُمراء اور حکام کے مقابلہ میں آزادی تو نسبتاً ایک چھوٹی چیز ہے۔ روح اور دماغ کی آزادی کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ انسان جس کو مقدس سمجھے جس کی عزت و عظمت اس کے پہنائے قلب میں جاگزیں ہو، اس کی بھی اندھی تقلید سے انکار کر دے، اور اس کے مقابلہ میں آزادی کے ساتھ سوچے اور آزادی کے ساتھ رائے قائم کرے۔ یہی سپرٹ ہم کو اس دور کے اہل علم میں نظر آتی ہے۔

ائمہ فقہاء کی حریتِ فکر

صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر مقدس ہستیاں اور کون ہوں گی؟ اور حضرات تابعین سے بڑھ کر کس کے دل میں ان کا احترام ہوگا؟ مگر یہ لوگ آزادی کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی آراء پر تنقید کرتے تھے، ان کے اختلافات میں محاکمہ کرتے تھے، اور ایک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے قبول کرتے تھے۔ اختلافِ صحابہؓ کے معاملہ میں امام مالکؒ کس صفائی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خطاء وصواب فانظروا فی ذالك ... "صحابہؓ کی آراء میں خطا بھی ہے اور صواب بھی، تم خود غور کر کے رائے قائم کرو۔" اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد ہے: احد القولین خطاء والمأثم فیه موضوع۔ "دو مختلف اقوال میں سے ایک بہرحال غلط ہوگا۔"

خود ان بزرگوں میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم خطا سے بری ہیں، اور تم اپنی فکر و نظر کو بالکل معطل کر کے صرف ہماری رائے کی پیروی کرو۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ جب کسی مسئلہ میں اپنی رائے سے کچھ فرماتے تو ساتھ ہی یہ بھی فرما دیتے کہ ھذا رأیی فان یکن صوابا فمن اللہ وان یکن خطاء فمنی واستغفر اللہ "یہ میری رائے ہے، اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اگر غلط ہے تو میری خطا ہے اور میں خدا سے مغفرت چاہتا ہوں۔"

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں لا تجعلوا خطاء الرای سنة للامة "رائے کی غلطی کو امت کے لیے سنت نہ بناؤ۔"

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے الا لا یقلدن احدکم دینه رجلا ان امن امن وان کفر کفر فانه لا اسوة فی الشر۔ "خبردار کوئی شخص اپنے دین کے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کی اندھی تقلید نہ کرے کہ وہ مومن ہوا تو یہ بھی مومن ہوا اور وہ کافر ہوا تو یہ بھی کافر ہو گیا۔ برائی اور غلطی میں کسی کی پیروی نہیں ہے۔"

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

انما انا بشر اخطئ واصیب فانظروا فی رائی فکلما وافق الکتاب والسنۃ فخذوہ وکلما لم یوافق الکتاب والسنۃ فاترکوہ۔

"میں ایک انسان ہوں۔ میری رائے غلط بھی ہوتی ہے اور درست بھی۔ تم میری رائے پر غور کرو۔ جو کچھ کتاب و سنت کے موافق پاؤ اُسے قبول کرو اور جو بات خلاف دیکھو اسے چھوڑ دو۔"

امام مالکؒ کا یہ واقعہ تاریخوں میں موجود ہے کہ خلیفہ منصور عباسی ان کی کتاب المؤطا کو تمام عالم اسلامی کا دستور اصل بنانا چاہتا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ تمام مذاہب فقہیہ کو موقوف کر کے صرف مذہب مالکیؒ کو رائج کر دے۔ مگر امام صاحبؒ نے خود اس کو ایسا کرنے سے روک دیا کیونکہ وہ دوسروں سے تحقیق و آزادیٔ رائے اور اجتہاد کا حق سلب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:

لا یحل لاحد ان یقول مقالتنا حتی یعلم من این قلنا۔

کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول کا قائل ہو تا وقتیکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے قول کا ماخذ کیا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

مثل الذی یطلب العلم بلا حجۃ کمثل حاطب لیل یحمل حزمۃ حطب وفیہ افعی تلدغہ وھو لا یدری۔

"جو شخص دلیل کے بغیر علم حاصل کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو رات کو لکڑیاں چُن رہا ہو۔ وہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھاتا ہے اور اس کو خبر نہیں کہ اس گٹھے میں کہیں سانپ بھی چھپا ہوا ہے جو اُسے ڈس لے گا۔"

اسلامی حُریّتِ فکر و نظر کی تباہی کا دور

تقریباً تین صدیوں تک تحقیق و اجتہاد و حُریّتِ فکر و نظر اور آزادانہ طلبِ حق کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں پوری شان کے ساتھ باقی رہی جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبعین میں پیدا کر گئے تھے۔ اس کے بعد اُمراء و حکام اور علماء و مشائخ کے استبداد نے اس رُوح کو کچلنا شروع کر دیا۔ سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے کا حق اور بولنے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کر لیا گیا۔ درباروں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی، دل اور دماغ، رُوح اور جسم کی غلامی اُن پر پُوری طرح مُسلط ہو گئی۔ درباروالوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کرا کے غلامانہ ذہنیت پیدا کی۔

مدرسے والوں نے خدا پرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر دماغوں میں اتارا۔ خانقاہ والوں نے بیعت کے مسنون طریقے
کو مسخ کر کے مقدس غلامی کا وہ طوق مسلمانوں کی گردنوں میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور بھاری طوق انسان نے
انسان کے لیے کبھی ایجاد نہ کیا ہوگا جب غیر اللہ کے سامنے زمین تک سر جھکنے لگیں جب غیر اللہ کے آگے نماز کی طرح
ہاتھ باندھے جانے لگیں، جب انسان کے سامنے نظر اٹھا کر دیکھنا سوء ادبی ہو جائے، جب انسان کے ہاتھ اور
پاؤں چومے جانے لگیں، جب انسان، انسان کا خداوند اور ان داتا بن جائے جب انسان بذات خود امر و نہی کا
مختار اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی سند سے بے نیاز قرار دیا جائے جب انسان خطا سے پاک اور نقص
سے بری اور عیب سے منزہ سمجھ لیا جائے جب انسان کا حکم اور اس کی رائے اعتقاداً نہ سہی عملاً اسی طرح
واجب الاطاعت قرار دے لی جائے جس طرح خدا کا حکم واجب الاطاعت ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس دعوت
سے منہ موڑ لیے گئے جو أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ
کے الفاظ میں دی گئی تھی۔ اس کے بعد کوئی علمی، اخلاقی، روحانی ترقی ممکن ہی نہیں پستی اور زوال اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ [لہ]

فصل ۳

رسالت اور اُس کے احکام

اطاعتِ رسول کے مسئلہ میں یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ کوئی رسول اپنی ذاتی حیثیت میں مُطاع اور متبوع نہیں ہو سکتا۔ نہ موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت اور پیروی اس بنا پر ہے کہ وہ موسیٰ بن عمران ہیں، نہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اس وجہ سے لائقِ اطاعت و اتباع ہیں کہ وہ عیسیٰ بن مریم ہیں، اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اس حیثیت سے لازم ہے کہ آپؐ محمد بن عبد اللہ ہیں۔ اطاعت اور پیروی جو کچھ بھی ہے صرف اس حیثیت سے ہے کہ یہ حضرات اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ نے ان کو وہ علمِ حق عطا کیا جو عام انسانوں کو عطا نہیں کیا اور ان کو وہ ہدایت بخشی جو عام انسانوں کو نہیں بخشی، اور ان کو دنیا میں اپنی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کے وہ صحیح طریقے بتائے جن کو عام لوگ اپنی ذاتی عقل یا انبیاءؑ کے سوا دوسرے لوگوں کی رہنمائی سے معلوم نہیں کر سکتے۔ اب اختلاف جس امر میں واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول کی اطاعت اور پیروی کس امر میں ہے اور کس حد تک ہے۔

ایک گروہ کا نقطۂ نظر

ایک گروہ کہتا ہے کہ اطاعت اور پیروی صرف اُس کتاب کی ہے جو اللہ کی طرف سے اس کا رسول لے کر آتا ہے۔ تبلیغِ کتاب کے بعد رسول کی حیثیتِ رسالت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ بھی ویسا ہی ایک انسان ہے جیسے اور دوسرے انسان۔ اگر دوسرے انسان امیر اور سردارِ قوم ہوں تو محض نظم و ضبط (Discipline) کے لیے ان کی اطاعت لازم ہوگی، مگر مذہبی فریضہ نہ ہوگی۔ دوسرے اگر عالم، حکیم اور متقین ہوں تو ان کے اوصاف (Merits) کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی پیروی کی جائے گی، اور یہ پیروی اختیاری ہوگی، واجب نہ ہوگی۔ یہی معاملہ رسولِ خدا کا بھی ہے۔ تبلیغِ کتاب کے سوا دوسرے تمام معاملات میں رسول کی حیثیت محض شخصی ہے۔ بحیثیت ایک شخص کے اگر وہ امیر ہے تو اس کی اطاعت بالمشافہہ ہے نہ کہ دائمی۔ اگر وہ قاضی ہے تو اس کے فیصلے وہیں تک نافذ ہوں گے جہاں تک اس کے حدودِ قضا (Jurisdiction) ہیں۔ ان سے باہر زیادہ سے زیادہ ایک فاضل جج کی حیثیت سے اس کے فیصلے بطور ایک نظیر کے لیے جائیں گے نہ کہ

ایک شارع اور واضع قانون کی حیثیت سے ہے۔ اگر وہ حکیم ہے تو اس کی زبان سے جو حکمت اور اخلاق کی باتیں نکلیں گی وہ اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے قبول کی جائیں گی جس طرح دوسرے علماء و عقلاء کی ایسی ہی باتیں قبول کی جاتی ہیں محض اس بنا پر کہ وہ حامل منصب رسالت کی زبان سے نکلی ہیں وہ داخل دین نہیں سمجھی جائیں گی۔ اسی طرح اگر وہ ایک نیک سیرت انسان ہے اور اس کی زندگی اپنے اطوار، آداب اور معاملات کے اعتبار سے ایک بہترین زندگی ہے تو ہم بالاختیار اس کو نمونہ (Model) بنائیں گے جس طرح ایک غیر نبی کی اچھی زندگی نمونہ قرار دینے میں ہم مختار ہیں۔ لیکن اس کا کوئی عمل اور قول ہمارے لیے اخلاق، معاشرت، معیشت اور معاملات میں ایسا قانون نہ ہوگا جس کی پیروی ہم پر واجب ہو۔

دوسرے گروہ کا نقطۂ نظر

ایک دوسرا گروہ اس خیال میں تھوڑی سی ترمیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے رسول کے ذمہ صرف کتاب پہنچا دینا ہی نہ تھا بلکہ کتاب کے احکام پر عمل کر کے دکھا دینا بھی تھا کہ امت اسی نمونہ پر عامل ہو۔ لہٰذا عبادات وغیرہ کے متعلق احکام کتاب کی جو تفصیلی عملی صورت رسول نے بتائی ہے، اس کی پیروی بھی کتاب ہی کی پیروی ہے، اور دینی فرض ہے۔ باقی رہے وہ معاملات جو احکام کتاب کے علاوہ رسول اپنی شخصی حیثیت میں ایک لیڈر، ایک قاضی، ایک منتظم، ایک حکمراں، ایک مدبر، اور ایک فرد جماعت کی حیثیت سے انجام دے، تو ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ایک دائمی اور عالمگیر ضابطہ و قانون بنانے والی ہو، اور جس کی پیروی ہمیشہ کے لیے ایک دینی فرض ہو۔

تیسرے گروہ کا نقطۂ نظر

ایک تیسرا گروہ ہے جو رسول کی حیثیت رسالت کو اس کی زندگی کے ایک بہت بڑے حصے پر حاوی سمجھتا ہے۔ اخلاق، معاشرت، معاملات، احکام و قضایا، اور بہت سے دوسرے معاملات میں اس کے قول اور فعل کا خدا کی جانب سے ہونا تسلیم کرتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ یہ سب چیزیں امت کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔ مگر وہ حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی میں فرق ضرور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ رسول کی زندگی کے بعض معاملات ایسے ضرور ہیں جو حیثیت رسالت سے خارج ہیں اور قابل تقلید نمونہ نہیں۔ اگرچہ وہ کوئی ایسا واضح خط نہیں کھینچ سکتا جو حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی میں تمیز قائم کر دیتا ہو، اور ایسی حد مقرر کرتا ہو جہاں پہنچ کر رسول کی حیثیت محض ایک انسان کی رہ جاتی ہے۔

چوتھے گروہ کا نقطۂ نظر

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ رسول کی شخصی حیثیت اور رسالت کی حیثیت اگرچہ اقتضاءً دو جداگانہ حیثیتیں ہیں مگر وجود میں یہ دونوں ایک ہی ہیں اور ان کے درمیان عملاً کوئی فرق کرنا ممکن نہیں ہے۔ منصب رسالت دنیاوی عہدوں کی طرح نہیں ہے کہ عہدہ دار جب تک اپنے عہدہ کی کرسی پر بیٹھا ہے، عہدہ دار ہے، اور جب اس سے اتر آیا تو

ایک عام انسان ہے۔ بلکہ رسول جس وقت منصب رسالت پر سرفراز ہوتا ہے، اُس وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن مامور (On Duty) ہوتا ہے اور وہ کوئی ایسا فعل نہیں کر سکتا جو اُس سلطنت کی پالیسی کے خلاف ہو جس کا وہ نمائندہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کی زندگی کے معاملات، عام اس سے کہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے، سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوں یا ایک شوہر، باپ، بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے، سب پر اُس کی حیثیت رسالت اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ اس کی ذمہ داریاں کسی حال میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے منفک نہیں ہوتیں، حتیٰ کہ جب وہ اپنی خلوت میں اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے، اُس وقت بھی وہ اُسی طرح اللہ کا رسول ہوتا ہے جس طرح وہ مسجد میں نماز پڑھاتے ہوئے ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کچھ کرتا ہے اللہ کی ہدایت کے تحت کرتا ہے۔ اس پر ہر آن اللہ کی طرف سے سخت نگرانی ہوتی ہے جس کے تحت وہ اُن ہی حدود کے اندر رہ کر چلنے پر مجبور ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں، اور اپنے اقوال میں، اعمال میں، اور زندگی کے پورے رویے میں دنیا کے سامنے اس امر کا مظاہرہ کرتا ہے کہ یہ ہیں وہ اصول جن پر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام قائم ہونا چاہیے، اور یہ ہیں وہ حدود جن کے دائرے میں انسان کی آزادیٔ عمل کو محدود ہونا چاہیے۔ اس خدمت کو نبی اپنی شخصی و خانگی زندگی میں اسی طرح انجام دیتا رہتا ہے جس طرح اپنی سرکاری حیثیت میں، اور کسی معاملہ میں بھی اگر اس کے قدم کو ذرا سی لغزش ہو جاتی ہے تو اس کو فوراً تنبیہ کی جاتی ہے، کیونکہ اس کی خطا صرف اُسی کی خطا نہیں بلکہ ایک پوری اُمت کی خطا ہے۔ اس کو بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر کے ان کے سامنے ایک "مسلم" کی زندگی کا نمونہ پیش کر دے اور صرف یہی نہیں کہ انفرادی معاملات میں ان کی رہنمائی کر کے ان کو فرداً فرداً مسلمان بنائے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلام کا تمدنی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام قائم کر کے صحیح معنوں میں ایک مسلم سوسائٹی بھی وجود میں لے آئے۔ لہٰذا اس کا خطا اور غلطی سے محفوظ ہونا لازم ہے تاکہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کی جا سکے اور اس کے قول و فعل کو بالکلیہ اسلام کی تعلیم اور اسلامیت کا معیار قرار دیا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ نبی کے اقوال و افعال میں تقلید و تاسی کے لحاظ سے فرق مراتب ضرور ہے۔ بعض وجوب اور فرضیت کے درجہ میں ہیں، بعض استحباب کے درجہ میں، اور بعض ایسے ہیں جن کی حیثیت درجۂ استکمال کی ہے۔ لیکن فی الجملہ نبی کی پوری زندگی ایک ایسا نمونہ (Model) ہے جس کو اسی لیے پیش کیا گیا ہے کہ ہر آدمی اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے۔ جو شخص اس نمونہ کی مطابقت میں جتنا بڑھا ہوا ہوگا وہ اُتنا ہی کامل انسان اور مسلمان ہوگا۔ اور جو اس کی مطابقت کے کم از کم ناگزیر مرتبہ سے بھی گھٹ جائے گا وہ اپنی کوتاہی کے لحاظ سے فاسق و فاجر، گمراہ اور مغضوب ہوگا۔

میرے نزدیک یہی آخری گروہ حق پر ہے، اور میں قرآن اور عقل کی روشنی میں جتنا زیادہ غور کرتا ہوں اس

مسلک کی حقانیت پر میرا یقین بڑھتا جاتا ہے۔

بچپن سے انبیاء کی تربیت کا خصوصی اہتمام

انبیاء علیہم السلام کے جو حالات قرآن مجید میں بیان ہوتے ہیں ان کو دیکھنے سے مجھ کو نبوت کی حقیقت یہ نہیں معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے یکایک راہ چلتے کسی کو پکڑ کر اپنی کتاب پہنچانے کے لیے مامور کر دیتا ہو، یا کسی شخص کو اس طور پر اپنی پیغام بری کے لیے مقرر کرتا ہو کہ وہ ایک جز وقتی مزدور (Part Time Worker) ہے جو مقررا وقات میں ایک مقررہ کام کر دیتا ہے اور اس کام کو ختم کرنے کے بعد آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ برعکس اس کے میں دیکھتا ہوں کہ اللہ نے جب کسی قوم میں نبی بھیجنا چاہا ہے تو خاص طور پر ایک شخص کو اسی کے لیے پیدا کیا ہے کہ وہ نبوت کی خدمت انجام دے۔ اس کے اندر انسانیت کی وہ بلند ترین صفات اور وہ اعلیٰ درجہ کی ذہنی و روحانی قوتیں ودیعت کی ہیں جو اس اہم ترین منصب کو سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں، پیدائش کے وقت سے خاص اپنی نگرانی میں اس کی پرورش اور تربیت کرائی ہے۔ نبوت عطا کرنے سے پہلے اس کو اخلاقی عیوب سے، گمراہیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھا ہے۔ خطرات اور ٹھوکروں سے اس کو بچایا ہے۔ اور ایسے حالات میں اس کی پرورش کی ہے جن میں اس کی استعداد نبوت قوت سے ترقی کر کے فعلیت کی طرف بڑھتی رہی ہے پھر جب وہ اپنے کمال کو پہنچ گیا ہے تو اس کو خاص اپنے پاس سے علم اور قوت فیصلہ (Judgement) اور رُشد و ہدایت عطا کر کے منصب نبوت پر مامور کیا ہے اور اس سے اس طرح یہ کام لیا ہے کہ اس منصب پر آنے کے بعد سے آخری سانس تک اس کی پوری زندگی اسی کام کے لیے وقف رہی ہے۔ اس کے لیے دنیا میں تلاوت آیات اور تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس کے سوا کوئی مشغلہ نہیں رہا ہے۔ رات، دن، اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اس کو یہی دھن رہی ہے کہ گمراہوں کو راہ راست پر لائے، اور راہ راست پر آجانے والوں کو ترقی کی اعلیٰ منزلوں پر چلانے کے قابل بنائے۔ وہ ہمیشہ ایک ہمہ وقتی ملازم (Whole Time Servant) رہا ہے جس کو کبھی چھٹی نہیں ملی۔ اور نہ کبھی اس کے لیے اوقات کار (Working Hours) مقرر کیے گئے۔ اس پر خدا کی طرف سے شدید نگرانی مقرر رہی ہے کہ خطا نہ کرنے پائے۔ ہوائے نفس کے اتباع اور شیطانی وساوس سے اس کی سخت حفاظت کی گئی ہے۔ اور معاملات کو بالکل اس کی بشری عقل اور اس کے انسانی اجتہاد پر نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ جہاں کہیں اس کی خواہش یا اس کے اجتہاد نے خدا کے مقرر کیے ہوئے خط مستقیم سے بال برابر بھی جنبش کی ہے، وہیں اس کو ٹوک کر سیدھا کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کی پیدائش اور اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ رہا ہے کہ خدا کے بندوں کو سواء السبیل اور صراط مستقیم پر چلائے۔ اگر وہ اس خط سے ایک سر مو بھی ہٹتا تو عام انسان میلوں اس سے دور نکل جاتے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے لفظ لفظ پر قرآن گواہ ہے۔

۱۔ یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے لیے نامزد کر دیے جاتے تھے اور ان کو خاص طور پر اسی مقصد کے لیے پیدا کیا جاتا تھا، متعدد انبیاء کے احوال سے معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت اسحاق کی پیدائش سے پہلے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی پیدائش اور نبوت کی خوشخبری دے دی جاتی ہے۔ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ (الصّٰفّٰت: آیات ۱۱۲-۱۱۳) حضرت یوسف کے متعلق بچپن ہی میں حضرت یعقوب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو برگزیدہ کرنے اور ابراہیم و اسحٰق علیہما السلام کی طرح ان پر اپنی نعمت کا اتمام کرنے والا ہے۔ حضرت زکریا بیٹے کے لیے دعا کرتے ہیں تو ان کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خوشخبری ان الفاظ میں دی جاتی ہے کہ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (آل عمران: آیت ۳۹) حضرت مریم کے پاس خاص طور پر فرشتہ بھیجا جاتا ہے کہ ان کو ایک پاک طینت لڑکے (غلام زکی) کی خوشخبری دے۔ اور جب ان کے وضع حمل کا وقت آتا ہے تو خاص حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی زچگی کے انتظامات ہوتے ہیں (ملاحظہ ہو سورہ مریم رکوع دوم)۔ پھر اُس اسرائیلی بچے کو بھی دیکھیے جس سے وادیٔ مقدس طُویٰ میں بلا کر باتیں کی گئیں۔ وہ بھی عام چرواہوں کی طرح نہ تھا۔ اسے مصر میں خاص طور پر فرعونیت کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا کیا گیا۔ اس کو قتل سے بچانے کے لیے ایک تابوت میں رکھوا کر دریا میں ڈلوا دیا گیا تاکہ خاص اُسی فرعون کے گھر میں پہنچا دیا گیا جس کو وہ تباہ کرنے والا تھا۔ اس کو پیاری صورت دی گئی کہ فرعون کے گھر والوں کے دل میں گھر کر لے۔ (وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ)۔ اس کے منہ کو تمام عورتوں کے دودھ سے روک دیا گیا اور اس کی پرورش کا انتظام خاص طور پر حق تعالیٰ کی نگرانی میں ہوا (وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ)۔ یہ چند مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خاص طور پر نبوت ہی کے لیے پیدا کیے جاتے تھے۔

غیر معمولی قابلیتیں اور خصوصی صلاحیتیں

پھر دیکھیے کہ اس طرح جن لوگوں کو پیدا کیا جاتا ہے وہ عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ غیر معمولی قابلیتوں کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ ان کی فطرت نہایت پاکیزہ ہوتی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچا ایسا ہوتا ہے کہ اس سے جو بات نکلتی ہے سیدھی نکلتی ہے۔ غلط روی اور کج بینی کی استعداد ہی ان میں نہیں ہوتی۔ وہ جبلی طور پر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ بلا ارادہ اور بلا کسی غور و فکر کے محض حواس اور وجدان (Intvition) سے وہ اُن صحیح نتائج پر پہنچ جاتے ہیں جن پر دوسرے انسان غور و فکر کے بعد بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے علوم کسبی نہیں ہوتے بلکہ جبلی و وہبی ہوتے ہیں۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط کا امتیاز ان کی عین سرشت میں ودیعت کیا جاتا ہے۔ وہ فطرتاً صحیح سوچتے ہیں، صحیح دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یعقوب کو دیکھیے۔ حضرت یوسف کا خواب سنتے ہی ان کے دل میں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے کہ

اس بچے کو اس کے بھائی جیتا نہ رہنے دیں گے۔ برادرانِ یوسفؑ ان کو کھیل کے لیے لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت یعقوبؑ نہ صرف ان کی بری نیت کو بھانپ جاتے ہیں، بلکہ ان کو ٹھیک وہ بہانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے جو آخر میں وہ بنانے والے تھے۔ فرماتے ہیں وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ۔ پھر جب یوسفؑ کے بھائی خون کا بھرا ہوا کرتا لا کر دکھاتے ہیں تو حضرت یعقوبؑ دیکھ کر فرماتے ہیں بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا۔ اسی طرح جب برادرانِ یوسفؑ مصر سے واپس آکر کہتے ہیں کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور یقین دلانے کے لیے یہاں تک عرض کرتے ہیں کہ اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجیے جہاں سے ہم آرہے ہیں تو حضرت یعقوبؑ پھر وہی جواب دیتے ہیں کہ یہ تمہارے نفس کا دھوکہ ہے۔ بیٹوں کو پھر مصر بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ "جاؤ اور جا کر یوسفؑ اور اس کے بھائی کا پتہ چلاؤ" گویا سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی ان کو یقین ہے کہ حضرت یوسفؑ زندہ ہیں اور مصر ہی میں موجود ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ کا قمیص لے کر مصر سے چلتے ہیں تو ان کو دور ہی سے حضرت یوسفؑ کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نفسی و روحانی قوتیں کس قدر غیر معمولی ہوتی ہیں۔ یہ صرف حضرت یعقوبؑ ہی کی خصوصیت نہیں تمام انبیاء کا یہی حال ہے۔ حضرت یحییٰؑ کے متعلق ارشاد ہے:

وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَحَنَانًا مِنْ لَدُنَّا وَزَكَاةً۔ (مریم: ۱۲-۱۳)	ہم نے بچپن ہی میں اس کو قوتِ فیصلہ اور رحم دلی اور پاک طینتی اپنی طرف سے عطا کی۔

حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے گہوارے میں کہلوایا جاتا ہے کہ:

وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا۔ (مریم: ۳۱-۳۲)	اور اس نے مجھ کو برکت والا بنایا جہاں کہیں میں رہوں اور اس نے مجھ کو وصیت کی کہ جب تک جیوں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا اور مجھ کو جبّار اور شقی نہیں بنایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ۔ (القلم: ۴)	اور تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

یہ سب اُن جبلّی اور فطری کمالات کی طرف اشارات ہیں جن کو لے کر انبیاء علیہم السلام پیدا ہوتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ ان کی اپنی فطری استعدادات کو ترقی دے کر فعلیت کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ ان کو وہ چیز عطا کرتا ہے جس کو قرآن میں علم اور حکم (قوتِ فیصلہ) اور ہدایت اور بیّنہ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں:

وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ (اعراف: ٦٢) میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوتِ سموات و ارض کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے (انعام: ۷۵)، اور جب وہ اس مشاہدہ سے علم یقین لے کر پلٹتے ہیں تو اپنے باپ سے کہتے ہیں:

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۔ (مریم: ٤٣) اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا، لہٰذا میری پیروی کر میں تجھے سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

حضرت یعقوبؑ کے متعلق ارشاد ہے:

وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۔ (یوسف: ٦٨) اور یقیناً وہ علم رکھتا تھا جو ہم نے اس کو تعلیم کیا تھا مگر اکثر لوگ یہ راز نہیں جانتے۔

حضرت یوسفؑ کے حق میں فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۔ (یوسف۔ ٢٢) اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو دانش اور قوتِ فیصلہ عطا کی۔

یہی بات حضرت موسیٰؑ کے حق میں بھی فرمائی (قصص: ۱۴)، یہی حکم اور علم حضرت لوطؑ کو عطا کیا گیا (انبیاء: ۷۴) اور اسی غیر معمولی علم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سرفراز ہوئے۔

وَأَنزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ (النساء ۔۱۱۳) اور اللہ نے تیرے اوپر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم دیا جو پہلے تو نہ جانتا تھا۔

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي ۔ (انعام: ٥٧) کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح اور روشن راستے پر ہوں۔

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللّٰهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۔ (یوسف: ١٠٨) کہو کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں بھی بصیرت پر ہوں اور وہ بھی جو میرے پیرو ہیں۔

اس علم اور حکم سے نبی اور عام انسانوں کے درمیان اتنا عظیم تفاوت واقع ہو جاتا ہے جتنا ایک آنکھوں والے اور ایک نابینا کے درمیان ہوتا ہے۔

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ (انعام: ٥٠) میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ کہو اے محمدؐ! کیا اندھا اور آنکھوں والا

دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

ان آیات میں جس چیز کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ ایک روشنی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے نفس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ اسی لیے اس کا ذکر کتاب سے الگ کیا گیا ہے اور اسے انبیاء کی صفت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس روشنی سے حقائق کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی سے اُن امور میں نظر کرتے ہیں جو ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ علماء نے اسی چیز کا نام "وحیِ خفی" رکھا ہے یعنی وہ اندرونی ہدایت و بصیرت جو ہر وقت ان بزرگوں کو حاصل رہتی ہے اور جس سے وہ ہر موقع پر کام لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ غور و فکر کے بعد جن باتوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے اور جن امور میں حق و صواب معلوم نہیں کر سکتے ان میں نبی کی نظر اللہ کی دی ہوئی بصیرت اور روشنی کے مدد سے آن واحد میں تہ تک پہنچ جاتی تھی۔

خدا کی طرف سے نگرانی اور حفاظت کا انتظام

اس کے بعد قرآن مجید ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ نے انبیاء علیہم السلام کو نہ صرف حکمت اور قوتِ فیصلہ اور غیر معمولی دانش و بینش عطا کی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ اُن پر خاص نظر رکھتا ہے۔ غلطیوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ گمراہیوں سے ان کو بچاتا ہے خواہ وہ انسانی اثرات کے تحت ہوں، یا شیطانی وساوس کے تحت، یا خود ان کے اپنے نفس سے پیدا ہوں۔ حتیٰ کہ اگر مقتضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں بھی غلطی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصے میں دیکھیے جب قریب تھا کہ عزیزِ مصر کی بیوی ان کو اپنے جال میں پھنسا لے، اللہ تعالیٰ نے اپنی "برہان" دکھا کر اُن کو بدکاری سے محفوظ کر دیا۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۔ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف: ۲۴)

اُس نے یوسفؑ سے ارادہ بد کر ڈالا اور وہ بھی اس کی طرف ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہُوا تاکہ ہم اُس کو برائی اور بے حیائی سے پھیر دیں کیونکہ وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جن کو ہم نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو جب فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا تو انہیں خوف ہُوا کہ کہیں فرعون اُن پر زیادتی نہ کرے۔ اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ کچھ خوف نہ کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، اور سب کچھ سُن اور دیکھ رہا ہوں (طٰہٰ: ۴۵-۴۶)۔ خوفِ بشریت کی بنا پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بشری کمزوری کو اپنی وحی سے دُور کیا۔

حضرت نوحؑ بیٹے کو ڈوبتے دیکھ کر چیخ اٹھے "رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ" خدایا یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ بشری کمزوری تھی۔ اللہ نے اُسی وقت اُن پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ وہ تیرے نطفہ سے پیدا ہوا کرے، مگر تیرے "اہل" سے نہیں ہے

کیونکہ یہ عمل غیر صالح ہے۔ بشریت نے محبت پدری کے جوش میں ذرا سی دیر کے لیے نبی کی نظر سے اس حقیقت کو چھپا دیا تھا کہ حق کے معاملہ میں باپ، بیٹا، بھائی، کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے اسی وقت آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا اور حضرت نوحؑ مطمئن ہو گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعدد مرتبہ ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں۔ اپنی فطری رحمت و رأفت، کفار کو مسلمان بنانے کی حرص، کفار کی تالیف قلب، لوگوں کے چھوٹے سے چھوٹے احسان کا بدلہ دینے کی کوشش، منافقین کے دلوں میں ایمان کی روح پھونکنے کی خواہش، اور کبھی کبھی اقتضائے بشریت کی بنا پر جب کبھی آپ سے کوئی اجتہادی لغزش ہوئی وحی جلی سے اس کی اصلاح کی گئی۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى (عبس: ۱)، مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى (انفال: ۶۷)، عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (توبہ: ۴۳)۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ: ۸۰)۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (توبہ: ۸۴)۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (تحریم: ۱)۔ یہ سب آیات اسی امر کی شہادت دیتی ہیں۔ لوگ ان آیات کو اس بات کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غلطیاں سرزد ہوتی تھیں اور آپ غلطیوں سے مبرا نہ تھے۔ خصوصاً حضرات اہل قرآن کو ان آیات کے ذریعہ سے اللہ کے رسولؐ کی غلطیاں پکڑنے میں خاص مزہ آتا ہے۔ لیکن دراصل یہی تو وہ آیتیں ہیں جن سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنے نبی کو غلطیوں سے بچانے اور اس کی زندگی کو ٹھیک معیار حق پر قائم رکھنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ اور یہ حقیقت صرف مذکورہ بالا آیات ہی میں بیان نہیں ہوئی ہے، بلکہ قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اسے اصولی حیثیت سے بھی بیان فرمایا ہے۔ مثلاً فرمایا:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النساء: ۱۱۳)

اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ تو تم کو راہ راست سے ہٹا دینے کا عزم کر ہی چکا تھا، مگر وہ خود اپنے آپ کو بھٹکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، کیونکہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تم کو وہ علم دیا ہے جو تم پہلے نہ جانتے تھے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ

قریب تھا کہ وہ تم کو اس بات سے جو ہم نے تم پر وحی کی ہے منحرف کر دیتے تاکہ تم اس کے سوا کچھ اور ہم پر بنا لاؤ، اس وقت وہ تم کو دوست بنا لیتے۔ اگر

إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا۔ (بنی اسرائیل: ۷۳-۷۴)

ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو کسی قدر تم ان کی طرف جھک ہی جاتے۔

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنَّىٰٓ أَلْقَى الشَّيْطَٰنُ فِيٓ أُمْنِيَّتِهِۦ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ ءَايَٰتِهِۦ۔ (الحج: ۵۲)

ہم نے تم سے پہلے جو نبی یا رسول بھی بھیجا ہے اُس نے جب کبھی کسی بات کی تمنا کی شیطان نے اس کی تمنا میں وسوسہ ڈال دیا۔ مگر اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ ذہن میں شیطان جو وسوسہ بھی ڈالتا ہے اللہ اسے مٹا دیتا ہے اور پھر اپنی آیات کو مضبوط کر دیتا ہے۔

ان اُصولی ارشادات اور اُوپر کی واقعاتی مثالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زندگی ٹھیک ٹھیک معیارِ مطلوب پر قائم رکھنے کی ذمہ داری خود اپنے اُوپر لی ہے اور اس نے اس بات کا سخت اہتمام کیا ہے کہ نبی سے جو لغزش بھی سرزد ہو جائے اس کی فوراً اصلاح کر دے، خواہ وہ لغزش کسی ذاتی معاملہ میں ہو یا پبلک معاملہ میں۔ پھر اگر اصولی طور پر یہ بات مان لی جائے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ نبی کے جن کاموں پر اللہ تعالیٰ نے گرفت نہیں کی ہے وہ سب کے سب اللہ کے معیارِ مطلوب پر پورے اُترتے ہیں، اور گویا ان پر خود اللہ ہی کی مُہرِ توثیق ثبت ہے۔

محاکمہ

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اس امر کی توضیح کے لیے بالکل کافی ہے کہ نبوت کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ ایک انسان جو تمام حیثیات سے دوسرے انسانوں جیسا ایک انسان ہو ایک عمر کو پہنچنے کے بعد یکایک خدا کی طرف سے نزولِ وحی کے لیے چُن لیا جائے اور بجز اس کتاب کے جو اس پر نازل کی گئی ہو اور کسی بات میں بھی اس کی رائے، اس کے خیالات، اُس کے اعمال، اس کے احکام اور اس کے فیصلے غیر نبی انسانوں سے ممتاز نہ ہوں، جیسا کہ پہلے گروہ کا گمان ہے، یا یہ کہ اس میں اور عام انسانوں میں صرف اتنا ہی فرق ہو کہ تنزیلِ کتاب کے ساتھ ساتھ اُس کو احکامِ کتاب کی عملی تفصیلات بھی بتا دی گئی ہوں اور اس خاص امتیازی حیثیت سے قطع نظر کر کے وہ محض عام امیروں جیسا ایک امیر اور عام قاضیوں جیسا ایک قاضی اور عام لیڈروں جیسا ایک لیڈر ہو، جیسا کہ دوسرے گروہ کا خیال ہے۔ اسی طرح نبوت کی حقیقت یہ بھی نہیں ہے کہ نبی کی ذاتِ بشریہ پر نبوت عارض ہوتی ہو، اور اس کے عروض کے بعد بھی نبی کی بشریت اور اس کی نبوت دونوں علیحدہ علیحدہ رہتی ہوں، حتیٰ کہ ہم اس کی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے صرف اُس شعبہ کو اطاعت و اتباع کے لیے منتخب کر سکیں جو نبوت سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ تیسرے گروہ کا نظریہ ہے۔ یہ تینوں خیالات بے اصل ہیں۔

نبیؐ کامل و اکمل بشریت سے آراستہ ہوتا ہے

ان کے برعکس قرآن مجید سے نبوت کی حقیقت پر جو روشنی پڑتی ہے، اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ نبی اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گزرنے کے بعد نبوت کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا ہے بلکہ وہ کارِ نبوت ہی کے لیے پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ اگرچہ بشر ہی ہوتا ہے، اور اُن تمام حدود سے محدود ہوتا ہے جو حق تعالیٰ نے فطرتِ بشری کے لیے مقرر فرمائی ہے، لیکن ان حدود میں اُس کی بشریت آخری اور انتہا درجہ کی کامل و اکمل بشریت ہوتی ہے جس میں وہ تمام قوتیں بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہیں جو زیادہ سے زیادہ ایک انسان کو حاصل ہونی ممکن ہیں۔ اُس کے جسمانی، نفسانی، عقلی اور روحانی قوٰی عدل و تسویہ (Balance or Moderation) کے انتہائی مقام پر ہوتے ہیں۔ اس کے ادراکات اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ وہ بلاکسی غور و فکر کے اپنے وجدان سے اُس الہامِ الٰہی کو پا لیتا ہے جس کی طرف فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اُس کی نظر اتنی صحیح ہوتی ہے کہ وہ کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر صرف اپنے میلِ طبعی سے فجور کی راہ چھوڑ کر تقوٰی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا قلب اتنا سلیم ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں جو اُس کے سامنے آئے اس الٰہی ہدایت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا ہے جس کی طرف وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اُس کے قلب کی سلامت اور اس کی فطرت کی صحت اس کو خود بخود اُن راستوں سے ہٹا دیتی ہے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہیں، اور وہ آپ سے آپ اُن راستوں پر چلتا ہے جو مرضاتِ الٰہی کے عین مطابق ہیں۔ یہی کامل و اکمل بشریت ہے جس کے ساتھ وہ صحیح معنوں میں بالفعل خدا کا خلیفہ ہوتا ہے، اور یہی چیز ہے جو اپنی پختگی اور اپنے کمال کو پہنچ جانے کے بعد ہدایتِ عام کے منصب پر سرفراز کی جاتی ہے، حق تعالیٰ کی طرف سے علم کی مزید روشنی پاکر سراجِ منیر بنتی ہے، مصالحِ عامۂ بشریہ کے لیے تعلیمات اور احکام کا منبع قرار پاتی ہے، اور اصطلاح میں نبوت و رسالت سے موسوم ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ نبوت ایک عرض ہے جو ایک خاص وقت میں نبی کے جوہرِ انسانیت پر عارض ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی انسانیتِ کاملہ کا جوہر ہے جو نبوت کی استعداد کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے اور فعلیت کی طرف ترقی کرتے کرتے آخرکار نبوت بنا دیا جاتا ہے۔ نبوت کا منصب ایسا نہیں ہے کہ ایک انسان تھا جو اتفاقاً نبی بنا دیا گیا، حتیٰ کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا انسان ہوتا تو وہ بھی اُسی طرح اتفاقاً نبی بنا دیا جا سکتا تھا۔ بلکہ دراصل نبوت ایک پیدائشی چیز ہے اور نبی کی حیثیتِ ذاتی ہی اُس کی حیثیتِ نبوی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ بعثت سے قبل اُس کی حیثیتِ نبوی بالقوہ ہوتی ہے اور بعثت کے بعد بالفعل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے میٹھا پھل کہ وہ بالذات میٹھا پھل ہی پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کی مٹھاس پختگی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر ہی ظاہر ہوتی ہے۔

بحث سے متعلق چند آیات

اب اُن آیات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبوت اور ذاتِ نبوی کے حق میں متعدد مقامات پر ارشاد فرمائی ہیں۔ میں توضیحِ مدعا کے لیے ان آیات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے نقل کرتا ہوں :

(۱) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ۔ (آل عمران - ۱۷۹)

اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ تم کو براہِ راست غیب کا علم دے، بلکہ وہ اس کام کے لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چُن لیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء: ۶۴)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔[1]

(۳) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء - ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی

(۴) وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى۔ (النجم: ۱ تا ۴)

تارے کی قسم جب وہ ٹوٹتا ہے، تمہارا صاحب (یعنی نبی) نہ گم کردہ راہ ہے اور نہ کج راہ۔ اور نہ وہ اپنے نفس سے بولتا ہے۔ وہ صرف وحی ہے جو اُس پر کی جاتی ہے۔

(۵) اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ۔ (انعام - ۵۰)

میں صرف اُس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے

(۶) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب - ۲۱)

تمہارے لیے رسولِ خدا میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

(۷) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران - ۳۱)

اے محمدؐ! کہہ دو کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

(۸) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ .... وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا (النور - ۵۱ تا ۵۴)

اہلِ ایمان کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ (رسول) اُن کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور مان لیا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ..... اور اگر تم اُس کی (یعنی رسول کی) اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔

---

[1] یعنی رسول بذاتِ خود مُطاع نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے اذن یا اس کے حکم کی بنا پر مُطاع ہوتا ہے (مرتب)

(۹) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء: ۶۵)

پس قسم ہے تیرے پروردگار کی نہیں! وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اے نبیؐ وہ اپنے آپس کے جھگڑے میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں، پھر تو جو فیصلہ کرے اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں بلکہ سربسر تسلیم کریں۔

(۱۰) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِينًا۔ (احزاب: ۳۶)

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو اس کے لیے اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

ان آیات پر غور کیجیے تو تمام حقیقت آپ پر کھل جائے گی۔

نبیؐ اور عام انسانوں کا فرق

پہلی آیت میں نبی اور عام انسانوں کے درمیان فرق ظاہر کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ نبی پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ اپنے غیب[1] کا علم ہر انسان پر فرداً فرداً ظاہر نہیں کرتا بلکہ اپنے بندوں میں سے کسی خاص بندے پر ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے عام انسانوں پر لازم ہے کہ وہ اس بندے پر ایمان لائیں۔

اطاعت نبیؐ کا حکم مطلق ہے

(۲) دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسولؐ پر ایمان لانے کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو رسولِ خداؐ مان لیا جائے بلکہ اس کے ساتھ رسول کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ یہ اطاعت کا حکم نہ صرف اس آیت میں، بلکہ قرآن کریم میں جہاں

---

[1] غیب، یعنی وہ غیر محسوس حقیقتیں جن سے واقف ہوئے بغیر دنیا میں انسانی زندگی کے لیے کوئی صحیح طریقہ اور نظام نہیں بن سکتا۔ مثلاً یہ کہ انسان کی اصلیت کیا ہے؟ وہ آزاد ہے یا کسی کا محکوم؟ محکوم ہے تو کس کا محکوم ہے؟ اپنے حاکم سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اسے کبھی اپنے حاکم کو جواب دینا ہے یا نہیں؟ جواب دینا ہے تو کہاں؟ کس شکل میں؟ کس معیار پر؟ کن معاملات میں؟ اور اس جواب دہی میں کامیاب یا ناکام ہونے کا کیا نتیجہ ہوگا؟ ان سوالات کا جب تک کوئی جواب، اور وہ بھی قیاسی و گمانی جواب نہیں بلکہ علمی اور یقینی جواب معلوم نہ ہو، انسانی زندگی کے لیے کوئی اسکیم نہیں بن سکتی اور یہی وہ علم ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں "غیب" کے علم سے تعبیر فرما رہا ہے۔ (مؤلف)

جہاں بھی دیا گیا ہے، مطلق ہے، مقید نہیں ہے۔ کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ رسُول کی اطاعت فلاں فلاں اُمور میں ہے اور اُن امور کے سوا کسی دوسرے امر میں نہیں ہے۔ پس قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کا رسُولؐ ایک حاکم عام ہے۔ جو حکم بھی وہ دے، مومنوں پر اس کا ماننا لازم ہے۔ یہ خود رسُولؐ کے اپنے اختیار میں ہے کہ اپنی ہدایت کے ماتحت اپنی حکومت کے اقتدار کو مخصوص حدود کے اندر محدود کر دے، اور اُن حدود سے باہر لوگوں کو رائے اور عمل کی آزادی بخش دے، لیکن مومنوں کو یہ حق ہرگز نہیں دیا گیا کہ وہ خود رسُولؐ کے اختیارات کی حد بندی کریں۔ وہ تو قطعاً محکوم و مامور ہیں۔ اگر رسُولؐ ان کو زراعت اور تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ کے طریقوں میں سے بھی کسی خاص طریقے کو اختیار کرنے کا حکم دیتا تو ان کا فرض یہی تھا کہ بے چون و چرا اس کے حکم کی اطاعت کرتے۔

نبیؐ کی اطاعت معمولی انسان کی اطاعت نہیں

جب غیر مشروط اور غیر محدود اطاعت کا حکم دے دیا گیا تو یہ اطمینان دلانا بھی ضروری تھا کہ نبیؐ کی اطاعت اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت نہیں ہے، جیسا کہ اُن جاہل کفار کا خیال تھا جو کہتے تھے کہ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ "یہ کیا یہ نہیں جیسا ایک بشر نہیں ہے؟" اور مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ "یہ کچھ نہیں ہے مگر تمہارے ہی جیسا ایک بشر، اور اس پر چاہتا یہ ہے کہ تم پر فضیلت حاصل کرے۔" اور لَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ "اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو تم ضرور ٹوٹے میں رہو گے"۔ بلکہ دراصل یہ خدا کی اطاعت ہے، کیونکہ نبیؐ جو کچھ کہتا ہے خدا کی طرف سے کہتا ہے، اور جو کچھ عمل کرتا ہے خدا کی ہدایت کے ماتحت کرتا ہے۔ وہ خود اپنے نفس کی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتا، بلکہ خدا کی وحی کا اتباع کرتا ہے۔ اس لیے تم کو مطمئن ہو جانا چاہیے کہ اس کی پیروی میں کسی قسم کی گمراہی اور غلط روی کا خطرہ نہیں ہے۔

نبیؐ کی رہنمائی کے لیے وحیِ غیر متلوّ

یہی بات ہے جو تیسری، چوتھی اور پانچویں آیت میں بیان کی گئی ہے۔ چوتھی اور پانچویں آیت میں جس چیز کو وحی کہا گیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد کتاب اللہ ہے، اور کتاب کے سوا کوئی وحی نبیؐ پر نہیں آتی۔ لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کی جاتی تھی بلکہ اُن کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل کرتا رہتا تھا اور اسی وحی کی روشنی میں وہ سیدھی راہ چلتے تھے، معاملات میں صائب رائے قائم کرتے تھے اور تدبیریں عمل میں لاتے تھے۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔ نوح علیہ السلام طوفان کی پیش بندی کے لیے اللہ کی نگرانی میں اور اس کی وحی کے ماتحت کشتی بناتے ہیں۔ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ حضرت ابراہیمؑ کو ملکوتِ سمٰوات و ارض کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے اور مُردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت دکھائی جاتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کو خوابوں کی تعبیر بتائی جاتی ہے ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ۔ حضرت موسیٰؑ سے طور پر باتیں کی جاتی ہیں۔ پوچھا

جاتا ہے کہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے ؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ میری لاٹھی ہے ، اس سے بکریاں ہانکتا ہوں۔ حکم ہوتا ہے کہ اس کو پھینک دو۔ جب لاٹھی اژدہا بن جاتی ہے اور حضرت موسیٰؑ ڈر کر بھاگتے ہیں تو فرمایا جاتا ہے یٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ "موسیٰؑ ڈرو نہیں، آگے بڑھو، تم امن میں ہو"۔ پھر حکم دیا جاتا ہے اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى "فرعون کی طرف جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے"۔ وہ اپنی مدد کے لیے ہارون علیہ السلام کو مانگتے ہیں اور یہ درخواست قبول کی جاتی ہے۔ دونوں بھائی فرعون کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے : لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى "ڈرو نہیں، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ میں سنتا اور دیکھتا ہوں"۔ فرعون کے دربار میں جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰؑ ڈر جاتے ہیں تو وحی آتی ہے لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى "مت ڈرو تمہارا ہی بول بالا ہوگا"۔ جب فرعون پر اتمام حجت ہو چکتا ہے تو ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ "میرے بندوں کو لے کر راتوں رات چل پڑو۔ تمہارا تعاقب کیا جائے گا"۔ دریا پر پہنچتے ہیں تو فرمان آتا ہے اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ "دریا پر اپنا عصا مارو"۔ کیا ان میں سے کوئی وحی بھی ایسی ہے جو کتاب کی صورت میں ہدایتِ عامہ کے لیے نازل ہوئی ہو! یہ مثالیں اس امر کے ثبوت میں کافی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ تعالیٰ متوجہ رہتا ہے اور ہر ایسے موقع پر جہاں بشری فکر و رائے کے غلطی کرنے کا امکان ہو اپنی وحی سے اُن کی رہنمائی کرتا رہتا ہے ، اور یہ وحی اُس وحی سے ماسوا ہوتی ہے جو ہدایتِ عام کے لیے اُن کے واسطے سے بھیجی جاتی اور کتاب میں ثبت کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لیے ایک الٰہی ہدایت نامہ اور دستور العمل کا کام دے۔

حضورؐ پر وحی غیر متلو ہونے کی چند مثالیں

ایسی ہی وحی غیر متلو اور وحیِ خفی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل ہوتی تھی جس کی طرف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں۔ حضورِ انور نے پہلے بَيْتُ الْمَقْدِس کو قبلہ بنایا تھا۔ اس کے متعلق کوئی حکم کتاب اللہ میں نہیں آیا۔ مگر جب اس قبلہ کو منسوخ کر کے بیت الحرام کو قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا اُس وقت ارشاد ہوا :

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ	جس قبلے پر تم تھے اس کو ہم نے صرف اس لیے مقرر
اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ	کیا تھا کہ رسولؐ کا اتباع کرنے والے اور اتباع
عَلٰى عَقِبَيْهِ ۔ (البقرہ - ۱۴۳)	سے منہ موڑنے والے کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے جو بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا، وہ وحی کی بنا پر تھا۔

جنگِ اُحد کے موقع پر حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کے لیے فرشتے بھیجے گا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے اس ارشاد کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا :

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ (آل عمران ۱۲۶)	اللہ نے اس وعدے کو تمہارے لیے خوشخبری بنایا

ظاہر ہوا کہ یہ وعدہ اللہ کی طرف سے تھا۔

جنگِ اُحُد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدرِ ثانیہ کے لیے لوگوں کو نکلنے کا حکم دیا۔ یہ حکم قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ مگر اللہ نے بعد میں تصدیق کی کہ یہ بھی اُسی کی جانب سے تھا۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۔ (آل عمران-۱۷۲)

جن لوگوں نے لڑائی میں زخم کھانے کے بعد پھر اللہ اور رسُول کی پکار پر لبیک کہا۔

جنگِ بدر کے موقع پر حضورؐ کے مدینے سے نکلنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے :

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَیْتِكَ (انفال-۵)

جس طرح تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے نکالا۔

گھر سے نکلنے کا حکم قرآن میں نہیں آیا، مگر بعد میں اللہ نے تصدیق فرمائی کہ یہ نکلنا اُسی کے حکم سے تھا نہ کہ اپنی رائے سے۔ پھر عین جنگ کے موقع پر اللہ نے اپنے نبیؐ کو خواب دکھایا :

اِذْ یُرِیْكَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا ۔ (انفال : ۴۳)

جب کہ اللہ ان کو قلیل بنا کر تیرے خواب میں تجھے دکھا رہا تھا۔

منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیمِ صدقات پر ناک بھوں چڑھائی تو اللہ نے اس حقیقت پر سے پردہ اُٹھایا کہ یہ تقسیم خود حضرتِ حق کے ارشاد سے عمل میں آئی تھی :

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۔ (توبہ : ۵۹)

اگر وہ راضی ہو جاتے اُس حصے پر جو اللہ اور اس کے رسُولؐ نے ان کو دیا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام صحابہؓ صلح کے مخالف تھے، اور صلح کی شرائط ہر شخص کو ناقابلِ قبول نظر آتی تھیں۔ مگر اللہ کے نبیؐ نے ان کو قبول کیا اور اللہ نے بعد میں تصدیق کی کہ یہ صلح اسی کی جانب سے تھی۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۔ (الفتح-۱)

ہم نے تجھ کو فتحِ مبین عطا کی۔

متذکرہ آیات کا ماحصل

آیات کے تتبع سے اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، مگر یہاں استقصاء مقصود نہیں ہے، صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اللہ کا تعلق اپنے انبیاء کے ساتھ کوئی عارضی اور مؤقتی تعلق نہیں ہے کہ جب کبھی اس کو اپنے بندوں تک کوئی پیغام پہنچانا ہو بس اسی وقت یہ تعلق بھی قائم ہو اور اس کے بعد منقطع ہو جائے بلکہ دراصل حق تعالیٰ جس شخص کو پیغمبری کے لیے منتخب فرماتے ہیں اُس کی طرف وہ ہمیشہ ایک توجہِ خاص کے ساتھ متوجہ رہتے ہیں اور دائماً اپنی وحی سے اس کی ہدایت و رہنمائی فرماتے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی میں ٹھیک ٹھیک راہِ راست پر گامزن رہے، اور اس سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر نہ ہونے پائے جو مرضاتِ الٰہی کے خلاف ہو۔ سُورۂ نجم

کی ابتدائی آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ دراصل اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ اور جیسا کہ میں اس مضمون کے پہلے حصہ میں عرض کر چکا ہوں، یہ بات بھی قرآن نے کھول کر بیان کر دی ہے کہ انبیاؑ پر ہمیشہ اللہ کی نگرانی رہتی ہے، ان کو غلط روی سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور اگر باقتضائے بشریت ان سے کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے، یا وحیٔ خفی کے لطیف اشارے کو سمجھنے میں وہ کبھی غلطی کر جاتے ہیں، یا اپنے اجتہاد سے کوئی ایسی روش اختیار کر جاتے ہیں جو مرضاتِ الٰہی سے یک سرِ مُو بھی ہٹی ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ فوراً اُس کی اصلاح کرتا ہے اور تنبیہ کر کے سیدھے راستے پر لے آتا ہے۔ قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیائے کرامؑ کی لغزشوں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی تنبیہوں کا جو ذکر آیا ہے اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں سے انبیاء علیہم السلام کا اعتماد اُٹھ جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ جب انبیاؑ بھی ہماری ہی طرح نعوذ باللہ غلط کار ہیں تو ان کے احکام کی اطاعت اور ان کی روش کی پیروی کامل اطمینان کے ساتھ کیسے کی جا سکتی ہے بلکہ اس ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ کو ہوائے نفس کا اتباع کرنے یا اپنی رائے اور بشری اجتہاد پر چلنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے۔ وہ چونکہ اُس کی طرف سے اُس کے بندوں کی رہنمائی کے لیے مامور کیے گئے ہیں، اس لیے ان پر یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ دائماً اُس کی ہدایت پر کاربند رہیں اور اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی اس کی رضا کے خلاف عمل نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بعض ایسی باتوں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کی گئی ہے جو عام انسانی زندگی میں قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، مثلاً کسی انسان کا شہد کھانا یا نہ کھانا، اور کسی اندھے کی طرف توجہ نہ کرنا اور اس کے دخل در معقولات پر چیں بہ جبیں ہو جانا، یا کسی کے لیے دعائے مغفرت کرنا، کونسا ایسا اہم واقعہ تھا، مگر اللہ نے نبیؐ کو ایسے چھوٹے معاملات میں بھی اپنی رائے یا دوسروں کی مرضی پر چلنے نہ دیا۔ اسی طرح جنگ کی شرکت سے کسی کو رخصت کر دینا اور بعض قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا ایک امیر کی زندگی میں محض ایک معمولی واقعہ ہے۔ مگر نبی کی زندگی میں یہی واقعہ اتنا اہم بن جاتا ہے کہ اس پر وحی جلی کے ذریعے سے تنبیہ کی جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کے نبی کی حیثیت عام اُمراء کی سی نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں آزاد ہو، بلکہ منصبِ نبوّت پر مامور ہونے کی وجہ سے نبیؐ کے لیے لازم ہے کہ اس کا اجتہاد بھی ٹھیک ٹھیک منشاء الٰہی کے مطابق ہو۔ اگر وہ اپنے اجتہاد میں وحی خفی کے اشارے کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ کر مرضیِ الٰہی کے خلاف بال برابر بھی جنبش کرتا ہے تو اللہ وحی جلی سے اس کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

نبیؐ کی راست روی مکمل طور پر قابلِ اعتماد ہے

اللہ نے اپنے نبیؐ کی اس خصوصیت کو ہمارے سامنے اسی لیے بیان فرمایا ہے کہ ہم کو اُس کے نبی کی راست روی پر کامل اعتماد ہو اور ہم پورے وثوق کے ساتھ یقین رکھیں کہ نبیؐ کا قول اور عمل گمراہی اور کج راہی اور اتباعِ ہویٰ اور بشری

فکر و رائے کی غلطیوں سے قطعاً محفوظ ہے۔ زندگی میں اس کا قدم مضبوطی کے ساتھ اس صراطِ مستقیم پر جما ہوا ہے جو ٹھیک ٹھیک خدا کی بتائی ہوئی ہے۔ اس کی سیرتِ پاک اسلامی سیرت کا ایک ایسا معیاری نمونہ ہے جس میں کسی نقص کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور اللہ نے خاص طور پر اس کامل و اکمل نمونہ کو اسی لیے بنایا ہے کہ اس کے بندوں میں سے جو کوئی اس کا مقبول و محبوب بندہ بننا چاہے وہ بے خطر اس کی پیروی کرے۔ اس مقصد کو چھٹی اور ساتویں آیت میں کھول دیا گیا ہے چھٹی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہؐ میں ایک "اُسوۂ حسنہ" ہے، اور ساتویں آیت میں رسول اللہؐ کے اتباع کو محبوبِ الٰہی بننے کا واحد ذریعہ بتایا گیا ہے۔

نبیؐ کی پوری زندگی اُسوۂ حسنہ ہے

یہاں پھر ہم کو کسی قسم کی تخصیص و تحدید نظر نہیں آتی۔ صریح تعمیم و اطلاق ہے۔ رسول اللہ کی ذات کو مطلقاً اُسوۂ حسنہ بتایا گیا اور مطلقاً ہی آپؐ کے اتباع کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس قدر زیادہ آپؐ کا اتباع کرو گے، اور اپنی زندگی میں سیرتِ پاک کا رنگ جتنا زیادہ پیدا کرو گے اتنا ہی تقرّب تم کو بارگاہِ الٰہی میں حاصل ہوگا اور حق تعالیٰ اتنا ہی تم کو پیار کرے گا۔

دائرۂ استثناء

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپؐ کے اتباع کا حکم دینے سے یہ مراد نہیں ہے کہ تمام معاملاتِ زندگی میں آپؐ نے جو کچھ کیا ہے، اور جس طرح کیا ہے، سب انسان بعینہٖ وہی فعل اسی طرح کریں اور اپنی زندگی میں آپؐ کی حیاتِ طیبہ کی ایسی نقل اُتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے۔ یہ مقصد نہ قرآن کا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صحیح صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں، مجملاً میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور فرائض و واجبات اور ارکانِ اسلام کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے ارشادات کی اطاعت اور آپؐ کے عمل کی پیروی طابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپؐ نے حکم دیا اور جس طرح خود عمل کرکے بتایا ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو اسلامی زندگی کی عام ہدایات سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً تمدنی، معاشی، اور سیاسی معاملات، اور معاشرت کے جزئیات، تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں آپؐ نے اخلاق اور حکمت اور شائستگی کی تعلیم دی ہے، اور بعض ایسی ہیں جن کو پیشِ نظر رکھ کر ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپؐ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپؐ کا

اتباع طابق النعل بالنعل ہونا چاہیے اور کن امور میں آپؐ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہییں۔ مگر جن لوگوں کی طبیعت نزاع پسند واقع ہوتی ہے وہ اس میں طرح طرح کی بحثیں نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم عربی بولتے تھے تو کیا ہم بھی عربی بولیں؟ آپؐ نے عرب عورتوں سے شادیاں کیں تو کیا ہم بھی عربوں ہی میں شادیاں کریں؟ آپؐ ایک خاص وضع کا لباس پہنتے تھے تو کیا ہم بھی ویسا ہی لباس پہنیں؟ آپؐ ایک خاص قسم کی غذا کھاتے تھے تو کیا ہم بھی وہی غذا کھائیں؟ آپؐ کی معاشرت کا ایک خاص طریقہ تھا تو کیا ہم بھی بعینہٖ ویسی ہی معاشرت اختیار کریں؟ کاش یہ لوگ غور کرتے کہ اصل چیز وہ زبان نہیں ہے جو آپؐ بولتے تھے بلکہ وہ اخلاقی حدود ہیں جن کی پابندی کو حضورؐ نے ہمیشہ کلام میں ملحوظ رکھا۔ اصل چیز یہ نہیں ہے کہ شادی عرب عورتوں سے کی جائے یا غیر عرب سے، بلکہ یہ ہے کہ جس عورت سے بھی کی جائے اس کے ساتھ ہمارا معاملہ کیسا ہو، اس کے حقوق ہم کس طرح ادا کریں، اور اپنے جائز شرعی اختیارات کو اس پر کس طرح استعمال کریں۔ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا جو برتاؤ اپنی ازواج مطہراتؓ کے ساتھ تھا اُس سے بہتر نمونہ ایک مسلمان کی خانگی زندگی کے لیے اور کونسا ہو سکتا ہے؟ پھر یہ کس نے کہا کہ آپؐ جس وضع کا لباس پہنتے تھے وہ ایک مشروع لباس ہے؟ اور جو کھانا آپؐ کھاتے تھے بعینہٖ وہی کھانا ہر مسلمان کو کھانا چاہیے؟ اس میں اتباع کے قابل جو چیز ہے وہ تو تقویٰ اور پاکیزگی کے وہ حدود ہیں جو آپؐ اپنے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں ملحوظ رکھتے تھے۔ ان ہی حدود سے ہم کو معلوم ہو سکتا ہے کہ رہبانیت اور نفس پرستی کے درمیان جس معتدل روش کا ہم کو قرآن میں ایک مجمل سبق دیا گیا ہے اس پر ہم کس طرح عمل کریں کہ نہ تو طیبات سے ناروا اجتناب ہو اور نہ اسراف۔ یہی حال حضورؐ کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کے دوسرے تمام معاملات کا بھی ہے۔ وہ پاک زندگی پوری کی پوری ایک سچے اور خدا ترس مسلمان کی زندگی کا معیاری نمونہ تھی۔ حضرت عائشہؓ نے سچ فرمایا کہ کَانَ خُلُقُہٗ الْقُرْاٰنُ۔ اگر تم کو معلوم کرنا ہو کہ قرآن کی تعلیم اور اسپرٹ کے مطابق ایک مومن انسان کو دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے، تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کو دیکھ لو۔ جو اسلام خدا کی کتاب میں مجمل ہے وہی رسولِ خدا کی ذات میں تم کو مفصل نظر آئے گا۔

۱

رسولؐ ہمہ وقت رسولؐ ہے

الحمد للہ کہ تیسرے گروہ کے لوگ پہلے اور دوسرے گروہوں کے ہم خیال نہیں ہیں۔ مگر بعض احادیث سے اُن کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ "حضورؐ ہر آن اور ہر حال میں رسول نہیں ہوتے تھے، اور آپؐ کا ہر قول اور ہر فعل بحیثیت رسول نہیں ہوتا تھا"۔ یہ غلط فہمی جن روایات سے پیدا ہوتی ہے وہ دراصل ایک دوسری حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول ہی تھے، اور یہ شانِ رسالت

ہی تھی کہ آپؐ ہمیشہ اُس مقصد کو پیش نظر رکھتے تھے جس کے لیے آپؐ کو بھیجا گیا تھا۔ آپؐ کی بعثت کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ لوگوں سے رائے اور عمل کی آزادی قطعاً سلب کرلیں اور ان کی عقل و فکر کو معطل کر دیں۔ نہ آپؐ دُنیا کو زراعت اور صنعت و حرفت سکھانے آئے تھے۔ نہ آپؐ کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ لوگوں کے کاروبار اور ان کے ذاتی معاملات میں اُن کی رہنمائی فرمائیں۔

اصل مقصدِ رسالت پر حضورؐ کی توجہ

آپؐ کی زندگی کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ اسلام کو عقیدے کی حیثیت سے دلوں میں بٹھانا اور عمل کی حیثیت سے افراد کی سیرت اور سوسائٹی کے نظام میں نافذ کر دینا تھا۔ اس مقصد کے سوا دوسری کسی چیز کی طرف حضورؐ نے کبھی توجہ نہیں فرمائی، اور اگر شاذ و نادر کسی موقع پر کچھ فرمایا بھی تو صاف کہہ دیا کہ تم اپنی رائے اور عمل میں آزاد ہو، جس طرح چاہو کرو۔ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ اگرچہ صحابہ کرامؓ آپؐ کے ہر ارشاد کو رسُول کا ارشاد سمجھ کر بدل و جان اس کی اطاعت پر آمادہ تھے، اور آپؐ کو مطلقاً مُطاع و متبُوع سمجھتے تھے، اور اسی لیے جب کبھی حضورؐ کسی دنیوی مسئلہ میں بھی کچھ ارشاد فرماتے تو صحابہؓ کو شبہ گزرتا تھا کہ شاید یہ حکم رسالت ہو، لیکن کبھی ایسا نہ ہُوا کہ آپؐ نے کسی ایسے مسئلے میں، جو آپؐ کے مقصدِ بعثت سے متعلق نہ تھا، صحابہؓ کو کوئی حکم دیا ہو اور انہیں اطاعت پر مجبور کیا ہو۔ ۲۳ سال کی مدت میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مشن سے غافل نہ ہونا اور ہر آن اس باریک فرق کو ملحوظ رکھنا کہ کونسا معاملہ اُس مشن سے تعلق رکھتا ہے، اور کون سا نہیں رکھتا، اور اپنے متبعین پر کامل اقتدار رکھنے کے باوجود کبھی ان کو کسی غیر متعلق امر میں حکم نہ دینا، خود اس بات پر شاہد ہے کہ شانِ رسالت کسی وقت بھی حضورؐ سے منفک نہیں ہوتی تھی۔ مگر یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیوی معاملات میں جو کچھ حضورؐ نے فرمایا وہ خدا کی وحی سے نہ تھا۔ اگرچہ آپؐ کے ایسے ارشادات آپؐ کے احکام نہیں ہیں، نہ آپؐ نے اُن کو حکم کے انداز میں فرمایا، اور نہ کسی نے ان کو حکم سمجھا، مگر پھر بھی جو بات آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکلی وہ سراسر حق تھی اور غلطی کا اس میں شائبہ تک نہ تھا۔ مثال کے طور پر طبِّ نبوی کے باب میں جو کچھ آپؐ سے ثابت ہے وہ ایسی ایسی حکیمانہ باتوں سے لبریز ہے جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عرب کا اُمّی جو طبیب نہ تھا، جس نے کبھی فنِ طب کی تحقیق نہ کی تھی، وہ کس طرح اس فن کی اُن حقیقتوں تک پہنچا جو صدیوں کے تجربات کے بعد اب منکشف ہو رہی ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہم کو حضورؐ کے حکیمانہ ارشادات میں ملتی ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں تبلیغِ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں، مگر اللہ اپنے رسُولوں کی جبلّت میں جو غیر معمولی قوتیں ودیعت فرماتا ہے وہ صرف تبلیغِ رسالت ہی کے لیے کام نہیں آتیں، بلکہ ہر معاملہ میں اپنی شانِ امتیاز دکھا کر رہتی ہیں۔ حدّادی اور زرہ سازی کا تبلیغ رسالت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ مگر حضرت داؤدؑ اس میں غیر معمولی کمال دکھاتے ہیں، اور حق تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ یہ فن ہم نے اُن کو سکھایا تھا۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (انبیاء: ۸۰)۔ پرندوں کی بولیاں جانچنے

سے تبلیغ رسالت کو کیا واسطہ؟ مگر حضرت سلیمانؑ اس پر کمال ظاہر فرماتے ہیں اور خود کہتے ہیں عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (النمل: ۱۶)۔ نجاری اور کشتی سازی تبلیغ رسالت کا کونسا شعبہ ہے؟ مگر اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ سے یہ نہیں کہتا کہ ایک مضبوط سی کشتی بنوالو، بلکہ فرماتا ہے، وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (ہود: ۳۷)

انبیاءؑ کی زندگی کے دو شعبے

پس انبیاءؑ کے حق میں یہ گمان کرنا صحیح نہیں کہ ان پر صرف وہی اُمور وحی کیے گئے تھے جو براہِ راست تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت ان کی ساری زندگی حق تعالیٰ کی ہدایت کے تابع تھی۔ البتہ اگر فرق ہے تو یہ کہ ان کی زندگی کا ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کے قدم بقدم چلنا مسلمان ہونے کے لیے ناگزیر شرط ہے۔ اور ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کا اتباع ہر مسلمان پر فرض نہیں، مگر جو شخص اللہ کا محبوب و مقبول بندہ بننا چاہتا ہو اور رہا رگاہِ حق میں تقرب کا طلبگار ہو، اس کے لیے بغیر اس کے چارہ نہیں کہ ٹھیک ٹھیک نبیؐ کی سنت پر چلے۔ حتیٰ کہ اگر یک سرِمُو بھی اس خط سے ہٹے گا تو تقرب اور محبوبیت میں اسی انحراف کی حد تک کسر رہ جائے گی۔ اس لیے کہ محبوبیت کے لیے بجز اتباعِ نبیؐ کے اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں، فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

نبیؐ کی امارت اور غیر نبیؐ کی امارت کا فرق

اس بحث کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ نبیؐ کی امارت اور دوسرے امیروں کی امارت میں کیا فرق ہے اور نبیؐ کے فیصلے اور دوسرے قاضیوں کے فیصلوں میں کتنا عظیم الشان تفاوت ہے۔ تاہم میں نے تین آیتیں آخر میں ایسی نقل کی ہیں جن سے یہ فرق قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ کے حکم پر سر جھکا دینا اور آپؐ کے فیصلوں کو تسلیم کرنا ایمان کے لیے ضروری شرط ہے۔ جو اس سے انکار کرے وہ مومن ہی نہیں۔ کیا یہ بات کسی دوسرے امیر یا قاضی کو حاصل ہے؟ اگر نہیں تو یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ "اللہ اور رسولؐ کے الفاظ ساتھ ساتھ قرآن میں جہاں جہاں آتے ہیں اُن سے مراد امارت ہے۔" مجھے مولانا اسلم جیراجپوری کے اسی قول پر اعتراض ہے اور میں اس کو قرآن مجید کی تعلیمات کے قطعاً خلاف سمجھتا ہوں۔ اولی الامر کی اطاعت کا معاملہ تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولی الامر کی اطاعت واجب ہے۔ اور اولی الامر اسلامی حکومت کے وہ تمام فرائض انجام دیں گے جو رسولِ اکرمؐ اپنی حیاتِ طیبہ میں انجام دیتے تھے، اور معاملات میں اولی الامر کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوگا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی دانست میں ان کے فیصلہ کو حکم خدا اور رسولؐ کے خلاف بھی سمجھتا ہو تب بھی ایک حد تک اُس کے لیے لازم ہوگا کہ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے اُن کے فیصلوں کو تسلیم کرے۔ لیکن اس کے یہ معنی کبھی نہیں ہو سکتے کہ امارت بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں "اللہ اور رسولؐ" کہا گیا ہے، اور امارت کے احکام بجنسہٖ وہی ہیں جو اللہ اور رسولؐ کے احکام ہیں۔ اگر ایسا

تو اُمراء کے بگڑ جانے اور ارباب حل وعقد کے کتاب وسُنّت سے منحرف ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کے لیے کوئی چارہ اُن کی اطاعت کرنے کے سواء اور ہلاکت کے راستوں میں اُن کی پیروی کرنے کے سوا باقی نہ رہے گا۔
ایسی صورت میں اگر کوئی بندۂ خدا اُٹھے اور رسُولؐ کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کرے تو مولانا اسلم جیراج پوری کے فتوے کی رُو سے تو ظالم اُمراء اس بندۂ خدا کو باغی قرار دے کر قتل کر دینے میں بالکل حق بجانب قرار پائیں گے اور ان کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ "اللہ اور رسُولؐ" تو ہم ہی ہیں، دوسرا کون ہے جس کی طرف تو ہم کو پھیرنا چاہتا ہے؟

فصل ۴

رسولؐ کی حیثیتِ شخصی و حیثیتِ نبوی کا جائزہ

میرے دو مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" اور "اتباع و اطاعتِ رسولؐ"[1] کا عربی ترجمہ دمشق کے رسالہ "المسلمون" میں شائع ہوا تھا۔ اس پر شام کے اہلِ علم حضرات نے مجھ کو توجہ دلائی کہ ان دونوں مضامین میں کچھ تعارض محسوس ہوتا ہے جسے رفع کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز دمشق کے ایک صاحب نے مقدم الذکر مضمون پر حسبِ ذیل اعتراض بھی کیا۔

• کیا محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام باعتبار انسان ہمارے اندر ایک عام فرد کی حیثیت رکھتے ہیں؟ اور باعتبارِ انسان ان کے اندر بھی ایسی ذاتی خواہشات پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر وہ لوگوں پر اپنی ذاتی عظمت کا سکہ جمائیں، اور اپنے شخصی اقتدار کے شکنجے میں جکڑیں؟ اگر یہ صورت ہے تو آپؐ کا بحیثیتِ نبی معصوم ہونا اور بحیثیتِ انسان محفوظ ہونا کیا معنی دارد؟ آپؐ کی اس زندگی کی تفصیلات کیا فائدہ رکھتی ہیں جب کہ آپؐ انسان تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منصبِ رسالت پر سرفراز نہیں فرمایا تھا؟ اور کیا رسولؐ ہونے کے بعد آپؐ کی یہ حیثیتیں حیثیتِ بشری اور حیثیتِ نبوی یکجا ہو گئی ہیں، یا الگ الگ ہیں؟ اور کیا ان دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے؟ تاکہ محمد الرسولؐ کی اطاعت کی جائے اور محمد الانسان کی مخالفت میں ہم آزاد ہوں؟ کیا اس تفریق کے لیے کوئی قاعدۂ کلیہ موجود ہے جس کی روشنی میں ہم آپؐ کے انسانی کلام — جس سے اختلاف کا ہمیں حق ہے — اور نبوی کلام — جو واجب الاطاعت ہے — کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ سکیں؟

کیا نبی کی ذاتی رائے سے اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے؟ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے اندر یہ روح پھونکتے تھے کہ بحیثیتِ انسان ان کی اطاعت واجب نہیں ہے؟ بلکہ اپنی ذاتی رائے سے اختلاف کرنے میں ان کی ہمت افزائی کرتے تھے؟ نیز کیا یہ درست ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی حجت اور دلیل کی بنا پر آپؐ سے بحیثیتِ انسان اختلاف کیا تھا . . . ؟

ذیل کا مضمون انہی اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

[1] "المسلمون" جلد ششم، شمارہ ۶، ۷ اور ۸ میں میرے جو مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" اور "اتباع و

اطاعتِ رسولؐ کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں، ان کے متعلق مجھے توجہ دلائی گئی ہے کہ ان میں تناقض محسوس ہوتا ہے جسے رفع کرنے کی ضرورت ہے یعنی پہلے مضمون میں تو کہا گیا ہے کہ نبیؐ کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی الگ الگ ہیں اور اسلام کی دعوت صرف حیثیتِ نبوی کی اطاعت کی طرف ہے نہ کہ حیثیتِ شخصی کی اطاعت کی طرف۔ لیکن دوسرے مضمون میں اس بات سے انکار کیا گیا ہے کہ نبیؐ کی دو حیثیتیں الگ الگ ہیں اور پورے اصرار کے ساتھ کہا گیا ہے کہ نبیؐ کی ایک ہی حیثیت تھی اور وہ تھی صرف نبیؐ ہونے کی حیثیت۔ ان دونوں باتوں میں توفیق و تطبیق کی کیا صورت ہے؟ علاوہ بریں میرے پہلے مضمون "آزادی کا اسلامی تصور" پر دمشق سے ایک صاحب نے کچھ سوالات کیے ہیں، جو "المسلمون" کے شمارہ ۷ میں درج ہوئے ہیں اور جنہیں اوپر نقل کیا گیا ہے۔

یہ دونوں اعتراضات چونکہ ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ایک ہی مختصر مضمون میں ان کا جواب دے رہا ہوں۔

دراصل اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری، اس اعتبار سے کہ حقیقتِ نفس الامری کیا ہے؟ دوسرے عملی اس لحاظ سے کہ جہاں تک نبیؐ کی ذات سے ہدایت اخذ کرنے کا تعلق ہے، آیا وہ ہمارے لیے پورا کا پورا نبیؐ اور صرف نبیؐ ہی ہے، یا ہم اس شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے صرف اس کی حیثیتِ نبوی کا اتباع اور اسی کی اطاعت کریں گے اور حیثیتِ شخصی کو چھوڑ دیں گے؟

بحث کا نظری پہلو

اب پہلے نظری پہلو کو لیجیے۔ قرآن مجید اس معاملہ میں بالکل واضح ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی میں فرق ہے۔ وہ انسانوں کو اپنا بندہ بنانے کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بنانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ "کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو۔" (آل عمران آیت ۷۹)۔ ان کے سپرد دو فریضے ایک ساتھ کیے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ لوگوں کو ہر غیر اللہ کی بندگی سے نکالیں جس میں دوسری سب مخلوقات کے ساتھ ان کی اپنی ذات بھی شامل تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کو صرف ایک اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔ (النحل: ۳۶)	ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا (یہ پیغام دے کر) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے الگ رہو۔
قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ	اے نبیؐ کہو کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے

بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (آل عمران: ۶۴) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب بنائے۔

دین میں ان کی بے چون وچرا اطاعت کا جو حکم دیا گیا ہے وہ ان کے ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس بنا پر تھا کہ رسولؐ ہی وہ شخص ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنی مرضی ظاہر فرماتا اور اپنے احکام بھیجتا ہے۔ اسی وجہ سے رسولؐ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت قرار دی گئی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء: ۶۴) "ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے" اور مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی" (النساء: ۸۰)۔

اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قرآن اور بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی رائے سے کی یا کہی ہے اس میں بے چون وچرا اطاعت کا وہ مطالبہ آپ نے کبھی نہیں کیا جو امر الٰہی کے تحت کوئی کام کرنے یا کوئی بات کہنے کی صورت میں کیا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں میں نے اپنے مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" میں پیش کی ہیں۔ خصوصاً حضرت زیدؓ کا حضورؐ کے منع فرمانے کے باوجود سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینا اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا ان پر کوئی نکیر نہ کرنا تو اس کی صریح مثال ہے جس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی جو میں نے اس مضمون میں کی ہے۔ اور تابیر نخل والے معاملے میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے کو بالفاظ صریح فرما چکے ہیں:-

انما انا بشر اذا امرتکم بشیء من دینکم فخذوا به واذا امرتکم بشیء من رائی فانما انا بشر ــــ انما ظننت ظنًّا فلا تؤاخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم من الله شیئًا فخذوا به فانی لم اکذب علی الله ــــ انتم اعلم بامور دنیاکم (صحیح مسلم باب امتثال ما قاله شرعًا دون ما ذکره صلی الله علیه وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرای)

میں بھی ایک انسان ہی ہوں، جب میں تم کو تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے مانو اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں، تو بس میں بھی ایک انسان ہی ہوں ــــ میں نے اندازہ سے ایک بات کہی تھی تم میری ان باتوں کو نہ لو جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں ہاں جب میں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اس کو لے لو۔ اس لیے کہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا ــــ تمہیں اپنے دنیوی معاملات کا زیادہ علم ہے۔

یہ تو ہے نظری اور اصولی فرق۔ اب اس کے عملی پہلو کو لیجیے۔

بحث کا عملی پہلو

دراصل یہ ایک نازک اور پیچیدہ معاملہ تھا کہ ایک بشر کو اللہ تعالیٰ اپنا واحد نمائندہ بنا کر انسانوں کے درمیان اس دوہری خدمت پر مامور فرمائے کہ ایک طرف تو وہ بشر اپنے ابنائے نوع کو اپنی شخصیت سمیت تمام مخلوقات کی بندگی سے آزاد کردے اور خود اس آزادی کی انہیں تربیت دے، اور دوسری طرف وہی بشر ان سے اللہ کی مکمل، بے چون وچرا اطاعت کرائے، اور اس اطاعت کا مرجع بھی تمام عملی اغراض کے لیے اس بشر کی اپنی ہی ذات من حیث الرسول ہو۔ یہ دو متضاد کام ایک ہی شخص کو بیک وقت کرنے تھے اور ان کے حدود ایک دوسرے کے ساتھ اتنے گتھے ہوئے تھے کہ خود اللہ اور اس کے رسولؐ کے سوا کوئی دوسرا ان کے درمیان خطِ امتیاز نہ کھینچ سکتا تھا۔

اس معاملہ کی نزاکت اور پیچیدگی اور بڑھ جاتی ہے جب ہم تین باتوں پر غور کرتے ہیں:

اوّل یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت احکامِ الٰہی کے تحت اپنی اطاعت کراتے تھے اُس وقت تو ظاہر ہی ہے کہ آپؐ ایک وظیفۂ رسالت انجام دیتے تھے۔ مگر جس وقت آپؐ اپنے انتہائی اطاعت گزار متبعین کو خود اپنی ذات کی ذہنی غلامی سے آزاد کرکے حریتِ فکر ورائے کی تربیت دیتے تھے، جب آپؐ اپنی شخصی آراء کے مقابلے میں جرأت دلا کر تمام انسانوں کو خود اپنے سامنے استقلالِ فکر برتنا سکھاتے تھے کہ یہاں تم آزاد ہو اور یہاں تمہارے لیے سمع و اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اس وقت بھی آپؐ دراصل وظیفۂ رسالت ہی کا ایک حصہ ادا فرماتے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے لیے آپ کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی کے فرق کو سمجھنا اور عملاً دونوں حیثیتوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے اس طرح ملی جلی نظر آتی ہیں کہ ان کے درمیان صرف نظری فرق رہ جاتا ہے۔ عملاً اپنی شخصی حیثیت میں بھی کام کرتے وقت آپؐ نبوت ہی کا ایک کام کرتے پائے جاتے ہیں۔

ثانیاً، جو معاملات بظاہر بالکل شخصی معاملات ہیں، مثلاً ایک انسان کا کھانا پینا، کپڑے پہننا، نکاح کرنا، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، گھر کا کام کاج کرنا، غسل وطہارت اور رفعِ حاجت وغیرہ، وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں خالص نجی نوعیت کے معاملات نہیں ہیں، بلکہ انہی میں شرعی حدود اور طریقوں اور آداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ شامل ہے۔ اور آدمی کے لیے خود یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان میں کہاں حیثیتِ رسالت ختم ہوتی ہے اور کہاں حیثیتِ شخصی شروع ہو جاتی ہے۔

ثالثاً، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ نبیؐ کی ذات بحیثیتِ مجموعی ایک اسوہ ہے جس کا ہر پہلو اور ہر رُخ ہمیں ہدایت کی روشنی دیتا ہے، اور اس ذات کا کوئی فعل اور قول بھی ہوائے نفس یا ضلالت وغوایت سے ذرہ برابر بھی

آلودہ نہیں ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (الاحزاب: ۲۱)

تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں بہترین اُسوہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔ (الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

اے نبیؐ ہم نے تمہیں (لوگوں کے لیے) گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور اس کے اِذن سے اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنایا ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ (النجم: ۲، ۳، ۴)

تمہارا صاحب (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بدراہ ہُوا نہ گمراہ ہُوا۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا۔ اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

اِن وجوہ سے نہ تو عملاً ہمارے لیے یہ ممکن ہے اور نہ شرعاً ہم اس کے مجاز ہیں کہ بطورِ خود نبیؐ کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی میں فرق کریں، اور آپ ہی آپ اُس کے حدُود متعین کر لیں، اور خود ہی یہ بھی طے کر لیں کہ فلاں اُمور آپ کی حیثیتِ نبوی کے تحت تھے جن میں ہم آپؐ کی اطاعت کریں گے اور فلاں شخصی حیثیت میں تھے جن میں ہم آپؐ کے اتباع اور اطاعت سے آزاد ہیں۔ اِس فرق کے معلوم ہونے کا ذریعہ یا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تصریح ہو سکتی ہے، یا پھر وہ اصولِ شریعت جو آپؐ ہی کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوں۔

چند قابلِ غور مثالیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ صحابۂ کرام اپنی ذاتی رائے ظاہر کرنے سے پہلے آپؐ سے دریافت کر لیتے تھے کہ آپؐ کا ارشاد یا عمل حکمِ الٰہی کی بنا پر ہے یا اپنی ذاتی رائے پر۔ اور جب معلوم ہو جاتا کہ یہ آپؐ کی ذاتی رائے ہے تب وہ اپنی بات عرض کرتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں حضرت حُبَابؓ بن المُنذر نے اپنی رائے پیش کرنے سے پہلے پوچھ لیا تھا کہ اِس مقام کا انتخاب وحی کے ذریعے سے کیا گیا ہے جس سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے، یا یہ محض ایک تدبیرِ جنگ کے طور پر ہے؟ اِسی طرح غزوۂ خندق میں حضرت سعد بن مُعاذؓ نے بنی غطفان سے صلح کی تدبیر پر اظہارِ رائے کرنے سے پہلے دریافت کر لیا "اے اللہ کے رسولؐ! کیا یہ ارادہ وحی کی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ اس میں ہمارے لیے مجالِ کلام نہیں ہے، یا حضورؐ صرف اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں؟"

اور بعض اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی یہ ظاہر فرما دیتے کہ فلاں بات آپ اللہ کی طرف سے ایک حکم دین کے طور پر نہیں فرما رہے ہیں، بلکہ اپنی شخصی رائے ظاہر فرما رہے ہیں، جیسا کہ اوپر تابیر نخل کے معاملہ میں حضورؐ کے ارشادات گزر چکے ہیں۔

اور بعض اوقات معاملہ کی نوعیت ہی ایسی ہوتی تھی جس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حضورؐ کا ارشاد اپنی شخصی حیثیت میں ہے۔ مثلاً حضرت زیدؓ سے آپؐ کا فرمانا کہ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ "اپنی بیوی کو طلاق نہ دو اور اللہ سے ڈرو"۔ اس ارشاد کے متعلق یہ بات ظاہر تھی کہ یہ ایک مومن کو نبی کا حکم شرعی نہ تھا بلکہ ایک خاندان کے فرد کو بزرگ خاندان کا مشورہ تھا۔ اسی وجہ سے حضرت زیدؓ نے حضورؐ کے ارشاد کے باوجود حضرت زینبؓ کو طلاق دی اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے اُن پر کوئی نکیر نہ کرنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت زیدؓ نے آپؐ کے فرمان کی نوعیت ٹھیک مشخص کی تھی۔

دَورِ مابعد میں حیثیتِ نبویہ کے تعیُّن کی صورت

یہ تو وہ مثالیں ہیں جو حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں پیش آئی تھیں۔ ان کے علاوہ متعدد معاملات ایسے ہیں جن میں اب بھی اصولِ شریعت کی روشنی میں اس فرق کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کے لباس اور آپؐ کے کھانے کے معاملہ کو دیکھیے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آپؐ خاص وضع اور قطع کا لباس پہنتے تھے جو عرب میں اُس وقت پہنا جاتا تھا اور جس کے انتخاب میں آپؐ کے شخصی ذوق کا دخل بھی تھا۔ اسی طرح آپؐ وہی کھانے کھاتے تھے جیسے آپؐ کے عہد میں اہلِ عرب کے گھروں میں پکتے تھے اور اُن کے انتخاب میں آپؐ کے اپنے ذوق کا بھی دخل ہوتا تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس کھانے اور پہننے میں آپؐ اپنے عمل اور قول سے شریعت کے حُدود اور اسلامی آداب کی تعلیم دیتے تھے۔ اب یہ بات خود حضورؐ ہی کے سکھائے ہوئے اصولِ شریعت سے ہم کو معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے پہلی چیز آپؐ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری چیز حیثیتِ نبویہ سے۔ اس لیے کہ شریعت نے جس کی تعلیم دینے کے لیے آپؐ اللہ کی طرف سے مامور کیے گئے تھے، انسانی زندگی کے اس معاملہ کو اپنے دائرہ میں نہیں لیا ہے کہ لوگ اپنے لباس کس تراش خراش اور وضع قطع پر سلوائیں اور اپنے کھانے کس طرح پکائیں، البتہ اس نے یہ چیز اپنے دائرۂ عمل میں لی ہے کہ کھانے اور پہننے کے معاملے میں حرام اور حلال، جائز اور ناجائز کے حُدود معیّن کرے اور لوگوں کو ان آداب کی تعلیم دے جو اہلِ ایمان کے اخلاق و تہذیب سے مناسبت رکھتے ہیں۔

یہ فرق ہم کو حضورؐ کی کسی تصریح سے معلوم ہو یا آپؐ کے سکھائے ہوئے اصولِ شریعت سے، بہرحال اس کے علم کا ذریعہ نبی کی تعلیم ہی ہے۔ گویا ہم آپؐ کی حیثیتِ شخصیہ کے کام کو متعین کرنے کے لیے بھی آپؐ ہی کی حیثیتِ نبویہ کی طرف رجوع کریں گے۔ حیثیتِ شخصیہ سے براہِ راست ہمارا کوئی معاملہ نہیں ہے جو آپؐ کی حیثیتِ نبویہ کو نظر انداز کر کے

ہم کر سکتے ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس پر میں نے اپنے دوسرے مضمون "اتباع و اطاعت رسولؐ" میں منکرین سنت کو متنبہ کیا ہے۔ ان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ محمد بن عبداللہ باعتبار رسولؐ اور محمدؐ بن عبداللہ باعتبار انسان میں خود تفریق کر کے ان دونوں حیثیتوں کے کاموں میں ایک خط امتیاز کھینچ دیتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے جس دائرے کو وہ خود آپ کی حیثیت رسالت سے الگ سمجھ بیٹھے ہیں اس کے اتباع و اطاعت سے خود ہی انہوں نے آزادی اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی اور نبوی حیثیتوں میں حقیقت کے اعتبار سے جو فرق بھی ہے وہ عنداللہ اور عندالرسول ہے۔ اور ہمیں اس سے صرف اس لیے آگاہ کیا گیا ہے کہ ہم کہیں عقیدے کی گمراہی میں مبتلا ہو کر محمدؐ بن عبداللہ کو اللہ کے بجائے مطاع حقیقی نہ سمجھ بیٹھیں۔ لیکن امت کے لیے تو عملاً آپ کی ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے رسول ہونے کی حیثیت حتیٰ کہ محمدؐ بن عبداللہ کے مقابلے میں اگر ہم کو آزادی حاصل بھی ہوتی ہے تو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کرنے سے ہوتی ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کے حدود متعین کرتے ہیں اور اس آزادی کے استعمال کی تربیت بھی ہم کو رسول اللہؐ ہی نے دی ہے۔

ان توضیحات کے بعد اگر میرے دونوں مضمونوں کو ملاحظہ کیا جائے تو کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہ سکتی۔ ۱۹۵

فصل ۵

منصبِ نبوّت اور اُس کے فرائض ازروئے قرآن ؎

رسول ﷺ کے چار شعبہائے کار

اس کتاب پاک میں چار مقامات پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے:

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ ... رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔
(البقرہ: ۱۲۹)

اور یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو انہوں نے دعا کی) اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔
(البقرہ: ۱۵۱)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (آل عمران: ۱۶۴)

اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اُس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے

؎ یہ مضمون منکرین حدیث کے اعتراضات و شبہات کو رفع کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ (ترجمان)

هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ۔ (الجمعہ ۲)

وہی ہے جس نے اُمیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسُول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سُناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں بار بار جس بات کو تاکید دُہرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُولؐ کو صرف آیاتِ قرآن ہی سُنا دینے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین مقصد اور بھی تھے۔

ایک یہ کہ آپؐ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں۔

دوسرے یہ کہ اُس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں

اور تیسرے یہ کہ آپؐ افراد کا بھی اور اُن کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں کو دُور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہترین نظامِ اجتماعی کو نشوونما دیں

ظاہر ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم صرف قرآن کے الفاظ سُنا دینے سے زائد ہی کوئی چیز تھی ورنہ اس کا الگ ذکر بے معنی تھا۔ اسی طرح افراد اور معاشرے کی تربیت کے لیے آپؐ جو تدابیر بھی اختیار فرماتے تھے وہ بھی قرآن کے الفاظ پڑھ کر سُنا دینے سے زائد ہی کچھ تھیں، ورنہ تربیت کی الگ خدمت کا ذکر کرنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اب فرمائیے کہ قرآن پہنچانے کے علاوہ یہ معلّم اور مربّی کے مناصب جو حضورؐ کو حاصل تھے اُن پر آپؐ خود فائز ہو بیٹھے تھے یا اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان پر مامور فرمایا تھا؟ کیا قرآن کی ان صاف اور مکرّر تصریحات کے بعد اس کتاب پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ دونوں مناصب رسالت کے اجزاء نہ تھے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ان مناصب کے فرائض اور خدمات بحیثیت رسُولؐ نہیں بلکہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں انجام دیتے تھے؟ اگر نہیں کہہ سکتا تو بتایئے کہ قرآن کے الفاظ سُنانے سے زائد جو باتیں حضورؐ نے تعلیمِ کتاب و حکمت کے سلسلے میں فرمائیں اور اپنے قول و عمل سے افراد اور معاشرہ کی جو تربیت حضورؐ نے کی اسے من جانب اللہ ماننے اور سند تسلیم کرنے سے انکار خود رسالت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

رسُولؐ بحیثیتِ شارحِ کتاب اللہ

سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (آیت ۴۴)

اور (اُسے نبیؐ) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اُس تعلیم کو جو اُن کی طرف اُتاری گئی ہے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی کہ قرآن میں خدا تعالیٰ جو احکام و ہدایات دے اُن کی آپؐ توضیح و تشریح فرمائیں۔ ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ سکتا ہے کہ کسی بات کی تشریح اور توضیح محض اُس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہوتی بلکہ تشریح کرنے والا اُس کے الفاظ سے زائد کچھ کہتا ہے تاکہ سُننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے، اور اگر کتاب کی کوئی بات کسی عملی مسئلے سے متعلق ہو تو شارح عملی مظاہرہ (Practical Demonstration) کر کے بتاتا ہے کہ مصنف کا منشا اس طرح عمل کرنا ہے۔ یہ نہ ہو تو کتاب کے الفاظ کا مطلب و مدعا پوچھنے والے کو پھر کتاب ہی کے الفاظ سُنا دینا کسی طفلِ مکتب کے نزدیک بھی تشریح و توضیح قرار نہیں پا سکتا۔ اب فرمائیے کہ اس آیت کی رُو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح اپنی ذاتی حیثیت میں تھے یا خدا نے آپؐ کو شارح مقرر کیا تھا؟ اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ہی یہ بیان کر رہا ہے کہ رسولؐ اپنے قول اور عمل سے اس کا مطلب واضح کرے پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ شارح قرآن کی حیثیت سے آپؐ کے منصب کو رسالت کے منصب سے الگ قرار دیا جائے؟ اور آپؐ کے پہچانتے ہوئے قرآن کو لے کر آپؐ کی شرح و تفسیر قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ انکار خود رسالت کا انکار نہ ہوگا؟

یہ آیت جس طرح ان منکرینِ نبوت کی حجت کے لیے قاطع تھی جو خدا کا ذکر بشر کے ذریعہ سے آنے کو نہیں مانتے تھے اُسی طرح آج یہ اُن منکرینِ حدیث کی حجت کے لیے بھی قاطع ہے جو نبیؐ کی تشریح و توضیح کے بغیر صرف "ذکر" کو لے لینا چاہتے ہیں۔ وہ خواہ اس بات کے قائل ہوں کہ نبیؐ نے تشریح و توضیح کچھ بھی نہیں کی تھی صرف "ذکر" پیش کر دیا تھا، یا اس کے قائل ہوں کہ ماننے کے لائق صرف "ذکر" ہے نہ کہ نبیؐ کی تشریح، یا اس کے قائل ہوں کہ اب ہمارے لیے صرف ذکر کافی ہے، نبیؐ کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں، یا اس بات کے قائل ہوں کہ اب صرف ذکر ہی قابلِ اعتماد حالت میں باقی رہ گیا ہے نبیؐ کی تشریح یا تو باقی ہی نہیں رہی یا باقی ہے بھی تو بھروسے کے لائق نہیں ہے، غرض اِن چاروں باتوں میں سے جس بات کے بھی وہ قائل ہوں اُن کا مسلک بہرحال قرآن کی اس آیت سے ٹکراتا ہے۔

اگر وہ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبیؐ نے اس منشا ہی کو فوت کر دیا جس کی خاطر ذکر کو فرشتوں کے ہاتھ بھیجنے یا براہِ راست لوگوں تک پہنچا دینے کے بجائے آپؐ کو واسطۂ تبلیغ بنایا گیا تھا۔

اور اگر وہ چوتھی بات کے قائل ہیں تو دراصل یہ قرآن اور نبوّتِ محمدیؐ، دونوں کے نسخ کا اعلان ہے جس کے بعد اگر کوئی مسلکِ معقول باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف اُن لوگوں کا مسلک ہے جو ایک نئی نبوّت اور نئی وحی کے قائل ہیں۔ اس لیے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ خود قرآن مجید کے مقصدِ نزول کی تکمیل کے لیے نبیؐ کی تشریح کو ناگزیر ٹھیرا رہا ہے اور نبیؐ کی ضرورت ہی اس طرح ثابت کر رہا ہے کہ وہ ذکر کے منشا کی توضیح کرے۔ اب اگر منکرینِ حدیث کا یہ

قول صحیح ہے کہ نبی کی توضیح و تشریح دنیا میں باقی نہیں رہی ہے تو اس کے دو نتیجے نکلتے ہوئے ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ کہ نمونۂ اتباع کی حیثیت سے نبوتِ محمدی ختم ہو گئی اور ہمارا تعلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اُس طرح کا رہ گیا ہے جیسا ہُود اور صالح اور شعیب علیہم السلام کے ساتھ ہے کہ ہم ان کی تصدیق تو کرتے ہیں، اُن پر ایمان بھی لاتے ہیں مگر اُن کا کوئی اُسوہ ہمارے پاس نہیں ہے جس کا ہم اتباع کریں۔ یہ چیز نئی نبوت کی ضرورت آپ سے آپ پیدا کر دیتی ہے۔ صرف ایک بے وقوف ہی اس کے بعد ختمِ نبوت پر اصرار کر سکتا ہے۔

دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اکیلا قرآن چونکہ نبی کی تشریح و تبیین کے بغیر خود اپنے بھیجنے والے کے قول کے مطابق ہدایت کے لیے ناکافی ہے، اس لیے قرآن کے ماننے والے خواہ کتنے ہی زور سے چیخ چیخ کر اسے بجائے خود کافی قرار دیں، تاہم شکست کی حمایت میں گرانِ حجیت کی بات ہرگز نہیں چل سکتی اور ایک نئی کتاب کے نزول کی ضرورت آپ سے آپ خود قرآن کی رُو سے ثابت ہو جاتی ہے۔ قاتلہم اللہ! اس طرح یہ لوگ حقیقت میں انکارِ حدیث کے ذریعے دین کی جڑ کھود رہے ہیں۔

رسولؐ بحیثیت پیشوا اور نمونۂ تقلید

سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔۔۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۔ (آیات ۳۱-۳۲)

(اے نبیؐ) کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا ۔۔۔ کہو کہ اطاعت کرو اللہ اور رسولؐ کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اور سورۂ احزاب میں فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ (آیت ۲۱)

تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک نمونۂ تقلید ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کا امیدوار ہو۔

ان دونوں آیتوں میں خود اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو پیشوا مقرر کر رہا ہے، اُن کی پیروی کا حکم دے رہا ہے، ان کی زندگی کو نمونۂ تقلید قرار دے رہا ہے، اور صاف فرما رہا ہے کہ یہ روش اختیار نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو۔ میری محبت اس کے بغیر تمہیں حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ اس سے منہ موڑنا کفر ہے۔ اب فرمائیے کہ حضورؐ رہنما اور لیڈر خود بن بیٹھے تھے؟ یا مسلمانوں نے آپؐ کو منتخب کیا تھا؟ یا اللہ نے اس منصب پر آپؐ کو مامور کیا تھا؟ اگر قرآن کے یہ الفاظ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے آنحضورؐ کو مامور من اللہ رہنما و پیشوا قرار دے رہے ہیں تو پھر آپؐ کی پیروی اور آپؐ کے نمونۂ زندگی کی تقلید سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہنا سراسر لغو ہے کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے۔

اگر یہ مراد ہوتی تو فَاتَّبِعُوا الْقُرْآنَ فرمایا جاتا نہ کہ فَاتَّبِعُونِي۔ اور اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اسوۂ حسنہ کہنے کے تو کوئی معنی ہی نہیں تھے۔

رسولؐ بحیثیت شارع

سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ (آیت: ۱۵۷)

وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے ان کو روکتا ہے اور ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتار دیتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔

اس آیت کے الفاظ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریعی اختیارات (Legislative Powers) عطا کیے ہیں۔ اللہ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے وہ بھی اللہ کے دیئے ہوتے اختیارات سے ہے، اس لیے وہ بھی قانونِ خداوندی کا ایک حصہ ہے یہی بات سورۂ حشر میں اسی صراحت کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۔ (آیت: ۷)

جو کچھ رسولؐ تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کر دے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سے کسی کی یہ تاویل نہیں کی جا سکتی کہ ان میں قرآن کے امر و نہی اور قرآن کی تحلیل و تحریم کا ذکر ہے یہ تاویل نہیں بلکہ اللہ کے کلام میں ترمیم ہو گی۔ اللہ نے تو یہاں امر و نہی اور تحلیل و تحریم کو رسولؐ کا فعل قرار دیا ہے نہ کہ قرآن کا۔ پھر کیا کوئی شخص اللہ میاں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ سے بیان میں غلطی ہو گئی، آپ بھولے سے قرآن کے بجائے رسولؐ کا نام لے گئے؟

رسولؐ بحیثیت قاضی:

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر اللہ تعالیٰ اس امر کی تصریح فرماتا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قاضی مقرر کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ (النساء: ۱۰۵)

(اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی

روشنی میں فیصلہ کرو۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ۔ (الشوریٰ:۱۵)

اور ان سے کہو کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ (النور:۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جائیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسولؐ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا۔ (النساء:۶۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی طرف اور رسولؐ کی طرف تو تم دیکھتے ہو منافقوں کو کہ وہ تم سے کنی کتراتے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء:۶۵)

پس (اے نبیؐ) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تو کرے اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں بلکہ اسے بسروچشم قبول کر لیں۔

یہ تمام آیتیں اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ساختہ، یا مسلمانوں کے مقرر کیے ہوئے جج نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے جج تھے۔ تیسری آیت بتا رہی ہے کہ آپؐ کی جج ہونے کی حیثیت رسالت کی حیثیت سے الگ نہیں تھی بلکہ رسول ہی کی حیثیت میں آپ جج بھی تھے، اور ایک مومن کا ایمان بالرسالت اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپؐ کی اس حیثیت کے آگے بھی سمع و طاعت کا رویہ نہ اختیار کرے۔ چوتھی آیت میں ما انزل اللہ (قرآن) اور رسول دونوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ حاصل کرنے کے لیے دو مستقل مرجع ہیں، ایک قرآن قانون کی حیثیت سے، دوسرے رسولؐ جج کی حیثیت سے، اور ان دونوں سے منہ موڑنا منافق کا کام ہے نہ کہ مومن کا۔ آخری آیت میں بالکل بے لاگ طریقے سے کہہ دیا گیا ہے کہ رسولؐ کو جو شخص جج کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا وہ مومن ہی نہیں ہے حتیٰ کہ اگر رسولؐ کے دیئے ہوئے فیصلے پر کوئی شخص اپنے دل میں بھی تنگی محسوس کرے تو اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ کیا قرآن کی ان تصریحات کے بعد بھی کوئی صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضورؐ رسول کی حیثیت سے قاضی نہ تھے بلکہ دنیا کے عام ججوں اور مجسٹریٹوں کی طرح

آپ بھی ایک جج یا مجسٹریٹ تھے اس لیے اُن کے فیصلوں کی طرح حضورؐ کے فیصلے بھی ماخذِ قانون نہیں بن سکتے؟ کیا دنیا کے کسی جج کی یہ حیثیت ہو سکتی ہے کہ اس کا فیصلہ اگر کوئی نہ مانے یا اس پر تنقید کرے یا اپنے دل میں بھی اُسے غلط سمجھے تو اس کا ایمان سلب ہو جائے؟

رسولؐ بحیثیتِ حاکم و فرمانروا

قرآن مجید اسی صراحت اور تکرار کے ساتھ بکثرت مقامات پر یہ بات بھی کہتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حاکم و فرمانروا تھے اور آپؐ کو یہ منصب بھی رسول ہی کی حیثیت سے عطا ہوا تھا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن (Sanction) سے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء۔ ۸۰)

جو رسولؐ کی اطاعت کرے اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح۔ ۱۰)

(اے نبیؐ) یقیناً جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ۔ (محمد۔ ۳۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کر لو۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب۔ ۳۶)

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسولؐ کر دے تو پھر ان کے لیے اپنے اُس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کر لینے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (النساء: ۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اس کو پھیر دو اللہ اور رسولؐ کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روزِ آخر پر۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ رسولؐ کوئی ایسا حاکم نہیں ہے جو خود اپنی قائم کردہ ریاست کا سربراہ بن بیٹھا ہو یا جسے لوگوں نے منتخب کر کے سربراہ بنایا ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا ہوا فرمانروا ہے۔ اس کی فرمانروائی

اس کے منصبِ رسالت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا رسول ہونا ہی اللہ کی طرف سے اُس کا حاکم مُطاع ہونا ہے۔ اس کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ اس سے بیعت دراصل اللہ سے بیعت ہے۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی کے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو۔ اُس کے مقابلے میں اہل ایمان کو جن میں ظاہر ہے کہ پوری اُمت اور اُس کے حکمران اور اس کے "مرکزِ ملت" سب شامل ہیں، قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جس معاملہ کا فیصلہ وہ کر چکا ہو اس میں وہ خود کوئی فیصلہ کریں۔

ان تمام تصریحات سے بڑھ کر صاف اور قطعی تصریح آخری آیت کرتی ہے جس میں یکے بعد دیگرے تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے:

سب سے پہلے اللہ کی اطاعت۔

اس کے بعد رسولؐ کی اطاعت۔

پھر تیسرے درجے میں اولی الامر (یعنی آپ کے "مرکزِ ملت") کی اطاعت۔

اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسولؐ اولی الامر میں شامل نہیں ہے بلکہ ان سے الگ اور بالاتر ہے اور اس کا درجہ خدا کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ اولی الامر سے نزاع ہو سکتی ہے مگر رسولؐ سے نزاع نہیں ہو سکتی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نزاعات میں فیصلے کے لیے مرجع دو ہیں، ایک اللہ اور دوسرا اس کے بعد اللہ کا رسولؐ۔ ظاہر ہے کہ اگر مرجع صرف اللہ ہوتا تو صراحت کے ساتھ رسولؐ کا ذکر محض بے معنی ہوتا۔ پھر جبکہ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، تو رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ عہدِ رسالت میں خود ذاتِ رسولؐ کی طرف اور اس عہد کے بعد سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے۔

بلکہ اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود عہدِ رسالت میں بھی بہت بڑی حد تک سنتِ رسولؐ ہی مرجع تھی۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں اسلامی حکومت پورے جزیرۂ عرب پر پھیلی ہوئی تھی، جس بارہ لاکھ مربع میل کے اس وسیع و عریض ملک میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہر معاملہ کا فیصلہ براہِ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرایا جائے۔ لامحالہ اُس زمانے میں بھی اسلامی حکومت کے گورنروں، قاضیوں اور دوسرے حکام کو معاملات کے فیصلے کرنے میں قرآن کے بعد جس دوسرے ماخذِ قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا تھا وہ سنتِ رسولؐ ہی تھی۔ ؁۱۸

عدلیہ کا طریقِ کار حضورؐ کے عہدِ مبارک میں

حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں جو معاملات براہِ راست آپؐ تک پہنچتے تھے ان میں تو اللہ اور رسولؐ کا منشا بتانے والے اور اس کے مطابق نزاعات کا فیصلہ کرنے والے آپؐ خود تھے لیکن ظاہر بات ہے کہ پوری مملکتِ اسلامیہ میں پھیلی ہوئی

آبادی کو جو معاملات پیش آتے تھے وہ سب کے سب براہِ راست حضورؐ ہی تک پہنچائے جاتے تھے، اور نہ آپؐ ہی سے شخصاً ان کا فیصلہ حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کے بجائے مملکت کے مختلف علاقوں میں آپؐ کی طرف سے معلّمین مامور تھے جو لوگوں کو دین سکھاتے تھے اور عام لوگ اپنے روزمرہ کے معاملات میں انہی سے معلوم کرتے تھے کہ کتاب اللہ کا حکم کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طریقے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے علاوہ ہر علاقے میں امیر، عامل اور قاضی مقرر تھے جو اپنے اپنے حلقۂ عمل سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر معاملات کے فیصلے خود کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے فَرُدُّوْهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُوْلِ کا منشا پورا کرنے کا جو طریقہ حضورؐ نے خود پسند فرمایا تھا وہ حضرت معاذ بن جبل کی مشہور حدیث میں بیان ہوا ہے:

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم بعث معاذاً الی الیمن فقال کیف تقضی؟ قال اقضی بما فی کتاب الله۔ قال فان لم یکن فی کتاب الله؟ قال فبسنة رسول الله۔ قال فان لم یکن فی سنة رسول الله؟ قال اجتهد برائی۔ قال الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله۔

(ترمذی، ابواب الاحکام۔ ابوداؤد، کتاب الاقضیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو یمن کی طرف قاضی بنا کر روانہ کیا تو ان سے پوچھا "تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟" انہوں نے عرض کیا اس ہدایت کے مطابق جو اللہ کی کتاب میں ہے۔ فرمایا اگر اللہ کی کتاب میں نہ ملے؟ عرض کیا پھر سنتِ رسول اللہ میں جو۔ فرمایا اگر سنتِ رسولؐ میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا میں اپنی رائے سے حق رسی تک پہنچنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے رسول اللہ کے فرستادہ شخص کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔ ۱۰

اسلامی نظام کی دستوری بنیادیں اور ان میں رسول کی حیثیت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔

(النساء: ۵۹)

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اوّلین دفعہ ہے۔ اس میں حسبِ ذیل اصول مستقل طور پر قائم کر دیئے گئے ہیں:

(۱) اسلامی نظام میں اصل مُطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندۂ خدا ہے، باقی جو کچھ بھی ہے اس کے بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی، اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام، دونوں کا مرکز و محور خدا کی فرمانبرداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اُس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی مدِّمقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور اس کی تابع ہوں۔ ورنہ ہر وہ حلقۂ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت کا حریف ہو۔ یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ "خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے۔"

(۲) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسولؐ کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے بلکہ اطاعتِ خدا کی واحد عملی صورت ہے۔ رسولؐ اس لیے مُطاع ہے کہ وہی ایک مستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف اسی طریقہ سے کرسکتے ہیں کہ رسولؐ کی اطاعت کریں۔ کوئی اطاعتِ خدا رسولؐ کی سند کے بغیر معتبر نہیں ہے اور رسولؐ کی پیروی سے منہ موڑنا خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ اسی مضمون کو یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللَّهَ "جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔" اور یہی بات خود قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ آگے آرہی ہے۔

(۳) مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ اُن "اولی الامر" کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ "اولی الامر" کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں، خواہ وہ ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں، یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، یا ملکی انتظام کرنے والے حکام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا تمدنی و معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحبِ امر ہے وہ اس حیثیت میں اطاعت کا مستحق ہے، اور اس سے نزاع کرکے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے، بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو اور خدا و رسولؐ کا مطیع ہو۔ یہ دونوں شرطیں اس اطاعت کے لیے لازمی شرط ہیں، اور یہ نہ صرف آیتِ مذکورہ صدر میں صاف طور پر درج ہیں، بلکہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ مثلاً حسب ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:

السمع والطاعة على المرء المسلم فيما أحب وكره ما لم يؤمر بمعصية فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة۔

مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند، تاوقتیکہ اُسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اور جب اسے معصیت

(بخاری و مسلم)

کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سننا چاہیے اور نہ ماننا چاہیے۔

لا طاعة فی معصیة۔ انما الطاعة فی المعروف۔ (بخاری و مسلم)

خدا اور رسولؐ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے "معروف" میں ہے۔

یکون علیکم امراء تعرفون وتنکرون فمن انکر فقد برئ ومن کرہ فقد سلم ولکن من رضی وتابع۔ فقالوا افلا نقاتلهم؟ قال لا ما صلوا۔ (مسلم)

حضورؐ نے فرمایا تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضی کیا وہ بری الذمہ ہوا۔ اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا پھر جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔

یعنی ترکِ نماز وہ علامت ہوگی جس سے صریح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعتِ خدا و رسولؐ سے باہر ہو گئے ہیں اور پھر اُن کے خلاف سعی و جہد کرنا درست ہوگا۔

شرار ائمتکم الذین تبغضونهم و یبغضونکم وتلعنونهم ویلعنونکم۔ قلنا یا رسول اللہ افلا ننابذهم عند ذالک؟ قال لا ما اقاموا فیکم الصلوٰة، لا ما اقاموا فیکم الصلوٰة۔ (مسلم)

حضورؐ نے فرمایا تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمہارے لیے مبغوض ہوں اور تم ان کے لیے مبغوض ہو۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان کے مقابلہ پر نہ اٹھیں؟ فرمایا نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔

اس حدیث میں اوپر والی شرط کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ اوپر کی حدیث سے گمان ہو سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد دراصل مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے۔ یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابندِ نماز ہوں، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظامِ حکومت چل رہا ہو وہ کم از کم اقامتِ صلوٰۃ کا انتظام کرے۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اصولی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے۔ ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اسے "اُلٹ پھینکنے" کی سعی مسلمانوں کے لیے جائز ہو جائے گی۔ اسی بات کو ایک اور روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے منجملہ اور باتوں کے ایک

اس امر کا عہد بھی لیا کہ أن لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان، یعنی یہ کہ ہم اپنے سربراہوں اور حکام سے نزاع نہ کریں گے، اِلا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں اُن کے خلاف ہمارے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے دلیل موجود ہو۔" (بخاری و مسلم)

(۴) چوتھی بات جو آیت زیر بحث میں ایک مستقل اور قطعی اصول کے طور پر طے کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسولؐ کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند (Final Authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان، یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہوگی اس میں فیصلہ کے لیے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب سر تسلیم خم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائل زندگی میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کو سند اور مرجع اور حرف آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام زندگی سے ممیز کرتی ہے۔ جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ تمام مسائل زندگی کے فیصلہ کے لیے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی طرف کیسے رجوع کیا جا سکتا ہے جبکہ میونسپلٹی اور ریلوے اور ڈاک خانہ کے قواعد و ضوابط اور ایسے ہی بے شمار معاملات کے احکام سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ شبہ اصولِ دین کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا مدعی ہے اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اُس دائرے میں آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اس کے رب نے اسے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اُصول اور قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجتمند سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملہ میں سب سے پہلے خدا اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے، اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اسی صورت میں آزادیِ عمل برتتا ہے۔ اور اس کی یہ آزادیِ عمل اسی حقیقت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں شارع کا کوئی حکم نہ دینا اس کی طرف سے آزادیِ عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے۔

فصل ۶

حضورؐ پر قرآن کے علاوہ وحی کا نزول

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ، فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔

(القیامہ: ۱۶ تا ۱۹)

اے نبیؐ! اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اُن گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔

اوّلاً، اس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپؐ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے احکام اور فرامین، اس کے اشارات، اس کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم و مدعا حضورؐ کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالبِ قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ کی طرف سے کی جاتی تھی، وہ بہر حال الفاظِ قرآن کے ماسوا تھے۔ یہ وحیِ خفی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔

ثانیاً، قرآن کے مفہوم و مدعا اور اس کے احکام کی یہ تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی تھی آخر اسی لیے تو بتائی گئی تھی کہ آپؐ اپنے قول اور عمل سے اُس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔ اگر یہ اُس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپؐ کو صرف اس لیے بتائی گئی تھی کہ آپؐ اپنی ذات کی حد تک اس علم کو محدود رکھیں تو یہ ایک بے کار کام تھا، کیونکہ فرائضِ نبوت کی ادائیگی میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے صرف ایک بیوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریحی علم سرے سے کوئی تشریعی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے خود سورۂ نحل آیت ۴۴ میں فرمایا ہے وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ "اور اے نبی، یہ ذکر ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے"[1]۔ اور قرآن ہی میں چار جگہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سنا دینا ہی نہ تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔ (البقرہ، آیات ۱۲۹ و ۱۵۱۔ آل عمران ۱۶۴۔ الجمعہ، ۲)[2]۔ اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی مستند، بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے فرمادی ہے کیونکہ وہ آپ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا اس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے وہ ایسی جسارت کرتا ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحب ایمان آدمی نہیں کر سکتا۔

ثانیاً، قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی بیان ہوئی ہیں جن میں ایک عربی دان آدمی محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ ان کا حقیقی منشا کیا ہے اور ان پر عمل کس طرح کیا جائے۔ مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہی کو لے لیجیے۔ قرآن مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوٰۃ ہے۔ لیکن محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم متعین نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد غالباً کوئی خاص فعل ہے جس کے انجام دینے کا اہل ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی دان یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے بھیجنے والے نے اپنی طرف سے ایک معلم کو مقرر کر کے اپنی اس اصطلاح کا مفہوم اسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا، تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں کوئی دو مسلمان بھی ایسے ہو سکتے تھے جو حکم صلوٰۃ پر عمل کرنے کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل ایک ہی طرح جو نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں، اور دنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن کے الفاظ ہی

---

[1] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۴۰۔

[2] ان سب آیات کی تشریح ہم "سنت کی آئینی حیثیت" نامی مضمون میں پوری تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ (مؤلف)

وحی نہیں فرماتے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپؐ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا، اور اسی مطلب کی تعلیم آپؐ اُن سب لوگوں کو دیتے چلے گئے جنہوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب اور آپؐ کو اللہ کا رسول مان لیا۔

رابعاً، قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسولؐ کو بتائی اور رسولؐ نے اپنے قول اور عمل سے اس کی جو تعلیم اُمّت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سُنّت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں، اور سنّت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضورؐ کی قولی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا جس کی تفصیلات معتبر روایتوں سے بھی بعد کی نسلوں کو اگلی نسلوں سے ملیں، اور بعد کی نسلوں نے اگلی نسلوں میں اس پر عمل درآمد ہوتے بھی دیکھا۔ اس ذریعۂ علم کو قبول کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسولؐ کو سمجھا دینے کی جو ذمّہ داری لی تھی اُسے پورا کرنے میں معاذ اللہ وہ ناکام ہو گیا، کیونکہ یہ ذمّہ داری محض رسولؐ کی ذاتی حیثیت سے مطلب سمجھانے کے لیے نہیں لی گئی تھی، بلکہ اس غرض کے لیے لی گئی تھی کہ رسولؐ کے ذریعہ سے اُمّت کو کتابِ الٰہی کا مطلب سمجھایا جائے، اور حدیث و سُنّت کے ماخذِ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ سے آپ یہ لازم آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ذمّہ داری کو پورا نہیں کر سکا ہے، اعاذنا اللہ من ذالک۔ اس کے جواب میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تو لی تھیں، اُس سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پوری اُمّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ جعل ساز لوگ وہی سکّے تو جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انہیں کون بیوقوف جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس اُمّت نے اوّل روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذاتِ پاکؐ کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اُس ذات کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا اُتنا ہی زیادہ اِس اُمّت کے خیر خواہ اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے ممیّز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر مغربی مستشرقین کے بہکائے میں آکر حدیث و سُنّت کو ناقابلِ اعتبار ٹھہراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

قبلہ کا تقرّر

قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ حضورؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے اور آپؐ

ان دونوں قسم کی وحیوں کا اتباع کرنے پر مامور تھے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۔ (البقرہ: ۱۴۳)	اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم تھے اسی لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھرتا ہے۔

یہ سب سے زیادہ کھلی ہوئی آیت ہے جو ہر تاویل کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور ساتھ ساتھ اس مفروضے کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کسی صورت میں وحی نہیں آتی تھی۔ مسجد حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اسے قبلہ بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا ہے اور یہ واقعہ ناقابل انکار ہے کہ وہ قبلہ آغاز اسلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا اور تقریباً ۱۴ سال تک اسی کی طرف حضورؐ اور صحابہ کرام نماز ادا کرتے رہے۔ ۱۴ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی اس آیت میں حضورؐ کے اس فعل کی توثیق فرمائی، اور یہ اعلان فرمایا کہ یہ قبلہ ہمارا مقرر کیا ہوا تھا، اور اسے ہم نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ سے اس لیے مقرر کیا تھا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے منہ موڑتا ہے۔ یہ ایک طرف اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف یہی آیت پوری صراحت کے ساتھ یہ بتاتی ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احکام کا اتباع کرنے پر بھی مامور تھے جو قرآن میں مذکور نہ ہوں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمانوں کے ایمان بالرسالت کی آزمائش ہی اس طریقہ سے ہوتی ہے کہ رسولؐ کے ذریعہ سے جو حکم دیا جائے اُسے وہ مانتے ہیں یا نہیں۔ [۱۲]

سوال یہ ہے کہ اگر حضورؐ پر قرآن کے علاوہ اور کوئی وحی نہیں آتی تھی تو یہ حکم حضورؐ کو کس ذریعہ سے ملا؟ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ حضورؐ کو ایسے احکام بھی ملتے تھے جو قرآن میں درج نہیں ہیں؟ [۱۳]

فتح مکہ کی بشارت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپؐ مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ آپؐ اس کی خبر صحابہ کرام کو دیتے ہیں۔ اور ۱۴ سو صحابیوں کو لیکر عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ کفار مکہ آپؐ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ واقع ہوتی ہے۔ بعض صحابی اس پر خلجان میں پڑ جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ کیا آپؐ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا "کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سفر میں ایسا ہوگا؟" اسی پر اللہ قرآن میں فرماتا ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ	اللہ نے اپنے رسولؐ کو یقیناً سچا خواب دکھایا تھا۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا۔ (الفتح : آیت ۲۷)

تم ضرور مسجد حرام میں انشاء اللہ داخل ہوگے امن کے ساتھ سر مونڈتے ہوئے اور بال ترشتے ہوئے بغیر اس کے کہ تمہیں کسی قسم کا خوف ہو۔ اللہ کو علم تھا اس بات کا جسے تم نہ جانتے تھے۔ اس لیے اس سے پہلے اُس نے یہ قریب کی فتح (یعنی صلح حدیبیہ) عطا کردی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کو خواب کے ذریعہ سے مکہ میں داخل ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپؐ اپنے ساتھیوں کو لیکر مکہ کی طرف جائیں، کفار روکیں گے، آخر کار صلح ہوگی جس کے ذریعہ سے دوسرے سال عمرہ کا موقع بھی ملے گا اور آئندہ کی فتوحات کا راستہ بھی کھل جائے گا۔ کیا یہ قرآن کے علاوہ دوسرے طریقوں سے ہدایات ملنے کا کھلا ثبوت نہیں ہے ؟

راز کی بات

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک بیوی کو راز میں ایک بات بتاتے ہیں وہ اس کا ذکر دوسروں سے کر دیتی ہیں۔ حضورؐ اس پر بازپرس کرتے ہیں تو وہ پوچھتی ہیں کہ آپؐ کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہہ دی ہے۔ حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے۔

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ۔ (التحریم : ۳)

اور جبکہ نبیؐ نے اپنی ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی اور اس بیوی نے اس کی دوسروں کو خبر دے دی اور اللہ نے نبیؐ کو اس پر مطلع کر دیا تو نبیؐ نے اس بیوی کو اس کے قصور کا ایک حصہ تو جتا دیا اور دوسرے حصے سے درگزر کیا۔ پس جب نبیؐ نے اس بیوی کو اس کا قصور جتایا تو اس نے پوچھا آپؐ کو کس نے اس کی خبر کر دی؟ نبیؐ نے کہا مجھے علیم و خبیر خدا نے بتایا۔

فرمایئے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی نے تمہاری راز کی بات دوسروں سے کہہ دی ہے؟ اگر نہیں ہے تو ثابت ہوا یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغامات بھیجتا تھا؟

نکاح زینبؓ

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے زیدؓ بن حارثہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں اور اس کے بعد حضورؐ ان کی

مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیتے ہیں۔ اس پر منافقین و مخالفین حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک شدید طوفان کھڑا کرتے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب کے ایک پورے رکوع میں دیتا ہے اور اس سلسلے میں لوگوں کو بتاتا ہے کہ ہمارے نبیؐ نے یہ نکاح خود نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے حکم سے کیا ہے۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا۔ (آیت ۳۷)

پھر جب زیدؓ کا اُس سے جی بھر گیا تو ہم نے اُس (خاتون) کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہلِ ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ ان سے جی بھر چکے ہوں (یعنی انہیں طلاق دے چکے ہوں)۔

یہ آیت گزرے ہوئے واقعہ کا بیان ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم دیا گیا تھا کہ تم زیدؓ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لو وہ قرآن میں کس جگہ ہے؟

درخت کاٹنے کی اجازت

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی نضیر کی مسلسل بدعہدیوں سے تنگ آ کر مدینہ سے متصل ان کی بستیوں پر چڑھائی کر دیتے ہیں۔ اور دورانِ محاصرہ میں اسلامی فوج گردوپیش کے باغات کے بہت سے درخت کاٹ ڈالتی ہے تاکہ حملہ کرنے کے لیے راستہ صاف ہو۔ اس پر مخالفین شور مچاتے ہیں کہ باغوں کو اُجاڑ کر اور ہرے بھرے ثمردار درختوں کو کاٹ کر مسلمانوں نے فساد فی الارض برپا کیا ہے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (الحشر ۵)

کھجوروں کے درخت تم نے کاٹے اور جو کھڑے رہنے دیئے۔ یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت قرآن مجید کی کس آیت میں نازل ہوئی تھی؟

جنگِ بدر سے پہلے کا ایک وعدہ

(۶) جنگِ بدر کے خاتمہ پر جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اس وقت سورۂ انفال نازل ہوتی ہے اور پوری جنگ پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اس تبصرے کا آغاز اللہ تعالیٰ اُس وقت سے کرتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کے لیے گھر سے نکلے تھے، اور اس سلسلے میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ

اور جبکہ اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں (یعنی تجارتی قافلے اور قریش کے لشکر) میں سے ایک تمہارے ہاتھ آئے گا، اور تم چاہتے تھے کہ بے زور

باب ۱۰

مسئلہ شفاعت

تھا جو قرآن میں نازل نہیں ہوتے تھے، اور وہ احکام بھی اُسی طرح واجب الاطاعت تھے جس طرح قرآن میں نازل ہونے والے احکام۔

نماز کی منادی وہی اذان ہے جو آج ساری دُنیا میں ہر روز پانچ وقت ہر مسجد میں دی جا رہی ہے۔ مگر قرآن میں کسی جگہ نہ اُس کے الفاظ بیان کیے گئے ہیں نہ کہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز کے لیے لوگوں کو اس طرح پکارا کرو۔ یہ چیز رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ ہے۔ قرآن میں اسی کی دو جگہ توثیق کی گئی ہے۔ ایک اس آیت میں، دوسرے سُورۂ مائدہ کی آیت ۵۸ میں۔

اسی طرح جمعہ کی یہ خاص نماز جو آج ساری دُنیا کے مسلمان ادا کر رہے ہیں، اس کا بھی قرآن میں نہ حکم دیا گیا ہے نہ وقت اور طریق ادا بتایا گیا ہے۔ یہ طریقہ بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جاری کردہ ہے، اور قرآن کی یہ آیت صرف اس کا وجوب اور اس کی شدت بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے

اس صریح دلیل کے باوجود جو شخص یہ کہتا ہے کہ شرعی احکام صرف وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے وہ دراصل سُنّت کا نہیں خود قرآن کا بھی منکر ہے۔ [۱۱۵]

نماز پڑھنے کا طریقہ

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ۔ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ۔ (العلق: ۹-۱۰)

تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جبکہ وہ نماز پڑھتا ہے۔

بندے سے مُراد خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس طریقے سے حضورؐ کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى (بنی اسرائیل۔ ۱) "پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف"۔ اَلْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ (الکہف۔ ۱) "تعریف ہے اُس خدا کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی"۔ وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا (الجن۔ ۱۹) "اور یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص محبت کا انداز ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اپنے رسُول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتا ہے۔ علاوہ بریں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اس طریقے کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے کہ اے نبی تم اس طرح نماز پڑھا کرو۔ لہٰذا یہ اس امر کا ایک اور ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپ کو ایسی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی جو قرآن میں درج نہیں ہیں۔ [۱۱۶]

فصل ۱

مسئلۂ شفاعت کے مختلف پہلو

[نبوت کی حقیقت سے مسئلۂ شفاعت کا گہرا تعلق دو وجہوں سے ہے: ایک اس وجہ سے کہ نبی اکرمؐ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے منکرین و مخالفین نے یہ کہہ کر عقیدۂ شفاعت کو اپنی ڈھال بنایا ہے کہ ہم جن بزرگوں کی اولاد ہیں اور جن بڑے بڑے دیوی دیوتاؤں کی عبادت کر کے ان کو خوش رکھتے ہیں، وہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہیں اور ان کی سفارش کی وجہ سے ہم اللہ کے چہیتے اور لاڈلے ہیں۔ سو ہمیں ہمارے اعمال کی وجہ سے خدا کے غضب اور عذاب سے ڈرنا بے معنی ہے۔ قرآن نے اس تصورِ شفاعت کا سختی سے توڑ کیا ہے۔

دوسرے اس وجہ سے کہ قیامت میں انبیاء (اور تبعاً جزوی طور پر صلحاء) کا اپنے ایسے پیروکاروں کے لیے شفاعت کرنا ثابت ہے جو مجموعی طور پر مرضیاتِ الٰہی کے مطابق اچھی زندگی گزارتے ہوئے بعض لغزشوں سے دوچار ہو گئے ہوں یا ان سے گناہوں کا صدور بھی ہوتا رہا ہو اور وہ بار بار نادم ہو کر اصلاح کی کوشش کرتے رہے ہوں۔

اس لحاظ سے شفاعت کا تعلق منصبِ نبوت سے ہے۔

ان دو وجوہ کی بنا پر ہم نے مناسب سمجھا کہ ایک فصل مسئلۂ شفاعت پر بھی بنیادی مباحث میں شامل ہونی چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس سلسلے میں مولانا کے قلم سے نہایت مفید عبارات نکلی ہیں۔ مرتبین]

شفاعت کے مسئلے کو قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی شخص کو یہ جاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی کہ شفاعت کون کر سکتا ہے اور کون نہیں کر سکتا، کس حالت میں کی جاسکتی ہے اور کس حالت میں نہیں کی جاسکتی، کس کے لیے کی جاسکتی ہے اور کس کے لیے نہیں کی جاسکتی، اور کس کے حق میں نافع ہے اور کس کے حق میں نافع نہیں ہے۔ دنیا میں چونکہ لوگوں کی گمراہی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب شفاعت کے بارے میں غلط عقائد بھی ہیں، اس لیے قرآن نے اس مسئلے کو اتنا کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش

فصل ا

نبوّت و بشریّت

نظریۂ جاہلیت کہ پیغمبر بشر نہیں ہو سکتا

ہر زمانے کے جاہل لوگ اِس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ بشر کبھی پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ اِسی لیے جب کوئی رسُول آیا تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے، گوشت پوست کا بنا ہوا ہے، فیصلہ کر دیا کہ یہ پیغمبر نہیں ہے کیونکہ بشر ہے۔ اور جب وہ گزر گیا تو ایک مدّت کے بعد اس کے عقیدت مندوں میں ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہو گئے جو کہنے لگے کہ وہ بشر نہیں تھا کیونکہ پیغمبر تھا۔ چنانچہ کسی نے اسے خدا بنایا، اور کسی نے خدا کا بیٹا، اور کسی نے کہا کہ خدا اس میں حلول کر گیا ہے۔ غرض بشریّت اور پیغمبری کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کے لیے ہمیشہ ایک معمّا ہی بنا رہا۔ ﷺ

مشرکینِ مکّہ کا نقطۂ نظر

اوّل تو اہلِ مکّہ انسان کا رسُول ہونا ہی عجیب سمجھتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہو۔ تاہم اگر آدمی ہی رسُول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دُنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور باریابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا۔ نہ یہ کہ ایک ایسا عام آدمی خداوندِ عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہو۔ بھلا اُس آدمی کو کون خاطر میں لائے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اُس کے اندر غیر معمولی پن نہ پاتا ہو۔ بالفاظِ دیگر اُن کی رائے میں رسُول کی ضرورت اگر تھی تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ عجوبہ دکھانے یا ٹھاٹھ باٹھ سے دھونس جمانے کے لیے تھی ——— یا پھر ایک فرشتہ اس کے ساتھ کر دیا جاتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ مانو اس کی بات ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسا دیتا ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کا مالک ایک شخص کو نبوّت کا جلیل القدر منصب عطا کر کے بس یُوں ہی اکیلا چھوڑ دے اور وہ لوگوں سے گالیاں اور پتھر کھاتا پھرے ———

بدرجۂ آخر ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اللہ میاں کم از کم اتنا تو کرتے کہ اپنے رسُول کے لیے معاش کا کوئی اچھا انتظام کر دیتے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا رسُول ہمارے معمولی رئیسوں سے بھی گیا گزرا ہو۔ نہ خرچ کے لیے مال میسّر، نہ پھل کھانے کو کوئی باغ نصیب اور دعوٰی یہ کہ ہم اللہ رب العٰلمین کے پیغمبر ہیں۔ [۱۱۸]

نبوّت اور خدا رسیدگی کے متعلق جاہلانہ تصوّرات

نادان لوگوں کے ذہن میں ہمیشہ سے یہ احمقانہ تصوّر رہا ہے کہ جو شخص خدا رسیدہ ہو اُسے انسانیت سے ماورا ہونا چاہیے۔ اُس سے عجائب و غرائب صادر ہونے چاہییں۔ وہ ایک اشارہ کرے اور پہاڑ سونے کا بن جائے۔ وہ ایک حکم کرے اور زمین خزانے اُگلنے لگے۔ اُس پر لوگوں کے اگلے پچھلے سب حالات روشن ہوں۔ وہ بتا دے کہ گم شدہ چیز کہاں رکھی ہے، مریض بچ جائے گا یا مر جائے گا، حاملہ کے پیٹ میں نر ہے یا مادہ۔ پھر اس کو انسانی کمزوریوں اور محدودیتوں سے بھی بالاتر ہونا چاہیے۔ بھلا وہ بھی کوئی خدا رسیدہ ہے جسے بھُوک اور پیاس لگے، جسے نیند آئے، جو بیوی بچے رکھتا ہو، جو اپنی ضرورتیں پُوری کرنے کے لیے خرید و فروخت کرتا ہو، جسے کبھی قرض لینے کی ضرورت پیش آئے اور کبھی وہ مفلسی و تنگ دستی میں مبتلا ہو کر پریشان حال رہے۔ اس قسم کے تصوّرات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے معاصرین کی ذہنیت پر مُسلّط تھے۔ وہ جب آپؐ سے پیغمبری کا دعوٰی سُنتے تھے تو آپؐ کی صداقت جانچنے کے لیے آپؐ سے غیب کی خبریں پوچھتے تھے، خوارقِ عادت کا مطالبہ کرتے تھے، اور آپؐ کو بالکل عام انسانوں جیسا ایک انسان دیکھ کر اعتراض کرتے تھے کہ یہ اچھا پیغمبر ہے جو کھاتا پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ [۱۱۹]

نبی کا بشر ہونا کیوں ضروری ہے؟

ذکرِ الٰہی (الہامی پیغام) کو نبی پر نازل کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سورۂ نحل کی ۴۴ ویں آیت میں فرماتا ہے:

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ۔

"اے نبیؐ ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس چیز کی وضاحت کرو جو اُن کی طرف بھیجی گئی ہے۔"

اس مقصد کا تقاضا یہ تھا کہ لازماً ایک انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے۔ "ذکر" فرشتوں کے ذریعے بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ بلکہ براہِ راست چھاپ کر ایک ایک انسان تک بھی پہنچایا جا سکتا تھا۔ مگر محض ذکر بھیج دینے سے وہ مقصد پُورا نہیں ہو سکتا تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت و ربوبیّت اُس کی تنزیل کی متقاضی تھی۔ اُس مقصد کی تکمیل کے لیے تو ضروری تھا کہ اس "ذکر" کو ایک قابل ترین انسان لے کر آئے۔ وہ اس کو تھوڑا تھوڑا

کرکے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتے اُس کا مطلب سمجھائے جنہیں کچھ شک ہو اُن کا شک رفع کرے۔ جنہیں کوئی اعتراض ہو اُن کے اعتراض کا جواب دے۔ جو نہ مانیں اور مخالفت اور مزاحمت کریں اُن سے مقابلہ میں وہ اُس طرح کا رویّہ برت کر دکھائے جو اس ذکر کے حاملین کی شان کے شایاں ہے۔ جو مان لیں اُنہیں زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کے متعلق ہدایات دے۔ اُن کے سامنے خود اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرے اور ان کو انفرادی و اجتماعی تربیت دے کر ساری دُنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بطورِ مثال رکھ دے جس کا پورا اجتماعی نظام "ذکر" کے منشا کی شرح ہو۔[۱]

انسان کی رہنمائی کے لیے انسان ہی نبی ہو سکتا ہے

پیغمبر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ آ کر پیغام سُنا دے، بلکہ اُس کا کام یہ بھی ہے کہ اس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح کرے۔ اُسے انسانی احوال پر اُس پیغام کے اصُولوں کا انطباق کرنا ہوتا ہے۔ اُسے خود اپنی زندگی میں ان اصُولوں کا عملی مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ اُسے اُن بے شمار مختلف انسانوں کے ذہن کی گتھیاں سُلجھانی پڑتی ہیں جو اس کا پیغام سُننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُسے ماننے والوں کی تنظیم اور تربیت کرنی ہوتی ہے تاکہ اس پیغام کی تعلیمات کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آسکے۔ اُسے انکار اور مخالفت و مزاحمت کرنے والوں کے مقابلے میں جدوجہد کرنی ہوتی ہے تاکہ بگاڑ کی حمایت کرنے والی طاقتوں کو نیچا دکھایا جائے اور وہ اصلاح عمل میں آسکے جس کے لیے خدا نے اپنا پیغمبر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سارے کام جبکہ انسانوں ہی میں کرنے کے ہیں تو ان کے لیے انسان نہیں تو اور کون بھیجا جاتا؟ فرشتہ تو زیادہ سے زیادہ بس یہی کر سکتا تھا کہ آتا اور پیغام پہنچا کر چلا جاتا۔ انسانوں میں انسان کی طرح رہ کر انسان کے سے کام کرنا اور پھر انسانی زندگی میں منشائے الٰہی کے مطابق اصلاح کر کے دکھا دینا کسی فرشتے کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے تو ایک انسان ہی موزوں ہو سکتا تھا۔[۲]

فصل ۲

بشریتِ انبیاء[1]

آدمؑ بشر تھے

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (الاعراف: ۱۱)

"ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا آدمؑ کو سجدہ کرو۔"

یہ جو فرمایا کہ "ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہیں صورت بخشی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو" تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا، اور تمہارا مادۂ آفرینش تیار کیا، پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی، پھر جب ایک زندہ انسان کی حیثیت سے آدمؑ وجود میں آگیا تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ آدمؑ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ نوعِ انسانی کا نمائندہ فرد ہونے کی حیثیت سے تھا۔ اِس آیت کی یہ تشریح خود قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ ص، رکوع ۵ میں ہے:

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۔ (ص، رکوع ۵)

"تصور کرو اس وقت کا جبکہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔"

اس آیت میں وہی تین مراتب ایک دوسرے انداز میں بیان کیے گئے ہیں یعنی پہلے مٹی سے ایک بشر کی تخلیق، پھر اس کا تسویہ، یعنی اس کی شکل و صورت بنانا اور اس کے اعضاء اور اس کی قوتوں کا تناسب قائم کرنا، پھر اس کے

---

[1] واضح رہے کہ یہاں صرف ایسے چند انبیاءؑ کا ذکر کیا گیا ہے جن کی بشریت پر قرآن میں صراحت سے کہا گیا ہے یا مؤلف نے کوئی تفصیلی بحث کی ہے۔ (مرتبین)

اندر اپنی رُوح سے کچھ پھونک کر آدمؑ کو وجود میں لے آنا۔ اسی مضمون کو سورۂ حجر رکوع ۳ میں بایں الفاظ ادا کیا گیا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ (الحجر: ۲۸-۲۹)

اور تصور کرو اس وقت کا جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں خمیر اٹھی ہوئی مٹی کے گارے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے اندر اپنی رُوح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔ [۱] ۱۲۲؎

نوح علیہ السلام کی بشریت

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّیْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (ہود۔ آیت ۳۱)

اور (نوحؑ نے کہا) میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔ نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی۔ ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔

یہ اُس بات کا جواب ہے جو مخالفین نے کہی تھی کہ ہمیں تو تم بس اپنے ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہو۔ اس پر حضرت نوحؑ فرماتے ہیں کہ واقعی میں ایک انسان ہی ہوں۔ میں نے انسان کے سوا اور کچھ ہونے کا دعویٰ کب کیا تھا کہ مجھ پر یہ اعتراض کرتے ہو۔ میرا دعویٰ جو کچھ ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ خدا نے مجھے علم و عمل کا سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ اس کی آزمائش تم جس طرح چاہو کر لو۔ مگر اس دعوے کی آزمائش کا یہ کونسا طریقہ ہے کہ کبھی تم مجھ سے غیب کی خبریں پوچھتے ہو، اور کبھی ایسے ایسے عجیب مطالبے کرتے ہو کہ گویا خدا کے خزانوں کی ساری کنجیاں میرے پاس ہیں، اور کبھی اس بات پر اعتراض کرتے ہو کہ میں انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہوں، گویا میں نے فرشتہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ جس آدمی نے عقائد، اخلاق اور تمدّن میں صحیح رہبری کا دعویٰ کیا ہے اُس سے ان چیزوں کے متعلق جو چاہو پوچھو۔ مگر تم عجیب لوگ ہو جو اس سے پوچھتے ہو کہ فلاں شخص کی بھینس کٹرا جنے گی یا پڑیا۔ گویا انسانی زندگی کے لیے صحیح اصولِ اخلاق و تمدّن بتانے کا کوئی تعلق بھینس کے حمل سے بھی ہے۔ ۱۲۳؎

---

[۱] اس سے ثابت ہوا کہ پہلا نبی ہی بشر تھا کیونکہ اسلام کا یہ مسلّم عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے (مؤلف)

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ

(المؤمنون۔ آیات ۲۴ و ۲۵)

"اس کی (یعنی حضرت نوحؑ کی) قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا۔ یہ بات تو ہم نے اپنے باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے) کچھ نہیں، بس اس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا ہے، کچھ مدت اور دیکھ لو (شاید افاقہ ہو جائے)۔"

یہ خیال تمام گمراہ لوگوں کی مشترک گمراہیوں میں سے ایک ہے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرآن نے بار بار اس جاہلانہ تصوّر کا ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے اور اس بات کو پورے زور کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تمام انبیاءؑ انسان تھے اور انسانوں کے لیے انسان ہی نبی ہونا چاہیے۔[۱۲۴]

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ

(ھود۔ ۲۷)

جواب میں اس کی (یعنی حضرت نوحؑ کی) قوم کے سردار جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے "ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے۔"

یہ وہی (قدیم) جاہلانہ اعتراض ہے جو مکّہ کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں پیش کرتے تھے کہ جو شخص ہماری ہی طرح کا ایک معمولی انسان ہے، کھاتا پیتا ہے، چلتا پھرتا ہے، سوتا اور جاگتا ہے، بال بچے رکھتا ہے، آخر ہم کیسے مان لیں کہ وہ خدا کی طرف سے پیغمبر مقرر ہو کر آیا ہے۔[۱۲۵]

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

(الاعراف۔ آیت ۶۳)

حضرت نوحؑ نے کہا "کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟"

حضرت ہودؑ کی بشریت

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ

"اس کی (یعنی حضرت ہودؑ کی) قوم کے جن سرداروں

الآخرۃ و اترفنٰھم فی الحیٰوۃ الدنیا ما ھٰذا الا بشر مثلکم یاکل مما تاکلون منہ و یشرب مما تشربون ۝ و لئن اطعتم بشرا مثلکم انکم اذا لخٰسرون ۝ (المومنون ۳۳-۳۴)

نے کفر کیا تھا اور آخرت کو جھٹلایا تھا اور جنہیں ہم نے دنیا کی زندگی میں خوشحالی سے رکھی تھی، کہا کہ یہ شخص کچھ بھی نہیں ہے، بس ایک بشر ہے تم ہی جیسا۔ جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو گھاٹے ہی میں رہے۔"

بعض لوگوں نے یہ غلط سمجھا ہے کہ یہ باتیں وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ نہیں، یہ خطاب دراصل عوام الناس سے تھا۔ سرداران قوم کو جب خطرہ ہوا کہ عوام پیغمبر کی پاکیزہ شخصیت اور دل لگتی باتوں سے متاثر ہو جائیں گے اور ان کے متاثر ہو جانے کے بعد ہماری سرداری پھر کس پر چلے گی، تو انہوں نے یہ تقریریں کر کے عام لوگوں کو بہکانا شروع کیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے پیغمبری ویغمبری کچھ نہیں ہے، محض اقتدار کی بھوک ہے جو اس شخص سے یہ باتیں کروا رہی ہے۔ بھائیو، ذرا غور تو کرو کہ آخر یہ شخص تم سے کس چیز میں مختلف ہے۔ ویسا ہی گوشت پوست کا آدمی ہے جیسے تم ہو۔ کوئی فرق اس میں اور تم میں نہیں ہے۔ پھر کیوں یہ بڑا بنے اور تم اس کے فرمان کی اطاعت کرو؟ ان تقریروں میں یہ بات گویا بلا نزاع تسلیم شدہ تھی کہ ہم جو تمہارے سردار ہیں تو ہمیں تو ہونا ہی چاہیے۔ ہمارے گوشت پوست اور کھانے پینے کی نوعیت کی طرف دیکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تو آپ سے آپ قائم اور مسلّم ہے۔ البتہ زیر بحث یہ نئی سرداری ہے جو اب قائم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی بات اُن سرداران قوم کی بات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی جن کے نزدیک قابل الزام اگر کوئی چیز تھی تو وہ "اقتدار کی بھوک" جو کسی نئے آنے والے کے اندر انہیں محسوس ہو، یا جس کے ہونے کا شبہہ کیا جا سکے۔ رہا اُن کا اپنا پیٹ، تو وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار بہرحال اس کی فطری خوراک ہے جس سے اگر وہ بدہضمی کی حد تک بھی بھر جائے تو قابل اعتراض نہیں۔ ۳۶؎

قال یٰقوم لیس بی سفاھۃ و لٰکنی رسول من رب العٰلمین ۝ ابلغکم رسٰلٰت ربی و انا لکم ناصح امین ۝ او عجبتم ان جاءکم ذکر من ربکم علٰی رجل منکم لینذرکم ط

(الاعراف، ۶۷ تا ۶۹)

اُس نے (یعنی حضرت ہودؑ نے) کہا "اے برادرانِ قوم! میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العٰلمین کا رسول ہوں، تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، اور تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے؟"

قالوا لو شاء ربنا لانزل ملٰئکۃ فانا

انہوں نے کہا اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہٰذا ہم

بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (حٰم السجدہ : ۱۴)

"اُس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔"

حضرت صالح و شعیب کی بشریت

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (الشعراء : ۱۵۳-۱۵۴)

"ثمود کی قوم کے لوگوں نے جواب دیا کہ تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے۔ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے۔"

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (الشعراء : ۱۸۵-۱۸۶)

"انہوں نے کہا تو محض سحر زدہ آدمی ہے اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے جھوٹا آدمی سمجھتے ہیں۔"

حضرت موسیٰ و ہارون کی بشریت

فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ اور ہارون کے متعلق کہا:

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝ (المؤمنون : ۴۷)

"کہنے لگے کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندی ہے۔"

تمام انبیاء کی بشریت

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۔ (ابراہیم : ۱۱)

"اُن کے رسولوں نے اُن سے کہا" واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے۔"

یعنی بلاشبہ ہم ہیں تو انسان ہی مگر اللہ نے تمہارے درمیان ہم کو علم حق اور بصیرت کاملہ عطا کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس میں ہمارے بس کی کوئی بات نہیں یہ تو اللہ کے اختیارات کا معاملہ ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے دے۔ ہم نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس آیا ہے وہ تمہارے پاس بھجوا دیں، نہ یہی کر سکتے ہیں کہ جو حقیقتیں ہم پر منکشف ہوتی ہیں اُن سے آنکھیں بند کر لیں۔[۱۱]

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۔ (ابراہیم - آیت ۱۰)

"انہوں نے رسولوں کو جواب دیا تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں۔ تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو جن کی بندگی باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند"

ان کا مطلب یہ تھا کہ تم ہر حیثیت سے بالکل ہم جیسے انسان ہی نظر آتے ہو۔ کھاتے ہو، پیتے ہو، سوتے ہو، بیوی بچے رکھتے ہو۔ بھوک، پیاس، بیماری، دکھ، سردی، گرمی، ہر چیز کے احساس میں اور ہر بشری کمزوری میں ہمارے مشابہ ہو۔ تمہارے اندر کوئی غیر معمولی پن ہمیں نظر نہیں آتا جس کی بنا پر ہم یہ مان لیں کہ تم کوئی پہنچے ہوئے لوگ ہو اور خدا تم سے ہم کلام ہوتا ہے اور فرشتے تمہارے پاس آتے ہیں۔[۱۲]

فصل ۳

نبی اکرمؐ بھی انسان تھے

کفارِ مکہ کہتے تھے کہ محمدؐ رسول نہیں ہیں کیونکہ وہ انسان ہیں۔

وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ (الفرقان: ۷)

کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسُول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ۔ (الانبیاء: ۳)

اور یہ ظالم لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم جیسے ایک بشر کے سوا آخر اور کیا ہے پھر تم آنکھوں دیکھتے اس جادو کے شکار ہو جاؤ گے؟

قدیم جاہلانہ خیال

قرآن مجید کفارِ مکہ کے اس جاہلانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ کوئی نئی جہالت نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ ان لوگوں سے ظاہر ہو رہی ہو۔ بلکہ قدیم ترین زمانے سے تمام جہلا اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ جو بشر ہے وہ رسُول نہیں ہو سکتا اور جو رسُول ہے وہ بشر نہیں ہو سکتا۔ قوم نوحؑ کے سرداروں نے جب حضرت نوحؑ کی رسالت کا انکار کیا تھا تو یہی کہا تھا۔

مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً۔ مَّا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ۔ (المؤمنون: ۲۴)

یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا۔ اور چاہتا ہے کہ تم پر اپنی فضیلت جمائے حالانکہ اللہ چاہتا تو فرشتے نازل کرتا۔ ہم نے یہ بات کبھی اپنے باپ دادا سے نہیں سُنی (کہ انسان رسُول بن کر آئے)۔

قوم عاد نے یہی بات حضرت ہودؑ کے متعلق بھی کہی تھی کہ:

مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ

یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ کھاتا ہے

مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخٰسِرُونَ ۝ (المؤمنون: ۳۳-۳۴)

وہی کچھ جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے وہی کچھ جو تم پیتے ہو۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت کرلی تو تم بڑے گھاٹے میں رہے۔

قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کے متعلق بھی یہی کہا تھا کہ:

أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ (القمر: ۲۴)

کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی اختیار کرلیں؟

اور یہی معاملہ قریب قریب تمام انبیاء کے ساتھ پیش آیا کہ کفار نے کہا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا "تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر" اور انبیاء نے ان کو جواب دیا کہ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ "واقعی ہم تمہاری طرح بشر کے سوا کچھ نہیں ہیں، مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے عنایت فرماتا ہے" (ابراہیم: ۱۰-۱۱)

ہدایت پانے میں رکاوٹ

اس کے بعد قرآن مجید کہتا ہے کہ یہی جاہلانہ خیال ہر زمانے میں لوگوں کو ہدایت قبول کرنے سے باز رکھتا رہا ہے اور اسی بنا پر قوموں کی شامت آئی ہے۔

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوْا۔ (التغابن: ۶)

کیا انہیں اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا تھا اور پھر اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور آگے ان کے لیے دردناک عذاب ہے؟ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اُن کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی دلیلیں لے کر آتے رہے مگر انہوں نے کہا: کیا اب انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟ اسی بنا پر انہوں نے کفر کیا اور منہ پھیر گئے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَن قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا۔ (بنی اسرائیل: ۹۴)

لوگوں کے پاس جب ہدایت آئی تو کوئی چیز انہیں ایمان لانے سے روکنے والی اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے کہا "کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا؟"

یعنی ہر زمانے کے جاہل لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ بشر کبھی پیغمبر نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے جب کوئی رسول آیا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے، گوشت پوست کا بنا ہوا ہے، فیصلہ کر دیا کہ یہ پیغمبر نہیں ہے کیونکہ بشر ہے۔ اور جب وہ گزر گیا تو ایک مدت کے بعد اس کے عقیدت مندوں

میں ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہو گئے جو کہنے لگے کہ وہ بشر نہیں تھا کیونکہ پیغمبر تھا چنانچہ کسی نے اس کو خدا کا بیٹا کہا، اور کسی نے کہا کہ خدا اُس میں حلول کر گیا تھا۔ غرض بشریت اور پیغمبری کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کے لیے ہمیشہ ایک معمّا ہی بنا رہا۔ ۱۲۹؎

ہمیشہ انسانوں ہی کو رسُول بنایا گیا

پھر قرآن مجید پُوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ اللہ نے ہمیشہ انسان ہی کو رسُول بنا کر بھیجا ہے اور انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی رسُول ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی فرشتہ یا بشریت سے بالاتر کوئی ہستی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝

(الانبیاء: ۷-۸)

اے نبی ہم نے تم سے پہلے انسانوں ہی کو رسُول بنا کر بھیجا ہے جن پر ہم وحی کرتے تھے۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پُوچھ لو۔ اور ہم نے ان کو ایسے جسم نہیں بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ ہمیشہ جینے والے تھے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝

(بنی اسرائیل: ۹۵)

اے نبی، (صلی اللہ علیہ وسلّم) ان سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ان پر فرشتے ہی کو رسُول بنا کر نازل کرتے۔ ۱۳۰؎

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(یوسف: ۱۰۹)

"اے محمدؐ! تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجے تھے، وہ سب انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔ اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انہیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں؟ یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر ہے جنہوں نے پیغمبروں کی بات مان کر تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے؟"

یہاں ایک بہت بڑے مضمون کو دو تین جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کو اگر کسی تفصیلی عبارت میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ تمہاری بات کی طرف اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ جو شخص کل ان کے شہر میں پیدا ہوا اور انہی کے درمیان بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہُوا ہو اس کے متعلق یہ کیسے مان لیں کہ یکایک ایک روز خدا نے اسے اپنا پیغمبر مقرر کر دیا ہے۔ لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے جس سے آج دنیا میں پہلی مرتبہ انہی کو سابقہ پیش آیا ہو۔ اس سے

پہلے بھی خدا اپنے نبی بھیج چکا ہے اور وہ سب بھی انسان ہی تھے۔ پھر یہ بھی کبھی نہیں ہُوا کہ اچانک ایک اجنبی شخص کسی شہر میں نمودار ہو گیا ہو اور اس نے کہا ہو کہ میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہُوں۔ بلکہ جو لوگ بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے اٹھائے گئے وہ سب ان کی اپنی ہی بستیوں کے رہنے والے تھے۔ مسیحؑ، موسیٰؑ، ابراہیمؑ، نوح (علیہم السلام)، آخر کون تھے؟ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ جن قوموں نے ان لوگوں کی دعوت اصلاح کو قبول نہ کیا اور اپنے بے بنیاد تخیلات اور بے لگام خواہشات کے پیچھے چلتی رہیں، ان کا انجام کیا ہُوا۔ تم خود اپنے تجارتی سفروں میں عاد، ثمود، مدین اور قوم لوط وغیرہ کے تباہ شدہ علاقوں سے گزرتے رہتے ہو، کیا وہاں کوئی سبق تمہیں نہیں ملا؟ یہ انجام جو انھوں نے دنیا میں دیکھا یہی تو خبر دے رہا ہے کہ عاقبت میں وہ اس سے بدتر انجام دیکھیں گے۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے دُنیا میں اپنی اصلاح کر لی وہ صرف دنیا ہی میں اچھے نہ رہے، آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ بہتر ہو گا۔ [۱۳۱]

بینا اور نابینا کا فرق

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ
لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ
اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي
الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۔

(الانعام: ۵۰)

اے محمدؐ! ان سے کہو "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے
پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں،
اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہُوں۔ میں تو صرف اُس
وحی کی پیروی کرتا ہُوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔"
پھر ان سے پُوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں
برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟

میں جن حقیقتوں کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہُوں ان کا میں نے مشاہدہ کیا ہے، وہ براہِ راست میرے تجربہ میں آئی ہیں۔ مجھے وحی کے ذریعہ سے ان کا ٹھیک ٹھیک علم دیا گیا ہے، ان کے بارے میں میری شہادت آنکھوں دیکھی شہادت ہے بخلاف اس کے تم ان حقیقتوں کی طرف سے اندھے ہو کر ان کے بارے میں جو خیالات رکھتے ہو۔ وہ یا تو قیاس و گمان پر مبنی ہیں۔ یا محض اندھی تقلید پر۔ لہٰذا میرے اور تمہارے درمیان بینا اور نابینا کا سا فرق ہے۔ اور اسی بنا پر مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے۔ نہ اس اعتبار سے کہ میرے پاس خدائی کے خزانے ہیں یا میں عالم الغیب ہُوں یا انسانی کمزوریوں سے مُبرا ہوں۔ [۱۳۲]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا
لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ (الرعد - ۳۸)

"اور اے نبیؐ تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسُول بھیج
چکے ہیں اور اُن کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا۔"

یہ ایک اعتراض کا جواب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ اچھا نبی ہے جو بیوی اور بچے رکھتا ہے۔ بھلا پیغمبروں کو بھی خواہشاتِ نفسانی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ [۱۳۳]

نبی کو فرشتہ ہونا چاہیے تھا

إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ۔ (حٰم السجدہ۔ ۱۴)

جب خدا کے رسول اُن کے پاس آگے اور پیچھے ہر طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انہوں نے کہا "ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہٰذا ہم اس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔"

یعنی اگر اللہ کو ہمارا یہ مذہب پسند نہ ہوتا اور وہ اس سے باز رکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ تم چونکہ فرشتے نہیں ہو بلکہ ہم جیسے انسان ہی ہو اس لیے ہم یہ نہیں مانتے کہ تم کو خدا نے بھیجا ہے۔ اور اس غرض کے لیے بھیجا ہے کہ ہم اپنا مذہب چھوڑ کر وہ دین اختیار کر لیں جسے تم پیش کر رہے ہو۔ کفار کا یہ کہنا کہ "جس چیز کے لیے تم بھیجے گئے ہو اُسے ہم نہیں مانتے" محض طنز کے طور پر تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا مانتے تھے اور پھر ان کی بات ماننے سے انکار کرتے تھے، بلکہ یہ اُسی قسم کا طنزیہ اندازِ بیان ہے جیسے فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے متعلق اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ (الشعراء، آیت ۲۷) "یہ رسول صاحب جو تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔" ؎

نبی ہوتا تو کوئی بڑا آدمی ہوتا

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ۔ (الزخرف، ۳۱)

"کہتے ہیں، یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟"

دونوں شہروں سے مراد مکہ اور طائف ہیں۔ کفار کا یہ کہنا تھا کہ اگر واقعی خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا اور وہ اس پر اپنی کتاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا تو ہمارے اِن مرکزی شہروں میں سے کسی بڑے آدمی کو اس غرض کے لیے منتخب کرتا۔ رسول بنانے کے لیے اللہ میاں کو ملا بھی تو وہ شخص جو یتیم پیدا ہوا، جس کے حصے میں کوئی میراث نہ آئی، جس نے بکریاں چرا کر جوانی گزار دی، جو اب گزر اوقات بھی کرتا ہے تو بیوی کے مال سے تجارت کر کے، جو کسی قبیلے کا شیخ یا کسی خانوادے کا سربراہ نہیں ہے۔ کیا مکہ میں ولید بن مغیرہ اور عُتبہ بن ربیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے؟ کیا طائف میں عروہ بن مسعود، حبیب بن عَمرو، کنانہ بن عبد عَمرو اور ابن عبد یالیل جیسے رئیس موجود نہ تھے؟ یہ تھا اُن لوگوں کا استدلال۔ پہلے تو وہ یہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کوئی بشر بھی رسول ہو سکتا ہے۔ مگر جب قرآن مجید میں پے در پے دلائل دے کر ان کے اس خیال کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اس سے پہلے ہمیشہ بشر ہی رسول ہو کر آتے رہے ہیں اور انسانوں کی ہدایت کے لیے بشر ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ غیر بشر، اور جو رسول بھی دنیا میں آئے ہیں وہ یکایک

آسمان سے نہیں اُتر آتے تھے بلکہ انہی انسانی بستیوں میں پیدا ہوئے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بال بچوں والے تھے، اور کھانے پینے سے مبرّا نہ تھے، تو انہوں نے یہ دوسرا پینترا بدلا کہ اچھا بشری رسُول سہی مگر وہ کوئی بڑا آدمی ہونا چاہیے۔ مالدار ہو، با اثر ہو، بڑا جتھے والا ہو۔ لوگوں میں اس کی شخصیت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہو۔ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس مرتبے کے لیے کیسے موزوں ہو سکتے ہیں؟[135]

حضورؐ پر سعیِ معاش کا اعتراض

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ (الفرقان: ۷)

"کہتے ہیں یہ کیسا رسُول ہے، جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا؟"

یعنی اوّل تو انسان کا رسُول ہونا ہی عجیب بات ہے۔ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہوتا ہم اگر آدمی ہی رسُول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دُنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور باریابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا، نہ یہ کہ ایک ایسا عام آدمی خداوندِ عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہو۔ بھلا اس آدمی کو کون خاطر میں لائے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اس کے اندر کوئی غیر معمولی پن نہ پایا جاتا ہو۔ بالفاظِ دیگر، ان کی رائے میں رسُول کی ضرورت اگر تھی "تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ عجوبہ دکھانے یا ٹھاٹھ باٹھ سے دھونس جمانے کے لیے تھی"[136]

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا (الفرقان: ۲۰)

"اے محمدؐ! تم سے پہلے جو رسُول ہم نے بھیجے تھے وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے۔ دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے کیا تم صبر کرتے ہو؟ تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے۔"

یہ جواب ہے کفارِ مکہ کی اس بات کا جو وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسُول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہے کہ کفارِ مکہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت موسیٰؑ اور بعض دوسرے انبیاءؑ سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان کی رسالت کو بھی تسلیم کرتے تھے اس لیے فرمایا گیا کہ

آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نرالا اعتراض کیوں اٹھا رہے ہو؟ پہلے کونسا نبی ایسا آیا ہے جو کھانا نہ کھاتا ہو اور بازاروں میں نہ چلتا پھرتا ہو؟ اور تو اور خود عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام جن کو عیسائیوں نے خدا کا بیٹا بنا رکھا ہے (اور جن کا مجسمہ کفارِ مکہ نے بھی کعبہ میں رکھ چھوڑا تھا) انجیلوں کے اپنے بیان کے مطابق کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔[۱۳۸]

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ (الانبیاء ۷-۸)	اور اے محمد! تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ اُن رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔

یہ جواب ہے کفار کے اس قول کا کہ "یہ شخص تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے"۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کو اس بات کی دلیل قرار دیتے تھے کہ آپ نبی نہیں ہو سکتے۔ جواب دیا گیا کہ پچھلے زمانے کے جن بزرگوں کو تم مانتے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے وہ سب بھی بشر تھے اور بشر ہوتے ہوئے ہی خدا کی وحی سے سرفراز ہوئے تھے۔[۱۳۹]

باب

دینِ حق

یہاں بہت ضروری ہے

فصل ۱

مذہب کا جاہلی تصور اور اسلامی تصور

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے، یا دوسرے الفاظ میں انسان کی دُنیوی زندگی کے ساتھ یہ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے۔ اُس کا تعلق صرف ان معاملات سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مراتب حاصل کرنے ہوں اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دُنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو رہے۔ مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں، بلکہ محض نجات مطلوب ہو اور اس کے ساتھ یہ بھی خواہش ہو کہ معبود اُن پر نظرِ عنایت رکھے اور ان کو دُنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے، اُس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دُنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دُنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے اہل و عیال سے، نوع سے، اپنے گرد و پیش کی ساری دُنیا سے ایک الگ چیز ہے۔ اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں۔

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں، اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو اُس پر پوری زندگی کی عمارت ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا، مگر یہ اثر اُسی قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادی علائق سے نفرت، لذاتِ دُنیوی سے کراہت، عالمِ اسباب سے بے تعلقی، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تنافر اور تعصب کے عناصر داخل کر دیئے

یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا۔ بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لیے ایک سنگِ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدّن نے، جس کی بنیاد سراسر مادیّت اور خواہشاتِ نفس کے اتباع پر قائم تھی، مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا اُس کو گندا کر دیا۔ اُس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں اور اس سے ہمیشہ یہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اُس گندی اور بد سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے، مذہبی تقدّس کا جامہ پہنا دیا جاتے تاکہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے نہ کوئی دوسرا اُس کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اِسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں تک میں ہم کو لذّت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی حلقے کے باہر خود اُن مذاہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اِس تعامل سے قطع نظر کر کے دیکھا جاتے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ دُنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدّن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اِخلاقی دیواروں پر قائم ہوتی ہے۔

سچّے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دُنیا سے الگ رہے اور دُنیا کے معاملات کو دُنیا والوں نے اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر ـــــ جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور جو ہر زمانہ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے ـــــ جس طرح چاہا چلایا۔ اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبُود کو خوش کرنے کے لیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کر لیں۔ مذہب چونکہ ان کے لیے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا اس لیے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم، ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں اور ہر قسم کی تمدّنی کج رویوں کے ساتھ یہ ضمیمہ منسلک ہو سکتا تھا۔ اُس نے ٹھگی اور قزّاقی کا بھی ساتھ دیا، جہاں سوزی اور غارت گری کا بھی، سُود خوری اور قمار بازی کا بھی، فحش کاری اور قحبہ گری کا بھی۔

ہمہ گیر اور جامع تصوّرِ دین

محمد صلی اللہ علیہ وسلّم جس غرض کے لیے بھیجے گئے تھے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے جاہلی تصوّر کو مٹا کر ایک عقلی و فکری تصوّر پیش کریں، اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدّن کا ایک مکمّل نظام قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپؐ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا بھی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو، زندگی کی روح اور اس کی قوّتِ محرّکہ ہو، فہم و شعور اور فکر و نظر ہو، صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو، زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہِ راست اور راہِ کج کے درمیان فرق کر کے دکھاتے، راہِ کج سے بچاتے، راہِ راست پر استقامت اور

پیش قدمی کی طاقت بخشے، اور زندگی کے اِس لامتناہی سفر میں، جو دُنیا سے لے کر آخرت تک مُسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کے ساتھ گزار دے۔

اِسی مذہب کا نام اِسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پُرانے جاہلی تصوّر کے ماتحت ایک ضمیمۂ زندگی قرار دے دیا جائے۔ یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے، اُسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اور اُسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اِس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اِس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں، بلکہ ایک مجموعہ ہیں مربُوط اور مرتّب اجزا کا اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا دارومدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور خُدا کا تعلق درُست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں، دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں، اور مذہب کا اصل کام اِسی کامیاب زندگی کے لیے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے۔ جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔

ایک خاص طریقِ فکر اور نقطۂ نظر

اسلام ایک خاص طریقِ فکر (Attitude of Mind) ہے، اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر (Outlook on Life) ہے۔ اور پھر وہ ایک خاص طرزِ عمل ہے جس کا راستہ اسی طریقِ فکر اور اسی نظریۂ زندگی سے متعیّن ہوتا ہے۔ اِس طریقِ فکر اور طرزِ عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہ مذہب اسلام ہے، وہ تہذیب اسلامی ہے، اور وہی تمدّن اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدّن الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریقِ فکر اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔ انسان پر خُدا کے کیا حقوق ہیں؟ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں؟ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، اور عزیزوں اور قرابت داروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دُشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوعِ انسانی کے حتّٰی کہ کائنات کی ہر چیز اور ہر قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ ان حقوق کا تعیّن بھی کرتا ہے اور ان کے درمیان کامل توازن اور عدل بھی قائم کرتا ہے۔ ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پُورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا، بغیر اس کے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو دوسرے حق پر قربان کرے۔ پھر یہی طریقِ فکر اور نظریۂ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ رُوحانی منتہائے نظر متعیّن کرتا ہے۔ اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو، خواہ وہ

کی [illegible] میں ہو، ایسے راستوں پر ڈالا جاتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجع ہوں۔

فیصلہ کن معیارِ اقدار

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (Value) متعین کی جاتی ہے۔ اسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے۔ جو شے اس مرکزی مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہے اُسے اختیار کر لیا جاتا ہے، اور جو شے سدِ راہ ہوتی ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کارفرما ہے۔ وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، حقیقی تعلقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ وہ مرکزِ مقصود کی طرف جانے والی سیدھی راہ پر قائم رہے اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا فیصلہ بھی کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کیے جائیں جن سے معاشرت، معیشت، سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزلِ مقصود کی طرف جانے والے ہوں اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دور ہٹانے والی ہوں۔ اس کا فیصلہ بھی کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو، اور جو چیزیں اس کے لیے مسخر کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا فیصلہ بھی کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراکِ اغراض میں اور اختلافِ مقاصد میں، غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کی حالت میں، علوم و فنون کے اکتساب میں اور تہذیب و تمدن کے لین دین میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ ان کے تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو نوعِ انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً یا کرہاً شعوری یا غیر شعوری طور پر اُسی مقصد کی خدمت لے لیں جو اصل فطرت کے اعتبار سے اُن کا بھی ایسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروانِ اسلام کا ہے۔

مسجد سے میدانِ کارزار تک

غرض وہ ایک ہی نقطۂ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدانِ کارزار تک، طریقِ عبادت سے لے کر [illegible] کے طریقِ استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجے کے جزوی مسائل سے لے کر تمدن و معاشرت، معیشت، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر علم و حکمت کے انتہائی منتہاءات اور قوانینِ طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک، زندگی کی تمام [illegible] اور تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب

رابطہ پایا جاتا ہے اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس طرح جوڑتا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ پیدا ہوتا ہو۔

انقلابی تصوّر

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصوّر تھا اور جاہلیت کے خمیر سے بنے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصوّر کبھی پوری طرح نہ آسکا۔ آج دنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے۔ مگر آج بھی اتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرۂ آفاق یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاتے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصوّر کے ادراک سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے ان پڑھ اور کودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصوّر وراثت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اُس کی گرفت دماغوں پر اتنی تک مضبوط ہو رہی ہے کہ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اُس کے بند نہیں کھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے تاریک حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں اور دین داری کو عبادات کے دائرے میں محدود خیال کریں تو جائے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی "تاریک خیال"۔ جاہل عوام اگر مذہب کو بابے، تعویذ اور گنڈے کے معاملات میں محدود دیکھیں تو یہ بھی مقام حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگان تہذیب و علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دور نہیں ہوتی، اور وہ بھی مذہب اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم قدیم جاہلی تصوّر کے تحت سمجھتا ہے۔ ۱۳۹ے

فصل ۲

دینِ حق کیا ہے؟

"قرآن جس دعوے کے ساتھ نوعِ انسان کو اپنے پیش کردہ مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے وہ خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آلِ عمران-۱۹) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

عموماً اس فقرے کا جو سیدھا سادھا مفہوم بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سچا مذہب تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے۔ اور "اسلام" کا جو تصور عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک مذہب کا نام ہے جو اب سے تیرہ سو برس پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا اور جس کی بنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی تھی۔ "بنا ڈالی تھی" کا لفظ میں قصداً اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ بکثرت مسلمان اور اب تو بعض اہلِ علم مسلمان بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "بانیٔ اسلام" کہتے اور لکھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اسلام کی ابتدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوئی اور آپؐ ہی اس کے بانی (Founder) ہیں۔ لہٰذا جب ایک غیر مسلم قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس فقرے پر پہنچتا ہے تو وہ یہ گمان کر کے سرسری طور پر اس سے گزر جاتا ہے کہ جس طرح ہر مذہب صرف اپنے ہی برحق ہونے اور دوسرے مذہبوں کے باطل ہونے کا مدعی ہے اسی طرح قرآن نے بھی اپنے پیش کردہ مذہب کے برحق ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔ اور جب ایک مسلمان اسے پڑھتا ہے تو وہ اس وجہ سے اس پر غور کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس مذہب کو اس فقرہ میں برحق کہا گیا ہے اُسے وہ خود بھی برحق مانتا ہے۔ یا اگر غور و فکر کے لیے اس کے ذہن میں کوئی تحریک پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ بالعموم یہ رُخ اختیار کر لیتی ہے کہ عیسائیت، ہندومت، یہودیت اور ایسے ہی دوسرے مذاہب سے اسلام کا مقابلہ کر کے اس کی حقانیت ثابت کی جائے۔ لیکن درحقیقت قرآن میں یہ مقام ایسا ہے جس پر ایک سنجیدہ طالبِ علم کو ٹھیر کر بہت غور کرنا چاہیے، اُس سے زیادہ غور کرنا چاہیے جتنا

---

۱ یہ ایک تقریر ہے جو ۱۴ مارچ [illegible] کو جامعہ ملیہ دہلی میں کی گئی تھی۔

اب تک اس پر کیا گیا ہے۔

قرآن کے اس دعوے کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں "الدین" اور "الاسلام" کا مفہوم متعین کر لینا چاہیے۔

اَلدِّین کا مفہوم

عربی زبان میں لفظ "دین" کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنی غلبہ اور استیلاء کے ہیں۔ دوسرے معنی اطاعت اور غلامی کے۔ تیسرے معنی جزا و سزا اور بدلہ کے۔ چوتھے معنی طریقہ اور مسلک کے۔ یہاں یہ لفظ اسی چوتھے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی دین سے مراد وہ طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے جس کی پیروی کی جائے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ قرآن محض دین نہیں کہہ رہا ہے بلکہ "الدین" کہہ رہا ہے۔ اس سے معنی میں وہی فرق واقع ہو جاتا ہے جو انگریزی زبان میں This is a way of life کہنے کے بجائے This is the way of Life کہنے سے واقع ہوتا ہے یعنی قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام ایک طریقِ زندگی ہے، بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے۔

پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن اس لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وسیع ترین معنی میں استعمال کرتا ہے۔ طریقِ زندگی سے اس کی مراد زندگی کے کسی خاص پہلو یا کسی خاص شعبہ کا طریق نہیں بلکہ پوری زندگی کا طریق ہے۔ الگ الگ ایک شخص کی انفرادی زندگی ہی کا طریق نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی کا طریق بھی ہے۔ ایک خاص ملک یا ایک خاص قوم یا ایک خاص زمانہ کی زندگی کا طریق نہیں بلکہ تمام زمانوں میں تمام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طریق ہے۔ لہٰذا قرآن کے دعوے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک پوجا پاٹ اور عالمِ بالا کے اعتقادات اور حیات بعد الممات کے تصورات کا ایک صحیح مجموعہ وہی ہے جس کا نام اسلام ہے۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ افرادِ انسانی کے مذہبی طرزِ خیال و عمل (جیسا کہ لفظ "مذہب" کا مفہوم آج کل کی مغربی اصطلاح میں لیا جاتا ہے) کی ایک صحیح صورت وہی ہے جسے اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کے لوگوں، یا فلاں صدی تک کے انسانوں، یا فلاں دور مثلاً صنعتی انقلاب سے پہلے تک کے آدمیوں کے لیے ایک صحیح نظامِ زندگی وہی ہے جس کو اسلام سے موسوم کیا گیا ہے۔ بلکہ صریح طور پر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ "ہر زمانے اور ہر دور میں پوری نوعِ انسانی کے لیے زمین پر زندگی بسر کرنے کا ایک ہی ڈھنگ اللہ کے نزدیک صحیح ہے، اور وہ ڈھنگ وہی ہے جس کا نام الاسلام ہے"۔

ؔ مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان کسی مقام پر قرآن کی کوئی ایسی تفسیر کی گئی ہے جس کی رو سے "دین" کا مفہوم صرف عقیدے اور خدا کے انفرادی تعلق تک محدود ہے اور تمدن و ریاست کے نظام سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ تفسیر اگر خود قرآن سے اخذ کی گئی ہے تو یقیناً بڑی دلچسپ چیز ہوگی لیکن میں نے اٹھارہ سال تک قرآن کا جو تحقیقی مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر

الاسلام کا مفہوم

۱۔ لفظ "اسلام" کو لیجیے۔ عربی زبان میں اس کے معنی ہیں سپر ڈال دینا، جھک جانا، اطاعت قبول کر لینا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ مگر قرآن محض اسلام نہیں بولتا بلکہ "الاسلام" بولتا ہے جو اس کی خاص اصطلاح ہے اس مخصوص اصطلاحی لفظ سے اس کی مراد خدا کے آگے جھک جانا، اس کی اطاعت قبول کر لینا، اس کے مقابلے میں اپنی آزادی سے دستبردار ہو جانا، اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا ہے۔ اس تسلیم و اطاعت اور سپردگی و حوالگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانونِ طبیعت (Law of Nature) کے آگے سپر ڈال دی جائے جیسا کہ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے تخیل یا اپنے مشاہدات و تجربات سے خدا کی مرضی اور اس کے منشا کا جو تصور بطورِ خود اخذ کرے اسی کی اطاعت کرنے لگے، جیسا کہ کچھ اور لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے خود اپنے رسولوں کے ذریعہ سے انسان کے لیے جس طریق فکر و عمل کی طرف رہنمائی کی ہے اس کو وہ قبول کرے اور اپنی آزادیٔ فکر و عمل ــــ یا بالفاظِ صحیح تر آوارگیٔ فکر و عمل ــــ چھوڑ کر اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر لے۔ اسی چیز کو قرآن "الاسلام" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ درحقیقت کوئی جدید العہد مذہب نہیں ہے جس کی بنا اب سے ۱۳۹۳ برس پہلے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی ہو۔ بلکہ جس روز پہلی مرتبہ اس کرۂ زمین پر انسان کا ظہور ہوا اسی روز خدا نے انسان کو بتا دیا تھا کہ تیرے لیے صرف یہ "الاسلام" ہی ایک صحیح طرزِ عمل ہے۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف گوشوں میں وقتاً فوقتاً جو پیغمبر بھی خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے مامور ہوتے ہیں ان سب کی دعوت بھی بلا استثناء اسی الاسلام کی طرف رہی ہے جس کی طرف بالآخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دعوت دی۔ یہ اور بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیرووں نے بعد میں بہت سی مختلف چیزوں کی آمیزش کر کے ایک نظام یہودیت کے نام سے اور مسیح علیہ السلام کے پیرووں نے ایک دوسرا نظام مسیحیت کے نام سے، اور اسی طرح ہندوستان، ایران، چین اور دوسرے ممالک کے پیرووں کی امتوں نے مختلف مخلوط و مرکب نظامات دوسرے ناموں سے بنا لیے ہوں لیکن موسیٰ اور مسیح اور دوسرے تمام معروف و غیر معروف انبیاء علیہم السلام جس دین کی دعوت دینے آتے تھے وہ خالص اسلام تھا نہ کہ کچھ اور۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ قرآن اپنے تمام جدید مفسرین کی خواہشات کے علی الرغم "الدین" کے لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ اس سے مراد وہ نظام ہے جو انسانوں کے لیے ان کی پوری زندگی کا نظامِ فکر و عمل مراد لیتا ہے۔ یہ اشارہ ہے اس کی اعتقادی، عبادتی، تمدنی، معاشی اور سیاسی ... بنیادوں کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن کا دعویٰ کیا ہے

اس تشریح کے بعد قرآن کا دعویٰ بالکل صاف اور واضح صورت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے، اور وہ یہ ہے:

"نوعِ انسان کے لیے خدا کے نزدیک صرف یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے کہ وہ خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کردے اور فکر و عمل کی اُس راہ پر چلے جس کی طرف خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے رہنمائی کی ہے۔"

یہ ہے قرآن کا دعویٰ۔ اب ہمیں تحقیق کرنا ہے کہ آیا یہ دعویٰ قبول کیا جانا چاہیے؟ خود قرآن نے اپنے اس دعوے کی تائید میں جو دلائل قائم کیے ہیں، ان پر تو ہم غور کریں گے ہی۔ مگر کیوں نہ اس سے پہلے خود اپنی جگہ تلاش و تجسس کر کے یہ دریافت کر لیں کہ آیا ہمارے لیے اس دعوے کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارہ کار بھی ہے؟

طریقِ زندگی کی ضرورت

یہ ظاہر ہے کہ دُنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے بہرحال ایک طریقِ زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ انسان دریا نہیں ہے جس کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے خود مُتعین ہو جاتا ہے۔ انسان درخت نہیں ہے جس کے لیے قوانینِ فطرت ایک راہ طے کر دیتے ہیں۔ انسان نرا جانور نہیں ہے جس کی رہنمائی کے لیے تنہا جبلّت ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اپنی زندگی کے ایک بڑے حصّے میں قوانینِ طبیعت کا محکوم ہونے کے باوجود انسان زندگی کے بہت سے ایسے پہلو رکھتا ہے جن میں اسے کوئی لگا بندھا راستہ نہیں ملا کہ حیوانات کی طرح بے اختیار اس پر چلتا رہے، بلکہ اس کو اپنے انتخاب سے خود ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس کو فکر کی ایک راہ چاہیے جس پر وہ اپنے اور کائنات کے اُن بہت سے مسائل کو حل کرے جنہیں فطرت اس کے سوچنے والے دماغ کے سامنے پیش تو کرتی ہے مگر ان کا کوئی حل غیر مشتبہ زبان میں نہیں بتاتی۔ اس کو علم کی ایک راہ چاہیے جس پر وہ اُن معلومات کو منظم کرے جنہیں فطرت اس کے حواس کے ذریعے سے اس کے ذہن تک پہنچاتی تو ہے مگر انہیں بطورِ خود منظّم کر کے اس کے حوالے نہیں کر دیتی۔ اس کو شخصی برتاؤ کے لیے ایک راہ چاہیے جس پر وہ اپنی ذات کے بہت سے اُن مطالبات کو پُورا کرے جن کے لیے فطرت تقاضا تو کرتی ہے مگر انہیں پُورا کرنے کا کوئی مہذب طریقہ مُعیّن کر کے نہیں دے دیتی۔ اس کو گھریلو زندگی کے لیے، خاندانی تعلقات کے لیے، معاشی معاملات کے لیے، ملکی انتظام کے لیے، بین الاقوامی ربط و تعلق کے لیے اور زندگی کے بہت سے دُوسرے پہلوؤں کے لیے بھی ایک راہ درکار ہے، جس پر وہ محض ایک شخص کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک جماعت، ایک قوم، ایک نوع کی حیثیت سے بھی چلے اور ان مقاصد تک پہنچ سکے جو اگرچہ فطرۃً اس کے مقصود و مطلوب ہیں مگر فطرت نے نہ تو ان مقاصد کو صریح طور پر اس کے سامنے نمایاں کیا ہے اور نہ ان تک پہنچنے کا ایک راستہ مُعیّن کر دیا ہے۔

زندگی کا انقسام پذیر ہونا

زندگی کے یہ مختلف پہلو جن میں کوئی ایک طریق اختیار کرنا انسان کے لیے ناگزیر ہے، بجائے خود منقسم اور ایک دوسرے سے بے نیاز شعبے نہیں ہیں۔ اس بنا پر یہ ممکن نہیں ہے کہ ان مختلف شعبوں کے لیے انسان ایسی مختلف راہیں اختیار کر سکتا ہو جن کی سمتیں الگ ہوں، جن کے زادِ راہ الگ ہوں، جن پر چلنے کے ڈھنگ اور انداز الگ ہوں، جن کی راہ نوردی کے مقتضیات الگ ہوں، اور جن کی منازلِ مقصود الگ ہوں۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی ایک ذرا سی دانشمندانہ کوشش ہی آدمی کو اس پر مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے کہ زندگی بحیثیت مجموعی ایک کُل ہے جس کا ہر جز دوسرے جز سے اور ہر پہلو دوسرے پہلو سے گہرا ربط رکھتا ہے، ایسا ربط جو توڑا نہیں جا سکتا۔ اس کا ہر جز دوسرے جز پر اثر ڈالتا ہے اور اس سے اثر قبول کرتا ہے۔ ایک ہی روح تمام اجزاء میں سرایت کیے ہوتی ہے اور وہ سب مل کر وہ چیز بناتے ہیں جسے انسانی زندگی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فی الواقع جو چیز انسان کو درکار ہے وہ زندگی کے مقاصد نہیں بلکہ مقصد ہے جس کے ضمن میں سارے چھوٹے بڑے مقاصد پوری موافقت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ سے سکیں اور جس کے حصول کی کوشش میں وہ سب حاصل ہو جائیں۔ اس کو راستے نہیں بلکہ راستہ درکار ہے جس پر وہ اپنی پوری زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنے مقصودِ حیات کی طرف لے چلے۔ اس کو فکر، علم، ادب، آرٹ، تعلیم، تہذیب، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون وغیرہ کے لیے الگ الگ نظامات نہیں بلکہ ایک جامع نظام درکار ہے جس میں یہ سب ہمواری کے ساتھ سموئے جا سکیں، جس میں ان سب کے لیے ایک ہی مزاج اور ایک ہی طبیعت رکھنے والے مناسب اصول موجود ہوں، اور جس کی پیروی کر کے آدمی اور آدمیوں کا مجموعہ اور بحیثیت الکل پوری آدمیت اپنے بلند ترین مقصود تک پہنچ سکے۔ وہ جاہلیت کا تاریک دور تھا جب زندگی کو مستقل جداگانہ شعبوں میں تقسیم کرنا ممکن خیال کیا جاتا تھا۔ اب اگر کچھ لوگ اس طرز خیال کی بحث گفتگو کرنے والے موجود ہیں تو وہ بیچارے یا تو اخلاص کے ساتھ پرانے خیالات کی فضا میں اب تک سانس لے رہے ہیں اس لیے قابلِ رحم ہیں، یا پھر وہ ظالم حقیقت کو خوب جانتے ہیں مگر جان بوجھ کر یہ گفتگو صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ جس "دین"[1] کو وہ کسی انسانی آبادی میں رائج کرنا چاہتے ہیں اس کے اصولوں سے اختلاف رکھنے والوں کو تھپکیاں دے کر یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ تہا جسے اس دین کے تحت نہیں زندگی کے فلاں فلاں شعبوں میں، جو بدقسمتی سے تم کو عزیز تر ہیں، پورا تحفظ حاصل رہے گا۔ حالانکہ یہ تحفظ عقلاً محال، فطرۃً ممتنع، عملاً ناممکن ہے، اور اس طرح کی گفتگو کرنے

---

[1] یعنی دین تو تیت جس میں قدا اور کتاب اور رسالت سے بے تعلق ہو کر یا اس زندگی قاعدوں پر ایک ملکت کے باشندوں کے لیے ایک نظامِ زندگی بنایا جاتا ہے۔ (مؤلف)

والے غالباً خود بھی جانتے ہیں کہ یہ نا ممکن ہے۔ ہر دینِ غالب زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی رُوح اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر ہی رہتا ہے۔ جس طرح ہر کاہن تک ان تمام چیزوں کو مبدّل بہ نمک کر کے ہی رہتی ہے جو اس کے حدود میں داخل ہو جائیں۔

زندگی کی جغرافی و نسلی تقسیم

پھر جس طرح یہ بات مہمل ہے کہ انسانی زندگی کو جُدا جُدا شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مُہمل بات یہ ہے کہ اسے جغرافی حلقوں یا نسلی دائروں میں تقسیم کیا جائے۔ انسان بلاشبہ زمین کے بہت سے حصّوں میں پایا جاتا ہے جن کو دریاؤں نے، پہاڑوں نے، جنگلوں اور سمندروں نے یا مصنوعی سرحدوں نے تقسیم کر رکھا ہے۔ اور انسان کی بہت سی مختلف نسلیں اور قومیں بھی ضرور پائی جاتی ہیں جن کے درمیان تاریخی، نفسیاتی اور دوسرے اسباب سے انسانیت کے نشوونما اور ارتقاء نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ لیکن اس اختلاف کو حقیقت قرار دے کر جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہر نسل، ہر قوم، اور ہر جغرافی آبادی کے لیے دین یعنی نظامِ زندگی الگ ہونا چاہیے وہ سراسر ایک مُہمل بات کہتا ہے۔ اُس کی محدود نگاہ مظاہر اور عوارض کے اختلافات میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ اس ظاہری کثرت کے اندر جوہرِ انسانیت کی وحدت کو وہ نہیں پا سکا۔ اگر فی الواقع یہ اختلافات اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی بنا پر دین الگ الگ ہونے چاہییں تو میں کہوں گا کہ زیادہ سے زیادہ جو اختلافات ایک ملک اور دوسرے ملک، ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان آپ پاتے ہیں، اُن سب کو جس قدر مبالغہ کے ساتھ چاہیں فلمبند کر لیں؛ اور پھر اُن اختلافات کا خالص علمی جائزہ لیں جو عورت اور مرد میں پائے جاتے ہیں، جو ہر انسان اور دوسرے انسان میں پائے جاتے ہیں، جو ایک ہی ماں اور باپ کے دو بچوں میں پائے جاتے ہیں۔ شاید میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ دعویٰ کروں کہ علمی تحلیل و تجزیہ میں پہلی قسم کے اختلافات سے یہ دوسری قسم کے اختلافات بہرحال شدید تر ہی نکلیں گے۔ پھر کیوں نہ کہہ دیجیے کہ ہر فرد کا نظامِ زندگی الگ ہونا چاہیے؟ مگر جب آپ انفرادی، جنسی، خاندانی کثرتوں کے اندر وحدت کا ایک عنصر اور پائیدار عنصر ایسا پاتے ہیں جس کی بنیاد پر قوم، وطن یا نسل کا تصوّر قائم ہو سکتا ہے اور اس تصوّر کی بنا پر ایک قوم یا ایک ملک کی کثیر آبادی کے لیے ایک نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جاتا ہے، تو آخر کس چیز نے آپ کو روک دیا ہے کہ قومی، نسلی، وطنی کثرتوں کے درمیان ایک بڑی اور بنیادی وحدت کا عنصر آپ نہیں پا سکتے جس پر انسانیت کا تصوّر قائم ہو اور جس کی بنا پر تمام عالمِ انسانی کا ایک دین یا نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جا سکے؟ کیا یہ

لہ اس مسئلے پر مفصّل بحث کے لیے مصنّف کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصّہ اوّل و دوم کا مطالعہ مفید ہوگا، خصوصاً حصّہ دوم میں بنیادی حقوق کی بحث۔ (مرتبین)

واقعہ نہیں ہے کہ تمام جغرافی، نسلی اور قومی اختلافات کے باوجود اصل بنیادی امور میں سب انسان بالکل یکساں ہیں؟ کیا وہ قوانینِ طبعی یکساں نہیں ہیں جن کے تحت انسان دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے؟ کیا وہ نظامِ جسمانی یکساں نہیں ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے؟ کیا وہ خصوصیات یکساں نہیں ہیں جن کی بنا پر انسان دوسری موجودات سے الگ ایک مستقل نوع قرار پاتا ہے؟ کیا وہ فطری داعیات اور مطالبات یکساں نہیں ہیں جو اُن کے اندر ودیعت کیے گئے ہیں؟ کیا وہ قوتیں یکساں نہیں ہیں جن کے مجموعے کو ہم نفسِ انسانی کہتے ہیں؟ اور کیا بنیادی طور پر وہ تمام طبعی، نفسیاتی، تاریخی، تمدنی اور معاشی عوامل بھی یکساں نہیں ہیں جو انسانی زندگی میں کارفرما ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے کہ ان تمام امور میں سب انسانوں کے درمیان یکسانی پائی جاتی ہے تو پھر یقیناً اُن اصولوں کو بھی، جو انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے صحیح ہوں، عالمگیر ہونا چاہیے۔ اُن کے قومی یا نسلی یا وطنی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قومیں اور نسلیں ان اصولوں کے تحت اپنی خصوصیات کا اظہار اور جزوی طور پر اپنے معاملاتِ زندگی کا بندوبست مختلف طریقوں سے کر سکتی ہیں اور ان کو ایسا کرنا چاہیے۔ مگر انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے جس صحیح دین یا نظامِ زندگی کی ضرورت ہے وہ بہرحال ایک ہی ہونا چاہیے۔ عقل یہ باور کرنے سے انکار کرتی ہے کہ جو چیز ایک قوم کے لیے حق ہو وہ دوسری قوم کے لیے باطل ہو جائے اور جو ایک قوم کے لیے باطل ہو وہ دوسری قوم کے لیے حق ہو جائے۔

زندگی کی زمانی تقسیم

ان جہالات اور جدید زمانہ کے عالمانہ جہلات میں سے ایک اور بات، جو حقیقت کے اعتبار سے جہلِ مرکب ہے، مگر حیرت ہے کہ تیقن کے پورے وثوق کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، انسانی زندگی کی زمانی تقسیم ہے، یعنی کہا جاتا ہے کہ جو نظامِ زندگی ایک دور میں حق ہوتا ہے وہ دوسرے دور میں باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ زندگی کے مسائل و معاملات ہر دور میں بدل جاتے ہیں، اور نظامِ زندگی کا حق یا باطل ہونا سراسر اُن مسائل و معاملات ہی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ یہ بات اُسی انسانی زندگی کے متعلق کہی جاتی ہے جس کے متعلق ساتھ ہی ساتھ ارتقائی گفتگو بھی کی جاتی ہے، جس کی تاریخ میں کارفرما قوانین بھی تلاش کیے جاتے ہیں، جس کے گزشتہ تجربات سے حال کے لیے سبق اور مستقبل کے لیے احکام بھی مستنبط کیے جاتے ہیں، اور جس کے لیے "انسانی فطرت" نامی ایک چیز بھی ثابت کی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا آپ کے پاس کوئی ایسا آلۂ پیمائش ہے جس سے آپ نوعِ انسانی کی اس مسلسل تاریخی حرکت کے درمیان دور، یا زمانے یا عہد کی واقعی حد بندیاں کر سکتے ہوں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ان حد بندیوں میں سے کسی ایک خط پر انگلی رکھ کر آپ کہہ سکتے ہوں کہ اس خط کے اُس پار جو مسائلِ زندگی تھے وہ اس پار آکر تبدیل ہو گئے، اور جو حالات اُس پار تھے وہ اِس پار باقی نہیں رہے؟ اگر فی الواقع انسانی سرگزشت ایسے ہی الگ الگ زمانی ٹکڑوں میں منقسم ہے تب تو یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک ٹکڑا جو گزر چکا ہے وہ بعد والے ٹکڑے کے لیے

محض ایک فضول اور لایعنی چیز ہو گیا۔ اُس کے گزرتے ہی وہ سب کچھ ضائع ہو گیا جو انسان نے اُس حصۂ عمر میں کیا تھا۔ اُس زمانے میں جو تجربات انسان کو ہوئے وہ بعد والے زمانے کے لیے کوئی سبق اپنے اندر نہیں رکھتے کیونکہ وہ حالات وہ مسائل ہی فنا ہو گئے جن میں انسان نے بعض طریقوں کا، بعض اصولوں کا، بعض قدروں کے لیے سعی و جہد کا تجربہ کیا تھا۔ پھر یہ ارتقاء کی گفتگو کیوں؟ یہ قوانین حیات کی تلاش کس لیے؟ یہ تاریخی استنباط کس بنا پر؟ جب آپ ارتقاء کا نام لیتے ہیں تو لامحالہ یہ اس بات کو متضمن ہوتا ہے کہ وہاں کوئی چیز ضرور ہے جو تمام تغیرات کا موضوع بنتی ہے اور ان تغیرات کے اندر اپنے آپ کو باقی رکھتے ہوئے پیہم حرکت کرتی ہے۔ جب آپ قوانین حیات پر بحث کرتے ہیں تو یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ ان ناپائیدار حالات میں، ان رواں دواں مظاہر میں، ان بنتی اور بگڑنے والی صورتوں میں کوئی پائیدار اور زندہ حقیقت بھی ہے جو اپنی ایک ذاتی فطرت اور اپنے کچھ مستقل قوانین بھی رکھتی ہے۔ جب آپ تاریخی استنباط کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ کے اس طول طویل رستہ پر جو مسافر مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا آ رہا ہے، اور منزلوں پر منزلیں طے کرتا چلا جا رہا ہے، وہ خود اپنی کوئی شخصیت اور اپنا کوئی مستقل مزاج رکھتا ہے جس کے متعلق یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مخصوص حالات میں مخصوص طور پر کام کرتا ہے، ایک وقت میں بعض چیزوں کو قبول کرتا ہے اور دوسرے وقت میں انہیں رد کر دیتا ہے اور بعض دوسری چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت، یہ پائیدار موضوعِ تغیرات، یہ شاہراہِ تاریخ کا مستقل مسافر وہی تو ہے جسے آپ غالباً "انسانیت" کہتے ہیں۔ مگر کیا بات ہے کہ جب آپ رستے کی منزلوں اور اُن میں پیش آنے والے حالات اور اُن سے پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو شروع کرتے ہیں تو اس گفتگو میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ خود مسافر آپ کو یاد نہیں رہتا؟ کیا یہ سچ ہے کہ منزلیں اور اُن کے حالات اور اُن کے مسائل بدل جانے سے مسافر اور اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی ساخت بالکل نہیں بدلی۔ اس کے عناصر ترکیبی وہی ہیں جو آپ سے ہزاروں برس پہلے تھے۔ اس کا مزاج وہی ہے، اس کی فطرت کے تقاضے وہی ہیں، اس کی صفات و خصوصیات وہی ہیں، اس کے رجحانات و میلانات وہی ہیں، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں وہی ہیں، اس کی کمزوریاں اور قابلیتیں وہی ہیں، اس کے فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کے قاعدے وہی ہیں، اس پر کارفرمائی کرنے والی قوتیں وہی ہیں، اور اس کا کائناتی ماحول بھی وہی ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی ابتدائے آفرینش سے آج تک ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ تاریخ کے دوران میں حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل زندگی کے تغیر سے خود انسانیت بھی بدلتی چلی آئی ہے۔ یا وہ بنیادی چیزیں بھی متغیر ہوتی رہی ہیں جو انسانیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو اس دعوے میں کیا وزن ہو سکتا ہے کہ انسان کے لیے جو چیز کل ترقی تھی وہ آج رجعت ہے، جو چیز کل حق تھی وہ آج باطل ہے، جو چیز کل قدر رکھتی تھی وہ آج

بے قدر ہے۔

انسان کیسے طریقِ زندگی کا حاجت مند ہے؟

اصل یہ ہے کہ انسانی افراد اور جماعتوں نے تاریخ کے دوران میں نفسِ انسانیت کو اور اس سے تعلق رکھنے والی بنیادی چیزوں کو سمجھنے میں دھوکا کھا کر اور بعض حقیقتوں کے اعتراف میں مبالغہ اور بعض کے ادراک میں قصور کر کے جو غلط نظامِ زندگی وقتاً فوقتاً اختیار کیے اور جنہیں انسانیتِ کبریٰ (Humanity at Large) نے تجربے کے بعد غلط پا کر دوسرے ایسے ہی نظامات کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور کر دیا، ان کی سرگزشت کے مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا ہے کہ انسانیت کے لیے لازماً ہر دور میں ایک الگ نظامِ زندگی درکار ہے جو صرف اُسی دور کے حالات و مسائل سے پیدا ہو اور انہی کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ حالانکہ زیادہ صحت کے ساتھ اس سرگزشت سے اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کے زمانی اور دَوری نظاماتِ زندگی، یا بالفاظِ دیگر موسمی حشرات الارض کو بار بار آزمانے اور ہر ایک کی ناکامی کے بعد اس کے دوسرے جانشین کا تجربہ کرنے میں انسانیتِ کبریٰ کا وقت ضائع ہوتا ہے، اس کی راہ ماری جاتی ہے، اس کے نشوو ارتقاء اور اپنے کمالِ مطلوب کی طرف اس کے سفر میں سخت رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ وہ درحقیقت محتاج اور سخت محتاج ہے ایسے نظامِ زندگی کی جو خود اُس کو اور اُس سے تعلق رکھنے والی تمام حقیقتوں کو جان کر عالمگیر، دائمی اور پائیدار اصولوں پر قائم کیا جائے جسے لے کر وہ حال و مستقبل کے تمام متغیر حالات سے بخیر و خوبی گزر سکے، ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کر سکے اور زندگی کے راستے پر افتاں و خیزاں نہیں بلکہ رواں اور دواں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ سکے۔

کیا انسان ایسا نظام خود بنا سکتا ہے؟

یہ ہے اس "دین" یا طریقِ زندگی یا نظامِ زندگی کی نوعیت جس کا انسان حاجت مند ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اگر انسان خدا کی مدد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لیے اس نوعیت کا ایک دین بنانا چاہے تو کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ میں آپ کے سامنے یہ سوال پیش نہ کروں گا کہ آیا انسان اب تک ایسا دین خود بنانے میں کامیاب ہوا ہے؟ کیونکہ اس کا جواب تو قطعاً نفی میں ہے۔ خود وہ لوگ بھی جو آج بڑے بڑے بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ اپنے دین پیش کر رہے ہیں اور ان کے لیے ایک دوسرے سے لڑے مر رہے ہیں، یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کا پیش کردہ دین ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جن کے لیے انسان من حیث الانسان ایک "الدّین" کا محتاج ہے۔ کسی کا دین نسلی و قومی ہے، کسی کا جغرافی، کسی کا طبقاتی، اور کسی کا دین پیدا ہی اُس دَور کے تقاضوں سے ہوا ہے جو ابھی کل ہی گزر چکا ہے، رہا وہ دور جو کل آنے والا ہے اُس کے حالات و مسائل کے متعلق کچھ پیشگی نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں بھی وہ کام دے سکے گا یا نہیں، کیونکہ جو دَور اب گزر رہا ہے ابھی تو اُسی کے

تاریخی تقاضوں کا جائزہ لینا باقی ہے ۔ اِسی لیے مَیں سوال یہ نہیں کر رہا ہوں کہ انسان ایسا دین بنانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں، بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ کامیاب ہو بھی سکتا ہے یا نہیں ؟

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس سے سرسری طور پر بحث کرنا مناسب نہیں ہے ۔ یہ انسانی زندگی کے فیصلہ کُن سوالات میں سے ایک ہے۔ اس لیے پہلے خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ وہ چیز کیا ہے جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے ، اور اس شخص کی قابلیتیں کیا ہیں جس کے متعلق یہ پوچھا جا رہا ہے کہ وہ اس کو وضع کر سکتا ہے یا نہیں ۔

الدّین کی نوعیّت

انسان کے لیے جس "الدّین" کی ضرورت مَیں نے ابھی ثابت کی ہے اس سے مُراد کوئی ایسا تفصیلی ضابطہ نہیں ہے جس میں ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لیے تمام چھوٹے بڑے جزئیات تک مُرتّب ہوں اور جس کی موجودگی میں انسان کا کام صرف اس کے مطابق عمل کرنا ہو۔ بلکہ دراصل اس سے مُراد ایسے ہمہ گیر ازلی و ابدی اصُول ہیں جو تمام حالات میں انسان کی رہنمائی کر سکیں ، اس کی فکر و نظر ، سعی و جہد اور پیش قدمی کے لیے صحیح رُخ متعیّن کر سکیں اور اسے غلط تجربات میں وقت اور محنت اور قوت ضائع کرنے سے بچا سکیں۔

اس غرض کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا علم ——— قیاس و گمان نہیں بلکہ علم ——— ہو کہ اس کی اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے ۔

پھر وہ اس بات کے جاننے کا ——— سمجھ بیٹھنے کا نہیں بلکہ جاننے کا ——— حاجت مند ہے کہ آیا زندگی بس یہی دُنیا کی زندگی ہے یا یہ پُوری زندگی کا ایک ابتدائی حصّہ ہے ۔ آیا سفر بس پیدائش سے لے کر موت تک کی مسافت کا ہے یا یہ پُورے سفر میں سے محض ایک مرحلہ ہے ۔

پھر اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا مقصدِ زندگی اس کے لیے متعیّن ہو جو حقیقت کے اعتبار سے ——— نہ کہ محض خواہش کی بنا پر ——— واقعی حیاتِ انسانی کا مقصود ہو جس کے لیے دراصل انسان پیدا کیا گیا ہو ، اور جس کے ساتھ ہر فرد ، ہر مجموعۂ افراد اور بحیثیتِ کُلّی تمام انسانیّت کے مقاصد تمام زمانوں میں بلا کسی تصادم و مزاحمت کے ہم آہنگ ہو سکیں ۔

پھر اس کو اخلاق کے ایسے پختہ اور ہمہ گیر اصُولوں کی ضرورت ہے جو اس کی فطرت کی تمام خصوصیات کے ساتھ مناسبت بھی رکھتے ہوں ، اور تمام ممکن حالات پر نظری و عملی حیثیت سے منطبق بھی ہو سکتے ہوں ، تاکہ وہ انہی اصولوں کی بنیاد پر اپنی سیرت کی تعمیر کر سکے ، انہی کی رہنمائی میں سفرِ زندگی کی ہر منزل پر پیش آنے والے مسائل کو حل کر سکے اور کبھی اس خطرے میں مبتلا نہ ہو کہ تغیّر پذیر حالات و مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاقی

اصُول ٹوٹتے اور بنتے چلے جاتے ہیں اور وہ محض ایک بے اصُولا نرا ابن الوقت بن کر رہ جاتا ہے۔

پھر اس کو تمدّن کے ایسے جامع اور وسیع اصُولوں کی ضرورت ہے جو انسانی اجتماع کی حقیقت وغایت اور اس کے فطری تقاضوں کو سمجھ کر بنائے جائیں۔ جن میں افراط و تفریط اور بے اعتدالی نہ ہو۔ جن میں تمام انسانوں کی مجموعی مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہو۔ جن کی پیروی کر کے ہر زمانے میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تشکیل، تعمیر اور ترقی کے لیے سعی کی جا سکے۔

پھر اسے شخصی کردار اور اجتماعی رویّے اور انفرادی و اجتماعی سعی و عمل کو صحیح سمت سفر کا پابند اور بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے جامع حدُود کی ضرورت ہے جو شاہراہِ زندگی پر نشاناتِ راہ کا کام دیں اور ہر موڑ، ہر دوراہے، ہر خطرناک مرحلے پر اُسے آگاہ کر دیں کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں ہے بلکہ اِدھر ہے۔

پھر اس کو چند ایسے عملی ضابطوں کی ضرورت ہے جو اپنی نوعیّت کے اعتبار سے دائمی اور عالمگیر پیروی کے قابل ہوں اور انسانی زندگی کو اُس حقیقتِ نفس الامری، اُس مآلِ زندگی، اُس مقصدِ حیات، اُن اصولِ اخلاق، اُن اصُولِ تمدّن اور اُن حدودِ عمل سے ہمیشہ وابستہ رکھیں جن کی تعیین اُس الدّین میں کی گئی ہو۔

یہ ہے وہ چیز جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اب غور کیجیے۔ کیا انسان ایسے ذرائع رکھتا ہے جن سے وہ خود اپنے لیے ایک ایسا الدّین وضع کر سکے؟

انسانی ذرائع کا جائزہ

انسان کے پاس اپنا "دین" یا طریقِ زندگی اخذ کرنے کے ذرائع چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ پہلا ذریعہ خواہش ہے۔ دوسرا ذریعہ عقل ہے۔ تیسرا ذریعہ مشاہدہ و تجربہ ہے۔ چوتھا ذریعہ پچھلے تجربات کا تاریخی ریکارڈ ہے۔ غالباً ان کے سوا کسی پانچویں ذریعہ کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ ان چاروں ذرائع کا جتنا مکمل جائزہ مَیں لے سکا ہوں، وہ آپ دیکھ سکتے ہیں، دیکھیے۔ کیا یہ "الدّین" کے ایجاد کرنے میں انسان کی مدد کر سکتے ہیں؟ میں نے اپنی عمر کا معتدبہ حصّہ اس کی تحقیق میں صرف کیا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ذرائع "الدّین" کی ایجاد میں تو مدد نہیں دے سکتے، البتہ اگر کوئی غیر انسانی رہنما "الدّین" کو پیش کر دے تو اسے سمجھنے، پرکھنے، جانچنے اور اس کے مطابق زندگی کے تفصیلی نظام کو وقتاً فوقتاً مرتّب کرتے رہنے میں ضرور مددگار بن سکتے ہیں۔

خواہش

پہلے خواہش کو لیجیے۔ کیا یہ انسان کی رہنما بن سکتی ہے؟ اگرچہ یہ انسان کے اندر اصلی محرّک عمل ہے، مگر اس کی عین فطرت ہی میں جو کمزوریاں موجود ہیں ان کی بنا پر یہ رہنمائی کے قابل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تنہا رہنمائی کرنا تو درکنار، عقل اور علم کو بھی اکثر اس نے گمراہ کیا ہے۔ اس کو تربیت سے خواہ کتنا ہی روشن خیال بنا دیا جائے، پھر جانی آخری

فیصلہ جب کبھی اس پر چھوڑا جاتا ہے تو یہ یا تو مبالغہ [illegible] وہ فرد کی حالات میں [illegible] ہی فیصلہ کرے گی کیونکہ اس
کے اندر جو تقاضے پائے جاتے ہیں وہ اس کو صحیح فیصلہ کرنے کے بجائے ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں جن سے
مطلوب کسی نہ کسی طرح جاری اور با آسانی حاصل ہو جاتا ہے یہ بجائے خود خواہش انسانی کی غلطی کی دلیل ہے
لہٰذا خواہ ایک فرد کی خواہش ہو یا ایک طبقہ کی، یا وہ خواہش عام (General Will) ہو
جس کا روسو نے ذکر کیا ہے، بہرحال کسی قسم کی انسانی خواہش بھی فطرۃً یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ ایک الدین
کو وضع کرنے میں مددگار بن سکے کیونکہ حیات انسانی کے [illegible] (Ultimate Problem) [illegible] یعنی حیات
انسانی کی حقیقت، اس کے آغاز اور اس کی غایت کا مسئلہ [illegible] حل کر ہی
نہیں سکتی۔

عقل

پھر عقل کو لیجیے۔ اس کی تمام بہترین صلاحیتیں مسلم۔ انسانی زندگی میں اس کی اہمیت بھی ناقابل انکار۔ اور
یہ بھی تسلیم کہ انسان کے اندر یہ بہت بڑی رہنما طاقت ہے۔ لیکن قطع نظر اس سوال کے کہ [illegible] الدین
کس کی عقل وضع کرے گی، زید کی؟ بکر کی؟ تمام انسانوں کی؟ یا انسانوں کے کسی خاص گروہ کی؟ اس زمانہ کے
لوگوں کی؟ یا کسی پچھلے زمانے والوں کی؟ یا آئندہ آنے والوں کی؟ سوال صرف یہ ہے کہ [illegible] خود عقل انسانی
کے حدود کا جائزہ لینے کے بعد کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ [illegible] کے وضع کرنے میں اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ عقل
کے تمام فیصلے منحصر ہیں اس مواد پر جو حواس اس کو فراہم کرتے ہیں۔ وہ غلط مواد فراہم کریں گے تو یہ غلط
فیصلہ کرے گی، وہ ناقص مواد فراہم کر کے دیں گے تو یہ ناقص فیصلہ کرے گی، اور جن امور میں وہ کوئی مواد
فراہم کر کے نہ دیں گے ان میں اگر یہ خود شناس ہے تو کوئی فیصلہ نہ کرے گی اور اگر یہ خود غلط ہے تو اندھیرے میں
تیر چلاتی رہے گی۔ یہ محدودیتیں جن سے ہماری عقل کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، [illegible] اس کی اہل ہو سکتی ہے کہ اس
کے لیے الدین بنانے کی تکلیف اسے دی جا سکے؟ "الدین" بنانے کا انحصار جن مسائل عالیہ کے حل پر ہے ان میں تو
سرے سے کوئی مواد فراہم ہی نہیں کرتے، پھر کیا ان مسائل کا فیصلہ تخیلات، ادھ کچے قیاسات اور تجربوں سے کیا
جا سکتا ہے؟ "الدین" بنانے کے لیے جن مستقل اخلاقی قدروں کا تعین ناگزیر ہے ان کے لیے حواس بہت ہی ناقص مواد
فراہم کرتے ہیں۔ پھر کیا عقل سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ناقص مواد پر صحیح و قابل قدروں کا تعین کرے گی؟ [illegible]
"الدین" کے جو دوسرے اجزاء تشریحی بہر نے بیان کیے ہیں ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی حواس سے بالکل
صحیح اور مکمل مواد حاصل نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر عقل ایک جامع و مکمل نظام بنا سکے۔ اور اس پر مزید یہ ہے کہ
عقل کے ساتھ خواہش کا عنصر مستقل طور پر لگا ہوا ہے جو اپنے حسب منشا نتیجے [illegible] کرتا ہے اور اس کی راہ [illegible]

روی کو کچھ نہ کچھ ٹیڑھ کی طرف مائل کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ عقلِ انسانی حواس کے فراہم کردہ مواد کی ترتیب اور اس سے استدلال کرنے میں کوئی غلطی نہ کرے گی، تب بھی اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ اس قابل ہوتا نہیں کہ اتنے بڑے کام کا بوجھ اس پر ڈالا جاسکے۔ یہ بوجھ اس پر ڈالنا اس پر بھی ظلم کرنا ہے اور خود اپنے اوپر بھی۔

سائنس

اب تیسرے ذریعہ کو لیجیے، یعنی وہ علم جو مشاہدات و تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اس علم کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے میں کسی طالب علم سے پیچھے نہیں ہوں اور نہ ذرہ برابر اس کی تحقیر کرنا پسند کرتا ہوں۔ لیکن اس کی محدودیتوں کو نظر انداز کر کے اسے وہ وسعت دینا جو فی الواقع اسے حاصل نہیں ہے، میرے نزدیک بے علمی ہے۔ "علمِ انسانی" کی حقیقت پر جس شخص کی بھی نظر ہوگی وہ اس بات کو ماننے سے انکار نہ کرے گا کہ جہاں تک مسائلِ عالیہ کا تعلق ہے، ان کی کنہ تک اس کی رسائی محال ہے۔ کیونکہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہی نہیں ہیں جن سے وہ اس تک پہنچ سکے۔ نہ وہ اس کا براہِ راست مشاہدہ کر سکتا ہے اور نہ مشاہدہ و تجربہ کے تحت آنے والی اشیاء سے استدلال کر کے اس کے متعلق ایسی رائے قائم کر سکتا ہے جس پر "علم" کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ لہٰذا "الدین" وضع کرنے کے لیے جن مسائل کا حل معلوم کرنا سب سے پہلی ناگزیر ضرورت ہے وہ تو علم کی دسترس سے باہر ہی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اخلاقی قدریں، تمدن کے اصول، اور بے راہ روی سے بچانے والے حدود متعین کرنے کا کام آیا علم کے حوالے کیا جا سکتا ہے یا نہیں، تو اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ کام کس شخص یا گروہ یا کس زمانہ کا علم انجام دے گا، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ علمی طور پر یہ کام انجام دینے کے لیے ناگزیر شرائط کیا ہیں۔ اس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ اُن تمام قوانینِ فطرت کا علم ہو جن کے تحت انسان اس دنیا میں جی رہا ہے۔ اس کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ خود انسان کی اپنی زندگی سے جو علوم تعلق رکھتے ہیں وہ مکمل ہوں۔ اس کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے علوم، یعنی کائناتی اور انسانیاتی علوم کی معلومات یکجا ہوں اور کوئی ذہنِ کامل ان کو صحیح ترتیب دے کر، اُن سے صحیح استدلال کر کے، انسان کے لیے اخلاقی قدروں کا، تمدن کے اصولوں کا، اور بے راہ روی سے بچانے والی حدوں کا تعین کرے۔ یہ شرائط نہ اس وقت تک پوری ہوئی ہیں، نہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ پانچ ہزار برس بعد پوری ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ انسانیت کی وفات سے ایک دن پہلے یہ پوری ہو جائیں، مگر اُس وقت اس کا فائدہ ہی کیا ہوگا۔

"تاریخ

آخر میں اُس ذریعہ علم کو لیجیے جسے ہم پچھلے انسانی تجربات کا تاریخی ریکارڈ یا انسانیت کا نامۂ اعمال کہتے ہیں۔ اس کی اہمیت اور اس کے فائدوں سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں، اور غور کریں گے تو آپ بھی مان لیں گے کہ "الدین" وضع کرنے کا عظیم الشان کام انجام دینے کے لیے یہ بھی ناکافی ہے۔ میں یہ سوال نہیں کرتا کہ یہ ریکارڈ واقعی

سے حال کے لوگوں تک صحت اور جامعیت کے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں؟ میں یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اس ریکارڈ کی مدد سے "الدین" وضع کرنے کے لیے انسانیت کا نمائندہ کس ذہن کو بنایا جائے گا؟ ہیگل کے ذہن کو؟ مارکس کے ذہن کو؟ ارنسٹ ہیکل کے ذہن کو؟ یا کسی اور ذہن کو؟ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ماضی، حال، یا مستقبل میں کس تاریخ تک کا ریکارڈ ایک "الدین" وضع کرنے کے لیے کافی مواد فراہم کر سکے گا؟ اُس تاریخ کے بعد پیدا ہونے والے خوش قسمت ہیں۔ باقی رہے اس سے پہلے گزر جانے والے تو ان کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

مایوس کن نتیجہ

یہ مختصر اشارات جو میں نے کیے ہیں، مجھے توقع ہے کہ میں نے ان میں کوئی علمی یا استدلالی غلطی نہیں کی ہے لہٰذا اگر انسان کے ذرائع کا یہ جائزہ جو میں نے لیا ہے، صحیح ہے تو پھر یہیں کوئی چیز اس تعین تک پہنچنے سے باز نہیں رکھ سکتی کہ انسان اپنے لیے کوئی کچا پکا، غلط سلط، وقتی اور مقامی "دین" تو وضع کر سکتا ہے، لیکن وہ چاہے کہ "الدین" وضع کرے، تو یہ قطعی محال ہے۔ پہلے بھی محال تھا، آج بھی محال ہے، اور آئندہ کے لیے بھی اس کے امکان سے پوری مایوسی ہے۔

اب اگر کوئی خدا رہنمائی کے لیے موجود نہیں ہے جیسا کہ منکرین خدا کا خیال ہے، تو انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ خودکشی کر لے۔ جس مسافر کے لیے نہ کوئی رہنما موجود ہو اور نہ جس کے اپنے پاس راستہ معلوم کرنے کے ذرائع موجود ہوں، اس کے لیے یاس اور کامل یاس کے سوا کچھ مقدر نہیں۔ اس کا کوئی چارہ اس کے سوا نہیں اور کیا مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ سر راہ ایک پتھر سے اپنی مشکل آسان کر لے۔ اور اگر خدا ہے لیکن رہنمائی کرنے والا خدا نہیں ہے جیسا کہ بعض فلسفیانہ اور سائنٹیفک طرز کے مثبتین خدا کا گمان ہے، تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک صورت حال ہے۔ جس خدا نے موجودات عالم کے بقا و نشو و نما کے لیے ہر اُس چیز کی فراہمی کا انتظام کیا ہے جس کی ضرورت کا تصور کیا جا سکتا ہو، لیکن ایک نہیں کیا تو صرف انسان کی اُس سب سے بڑی ضرورت کا انتظام جس کے بغیر پوری نوع کی زندگی غلط ہوئی جاتی ہے، اس کی بنائی ہوئی دُنیا میں رہنا ایک مصیبت ہے، ایسی سخت مصیبت جس سے بڑھ کر کسی دوسری مصیبت کا تصور ممکن نہیں۔ آپ غریبوں اور مفلسوں، بیماروں اور زخمیوں، مظلوموں اور دُکھی جنتاؤں کی مصیبت پر کیا روتے ہیں، روئیے اس پوری نوع کی مصیبت پر جو اس بیچارگی کے عالم میں چھوڑ دی گئی ہے کہ بار بار غلط تجربے کر کے ناکام ہوتی ہے، ٹھوکریں کھا کر گرتی ہے اور پھر اُٹھ کر چلتی ہے تاکہ پھر ٹھوکر کھائے، ہر ٹھوکر پر لاکھوں کروڑوں بندگانِ خدا کی زندگیاں اور بسا اوقات پورے پورے ملک اور قومیں تباہ ہو جاتی ہیں، اس غریب کو اپنے مقصدِ زندگی تک کی خبر نہیں ہے، کچھ نہیں جانتی کہ کاہے کے لیے سعی و عمل کرے اور کس ڈھنگ پر کرے۔ یہ سب کچھ وہ خدا دیکھ رہا ہے جو اسے زمین پر وجود میں لایا ہے، مگر وہ بس پیدا کرنے سے مطلب رکھتا ہے، رہنمائی کی پروا نہیں کرتا۔

اُمید کی ایک ہی کرن

اس تصویر کے بالکل برعکس قرآن ہمارے سامنے صورتِ حال کا ایک دوسرا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا محض پیدا ہی کر دینے والا نہیں ہے بلکہ رہنمائی کرنے والا بھی ہے۔ اس نے موجوداتِ عالم میں سے ہر چیز کو وہ ہدایت بخشی ہے جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اس کے لیے ضروری ہے۔ اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔[1] اگر اس کا ثبوت پانا ہو تو کسی چیونٹی، شہد کی مکھی، یا مکڑی کو جا کر دیکھ لو۔ جو خدا ان مخلوقات کی رہنمائی کر رہا ہے وہی خدا انسان کی بھی رہنمائی کرنے والا ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے کہ وہ دوسروں کو چھوڑ کر اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور جس جامع اور مکمل نظامِ زندگی یا "الدین" کی ہدایت اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجی ہے، اس کی پیروی اختیار کر لے۔

دیکھیے! ایک طرف تو وہ نتیجہ ہے جو انسان کی کوششوں اور اس کے تدریجی تجربات کا لگاتار جائزہ لینے سے ہم کو حاصل ہوتا ہے، اور دوسری طرف قرآن کا یہ دعویٰ ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ یا تو اس دعوت کو قبول کریں، یا پھر اپنے آپ کو مایوسی اور اس مایوسی کے حوالے کر دیں کہ اندھیرے میں کہیں برائے نام بھی اُمید کی کرن نظر نہیں آتی۔ دراصل صورتِ حال یہ ہے ہی نہیں کہ "الدین" حاصل ہونے کے دو وسیلے موجود ہوں اور سوال یہ ہو کہ ہم ان میں سے کس وسیلے سے مدد لیں۔ اصلی صورتِ حال یہ ہے کہ "الدین" جس وسیلے سے ہم کو مل سکتا ہے وہ صرف ایک ہے اور انتخاب کا سوال صرف اس امر میں ہے کہ آیا ہم اس تنہا وسیلے سے مدد لیں یا اس کی دستگیری کا فائدہ اٹھانے کے بجائے تاریکی میں بھٹکتے پھرنے کو ترجیح دیں۔

قرآن کے دلائل

یہاں تک جو استدلال میں نے کیا ہے وہ تو ہم کو محض اس حد تک پہنچاتا ہے کہ ہماری فلاح کے لیے قرآن کے اس دعوے کو قبول کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے، یعنی بالفاظِ دیگر کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو۔ لیکن قرآن اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل پیش کرتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ اعلیٰ و اشرف ہیں، کیونکہ وہ ہمیں بادلِ ناخواستہ مسلمان ہونے کے بجائے برضا و رغبت مسلمان ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کی بہت سی دلیلوں میں سے چار سب سے زیادہ پُرزور ہیں اور انہی کو اس نے بار بار مکرر پیش کیا ہے۔

(۱) انسان کے لیے اسلام ہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے، اس لیے کہ یہی حقیقت نفس الامری کے مطابق ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا رویہ خلافِ حقیقت ہے:

---

[1] جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر رہنمائی کی۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (آل عمران: آیت ۸۳)

"کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں چار و ناچار اسی کے آگے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور اسی کی طرف انہیں پلٹ کر جانا ہے۔"

(۲) انسان کے لیے یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے، کیونکہ یہی حق ہے اور از روئے انصاف اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (الاعراف: آیت ۵۴)

"حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہ مالک و فرمانروا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا، جو رات کو دن کا لباس اڑھاتا ہے اور پھر دن رات کے تعاقب میں تیزی کے ساتھ دوڑا آتا ہے۔ سورج، چاند اور تارے سب جس کے تابع فرمان ہیں۔ خبردار! خلق بھی اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا۔ بڑا برکت والا ہے اللہ جو سارے جہانوں کا رب ہے۔"

(۳) انسان کے لیے یہی رویہ صحیح ہے کیونکہ تمام حقیقتوں کا صحیح علم صرف خدا ہی کو ہے اور رہنمائی بھی وہی کر سکتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۔ (آل عمران: آیت ۵)

"درحقیقت اللہ سے نہ زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی ہے اور نہ آسمان کی۔"

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۔ (البقرہ: آیت ۲۵۵)

"جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے اور لوگ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر حاوی نہیں ہو سکتے، بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے۔"

قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ (الانعام: ۷۱) "کہو اے پیغمبر! کہ اصلی ہدایت صرف خدا ہی کی ہدایت ہے۔"

(۴) انسان کے لیے یہی ایک راہِ راست ہے، کیونکہ اس کے بغیر عدل ممکن نہیں۔ اس کے سوا جس راہ پر بھی انسان چلے گا وہ بالآخر ظلم ہی کی طرف جائے گی۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۔ (الطلاق ۔ ۱)

"جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرے اس نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا۔"

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔۔ (المائدہ ۔ ۴۵)

"جو اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظالم ہیں۔"

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر معقول انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور ہدایت کے لیے اسی کی طرف رجوع کرے۔

خدائی ہدایت کے پرکھنے کا معیار

اب آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لازماً اس مرحلہ پر پہنچ کر ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اپنی تحقیق کے دوران خود میرے دل میں بھی پیدا ہو چکا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہر اُس شخص کی بات مان لیں جو ایک دین ہمارے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کر دے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو آخر ہمارے پاس وہ کیا معیار ہے جس سے ہم انسانی ساخت کے دین اور خدائی ہدایت کے دین میں فرق کر سکیں؟ اس کا جواب اگرچہ بڑی مفصل تحقیقی بحث چاہتا ہے، مگر میں یہاں مختصر اشاروں میں وہ چار بڑے معیار بیان کروں گا جو انسانی فکر اور خدائی فکر کو ممیّز کرتے ہیں۔

انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہوتی ہے۔ جو چیز خدا کی طرف سے ہو گی اُس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانے میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو، یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے مصنّف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اوجھل رہ گیا۔ مگر اس معیارِ تحقیق کو استعمال کرتے ہوئے یہ بات نہ بھول جانا چاہیے کہ علم، اور علمی قیاس، اور نظریۂ علمی میں بڑا فرق ہے۔ ایک وقت میں جو علمی قیاسات اور علمی نظریات دماغوں پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں، اکثر غلطی سے ان کو "علم" سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے غلط ہونے کا بھی اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا۔ تاریخِ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو بالآخر "علم" ثابت ہوتے ہیں۔

انسانی فکر کی دوسری بڑی کمزوری نقطۂ نظر کی تنگی ہے۔ اس کے برخلاف خدائی فکر میں وسیع ترین نقطۂ نظر پایا جاتا ہے۔ جب آپ خدائی فکر سے نکلی ہوئی کسی چیز کو دیکھیں گے تو آپ کو ایسا محسوس ہو گا جیسے اس کا مصنّف ازل سے ابد تک دیکھ رہا ہے، پوری کائنات کو دیکھ رہا ہے، تمام حقیقتوں کو بیک نگاہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں بڑے سے بڑے فلسفی اور "مفکّر" کی فکر بھی ایک بچے کی فکر محسوس ہو گی۔

انسانی فکر کا تیسرا اہم خاصہ یہ ہے کہ اس میں حکمت و دانش، جذبات و خواہشات کے ساتھ کہیں نہ کہیں سازباز اور مصلحت کرتی نظر آہی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے خدائی فکر میں بے لاگ حکمت اور خالص دانش مندی کی شان اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ اس کے احکام میں کہیں آپ جذباتی جھکاؤ کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔

انسانی فکر کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ جو نظامِ زندگی وہ خود تصنیف کرے گا اس میں جانبداری، انسان اور انسان کے درمیان غیر عقلی امتیازات اور غیر عقلی بنیادوں ہی پر ترجیح بعض علیٰ بعض کا عنصر لازماً پایا جائے گا۔ کیونکہ ہر انسان کی کچھ ذاتی دلچسپیاں ہوتی ہیں جو بعض انسانوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور بعض کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتیں۔ بخلاف اس کے خدائی فکر سے نکلا ہوا نظامِ زندگی ایسے ہر عنصر سے بالکل پاک ہوگا۔

اس معیار پر آپ ہر اُس نظامِ زندگی کو جانچ کر دیکھیے جو اپنے آپ کو خدا کی طرف سے "الدین" کہتا ہو۔ اگر وہ انسانی فکر کی اِن تمام خصوصیات سے خالی ہو اور پھر جامعیت اور ہمہ گیری کی وہ شان بھی رکھتا ہو جو اس سے پہلے میں نے "الدین" کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے بیان کی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر ایمان لانے میں تامل کریں۔

ایمان کے تقاضے

اب مجھے بنیادی سوالات میں سے آخری سوال پر کچھ گفتگو کرنی ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

آدمی جب قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کرلے اور اس "الدین" پر ایمان لے آئے جس کے منجانب اللہ ہونے کا اطمینان اُسے حاصل ہوگیا ہو، تو اس تسلیم کرنے اور ایمان لانے کے مقتضیات کیا ہیں۔

میں ابتدا میں عرض کرچکا ہوں کہ اسلام کے معنی جھک جانے، سر ڈال دینے، اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ اس جھکاؤ، سپردگی اور سپراندازی کے ساتھ خودرائی، خودمختاری اور فکر و عمل کی آزادی ہرگز نہیں نبھ سکتی۔ جس دین پر بھی آپ ایمان لائیں، آپ کو اپنی پوری شخصیت اس کے حوالے کردینی ہوگی۔ اپنی کسی چیز کو بھی آپ اس کی پیروی سے مستثنیٰ نہیں کرسکتے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپ کے دل اور دماغ کا دین ہو۔ آپ کی آنکھ اور کان کا دین ہو۔ آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا دین ہو۔ آپ کے پیٹ اور دھڑ کا دین ہو، آپ کے قلم اور زبان کا دین ہو، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتوں کا دین ہو، آپ کی سعی اور عمل کا دین ہو، آپ کی محبت اور نفرت کا دین ہو، آپ کی دوستی اور دشمنی کا دین ہو۔ غرض آپ کی شخصیت کا کوئی جز اور کوئی پہلو بھی اس دین سے خارج نہ ہو۔ اپنی کسی چیز کو جتنا اور جس حیثیت سے بھی آپ اُس دین کے احاطہ سے باہر اور اُس کی پیروی سے مستثنیٰ رکھیں گے، سمجھ لیجیے کہ اُسی قدر آپ کے دعوائے ایمان میں جھوٹ شامل ہے، اور ہر راستی پسند انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کو جھوٹ سے پاک رکھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

پھر جیسا کہ میں ابتداء میں عرض کرچکا ہوں کہ انسانی زندگی ایک کُل ہے جسے الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے انسان کی پوری زندگی کا ایک ہی دین ہونا چاہیے۔ دو دو اور تین تین دینوں کی بیک وقت پیروی بجز اس کے کچھ نہیں کہ آدمی اپنے آپ کو ڈانواں ڈول اور عقلی خبطے کے مضطرب ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ جب فی الواقع کسی دین کے "الدین" ہونے کا اطمینان آپ حاصل کرلیں اور اس پر ایمان لے آئیں تو لازماً اس کو آپ کی زندگی کے تمام شعبوں کا دین ہونا چاہیے اگر یہ شخصی حیثیت سے آپ کا دین ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہی آپ کے گھر کا دین بھی نہ ہو اور وہی آپ کی تربیت اولاد کا، آپ کی تعلیم اور آپ کے مدرسے کا، آپ کے کاروبار اور کسب معاش کا، آپ کی مجلسی زندگی اور قومی طرز عمل کا، آپ کی ملکی سیاست اور بین الاقوامی سیاست کا اور آپ کے ادب اور آرٹ کا دین بھی نہ ہو۔ جس طرح یہ بات محال ہے کہ ایک ایک دانہ الگ الگ تو موتی ہو مگر جب تسبیح کے رشتے میں بندھ جائے تو موتی منتظم ہوں تو سب مل کر دانۂ نخود بن جائیں، اسی طرح یہ بات بھی کسی صحیح دماغ کو اپیل نہیں کرتی کہ انفرادی حیثیت سے تو ہم ایک دین کے پیرو ہوں، مگر جب اجتماعی طور پر منظم کریں تو اس منظم زندگی کا کوئی پہلو اس دین کی پیروی سے مستثنیٰ رہ جائے۔

اس سلسلے میں پھر کہ ایمان کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ جس دین کے "الدین" ہونے پر آپ ایمان لائیں، اس کو پھیلانے کی، اپنے ابنائے نوع کو پورے طور پر اس کا پیرو بنانے کی کوشش کریں اور آپ کی تمام سعی وجہد کا مرکز و محور یہ ہو کہ یہی الدین تمام دنیا کا دین بن جائے۔ جس طرح حق کی فطرت یہ ہے کہ وہ غالب ہو کر رہنا چاہتا ہے، اسی طرح حق پرستی کی فطرت یہ ہے کہ وہ حق کو جان لینے کے بعد باطل پر اسے غالب کرنے کی سعی کیے بغیر چین نہیں لے سکتی۔ جو شخص یہ دیکھتا ہو کہ باطل ہر طرف زمین اور اس کے باشندوں پر چھایا ہوا ہے اور یہ منظر اس کے اندر کوئی بے کلی پیدا نہیں کرتا، اس کے دل میں اگر حق بیٹھی ہے بھی تو سوئی ہوئی ہے۔ اسے فکر کرنی چاہیے کہ کہیں یہ موت کے سکرات میں تبدیل نہ ہو جائے۔[۱]

فصل ۳

اسلام اور جاہلیت کی کشمکش[1]

دُنیا میں انسان کی زندگی کے لیے جو نظام نامہ بھی بنایا جائے گا اس کی ابتداء لامحالہ مابعد الطبیعی (Metaphysical) یا الٰہیاتی مسائل سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق جس میں انسان رہتا ہے، ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کر لیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا برتاؤ یہاں کیا ہونا چاہیے اور کس طرح اُسے دُنیا میں کام کرنا چاہیے، دراصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے، اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے، اور اس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈھنگ کو ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائے گا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا، پھر اسی نظریہ اخلاق کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی، پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلقات و معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورتیں اختیار کریں گے، اور آخر کار تمدن کی پوری عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔ دنیا میں اس وقت تک تاریخ انسانی کے لیے جتنے مذہب و مسلک بھی بنے ہیں، ان سب کو بہرحال اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریۂ اخلاق مرتب کرنا پڑا ہے، اور اصول سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک میں ایک مسلک کو دوسرے مسلک سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہی فلسفہ اور یہی اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ کیونکہ ہر دستورِ زندگی کا مزاج اسی چیز کی طبیعت کے مطابق بنتا ہے، اور یہ اس کے قالب میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

[1] "دینِ حق" یا اسلام کے بالمقابل جتنے بھی نظام کارفرما رہے ہیں یا اب ہیں، ان سب کے لیے جاہلیت کی اصطلاح بطورِ مواز نہ استعمال ہوتی ہے۔ دین کی اساس "العلم" (وحی الٰہی) پر ہے اور جاہلی نظاموں کی اساس ایسے مابعد الطبیعی نظریات پر ہوتی ہے جو قیاس و گمان سے گھڑ لیے جاتے ہیں یا سوچے سمجھے بغیر اختیار کر لیے جاتے ہیں۔ (مرتب)

زندگی کے چار نظریے

جزئیات و فروع سے قطع نظر، اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسان اور کائنات کے متعلق چار مابعد الطبیعی نظریے قائم ہو سکتے ہیں اور دُنیا میں جتنے دستورِ زندگی پائے جاتے ہیں انہوں نے انہی چار میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔

ان میں سے پہلے نظریے کو ہم جاہلیّتِ خالصہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ جاہلیّتِ خالصہ

کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ یُونہی بن گیا ہے، یُونہی چل رہا ہے اور یُونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی خدا نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو دوسری چیزوں کی طرح شاید اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس کو کس نے پیدا کیا اور کس لیے پیدا کیا۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے، کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پُورا کرنے کے لیے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے۔ کچھ قوٰی اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور اپنے گردوپیش کے دامن پر بہت سا سامان پھیلا ہوا دیکھتا ہے جن پر یہ اپنے ان قوٰی اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشوں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اُس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبیعتِ حیوانی کے مطالبات پُورے کرے، اور اس کی انسانی استعدادوں کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان مطالبات کو پُورا کرنے کے لیے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرے۔

انسان سے مافوق کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اس کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو۔ لہٰذا اس کو اپنے گردوپیش کے آثار و احوال سے اور اپنی تاریخ کے تجربات سے خود ہی ایک قانونِ عمل اخذ کرنا چاہیے۔

بظاہر کوئی ایسی حکومت نظر نہیں آتی جس کے سامنے انسان جوابدہ ہو۔ اس لیے انسان بجائے خود ایک غیر ذمّہ دار ہستی ہے۔ اور اگر یہ جوابدہ ہے بھی تو آپ اپنے ہی سامنے ہے۔ یا پھر اُس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مسلّط ہو جاتے۔

اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اِسی دنیوی زندگی کی حد تک ہیں۔ اس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے۔ لہٰذا صحیح اور غلط، مُفید اور مُضر، قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ صرف اُنہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا

جو دُنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

انسان جب جاہلیتِ محضہ کی حالت میں ہوتا ہے، یعنی جب اپنے محسوسات سے ماوراء کسی حقیقت تک وہ نہیں پہنچتا، یا بندگیٔ نفس کی وجہ سے نہیں پہنچنا چاہتا، تو اس کے ذہن پر یہی نظریہ حاوی ہوتا ہے۔ دُنیا پرستوں نے ہر زمانے میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر بادشاہوں نے، امیروں نے، درباریوں اور اربابِ حکومت نے، خوش حال لوگوں اور خوشحالی کے پیچھے جان دینے والوں نے عموماً اسی نظریہ کو ترجیح دی ہے۔ اور جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گاتے جاتے ہیں بالعموم ان سب کے تمدن کی جڑ میں یہی نظریہ کام کر رہا ہے۔ موجودہ مغربی تمدن کی بنیاد میں بھی یہی نظریہ کارفرما ہے۔ اگرچہ اہلِ مغرب سب کے سب خدا اور آخرت کے منکر نہیں ہیں۔ نہ علمی حیثیت سے سب مادہ پرستانہ اخلاق کے قائل ہیں، لیکن جو رُوح ان کے پورے نظامِ تہذیب و تمدن میں کام کر رہی ہے وہ اسی انکارِ خدا و آخرت اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق ہی کی رُوح ہے اور وہ کچھ اس طرح ان کی زندگی میں پیوست ہو گئی ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے خدا اور آخرت کے قائل ہیں اور اخلاق میں ایک غیر مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں وہ بھی غیر شعوری طور پر اپنی واقعی زندگی میں دہریے اور مادہ پرست ہی ہیں۔ کیونکہ ان کے علمی نظریہ کا ان کی عملی زندگی سے بالفعل کوئی ربط قائم نہیں ہے۔ ایسی ہی کیفیت ان سے پہلے کے مُترفین اور خدا فراموش لوگوں کی بھی تھی۔ بغداد، دمشق، دہلی اور غرناطہ کے مُترفین مسلمان ہونے کی وجہ سے خدا اور آخرت کے منکر نہ تھے، مگر ان کی زندگی کا سارا پروگرام اس طرح بنتا تھا کہ گویا نہ خدا ہے نہ آخرت، نہ کسی کو جواب دینا ہے، نہ کہیں سے ہدایت لینی ہے، جو کچھ ہیں ہماری خواہشات ہیں، ان خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر قسم کے ذرائع اور ہر قسم کے طریقے اختیار کرنے میں ہم آزاد ہیں اور دنیا میں جینے کی جتنی مہلت ملتی ہے اُس کا بہترین مصرف بس یہ ہے کہ

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جیسا کہ اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اِس نظریہ کی عین فطرت یہی ہے کہ اس کی بُنیاد پر ایک خالص مادہ پرستانہ نظامِ اخلاق بنتا ہے۔ خواہ وہ کتابوں میں مدوّن ہو یا صرف ذہنیتوں ہی میں مرتّب ہو کر رہ جائے۔ پھر اسی ذہنیت سے علوم و فنون اور افکار و آداب کی آبیاری ہوتی ہے اور پورے نظامِ تعلیم و تربیت میں الحاد و مادیت کی رُوح سرایت کر جاتی ہے۔ پھر انفرادی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان تعلقات و معاملات کی تمام صورتیں اسی نقشہ پر بنتی ہیں۔ اور قوانین کا نشو و نما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے۔ پھر اس طرز کی سوسائٹی میں سطح پر وہ لوگ اُبھر آتے ہیں جو سب سے زیادہ مکّار، بددیانت، جھوٹے، دغاباز، سنگدل اور خبیث النفس ہوتے ہیں۔ تمام سوسائٹی کی سیادت و قیادت اور مملکت کی زمام کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ شتر بے مُہار کی طرح ہر حساب سے بے خوف اور ہر مواخذہ سے بے پروا ہو کر خلقِ خدا پر ٹوٹ پڑتے ہیں میکیاویلی (Machiavelli

کے اصولِ سیاست پر ان کی ساری حکمتِ عملی مبنی ہوتی ہے۔ ان کی کتابِ آئین میں زور ہی کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے۔ جہاں کوئی مادی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی۔ یہ ظلم مملکت کے دائرے میں یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقت ور طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کچلتے اور دباتے ہیں اور مملکت کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی، امپیریلزم اور ملک گیری اور اقوام کشی کی صورت میں ہوتا ہے۔

۲۔ جاہلیتِ مشرکانہ

دوسرا مابعد الطبیعی نظریہ شرک کے اصول پر مبنی ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اتفاقی تو نہیں ہے اور نہ بے خداوند ہے، مگر اس کا ایک خداوند (Master) نہیں بلکہ بہت سے خداوند ہیں۔ یہ خیال چونکہ کسی علمی

لہ فاضل مؤلف نے نظریۂ جاہلیت کے ایک اہم پہلو کو یوں واضح کیا ہے (مرتبین)

حضرت شعیب نے جب اپنی قوم کے لوگوں کو اللہ واحد کی بندگی کی دعوت دی اور تجارتی کاروبار میں بددیانتی سے روکا تو انہوں نے جواب دیا:

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود۔ آیت ۸۷)

"اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے، یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟"

یہ اسلام کے مقابلہ میں جاہلیت کے نظریہ کی پوری ترجمانی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا جو طریقہ بھی ہے غلط ہے اور اس کی پیروی نہ کرنی چاہیے کیونکہ دوسرے کسی طریقے کے لیے عقل و علم اور کتبِ آسمانی میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی بندگی صرف ایک محدود مذہبی دائرے ہی میں نہ ہونی چاہیے بلکہ تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، غرض زندگی کے ہر شعبے میں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ دنیا میں انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کا ہے اور انسان کسی چیز پر بھی اللہ کی مرضی سے آزاد ہو کر خود مختارانہ تصرف کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے مقابلہ میں جاہلیت کا نظریہ یہ ہے کہ باپ دادا سے جو طریقہ بھی چلا آ رہا ہو انسان کو اسی کی پیروی کرنی چاہیے اور اس کی پیروی کے لیے اس دلیل کے سوا کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ نیز یہ کہ دین و مذہب کا تعلق صرف پوجا پاٹ سے ہے، رہے ہماری زندگی کے عام دنیوی معاملات، تو ان میں ہم کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ جس طرح چاہیں کام کریں۔ اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دائروں میں الگ الگ تقسیم کرنے کا تخیل آج کوئی نیا تخیل نہیں ہے بلکہ آج سے تین ساڑھے تین ہزار برس پہلے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو بھی اس تقسیم پر ویسا ہی اصرار تھا جیسا آج اہلِ مغرب اور ان کے مشرقی شاگردوں کو ہے۔ یہ فی الحقیقت کوئی "نئی روشنی" نہیں ہے جو انسان کو آج ذہنی ارتقاء کی بدولت نصیب ہو گئی ہو، بلکہ یہ وہی پرانی تاریک خیالی ہے جو ہزارہا برس پہلے کی جاہلیت میں بھی اسی شان سے پائی جاتی تھی اور اس کے خلاف اسلام کی کشمکش بھی آج کی نہیں، بہت قدیم ہے۔ (مؤلف)

ثبوت (Scientific Proof) پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیالی آرائی پر اس کی بنا ہے، اس لیے موہوم، محسوس اور معقول اشیاء کی طرف خداوندی و الوہیت کو منسوب کرنے میں مشرکین کے درمیان نہ کبھی اتفاق ہو سکتا ہے، نہ کبھی ہوا ہے۔ اندھیرے میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر بھی پڑ گیا وہ خدا بنا لی گئی۔ اور خداؤں کی فہرست ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ فرشتے، جن، ارواح، ستارے، زندہ اور مردہ انسان، درخت، پہاڑ، جانور، دریا، زمین، آگ، سب دیوتا بنائے گئے۔ بہت سے معانی مجردہ (Abstract Ideas) مثلاً محبت، حسن، شہوت، قوتِ تخلیق، بیماری، جنگ، بجلی، خشکی وغیرہ کو بھی خدائی کا مقام دیا گیا۔ طرح طرح کے خیالی مرکبات، مثلاً شیرِ انسان، ماہی انسان، پرند انسان، چہار سرا، ہزار دستہ، خرطوم پیکر وغیرہ بھی مشرکین کے معبودوں میں جگہ پاتے رہے۔

پھر اس دیومالا کے گرد اوہام و خرافات (Mythology) کا ایک عجیب طلسم ہوش ربا تیار ہوا ہے جس میں ہر جاہل قوم کی قوتِ واہمہ نے اپنی شادابی و نادرہ کاری کے وہ وہ دلچسپ نمونے فراہم کیے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن قوموں میں خداوندِ اعلیٰ یعنی اللہ کا تصور نمایاں پایا گیا ہے، وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس طرز کا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے خدا اس کے وزیر، درباری، مصاحب، عہدہ دار اور اہلکار ہیں۔ مگر انسان بادشاہ سلامت تک راہ نہیں پا سکتا، اس لیے سارے معاملات ماتحت خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور جن قوموں میں خداوندِ اعلیٰ کا تصور مبہم و دھندلا یا تقریباً مفقود ہے وہاں ساری خدائی اربابِ متفرقین میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

جاہلیتِ خالصہ کے بعد یہ دوسری قسم کی جاہلیت ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے، اور ہمیشہ گھٹیا درجہ کی دماغی حالت ہی میں یہ کیفیت رونما ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ واحد قہار کی خدائی کے قائل ہو گئے وہاں سے خداؤں کی دوسری اقسام تو رخصت ہو گئیں، مگر انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین، مجاذیب، اقطاب، ابدال، علماء، مشائخ اور ظلّ اللہیوں کی خدائی پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں اپنی جگہ نکالتی ہی رہی۔ جاہل دماغوں نے مشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر ان نیک بندوں کو خدا بنا لیا جن کی ساری زندگیاں بتوں کی خدائی ختم کرنے اور صرف اللہ کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہوئی تھیں۔ ایک طرف مشرکانہ پوجا پاٹ کی جگہ فاتحہ، زیارت، نیاز، نذر، عرس، صندل، چڑھاوے، نشان، علم، تعزیے اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی اعمال کی ایک نئی شریعت تصنیف کر لی گئی۔ دوسری طرف کسی علمی ثبوت کے بغیر ان بزرگوں کی ولادت و وفات، ظہور و غیاب، کرامات و خوارق، اختیارات و تصرفات اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے تقرب کی کیفیات کے متعلق ایک پوری میتھالوجی تیار ہو گئی جو بت پرست مشرکین کی میتھالوجی سے ہر طرح لگا کھا سکتی ہے۔ تیسری طرف توسل اور استمداد روحانی اور اکتسابِ فیض وغیرہ ناموں سے خوشنما پردوں میں وہ سب

معاملات جو اللہ اور بندوں کے درمیان ہوتے ہیں، اِن بزرگوں سے متعلق ہو گئے۔ اور عملاً وہی حالت قائم ہو گئی جو اللہ کے ماننے والے اُن مشرکین کے ہاں ہے جن کے نزدیک پادشاہِ عالم انسان کی رسائی سے بہت دُور ہے اور انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام اُمور نیچے کے اہلکاروں ہی سے وابستہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کے ہاں اِلٰہ علانیہ اِلٰہ، دیوتا، اَوتار، یا ابنُ اللہ کہلاتے ہیں اور یہ انہیں غوث، قطب، اَبدال، اولیاء اور اہلُ اللہ وغیرہ الفاظ کے پردوں میں چھپاتے ہیں

یہ دوسری قسم کی جاہلیت تاریخ کے دَوران میں عموماً پہلی قسم کی جاہلیت یعنی جاہلیتِ خالصہ کے ساتھ تعاون کرتی رہی ہے۔ قدیم زمانے میں بابل، مصر، ہندوستان، ایران، یونان، رُوم وغیرہ ممالک کے تمدّن میں یہ دونوں جاہلیتیں ہم آغوش تھیں۔ اور موجودہ زمانہ میں جاپان کا بھی یہی حال ہے۔ اِس موافقت کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند کی طرف میں اشارہ کروں گا۔

اوّلاً، مُشرکانہ جاہلیت میں آدمی کا کوئی تعلق اپنے معبودوں کے ساتھ اِس کے سوا نہیں ہوتا کہ یہ اپنے خیال میں اُن کو صاحبِ اختیار اور نافع و ضار سمجھ لیتا ہے اور مختلف مراسمِ عبودیت کے ذریعہ سے اپنے دُنیوی مقاصد میں ان کی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔[1]

---

[1] حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا:

فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۔ (ہود۔ آیت ۶۱)

"لہٰذا تم اللہ سے معافی چاہو اور اسی کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے۔"

یہ مشرکین کی ایک بہت بڑی غلط فہمی کا رد ہے جو بالعموم ان سب میں پائی جاتی ہے اور اُن اہم اسباب میں سے ایک ہے جنہوں نے ہر زمانہ میں انسان کو شرک میں مبتلا کیا ہے۔ یہ لوگ اللہ کو اپنے راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں پر قیاس کرتے ہیں جو رعیت سے دُور اپنے محلوں میں دادِ عیش دیا کرتے ہیں، جن کے دربار تک عام رعایا میں سے کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی، جن کے حضور میں کوئی درخواست پہنچانی ہو تو مقرّبینِ بارگاہ میں سے کسی کا دامن تھامنا پڑتا ہے اور پھر اگر خوش قسمتی سے کسی کی درخواست ان کے آستانۂ بلند پر پہنچ بھی جاتی ہے تو ان کا پندارِ خدائی یہ گوارا نہیں کرتا کہ خود اس کو جواب دیں، بلکہ جواب دینے کا کام مقرّبین ہی میں سے کسی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس غلط گمان کی وجہ سے یہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں اور ہوشیار لوگوں نے ان کو ایسا سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے کہ خداوندِ عالم کا آستانۂ قدس عام انسانوں کی دسترس سے بہت ہی دُور ہے۔ اس کے دربار تک بھلا کسی عامی کی پہنچ کیسے ہو سکتی ہے۔ وہاں تک دعاؤں کا پہنچنا اور پھر ان کا جواب ملنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ پاک رُوحوں کا وسیلہ نہ ڈھونڈا جائے اور اُن مذہبی منصب داروں کی خدمات نہ حاصل کی جائیں جو اُوپر تک نذریں، نیازیں اور عرضیاں پہنچانے کے ڈھب جانتے ہیں۔ یہی

باقی رہا یہ امر کہ وہاں سے اس کو کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا ضابطہ و قانون ملے تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں کیونکہ وہاں کوئی واقع ہی خدا ہو تو ہدایت اور قانون بھیجے۔ پس جب ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو مشرک انسان لامحالہ خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کر لیتا ہے۔ اس طرح وہی جاہلیتِ محضہ برسرِکار آجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ خالص جاہلیت کے تمدن اور مشرکانہ تمدن میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہوتا کہ ایک جگہ جاہلیت کے ساتھ مندروں، پجاریوں اور عبادات کا سلسلہ ہوتا ہے اور دوسری جگہ نہیں ہوتا۔ اخلاق اور اعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں۔ یونانِ قدیم اور بت پرست روم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کا یہی سبب ہے۔

ثانیاً، علوم و فنون، فلسفہ و ادب اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے لیے مشرکانہ نظریہ کوئی الگ مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ اس باب میں بھی مشرک انسان جاہلیتِ محضہ ہی کا رُخ اختیار کرتا ہے اور مشرک سوسائٹی کا سارا ذہنی نشوونما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے جس پر خالص جاہلی سوسائٹی میں ہوا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مشرکین کی قوتِ واہمہ حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس لیے ان کے افکار میں خیال آرائی (Speculation) کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے، اور ملاحدہ ذرا عملی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے نِرے خیالی فلسفوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ البتہ جب یہ ملاحدہ خدا کے بغیر کائنات کے معمّے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی استدلالی کھینچ تان بھی اتنی ہی غیر معقول ہوتی ہے جتنی مشرکین کی ملیغار رہی۔ بہرحال علمی حیثیت سے شرک اور جاہلیتِ خالصہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہوتا اور اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ موجودہ یورپ اپنے موجودہ نظریات میں قدیم یونان و روم سے اس طرح سلسلہ جوڑتا ہے کہ گویا یہ بیٹا ہے اور وہ باپ۔

ثالثاً، مشرک سوسائٹی ان تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح مستعد رہتی ہے جن کو خالص جاہلی سوسائٹی اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ سوسائٹی کی ترتیب و تعمیر میں شرک اور جاہلیتِ خالصہ کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے، روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص امتیازات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ شاہی خاندان اور مذہبی طبقے مل کر ایک ملی بھگت قائم کرتے ہیں، خاندانوں پر خاندانوں کے اور طبقوں پر طبقوں کے تفوّق کا ایک مستقل نظریہ وضع کیا جاتا ہے، اور اس طرح

وہ غلط فہمی ہے جس نے بندے اور خدا کے درمیان بہت سے چھوٹے بڑے معبودوں اور خارشیوں کا ایک جمِ غفیر کھڑا کر دیا اور اس کے ساتھ مہنت گری (Priesthood) کا وہ نظام پیدا کیا جس کے توسط کے بغیر جاہلی مذاہب کے پیرو پیدائش سے لے کر موت تک اپنی کوئی مذہبی رسم بھی انجام نہیں دے سکتے۔ (مؤلف) ۱۳۲

جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلط قائم کر لیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے خالص جاہلی سوسائٹی میں یہ خرابیاں نسل پرستی، قوم پرستی، قومی امپیریلزم، ڈکٹیٹر شپ، سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں لیکن جہاں تک رُوح اور جوہر کا تعلق ہے، انسان پر انسان کی خدائی تسلط کرنے، انسان کو انسان سے پھاڑنے اور انسانیت کو تقسیم کرنے، ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لیے صیاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

۳۔ جاہلیتِ راہبانہ

تیسرا مابعد الطبیعی نظریہ رہبانیت پرستی پر مبنی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

یہ دُنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دارالعذاب ہے۔ انسان کی رُوح اس قفسِ عنصری میں دراصل ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس جسمانی تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں، اصل میں اس قید خانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ انسان اس دنیا اور اس کی چیزوں سے جتنا تعلق رکھے گا اُتنا ہی گندگی سے آلودہ ہوگا اور اسی قدر مزید عذاب کا مستحق بن جائے گا۔ نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ اس زندگی کے جھگڑوں سے قطع تعلق کیا جائے، خواہشات کو مٹایا جائے، لذات سے کنارہ کشی کی جائے، جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبات کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے، ان تمام محبتوں کو جو دنیوی اشیاء اور گوشت پوست کے رشتہ داروں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں دل سے نکال دیا جائے، اور اپنے اس دشمن یعنی نفس و جسم کو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ رُوح پر اس کا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہو جائے گی اور نجات کے بلند مقامات پر اُڑنے کی طاقت حاصل کرے گی۔

یہ نظریہ بجائے خود غیر تمدنی (Anti Social) نظریہ ہے، مگر تمدن پر یہ متعدد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں ویدانتزم، مانویت، اشراقیت (New-Platonism)، یوگ، تصوف، مسیحی رہبانیت اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی (Positive) اور بہت زیادہ بلکہ تمام تر سلبی (Negative) نوعیت کا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مل جل کر لٹریچر، عقائد، اخلاقیات، اور عملی زندگی میں نفوذ کرتی ہیں اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچتے ہیں وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں۔

پہلی دونوں قسم کی جاہلیتوں کے ساتھ اس تیسری قسم کی جاہلیت کا تعاون عموماً تین صورتوں سے ہوتا ہے:

۱۔ یہ راہبانہ جاہلیت انسانی جماعت کے نیک اور پاک باز افراد کو دُنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لے جاتی ہے اور بدترین قسم کے شریر افراد کے لیے میدان صاف کر دیتی ہے۔ بدکار لوگ خدا کی زمین کے متولی بن کر آزادی کے ساتھ فساد پھیلاتے ہیں اور نیک لوگ اپنی نجات کی فکر میں تپسیا کیے چلے جاتے ہیں۔

۲- اِس جاہلیت کے اثرات جہاں تک عوام میں پہنچتے ہیں، وہ ان کے اندر غلط قسم کا صبر و تحمّل اور راہبانہ نقطۂ نظر پیدا کر کے انہیں ظالموں کے لیے نرم نوالہ بنا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ، اُمراء اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اور یہ خوب آرام سے اُن کی سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔ تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ امپیریلزم، سرمایہ داری اور پاپائیت سے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی کبھی لڑائی ہوئی ہو۔

۳- جب یہ راہبانہ فلسفہ و اخلاق انسانی فطرت سے شکست کھا جاتا ہے تو کتاب الحیل کی تصنیف شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں کفّارے کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے تاکہ دل کھول کر گناہ کیا جا سکے، اور جنّت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ کہیں ہوس رانی کے لیے عشقِ مجازی کا حیلہ نکالا جاتا ہے تاکہ دل کی لگی بجھا بھی لی جائے اور تقدّس بھی جوں کا توں قائم رہے۔ اور کہیں ترکِ دُنیا کے پردے میں بادشاہوں اور رئیسوں سے سانٹھ گانٹھ کی جاتی ہے اور رُوحانی امارت کا وہ جال پھیلایا جاتا ہے جس کی بدترین مثالیں رُوم کے پاپاؤں اور مشرقی دُنیا کے گدّی نشینوں نے پیش کی ہیں۔

یہ تو اس جاہلیّت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں جب یہ گھس جاتی ہے تو کچھ اور ہی گل کھلاتی ہے۔ خُدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ یہ دُنیا کو دار العمل، دار الامتحان اور مزرعۃ الآخرۃ کے بجائے دارالعذاب اور "مایا کے جال" کی حیثیت سے آدمی کے سامنے پیش کرتی ہے۔ نقطۂ نظر کے اس بنیادی تغیّر کی وجہ سے آدمی یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وُہ اس دُنیا میں خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں یہاں کام کرنے اور دُنیا کے معاملات کو چلانے نہیں آیا ہوں، بلکہ گندگی و نجاست میں پھینکا گیا ہوں جس سے مجھے بچنا اور دُور بھاگنا چاہیے۔ میرے لیے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ میں یہاں نان کوآپریٹر (Non-Co-operator) کی طرح رہوں اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے ان سے کنارہ کروں۔ اِس تصور کے ساتھ آدمی دُنیا اور اس کے معاملات پر سہمی ہوئی نگاہ ڈالنے لگتا ہے اور بارِ خلافت کو سنبھالنا تو درکنار بارِ تمدّن کو اپنے سر لیتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اس کے لیے پُورا نظامِ شریعت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبادات اور اوامر و نواہی کا یہ مفہوم بالکل ساقط ہو جاتا ہے کہ یہ حیاتِ دُنیا کی اصلاح اور فرائضِ خلافت کی انجام دہی کے لیے تیار کرنے والی چیزیں ہیں۔ برعکس اس کے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ عبادات اور چند خاص مذہبی اعمال اس گناہ زندگی کا کفّارہ ہیں۔ انہی کو پُورے انہماک سے ٹھیک ناپ تول کے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیے تاکہ آخرت میں نجات حاصل ہو۔

اِس ذہنیت نے انبیاء کی اُمّتوں میں سے ایک گروہ کو مُراقبہ و عُزلہ، تقشف، چِلّہ کشی و ریاضت، اَوراد و وظائف، اَحزاب و اعمال، سَیرِ مقامات اور حقیقت کی فلسفیانہ تعبیروں کے چکّر میں ڈال دیا اور مستحبات و نوافل کے التزام

مزرعۃ الآخرۃ

میں فرائض سے بھی زیادہ منہمک کر کے خلافتِ الٰہیہ کے اِس کام سے غافل کر دیا جس کو جاری کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام آئے تھے۔ اور بعد والے گروہ میں تقشّف، تعمّق فی الدین، غلو، مُوشگافی، چھوٹی چھوٹی چیزوں کی ناپ تول اور جزئیات کے ساتھ غیر معمولی اہتمام کی بیماری پیدا کر دی، حتیٰ کہ ان کے لیے خدا کا دین ایک ایسا نازک آبگینہ ہو گیا جو ذرا ذرا سی باتوں سے ٹھیس کھا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بیچاروں کا سارا وقت بس اسی دیکھ بھال کی نذر ہونے لگا کہ کہیں کچھ اُونچ نیچ نہ ہو جائے اور یہ شیشے کا برتن جو سر پر رکھا ہے کھیل کھیل ہو کر نہ رہ جائے۔ دین میں اتنی باریکیاں نکل آنے کے بعد ناگزیر ہے کہ جمود، تنگ خیالی اور کم حوصلگی پیدا ہو۔ ایسے لوگوں میں کہاں یہ قابلیت باقی رہ سکتی ہے کہ نگاہِ جہاں بیں سے انسانی زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر نظر ڈالیں، دین کے عالمگیر اُصول و کلیات پر گرفت حاصل کریں اور زمانہ کی ہر نئی گردش میں دُنیا کی امامت و رہنمائی کے لیے مستعد ہوں۔

۴۔ اسلام

چوتھا ما بعد الطبیعی نظریہ وہ ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

یہ سارا عالمِ ہست و بود جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جز ہم خود ہیں، دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے، اُسی نے اس کو بنایا، پھر وہی اس کا مالک ہے اور وہی اس کا واحد حاکم ہے۔ اس سلطنت میں کسی کا حکم نہیں چلتا، سب کے سب تابع فرمان ہیں اور اختیارات بالکلیہ اسی ایک مالک و فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں۔

انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے، یعنی رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان ہی میں نہیں ہے۔

اس نظامِ حکومت کے اندر انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرۃً ہو سکتی ہے۔ پیدائشی رعیت اور ایک جزوِ مملکت ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ جس طرح مملکت کے تمام اجزاء بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ خود اپنے لیے طریقِ زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کر لینے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اس کی پیروی کرے۔ اس ہدایت کے آنے کا ذریعہ وحی ہے، اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں۔

مگر انسان کی آزمائش کے لیے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھپ گیا اور اپنی سلطنت کا وہ پورا اندرونی انتظام بھی چھپا دیا جس سے وہ تدبیرِ امر کرتا ہے۔ ظاہر میں سلطنت اس طرح چل رہی ہے کہ نہ اس کا کوئی حاکم نظر آتا ہے نہ کارپرداز دکھائی دیتے ہیں۔ انسان صرف ایک کارخانہ چلتا ہوا دیکھتا ہے، اُس کے درمیان اپنے آپ کو موجود پاتا ہے، اور ظاہری حواس سے کہیں یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا محکوم ہوں اور کسی کو مجھے

حساب دیا ہے۔ امتحان و شہود میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ اس پر فرمانروائے عالم کی حاکمیت اور اپنی محکومیت و مسئولیت (Responsibility) کا حال غیر مشتبہ طور پر کھل جائے، یہاں تک کہ آدمی اسے ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ نبی بھی آتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ ان کے اوپر عیاناً وحی اترتی دکھائی دے یا کوئی ایسی صریح علامت ان کے ساتھ اترے جس کو دیکھ کر ان کی نبوت ماننے کے سوا چارہ نہ رہے۔ پھر آدمی ایک حد کے اندر اپنے آپ کو بالکل مختار پاتا ہے۔ بغاوت کرنا چاہے تو اس کی قدرت دے دی جاتی ہے۔ ذرائع بہم پہنچا دیئے جاتے ہیں اور بڑی لمبی ڈھیل دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ شرارت و عصیان کی آخری حد تک پہنچنے تک کوئی رکاوٹ اسے پیش نہیں آتی۔ مالک کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو نہیں روکا جاتا۔ پوری آزادی اسے دی جاتی ہے کہ جس جس کی بندگی، عبادت، اطاعت کرنا چاہے کرے۔ دونوں صورتوں یعنی بغاوت اور بندگیٔ غیر کی صورتوں میں رزق برابر ملے جاتا ہے، سامانِ زندگی، وسائلِ کار، اسبابِ عیش حسبِ حیثیت برابر دیئے جاتے ہیں، اور مرتے دم تک دیئے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی باغی یا کسی بندۂ غیر سے محض اس جرم کی پاداش میں اسبابِ دنیا روک لیے جائیں۔ یہ سارا طریقِ کار روا رکھنے کی وجہ صرف اس لیے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل، تمیز و استدلال، ارادہ و اختیار کی جو قوتیں دی ہیں، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو ایک طرح کے حاکمانہ تصرّف کی جو قدرت بخشی ہے، اس میں وہ اس کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ اسی آزمائش کی تکمیل کے لیے حقیقت پر غیب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے تاکہ انسان کی عقل کا امتحان ہو۔ انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہے تاکہ اس امر کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے اس کی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کر کے اس سے منہ موڑ جاتا ہے۔ اسبابِ زندگی کا سرمایہ، وسائل اور کام کا موقع نہ دیا جائے تو اس کی لیاقت و عدم لیاقت کا امتحان نہیں ہو سکتا۔

یہ دُنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے اس لیے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عملِ نیک کا انعام نہیں بلکہ امتحان کا سامان ہے، اور جو تکالیف، مصائب، شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی عملِ بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اُسی قانونِ طبیعی کے تحت جس پر اس دُنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے، آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں۔[1] اعمال کے اصلی حساب، جانچ پڑتال اور فیصلے کا وقت مُہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد ہے، اور اُسی کا نام آخرت ہے۔ لہٰذا دُنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس دُنیا میں قانونِ مکافات سرے سے کارفرما ہی نہیں بلکہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہاں کی مکافات ادھوری اور مجمل اور مبہم ہے اور آزمائش کا عنصر بہر حال دنیوی جزا اور سزا پر غالب ہے۔ اس لیے یہاں اعمال کے جو نتائج ظاہر ہوتے ہیں ان کو اخلاقی حُسن و قبح کا معیار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ (مؤلف)

اور قابلِ اعتقاد یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقہ اور کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا بُرا ہوگا، صرف اُس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاءؑ پر نازل ہوتی ہے۔ جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر، فیصلہ کن بات جس پر آخرت کی فلاح یا خسران کا مدار ہے یہ ہے کہ اوّلاً انسان اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکمِ حقیقی ہونے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے من جانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں۔ ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد وہ آزادیٔ انتخاب رکھنے کے باوجود اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے امرِ شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتدا سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔ اس نظریہ کی بنیاد پر تمام واقعاتِ عالم کی مکمل توجیہ (Explanation) ہوتی ہے۔ کائنات کے تمام آثار (Phenomena) کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ اور کسی مشاہدے یا تجربے سے یہ نظریہ ٹوٹتا نہیں۔ یہ ایک مستقل نظامِ فلسفہ پیدا کرتا ہے جو جاہلیت کے فلسفوں سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ کائنات اور خود وجودِ انسانی کے متعلق معلومات کے پورے ذخیرہ کو ایک دوسرے ڈھنگ پر مرتب کرتا ہے جس کی ترتیب جاہلی علوم کی ترتیب سے سراسر مباین ہوتی ہے۔ ادب اور ہنر (Art and Literature) کے نشو و نما کا ایک الگ راستہ بناتا ہے جو جاہلی ادب و ہنر کے تمام راستوں سے متغایر ہوتا ہے۔ زندگی کے جملہ معاملات میں ایک خاص زاویۂ نظر اور ایک خاص مقصد پیدا کرتا ہے جو جاہلی مقاصد و نقطہ ہائے نظر سے اپنی روح اور اپنے جوہر میں کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ اخلاق کا ایک علیحدہ نظام بناتا ہے جس کو جاہلی اخلاقیات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ پھر ان علمی و اخلاقی بنیادوں پر جس تہذیب کی عمارت اُٹھتی ہے اُس کی نوعیت تمام جاہلی تہذیبوں کی نوعیت سے قطعاً مختلف ہوتی ہے، اور اس کو سنبھالنے کے لیے ایک اور ہی طرز کے نظامِ تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے اصول جاہلیت کے ہر نظامِ تعلیم و تربیت سے کامل تضاد کی نسبت رکھتے ہیں۔ فی الجملہ اس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحدِ قہار کی حاکمیت، آخرت کے اعتقاد اور انسان کے محکوم و ذمہ دار ہونے کی روح ہے بخلاف اس کے ہر جاہلی تہذیب کے پورے نظام میں انسان کی خودمختاری، بے قیدی، بے لگام آزادی اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے۔ اسی لیے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قائم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے، اس کے خد و خال اور رنگ و روغن جاہلی تہذیب کے بنائے ہوئے نمونہ سے ہر جزو اور ہر پہلو میں جُدا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد تمدن کی تفصیلی صورت جو اس بنیاد پر مبنی ہے اس کا سارا نقشہ دنیا کے دوسرے نقشوں سے

پیدا ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، لباس، خوراک، طرزِ زندگی، آداب و اطوار، شخصی کردار، کسبِ معاش، صرفِ دولت، ازدواجی زندگی، خاندانی زندگی، معاشرتی رسوم، مجلسی طریقے، انسان اور انسان کے تعلق کی مختلف شکلیں، لین دین کے معاملات، دولت کی تقسیم، مملکت کا انتظام، حکومت کی تشکیل، امیر کی حیثیت، شوریٰ کا طریقہ، سول سروس کی تنظیم، قانون کے اصول، تفصیلی ضوابط کا اصول سے استنباط، عدالت، پولیس، احتساب، مالگزاری، فینانس، امورِ رفاہِ عامہ (Public Works)، صنعت و تجارت، خبر رسانی، تعلیمات اور دوسرے تمام محکموں کی پالیسی، فوج کی ترتیب و تنظیم، جنگ و صلح کے معاملات، بین الاقوامی تعلقات اور خارجی سیاست، غرض انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدن کا طور و طریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے اور ہر ہر جز میں ایک واضح خطِ امتیاز اس کو دوسرے تمدنوں سے الگ کرتا ہے۔ اس کی ہر چیز میں اوّل سے آخر تک ایک خاص نقطۂ نظر، ایک خاص مقصد اور ایک خاص اخلاقی رویّہ کار فرما ہوتا ہے جس کا براہِ راست تعلق خدائے واحد کی حاکمیتِ مطلقہ اور انسان کی محکومیت و مسئولیت اور دنیا کے بجائے آخرت کی مقصودیت سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔

انبیاء کا مشن

اسی تہذیب و تمدن کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام پے در پے بھیجے گئے تھے۔

رہبانی تہذیب کو مستثنیٰ کر کے ہر وہ تہذیب جو دنیا کی زندگی کے متعلق ایک جامع نظریہ اور کاروبارِ دنیا کو چلانے کے لیے ایک ہمہ گیر طریقہ رکھتی ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ جاہلیت کی تہذیب ہو یا اسلام کی، طبعاً اس بات کی طالب ہوتی ہے کہ حاکمانہ اختیارات پر قبضہ کرے، زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے، اور زندگی کا نقشہ اپنے طرز پر بنائے۔ حکومت کے بغیر کسی ضابطہ و نظریہ کو پیش کرنا یا اس کا معتقد ہونا محض بے معنی ہے۔ راہب تو دنیا کے معاملات کو چلانا ہی نہیں چاہتا، بلکہ ایک خاص قسم کے سلوک سے اپنی خیالی نجات کی منزل تک دنیا کے باہر ہی باہر پہنچ جانے کی فکر میں لگا رہتا ہے، اس لیے نہ اس کو حکومت کی حاجت نہ طلب۔ مگر جو دنیا کے معاملات ہی کو چلانے کا ایک خاص ڈھنگ رکھتا ہو اور اسی ڈھنگ کی پیروی میں انسان کی فلاح و نجات کا معتقد ہو، اس کے لیے تو بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ اقتدار کی کنجیوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ جب تک وہ اپنے نقشے پر عمل درآمد کرنے کی طاقت حاصل نہ کر لے، اس کا نقشہ واقعات کی دنیا میں قائم نہیں ہو سکتا، بلکہ خود اپنے پیروؤں میں بھی زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔ جس تہذیب کے ہاتھ میں زمامِ کار ہوتی ہے دنیا کا سارا کاروبار اسی کے نقشہ پر چلتا ہے۔ وہی علوم و افکار اور تہذیب و آداب کی رہنمائی کرتی ہے۔ وہی اخلاق کے سانچے بناتی ہے۔ وہی تعلیم و تربیتِ عامہ کا انتظام کرتی ہے۔ اسی کے قوانین پر سارا نظامِ تمدن مبنی ہوتا ہے۔ اور اسی کی پالیسی ہر شعبۂ زندگی میں کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی میں کہیں بھی اس تہذیب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی جو اپنی حکومت نہ رکھتی ہو۔ یہاں تک کہ جب ایک طویل مدت تک حکمران تہذیب

کا دور دورہ رہتا ہے تو غیر حکمران تہذیب عمل کی دُنیا میں خارج از بحث ہو جاتی ہے۔ اُس کی طرف بعد از نقطۂ نظر رکھنے والوں کو بھی اس امر میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ طریقۂ دُنیا کی زندگی میں چل سکتا ہے یا نہیں۔ اُس کے نام نہاد علم بردار اور اس کی لیڈرشپ کے بزعم خود وارثین تک تہذیب مخالف سے مدارات (Compromise) اور آدھے پونے کا مشترک معاملہ کرنے پر اُتر آتے ہیں۔ حالانکہ حکمرانی میں دو بالکل مختلف الاصول تہذیبوں کے درمیان مُفاسمت و مُصالحت قطعی غیر ممکن العمل چیز ہے۔ اور انسانی تمدّن اِس شرکت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بنا بریں کو ممکن العمل خیال کرنا عقل کی کمی پر دلالت کرتا ہے، اور اُس کے لیے راضی ہو جانا ایمان اور حمیّت کی کمی پر۔

پس دُنیا میں انبیاء علیہم السّلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا ہے کہ حکومتِ الٰہیّہ قائم کر کے اُس پورے نظامِ زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے[1]۔ وہ اہلِ جاہلیت کو یہ حق تو دینے کے لیے تیار تھے کہ اگر چاہیں تو اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں اور جس حد کے اندر اُن کے عمل کا اثر اُنہی کی ذات تک محدود رہتا ہے اس میں اپنے جاہلی طریقوں پر چلتے رہیں۔ مگر وہ اُنہیں یہ حق دینے کے لیے تیار نہ تھے، اور فطرۃً نہ دے سکتے تھے، کہ اقتدار کی کُنجیاں اُن کے ہاتھ میں رہیں اور وہ انسانی زندگی کے معاملات کو طاقت کے زور سے جاہلیت کے قوانین پر چلائیں۔ اسی لیے تمام انبیاءؑ نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ بعض کی مساعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں جیسے حضرت ابراہیمؑ۔ بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کر دی مگر حکومتِ الٰہیّہ قائم کرنے سے پہلے ہی ان کا کام ختم ہو گیا جیسے حضرت مسیحؑ۔ اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا جیسے حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، اور سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ﷺ۔

---

[1] موجودہ زمانے میں بعض دیندار بزرگوں کی زبان سے یہ فقرہ اکثر سننے میں آتا ہے کہ حکومت مقصود نہیں بلکہ موعود ہے۔ یہ بات جو حضرات فرماتے ہیں ان کے ذہن میں دراصل حکومت کے محض ایک انعام ہونے کا تصور ہے، اُس کے ڈیوٹی اور خدمت ہونے کا تصور نہیں ہے۔ اور نہیں جانتے کہ دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے جس حکومت کی ضرورت ہے اس کا قیام خدا کی شریعت میں مطلوب و مقصود ہے اور اس کے لیے جہاد کرنا فرض ہے۔

فصل ۴

دین کا قرآنی تصوّر

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔ (الشوریٰ ۔ آیت ۱۳)

"اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا ۔ اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے بھیجا ہے ۔ اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں ۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ ۔"

اس آیت میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی نئے مذہب کے بانی نہیں ہیں ۔ نہ انبیاءؑ میں سے کوئی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی گزرا ہے ۔ بلکہ اللہ کی طرف سے ایک ہی دین ہے جسے شروع سے تمام انبیاءؑ پیش کرتے چلے آ رہے ہیں اور اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کر رہے ہیں ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کا نام لیا گیا ہے جو طوفان کے بعد موجودہ نسلِ انسانی کے اولین پیغمبر تھے ۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے جو آخری نبی ہیں ۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کا نام دیا گیا ہے جنہیں اہلِ عرب اپنا پیشوا مانتے تھے ۔ اور آخر میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کیا گیا ہے ، جن کی طرف یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کو منسوب کرتے ہیں ۔ اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ انہی پانچ انبیاءؑ کو اس دین کی ہدایت کی گئی تھی ۔ بلکہ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا میں جتنے انبیاءؑ بھی آتے ہیں سب ایک ہی دین لے کر آتے ہیں اور نمونے کے طور پر ان پانچ جلیل القدر انبیاءؑ کا نام لے دیا گیا ہے جن سے دنیا کو معروف ترین آسمانی شریعتیں ملی ہیں ۔

یہ آیت چونکہ دین اور اس کے مقصود پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس پر پوری طرح غور کر کے اسے سمجھا جائے ۔

لغوی تحقیق

کلامِ عرب میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے :

(۱) غلبہ و اقتدار، حکمرانی و فرمانروائی، دوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اُس پر اپنی قوّتِ قاہرہ (Sovereignty) استعمال کرنا، اُس کو اپنا غلام اور تابعِ اَمر بنانا، مثلاً کہتے ہیں دَانَ النَّاسَ ای قَھَرَھُم علی الطاعۃ (یعنی لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا)۔ دِنْتُھُم فَدَانُوا ای قَھَرْتُھُم فَاَطَاعُوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کیا اور وہ مطیع ہو گئے)۔ دِنْتُ القَوْمَ ای اَذْلَلْتُھُم وَاسْتَعْبَدْتُھُم (میں نے اُس قوم کو مسخر کر لیا اور غلام بنا لیا)۔ دان الرجل اذا عزّ (فلاں شخص عزت اور طاقت والا ہو گیا)۔ دِنْتُ الرجل، حملتُہ علی ما یکرہ (میں نے اس کو ایسے کام پر مجبور کیا جس کے لیے وہ راضی نہ تھا)۔ دِیْنَ فلان، اذا حُمِلَ علی مکروہ (فلاں شخص اس کام کے لیے بزور مجبور کیا گیا)۔ دِنْتُہ، سُسْتُہ و ملکتُہ (یعنی میں نے اس پر حکم چلایا اور فرمانروائی کی)۔ دَیَّنْتُہ القومَ وَلَّیْتُہ سیاستَھُم (یعنی میں نے قوم کی سیاست و حکمرانی فلاں شخص کو دی)۔ اسی معنی میں حُطَیئہ اپنی ماں کو خطاب کر کے کہتا ہے:

لَقَدْ دُیِّنْتِ اَمْرَ بَنِیْکِ حَتّٰی ... تَرَکْتِھِمْ اَدَقَّ مِنَ الطَّحِیْنِ

(تو اپنے بچوں کے حالات کی نگراں بنائی گئی تھی ... آخر کار تو نے انہیں آٹے سے بھی زیادہ باریک کر کے چھوڑا)

حدیث میں آتا ہے الکیّس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت (یعنی عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مغلوب کر لیا اور وہ کام کیا جو اس کی آخرت کے لیے نافع ہو)۔ اسی معنی کے لحاظ سے دیّان اس کو کہتے ہیں جو کسی ملک، یا قوم یا قبیلہ پر غالب و قاہر ہو اور اس پر فرمانروائی کرے۔ چنانچہ اعشی الحرمازی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہتا ہے یا سیّد الناس و دیّان العرب۔ اور اسی لحاظ سے مَدِین کے معنی غلام اور مدینۃ کے معنی لونڈی، اور ابن مدینۃ کے معنی لونڈی زادہ کے آتے ہیں، جیسے اخطل کہتا ہے ربت و ربا فی حجرھا ابن مدینۃ۔ اور قرآن میں ہے فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ یعنی "اگر تم کسی کے مملوک، تابع، ماتحت نہیں ہو تو مرنے والے کو موت سے بچا کیوں نہیں لیتے؟ جان کو واپس کیوں نہیں پلٹا لاتے؟"

(۲) اطاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لیے مسخر ہو جانا، کسی کے تحتِ اَمر ہونا، کسی کے غلبہ و قہر سے دب کر اس کے مقابلہ میں ذلّت قبول کر لینا۔ چنانچہ کہتے ہیں دِنْتُھُم فَدَانُوا ای قَھَرْتُھُم فَاَطَاعُوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کر لیا اور وہ لوگ مطیع ہو گئے)۔ دِنْتُ الرَّجُلَ ای خدمتہ (یعنی میں نے فلاں شخص کی خدمت کی)۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اُرِیدُ من قریش کلمۃ تدین لھم بھا العرب، ای تطیعھم وتخضع لھم یعنی "میں قریش کو ایک ایسے کلمہ کا پیرو بنانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اسے مان لیں تو تمام عرب ان کا تابع فرمان بن جائے اور ان کے آگے جھک جائے"۔ اسی معنی کے لحاظ سے اطاعت شعار قوم کو قوم دِین کہتے ہیں۔ اور اسی معنی میں دین کا لفظ حدیث خوارج میں استعمال کیا گیا ہے، یمرقون من الدین مروق السھم

من الرَّمِیَّۃ۔

(۳) شریعت، قانون، طریقہ، کیش و ملّت، رسم و عادت۔ مثلاً کہتے ہیں ما زال ذالک دینی و دَیدَنی، یعنی "یہ ہمیشہ سے میرا طریقہ رہا ہے"۔ یقال دان اذا اعتاد خیراً او شرّاً۔ یعنی "آدمی خواہ بُرے طریقہ کا پابند ہو یا بھلے طریقہ کا، دونوں صورتوں میں اس طریقہ کو جس کا وہ پابند ہے دین کہیں گے"۔ حدیث میں ہے کانت قریش و من دان بدینھم۔ "قریش اور وہ لوگ جو ان کے مسلک کے پیرو تھے"۔ اور حدیث میں ہے انّہ علیہ السّلام کان علٰی دین قومہ۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے اپنی قوم کے دین پر تھے"۔ یعنی نکاح، طلاق، میراث، اور دوسرے تمدّنی و معاشرتی امور میں انہی قاعدوں اور ضابطوں کے پابند تھے جو آپؐ کی قوم میں رائج تھے۔

(۴) جزاء عمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ۔ چنانچہ عربی میں مثل ہے کما تدین تُدان۔ یعنی "جیسا تُو کرے گا ویسا بھرے گا"۔ قرآن میں کفار کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہے أَئِنَّا لَمَدِينُونَ؟ "کیا مرنے کے بعد ہم سے حساب لیا جانے والا ہے؟ اور ہمیں بدلہ ملنے والا ہے؟" عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں آتا ہے لا تسبّوا السلطان فان کان لا بدّ فقولوا اللّٰھم دِنْھم کما یدینوننا۔ "اپنے حکمرانوں کو بُرا نہ کہو اور کہنا ناگزیر ہو تو یوں کہو خدایا جیسا یہ ہمارے ساتھ کر رہے ہیں ایسا ہی تو ان کے ساتھ کر"۔ اسی معنی میں دیّان بمعنی قاضی و حاکم عدالت آتا ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ سے جب حضرت علیؓ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کان دیّان ھٰذہ الامّۃ بعد نبیّھا۔ یعنی "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اس اُمّت کے سب سے بڑے قاضی تھے"۔

جامع اصطلاح

انہی تصوّرات میں سے کبھی ایک کے لیے اور کبھی دوسرے کے لیے اہلِ عرب مختلف طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔ مگر چونکہ ان چاروں اُمور کے متعلق عرب کے تصوّرات پُوری طرح صاف نہ تھے اور کچھ بہت

لہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خوارج دین یعنی ملّت سے نکل جائیں گے۔ کیونکہ حضرت علیؓ سے جب ان کے متعلق پوچھا گیا اکفار ھم؟ "کیا یہ لوگ کافر ہیں؟" تو آپؓ نے فرمایا من الکفر فرّوا۔ "کفر ہی سے تو وہ بھاگے ہیں"۔ پھر پوچھا گیا افمنافقون ھم؟ "کیا یہ منافق ہیں؟" آپؓ نے فرمایا "منافق تو خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں اور ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ شب و روز اللہ کا ذکر کرتے ہیں"۔ اسی بنا پر یہ متعیّن ہوتا ہے کہ اس حدیث میں دین سے مراد اطاعتِ امیر ہے۔ چنانچہ ابن اثیر نے نہایہ میں اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ اراد بالدین الطاعۃ ای انھم یخرجون من طاعۃ الامام المفترض الطاعۃ و ینسلخون منھا۔ یعنی حضرت علیؓ کا مطلب یہ تھا کہ وہ دین یعنی اس امام کی اطاعت سے نکل جائیں گے جس کی اطاعت فرض ہے۔ (جلد ۲ ص ۱۴۱-۱۴۲)

زیادہ علیحدہ بھی نہ تھے، اس لیے اس لفظ کے استعمال میں ابہام پایا جاتا تھا اور یہ کسی باقاعدہ نظامِ فکر کا اصطلاحی لفظ نہ بن سکا۔ قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے لیے مناسب پاکر بالکل واضح اور متعین مفہومات کے لیے استعمال کیا اور اس کو اپنی مخصوص اصطلاح بنا لیا۔ قرآنی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے۔

قرآنی مفہومات کے لحاظ سے دین کے معنی اُس طرزِ عمل اور اُس رویے کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے۔ اور دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے۔ اُسی کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی، اور انعام کا اُمیدوار ہو۔ اور اُس کی نافرمانی پر ذلّت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے لیکن ابھی اس کو دین کے پورے معنوی حُدود پر حاوی ہونے کے لیے مزید وسعت درکار ہے۔

ایک مُغالطہ

بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے، لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا۔ اس لیے انہوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ لامحالہ اس دین سے مُراد شرعی احکام و ضوابط نہیں ہیں۔ بلکہ صرف توحید و آخرت اور کتاب و نبوت کا ماننا اور اللہ کی عبادت بجا لانا ہے، یا حد سے حد اُس میں وہ موٹے موٹے اخلاقی اصُول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں مشترک رہے ہیں۔ لیکن یہ ایک بڑی سطحی رائے ہے جو سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کرلی گئی ہے۔ اور یہ ایسی خطرناک رائے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کر دی جائے تو آگے بڑھ کر بات دین و شریعت کی اُس تفریق تک جا پہنچے گی جس میں مبتلا ہو کر سینٹ پال نے دین بلاشریعت کا نظریہ پیش کیا اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی اُمت کو خراب کر دیا۔ اس لیے کہ جب شریعت دین سے الگ ایک چیز ہے، اور حکم صرف دین کو قائم کرنے کا ہے نہ کہ شریعت کو، تو لامحالہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح شریعت کو غیر اہم اور اس کی اقامت کو غیر مقصود بالذّات سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے اور صرف ایمانیات اور موٹے موٹے اخلاقی اصُولوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے۔ اس طرح کے قیاسات سے دین کا مفہوم متعین کرنے کے بجائے آخر کیوں نہ ہم خود اللہ کی کتاب سے پوچھ لیں کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم یہاں دیا گیا ہے آیا اس سے مراد صرف ایمانیات اور چند بڑے بڑے اخلاقی اصول ہی ہیں، یا شرعی احکام بھی؟ قرآن مجید کا جب ہم تتبع کرتے ہیں تو اس میں جن چیزوں کو دین میں شمار کیا گیا ہے ان میں حسب ذیل چیزیں بھی ہمیں ملتی ہیں:

(۱) وَمَآ أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَآءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَوٰةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ۔ (البیّنہ: آیت ۵)

"اور ان کو حکم نہیں دیا گیا مگر اس بات کا کہ یکسُو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی راست رَو ملّت کا دین ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ اس دین میں شامل ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے احکام مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام پچھلی شریعتوں میں نماز کی یہی شکل و ہیئت، یہی اس کے اجزاء، یہی اس کی رکعتیں، یہی اس کا قبلہ، یہی اس کے اوقات اور یہی اس کے دوسرے احکام رہے ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ تمام شریعتوں میں یہی اس کا نصاب، یہی اس کی شرحیں، اور یہی اس کی تفصیل اور تقسیم کے احکام رہے ہیں۔ لیکن اختلافِ شرائع کے باوجود اللہ تعالیٰ ان دونوں چیزوں کو دین میں شمار کر رہا ہے۔

(۲) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَن تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔ (المائدہ: ۳)

"تمہارے لیے حرام کیا گیا مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اور وہ جو گلا گُھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔ اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو، نیز یہ بھی تمہارے لیے حرام کیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب کام فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے۔ لہٰذا تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کیا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکامِ شریعت بھی دین ہی ہیں۔

(۳) قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ (التوبہ: ۲۹)

"جنگ کرو اُن لوگوں سے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسُول نے حرام کیا ہے اُسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔"

معلوم ہوا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ حلال و حرام کے اُن احکام کو ماننا اور اُن کی پابندی کرنا بھی دین ہے جو اللہ اور اُس کے رسُول نے دیئے ہیں

(۴) اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔ (النور: ۲)

"زانیہ عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔"

معلوم ہوا کہ فوجداری قانون بھی دین ہی ہے۔

یہ تو وہ چار نمونے ہیں جن میں شریعت کے احکام کو بالفاظِ صریح دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے جہنّم کی دھمکی ہے (مثلاً زنا، سُود خواری، قتلِ مومن، یتیم کا مال کھانا، باطل طریقوں سے لوگوں کے مال لینا، وغیرہ)، اور جن جرائم کو خدا کے عذاب کا مُوجب قرار دیا گیا ہے، (مثلاً عمل قوم لُوطؑ اور لین دین میں قومِ شعیبؑ کا سا رویہ)، ان کا شمار بھی لازماً دین میں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر دین جہنّم اور عذابِ الٰہی سے بچانے کے لیے نہیں آیا ہے تو اور کس چیز کے لیے آیا ہے؟ اسی طرح وہ احکام شریعت بھی دین ہی کا حصہ ہونے چاہییں جن کی خلاف ورزی کو خلودِ فی النار کا موجب قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً میراث کے احکام، جن کو بیان کرنے کے بعد آخر میں ارشاد ہوا ہے:-

وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ۔ (النساء: ۱۴)

"جو اللہ اور اس کے رسُول کی نافرمانی اور اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا اللہ اس کو دوزخ میں ڈال دے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اُس کے لیے رسوا کُن عذاب ہے۔"

اسی طرح جن چیزوں کی حُرمت کا فیصلہ کیا گیا ہے، مثلاً جوئے کی حُرمت، جھوٹی شہادت کی حُرمت، ان کی تحریم کو اگر اقامتِ دین میں شامل نہ کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر ضروری احکام بھی دے دیئے ہیں جن کا اجراء مقصود نہیں ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً روزہ اور حج، اُن کی اقامت کو بھی محض اس بہانے اقامتِ دین سے خارج نہیں کیا جا سکتا کہ رمضان کے ۳۰ روزے تو پچھلی شریعتوں میں نہ تھے، اور کعبے کا حج تو اُس شریعت میں تھا جو اولادِ ابراہیمؑ کی اسماعیلی شاخ کو ملی تھی۔

قانونِ مُلکی اور دین

سُورۂ یُوسُفؑ کی آیت مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ میں قانونِ مُلکی (Law of the Land

کے لیے لفظ "دین" استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے معنی دین کی وسعت پوری طرح واضح کر دی ہے۔ اس سے ان لوگوں کے تصورِ دین کی جڑ کٹ جاتی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو صرف عام مذہبی معنوں میں خدائے واحد کی پوجا کرانے اور محض چند مذہبی مراسم و عقائد کی پابندی کرا لینے تک محدود سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ انسانی تمدن، سیاست، معیشت، عدالت، قانون اور ایسے ہی دوسرے دُنیوی امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں ہے، یا اگر ہے بھی تو ان اُمور کے بارے میں دین کی ہدایات محض اختیاری سفارشات ہیں جن پر اگر عمل ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے اصول و ضوابط قبول کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سراسر گمراہانہ تصورِ دین، جس کا ایک مدت سے مسلمانوں میں چرچا ہے، جو بہت بڑی حد تک مسلمانوں کو اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی سعی سے غافل کرنے کا ذمہ دار رہا ہے، جس کی بدولت مسلمان کفر و جاہلیت کے نظامِ زندگی پر نہ صرف راضی ہو جائے بلکہ ایک نبی کی سُنّت سمجھ کر اس نظام کے پُرزے بننے اور اس کو خود چلانے کے لیے بھی آمادہ ہو گئے، اس آیت کی رُو سے قطعاً غلط ثابت ہوتا ہے جس میں فوجداری قانون کو دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ صاف بتا رہا ہے کہ جس طرح نماز، روزہ اور حج دین ہے اسی طرح وہ قانون بھی دین ہے جس پر سوسائٹی کا نظام اور ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ لہٰذا اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ اور وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وغیرہ آیات میں جس دین کی اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے اس سے مراد صرف نماز، روزہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کا اجتماعی نظام بھی ہے جس سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کی پیروی خدا کے ہاں ہرگز مقبول نہیں ہو سکتی۔

دراصل ساری غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ سُورۂ مائدہ کی آیت لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا "ہم نے تم میں سے ہر اُمّت کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کر دی" کا اُلٹا مطلب لے کر اسے یہ معنی پہنا دیئے گئے ہیں کہ شریعت چونکہ ہر اُمّت کے لیے الگ تھی اور حکم صرف اُس دین کے قائم کرنے کا دیا گیا ہے جو تمام انبیاءؑ کے درمیان مشترک تھا، اِس لیے اقامتِ دین کے حکم میں اقامتِ شریعت شامل نہیں ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ سُورۂ مائدہ میں جس مقام پر یہ آیت آئی ہے اس کے پورے سیاق و سباق کو آیت ۴۱ سے آیت ۵۰ تک اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی اُمّت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اِس اُمّت کے لیے دین تھی، اور اس کے دورِ نبوّت میں اسی کی اقامت مطلوب تھی۔ اور اب چونکہ سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کا دورِ نبوّت ہے اِس لیے اُمّتِ محمّدیہ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ اِس دور کے لیے دین ہے اور اس کا قائم کرنا ہی دین کا قائم کرنا ہے۔ رہا اِن شریعتوں کا اختلاف تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر

نماز اور روزے کو دیکھیے۔ نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے۔ مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزاء میں بھی فرق تھا۔ اسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا مگر ماہ رمضان کے ہی روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ مطلقاً نماز اور روزہ تو اقامتِ دین میں شامل ہے مگر ایک خاص طریقے سے نماز پڑھنا اور خاص زمانے میں روزے رکھنا اقامتِ دین سے خارج ہے۔ بلکہ اس سے صحیح طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کی اُمت کے لیے اُس وقت کی شریعت میں نماز اور روزے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے گئے تھے اُنہی کے مطابق اُس زمانے میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا دین قائم کرنا تھا۔ اور اب اقامتِ دین یہ ہے کہ ان عبادتوں کے لیے شریعتِ محمدیہ میں جو طریقہ رکھا گیا ہے ان کے مطابق انہیں ادا کیا جائے۔ اِنہی دو مثالوں پر دوسرے تمام احکامِ شریعت کو بھی قیاس کر لیجیے۔

دین اپنا اقتدار چاہتا ہے

قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دینِ حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیے جان لڑا دیں، اور یہ اُن کو انسانی زندگی کی اصلاح کا ایسا پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصے پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کیے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے کہ

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۔ (النساء: ۱۰۵)	"اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اُس روشنی میں جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔"

اس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے جو احکام دیئے گئے ہیں وہ صریحاً اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت کا تصور رکھتے ہیں جو ایک مقرر قاعدے کے مطابق زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمہ لے (التوبہ ۶۰-۱۰۳)۔ اس کتاب میں سُود کو بند کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سُود خوری جاری رکھنے والوں کے خلاف جو اعلانِ جنگ کیا گیا ہے (البقرہ ۲۷۵-۲۷۹)، وہ اسی صورت میں رُوبعمل آ سکتا ہے جب ملک کا سیاسی اور معاشی نظام پوری طرح اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ اس کتاب میں قاتل سے قصاص لینے کا حکم (البقرہ: ۱۷۸)، چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (المائدہ: ۳۸)، زنا اور قذف پر حد جاری کرنے کا حکم (النور ۲-۴)، اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ ان احکام کے ماننے والے لوگوں کو کفار کی پولیس اور عدالتوں کے ماتحت رہنا ہو گا۔ اس کتاب میں کفار سے قتال کا حکم (البقرہ ۱۹۰-۲۱۶) یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے

کہ اس دین کے پیرو کفر کی حکومت میں فوج بھرتی کرکے اس حکم کی تعمیل کریں گے۔ اس کتاب میں اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا حکم (التوبہ۔ ۲۹) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے ان سے جزیہ وصول کریں گے اور ان کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔ اور یہ معاملہ صرف مدنی سورتوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ مکی سورتوں میں بھی دیدۂ بینا کو علانیہ یہ نظر آسکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیشِ نظر تھا وہ دین کے غلبہ و اقتدار کا تھا نہ کہ کفر کی حکومت کے تحت دین اور اہلِ دین کے ذمی بن کر رہنے کا۔

حضورؐ کے کارنامے سے استشہاد

سب سے بڑھ کر جس چیز سے تعبیر کی یہ غلطی متصادم ہوتی ہے وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عظیم الشان کام ہے جو حضورؐ نے ۲۳ سال کے زمانۂ رسالت میں انجام دیا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ آپؐ نے تبلیغ اور تلوار دونوں سے پورے عرب کو مسخر کیا اور اس میں ایک مکمل حکومت کا نظام ایک مفصل شریعت کے ساتھ قائم کر دیا جو اعتقادات اور عبادات سے لے کر شخصی کردار، اجتماعی اخلاق، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، سیاست و عدالت، صلح و جنگ، غرض زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھی۔ اگر حضورؐ کے اس پورے کام کو اقامتِ دین [redacted]

اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرماں برداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ حسبِ ذیل آیات میں "دین" اسی اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۔ (توبہ۔ آیت ۲۹)

"اہلِ کتاب میں جو لوگ نہ اللہ کو مانتے ہیں (یعنی اس کو واحد مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے) نہ یومِ آخرت (یعنی یوم الحساب اور یوم الجزاء) کو مانتے ہیں اور نہ اُن چیزوں کو حرام مانتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسُول نے حرام قرار دیا ہے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں"

اس آیت میں "دینِ حق" اصطلاحی لفظ ہے جس کے مفہوم کی تشریح واضع اصطلاح جل شانہٗ نے پہلے تین فقروں میں خود ہی کر دی ہے۔ ان کے مجموعے ہی کو دینِ حق سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۔ (المؤمن۔ آیت ۲۶)

"فرعون نے کہا چھوڑو مجھے، میں اس موسیٰ کو قتل ہی کیے دیتا ہوں اور اب پکارے یہ اپنے رب کو مجھے خوف ہے کہ کہیں یہ تمہارا دین نہ بدل دے یا ملک میں فساد نہ کھڑا کر دے"

قرآن میں قصّہ فرعون و موسیٰ کی جتنی تفصیلات آئی ہیں ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین محض "مذہب" کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ ریاست اور نظامِ تمدّن کے معنی میں آیا ہے۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر موسیٰ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا، جو نظامِ زندگی اس وقت فراعنہ کی حاکمیت اور رائج الوقت قوانین و رسُوم کی بنیادوں پر چل رہا ہے وہ جڑ سے اکھڑ جائے گا، اور اس کی جگہ یا تو دوسرا نظام بالکل دوسری ہی بنیادوں پر قائم ہوگا، یا نہیں تو سرے سے کوئی نظام قائم ہی نہ ہو سکے گا، بلکہ تمام ملک میں بدنظمی پھیل جائے گی۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران۔ ۱۹)

"اللہ کے نزدیک دین تو دراصل "اسلام" ہے"

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران۔ ۸۵)

"اور جو "اسلام" کے سوا کوئی اور "دین" تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا"

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۔ (التوبہ۔ ۳۳)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسُول کو صحیح رہنمائی اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے اگرچہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ - (الانفال - ۳۹)	"اور تم اُن سے لڑتے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے۔"
إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (النصر)	"جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہو چکی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اب اپنے رب کی حمد و ثنا اور اس کی تسبیح کرو اور اس سے درگزر کی درخواست کرو وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔"

ان سب آیات میں دین سے پُورا نظامِ زندگی اپنے تمام اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مُراد ہے۔ پہلی دو آیتوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صحیح نظامِ زندگی صرف وہ ہے جو خود اللہ ہی کی اطاعت و بندگی (اسلام) پر مبنی ہو۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نظام جس کی بنیاد کسی دوسرے مفروضہ اقتدار کی اطاعت پر ہو، مالکِ کائنات کے ہاں ہرگز مقبول نہیں اور فطرۃً نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ انسان جس کا مخلوق، مملوک اور پروردہ ہے اور جس کے ملک میں رعیّت کی حیثیت سے رہتا ہے، وہ تو کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ انسان خدا اس کے سوا کسی دوسرے اقتدار کی بندگی و اطاعت میں زندگی گذارنے اور کسی دوسرے کی ہدایات پر چلنے کا حق رکھتا ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسُول کو اسی صحیح و برحق نظامِ زندگی یعنی اسلام کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کے مشن کی غایت یہ ہے کہ اس نظام کو تمام دوسرے نظاموں پر غالب کر کے رہے۔

چوتھی آیت میں دینِ اسلام کے پیروؤں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو اور اُس وقت تک دم نہ لو جب تک فتنہ یعنی اُن نظامات کا وجود دُنیا سے مٹ نہ جائے جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے اور پُورا نظامِ اطاعت و بندگی اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے۔

پانچویں آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے اس موقع پر خطاب کیا گیا ہے جب کہ ۲۳ سال کی مسلسل جدوجہد سے عرب میں انقلاب کی تکمیل ہو چکی تھی، اسلام اپنی پُوری تفصیلی صورت میں ایک اعتقادی و فکری، اخلاقی و تعلیمی، تمدّنی و معاشرتی اور معاشی و سیاسی نظام کی حیثیت سے عملاً قائم ہو گیا تھا، اور عرب کے مختلف گوشوں سے وفد پر وفد آکر اس نظام کے دائرے میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس طرح جب وہ کام تکمیل کو پہنچ گیا جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو مامور کیا گیا تھا، تو آپؐ سے ارشاد ہوتا ہے کہ اس کارنامے کو اپنا کارنامہ سمجھ کر کہیں فخر نہ کرنے لگنا، نقص سے پاک بے عیب ذات اور کامل ذات صرف تمہارے رب ہی کی ہے۔ لہٰذا اس کارِ عظیم کی انجام دہی پر اُس کی تسبیح اور

حمد و ثنا کرو اور اُس ذات سے درخواست کرو کہ مالک، اس ۲۳ سال کے زمانۂ خدمت میں اپنے فرائض ادا کرنے میں جو خامیاں اور کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہو گئی ہوں انہیں معاف فرما دے ۴۳

باب ۹

معجزات

فصل ۱

مسئلۂ معجزات

پیغمبروں نے جب کبھی اپنے آپ کو فرستادۂ ربّ العٰلمین کی حیثیت سے پیش کیا تو لوگوں نے اُن سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی ربّ العٰلمین کے نمائندے ہو تو تمہارے ہاتھوں سے کوئی ایسا واقعہ ظہور میں آنا چاہیے جو قوانینِ فطرت کی عام روش سے ہٹا ہُوا ہو اور جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہو کہ ربّ العٰلمین نے تمہاری صداقت ثابت کرنے کے لیے اپنی براہِ راست مداخلت سے یہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے۔ اِس مطالبہ کے جواب میں انبیاء علیہم السلام نے وہ نشانیاں دکھائی ہیں جن کو قرآن کی اصطلاح میں "آیات" اور متکلمین کی اصطلاح میں "معجزات" کہا جاتا ہے۔

منکرینِ معجزات کی اُلجھن

ایسے نشانات یا معجزات کو جو لوگ قوانینِ فطرت کے تحت صادر ہونے والے عام واقعات قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ درحقیقت کتاب کو ماننے اور نہ ماننے کے درمیان ایک ایسا موقف اختیار کرتے ہیں جو کسی طرح معقول نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے کہ قرآن جس جگہ صریح طور پر خارقِ عادت واقعہ کا ذکر کر رہا ہو وہاں اسے سیاق و سباق کے بالکل خلاف ایک عادی واقعہ بنانے کی کوشش محض ایک بھونڈی سخن سازی ہے جس کی ضرورت صرف اُن لوگوں کو پیش آتی ہے جو ایک طرف تو کسی ایسی کتاب پر ایمان نہیں لانا چاہتے جو خارقِ عادت واقعات کا ذکر کرتی ہو، اور دوسری طرف آبائی مذہب کے پیدائشی معتقد ہونے کی وجہ سے اس کتاب کا انکار بھی نہیں کرنا چاہتے جو فی الواقع خارقِ عادت واقعات کا ذکر کرتی ہے۔

اصل سوال

معجزات کے باب میں اصل فیصلہ کن سوال صرف یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ نظامِ کائنات کو ایک قانون پر چلا دینے کے بعد معطّل ہو چکا ہے اور اس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کسی موقع پر مداخلت نہیں کر سکتا؟ یا وہ بالفعل اپنی سلطنت کی زمامِ تدبیر و انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور ہر آن اُس کے احکام اِس سلطنت میں نافذ ہوتے

ہیں اور اس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ اشیاء کی شکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جزئی طور پر یا کلی طور پر جیسا چاہے اور جب چاہے تغیر کر دے۔

دو نقطہ ہائے نظر

جو لوگ اس سوال کے جواب میں پہلی بات کے قائل ہیں ان کے لیے معجزات کو تسلیم کرنا غیر ممکن ہے کیونکہ معجزہ نہ ان کے تصورِ خدا سے میل کھاتا ہے اور نہ تصورِ کائنات سے۔ لیکن ایسے لوگوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر و تشریح کرنے کے بجائے اس کا صاف صاف انکار کر دیں۔ کیونکہ قرآن نے تو سارا زورِ بیان ہی خدا کے مقدم الذکر تصور کا ابطال اور مؤخر الذکر تصور کا اثبات کرنے پر صرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص قرآن کے دلائل سے مطمئن ہو کر دوسرے تصور کو قبول کر لے اس کے لیے معجزے کو سمجھنا اور تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ جب آپ کا عقیدہ یہی ہوگا کہ مثلاً اژدہے جس طرح پیدا ہوا کرتے ہیں اسی طرح وہ پیدا ہو سکتے ہیں، اس کے سوا کسی دوسرے ڈھنگ پر کوئی اژدہا پیدا کر دینا خدا کی قدرت سے بھی باہر ہے، تو آپ مجبور ہیں کہ ایسے شخص کے بیان کو قطعی طور پر جھٹلا دیں جو آپ کو خبر دے رہا ہو کہ ایک لاٹھی اژدہے میں تبدیل ہوئی، اور پھر اژدہے سے لاٹھی بن گئی لیکن اس کے برعکس اگر آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ بے جان مادے میں خدا کے حکم سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور خدا جس مادے کو جیسی چاہے زندگی عطا کر سکتا ہے تو اس کے حکم سے لاٹھی کا اژدہا بننا اتنا ہی غیر عجیب واقعہ ہے جتنا اسی خدا کے حکم سے انڈے کے اندر بھرے ہوئے چند بے جان مادوں کا اژدہا بن جانا غیر عجیب ہے۔ مجرد یہ فرق کہ ایک واقعہ ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے، اور دوسرا واقعہ صرف تین مرتبہ پیش آیا، ایک کو غیر عجیب اور دوسرے کو عجیب بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔[۱۳۵]

معجزات کے برحق ہونے کے دلائل

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ اَحَدًا۔
(الکہف۔ آیت ۲۲)

"کہو میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ ٹھیک کتنے تھے کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں پس تم سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو، اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔"

مطلب یہ ہے کہ اصل چیز ان کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اصل چیز وہ سبق ہیں جو اس قصے سے ملتے ہیں۔ اس سے سبق یہ ملتا ہے کہ ایک سچے مومن کو کسی حال میں حق سے منہ موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہونا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کا اعتماد اسبابِ دنیا پر نہیں بلکہ اللہ پر ہونا چاہیے اور حق پرستی کے

سیلے بظاہر احوال میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہِ حق میں قدم اٹھا دینا چاہیے۔

قانونِ فطرت اور خدا کا بالاتر اختیار

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس "عادتِ جاریہ" کو لوگ "قانونِ فطرت" سمجھتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دُنیا میں کچھ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ درحقیقت اُس کا پابند نہیں ہے۔ وہ جب اور جہاں چاہے اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اُس کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو دو سو برس تک سُلا کر اس طرح اُٹھا بٹھائے جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہے، اور اس کی عمر، شکل، صورت، لباس، تندرستی، غرض کسی چیز پر بھی اس طویل زمانے کا کچھ اثر نہ ہو۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو بیک وقت زندہ کر کے اُٹھا دینا، جس کی خبر انبیاءؑ اور کتبِ آسمانی نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جاہل انسان کس طرح ہر زمانے میں اللہ کی نشانیوں کو اپنے لیے سرمۂ چشمِ بصیرت بنانے کے بجائے اُلٹا مزید گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔ لہ

کائنات میں غیر معمولی عجائبات

خدا کی اس خدائی میں عجائبات کی کمی نہیں ہے۔ جس طرف بھی آدمی نگاہ ڈالے اس کی قدرت کے کرشمے غیر معمولی واقعات کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ کچھ واقعات و حالات کا معمولاً ایک خاص صورت میں رونما ہوتے رہنا اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس معمول سے ہٹ کر کسی دوسری غیر معمولی صورت میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے مفروضات کو توڑنے کے لیے کائنات کے ہر گوشے میں اور مخلوقات کی ہر صنف میں خلافِ معمول حالات و واقعات کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جو شخص خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا واضح تصور رکھتا ہو وہ تو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ کسی انسان کو ایک ہزار برس یا اس سے کم و بیش عمر عطا کر دینا اس خدا کے لیے بھی ممکن نہیں ہے جو موت و حیات کا خالق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر خود چاہے تو ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن اگر خدا چاہے تو جب تک وہ چاہے اُسے زندہ رکھ سکتا ہے۔ لہ

لہ اصحابِ کہف کا جو معجزہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے دکھایا تھا کہ لوگ اس سے آخرت کا یقین حاصل کریں، ٹھیک اسی نشان کو انہوں نے یہ سمجھا کہ اللہ نے انہیں اپنے کچھ اور ولی پوجنے کے لیے عطا کر دیئے۔ (از مؤلف)

فصل ۲

انبیائے ماسبق کے معجزات پر ایک نظر

حضرت صالحؑ کی اونٹنی کا معجزہ

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (اعراف: ۷۳)

"اور ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا، اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے۔ اس کو کسی بُرے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آ لے گا۔"

ظاہر عبارت سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے فقرے میں اللہ کی جس کھلی دلیل کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس سے مراد یہی اونٹنی ہے جسے اس دوسرے فقرے میں "نشانی" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورہ شعراء رکوع ۸ میں تصریح ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالحؑ سے مطالبہ کیا تھا، جو ان کے مامور من اللہ ہونے پر کھلی دلیل ہو، اور اسی کے جواب میں حضرت صالحؑ نے اونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہوا تھا اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاء نے اپنی نبوت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبہ پر پیش کیے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس اونٹنی کی معجزانہ پیدائش پر دلیل ہے کہ حضرت صالحؑ نے اسے پیش کر کے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اس اونٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی معلق ہے۔ یہ آزادانہ تمہاری زمینوں میں چرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ اکیلی پانی پیئے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پئیں گے اور اگر تم نے اس کو ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ظاہر ہے اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جا سکتی تھی جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ پھر یہ بات

کہ ایک کافی مدت تک یہ لوگ اس کے چرتے پھرنے کو اور اس بات کو کہ ایک دن تنہا وہ پانی پیئے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پییں، بادلِ ناخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر ٹوبے مشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا، درآں حالے کہ حضرت صالح کے پاس کوئی طاقت نہ تھی جس کا انہیں کوئی خوف ہوتا۔ اس حقیقت پر مزید دلیل ہے کہ وہ اس اونٹنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی زور ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دندناتی پھرتی ہے۔ قرآن اس امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ اونٹنی کیسی تھی، اور کس طرح وجود میں آئی کسی صحیح حدیث میں بھی اس کی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے ان روایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو مفسرین نے اس کی کیفیتِ پیدائش کے متعلق نقل کی ہیں لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور پر معجزے کی حیثیت رکھتی تھی، قرآن سے ثابت ہے۔ ۱۵۸؎

احیائے موتیٰ کا معجزہ

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (البقرہ۔ ۲۵۹)

"یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اس نے کہا یہ آبادی، جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟ اس پر اللہ نے اس کی رُوح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مُردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پُوچھا: بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟ اس نے کہا: ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ فرمایا: تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ تم ہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی، تو اس نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

یہ ایک غیر ضروری بحث ہے کہ وہ شخص کون تھا اور وہ بستی کون سی تھی۔ اصل مدعا جس کے لیے یہاں یہ ذکر لایا گیا ہے، صرف یہ بتانا ہے کہ جس نے اللہ کو اپنا ولی بنایا تھا اُسے اللہ نے کس طرح روشنی عطا کی۔ شخص اور مقام

دونوں کی تعیین کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ اس کا کوئی فائدہ۔ البتہ بعد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن صاحب کا یہ ذکر ہے، وہ ضرور کوئی نبی ہوں گے۔

اس سوال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بزرگ حیات بعد الموت کے منکر تھے۔ یا انہیں اس میں شک تھا بلکہ دراصل وہ حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے، جیسا کہ انبیاء کو کرایا جاتا رہا ہے۔ ایک ایسے شخص کا زندہ پلٹ کر آنا جسے دنیا سو برس پہلے مردہ سمجھ چکی تھی خود اس کو اپنے ہم عصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بنا دینے کے لیے کافی تھا۔ ۱۴۹ے

حضرت ایوبؑ کے لیے چشمۂ شفا

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ؕ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ○ (ص۔ ۴۱-۴۲)

"اور ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر کرو۔ جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔ (ہم نے اسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مار، یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین میں پاؤں مارتے ہی ایک چشمہ نکل آیا جس کا پانی پینا اور اس میں غسل کرنا حضرت ایوبؑ کے مرض کا علاج تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ کسی سخت جلدی مرض میں مبتلا تھے۔ بائبل کا بیان بھی یہی ہے کہ سر سے پاؤں تک ان کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔ ۱۵۰ے

معجزاتِ حضرت ابراہیمؑ

چار پرندوں کو زندہ کرنے کا واقعہ

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (البقرہ۔ ۲۶۰)

"اور وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے، جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ "میرے مالک! مجھے دکھا دے، تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔" فرمایا: کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔ فرمایا اچھا تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے

چلے آئیں گے۔ خوب جان رکھو کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔"

حضرت ابراہیمؑ کے ہاں بڑھاپے میں اولاد کی پیدائش

فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝ (ہود۔ آیات ۷۱-۷۳)

"پھر ہم نے اس کو اسحٰقؑ کی اور اسحٰقؑ کے بعد یعقوبؑ کی خوشخبری دی۔ وہ بولی" ہائے میری کم بختی! کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جبکہ میں بڑھیا کھوسٹ ہوگئی اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" فرشتوں نے کہا" اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیمؑ کے گھر والو! تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔ اور یقیناً اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے۔"

حضرت ابراہیمؑ کا آگ سے بچا یا جانا

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ۝ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت۔ ۹۷-۹۸)

"انہوں نے آپس میں کہا" اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔" انہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی۔ مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا۔"

معجزات حضرت موسیٰؑ

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ۔ (المؤمنون: آیت ۴۵)

"پھر ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی ہارونؑ کو اپنی نشانیوں اور کھلی سند کے ساتھ فرعون اور اُس کے اعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا۔"

"نشانیوں" کے بعد "کھلی سند" سے مراد یا تو یہ ہے کہ ان نشانیوں کا ان کے ساتھ ہونا ہی اس بات کی کھلی سند تھا کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔ یا پھر نشانیوں سے مراد عصا کے سوا دوسرے وہ تمام معجزات ہیں جو مصر میں دکھائے گئے تھے۔ اور کھلی سند سے مراد عصا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے جو معجزے رونما ہوئے ان کے بعد تو یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ یہ دونوں بھائی مامور من اللہ ہیں۔[۱]

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَاۗءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝

"انہوں نے جو اپنے انچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوفزدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ
(سورۂ اعراف: ۱۱۷-۱۱۸)

بنا لائے ہیں۔ ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے اس جھوٹے طلسم کو نگلتا چلا گیا۔

عصائے موسوی

یہ گمان کرنا صحیح نہیں ہے کہ عصا ان لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا جو جادوگروں نے پھینکی تھیں اور سانپ اور اژدہے بنی نظر آرہی تھیں۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ عصا نے سانپ بن کر ان کے اس طلسم فریب کو نگلنا شروع کر دیا جو انہوں نے تیار کیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانپ جدھر جدھر گیا وہاں سے جادو کا وہ اثر کافور ہوتا چلا گیا جس کی بدولت لاٹھیاں اور رسیاں سانپوں کی طرح لہراتی نظر آتی تھیں اور اس کی ایک ہی گردش میں جادوگروں کی ہر لاٹھی اور ہر رسی، رسی بن کر رہ گئی۔ [illegible]

آلِ فرعون پر متعدد تنبیہی عذاب

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ○ فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ ۗ أَلَا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِندَ اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○ وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ○ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ○ (اعراف آیات ۱۳۰-۱۳۳)

ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں، اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لیے فالِ بد ٹھیراتے، حالانکہ درحقیقت ان کی فالِ بد تو اللہ کے پاس تھی، مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔ انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے ہم تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سُرسُریاں پھیلائیں، مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں مگر وہ سرکشی کیے چلے گئے اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔

یہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخن پروری تھی کہ فرعون کے اہلِ دربار اُس چیز کو بھی جادو قرار دے رہے تھے جس کے متعلق وہ خود بھی بالیقین جانتے تھے کہ وہ جادو کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ شاید ایک بے وقوف آدمی بھی یہ باور نہ کرے گا کہ ایک پورے ملک میں قحط پڑ جانا اور زمین کی پیداوار میں مسلسل کمی واقع ہونا کسی جادوگر کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ اسی

بنا پر قرآن پاک کہتا ہے کہ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل۔ آیات ۱۳-۱۴) یعنی "جب ہماری نشانیاں ان کی نگاہوں کے سامنے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے، حالانکہ ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے مگر انہوں نے محض ظلم اور سرکشی کی راہ سے ان کا انکار کیا"۔

طوفان سے مراد غالباً بارش کا طوفان ہے جس میں اولے بھی برسے تھے۔ اگرچہ طوفان دوسری چیزوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر بائیبل میں ژالہ باری کے طوفان کا ہی ذکر ہے اس لیے ہم اسی معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اصل میں لفظ قُمَّل استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ جُوئیں، چھوٹی مکھی، چھوٹی ٹڈی، مچھر، سُرسُری وغیرہ۔ غالباً یہ جامع لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ بیک وقت جُوؤں اور مچھروں نے آدمیوں پر اور سُرسُریوں (گھن) کے کیڑوں نے غلّے کے ذخیروں پر حملہ کیا ہوگا۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو بائیبل کی کتاب خروج، باب ۷ تا ۱۲)

۹ نشانیاں

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ
بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ
فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا
قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ
يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۔ (بنی اسرائیل۔ آیات ۱۰۱-۱۰۲)

"ہم نے موسیٰ کو نو نشانیاں عطا کی تھیں جو صریح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اب یہ تم خود بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب وہ سامنے آئیں تو فرعون نے یہی کہا تھا کہ "اے موسیٰ میں سمجھتا ہوں کہ تو ضرور ایک سحر زدہ آدمی ہے"۔ موسیٰ نے اس کے جواب میں کہا "تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں ربّ السموات والارض کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں، اور میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون تو ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہے"۔

وہ نو نشانیاں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے پہلے سورۂ اعراف میں گزر چکی ہیں یعنی عصا جو اژدہا بن جاتا تھا۔ یدِ بیضا، جو بغل سے نکالتے ہی سورج کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ جادوگروں کے جادو کو برسرِ عام شکست دینا۔ ایک اعلان کے مطابق سارے ملک میں قحط برپا ہو جانا۔ اور پھر یکے بعد دیگرے طوفان، ٹڈی دَل، سُرسُریوں، مینڈکوں اور خون کی بلاؤں کا نازل ہونا۔

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی بات کا جو جواب دیا اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی ملک میں قحط آ جانا، یا لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلے ہوئے علاقوں میں مینڈکوں کا ایک بلا کی طرح نکلنا، یا تمام ملک کے غلّے کے گوداموں میں گھن لگ جانا، اور ایسے ہی دوسرے عام مصائب کسی جادوگر کے جادو، یا کسی انسانی طاقت کے کرتب سے رونما نہیں ہو سکتے۔ پھر جبکہ ہر بلا کے نزول سے پہلے حضرت موسیٰؑ فرعون کو نوٹس دے دیتے تھے کہ اگر تو اپنی ہٹ سے باز نہ آیا تو یہ بلا تیری سلطنت پر مسلط کی جائے گی اور ٹھیک ان کے بیان کے مطابق وہی بلا پوری سلطنت پر نازل ہو جاتی تھی، تو اس صورت میں صرف

ایک دیوانہ یا ایک سخت ہٹ دھرم آدمی ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ ان بلاؤں کا نزول ربّ السّموات والارض کے سوا کسی اور کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔ ؎

عصا سے بحر کا پھٹنا

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ	"ہم نے موسیٰؑ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں
بِعِبَادِىْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ	کو لے کر چل پڑ اور ان کے لیے سمندر میں سے سوکھی سڑک
يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝	بنا لے، تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ
(طٰہٰ۔ آیت ۷۷)	(سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے) ڈر لگے۔"

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر کار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام بنی اسرائیل اور غیر اسرائیلی مسلمانوں کو (جن کے لیے "میرے بندوں" کا جامع لفظ استعمال کیا گیا ہے) مصر کے ہر حصّے سے ہجرت کے لیے نکل پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔ اُس زمانے میں نہر سویز موجود نہ تھی۔ بحر احمر سے بحر روم (میڈیٹرینین) تک کا پورا علاقہ کھلا ہوا تھا۔ مگر اس علاقے کے تمام راستوں پر فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے بخیریت نہیں گزرا جا سکتا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ نے بحر احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ سمندر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف نکل جائیں۔ لیکن اُدھر سے فرعون ایک لشکر عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اُس موقع پر آ پہنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سُورۃ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کا قافلہ لشکرِ فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گھر چکا تھا۔ عین اُس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ "اپنا عصا سمندر پر مار"۔ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ، "فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا"۔ اور بیچ میں صرف یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا، بلکہ بیچ کا یہ حصّہ اوپر کی آیت کے مطابق خشک ہو کر سوکھی سڑک کی طرح بن گیا۔ یہ صاف اور صریح معجزے کا بیان ہے، اور اس سے ان لوگوں کے بیان کی غلطی واضح ہو جاتی ہے، جو کہتے ہیں کہ ہوا کے طوفان یا جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر ہٹ گیا تھا۔ اس طرح جو پانی ہٹتا ہے وہ دونوں طرف ٹیلوں کی صورت میں کھڑا نہیں ہو جاتا، اور نہ بیچ کا حصّہ سوکھ کر سڑک کی طرح بن جاتا ہے۔ ؎

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ	"ہم نے موسیٰؑ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ مار اپنا
الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ	عصا سمندر پر، یکایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر
الْعَظِيْمِ ۝ (الشّعراء: آیت ۶۳)	ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔"

اصل الفاظ ہیں کَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ۔ طَود عربی زبان میں کہتے ہی بڑے پہاڑ کو ہیں۔ لسان العرب میں ہے اَلطَّوْدُ:

الجبل العظیم۔ اس کے لیے پھر عظیم کی صفت لانے کے معنی یہ ہوئے کہ پانی دونوں طرف بہت اونچے پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا تھا پھر جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ یہ کام ایک طرف بنی اسرائیل کے پورے قافلے کو گزارنے کے لیے کیا گیا تھا اور دوسری طرف اس سے مقصد فرعون کے لشکر کو غرق کرنا تھا تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پانی ان بہت بلند پہاڑوں کی شکل میں اتنی دیر تک کھڑا رہا کہ ہزاروں لاکھوں بنی اسرائیل کا مہاجر قافلہ اس بیچ میں گزر بھی گیا اور پھر فرعون کا پورا لشکر اس کے درمیان پہنچ بھی گیا۔ ظاہر ہے کہ عام قانونِ فطرت کے تحت جو طوفانی ہوائیں چلتی ہیں۔ وہ خواہ کیسی ہی تند و تیز ہوں ان کے اثر سے کبھی سمندر کا پانی اس طرح عالی شان پہاڑوں کی طرح اتنی دیر کھڑا نہیں رہا کرتا۔ اس پر مزید سورۃ طٰہٰ کا یہ بیان ہے کہ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا "ان کے لیے سمندر میں سوکھا راستہ بنا دے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سمندر پر عصا مارنے سے صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ سمندر کا پانی ہٹ کر دونوں طرف پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا، بلکہ بیچ میں جو راستہ نکلا وہ خشک بھی ہو گیا، کوئی کیچڑ ایسی نہ رہی جو چلنے میں مانع ہوتی۔ یہ صریح ایک معجزے کا بیان ہے اور اس سے ان لوگوں کے خیال کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو اس واقعے کی تعبیر عام قوانینِ فطرت کے تحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔[۱۵۹]

مَن و سلویٰ کا نزول

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَى (بقرہ۔۵۷) "اور تم پر من و سلویٰ اتارا۔"

بائیبل کا بیان ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشت سین میں ایلیم اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خوراک کے ذخیرے ختم ہو کر فاقوں کی نوبت آگئی تھی، اس وقت من و سلویٰ کا نزول شروع ہوا اور فلسطین کے آباد علاقے میں پہنچنے تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا (خروج، باب ۱۶، گنتی باب ۱۱ آیت ۷-۹۔ یشوع، باب ۵ آیت ۱۲)۔ کتاب خروج میں من و سلویٰ کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:

"اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب وہ اوس سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول گول چیز ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اس کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے من؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے وہ کیا ہے۔" (باب ۱۶ آیت ۱۳-۱۵)۔

"اور بنی اسرائیل نے اس کا نام من رکھا اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید اور اس کا مزہ شہد کے بنے ہوئے پوئے کی طرح تھا۔" (آیت ۳۱)۔

گنتی میں اس کی مزید تشریح یہ ملتی ہے:

"لوگ ادھر ادھر جا کر اسے جمع کرتے اور اسے چکی میں پیستے یا اوکھلی میں کوٹ لیتے تھے پھر اسے ہانڈیوں

میں اُبال کر روٹیاں بناتے تھے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب لشکر گاہ میں اوس پڑتی تو اس کے ساتھ مَن بھی گرتا تھا (باب ۱۱۔ آیت ۸-۹)۔

یہ بھی ایک معجزہ تھا۔ کیونکہ چالیس برس بعد جب بنی اسرائیل کے لیے خوراک کے فطری ذرائع بہم پہنچ گئے تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب نہ اس علاقے میں بٹیروں کی وہ کثرت ہے، نہ مَن ہی کہیں پایا جاتا ہے۔ "تلاش و جستجو کرنے والوں نے اُن علاقوں کو چھان مارا ہے۔ جہاں بائیبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل نے چالیس سال تک دشت نوردی کی تھی۔ مَن اُن کو کہیں نہ ملا۔ البتہ کاروباری لوگ خریداروں کو بیوقوف بنانے کے لیے مَن کا حلوہ ضرور بیچتے پھرتے ہیں۔[۱۷۰]

معجزات حضرت سلیمانؑ

پرندوں کی بولیوں کا علم

وَقَالَ يَاأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ۔ (النمل۔ آیت ۱۶)

"اور اُس نے کہا "لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں۔"

بائیبل اس ذکر سے خالی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو پرندوں اور جانوروں کی بولیوں کا علم دیا گیا تھا لیکن بنی اسرائیل کی روایات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ۱۱ص ۴۳۹)[۱۷۱]

ان کے لیے جنوں کا مسخر ہونا

وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ۔ (النمل ۱۷)

"سلیمانؑ کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے جو پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔"

ملکہ سبا کا تخت آناً فاناً لایا جانا

قَالَ يَاأَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ ٭ قَالَ عِفْرِيتٌ مِنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ ۖ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ ٭ قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي (النمل۔ آیت ۴۰)

"سلیمانؑ نے کہا "اے اہلِ دربار! تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟" جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا "میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں۔ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں۔" جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا "میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں۔" جونہی کہ سلیمانؑ

نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا وہ پکار اُٹھا "یہ میرے رب کا فضل ہے"۔

دُوسرے انبیاؑ کے چند اور مُعجزات

قصۂ یونسؑ کے مُعجزاتی پہلو

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ۝ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝ فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۝ (الصّٰفّٰت ۱۳۹-۱۴۶)

"اور یقیناً یونسؑ بھی رسولوں میں سے تھا۔ یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا۔ پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا اور اس میں مات کھائی۔ آخر کار مچھلی نے اُسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا۔ اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو روزِ قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔ آخر کار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا اور اس پر ایک بیلدار درخت اُگا دیا"

حضرت زکریاؑ کے لیے سن رسیدہ بیوی سے اولاد

فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ يٰزَكَرِيَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ (مریم: ۵-۱۰)

"تو مجھے اپنے فضلِ خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آلِ یعقوبؑ کی میراث بھی پائے اور اُسے پروردگار! اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا" (جواب دیا گیا) "اے زکریاؑ! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا" عرض کیا "پروردگار! بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سوکھ چکا ہوں" جواب ملا "ایسا ہی ہوگا تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے۔ آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جبکہ تو کوئی چیز نہ تھا" زکریاؑ نے کہا "پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے" فرمایا "تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے"

معجزاتِ حضرت عیسیٰؑ

حضرت عیسیٰؑ کا بے باپ پیدا کیا جانا

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ ۝ (المؤمنون آیت ۵۰)

"اور ابن مریمؑ اور اس کی ماں کو ہم نے ایک نشان بنایا اور ان کو ایک سطحِ مرتفع پر رکھا جو اطمینان کی جگہ تھی اور چشمے اس میں جاری تھے۔"

یہ نہیں فرمایا کہ ایک نشانی ابن مریمؑ تھے اور ایک نشانی خود مریمؑ۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ ابن مریمؑ اور اس کی ماں کو دو نشانیاں بنایا۔ بلکہ فرمایا یہ ہے کہ دونوں مل کر ایک نشانی بنائے گئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ باپ کے بغیر ابن مریمؑ کا پیدا ہونا اور مرد کی صحبت کے بغیر مریمؑ کا حاملہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو ان دونوں کو ایک نشانی بناتی ہے[62]۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِن دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۝ قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۖ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝ فَحَمَلَتْهُ فَانتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَٰذَا وَكُنتُ نَسْيًا مَّنسِيًّا ۝

(مریم: آیات ۱۶ تا ۲۲)

"اور (اے محمدؐ!) اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو، جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ بیٹھی تھی۔ اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ مریمؑ یکایک بول اٹھی کہ "اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔" اس نے کہا "میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔" مریمؑ نے کہا "میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے۔ اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔" فرشتے نے کہا "ایسا ہی ہو گا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف

سے ایک رحمت، اور یہ کام ہو کر رہنا ہے" مریمؑ کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دُور کے مقام پر چلی گئی۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی" کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام نشان نہ رہتا۔"

دُور کے مقام سے مُراد بیت لحم ہے۔ حضرت مریمؑ کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المقدس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں تا کہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال سب کو چھوڑ کر وہ زچگی کے لیے ایک دور دراز مقام پر چلی جاتیں۔[163]

ان الفاظ سے اُس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریمؑ اس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ درد زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے بلکہ یہ فکر ان کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں انہیں ڈالا ہے، اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا۔ اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے ان سے کہا "غم نہ کر" اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریمؑ نے یہ الفاظ کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے اسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہوتا۔[164]

نوزائیدہ بچے کا گہوارے میں کلام کرنا

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ (مریم - ۲۸)

"پس جب وہ بچے کو گود میں لیے قوم کے پاس آئیں تو لوگوں نے پوچھا: اے مریم یہ چیز کہاں سے لے آئی؟ اے ہارون کی بہن، نہ تو تیرا باپ کوئی [illegible] نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔"

جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش کے منکر ہیں وہ آخر اس بات کی کیا معقول توجیہ کرتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کے بچہ لیے ہوئے آنے پر قوم کیوں چڑھ آئی اور ان پر طعن اور ملامت کی بوچھاڑ اس نے کیوں کی ہے۔[165]

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۔ (مریم ۔ ۲۹)	مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے"

قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ "ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے" یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسیٰؑ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گہوارے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر جو شخص موقع و محل اور سیاق و سباق پر کچھ بھی غور کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ یہ محض ایک مہمل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے ۔ اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے وہ لوگ آئے تھے وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت ۔ علاوہ بریں سورۃ آل عمران کی آیت ۴۶ اور سورۃ مائدہ کی آیت ۱۱۰ دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گہوارے میں ایک نوزائیدہ بچے کی حیثیت ہی سے کیا تھا۔ پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود حضرت عیسیٰؑ سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرتا تھا اور جوانی میں بھی ۔ ۱۶۲؎

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۔ (مریم ۔ ۳۰ ۔ ۳۱ ۔ ۳۲)	بچہ بول اٹھا " میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں، اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا"

یہ نہیں فرمایا کہ والدین کا حق ادا کرنے والا ۔ صرف والدہ کا حق ادا کرنے والا فرمایا ہے ۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا باپ کوئی نہ تھا اور اسی کی ایک صریح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ آپ کو عیسیٰؑ بن مریمؑ کہا گیا ہے ۔ ۱۶۳؎

وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۔ (مریم ۔ ۳۳)	"سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں"

یہ ہے وہ نشانی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی ۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی

مسلسل بدکرداریوں پر عبرتناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو جو بیت المقدس میں معتکف اور حضرت زکریا کے زیرِ تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجہات یک لخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریمؑ پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود ہوں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔ ؎۲۹

قرآن کے ذکر کردہ دوسرے معجزات

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝

(آل عمران۔ ۴۹)

"اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو (اس نے کہا) "میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔"

حضورؐ اور معجزات

قرآن ہی کو دلیلِ نبوت بنایا گیا

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِم بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

"اے نبیؐ، جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لیے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ ان سے کہو، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے

رب نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں (الاعراف۔ آیت ۲۰۳)۔
ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان کے لیے جو اسے قبول کریں۔

کفار کے اس سوال میں ایک صریح طعن کا انداز پایا جاتا تھا یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میاں جس طرح تم نبی بن بیٹھے ہو اسی طرح کوئی معجزہ بھی چھانٹ کر اپنے لیے بنا لاتے ہوتے لیکن آگے ملاحظہ ہو کہ اس طعن کا جواب کس شان سے دیا جاتا ہے۔

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو یا جس کی میں خود ضرورت محسوس کروں اسے خود ایجاد یا تصنیف کر کے پیش کر دوں۔ میں تو ایک رسول ہوں، اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں۔ معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے وہ یہ قرآن ہے۔ اس کے اندر بصیرت افروز روشنیاں موجود ہیں، اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مان لیتے ہیں، ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے، اور ان کے اخلاقِ حسنہ میں رحمتِ الٰہی کے آثار صاف ہویدا ہونے لگتے ہیں۔ ۱۴۹

بطورِ خود معجزات دکھانے پر حضورؐ قادر نہیں تھے

وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ
اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ
أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ؕ
(الانعام - ۳۵)

"تاہم اگر (اے نبیؐ) ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت
نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی
سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے
پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدتیں گزر گئی ہیں اور کسی طرح یہ راستی پر نہیں آتی تو بسا اوقات آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جس سے ان لوگوں کا کفر ٹوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کریں۔ آپؐ کی اسی خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ بے صبری سے کام نہ لو۔ جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدریج سے ہم اس کام کو چلوا رہے ہیں اسی پر صبر کے ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا ہم خود نہ لے سکتے تھے؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ جس فکری و اخلاقی انقلاب اور جس مدنیتِ صالحہ کی تعمیر کے کام پر تم مامور کیے گئے ہو اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے۔ تاہم اگر لوگوں کے موجودہ جمود اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا اور تمہیں گمان ہے کہ اس جمود کو توڑنے کے لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرانا ہی ضروری ہے، تو خود زور لگاؤ اور تمہارا کچھ بس چلتا ہو تو زمین میں گھس کر یا آسمان پر چڑھ کر کوئی ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو کہ یہ بے یقینی کو یقین میں تبدیل کر دینے کے لیے کافی ہوگا مگر ہم سے امید نہ رکھو کہ ہم تمہاری یہ خواہش پوری کریں گے کیونکہ ہماری اسکیم میں اس تدبیر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ۱۵۰

حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن

وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ (طٰہٰ - ۱۳۳)

"وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتا - اور کیا ان کے پاس اگلے صحیفوں کی تمام تعلیمات کا بیان واضح نہیں آگیا"

یعنی کیا یہ کوئی کم معجزہ ہے کہ انہی میں سے ایک اُمّی شخص نے وہ کتاب پیش کی ہے جس میں شروع سے اب تک کی تمام کتبِ آسمانی کے مضامین اور تعلیمات کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ان کتابوں میں جو کچھ تھا وہ سب نہ صرف یہ کہ اس میں جمع کر دیا گیا ہے، بلکہ اس کو کھول کر ایسا واضح کر دیا گیا ہے کہ صحرا نشین بدّو تک اس کو سمجھ کر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ الخ

وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ ۖ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ۝ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ۝ وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (العنکبوت ۴۸ تا ۵۱)

"(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے، اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئیں اُس شخص پر نشانیاں (یعنی معجزات) اس کے رب کی طرف سے؟ کہو، نشانیاں تو اُس کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ہے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"

ان آیات میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اَن پڑھ تھے۔ آپؐ کے اہلِ وطن اور رشتہ دار اور برادری کے لوگ، جن کے درمیان روزِ پیدائش سے سنِ کہولت کو پہنچنے تک آپؐ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپؐ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔ اس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیاءِ سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدّن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے

علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اُس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے کبھی اسے کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل کیا گیا ہے لیکن اس کی اُمیّت نے تو کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص ہٹ دھرمی کے سوا اس کی نبوّت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجہ میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔[۱۶۲]

اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا کیا بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمہاری رسالت پر یقین لانے کے لیے یہ کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنہوں نے دیکھے اُن کے لیے وہ معجزے تھے، مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمہارے سامنے ہے۔ تمہیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے، تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔[۱۶۳]

حضورؐ کو حسّی معجزہ کے بجائے عقلی معجزہ دینے کی وجہ

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ (الرّعد-۳۱)

"اور کیا ہو جاتا اگر کوئی ایسا قرآن اُتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شق ہو جاتی یا مُردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟"

اِس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ اس میں خطاب کفّار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ مسلمان جب کفّار کی طرف سے بار بار نشانی کا مطالبہ سنتے تھے تو ان کے دلوں میں بےچینی پیدا ہوتی تھی کہ کاش ان لوگوں کو ایسی نشانی دکھا دی جاتی جس سے یہ لوگ قائل ہو جاتے۔ پھر جب وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کی کسی نشانی کے نہ آنے کی وجہ سے کفّار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شبہات پھیلانے کا موقع مل رہا ہے تو ان کی یہ بےچینی اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ اس پر مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر قرآن کی کسی سورۃ کے ساتھ ایسی اور ایسی نشانیاں یکایک دکھا دی جاتیں تو کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آتے؟ کیا تمہیں ان سے یہ خوش گمانی ہے کہ یہ قبولِ حق کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں، صرف ایک نشانی کے ظہور کی کسر ہے؟ جن لوگوں کو قرآن کی تعلیم میں، کائنات کے آثار میں، نبی کی پاکیزہ زندگی میں، صحابۂ کرام کے انقلابِ حیات میں نورِ حق نظر نہ آیا، کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ پہاڑوں کے چلنے اور زمین کے پھٹنے اور مُردوں کے قبروں سے نکل آنے میں کوئی روشنی پا لیں گے؟[۱]

---

[۱] اس بحث سے مراد یہ نہیں ہے کہ حضورؐ سے معجزات صادر نہیں ہوتے۔ حضورؐ سے بہت سے معجزات وقتاً فوقتاً صادر ہوئے، مگر وہ بطور دلیلِ نبوّت مخالفین کو ایمان سے مالا مال کرنے کا ذریعہ نہیں بنے، ان سے صرف اہلِ ایمان کا ایمان نشوونما پاتا رہا۔ (مرتّبین)

إِنْ نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۔	"ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں"۔

(الشعراء۔ آیت ۴)

یعنی کوئی ایسی نشانی نازل کر دینا جو تمام کفار کو ایمان و اطاعت کی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دے، اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ کام اس کی قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا جبری ایمان اس کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل و خرد سے کام لے کر ان آیات کی مدد سے حق کو پہچانیں جو کتاب الٰہی میں پیش کی گئی ہیں۔ جو تمام آفاق میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ جو خود ان کی اپنی ہستی میں پائی جاتی ہیں پھر جب ان کا دل گواہی دے کہ واقعی حق وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے اور اس کے خلاف جو جو عقیدے اور طریقے رائج ہیں وہ باطل ہیں، تو جان بوجھ کر باطل کو چھوڑیں اور حق کو اختیار کریں یہی اختیاری ایمان، اور ترک باطل اور اتباع حق وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی دی ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے کہ صحیح اور غلط جس راہ پر بھی وہ جانا چاہے جا سکے۔ اسی وجہ سے اس نے انسان کے اندر خیر و شر کے دونوں رجحانات رکھ دیئے ہیں۔ فجور اور تقویٰ کی دونوں راہیں اس کے آگے کھول دی ہیں شیطان کو بہکانے کی آزادی عطا کی ہے۔ نبوت اور وحی اور دعوت خیر کا سلسلہ راہ راست دکھانے کے لیے قائم کیا ہے۔ اور انسان کو انتخاب راہ کے لیے ساری مناسب حال صلاحیتیں دے کر اس امتحان کے مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ کفر و فسق کا راستہ اختیار کرتا ہے یا ایمان و اطاعت کا۔ اس امتحان کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسی تدبیر اختیار فرماتے جو انسان کو ایمان و اطاعت پر مجبور کر دینے والی ہو۔ جبری ایمان ہی مطلوب ہوتا تو نشانیاں نازل کر کے مجبور کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی فطرت اور ساخت پر پیدا فرما سکتا تھا جس میں کفر، نافرمانی، اور بدی کا کوئی امکان ہی نہ ہوتا، بلکہ فرشتوں کی طرح انسان بھی پیدائشی فرمانبردار ہوتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف متعدد مواقع پر قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس۔ آیت ۹۹) "اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والے سب کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ اب کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرو گے" اور وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (ہود۔ آیت ۱۱۹) "اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی امت بنا سکتا تھا۔ اور وہ تو مختلف راہوں پر ہی چلتے رہیں گے۔ (اور بے راہ رویوں سے) صرف وہی بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی لیے تو اس نے ان کو پیدا کیا تھا"۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۔

(سورۃ الشعراء آیات ۷-۸)

"اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں"

یعنی جستجوئے حق کے لیے کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں، آنکھیں کھول کر ذرا اِسی زمین ہی کی روئیدگی دیکھ لے۔ اُسے معلوم ہو جائے گا کہ نظامِ کائنات کی جو حقیقت (توحید الٰہ) انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ صحیح ہے یا وہ نظریات صحیح ہیں جو مشرکین یا منکرینِ خدا بیان کرتے ہیں۔ زمین سے اُگنے والی انواع و اقسام کی چیزیں جس کثرت سے اُگ رہی ہیں، پھر اُن کے خواص و صفات میں اور بے شمار مخلوقات کی اَن گنت ضرورتوں میں جو صریح مناسبت پائی جاتی ہے، اِن ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک احمق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کی حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت، کسی خالق کے منصوبۂ تخلیق کے بغیر یونہی آپ سے آپ ہو رہا ہے، یا اِس سارے منصوبے کو بنانے اور چلانے والا کوئی ایک خدا نہیں ہے بلکہ بہت سے خداؤں کی تدبیر نے زمین اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی اور ان وسائل سے پیدا ہونے والی نباتات اور بے حد و حساب مختلف النوع جانداروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل انسان تو اگر کسی ہٹ دھرمی اور پیشگی تعصب میں مبتلا نہیں ہے، اِس منظر کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ یقیناً یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی کھلی علامات ہیں۔ ان نشانیوں کے ہوتے اور کس معجزے کی ضرورت ہے جسے دیکھے بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین نہ آ سکتا ہو؟[1]

فصل ۳

ایک عظیم حسّی معجزہ

[کتاب کا یہ حصّہ ہمارے نقشے کے مطابق معجزات کی اصُولی بحث سے متعلق ہے۔ اس میں واقعاتی حیثیت سے حضورؐ کے مختلف معجزات شامل نہیں کیے گئے، بلکہ وہ کتاب کے واقعاتی مباحث میں اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں۔ یہاں صرف شق القمر کے بہت بڑے معجزے کو بطورِ مثال سلسلۂ بحث میں شامل کیا گیا ہے۔

انبیائے ماسبق کے معجزات اس بحث میں بعض اُمُور کے ثبوت کے لیے بیان ہوئے ہیں یا ان کو پیش کر کے ان سے اصُولی نتائج نکالے گئے ہیں — مرتبین]

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝ (القمر - آیات ۱ تا ۳)

"قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، مُنہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا ہُوا جادو ہے۔ انہوں نے جھٹلا دیا اور اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کی۔"

شق القمر سے متعلق روایات

حقیقت یہ ہے کہ شقّ القمر کا واقعہ قرآن کے صریح الفاظ سے ثابت ہے اور حدیث کی روایات پر اس کا انحصار نہیں ہے۔ البتہ روایات سے اس کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ یہ کب اور کیسے پیش آیا تھا۔ یہ روایات بخاری، مُسلم، ترمذی، احمد، ابوعوانہ، ابوداؤد طیالسی، عبدالرزاق، ابن جریر، بیہقی، طبرانی، ابن مردویہ اور ابونُعیم اصفہانی نے بکثرت سندوں کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حُذیفہؓ، حضرت انس بن مالکؓ، اور حضرت جُبیر بن مُطعمؓ سے نقل کی ہیں۔ ان میں سے تین بزرگ، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حُذیفہؓ اور حضرت جُبیرؓ بن مُطعم تصریح کرتے ہیں کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔ اور دو بزرگ ایسے ہیں جو اس کے

عینی شاہد نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ ان میں سے ایک (یعنی عبداللہ بن عباسؓ) کی پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے، اور دوسرے (یعنی انس بن مالکؓ) اُس وقت بچے تھے لیکن چونکہ یہ دونوں حضرات صحابی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ انہوں نے ایسے سن رسیدہ صحابیوں سے سُن کر ہی اسے روایت کیا ہوگا جو اس واقعہ کا براہِ راست علم رکھتے تھے۔

روایات کا ماحصل

تمام روایات کو جمع کرنے سے اس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً ۵ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ پھٹا اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جُڑ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا دیکھو اور گواہ رہو۔ کفار نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم پر جادو کر دیا تھا اس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکا کھایا۔ دوسرے لوگ بولے کہ محمدؐ ہم پر جادو کر سکتے تھے، تمام لوگوں پر تو نہیں کر سکتے تھے۔ باہر کے لوگوں کو آنے دو۔ ان سے پُوچھیں گے کہ یہ واقعہ انہوں نے بھی دیکھا ہے یا نہیں۔ باہر سے جب کچھ لوگ آئے تو انہوں نے شہادت دی کہ وہ بھی یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔

بعض روایات جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں ان کی بنا پر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شق القمر کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ پیش آیا تھا لیکن اوّل تو صحابہؓ میں سے کسی اور نے یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ دوسرے خود حضرت انسؓ کی بھی بعض روایات میں مرتین (دو مرتبہ) کے الفاظ ہیں اور بعض میں فرقتین اور شقتین (دو ٹکڑے) کے الفاظ۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید صرف ایک ہی انشقاق کا ذکر کرتا ہے۔ اس بنا پر صحیح بات یہی ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا تھا۔ رہے وہ قصے جو عوام میں مشہور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی سے چاند کی طرف اشارہ کیا اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا، اور یہ کہ چاند کا ایک ٹکڑا حضورؐ کے گریبان میں داخل ہو کر آپؐ کی آستین سے نکل گیا، تو یہ بالکل ہی بے اصل ہیں۔

واقعہ کی حقیقی نوعیت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی حقیقی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا جو کفارِ مکہ کے مطالبہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا؟ یا یہ ایک حادثہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اُس کی طرف توجہ صرف اس غرض کے لیے دلائی کہ یہ امکانِ قیامت اور قربِ قیامت کی ایک نشانی ہے؟ علمائے اسلام کا ایک گروہ اسے حضورؐ کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ کفار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا لیکن اس رائے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ اُن کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ فتح الباری

ہیں ابنِ حجر کہتے ہیں کہ یہ قصہ جتنے طریقوں سے منقول ہوا ہے ان میں سے کسی میں بھی حضرت انسؓ کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شق القمر کا واقعہ مشرکین کے مطالبہ پر ہوا تھا" (باب انشقاق القمر)۔ ایک روایت ابونعیم اصفہانی نے دلائل النبوۃ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اس مضمون کی نقل کی ہے، مگر اس کی سند ضعیف ہے، اور قوی سندوں سے جتنی روایات کتبِ حدیث میں ابن عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں ان میں سے کسی میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ، دونوں اس واقعہ کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بخلاف اس کے جو جو صحابہ اُس زمانے میں موجود تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت جُبیر بن مُطعِمؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مشرکین نے حضورؐ کی صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا اور اس پر شق القمر کا معجزہ ان کو دکھایا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن مجید خود بھی اس واقعہ کو رسالتِ محمدی کی نہیں بلکہ قُربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ البتہ یہ اس لحاظ سے حضورؐ کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپؐ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں، یہ واقعہ اُن کی تصدیق کر رہا تھا۔

اعتراضات اور جوابات

معترضین اس پر دو طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اوّل تو ان کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کہ چاند جیسے عظیم کُرّے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں اور سینکڑوں میل کے فاصلے تک ایک دوسرے سے دور جانے کے بعد پھر باہم جُڑ جائیں۔ دوسرے، وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ واقعہ دنیا بھر میں مشہور ہو جاتا، تاریخوں میں اس کا ذکر آتا۔ اور علم نجوم کی کتابوں میں اسے بیان کیا جاتا۔ لیکن درحقیقت یہ دونوں اعتراض بے بنیاد ہیں۔ جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے، قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی، لیکن موجودہ زمانے میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کُرّہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دور تک چلے جائیں، اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی طاقت کے سبب وہ ایک دوسرے سے آملیں۔ رہا دوسرا اعتراض تو وہ اس لیے بے وزن ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لحظہ کے لیے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس خاص لحظے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ اس سے کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اس کی نہ تھی کہ لوگ اس کے منتظر ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوتے۔ پُوری رُوئے زمین پر اُسے دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ صرف عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اُس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اُس وقت تک اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مشرقی

ممالک میں جن لوگوں نے اسے دیکھا ہوتا وہ اسے ثبت کر لیتے اور کسی مورخ کے پاس یہ شہادتیں جمع ہوتیں اور وہ تاریخ کی کسی کتاب میں ان کو درج کر لیتا۔ تاہم مالابار کی تاریخوں میں اس کا ذکر آیا ہے کہ اس رات وہاں ایک راجہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ رہیں علم نجوم کی کتابیں اور جنتریاں تو ان میں اس کا ذکر آنا صرف اس حالت میں ضروری تھا جب کہ چاند کی رفتار اور اس کی گردش کے راستے، اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اس سے کوئی فرق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی اس لیے قدیم زمانے کے اہل تنجیم کی توجہ اس کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں رصد گاہیں اس حد تک ترقی یافتہ نہ تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتیں اور اس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔ ختم

باقی نہیں چھوڑی۔ مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۵ (آیت الکرسی) ملاحظہ ہو:

(۱) لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ إِلَّا بِإِذْنِهٖ۔	"آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے۔ کون ہے جو اللہ کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے
(۲) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ إِلَّا بِمَا شَآءَ۔	جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اُس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔"

خدا کے ہاں کسی کا زور نہیں چلتا

پہلے حصہ میں ان مشرکین کے خیالات کا ابطال کیا گیا ہے جو بزرگ انسانوں یا فرشتوں یا دوسری ہستیوں کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بڑا زور چلتا ہے، جس بات پر وہ اَڑ بیٹھیں وہ منوا کر چھوڑتے ہیں، اور جو کام چاہیں خدا سے لے سکتے ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ زور چلانا تو درکنار کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر اور کوئی مقرب ترین فرشتہ اُس بادشاہِ ارض و سما کے دربار میں بلا اجازت زبان تک کھولنے کی جرأت نہیں رکھتا۔[۱۲۸]

دوسرے حصہ میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس سے شرک کی بنیادوں پر ایک اور ضرب لگتی ہے۔ پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود حاکمیت اور اس کے مطلق اختیارات کا تصور پیش کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی حکومت میں نہ تو کوئی بالاستقلال شریک ہے اور نہ کسی کا اس کے ہاں ایسا زور چلتا ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ اب ایک دوسری حیثیت سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی دوسرا اُس کے کام میں دخل دے کیسے سکتا ہے جبکہ کسی دوسرے کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظامِ کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں، یا جن، یا فرشتے یا دوسری مخلوقات، سب کا علم ناقص اور محدود ہے، کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں ہے پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظمِ عالم درہم برہم ہو جائے۔ نظامِ عالم تو رہا درکنار، بندے تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوندِ عالم ہی پوری طرح جانتا ہے، اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اُس خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں جو علم کا اصلی سرچشمہ ہے۔[۱۲۹]

مستحق عذاب لوگوں کے لیے کوئی سفارشی نہیں

سورۃ الانعام میں ارشاد ہے:

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ	اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے اُن سفارشیوں کو بھی

زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (الانعام: آیت ۹۴)

نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے۔"

دوسرے مقام پر اسی سورہ میں یوں ارشاد ہے:۔

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۔ (الانعام: آیت ۵۱)

"(اے محمدؐ) تم اس علم وحی کے ذریعہ سے ان لوگوں کو نصیحت کرو جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اُس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہوگا جو اُن کا حامی و مددگار ہو یا ان کی سفارش کرے، شاید کہ (اس نصیحت سے متنبّہ ہو کر) وہ خدا ترسی کی روش اختیار کر لیں۔"

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دُنیا کی زندگی میں ایسے مدہوش ہیں کہ انہیں نہ موت کی فکر ہے نہ یہ خیال ہے کہ کبھی ہمیں اپنے خدا کے سامنے بھی جانا ہے، ان پر تو نصیحت ہرگز کارگر نہ ہوگی۔ اسی طرح اُن لوگوں پر بھی اس کا کچھ اثر نہ ہوگا جو اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ دُنیا میں ہم جو چاہیں کر گذریں، آخرت میں ہمارا بال تک بیکا نہ ہوگا کیونکہ ہم فلاں کے دامن گرفتہ ہیں یا فلاں ہماری سفارش کر دے گا، یا فلاں ہمارے لیے کفارہ بن چکا ہے۔ شملہ

سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:

فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۔ (آیت ۵۳)

"آخرت میں یہ لوگ کہیں گے) پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں۔"

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۔ (آیت ۳)

"کوئی شفاعت (سفارش) کرنے والا نہیں ہے اِلّا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے یہی اللہ تمہارا رب ہے، لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟"

مزید اسی سورہ کی آیت ۱۸ میں ارشاد ہے:

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ (آیت ۱۸)	"یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ آپ ان سے کہو کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں۔ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ سب کچھ جو موجود ہے اللہ کے علم میں ہے۔ پس سفارشیوں کے معدوم ہونے کے لیے یہ ایک نہایت لطیف انداز بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا نہیں کہ زمین یا آسمان میں کوئی اس کے حضور تمہاری سفارش کرنے والا ہے، پھر یہ تم کن سفارشیوں کی اس کو خبر دے رہے ہو۔ [۱۸۱]

سورۃ المومن میں ارشاد ہے:

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ۔ (آیت ۱۸)	"ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔"

یہ بات بر سبیل تنزل کفار کے عقیدۂ شفاعت کی تردید کرتے ہوئے فرمائی گئی ہے حقیقت میں تو وہاں ظالموں کا کوئی شفیع سرے سے ہوگا ہی نہیں، کیونکہ شفاعت کی اجازت اگر مل بھی سکتی ہے تو اللہ کے نیک بندوں کو مل سکتی ہے اور اللہ کے نیک بندے کبھی کافروں اور مشرکوں اور فساق و فجار کے دوست نہیں ہو سکتے کہ وہ انہیں بچانے کے لیے سفارش کا خیال بھی کریں۔ لیکن چونکہ کفار و مشرکین اور گمراہ لوگوں کا بالعموم یہ عقیدہ رہا ہے اور آج بھی ہے کہ ہم جن بزرگوں کے دامن گرفتہ ہیں وہ کبھی ہمیں دوزخ میں نہ جانے دیں گے، بلکہ اڑ کر کھڑے ہو جائیں گے اور بخشوا کر ہی چھوڑیں گے، اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ایسا شفیع کوئی بھی نہ ہوگا جس کی بات مانی جائے اور جس کی سفارش اللہ کو لازماً قبول ہی کرنی پڑے۔ [۱۸۲]

سفارش کے لیے پروانۂ اذن ضروری ہے

سورۂ مریم میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۔	"اس وقت لوگ کوئی سفارش لانے پر قادر نہ ہوں گے بجز اس کے جس نے رحمان کے حضور سے پروانہ

حاصل کر لیا ہو"	(آیت ۸۷)

ایک مطلب تو اس کا یہ ہے کہ سفارش اسی کے حق میں ہوگی جس نے پروانہ حاصل کیا ہو، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہی سفارش کر سکے گا جسے پروانہ ملا ہو۔ آیت کے الفاظ ایسے ہیں جو دونوں پہلوؤں پر یکساں روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ بات کہ سفارش صرف اسی کے حق میں ہو سکے گی جس نے رحمٰن سے پروانہ حاصل کر لیا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے دنیا میں ایمان لا کر اور تیرا اسے کچھ تعلق جوڑ کر اپنے آپ کو خدا کے عفو و درگزر کا مستحق بنا لیا ہو اسی کے حق میں سفارش کا امکان ہے۔ اور یہ بات کہ سفارش وہی کر سکے گا جس کو پروانہ ملا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے جن جن کو اپنا شفیع اور سفارشی سمجھ لیا ہے وہ سفارشیں کرنے کے مجاز نہ ہوں گے، بلکہ خدا خود جس کو اجازت دے گا وہی شفاعت کے لیے زبان کھول سکے گا۔[۱]

سورۃ طٰہٰ میں ہے :

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا. يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا. (آیات ۱۰۹-۱۱۰)	"اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی، الّا یہ کہ کسی کو رحمان اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے۔ وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے۔ دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے۔"

---

[۱] اس فقرے کا منشا یہ ہے کہ شفاعت خدا کے قانون جزا و سزا اور ضابطۂ مغفرت کے تحت آتی ہے اور شفاعت سے بہرہ ور ہونے کے لیے ضروری ہے کہ بندہ خدا کے سامنے عفو و درگزر کا مستحق بن کے پیش ہو۔ مثلاً خدا کے قانون مغفرت کا ایک کلیہ اصول توبہ میں بیان ہوا ہے کہ توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو اطمینان سے ساری عمر گناہ و گنت کے چکر میں پڑے پڑے گزار دیں بلکہ توبہ صرف ایسے لوگوں کے لیے ہے جو گناہ سرزد ہو جانے پر پشیمان ہوں — بلکہ فوری طور پر زمن قریب پشیمان ہوں — توبہ کریں، اور ترک گناہ کر کے اپنی اصلاح کے لیے کوشاں ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ شفاعت کا استحقاق انہی بندوں کو حاصل ہو سکتا ہے جو کلیۂ توبہ کا صحیح تقاضا پورا کرتے ہوں۔ اسی طرح دوسرے موقع پر استحقاق مغفرت پانے والوں کے لیے یہ تعریف بتائی گئی ہے کہ وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلی کھلی برائیوں سے پرہیز کرتے ہیں، اور اگر ان سے غلطیاں سرزد ہوتی بھی ہیں تو نادانستگی میں چھوٹی چھوٹی لغزشوں کی حد تک۔ اس سے ایک آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ مغفرت اور شفاعت کا مستحق بن سکے گا یا نہیں۔ علاوہ بریں احادیث میں حضورؐ نے متعدد اعمال کے متعلق خود واضح فرما دیا ہے کہ میں ان کے لیے سفارش نہیں کروں گا۔ (مرتبین)

پہلی آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اوپر کیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ "اُس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی اِلّا یہ کہ کسی کے حق میں رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کے لیے بات سننے پر راضی ہو"۔ الفاظ ایسے جامع ہیں جو دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے روز کسی کو دم مارنے تک کی جرأت نہ ہوگی کجا کہ کوئی سفارش کے لیے بطور خود زبان کھول سکے۔ سفارش وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ بولنے کی اجازت دے اور اسی کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے بارگاہِ الٰہی سے سفارش کرنے کی اجازت مل جائے۔ یہ دونوں باتیں قرآن میں متعدد مقامات پر کھول کر بتا دی گئی ہیں۔ ایک طرف فرمایا مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ "کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کر سکے؟" (البقرہ۔ آیت ۲۵۵)۔ اور یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (النبا۔ آیت ۳۸) "وہ دن جبکہ رُوح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہوں گے، ذرا بات نہ کریں گے، صرف وہی بول سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے۔"

دوسری طرف ارشاد ہوا وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ "وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اُس شخص کے جس کے حق میں سفارش سُننے پر (رحمٰن) راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں۔" (الانبیاء۔ آیت ۲۸)۔ اور وَکَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُھُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰہُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی "کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی بجز اس صورت کے کہ اللہ سے اجازت لینے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سُننا چاہے اور پسند کرے۔" (النجم۔ آیت ۲۶)

شفاعت پر پابندی کی وجہ

[1] کی آیت میں یہ وجہ بتائی گئی ہے کہ شفاعت پر یہ پابندی کیوں ہے۔ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء، کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا کہ کس کا ریکارڈ کیسا ہے، کون دُنیا میں کیا کرتا رہا ہے، اور اللہ کی عدالت میں کس سیرت و کردار اور کیسی کیسی ذمہ داریوں کے بارے کر آیا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کو ہر ایک کے پچھلے کارناموں اور کرتوتوں کا بھی علم ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اب اُس کا موقف کیا ہے، نیک ہے تو کیسا نیک ہے اور مجرم ہے تو کس درجے کا مجرم ہے، معافی کے قابل ہے یا نہیں، پُوری سزا کا مستحق ہے یا تخفیف اور رعایت بھی اس کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ملائکہ اور انبیاء اور صلحاء کو سفارش کی کُھلی چھٹی دے دی جائے اور ہر ایک جس کے

---

[1] دوسرے لفظوں میں شفاعت بھی دراصل ایک طرح کی شہادت ہے کہ کوئی شخص جس کا نامۂ اعمال پیش ہو رہا ہے فی الحقیقت کس قسم کا آدمی تھا اور کیسے قابلِ عذاب یا قابلِ مغفرت۔ (مرتبین)

حق میں جو سفارش چاہیں کر دیں۔ ایک معمولی افسر اپنے ذرا سے محکمے میں اگر اپنے ہر دوست یا عزیز کی سفارشیں سننے لگے تو چار دن میں سارے محکمے کا ستیاناس کر کے رکھ دے گا۔ پھر بھلا زمین و آسمان کے فرمانروا سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے ہاں سفارشوں کا بازار گرم ہوگا اور ہر بزرگ جا جا کر جس کو چاہیں گے بخشوا لیں گے، درآں حالیکہ ان میں سے کسی بزرگ کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ جن لوگوں کی سفارش وہ کر رہے ہیں ان کے نامۂ اعمال کیسے ہیں۔ دنیا میں جو افسر کچھ بھی احساسِ ذمہ داری رکھتا ہے اس کی روش یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کا کوئی دوست اس کے کسی قصوروار ماتحت کی سفارش لے کر جاتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ آپ کو خبر نہیں ہے کہ یہ شخص کتنا کام چور، نافرض شناس، رشوت خوار اور خلقِ خدا کو تنگ کرنے والا ہے، میں اس کے کرتوتوں سے واقف ہوں، اس لیے آپ براہِ کرم مجھ سے اس کی سفارش نہ فرمائیں۔ اسی چھوٹی سی مثال پر قیاس کر کے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں شفاعت کے متعلق جو قاعدہ بیان کیا گیا ہے وہ کس قدر صحیح، معقول اور مبنی بر انصاف ہے۔ خدا کے ہاں شفاعت کا دروازہ بند نہ ہوگا۔ نیک بندے جو دنیا میں خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرنے کے عادی تھے، انہیں آخرت میں بھی ہمدردی کا حق ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن وہ سفارش کرنے سے پہلے اجازت طلب کریں گے، اور جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انہیں بولنے کی اجازت دے گا صرف اُسی کے حق میں وہ سفارش کر سکیں گے۔ پھر سفارش کے لیے بھی شرط یہ ہوگی کہ وہ مناسب اور مبنی برحق ہو جیسا کہ وَقَالَ صَوَابًا (اور بات ٹھیک کہے) کا ارشادِ ربانی صاف بتا رہا ہے۔ بودی سفارشیں کرنے کی وہاں اجازت نہ ہوگی کہ ایک شخص دنیا میں سینکڑوں ہزاروں بندگانِ خدا کے حقوق مار آیا ہو اور کوئی بزرگ اٹھ کر سفارش کر دیں کہ حضور اسے انعام سے سرفراز فرمائیں۔[۱][۲]

سورۃ النبأ میں ارشاد ہے:

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا	”جس روز رُوح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے،
لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ	کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت

۱؎ حضورؐ نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدل لیں گے، اُن کو اُس حوض سے ہٹا دیا جائے گا اور اس پر انہیں نہ آنے دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں، تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا۔ پھر میں بھی ان کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دُور ہو۔ یہ مضمون بھی بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے (مؤلف) حوالہ: بخاری، کتاب الرقاق، کتاب الفتن۔ مسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الفضائل۔ مسند احمد، مرویات ابن مسعودؓ و ابوہریرہؓ۔ ابن ماجہ، کتاب المناسک۔

۲؎ بلکہ اُلٹا انبیاء اپنے مجرم و نخوت پیروکاروں کے خلاف سزادہی کی سفارش کریں گے جیسا کہ قرآن میں ایک گروہ کے متعلق حضورؐ کا یہ بیان سامنے لایا گیا ہے کہ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (فرقان)

وَقَالَ صَوَابًا (آیت ۳۸) دے اور جو ٹھیک بات کہے۔"

بولنے سے مراد شفاعت ہے اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہو گی۔ ایک شرط یہ کہ جس شخص کو جس گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی صرف وہی شخص اسی کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ دوسری شرط یہ کہ شفاعت کرنے والا بجا اور درست بات کہے بے جا نوعیت کی سفارش نہ کرے۔ اور جس کے معاملہ میں وہ سفارش کر رہا ہو وہ دنیا میں کم از کم کلمۂ حق کا قائل رہا ہو یعنی محض گناہگار ہو، کافر نہ ہو۔[۱۹۶]

مشرکین کے مزعومہ سفارشی

سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ۔ (آیت ۲۸)

"جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں۔"

مشرکین فرشتوں کو دو وجوہ سے معبود بناتے تھے۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک وہ خدا کی اولاد تھے، دوسرے یہ کہ وہ ان کی پرستش (خوشامد) کر کے انہیں خدا کے ہاں اپنا شفیع (سفارشی) بنانا چاہتے تھے۔ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ (یونس آیت ۱۸) اور مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (الزمر آیت ۳)۔ ان آیات میں دونوں وجوہ کی تردید کر دی گئی ہے۔

اس جگہ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن بالعموم شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی تردید کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ جنہیں تم شفیع قرار دیتے ہو وہ علمِ غیب نہیں رکھتے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو ان کے سامنے ہیں اور ان باتوں کو بھی جو ان سے اوجھل ہیں۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ آخر ان کو سفارش کرنے کا مطلق اور غیر مشروط اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ ہر شخص کے اگلے پچھلے اور پوشیدہ و ظاہر حالات سے واقف نہیں ہیں۔ اس لیے خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء و صالحین ہر ایک کا اختیارِ شفاعت لازماً اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی کے حق میں شفاعت کی اجازت دے۔ بطورِ خود ہر کس و ناکس کی شفاعت کر دینے کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے۔ اور جب شفاعت سننا یا نہ سننا اور اُسے قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اللہ کی مرضی پر موقوف ہے تو ایسے بے اختیار شفیع اس قابل کب ہو سکتے ہیں کہ ان کے آگے سرِ نیاز جھکایا جائے اور دستِ سوال دراز کیا جائے۔[۱۹۷]

سورۃ سبا میں ارشاد ہے:

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ (سبا۔ ۲۳)	"اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجز اُس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو۔"

یعنی کسی کا خود مالک ہونا یا ملکیت میں شریک ہونا یا مددگار خدا ہونا تو درکنار ساری کائنات میں کوئی ایسی ہستی تک نہیں پائی جاتی جو اللہ تعالیٰ کے حضور کسی کے حق میں بطور خود سفارش کر سکے۔ تم لوگ اِس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ خدا کے کچھ پیارے ایسے ہیں، یا خدائی میں کچھ بندے ایسے زور آور ہیں کہ وہ اگر اڑ بیٹھیں تو خدا کو ان کی سفارش ماننی ہی پڑے گی۔ حالانکہ وہاں حال یہ ہے کہ اجازت لیے بغیر کوئی زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جس کو اجازت ملے گی صرف وہی کچھ عرض کر سکے گا اور جس کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت ملے گی اسی کے حق میں عرض معروض کی جا سکے گی۔

پھر آگے چل کر اسی آیت میں ارشاد ہوتا ہے[1]:

حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (سبا۔ آیت ۲۳)	"حتّٰی کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی تو وہ (سفارش کرنے والوں سے) پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا جواب دیا۔ وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے۔ اور وہ بزرگ و برتر ہے۔"

یہاں اُس وقت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جب قیامت کے روز کوئی سفارش کرنے والا کسی کے حق میں سفارش کی اجازت طلب کرے گا۔ اس نقشے میں یہ کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے کہ طلبِ اجازت کی درخواست بھیجنے کے بعد شافع اور مشفوع دونوں نہایت بے چینی کے عالم میں ڈرتے اور کانپتے ہوئے جواب کے منتظر کھڑے ہیں۔ آخر کار جب اُوپر سے اجازت آ جاتی ہے اور شافع کے چہرے سے مشفوع بھانپ جاتا ہے کہ معاملہ کچھ اطمینان بخش ہے تو اس کی جان میں جان آتی ہے اور وہ آگے بڑھ کر شافع سے پوچھتا ہے "کیا جواب آیا؟" شافع جواب دیتا ہے کہ ٹھیک ہے اجازت مل گئی ہے[1]۔

اس بیان سے جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ نادانو! جس بڑے دربار کی شان یہ ہے اُس کے متعلق تم کس خیالِ خام میں پڑے ہوئے ہو کہ وہاں کوئی اپنے زور سے تم کو بخشوا لے گا یا کسی کی یہ مجال ہو گی کہ وہاں

---

[1] قیامت میں انبیاء کے عاجزانہ اندازِ شفاعت کا نقشہ سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں کھینچا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ حضرت مسیح اپنے پیروؤں کی کس انداز سے سفارش کریں گے جبکہ وہ سوالات کے جواب میں شہادت دیں گے اور پھر کہیں گے کہ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اس بلیغ جملے کے پچھلے حصے میں بھی سفارش کا پہلو جھلکتا ہے، مگر انداز عجز و رسا ہے اور تقاضے کا نہیں درخواست کا ہے۔

مچل کر بیٹھ جاتے اور اللہ سے کہتے کہ یہ تو میرے متوسّل ہیں انہیں تو بخشنا ہی پڑے گا۔ ۱۸۹ـہ

سُورۂ الدّخان میں ارشادِ باری ہے:

يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا	وُہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے
وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ	کچھ بھی کام نہ آسکے گا، اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد
اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ	پہنچے گی سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے،
(الدّخان - ۴۱ تا ۴۲)	وہ زبردست اور رحیم ہے۔

ان فقروں میں بتایا گیا ہے کہ فیصلے کے دن جو عدالت قائم ہوگی اس کا کیا رنگ ہوگا کسی کی مدد یا حمایت وہاں کسی مجرم کو نہ چھڑا سکے گی نہ اس کی سزا کم ہی کرا سکے گی۔ کلی اختیارات اس حاکمِ حقیقی کے ہاتھ میں ہوں گے جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی اور جس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کا بل بوتا کسی میں نہیں ہے۔ یہ بالکل اُس کے اپنے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہوگا کہ کسی پر رحم فرما کر اس کو سزا نہ دے یا کم سزا دے، اور حقیقت میں اُس کی شان یہی ہے کہ انصاف کرنے میں بے رحمی سے نہیں بلکہ رحم ہی سے کام لے لیکن جس مقدمے میں جو فیصلہ بھی وہ کرے گا وہ جوں کا توں بے کم و کاست نافذ ہوگا۔ عدالتِ الٰہی کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد آگے کے چند فقروں میں بتایا گیا ہے کہ اس عدالت میں جو لوگ مجرم ثابت ہوں گے ان کا انجام کیا ہوگا اور جن لوگوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ دُنیا میں خدا سے ڈر کر نافرمانیوں سے پرہیز کرتے رہتے تھے ان کو کن انعامات سے سرفراز کیا جائے گا۔ ۱۹۰ـہ

بیٹے کے لیے حضرت نوحؑ کی دُعا کی مثال

سُورۂ ہُود میں حضرت ابراہیمؑ کے قصّہ (آیات ۶۹ تا ۷۶) کے مخاطب قریش کے لوگ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کی وجہ ہی سے تمام عرب کے پیرزادے، کعبۃ اللہ کے مجاور اور مذہبی و اخلاقی اور سیاسی و تمدنی پیشوائی کے مالک بنے ہوئے تھے اور اس گھمنڈ میں مبتلا تھے کہ ہم پر خدا کا غضب کیسے نازل ہو سکتا ہے جبکہ ہم خدا کے اُس پیارے بندے کی اولاد میں اور وہ خدا کے دربار میں ہماری سفارش کرنے کو موجود ہے۔ اس پندار غلط کو توڑنے کے لیے پہلے تو انہیں یہ منظر دکھایا گیا کہ حضرت نوحؑ جیسا عظیم الشّان پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشے کو ڈوبتے دیکھ رہا ہے اور تڑپ کر خدا سے دُعا کرتا ہے کہ اس کے بیٹے کو بچا لیا جائے۔ مگر صرف یہی نہیں کہ اس کی سفارش بیٹے کے کچھ کام نہیں آتی، بلکہ اس سفارش پر باپ کو اُلٹی ڈانٹ سننی پڑتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا منظر خود حضرت ابراہیمؑ کا دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ان پر بے پایاں عنایات ہیں اور نہایت پیار کے انداز میں ان کا ذکر ہو رہا ہے، مگر دوسری طرف جب وہی ابراہیمؑ خلیل انصاف کے معاملہ میں دخل دیتے ہیں تو ان کے اصرار و الحاح کے باوجود اللہ تعالیٰ مجرم قوم (قومِ لوطؑ) کے معاملے میں ان کی سفارش رد کر دیتا ہے۔ ۱۹۱ـہ

پھر اسی سورۂ ہود میں آگے چل کر فرمایا:

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (ہود۔ آیت ۱۰۵)

"جب وہ (قیامت کا دن) آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہو گی الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے"

یعنی یہ بے وقوف لوگ اپنی جگہ اس بھروسے میں ہیں کہ فلاں حضرت ہماری سفارش کر کے ہمیں بچا لیں گے، فلاں بزرگ اڑ کر بیٹھ جائیں گے اور اپنے ایک ایک متوسل کو بخشوائے بغیر نہ مانیں گے، فلاں صاحب جو اللہ میاں کے چہیتے ہیں جنت کے راستے میں مچل بیٹھیں گے اور اپنے دامن گرفتوں کی بخشش کا پروانہ لے کر ہی ٹلیں گے۔ حالانکہ اڑنا اور مچلنا کیسا، اُس پُرجلال عدالت میں تو کسی بڑے سے بڑے انسان اور کسی معزز سے معزز فرشتے کو بھی مجال دم زدن تک نہ ہو گی اور اگر کوئی کچھ کہہ بھی سکے گا تو اُس وقت جبکہ احکم الحاکمین خود اسے کچھ عرض کرنے کی اجازت دے دیں۔[۱۹۲]

دنیوی زندگی میں خدا کے ہاں سفارش کا مشرکانہ تصور

سورۂ النحل میں ارشاد ہے:

اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ۔ (آیت ۷۲)

"پھر کیا یہ لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں"

اگرچہ مشرکین مکہ اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں، اور ان نعمتوں پر اللہ کا احسان ماننے سے بھی انہیں انکار نہ تھا، لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان بہت سی ہستیوں کا شکریہ بھی زبان اور عمل سے ادا کرتے تھے جن کو انہوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی سند کے اس نعمت بخشی میں دخیل اور حصہ دار ٹھیرا رکھا تھا۔ اسی چیز کو قرآن "اللہ کے احسان کا انکار" قرار دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بطور ایک قاعدۂ کلیہ کے پیش کی گئی ہے کہ محسن کے احسان کا شکریہ غیر محسن کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ محسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا کہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ فلاں شخص کے طفیل، یا فلاں کی رعایت سے، یا فلاں کی سفارش سے، یا فلاں کی مداخلت سے کیا ہے، یہ بھی دراصل اس کے احسان کا انکار ہی ہے۔

یہ دونوں اصولی باتیں سراسر انصاف اور عقل عام کے مطابق ہیں۔ ہر شخص خود بادنیٰ تامل ان کی معقولیت سمجھ سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک حاجت مند آدمی پر رحم کھا کر اس کی مدد کرتے ہیں اور وہ اُسی وقت اُٹھ کر آپ کے سامنے ایک دوسرے

---

[۱۹۲] پس جو لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ غیر اللہ کے آستانوں پر نذریں اور نیازیں چڑھا رہے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور ان کی سفارش کے بھروسے پر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیے جا رہے ہیں، ان کو وہاں سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔[۱۹۳]

آدمی کا شکریہ ادا کر دیتا ہے جس کا اس امداد میں کوئی دخل نہ تھا۔ آپ چاہے اپنی فراخ دلی کی بنا پر اس کی اس بیہودگی کو نظر انداز کر دیں اور آئندہ بھی اپنی امداد کا سلسلہ جاری رکھیں، مگر اپنے دل میں یہ ضرور سمجھیں گے کہ یہ ایک نہایت بدتمیز اور احسان فراموش آدمی ہے۔ پھر اگر دریافت کرنے پر آپ کو معلوم ہو کہ اس شخص نے یہ حرکت اس خیال کی بنا پر کی تھی کہ آپ نے اس کی جو کچھ بھی مدد کی ہے وہ اپنی نیک دلی اور فیاضی کی وجہ سے نہیں کی بلکہ اُس دوسرے شخص کی خاطر کی ہے، درآنحالیکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو آپ لامحالہ اُسے اپنی توہین سمجھیں گے۔ اُس کی اس بیہودہ تاویل کا صریح مطلب آپ کے نزدیک یہ ہوگا کہ وہ آپ سے بدگمان ہے اور آپ کے متعلق یہ رائے رکھتا ہے کہ آپ کوئی رحیم اور شفیق انسان نہیں ہیں بلکہ محض ایک دوست نواز اور یار باش آدمی ہیں، چند لگے بندھے دوستوں کے توسل سے کوئی آئے تو آپ اس کی مدد کر دیتے ہیں ورنہ آپ کے ہاتھ سے کسی کو کچھ فیض حاصل نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۴ے

سورۂ نحل ہی میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُونَ ۔ (آیت ۸۳)

"یہ اللہ کے احسان کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو حق ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

انکار سے مراد وہی طرزِ عمل ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کفارِ مکہ اس بات کے منکر نہ تھے کہ یہ سارے احسانات اللہ نے اُن پر کیے ہیں مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ نے یہ احسانات ان کے بزرگوں اور دیوتاؤں کی مداخلت سے کیے ہیں اور اسی بنا پر وہ ان احسانات کا شکریہ اللہ کے ساتھ بلکہ کچھ اللہ سے بھی بڑھ کر ان متوسط ہستیوں کو ادا کرتے تھے۔ اسی حرکت کو اللہ تعالیٰ انکارِ نعمت اور احسان فراموشی اور کفران سے تعبیر کرتا ہے۔ ۱۹۵ے

سورۃ الحج میں ارشادِ گرامی ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۔ (آیت ۷۵، ۷۶)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لیے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ وہ سمیع اور بصیر ہے اور جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ اور سارے معاملات اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ مشرکین نے مخلوقات میں سے جن جن ہستیوں کو معبود بنا رکھا ہے ان میں افضل ترین مخلوق یا ملائکہ ہیں یا انبیاء ۔ اور ان کی حیثیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے احکام پہنچانے کا ذریعہ ہیں جن کو اُس نے

اس خدمت کے لیے چن لیا ہے محض یہ فضیلت اُن کو خدا یا خدائی میں اللہ کا شریک تو نہیں بنا دیتی۔ رہا یہ فقرہ کہ "جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اُس سے بھی وہ واقف ہے" تو یہ قرآن مجید میں بالعموم شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی تردید کے لیے آیا کرتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر پچھلے فقرے کے بعد اسے ارشاد فرمانے کا مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ اور انبیاء و صلحاء کو بذاتِ خود حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر نہ سہی اللہ کے ہاں سفارشی سمجھ کر بھی اگر تم پوجتے ہو تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، ہر شخص کے ظاہر و مخفی حالات وہی جانتا ہے۔ دنیا کے کھلے اور چھپے مصالح سے بھی وہی واقف ہے۔ ملائکہ اور انبیاء سمیت کسی مخلوق کو بھی ٹھیک معلوم نہیں ہے کہ کس وقت کیا کرنا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ نے اپنی مقرب ترین مخلوق کو بھی یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس کے اذن کے بغیر جو سفارش چاہیں کر بیٹھیں اور ان کی سفارش قبول ہو جائے۔ ۱۹۶؎

سورۃ الزمر میں ارشاد ہے:

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ۔ قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۖ لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۔ (آیت ۴۳، ۴۴)

"کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو، کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو، شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے، پھر اُسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔"

یعنی ایک تو ان لوگوں نے اپنے طور پر خود ہی یہ فرض کر لیا کہ کچھ ہستیاں اللہ کے ہاں بڑی زور آور ہیں جن کی سفارش کسی طرح ٹل نہیں سکتی حالانکہ کسی کا یہ زور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں خود سفارشی بن کر اُٹھ سکے کجا کہ اپنی سفارش منوا لینے کی طاقت بھی اس میں ہو۔ پھر ان کے سفارشی ہونے پر نہ کوئی دلیل، نہ اللہ تعالیٰ نے کبھی یہ فرمایا کہ ان کو میرے ہاں یہ مرتبہ حاصل ہے اور نہ خود ان ہستیوں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ ہم اپنے زور سے تمہارے سارے کام بنوا دیا کریں گے۔ اس پر مزید حماقت ان لوگوں کی یہ ہے کہ اصل مالک کو چھوڑ کر ان فرضی سفارشیوں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور ان کی ساری نیاز مندیاں انہی کے لیے وقف ہیں۔ ۱۹۷؎

سورۃ النجم میں ارشاد باری ہے:

وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِن

"آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں، اُن کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آ سکتی جب تک کہ

بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۔ (آیت ۲۶)

"اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کے حق میں اس کی اجازت نہ دے جس کے لیے وہ کوئی عرضداشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے۔"

یعنی تمام فرشتے مل کر بھی اگر کسی کی شفاعت کریں تو وہ اس کے حق میں نافع نہیں ہو سکتی کجا کہ تمہارے ان بناوٹی معبودوں کی شفاعت کسی کی بگڑی بنا سکے۔ خدائی کے اختیارات سارے کے سارے بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ فرشتے بھی اس کے حضور کسی کی سفارش کرنے کی اس وقت تک جسارت نہیں کر سکتے جب تک وہ انہیں اس کی اجازت نہ دے اور کسی کے حق میں ان کی سفارش سننے پر راضی نہ ہو۔ ۱۹۸؎

اللہ کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا

سورۃ الرعد میں اس طرح ارشاد ہے:

وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۔ (آیت ۱۱)

"اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔"

یعنی اس غلط فہمی میں بھی نہ رہو کہ اللہ کے ہاں کوئی پیر یا فقیر یا کوئی اگلا پچھلا بزرگ، یا کوئی جن یا فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ تم خواہ کچھ ہی کرتے رہو وہ تمہاری نذروں اور نیازوں کی رشوت لے کر تمہیں تمہارے برے اعمال کی پاداش سے بچا لے گا۔ ۱۹۹؎

شفاعت کے دروازے کی بندش

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۸۰)

"اے نبیؐ! تم خواہ ایسے لوگوں (یعنی منافقین) کے لیے معافی کی درخواست کرو، یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی انہیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور اللہ فاسق لوگوں کو راہِ نجات نہیں دکھاتا۔"

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۔

"اے نبیؐ تم چاہے ان (منافقین) کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو، ان کے لیے یکساں ہے، اللہ ہرگز انہیں معاف نہ کرے گا، اللہ فاسق لوگوں کو

(المنافقون آیت ۶) ہرگز ہدایت نہیں دیتا۔"

یہ بات سورۂ توبہ میں (جو سورۂ منافقون کے تین سال بعد نازل ہوئی ہے) اور زیادہ تاکید کے ساتھ فرما دی گئی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے منافقین کے متعلق فرمایا کہ "تم چاہے ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرو گے تو اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے۔ اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔" (التوبہ آیت ۸۰)

آگے چل کر پھر فرمایا "اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کی نماز جنازہ کبھی نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے اور یہ فاسق ہونے کی حالت میں مرے ہیں۔" (التوبہ ۸۴)

اس آیت میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دعائے مغفرت صرف ہدایت یافتہ لوگوں کے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔ جو شخص ہدایت سے پھر گیا ہو اور جس نے اطاعت کے بجائے فسق و نافرمانی کی راہ اختیار کر لی ہو، اس کے لیے کوئی عام آدمی تو درکنار، خود اللہ کا رسول بھی مغفرت کی دعا کرے تو اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کو ہدایت بخشنا اللہ کا طریقہ نہیں ہے جو اس کی ہدایت کے طالب نہ ہوں۔ اگر ایک بندہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے منہ موڑ رہا ہو، بلکہ ہدایت کی طرف اسے بلایا جائے تو سر جھٹک کر غرور کے ساتھ اس دعوت کو رد کر دے تو اللہ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے اپنی ہدایت لیے پھرے اور خوشامد کر کے اسے راہ ہدایت پر لائے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت شافع روز محشر

اسلامی عقیدۂ شفاعت تو قرآن و حدیث کی رو سے یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں شفاعت صرف وہ کر سکے گا جس کو اللہ اجازت دے اور صرف اسی شخص کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے اللہ اجازت دے۔ ملاحظہ ہو: يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا۔

مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ

---

[1] قرآن کی ان آیات سے اور ایسی ہی بعض دوسری آیات سے ایک اہم حقیقت کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی زبان سے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قیامت میں کیسے لوگوں کے لیے اور کیسے اعمال کے مرتکبین کے لیے کوئی شفاعت کارگر نہ ہو گی۔ متعدد احادیث اس بارے میں قطعی ہیں۔ اس حقیقت کی روشنی میں شفاعت کے اس مروجہ تصور کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی جس کے سے سرشار ہو کر لوگ فرائض سے ترک عبادات کرتے ہیں۔ احکام دین کی اطاعت سے بے نیاز رہتے ہیں اور من پسند گناہ میں مگن رہتے ہیں۔ (مرتبین)

اس قاعدے کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں یقیناً شفاعت فرمائیں گے، مگر یہ شفاعت اللہ کے اذن سے ہوگی اور اُن اہل ایمان کے حق میں ہوگی جو اپنی حد بھر نیک عمل کرنے کی کوشش کے باوجود کچھ گناہوں میں آلودہ ہوگئے ہوں۔ جان بوجھ کر خیانتیں اور بدکاریاں کرنے والے اور کبھی خدا سے نہ ڈرنے والے لوگ حضورؐ کی شفاعت کے مستحق نہیں ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضورؐ کا ایک طویل خطبہ مروی ہے جس میں آپؐ جرم خیانت کی شدت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز یہ خائن لوگ اس حالت میں آئیں گے کہ ان کی گردن پر ان کا خیانت سے حاصل کیا ہوا مال لدا ہوگا اور وہ مجھے پکاریں گے کہ یا رسول اللہ اغثنی! (یا رسول اللہ! میری مدد فرمائیے) مگر میں جواب دوں گا کہ لا املک لک شیئًا قد ابلغتک (میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا، میں نے تجھ تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا)۔ (ملاحظہ ہو مشکوٰۃ، باب قسمۃ الغنائم، الغلول فیہا) - ۲۲۳

باب ۱۱

پیشین گوئیاں

حضورؐ کی چند اہم پیشین گوئیاں

انبیاء علیہم السلام کی طرف سے ایسی پیشین گوئیاں صادر ہوتی ہیں جو بالکل سچی ثابت ہوتی ہیں حالانکہ بسا اوقات ان کے پورا ہونے کا وقت خاصی دیر سے آتا ہے اور بظاہر حالات سے بھی کوئی پیشین گوئی کا کوئی امکان نہیں ہوتا ہے ان کو دیکھ کر عقلمند یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کوئی پیشین گوئی پوری ہو سکے گی۔ یہی پیشین گوئیاں علامات نبوت میں سے ہیں اور ایک لحاظ سے ان میں معجزانہ پہلو پایا جاتا ہے۔ نجومیوں اور فال گیروں کی جھوٹی باتوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ چیزیں کسی درجے اور کسی شکل میں کسی موقع پر پوری ہو جاتی ہیں لیکن انبیاء کی پیشین گوئیاں چونکہ علم الٰہی پر مبنی ہوتی ہیں اس لیے وہ بالکل قطعی ہوتی ہیں

حضورؐ کی پیشین گوئیاں ایک وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے، دوسری وہ ہیں جو احادیث صحیحہ میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے جس قدر تعداد کو ہم جناب مؤلف کی تحریروں سے برآمد کر سکے ہیں یہاں یکجا کر دی گئی ہیں۔

(مرتبین)

فصل ۱

قرآن کی پیشین گوئیاں

روشن مستقبل

وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ۔ (الضحیٰ۔ آیت ۴)

"اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہے"

یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جبکہ چند مٹھی بھر آدمی آپ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپ کی مخالف تھی، بظاہر کامیابی کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ اسلام کی شمع مکہ ہی میں ٹمٹما رہی تھی اور اسے بجھا دینے کے لیے ہر طرف طوفان اُٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ ابتدائی دَور کی مشکلات سے آپؐ ذرا پریشان نہ ہوں، ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے آپؐ کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔ آپؐ کی قوت، آپؐ کی عزت و شوکت اور آپؐ کی قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپؐ کا نفوذ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔ پھر یہ وعدہ صرف دنیا ہی تک محدود نہیں ہے، اس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپؐ کو ملے گا وہ اُس مرتبے سے بھی بدرجہا بڑھ کر ہوگا جو دنیا میں آپ کو حاصل ہوگا۔ طبرانی نے اوسط میں اور بیہقی نے دلائل میں ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میرے سامنے وہ تمام کامیابیاں پیش کی گئیں جو میرے بعد میری اُمت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آخرت تمہارے لیے دُنیا سے بھی بہتر ہے۔"

غلبۂ دین کی پیشین گوئی

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ۔ (الضحیٰ۔ آیت ۵)

"اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

یعنی اگرچہ دینے میں کچھ دیر تو لگے گی، لیکن وہ وقت دُور نہیں ہے جب تم پر تمہارے رب کی عطا و بخشش کی وہ بارش ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ یہ وعدہ حضورؐ کی زندگی ہی میں اس طرح پورا ہوا کہ سارا ملک عرب جنوب کے سواحل سے لے کر شمال میں سلطنتِ روم کی شامی اور سلطنتِ فارس کی عراقی سرحدوں تک، اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر

مغرب میں بحرِ احمر تک آپؐ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ضابطہ کی تابع ہو گئی۔ جو طاقت بھی اس سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو کر رہ گئی۔ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ سے وہ پورا ملک گونج اٹھا جس میں مشرکین اور اہلِ کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دم تک ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے۔ لوگوں کے صرف سر ہی اطاعت میں نہیں جھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مسخر ہو گئے اور عقائد، اخلاق اور اعمال میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ پوری تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ ایک جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم صرف ۲۳ سال کے اندر اتنی بدل گئی ہو۔ اس کے بعد حضورؐ کی برپا کی ہوئی تحریک اس طاقت کے ساتھ اٹھی کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر وہ چھا گئی اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دنیا میں دیا اور آخرت میں جو کچھ دے گا اس کی عظمت کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔[۲۴]

یہ اللہ کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ ایک ناتراشیدہ اُمّی قوم میں اس نے ایسا عظیم نبیؐ پیدا کیا جس کی تعلیم و ہدایت اس درجہ انقلاب انگیز ہے، اور پھر ایسے عالمگیر ابدی اصولوں کی حامل ہے جن پر تمام نوعِ انسانی مل کر ایک اُمّت بن سکتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ان اُصولوں سے رہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔ کوئی بناوٹی انسان خواہ کتنی ہی کوشش کر لیتا، یہ مقام و مرتبہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ عرب جیسی پسماندہ قوم تو درکنار، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی قوم کا کوئی ذہین سے ذہین آدمی بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کی اس طرح مکمل طور پر کایا پلٹ دے، اور پھر ایسے جامع اصول دنیا کو دے دے جن پر ساری نوعِ انسانی ایک اُمّت بن کر ایک دین اور ایک تہذیب کا عالمگیر و ہمہ گیر نظام ابد تک چلانے کے قابل ہو جائے۔ یہ ایک معجزہ ہے جو اللہ کی قدرت سے رونما ہوا ہے، اور اللہ ہی نے اپنی حکمت کی بنا پر جس شخص، جس ملک، اور جس قوم کو چاہا ہے اس کے لیے انتخاب کیا ہے۔ اس پر اگر کسی بے وقوف کا دل دکھتا ہے تو دکھتا رہے۔[۲۵]

بہتر دَور کی یقین دہانی

سورۃ الضحیٰ کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے اور مقصد اُس پریشانی کو دُور کرنا ہے جو نزولِ وحی کا سلسلہ رُک جانے سے آپؐ کو لاحق ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے روزِ روشن اور سکونِ شب کی قسم کھا کر آپؐ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپؐ کے رب نے آپؐ کو ہرگز نہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ آپؐ سے ناراض ہوا ہے۔ اس کے بعد آپؐ کو خوشخبری دی گئی ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ابتدائی دور میں جن شدید مشکلات سے آپؐ کو سابقہ پیش آ رہا ہے یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ آپؐ کے لیے ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہوتا چلا جائے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ اللہ تعالیٰ آپؐ پر اپنی عطاء و بخشش کی ایسی بارش کرے گا جس سے آپؐ خوش ہو جائیں گے۔ یہ قرآن کی ان صریح پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے جو بعد میں حرف بحرف پوری ہوئیں، حالانکہ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اُس

وقت کہیں دُور دُور تک بھی اس کے آثار نظر نہ آتے تھے کہ تم میں جو بیدار مددگار انسان پوری قوم کی جاہلیت کے مقابلے میں برسرِ پیکار ہو گیا ہے اُسے اتنی حیرت انگیز کامیابی نصیب ہو گی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم سے فرمایا ہے کہ تمہیں یہ پریشانی کیسے لاحق ہو گئی کہ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور ہم تم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ ہم تو تمہارے روزِ پیدائش سے مسلسل تم پر مہربانیاں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تم یتیم پیدا ہوئے تھے، ہم نے تمہاری پرورش اور خبر گیری کا بہترین انتظام کر دیا۔ تم ناواقفِ راہ تھے، ہم نے تمہیں راستہ بتایا۔ تم نادار تھے، ہم نے تمہیں مالدار بنا دیا۔ یہ ساری باتیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم ابتدا سے ہمارے منظورِ نظر ہو اور ہمارا فضل و کرم مستقل طور پر تمہارے شاملِ حال ہے۔ آسہلہ

بوجھ اُتارنے کا مفہوم

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ○ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ○ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ○	"اے نبیؐ! کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا"۔
(الم نشرح: ۱-۳)	

مفسرین میں سے بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ نبوت سے پہلے ایامِ جاہلیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے کچھ قصور ایسے ہو گئے تھے جن کی فکر آپؐ کو سخت گراں گزر رہی تھی اور یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مطمئن کر دیا کہ آپؐ کے وہ قصور ہم نے معاف کر دیے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ معنی لینا سخت غلطی ہے۔ اوّل تو لفظِ وِزر کے معنی لازماً گناہ ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ بھاری بوجھ کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو خواہ مخواہ بُرے معنی میں لیا جائے۔ دوسرے حضورؐ کی نبوت سے پہلے کی زندگی بھی اس قدر پاکیزہ تھی کہ قرآن میں مخالفین کے سامنے اُس کو ایک چیلنج کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے کفّار کو مخاطب کر کے یہ کہلوایا گیا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ "میں اس قرآن کو پیش کرنے سے پہلے تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں" (یونس، آیت ۱۶)۔ اور حضورؐ اس کردار کے آدمی بھی نہ تھے کہ لوگوں سے چھپ کر آپؐ نے کوئی گناہ کیا ہو۔ معاذ اللہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تو اس سے ناواقف نہ ہو سکتا تھا کہ جو شخص کوئی چھپا ہوا داغ اپنے دامن پر لیے ہوئے ہوتا اُس سے خلقِ خدا کے سامنے برملا وہ بات کہلواتا جو سورۂ یونس کی مذکورۂ بالا آیت میں اُس نے کہلوائی ہے۔ پس درحقیقت اِس آیت میں وِزر کے صحیح معنی بوجھ کے ہیں اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا بوجھ ہے، وہ جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیت کو دیکھ دیکھ کر آپؐ کی حساس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپؐ کے سامنے بُت پوجے جا رہے تھے۔ شرک اور مُشرکانہ اوہام و رسوم کا بازار گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں فساد عام تھا۔ زور آوروں کی

زیادتیوں سے بے زور بس رہتے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اوقات سَو سَو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پُشت پر کوئی مضبوط جتھا نہ ہو۔ یہ حالت دیکھ کر آپؐ کُڑھتے تھے مگر اس بگاڑ کو دُور کرنے کی کوئی صورت آپؐ کو نظر نہ آتی تھی یہی فکر آپؐ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارِ گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپؐ کے اُوپر سے اُتار دیا اور نبوّت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپؐ کو معلوم ہو گیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا قفل کھولا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس رہنمائی نے آپؐ کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپؐ پوری طرح مطمئن ہو گئے کہ اس ذریعہ سے آپؐ نہ صرف عرب بلکہ پوری نوعِ انسانی کو اُن خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اُس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔ ۱۶۰؎

رفعِ ذکر

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۔ (الم نشرح-۴) اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔

یہ بات اُس زمانہ میں فرمائی گئی تھی جب کوئی شخص یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جس فردِ فرید کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہیں اور وہ بھی صرف شہرِ مکّہ تک محدُود ہیں اُس کا آوازہ دنیا بھر میں کیسے بلند ہو گا اور کیسی ناموری اس کو حاصل ہو گی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان حالات میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ خوشخبری سُنائی اور پھر عجیب طریقہ سے اس کو پُورا کیا۔ سب سے پہلے آپؐ کے رفعِ ذکر کا کام اُس نے خود آپؐ کے دشمنوں سے لیا۔ کُفّارِ مکہ نے آپؐ کو زک دینے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ حج کے موقع پر جب تمام عرب سے لوگ کھنچ کھنچ کر ان کے شہر میں آتے تھے، اُس زمانہ میں کُفّار کے وفود حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک خطرناک شخص محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نامی ہے جو لوگوں پر ایسا جادُو کرتا ہے کہ باپ بیٹے بھائی بھائی اور شوہر اور بیوی میں جُدائی پڑ جاتی ہے۔ اس لیے ذرا اُس سے بچ کر رہنا۔ یہی باتیں وہ ان سب لوگوں سے بھی کہتے تھے جو حج کے سوا دوسرے دنوں میں زیارت یا کسی کاروبار کے سلسلے میں مکہ آتے تھے۔ اس طرح اگرچہ وہ حضورؐ کو بدنام کر رہے تھے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپؐ کا نام پہنچ گیا اور مکہ کے گوشۂ گمنامی سے نکال کر خود دشمنوں نے آپؐ کو تمام ملک کے قبائل سے متعارف کرا دیا۔ اس کے بعد یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ شخص ہے کون؟ کیا کہتا ہے؟ کیسا آدمی ہے؟ اُس کے "جادُو" سے متاثر ہونے والے کون لوگ ہیں اور ان پر اس کے "جادو" کا آخر کیا اثر پڑا ہے؟ کُفّارِ مکہ کا پراپیگنڈا جتنا جتنا بڑھتا چلا گیا، لوگوں میں یہ جستجو بھی بڑھتی چلی گئی۔ پھر جب اس جستجو کے نتیجے میں لوگوں کو آپؐ کے اخلاق اور آپؐ کی سیرت و کردار کا

حال معلوم ہوا، سب لوگوں نے قرآن سنا اور انہیں پتہ چلا کہ وہ تعلیمات کیا ہیں جو آپ پیش فرما رہے ہیں، اور جب دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ جس چیز کو بدنام کیا جا رہا ہے اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگیاں عرب کے عام لوگوں کی زندگیوں سے کس قدر مختلف ہو گئی ہیں، تو وہی بدنامی نیک نامی سے بدلنی شروع ہو گئی، حتیٰ کہ ہجرت کا زمانہ آتے آتے نوبت یہ پہنچ گئی کہ دور و نزدیک کے عرب قبائل میں شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو جس میں کسی نہ کسی شخص نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو، اور جس میں کچھ نہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپؐ کی دعوت سے ہمدردی و دلچسپی رکھنے والے پیدا نہ ہو گئے ہوں۔ یہ حضورؐ کے رفع ذکر کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد ہجرت سے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا جس میں ایک طرف منافقین، یہود اور تمام عرب کے اکابر مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے، اور دوسری طرف مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست خدا پرستی و خدا ترسی، زہد و تقویٰ، طہارت اخلاق، حسن معاشرت، عدل و انصاف، انسانی مساوات، مالداروں کی فیاضی، غریبوں کی خبرگیری، عہد و پیمان کی پاسداری اور معاملات میں راست بازی کا وہ عملی نمونہ پیش کر رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتا چلا جا رہا تھا۔ دشمنوں نے جنگ کے ذریعہ سے حضورؐ کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو مٹانے کی کوشش کی، مگر آپؐ کی قیادت میں اہل ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے اپنے نظم و ضبط، اپنی شجاعت، اپنی موت سے بے خوفی، اور حالت جنگ تک میں اخلاقی حدود کی پابندی سے اپنی برتری اس طرح ثابت کر دی کہ سارے عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ دس سال کے اندر حضورؐ کا رفع ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپؐ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا، اس کا گوشہ گوشہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ پھر تیسرے مرحلے کا افتتاح خلافت راشدہ کے دور سے ہوا جب آپؐ کا نام مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں بآواز بلند محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں حضورؐ پر درود نہ بھیجا جا رہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپؐ کا ذکر خیر نہ کیا جا رہا ہو، اور سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن اور دن کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب روئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ حضورؐ کا ذکر مبارک نہ ہو رہا ہو۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جس وقت نبوت کے ابتدائی دور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ، اس وقت کوئی شخص بھی یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ رفع ذکر اس شان سے اور اتنے بڑے پیمانے پر ہو گا۔

حدیث میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جبریلؑ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کس طرح تمہارا رفع ذکر کیا؟ میں نے عرض کیا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا۔"

(ابن جریر، ابن ابی حاتم، مسند ابو یعلیٰ، ابن المنذر، ابن حبّان، ابن مردویہ، ابو نعیم) بعد کی پوری تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حرف بحرف پوری ہوئی۔

شرح صدر

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ (الم نشرح آیت ۱) "(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟"

اس سوال سے کلام کا آغاز، اور پھر بعد کا مضمون یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس زمانے میں اُن شدید مشکلات پر سخت پریشان تھے جو دعوت اسلامی کے شروع کرتے ہی پیش آ رہی تھیں۔ اس پر تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ اے نبیؐ! کیا ہم نے یہ اور یہ عنایات تم پر نہیں کی ہیں؟ پھر ان ابتدائی مشکلات پر تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سینہ کھولنے کا لفظ قرآن مجید میں جن مواقع پر آیا ہے اُن پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں (۱) سورۂ انعام آیت ۱۲۵ میں فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ "پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔" اور سورۂ زمر آیت ۲۲ میں فرمایا اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ "کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو پھر وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہو ۔۔۔" ان دونوں مقامات پر شرح صدر سے مراد ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردّد سے پاک ہو کر اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جانا ہے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی عقائد، وہی اصولِ اخلاق و تہذیب و تمدّن، اور وہی احکام و ہدایات بالکل صحیح ہیں جو اسلام نے انسان کو دیئے ہیں۔ (۲) سورۂ شعراء آیت ۱۲-۱۳ میں ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جب اللہ تعالیٰ نبوت کے منصب عظیم پر مامور کر کے فرعون اور اس کی عظیم سلطنت سے جا ٹکرانے کا حکم دے رہا تھا تو انہوں نے عرض کیا رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ "میرے رب، میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے۔" اور سورۂ طٰہٰ آیات ۲۵-۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسی موقع پر حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ "میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے۔" یہاں سینے کی تنگی سے مراد یہ ہے کہ نبوت جیسے کارِ عظیم کا بار سنبھالنے اور تن تنہا کفر کی جابر و قاہر طاقت سے ٹکر لینے کی آدمی کو ہمت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرح صدر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بلند ہو جائے، کسی بڑی سے بڑی مہم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو انجام دینے میں بھی اسے تأمل نہ ہو، اور نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی اُس میں ہمت پیدا ہو جائے۔

غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ کھول دینے سے

یہ دونوں معنی مُراد ہیں پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت سے پہلے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مُشرکین عرب، نصاریٰ، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے، اور اُس حنیفیّت پر بھی مطمئن نہ تھے جو عرب کے بعض قائلین توحید میں پائی جاتی تھی، کیونکہ یہ ایک مُبْہَم عقیدہ تھا جس میں راہِ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی لیکن آپؐ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہِ راست کیا ہے، اس لیے آپؐ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا تھے۔ نبوّت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اس خلجان کو دُور کر دیا اور وہ راہِ راست کھول کر آپؐ کے سامنے رکھ دی جس سے آپؐ کو کامل اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وہ حوصلہ وہ ہمّت، وہ اُولوالعزمی اور وہ وسعتِ قلب عطا فرما دی جو اس منصبِ عظیم کی ذمّہ داریاں سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ آپؐ اُس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپؐ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سما نہ سکتا تھا۔ آپؐ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دُور کرنے اور سنوارنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ آپؐ اس قابل ہو گئے کہ جاہلیّت میں مستغرق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اکھڑ معاشرے میں کسی سروسامان اور بظاہر کسی پُشت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر کھڑے ہو جائیں، اسلام کے علمبردار بن کر مخالفت اور دشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے سے نہ ہچکچائیں۔ اس راہ میں جو بھی تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آئیں، ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں۔ اور کوئی طاقت آپؐ کو آپؐ کے موقف سے نہ ہٹا سکے۔ یہ شرحِ صدر کی بیش بہا دولت جب اللہ نے آپؐ کو عطا کر دی ہے تو آپؐ ان مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغازِ کار کے اس مرحلے میں پیش آ رہی ہیں؟

بعض مفسّرین نے شرحِ صدر کو شقِّ صدر کے معنوں میں لیا ہے۔ اور اس آیت کو اُس معجزۂ شقِّ صدر کا ثبوت قرار دیا ہے جو احادیث کی روشنی میں بیان ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معجزہ کے ثبوت کا دارومدار احادیث کی روایات ہی پر ہے۔ قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرحِ صدر کو کسی طرح بھی شقِّ صدر کے معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں: حَمْلُ الشَّرْحِ فِي الْآيَةِ عَلَى الشَّقِّ الْمَعْلُومِ ضَعِيفٌ عِنْدَ الْمُحَقِّقِينَ "محققین کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شق پر محمول کرنا ایک کمزور سی بات ہے۔"

بشارتِ کوثر

نبوّت کے ابتدائی دَور میں جب رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم شدید ترین مشکلات سے گزر رہے تھے، پوری قوم دُشمنی پر تُلی ہوئی تھی، مزاحمتوں کے پہاڑ راستے میں حائل تھے، مخالفت کا طوفان ہر طرف برپا تھا، اور حضورؐ اور آپؐ کے چند مُٹھی بھر ساتھیوں کو دُور دُور تک کہیں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، اُس وقت آپؐ کو تسلّی دینے اور آپؐ کی ہمّت بندھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات نازل فرمائیں۔ سورۂ ضحیٰ میں فرمایا وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۔ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى " اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دَور یعنی ہر بعد کا دَور

پہلے دَور سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تمہیں وہ کچھ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے" اور الم نشرح میں فرمایا کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ "اور ہم نے تمہارا آوازہ بلند کر دیا" یعنی دشمن تمہیں ملک بھر میں بدنام کرتے پھر رہے ہیں مگر ہم نے اُن کے علی الرغم تمہارا نام روشن کرنے اور تمہیں ناموری عطا کرنے کا سامان کر دیا ہے اور فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا "پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے" یعنی اِس وقت حالات کی سختیوں سے پریشان نہ ہو، عنقریب مصائب کا دَور ختم ہونے والا ہے اور کامیابیوں کا دَور آنے ہی والا ہے۔

ایسے ہی حالات تھے جن میں سُورۂ کوثر نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلّی بھی دی اور آپؐ کے مخالفین کے تباہ و برباد ہونے کی پیشین گوئی بھی فرمائی۔ قریش کے کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری قوم سے کٹ گئے ہیں اور ان کی حیثیت ایک بے کس اور بے یار و مددگار انسان کی سی ہو گئی ہے۔ عکرمہ کی روایت ہے کہ جب حضورؐ نبی بنائے گئے اور آپؐ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قریش کے لوگ کہنے لگے بَتِرَ مُحَمَّدٌ مِنَّا (ابن جریر) یعنی محمدؐ اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت اپنی جڑ سے کٹ گیا ہو اور متوقع یہی ہو کہ کچھ مدت بعد وہ سُوکھ کر پیوندِ خاک ہو جائے گا۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ مکہ کے سردار عاص بن وائل سہمی کے سامنے جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکر کیا جاتا، تو وہ کہتا "اجی چھوڑو، وہ تو ایک ابتر (جڑ کٹے) آدمی ہیں، ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں، مر جائیں گے تو کوئی ان کا نام لیوا بھی نہیں ہوگا"۔ شمر بن عطیہ کا بیان ہے کہ عُقبہ بن ابی مُعَیط بھی ایسی ہی باتیں حضورؐ کے متعلق کہا کرتا تھا (ابن جریر)۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ کعب بن اشرف (مدینہ کا یہُودی سردار) مکہ آیا تو قریش کے سرداروں نے اس سے کہا: اَلَا تَرٰى اِلٰى هٰذَا الصَّبِيِّ الْمُنْبَتِرِ مِنْ قَوْمِهٖ يَزْعَمُ اَنَّهٗ خَيْرٌ مِّنَّا وَنَحْنُ اَهْلُ الْحَجِيْجِ وَاَهْلُ السِّدَانَةِ وَاَهْلُ السِّقَايَةِ "ذرا دیکھو تو سہی اس لڑکے کو جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ ہم سے بہتر ہے حالانکہ ہم حج اور سدانت اور سقایت کے منتظم ہیں" (بزار)۔ اِس واقعہ کے متعلق عکرمہ کی روایت یہ ہے کہ قریش والوں نے حضورؐ کے لیے الصُّنْبُوْرُ الْمُنْبَتِرُ مِنْ قَوْمِهٖ کے الفاظ استعمال کیے تھے، یعنی "کمزور، بے یار و مددگار اور بے اولاد آدمی جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے" (ابن جریر)۔ ابن سعد اور ابن عساکر کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سب سے بڑے صاحبزادے قاسمؓ تھے، اُن سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے، پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں امّ کلثومؓ، فاطمہؓ اور رقیّہؓ تھیں۔ اِن میں سے پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا، پھر حضرت عبداللہؓ نے وفات پائی۔ اِس پر عاص بن وائل نے کہا "ان کی نسل ختم ہو گئی اب وہ ابتر ہیں" (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی)۔ بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ عاص نے کہا اِنَّ مُحَمَّدًا اَبْتَرُ

لَا ابْنَ لَہٗ یَقُوْمُ مَقَامَہٗ بَعْدَہٗ ۔ فَاِذَا مَاتَ انْقَطَعَ ذِکْرُہٗ وَاسْتَرَحْتُمْ مِنْہُ "یعنی محمدؐ ابتر ہیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے، جب وہ مر جائیں گے تو ان کا نام دُنیا سے مٹ جائے گا اور ان سے تمہارا پیچھا چھُوٹ جائے گا"۔ عبد بن حُمَید نے ابن عباسؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے صاحبزادے عبداللہؓ کی وفات پر ابوجہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ شِمر بن عطیہ سے ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضورؐ کے اس غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی کمینہ پن کا مظاہرہ عُقبہ بن ابی مُعَیط نے کیا تھا۔ عطاء کہتے ہیں جب حضورؐ کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضورؐ کا اپنا چچا ابُولہب (جس کا گھر بالکل حضورؐ کے گھر سے متّصل تھا) دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ "خوشخبری" دی کہ بَتِرَ مُحَمَّدٌ اللَّیْلَۃَ "کہ آج رات محمدؐ لاولد ہو گئے یا ان کی جڑ کٹ گئی"۔

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضورؐ پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپؐ سے بگڑے تھے کہ آپؐ صرف اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرتے تھے، اور ان کے شرک کو آپؐ نے علانیہ رد کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے پُوری قوم میں جو مرتبہ و مقام آپؐ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپؐ سے چھین لیا گیا تھا۔ اور آپؐ گویا برادری سے کاٹ پھینکے گئے تھے۔ آپؐ کے چند مٹھی بھر ساتھی بھی سب بے یار و مددگار تھے، اور مارے کھدیڑے جا رہے تھے۔ اس پر مزید آپؐ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی وفات سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلے اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت کے بجائے وہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں، اور وہ باتیں بنائی جا رہی تھیں جو ایک ایسے شریف انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنوں اور غیروں تک سے ہمیشہ نیک سلوک کیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس مختصر ترین سورۃ کے ایک فقرے میں وہ خوشخبری دی جس سے بڑی خوشخبری دُنیا کے کسی انسان کو کبھی نہیں دی گئی اور ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی سُنا دیا کہ آپؐ کی مخالفت کرنے والوں ہی کی جڑ کٹ جائے گی۔

لفظ اَبْتَر بَتَر سے ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں، مگر محاورہ میں یہ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں نماز کی اُس رکعت کو جس کے ساتھ کوئی دوسری رکعت نہ پڑھی جائے بُتَیْراء کہا گیا ہے یعنی اکیلی رکعت۔ ایک اور حدیث میں ہے کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَا یُبْدَأُ فِیْہِ بِحَمْدِ اللہِ فَھُوَ اَبْتَرُ "ہر وہ کام جو کوئی اہمیت رکھتا ہو، اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ اَبتر ہے" یعنی اس کی جڑ کٹی ہوئی ہے۔ اُسے کوئی استحکام نصیب نہیں ہے، یا اُس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ نامراد آدمی کو بھی اَبتر کہتے ہیں۔ ذرائع و وسائل سے محروم ہو جانے والا بھی اَبتر کہلاتا ہے۔ جس شخص کے لیے کسی خیر اور بھلائی کی توقع باقی نہ رہی ہو اور جس کی کامیابی کی سب اُمیدیں منقطع ہو گئی ہوں وہ بھی اَبتر ہے۔ جو آدمی اپنے کنبے برادری اور اعوان و انصار سے کٹ کر اکیلا رہ گیا ہو وہ بھی اَبتر

ہے جس آدمی کی کوئی اولادِ نرینہ نہ ہو یا مر گئی ہو اس کے لیے بھی اَبتر کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہتا اور مرنے کے بعد وہ بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔ قریب قریب ان سب معنوں میں کفارِ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَبتر کہتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبیؐ، ابتر تم نہیں ہو بلکہ تمہارے یہ دشمن اَبتر ہیں۔ یہ محض کوئی جوابی حملہ نہ تھا بلکہ درحقیقت یہ قرآن کی بڑی اہم پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس وقت تو لوگ حضورؐ ہی کو ابتر سمجھ رہے تھے اور کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے اَبتر ہو جائیں گے جو نہ صرف مکہ میں بلکہ پورے ملکِ عرب میں نامور تھے، کامیاب تھے، مال و دولت اور اولاد ہی کی نعمتیں نہیں رکھتے تھے بلکہ سارے ملک میں جگہ جگہ ان کے اعوان و انصار موجود تھے، تجارت کے اجارہ دار تھے، اور حج کے منتظم ہونے کی وجہ سے تمام قبائلِ عرب سے ان کے وسیع تعلقات تھے۔ لیکن چند سال نہ گزرے تھے کہ حالات بالکل پلٹ گئے۔ یا تو وہ وقت تھا کہ غزوۂ احزاب (سنہ ۵ ہجری) کے موقع پر قریش بہت سے عرب اور یہودی قبائل کو لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے، اور حضورؐ کو محصور ہو کر شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی، یا تین ہی سال بعد وہ وقت آیا کہ سنہ ۸ھ میں جب آپؐ نے مکہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا، اور انہیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر پورا ملکِ عرب حضورؐ کے ہاتھ میں تھا، ملک کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفود آکر بیعت کر رہے تھے، اور آپؐ کے دشمن بالکل بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ ان کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی تو آج ان میں سے کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ابوجہل یا ابولہب یا عاص بن وائل یا عُقبہ بن ابی مُعَیط وغیرہ اعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے، اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے اسلاف یہ لوگ تھے۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر آج دنیا بھر میں درود بھیجا جا رہا ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو آپؐ سے نسبت پر فخر ہے۔ لاکھوں انسان آپؐ ہی سے نہیں بلکہ آپؐ کے خاندان اور آپؐ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک سے انتساب کو باعثِ عزّ و شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سید ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے، کوئی صدیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زُبیری اور کوئی انصاری، مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اَبتر حضورؐ نہیں بلکہ آپؐ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔[1] ـــ ۱۱۱ـ

---

[1] آیت میں لفظ شانی استعمال ہوا ہے اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ، شَنْءٌ سے ہے جس کے معنی ایسے بغض اور عداوت کے ہیں جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا "اور اے مسلمانو، کسی گروہ کی عداوت تمہیں اس زیادتی پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم انصاف نہ کرو"۔ پس شَانِئَكَ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور عداوت میں ایسا اندھا ہو گیا ہو کہ آپؐ پر عیب لگاتا ہو، آپؐ کے خلاف بدگوئی کرتا ہو، آپؐ کی توہین کرتا ہو، اور آپؐ پر طرح طرح کی باتیں چھانٹ کر اپنے دل کا بخار نکالتا ہو۔ ـ ۱۱۲ـ

بشارتِ کوثر کا اُخروی پہلو

حوضِ کوثر کے متعلق حضورؐ نے جو کچھ فرمایا وہ یہ ہے:

(۱) یہ حوض قیامت کے روز آپؐ کو عطا ہوگا۔ اور اُس سخت وقت میں جبکہ ہر ایک العطش، العطش کہہ رہا ہوگا، آپؐ کی اُمّت آپؐ کے پاس اُس پر حاضر ہوگی اور اس سے سیراب ہوگی۔ آپؐ اس پر سب سے پہلے پہنچے ہوئے ہوں گے اور اُس کے وسط میں تشریف فرما ہوں گے۔ آپؐ کا ارشاد ہے هُوَ حَوْضٌ تَرِدُ عَلَيْهِ اُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ "وہ ایک حوض ہے جس پر میری اُمّت قیامت کے روز وارد ہوگی" (مسلم، کتاب الصلوٰۃ۔ ابوداؤد، کتاب السنۃ)۔ انا فرطکم علی الحوض "میں تم سب سے پہلے اس پر پہنچا ہوا ہوں گا" (بخاری، کتاب الرقاق اور کتاب الفتن۔ مسلم، کتاب الفضائل اور کتاب الطہارۃ۔ ابن ماجہ، کتاب المناسک اور کتاب الزہد۔ مسند احمد، مرویات عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ و ابوہریرہؓ)۔ انی فرط لکم وانا شہید علیکم وانی واللہ لانظر الی حوضی الآن "میں تم سے آگے پہنچنے والا ہوں، اور تم پر گواہی دوں گا، اور خدا کی قسم میں اپنے حوض کو اِس وقت دیکھ رہا ہوں" (بخاری، کتاب الجنائز، کتاب المغازی، کتاب الرقاق)۔

انصار کو مخاطب کرتے ہوئے ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا انکم ستلقون بعدی اثرۃ فاصبروا حتی تلقونی علی الحوض "میرے بعد تم کو خود غرضیوں اور اقربا نوازیوں سے پالا پڑے گا۔ اس پر صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے آکر حوض پر ملو" (بخاری، کتاب مناقب الانصار و کتاب المغازی۔ مسلم، کتاب الامارۃ۔ ترمذی، کتاب الفتن)۔ انا یوم القیٰمۃ عند عقر الحوض "میں قیامت کے روز حوض کے وسط کے پاس ہوں گا" (مسلم، کتاب الفضائل)۔

حضرت ابوبرزہؓ اسلمی سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے حوض کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے؟ انہوں نے کہا ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، چار نہیں، پانچ نہیں، بار بار سنا ہے، جو اس کو جھٹلائے اللہ اسے اس کا پانی پینا نصیب نہ کرے (ابوداؤد، کتاب السنۃ)۔

عبیداللہ بن زیاد حوض کے بارے میں روایات کو جھوٹ سمجھتا تھا، حتیٰ کہ اُس نے ابوبرزہؓ اسلمی، براءؓ بن عازب اور عائذؓ بن عمرو کی سب روایات کو جھٹلا دیا۔ آخر کار ابوسبرہ ایک تحریر نکال کر لائے جو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص سے سُن کر نقل کی تھی اور اس میں حضورؐ کا یہ ارشاد درج تھا کہ الا ان موعدکم حوضی "خبردار رہو، میری اور تمہاری ملاقات کی جگہ میرا حوض ہے" (مسند احمد، مرویات عبداللہ بن عمرو بن عاص)۔

(۲) اِس حوض کی وسعت مختلف روایات میں مختلف بیان کی گئی ہے، مگر کثیر روایات میں یہ ہے کہ وہ اَیلہ (اسرائیل کی موجودہ بندرگاہ اَیلات) سے یمن کے صنعاء تک، یا اَیلہ سے عدن تک، یا عمّان سے عدن تک طویل ہوگا اور اس کی چوڑائی اتنی ہوگی جتنا اَیلہ سے جُحفہ (جدّہ اور رابغ کے درمیان ایک مقام) تک کا فاصلہ ہے۔ (بخاری، کتاب الرقاق۔

ابوداؤد الطیالسی، حدیث نمبر ۹۹۵۔ مُسند احمد، مرویات ابوبکر صدیقؓ و عبداللہ بن عمرؓ۔ مُسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ۔ ابن ماجہ، کتاب الزُّھد)۔

اس سے گمان ہوتا ہے کہ قیامت کے روز موجودہ بحرِ احمر ہی کو حوضِ کوثر میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۳) اِس حوض کے متعلق حضورؐ نے بتایا ہے کہ اس میں جنّت کی نہر کوثر (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) سے پانی لا کر ڈالا جائے گا۔ یشخب فیہ میزابان من الجنۃ، اور دوسری روایت میں ہے یغت فیہ میزابان یمدانہ من الجنۃ یعنی اس میں جنّت سے دو نالیاں لا کر ڈالی جائیں گی جو اسے پانی بہم پہنچائیں گی (مُسلم، کتاب الفضائل)۔ ایک اور روایت میں ہے یُفْتَحُ نھر من الکوثر الی الحوض "جنّت کی نہر کوثر سے ایک نہر اس حوض کی طرف کھول دی جائے گی۔ (مُسند احمد، مرویات عبداللہ بن مسعودؓ)۔

(۴) اس کی کیفیت حضورؐ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کا پانی دُودھ سے (اور بعض روایات میں ہے چاندی سے اور بعض میں برف سے) زیادہ سفید، برف سے زیادہ ٹھنڈا، شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا، اس کی تہ کی مٹی مُشک سے زیادہ خوشبودار ہوگی۔ اس پر اتنے کوزے رکھے ہونگے جتنے آسمان میں تارے ہیں۔ جو اس کا پانی پی لے گا اُسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔ اور جو اس سے محروم رہ گیا وہ پھر کبھی سیراب نہ ہوگا۔ یہ باتیں تھوڑے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ بکثرت احادیث میں منقول ہوئی ہیں (بخاری، کتاب الرقاق۔ مُسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔ مُسند احمد، مرویات ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ و عبداللہ بن عَمرو بن عاص۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ۔ ابن ماجہ، کتاب الزھد۔ ابوداؤد طیالسی، حدیث ۹۹۵، ۲۱۳۵)۔

(۵) اس کے بارے میں حضورؐ نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے، اُن کو اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا اور اس پر انہیں نہ آنے دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا ہے۔ پھر میں بھی ان کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دُور رہو۔ یہ مضمون بھی بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے (بخاری، کتاب الرقاق، کتاب الفتن۔ مُسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الفضائل۔ مُسند احمد، مرویات ابن مسعودؓ و ابوہریرہؓ۔ ابن ماجہ، کتاب المناسک)۔ ابن ماجہ نے اس سلسلے میں جو حدیث نقل کی ہے وہ بڑے ہی دردناک الفاظ میں ہے۔ اس میں حضورؐ فرماتے ہیں الا وانی فرطکم علی الحوض واکاثر بکم الامم فلا تسودوا وجھی، الا وانی مستنقذ اناسا و مستنقذ اناس منی فاقول یا رب اصیحابی، فیقول انک لا تدری ما احدثوا بعدک "خبردار رہو، میں تم سے آگے حوض پر پہنچا ہوا ہونگا اور تمہارے ذریعہ سے دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں اپنی اُمت کی کثرت

پر فخر کروں گا۔ اُس وقت میرا منہ کالا نہ کروانا۔ خبردار رہو کچھ لوگوں کو میں چھڑاؤں گا۔ اور کچھ لوگ مجھ سے چھڑا لیے جائیں گے۔ میں کہوں گا کہ اَے پروردگار یہ تو میرے صحابی ہیں وہ فرمائے گا تم نہیں جانتے انہوں نے تمہارے بعد کیا نرالے کام کیسے ہیں" ابن ماجہ کی روایت ہے کہ یہ الفاظ حضور نے عرفات کے خطبے میں فرماتے تھے)۔

(۴) اسی طرح حضور نے اپنے دَور کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میرے طریقے سے ہٹ کر چلیں گے اور اس میں ردّ و بدل کریں گے انہیں اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا۔ میں کہوں گا اَے میرے رب یہ تو میرے ہیں، میری اُمّت کے لوگ ہیں، جواب ملے گا آپؐ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپؐ کے بعد کیا کیا تغیرات کیے اور اُلٹے ہی پھرتے چلے گئے۔ پھر میں بھی ان کو دفع کروں گا اور حوض پر نہ آنے دوں گا۔ اِس مضمون کی بہت سی روایات احادیث میں ہیں (بخاری کتاب المساقاۃ، کتاب الرّقاق، کتاب الفتن۔ مسلم، کتاب الطّہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الفضائل۔ ابن ماجہ، کتاب الزّہد، مسند احمد، مرویاتِ ابن عباسؓ)۔

اِس حوض کی روایات ۵۰ سے زیادہ صحابہؓ سے مروی ہیں۔ اور سلف نے بالعموم اِس سے مراد حوضِ کوثر لیا ہے۔ امام بخاری نے کتاب الرّقاق کے آخری باب کا عنوان ہی یہ باندھا ہے باَبٌ فی الحوض وقول اللہ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ اور حضرت انسؓ کی ایک روایت میں تو تصریح ہے کہ حضور نے کوثر کے متعلق فرمایا ھُوَ حوضٌ تَرِدُ عَلَیْہِ اُمَّتِیْ "وہ ایک حوض ہے جس پر میری اُمّت وارد ہوگی"۔

جنّت میں کوثر نامی جو نہر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی جائے گی اس کا ذکر بھی بکثرت روایات میں آیا ہے۔ حضرت انسؓ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں وہ فرماتے ہیں (اور بعض روایات میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں) کہ معراج کے موقع پر حضور کو جنّت کی سیر کرائی گئی۔ اور اس موقع پر آپؐ نے ایک نہر دیکھی جس کے کناروں پر اندر سے ترشے ہوئے موتیوں یا ہیروں کے قبّے بنے ہوئے تھے، اس کی تہ کی مٹی مُشکِ اَذفر کی تھی۔ حضور نے جبریلؑ سے یا اُس فرشتے سے جس نے آپؐ کو سیر کرائی تھی پُوچھا، یہ کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا یہ نہر کوثر ہے جو آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے (مُسند احمد، بخاری، مُسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابوداؤد طیالسی، ابن جریر)۔

حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے کہ حضورؐ سے پُوچھا گیا (یا ایک شخص نے پوچھا) کوثر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے جنّت میں عطا کی ہے۔ اس کی مٹی مُشک ہے، اس کا پانی دُودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے (مُسند احمد، ترمذی، ابن جریر۔ مُسند احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے نہر کوثر کی یہ صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا، اس کی تہ میں کنکریوں کے بجائے موتی پڑے ہوئے ہیں)۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ کوثر جنّت میں ایک نہر ہے جس کے کنارے سونے کے ہیں۔ وہ موتیوں اور ہیروں پر بہہ رہی ہے (یعنی

کنکریوں کی بجائے اس کی تہ میں یہ جواہر پڑے ہوتے ہیں)۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے، اس کا پانی دودھ سے (یا برف سے) زیادہ سفید ہے، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم، دارمی، ابو داؤد طیالسی، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن ابی شیبہ)۔ اسامہؓ بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ حضرت حمزہؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ گھر پر نہ تھے۔ ان کی اہلیہ نے حضورؐ کی تواضع کی، اور دوران گفتگو عرض کیا کہ میرے شوہر نے مجھے بتایا ہے کہ آپؐ کو جنت میں ایک نہر عطا کی گئی ہے جس کا نام کوثر ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں، اور اس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد اور موتیوں کی ہے (ابن جریر۔ ابن مردویہ۔ اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے مگر اس مضمون کی کثیر التعداد روایات کا موجود ہونا اس کو تقویت پہنچاتا ہے)۔ ان مرفوع روایات کے علاوہ صحابہؓ اور تابعین کے بکثرت اقوال احادیث میں نقل ہوئے ہیں جن میں وہ کوثر سے مراد جنت کی یہ نہر لیتے ہیں اور اس کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو اوپر گزری ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت انسؓ بن مالکؓ، حضرت عائشہؓ، مجاہد اور ابو العالیہ کے اقوال مسند احمد، بخاری، ترمذی، نسائی، ابن مردویہ، ابن جریر اور ابن ابی شیبہ وغیرہ محدثین کی کتابوں میں موجود ہیں۔ [۲۱۴]

ابولہب کا انجام بد

تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ (اللہب۔۱) "ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ"

تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ کے معنی بعض مفسرین نے "ٹوٹ جائیں ابولہب کے ہاتھ" بیان کیے ہیں اور وَتَبَّ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "وہ ہلاک ہو جائے" یا "وہ ہلاک ہو گیا"۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی کوسنا نہیں ہے جو اس کو دیا گیا ہو، بلکہ ایک پیشین گوئی ہے جس میں آئندہ پیش آنے والی بات کو ماضی کے صیغوں میں بیان کیا گیا ہے، گویا اس کا ہونا ایسا یقینی ہے جیسے وہ ہو چکی، اور فی الواقع آخر کار وہی کچھ ہوا جو اس سورہ میں چند سال پہلے بیان کیا جا چکا تھا۔ ہاتھ ٹوٹنے سے مراد ظاہر ہے کہ جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں ہے، بلکہ کسی شخص کا اپنے اس مقصد میں قطعی ناکام ہو جانا ہے جس کے لیے اس نے اپنا پورا زور لگا دیا ہو۔ اور ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے واقعی اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ لیکن اس سورہ کے نزول پر سات آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ جنگ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام کی دشمنی میں ابولہب کے ساتھی تھے۔ مکہ میں جب اس شکست کی خبر پہنچی تو اس کو اتنا رنج ہوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ پھر اس کی موت بھی نہایت عبرتناک تھی۔ اسے عدسہ (Malignant Pustule) کی بیماری ہو گئی جس کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے اسے چھوڑ دیا، کیونکہ انہیں چھوت لگنے کا ڈر تھا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا، یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور اس کی بو پھیلنے لگی۔ آخر کار جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے تو ایک روایت

یہ ہے کہ انہوں نے کچھ حبشیوں کو اُجرت دے کر اس کی لاش اُٹھوائی اور انہی مزدوروں نے اس کو دفن کیا۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اسے ڈھانک دیا۔ اس کی مزید اور مکمل شکست اس طرح ہوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، اُسی دین کو اُس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی درّہ ہجرت کر کے مکّہ سے مدینے پہنچیں اور اسلام لائیں۔ پھر فتح مکّہ کے موقع پر اس کے دونوں بیٹے عُتبہ اور مُعتّب، حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضورؐ کے سامنے پیش ہوئے اور ایمان لا کر انہوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔

اہلِ مکّہ کے لیے نبیؐ کو نکالنے کی سزا

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا۔ (بنی اسرائیل۔ آیت ۷۶)

"اور یہ لوگ اس بات پر تُلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔"

یہ صریح پیشین گوئی اگرچہ اُس وقت ایک دھمکی نظر آتی تھی مگر دس گیارہ سال کے اندر یہ حرف بحرف سچّی ثابت ہو گئی۔ اس سُورہ کے نزول پر ایک سال گزرا تھا کہ کفارِ مکّہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اور اس پر ۸ سال سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ آپؐ فاتح کی حیثیت سے مکّہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ اور پھر دو سال کے اندر اندر سرزمینِ عرب مشرکین کے وجود سے پاک کر دی گئی۔ پھر جو بھی اس ملک میں رہا مسلمان بن کر رہا، مشرک بن کر وہاں ٹھہر نہ سکا۔

جمعیتِ قریش کی ہزیمت

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ۔ (القمر۔ آیت ۴۵)

"عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔"

یہ صریح پیشین گوئی ہے جو ہجرت سے پانچ سال پہلے کر دی گئی تھی کہ قریش کی جمعیت جس کی طاقت کا انہیں بڑا زعم تھا، عنقریب مسلمانوں سے شکست کھا جائے گی۔ اُس وقت کوئی شخص یہ تصوّر تک نہ کر سکتا تھا کہ مستقبل قریب میں یہ انقلاب کیسے ہو گا۔ مسلمانوں کی بے بسی کا حال یہ تھا کہ ان میں سے ایک گروہ ملک چھوڑ کر حبش میں پناہ گزین ہو چکا تھا اور باقی ماندہ اہلِ ایمان شعبِ ابی طالب میں محصور تھے جنہیں قریش کے مقاطعہ اور محاصرے نے بھوکوں مار دیا تھا۔ اس حالت میں کون یہ سمجھ سکتا تھا کہ سات ہی برس کے اندر نقشہ بدل جانے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد عکرمہؒ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے جب سورۂ قمر کی یہ آیت نازل ہوئی تو میں حیران تھا

کہ آخر یہ کونسی جمعیت ہے جو شکست کھائے گی۔ مگر جب جنگ بدر میں کفار شکست کھا کر بھاگ رہے تھے اُس وقت میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زرہ پہنے ہوئے آگے کی طرف جھپٹ رہے ہیں اور آپؐ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں کہ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ تھی وہ ہزیمت جس کی خبر دی گئی تھی۔ (ابن جریر۔ ابن ابی حاتم) ۔

مکہ مفتوح ہو گا

وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ۔ (الصّٰفّٰت۔ ۱۷۳) " ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔"

یعنی کچھ زیادہ مدت نہ گزرے گی کہ اپنی شکست اور تمہاری فتح کو یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہ بات جس طرح فرمائی گئی تھی اُسی طرح پوری ہوئی۔ ان آیات کے نزول پر مشکل سے ۱۴۔۱۵ سال گزرے تھے کہ کفارِ مکہ نے اپنی آنکھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فاتحانہ داخلہ اپنے شہر میں دیکھ لیا اور پھر اس کے چند سال بعد انہی لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اسلام نہ صرف عرب پر، بلکہ روم و ایران کی عظیم سلطنتوں پر بھی غالب آ گیا۔

جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ (ص۔ آیت ۱۱) "یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھا ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے۔"

"اسی جگہ" کا اشارہ مکہ معظمہ کی طرف ہے یعنی جہاں یہ لوگ یہ باتیں بنا رہے ہیں اسی جگہ ایک دن یہ شکست کھانے والے ہیں اور یہیں وہ وقت آنے والا ہے جب یہ منہ لٹکائے اُسی شخص کے سامنے کھڑے ہوں گے جسے آج یہ حقیر سمجھ کر نبی تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

قرآنی دعوت چھا کے رہے گی

حٰمٓ السجدہ میں ارشادِ گرامی ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (آیت ۵۳) "عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔"

یعنی عنقریب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام گرد و پیش کے ممالک پر چھا گئی ہے اور یہ خود اس کے آگے سرنگوں ہیں۔ اُس وقت انہیں پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ آج ان سے کہا جا رہا ہے اور یہ مان کر نہیں دے رہے ہیں وہ سراسر حق تھا۔

بعض لوگوں نے اِس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محض کسی دعوت کا غالب آ جانا اور بڑے بڑے علاقے فتح کر لینا تو اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، باطل دعوتیں بھی چھا جاتی ہیں اور ان کے پیرو بھی ملک پر ملک فتح کرتے

چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک سطحی اعتراض ہے جو پُورے معاملے پر غور کیے بغیر کر دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دَور میں جو حیرت انگیز فتوحات اسلام کو نصیب ہوئیں وہ محض اس معنی میں اللہ کی نشانیاں نہ تھیں کہ اہلِ ایمان ملک پر ملک فتح کرتے چلے گئے، بلکہ اس معنی میں تھیں کہ یہ فتح ممالک دُنیا کی دوسری فتوحات کی طرح نہیں تھی جو ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کو دوسروں کی جان و مال کا مالک بنا دیتی ہیں اور خدا کی زمین ظلم سے بھر جاتی ہے۔ اس کے برعکس یہ فتح اپنے جلَو میں ایک عظیم الشان، مذہبی، اخلاقی، ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدنی و معاشی انقلاب لے کر آئی تھی جس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے، انسان کے بہترین جوہر کھلتے چلے گئے اور بدترین اوصاف دبتے چلے گئے۔ دنیا جن فضائل کو صرف تارک الدُّنیا درویشوں اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے اندر ہی دیکھنے کی اُمید رکھتی تھی اور کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کاروبارِ دنیا چلانے والوں میں بھی وہ پائے جا سکتے ہیں، اِس انقلاب نے وہ فضائل اخلاق فرمانرواؤں کی سیاست میں، انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کی عدالت میں، فوجوں کی قیادت کرنے والے سپہ سالاروں کی جنگ اور فتوحات میں، ٹیکس وصول کرنے والوں کی تحصیلداری میں، اور بڑے سے بڑے کاروبار چلانے والوں کی تجارت میں جلوہ گر کر کے دکھا دیئے۔ اس نے اپنے پیدا کردہ معاشرے میں عام انسانوں کو اخلاق اور کردار، طہارت و نظافت کے اعتبار سے اتنا اُونچا اٹھایا کہ دوسرے معاشروں کے چیدہ لوگ بھی اُن کی سطح سے فروتر نظر آنے لگے۔ اس نے اوہام و خرافات کے چکر سے نکال کر انسان کو علمی تحقیق اور معقول طرزِ فکر و عمل کی صاف شاہراہ پر ڈال دیا۔ اُس نے اجتماعی زندگی کے اُن امراض کا علاج کیا جن کے علاج کی فکر تک سے دوسرے نظام خالی تھے، یا اگر انہوں نے اس کی فکر کی بھی تو ان امراض کے علاج میں کامیاب نہ ہو سکے، مثلاً رنگ و نسل اور وطن و زبان کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق، ایک ہی معاشرے میں طبقات کی تقسیم اور ان کے درمیان اُونچ نیچ کا امتیاز اور چھوت چھات، قانونی حقوق اور عملی معاشرت میں مساوات کا فقدان، عورتوں کی پستی اور بنیادی حقوق تک سے محرومی، جرائم کی کثرت، شراب اور نشہ آور چیزوں کا عام رواج، حکومت کا تنقید و محاسبے سے بالاتر رہنا، عوام کا بنیادی حقوق تک سے محروم ہونا، بین الاقوامی تعلقات میں معاہدات کی بے اعتباری، جنگ میں وحشیانہ حرکات، اور ایسے ہی دوسرے امراض۔ سب سے بڑھ کر خود عرب کی سرزمین میں اس انقلاب نے دیکھتے دیکھتے طوائف الملوکی کی جگہ نظم، خونریزی و بدامنی کی جگہ امن، فسق و فجور کی جگہ تقویٰ و طہارت، ظلم و بے انصافی کی جگہ عدل، گندگی اور ناشائستگی کی جگہ پاکیزگی اور تہذیب، جہالت کی جگہ علم اور نسل در نسل چلنے والی عداوتوں کی جگہ اخوت و محبت پیدا کر دی، اور جس قوم کے لوگ اپنے قبیلے کی سرداری سے بڑھ کر کسی چیز کا خواب تک نہ دیکھ سکتے تھے انہیں دُنیا کا امام بنا دیا۔ یہ تھیں وہ نشانیاں جو اُسی نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جسے مخاطب کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ یہ آیت سنائی تھی۔ اور اس کے بعد سے آج تک اللہ تعالیٰ ان نشانیوں کو برابر دکھا رہا ہے

جا رہا ہے مسلمانوں نے اپنے زوال کے دور میں بھی اخلاق کی جس بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی گرد کو بھی وہ لوگ کبھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب و شائستگی کے علمبردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقہ، امریکہ، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کر دی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پاکر اتنے ظالم نہ بن سکے جتنے غیر مسلم تاریخ کے ہر دور میں ظالم پائے گئے ہیں اور آج تک پائے جا رہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو خود دیکھ لے کہ اسپین میں مسلمان صدیوں حکمران رہے اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانۂ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اب ہندو غالب آجانے کے بعد ان کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ پچھلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے۔ ۲۱۹

آنحضورؐ کے لیے رتبۂ بلند

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ۔ (القصص۔ آیت ۸۵)

"اے نبیؐ، یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین انجام کو پہنچانے والا ہے۔"

اصل الفاظ ہیں لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ "تمہیں ایک معاد کی طرف پھیرنے والا ہے" معاد کے لغوی معنی ہیں وہ مقام جس کی طرف آخرکار آدمی کو پلٹنا ہو اور اسے نکرہ استعمال کرنے سے اس میں خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مقام بڑی شان اور عظمت کا مقام ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد جنت لی ہے لیکن اسے صرف جنت کے ساتھ مخصوص کر دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ کیوں نہ اسے ویسا ہی عام رکھا جائے جیسا خود اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے تاکہ یہ وعدہ دنیا اور آخرت دونوں سے متعلق ہو جائے۔ سیاق عبارت کا اقتضاء بھی یہ ہے کہ اسے آخرت ہی میں نہیں اس دنیا میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرکار بڑی شان و عظمت عطا کرنے کا وعدہ سمجھا جائے۔ کفار مکہ کے جس قول پر آیت ۵۷ سے لے کر یہاں تک مسلسل گفتگو چلی آ رہی ہے، اس میں انہوں نے کہا تھا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، تم اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبنا چاہتے ہو۔ اگر ہم تمہارا ساتھ دیں اور اس دین کو اختیار کر لیں تو عرب کی سرزمین میں ہمارا جینا مشکل ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ سے فرماتا ہے کہ اے نبیؐ، جس خدا نے اس قرآن کی علمبرداری کا بار تم پر ڈالا ہے وہ تمہیں برباد کرنے والا نہیں ہے، بلکہ تم کو اس مرتبے پر پہنچانے والا ہے جس کا تصور بھی یہ لوگ آج نہیں کر سکتے۔ اور فی الواقع اللہ تعالیٰ نے چند ہی سال بعد حضورؐ کو اس دنیا میں، انہی لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تمام ملک عرب پر ایسا مکمل اقتدار عطا کر کے دکھا دیا کہ آپؐ کی مزاحمت کرنے والی کوئی طاقت وہاں

۔ نظیر نکلی اور آپؐ کے دین کے سوا کسی دین کے لیے وہاں گنجائش نہ رہی۔ عرب کی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی نظیر اس کی موجود نہ تھی کہ پورے جزیرۃ العرب پر کسی ایک شخص کی ایسی بے خل و غش بادشاہی قائم ہو گئی ہو کہ ملک بھر میں کوئی اس کا مدِّمقابل باقی نہ رہا ہو، کسی میں اس کے حکم سے سرتابی کا یارا نہ ہو، اور لوگ صرف سیاسی طور پر ہی اس کے حلقہ بگوش نہ ہو گئے ہوں بلکہ سارے دینوں کو مٹا کر اسی ایک شخص نے سب کو اپنے دین کا پیرو بھی بنا لیا ہو۔

آنحضورؐ کے لیے مقامِ محمود

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۔ (بنی اسرائیل۔ آیت ۷۹)

"بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقامِ محمود پر فائز کر دے۔"

یعنی دنیا اور آخرت میں تم کو ایسے مرتبے پر پہنچا دے جہاں تم محمودِ خلائق ہو کر رہو، ہر طرف سے تم پر مدح و ستائش کی بارش ہو، اور تمہاری ہستی ایک قابلِ تعریف ہستی بن کر رہے۔ آج تمہارے مخالفین تمہاری تواضع گالیوں اور ملامتوں سے کر رہے ہیں اور ملک بھر میں تم کو بدنام کرنے کے لیے انہوں نے جھوٹے الزامات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے، مگر وہ وقت دور نہیں ہے جبکہ دنیا تمہاری تعریفوں سے گونج اٹھے گی اور آخرت میں بھی تم ساری خلق کے ممدوح ہو کر رہو گے۔ قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ شفاعت پر کھڑا ہونا بھی اسی مرتبۂ محمودیت کا ایک حصہ ہے۔

شکست خوردہ رُوم کے لیے فتح کی خبر

جو پیشین گوئی سورۂ رُوم کی ابتدائی آیات میں کی گئی ہے وہ قرآن مجید کے کلامِ الٰہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کی نمایاں ترین شہادتوں میں سے ایک ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن تاریخی واقعات پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی جائے جو ان آیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصرِ روم ماریس (Maurice) کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس (Phocas) تختِ سلطنت پر قابض ہو گیا۔ اس شخص نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کر دیا، پھر خود قیصر کو قتل کر کے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں برسرِعام لٹکوا دیئے، اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس واقعہ سے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو رُوم پر حملہ آور ہونے کے لیے بہترین اخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر ماریس اس کا محسن تھا۔ اُسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہوا تھا۔ اسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اس بنا پر اُس نے اعلان کیا کہ میں غاصب فوکاس سے اُس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اُس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اس نے سلطنتِ رُوم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فوجوں کو پے در پے

شکستیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں اڈیسا (موجودہ اورفا) تک اور دوسری طرف شام میں حلب اور انطاکیہ تک پہنچ گیا۔ روم کے اعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقہ کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اس نے اپنے بیٹے ہرقل (Heraclius) کو ایک طاقتور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہرقل قیصر بنا دیا گیا اور اس نے برسرِ اقتدار آ کر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اس نے ماریس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ سن ۶۱۰ء کا واقعہ ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ رسالت پر سرفراز ہوئے تھے۔

خسرو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اُس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے کے بعد اس کو نئے قیصر کے ساتھ صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اُس نے جنگ کو مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو سرکاری کلیسا نے ملحد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نسطوری اور یعقوبی وغیرہ) ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ خسرو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہرقل آکر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا کنیسۃ القیامہ (Holy Sepulchre) برباد کر دیا گیا۔ اصل صلیب، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اُسی پر مسیح نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاٹ پادری زکریا کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انہوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بری طرح خسرو پرویز پر چڑھا تھا اُس کا اندازہ اُس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

"سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام

تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا؟"

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اُردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ معظمہ میں ایک اور اس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے

والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں، اور شرک کے پیروکار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ سنہ ۶۱۵ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو روم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اُس وقت سلطنتِ روم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ "دیکھو ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بت پرست بھی تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔"

ان حالات میں قرآن مجید کی یہ سورۃ نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ "قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آجائیں گے اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔" اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر دُور دُور تک اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو مکے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشین گوئی کے بعد بھی آٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف روم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ سنہ ۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضے میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور سنہ ۶۱۷ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون (Chalcedon موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اُس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابزنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوندِ آتش کی بندگی نہ اختیار کر لے۔" آخرکار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اُس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (Carthage. موجودہ ٹیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض انگریز مؤرخ گبن کے بقول، قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آجائے گی، بلکہ غلبہ تو درکنار، اس وقت تو کسی کو یہ اُمید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔[1]

---

[1] Gibbon, Decline & Fall of the Roman Empire, Vol. II P. 788 Modern Library, New York

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفار مکہ نے ان کا خوب مذاق اڑایا اور اُبی بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آگئے تو دس اونٹ میں دوں گا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ قرآن میں فِی بِضْعِ سِنِیْنَ کے الفاظ آتے ہیں، اور عربی زبان میں بضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبی سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ سو اونٹ دے گا۔

۶۲۲ء میں ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے اور ادھر قیصر ہرقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحر اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہوا جہاں اس نے ایران پر پشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اسقف اعظم سرجیس (Serjius) نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض دی۔ ہرقل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں آرمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے آذربیجان میں گھس کر زرتشت کے مقام پیدائش ارمیاہ کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ یہی سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشین گوئیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہو گئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوی کی فیصلہ کن لڑائی (۶۲۷ء) میں انہوں نے سلطنت ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دستگرد (دسکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر ہرقل کے لشکر عین طیسفون (Ctesiphon) کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رونما ہوئی، وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے اٹھارہ بچے قتل کر دیے گئے، اور چند روز بعد وہ خود قید کی سختیوں سے ہلاک ہو گیا۔ یہی سال تھا جس میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی جسے قرآن "فتح عظیم" کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہی سال تھا جس میں خسرو پرویز کے بیٹے قباد ثانی نے تمام رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر "مقدس صلیب" کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المقدس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش ہی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچی تھی۔ عرب کے بکثرت

مشرکین اس پر ایمان لے آئے۔ اُبی بن خلف کے وارثوں کو شرط ہار کر شرط کے اونٹ حضرت ابوبکرؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ انہیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے۔ کیونکہ شرط اُس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جُوئے کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا۔ مگر اب حُرمت کا حکم آ چکا تھا۔ اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی، مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔[۲۲۲]

وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللَّهِ ۔ (الرّوم۔ آیت ۴)

"اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے۔"

ابن عباسؓ، ابوسعید خدریؓ، سُفیان ثوری، سُدیؒ وغیرہ حضرات کا بیان ہے کہ ایرانیوں پر رُومیوں کی فتح اور جنگِ بدر میں مُشرکین پر مسلمانوں کی فتح کا زمانہ ایک ہی تھا، اس لیے مسلمانوں کو دوہری خوشی حاصل ہوئی۔ یہی بات ایران اور رُوم کی تاریخوں سے بھی ثابت ہے۔ ۶۲۴ء ہی وہ سال ہے جس میں جنگِ بدر ہوئی، اور یہی وہ سال ہے جس میں قیصرِ رُوم نے زرتشت کا مولد تباہ کیا اور ایران کے سب سے بڑے آتش کدے کو مسمار کر دیا۔[۲۲۳]

نعشِ فرعون کا استحفاظ[۱]

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ۔

"اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت رہے۔"

آج تک وہ مقام جزیرہ سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے جہاں فرعون کی لاش تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کو موجودہ زمانے میں جبلِ فرعون کہتے ہیں، اور اسی کے قریب ایک گرم چشمہ ہے جس کو مقامی آبادی نے حمامِ فرعون کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ اس کی جائے وقوع ابوزنیمہ سے چند میل اوپر شمال کی جانب ہے اور علاقے کے باشندے اسی جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ فرعون کی لاش یہاں پڑی ہوئی ملی تھی۔

اگر یہ ڈوبنے والا وہی فرعون منفتہ ہے جس کو زمانۂ حال کی تحقیق نے فرعونِ موسیٰ قرار دیا ہے تو اس کی لاش آج تک

---

۱ یہ قرآن کی نہایت بڑی عظیم پیشین گوئی ہے جو حضورؐ کی نبوت اور قرآن کی صداقت کی ایک واضح دلیل ہے جس وقت قرآن میں یہ پیشین گوئی سامنے آئی تھی اس وقت تک نہ اہلِ مصر کی قبروں اور نقشوں کا حال منکشف نہیں ہوا تھا۔ اہرام مصر میں داخل ہونے اور فراعنہ کے مقبروں اور تابوتوں کو کھولنے کا کام زمانۂ حال میں ہوا ہے ۱۹۰۷ء سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھا کہ دورِ موسیٰ کے فرعونِ غرقاب کی لاش محفوظ ہے یا نہیں۔ تین ہزار سال سے زیادہ پرانے واقعہ کے متعلق حالیہ انکشافات نے قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل منکرین کے لیے فراہم کر دی ہے۔

قاہرہ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سر گرافٹن ایلیٹ سمتھ نے اس کی ممی پر سے جب پٹیاں کھولی تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی تھی، جو کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی ایک کھلی علامت تھی۔

وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ ۔ یعنی ہم تو سبق آموز اور عبرت انگیز نشانات دکھاتے ہی رہیں گے اگرچہ اکثر انسانوں کا حال یہ ہے کہ کسی بڑی سے بڑی عبرتناک نشانی کو دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ۲۲۴

یاجوج ماجوج کی عالمگیر یورش

یاجوج سے مراد روس اور شمالی چین کے وہ قبائل ہیں جو تاتاری، منگولی، ہُن اور سیتھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں اور قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر حملے کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے حملوں سے بچنے کے لیے قفقاز کے جنوبی علاقے میں دربند اور داریال کے استحکامات تعمیر کیے گئے ہیں کیونکہ ان کے سیلاب وقتاً فوقتاً اٹھ کر ایشیا اور یورپ، دونوں طرف رخ کرتے رہے ہیں۔ بائیبل کی کتاب پیدائش (باب ۱۰) میں ان کو حضرت نوحؑ کے بیٹے یافث کی نسل میں شمار کیا گیا ہے، اور یہی بیان مسلمان مؤرخین کا بھی ہے۔ حزقی ایل کے صحیفے (باب ۳۸ و ۳۹) میں ان کا علاقہ روس اور توبل (موجودہ توبالسک) اور مسک (موجودہ ماسکو) بتایا گیا ہے۔ اسرائیلی مؤرخ یوسیفوس اُن سے مراد سیتھین قوم لیتا ہے جس کا علاقہ بحر اسود کے شمال اور مشرق میں واقع تھا۔ جیروم کے بیان کے مطابق ماجوج کاکیشیا کے شمال میں بحر خزر کے قریب آباد تھے۔ ۲۲۵

ان کے کھول دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے کہ جیسے کوئی شکاری درندہ یکایک پنجرے یا بندھن سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ "وعدۂ حق پورا ہونے کا وقت قریب آ لگے گا" کا اشارہ صاف طور پر اس طرف ہے کہ یاجوج ماجوج کی یہ عالمگیر یورش آخری زمانہ میں ہوگی اور اس کے بعد جلدی ہی قیامت آ جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد اس معنی کو اور زیادہ کھول دیتا ہے جو مسلم نے حذیفہ بن اسید الغفاری کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو: دھواں، دجال، دابۃ الارض، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ ابن مریم کا نزول، یاجوج و ماجوج کی یورش، اور تین بڑے خسوف (زمین کا دھنسنا یا Land Slide)، ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں، پھر سب سے آخر میں یمن سے ایک سخت آگ اٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی (یعنی بس اس کے بعد قیامت آ جائے گی)۔ ایک اور حدیث میں یاجوج ماجوج کی یورش کا ذکر کر کے حضورؐ نے فرمایا اُس وقت قیامت اس قدر قریب ہوگی جیسے پورے پیٹوں کی حاملہ کہ نہیں کہہ سکتے کب وہ بچہ جن دے، رات کو یا دن کو (کالحامل المتم لا یدری اھلھا متی تفجؤھم بولدھا لیلا او نھارا)۔ لیکن قرآن مجید اور حدیث میں یاجوج و ماجوج کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ یہ دونوں متحد ہوں گے اور مل کر دنیا پر ٹوٹ پڑیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے قریب

زمانے میں یہ دونوں آپس ہی میں لڑجائیں اور پھر ان کی لڑائی ایک عالمگیر فساد کی موجب بن جائے [illegible]

یہود کی ذلّت و مسکنت

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کے بارے میں میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ تا قیامت ہے۔ اس میں فلسطین کی موجودہ اسرائیلی حکومت بن جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اوّل تو آیت تمام یہودی ملت کے بارے میں بحیثیتِ مجموعی ایک حکم لگاتی ہے، اس کے ایک ایک فرد پر یا افراد کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ اُس کیفیت کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہونے کے بعد سے قیامت تک ان پر من حیث المجموع دُنیا بھر میں جاری رہے گی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس طویل مدّت کے دوران میں کبھی کسی مختصر مدّت کے لیے بھی زمین کے کسی گوشے میں انہیں قوت و اقتدار نصیب نہ ہو۔ دراصل اِس آیت کو سمجھنے کے لیے یہودی قوم کی اُس تاریخ سے واقف ہونا ضروری ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے آج تک گزری ہے۔ اس تاریخ کو، اور اُن کی موجودہ حالت کو جو بحیثیت مجموعی دنیا میں آج بھی پائی جاتی ہے، بغور دیکھا جائے تو قرآن مجید کے ان ارشادات کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے:

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ۔ (الاعراف ۱۶۷)

"اور جب اعلان کر دیا تیرے رب نے کہ وہ قیامت تک ان پر کسی نہ کسی ایسے شخص کو مسلط کرتا رہیگا جو ان کو سخت عذاب دے گا۔"

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ۔ (آل عمران ۱۱۲)

"اُن پر ذلّت تھوپ دی گئی جہاں بھی وہ پائے جائیں بجز اس کے کہ کہیں ان کو اللہ کی طرف سے اور انسانوں کی طرف سے تحفظ کی ضمانت مل جائے۔"

پوری تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وقتاً فوقتاً دُنیا کے کسی گوشے میں کوئی نہ کوئی طاقت ایسی اُٹھتی رہی ہے جو یہودیوں کو خوب مارتی کھدیڑتی رہی۔ اور جہاں کہیں بھی وہ مجتمع رہے ہیں اپنے بل بُوتے پر نہیں بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے مواقع کی بنا پر کسی دوسرے ہی انسانی گروہ کی حمایت میں آجانے کی وجہ سے رہے ہیں۔ موجودہ یہودی ریاست بھی برطانیہ اور امریکہ کی حمایت ہی میں قائم ہوئی ہے اور باقی ہے۔ یہ حمایت جس وقت بھی ہٹے گی اس ریاست کا حشر دُنیا دیکھ لے گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو فنا نہیں کرنا چاہتا بلکہ نمونۂ عبرت بنا کر باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس پر مسلسل عذاب کا کوڑا برستا رہتا تو یہ کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس کے باقی رہنے کا یہ انتظام کر دیا ہے کہ کہیں وہ پٹتی جاتی ہے تو کہیں اُسے پناہ بھی مل جاتی ہے۔ اس طرح یہ ڈھائی ہزار برس سے لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ کی مصداق اِس دُنیا میں جیتے جا رہی ہے [illegible]

فصل ۲

حدیث میں پیشین گوئیاں

کامل امن کا دور

حضرت خباب کہتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپ خدا سے دعا نہیں فرماتے؟" یہ سن کر آپ کا چہرہ مبارک تمتما اٹھا اور آپ نے فرمایا، "تم سے پہلے جو اہل ایمان تھے ان پر اس سے زیادہ مظالم ہو چکے ہیں۔ ان کی ہڈیوں پر لوہے کی کنگھیاں گھسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر رکھ کر آرے چلائے جاتے تھے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا کہ ایک آدمی صنعاء سے حضر موت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہو گا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو (بخاری)۔ ۵۲۲۹

عرب و عجم پر غلبہ کی شرط

ابو طالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپ سے کہا "بھتیجے، یہ تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک منصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو تا کہ تمہارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔" پھر انہوں نے وہ بات حضورؐ کو بتائی جو سرداران قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا "چچا جان، میں تو ان کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہ مان لیں تو عرب ان کا تابع فرمان اور عجم ان کا باجگزار ہو جائے۔"

حضورؐ کے اس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا اریدھم علی کلمة واحدة یقولونھا تدین لھم بھا العرب وتؤدی الیھم بھا العجم الجزیة۔ دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: ادعوھم الی ان یتکلموا بکلمة تدین لھم بھا العرب ویملکون بھا العجم۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے ابو طالب کے بجائے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے

فرمایا "کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم۔ اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں "أرأیتم ان اعطیتکم کلمۃ تکلمتم بھا ملکتم بھا العرب ودانت لکم بھا العجم۔ ان لفظی اختلافات کے باوجود تمام کا مطلب یکساں ہے یعنی حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کروں جسے قبول کر کے تم عرب وعجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر بات ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمہاری بھلائی اس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اس میں کہ جس حالت میں تم پڑے ہو اسی میں تم کو پڑا رہنے دوں اور بس اپنی جگہ آپ ہی اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں"۔ [۲۲۹]

قریش کا سیاسی اقتدار

آپؐ نے پیش گوئی کر دی تھی کہ جب تک قریش اپنے اخلاق بلند رکھیں گے اور فی الجملہ دین کی علمبرداری کرتے رہیں گے، اور ان میں دو آدمی بھی مروان کار پائے جائیں گے ریاست انہی کو حاصل رہے گی۔

حضورؐ کا یہ اندازہ اس قدر صحیح تھا کہ تاریخ آپؐ کے بعد صدیوں تک اس کی صحت کا ثبوت دیتی رہی ہے قریش کے قبیلے کی زبردست مردم خیزی کا حال یہ تھا کہ خلافت راشدہ کے دور میں چاروں خلیفہ اسی نے فراہم کیے اور معلوم ہے کہ ان چاروں کی ٹکر کا کوئی آدمی فی الواقع اس وقت عرب میں نہ تھا۔ پھر اسی قبیلے نے عظیم الشان اموی سلطنت قائم کی۔ اسی نے عباسی سلطنت کو جنم دیا۔ اسی نے اسپین میں ایک زبردست حکومت کھڑی کر دی۔ اور اسی نے مصر میں دولت فاطمیہ کی تاسیس کی۔ [۲۳۰]

جہاد جاری رہے گا

"میری اُمت میں جہاد قیامت تک جاری رہے گا اور نہ کسی عادل کا عدل اسے ختم کر سکے گا، نہ کسی ظالم کا ظلم۔ —یہی اسپرٹ ہمیشہ تجدید اسلام کی تحریکوں کی محرک رہی ہے، اور اسی نے صالحین کو ماحول کی خوفناکیوں کے آگے جھک جانے سے روکا ہے۔ [۲۳۱]

مسلمانوں کا بگاڑ یہود ونصاریٰ کی طرح کا ہوگا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی جو حدیث میں حضورؐ نے فرمائی ہے، یہ ہے کہ مسلمان آخر کار یہود ونصاریٰ کے نقش قدم پر چل پڑیں گے اور جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا ہے یہ بھی قدم رکھیں گے حتیٰ کہ اگر ان میں کسی نے اپنی ماں سے زنا کی تو مسلمانوں میں بھی کوئی شخص اُٹھے گا جو اس فعل کا ارتکاب کرے گا۔ [۲۳۲]

لہ فاضل مؤلف نے حضورؐ کے ارشاد کو ایک دوسری روایت سے اخذ کر کے یُوں ذکر کیا ہے:

"آپؐ نے فرمایا ہے کہ تم بھی آخرکار پچھلی اُمتوں ہی کی روش پر چل کر رہو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم

مِلّت کی تاریخ مابعد کا خاکہ

اگرچہ یہ پیشین گوئیاں مُسلم، ترمذی، ابن ماجہ، مُستدرک وغیرہ کتابوں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں، مگر یہاں اس روایت کا نقل کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا جو امام شاطبی نے موافقات میں اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے منصبِ امامت میں نقل کی ہے:

ان اوّل دینکم نبوة و رحمة و تکون فیکم ماشاء الله ان تکون ثم یرفعها الله جلّ جلاله ثم تکون خلافة علی منهاج النبوة ماشاء الله ان تکون ثم یرفعها الله جل جلاله ثمّ تکون ملکا عاضاً فیکون ماشاء الله ان یکون ثم یرفعه الله جلّ جلاله۔ ثمّ تکون ملکا جبریة فتکون ماشاء الله ان تکون ثم یرفعها الله جلّ جلاله۔

ثم تکون خلافة علی منهاج النبوة تعمل فی الناس بسُنّة النبی و یلقی الاسلام بجرانه فی الارض یرضی عنها ساکن السماء و ساکن الارض لا تدع السماء من قطر الا صبّته مدرارًا و لا

"تمہارے دین کی ابتداء نبوّت اور رحمت سے ہے اور وہ تمہارے درمیان رہے گی جب تک اللہ چاہے گا پھر اللہ جل جلالہٗ اس کو اٹھا لے گا۔ پھر نبوّت کے طرز پر خلافت ہوگی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ اسے بھی اُٹھا لے گا۔ پھر بداطوار بادشاہی ہوگی اور جب تک اللہ چاہے گا رہے گی پھر اللہ اسے بھی اُٹھا لے گا۔

پھر جبری فرمانروائی ہوگی اور وہ بھی جب تک اللہ چاہے گا رہے گی۔ پھر اللہ اسے بھی اُٹھا لے گا۔

پھر وہی خلافت بطریقِ نبوّت ہوگی جو لوگوں کے درمیان نبی کی سُنّت کے مطابق عمل کرے گی اور اسلام زمین میں پاؤں جمائے گا۔ اس حکومت سے آسمان والے بھی خوش ہوں گے اور زمین والے بھی۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین

---

[۴۳] بھی اسی میں گُھس گے صحابہؓ نے پوچھا: یا رسُول اللہ، کیا یہود و نصاریٰ مُراد ہیں؟ آپؐ نے فرمایا اور کون؟"

نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد محض ایک تاریخ نہ تھا بلکہ اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے آپ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کی اُمتوں میں بگاڑ کن کن راستوں سے آیا اور کن کن شکلوں میں ظہور کرتا رہا ہے [۴۳۲]

لے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ "میرے بعد خلافت ۳۰ سال رہے گی، پھر بادشاہی ہوگی" اور یہ مدت ربیع الاوّل ۴۱ھ میں ختم ہوگئی جب کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوئے۔ (مُصنّف) [۴۳۳]

تقیء الأرض من بناتها و برکاتها شیئاً إلا أخرجته۔

"اپنے پیٹ کے سارے خزانے اُگل دے گی۔"

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اسناد کے اعتبار سے اس روایت کا کیا مرتبہ ہے مگر معنًی یہ ان تمام روایات سے مطابقت رکھتی ہے جو اس معنی میں وارد ہوئی ہیں۔ اس میں تاریخ کے پانچ مرحلوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے تین گزر چکے ہیں اور چوتھا اب گزر رہا ہے۔ آخر میں جس پانچویں مرحلہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے، تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ انسانی تاریخ تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انسانی ساختہ کے سارے "ازم" آزمائے جا چکے ہیں اور بُری طرح ناکام ہو رہے ہیں۔ آدمی کے لیے اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تھک ہار کر اسلام کی طرف رجوع کرے۔

اُمراء و حکام کا بگاڑ

أنّه ستکون بعدی أمراء من صدّقهم بکذبهم و أعانهم علی ظلمهم فلیس منّی و لست منه (نسائی، کتاب البیعہ، باب ۳۴)

"میرے بعد کچھ لوگ حکمران ہونے والے ہیں جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے، وہ مجھ سے نہیں اور میں اُس سے نہیں۔"

سیکون علیکم أئمۃ یملکون أرزاقکم یحدثونکم فیکذبونکم و یعملون فیسیئون العمل لا یرضون منکم حتیٰ تحسّنوا قبیحهم و تصدّقوا کذبهم فأعطوهم الحقّ ما رضوا به فإذا تجاوزوا فمن قتل علیٰ ذالک فهو شهید۔ (کنز العمال، ج ۶، ص ۶۷)

"عنقریب تم پر ایسے لوگ حاکم ہوں گے جن کے ہاتھ میں تمہاری روزی ہوگی۔ وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور کام کریں گے تو بُرے کام کریں گے۔ وہ تم سے اُس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی بُرائیوں کی تعریف اور ان کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرو۔ پس تم ان کے سامنے حق پیش کرو جب تک وہ اسے گوارا کریں۔ پھر اگر وہ اس سے تجاوز کریں تو جو شخص اس پر قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔"

سلسلۂ تجدیدِ دین

شرح حدیث مَنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا

یہی وہ چیز ہے جس کی خبر مُخبرِ صادق علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اُس حدیث میں دی ہے جو ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ:

إنّ اللّٰهَ یبعث لهٰذه الأُمّة علیٰ رأس کلّ مائة سنةٍ مَنْ یُّجدّدُ لَهَا دِیْنَهَا۔

"اللہ ہر صدی کے سر پر اس اُمّت کے لیے ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا جو اس کے لیے دین کو تازہ کریں گے۔"

مگر اس حدیث سے بعض لوگوں نے تجدید اور مجددِ دین کا بالکل ہی ایک غلط تصور اخذ کر لیا۔ انہوں نے علیٰ رأس کل مائۃ سے صدی کا آغاز یا اختتام مراد لے لیا اور مَن یجدد لہا کا مطلب یہ سمجھا کہ اس سے مراد لازماً کوئی ایک شخص ہے۔ اس بنا پر انہوں نے تلاش کرنا شروع کر دیا کہ اسلام کی پچھلی تاریخوں میں کون کون ایسے اشخاص ملتے ہیں جو ایک ایک صدی کے آغاز یا اختتام پر پیدا ہوئے یا مرے ہوں اور انہوں نے تجدید کا کام بھی کیا ہو۔ حالانکہ نہ رأس سے مراد سرا ہے اور نہ مَن کا مفہوم فردِ واحد تک محدود ہے۔ رأس کے معنی سر کے ہیں اور صدی کے سر پر کسی شخص کے اٹھائے جانے کا مطلب علامتی طور پر یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے علوم، افکار اور رفتارِ عمل پر نمایاں اثر ڈالے گا۔ اور مَن کا لفظ عربی زبان میں واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے مَن سے مراد ایک شخص بھی ہو سکتا ہے، بہت سے اشخاص بھی ہو سکتے ہیں، اور پورے پورے ادارے اور گروہ بھی ہو سکتے ہیں۔ حضورؐ نے جو خبر دی ہے اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ان شاء اللہ اسلامی تاریخ کی کوئی صدی ایسے لوگوں سے خالی نہ گزرے گی جو طوفانِ جاہلیت کے مقابلے میں اٹھیں گے اور اسلام کو اس کی اصلی روح اور صورت میں از سرِ نو قائم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ ضروری نہیں کہ ایک صدی کا مجدد ایک ہی شخص ہو۔ ایک صدی میں متعدد اشخاص اور گروہ یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام دنیائے اسلام کے لیے ایک ہی مجدد ہو۔ ایک وقت میں بہت سے ملکوں میں بہت سے آدمی تجدیدِ دین کے لیے سعی کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ شخص جو اس سلسلے کی کوئی خدمت انجام دے "مجدد" کے خطاب سے نوازا جائے۔ یہ خطاب تو صرف ایسے اشخاص ہی کو دیا جا سکتا ہے جنہوں نے تجدیدِ دین کے لیے کوئی بہت بڑا اور نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔[۲۳۷]

مسلمانوں میں تفرقہ کا ظہور

ایک حدیث میں ہے کہ "عنقریب میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے صرف ایک ناجی ہوگا، وہ جو میری اور میرے اصحاب کی پیروی کرے گا"

احادیث میں مسلمانوں کے اندر بہت سے فتنے پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے جس سے مقصود اہلِ ایمان کو فتنوں پر متنبہ کرنا اور ان سے بچنے کے لیے تاکید کرنا تھا۔[۲۳۸]

ظہورِ مہدی کے متعلق پیشین گوئیاں

ظہورِ مہدی کے متعلق جو روایات ہیں، ان کے متعلق ناقدینِ حدیث نے اس قدر سخت تنقید کی ہے کہ ایک گروہ سرے سے اس بات کا قائل ہی نہیں رہا ہے کہ امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ اسماء الرجال کی تنقید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث کے اکثر رواۃ شیعہ ہیں۔ تاریخ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر گروہ نے سیاسی و مذہبی اغراض کے لیے ان احادیث کو استعمال کیا ہے، اور اپنے کسی آدمی پر ان مذکورہ علامات کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے

روایات میں صحیح اور وضعی عنصر

اِن وجوہ سے میں اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نفسِ ظہورِ مہدی کی خبر کی حد تک تو یہ روایات صحیح ہیں لیکن تفصیل علامات کا بیشتر بیان غالباً وضعی ہے، اور اہلِ غرض نے شاید بعد میں اِن چیزوں کا اصل ارشادِ نبوی پر اضافہ کیا ہے مختلف زمانوں میں جن لوگوں نے مہدیؑ موعود ہونے کے جھوٹے دعوے کیے ہیں ان کے لٹریچر میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری فتنہ پردازی کے لیے مواد انہی روایات نے بہم پہنچایا ہے۔

حضورؐ کی پیشین گوئیوں کا انداز

میں نے جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں پر غور کیا ہے۔ ان کا انداز یہ نہیں ہوتا کہ کسی آنے والی چیز کی علامات و تفصیلات اس طریقے سے کبھی آپؐ نے بیان کی ہوں جس طرح ظہورِ مہدی کی احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ آپؐ بڑی بڑی اصولی علامات تو ضرور بیان فرما دیا کرتے تھے لیکن جزئی تفصیلات بیان کرنا آپؐ کا طریقہ نہ تھا۔[۲۳۹]

متعلقہ روایات کی ژولیدگی

لیکن جو لوگ ان روایات کو جمع کر کے ان کا باہمی مقابلہ کرتے ہیں اور ان میں بکثرت تعارضات پاتے ہیں، نیز جن کے سامنے بنی فاطمہ اور بنی عباس اور بنی اُمیّہ کی کشمکش کی پوری تاریخ ہے، اور وہ صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ اس کشمکش کے فریقوں میں سے ہر ایک کے حق میں متعدد روایات موجود ہیں، اور راویوں میں سے بھی اکثر و بیشتر وہ لوگ ہیں جن کا ایک نہ ایک فریق سے کھلا ہوا تعلق تھا، ان کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ ان روایات کی ساری تفصیلات کو صحیح تسلیم کر لیں جو احادیث میں منقول ہیں۔ مثلاً ان میں سے بعض میں "رایات السود

لہ اوّل تو خود لفظ "مہدی" پر غور کرنا چاہیے جو حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے مہدی کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنی ہدایت یافتہ کے ہیں۔ "ہادی" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ مہدی ہر وہ سردار، لیڈر اور امیر ہو سکتا ہے جو راہِ راست پر ہو۔ "المہدی" زیادہ سے زیادہ خصوصیت کے لیے استعمال ہوگا جس سے آنے والے کی کسی خاص امتیازی شان کا اظہار مقصود ہے اور وہ امتیازی شان حدیث میں اس طرح بیان کر دی گئی ہے کہ آنے والا خلافت علی منہاج النبوۃ کا نظام درہم برہم ہو جانے اور ظلم و جور سے زمین کے بھر جانے کے بعد از سرِ نو خلافت کو منہاجِ نبوت پر قائم کرے گا اور زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ بس یہی چیز ہے جس کی وجہ سے اس کو مخصوص و ممتاز کرنے کے لیے "مہدی" پر "ال" داخل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ مہدی کے نام سے دین میں کوئی خاص منصب قائم کیا گیا ہے جس پر ایمان لانا اور جس کی معرفت حاصل کرنا ویسا ہی ضروری ہو جیسا انبیاء پر ایمان لانا، اور اُس کی اطاعت بھی شرطِ نجات اور شرطِ اسلام و ایمان ہو۔ نیز اس خیال کے لیے بھی حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ مہدی کوئی امام معصوم ہوگا۔ دراصل یہ معصومیت غیر انبیاء کا تخیل ایک خاص شیعی تخیل ہے جس کی کوئی سند کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔[۲۴۰]

یعنی کالے جھنڈوں کا ذکر ہے، اور تاریخ سے معلوم ہے کہ کالے جھنڈے بنی عباس کا شعار تھے نیز یہ بھی تاریخ سے معلوم ہے کہ اس قسم کی احادیث کو پیش کر کر کے خلیفہ مہدی عباسی کو مہدی موعود ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔[۱۲۳]

مجددِ کامل کا مقام

"تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجددِ کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجددِ کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام الامام المہدی ہوگا جس کے بارے میں صاف پیشین گوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔

آج کل لوگ نادانی کی وجہ سے اس نام کو سن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ کسی آنے والے مردِ کامل کے انتظار نے جاہل مسلمانوں کے قوائے عمل کو سرد کر دیا ہے، اس لیے ان کی رائے یہ ہے کہ جس حقیقت کا غلط مفہوم لے کر جاہل لوگ بے عمل ہو جائیں وہ سرے سے حقیقت ہی نہ ہونی چاہیے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ تمام مذہبی قوموں میں کسی "مردِ از غیب" کی آمد کا عقیدہ پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ محض ایک وہم ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح پچھلے انبیاء نے بھی اگر اپنی قوموں کو یہ خوش خبری دی ہو کہ نوعِ انسانی کی دنیوی زندگی ختم ہونے سے پہلے ایک دفعہ اسلام ساری دنیا کا دین بنے گا اور انسان کے بنائے ہوئے سارے "ازموں" کی ناکامی کے بعد آخرکار تباہیوں کا مارا ہوا انسان اس "ازم" کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوگا جسے خدا نے بنایا ہے، اور یہ نعمت انسان کو ایک ایسے عظیم الشان لیڈر کی بدولت نصیب ہوگی جو انبیاء کے طریقہ پر کام کر کے اسلام کو اس کی صحیح صورت میں پوری طرح نافذ کر دے گا، تو آخر اس میں وہم کی کون سی بات ہے؟ بہت ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے کلام سے نکل کر یہ خبر دنیا کی دوسری قوموں میں بھی پھیلی ہو اور جہالت نے اس کی روح نکال کر اوہام کے لبادے اس کے گرد لپیٹ دیئے ہوں

مہدی کے متعلق مروّجہ تصور

مسلمانوں میں جو لوگ الامام المہدی کی آمد کے قائل ہیں وہ بھی اُن متجددین سے جو اس کے قائل نہیں ہیں، اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ و صوفیانہ وضع و قطع کے آدمی ہوں گے۔ تسبیح ہاتھ میں لیے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہوں گے۔ آتے ہی اَنا المہدی

اعلان کریں گے۔ علماء اور مشائخ کتابیں لیے ہوئے پہنچ جائیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے ان کے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کر کے انہیں شناخت کر لیں گے، پھر بیعت ہوگی اور اعلانِ جہاد کر دیا جائے گا۔ چھٹے چھٹائے ہوئے درویش اور سب پرانے طرز کے "بقیۃ السلف" ان کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے۔ تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لیے برائے نام چلانی پڑے گی، اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے ہوگا۔ پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے۔ جس کافر پر نظر ڈال دیں گے تڑپ کر بے ہوش ہو جائے گا اور محض بددعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائیں گے۔

مہدی کے متعلق مؤلف کا اندازہ

عقیدۂ ظہورِ مہدی کے متعلق عام لوگوں کے تصورات کچھ اسی قسم کے ہیں، مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھ کو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علومِ جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائلِ مہمّہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی سیاست، سیاسی تدبّر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکّہ جما دے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی "جدتوں" کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورشیں برپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا کہ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے، نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرے گا۔ بلکہ شاید اسے خود بھی اپنے مہدیِ موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی اور اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا۔

مہدویت دعوی کرنے کی چیز نہیں

جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، نبی کے سوا کسی کا یہ منصب نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے۔ مہدویت دعوی کرنے کی چیز نہیں، کر کے دکھا جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں، میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

مہدی کے کام کی نوعیت

مہدی کے کام کی نوعیت کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ بھی ان حضرات کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے اس کام میں کرامات و خوارق، کشوف و الہامات، اور چلّوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انقلابی لیڈر کو دنیا میں جس طرح شدید جدّوجہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے انہی مرحلوں سے مہدی کو بھی گزرنا ہوگا۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہبِ فکر (School of Thought

پیدا کرے گا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا، ایک زبردست تحریک اٹھائے گا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی، جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی، مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو اُلٹ کر پھینک دیگا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری رُوح کار فرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوجِ کمال پر پہنچ جائے گی جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے" اس کی حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہونگے اور زمین والے بھی، آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا، اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اُگل دے گی۔"

اگر یہ توقع صحیح ہے کہ ایک وقت میں اسلام تمام دُنیا کے افکار، تمدّن اور سیاست پر چھا جانے والا ہے تو ایسے عظیم الشان لیڈر کی پیدائش بھی یقینی ہے جس کی ہمہ گیر و پُرزور قیادت میں یہ انقلاب رُونما ہوگا۔ جن لوگوں کو ایسے لیڈر کے ظہور کا خیال سن کر حیرت ہوتی ہے مجھے ان کی عقل پر حیرت ہوتی ہے جب خدا کی اس خدائی میں لینن اور ہٹلر جیسے ائمۂ ضلالت کا ظہور ہو سکتا ہے تو آخر ایک امامِ ہدایت ہی کا ظہور کیوں مستبعد ہو؟[۲۲]

مسیح علیہ السلام کی آمدِ ثانی کے متعلق حضورؐ کی پیشین گوئیاں

متعلقہ احادیث

(۱) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیوشکنّ ان ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلًا فیکسر الصلیب و یقتل الخنزیر و یضع الحرب و یفیض المال حتی لایقبلہ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اُتریں گے تمہارے درمیان ابن مریمؑ حاکمِ عادل بن کر، پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور خنزیر کو ہلاک کر دیں گے[۱] اور

[۱] صلیب کو توڑ ڈالنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ دینِ عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسٰیؑ) کو صلیب پر "لعنت" کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفارہ بن گیا اور انبیاءؑ کی اُمتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی تھی کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا جو تمام انبیاءؑ کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسٰی علیہ السلام آ کر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دی، نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بنا تو عیسائی عقیدے کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے تو نہ اپنے پیروؤں کے لیے سؤر حلال کیا تھا اور نہ ان کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھیرایا تھا، تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

احدٌ حتّیٰ تکون السجدة الواحدة خیراً من الدنیا و ما فیہا (بخاری کتاب احادیث الانبیاء باب نزول عیسیٰ بن مریم، مسلم، باب بیان نزول عیسیٰ۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی نزول عیسیٰ، مسند احمد مرویات ابی ہریرہؓ)۔

جنگ کا خاتمہ کر دیں گے (دوسری روایت میں حرب کے بجائے جزیہ کا لفظ ہے یعنی جزیہ ختم کر دیں گے)[1] اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا اور (حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور) ایک سجدہ کر لینا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہوگا۔

(۲) ایک اور روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ان الفاظ میں ہے کہ لا تقوم الساعة حتی ینزل عیسی ابن مریم ...... "قیامت قائم نہ ہوگی جب تک نازل نہ ہولیں عیسیٰ ابن مریم ...." اور اس کے بعد وہی مضمون ہے جو اوپر کی حدیث میں بیان ہوا ہے (بخاری، کتاب المظالم، باب کسر الصلیب۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن باب فتنة الدجال)

(۳) عن ابی ھریرةؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم و امامکم منکم (بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ، مسلم، بیان نزول عیسیٰ، مسند احمد، مرویات ابی ہریرہؓ)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیسے ہو گے تم جبکہ تمہارے درمیان ابن مریمؑ اتریں گے اور تمہارا امام اس وقت خود تم میں سے ہوگا۔[2]

(۴) عن ابی ھریرةؓ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ینزل عیسی ابن مریم فیقتل الخنزیر و یمحوا الصلیب و تجمع له الصلوٰة و یعطی المال حتی لا یقبل و یضع الخراج و ینزل الروحاء فیحج منها او یعتمر او یجمعهما (مسند احمد، مسند ابی ہریرہؓ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ ابن مریمؑ نازل ہوں گے پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو مٹا دیں گے اور ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا اور وہ خراج ساقط کر دیں گے اور روحاء کے مقام

---

[1] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ملتوں کے اختلافات ختم ہو کر سب لوگ ایک ملت اسلام میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح نہ جنگ ہوگی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اسی بات پر آگے احادیث نمبر ۵، ۲۱ دلالت کرتی ہیں۔

[2] یعنی نماز میں حضرت عیسیٰؑ امامت نہیں کرائیں گے بلکہ مسلمانوں کا جو امام پہلے سے ہوگا اسی کے پیچھے وہ نماز پڑھیں گے۔

[3] مدینہ سے ۳۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

ابی ہریرۃ مسلم کتاب الحج۔ باب جواز التمتع فی الحج والقران۔

پر نزول کریں گے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے، یا دونوں کو جمع کریں گے[1]۔ راوی کو شک ہے کہ حضورؐ نے ان میں سے کونسی بات فرمائی تھی۔"

(۵) عن ابی هريرة (بعد ذكر خروج الدجال) فبينما هم يعدون للقتال يسوون الصفوف اذا اقيمت الصلوة فينزل عيسى ابن مريم فامّهم فاذا رآه عدو الله يذوب كما يذوب الملح في الماء فلو تركه لانذاب حتى يهلك ولكن يقتله الله بيده فيريهم دمه في حربته (مشكوة كتاب الفتن باب الملاحم بحوالہ مسلم)۔

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے (دجال کے خروج کا ذکر کرنے کے بعد حضورؐ نے فرمایا) اس اثناء میں کہ مسلمان اس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے صفیں باندھ رہے ہوں گے اور نماز کے لئے تکبیر اقامت کہی جا چکی ہوگی کہ عیسیٰ ابن مریمؑ نازل ہو جائیں گے اور نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ اور اللہ کا دشمن (یعنی دجال) ان کو دیکھتے ہی اس طرح گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام اس کو اس کے حال ہی پر چھوڑ دیں تو وہ آپ ہی گھل کر مر جائے۔ مگر اللہ اس کو ان کے ہاتھ سے قتل کرائے گا اور وہ اپنے نیزے میں اس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔"

(۶) عن ابي هريرة ان النبي صلى الله عليه وسلم قال ليس بيني وبينه نبي (يعني عيسى) وانه نازل فاذا رأيتموه فاعرفوه رجل مربوع الى الحمرة والبياض بين ممصرتين كان رأسه يقطر وان لم يصبه بلل فيقاتل الناس على الاسلام فيدق الصليب ويقتل الخنزير ويضع الجزية ويهلك الله في زمانه الملل كلها الا الاسلام ويهلك المسيح الدجال فيمكث في الارض اربعين سنة ثم يتوفى فيصلي عليه المسلمون (ابوداؤد)۔

"ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے اور ان (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اترنے والے ہیں۔ پس جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا، وہ ایک میانہ قد آدمی ہیں، رنگ مائل بسرخی و سپیدی ہے، دو زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر کے بال ایسے ہوں گے گویا اب ان سے پانی ٹپکنے والا ہے، حالانکہ وہ بھیگے ہوئے نہ ہوں گے، وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے، صلیب کو پاش پاش کر دیں گے۔ خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، اور اللہ

---

[1] واضح رہے کہ اس زمانے میں جن صاحب کو مثیل مسیح قرار دیا گیا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں نہ حج کیا اور نہ عمرہ۔

کتاب الملاحم باب خروج الدجال ، مسند احمد مرویات ابوہریرہؓ)۔

ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام مذہبوں کو مٹا دیگا اور وہ مسیح دجّال کو ہلاک کر دیں گے ، اور زمین میں وہ چالیس سال ٹھیریں گے پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے "۔

(۷) عن جابر بن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ... فینزل عیسی بن مریم علیہ السلام فیقول امیرھم تعال فصلّ فیقول لا ان بعضکم علی بعض امراء تکرمۃ اللہ ھذہ الامۃ (مسلم باب نزول عیسیٰ ابن مریم، مسند احمد سلسلہ مرویات جابر بن عبد اللہ)۔

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ ... پھر عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ آئیے، آپ نماز پڑھائیے ، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں ، تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو* یہ وہ اس عزت کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اس اُمت کو دی ہے "۔

(۸) عن جابر بن عبد اللہ (فی قصۃ ابن صیاد) فقال عمر بن الخطاب ائذن لی فاقتلہ یا رسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یکن ھو فلست صاحبہ انما صاحبہ عیسی ابن مریم علیہ الصلوٰۃ و السلام ، وان لا یکن ھو فلیس لک ان تقتل رجلا من اھل العھد (مشکوٰۃ ۔کتاب الفتن باب قصۃ ابن صیاد ، بحوالہ شرح السنۃ بغوی)۔

"جابر بن عبد اللہ (قصۂ ابن صیاد کے سلسلے میں) روایت کرتے ہیں کہ پھر عمرؓ بن خطاب نے عرض کیا، یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسے قتل کر دوں اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ وہی شخص (یعنی دجّال) ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو بلکہ اسے تو عیسیٰ ابن مریم ہی قتل کریں گے۔ اور اگر یہ وہ شخص نہیں ہے تو تمہیں اہل عہد (یعنی ذمیوں) میں سے ایک آدمی کو قتل کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے"۔

(۹) عن جابر بن عبد اللہ (فی قصۃ الدجال) فاذا ھم بعیسی ابن مریم علیہ السلام فتقام الصلوٰۃ فیقال لہ تقدّم یا روح اللہ فیقول لیتقدم امامکم فلیصلّ بکم ۔ فاذا صلی صلوٰۃ الصبح خرجوا الیہ قال فحین یری

"جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ دجّال کا قصہ بیان کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت یکایک عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام مسلمانوں کے درمیان آ جائیں گے ۔ پھر نماز کھڑی ہوگی اور ان سے کہا جائے گا کہ اے روح اللہ آگے بڑھیے ، مگر وہ

---

* یعنی تمہارا امیر خود تم ہی میں سے ہونا چاہیے ۔

الكذاب ينماث كما ينماث الملح في الماء فيمشي إليه فيقتله حتى أن الشجر والحجر ينادي يا روح الله هذا اليهودي فلا يترك ممن كان يتبعه أحداً إلا قتله ۔ (مسند احمد بسلسلۂ روایات جابر بن عبد اللہ) ۔

کہیں گے کہ نہیں تمہارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے وہی نماز پڑھائے۔ پھر صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمان دجال کے مقابلے پر نکلیں گے۔ فرمایا جب وہ کذاب حضرت عیسیٰ کو دیکھے گا تو گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھیں گے اور اُسے قتل کر دیں گے اور حالت یہ ہو گی کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے کہ اے روح اللہ یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ دجال کے پیروؤں میں سے کوئی نہ بچے گا جسے وہ (یعنی عیسیٰ) قتل نہ کر دیں۔

(۱۰) عن النواس بن سمعان (في قصة الدجال) فبينا هو كذلك إذ بعث الله المسيح ابن مريم فينزل عند المنارة البيضاء شرقي دمشق بين مهرودتين واضعاً كفيه على أجنحة ملكين إذا طأطأ رأسه قطروا إذا رفعه تحدر منه جمان كاللؤلؤ فلا يحل لكافر يجد ريح نفسه إلا مات ونفسه ينتهي إلى حيث ينتهي طرفه فيطلبه حتى يدركه بباب لُدّ فيقتله ۔ (مسلم، ذکر الدجال۔ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب فی فتنة الدجال۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنة الدجال) ۔

حضرت نواس بن سمعان کلابی (قصۂ دجال بیان کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں: اس اثناء میں کہ دجال یہ کچھ کر رہا ہوگا، اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو بھیج دیگا اور وہ دمشق کے مشرقی حصے میں، سفید مینار کے پاس، زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے، دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں، اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی۔ اور وہ ان کی حد نظر تک جائیگی۔ وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابن مریم دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ[1] کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔

(۱۱) عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله ﷺ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

۱؎ واضح رہے کہ لُدّ (Lydda) فلسطین میں ریاست اسرائیل کے دار السلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہودیوں نے وہاں بہت بڑا ہوائی اڈا بنا رکھا ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم: یخرج الدجال فی امتی فیمکث اربعین (لا ادری اربعین یوماً او اربعین شھراً او اربعین عاماً) فیبعث اللہ عیسی ابن مریم کانہ عروۃ بن مسعود فیطلبہ فیھلکہ ثم یمکث الناس سبع سنین لیس بین اثنین عداوۃ (مسلم، ذکر الدجال)

علیہ وسلم نے فرمایا: دجال میری امت میں نکلے گا اور چالیس (میں نہیں جانتا کہ چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال) رہے گا۔ پھر اللہ عیسیٰ ابن مریم کو بھیجے گا۔ ان کا حلیہ عروہ بن مسعود (ایک صحابی) سے مشابہ ہوگا۔ وہ اس کا پیچھا کریں گے اور اسے ہلاک کر دیں گے۔ پھر سات سال تک لوگ اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان بھی عداوت نہ ہوگی۔

(۱۴) عن حذیفۃ بن اسید الغفاری قال اطلع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علینا ونحن نتذاکر فقال ما تذاکرون قالوا نذکر الساعۃ قال انھا لن تقوم حتی ترون قبلھا عشر آیات فذکر الدخان والدجال والدابۃ وطلوع الشمس من مغربھا ونزول عیسی ابن مریم ویاجوج وماجوج وثلاثۃ خسوف، خسف بالمشرق وخسف بالمغرب، وخسف بجزیرۃ العرب وآخر ذلک نار تخرج من الیمن تطرد الناس الی محشرھم (مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعۃ، ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب امارات الساعۃ)۔

حذیفہ بن اسید الغفاری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مجلس میں تشریف لائے اور ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ آپ نے پوچھا کیا بات ہو رہی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ فرمایا وہ ہرگز قائم نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے دس نشانیاں ظاہر نہ ہو جائیں۔ پھر آپ نے وہ دس نشانیاں یہ بتائیں: (۱) دھواں (۲) دجال (۳) دابۃ الارض (۴) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا (۵) عیسیٰ ابن مریم کا نزول (۶) یاجوج ماجوج (۷) تین بڑے خسف، ایک مشرق میں (۸) دوسرا مغرب میں (۹) تیسرا جزیرۃ العرب میں (۱۰) سب سے آخر میں ایک زبردست آگ جو یمن سے اٹھے گی اور لوگوں کو ارض محشر کی طرف ہانکے لے جائے گی۔

(۱۵) عن ثوبان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ثوبان روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا "میری امت

---

۱ یہ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاص کا اپنا قول ہے۔

۲ زمین کا دھنس جانا یا and Slide

عصابتان من امتی احرزهما الله تعالیٰ من النار، عصابة تغزو الهند، و عصابة تكون مع عیسی ابن مریم علیه السلام (نسائی، کتاب الجہاد، مسند احمد بسلسلہ روایت ثوبان)۔

کے دو لشکر ایسے ہیں جن کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچا لیا۔ ایک وہ لشکر جو ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا وہ جو عیسیٰ ابن مریمؑ کے ساتھ ہوگا۔

(۱۴) عن مجمع ابن جارية قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول يقتل ابن مريم الدجال بباب لد (مسند احمد، ترمذی، ابواب الفتن)۔

"مجمع بن جاریہ انصاری کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ابن مریمؑ دجال کو لُد کے دروازے پر قتل کریں گے۔"

(۱۵) عن ابی امامة الباهلی (فی حديث طويل فی ذكر الدجال) فبينما امامهم قد تقدم يصلی بهم الصبح اذ نزل عليهم عيسى ابن مريم فرجع ذالك الامام ينكص يمشی القهقرى ليتقدم عيسى فيضع عيسى يده بين كتفيه ثم يقول له تقدم فصل فانها لك اقيمت فيصلی بهم امامهم فاذا انصرف قال عيسى عليه السلام افتحوا الباب فيفتح ووراءه الدجال ومعه سبعون الف يهودی كلهم ذو سيف محلى وساج فاذا نظر اليه الدجال ذاب كما يذوب الملح فی الماء وينطلق هاربا ويقول عيسى ان لی فيك ضربة لن تسبقنی بها فيدركه عند باب اللد الشرقی فيقتله فيهزم الله اليهود ..... وتملأ الارض من المسلم كما يملأ الاناء من الماء وتكون الكلمة واحدة فلا يعبد الا الله تعالى (ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجال)۔

ابو امامہ باہلی (ایک طویل حدیث میں دجال کا ذکر کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں کہ عین اس وقت جب مسلمانوں کا امام صبح کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکا ہوگا عیسیٰ ابن مریمؑ ان پر اتر آئیں گے امام پیچھے ہٹے گا تاکہ عیسیٰؑ آگے بڑھیں، مگر عیسیٰؑ اس کے شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ تم ہی نماز پڑھاؤ کیونکہ یہ تمہارے لیے ہی کھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہی نماز پڑھائے گا۔ سلام پھیرنے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ دروازہ کھولو، چنانچہ وہ کھولا جائے گا باہر دجال ۷۰ ہزار مسلح یہودیوں کے ساتھ موجود ہوگا جونہی کہ عیسیٰ علیہ السلام پر اس کی نظر پڑے گی وہ اس طرح گھلنے لگے گا جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے اور وہ بھاگ نکلے گا عیسیٰؑ کہیں گے میرے پاس تیرے لیے ایک ایسی ضرب ہے جس سے تو بچ کر نہ جا سکے گا۔ پھر وہ اسے لُد کے مشرقی دروازہ پر جا لیں گے اور اللہ یہودیوں کو ہرا دے گا . . . اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی جیسے برتن پانی سے بھر جاتے ہیں۔ سب دنیا کا کلمہ ایک ہو جائے گا اور

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔"

(۱۶) عن عثمان بن ابی العاص قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ۔ ۔ ۔ و ینزل عیسی ابن مریم علیہ السلام عند صلوۃ الفجر فیقول لہ امیرھم یا روح اللہ تقدم صلّ، فیقول ھذہ الامۃ بعضھم امراء علی بعض فیتقدم امیرھم فیصلی، فاذا قضی صلوتہ اخذ عیسی حربتہ فیذھب نحو الدجال فاذا یراہ الدجال ذاب کما یذوب الرصاص فیضع حربتہ بین ثندوتہ فیقتلہ و ینھزم اصحابہ فلیس یومئذ شیٔ یواری منھم احدا حتی ان الشجر لیقول یا مومن ھذا کافر ویقول الحجر یا مومن ھذا کافر (مسند احمد، طبرانی، حاکم)۔

"عثمان بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے ۔ ۔ ۔ اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام فجر کی نماز کے وقت اتر آئیں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ اے روح اللہ! آپ نماز پڑھائیے۔ وہ جواب دیں گے کہ اس امت کے لوگ خود ہی ایک دوسرے پر امیر ہیں تب مسلمانوں کا امیر آگے بڑھ کر نماز پڑھائے گا پھر نماز سے فارغ ہو کر عیسیٰ اپنا حربہ لے کر دجال کی طرف چلیں گے۔ وہ جب ان کو دیکھے گا تو اس طرح پگھلنے لگے گا جیسے سیسہ پگھلتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنے حربہ سے اس کو ہلاک کر دیں گے اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگیں گے مگر کہیں انہیں چھپنے کو جگہ نہ ملے گی حتیٰ کہ درخت پکاریں گے اے مومن، یہ کافر یہاں موجود ہے اور پتھر پکاریں گے کہ اے مومن، یہ کافر یہاں موجود ہے۔"

(۱۷) عن سمرۃ بن جندب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث طویل، فیصبح فیھم عیسی ابن مریم فیھزمہ اللہ وجنودہ حتی ان اجذم الحائط و اصل الشجر لینادی یا مومن ھذا کافر یستتر بی فتعال اقتلہ۔ (مسند احمد، حاکم)۔

"سمرہ بن جندب ایک طویل حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: پھر صبح کے وقت مسلمانوں کے درمیان عیسیٰ ابن مریم آ جائیں گے اور اللہ دجال اور اس کے لشکروں کو شکست دے گا یہاں تک کہ دیواریں اور درختوں کی جڑیں پکار اٹھیں گی کہ اے مومن، یہ کافر میرے پیچھے چھپا ہوا ہے، آ اور اسے قتل کر۔"

(۱۸) عن عمران بن حصین ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تزال طائفۃ من امتی علی الحق ظاھرین علی من ناواھم

"عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا موجود رہے گا جو حق پر قائم اور مخالفین پر بھاری

حتى يأتي أمر الله تبارك وتعالى وينزل عيسى ابن مريم عليه السلام (مسند احمد)۔

ہوگا یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فیصلہ آجائے اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نازل ہو جائیں۔"

(۲۰) عن عائشة (في قصة الدجال) فينزل عيسى عليه السلام فيقتله ثم يمكث عيسى عليه السلام في الأرض أربعين سنة إماماً عادلاً وحكماً مقسطاً (مسند احمد)۔

"حضرت عائشہؓ (دجال کے قصے میں) روایت کرتی ہیں: پھر عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں ایک امامِ عادل اور حاکمِ منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔"

(۲۱) عن سفينة مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم (في قصة الدجال) فينزل عيسى عليه السلام فيقتله الله تعالى عند عقبة أفيق۔ (مسند احمد)۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سفینہ (دجال کے قصے میں) روایت کرتے ہیں: پھر عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دجال کو افیق[1] کی گھاٹی کے قریب ہلاک کر دے گا۔"

(۲۲) عن حذيفة (في ذكر الدجال) فلما قاموا يصلون نزل عيسى ابن مريم إمامهم فصلى بهم فلما انصرف قال هكذا أفرجوا بيني وبين عدو الله ... ويسلط الله عليهم المسلمين فيقتلونهم حتى إن الشجر والحجر لينادي يا عبد الله يا عبد الرحمن يا مسلم هذا اليهودي فاقتله فيفنيهم الله تعالى ويظهر المسلمون فيكسرون الصليب ويقتلون الخنزير ويضعون الجزية (مستدرک حاکم، مسلم نے بھی یہ روایت

"حضرت حذیفہ بن یمان (دجال کا ذکر کرتے ہوئے) بیان کرتے ہیں: "پھر جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوں گے تو ان کی آنکھوں کے سامنے عیسیٰ ابن مریم اتر آئیں گے، اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے پھر سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے کہیں گے کہ میرے اور اس دشمنِ خدا کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔۔۔ اور اللہ دجال کے ساتھیوں پر مسلمانوں کو مسلط کر دے گا اور مسلمان انہیں خوب ماریں گے یہاں تک کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے کہ اے عبداللہ، اے عبدالرحمٰن، اے مسلمان، یہ رہا ایک یہودی، مار اسے۔ اس طرح

---

[1] افیق، جسے آج کل فیق کہتے ہیں، شام اور اسرائیل کی سرحد پر موجودہ ریاست شام کا آخری شہر ہے۔ اس کے آگے مغرب کی جانب چند میل کے فاصلے پر طبریہ (Tiberias) کی جھیل ہے جس میں سے دریائے اردن نکلتا ہے۔ اور اس کے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے درمیان ایک نشیبی راستہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ دو ہزار فیٹ گہرائی میں اتر کر اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے دریائے اردن جھیل طبریہ سے نکلتا ہے۔ اسی پہاڑی راستے کو عقبۂ افیق (افیق کی گھاٹی) کہتے ہیں۔

اختصار کے ساتھ آئی ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری جلد ۶ ص ۴۹۳ میں اسے صحیح قرار دیا ہے)۔

اللہ ان کو فنا کر دے گا اور مسلمان غالب ہوں گے اور صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے اور جزیہ ساقط کر دیں گے۔"

یہ جملہ ۲۱ روایات ہیں جو ۱۴ صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے لیکن طوالت کلام سے بچنے کے لیے ہم نے ان سب کو نقل نہیں کیا ہے بلکہ صرف وہ روایتیں لے لی ہیں جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں۔

مثیلِ مسیحؑ کا تصوّر باطل ہے

جو شخص بھی ان احادیث کو پڑھے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی "مسیح موعود" یا "مثیلِ مسیح" یا "بروزِ مسیح" کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ ان میں اس امر کی گنجائش ہے کہ کوئی شخص اس زمانے میں کسی ماں کے پیٹ اور کسی باپ کے نطفے سے پیدا ہو کر یہ دعویٰ کر دے کہ میں ہی وہ مسیحؑ ہوں جس کے آنے کی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں ان عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں جو آپ سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ۲۴۳

دجّال اور اُس کا ظہور

ظہورِ دجّال کے زمانہ کا تعیّن

دجال کے متعلق جتنی احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، ان کے مضمون پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ کو اللہ کی طرف سے اس معاملہ میں جو علم ملا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ ایک بڑا دجّال ظاہر ہونے والا ہے، اس کی یہ اور یہ صفات ہوں گی، اور وہ ان ان خصوصیات کا حامل ہوگا۔ لیکن یہ آپؐ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا، کہاں ظاہر ہوگا، اور یہ کہ آیا وہ آپؐ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپؐ کے بعد کسی بعید زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے۔

حضورؐ کے مختلف قیاسات

ان اُمور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں ان کا اختلاف مضمون خود بھی یہ ظاہر کرتا ہے اور حضورؐ کے طرزِ کلام سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ آپؐ نے بربنائے وحی نہیں بلکہ بربنائے ظن و قیاس ارشاد فرمائی ہیں۔ کبھی آپؐ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ دجّال خراسان سے اُٹھے گا، کبھی یہ کہ اصفہان سے، اور کبھی یہ کہ شام و عراق کے درمیانی علاقہ سے۔ پھر کبھی آپؐ نے ابن صیّاد نامی اُس یہودی بچے پر جو مدینہ میں (غالباً ۲ یا ۳ ھ میں) پیدا ہوا تھا یہ

شبہ کیا کہ شاید یہی دجال ہو اور آخری روایت یہ ہے کہ ۹ھ میں جب فلسطین کے ایک عیسائی راہب (تمیم داری) نے آکر اسلام قبول کیا اور آپؐ کو یہ قصہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ سمندر میں (غالباً بحیرۂ روم یا بحیرۂ عرب) میں سفر کرتے ہوئے ایک غیر آباد جزیرے میں پہنچے اور ان کی ملاقات ایک عجیب شخص سے ہوئی اور اس نے انہیں بتایا کہ وہ خود ہی دجال ہے، تو آپؐ نے اُن کے بیان کو بھی غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نہ سمجھی، البتہ اس پر اپنے شک کا اظہار فرمایا کہ اس بیان کی رُو سے دجال بحیرۂ روم یا بحرِ عرب میں ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ وہ مشرق سے ظاہر ہوگا۔

حضورؐ کے ارشادات کے دو اجزاء

ان مختلف روایات پر جو شخص بھی مجموعی نظر ڈالے گا وہ اگر علمِ حدیث اور اُصولِ دین سے کچھ بھی واقف ہو تو اُسے یہ سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ اس معاملہ میں حضورؐ کے ارشادات دو اجزاء پر مشتمل ہیں:-

جزوِ اوّل یہ کہ دجال آئے گا، ان صفات کا حامل ہوگا اور یہ فتنے برپا کرے گا۔ یہ بالکل یقینی خبریں ہیں جو آپؐ نے اللہ کی طرف سے دی ہیں۔ ان میں کوئی روایت دوسری روایت سے مختلف نہیں ہے۔

جزوِ دوم کی جداگانہ حیثیت

جزوِ دوم یہ کہ دجال کب اور کہاں ظاہر ہوگا اور وہ کون شخص ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ روایات مختلف ہیں بلکہ اکثر روایات میں شک اور شبہ اور گمان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی مروی ہیں۔ مثلاً ابنِ صیاد کے متعلق آپؐ کا حضرت عمرؓ سے یہ فرمانا کہ "اگر دجال یہی ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو۔ اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو تمہیں ایک معاہد کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے" یا مثلاً ایک حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد کہ "اگر وہ میری زندگی میں آ گیا تو میں حجت سے اس کا مقابلہ کروں گا ورنہ میرے بعد میرا رب تو ہر مومن کا حامی و ناصر ہے ہی۔"

اس دوسرے جز کی دینی اور اصولی حیثیت ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی جو پہلے جز کی ہے۔ جو شخص اس کی بھی تمام تفصیلات کو اسلامی عقائد میں شمار کرتا ہے وہ غلطی کرتا ہے بلکہ اس کے ہر حصے کی صحت کا دعویٰ کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ابنِ صیاد پر آپؐ کو شبہ ہوا تھا کہ شاید وہی دجال ہو، اور حضرت عمرؓ نے تو قسم بھی کھائی تھی کہ یہی دجال ہے، مگر بعد میں وہ مسلمان ہوا، حرمین میں رہا، حالتِ اسلام میں مرا اور اس کی نمازِ جنازہ مسلمانوں نے پڑھی۔ اب اس کی کیا گنجائش باقی رہ گئی کہ آج تک ابنِ صیاد پر دجال ہونے کا شبہ کیا جاتا رہے؟ تمیمؓ داری کے بیان کو اس وقت تقریباً صحیح سمجھا گیا تھا، مگر کیا ساڑھے تیرہ سو برس تک بھی اس شخص کا ظاہر نہ ہونا جسے حضرت تمیمؓ نے جزیرے میں محبوس دیکھا تھا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس نے اپنے دجال ہونے کی جو خبر حضرت تمیمؓ کو دی تھی وہ صحیح نہ تھی؟ حضورؐ کو اپنے زمانہ میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجال آپؐ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے یا آپؐ کے بعد کسی قریبی زمانہ میں ظاہر ہو۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں اور ابھی تک دجال

نہیں آیا ہے۔ اب اِن چیزوں کو اس طرح نقل و روایت کیے جانا کہ گویا یہ بھی اسلامی عقائد ہیں، نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی ہے اور نہ اسے حدیث ہی کا صحیح فہم کہا جا سکتا ہے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اس قسم کے معاملات میں اگر کوئی بات نبی کے قیاس یا گمان یا اندیشے کے مطابق ظاہر نہ ہو تو یہ اس کے منصب نبوت میں ہرگز قادح نہیں ہے۔ نہ اس سے عصمتِ انبیاء کے عقیدے پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ ایسی چیزوں پر ایمان لانے کے لیے شریعت نے ہم کو مکلّف کیا ہے۔ اس اُصولی حقیقت کو تابیرِ نخل والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم خود واضح فرما چکے ہیں۔ ۳۴۲

حضورؐ کی اپنی تصریحات سے رہنمائی

یہ امر کہ حضورؐ کی کون سی بات ظن یا ذاتی رائے پر مبنی ہے اور کون سی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم پر، اس کا اظہار بسا اوقات حضورؐ کی اپنی تصریحات سے ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات دوسرے قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً یہی احادیث جو دجّال کے متعلق وارد ہوئی ہیں، ان میں یہ بات حضورؐ کی اپنی ہی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ کو اس کے مقام، زمانے اور شخصیت کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم نہیں دیا گیا تھا۔ ابنِ صیّاد کے متعلق آپؐ کو اتنا قوی شبہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے آپؐ کی موجودگی میں قسم کھا کر اسے دجّال قرار دیا اور آپؐ نے اس کی تردید نہ کی، مگر جب انہوں نے اس کے قتل کی اجازت مانگی تو آپؐ نے فرمایا: ان یکنہ فلن تسلط علیہ وان لم یکنہ فلا خیر لك فی قتلہ "اگر یہ وہی ہے تو تم اس پر قابو نہ پا سکو گے اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو اس کے قتل میں تمہارے لیے کوئی بھلائی نہیں" (مسلم۔ ذکر ابن صیّاد)۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ نے دجّال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ان یخرج وانا فیکم فانا حجیجہ دونکم وان یخرج ولست فیکم فامرؤ حجیج نفسہ واللہ خلیفتی علیٰ کل مسلم "اگر وہ میری موجودگی میں نکلے تو تمہاری طرف سے میں اس کا مقابلہ کروں گا، اور اگر وہ ایسے زمانے میں نکلے جب میں تمہارے درمیان موجود نہ ہوں تو ہر آدمی اپنی طرف سے خود ہی اس کا مقابلہ کرے اور اللہ میرے پیچھے ہر مسلم کا حامی ہے" (مسلم، ذکر الدجّال)۔ تمیم داریؓ نے اپنے ایک بحری سفر میں دجّال سے اپنی ملاقات کا قصہ جب آپؐ کو سنایا تو اس کی بھی آپؐ نے تصدیق یا تکذیب نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ اعجبنی حدیث تمیم انہ وافق الذی کنت احدثکم عنہ، "مجھے تمیمؓ کا بیان پسند آیا، وہ موافقت رکھتا ہے اس بات سے جو میں دجّال کے متعلق تم سے بیان کرتا تھا۔" پھر آپؐ نے اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمایا الا انہ فی بحر الشام او بحر الیمن، لا بل من قبل المشرق "مگر وہ بحرِ شام یا بحرِ یمن میں ہے نہیں بلکہ مشرق کی جانب ہے" (مسلم، قصۃ الجساسہ)۔ یہ سب روایات اپنا مفہوم خود واضح کر رہی ہیں۔ ۳۴۳

حضرت عمّار بن یاسرؓ کے قتل کی پیشین گوئی

حضرت عمّارؓ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد صحابہؓ میں مشہور و معروف تھا، اور بہت سے صحابیوںؓ نے اس کو حضورؐ کی زبانِ مبارک سے سُنا تھا کہ تقتلك الفئۃ الباغیۃ "تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا" (مسند احمد، بخاری،

مسلم، ترمذی، نسائی، طبرانی، بیہقی، مسند احمد، ابوداؤد طیالسی وغیرہ کتب حدیث میں حضرات ابوسعید خدری، ابوقتادہ انصاری، اُمّ سلمہ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابوہریرہ، عثمان بن عفان، حذیفہ، ابوایوب انصاری، ابورافع، خزیمہ بن ثابت، عمرو بن العاص، ابوالیسر، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم اور متعدد دوسرے صحابہؓ سے اس مضمون کی روایات منقول ہوئی ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں بھی یہ حدیث کئی سندوں سے نقل کی ہے۔

ابن عبدالبر الاستیعاب میں لکھتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر آثار یہ بات منقول ہے کہ عمار بن یاسر کو باغی گروہ قتل کرے گا اور یہ صحیح ترین احادیث میں سے ہے۔"[۲۴۶]

قربِ قیامت کی دس نشانیاں

مسلم میں حذیفہ بن اسید الغفاری کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ دھواں۔ دجال۔ دابۃ الارض۔ مغرب سے سورج کا طلوع۔ عیسیٰ بن مریم کا نزول۔ یاجوج ماجوج کی یورش اور تین بڑے خسوف (زمین کا دھنسنا یا Land Slide)، ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں۔ پھر سب سے آخر میں یمن سے ایک سخت آگ اُٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی (یعنی بس اس کے بعد قیامت آجائے گی)۔ ایک اور حدیث میں یاجوج و ماجوج کی یورش کا ذکر کرکے حضورؐ نے فرمایا "اس وقت قیامت اس قدر قریب ہوگی جیسے پورے پیٹوں کی حاملہ، کہ نہیں کہہ سکتے کب وہ بچہ جن دے، رات کو یا دن کو، کالحامل المتم لا یدری اہلہا متی تفجؤہم بولدہا لیلاً او نہاراً"۔[۲۴۷]

باب ۱۲

قرآن اور حضورؐ سے متعلق

مستشرقین کی علمی خیانتیں

[اسلام، قرآن اور سیرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مستشرقین نے جو کام کیا ہے اس میں بے شمار لغویات اور نامعقول باتیں سامنے آئی ہیں، جنہیں تحقیق کے خوبصورت نام سے علمی حقائق کی حیثیت دے کر پھیلایا گیا ہے۔ ان نام نہاد حقائق کے دائرے میں —— ولیم میور جیسے متعصب مصنفین سے لے کر منٹگمری واٹ جیسے معتدل مزاج اہل قلم تک —— ایسی ایسی مضحکہ انگیز باتیں اسلام اور نبی اکرم کے متعلق پائی جاتی ہیں کہ جن سے آگاہ ہو جانے والے منصف مزاج قارئین کی نگاہ میں مستشرقین کے سارے علمی کارناموں کی وقعت ختم ہو جاتی ہے۔ ان شاندار علمی تحقیقی کارناموں کا ایک مقصد تو یورپ صلیبیہ کی پیدا کردہ ذہنیت کے تحت عیسائیوں کے جہان افکار کو اسلام کی یلغار سے محفوظ کرنے کے لیے تعصبات کی دیواریں اٹھانا ہے۔ ان کا دوسرا مقصد اسلام نا آشنا مسلمانوں کو اسلام کے متعلق مغالطوں اور شبہات میں ڈالنا بھی ہے۔ بایں ہمہ مستشرقین ہمارے جدید طبقوں کے لیے ایک صدی سے معلمین اسلام اور اساتذہ سیرت بنے ہوئے ہیں، اور اسلام نا آشنا مسلمان ان کی تحریریں کو پڑھ کر ایسے ایسے شکوک میں مبتلا ہوتے ہیں اور ایسے ایسے اعتراضات اپنے ہی دین کے خلاف خود اٹھاتے ہیں کہ ہر شناسائے حقیقت کے لیے حیرت و عبرت کا مقام پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں مشمولہ مواد کے فاضل مؤلف نے بحیثیت متکلم اسلام علمی دائرے میں اسلامی علوم و معارف کی تجدید کا جو وسیع کام کیا ہے، اس میں جا بجا مستشرقین کی نکتہ آفرینیوں سے تعرض کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ حقائق کو مسخ کرنے والے ان محققین کا طلسم توڑے بغیر مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو اسلام کی حقیقت کے سرچشمے تک پہنچانا ممکن نہیں۔

چنانچہ سیرت نبی اکرم کے سلسلے میں اپنی جن تحریروں میں فاضل مؤلف نے مستشرقین کی مغالطہ انگیزیوں سے تعرض کیا ہے ان میں سے جن تک ہماری نگاہ پہنچ سکی ہے، ان کے ضروری اقتباسات اس باب میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس باب کے مواد کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین یہ ملحوظ رکھیں کہ مستشرقین نے اسلام اور نبی اسلام کو سمجھنے

میں جو غلطیاں کی ہیں اور طرح طرح کے جو مغالطے پیدا کیے ہیں، ان سب کا استقصا جناب مؤلف نے نہیں کیا کیونکہ خود مستشرقین کے پورے کام کو موضوع بنا کر کسی مستقل کتاب یا مقالے کی تدوین نہیں کی گئی۔ صرف ضروری نکات پر حسبِ موقع بحث اٹھائی گئی ہے۔ سیرتِ پاک سے متعلق مستشرقین کے ڈھیر سے بے شمار اعتراضات کے جوابات مختلف ابواب میں شامل ہیں، اگرچہ معترضین کے متعلق حوالے درج نہیں کیے گئے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس باب کے مواد کے بارے میں یہ مسئلہ ہمارے لیے الجھن کا باعث بنا کہ اسے کتاب کے کس حصے میں کس مقام پر رکھا جائے۔ غور و بحث کے بعد ہم نے اسے بھی بنیادی مباحث میں جگہ دی ہے، کیونکہ جہاں اس حصے کے دوسرے مضامین کو یہ اہمیت ہے کہ سیرتِ پاک کو سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے، وہاں مستشرقین کے باب کا مطالعہ بعض ایسی رکاوٹوں کو دور کرتا ہے جو سیرتِ نبوی کے فہم میں حائل ہوتی ہیں۔

اس باب کی فصلِ اوّل بڑی مختصر ہے، مگر انتہائی جامع بھی۔ ایک چند سطری عبارت کو ہم نے مستقل فصل اس لیے قرار دیا ہے کہ فاضل مؤلف کا یہ نقطۂ نظر نمایاں ہو کر سامنے آجائے۔ (مرتبین) ——]

فصل ۱

مستشرقین کا نامعقول طریقِ کار

یہ بدقسمت لوگ علم کے نام سے جو تحقیقات کرتے ہیں، اُس میں پہلے اپنی جگہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کو بہرحال منزّل من اللہ تو نہیں ماننا ہے، اب کہیں نہ کہیں سے اِس امر کا ثبوت بہم پہنچانا ضروری ہے کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں پیش کیا ہے، یہ فلاں فلاں مقامات سے چُرائے ہوئے مضامین اور معلومات ہیں۔ اِس طرزِ تحقیق میں یہ لوگ اِس قدر بے شرمی کے ساتھ کھینچ تان کر زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے ہیں کہ بے اختیار گھن آنے لگتی ہے اور آدمی کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسی کا نام علمی تحقیق ہے تو لعنت ہے اِس علم پر اور اِس تحقیق پر!

فصل ۲

بحیرا راہب کا افسانہ

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرٰىهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَّزُورًا ۝ وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا ۝ قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۔ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

(الفرقان، آیت ۴ تا ۶)

"جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔ اے محمدؐ، ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔"

یہ وہی اعتراض ہے جو اس زمانے کے مستشرقینِ مغرب قرآن مجید کے خلاف پیش کرتے ہیں۔

حضورؐ کی قوم نے اعتراض کیوں نہ اٹھایا؟

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر دشمنوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تم بچپن میں بحیرا راہب سے جب ملے تھے اس وقت یہ سارے مضامین تم نے سیکھ لیے تھے۔ اور نہ یہ کہا کہ جوانی میں جب تجارتی سفروں کے سلسلے میں تم باہر جایا کرتے تھے اس زمانے میں تم نے عیسائی راہبوں اور یہودی ربیوں سے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔ اس لیے کہ ان سارے سفروں کا حال ان کو معلوم تھا۔ یہ سفر اکیلے نہیں ہوئے تھے۔ ان کے اپنے قافلوں کے ساتھ ہوئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان میں کسی سے کچھ سیکھ آنے کا الزام ہم لگائیں گے تو ہمارے اپنے ہی شہر میں سینکڑوں زبانیں ہم کو جھٹلا دیں گی۔ اس کے علاوہ مکے کا ہر عام آدمی پوچھے گا کہ اگر یہ معلومات اس شخص کو بارہ تیرہ برس کی عمر ہی میں بحیرا سے حاصل ہو گئی تھیں، تو آخر یہ شخص کہیں باہر تو نہیں رہتا

تھا، ہمارے ہی درمیان رہتا بستا تھا، کیا وجہ ہے کہ چالیس برس کی عمر تک اس کا یہ سارا علم چھپا رہا اور کبھی ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ایسا نہ نکلا جو اس علم کی غمازی کرتا؟ یہی وجہ ہے کہ کفارِ مکہ نے اتنا سفید جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کی اور اسے بعد کے زیادہ بے حیا لوگوں کے لیے چھوڑ دیا۔

کفارِ مکہ کا اعتراض کیا تھا؟

وہ جو بات کہتے تھے وہ نبوت سے پہلے کے متعلق نہیں بلکہ دعوائے نبوت کے زمانے کے متعلق تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص اَن پڑھ ہے، خود مطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل کر نہیں سکتا، پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا، چالیس برس کی عمر تک ان میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا جو آج اس کی زبان سے نکل رہی ہیں، اب آخر یہ معلومات آ کہاں سے رہی ہیں؟ ان کا سرچشمہ لامحالہ کچھ دوسرے لوگوں کی کتابیں ہیں جن کے اقتباسات راتوں کو چپکے چپکے ترجمہ اور نقل کرائے جاتے ہیں، انہیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے اور پھر انہیں یاد کر کے ہمیں دن کو سنا دیتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہلِ کتاب تھے، پڑھے لکھے تھے اور مکہ میں رہتے تھے۔ یعنی عَدّاس (حُوَیطِب بن عبدالعُزّیٰ کا آزاد کردہ غلام)، یَسار (علاء بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام) اور جَبر (عامر بن ربیعہ کا آزاد کردہ غلام)۔

بظاہر بڑا وزنی اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ وحی کے دعوے کو رد کر دینے کے لیے نبی کے ماخذِ علم کی نشاندہی کر دینے سے بڑھ کر اور کونسا اعتراض وزنی ہو سکتا ہے۔ مگر آدمی پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ جواب میں سرے سے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی، بلکہ صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو، صریح بے انصافی کی بات کہہ رہے ہو، سخت جھوٹ کا طوفان اُٹھا رہے ہو، یہ تو اُس خدا کا کلام ہے جو آسمان و زمین کے بھید جانتا ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ سخت مخالفت کے ماحول میں ایسا زوردار اعتراض پیش کیا جائے، اور اس کو یوں حقارت سے رد کر دیا جائے؟ کیا واقعی یہ ایسا ہی پوچ اور بے وزن اعتراض تھا کہ اس کے جواب میں بس "جھوٹ اور ظلم" کہہ دینا کافی تھا؟ آخر وجہ کیا ہے کہ اس مختصر سے جواب کے بعد نہ عوام نے کسی تفصیلی اور واضح جواب کا مطالبہ کیا اور نہ نئے نئے ایمان لانے والوں کے دلوں میں کوئی شک پیدا ہوا اور نہ مخالفین ہی میں سے کسی کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ دیکھو، ہمارے اس وزنی اعتراض کا جواب بن نہیں پڑ رہا ہے اور محض "جھوٹ اور ظلم" کہہ کر بات ٹالی جا رہی ہے؟

اس گتھی کا حل ہمیں اُسی ماحول سے مل جاتا ہے جس میں مخالفینِ اسلام نے یہ اعتراض کیا تھا۔ (اس حل کو پانے کے لیے مؤلف نے ذیل کی تنقیحات قائم کی ہیں)[1]:-

---

[1] اضافہ مرتبین۔

پہلی تنقیح

وہ ظالم سردار جو ایک ایک مسلمان کو مارتے کوٹتے اور تنگ کرتے پھر رہے تھے، ان کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن جن لوگوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ پرانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے محمد کو یاد کرایا کرتے ہیں، ان کے گھروں پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر چھاپے مارتے اور وہ سارا ذخیرہ برآمد کر کے پبلک کے سامنے لا رکھتے جو ان کے زعم میں اس کام کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ وہ عین اس وقت چھاپا مار سکتے تھے جب کہ یہ کام کیا جا رہا ہو اور ایک مجمع کو دکھا سکتے تھے کہ لو دیکھو، یہ نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بلال کو تپتی ریت پر گھسیٹنے والوں کے لیے ایسا کرنے میں کوئی آئینی و ضابطہ مانع نہ تھا۔ اور ایسا کر کے وہ ہمیشہ کے لیے نبوت محمدی کے "خطرے" کو مٹا سکتے تھے۔ مگر وہ بس زبانی اعتراض ہی کرتے رہے اور ایک دن بھی یہ فیصلہ کن قدم اٹھا کر انہوں نے نہ دکھایا۔

دوسری تنقیح

جن لوگوں کے نام وہ اس سلسلے میں لیتے تھے وہ کہیں باہر کے نہ تھے۔ اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ ان کی قابلیتیں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ ہر شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا تھا یہ دیکھ سکتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ کس پائے کی ہے، کس شان کی زبان ہے، کس مرتبے کا ادب ہے، کیا زور کلام ہے، کیسے بلند خیالات اور مضامین ہیں، اور وہ کس درجے کے لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محمد ان سے یہ سب کچھ حاصل کر کے لا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی نے بھی اس اعتراض کو کوئی وزن نہ دیا۔ ہر شخص سمجھتا تھا کہ ان باتوں سے بس دل کے جلے پھپھولے پھوڑے جا رہے ہیں ورنہ اس قول میں کسی شبہ کے قابل بھی جان نہیں ہے۔ جو لوگ ان اشخاص سے واقف نہ تھے وہ بھی آخر اتنی ذرا سی بات تو سوچ سکتے تھے کہ اگر یہ لوگ ایسی ہی قابلیت رکھتے تھے تو آخر انہوں نے خود اپنا چراغ کیوں نہ جلایا؟ ایک دوسرے شخص کے چراغ کو تیل مہیا کرنے کی انہیں ضرورت کیا پڑی تھی؟ اور وہ بھی چھپے چھپے کہ اس کام کی شہرت کا ذرا سا حصہ بھی ان کو نہ ملے۔

تیسری تنقیح

وہ سب اشخاص جن کا نام اس سلسلے میں لیا جا رہا تھا، بیرونی ممالک سے آئے ہوئے غلام تھے جن کو ان کے مالکوں نے آزاد کر دیا تھا۔ عرب کی قبائلی زندگی میں کوئی شخص بھی کسی طاقتور قبیلے کی حمایت کے بغیر نہ جی سکتا تھا۔ آزاد ہو جانے پر بھی غلام اپنے سابق مالکوں کے ولاء (یعنی سرپرستی) ہی میں رہتے تھے اور ان کی حمایت ہی معاشرے میں ان کے لیے زندگی کا سہارا ہوتی تھی۔ اب یہ ظاہر بات تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی بدولت معاذ اللہ ایک جھوٹی نبوت کی دکان چلا رہے تھے تو یہ لوگ کسی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ تو اس سازش میں آپ کے شریک نہ ہو سکتے تھے۔ آخر کار ایسے شخص کے وہ مخلص رفیق کار اور سچے عقیدت مند کیسے ہو سکتے تھے جو رات کو انہی سے کچھ باتیں

سیکھتا ہو اور دن کو دنیا بھر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتا ہو کہ یہ خدا کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے؟ اس لیے ان کی شرکت کسی لالچ اور کسی غرض ہی کی بنا پر ہو سکتی تھی۔ مگر کون صاحب عقل و ہوش آدمی یہ باور کر سکتا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے سرپرستوں کو ناراض کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سازش میں شریک ہو گئے ہوں گے؟ آخر کیا لالچ ہو سکتا تھا جس کی بنا پر وہ ساری قوم کے مغضوب اور مطعون اور ساری قوم کی دشمنی کے ہدف آدمی کے ساتھ مل جاتے اور اپنے سرپرستوں سے کٹ جانے کے نقصان کو ایسے مصیبت زدہ آدمی سے حاصل ہونے والے کسی فائدے کی اُمید پر گوارا کر لیتے؟ پھر یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ ان کے سرپرستوں کو یہ موقع تو آخر حاصل ہی تھا کہ مار کوٹ کر ان سے سازش کا اقبال کرا لیں۔ اس موقع سے انہوں نے کیوں نہ فائدہ اٹھایا اور کیوں نہ ساری قوم کے سامنے خود انہی سے یہ اعتراف کروا لیا کہ ہم سے سیکھ سیکھ کر یہ نبوت کی دکان چمکائی جا رہی ہے؟

پانچویں توضیح

سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور آپ سے قریب ترین عقیدت میں شامل ہوتے جو صحابہ کرام آنحضورؐ کی ذات اقدس سے رکھتے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بناوٹی اور سازشی نبوت پر خود وہی لوگ ایمان لائیں اور گہری عقیدت کے ساتھ ایمان لائیں جنہوں نے اس کے بنانے کی سازش میں خود حصہ لیا ہو؟ اور بالفرض اگر یہ ممکن بھی تھا تو ان لوگوں کو اہل ایمان کی جماعت میں کوئی نمایاں مرتبہ تو ملا ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نبوت کا کاروبار تو چلے عدّاس اور یسار اور جبر کے بل بوتے پر اور نبی کے دست راست بنیں ابوبکرؓ اور عمرؓ اور ابوعبیدہؓ؟

اسی طرح یہ بات بھی بڑی تعجب انگیز تھی کہ اگر چند آدمیوں کی مدد سے راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر نبوت کے اس کاروبار کا مواد تیار کیا جا رہا تھا تو وہ زیدؓ بن حارثہ، علیؓ بن ابی طالب، ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے لوگوں سے کس طرح چھپ سکتا تھا جو شب و روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے تھے؟

اس الزام میں برائے نام بھی کوئی شائبہ صداقت ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ یہ لوگ اس قدر خلوص کے ساتھ حضورؐ پر ایمان لاتے اور آپ کی حمایت میں ہر طرح کے خطرات اور نقصانات برداشت کرتے؟

یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر ہر سننے والے کی نگاہ میں یہ اعتراض آپ ہی بے وزن تھا۔ اس لیے قرآن میں اس کو کسی وزنی اعتراض کی حیثیت سے، جواب دینے کی خاطر نقل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بتانے کی خاطر اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ دیکھو، حق کی دشمنی میں یہ لوگ کیسے اندھے ہو گئے ہیں اور کس قدر صریح جھوٹ اور بے انصافی پر اتر آئے ہیں۔ — ۲۴۸ —

فصل ۳

قرآن کے تین قصص کی بحث

مستشرقین نے قرآن کے تین قصص کو بھی اپنی تحقیق کے خراد پر چڑھایا ہے، اور ان کے متعلق بھی یہ الزام لگایا ہے کہ نبی اکرمؐ نے یہ قصص دوسرے مآخذ سے مستعار لے کر اپنی طرف سے پیش کر دیئے۔

مستشرقین کے الزام و اعتراض کو بیان کرنے سے پہلے لازم ہے کہ خود ان قصص کو سامنے رکھا جائے۔ ورنہ آنے والی بحث کو سمجھنے میں دقت پیش آئے گی۔ (مترجم)

(۱) حضرت موسیٰؑ کا سفر مجمع البحرین

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ۔ (الکہف: آیت ۶۰)

"ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰؑ کو پیش آیا تھا جبکہ موسیٰؑ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک زمانۂ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔"

اس مرحلے پر یہ قصہ سنانے سے مقصود کفار اور مومنین دونوں کو ایک اہم حقیقت پر متنبہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہر بین نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتے دیکھتی ہے اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے، کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحتیں نہیں ہوتیں جنہیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ ظالموں کا پھلنا پھولنا اور بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا، نافرمانوں پر انعامات کی بارش اور فرمانبرداروں پر مصائب کا ہجوم، بدکاروں کا عیش اور نیکوکاروں کی بدحالی، یہ وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور محض اس لیے کہ لوگ ان کی تہہ کو نہیں سمجھتے، ان سے عام طور پر ذہنوں میں الجھنیں، بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہو جاتی ہیں۔ کفار اور ظالم ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیا اندھیر نگری ہے، کوئی اس کا راجہ نہیں، اور ہے تو چوپٹ ہے۔ یہاں جس کا جو جی چاہے کرتا رہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مومن اس طرح کے واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں اور بسا اوقات سخت

آزمائشوں کے مواقع پر ان کے ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانۂ مشیت کا پردہ اٹھا کر ذرا اس کی ایک جھلک دکھائی تھی تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے کیسے اور کن مصلحتوں سے ہو رہا ہے اور کس طرح واقعات کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہوتا ہے۔

قصے کی تفصیلات

حضرت موسیٰؑ کو یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟ اس کی کوئی تصریح قرآن نے نہیں کی ہے۔ حدیث میں عوفی کی ایک روایت میں ضرور یہ ہے جس میں وہ ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰؑ نے مصر میں اپنی قوم کو آباد کیا تھا لیکن ابن عباسؓ سے جو قوی تر روایات بخاری اور دوسری کتب حدیث میں منقول ہیں وہ سب اس بیان کی تائید نہیں کرتیں اور نہ کسی دوسرے ذریعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰؑ کبھی مصر میں بسے تھے بلکہ قرآن اس کی تصریح کرتا ہے کہ مصر سے خروج کے بعد ان کا سارا زمانہ سینا اور تیہ میں گزرا۔ اس لیے یہ روایت تو قابل قبول نہیں ہے۔ البتہ ہم خود اس قصے کی تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مشاہدات حضرت موسیٰؑ کو ان کی نبوت کے ابتدائی دور میں کرائے گئے ہوں گے، کیونکہ آغازِ نبوت ہی میں انبیاء علیہم السلام کو اس طرح کی تعلیم و تربیت درکار ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو ان مشاہدات کی ضرورت اس زمانے میں پیش آئی ہوگی جبکہ مصر میں بنی اسرائیل کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آ رہا تھا جن سے مسلمان مکہ معظمہ میں دوچار تھے۔ ان دو وجوہ سے ہمارا قیاس یہ ہے (والعلم عند اللہ) کہ اس واقعہ کا تعلق اس دور سے ہے جبکہ مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور سردارانِ قریش کی طرح فرعون اور اس کے درباری بھی عذاب میں تاخیر دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ اوپر کوئی نہیں ہے جو اس سے باز پرس کرنے والا ہو، اور مکے کے مظلوم مسلمانوں کی طرح مصر کے مظلوم مسلمان بھی بے چین ہو ہو کر پوچھ رہے تھے کہ خدایا ان ظالموں پر انعامات کی اور ہم پر مصائب کی یہ بارش کب تک؟ حتیٰ کہ خود حضرت موسیٰؑ بھی پکار اٹھے تھے کہ رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ۔ "اے پروردگار، تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں بڑی شان و شوکت اور مال و دولت دے رکھی ہے، اے پروردگار، کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ دنیا کو تیرے راستے سے بھٹکا دیں؟"

اگر ہمارا یہ قیاس درست ہو تو پھر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ غالباً حضرت موسیٰؑ کا یہ سفر سوڈان کی جانب تھا اور مجمع البحرین سے مراد وہ مقام ہے جہاں موجودہ شہر خرطوم کے قریب دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں البحر الابیض اور البحر الازرق آ کر ملتی ہیں۔

تلمود کا بیان

بائیبل اس واقعے کے باب میں بالکل خاموش ہے۔ البتہ تلمود میں اس کا ذکر موجود ہے، مگر وہ اسے حضرت

موسیٰ کے بجائے ربی یہوحانان بن لاوی کی طرف منسوب کرتی ہے اور اس کا بیان ہے کہ ربی مذکور کو یہ واقعہ حضرت الیاس کے ساتھ پیش آیا تھا جو دنیا سے زندہ اُٹھائے جانے کے بعد فرشتوں میں شامل کر لیے گئے ہیں اور دنیا کے انتظام پر مامور ہیں۔

(The Talmud Selections, By H. Polano. PP. 313 - 16)

ممکن ہے کہ خروج سے پہلے کے بہت سے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کے ہاں اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رہا ہو اور صدیوں بعد انہوں نے قصے کی کڑیاں کہیں سے کہیں لے جا کر جوڑ دی ہوں۔ تلمود کی اسی روایت سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ قرآن میں اس مقام پر موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ نہیں بلکہ کوئی اور موسیٰ ہیں۔ لیکن نہ تو تلمود کی ہر روایت لازماً صحیح تاریخ قرار دی جا سکتی ہے، نہ ہمارے لیے یہ گمان کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ قرآن میں کسی اور مجہول الحال موسیٰ کا ذکر اس طریقہ سے کیا گیا ہو گا، اور پھر جبکہ معتبر احادیث میں حضرت اُبَیّ بن کعب کی یہ روایت موجود ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصے کی تشریح فرماتے ہوئے موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ پیغمبر بنی اسرائیل کو بتایا ہے تو کسی مسلمان کے لیے تلمود کا بیان لائق التفات نہیں۔

مستشرقین مغرب نے اپنے معمول کے مطابق قرآن مجید کے اس قصے کے بھی ماخذ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور تین قصوں پر انگلی رکھ دی ہے کہ یہ ہیں وہ مقامات جہاں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نقل کر کے یہ قصہ بنایا اور پھر دعویٰ کر دیا کہ یہ تو میرے اوپر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے۔ ایک داستانِ گلگامیش، دوسرے سکندر نامہ سُریانی اور تیسرے وہ یہودی روایات جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

مستشرقین پر جرح کے لیے چار سوال

ان کی اس متعصبانہ افترا پردازی کا پردہ بالکل چاک ہو جائے اگر کوئی طالب علم ان سے صرف چار باتوں کا جواب طلب کرے:

(۱) اوّل یہ کہ آپ کے پاس وہ کیا دلیل ہے جس کی بنا پر آپ دو چار قدیم کتابوں میں قرآن کے کسی بیان سے ملتا جلتا مضمون پا کر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ قرآن کا بیان لازماً انہی کتابوں سے ماخوذ ہے؟

(۲) دوسرے یہ کہ مختلف زبانوں کی جتنی کتابوں کو آپ لوگوں نے قرآن مجید کے قصوں اور دوسرے بیانات کی ماخذ قرار دیا ہے اگر ان کی فہرست بنائی جائے تو اچھے خاصے ایک کتب خانے کی فہرست بن جائے۔ کیا ایسا کوئی کتب خانہ مکّے میں اُس وقت موجود تھا؟ اور کیا مختلف زبانوں کے مترجمین بیٹھے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مواد فراہم کر رہے تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ کا سارا انحصار ان دو تین سفروں پر ہے

جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوّت سے کئی سال پہلے عرب سے باہر کیے تھے، تو سوال یہ ہے کہ آخر ان تجارتی سفروں میں آنحضرتؐ کتنے کتب خانے نقل یا حفظ کر لاتے تھے؟ اور اعلانِ نبوّت سے ایک دن پہلے تک بھی آنحضرتؐ کی ایسی معلومات کا کوئی نشان آپؐ کی بات چیت میں نہ پائے جانے کی کیا معقول وجہ ہے؟

(۳) تیسرے یہ کہ کفارِ مکہ اور یہودی اور نصرانی، سب آپ ہی لوگوں کی طرح اس تلاش میں تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ مضامین کہاں سے لاتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے معاصرین کو اس سرچشمے کا پتہ نہ چلنے کی کیا وجہ ہے؟ انہیں تو بار بار تحدّی کی جا رہی تھی کہ یہ قرآن مُنزّل من اللہ ہے، وحی کے سوا اس کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اگر تم اسے بشر کا کلام کہتے ہو تو ثابت کرو کہ بشر ایسا کلام کہہ سکتا ہے۔ اس چیلنج نے آنحضرتؐ کے معاصر دشمنانِ اسلام کی کمر توڑ کر رکھ دی، مگر وہ ایک ماخذ کی بھی نشان دہی نہ کر سکے جس سے قرآن کے ماخوذ ہونے کا کوئی معقول آدمی تعین تو درکنار شک ہی کر سکتا ہو۔ سوال یہ ہے کہ معاصرین اس سُراغ رسانی میں ناکام کیوں ہوئے اور ہزار بارہ سو برس کے بعد آج مُعاندین کو اس میں کیسے کامیابی نصیب ہو رہی ہے؟

(۴) آخری اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس بات کا امکان تو بہر حال ہے نا کہ قرآن مُنزّل من اللہ ہو اور وہ پچھلی تاریخ کے انہی واقعات کی صحیح خبریں دے رہا ہو جو دوسرے لوگوں تک صدیوں کے دوران میں زبانی روایات سے مسخ ہوتی ہوتی پہنچی ہوں اور افسانوں میں جگہ پا گئی ہوں۔ اس امکان کو کس معقول دلیل کی بنا پر بالکل ہی خارج از بحث کر دیا گیا؟ اور کیوں صرف اسی ایک امکان کو بنائے بحث و تحقیق بنا لیا گیا کہ قرآن اُن قصّوں ہی سے ماخوذ ہو جو لوگوں کے پاس زبانی روایات اور افسانوں کی شکل میں موجود تھے؟ کیا مذہبی تعصب اور عناد کے سوا اس ترجیح کی کوئی دوسری وجہ بیان کی جا سکتی ہے؟

ان سوالات پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا کہ مستشرقین نے "علم" کے نام سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ درحقیقت کسی سنجیدہ طالبِ علم کے لیے قابلِ التفات نہیں ہے ۹۲؎

(۲) فرعون کا ارادۂ قتلِ موسٰیؑ

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۔ (المؤمن۔ آیت ۲۶)	"ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا چھوڑو مجھے میں اس موسٰیؑ کو قتل کیے دیتا ہوں اور یہ پکار دیکھے اپنے رب کو۔"

اس آیت سے آیت ۴۵ تک جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ تاریخِ بنی اسرائیل کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے جسے خود بنی اسرائیل بالکل فراموش کر گئے ہیں۔ بائیبل اور تلمود دونوں اس کے ذکر سے خالی ہیں اور دوسری اسرائیلی روایات

میں بھی اس کا کوئی نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ صرف قرآن مجید ہی کے ذریعہ سے دنیا کو یہ معلوم ہوا ہے کہ فرعون اور موسیٰ کی کشمکش کے دور میں ایک وقت یہ واقعہ بھی پیش آیا تھا۔

دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے قصے کی اہمیت

اس قصے کو جو شخص بھی پڑھے گا بشرطیکہ وہ اسلام اور قرآن کے خلاف تعصب میں اندھا نہ ہو چکا ہو، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے گا کہ دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے یہ قصہ بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور یہ بجائے خود یہ بات بعید از عقل و قیاس بھی نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی شخصیت، ان کی تبلیغ اور ان کے ہاتھوں ظہور پذیر ہونے والے حیرت انگیز معجزات سے متاثر ہو کر خود فرعون کے اعیانِ سلطنت میں سے کوئی شخص دل ہی دل میں ایمان لے آیا ہو اور فرعون کو ان کے قتل پر آمادہ دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا ہو۔ لیکن مغربی مستشرقین علم و تحقیق کے لمبے چوڑے دعووں کے باوجود تعصب میں اندھے ہو کر جس طرح قرآن کی روشن صداقتوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اُس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مضمون "موسیٰؑ" کا مصنف اس قصے کے متعلق لکھتا ہے:

"قرآن کی یہ کہانی کہ فرعون کے دربار میں ایک مومن موسیٰؑ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، پوری طرح واضح نہیں ہے (سورہ ۴۰۔ آیت ۲۸)۔ کیا ہمیں اس کا تقابل اُس قصے سے کرنا چاہیے جو ہگّادا میں بیان ہوا ہے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ یتھرو نے فرعون کے دربار میں عفو سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا؟"

مدّعیانِ تحقیق کی شبہ انگیزی

گویا ان مدّعیانِ تحقیق کے ہاں یہ بات تو طے شدہ ہے کہ قرآن کی ہر بات میں ضرور کیڑے ہی ڈالنے ہیں۔ اب اگر اس کے کسی بیان پر حرف زنی کی کوئی بنیاد نہیں ملتی تو کم از کم یہی شوشہ چھوڑ دیا جائے کہ یہ قصہ پوری طرح واضح نہیں ہے۔ اور چلتے چلتے یہ شک بھی پڑھنے والوں کے دل میں ڈال دیا جائے کہ ہگّادا میں یتھرو کا جو قصہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے کا بیان ہوا ہے وہ کہیں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سُن لیا ہو گا اور اسے لا کر یہاں اس شکل میں بیان کر دیا ہو گا۔ یہ ہے "علمی تحقیق" کا وہ انداز جو ان لوگوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں اختیار کر رکھا ہے۔ ؁۱۵۰

(۳) قصّۂ اصحابِ کہف

غار میں مدتِ قیام پر اعتراض

بعض مستشرقین نے اس قصے کو قصۂ اصحابِ کہف کا مترادف ماننے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ قرآن اُن کے قیامِ غار کی مدت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے۔ لیکن اس سورہ کے حاشیہ ۲۵ میں ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ

آیت ۲۵ میں اصحاب کہف کے غار میں قیام کی مدت ۳ سو اور ۹ سو سال کی جو بیان کی گئی ہے یہ ہمارے خیال میں دراصل لوگوں کے قول کی حکایت ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ بعد کے فقرے (آیت ۲۶) میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ تم کہو، اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت رہے۔ اگر ۳۰۹ کی تعداد اللہ نے خود بیان فرمائی ہوتی تو اس کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اسی دلیل کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی یہی تاویل اختیار فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے بلکہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے۔

گبن کی جسارت

سُریانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں جن کو بنیاد بنا کر گبن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر "جہالت" کا الزام لگایا ہے، حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر وہ اتنی بڑی جسارت کر رہا ہے اس کے متعلق وہ خود جانتا ہے کہ وہ اس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے۔ اور اتنی مدت کے اندر زبانی روایات کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح کی ایک روایت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس سے کسی جز میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے، صرف اُن ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

عیسائی نوشتوں سے شہادت

اس قصے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے جو سُریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ شخص اصحاب کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ مرتب کیے تھے۔ ان مواعظ میں وہ اس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سُریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دور کے مفسرین کو پہنچی جسے ابن جریر طبری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، اور دوسری طرف یورپ پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ گبن نے اپنی کتاب "تاریخ زوال و سقوط دولت روم" کے باب ۳۳ میں "سات سونے والے" (Seven Sleepers) کے عنوان کے تحت ان مآخذ سے اس قصے کا جو خلاصہ دیا ہے وہ ہمارے مفسرین کی روایات سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں قصے قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحاب کہف غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے، ہمارے مفسرین اس کا نام دقینوس یا دقیانوس یا دقیوس بتاتے ہیں، اور گبن کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈیسیس (Decius) تھا جس نے ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک سلطنت روم پر فرماں روائی کی ہے اور مسیح علیہ السلام کے

پیروؤں پر ظلم و ستم کرنے کے معاملہ میں جس کا عہد بہت بدنام ہے۔ جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام ہمارے مفسرین افسس یا افسوس لکھتے ہیں اور گبن اس کا نام افِسس (Ephesus) بتاتا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، جس کے کھنڈر آج موجودہ ٹرکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰-۲۵ میل بجانب جنوب پائے جاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقشہ ۱) پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحاب کہف جاگے اس کا نام ہمارے مفسرین تیذوسیس لکھتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ ان کے بعث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسیس (Theodosius) ثانی کے زمانے میں پیش آیا جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحاب کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا تھا اس کا نام ہمارے مفسرین یملیخا بتاتے ہیں اور گبن اسے ئیمبلیخس (Jamblichus) لکھتا ہے۔

دو طرفہ روایات میں یکسانی

قصے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈیسیس کے زمانے میں جب مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر سخت ظلم و ستم ہو رہے تھے، یہ سات نوجوان ایک غار میں جا بیٹھے تھے پھر قیصر تھیوڈوسیس کی سلطنت کے اڑتیسویں سال (یعنی تقریباً ۴۴۵ء یا ۴۴۶ء میں) یہ لوگ بیدار ہوئے جبکہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیرو بن چکی تھی۔ اسی حساب سے غار میں ان کے رہنے کی مدت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے ملحضہ

جلد اوّل ——— حصّہ ۲

بعثت سے پہلے کا ماحول

ا: اقوامِ ماضیہ

باب ۱۳

سابق اُمّتوں کی تباہی

اور اُن کے آثار

فصل ا

ابتدائیہ

نوعِ انسانی کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو کہ دنیا کو محض ایک تماشا گاہ سمجھ کر، ایک خوانِ یغما محض ایک عیش کدہ سمجھ کر جینے والی، اور انبیاء کی بتائی ہوئی حقیقت سے منہ موڑ کر باطل نظریات پر کام کرنے والی قومیں پے در پے کس انجام سے دوچار ہوتی رہی ہیں؟

آثارِ قدیمہ کا مشاہدہ انہوں نے بعض مہذب و تباہ شدہ اقوام سے محض ایک تماشائی کی حیثیت سے کیا ان سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کے قائل کی نگاہ اور اس کے منکر کی نگاہ میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک تماشا دیکھتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ تاریخ مرتب کرتا ہے۔ دوسرا انہی چیزوں سے اخلاقی سبق لیتا ہے اور زندگی کی ماورائی حقیقتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

جو لوگ بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے اٹھائے گئے وہ سب ان کی اپنی ہی بستیوں کے رہنے والے تھے یعنی موسیٰ، ابراہیم اور نوح علیہم السلام آخر کون تھے۔ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ جن قوموں نے ان لوگوں کی دعوتِ اصلاح کو قبول نہ کیا اور اپنے بے بنیاد تخیلات اور اپنی بے لگام خواہشات کے پیچھے چلتی رہیں ان کا انجام کیا ہوا۔ تم خود اپنے تجارتی سفروں میں عاد، ثمود، مدین اور قومِ لوط وغیرہ کے تباہ شدہ علاقوں سے گذرتے رہتے ہو کیا وہاں تمہیں کوئی سبق نہیں ملا۔ یہ انجام جو انہوں نے دنیا ہی میں دیکھا یہی تو خبر دے رہا ہے کہ عاقبت میں وہ اس سے بدتر انجام دیکھیں گے۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے دنیا میں اپنی اصلاح کر لی وہ صرف دنیا ہی میں اچھے نہ رہے آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ بہتر ہوگا۔

جن قوموں نے بھی انبیاء علیہم السلام کی بات نہ مانی اور اپنی زندگی کا پورا رویہ توحید، رسالت، اور آخرت کے انکار پر قائم کیا وہ آخر کار ہلاکت کی مستحق ہو کر رہیں۔ تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا کا قانونِ اخلاق جو انبیاء کے ذریعہ سے دیا گیا، اور اس کے مطابق انسانی اعمال کی بازپرس جو آخرت میں ہونی ہے، سراسر مبنی برحقیقت ہے۔ کیونکہ جس قوم نے بھی اس قانون سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جوابدہ سمجھتے ہوئے دنیا میں اپنا

رویہ متعین کیا ہے وہ آخرکار سیدھی تباہی کی طرف گئی ہے۔[۵۵]

پچھلی انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہیں ان سب کو جس چیز نے گرایا وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوشحالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی ضمیر اس درجہ بگڑ گیا کہ یا تو ان کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو برائیوں سے روکتے، یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت آخرکار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں۔[۵۶]

طالب حق لوگوں کے لیے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ حقیقت کو پہچان سکتے ہیں، لیکن ہٹ دھرم لوگ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے ہیں۔ نہ آفاق کی نشانیاں دیکھ کر اور نہ انبیاءؑ کے معجزات دیکھ کر۔ وہ تو ہمیشہ اس وقت تک اپنی ضلالت پر جمے رہتے ہیں جب تک خدا کے عذاب نے آکر ان کو گرفت میں نہیں لے لیا ہے۔ اسی مناسبت سے سورۂ شعراء میں تاریخ کی سات قوموں کے حالات پیش کیے گئے ہیں جنہوں نے اسی ہٹ دھرمی سے کام لیا تھا جس سے کفار مکہ کام لے رہے تھے۔ اور اس تاریخی بیان کے ضمن میں چند باتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔

اوّل یہ کہ نشانیاں دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو خدا کی زمین پر ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر ہر صاحب عقل آدمی تحقیق کر سکتا ہے کہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔ دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو فرعون اور اس کی قوم نے دیکھیں، قوم نوح نے دیکھیں، عاد اور ثمود نے دیکھیں، قوم لوط اور اصحاب الایکہ نے دیکھیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

دوم یہ کہ ہر زمانے میں کفار کی ذہنیت ایک ہی رہی ہے، ان کی حجتیں ایک ہی طرح کی تھیں۔ ان کے اعتراضات یکساں تھے۔ ایمان نہ لانے کے لیے ان کے حیلے اور بہانے یکساں تھے اور آخرکار ان کا انجام بھی یکساں ہی رہا۔ اس کے برعکس ہر زمانے میں انبیاءؑ کی تعلیم ایک تھی۔ ان کی سیرت و اخلاق کا رنگ ایک تھا۔ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں ان کی دلیل و حجت کا انداز ایک تھا اور ان سب کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک تھا۔ یہ دونوں نمونے تاریخ میں موجود ہیں۔[۵۷]

پچھلی قوموں کو اپنے اپنے زمانے میں کام کرنے کا موقع دیا گیا تھا، مگر انہوں نے آخرکار ظلم و بغاوت کی روش اختیار کی اور جو انبیاءؑ ان کو راہ راست دکھانے کے لیے بھیجے گئے تھے اُن کی بات انہوں نے نہ مانی۔ اس لیے وہ ہمارے امتحان میں ناکام ہوئیں اور میدان سے ہٹا دی گئیں۔ اب اے اہل عرب تمہاری باری آئی ہے تمہیں ان کی جگہ کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تم اس امتحان گاہ میں کھڑے ہو جس سے تمہارے پیش رو ناکام ہو کر نکالے

جا چکے ہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارا انجام بھی وہی ہو جو ان کا ہوا تو اس موقع سے جو تمہیں دیا جا رہا ہے، فائدہ اٹھاؤ، پچھلی قوموں کی تاریخ سے سبق لو اور اُن غلطیوں کا اعادہ نہ کرو جو ان کی تباہی کی موجب ہوئی ہیں۔[۲۵]

فصل ۲

قومِ نوحؑ

قرآن کے اشارات اور بائیبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم اُس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔ بابل کے آثارِ قدیمہ میں بائیبل سے قدیم تر جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں بیان ہوا ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔ پھر جو روایات کردستان اور آرمینیا میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسل چلی آ رہی ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی۔ موصل کے شمال میں جزیرۂ ابن عمر کے آس پاس، اور آرمینیا کی سرحد پر کوہ اراراط کے نواح میں نوح علیہ السلام کے مختلف آثار کی نشاندہی اب بھی کی جاتی ہے اور نخچیوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اس شہر کی بنا حضرت نوحؑ نے ڈالی تھی۔

ایک بڑے طوفان کا تاریخی ریکارڈ

حضرت نوحؑ کے اس قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں اور اس کے علاوہ برما، ملایا، جزائر شرق الہند، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانہ سے چلی آ رہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اُس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسلِ آدم کسی ایک ہی خطۂ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشان دہی کرتی ہیں، اگرچہ مرورِ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انہوں نے فراموش کر دیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔ ۲۵۹

جودی پہاڑ جس پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹھہری تھی، کردستان کے علاقہ میں جزیرۂ ابن عمر کے شمال مشرقی جانب واقع ہے۔ بائیبل میں اس کشتی کے ٹھہرنے کی جگہ اراراط بتائی گئی ہے جو آرمینیا کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور ایک

سلسلہ کوہستان کا نام ہی سلسلہ کردستان کے معنی میں جس کو ارارات کہتے ہیں وہ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلتا ہے اور جبل الجودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جو آج بھی جودی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم تاریخوں میں کشتی کے ٹھہرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے چنانچہ مسیحؑ سے ڈھائی سو برس پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیروسس (Berasus) نے پرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنے ملک کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں وہ کشتی نوحؑ کے ٹھہرنے کا مقام جودی ہی بتاتا ہے۔ ارسطو کا شاگرد ابیڈینوس (Abydenus) بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے نیز وہ اپنے زمانہ کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جنہیں وہ گھول گھول کر بیماروں کو پلاتے ہیں۔

قومِ نوحؑ کا بگاڑ

حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا جو حال قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو اللہ تعالیٰ کے وجود کی منکر تھی، نہ اس سے ناواقف تھی، نہ اسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئی تھی شرک کی گمراہی تھی یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو خدائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دے لیا تھا۔ پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں رونما ہو گئیں۔ جو خود ساختہ معبود خدائی میں شریک ٹھیرا لیے گئے تھے، ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا اور اس نے انسانوں میں اونچ نیچ کی تقسیم پیدا کر دی، اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔

حضرت نوحؑ کی مساعی اصلاح

وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا ۔ (نوح ۲۲) ان لوگوں نے بڑا بھاری مکر کا جال پھیلا رکھا ہے۔

مکر سے مراد ان سرداروں اور پیشواؤں کے وہ فریب ہیں جن سے وہ اپنی قوم کے عوام کو حضرت نوحؑ کی تعلیمات کے خلاف بہکانے کی کوشش کرتے تھے مثلاً وہ کہتے تھے کہ نوحؑ تمہی جیسا ایک آدمی ہے کیسے مان لیا جائے کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے (الاعراف ۶۳-۶۹، ہود ۲۷)۔ نوحؑ کی پیروی تو ہمارے اراذل نے بے سوچے سمجھے قبول کر لی ہے، اگر اس کی بات میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے اکابر اس پر ایمان لاتے (ہود ۲۷)۔ خدا کو اگر بھیجنا ہوتا تو کوئی فرشتہ بھیجتا (المومنون ۲۴)۔ اگر یہ شخص خدا کا بھیجا ہوا ہوتا تو اس کے پاس خزانے ہوتے، اس کو علم غیب حاصل ہوتا اور یہ فرشتوں کی طرح تمام انسانی حاجات سے بے نیاز ہوتا (ہود ۳۱)۔ نوحؑ اور ان کے پیروؤں میں آخر کونسی کرامت نظر آتی ہے جس کی بنا پر ان کی فضیلت مان لی جائے (ہود ۲۷)۔ یہ شخص

دراصل تم پر اپنی سرداری جمانا چاہتا ہے (المومنون ۲۴)۔ اِس شخص پر کسی جن کا سایہ ہے جس نے اِسے دیوانہ بنا دیا ہے (المومنون ۲۵)![1]

حضرت نوحؑ علیہ السلام نے اِس حالت کو بدلنے کے لیے ایک زمانہ دراز تک اِنتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھانس رکھا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ آخرکار حضرت نوحؑ نے خدا سے دُعا کی کہ ان کافروں میں سے ایک کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ، کیوں کہ اگر تو نے ان میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور نمک حرام ہی پیدا ہوگا۔[2]

عذاب

حضرت نوحؑ کی دُعا دربار ایزدی میں مقبول ہوئی اور اس قوم کو عذاب الٰہی نے آن لیا۔ قرآن کے صریح الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کی ابتدا ایک خاص تنور سے ہوئی جس کے نیچے سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا، پھر ایک طرف آسمان سے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اور دوسری طرف زمین میں جگہ جگہ سے چشمے پھوٹنے لگے۔ سورۂ ہود میں صرف تنور کے اُبل پڑنے کا ذکر ہے اور آگے چل کر بارش کی طرف بھی اشارہ ہے۔ مگر سورۂ قمر میں اس کی تفصیل دی

---

[1] اشارہ ہے حضرت نوحؑ کی اُس دعا کی طرف جو ایک مدتِ دراز تک اپنی قوم کی اصلاح کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہنے کے بعد آخر کار تنگ آ کر انہوں نے مانگی کہ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ "پروردگار میں مغلوب ہو گیا ہوں میری مدد کو پہنچ" (القمر آیت ۱۰)۔ اور رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا "پروردگار زمین پر ایک کافر باشندہ بھی نہ چھوڑ۔" (نوح۔ آیت ۱۰)

[2] قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس طویل کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت نوحؑ کی دعوت اور ان کی قوم کے اصرار علی الکفر کے درمیان صدیوں برپا رہی۔ سورۂ عنکبوت میں بتایا گیا ہے کہ اس کشمکش کا زمانہ ساڑھے نو سو برس تک ممتد رہا ہے۔ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا (آیت ۱۴)۔ حضرت نوحؑ نے اس زمانہ میں پشت در پشت ان کے اجتماعی طرز عمل کو دیکھ کر نہ صرف یہ اندازہ فرما لیا کہ ان کے اندر قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے بلکہ یہ رائے بھی قائم کر لی کہ آئندہ ان کی نسلوں سے بھی نیک اور ایماندار آدمیوں کے اٹھنے کی توقع نہیں ہے۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (نوح۔ آیت ۲۷) "اے رب اگر تو نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا فاجر اور سخت منکرِ حق ہوگا۔" خود اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت نوحؑ کی اس رائے کو درست قرار دیا اور اپنے علمِ کامل کی بنا پر فرمایا لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (ہود۔ آیت ۳۶) "تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے بس وہ لا چکے، اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے لہٰذا اب ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دے۔"

گئی ہے کہ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ "ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے جن سے لگاتار بارش برسنے لگی اور زمین کو پھاڑ دیا کہ ہر طرف چشمے ہی چشمے پھوٹ نکلے اور یہ دونوں طرح کے پانی اُس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گئے جو مقدر کر دیا گیا تھا"۔ نیز لفظ "تنور" پر الف لام داخل کرنے کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تنور کو اس کام کی ابتدا کے لیے نامزد فرما دیا تھا جو اشارہ پاتے ہی ٹھیک اپنے وقت پر اُبل پڑا اور بعد میں طوفان والے تنور کی حیثیت سے معروف ہو گیا؟ ...

کیا طوفان عالمگیر تھا؟

یہ طوفان عالمگیر تھا یا اُس خاص علاقے میں آیا تھا جہاں حضرت نوحؑ کی قوم آباد تھی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فیصلہ آج تک نہیں ہوا۔ اسرائیلی روایات کی بنا پر عام خیال یہی ہے کہ یہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا تھا (پیدائش ۷: ۱۸-۲۴)۔ مگر قرآن میں یہ بات کہیں نہیں کہی گئی ہے۔ قرآن کے اشارات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی انسانی نسلیں انہی لوگوں کی اولاد سے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے بچا لیے گئے تھے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا ہو۔ کیونکہ یہ بات اس طرح بھی صحیح ہو سکتی ہے کہ اُس وقت تک بنی آدم کی آبادی اسی خطے تک محدود رہی ہو جہاں طوفان آیا تھا اور طوفان کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئی ہوں وہ بتدریج تمام دُنیا میں پھیل گئی ہوں۔ اس نظریہ کی تائید دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ دجلہ و فرات کی سرزمین میں تو ایک زبردست طوفان کا ثبوت تاریخی روایات سے، آثارِ قدیمہ سے اور طبقات الارض سے ملتا ہے، لیکن روئے زمین کے تمام خطوں میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے کسی عالمگیر طوفان کا یقین کیا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ روئے زمین کی اکثر و بیشتر قوموں میں ایک طوفانِ عظیم کی روایات قدیم زمانے سے مشہور ہیں، حتیٰ کہ آسٹریلیا، امریکہ اور نیوگنی جیسے دُور دراز علاقوں کی پرانی روایات میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کسی وقت ان سب قوموں کے آباؤ اجداد ایک ہی خطے میں آباد ہوں گے جہاں یہ طوفان آیا تھا۔ اور پھر جب ان کی نسلیں زمین کے مختلف حصوں میں پھیلیں تو یہ روایات اُن کے ساتھ گئیں۔ ۲۶۵

کشتی نوحؑ ایک نشانِ عبرت بن گئی

وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (العنکبوت ۱۵) "اور اسے دُنیا والوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا کر رکھ دیا"۔

اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہولناک عقوبت کو یا اس عظیم الشان واقعہ کو بعد والوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ لیکن یہاں اور سورۂ قمر آیت ۱۵ میں یہ بات جس طرز تعبیر سے بیان فرمائی گئی ہے اس سے تبادر یہی ہوتا ہے کہ وہ نشانِ عبرت خود وہ کشتی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر صدیوں موجود رہی اور بعد کی نسلوں کو خبر دیتی رہی

کہ اس سرزمین میں کبھی ایسا طوفان آیا تھا جس کی بدولت یہ کشتی پہاڑ پر جا ٹکی ہے۔ سورۂ قمر کی آیت کی تفسیر میں ابن جریر نے قتادہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ عہد صحابہ میں جب مسلمان الجزیرہ کے علاقے میں گئے ہیں تو انہوں نے کوہِ جودی پر اور ایک روایت کی رُو سے باقردیٰ نامی بستی کے قریب، اس کشتی کو دیکھا ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی وقتاً فوقتاً یہ اطلاعات اخبارات میں آتی رہتی ہیں کہ کشتی نوحؑ کو تلاش کرنے کے لیے مہمات بھیجی جا رہی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہاز جب کوہستان اراراط پر سے گزرتے ہیں تو ایک چوٹی پر انہوں نے ایسی چیز دیکھی ہے جو کشتی سے مشابہ ہے۔

امام بخاری، ابن ابی حاتم، عبدالرزاق اور ابن جریر نے قتادہ سے یہ روایات نقل کی ہیں کہ مسلمانوں کو فتح عراق والجزیرہ کے زمانے میں یہ کشتی جودی پر اور ایک روایت کے مطابق باقردیٰ کی بستی کے قریب موجود تھی اور ابتدائی دور کے اہل اسلام نے اس کو دیکھا تھا۔

فصل ۳

قوم عاد

وجہ تسمیہ

یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہل عرب میں زبان زد عام تھے۔ بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شوکت و حشمت ضرب المثل تھی۔ پھر دنیا سے ان کا نام و نشان تک مٹ جانا بھی ضرب المثل ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی شہرت کی وجہ سے عربی زبان میں ہر قدیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آثار قدیمہ کو عادیات کہتے ہیں جس زمین کے مالک باقی نہ رہے ہوں اور جو آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے افتادہ پڑی ہوئی ہو اُسے عادی الارض کہا جاتا ہے۔ قدیم عربی شاعری میں ہم کو بڑی کثرت سے اس قوم کا ذکر ملتا ہے۔ عرب کے ماہرین انساب بھی اپنے ملک کی معدوم شدہ قوموں میں سب سے پہلے اسی قوم کا نام لیتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بنی ذہل بن شیبان کے ایک صاحب آئے جو عاد کے علاقے کے رہنے والے تھے اور انہوں نے وہ قصے حضورؐ کو سنائے جو اس قوم کے متعلق قدیم زمانوں سے ان کے علاقہ کے لوگوں میں نقل ہوتے چلے آرہے تھے۔

قوم عاد کا مسکن

قرآن کی رُو سے اس قوم کا اصل مسکن احقافؔ[1] کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان واقع ہے۔ یہیں سے پھیل کر ان لوگوں نے یمن کے مغربی سواحل سے عراق تک اپنی طاقت کا سکّہ رواں کر دیا تھا۔ تاریخی حیثیت سے اس قوم کے آثار دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں لیکن جنوبی عرب میں کہیں کہیں کچھ پرانے کھنڈر موجود ہیں جنہیں عاد کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ ایک مقام پر حضرت ہودعلیہ السلام کی قبر بھی مشہور ہے ۱۸۳۷ء میں ایک انگریز بحری افسر James R. Wellested کو حصن غراب میں ایک پرانا کتبہ ملا تھا جس میں حضرت ہود علیہ السلام

---

[1] احقاف حقف کی جمع ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ریت کے لمبے لمبے ٹیلے جو بلندی میں پہاڑوں کی حد کو نہ پہنچے ہوں، لیکن اصطلاحاً یہ صحرائے عرب (الربع الخالی) کے جنوبی مغربی حصے کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔ (مؤلف)

کا ذکر موجود ہے اور عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی ...

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ عاد کا علاقہ عمان سے یمن تک پھیلا ہوا تھا اور قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا اصل وطن الاحقاف تھا جہاں سے نکل کر وہ گرد و پیش کے ممالک میں پھیلے اور کمزور قوموں پر چھا گئے۔ آج کے زمانے تک بھی جنوبی عرب کے باشندوں میں یہی بات مشہور ہے کہ عاد اسی علاقے میں آباد تھے۔ موجودہ شہر مکلا سے تقریباً ۱۲۵ میل کے فاصلے پر شمال کی جانب حضرموت میں ایک مقام ہے جہاں لوگوں نے حضرت ہودؑ کا مزار بنا رکھا ہے اور وہ قبرِ ہود کے نام ہی سے مشہور ہے۔ ہر سال ۱۵ شعبان کو وہاں عرس ہوتا ہے اور عرب کے مختلف حصوں سے ہزاروں آدمی وہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہ قبر اگرچہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے لیکن اس کا وہاں بنایا جانا اور جنوبی عرب کے لوگوں کا کثرت سے اس کی طرف رجوع کرنا کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ مقامی روایات اسی علاقے کو قومِ عاد کا علاقہ قرار دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ حضرموت میں متعدد خرابے (Ruins) ایسے ہیں جن کو مقامی باشندے آج تک دارِ عاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مساکنِ عاد کی موجودہ حالت

الاحقاف کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شاندار تمدن رکھنے والی طاقتور قوم آباد ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاداب علاقہ ہوگا اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگ زار بنا دیا ہوگا۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک لق و دق ریگستان ہے جس کے اندرونی حصوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ ۱۸۴۳ء میں بویریا کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ حضرموت کی شمالی سطح مرتفع پر سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فیٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید قطعے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بدو اس علاقے سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدو اسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کی ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے۔ میں نے دور سے ایک شاقول اس میں پھینکا تو وہ ۵ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا اور اس رسی کا سرا گل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔ ۱۹

---

۱ مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ ہوں:

1. Arabia and The Isles, Harold Ingrams, London. 1946
2. The unveiling of Arabia, R. H. Kirnan, London. 1937
3. The Empty Quarter, Philby, London. 1933

تباہی سے پہلے کی خوشحالی

یہ بات خود اہلِ عرب کی تاریخی روایات سے بھی ثابت ہے۔ اور موجودہ آثری انکشافات بھی اس پر شہادت دیتے ہیں کہ عادِ اولیٰ بالکل تباہ ہو گئے اور ان کی یادگاریں تک دنیا سے مٹ گئیں چنانچہ مؤرخینِ عرب انہیں عرب کی اُمَم بائدہ (معدوم اقوام) میں شمار کرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی عرب کے تاریخی مسلّمات میں سے ہے کہ عاد کا صرف وہ حصہ باقی رہا جو حضرت ہودؑ کا پیرو تھا۔ انہی بقایائے عاد کا نام تاریخ میں عادِ ثانیہ ہے اور حصنِ غراب کا وہ کتبہ جس کا ہم ابھی اوپر ذکر کر چکے ہیں انہی کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس کتبے میں جسے تقریباً ۱۸ سو برس قبل مسیحؑ کی تحریر سمجھا جاتا ہے، ماہرینِ آثار نے جو عبارت پڑھی ہے اس کے چند جملے یہ ہیں:

"ہم نے ایک طویل زمانہ اس قلعہ میں اس شان سے گزارا ہے کہ ہماری زندگی تنگی و بدحالی سے دور تھی، ہماری نہریں دریا کے پانی سے لبریز رہتی تھیں، اور ہمارے حکمران ایسے بادشاہ تھے جو برے خیالات سے پاک اور اہلِ شر و فساد پر سخت تھے۔ وہ ہم پر ہودؑ کی شریعت کے مطابق حکومت کرتے تھے اور عمدہ فیصلے ایک کتاب میں درج کر لیے جاتے تھے۔ اور ہم معجزات اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے۔"

یہ عبارت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عاد کی قدیم عظمت و شوکت اور خوشحالی کے وارث آخر کار وہی لوگ ہوئے جو حضرت ہودؑ پر ایمان لائے تھے۔ ۱۲۷؎

قرآن میں ان کے عروج اور استکبار کا ذکر

قومِ نوحؑ کی تباہی کے بعد دنیا میں جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی۔

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (الاعراف، آیت ۶۹) "یاد کرو اللہ کے اس فضل و انعام کو کہ قوم نوح کے بعد اس نے تم کو خلیفہ بنایا۔"

جسمانی حیثیت سے یہ بڑے تنومند اور زور آور لوگ تھے۔

وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً (الاعراف ۶۹) "اور تمہیں جسمانی ساخت میں خوب تنومند کیا۔"

اپنے زمانے میں یہ بے نظیر قوم تھی، کوئی دوسری قوم اس کی ٹکر کی نہ تھی۔

الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (الفجر ۸) "جس کے مانند ملکوں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔"

ان کا تمدن بڑا شاندار تھا۔ اونچے اونچے ستونوں کی بلند و بالا عمارتیں بنانا اس کی وہ خصوصیت تھی جس کے لیے وہ اس وقت کی دنیا میں مشہور تھی۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ "تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے کیا کیا ستونوں والے

الْعِمَادِ ۔ (الفجر۔ آیت ۶-۷) عاد ارم کے ساتھ ؟

اس مادی اور جسمانی زور آوری نے ان کو سخت متکبر بنا دیا تھا اور انہیں اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا ۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۔ (حم السجدہ۔ آیت ۱۵)

رہے عاد تو انہوں نے زمین میں حق کی راہ سے ہٹ کر تکبر کی روش اختیار کی اور کہنے لگے کہ کون ہے ہم سے زیادہ زور آور ؟

ان کا سیاسی نظام چند بڑے بڑے جباروں کے ہاتھ میں تھا جن کے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا :

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (ھود۔ آیت ۵۹) اور انہوں نے ہر جبار دشمن حق کے حکم کی پیروی کی ۔

مذہبی حیثیت سے یہ اللہ تعالیٰ کے منکر نہ تھے بلکہ شرک میں مبتلا تھے ۔ ان کو اس بات سے انکار تھا کہ بندگی صرف اللہ کی ہونی چاہیے ۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۔ (الاعراف۔ آیت ۷۰)

انہوں نے (ہود سے) کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی بندگی کریں اور ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں

ان پر نزول عذاب کی وجہ

قدیم قوم عاد کی تباہی و بربادی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اللہ کو ان کے ساتھ کوئی دشمنی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ انہیں تباہ کر دے ، بلکہ دراصل انہوں نے خود ہی اپنے لیے وہ طرز زندگی پسند کیا جو انہیں بربادی کی طرف لے جانے والا تھا ۔ اللہ نے تو انہیں سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا پورا موقع دیا ۔ ان کی فہمائش کے لیے رسول بھیجے ، رسولوں کے ذریعہ سے ان کو غلط روی کے برے نتائج سے آگاہ کیا اور انہیں کھول کھول کر نہایت واضح طریقے سے بتا دیا کہ ان کے لیے فلاح کا راستہ کونسا ہے اور ہلاکت و بربادی کا کونسا ۔ مگر جب انہوں نے اصلاح حال کے کسی موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور ہلاکت کی راہ چلنے ہی پر اصرار کیا تو لامحالہ ان کا وہ انجام ہونا ہی تھا جو بالآخر ہو کر رہا ۔ (ملخصاً)

عذاب کے بارے میں قرآنی تصریحات

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ (حم السجدہ آیت ۱۶)

آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں ۔

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہوا مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک چلتی رہی ۔ اس کے زور سے لوگ اس طرح گر گر کر مر گئے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے پڑے ہوں

(الحاقہ آیت ۷) جس چیز پر سے بھی یہ ہوا گزر گئی اس کو بوسیدہ کر کے رکھ دیا (الذاریات: ۴۲) جس وقت یہ ہوا آ رہی تھی اس وقت عاد کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے کہ خوب گھٹا گھر کر آئی ہے، بارش ہوگی اور سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے گا۔ مگر وہ آئی تو اس طرح آئی کہ اس نے ان کے پورے علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِى يَوْمِ	ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا
نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۔ تَنزِعُ ٱلنَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ	ان پر بھیج دی جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک
نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ ۔ (القمر: ۱۹-۲۰)	رہی تھی جیسے وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں

یعنی ایک ایسے دن جس کی نحوست کئی روز تک مسلسل جاری رہی۔ سورہ حم السجدہ آیت ۱۶ میں فِىٓ أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اور سورہ الحاقہ آیت ۷ میں فرمایا گیا ہے کہ ہوا کا یہ طوفان مسلسل سات رات اور آٹھ دن جاری رہا۔

۱۔ مشہور یہ ہے کہ جس دن یہ عذاب شروع ہوا وہ بدھ کا دن تھا۔ اسی سے لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ بدھ کا دن منحوس ہے اور کوئی کام اس دن شروع نہ کرنا چاہیے۔ بعض نہایت ضعیف احادیث بھی اس سلسلے میں نقل کی گئی ہیں جن سے اس دن کی نحوست کا عقیدہ عوام کے ذہن میں بیٹھ گیا ہے مثلاً ابن مردویہ اور خطیب بغدادی کی یہ روایت کہ آخر اربعاء فی الشہر یوم نحس مستمر (مہینے کا آخری بدھ منحوس ہے جس کی نحوست مسلسل جاری رہتی ہے)۔ ابن جوزی اسے موضوع کہتے ہیں۔ ابن رجب نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ حافظ سخاوی کہتے ہیں کہ جتنے طریقوں سے یہ منقول ہوئی ہے وہ سب واہی ہیں۔ اسی طرح طبرانی کی اس روایت کو بھی محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے کہ یوم الاربعاء یوم نحس مستمر (بدھ کا دن پیہم نحوست کا دن ہے)۔ بعض اور روایات میں یہ باتیں بھی مروی ہیں کہ بدھ کو سفر نہ کیا جائے، لین دین نہ کیا جائے، ناخن نہ کٹوائے جائیں، مریض کی عیادت نہ کی جائے، اور یہ کہ جذام اور برص اسی روز شروع ہوتے ہیں۔ مگر یہ تمام روایات ضعیف ہیں اور ان پر کسی عقیدے کی بنا نہیں رکھی جا سکتی۔ محقق مناوی کہتے ہیں توقی الاربعاء على جهة الطيرة وظن اعتقاد المنجمين حرام شديد التحريم، إذ الأيام كلها لله تعالى لا تنفع ولا تضر بذاتها۔ "بدھ کے دن کو منحوس سمجھ کر چھوڑنا اور نجومیوں کے سے اعتقادات اس باب میں رکھنا سخت حرام ہے کیونکہ سارے دن اللہ کے ہیں، کوئی دن بذات خود نہ نفع پہنچانے والا ہے نہ نقصان۔" علامہ آلوسی کہتے ہیں "سارے دن یکساں ہیں، بدھ کی کوئی تخصیص نہیں۔ رات دن میں کوئی گھڑی ایسی نہیں ہے جو کسی کے لیے اچھی اور کسی کے لیے بری نہ ہو۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کسی کے لیے موافق اور کسی کے لیے ناموافق حالات پیدا کرتا رہتا ہے۔" (از مؤلف رحمہ ۲۷)

فصل ۴

قوم ثمود

تعارف

یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ نزول قرآن سے پہلے اس کے قصے اہل عرب میں زبان زد عام تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔ اسیریا کے کتبات اور یونان، اسکندریہ اور روم کے قدیم مؤرخین اور جغرافیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے۔ چنانچہ رومی مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن فوج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کے خلاف لڑے جن سے ان کی دشمنی تھی۔

قوم ثمود کا مسکن

اس قوم کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحِجر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانہ میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جسے مدائن صالح کہتے ہیں، یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانہ میں حجر کہلاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا۔ اس شہر خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔[1] نزول قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کے موقع پر جب ادھر سے گزرے تو آپ نے مسلمانوں کو یہ آثار عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثار قدیمہ سے ہر صاحب بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک جگہ آپ نے ایک کنوئیں کی نشاندہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنوئیں سے

---

[1] حجاز کے شمالی حصہ میں رابغ سے عقبہ تک اور مدینہ و خیبر سے تیماء اور تبوک تک کا سارا علاقہ آج بھی ثمود کے آثار سے بھرا ہوا ہے۔ نزول قرآن کے زمانہ میں یہ آثار موجودہ حالت سے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوں گے۔ (مؤلف)

پانی لینا، باقی کنووں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درے کو دیکھ کر آپ نے بتایا کہ اسی درے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ چنانچہ وہ مقام آج بھی فج الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ؎

آثارِ ثمود

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا۔ (الاعراف-۷۴)

یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔

ثمود کی یہ صنعت (کوہ تراشی) ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان میں ایلورا، اجنتا اور بعض دوسرے مقامات پر پائی جاتی ہے یعنی وہ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بناتے تھے۔ مدائن صالح میں اب تک ان کی یہ عمارتیں جوں کی توں موجود ہیں اور ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم نے انجینئری میں کتنی حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ ؎

حِجر قوم ثمود کا مرکزی شہر تھا اور اس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العُلا سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ مدینہ سے تبوک جاتے ہوئے یہ مقام شاہراہِ عام پر ملتا ہے۔ اور قافلے اس وادی میں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔

آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ حج کو جاتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہاں سُرخ رنگ کے پہاڑوں میں قوم ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں۔ ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہیں۔ ان مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں۔" ؎

مادّی ترقی اور اخلاقی بگاڑ

اس قوم سے متعلق قرآن مجید میں مختلف مقامات (مثلاً الاعراف آیات ۷۳ تا ۷۹۔ ہود ۶۱ تا ۶۸۔ الحجر ۸۰ تا ۸۴

؎ غزوہ تبوک کے موقع پر ثمود کے ان کھنڈروں میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے ان کو آپ نے جمع کیا اور ان کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا لہٰذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ۔ یہ سیرگاہ نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔ (مؤلف)

(الشعراء ۱۴۱ تا ۱۵۹۔ النمل ۴۵ تا ۵۳۔ الذاریات ۴۳ تا ۴۵۔ القمر ۲۳ تا ۳۱۔ الحاقہ ۴-۵۔ الفجر ۹۔ الشمس ۱۱) پر جو تصریحات کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہی تھی۔ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ (الاعراف ۷۴) مگر اس کی تمدنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کی جو عاد کی ترقی نے کی تھی یعنی معیارِ زندگی بلند سے بلند تر اور معیارِ آدمیت پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف میدانی علاقوں میں عالی شان قصر اور پہاڑوں میں ایلورا اور اجنتہ کے غاروں جیسے مکان بن رہے تھے، دوسری طرف معاشرے میں شرک و بت پرستی کا زور تھا۔ اور زمین ظلم و ستم سے لبریز ہو رہی تھی۔ قوم کے بدترین مفسد لوگ اس کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ اونچے طبقے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مست تھے۔ حضرت صالحؑ کی دعوتِ حق نے اگر اپیل کیا تو نچلے طبقے کے کمزور لوگوں کو کیا۔ اونچے طبقوں نے اسے ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اِنَّا بِالَّذِیٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ "جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کو ہم نہیں مان سکتے۔"

سرکشی کے تین وجوہ

حضرت صالحؑ کی پیروی سے ان کا انکار تین وجوہ سے تھا۔ ایک یہ کہ وہ بشر ہیں۔ انسانیت سے بالاتر نہیں ہیں کہ ہم ان کی بڑائی مان لیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ہماری ہی قوم کے ایک فرد ہیں۔ ہم پر ان کی فضیلت کی کوئی وجہ نہیں۔ تیسرے یہ کہ اکیلے ہیں ہمارے عام آدمیوں میں سے ایک آدمی ہیں، کوئی بڑے سردار نہیں ہیں جس کے ساتھ کوئی بڑا جتھا ہو، لاؤ لشکر ہو، خدم و حشم ہوں، اور اس بنا پر ہم ان کی بڑائی تسلیم کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ نبی یا تو کوئی فوق البشر ہستی ہو، یا اگر وہ انسان ہی ہو تو ہمارے اپنے ملک اور قوم میں پیدا نہ ہوا ہو، بلکہ کہیں اوپر سے اتر کر آئے یا باہر سے بھیجا جائے، اور اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم اسے کوئی رئیس ہونا چاہیے جس کی غیر معمولی شان و شوکت کی وجہ سے یہ مان لیا جائے کہ رہنمائی کے لیے خدا کی نظرِ انتخاب اس پر پڑی ہے۔[۱]

خیر و شر کی کشمکش

چونکہ حضرت صالحؑ کی دعوت کا آغاز ہوا ان کی قوم دو گروہوں میں بٹ گئی۔

فَاِذَا هُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ (النمل آیت ۴۵) "تو یکایک وہ دو متخاصم فریق بن گئے۔"

ایک گروہ ایمان لانے والوں کا، دوسرا گروہ انکار کرنے والوں کا اور اس تفرقہ کے ساتھ ہی ان کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ	اُن کی قوم میں سے جو سردار اپنی بڑائی کا گھمنڈ رکھتے
لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ	تھے انہوں نے اُن لوگوں سے جو کمزور بنا کر رکھے گئے
اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ	تھے۔ ہوا ان میں سے ایمان لاتے تھے، کہا کیا واقعی

قَالُوٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ، قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۔	تم یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے ؟ انہوں نے جواب دیا ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کو لے کر وہ بھیجے گئے ہیں ان متکبرین نے کہا جس چیز پر تم ایمان لاتے ہو اس کے ہم کافر ہیں ۔
(الاعراف ۔ آیات ۷۵-۷۶)	

دوسرے مقام پر قوم صالحؑ کے سرداروں کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ "اے صالحؑ، لے آ وہ عذاب ہم پر جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی رسُولوں میں سے ہے (الاعراف آیت ۷۷)

معجزہ کا مُطالبہ

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ، وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۔ (القمر ۲۷-۲۸)	ہم اونٹنی کو ان کے لیے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں ، اب صبر کے ساتھ دیکھ کہ ان کا کیا انجام ہوتا ہے ان کو جتا دے کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری کے دن پانی پر آئے گا ۔

یہ تشریح ہے اس ارشاد کی کہ "ہم اونٹنی کو ان کے لیے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں"۔ وہ فتنہ یہ تھا کہ یکایک ایک اونٹنی لا کر ان کے سامنے کھڑی کر دی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ ایک دن یہ اکیلی پانی پیے گی اور دوسرے دن تم سب لوگ اپنے لیے اور اپنے جانوروں کے لیے پانی لے سکو گے ۔ اس کی باری کے دن تم میں سے کوئی شخص کسی چشمے اور کنوئیں پر نہ خود پانی لینے کے لیے آئے ، اور نہ اپنے جانوروں کو پلانے کے لیے لائے ۔ یہ چیلنج اس شخص کی طرف سے دیا گیا تھا جس کے متعلق وہ خود کہتے تھے کہ یہ کوئی لاؤ لشکر نہیں رکھتا ۔ نہ کوئی بڑا جتھا اس کی پشت پر ہے ۔ (۲۵-۲۴)

فیصلہ کُن نشانی

سُورۂ شُعراء آیات ۱۵۴ تا ۱۵۶ میں تصریح ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالحؑ سے مطالبہ کیا تھا جو ان کے مامور من اللہ ہونے پر کھلی دلیل ہو اور اسی کے جواب میں حضرت صالحؑ نے اونٹنی کو پیش کیا تھا۔[1] اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہوا تھا اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاء نے اپنی نبوت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبہ پر پیش کیے ہیں نیز یہ بات بھی اس

---

[1] یہی بات سورۂ اعراف میں ارشاد ہوئی ہے ۔ آیت ۷۳ ۔ (مرتب)

اونٹنی کی معجزانہ پیدائش پر دلیل ہے کہ حضرت صالح نے اسے پیش کر کے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اب اس اونٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی معلق ہے۔ یہ آزادانہ تمہاری زمینوں میں چرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ اکیلی پانی پیئے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پیئیں گے۔ اور اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جا سکتی تھی جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ پھر یہ بات کہ ایک کافی مدت تک یہ لوگ اس کے آزادانہ چرنے پھرنے کو اور اس بات کو کہ ایک دن وہ تنہا پانی پیئے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پیئیں، بادل ناخواستہ برداشت کرتے رہے، اور بالآخر بڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا، درآنحالیکہ حضرت صالح کے پاس کوئی طاقت نہ تھی جس کا انہیں کوئی خوف ہوتا۔ اس حقیقت پر مزید دلیل ہے کہ وہ لوگ اس اونٹنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی زور ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دندناتی پھر رہی ہے۔[1] ۲۸۵

اونٹنی کا قتل

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ — انہوں نے اونٹنی کو قتل کر ڈالا اور اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ الاعراف ۷۷

کافی مدت تک یہ اونٹنی ان کی قوم کے لیے ایک مسئلہ بنی رہی۔ لوگ اس پر دلوں میں آزردہ رہتے اور مشورے ہوتے رہتے، اور آخر کار ایک من چلے سردار نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ وہ قوم کو اس بلا سے نجات دلائے گا۔ سورۂ شمس میں اس شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا "جبکہ اٹھا اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی" اور سورۂ قمر میں فرمایا گیا ہے: فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ "انہوں نے اپنے رفیق سے اپیل کی۔ آخر کار وہ یہ کام اپنے ذمہ لے کر اٹھا اور اس نے اونٹنی کی کوچیں کاٹ ڈالیں"۔ ۲۸۶

اگرچہ اونٹنی کو مارا ایک شخص نے تھا جیسا کہ سورۂ قمر اور سورۂ شمس میں ارشاد ہوا ہے، لیکن چونکہ پوری قوم اس مجرم کی پشت پر تھی اور وہ دراصل اس جرم میں پوری قوم کی مرضی کا آلہ کار تھا اس لیے الزام پوری قوم پر عائد کیا گیا ہے۔[2] ۲۸۷

---

[1] قرآن اس امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ اونٹنی کیسی تھی اور کس طرح وجود میں آئی۔ کسی صحیح حدیث میں بھی اس کی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے ان روایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو مفسرین نے اس کی کیفیت پیدائش کے متعلق نقل کی ہیں لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور پر معجزے کی حیثیت رکھتی تھی قرآن سے ثابت ہے۔ ۲۸۸

[2] ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش کے مطابق کیا جائے یا جس کے ارتکاب کو قوم کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہو، ایک قومی گناہ ہے، خواہ اس کا ارتکاب کرنے والا ایک فرد واحد ہی ہو۔ صرف یہی نہیں، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ جو گناہ قوم کے درمیان علی الاعلان کیا جائے اور قوم اسے گوارا کرے وہ بھی قومی گناہ ہے۔ ۲۸۹

حضرت صالحؑ کے خلاف اشرار کی سازش

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ

(النمل آیات ۴۸ تا ۵۱)

"اُس شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ ہم صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو۔"

قبل اس کے کہ وہ اپنے طے شدہ وقت پر حضرت صالحؑ کے ہاں شبخون مارتے، اللہ تعالیٰ نے اپنا عذاب بھیج دیا اور نہ صرف وہ بلکہ ان کی پوری قوم تباہ ہو گئی۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سازش ان لوگوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے بعد کی تھی۔ سورۂ ہود میں ذکر آیا ہے کہ جب انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا تو حضرت صالحؑ نے انہیں نوٹس دیا کہ بس اب تین دن اور مزے کر لو اس کے بعد تم پر عذاب آ جائے گا۔ فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذَٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ۔ اس پر شاید انہوں نے سوچا ہو گا کہ صالحؑ کا عذاب موعود تو آتے آتے آئے، ہم لگے ہاتھوں اونٹنی کے ساتھ اس کا بھی کیوں نہ کام تمام کر دیں۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ انہوں نے شبخون مارنے کے لیے وہی رات تجویز کی ہو گی جس رات عذاب آنا تھا، اور قبل اس کے کہ ان کا ہاتھ حضرت صالحؑ پر پڑتا خدا کا زبردست ہاتھ ان پر پڑ گیا۔

عذاب کی تفصیل

فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ (الشعراء آیت ۱۵۸) "عذاب نے انہیں آ لیا۔"

قرآن میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب اونٹنی مار ڈالی گئی تو حضرت صالحؑ نے اعلان کیا تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ "تین دن اپنے گھروں میں مزے کر لو" (ہود آیت ۶۵) اس نوٹس کی مدت تمام ہونے پر رات کے پچھلے پہر صبح کے قریب ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ایسا سخت زلزلہ آیا جس نے آن کی آن میں پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ صبح ہوئی تو ہر طرف اس طرح

کچلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جیسے باڑے کی باڑھ میں لگی ہوئی جھاڑیاں جانوروں کی آمد و رفت سے پامال ہو کر رہ گئی ہوں۔ نہ ان کے سنگین قصر انہیں اس آفت سے بچا سکے نہ پہاڑوں میں کھودے ہوئے غار۔[1]

اہلِ ایمان کو بچا لیا گیا

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ۔ (ہود، آیت ۶۶)

"آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالحؑ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لاتے تھے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے ان کو محفوظ رکھا۔"

جزیرہ نمائے سینا میں جو روایات مشہور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ثمود پر عذاب آیا تو حضرت صالحؑ ہجرت کر کے وہاں چلے گئے تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ والے پہاڑ کے قریب ہی ایک پہاڑی کا نام نبی صالح ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہی جگہ آنجناب کی جائے قیام تھی۔[2]

ثمود کا تمدنی عروج اور اس کے آثار

جس طرح عاد کے تمدن کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ اُونچے اُونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے، اسی طرح ثمود کے تمدن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت، جس کی بنا پر وہ قدیم زمانے کی قوموں میں مشہور تھے، یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے تھے۔ چنانچہ سورۂ فجر میں جس طرح عاد کو ذات العماد (ستونوں والے) کا لقب دیا گیا ہے اسی طرح ثمود کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ "وہ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں"۔ اس کے علاوہ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے۔ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا۔ (الاعراف، آیت ۷۴) اور ان کی تعمیرات کی غرض و غایت کیا تھی؟ قرآن اس پر لفظ فٰرِهِيْنَ سے روشنی ڈالتا ہے، یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی، اپنی دولت و قوت اور اپنے کمالاتِ فن کی نمائش کے لیے تھا، کوئی حقیقی ضرورت ان کے لیے داعی نہ تھی۔ ایک بگڑے ہوئے تمدن کی شان یہی ہوتی ہے۔ ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سر چھپانے تک کو ڈھنگ کی جگہ نہیں پاتے۔ دوسری طرف اُمراء اور اہلِ ثروت رہنے کیلیے جب ضرورت سے زیادہ محل بنا چکتے ہیں تو بلا ضرورت نمائشی یادگاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

ثمود کی ان عمارتوں میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں جنہیں دسمبر ۱۹۵۹ء میں میں نے خود دیکھا ہے۔ مقابل کے

---

[1] ملاحظہ ہو القمر، آیت ۳۱۔ الاعراف، آیت ۷۸۔ الحجر، آیات ۸۳-۸۴ (مؤلف)

صفحات میں ان کی کچھ تصویریں دی جا رہی ہیں۔ یہ جگہ مدینہ طیبہ اور تبوک کے درمیان حجاز کے مشہور تمام الشیڈر سے (جس کو عہد نبوی میں وادی القریٰ کہا جاتا تھا) چند میل کے فاصلے پر بجانب شمال واقع ہے۔ آج بھی اس جگہ کو مقامی باشندے الحِجر اور مدائن صالح کے ناموں ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اس علاقے میں العُلاء تو اب بھی ایک نہایت سرسبز و شاداب وادی ہے جس میں کثرت سے چشمے اور باغات ہیں۔ مگر الحجر کے گرد و پیش بڑی نحوست پائی جاتی ہے۔ آبادی برائے نام ہے۔ رونیدگی بہت کم ہے۔ چند کوتیں ہیں۔ انہی میں سے ایک کنوئیں کے متعلق مقامی آبادی میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ حضرت صالحؑ کی اونٹنی اسی سے پانی پیتی تھی۔ اب وہ ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سی فوجی چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے (اس کی تصویر دی جا رہی ہے) اس علاقے میں جب ہم داخل ہوئے تو العُلاء کے قریب پہنچتے ہی ہر طرف ہمیں ایسے پہاڑ نظر آئے جو بالکل کھیل کھیل ہو گئے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انہیں سطح زمین سے چوٹی تک جھنجوڑ کر قاش قاش کر رکھا ہے (ان پہاڑوں کی بھی کچھ تصویریں مقابل کے صفحات پر دی جا رہی ہیں)۔ اسی طرح کے پہاڑ ہمیں مشرق کی طرف العُلاء سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً ۵۰ میل تک اور شمال کی طرف ریاست اردن کے حدود میں ۳۰-۴۰ میل اندر تک ملتے چلے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور ۱۰۰ میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک زلزلہ عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ثمود کی جو عمارتیں ہم نے الحجر میں دیکھی تھیں، اسی طرز کی چند عمارتیں ہم کو خلیج عقبہ کے کنارے مدین کے مقام پر اور اردن کی ریاست میں پٹرا (Petra) کے مقام پر بھی ملیں۔ خصوصیت کے ساتھ پٹرا میں ثمودی عمارات اور نبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور ان کی تراش خراش اور طرز تعمیر میں اتنا نمایاں فرق ہے کہ ہر شخص ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ دونوں نہ ایک زمانے کی ہیں اور نہ یہ ایک ہی قوم کا طرز تعمیر ہے۔

انگریز مستشرق ڈاٹی (Daughty) قرآن کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے الحجر کی عمارات کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ ثمود کی نہیں بلکہ نبطیوں کی بنائی ہوئی عمارات ہیں لیکن دونوں کی عمارات کا فرق اس قدر واضح ہے کہ ایک اندھا ہی انہیں ایک قوم کی عمارات کہہ سکتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پہاڑ تراش کر ان کے اندر عمارتیں بنانے کا فن ثمود سے شروع ہوا، اس کے ہزاروں سال بعد نبطیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبل مسیحؑ میں اسے عروج پر پہنچایا اور پھر الحجر میں (جس کے غار پٹرا سے تقریباً سات سو برس پہلے کے ہیں) یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔[۹۲]

فصل ۵

قومِ ابراہیم علیہ السلام

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انہوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستانِ عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں اپنے خلیفہ مقرر کیے۔ شرقِ اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو اور اندرونِ عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے   وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔ ؎

مولدِ ابراہیم علیہ السلام

جدید اثری تحقیقات کے سلسلہ میں نہ صرف وہ شہر دریافت ہو گیا ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے بلکہ دورِ ابراہیمیؑ میں اس علاقے کے لوگوں کی جو حالت تھی اس پر بھی بہت کچھ روشنی پڑی ہے۔ سر لیونارڈ وولی (Sir Leonard Woolley) نے اپنی کتاب ("Abraham," London, 1935) میں ان تحقیقات کے جو نتائج شائع کیے ہیں ان کا خلاصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

شہرِ اُر کے متعلق تاریخی و تمدنی معلومات

اندازہ کیا گیا ہے کہ سنہ ۲۱۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں، جسے اب عام طور پر محققین حضرت ابراہیمؑ کے ظہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں، شہرِ اُر کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی اور بعید نہیں کہ پانچ لاکھ ہو۔ بڑا صنعتی و تجارتی مرکز تھا۔ ایک طرف پامیر اور نیلگیری تک سے وہاں مال آتا تھا اور دوسری طرف اناطولیہ تک سے اس کے تجارتی تعلقات تھے۔ جس ریاست کا یہ صدر مقام تھا اس کے حدود موجودہ حکومتِ عراق سے شمال میں کچھ کم اور مغرب میں کچھ زیادہ تھے۔ ملک کی آبادی بیشتر صنعت و تجارت پیشہ تھی۔ اس عہد کی جو تحریرات آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں میں دستیاب ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطۂ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دولت

کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصدِ حیات تھا۔ سُود خواری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی سخت کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور آپس میں بہت مقدمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اپنے خداؤں سے ان کی دعائیں زیادہ تر درازیٔ عمر، خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی۔

(۱) عَمیلو۔ یہ اُونچے طبقے کے لوگ تھے، جن میں پجاری، حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔

(۲) مشکینو۔ یہ تجّار، اہلِ صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔

(۳) اَردو۔ یعنی غلام

ان میں سے پہلے طبقہ یعنی عَمیلو کو خاص امتیازات حاصل تھے۔ ان کے فوجداری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے اور ان کی جان و مال کی قیمت دوسروں سے بڑھ کر تھی۔

یہ شہر اور یہ معاشرہ تھا جس میں حضرت ابراہیمؑ نے آنکھیں کھولیں۔ ان کا اور ان کے خاندان کا جو حال ہمیں تلمود میں ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عَمیلو طبقہ کے ایک فرد تھے اور ان کا باپ ریاست کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا (نمرود کے ہاں سلطنت کے سب سے بڑے عہدے (Chief Officer of the State) کا منصب رکھتا تھا)۔

صنعیات، معابد اور مذہبی مراسم

اُر کے کتبات میں تقریباً ۵ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ خدا ہوتا تھا جو ربُّ البَلَد، مہادیو یا رئیس الآلہہ سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبُودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ اُر کا ربُّ البَلَد "نَنّار" (چاند دیوتا) تھا اور اسی مناسبت سے بعد کے لوگوں نے اس شہر کا نام "قمرینہ" بھی لکھا ہے۔ دوسرا بڑا شہر لَرسہ تھا جو بعد میں اُر کے بجائے مرکزِ سلطنت ہوا۔ اس کا ربُّ البَلَد "شماش" (سُورج دیوتا) تھا۔ ان بڑے خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کیے گئے تھے اور لوگ اپنی مختلف فروعی ضروریات اُن سے متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی اور زمینی دیوتاؤں کی شبیہیں بُتوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں اور تمام مراسمِ عبادت انہی کے آگے بجا لائے جاتے تھے۔ "نَنّار" کا بُت اُر میں سب سے اُونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اسی کے قریب "نَنّار" کی بیوی "نن گل" کا معبد تھا۔ نَنّار کے معبد کی شان ایک شاہی محل کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ایک پجارن جا کر اس کی دُلہن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں (Religious Prostitutes) کی سی تھی۔

وہ عورت بڑی معتزز خیال کی جاتی تھی جو "خدا" کے نام پر اپنی بکارت قربان کر دے۔ کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو "راہِ خدا" میں کسی اجنبی کے حوالے کرنا عورت کے لیے ذریعۂ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں کہ اس مذہبی قحبہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پجاری حضرات ہی ہوتے تھے۔

"ننّار" دیوتا کا مقام

ننّار محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ ملک کا سب سے بڑا زمیندار، سب سے بڑا تاجر، سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغ، مکانات، اور زمینیں اس مندر کے لیے وقف تھیں۔ اس جائداد کی آمدنی کے علاوہ کسان، زمیندار، تجار سب ہر قسم کے غلّے، دودھ، سونا، کپڑا اور دوسری چیزیں لاکر مندر میں نذر بھی کرتے تھے۔ تجارتی کاروبار بھی بہت بڑے پیمانے پر مندر کی طرف سے ہوتا تھا۔ یہ سب کام دیوتا کی نیابت میں پجاری ہی انجام دیتے تھے پھر ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی مندر ہی میں تھی۔ پجاری اس کے جج تھے اور ان کے فیصلے "خدا" کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ خود شاہی خاندان کی حاکمیت بھی ننّار ہی سے ماخوذ تھی۔ اصل بادشاہ ننّار تھا اور فرمانروائے ملک اس کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ اس تعلق سے بادشاہ خود بھی معبودوں میں شامل ہو جاتا تھا اور خداؤں کے مانند اس کی پرستش کی جاتی تھی۔

نمرودی سلطنت کا آغاز، عروج اور خاتمہ

اُر کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں حکمران تھا اس کے بانیٔ اوّل کا نام اُرنمّو تھا جس نے ۲۳۰۰ برس قبل مسیح ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس کے حدود مملکت مشرق میں سُوسَہ سے لے کر مغرب میں لبنان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اسی سے اس خاندان کو "نمّو" کا نام ملا جو عربی میں جا کر نمرود ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اس خاندان اور قوم پر مسلسل تباہی نازل ہونی شروع ہوئی پہلے عیلامیوں نے اُر کو تباہ کیا اور نمرود کو ننّار کے بت سمیت پکڑ لے گئے۔ پھر لَرسَہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت اُر کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخر کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابل نے زور پکڑا اور لَرسَہ اور اُر دونوں اس کے زیرِ حکم ہو گئے۔ ان تباہیوں نے ننّار کے ساتھ اُر کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا کیونکہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

تعلیم ابراہیمیؑ کے اثرات بعد کے ادوار میں

یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کے ادوار میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کا اثر اس ملک کے لوگوں نے کہاں تک قبول کیا۔ لیکن ۱۹۱۰ قبل مسیحؑ میں بابل کے بادشاہ حمورابی (یا ہمیل) نے جو قوانین مرتب کیے تھے وہ شہادت دیتے ہیں کہ بالواسطہ یا بلا واسطہ اُن کی تدوین میں مشکوٰۃ نبوّت سے حاصل کی ہوئی روشنی

کسی حد تک ضرور کارفرما تھی۔ اِن قوانین کا مفصّل کتبہ سنہ ۱۹۰۲ء بعد مسیح میں ایک فرانسیسی مُفتّش آثارِ قدیمہ کو ملا اور اس کا انگریزی ترجمہ C. H. W. Johns نے سنہ ۱۹۰۳ء بعد مسیح میں The Oldest Code of law کے نام سے شائع کیا۔ اِس ضابطۂ قوانین کے بہت سے اصُول اور فروع موسوی شریعت سے مشابہت رکھتے ہیں۔

مکمّل مُشرکانہ نظامِ تمدّن

یہ اب تک کی اثری تحقیقات کے نتائج اگر صحیح ہیں تو ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم میں شرک محض ایک مذہبی عقیدہ اور بُت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس قوم کی پُوری معاشی، تمدّنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام اسی عقیدے پر مبنی تھا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت ابراہیمؑ توحید کی جو دعوت لے کر اُٹھے تھے اس کا اثر صرف بُتوں کی پرستش ہی پر نہ پڑتا تھا بلکہ شاہی خاندان کی معبودیّت اور حاکمیت، پجاریوں اور اُونچے طبقوں کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی حیثیت، اور پُورے ملک کی اجتماعی زندگی اُس کی زد میں آئی جاتی تھی۔ ان کی دعوت کو قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ نیچے سے اُوپر تک ساری سوسائٹی کی عمارت اُدھیڑ ڈالی جاتے اور اسے از سرِ نو توحیدِ الٰہ کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے۔ اسی لیے ابراہیم علیہ السّلام کی آواز بلند ہوتے ہی عوام اور خواص، پجاری اور نمرود سب کے سب بیک وقت اس کو دبانے کے لیے کھڑے ہو گئے ۲۹۵ء

نمرُودی نظامِ شرک کا جائزہ

قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام مُشرک سوسائٹیوں کی یہ مُشترک خصوصیت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ربُّ الارباب اور خدائے خدائیگاں کی حیثیت سے تو مانتے ہیں، مگر صرف اُسی کو رب اور تنہا اُسی کو خدا اور معبُود نہیں مانتے۔

خُدائی کو مُشرکین نے ہمیشہ دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک فوق الفطری (Supernatural) خدائی جو سلسلۂ اسباب پر حکمران ہے اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مُشکلات میں دستگیری کے لیے رجُوع کرتا ہے۔ اِس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اَرواح اور فرشتوں اور جِنّوں اور سیاروں اور دوسری بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھیراتے ہیں، اُن سے دُعائیں مانگتے ہیں، ان کے سامنے مراسمِ پرستش بجالاتے ہیں اور اُن کے آستانوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ دوسری تمدّنی اور سیاسی معاملات کی خُدائی (یعنی حاکمیت) جو قوانینِ حیات مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعتِ امر کی مستحق ہو، اور جسے دنیوی معاملات میں فرماں روائی کے مطلق اختیارات حاصل ہوں۔ اِس دوسری قسم کی خدائی کو دنیا کے تمام مشرکین نے قریب قریب ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب

کرکے، یا اس کے ساتھ شاہی خاندانوں اور مذہبی پروہتوں اور سوسائٹی کے اگلے پچھلے بڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اکثر شاہی خاندان اسی دوسرے معنی میں خدائی کے مدعی ہوتے ہیں۔ اور اسے مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے بالعموم پہلے معنی والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریکِ سازش رہے ہیں۔

نمرود کا دعوائے خدائی بھی اسی دوسری قسم کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسبابِ عالم کے پورے سلسلے پر اس کی حکومت چل رہی ہے۔ بلکہ اسے دعویٰ اس امر کا تھا کہ اس ملکِ عراق کا اور اس کے باشندوں کا حاکمِ مطلق میں ہوں، میری زبان قانون ہے، میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دِہ ہوں، اور عراق کا ہر وہ باشندہ باغی و غدار ہے جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے یا میرے سوا کسی اور کو رب تسلیم کرے۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ توحید کی سیاسی زد

ابراہیم علیہ السلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین ہی کو خدا اور معبود اور رب مانتا ہوں اور اس کے سوا سب کی خدائی اور ربوبیت کا قطعی طور پر منکر ہوں، تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہوا کہ قومی مذہب اور مذہبی معبودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابلِ برداشت ہے، بلکہ یہ سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا کہ قومی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس عقیدے کی جو زد پڑتی ہے اسے کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جرمِ بغاوت کے الزام میں نمرود کے سامنے پیش کیے گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کا اتمامِ حجّت

اس وقت جب نمرود سے ابراہیم علیہ السّلام نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے"۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا "اچھا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا"۔ یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا۔

اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلے فقرے ہی سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، تاہم نمرود اس کا جواب ڈھٹائی سے دے گیا۔ لیکن دوسرے فقرے کے بعد اس کے لیے مزید ڈھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اسی خدا کے زیرِ فرمان ہیں، جس کو ابراہیمؑ نے رب مانا ہے پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا؟ مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی اس کو تسلیم کر لینے کے معنی اپنی مطلق العنان فرمانروائی سے دست بردار ہو جانے

سکے تھے جس کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھا۔ لہٰذا وہ صرف ششدر ہی ہو کر رہ گیا، خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا۔ اگر اس طاغوت کے بجائے اس نے خدا کو اپنا ولی و مددگار بنایا ہوتا، تو اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی اس تبلیغ کے بعد راہِ راست کھل جاتی۔

نارِ نمرود اور گلزارِ خلیلؑ

تلمود کا بیان ہے کہ اس کے بعد بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ قید کر دیئے گئے۔ دس روز تک وہ جیل میں رہے پھر بادشاہ کی کونسل نے ان کو زندہ جلا دینے کا فیصلہ کیا۔[1]

قرآن مجید کی رو سے بھی اُنہوں نے واقعی اپنے اس فیصلے پر عمل کیا اور جب آگ کا الاؤ تیار کر کے انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو اس میں پھینکا تب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی ہو جائے اور بے ضرر بن کر رہ جائے۔[2]

قومِ ابراہیمؑ دنیا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا، اس میں سے اگر کسی کو بقا نصیب ہُوا تو صرف ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مبارک فرزندوں (اسماعیلؑ و اسحاقؑ) کی اولاد ہی کو نصیب ہُوا۔[3] قرآن میں اگرچہ اُس عذاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے نکل جانے کے بعد ان کی قوم پر آیا، لیکن اس

---

[1] حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں پھینکے جانے کے واقعہ کے متعلق قرآن کے حسبِ ذیل مقامات دیکھے جا سکتے ہیں:۔ الانبیاء، آیات ۶۸ تا ۷۰۔ العنکبوت ۲۴۔ الصّٰفّٰت: ۹۷-۹۸۔ (مرتبین)

[2] یہ بھی صریح طور پر ان معجزات میں سے ایک ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان معجزات کی اس لیے تاویلیں کرتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کے لیے بھی نظامِ عالم کے معمول (Routine) سے ہٹ کر کوئی غیر معمولی کام کرنا ممکن نہیں ہے تو آخر وہ خدا کو ماننے ہی کی زحمت کیوں اُٹھاتا ہے؟ اور اگر وہ اس طرح کی تاویلیں اس لیے کرتا ہے کہ جدید زمانے کے نام نہاد عقلیت پرست ایسی باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ہم اس سے پُوچھتے ہیں کہ بندۂ خدا تیرے اُوپر یہ فرض کس نے عائد کیا تھا کہ تُو کسی نہ کسی طرح انہیں منوا کر ہی چھوڑ؟ جو شخص قرآن کو، جیسا کہ وہ ہے، ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسے منوانے کی خاطر قرآن کو اس کے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا جبکہ قرآن کے الفاظ قدم قدم پر اس ڈھالنے کی مزاحمت کر رہے ہوں، آخر کس قسم کی تبلیغ ہے اور کون معقول آدمی اسے جائز سمجھ سکتا ہے؟[1]

[3] بلکہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو مخاطب کر کے یہ اعلان فرمایا کہ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (البقرہ آیت ۱۲۴) یعنی ہم نے تمہیں ساری انسانیت کی امامت کا منصب سونپا۔ چنانچہ آج دنیا کے تمام زندہ الہامی سلسلۂ مذاہب کے پیرو مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور نصرانی حضرت ابراہیمؑ سے یکساں وابستگی رکھتے ہیں۔ (مرتبین)

کا شمار مُعذّب قوموں ہی میں کیا گیا ہے[1]۔

بابل کے وہ حکمران اور پنڈت اور پروہت جنہوں نے ابراہیم علیہ السّلام کی دعوت کو نیچا دکھانا چاہا تھا اور اس کے وہ مُشرک باشندے جنہوں نے آنکھیں بند کرکے ان ظالموں کی پیروی کی تھی، وہ تو دنیا سے مٹ گئے اور ایسے مٹے کہ آج دُنیا میں کہیں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں، مگر وہ شخص جسے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے جُرم میں اُن لوگوں نے جلا کر خاک کر دینا چاہا تھا، اور جسے آخر کار بے سروسامانی کے عالم میں وطن سے نکل جانا پڑا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ سرفرازی عطا فرمائی کہ چار ہزار برس سے دنیا میں اس کا نام روشن ہے اور قیامت تک رہے گا۔ دنیا کے تمام مسلمان، عیسائی اور یہودی اس خلیل رب العٰلمین کو بالاتفاق اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ دنیا کو ان چالیس صدیوں میں جو کچھ بھی ہدایت کی روشنی میسّر آئی ہے اسی ایک انسان اور اس کی پاکیزہ اولاد کی بدولت میسّر آئی ہے۔ آخرت میں جو اجرِ عظیم اس کو ملے گا وہ تو ملے گا ہی، مگر اس دنیا میں بھی اس نے وہ عزت پائی جو حصُولِ دُنیا کے پیچھے جان کھپانے والوں میں سے کسی کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔ تہ ۱۵

تلمُود کا بیان

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اس اہم واقعے کا بائیبل میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کے عراقی دور کا کوئی واقعہ بھی اس کتاب میں جگہ نہیں پاسکا ہے۔ نمرُود سے ان کی مڈبھیڑ، باپ اور قوم سے ان کی کش مکش، بُت پرستی کے خلاف ان کی جدوجہد، آگ میں ڈالے جانے کا قصہ اور بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبُور ہونا، ان میں سے ہر چیز بائیبل کی کتاب "پیدائش" کے مُصنّف کی نگاہ میں ناقابلِ التفات تھی۔ وہ صرف ان کی ہجرت کا ذکر کرتا ہے مگر وہ بھی اس انداز سے کہ جیسے ایک خاندان تلاشِ معاش میں ایک ملک چھوڑ کر دُوسرے ملک میں جا کر آباد ہو رہا ہے۔ قرآن اور بائیبل کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ اختلاف یہ ہے کہ قرآن کے بیان کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ کا مُشرک باپ اُن پر ظلم کرنے میں پیش پیش تھا، اور بائیبل کہتی ہے کہ ان کا باپ خود اپنے بیٹوں، پوتوں اور بہوؤں کو لے کر حاران میں جا بسا (پیدائش، باب ۱۱۔ آیات ۲۷ تا ۳۲)۔ اس کے بعد یکایک خدا حضرت ابراہیمؑ سے کہتا ہے کہ تو حاران کو چھوڑ کر کنعان میں جا کر بس جا اور "میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا، سو تو باعث برکت ہو، جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اُس پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے" (پیدائش باب ۱۲ آیت ۱-۳)۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک حضرت ابراہیمؑ پر یہ نظرِ عنایت کیوں ہوگئی۔

---

[1] اَلَمۡ یَاۡتِہِمۡ نَبَاُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ ۬ۙ وَقَوۡمِ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاَصۡحٰبِ مَدۡیَنَ وَالۡمُؤۡتَفِکٰتِ (التوبہ آیت ۷۰)

تلمود میں البتہ سیرت ابراہیمی کے عراقی دور کی وہ بیشتر تفصیلات ملتی ہیں جو قرآن کے مختلف مقامات پر بیان ہوتی ہیں، مگر دونوں کا تقابل کرنے سے نہ صرف یہ کہ قصے کے اہم اجزاء میں بیّن تفاوت نظر آتا ہے بلکہ ایک شخص صریح طور پر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تلمود کا بیان بکثرت بے جوڑ اور خلافِ قیاس باتوں سے بھرا پڑا ہے اور اس کے برعکس قرآن بالکل منقح صورت میں حضرت ابراہیمؑ کے اہم واقعاتِ زندگی کو پیش کرتا ہے جن میں کوئی لغویات آنے نہیں پائی ہے۔ توضیحِ مدعا کے لیے ہم یہاں تلمود کی داستان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کی غلطی پوری طرح کھل جائے جو قرآن کو بائیبل اور یہودی لٹریچر کا خوشہ چین قرار دیتے ہیں۔

تلمود کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش کے روز نجومیوں نے آسمان پر ایک علامت دیکھ کر نمرود کو مشورہ دیا تھا کہ تارح کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے اسے قتل کر دے۔ چنانچہ وہ ان کے قتل کے درپے ہوا۔ مگر تارح نے اپنے ایک غلام کا بچہ ان کے بدلے میں دے کر انہیں بچا لیا۔ اس کے بعد تارح نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک غار میں لے جا کر چھپا دیا جہاں ۱۰ سال تک وہ رہے۔ گیارھویں سال حضرت ابراہیمؑ کو تارح نے حضرت نوحؑ کے پاس پہنچا دیا اور ۳۹ سال تک وہ حضرت نوحؑ اور اُن کے بیٹے سام کی تربیت میں رہے۔ اسی زمانے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی سگی بھتیجی سارہ سے نکاح کر لیا جو عمر میں ان سے ۴۲ سال چھوٹی تھیں (بائیبل اس کی تصریح نہیں کرتی کہ سارہ حضرت ابراہیمؑ کی بھتیجی تھیں۔ نیز وہ دونوں کے درمیان عمر کا فرق صرف دس سال بتاتی ہے (پیدائش، باب ۱۱، آیت ۲۹۔ اور باب ۱۷۔ آیت ۱۷)

پھر تلمود کہتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پچاس سال کی عمر میں حضرت نوحؑ کا گھر چھوڑ کر اپنے باپ کے ہاں آ گئے۔ یہاں انہوں نے دیکھا کہ باپ بُت پرست ہے اور گھر میں سال کے بارہ مہینوں کے حساب سے ۱۲ بُت رکھے ہیں۔ انہوں نے پہلے تو باپ کو سمجھانے کی کوشش کی، اور جب اس کی سمجھ میں بات نہ آئی تو ایک روز موقع پا کر اس گھر یلو بُت خانے کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ تارح نے آ کر اپنے خداؤں کا یہ حال جو دیکھا تو سیدھا نمرود کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ ۵۰ برس پہلے میرے ہاں جو لڑکا پیدا ہوا تھا آج اس نے میرے گھر میں یہ حرکت کی ہے آپ اس کا فیصلہ کیجیے۔ نمرود نے بُلا کر حضرت ابراہیمؑ سے باز پرس کی۔ اُنہوں نے سخت جوابات دیئے۔ نمرود نے ان کو تو فوراً جیل بھیج دیا اور پھر معاملہ اپنی کونسل میں پیش کیا تاکہ مسلاح مشورے سے اس مقدمے کا فیصلہ کیا جائے۔ کونسل کے ارکان نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ آگ کا ایک بڑا الاؤ تیار کرایا گیا اور حضرت ابراہیمؑ اس میں پھینک دیئے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کے بھائی اور خسر حاران کو بھی پھینکا گیا، کیونکہ نمرود نے تارح سے جب پوچھا کہ تیرے اس بیٹے کو تو میں پیدائش ہی کے روز قتل کرنا چاہتا تھا، تو نے اس وقت اسے بچا کر دوسرا بچہ کیوں اس کے بدلے قتل کرایا، تو اس نے کہا

کہ ہیں نے حاران کے کہنے سے یہ حرکت کی تھی، اس لیے خود اس فعل کے مرتکب کو تو چھوڑ دیا گیا اور مشورہ دینے والے کو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ آگ میں پھینکا گیا۔ آگ میں گرتے ہی حاران فوراً جل بھن کر کوئلہ ہو گیا مگر حضرت ابراہیمؑ کو لوگوں نے دیکھا کہ اندر اطمینان سے ٹہل رہے ہیں۔ نمرود کو اس معاملے کی اطلاع دی گئی۔ اس نے آکر جب خود اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھ لیا تو پکار کر کہا "آسمانی خدا کے بندے، آگ سے نکل آ اور میرے سامنے کھڑا ہو جا۔"

حضرت ابراہیمؑ باہر آگئے۔ نمرود ان کا معتقد ہو گیا اور اس نے بہت سے قیمتی نذرانے ان کو دے کر رخصت کر دیا۔

اس کے بعد تلمود کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ دو سال تک وہاں رہے۔ پھر نمرود نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا اور اس کے نجومیوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ ابراہیمؑ تیری سلطنت کی تباہی کا موجب بنے گا، اسے قتل کرا دے۔ اس نے ان کے قتل کے لیے آدمی بھیجے، مگر حضرت ابراہیمؑ کو خود نمرود ہی کے عطا کیے ہوئے غلام الیعزر نے قبل از وقت اس منصوبے کی اطلاع دے دی اور حضرت ابراہیمؑ نے بھاگ کر حضرت نوحؑ کے ہاں پناہ لی۔ وہاں تارح آکر ان سے خفیہ طور پر ملتا رہا اور آخر باپ بیٹوں کی یہ صلاح ہوئی کہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ حضرت نوحؑ اور سام نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ تارح اپنے بیٹے ابراہیمؑ اور پوتے لوطؑ اور پوتی اور بہو سارہ کو لے کر اُر سے حاران چلا گیا۔ (منتخباتِ تلمود از ایچ پولانو لندن صفحہ ۳۰ تا ۴۲)

کیا اس داستان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ قرآن کا ماخذ ہو سکتی ہے؟

فصل ۶

قومِ لوطؑ

بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے دو بھائی تھے۔ نحور اور حاران۔ حضرت لوطؑ حاران کے بیٹے تھے (پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۶)۔ سورۂ عنکبوت آیت ۲۶ میں حضرت ابراہیمؑ کا جو تذکرہ آیا ہے اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم میں سے صرف ایک حضرت لوطؑ ہی ان پر ایمان لائے تھے۔[1]

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام، فلسطین و مصر میں گشت لگا کر دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے جو قومِ لوطؑ کے نام سے مشہور ہوئی ہے۔ اہلِ سدوم کو ان کی قوم اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ شاید ان کا رشتہ داری کا تعلق اس قوم سے ہو گا۔

قومِ لوطؑ کا علاقہ

یہ قوم اس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج کل شرقِ اُردن (Trans Jordan) کہا جاتا ہے اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اس قوم کے صدر مقام "سدوم" بتایا گیا ہے جو بحیرۂ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا۔ تلمود میں لکھا ہے کہ سدوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے اور ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہونے لگتی تھی۔ مگر آج اس قوم کا نام و نشان دنیا سے بالکل نابید ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرۂ مردار (Dead Sea) ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے جسے آج تک بحرِ لوط کہا جاتا ہے۔[2]

---

1 یہودیوں کی تحریف کردہ بائیبل میں حضرت لوطؑ کی سیرت پر جہاں اور بہت سے سیاہ دھبے لگائے گئے ہیں وہاں ایک دھبہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ سے لڑ کر سدوم کے علاقے میں چلے گئے تھے (پیدائش، باب ۱۳، آیت ۱-۱۲)۔ مگر قرآن اس غلط بیانی کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے اُنہیں رسول بنا کر اُس قوم کی طرف بھیجا تھا۔[3]

حجاز سے شام اور عراق سے مصر جاتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستے میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے ان آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پورے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ بحرِ لوط (بحرِ مُردار) کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے جنوبی حصّے کے متعلق جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ یہاں اس درجہ ویرانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی ۳۰۵؎

قومِ لُوطؑ کا بگاڑ

(۱) اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۔

(الشعراء۔ آیت ۱۶۶)

کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اُسے چھوڑ دیتے ہو، بلکہ تم لوگ تو حد سے ہی گزر گئے ۔

(۲) اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۔(العنکبوت آیت ۲۸)

کیا تم وہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جو دنیا کی مخلوق میں سے کسی نے تم سے پہلے نہیں کیا ۔

(۳) اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ۔

(العنکبوت۔ آیت ۲۹)

کیا تمہارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بُرے کام کرتے ہو ۔

یعنی ان سے شہوت رانی کرتے ہو، جیسا کہ سُورۂ اعراف میں ہے اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَاۗءِ "تم خواہشِ نفس پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو" اور اُوپر سے غضب یہ ہے کہ یہ) فحش کام چھُپ کر بھی نہیں کرتے بلکہ عَلانیہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ یہی بات سُورۂ نمل میں فرمائی ہے اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۔کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے فحش کاری کرتے ہو ۳۰۶؎

وہ قابلِ نفرت فعل جس کی بدولت قومِ لُوطؑ نے شہرتِ دوام حاصل کی ہے، اس کے ارتکاب سے تو بدکردار انسان کبھی باز نہیں آتے، لیکن یہ فخر صرف یُونان کو حاصل ہے کہ اس کے فلاسفہ نے اس گھناؤنے جُرم کو اخلاقی خوبی کے مرتبے تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی اُسے موجودہ یورپ اور امریکہ نے پُورا کیا کہ علانیہ اس کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا گیا یہاں تک کہ ایک ملک (جرمنی) کی پارلیمنٹ نے اسے باقاعدہ جائز ٹھہرا دیا (اور بعض اور مغربی ممالک میں بھی اب ایسے قانوناً جائز کر دیا گیا ہے۔ ...) حالانکہ یہ بالکل ایک صریح حقیقت ہے کہ مباشرتِ ہم جنس قطعی طور پر وضعِ فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ذی حیات

انواع میں نر و مادہ کا فرق محض تناسُل اور بقائے نوع کے لیے رکھا ہے اور نوعِ انسانی کے اندر اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل کر ایک خاندان وجود میں لائیں اور اس سے تمدّن کی بنیاد پڑے۔ اسی مقصد کے لیے مرد اور عورت دو الگ صنفیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پیدا کی گئی ہے۔ ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصدِ زوجیت کے لیے عین مناسب بنائی گئی ہے۔ اور ان کے جذب و انجذاب میں وہ لذّت رکھی گئی ہے جو فطرت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے بیک وقت داعی و محرّک بھی ہے اور اس خدمت کا صلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس اسکیم کے خلاف عمل کر کے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذّت حاصل کرتا ہے وہ ایک ہی وقت میں متعدد جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اوّلاً وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اس میں خللِ عظیم برپا کر دیتا ہے جس سے دونوں کے جسم، نفس اور اخلاق پر نہایت بُرے اثرات مترتّب ہوتے ہیں۔ ثانیاً وہ فطرت کے ساتھ غدّاری اور خیانت کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ فطرت نے جس لذّت کو نوع اور تمدّن کی خدمت کا صلہ بنایا تھا اور جس کے حصول کو فرائض اور ذمّہ داریوں اور حقوق کے ساتھ وابستہ کیا تھا، وہ اسے کسی خدمت کی بجا آوری اور کسی فرض اور حق کی ادائیگی اور کسی ذمّہ داری کے التزام کے بغیر چُرا لیتا ہے۔ ثالثاً، وہ انسانی اجتماع کے ساتھ کھلی بددیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے قائم کیے ہوئے تمدّنی اداروں سے فائدہ تو اُٹھا لیتا ہے، مگر جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فرائض اور ذمّہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے بجائے اپنی قوّتوں کو پوری خود غرضی کے ساتھ ایسے طریقہ پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدّن و اخلاق کے لیے صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ایجاباً مضرّت رساں ہے۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور خاندان کی خدمت کے لیے نااہل بناتا ہے، اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا کرتا ہے۔ اور کم از کم دو عورتوں کے لیے بھی صنفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کے دروازے کھول دیتا ہے ۸۴

(۷) وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۝ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِىْ ضَيْفِىْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ

اور جب ہمارے فرشتے لُوطؑ کے پاس پہنچے تو اُن کی آمد سے وہ بہت گھبرایا اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔ (ان مہمانوں کا آنا تھا کہ) اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ لُوطؑ نے اُن سے کہا "بھائیو، یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر

مَا لَنَا فِي بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ وَّ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۔ (ہود۔ آیات ۷۷ تا ۷۹)

ہیں کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟" انہوں نے جواب دیا "تجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔"

اس قصے کی جو تفصیلات قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں ان کے مخواتے کلام سے یہ بات صاف مترشح ہوتی ہے کہ یہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے ہاں پہنچے تھے اور حضرت لوطؑ اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ فرشتے ہیں یہی سبب تھا کہ ان مہمانوں کی آمد سے آپ کو سخت پریشانی و دل تنگی لاحق ہوئی۔ اپنی قوم کو جانتے تھے کہ وہ کیسی بدکردار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ حضرت لوطؑ کا اشارہ قوم کی لڑکیوں کی طرف ہو کیونکہ نبی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے اور قوم کی لڑکیاں اس کی نگاہ میں اپنی بیٹیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کا اشارہ خود اپنی صاحبزادیوں کی طرف ہو۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ حضرت لوطؑ نے اُن سے زنا کرنے کے لیے کہا ہوگا "یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہیں" کا فقرہ ایسا غلط مفہوم لینے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ حضرت لوطؑ کا منشا صاف طور پر یہ تھا کہ اپنی شہوتِ نفس کو اس فطری اور جائز طریقے سے پورا کرو جو اللہ نے مقرر کیا ہے اور اس کے لیے عورتوں کی کمی نہیں ہے۔

یہ فقرہ (وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ) ان لوگوں کے نفس کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے کہ وہ خباثت میں کس قدر ڈوب گئے تھے۔ بات صرف اس حد تک ہی نہیں تھی کہ وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ سے ہٹ کر ایک گندی خلافِ فطرت راہ پر چل پڑے تھے، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اب اسی گندی راہ ہی میں تھی۔ ان کے نفس میں اب طلب اُس گندگی ہی کی رہ گئی تھی اور وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے کہ یہ راستہ تو ہمارے لیے بنا ہی نہیں ہے۔ یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے بگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے جس سے فروتر کسی مرتبے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس شخص کا معاملہ تو بہت ہلکا ہے جو محض نفس کی کمزوری کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو جاتا ہو مگر حلال کو چاہنے کے قابل اور حرام کو بچنے کے قابل چیز سمجھتا ہو۔ ایسا شخص کبھی سُدھر بھی سکتا ہے، اور نہ سُدھرے تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بگڑا ہوا انسان ہے۔ مگر جب کسی شخص کی ساری رغبت صرف حرام ہی میں ہو اور وہ سمجھے کہ حلال اس کے لیے ہے ہی نہیں تو اس کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دراصل ایک گندا کیڑا ہے جو غلاظت ہی میں پرورش پاتا ہے اور طیبات سے اس کے مزاج کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ ایسے کیڑے اگر کسی صفائی پسند

انسان کے گھر میں پیدا ہو جاتیں تو وہ پہلی فرصت میں فیناٹل ڈال کر ان کے وجود سے اپنے گھر کو پاک کر دیتا ہے۔ پھر بھلا خدا اپنی زمین پر ان گندے کیڑوں کے اجتماع کو کب تک گوارا کر سکتا تھا۔ ۳۲۸ھ

(۵) وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ . قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ . وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ . قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ . قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ .

(الحجر، آیات ۶۷ تا ۷۱)

اتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بیتاب ہو کر لوطؑ کے گھر چڑھ آئے۔ لوطؑ نے کہا "بھائیو، یہ میرے مہمان ہیں، میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو، مجھے رُسوا نہ کرو۔" وہ بولے "کیا ہم بارہا تمہیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو؟" لوطؑ نے عاجز ہو کر کہا "اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں۔"

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کی بداخلاقی کس حد کو پہنچ چکی تھی۔ بستی کے ایک شخص کے ہاں چند خوبصورت مہمانوں کا آجانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ اس کے گھر پر اوباشوں کا ایک ہجوم اُمنڈ آئے اور علانیہ وہ اس سے مطالبہ کریں کہ اپنے مہمانوں کو بدکاری کے لیے ہمارے حوالے کر دے۔ ان کی پوری آبادی میں کوئی ایسا عنصر باقی نہ رہا تھا جو ان حرکات کے خلاف آواز اُٹھاتا، اور نہ ان کی قوم میں کوئی اخلاقی حس باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو علی الاعلان یہ زیادتیاں کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس ہوتی۔ حضرت لوطؑ جیسے مقدس انسان اور معلمِ اخلاق کے گھر پر بھی جب بدمعاشوں کا حملہ اس بے باکی کے ساتھ ہو سکتا تھا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عام انسانوں کے ساتھ ان بستیوں میں کیا کچھ ہو رہا ہوگا۔ ۳۲۹ھ

تلمود کا بیان

تلمود میں اس قوم کے جو حالات لکھے ہیں ان کا خلاصہ ہم یہاں دیتے ہیں جس سے کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگا کہ یہ قوم اخلاقی فساد کی کس انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عیلامی مسافر ان کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ راستہ میں شام ہو گئی اور اسے مجبوراً ان کے شہر سدوم میں ٹھیرنا پڑا۔ اس کے ساتھ اپنا زادِ راہ تھا۔ کسی سے اس نے میزبانی کی درخواست نہ کی۔ بس ایک درخت کے نیچے اُتر گیا۔ مگر ایک سدومی اصرار کے ساتھ اُٹھا کر اسے اپنے گھر لے گیا۔ رات اسے اپنے ہاں رکھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کا گدھا اس کے زین اور مالِ تجارت سمیت اُڑا دیا۔ اُس نے شور مچایا، مگر کسی نے اس کی فریاد نہ سُنی۔ بلکہ بستی کے لوگوں نے اس کا رہا سہا مال بھی لُوٹ کر اُسے نکال باہر کیا۔

ایک مرتبہ حضرت سارہ (حضرت ابراہیمؑ کی بیوی) نے حضرت لوطؑ کے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے

نے پہلے اپنے غلام اِلیعزر کو سدوم بھیجا۔ الیعزر جب شہر میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ ایک سدومی ایک اجنبی کو مار رہا ہے۔ الیعزر نے اسے شرم دلائی کہ تم بیکس مسافروں سے یہ سلوک کرتے ہو۔ مگر جواب میں سر بازار الیعزر کا سر پھاڑ دیا گیا۔

ایک مرتبہ ایک غریب آدمی کہیں سے ان کے شہر میں آیا اور کسی نے اسے کھانے کو کچھ نہ دیا۔ وہ فاقے سے بدحال ہو کر ایک جگہ گرا پڑا تھا کہ حضرت لُوطؑ کی بیٹی نے اسے دیکھ لیا اور اس کے لیے کھانا پہنچایا۔ اس پر حضرت لُوطؑ اور ان کی بیٹی کو سخت ملامت کی گئی اور اُنہیں دھمکیاں دی گئیں کہ ان حرکتوں کے ساتھ تم لوگ ہماری بستی میں نہیں رہ سکتے۔

اس طرح کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد تلمود کا مُصنّف لکھتا ہے کہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں یہ لوگ سخت ظالم، دھوکہ باز اور بدمعاملہ تھے۔ کوئی مسافر ان کے علاقے سے خیریت سے نہ گزر سکتا تھا۔ کوئی غریب ان کی بستیوں سے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ پا سکتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مر جاتا اور یہ اس کے کپڑے اُتار کر اس کی لاش کو برہنہ دفن کر دیتے۔ بیرونی تاجر اگر شامت کے مارے وہاں چلے جاتے تو برسرِعام لُوٹ لیے جاتے اور ان کی فریاد کو ٹھٹھوں میں اُڑا دیا جاتا۔ اپنی وادی کو انہوں نے ایک باغ بنا رکھا تھا جس کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہُوا تھا۔ اس باغ میں وہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ علانیہ بدکاریاں کرتے تھے اور ایک لُوطؑ کی زبان کے سوا کوئی زبان ان کو ٹوکنے والی نہ تھی۔

قرآن کا ایجازِ بیان

قرآن مجید میں اس ساری داستان کو صرف دو فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے کہ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ (وہ پہلے سے بہت بُرے بُرے کام کر رہے تھے)۔ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ۔ (تم مردوں سے خواہشِ نفس پُوری کرتے ہو، مسافروں کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں کھُلّم کھُلّا بدکاریاں کرتے ہو)۔ (۱۰۰)

نبی کی دعوت پر ردِّعمل

حضرت لُوطؑ نے جب آیاتِ ماسبق کے مطابق دعوتِ اصلاح دی تو ان کی قوم نے بھڑک کر ان سے کہا کہ:-

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ۔ (الشّعراء۔ ۱۶۷)	"اے لُوطؑ، اگر تو ان باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں ان میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا۔"

یعنی تجھے معلوم ہے کہ اس سے پہلے جس نے بھی ہمارے خلاف زبان کھولی ہے یا ہماری حرکتوں پر احتجاج کیا ہے

یا ہماری مرضی کے خلاف کام کیا ہے۔ وہ ہماری بستیوں سے نکالا گیا ہے۔ اب اگر تو یہ باتیں کرے گا تو تیرا حشر بھی ایسا ہی ہوگا۔

سورۂ اعراف اور سورۂ نمل میں بیان ہوا ہے کہ حضرت لوطؑ کو یہ نوٹس دینے سے پہلے اس شہر پر قوم کے لوگ آپس میں یہ طے کر چکے تھے کہ اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ اِنَّھُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَھَّرُوْنَ۔ یعنی لوطؑ اور اس کے خاندان والوں اور ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں، ان صالحین کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔[اسے]

فرشتوں کی آمد

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰھِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْٓا اِنَّا مُھْلِكُوْٓا اَھْلِ ھٰذِهِ الْقَرْیَةِ اِنَّ اَھْلَھَا كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ۔ (العنکبوت - ۳۱)	"اور جب ہمارے فرستادے ابراہیمؑ کے پاس بشارت لے کر پہنچے تو انہوں نے اس سے کہا ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں اس کے لوگ سخت ظالم ہو چکے ہیں"

جو فرشتے قوم لوطؑ پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے وہ پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس حاضر ہوئے اور انہوں نے آنجناب کو حضرت اسحٰقؑ کی اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ کی پیدائش کی بشارت دی، پھر یہ بتایا کہ ہمیں قوم لوطؑ کو تباہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔[اللہ]

قَالَ اِنَّ فِیْھَا لُوْطًا۔ (العنکبوت ۳۲)	ابراہیمؑ نے کہا "وہاں تو لوطؑ موجود ہے"

سب سے پہلے تو حضرت ابراہیمؑ فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھ کر ہی گھبرا گئے، کیونکہ اس شکل میں فرشتوں کا آنا کسی خطرناک مہم کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ پھر جب انہوں نے آپ کو بشارت دی اور آپ کی گھبراہٹ دُور ہو گئی اور آپ کو معلوم ہوا کہ یہ مہم قوم لوطؑ کی طرف جا رہی ہے تو آپؑ اس قوم کے لیے بڑے اصرار کے ساتھ رحم کی درخواست کرنے لگے (فَلَمَّا ذَھَبَ عَنْ اِبْرٰھِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰی یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ) مگر یہ درخواست قبول نہ ہوئی اور فرمایا گیا کہ اس معاملہ میں اب کچھ نہ کہو، تمہارے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ عذاب اب ٹلنے والا نہیں ہے (یٰٓاِبْرٰھِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ ھٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّھُمْ اٰتِیْھِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ)۔ اس جواب سے جب حضرت ابراہیمؑ کو یہ امید باقی نہ رہی کہ قوم لوطؑ کی مہلت میں کوئی اضافہ ہو سکے گا تب انہیں حضرت لوطؑ کی فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے وہ بات عرض کی جو یہاں نقل کی گئی ہے کہ "وہاں تو لوطؑ موجود ہے" یعنی یہ عذاب اگر لوطؑ کی موجودگی میں نازل ہوا تو وہ اور ان کے اہل و عیال اس سے

---

[۱] کسی قوم کے بگاڑ کی یہ آخری حد ہوتی ہے کہ وہ داعیانِ اصلاح کی بات قبول نہ کرنے سے آگے بڑھ کر ان کی معاندین جاتی ہے

تفہیم القرآن!

کیسے محفوظ رہیں گے۔ ۳۱۳ ے

قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۔ (العنکبوت۔ ۳۲)	انہوں نے کہا "ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے ہم اسے اور اس کی بیوی کے سوا اس کے باقی سب گھر والوں کو بچالیں گے" اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔

اس عورت کے متعلق سورۂ تحریم (آیت ۔ ۱۰) میں بتایا گیا ہے کہ یہ حضرت لوطؑ کی وفادار نہ تھی۔ اسی وجہ سے اس کے حق میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ بھی ایک نبی کی بیوی ہونے کے باوجود عذاب میں مبتلا کر دی جائے۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت لوطؑ ہجرت کے بعد جب اُردن کے علاقے میں آکر آباد ہوئے ہوں گے تو انہوں نے اسی قوم میں شادی کرلی ہو گی۔ لیکن ان کی صحبت میں ایک عمر گزار دینے کے بعد بھی یہ عورت ایمان نہ لائی اور اس کی ہمدردیاں اور دلچسپیاں اپنی قوم ہی کے ساتھ وابستہ رہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رشتہ داریاں اور رشتہ داریاں کوئی چیز نہیں ہیں، ہر شخص کے ساتھ معاملہ اس کے اپنے ایمان و اخلاق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لیے پیغمبر کی بیوی ہونا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکا اور اس کا انجام اپنے شوہر کے ساتھ ہونے کے بجائے اپنی اس قوم کے ساتھ ہوا جس کے ساتھ اس نے اپنا دین و اخلاق وابستہ کر رکھا تھا۔ ۳۱۴ ے

حضرت لوطؑ کی پریشانی

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا ۔ (العنکبوت ۳۳)	پھر جب ہمارے فرشتادے لوطؑ کے پاس پہنچے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور دل تنگ ہوا۔

اس پریشانی اور دل تنگی کی وجہ یہ تھی کہ فرشتے بہت خوبصورت نوخیز لڑکوں کی شکل میں آتے تھے۔ حضرت لوطؑ اپنی قوم کے اخلاق سے واقف تھے، اس لیے ان کے آتے ہی وہ پریشان ہو گئے کہ میں اپنے ان مہمانوں کو ٹھیراؤں تو اس بدکردار قوم سے ان کو بچانا مشکل ہے، اور نہ ٹھیراؤں تو یہ بڑی بے مروتی ہے جسے شرافت گوارا نہیں کرتی۔ مزید برآں یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر میں ان مسافروں کو اپنی پناہ میں نہ لوں گا تو رات انہیں کہیں اور گزارنی پڑے گی اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ گویا میں نے خود انہیں بھیڑیوں کے حوالہ کیا ہے۔ ۳۱۵ ے

سورۂ ہود میں بیان ہوا ہے کہ جب لوگ حضرت لوطؑ کے گھر میں گھسے چلے آ رہے تھے اور آپ نے محسوس کیا کہ اب آپ کسی طرح بھی اپنے مہمانوں کو ان سے نہیں بچا سکتے تو آپ پریشان ہو کر چیخ اُٹھے کہ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ "کاش میرے پاس تمہارے ٹھیک کر دینے کی طاقت ہوتی یا کسی زورآور کی حمایت میں پا سکتا"۔ اس وقت فرشتوں نے کہا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ

"اے لُوطؑ، ہم تمہارے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں یہ تم تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔"

وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ (آیت ۳۳) "انہوں نے کہا" نہ ڈرو اور نہ رنج کرو۔"

یعنی ہمارے معاملہ میں نہ اس بات سے ڈرو کہ یہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ اس بات کے لیے فکر مند ہو کہ ہمیں ان سے کیسے بچایا جائے۔ یہی موقع تھا جب فرشتوں نے حضرت لوطؑ پر یہ راز فاش کیا کہ وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں جنہیں اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔[۱۲]

لُوط علیہ السلام کے قصے کی جو تفصیلات قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں ان کے فحوائے کلام سے یہ بات صاف مترشح ہوتی ہے کہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے ہاں پہنچے تھے اور حضرت لوطؑ اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ فرشتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان مہمانوں کی آمد سے آپ کو سخت پریشانی و دل تنگی لاحق ہوئی۔ اپنی قوم کو جانتے تھے کہ وہ کیسی بدکردار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔

ان مہمانوں کا آنا تھا کہ اس قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ لوطؑ نے ان سے کہا، بھائیو! یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟ انہوں نے جواب دیا تجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں؟ (ہود۔ آیت ۷۸-۷۹)[۱۹]

وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ۔ (القمر: ۳۷)	پھر انہوں نے اسے اپنے مہمانوں کی حفاظت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ آخرکار ہم نے ان کی آنکھیں موند دیں کہ چکھو اب میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزا۔

حضرت لوطؑ نے ان کی بے انتہا منت سماجت کی کہ وہ اس ذلیل حرکت سے باز رہیں مگر وہ نہ مانے اور گھر میں گھس کر زبردستی مہمانوں کو نکال لینے کی کوشش کی۔ اس آخری مرحلے پر یکایک ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ پھر فرشتوں نے حضرت لوطؑ سے کہا کہ وہ اور ان کے گھر والے صبح ہونے سے پہلے اس بستی سے نکل جائیں، اور ان کے نکلتے ہی اس قوم پر ایک ہولناک عذاب نازل ہو گیا۔ بائیبل میں یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "تب وہ اس مرد یعنی لوطؑ پر پل پڑے اور نزدیک آئے تاکہ کواڑ توڑ ڈالیں لیکن ان مردوں یعنی فرشتوں نے اپنے ہاتھ بڑھا کر لوطؑ کو اپنے پاس گھر میں کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا اور ان مردوں کو جو گھر کے دروازے پر تھے، کیا چھوٹے کیا بڑے اندھا کر دیا، سو وہ دروازہ

ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے۔" پیدائش، ۱۹ : ۹ - ۱۱)[316]

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ۔ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ۔ (الذّاریات ۳۲-۳۴)

انہوں نے کہا ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسا دیں جو آپکے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لیے نشان زدہ ہیں۔

یعنی ایک ایک پتھر پر آپ کے رب کی طرف سے نشان لگا دیا گیا ہے کہ اُسے کس مُجرم کی سرکوبی کرنی ہے۔[320]

نزولِ عذاب

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۚ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ (ھود۔ ۸۲-۸۳)

پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑتوڑ برسائے جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دُور نہیں ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ (الشعراء۔ آیت: ۱۷۳)

اور ہم نے ان پر برسائی ایک برسات بڑی ہی بُری بارش تھی جو ان ڈرائے جانے والوں پر نازل ہوئی۔

غالباً یہ عذاب ایک سخت زلزلے اور آتش فشانی انفجار کی شکل میں آیا تھا۔ زلزلے نے ان کی بستیوں کو تل پٹ کیا اور آتش فشاں مادّے کے پھٹنے سے ان کے اوپر زور کا پتھراؤ ہوا۔ پکی ہوئی مٹی کے پتھروں سے مُراد شاید وہ متحجر مٹی ہے جو آتش فشاں علاقے میں زیرِ زمین حرارت اور لاوے کے اثر سے پتھر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آج تک بحرِ لُوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں اس انفجار کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔[321]

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (الذّاریات ۳۶)

اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

پُوری قوم میں اور اس کے پُورے علاقے میں صرف ایک گھر تھا جس میں ایمان و اسلام کی روشنی پائی جاتی تھی، اور وہ تنہا حضرت لوطؑ کا گھر تھا۔ باقی پوری قوم فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کا سارا ملک گندگی سے لبریز ہو چکا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس ایک گھر کے لوگوں کو بچا کر نکال لیا اور اس کے بعد اس ملک پر وہ تباہی نازل کی جس سے اس بدکار قوم کا کوئی فرد بچ کر نہ جا سکا۔[1][322]

---

[1] اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اس وقت تک کسی قوم کی کامل تباہی کا فیصلہ نہیں کرتا جب تک اس میں کچھ قابلِ لحا

بائبل میں اس عذاب کی تفصیلات

بائبل کے بیانات، قدیم یونانی اور لاطینی تحریروں، جدید زمانے کی طبقات الارضی تحقیقات اور آثار قدیمہ کے مشاہدات سے اس عذاب کی تفصیلات پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بحیرۂ مردار (Dead Sea) کے جنوب اور مشرق میں جو علاقہ آج انتہائی ویران اور سنسان حالت میں پڑا ہوا ہے۔ اس میں بکثرت پرانی بستیوں کے کھنڈروں کی موجودگی پتہ دیتی ہے کہ یہ کسی زمانہ میں نہایت آباد علاقہ رہا تھا۔ آج وہاں سینکڑوں برباد شدہ قریوں کے آثار ملتے ہیں، حالانکہ اب یہ علاقہ اتنا شاداب نہیں ہے کہ اتنی آبادی کا بوجھ سہار سکے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی و خوشحالی کا دور ۲۳۰۰ء قبل مسیح سے ۱۹۰۰ء قبل مسیح تک رہا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مؤرخین کا اندازہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں گزرے ہیں۔ اس لحاظ سے آثار کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے کہ یہ علاقہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ کے عہد ہی میں برباد ہوا ہے۔

اس علاقے کا سب سے زیادہ آباد اور سرسبز و شاداب حصہ وہ تھا جسے بائبل میں سدیم کی وادی کہا گیا ہے۔ جس کے متعلق بائبل کا بیان ہے کہ "وہ اس سے پیشتر کہ خداوند نے سدوم اور عمورہ کو تباہ کیا، خداوند کے باغ (عدن) اور مصر کے مانند خوب سیراب تھی" (پیدائش باب ۱۳، آیت ۱۰)۔ موجودہ زمانے کے محققین کی عام رائے یہ ہے کہ وہ وادی اب بحیرۂ مردار کے اندر غرق ہے اور یہ رائے مختلف آثار کی شہادتوں سے قائم کی گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں بحیرۂ مردار جنوب کی طرف اتنا وسیع نہ تھا جتنا اب ہے۔ شرقِ اردن کے موجودہ شہر الکرک کے سامنے مغرب کی جانب اس بحیرے میں جو ایک چھوٹا سا جزیرہ نما "اللسان" پایا جاتا ہے، قدیم زمانے میں بس یہی پانی کی آخری سرحد تھی۔ اس کے نیچے کا حصہ جہاں اب پانی پھیل گیا ہے (جسے ملحقہ نقشے میں ہم نے

بھلائی موجود رہے۔ بُرے لوگوں کی اکثریت کے مقابلے میں اگر ایک قلیل عنصر بھی ایسا پایا جاتا ہو جو بدی کو روکنے اور نیکی کے راستے کی طرف بلانے کے لیے کوشاں ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ مگر جب حالت یہ ہو جائے کہ کسی قوم کے اندر رائی کے دانے کے برابر بھی خیر باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو دو چار نیک انسان اس کی بستیوں میں بُرائی کے خلاف لڑتے لڑتے تھک کر عاجز آ چکے ہوں انہیں وہ اپنی قدرت سے کسی نہ کسی طرح بچا کر نکال دیتا ہے اور باقی لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو ہر ہوشمند مالک اپنے سڑے ہوئے پھلوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ ۲۳۳ھ

آثری تحریروں سے نمایاں کیا ہے ، پہلے ایک سرسبز وادی کی شکل میں آباد تھا اور یہی وہ وادی سدیم تھی جس میں قوم لوط کے بڑے بڑے شہر سدوم ، عمورہ ، اَدمہ ، ضبوئیم اور ضُغر واقع تھے ۔ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے یہ وادی پھٹ کر دب گئی اور بحیرۂ مردار کا پانی اس کے اوپر چھا گیا ۔ آج بھی یہ بحیرے کا سب سے زیادہ اُتھلا حصہ ہے مگر رومی عہد میں یہ اتنا اُتھلا تھا کہ لوگ اللسان سے چل کر مغربی ساحل تک پانی میں سے گزر جاتے تھے ۔ اس وقت تک جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبے ہوئے جنگلات صاف نظر آتے ہیں ، بلکہ یہ شبہ بھی کیا جاتا ہے کہ پانی میں کچھ عمارات بھی ڈوبی ہوئی ہیں ۔

بائیبل اور قدیم یونانی ولاطینی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں جگہ جگہ نفط (پیٹرول) اور اسفالٹ کے گڑھے تھے اور بعض بعض جگہ زمین سے آتش گیر گیس بھی نکلتی تھی ۔ اب بھی وہاں زیر زمین پٹرول اور گیسوں کا پتہ چلتا ہے ۔ طبقات الارضی مشاہدات سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے ساتھ پٹرول ، گیس اور اسفالٹ زمین سے نکل کر بھڑک اٹھے اور سارا علاقہ بھک سے اُڑ گیا ۔ بائیبل کا بیان ہے کہ اس تباہی کی اطلاع پا کر حضرت ابراہیمؑ جب حبرون سے اس وادی کا حال دیکھنے آئے تو زمین سے دھواں اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے بھٹی کا دھواں ہوتا ہے ۔ (پیدائش باب ۱۹ ۔ آیت ۲۸) [۲۴۴]

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً ۔ اور ہم نے اس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ہے

اس کھلی نشانی سے مراد ہے بحیرہ مردار جسے بحر لوط بھی کہا جاتا ہے ۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کفارِ مکہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اس ظالم قوم پر اس کے کرتوتوں کی بدولت جو عذاب آیا تھا اس کی ایک نشانی آج بھی شاہراہِ عام پر موجود ہے جسے تم شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں جاتے ہوئے شب و روز دیکھتے ہو ۔ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ (الحجر) اور وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ وَبِالَّيْلِ (الصّٰفّٰت)

حالیہ انکشافات

موجودہ زمانے میں یہ بات قریب قریب یقین کے ساتھ تسلیم کی جا رہی ہے کہ بحیرۂ مردار کا جنوبی حصہ ایک ہولناک زلزلے کی وجہ سے زمین میں دھنس جانے کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اسی دھنسے ہوئے حصے میں قوم لوط کا مرکزی شہر سدوم (Sodom) واقع تھا ۔ اس حصے میں پانی کے نیچے کچھ ڈوبی ہوئی بستیوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں ۔ حال میں جدید آلات غوطہ زنی کی مدد سے یہ کوشش شروع ہوئی ہے کہ کچھ لوگ نیچے جا کر ان آثار کی جستجو کریں ۔ لیکن ابھی تک ان کوششوں کے نتائج سامنے نہیں آئے ہیں ۔ [۲۴۵]

وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۔ (الذاریات : ۳۷)

اس کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی ان لوگوں کے لیے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں ۔

اس نشانی سے مراد بحیرۂ مُردار Dead Sea ہے جس کا جنوبی علاقہ آج بھی ایک عظیم الشان تباہی کے آثار پیش کر رہا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کا اندازہ ہے کہ قوم لُوط کے بڑے شہر غالباً شدید زلزلے سے زمین کے اندر دھنس گئے تھے اور ان کے اُوپر بحیرۂ مُردار کا پانی پھیل گیا تھا، کیونکہ اس بحیرے کا وہ حصہ جو اللسان نامی چھوٹے سے جزیرہ نما کے جنوب میں واقع ہے، صاف طور پر بعد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے اور قدیم بحیرۂ مُردار کے جو آثار اس جزیرہ نما کے شمال تک نظر آتے ہیں وہ جنوب میں پائے جانے والے آثار سے بہت مختلف ہیں۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جنوب کا حصہ پہلے اس بحیرے کی سطح سے بلند تھا، بعد میں کسی وقت دھنس کر اس کے نیچے چلا گیا۔ اس کے دھنسنے کا زمانہ بھی دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ معلوم ہوتا ہے اور یہی تاریخی طور پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کا زمانہ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں آثار قدیمہ کی تلاش کرنے والی ایک امریکی جماعت کو اللسان پر ایک بہت بڑا قبرستان ملا ہے جس میں بیس ہزار سے زیادہ قبریں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریب میں کوئی بڑا شہر ضرور آباد ہو گا۔ مگر کسی ایسے شہر کے آثار آس پاس کہیں موجود نہیں ہیں جس سے متصل اتنا بڑا قبرستان بن سکتا ہو۔ اس سے بھی یہ شبہ تقویت پاتا ہے کہ جس شہر کا یہ قبرستان تھا وہ بحیرے میں غرق ہو چکا ہے۔ بحیرے کے جنوب میں جو علاقہ ہے اس میں اب بھی ہر طرف تباہی کے آثار موجود ہیں اور زمین میں گندھک، رال، تارکول اور قدرتی گیس کے اتنے ذخائر پائے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کسی وقت بجلیوں کے گرنے سے یا زلزلے کا لاوا نکلنے سے یہاں ایک جہنم پھٹ پڑی ہو گی۔

فصل ۷

قومِ سبا

قومِ سبا کا علاقہ

سبا جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی، جس کا دارالحکومت مارب، موجودہ یمن کے دارالسلطنت صنعاء سے ۵۵ میل بجانبِ شمال مشرق واقع تھا۔ اس کا زمانۂ عروج مُعین کی سلطنت کے زوال کے بعد تقریباً ۱۱۰۰ ق م سے شروع ہوا اور ایک ہزار سال تک یہ عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔ پھر ۱۱۵ ق م میں جنوبی عرب کی دوسری مشہور قوم حمیر نے اس کی جگہ لے لی۔ عرب میں یمن اور حضر موت اور افریقہ میں حبش کے علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔

مشہور عظیم قوم

مشرقی افریقہ، ہندوستان، مشرقِ بعید اور خود عرب کی جتنی تجارت مصر و شام اور یونان و روم کے ساتھ ہوتی تھی وہ زیادہ تر انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسی وجہ سے یہ قوم قدیم زمانہ میں اپنی دولت کے لیے نہایت مشہور تھی۔ بلکہ یونانی مؤرخین تو اسے دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم کہتے ہیں۔ تجارت کے علاوہ ان کی خوشحالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر ایک بہترین نظامِ آبپاشی قائم کر رکھا تھا جس سے ان کا پورا علاقہ جنت بنا ہوا تھا۔ ان کے ملک کی اس غیر معمولی سرسبزی و شادابی کا ذکر یونانی مؤرخین نے بھی کیا ہے اور سورۂ سبا کے دوسرے رکوع میں قرآن مجید بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے؛[1]

"تاریخ کی رُو سے "سبا" جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عبدالبر اور ترمذی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حسبِ ذیل قبیلے پیدا ہوئے: کِندہ، حمیر، اَزد، اشعریین، مذحج، انمار (جس کی دو شاخیں ہیں، خثعم اور بجیلہ)، عاملہ، جذام، لخم اور غسّان۔

بہت قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شہرہ تھا۔ ۱۱۰۰ قبل مسیح میں اُر کے کتبات اس کا

ذکر سابوم کے نام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابل اور آشور (اسیریا) کے کتبات میں اور اسی طرح بائیبل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو زبور، ۷۲ : ۱۵، یرمیاہ ۶ : ۲۰، حزقی ایل ۲۷ : ۲۲-۳۸ : ۱۳، ایوب ۶ : ۱۹)۔ یونان و روم کے مورخین و جغرافیہ نویس تھیوفراسٹس (۲۸۸ قبل مسیح) کے وقت سے مسیح کے بعد کی کئی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔ اس کا وطن عرب کا جنوبی مغربی گوشہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔

سبا کی مذہبی تاریخ

آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی[1]۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمانؑ (۹۶۵ - ۹۲۶ ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت مسلمان ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور اس نے اَلْمَقَہ (چاند دیوتا)، عَشْتَر (زہرہ)، ذات حَمِیم اور ذات بعدان (سورج دیوی)، ہوبس، حرمتم یا حریمت اور ایسے ہی دوسرے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ اَلْمَقَہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حق دار قرار دیتے تھے۔ یمن میں بکثرت کتبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں اور خصوصاً اَلْمَقَہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا اور ہر اہم واقعہ پر ان کے شکریے ادا کیے جاتے تھے[2]۔

---

[1] قرآن مجید (النمل آیت ۲۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو جب ہُدہُد نے اس قوم کا حال سنایا اُس وقت یہ آفتاب کی عبادت کرتی تھی۔ عرب کی قدیم روایات سے بھی اس کا یہی مذہب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ابن اسحاق علمائے انساب کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ سبا کی قوم دراصل ایک مورث اعلیٰ کی طرف منسوب ہے جس کا نام عبد شمس (بندۂ آفتاب یا سورج کا پرستار) اور لقب سبا تھا۔ بنی اسرائیل کی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔ ان میں بیان کیا گیا ہے کہ ہُدہُد جب حضرت سلیمانؑ کا خط لے کر پہنچا تو ملکۂ سبا سورج دیوتا کی پرستش کے لیے جا رہی تھی۔ ہُدہُد نے راستے ہی میں وہ خط ملکہ کے سامنے پھینک دیا۔

[2] تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانے سے قوم سبا میں ایک عنصر ایسا موجود تھا جو دوسرے معبودوں کو ماننے کے بجائے خدائے واحد کو مانتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اثری تحقیقات کے سلسلے میں یمن کے کھنڈروں سے جو کتبات ملے ہیں ان میں سے بعض اس قلیل عنصر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ۶۵۰ ق م کے لگ بھگ

آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں یمن سے تقریباً ۳ ہزار کتبات فراہم ہوتے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ عربی روایات اور رومی و یونانی تواریخ کی فراہم کردہ معلومات کو اگر جمع کر لیا جائے تو اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اس کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ ان معلومات کی رُو سے اس کی تاریخ کے اہم اَدوار حسبِ ذیل ہیں۔

سنہ ۶۵۰ ق م سے پہلے کا دَور

اس زمانے میں ملوکِ سبا کا لقب مُکَرِّب سبا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لفظ مُقرِّب کا ہم معنی تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بادشاہ انسانوں اور خداؤں کے درمیان اپنے آپ کو واسطہ قرار دیتے تھے، یا دوسرے الفاظ میں یہ کاہن بادشاہ (Priest Kings) تھے۔ اس زمانے میں ان کا پایۂ تخت صرواح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مارب سے مغرب کی جانب ایک دن کی راہ پر پائے جاتے ہیں اور خریبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس دَور میں مارب کے مشہور بند کی بنا رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔

سنہ ۶۵۰ ق م سے سنہ ۱۱۵ ق م تک کا دَور

اس دَور میں سبا کے بادشاہوں نے مُکَرِّب کا لقب چھوڑ کر مَلِک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت میں مذہبیت کی جگہ سیاست اور سیکولرزم کا رنگ غالب ہو گیا۔ اس زمانے میں ملوکِ سبا نے صرواح کو چھوڑ کر مارب کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔ یہ مقام سمندر سے ۳۹۰۰ فیٹ کی بلندی پر صنعاء سے ۶۰ میل جانب مشرق واقع ہے اور آج تک اس کے کھنڈر شہادت

زمانے کے بعض کتبات بتاتے ہیں کہ مملکتِ سبا کے متعدد مقامات پر ایسی عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں جو ذُو سَمَوِی یا ذُو سماوی (یعنی ربِّ السماء) کی عبادت کے لیے مخصوص تھیں۔ بعض مقامات پر اس معبود کا نام ملکن ذُسَموی (وہ بادشاہ جو آسمانوں کا مالک ہے) لکھا ہے۔ یہ عنصر مسلسل صدیوں تک یمن میں موجود رہا۔ چنانچہ ۳۷۸ء کے ایک کتبے میں بھی اِلٰہ ذُو سَموی کے نام سے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ پھر ۴۶۵ء کے ایک کتبے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں بنصر و ردا الٰھن بعل سمین و ارضین (یعنی اس خدا کی مدد اور تائید سے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے)۔ اسی زمانے کے ایک اور کتبے میں جس کی تاریخ ۴۵۸ء ہے، اسی خدا کے لیے رحمان کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ ہیں بردا رحمنن (یعنی رحمان کی مدد سے)۔

دے رہے ہیں کہ یہ کبھی ایک بڑی متمدن قوم کا مرکز تھا۔

سنہ ۱۱۵ ق م سے سنہ ۳۰۰ء تک کا دور

اس زمانے میں سبا کی مملکت پر حِمیَر کا قبیلہ غالب ہو گیا جو قومِ سبا ہی کا ایک قبیلہ تھا اور تعداد میں دیگر تمام قبائل سے بڑھا ہوا تھا۔ اس دور میں مارب کو اُجاڑ کر رَیدان پایۂ تخت بنایا گیا جو قبیلۂ حِمیَر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل موجودہ شہر یریم کے قریب ایک مدوّر پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں اور اسی کے قریب علاقہ میں ایک چھوٹا سا قبیلہ حِمیَر کے نام سے آباد ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص تصور تک نہیں کر سکتا کہ یہ اُسی قوم کی یادگار ہے جس کے ڈنکے کبھی دنیا بھر میں بجتے تھے۔ اسی زمانے میں سلطنت کے ایک حصہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ یمنت اور یمنات کا استعمال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یمن اس پورے علاقے کا نام ہو گیا جو عرب کے جنوبی مغربی کونے پر عَسیر سے عدن تک اور باب المندب سے حضرموت تک واقع ہے۔ یہی دور ہے جس میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا۔

سنہ ۳۰۰ء کے بعد سے آغازِ اسلام تک کا دور

یہ قومِ سبا کی تباہی کا دور ہے۔ اس دور میں ان کے ہاں مسلسل خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوئی۔ تجارت برباد ہوئی۔ زراعت نے دم توڑا اور آخرکار آزادی تک ختم ہو گئی۔ پہلے ریدانیوں، حِمیَریوں اور ہمدانیوں کی باہمی نزاعات سے فائدہ اٹھا کر سنہ ۳۴۰ء سے سنہ ۳۷۸ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی تو بحال ہو گئی مگر مارب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے یہاں تک کہ آخرکار سنہ ۴۵۰ء یا سنہ ۴۵۱ء میں بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر سورۂ سبا میں آیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد اَبرہہ کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مرمتیں ہوتی رہیں، لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی وہ پھر جمع نہ ہو سکی اور نہ آب پاشی اور زراعت کا وہ نظام جو درہم برہم ہو چکا تھا، دوبارہ بحال ہو سکا۔[1]

---

[1] سبا کی قوم ایسی منتشر ہوئی کہ اس کی پراگندگی ضرب المثل ہو گئی۔ آج بھی اہلِ عرب اگر کسی گروہ کے انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں "تفرقوا ایدی سبا" وہ تو ایسے پراگندہ ہو گئے جیسے سبا کی قوم پراگندہ ہوئی تھی"۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب زوال نعمت کا دور شروع ہوا تو سبا کے مختلف قبیلے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر عرب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ غسانیوں نے اُردن اور شام کا رُخ کیا۔ اَوس و خزرج کے قبیلے یثرب میں جا بسے۔ خزاعہ نے جدّہ کے قریب تہامہ کے علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ اَزد کا قبیلہ عُمان میں جا کر آباد ہوا۔ لَخم اور جُذام اور کِندہ بھی نکلنے پر مجبور ہوئے۔ حتیٰ کہ "سبا" نام کی کوئی قوم ہی دنیا میں باقی نہ رہی۔ صرف اس کا ذکر افسانوں میں رہ گیا۔ ۳۴۲

۵۲۳ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ذُونواس نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم و ستم برپا کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں اصحاب الاُخدُود کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہو گئی اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی وائسرائے ابرہہ نے کعبہ کی مرکزیت کو ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو رومی حبشی اثر میں لانے کے لیے ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چند روز قبل، مکہ معظمہ پر حملہ کیا اور اس کی پوری فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآن مجید میں اصحاب الفیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آخرکار ۵۷۵ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا اور اس کا خاتمہ اُس وقت ہوا جب ۶۲۸ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کر لیا۔

قومِ سبا کا مادّی عروج

قومِ سبا کا عروج دراصل دو بنیادوں پر قائم تھا۔ ایک زراعت، دوسرے تجارت۔ زراعت کو انہوں نے آب پاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعہ سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا نظام آب پاشی بابل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ اُن کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہ نکلتے تھے۔ انہی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انہوں نے تالاب بنا لیے تھے اور ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق ہر طرف ایک باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ اس نظامِ آب پاشی کا سب سے بڑا مخزنِ آب وہ تالاب تھا جو شہر مارب کے قریب کوہِ بلق کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ مگر جب اللہ کی نظرِ عنایت ان سے پھر گئی تو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ ملک کا پورا نظامِ آب پاشی تباہ ہو کر رہ گیا، پھر کوئی اسے بحال نہ کر سکا۔[1]

تجارت کے لیے اس قوم کو خدا نے بہترین جغرافی مقام عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہی قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کے بندرگاہوں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالابار کے گرم مسالے، ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں، مشرقی افریقہ کے زنگی غلام، بندر، شتر مرغ کے پر اور ہاتھی دانت پہنچتے تھے اور دوسری طرف یہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچانے تھے جہاں سے روم و یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان، عود، عنبر، مشک، مُر، قرفہ، قصب الذریرہ، سلیخہ اور دوسری ان خوشبودار

---

[1] قرآن میں اس تباہ کن عذاب کا واضح طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔

چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنہیں مصر و شام اور روم و یونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اس عظیم الشان تجارت کے دو بڑے راستے تھے۔ ایک بحری دوسرا بری۔ بحری تجارت کا اجارہ ہزار سال تک انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھا کیونکہ بحر احمر کی موسمی ہواؤں، زیر آب چٹانوں اور لنگر اندازی کے مقامات کا راز یہی لوگ جانتے تھے اور دوسری کوئی قوم اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اُردن اور مصر کی بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔ بری راستے عدن اور حضر موت سے مارب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ، جدہ، یثرب، العلاء، تبوک اور ایلہ سے گزرتی ہوئی پٹرا تک پہنچتی تھی۔ اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرف اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا تھا۔ اس بری راستے پر جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، یمن سے حدود شام تک سبائیوں کی نوآبادیاں مسلسل قائم تھیں اور شب و روز ان کے تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ آج تک ان میں سے بہت سی نوآبادیوں کے آثار اس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی و حمیری زبان کے کتبات مل رہے ہیں۔

تجارتی زوال کا آغاز

پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں اس تجارت پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ شرق اوسط میں جب یونانیوں اور پھر رومیوں کی طاقتور سلطنتیں قائم ہوئیں تو شور مچنا شروع ہوا کہ عرب تاجر اپنی اجارہ داری کے باعث مشرق کے اموالِ تجارت کی من مانی قیمتیں وصول کر رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہم خود اس میدان میں آگے بڑھ کر اس تجارت پر قبضہ کر لیں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے مصر کے یونانی الاصل فرماں روا بطلیموس ثانی (۲۸۵ تا ۲۴۶ ق م) نے اس قدیم نہر کو پھر سے کھولا جو ۱۷ سو برس پہلے فرعون سسوستریس نے دریائے نیل کو بحر احمر سے ملانے کے لیے کھدوائی تھی۔ اس نہر کے ذریعہ سے مصر کا بحری بیڑا پہلی مرتبہ بحر احمر میں داخل ہوا لیکن سبائیوں کے مقابلے میں یہ کوشش زیادہ کارگر نہ ہو سکی۔ پھر جب مصر پر روم کا قبضہ ہوا تو رومی زیادہ طاقتور تجارتی بیڑا بحر احمر میں لے آئے، اور اس کی پشت پر انہوں نے ایک جنگی بیڑا لا کر ڈال دیا۔ اس طاقت کا مقابلہ سبائیوں کے بس میں نہ تھا۔ رومیوں نے جگہ جگہ بندرگاہوں پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کیں، ان میں جہازوں کی ضروریات فراہم کرنے کا انتظام کیا، اور جہاں ممکن ہوا وہاں اپنے فوجی دستے بھی رکھ دیے، حتیٰ کہ ایک وقت وہ آ گیا کہ عدن پر رومیوں کا فوجی تسلط قائم ہو گیا۔ اس سلسلے میں رومی اور حبشی سلطنتوں نے سبائیوں کے مقابلے میں باہم سازباز بھی کر لیا جس کی بدولت بالآخر اس قوم کی آزادی تک ختم ہو گئی۔

بحری تجارت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد صرف بری تجارت سبائیوں کے پاس رہ گئی تھی۔ مگر بہت سے اسباب

نے رفتہ رفتہ اس کی کمر بھی توڑ دی۔ پہلے نبطیوں نے پیٹرا سے العلا تک بالائی حجاز اور اُردن کی تمام نوآبادیوں سے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر سنہ ۱۰۶ء میں رومیوں نے نبطی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور حجاز کی سرحد تک شام و اُردن کے تمام علاقے ان کے مضبوط ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد حبش اور روم کی متحدہ کوشش یہ رہی کہ سبائیوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر ان کی تجارت کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر حبشی بار بار یمن میں مداخلت کرتے رہے، یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔

عذاب سے پہلے کا مُترفانہ تمدن

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اِس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر اُس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی۔ ایک وقت تھا کہ اس کی دولت کے افسانے سُن سُن کر یونان و روم والوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اسٹرابو لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں اور ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت، سونے چاندی اور جواہر کا کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ پلینی کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت ان کی طرف بہی چلی جا رہی ہے۔ یہ اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم ہیں اور ان کا سرسبز و شاداب ملک باغات، کھیتوں اور مواشی سے بھرا ہوا ہے۔ آرٹی میڈورس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی لکڑی کے بجائے دار چینی، صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مؤرخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب سواحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی لپٹیں پہنچتی ہیں۔ انہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صنعاء کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت Skyscraper تعمیر کی جو قصرِ غمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی ۲۰ منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فٹ بلند تھی۔

یہ سب کچھ بس اسی وقت تک رہا جب تک اللہ کا فضل ان کے شاملِ حال رہا۔ آخر کار جب انہوں نے کفرانِ نعمت کی حد کر دی تو ربِّ قدیر کی نظرِ عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ انتہیٰ

فصل ۸

اہلِ مَدیَن و اَصحابُ الاَیکہ

مُفسّرین کے درمیان اِس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مَدیَن اور اَصحابُ الاَیکہ الگ الگ قومیں ہیں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں اور اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سُورۃ اَعراف میں حضرت شُعَیبؑ کو اہلِ مَدیَن کا بھائی فرمایا گیا ہے (وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیبًا) اور یہاں اَصحابُ الاَیکہ کے ذکر میں صرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ اِذْ قَالَ لَھُمْ شُعَیبٌ (جبکہ ان سے شُعَیبؑ نے کہا)، "اُن کے بھائی" (اَخُوھُمْ) کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس بعض مُفسّرین دونوں کو ایک ہی قوم قرار دیتے ہیں کیونکہ سُورۃ اعراف اور ہُود میں جو امراض اور اوصاف اصحابِ مَدیَن کے بیان ہوئے ہیں وہی یہاں اصحابُ الاَیکہ کے بیان ہو رہے ہیں۔ حضرت شُعیبؑ کی دعوت و نصیحت بھی یکساں ہے اور آخر کار ان کے انجام میں بھی فرق نہیں ہے۔

تاریخی تحقیق

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اقوال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحابِ مَدیَن اور اصحاب الاَیکہ بلاشبہ دو الگ قبیلے ہیں، مگر ہیں ایک ہی نسل کی دو شاخیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اولاد اُن کی بیوی یا کنیز قَطُورا کے بطن سے تھی وہ عرب اور اسرائیل کی تاریخ میں بنی قطورا کے نام سے معروف ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا مدیان بن ابراہیمؑ کی نسبت سے مِدیانی یا اصحابِ مَدیَن کہلایا اور اس کی آبادی شمالی حجاز سے فلسطین کے جنوب تک اور وہاں سے جزیرہ نمائے سینا کے آخری گوشے تک بحرِ قلزم اور خلیج عقبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔ اُس کا صدر مقام شہر مَدیَن تھا جس کی جائے وقوع ابوالفداء نے خلیج عقبہ کے مغربی کنارے پر اَیلہ (موجودہ عقبہ) سے پانچ دن کی راہ پر بتائی ہے۔ باقی بنی قطورا جن میں بنی دِدان (Dedanites) نسبتاً زیادہ مشہور ہیں، شمالی عرب میں تَیماء اور تبوک اور العُلاء کے درمیان آباد ہوئے اور اُن کا صدر مقام تبوک تھا جسے قدیم زمانے میں اَیکہ کہتے تھے۔

(یاقوت نے معجم البلدان میں لفظ ایکہ کے تحت بتایا ہے کہ یہ تبوک کا پرانا نام ہے اور اہلِ تبوک میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ یہی جگہ کسی زمانے میں ایکہ تھی)۔

دونوں قبیلوں کے لیے مشترک نبی کیوں؟

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے اور ان کے علاقے بھی بالکل ایک دوسرے سے متصل تھے، بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قطورا کی ان شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ بائیبل کی ابتدائی کتابوں میں جگہ جگہ یہ ذکر ملتا ہے کہ یہ لوگ بعل فغور کی پرستش کرتے تھے اور بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر ان کے علاقے میں آئے تو ان کے اندر بھی انہوں نے شرک اور زناکاری کی وبا پھیلا دی (گنتی باب ۲۵ آیت ۱-۵۔ باب ۳۱ آیت ۱۶-۱۷)۔ پھر یہ لوگ بین الاقوامی تجارت کی ان دو بڑی شاہراہوں پر آباد تھے جو یمن سے شام اور خلیج فارس سے مصر کی طرف جاتی تھیں۔ ان شاہراہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے انہوں نے بڑے پیمانے پر رہزنی کا سلسلہ چلا رکھا تھا۔ دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خراج لیے بغیر نہ گزرنے دیتے تھے اور بین الاقوامی تجارت پر خود قابض رہنے کی خاطر انہوں نے راستوں کا امن خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ قرآن مجید میں ان کی اس پوزیشن کو یوں بیان کیا گیا ہے: وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ "یہ دونوں (یعنی قوم لوط اور اصحاب الایکہ) کھلی شاہراہ پر آباد تھے۔" اور ان کی راہزنی کا ذکر سورۂ اعراف میں اس طرح کیا گیا ہے: وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ "اور ہر راستے پر لوگوں کو ڈرانے نہ بیٹھو۔" یہی اسباب تھے جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قبیلوں کے لیے ایک ہی پیغمبر بھیجا اور ان کو ایک ہی طرح کی تعلیم دی۔

اہلِ مدین کے متعلق مزید تفاصیل[1]

مدین کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، اگرچہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانہ میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے یمن سے مکہ اور ینبوع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی، اور ایک

---

[1] چونکہ یہ مستقل بڑا قبیلہ تھا اور حضرت شعیب علیہ السلام کو قرآن نے ان کے ساتھ زیادہ قریبی نسبت دی (اخاھم) اس لیے اس کے متعلق کچھ زیادہ تفاصیل دی گئی ہیں (مرتب)

دوسری تجارتی شاہ راہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی، اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں تھیں، اسی بنا پر عرب کا بچہ بچہ مدین سے واقف تھا اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی، کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات دن اس کے آثارِ قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔

اہلِ مدین کے متعلق ایک اور ضروری بات جس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے، یہ ہے کہ یہ لوگ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مدیان کی طرف منسوب ہیں جو ان کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ قدیم زمانے کے قاعدے کے مطابق جو لوگ کسی بڑے آدمی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے وہ رفتہ رفتہ اسی کی آل اولاد میں شمار ہو کر بنی فلاں کہلانے لگتے تھے۔ اسی قاعدے پر عرب کی آبادی کا بڑا حصہ بنی اسماعیل کہلایا۔ اور اولادِ یعقوب کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہونے والے لوگ سب کے سب بنی اسرائیل کے جامع نام کے تحت کھپ گئے۔ اسی طرح مدین کے علاقے کی ساری آبادی بھی جو مدیان بن ابراہیم علیہ السلام کے زیر اثر آئی، بنی مدیان کہلائی اور ان کے ملک کا نام ہی مدین یا مدیان ہو گیا۔ اس تاریخی حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ اس قوم کو دینِ حق کی آواز پہلی مرتبہ حضرت شعیبؑ ہی کے ذریعے سے پہنچی تھی۔ درحقیقت بنی اسرائیل کی طرح ابتداءً وہ بھی مسلمان ہی تھے اور شعیب علیہ السلام کے ظہور کے وقت ان کی حالت ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم کی سی تھی جیسی ظہورِ موسیٰ علیہ السلام کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد چھ سات سو برس تک مشرک اور بداخلاق قوموں کے درمیان رہتے رہتے یہ لوگ شرک بھی سیکھ گئے تھے اور بداخلاقیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود ایمان کا دعویٰ اور اس پر فخر برقرار تھا۔ ۲۴۳

دعوتِ اصلاح کا ردِّ عمل

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۔ (الاعراف۔ آیت ۹۰)

اس قوم کے سرداروں نے جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے، آپس میں کہا اگر تم نے شعیبؑ کی پیروی کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔

حضرت شعیبؑ کی دعوتِ اصلاح کے جواب میں مدین کے سردار اور لیڈر کہتے تھے اور یہی بات کا اپنی قوم کو بھی یقین دلاتے تھے کہ شعیبؑ جس ایمانداری اور راستبازی کی دعوت دے رہا ہے اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اصولوں کی پابندی کرانا چاہتا ہے اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے اگر ہم بالکل ہی سچائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں۔ اور ہم جو دنیا کی سب سے بڑی تجارتی شاہ راہوں کے چوراہے

پر بستے ہیں اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدن سلطنتوں کی سرحد پر آباد ہیں اگر ہم قافلوں کو چھیڑنا بند کر دیں اور بے ضرر اور پرامن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو معاشی اور سیاسی فوائد ہمیں اپنی موجودہ جغرافی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور آس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے گی۔ یہ بات صرف قوم شعیب کے سرداروں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں بگڑے ہوئے لوگوں نے حق اور راستی اور دیانت کی روش میں ایسے ہی خطرات محسوس کیے ہیں۔ ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات جھوٹ اور بے ایمانی اور بد اخلاقی کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ہر جگہ دعوتِ حق کے مقابلہ میں جو زبردست عذرات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر دنیا کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے گی تو قوم تباہ ہو جائے گی۔ ۳۳۴ھ

اہل مدین پر عذاب

اہل مدین پر عذاب رجفہ (بھونچال) دھماکے اور زلزلے کی صورت میں آیا۔ ان کی یہ تباہی مدت دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضرب المثل رہی ہے۔ چنانچہ زبور داؤد میں ایک جگہ آتا ہے کہ "اے خدا فلاں فلاں قوموں نے تیرے خلاف عہد باندھ لیا ہے، لہٰذا تو ان کے ساتھ وہی کر جو تو نے مدیان کے ساتھ کیا" (۸۳ : ۵ تا ۹) اور یسعیاہ نبی ایک جگہ بنی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آشور والوں سے نہ ڈرو، اگرچہ وہ تمہارے لیے مصریوں کی طرح ظالم بنے جا رہے ہیں لیکن کچھ دیر نہ گزرے گی کہ رب الافواج ان پر اپنا کوڑا برسائے گا اور ان کا وہی حشر ہوگا جو مدیان کا ہوا" (یسعیاہ : ۱۰ - ۲۱ تا ۲۶) ۳۳۵ھ

اصحاب الایکہ پر عذاب

فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ

(آیت ۱۸۹، الشعراء)

انہوں نے اسے جھٹلایا، آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آ گیا۔ اور وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا۔

ان پر نازل ہونے والے عذاب کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ آسمانی عذاب مانگا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک بادل بھیج دیا اور وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھایا رہا جب تک عذاب نے ان کو بالکل تباہ نہ کر دیا۔ قرآن سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب مدین کے عذاب کی کیفیت اصحاب الایکہ کے

عذاب سے مختلف تھی۔ یہ جیسا کہ یہاں بتایا گیا ہے چھتری والے عذاب سے ہلاک ہوئے۔ اور ان پر عذاب ایک دھماکے اور زلزلے کی شکل میں آیا (فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ، اور وَاَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ)۔ اس لیے ان دونوں کو ملا کر ایک داستان بنانے کی کوشش درست نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے عذاب یوم الظلّہ کی کچھ تشریحات بیان کی ہیں۔ مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کی معلومات کا ماخذ کیا ہے۔ ابن جریرؒ نے حضرت عبداللہؓ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ من حدثک من العلماء ما عذاب یوم الظلّۃ فکذبہ "علماء میں سے جو کوئی تم سے بیان کرے کہ یوم الظلّہ کا عذاب کیا تھا اس کو درست نہ سمجھو"۔ ۱۲۳؎

فصل ۹

قومِ یونسؑ

حضرت یونسؑ کے حالاتِ زندگی

یونس علیہ السلام (جن کا نام بائیبل میں یوناہ ہے اور جن کا زمانہ سنہ ۸۶۰ سے ۷۸۴ قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے)، اگرچہ اسرائیلی نبی تھے، مگر ان کو اشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق بھیجا گیا تھا اور اسی بنا پر اشوریوں کو یہاں قومِ یونس کہا گیا ہے۔ اس قوم کا مرکز اُس زمانہ میں نینوی کا مشہور شہر تھا جس کے وسیع کھنڈرات آج تک دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ شہر موصل کے عین مقابل پائے جاتے ہیں۔ اور اسی علاقے میں "یونس نبی" کے نام سے ایک مقام بھی موجود ہے۔ اس قوم کے عروج کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا دارالسلطنت نینوی تقریباً ۶۰ میل کے دور میں پھیلا ہوا تھا۔

قرآن اور بائیبل میں تذکرۂ یونسؑ

قرآن میں اس قصہ کی طرف چار جگہ صرف اشارات کیے گئے ہیں، کوئی تفصیل نہیں دی گئی[2]۔ اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قوم کن خاص وجوہ کی بنا پر خدا کے اس قانون سے مستثنیٰ کی گئی کہ عذاب کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کسی کا ایمان اس کے لیے نافع نہیں ہوتا۔ بائیبل میں "یوناہ" کے نام سے جو مختصر سا صحیفہ ہے اس میں کچھ تفصیل تو ملتی ہے مگر وہ چنداں قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ کیونکہ اوّل تو نہ وہ آسمانی صحیفہ ہے نہ خود یونس علیہ السلام کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ بلکہ ان کے چار پانچ سو برس بعد کسی نامعلوم شخص نے اسے تاریخِ یونسؑ کے طور پر لکھ کر مجموعہ

---

[1] قرآن میں کہیں ان کا نام لیا گیا ہے اور کہیں "ذوالنون" اور "صاحب الحوت" یعنی مچھلی والے کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مچھلی والا انہیں اس لیے نہیں کہا گیا کہ وہ مچھلیاں پکڑتے یا بیچتے تھے، بلکہ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا تھا جیسا کہ سورۂ صافات آیت ۱۴۲ میں بیان ہوا ہے (تفہیم القرآن جلد سوم۔ الانبیاء، حاشیہ ۸۲)

[2] ملاحظہ ہو سورۂ یونس آیت ۹۸۔ سورۂ انبیاء، آیات ۸۷-۸۸۔ الصافات ۱۳۹-۱۴۸۔ القلم ۴۸-۵۰۔

سب مقدمہ میں شامل کر دیا ہے۔ دوسرے اس میں بعض صریح مُہملات بھی پائے جاتے ہیں جو ماننے کے قابل نہیں ہیں۔ تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونسؑ کی تفصیلات پر غور کرنے سے وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو مفسرین قرآن نے بیان کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام چونکہ عذاب کی اطلاع دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اپنا مستقر چھوڑ گئے تھے[1]، اس لیے جب آثارِ عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ و استغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا[2]۔

قرآن مجید میں خدائی دستور کے جو اصول و کلیات بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کر دیتا۔ پس جب نبیؑ نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا، اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود ہی ہجرت کر گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا، کیونکہ اس پر اتمامِ حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔

قومِ یونسؑ کی آخری تباہی

جب یہ قوم ایمان لے آئی تو اس کی مہلت عمر میں اضافہ کر دیا گیا۔ بعد میں اس نے پھر خیال و عمل کی گمراہیاں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ ناحوم نبی (۷۲۰ء تا ۶۹۸ء قبل مسیح) نے اسے متنبہ کیا، مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر صفنیاہ نبی (۶۴۰ء تا ۶۰۹ء قبل مسیح) نے اس کو آخری تنبیہ کی۔ وہ بھی کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار ۶۱۲ء ق م کے لگ بھگ زمانے میں اللہ تعالیٰ نے میڈیا والوں کو اس پر مسلط کر دیا۔ میڈیا کا بادشاہ بابل والوں کی مدد سے آشور کے علاقے پر چڑھ آیا۔ اشوری فوج شکست کھا کر نینویٰ میں محصور ہو گئی۔ کچھ مدت تک اس نے سخت مقابلہ کیا۔ پھر دجلہ کی طغیانی نے فصیلِ شہر توڑ دی اور حملہ آور اندر گھس گئے۔ پورا شہر جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ گرد و پیش کے علاقے کا بھی یہی حشر ہوا۔ اشور کا بادشاہ خود اپنے محل میں آگ لگا کر جل مرا اور اس کے ساتھ ہی اشوری سلطنت اور تہذیب بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ زمانہ حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں، ان میں آتش زدگی کے نشانات کثرت سے پائے جاتے ہیں ۳۴۹؎

---

[1] یعنی وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے قبل اس کے کہ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم آتا اور ان کے لیے اپنی ڈیوٹی چھوڑنا جائز ہوتا۔ ۳۴۸؎

[2] اس مسئلے پر مفصل بحث تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۸۵ میں کی گئی ہے جس میں معترضین کے تمام اعتراضات کا جواب دے دیا گیا ہے۔

فصل ۱۰

بنی اسرائیل

نسل ابراہیمی کی دو شاخیں

حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں: ایک حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ ان کے پھیلاتے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے، اس لیے وہ اپنا سلسلہ انہی سے جوڑتے تھے۔ دوسرے حضرت اسحاقؑ کی اولاد جن میں حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا، انہوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی ان کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو ان سے الگ رہے مگر مذہباً ان کے متبع رہے۔ اس شاخ میں جب پستی و تنزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔[239]

سورۃ المائدہ کی آیت ۲۰ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس عظمت گذشتہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کسی زمانہ میں ان کو حاصل تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر ان کی قوم میں پیدا ہوتے اور دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں اور ان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ مدت دراز تک یہی اس زمانہ کی مہذب دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے۔ اور انہی کا سکہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔ عموماً لوگ بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰؑ سے شروع کرتے ہیں لیکن قرآن اس مقام پر تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانہ عروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا تھا جسے خود حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔[240]

فلسطین میں بدترین شرک کا دور

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف قومیں آباد تھیں: حِتّی، اَموری، کنعانی، فِرِزّی، حِوّی، یبوسی، فلستی وغیرہ۔ ان قوموں میں بدترین قسم کا شرک پایا جاتا تھا۔ ان کے سب سے بڑے معبود کا نام ایل تھا جسے دیوتاؤں کا باپ کہتے تھے اور اسے عموماً سانڈ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اس کی بیوی کا نام عشیرہ تھا اور اس سے خداؤں اور خدانیوں کی ایک پوری نسل چلی تھی جن کی تعداد ستّر تک پہنچتی تھی۔ ان کی اولاد میں سب سے زیادہ زبردست بعل تھا جس کو بارش اور روئیدگی کا خدا اور زمین و آسمان کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ شمالی علاقوں میں اس کی بیوی اَنات کہلاتی تھی اور فلسطین میں عستارات۔ یہ دونوں خواتین عشق اور افزائشِ نسل کی دیویاں تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی دیوتا موت کا مالک تھا۔ کسی دیوی کے قبضے میں صحت تھی۔ کسی دیوتا کو وبا اور قحط لانے کے اختیارات تفویض کیے گئے تھے۔ اور یوں ساری خدائی بہت سے معبودوں میں بٹ گئی تھی۔ ان دیوتاؤں اور دیویوں کی طرف ایسے ایسے ذلیل اوصاف و اعمال منسوب تھے کہ اخلاقی حیثیت سے انتہائی بدکردار انسان بھی ان کے ساتھ مشتہر ہونا پسند نہ کریں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسی کمینہ ہستیوں کو خدا بنائیں اور ان کی پرستش کریں وہ اخلاق کی ذلیل ترین پستیوں میں گرنے سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو حالات آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں سے دریافت ہوئے ہیں وہ شدید اخلاقی گراوٹ کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کے ہاں بچوں کی قربانی کا عام رواج تھا۔ ان کے معابد زناکاری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ عورتوں کو دیوداسیاں بنا کر عبادت گاہوں میں رکھنا اور ان سے بدکاریاں کرنا عبادت کے اجزا میں داخل تھا۔ اور اسی طرح کی اور بہت سی بداخلاقیاں ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔

بنی اسرائیل میں بگاڑ کا سبب

تورات میں حضرت موسیٰؑ کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو جو ہدایات دی گئی تھیں ان میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تم ان قوموں کو ہلاک کر کے ان کے قبضے سے فلسطین کی سرزمین چھین لینا اور ان کے ساتھ رہنے بسنے اور ان کی اخلاقی و اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔

لیکن بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو وہ اس ہدایت کو بھول گئے۔ انہوں نے اپنی کوئی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقے کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔ اس تفرقے کی وجہ سے ان کا کوئی قبیلہ بھی اتنا طاقتور نہ ہو سکا کہ اپنے علاقے کو مشرکین سے پوری طرح پاک کر دیتا۔ آخرکار انہیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں بسیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے مفتوح علاقوں میں جگہ جگہ ان مشرک قوموں کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں بھی موجود رہیں جن کو بنی اسرائیل

مسخر کر سکے۔ اسی بات کی شکایت زبور میں کی گئی ہے۔[1]

نتائج بد

اس کا پہلا خمیازہ تو بنی اسرائیل کو یہ بھگتنا پڑا کہ ان قوموں کے ذریعے سے ان کے اندر شرک گھس آیا اور اس کے ساتھ بتدریج دوسری اخلاقی گندگیاں بھی راہ پانے لگیں۔ چنانچہ اس کی شکایت بائیبل کی کتاب قضاۃ میں یوں کی گئی ہے:

"اور بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے اور انہوں نے خداوند اپنے باپ دادا کے خدا کو جو انہیں ملک مصر سے نکال لایا تھا چھوڑ دیا اور دوسرے معبودوں کی جو اُن کے گرداگرد کی قوموں کے دیوتاؤں میں سے تھے پیروی کرنے اور ان کو سجدہ کرنے لگے اور خداوند کو غصہ دلایا۔ وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے اور خداوند کا قہر اسرائیل پر بھڑکا۔" (باب ۲۔ آیت ۱۱-۱۴)

اس کے بعد دوسرا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انہوں نے چھوڑ دی تھیں، انہوں نے اور فلسطینیوں نے جن کا پورا علاقہ غیر مغلوب رہ گیا تھا بنی اسرائیل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور پے درپے حملے کرکے فلسطین کے بڑے حصے سے ان کو بے دخل کر دیا حتّٰی کہ ان سے خداوند کے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) تک چھین لیا۔ آخرکار بنی اسرائیل کو ایک فرمانروا کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی درخواست پر حضرت سموئیل نبی نے سنہ ۱۰۲۰ قبل مسیح میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا (اس کی تفصیل سورۂ بقرہ رکوع ۳۲ میں بیان ہوئی ہے)۔

دورِ عروج و فلاح

اس متحدہ سلطنت کے تین فرمانروا ہوئے۔ طالوت (سنہ ۱۰۲۰ تا سنہ ۱۰۰۴ ق م)، حضرت داؤد علیہ السلام (سنہ ۱۰۰۴ تا سنہ ۹۶۵ ق م) اور حضرت سلیمان علیہ السلام (سنہ ۹۶۵ تا سنہ ۹۲۶ ق م)۔ ان فرمانرواؤں نے اس کام

---

[1] یہ شکایت حضرت داؤد کی زبان سے یوں ادا ہوئی ہے:

"انہوں نے ان قوموں کو ہلاک نہ کیا جیسا خداوند نے ان کو حکم دیا تھا بلکہ ان قوموں کے ساتھ مل گئے اور ان کے سے کام سیکھ گئے اور ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگے جو ان کے لیے پھندا بن گئے بلکہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا یعنی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا خون بہایا ..... اس لیے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث سے نفرت ہوگئی۔ اور اس نے ان کو قوموں کے قبضے میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمران بن گئے۔"

(زبور، باب ۱۰۶- آیات ۳۴-۴۱)

کو مسخّر کیا تھا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے بعد نامکمّل چھوڑ دیا تھا۔ صرف شمالی ساحل پر فنیقیوں کی اور جنوبی مغربی ساحل پر فلستیوں کی ریاستیں باقی رہ گئیں جنہیں مسخّر نہ کیا جاسکا اور محض باجگزار بنانے پر اکتفا کیا گیا۔

دَورِ فساد و بحران

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل پر دُنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انہوں نے آپس میں لڑ کر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کرلیں۔ شمالی فلسطین اور شرقِ اُردن میں سلطنتِ اسرائیل جس کا پایۂ تخت آخرکار سامریہ قرار پایا۔ اور جنوبی فلسطین اور اَدُوم کے علاقے میں سلطنتِ یہودیّہ جس کا پایۂ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش اوّل روز سے شروع ہوگئی اور آخر تک رہی۔

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور یہ حالت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب اس ریاست کے فرمانروا اخی اب نے صیدا کی مشرک شہزادی ایزِبل سے شادی کرلی۔ اس وقت حکومت کی طاقت اور ذرائع سے شرک اور بداخلاقیاں سیلاب کی طرح اسرائیلیوں میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ حضرت الیاس، اور حضرت الیسع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی مگر یہ قوم جس تنزّل کی طرف جا رہی تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخرکار اللہ کا غضب اشوریوں کی شکل میں دولتِ اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر اشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہوگئے۔ اس دَور میں عاموس نبی (۷۸۷ تا ۷۴۷ قبل مسیح) اور پھر ہوسیع نبی (۷۴۷ تا ۷۳۵ قبل مسیح) نے اٹھ کر اسرائیلیوں کو پے در پے تنبیہات کیں مگر جس غفلت کے نشے میں وہ سرشار تھے وہ تنبیہ کی تُرشی سے اور زیادہ تیز ہوگیا۔ یہاں تک کہ عاموس نبی کو شاہِ اسرائیل نے ملک سے نکل جانے اور دولتِ سامریہ کے حدود میں نبوت بند کر دینے کا نوٹس دے دیا۔ اس کے بعد کچھ زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ خدا کا عذاب اسرائیلی سلطنت اور اس کے باشندوں پر ٹوٹ پڑا۔ ۷۲۱ قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرمانروا سارگون نے سامریہ کو فتح کرکے دولتِ اسرائیل کا خاتمہ کر دیا، ہزارہا اسرائیلی تہ تیغ کیے گئے، ۲۷ ہزار سے زیادہ بااثر اسرائیلیوں کو ملک سے نکال کر اشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بتّر کر دیا گیا۔ اور دوسرے علاقوں سے لاکر غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسایا گیا جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عنصر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز زیادہ بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی، وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السّلام کے بعد بہت جلدی شرک اور بداخلاقی میں مبتلا ہوگئی۔ مگر نسبتہً اس کا اعتقادی اور اخلاقی زوال دولتِ اسرائیل کی بہ نسبت سُست رفتار تھا اس لیے اس کو مہلت بھی کچھ زیادہ دی گئی۔ اگرچہ

دولت اسرائیل کی طرح اس پر بھی اشوریوں نے پے در پے حملے کیے، اس کے شہروں کو تباہ کیا، اس کے پایہ تخت کا محاصرہ کیا لیکن یہ ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم نہ ہو سکی۔ بلکہ صرف باج گزار بن کر رہ گئی۔ پھر جب حضرت یسعیاہؑ اور حضرت یرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بت پرستی اور بد اخلاقیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۷ ق م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو مسخر کر لیا اور یہودیہ کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ۵۸۶ قبل مسیح میں بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی، یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کر دیا اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بری طرح ذلیل اور پامال ہو کر رہے۔ ۱۴۲

بابل کی اسیری کے زمانے میں بنی اسرائیل کا کردار

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ۔ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ۔ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

(البقرہ ۔ ۱۰۲)

"اور لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے، جو شیاطین سلیمانؑ کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے، حالانکہ سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ (فرشتے) جب کبھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ دیکھو، ہم محض ایک آزمائش ہیں، تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔ پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ظاہر تھا کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے، جو خود ان کے لیے نفع بخش

نہیں بلکہ نقصان دہ تھی اور انہیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ کتنی بری متاع تھی جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، کاش انہیں معلوم ہوتا!

شیاطین سے مراد شیاطینِ جن اور شیاطینِ اِنس دونوں ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔ جب بنی اسرائیل میں اخلاقی و مادّی انحطاط کا دور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت و افلاس اور ذلّت و پستی نے ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی تو ان کی توجہات جادو ٹونے اور طلسمات و عملیات اور تعویذ گنڈوں کی طرف مبذول ہونے لگیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مشقت اور جدوجہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں کے زور پر سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیاطین نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمان علیہ السلام کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں تو سب کچھ چند نقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں، اور وہ ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعیِ حق کی آواز انہوں نے سُن کر دی۔

اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں، مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے بھیجا ہوگا جس طرح قومِ لوطؑ کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی۔ اور دوسری طرف وہ اِتمامِ حُجّت کے لیے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہارے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں، ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

اس منڈی میں سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس سے ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو اس سے توڑ کر اپنے اوپر عاشق کر لے۔ یہ اخلاقی زوال کا وہ انتہائی درجہ تھا

جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔

ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدّن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدّن کی درستی کا اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدّن کی خرابی کا مدار ہے۔ لہٰذا وہ شخص بدترین مفسد ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہو جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ابلیس اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ ایجنٹ واپس آکر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں فتنہ برپا کیا۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شر کھڑا کیا۔ مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں جدائی ڈال آیا ہوں۔ یہ سن کر ابلیس اس کو گلے سے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو کام کرکے آیا ہے۔ اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے انہیں کیوں حکم دیا گیا کہ عورت اور مرد کے درمیان جدائی ڈالنے کا "عمل" ان کے سامنے پیش کریں۔ دراصل یہی ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔ ۳۳۸

دورِ تجدید و احیاء

جہاں تک سامریہ اور اسرائیل کے لوگوں کا تعلق ہے وہ تو اخلاقی و اعتقادی زوال کی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اٹھے۔ مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت دینے والا تھا۔ اس نے ان لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے کھچے رہ گئے تھے۔ اور ان لوگوں کو بھی توبہ و انابت کی ترغیب دی جو بابل اور دوسرے علاقوں میں جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ آخرکار رحمتِ الٰہی ان کی مددگار ہوئی۔ بابل کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ۵۳۹ قبل مسیح میں ایرانی فاتح سائرس (خورس یا خسرو) نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے فرمان جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہودیوں کے قافلے پر قافلے یہودیہ کی طرف جانے شروع ہو گئے جن کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ سائرس نے یہودیوں کو ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی اجازت بھی دی۔ مگر ایک عرصے تک ہمسایہ قومیں جو اس علاقہ میں آباد ہو گئی تھیں، مزاحمت کرتی رہیں۔ آخر دارا (داریوس) اوّل نے ۵۲۲ ق م میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے

پوتے زرُبّابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے حَجّی نبی، زکریاہ نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکلِ مقدس کو نئے سرے سے تعمیر کیا۔ پھر ۴۵۸ ق م میں ایک جلاوطن گروہ کے ساتھ حضرت عُزَیر (عزرا) یہودیہ پہنچے اور شاہ ایران اَرتخششتا (ارٹا کسرکسیز یا اردشیر) نے ایک فرمان کی رُو سے ان کو مجاز کیا کہ:

"تو اپنے خدا کی اُس دانش کے مطابق جو تجھ کو عنایت ہوئی، حاکموں اور قاضیوں کو مقرر کر تاکہ دریا پار کے سب لوگوں کا جو تیرے خدا کی شریعت کو جانتے ہیں انصاف کریں، اور تم اس کو جو نہ جانتا ہو سکھاؤ۔ اور جو کوئی تیرے خدا کی شریعت پر اور بادشاہ کے فرمان پر عمل نہ کرے اس کو بلا توقف قانونی سزا دی جائے، خواہ موت ہو، یا جلاوطنی، یا مال کی ضبطی، یا قید۔"

(عزرا۔ باب ۷۔ آیت ۲۵-۲۶)

اس فرمان سے فائدہ اُٹھا کر حضرت عُزَیر نے دینِ موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ انہوں نے یہودی قوم کے تمام اہلِ خیر و صلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائیبل کی کتب خمسہ کو جن میں توراۃ تھی، مرتب کر کے شائع کیا۔ یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا۔ قوانینِ شریعت کو نافذ کر کے اُن اعتقادی اور اخلاقی بُرائیوں کو دُور کرنا شروع کیا جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گھس آئی تھیں۔ اُن تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جن سے یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے۔ اور بنی اسرائیل سے ازسرِ نو خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا میثاق لیا۔

۴۴۵ قبل مسیح میں نحمیاہ کے زیرِ قیادت ایک اور جلاوطن گروہ یہودیہ واپس آیا اور شاہِ ایران نے نحمیاہ کو یروشلم کا حاکم مقرر کر کے اس امر کی اجازت دی کہ وہ اس کی شہر پناہ تعمیر کرے۔ اس طرح ڈیڑھ سو سال بعد بیت المقدس پھر سے آباد ہوا اور یہودی مذہب و تہذیب کا مرکز بن گیا۔ مگر شمالی فلسطین اور سامریہ کے اسرائیلیوں نے حضرت عُزَیر کی اصلاح و تجدید سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ بلکہ بیت المقدس کے مقابلہ میں اپنا ایک مذہبی مرکز کوہ جرزیم پر تعمیر کر کے اس کو قبلۂ اہلِ کتاب بنانے کی کوشش کی۔ اس طرح یہودیوں اور سامریوں کے درمیان بُعد اور زیادہ بڑھ گیا۔

یُونانی تسلّط اور اس کے خلاف کشمکش

ایرانی سلطنت کے زوال اور سکندرِ اعظم کی فتوحات اور پھر یونانیوں کے عروج سے یہودیوں کو کچھ مدت کے لیے ایک سخت دھکا لگا۔ سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت جن تین سلطنتوں میں تقسیم ہوئی تھی ان میں سے شام کا علاقہ اس سَلُوقی سلطنت کے حصے میں آیا جس کا پایۂ تخت انطاکیہ تھا۔ اور اس کے فرمانروا انٹیوکس ثالث نے ۱۹۸ ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یہ یونانی فاتح، جو مذہباً مشرک اور اخلاقاً اباحیت پسند تھے، یہودی مذہب

تہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی دباؤ سے یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کر دیا اور خود یہودیوں میں سے ایک اچھا خاصا عنصر ان کا آلۂ کار بن گیا۔ اس خارجی مداخلت نے یہودی قوم میں تفرقہ ڈال دیا۔ ایک گروہ نے یونانی لباس، یونانی زبان، یونانی طرزِ معاشرت اور یونانی کھیلوں کو اپنا لیا اور دوسرا گروہ اپنی تہذیب پر سختی کے ساتھ قائم رہا۔ ۱۷۵ ق م میں انٹیوکس چہارم (جس کا لقب ایپی فانیس یعنی مظہرِ خدا تھا) جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری جابرانہ طاقت سے کام لے کر یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔ اس نے بیت المقدس کے ہیکل میں زبردستی بت رکھوائے اور یہودیوں کو مجبور کیا کہ ان کو سجدہ کریں۔ اس نے قربان گاہ پر قربانی بند کرائی۔ اس نے یہودیوں کو مشرکانہ قربان گاہوں پر قربانیاں کرنے کا حکم دیا، اس نے ان سب لوگوں کے لیے سزائے موت تجویز کی جو اپنے گھروں میں توراۃ کا نسخہ رکھیں۔ یا سبت کے احکام پر عمل کریں۔ یا اپنے بچوں کے ختنے کرائیں۔ مگر یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکابی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس کشمکش میں یونانیت زدہ یہودیوں کی ساری ہمدردیاں یونانیوں کے ساتھ تھیں۔ اور انہوں نے عملاً مکابی بغاوت کو کچلنے میں انطاکیہ کے ظالموں کا پورا ساتھ دیا۔ لیکن عام یہودیوں میں حضرت عزیر کی پھونکی ہوئی روحِ دینداری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مکابیوں کے ساتھ ہو گئے اور آخرکار انہوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کر لی جو ۶۷ ق م تک قائم رہی۔ اس ریاست کے حدود پھیل کر رفتہ رفتہ اس پورے رقبے پر حاوی ہو گئے جو کبھی یہودیہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے زیرِ نگین تھے بلکہ فلستیہ کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں آ گیا جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بھی مسخر نہ ہوا تھا۔ ۳۴۳

دوسرا دورِ فساد

مکابیوں کی تحریک جس اخلاقی و دینی روح کے ساتھ اٹھی تھی، وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ خالص دنیا پرستی اور بے روح ظاہرداری نے لے لی۔ آخرکار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپی ۶۳ ق م میں اس ملک کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن رومی فاتحین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ وہ مفتوح علاقوں پر براہِ راست اپنا نظم و نسق قائم کرنے کی بہ نسبت مقامی حکمرانوں کے ذریعے سے بالواسطہ اپنا کام نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے فلسطین میں اپنے زیرِ سایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی جو بالآخر ۴۰ ق م میں ایک ہوشیار یہودی ہیرود نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرودِ اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی فرمانروائی پورے فلسطین اور شرقِ اُردن پر ۴۰ سے ۴ قبل مسیح تک رہی۔ اس نے ایک طرف

مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کر کے یہودیوں کو خوش رکھا اور دوسری طرف رومی تہذیب کو فروغ دے کر اور رُومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے قیصر کی بھی خوشنودی حاصل کی۔ اس زمانے میں یہودیوں کی دینی و اخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

ہیرود کے بعد اس کی ریاست تین حصّوں میں تقسیم ہو گئی:

اس کا ایک بیٹا ارخلاؤس سامریہ، یہودیہ اور شمالی اَدُومیہ کا فرمانروا ہُوا، مگر سنہ ۶ء میں قیصر آگسٹس نے اس کو معزول کر کے اس کی پوری ریاست اپنے گورنر کے ماتحت کر دی اور سنہ ۴۱ء تک یہی انتظام قائم رہا۔ یہی تھا جب حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے اُٹھے اور یہودیوں کے تمام مذہبی پیشواؤں نے مل کر اُن کی مخالفت کی اور رومی گورنر پونٹس پیلاطس سے ان کو سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔

ہیرود کا دوسرا بیٹا ہیرود اینٹی پاس شمالی فلسطین کے علاقہ گلیل اور شرقِ اُردن کا مالک ہُوا اور یہی وہ شخص ہے جس نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰ علیہ السّلام کا سر قلم کر کے اس کی نذر کیا۔

اس کا تیسرا بیٹا فلپ، کوہ حرمون سے دریائے یرموک تک کے علاقے کا مالک ہُوا اور یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بھی بڑھ کر رومی و یونانی تہذیب میں غرق تھا۔ اس کے علاقے میں کسی کلمۂ خیر کے پنپنے کی اتنی گنجائش بھی نہ تھی جتنی فلسطین کے دوسرے علاقوں میں تھی۔

سنہ ۴۱ء میں ہیرود اعظم کے پوتے ہیرود اگرپا کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرمانروا بنا دیا جن پر ہیرود اعظم اپنے زمانے میں حکمران تھا۔ اس شخص نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السّلام کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کر دی اور اپنا پُورا زور خدا ترسی اور اصلاحِ اخلاق کی اس تحریک کو کچلنے میں صرف کر ڈالا جو حواریوں کی رہنمائی میں چل رہی تھی۔

اس دَور میں عام یہودیوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی جو حالت تھی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اُن تنقیدوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مسیحؑ نے اپنے خطبوں میں اُن پر کی ہیں۔ یہ سب خطبے اناجیل اربعہ میں موجود ہیں۔ پھر اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس قوم کی آنکھوں کے سامنے یحییٰ علیہ السلام جیسے پاکیزہ انسان کا سر قلم کیا گیا، مگر ایک آواز بھی اس ظلمِ عظیم کے خلاف نہ اُٹھی اور پُوری قوم کے مذہبی پیشواؤں نے مسیحؑ کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا مگر تھوڑے سے راستباز انسانوں کے سوا کوئی نہ تھا جو اس بدبختی پر ماتم کرتا۔ حد یہ ہے کہ جب پونٹس پیلاطس نے ان شامت زدہ لوگوں سے پُوچھا کہ آج تمہاری عید کا دن ہے اور قاعدے کے مطابق میں سزائے موت کے مستحق مجرموں میں سے ایک کو چھوڑ دینے کا مجاز ہوں، بتاؤ یسوعؑ کو چھوڑوں یا برابا ڈاکو کو؟ تو اُن کے پُورے مجمع نے بیک آواز کہا کہ برابا ڈاکو کو چھوڑ دیجیے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ

کی طرف سے آخری حجت تھی جو اس قوم پر قائم کی گئی۔

تازیانۂ مشیّت

اس پر تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی اور ۶۴ء اور ۶۶ء کے درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کر دی۔ ہیرود اگرپا ثانی اور رومی پروکیوریٹر فلورس دونوں اس بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام ہوئے۔ آخر کار رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی سے اس بغاوت کو کچل دیا اور ۷۰ء میں ٹیٹس نے بزور شمشیر یروشلم کو فتح کر لیا۔ اس موقع پر قتل عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار آدمی مارے گئے۔ ۶۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنائے گئے، ہزارہا آدمی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیے گئے، ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لیے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لیے چن لی گئیں، اور یروشلم کے شہر اور ہیکل کو مسمار کر کے پیوند خاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد فلسطین سے یہودی اثر و اقتدار ایسا مٹا کہ دو ہزار برس تک اس کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا اور یروشلم کا ہیکل مقدس پھر کبھی تعمیر نہ ہو سکا۔ بعد میں قیصر ہیڈریان نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا، مگر اب اس کا نام ایلیا تھا اور اس میں مدتہائے دراز تک یہودیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

آخری اتمامِ حجّت

چونکہ بنی اسرائیل صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمائشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، پے درپے کئی انبیاء کو قتل کر چکے تھے اور ہر اس بندۂ صالح کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انہیں دعوت دیتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کرنے اور انہیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بیک وقت مبعوث کیا جن کے ساتھ مامور من اللہ ہونے کی ایسی کھلی کھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو حق و صداقت سے انتہا درجہ کا عناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلہ میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا اور پھر اتنا ہی نہ کیا کہ ان دونوں پیغمبروں کی دعوت رد کر دی، بلکہ ان کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش پر قلم کرا دیا، اور ان کے علماء و فقہاء نے سازش کر کے حضرت عیسیٰ کو رومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمائش پر مزید وقت

اور نبوت عرف کرنا بالکل فضول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بلا لیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔

حضرت یحییٰ اور ان سے بنی اسرائیل کا سلوک

حضرت یحییٰ کے جو حالات مختلف انجیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں انہیں جمع کرکے ہم یہاں ان کی سیرت پاک کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔

لوقا کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ سے ۶ مہینے بڑے تھے۔ ان کی والدہ اور حضرت عیسیٰ کی والدہ آپس میں قریبی رشتہ دار تھیں۔ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ نبوت کے منصب پر عملاً مامور ہوئے اور یوحنا کی روایت کے مطابق انہوں نے شرق اُردن کے علاقے میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا۔ وہ کہتے تھے:

"میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔"
(یوحنا ۱: ۲۳)

مرقس کا بیان ہے کہ وہ لوگوں سے گناہوں کی توبہ کراتے تھے اور توبہ کرنے والوں کو بپتسمہ دیتے تھے یعنی توبہ کے بعد غسل کراتے تھے تاکہ روح اور جسم دونوں پاک ہو جائیں۔ یہودیہ اور یروشلم کے بکثرت لوگ ان کے معتقد ہو گئے تھے اور ان کے پاس جا کر بپتسمہ لیتے تھے (مرقس ۱: ۴-۵)۔ اسی بنا پر ان کا نام یوحنا بپتسمہ دینے والا (John The Baptist) مشہور ہو گیا تھا۔ عام طور پر بنی اسرائیل ان کی نبوت تسلیم کر چکے تھے (متی ۲۱: ۲۶)۔ مسیح علیہ السلام کا قول تھا کہ "جو عورتوں سے پیدا ہوتے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا" (متی ۱۱: ۱۱)

وہ اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھے رہتے تھے اور ان کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا (متی ۳: ۴)۔ اس فقیرانہ زندگی کے ساتھ وہ منادی کرتے پھرتے تھے کہ "توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی قریب آگئی ہے" (متی ۳: ۲) یعنی مسیح علیہ السلام کی دعوتِ نبوت کا آغاز ہونے والا ہے۔ اسی بنا پر ان کو عموماً حضرت مسیح کا "ارہاص" کہا جاتا ہے، اور یہی بات ان کے متعلق قرآن میں کہی گئی ہے کہ "مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" (آل عمران ۳۹)۔

وہ لوگوں کو روزے اور نماز کی تلقین کرتے تھے (متی ۹: ۱۴۔ لوقا ۵: ۳۳۔ لوقا ۱۱: ۱)

وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ "جس کے پاس دو کرتے ہوں وہ اس کو جس کے پاس نہ ہو بانٹ دے اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا ہی کرے۔" محصول لینے والوں نے پوچھا کہ استاد، ہم کیا کریں تو انہوں نے فرمایا "جو تمہارے لیے مقرر ہے اس سے زیادہ نہ لینا۔" سپاہیوں نے پوچھا ہمارے لیے کیا ہدایت ہے؟ فرمایا

"نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ناحق کسی سے کچھ لو اور اپنی تنخواہ پر کفایت کرو" (لوقا ۳: ۱۰-۱۴)
بنی اسرائیل کے بگڑے ہوئے علماء، فریسی اور صدوقی ان کے پاس بپتسمہ لینے آئے تو ڈانٹ کر فرمایا "اے سانپ کے بچو! تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو؟ ۔۔۔ اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہام ہمارا باپ ہے ...... اب درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے، پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے" (متی ۳: ۷-۱۰)

ان کے عہد کا یہودی فرمانروا، ہیرودانٹی پاس جس کی ریاست میں وہ دعوتِ حق کی خدمت انجام دیتے تھے، سرتاپا رومی تہذیب میں غرق تھا اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فسق و فجور پھیل رہا تھا اس نے خود اپنے بھائی فلپ کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا حضرت یحییٰؑ نے اس پر ہیرود کو ملامت کی اور اس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس جرم میں ہیرود نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ تاہم وہ ان کو ایک مقدس اور راستباز آدمی جان کر ان کا احترام بھی کرتا تھا اور پبلک میں ان کے غیر معمولی اثر سے ڈرتا بھی تھا لیکن ہیرودیاس یہ سمجھتی تھی کہ یحییٰ علیہ السلام جو اخلاقی رُوح قوم میں پھونک رہے ہیں وہ لوگوں کی نگاہ میں اُس جیسی عورتوں کو ذلیل کیے دے رہی ہے۔ اس لیے وہ ان کی جان کے درپے ہو گئی۔ آخر کار ہیرود کی سالگرہ کے جشن میں اس نے وہ موقع پا لیا جس کی وہ تاک میں تھی۔ جشن کے دربار میں اس کی بیٹی نے خوب رقص کیا۔ جس پر خوش ہو کر ہیرود نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے۔ بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا کیا مانگوں؟ ماں نے کہا کہ یحییٰؑ کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اس نے ہیرود کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کیا مجھے یُوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی منگوا دیجیے۔ ہیرود یہ سن کر بہت غمگین ہوا۔ مگر محبوبہ کی بیٹی کا تقاضا کیسے رد کر سکتا تھا۔ اُس نے فوراً قید خانے سے یحییٰ علیہ السلام کا سر کٹوا کر منگوایا اور ایک تھال میں رکھوا کر رقاصہ کی نذر کر دیا۔ (متی ۱۴: ۳-۱۲۔ مرقس ۶: ۱۷-۲۹۔ لوقا ۳: ۱۹-۲۰) (تفہیم القرآن)

حضرت عیسیٰؑ اور ان سے بنی اسرائیل کا سلوک

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۔	اور اے محمدؐ، اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو، جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ بیٹھی تھی۔

سورۂ آلِ عمران میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے اپنی مانی ہوئی نذر کے مطابق ان کو بیت المقدس میں عبادت کے لیے بٹھا دیا تھا اور حضرت زکریاؑ نے ان کی حفاظت و کفالت اپنے ذمے

لے لی تھی۔ وہاں یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت مریمؑ بیت المقدس کی ایک محراب میں معتکف ہو گئی تھیں اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ محراب جس میں حضرت مریمؑ معتکف تھیں بیت المقدس کے شرقی حصے میں واقع تھی اور انہوں نے معتکفین کے عام طریقے کے مطابق ایک پردہ لٹکا کر اپنے آپ کو دیکھنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے محض بائیبل کی موافقت کی خاطر مَکَانًا شَرْقِیًّا سے مُراد ناصرہ لیا ہے انہوں نے غلطی کی ہے، کیونکہ ناصرہ یروشلم کے شمال میں ہے نہ کہ مشرق میں۔

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۔ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۔ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۔ قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۔ قَالَ كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۖ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَقْضِيًّا ۔ (مریم ۱۷ تا ۲۱)

اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی رُوح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پُورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ مریمؑ یکایک بول اٹھی کہ "اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔" اس نے کہا "میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔" مریمؑ نے کہا "میرے ہاں کیسے لڑکا ہو گا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔" فرشتے نے کہا "ایسا ہی ہو گا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔ اور یہ کام ہو کر رہنا ہے۔"

حضرت مریمؑ کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ "ایسا ہی ہو گا" ہرگز اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہو گا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہو گا باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔ انہی الفاظ میں حضرت زکریاؑ کا استعجاب نقل ہو چکا ہے اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مطلب اس کا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ ذاریات، آیات ۲۸۔۳۰ میں جب فرشتہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور حضرت سارہؓ کہتی ہیں کہ مجھ بوڑھی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہو گا تو فرشتہ ان کو جواب دیتا ہے کہ "كَذَٰلِكِ" ایسا ہی ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود ان کے ہاں اولاد ہونا ہے۔ علاوہ بریں اگر كَذَٰلِكِ کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھے چھوئے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہو گا جیسے دنیا بھر

لی عورتوں کے ہاں ہُوا کرتا ہے، تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اِس صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے، اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی کا لفظ یہاں صریح معجزے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اسی معنی پر یہ فقرہ بھی دلالت کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے"۔ لہٰذا اِس ارشاد کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کی تفصیلات اس بات کی خود تصریح کر رہی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کو کس طرح معجزہ بنا کر پیش کیا گیا ہے:

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۔ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۔ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۔ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۔ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـــًٔا فَرِيًّا ۔ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۔ (مریم ۲۲ تا ۲۸)

"مریم کو اس بچے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دُور کے مقام پر چلی گئی۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی "کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام و نشان نہ رہتا"۔ فرشتے نے پائنتی سے اس کو پکار کر کہا "غم نہ کر، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے، اور تو ذرا اس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تر و تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی۔" پھر وہ اس بچے کو لیے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے "مریم! یہ تو تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن، نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔"

دُور کے مقام سے مُراد بیت لحم ہے۔ حضرت مریم کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المقدس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اِس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں اور

ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے اس بیچاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال سب کو چھوڑ چھاڑ کر وہ زچگی کے لیے تن تنہا ایک دور دراز مقام پر چلی جاتیں۔

ان الفاظ سے اس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریمؑ اُس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت ملحوظ ہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر ان کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں اُنہیں ڈالا ہے اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا۔ اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے ان سے کہا "غم نہ کر" اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریمؑ نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے اسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہوا کرتا۔

مطلب یہ ہے کہ بچے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدائش پر جو کوئی بھی معترض ہو اس کا جواب اب ہمارے ذمے ہے۔ (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ بھی رائج تھا)۔ یہ الفاظ بھی صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت مریمؑ کو اصل پریشانی کیا تھی۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلوٹھی کا بچہ اگر دنیا کے معروف طریقہ پر پیدا ہو تو آخر اسے چپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟

ان الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں ظاہری معنی میں لیا جائے۔ اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مریمؑ کا کوئی بھائی ہارون نامی ہو۔ دوسرے یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اُختِ ہارون کے معنی "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے مثلاً قبیلہ مضر کے آدمی کو یا اخا مضر (اے مضر کے بھائی) اور قبیلہ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ھمدان (اے ہمدان کے بھائی) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنی کے حق میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی منقول ہوتے ہیں۔ اور دوسرے معنی کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اس معنی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اس واقعہ سے قوم میں جو ہیجان برپا ہوا تھا اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک

گمنام شخص کی کنواری بہن گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریمؑ کے گرد جمع کر دیا تھا وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادہ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیث مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری "تاویل اصول" قابل لحاظ نہیں ہو سکتی، لیکن مسلم، نسائی، ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنی "ہارون کی بہن" ہی ہیں۔ مغیرہؓ بن شعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے حضرت مغیرہؓ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریمؑ کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے حالانکہ حضرت ہارونؑ ان سے سینکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہؓ ان کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہ دے سکے اور انہوں نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ "تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیاء اور صلحاء کے نام پر رکھتے تھے"۔ حضورؐ کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۔ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۔ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۔ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۔ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۔ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۔

(مریم - آیات ۲۹ تا ۳۴)

"مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا "ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟" بچہ بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا اور بابرکت کیا جہاں بھی رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مروں اور جبکہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں"۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریمؑ اور یہ ہے اس کے بارے میں وہ سچی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔

یہ ہے وہ "نشانی" جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرتناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا

چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک زاہدہ و عابدہ لڑکی کو جو بیت المقدس میں معتکف اور حضرت زکریا کے زیر تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجہات یک لخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریمؑ پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود رہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے جو دنیا کی کسی قوم کو نہیں دی گئی ہے۔[1]

؎ مزید تشریح کے لیے تفہیم القرآن، جلد اول، آل عمران، حاشیہ ۴۴، ۵۳۔ النساء، حاشیہ ۲۱۲، ۲۱۳۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۸، ۸۹، ۹۰۔ المومنون، حاشیہ ۴۳۔

فصل ۱۱

اَصۡحابُ الرَّس

ان کا ذکر پہلے سورۃ فرقان آیت ۳۸ میں کیا گیا ہے اور اس کے بعد سورۃ قٓ آیت ۱۲ میں دوبارہ ان کا ذکر آیا ہے۔ مگر دونوں جگہ انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کے سلسلے میں صرف ان کا نام ہی لیا گیا ہے کوئی تفصیل ان کے قصے کی بیان نہیں کی گئی ہے[1]۔

عرب کی روایات میں الرس کے نام سے دو مقام معروف ہیں ایک نجد میں، دوسرا شمالی حجاز میں۔ ان میں نجد کا الرس زیادہ مشہور رہا ہے اور اشعار جاہلیت میں زیادہ تر اسی کا ذکر ملتا ہے۔ اب یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ اصحاب الرس ان دونوں میں سے کس جگہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے قصے کی بھی کوئی قابل اعتماد تفصیل کسی روایت میں نہیں ملتی۔ زیادہ سے زیادہ بس اتنی بات صحت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ کوئی ایسی قوم تھی جس نے اپنے نبی کو کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ لیکن قرآن مجید میں جس طرح ان کی طرف محض ایک اشارہ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں اہل عرب بالعموم اس قوم اور اس کے قصے سے واقف تھے اور بعد میں یہ روایات تاریخ میں محفوظ نہ رہ سکیں۔ (۲۳۵)

---

[1] اصحاب الرس کے متعلق تحقیق نہ ہو سکا کہ کون لوگ تھے۔ مفسرین نے مختلف روایات بیان کی ہیں مگر ان میں سے کوئی چیز قابل اطمینان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ ایک ایسی قوم تھی جس نے اپنے پیغمبر کو کنوئیں میں پھینک یا لٹکا کر مار دیا تھا۔ رس عربی زبان میں پرانے کنوئیں یا اندھے کنوئیں کو کہتے ہیں (تفہیم القرآن جلد سوم، الفرقان حاشیہ ۵۲)

جلد اوّل ——— حصّہ ۳

بعثت سے پہلے کا ماحول

ب : مُرَوَّجہ مذاہب

باب ۱۴

مُشرکین

فصل ۱

پوری انسانی دُنیا پر ایک اجمالی نظر

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامُور ہُوئے تو دُنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدّنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رُومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجُود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی ہو رہا تھا اور اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہُوئے تھے۔ خود آپؐ کے اپنے ملک میں بہت سے پیچیدہ مسائل موجود تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک مشرقی اور جنوبی عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق تک زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلّط میں تھے۔ شمال میں حجاز کی سرحد تک رُومی تسلّط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سُود خواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مغربی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکّہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہب اور اس سے گہرا معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ ۱۴۴ء میں

رُوم، یونان اور ہند

رُوم کے کولوسیم (Colosseum) کے افسانے اب تک تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں جن میں ہزارہا انسان شمشیر زنی (Gladiatory) کے کمالات اور رُومی اُمراء کے شوقِ تماشا کی نذر ہو گئے۔ مہمانوں کی تفریح کے لیے یا دوستوں کی فرمائش کے لیے غلاموں کو درندوں سے پھڑوا دینا، یا جانوروں کی طرح ذبح کرا دینا، یا ان کے جلنے کا تماشا دیکھنا، یورپ اور ایشیا کے اکثر ممالک میں کوئی معیوب کام نہ تھا۔ قیدیوں اور غلاموں کو مختلف طریقوں سے عذاب دے دے کر مار ڈالنا اس عہد کا عام دستور تھا۔ بابل و خوارزم کے خونخوار اُمراء سے گزر کر یونان و روما کے بڑے بڑے حکماء و فلاسفہ کے اجتہادات میں بھی انسانی جانوں کو بے قصور ہلاک کرنے کی بہت سی وحشیانہ صورتیں جائز تھیں۔

ارسطو۔ افلاطون جیسے اساتذۂ اخلاق ماں کو یہ اختیار دینے میں کوئی خرابی نہ پاتے تھے کہ وہ اپنے جسم کے ایک حصّہ (یعنی جنین) کو الگ کر دے۔ چنانچہ یونان و روما میں اسقاطِ حمل کوئی ناجائز فعل نہ تھا۔ باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق تھا اور رُومی مقننوں کو اپنے قانون کی اس خصوصیت پر فخر تھا کہ اس میں اولاد پر باپ کے اختیارات اس قدر غیر محدود ہیں جتنا ہر رواقیین ر ... کے نزدیک خودکشی کوئی بُری چیز نہ تھی، بلکہ ایک ایسی عزت کی بات تھی کہ لوگ جلسے کر کے ان میں خودکشیاں کیا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ افلاطون جیسا حکیم بھی اسے کوئی بڑی معصیت نہ سمجھتا تھا۔ شوہر کے لیے اپنی بیوی کا قتل بالکل ایسا تھا جیسے وہ اپنے کسی پالتو جانور کو ذبح کر دے، اس لیے قانونِ یونان میں اس کی کوئی سزا نہ تھی۔ جیو ہتھیا کا گہوارہ ہندوستان ان سب سے بڑھا ہوا تھا۔ یہاں مُردہ شوہر کی لاش پر زندہ بیوہ کو جلا دینا ایک جائز فعل تھا (کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عورتیں شوہر کی چتا میں جلائی نہ جاتی تھیں بلکہ خود جلتی تھیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مختلف طریقوں سے سوسائٹی کا دباؤ بھی ان کو یہ ہولناک خودکشی کرنے پر مجبور کرتا تھا) اور مذہباً اس کی تاکید تھی۔ شُودر کی جان کی کوئی قیمت نہ تھی اور صرف اس بنا پر کہ وہ غریب برہما کے پاؤں سے پیدا ہُوا ہے، اُس کا خون برہمن کے لیے حلال تھا۔ وید کی آواز سُن لینا شودر کے لیے اتنا بڑا گناہ تھا کہ اس کے کان میں پگھلا ہُوا سیسہ ڈال کر اسے مار ڈالنا نہ صرف جائز تھا بلکہ ضروری تھا۔ "جل پروا" کی رسم عام تھی جس کے مطابق ماں باپ اپنے پہلے بچہ کو دریائے گنگا کی نذر کر دیتے تھے اور اس قساوت کو اپنے لیے مُوجب سعادت سمجھتے تھے۔ (۳۵)

شرک کا عالمگیر روگ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت لے کر اٹھے اُس وقت دُنیا کے مذہبی تصوّرات کیا تھے۔ بت پرست مشرکین اُن خداؤں کو پُوج رہے تھے جو لکڑی، پتھر، سونے، چاندی وغیرہ مختلف چیزوں کے بنے ہوئے ہونے تھے، شکل، صورت اور جسم رکھتے تھے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی باقاعدہ نسل چلتی تھی۔ کوئی دیوی بے شوہر نہ تھی اور کوئی دیوتا بے زوجہ نہ تھا۔ ان کو کھانے پینے کی ضرورت بھی لاحق ہوتی تھی اور اُن کے پرستار اُن کے لیے اس کا انتظام کرتے تھے۔ مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور کرتا ہے اور کچھ لوگ اس کے اوتار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ ایک خدا کو ماننے کے مدعی تھے، مگر اُن کا خدا بھی کم از کم ایک بیٹا تو رکھتا ہی تھا۔ اور باپ بیٹے کے ساتھ خدائی میں رُوح القدس کو بھی حصّہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا حتیٰ کہ خدا کی ماں بھی ہوتی تھی اور اُس کی ساس بھی۔ یہودی بھی ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، مگر اُن کا خدا بھی مادّیت اور جسمانیت اور دوسری انسانی صفات سے خالی نہ تھا۔ وہ ٹہلتا تھا۔ انسانی شکل

میں نمودار ہوتا تھا۔ اس کے کسی بندے سے کشتی بھی لڑ لیتا تھا اور ایک عدد بیٹے تو خیر اس کا باپ بھی تھا۔ ان تینوں گروہوں کے علاوہ مجوس آتش پرست تھے اور صابی ستارہ پرست۔ انتہی

انسانیت کی باطل تقسیموں کا فتنہ

قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اس نے اپنا اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور اخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی پیدائش کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں۔ کہیں ان کی بنا ایک خاندان، قبیلے یا نسل میں پیدا ہونا ہے، اور کہیں ایک جغرافی خطے میں یا ایک خاص رنگ والی یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہو جانا۔ پھر ان بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے وہ صرف اس حد تک محدود نہیں رہی ہے کہ جنہیں اس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو ان کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اس تمیز نے غیروں کے ساتھ نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں۔ مذہب ایجاد کیے گئے ہیں۔ قوانین بنائے گئے ہیں۔ اخلاقی اصول وضع کیے گئے ہیں۔ قوموں اور سلطنتوں نے اس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے اسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق ٹھیرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا جس کی رو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھیرائے گئے، اور شودروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، آج اس بیسویں صدی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے براعظم امریکہ میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا اور ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کر کے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا اس کی تہ میں بھی یہی تصور کارفرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے حدود سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال اور آبرو ان پر مباح ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ ان کو لوٹیں، غلام بنائیں اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں کے لیے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے اس کی بدترین مثالیں زمانۂ قریب کی لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہیں اور آج دیکھی جا رہی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیت اور نارڈک نسل کی برتری کا تصور پچھلی جنگ عظیم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت[1] نازل ہوئی ہے۔

---

[1] الحجرات آیت ۱۳۔

فصل ۲

مُشرکینِ عرب کا مذہب اور معاشرتی رُسوم و اَطوار

مُشرکینِ عرب کا معاشرہ ایک نظر میں

اُس تاریک دور میں زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تاریکی کا تسلّط اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا جو ممالک اُس زمانے کے معیارِ تمدّن کے لحاظ سے متمدّن تھے ان کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد ایران، روم اور مصر کے ملکوں میں علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی کچھ روشنی پائی جاتی تھی۔ مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی راہ طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے اور صرف اموال کا تبادلہ کر کے واپس آجاتے تھے۔ علم و تہذیب کی کوئی روشنی ان کے ساتھ نہ آتی تھی۔ ان کے ملک میں نہ کوئی مدرسہ تھا، نہ کتب خانہ تھا، نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا، نہ علوم و فنون سے کوئی دلچسپی تھی۔ تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنہیں کچھ لکھنا پڑھنا آتا تھا، مگر وہ بھی اتنا نہیں کہ اس زمانہ کے علوم و فنون سے آشنا ہوتے۔ اُن کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی باقاعدہ زبان ضرور تھی جس میں بلند خیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان میں بہترین ادبی مذاق بھی موجود تھا۔ مگر ان کے لٹریچر کے جو کچھ باقیات ہم تک پہنچے ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کس قدر محدود تھیں، تہذیب و تمدّن میں ان کا درجہ کس قدر پست تھا، اُن پر اوہام کا کس قدر غلبہ تھا، ان کے خیالات اور ان کی عادات میں کتنی جہالت اور وحشت تھی، اُن کے اخلاقی تصورات کتنے بھدے تھے۔

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ کوئی ضابطہ اور قانون نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا، اور صرف "جنگل کے قانون" کی پیروی کی جاتی تھی۔ جس کا جس پر بس چلتا اُسے مار ڈالتا اور اس کے مال پر قابض ہو جاتا۔ یہ بات ایک عرب بدوی کے فہم سے بالاتر تھی کہ جو شخص اس کے قبیلہ کا نہیں ہے اُسے آخر وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اس کے مال پر کیوں نہ متصرّف ہو جائے؟

اخلاق و تہذیب و شائستگی کے جو کچھ بھی تصورات ان لوگوں میں تھے وہ نہایت ادنیٰ اور سخت ناتراشیدہ

تھے۔ پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً ناآشنا تھے۔ اُن کی زندگی نہایت گندی تھی۔ ان کے طریقے وحشیانہ تھے۔ زنا، جُوا، شراب، چوری، رہزنی، قتل و خونریزی ان کی زندگی کے معمولات تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف برہنہ ہو جاتے تھے۔ ان کی عورتیں تک ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ وہ اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کر دیتے تھے محض اس جاہلانہ خیال کی بنا پر کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے۔ وہ اپنے باپوں کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ انہیں کھانے اور لباس اور طہارت کے معمولی آداب تک معلوم نہ تھے۔

مذہب کے باب میں وہ ان تمام جہالتوں اور ضلالتوں کے حصہ دار تھے جن میں اُس زمانہ کی دنیا مبتلا تھی[1]۔ بُت پرستی، ارواح پرستی، کواکب پرستی، غرض ایک خدا کی پرستش کے سوا اس وقت دنیا میں جتنی پرستیاں پائی جاتی ہیں وہ سب ان میں رائج تھیں۔ انبیائے قدیم اور ان کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم ان کے پاس نہ تھا۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ ان کے باپ ہیں مگر یہ نہ جانتے تھے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عاد اور ثمود کے قصے بھی ان میں مشہور تھے مگر ان کی جو روایتیں عرب کے مؤرخین نے نقل کی ہیں ان کو پڑھ جائیے کہیں آپ کو صالحؑ اور ہودؑ کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ ان کو یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے انبیائے بنی اسرائیل کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں مگر وہ جیسی کچھ تھیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک نظر ان اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے جو مفسرینِ اسلام نے نقل کی ہیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہلِ عرب اور خود بنی اسرائیل جن انبیاء سے واقف تھے وہ کیسے انسان تھے اور نبوت کے متعلق ان لوگوں کا تصور کس قدر گھٹیا درجہ کا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کی پیروی کا زعم

زمانۂ جاہلیت کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا پیرو کہتے اور سمجھتے تھے اور اسی بنا پر ان کا خیال یہ تھا کہ جس مذہب کا وہ اتباع کر رہے ہیں وہ خدا کا پسندیدہ مذہب ہی ہے۔ لیکن جو دین ان لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے سیکھا تھا اس کے اندر بعد کی صدیوں میں مذہبی پیشوا، قبائل کے سردار، خاندانوں کے بڑے بوڑھے اور مختلف لوگ طرح طرح کے عقائد اور اعمال اور رسوم کا اضافہ کرتے چلے گئے جنہیں آنے والی نسلوں نے اصل مذہب کا جز سمجھا اور عقیدت مندی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ چونکہ روایات میں یا تاریخ میں یا کسی کتاب میں ایسا کوئی ریکارڈ محفوظ نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ اصل مذہب کیا تھا اور بعد میں

---

[1] عربوں کے مذہبی حالات پر ایک مستقل فصل آگے آ رہی ہے۔ (مرتبین)

کیا چیزیں کس زمانہ میں کس نے کس طرح اضافہ کیں، اس وجہ سے اہلِ عرب کے لیے ان کا پورا دین مشتبہ ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ کسی چیز کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ اس اصل دین کا جز ہے جو خدا کی طرف سے آیا تھا اور نہ یہی جانتے تھے کہ یہ بدعات اور غلط رسوم ہیں جو بعد میں لوگوں نے بڑھا دیں۔[1]

مشرکینِ عرب کے چند مشہور ترین بُت

لات

اس کا استھان طائف میں تھا اور بنی ثقیف اس کے اس حد تک معتقد تھے کہ جب ابرہہ ہاتھیوں کی فوج لے کر خانۂ کعبہ کو توڑنے کے لیے مکہ پر چڑھائی کرنے جا رہا تھا اس وقت ان لوگوں نے محض اپنے اس معبود کے آستانے کو بچانے کی خاطر اس ظالم کو مکے کا راستہ بتانے کے لیے بدرقے فراہم کیے تاکہ وہ لات کو ہاتھ نہ لگائے، حالانکہ تمام اہلِ عرب کی طرح ثقیف کے لوگ بھی یہ مانتے تھے کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے۔ لات کے معنی میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن جریر طبری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اللہ کی تانیث ہے یعنی اصل میں یہ لفظ اَللّٰہَة تھا جسے اللات کر دیا گیا۔ زمخشری کے نزدیک یہ لَوٰی یَلْوِی سے مشتق ہے جس کے معنی مڑنے اور کسی کی طرف جھکنے کے ہیں۔ چونکہ مشرکین عبادت کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے اور اس کے آگے جھکتے اور اس کا طواف کرتے تھے اس لیے اس کو لات کہا جانے لگا۔ ابن عباسؓ اس کو لاتّ بتشدید تاء پڑھتے ہیں اور اسے لَتّ یَلُتّ سے مشتق قرار دیتے ہیں جس کے معنی ستّو گھولنے اور لتھیڑنے کے ہیں۔ ان کا اور مجاہد کا بیان ہے کہ یہ دراصل ایک شخص تھا جو طائف کے قریب ایک چٹان پر رہتا تھا اور حج کے لیے جانے والوں کو ستّو پلاتا اور کھانا کھلاتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اسی چٹان پر اس کا استھان بنا لیا اور اس کی عبادت کرنے لگے۔ مگر لات کی یہ تشریح ابن عباسؓ اور مجاہد جیسے بزرگوں سے مروی ہونے کے باوجود دو وجوہ سے قابلِ قبول نہیں ہے۔ ایک یہ کہ قرآن میں اسے لات کہا گیا ہے نہ کہ لاتّ۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید ان تینوں کو دیویاں بتا رہا ہے، اور اس روایت کی رُو سے لات مرد تھا نہ کہ عورت۔

عُزّٰی

عِزّت سے ہے اور اس کے معنی عزّت والی کے ہیں۔ یہ قریش کی خاص دیوی تھی اور اس کا استھان مکّہ اور

---

[1] عربوں کے عقائد اور مذہبی مراسم میں سے جن چند باتوں کو قرآن نے صحیح یا غلط قرار دیا ہے، ہم صرف ان کے متعلق حتمی طور پر جانتے ہیں کیونکہ ان کی حفاظت کی گئی ہے۔ (مرتبین)

طائف کے درمیان وادیٔ نخلہ میں حُراض کے مقام پر واقع تھا۔ بنی ہاشم کے حلیف بنی شیبان کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ قریش اور دوسرے قبائل کے لوگ اس کی زیارت کرتے اور اس پر نذریں چڑھاتے اور اس کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ کعبہ کی طرح اس کی طرف بھی ہَدی کے جانور لے جائے جاتے اور تمام بُتوں سے بڑھ کر اس کی عزت کی جاتی تھی۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ ابواُحَیحہ جب مرنے لگا تو ابولہب اس کی عیادت کے لیے گیا۔ دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔ ابولہب نے کہا کیوں روتے ہو ابواُحَیحہ؟ کیا موت سے ڈرتے ہو حالانکہ وہ سب ہی کو آنی ہے۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں موت سے ڈر کر نہیں روتا، بلکہ مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے بعد عُزّیٰ کی پوجا کیسے ہوگی؟ ابولہب بولا، اس کی پوجا نہ تمہاری زندگی میں تمہاری خاطر ہوتی تھی اور نہ تمہارے بعد اُسے چھوڑا جائے گا۔ ابواُحَیحہ نے کہا اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے بعد کوئی میری جگہ سنبھالنے والا ہے۔

مَنَاۃ

اس کا استھان مکہ اور مدینہ کے درمیان بحرِ احمر کے کنارے قُدَید کے مقام پر تھا اور خاص طور پر بنی خُزاعہ اور اَوس اور خَزرج کے لوگ اس کے بہت معتقد تھے۔ اس کا حج اور طواف کیا جاتا اور اس پر نذر کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ زمانۂ حج میں جب حُجّاج طوافِ بیت اللہ اور عرفات اور مِنیٰ سے فارغ ہو جاتے تو وہیں سے مَنَاۃ کی زیارت کے لیے لبّیک لبّیک کی صدائیں بلند کر دی جاتیں اور جو لوگ اِس دوسرے "حج" کی نیت کر لیتے وہ صفا اور مَروہ کے درمیان سعی نہ کرتے تھے۔ [۲۵۵]

قومِ نوحؑ کے اَصنام

قومِ نوحؑ کے معبُودوں میں سے سُورۂ نوحؑ میں صرف اُن معبُودوں کے نام لیے گئے ہیں جنہیں بعد میں اہلِ عرب نے بھی پُوجنا شروع کر دیا تھا اور آغازِ اسلام کے وقت عرب میں جگہ جگہ ان کے مندر بنے ہوئے تھے۔ بعید نہیں کہ طوفان میں جو لوگ بچ گئے تھے ان کی زبان سے بعد کی نسلوں نے قومِ نوحؑ کے قدیم معبُودوں کا ذکر سُنا ہو اور جب ازسرِ نو ان کی اولاد میں جاہلیت پھیلی تو انہی معبُودوں کے بُت بنا کر انہوں نے پھر انہیں پُوجنا شروع کر دیا ہو۔

(۱) وَدّ

قبیلۂ قُضاعہ کی شاخ بنی کَلب بن وَبرہ کا معبُود تھا جس کا استھان انہوں نے دُومۃ الجندل میں بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات میں اس کا نام وَدَّم اَبَم (وَدّ باپ) لکھا ہُوا ملتا ہے۔ کلبی کا بیان ہے کہ اس کا

بُت ایک نہایت عظیم الجثہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور اس کا نام ان کے ہاں وُدّ تھا۔ اسی کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام عبد وُدّ ملتا ہے۔

(۲) سُواع

قبیلۂ ہُذَیل کی دیوی تھی اور اس کا بُت عورت کی شکل کا بنایا گیا تھا۔ ینبوع کے قریب رُہاط کے مقام پر اس کا مندر واقع تھا۔

(۳) یَغُوث

قبیلۂ طے کی شاخ اَنعُم اور قبیلہ مذحج کی بعض شاخوں کا معبود تھا۔ مذحج والوں نے یمن اور حجاز کے درمیان جُرش کے مقام پر اس کا بُت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی بعض کا نام عبد یغوث ملتا ہے۔

(۴) یَعُوق

یمن کے علاقہ ہمدان میں قبیلۂ ہمدان کی شاخ خَیوان کا معبود تھا اور اس کا بُت گھوڑے کی شکل کا تھا۔

(۵) نَسر

حِمیَر کے علاقے میں قبیلۂ حِمیَر کی شاخ آلِ ذُوالکلاع کا معبود تھا اور بلخع کے مقام پر اس کا بُت نصب تھا جس کی شکل گدھ کی تھی۔ سبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام نَسور لکھا ہُوا ملتا ہے۔ اس کے مندر کو وہ لوگ بیتِ نسور، اور اس کے پُجاریوں کو اہلِ نسور کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے جو آثار عرب اور اس کے متصل علاقوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گدھ کی تصویر بنی ہوئی ہے[۱۲۵]۔

مشہور بُت بَعل

أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ۔ (الصّٰفّٰت۔۱۲۵)

(حضرت الیاسؑ نے کہا) کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے تھے۔

بعل کے لغوی معنی آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوہر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا اور متعدد مقامات پر خود قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸، سورۂ نساء آیت ۱۲۸۔ سورۂ ہود آیت ۷۲، اور سورۂ نور آیت ۳۱ میں۔ لیکن قدیم زمانے کی سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنی میں استعمال کرتی تھیں اور انہوں نے ایک خاص دیوتا کو بعل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا خصوصیت کے ساتھ لبنان کی فنیقی قوم (Phoenicians) کا سب سے بڑا دیوتا بعل تھا اور اس کی بیوی عشتارات (Ashtoreth) ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اس امر

میں اختلاف ہے کہ آیا بعل سے مُراد سُورج ہے یا مُشتری، اور عستارات سے مراد چاند ہے یا زُہرہ۔ بہرحال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابل سے لے کر مصر تک پُورے مشرقِ اوسط میں بعل پرستی پھیلی ہوئی تھی، اور خصوصاً لبنان اور شام و فلسطین کی مُشرک اقوام بُری طرح اس میں مُبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد فلسطین اور شرقِ اُردن میں آ کر آباد ہوئے اور توراۃ کے سخت امتناعی احکام کی خلاف ورزی کر کے انہوں نے ان مُشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کر دیئے تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشع بن نون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں یہ اخلاقی و دینی زوال رُونما ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"اور بنی اسرائیل خدا کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے" (قضاۃ، ۲: ۱۱، ۱۳)

"سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور حِتّیوں اور اَموریوں اور فرزّیوں اور حَوّیوں اور یبوسیوں کے درمیان بس گئے اور ان کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو دیتے اور ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے" (قضاۃ ۲: ۵-۶)

اُس زمانہ میں بعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گھُس چکی تھی کہ بائیبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں علانیہ بعل کا مذبح بنا ہُوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مذبح توڑ دیا۔ دوسرے دن ایک مجمع کثیر اکٹھا ہو گیا اور وہ اس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اڈے کو توڑا تھا۔ اس صورتِ حال کو آخر کار حضرت سموایل، طالوت، داؤد علیہ السّلام اور سُلیمان علیہ السّلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی بلکہ اپنی مملکت میں بالعموم شرک و بُت پرستی کو دبا دیا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر اُبھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بعل پرستی کے سیلاب میں بہ گئی۔ ۲۵۰

بُت پرستی کے ساتھ خدا کا برتر تصوّر

مشرکینِ عرب اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے۔ وہی دن نکالتا اور رات لاتا ہے اور اسی نے آفتاب و ماہتاب کو وجود بخشا ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ عقیدہ نہ تھا کہ یہ کام لات یا ہُبل یا عُزّیٰ یا کسی اور دیوتا کے ہیں۔ ۲۵۱

قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے بارے میں مُشرکینِ عرب کا عقیدہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر سُورۂ زُخرف میں ہے: "اگر تم ان سے پُوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے"

(آیت ۶۱)۔ سورۂ عنکبوت میں ہے: "اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے ۔ ۔ ۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مُردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اٹھایا تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے" (آیات ۶۱ تا ۶۳)۔

سورۂ مومنون میں ہے: "ان سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ کی ۔ ۔ ۔ ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ ۔ ۔ ۔ ان سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے؟ اور کون ہے جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور جواب دیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے" (آیات ۸۴ تا ۸۹)۔

سورۂ یونس میں ہے: "ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں جو تمہیں حاصل ہیں کس کے اختیار میں ہیں؟ اور کون زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون اس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ" (آیت ۳۱)۔ اسی سورۂ یونس میں ایک اور جگہ ہے: "جب تم لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکرگزار بندے بنیں گے۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں" (آیات ۲۲-۲۳)۔ یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں یوں دہرائی گئی ہے: "جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو" (آیت ۶۷)۔ ؎۲۵۹

اموال میں خدا کے ساتھ بتوں کا حصّہ

وہ اس بات کے خود قائل تھے کہ زمین اللہ کی ہے اور کھیتیاں تو وہی اگاتا ہے، اُن جانوروں کا خالق بھی اللہ ہی ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خدمت لیتے ہیں لیکن ان کا تصور یہ تھا کہ ان پر اللہ کا یہ فضل اُن دیویوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں اور جنات اور آسمانی تاروں اور بزرگانِ سلف کی ارواح کے طفیل و برکت سے ہے جو ان پر نظرِ کرم رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو حصے نکالتے تھے۔ ایک حصہ اللہ کے نام کا، اس شکریہ میں کہ اس نے یہ کھیت اور یہ جانور انہیں بخشے، اور دوسرا حصہ اپنے قبیلہ یا خاندان کے سرپرست معبودوں کی نذر و نیاز کا، تاکہ اُن کی مہربانیاں ان کے شاملِ حال رہیں۔ ؎۲۶۰

خُدا پر بُتوں کو ترجیح

لیکن وہ خدا کے نام سے جو حصہ نکالتے تھے اس میں بھی طرح طرح کی چالبازیاں کر کے کمی کرتے رہتے تھے اور ہر صُورت سے اپنے خود ساختہ شریکوں کا حصّہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جو دلچسپی انہیں اپنے ان شریکوں سے ہے وہ خُدا سے نہیں ہے۔ مثلاً جو غلّہ یا پھل وغیرہ خدا کے نام پر نکالے جاتے ان میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شریکوں کے حصّہ میں شامل کر دیا جاتا تھا اور اگر شریکوں کے حصّے میں سے گرتا یا خُدا کے حصّے میں مل جاتا تو اُسے اُنہی کے حصّہ میں واپس کیا جاتا۔ کھیت کا جو حصّہ شریکوں کی نذر کے لیے مخصوص کیا جاتا تھا اگر اُس میں سے پانی اُس حصّہ کی طرف پھوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تھا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصّہ میں داخل کر دی جاتی تھی۔ لیکن اگر اس کے برعکس صُورت پیش آتی تو خدا کے حصّہ میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا غلّہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو خدا کا حصہ کھا لیتے تھے مگر شریکوں کے حصّہ کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصّہ میں کچھ کمی آجاتی تو وہ خدا کے حصّہ سے پوری کی جاتی تھی لیکن خدا کے حصہ میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصّہ میں سے ایک حبّہ بھی اس میں نہ ڈالا جاتا۔ اس طرزِ عمل پر کوئی نکتہ چینی کرتا تو جواب میں طرح طرح کی دلفریب توجیہیں کی جاتی تھیں۔ مثلاً کہتے تھے کہ خدا تو غنی ہے اس کے حصّہ میں کچھ کم بھی ہو جائے تو اُسے کیا پروا ہو سکتی ہے۔ رہے ہمارے یہ شریک، تو یہ بندے ہیں۔ خدا کی طرح غنی نہیں ہیں اس لیے ذراسی کمی بیشی پر بھی ان کے ہاں گرفت ہو جاتی ہے۔

ان توہّمات کی اصل جڑ کیا تھی اس کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ جہلائے عرب اپنے مال میں سے جو حصّہ خدا کے لیے نکالتے تھے وہ فقیروں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مدد میں صرف کیا جاتا تھا۔ اور جو حصّہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لیے نکالتے تھے وہ یا تو براہِ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر چڑھاوے کی صورت میں پیش کیا جاتا اور اس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پوجاریوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی لیے ان کے خود غرض مذہبی پیشواؤں نے صدیوں کی مسلسل تلقین سے ان جاہلوں کے دل میں یہ بات بٹھائی تھی کہ خدا کے حصّہ میں کمی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں مگر خُدا کے پیاروں کے حصّہ میں کمی نہ ہونی چاہیے بلکہ حتی الامکان کچھ بیشی ہی ہوتی رہے تو بہتر ہے۔[۱۰۶]

مُشرکین کی اصل گمراہی کیا تھی

اگرچہ مشرکینِ مکہ اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں اور ان نعمتوں پر اللہ کا احسان ماننے سے بھی انہیں انکار نہ تھا۔ لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی

کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن بہت سی ہستیوں کا شکریہ بھی زبان اور عمل سے ادا کرتے تھے جن کو انہوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی سند کے اس نعمت بخشی میں دخیل اور حصہ دار ٹھیرا رکھا ہے۔

اسی چیز کو قرآن "اللہ کے احسان کا انکار" قرار دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بطور ایک قاعدۂ کلیہ کے پیش کی گئی ہے کہ محسن کے احسان کا شکریہ غیر محسن کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ محسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا کہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ فلاں شخص کے طفیل، یا فلاں کی رعایت سے، یا فلاں کی سفارش سے، یا فلاں کی مداخلت سے کیا ہے۔ یہ بھی دراصل اس کے احسان کا انکار ہی ہے۔

اپنے معبودوں کے متعلق اہلِ عرب کے تصورات

اہلِ عرب اگرچہ شرک میں مبتلا تھے اور سخت تعصب کی حد تک مبتلا تھے، مگر درحقیقت اس کی جڑیں اوپر کی سطح ہی تک محدود تھیں، کچھ گہری اُتری ہوئی نہ تھیں، اور دنیا میں کبھی کہیں بھی شرک کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری اُتری ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس خالص خدا پرستی کی عظمت ان کے ذہن کی گہرائیوں میں رچی ہوئی موجود تھی جس کو اُبھارنے کے لیے اُوپر کی سطح کو بس ذرا زور سے کھُرچ دینے کی ضرورت تھی۔

جاہلیت کی تاریخ کے متعدد واقعات ان دونوں باتوں کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً ابرہہ کے حملے کے موقع پر قریش کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ اس بلا کو وہ بت نہیں ٹال سکتے جو خانۂ کعبہ میں رکھے ہوئے ہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ٹال سکتا ہے جس کا یہ گھر ہے۔ آج تک وہ اشعار اور قصائد محفوظ ہیں جو اصحاب الفیل کی تباہی پر ہمعصر شعراء نے کہے تھے۔ اُن کا لفظ لفظ گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ اس واقعہ کو محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ سمجھتے تھے اور اس امر کا ادنیٰ سا گمان بھی نہ رکھتے تھے کہ اس میں اُن کے معبودوں کا کوئی دخل ہے۔ اسی موقع پر شرک کا یہ بدترین کرشمہ بھی قریش اور تمام مشرکینِ عرب کے سامنے آیا تھا کہ ابرہہ جب مکے کی طرف جاتے ہوئے طائف کے قریب پہنچا تو اہلِ طائف نے اس اندیشے سے کہ کہیں اُن کے معبود "لات" کے مندر کو بھی نہ گرا دے، اپنی خدمات کعبے کو منہدم کرنے کے لیے اُس کے آگے پیش کر دیں اور اپنے رہبر اس کے ساتھ کر دیے تاکہ وہ پہاڑی راستوں سے اس کے لشکر کو بخیریت مکہ تک پہنچا دیں۔ اس واقعہ کی تلخ یاد مدتوں تک قریش کو ستاتی رہی اور سالہا سال تک وہ اس شخص کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے جو طائف کے رہبروں کا سردار تھا۔

علاوہ بریں قریش اور دوسرے اہلِ عرب اپنے دین کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے تھے، اپنے بہت سے مذہبی اور معاشرتی مراسم اور عبادات و مناسکِ حج کو دینِ ابراہیمی ہی کے احکام قرار دیتے تھے،

اور یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ خالص خدا پرست تھے۔ بتوں کی پرستش انھوں نے کبھی نہیں کی۔ ان کے ہاں کی روایات میں یہ تفصیلات بھی محفوظ تھیں کہ بت پرستی ان کے ہاں کب سے رائج ہوئی اور کون سا بت کب کہاں سے، کون لایا؟

اپنے معبودوں کی جیسی کچھ عزت ایک عام عرب کے دل میں تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب کبھی اس کی دعاؤں اور تمناؤں کے خلاف کوئی واقعہ ظہور میں آ جاتا تو بسا اوقات وہ معبود صاحب کی توہین بھی کر ڈالتا تھا اور اس کی نذر و نیاز سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ ایک عرب اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ذوالخلصہ نامی بت کے آستانے پر جا کر اس نے فال کھلوائی۔ جواب نکلا یہ کام نہ کیا جائے۔ اس پہ عرب طیش میں آ گیا۔ کہنے لگا:

لَوْ كُنْتَ يَا ذَا الْخَلَصِ الْمَوْتُورَا ... مِثْلِي وَكَانَ شَيْخُكَ الْمَقْبُورَا

لَمْ تَنْهَ عَنْ قَتْلِ الْعُدَاةِ زُورًا

"یعنی اے ذوالخلصہ! اگر میری جگہ تو ہوتا اور تیرا باپ مارا گیا ہوتا تو ہرگز تو یہ جھوٹی بات نہ کہتا کہ ظالموں سے بدلہ نہ لیا جائے۔"

ایک اور عرب صاحب اپنے اونٹوں کا گلہ اپنے معبود سعد نامی کے آستانے پر لے گئے تاکہ ان کے لیے برکت حاصل کریں۔ یہ ایک لمبا تڑنگا بت تھا جس پر قربانیوں کا خون لتھڑا ہوا تھا۔ اونٹ اسے دیکھ کر بھڑک گئے اور ہر طرف بھاگ نکلے۔ عرب اپنے اونٹوں کو اس طرح تتر بتر ہوتے دیکھ کر غصے میں آ گیا۔ بت پر پتھر مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ "خدا تیرا ستیاناس کرے۔ میں آیا تھا برکت لینے کے لیے اور تو نے جو رہے سہے اونٹ بھی بھگا دیئے۔"

متعدد بت ایسے تھے جن کی اصلیت کے متعلق نہایت گندے قصے مشہور تھے مثلاً اِساف اور نائلہ جن کے مجسمے صفا اور مروہ پر رکھے ہوئے تھے، ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دونوں دراصل ایک عورت اور ایک مرد تھے جنہوں نے خانہ کعبہ میں زنا کا ارتکاب کیا تھا اور خدا نے ان کو پتھر بنا دیا۔ یہ حقیقت جن معبودوں کی ہو ظاہر ہے کہ ان کی کوئی حقیقی عزت تو عابدوں کے دلوں میں نہیں ہو سکتی[۲۱]

---

[۲۰] ان مختلف پہلوؤں کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ خالص خدا پرستی کی ایک گہری قدر و منزلت تو دلوں میں موجود تھی مگر ایک طرف جاہلانہ قدامت پرستی نے اس کو دبا رکھا تھا اور دوسری طرف قریش کے پروہت اس کے خلاف تعصبات بھڑکاتے رہتے تھے کیونکہ بتوں کی عقیدت ختم ہو جانے سے ان کو اندیشہ تھا کہ

صالحینِ سلف کے بُت

عرب کے متعدد قبائل، ربیعہ، غسّان، کلب، تغلب، قضاعہ، کنانہ، حَرث، کعب، کِندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے۔ اور یہ دونوں مذاہب بُری طرح انبیاء، اولیاء اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے۔ پھر مشرکین عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے معبُود وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے جنہیں بعد کی نسلوں نے خدا بنا لیا تھا۔ بخاری میں ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق، نسر یہ سب صالحین کے نام ہیں جنہیں بعد کے لوگ بُت بنا بیٹھے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ اِساف اور نائلہ دونوں انسان تھے۔ اسی طرح کی روایات لات اور مَنَاۃ اور عُزّٰی کے بارے میں بھی موجود ہیں اور مشرکین کا یہ عقیدہ بھی روایات میں آیا ہے کہ لات اور عُزّٰی اللہ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ میاں جاڑا لات کے ہاں اور گرمی عُزّٰی کے ہاں بسر کرتے تھے۔ (سُبحَانَہٗ وتعالیٰ عمّا یصِفُونَ)[۶۵]

اصحابِ قبُور کی پرستش

سُورۂ نحل آیت ۲۱ میں خاص طور پر جن بناوٹی معبُودوں کی تردید کی گئی ہے وہ فرشتے، یا جن یا شیاطین، یا لکڑی پتھر کی مُورتیاں نہیں ہیں، بلکہ اصحابِ قبُور ہیں۔ اس لیے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں ان پر اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہوسکتا اور لکڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملہ میں بعث بعدالموت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اس لیے مَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ کے الفاظ انہیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ سے مُراد وہ انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین داتا، مشکل کُشا، فریاد رس، غریب نواز، گنج بخش، اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لیئے پکارنا شرُوع کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اِس نوعیت کے معبُود نہیں پائے جاتے تھے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ جاہلیّتِ عرب کی تاریخ سے اس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔[۶۶]

۴۔ عرب میں ان کو جو مرکزیت حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی اور ان کی آمدنی میں بھی فرق آجائے گا۔ ان بیچاروں پر جو مذہب شرک قائم تھا وہ توحید کی دعوت کے مقابلے میں کسی وقار کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے خود مشرکین کو خطاب کرکے بتے تکلّف کہا کہ تمہارے معاشرے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیروؤں کو جن وجوہ سے برتری حاصل ہے ان میں سے ایک اہم ترین وجہ ان کا شرک سے پاک ہونا اور خالص خدا پرستی پر قائم ہو جانا ہے۔ اس پہلو سے مسلمانوں کی برتری کو زبان سے ماننے کے لیے چاہے مشرکین تیار نہ ہوں مگر دِلوں میں اس کا وزن محسوس کرتے تھے۔[۶۴]

فرشتوں کے زنانہ مجسّموں کی پرستش

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں قُریش، جُہَینہ، بنی سَلمہ، خزاعہ، بنی مُلَیح اور بعض دوسرے قبائل کا عقیدہ یہ تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔* فرشتوں کو انہوں نے دیویاں قرار دے رکھا تھا۔ ان کے بُت عورتوں کی شکل کے بنا رکھے تھے۔ انہیں زنانہ کپڑے اور زیور پہناتے اور کہتے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اُن کی عبادت کرتے، اور انہی سے مِنّتیں اور مُرادیں مانگتے۔

تقدیر کا بہانہ

ان جہالتوں پر ٹوکا جاتا تو تقدیر کا بہانہ پیش کرتے اور کہتے کہ اگر اللہ ہمارے اس کام کو پسند نہ کرتا تو ہم کیسے ان بتوں کی پرستش کر سکتے تھے۔ حالانکہ اللہ کی پسند اور نا پسند معلوم ہونے کا ذریعہ اُس کی کتابیں ہیں نہ کہ وہ کام جو دُنیا میں اُس کی مشیّت کے تحت ہو رہے ہیں۔ مشیّت کے تحت تو ایک بُت پرستی ہی نہیں، چوری، زنا، ڈاکہ، قتل سب ہی کچھ ہو رہا ہے۔ کیا اس دلیل سے ہر اُس بُرائی کو جائز و برحق قرار دیا جائے گا جو دنیا میں ہو رہی ہے۔ دُنیا کے کسی کام کا مشیّت کے تحت ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس کام کو اللہ کی رضا بھی حاصل ہے۔

باپ دادا کی اندھی تقلید

پوچھا جاتا کہ اپنے اِس شرک کے لیے تمہارے پاس اِس غلط دلیل کے سوا کوئی اور سند بھی ہے تو جواب دیتے کہ باپ دادا سے یہ کام یونہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ گویا ان کے نزدیک کسی مذہب کے حق ہونے کے لیے یہ کافی دلیل تھی۔ حالانکہ ابراہیم علیہ السّلام جن کی اولاد ہونے پر ہی ان کے سارے فخر و امتیاز کا مدار تھا، باپ دادا کے مذہب کو لات مار کر گھر سے نکل گئے تھے اور انہوں نے اسلاف کی ایسی اندھی تقلید کو رد کر دیا تھا جس کا ساتھ کوئی دلیل معقول نہ دیتی ہو۔ پھر اگر ان لوگوں کو اسلاف کی تقلید ہی کرنی تھی تو اس کے لیے بھی اپنے بزرگ ترین اسلاف ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے جاہل ترین اسلاف کا انتخاب کیا!

عیسائیوں کی گمراہی سے بُت پرست اہلِ عرب کا استدلال

ان سے کہا جاتا کہ کیا کبھی کسی نبی نے اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی کتاب نے بھی یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے ساتھ دوسرے بھی عبادت کے مستحق ہیں، تو وہ عیسائیوں کے اِس فعل کو دلیل میں پیش کرتے کہ انہوں نے عیسیٰ ابنِ مریمؑ کو ابن اللہ مانا اور اُن کی پرستش کی۔ حالانکہ سوال یہ نہ تھا کہ کسی نبی کی اُمّت نے شرک کیا ہے

---

* قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ان کے اس جاہلانہ عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: النساء آیت ۱۱۷۔ النحل آیات ۵۷، ۵۸۔ بنی اسرائیل آیت ۴۰۔ الزخرف آیات ۱۶ تا ۱۹۔ النجم آیات ۲۱ تا ۲۷۔

یا نہیں ؟ بلکہ یہ تھا کہ کیا خود کسی نبی نے بھی شرک کی تعلیم دی ہے ؟ عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے کب کہا تھا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو ؟ ان کی اپنی تعلیم تو وہی تھی جو دنیا کے ہر نبی نے دی ہے کہ میرا رب بھی اللہ ہے اور تمہارا رب بھی ، اسی کی تم عبادت کرو ۔ ۳۶۴

مشرکین کے خداؤں کی اقسام

دنیا بھر کے مشرکین خدا کے سوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں اور اہلِ عرب بھی جن سے دعائیں مانگتے تھے ، وہ تین اقسام پر منقسم ہیں ۔ ایک بے روح اور بے عقل مخلوقات ۔ دوسرے وہ بزرگ انسان جو گزر چکے ہیں تیسرے وہ گمراہ انسان جو خود بگڑے ہوئے تھے اور دوسروں کو بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے عابدوں کی دعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر ہی ہے ۔ رہے دوسری قسم کے معبود جو اللہ کے مقرب انسان تھے ، تو ان کے بے خبر رہنے کے دو وجوہ ہیں ۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں جہاں انسانی آوازیں براہ راست ان تک نہیں پہنچتیں ۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی ان تک یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو آپ ساری عمر اللہ سے دعا مانگنا سکھاتے رہے تھے وہ اب الٹی آپ سے دعائیں مانگ رہے ہیں ، اس لیے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو صدمہ پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی ارواح کو اذیت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا ۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معبودوں کے معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے بے خبر رہنے کے بھی دو وجوہ ہیں ۔ ایک یہ کہ وہ ملزموں کی حیثیت سے اللہ کے ہاں حوالات میں بند ہیں جہاں دنیا کی کوئی آواز انہیں نہیں پہنچتی ۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے بھی انہیں یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ تمہارا مشن دنیا میں خوب کامیاب ہو رہا ہے اور لوگ تمہارے پیچھے تمہیں معبود بنائے بیٹھے ہیں ، اس لیے کہ یہ خبریں ان کے لیے مسرت کی موجب ہوں گی ۔ اور خدا ان ظالموں کو ہرگز خوش نہیں کرنا چاہتا ۔ ۳۶۵

وہ تمام فرشتے جن کو دنیا میں دیوی اور دیوتا قرار دے کر پوجا گیا ، اور وہ تمام جن ، ارواح ، اسلاف اجداد ، انبیاء ، اولیاء ، شہداء وغیرہ جن کو خدائی صفات میں شریک ٹھیرا کر وہ حقوق انہیں ادا کیے گئے جو

لے مولانا نے اسی بات کو دوسری جگہ ایک اور انداز سے لکھا ہے کہ مشرکانہ مذاہب میں تین چیزیں الگ الگ پائی جاتی ہیں ۔ ایک تو وہ اصنام ، تصاویر یا علامات جو مرجع پرستش د ... ہوتی ہیں ۔ دوسرے وہ اشخاص یا ارواح یا معانی جو دراصل معبود قرار دیے جاتے ہیں اور جن کی نمائندگی اصنام اور تصاویر وغیرہ کی شکل میں کی جاتی ہے ۔ تیسرے وہ اعتقادات جو ان مشرکانہ عبادات و اعمال کی تہ میں کارفرما ہوتے ہیں ۔ ۳۶۶

دراصل خدا کے حقوق تھے، وہاں اپنے پرستاروں سے صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہماری عبادت بجالا رہے ہو۔ تمہاری کوئی دُعا، کوئی التجا، کوئی پکار اور فریاد، کوئی نذر و نیاز، کوئی چڑھاوے کی چیز، کوئی تعریف مدح اور ہمارے نام کی جاپ، اور کوئی سجدہ ریزی و آستانہ بوسی و درگاہ گردی ہم تک نہیں پہنچی۔[illegible]

عرب میں قحبہ گری کی صورتیں

عرب میں قحبہ گری کی دو صورتیں رائج تھیں۔ ایک خانگی کا پیشہ۔ دوسرے باقاعدہ چکلہ۔ "خانگی" کا پیشہ کرنے والی زیادہ تر آزاد شدہ لونڈیاں ہوتی تھیں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا، یا ایسی آزاد عورتیں ہوتی تھیں جن کی پشت پناہی کرنے والا کوئی خاندان یا قبیلہ نہ ہوتا، یہ کسی گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مردوں سے بیک وقت ان کا معاہدہ ہو جاتا کہ وہ ان کو مدد و خرچ دیں گے اور اپنی حاجت پوری کرتے رہیں گے جب بچہ پیدا ہوتا تو عورت ان مردوں میں سے جس کے متعلق کہہ دیتی کہ یہ بچہ اس کا ہے اُسی کا بچہ وہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ یہ گویا معاشرے میں ایک مسلّم ادارہ تھا جسے اہل جاہلیّت "ایک قسم کا نکاح" سمجھتے تھے۔ (ابوداؤد)۔ دوسری صورت یعنی کھلی قحبہ گری تمام تر لونڈیوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس کے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ لوگ اپنی جوان لونڈیوں پہ ایک بھاری رقم عائد کر دیتے تھے کہ ہر مہینے اتنا کما کر ہمیں دیا کرو، اور وہ بے چاریاں بدکاری کرا کرا کر یہ مطالبہ پورا کرتی تھیں۔ اس کے سوا نہ کسی دوسرے ذریعہ سے وہ اتنا کما سکتی تھیں، نہ مالک ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی پاکیزہ کسب کے ذریعے یہ رقم لایا کرتی ہیں، اور نہ جوان لونڈیوں پر عام مزدوری کی شرح سے کئی کئی گُنی رقم عائد کرنے کی کوئی دوسری معقول وجہ ہی ہو سکتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان جوان اور خوبصورت لونڈیوں کو کوٹھوں پر بٹھا دیتے تھے اور ان کے دروازوں پر جھنڈے لگا دیتے تھے جنہیں دیکھ کر دُور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ "حاجتمند" آدمی کہاں اپنی حاجت رفع کر سکتا ہے۔ یہ عورتیں "قلیقیات" کہلاتی تھیں اور ان کے گھر "مواخیر" کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں نے اس طرح کے چکلے کھول رکھے تھے۔ خود عبداللہ بن اُبَیّ رئیس المنافقین، وہی صاحب جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا طے کر چکے تھے، اور وہی صاحب جو حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے میں سب سے پیش پیش تھے، مدینے میں ان کا ایک باقاعدہ چکلہ موجود تھا جس میں چھ خوبصورت لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے ذریعہ سے وہ صرف دولت ہی نہیں کماتے تھے بلکہ عرب کے مختلف حصوں سے آنے والے معزز مہمانوں کی تواضع بھی انہی سے فرمایا کرتے تھے اور ان کی ناجائز اولاد سے اپنے خدم و حشم کی فوج بھی بڑھاتے تھے۔[illegible]

بتوں کے استھانوں پر فال گیری

مشرکین مکہ نے فال گیری (جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا تھا یا غیب کی

تیر وہ یا قسمت کی جانچ تھی یا باہمی تنازعات کا تصفیہ کرایا جاتا تھا) کی غرض سے کعبہ کے اندر ہبل دیوتا کے بت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے استھان میں سات تیر رکھے ہوتے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو، یا کھوئی ہوئی چیز کا پتہ پوچھنا ہو، یا خون کے مقدمہ کا فیصلہ مطلوب ہو۔ غرض کوئی کام بھی ہو، اُس کے لیے ہبل کے پانسہ دار (صاحب القداح) کے پاس پہنچ جاتے، اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہبل سے دعا مانگتے کہ ہمارے اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسہ دار ان تیروں کے ذریعے سے فال نکالتا اور جو تیر بھی فال میں نکل آتا اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہبل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔ ۳۲؎

نذر و نیاز کے طریقے

اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ بعض جانوروں کے متعلق یا بعض کھیتوں کی پیداوار کے متعلق منت مان لیتے تھے کہ یہ فلاں آستانے یا فلاں حضرت کی نیاز کے لیے مخصوص ہیں۔ اس نیاز کو ہر ایک نہ کھا سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے ان کے ہاں ایک مفصل ضابطہ تھا جس کی رو سے مختلف نیازوں کو مختلف قسم کے مخصوص لوگ ہی کھا سکتے تھے۔ ۳۳؎

اہل عرب کے ہاں بعض مخصوص منتوں اور نذروں کے جانور ایسے ہوتے تھے جن پر خدا کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا کیونکہ حج کے لیے لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دودھ دوہتے وقت یا ان پر سوار ہونے کی حالت میں یا ان کو ذبح کرتے ہوئے یا ان کو کھانے کے وقت اہتمام کیا جاتا تھا کہ خدا کا نام زبان پر نہ آئے۔ ۳۴؎

اہل عرب کے ہاں نذروں اور منتوں کے جانوروں کے متعلق جو خود ساختہ شریعت بنی ہوئی تھی اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو بچہ پیدا ہو اس کا گوشت صرف مرد کھا سکتے ہیں، عورتوں کے لیے ان کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن اگر وہ بچہ مُردہ ہو یا مر جائے تو اس کا گوشت کھانے میں مرد و عورت سب شریک ہو سکتے ہیں۔ ۳۵؎

جانوروں کو پُن کر کے چھوڑنا

زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب مختلف طریقوں سے جانوروں کو پُن کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان طریقوں سے چھوڑے ہوئے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔

بَحِیرہ ۔ اس اونٹنی کو کہتے تھے جو پانچ دفعہ بچے جن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچہ ہوا ہو۔ اُس کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا، نہ اُس کا دودھ پیا جاتا، نہ اسے ذبح کیا جاتا، نہ اس کا اون اتارا جاتا۔ اسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے چرے اور جس گھاٹ سے چاہے

پانی پیے۔

سائبہ، اُس اونٹ یا اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی منت کے پورا ہونے یا کسی بیماری سے شفا پانے یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطور شکرانہ پُن کر دیا گیا ہے۔ نیز جس اونٹنی نے دس مرتبہ بچے دیئے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو اُسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وصیلہ، اگر بکری کا پہلا بچہ نر ہوتا تو وہ خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا۔ اور اگر وہ پہلی بار مادہ جنتی تو اسے اپنے لیے رکھ لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کے بجائے اُن ہی خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کا نام وصیلہ تھا۔

حام، اگر کسی اونٹ کا پوتا سواری کے قابل ہو جاتا تو اُس بوڑھے اونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ نیز اگر کسی اونٹ کے نطفے سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل جاتی تھی۔

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا حج

منجملہ ان توہم پرستانہ رسموں کے جو عرب میں رائج تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ جب حج کے لیے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے بلکہ پیچھے سے دیوار کود کر یا دیوار میں کھڑکی سی بنا کر داخل ہوتے تھے، نیز سفر سے واپس آکر بھی گھروں میں پیچھے سے داخل ہوا کرتے تھے۔

یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصور تھا کہ سفرِ حج کے دوران میں کسبِ معاش کے لیے کام کرنے کو وہ بُرا سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک کسبِ معاش ایک دُنیادارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔

اہلِ عرب حج سے فارغ ہو کر جلسے کرتے تھے جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ دادا کے کارنامے فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔

مظاہرِ قدرت سے شگون لینا

چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے جس نے ہر زمانے میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے اوہام و تخیلات اور رسوم دُنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہلِ عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے۔ چاند سے اچھے یا بُرے شگون لینا، بعض تاریخوں کو سعد اور بعض کو نحس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کام کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسعود خیال کرنا، اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع و غروب اور اس کی کمی و بیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے، یہ سب باتیں دوسری جاہل قوموں کی طرح اہلِ عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس

سلسلے میں مختلف توہم پرستانہ رسمیں اُن میں رائج تھیں۔ [۳۸۱]

جنات کے بارے میں توہم پرستی

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں جب عرب کسی سنسان وادی میں رات گزارتے تھے تو پکار کر کہتے "ہم اِس وادی کے مالک (یعنی جن) کی پناہ مانگتے ہیں" عہدِ جاہلیت کی دوسری روایات میں بھی بکثرت اس بات کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً اگر کسی جگہ پانی اور چارہ ختم ہو جاتا تو خانہ بدوش بدو اپنا ایک آدمی کوئی دوسری جگہ تلاش کرنے کے لیے بھیجتے جہاں پانی اور چارہ مل سکتا ہو، پھر اُس کی نشان دہی پر جب یہ لوگ نئی جگہ پہنچتے تو وہاں اترنے سے پہلے پکار پکار کر کہتے "کہ ہم اس وادی کے رب کی پناہ مانگتے ہیں تاکہ یہاں ہم ہر آفت سے محفوظ رہیں" ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر غیر آباد جگہ کسی نہ کسی جن کے قبضے میں ہے اور اس کی پناہ مانگے بغیر وہاں کوئی ٹھیر جائے تو وہ جن یا تو خود ستاتا ہے یا دوسرے جنوں کو ستانے دیتا ہے۔ [۳۸۲]

کثرتِ ازدواج

جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا تھا۔ اور جب اس کثرتِ ازدواج سے مصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ [۳۸۳]

سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے۔ [۳۸۴]

حائضہ سے سلوک

اہلِ مدینہ چونکہ یہودیوں سے بہت متأثر تھے اس لیے ان کے ہاں یہودیوں کی طرح ایامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اس کا پکایا ہوا کھانا کھاتے نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اس کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھتے۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی تھی۔ [۳۸۵]

طلاق در طلاق کا رواج

ایک بہت بڑی معاشرتی خرابی عرب جاہلیت میں یہ رائج تھی کہ ایک شخص اپنی بیوی کو بے حد و حساب طلاق دینے کا مجاز تھا۔ جس عورت سے اس کا شوہر بگڑ جاتا اس کو وہ بار بار طلاق دے دے کر رجوع کرتا رہتا تھا۔ تاکہ نہ تو وہ غریب اس کے ساتھ ہی بس سکے اور نہ اس سے آزاد ہو کر کسی اور ہی سے نکاح کر سکے۔ [۳۸۶]

یتامیٰ پر زیادتیاں

زمانۂ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں ان کے مال اور ان کے حُسن و جمال کی وجہ

سے یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرا تو ہے نہیں جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے ۔ ؎۸۵

حضرت عائشہؓ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے۔ اگر لڑکی مالدار ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور مہر نقد ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے تھے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح ہونے دیتے تھے تاکہ اس کا کوئی ایسا سر دھرا پیدا نہ ہو جائے جو کل اُس کے حق کا مطالبہ کرنے والا ہو۔ ؎۸۸

یتامیٰ کے ساتھ عرب میں کیا سلوک ہوتا تھا ؟

اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب واقعہ قاضی ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب اَعلام النبوّۃ میں لکھا ہے۔ ابوجہل ایک یتیم بچے کا وصی تھا۔ وہ بچہ ایک روز اس حالت میں اُس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اسے کچھ دے دے۔ مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجّہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخرکار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہِ شرارت اس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر شکایت کر، وہ ابوجہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بے چارا ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے کیا تعلق ہے اور یہ بدبخت اسے کس غرض کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضورؐ کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپ سے بیان کیا۔ آپؐ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپؐ کو دیکھ کر اس نے آپؐ کا استقبال کیا اور جب آپؐ نے فرمایا کہ اس بچے کا حق اسے دے دو تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں، ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزے دار جھڑپ کی امید کر رہے تھے۔ مگر جب انہوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے اور اسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے۔ اس نے کہا خدا کی قسم، میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دائیں بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا اگر میں نے ذرا بھی ان کی مرضی کے خلاف حرکت کی۔ ؎۸۹

؎ اس واقعہ سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور معزز قبیلے تک کے

قتلِ اولاد کی صورتیں

قتلِ اولاد کی تین صورتیں اہلِ عرب میں رائج تھیں:

۱۔ لڑکیوں کا قتل، اس خیال سے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے یا قبائلی لڑائیوں میں وہ دشمن کے ہاتھ نہ پڑیں یا کسی دوسرے سبب سے وہ ان کے لیے سببِ عار نہ بنیں۔

۲۔ بچوں کا قتل، اس خیال سے کہ ان کی پرورش کا بار نہ اٹھایا جا سکے گا اور ذرائع معاش کی کمی کے سبب سے وہ ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائیں گے۔

۳۔ بچوں کو اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لیے بھینٹ چڑھانا![۳۹۱]

عورتوں اور بچوں کی میراث سے محرومی

عرب میں عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظریہ اس باب میں یہ تھا کہ میراث کا حق صرف ان مردوں کو پہنچتا ہے جو لڑنے اور کنبے کی حفاظت کرنے کے قابل ہوں۔ اس کے علاوہ مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور بااثر ہوتا تھا وہ بلا تامل ساری میراث سمیٹ لیتا تھا اور ان سب لوگوں کا حصہ مار کھاتا تھا جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بوتا نہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی اہمیت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دیں خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔[۳۹۲]

وراثت کا ایک رواج

اہل عرب میں قاعدہ تھا کہ جن لوگوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارہ کے عہد و پیمان ہو جاتے تھے وہ ایک دوسرے کی میراث کے حقدار بن جاتے تھے اسی طرح جسے بیٹا بنا لیا جاتا وہ بھی منہ بولے باپ کا وارث قرار پاتا تھا۔[۳۹۳]

لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا یہ بے رحمانہ طریقہ قدیم زمانے میں مختلف وجوہ سے رائج ہو گیا تھا۔ ایک معاشی خستہ حالی جس کی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے کم ہوں اور اولاد کو پالنے پوسنے کا بار ان پر نہ پڑے

ء بڑے بڑے سرداروں کا تیمیوں اور دوسرے بے یارومددگار لوگوں کے ساتھ کیا سلوک تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس بلند اخلاق کے مالک تھے اور آپ کے اس اخلاق کا آپ کے بدترین دشمنوں تک پر کیسا رعب تھا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ہم اس سے پہلے تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۱۶ پر نقل کر چکے ہیں جو حضور کے اس زبردست اخلاقی رعب پر دلالت کرتا ہے جس کی وجہ سے کفار قریش آپ کو جادوگر کہتے تھے۔[۳۹۰]

بیٹوں کو تو اس اُمید پر پال لیا جاتا تھا کہ بعد میں وُہ حصُولِ معیشت میں ہاتھ بٹائیں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ انہیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر انہیں بیاہ دینا ہوگا۔ دوسرے عام بدامنی جس کی وجہ سے بیٹوں کو اس لیے پالا جاتا تھا کہ جس کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں گے اس کے اتنے ہی حامی و مددگار ہوں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ قبائلی لڑائیوں میں اُلٹی ان کی حفاظت کرنی پڑتی تھی اور دفاع میں وہ کسی کام نہ آسکتی تھیں۔ تیسرے عام بدامنی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ دشمن قبیلے جب ایک دوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تھے تو جو لڑکیاں بھی ان کے ہاتھ لگتی تھیں انہیں لے کر وہ یا تو لونڈیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے۔ ان وجوہ سے عرب میں یہ طریقہ چل پڑا تھا کہ کبھی تو زچگی کے وقت ہی عورت کے آگے ایک گڑھا کھود رکھا جاتا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسی وقت اسے گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جاتی، اور کبھی اگر ماں اس پر راضی نہ ہوتی یا اُس کے خاندان والے اس میں مانع ہوتے تو باپ بادلِ ناخواستہ اسے کچھ مدت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لے جاکر زندہ دفن کر دیتا۔ اس معاملہ میں جو شقاوت برتی جاتی تھی اس کا قصہ ایک شخص نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ بیان کیا۔ سُنَنِ دارمی کے پہلے ہی باب میں یہ حدیث منقول ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے اپنے عہدِ جاہلیت کا یہ واقعہ بیان کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت مانوس تھی۔ جب میں اس کو پکارتا تو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستہ میں ایک کنواں آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنوئیں میں دھکا دے دیا۔ آخری آواز جو اس کی میرے کانوں میں آئی وہ تھی ہائے ابّا، ہائے ابّا۔ یہ سُن کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رو دیئے اور آپؐ کے آنسُو بہنے لگے۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا اے شخص تُو نے حضُورؐ کو غمگین کر دیا۔ حضُورؐ نے فرمایا اسے مت روکو، جس چیز کا اسے سخت احساس ہے، اس کے بارے میں اسے سوال کرنے دو۔ پھر آپؐ نے اس سے فرمایا کہ اپنا قصہ پھر بیان کرو۔ اس نے دوبارہ اسے بیان کیا اور آپؐ سُن کر اس قدر روئے کہ آپؐ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ جاہلیت میں جو کچھ ہو گیا اسے اللہ نے معاف کر دیا۔ اب نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر۔

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اہلِ عرب اس انتہائی غیر انسانی فعل کی قباحت کا سرے سے کوئی احساس ہی نہ رکھتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی معاشرہ خواہ کتنا ہی بگڑ چکا ہو، وہ ایسے ظالمانہ افعال کی بُرائی کے احساس سے بالکل خالی نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے قرآن پاک میں اس فعل کی قباحت پر کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کی گئی ہے بلکہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے الفاظ میں صرف اتنی بات کہہ کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قصور میں ماری

گئی۔[1]

عرب کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو زمانۂ جاہلیت میں اس رسم کی قباحت کا احساس تھا۔ طَبَرانی کی روایت ہے کہ فَرَزْدَق شاعر کے دادا صَعْصَعہ بن ناجِیۃُ المُجاشِعی نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا یا رسُول اللہ، مَیں نے جاہلیت کے زمانے میں کچھ اچھے اعمال بھی کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ مَیں نے ۳۶۰ لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے بچایا اور ہر ایک کی جان بچانے کے لیے دو دو اُونٹ فدیے میں دیئیے۔ کیا مجھے اس پر اجر ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا ہاں تیرے لیے اجر ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تجھے اسلام کی نعمت عطا فرمائی۔

---

[1] وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (التکویر: ۸-۹) "اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصُور میں ماری گئی۔

اِس آیت کے اندازِ بیان میں ایسی شدید غضبناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضبناکی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابلِ نفرت ہوں گے کہ اُن کو مخاطب کر کے یہ نہ پُوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصُوم کو کیوں قتل کیا، بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچّی سے پُوچھا جائے گا کہ تو بے چاری آخر کس قصُور میں ماری گئی اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظُلم کیا اور کس طرح اُسے زندہ دفن کر دیا۔ اس کے علاوہ اس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیئے گئے ہیں جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اس کے فحوٰی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اہلِ عرب کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جاہلیت نے ان کو اخلاقی پستی کی کس اِنتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرتے ہیں، پھر بھی انہیں اصرار ہے کہ اپنی اس جاہلیت پر قائم رہیں گے اور اُس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں آخرت کے ضروری ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کی گئی ہے۔ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا اس کی آخر کہیں تو داد رسی ہونی چاہیے اور جن ظالموں نے یہ ظُلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب ان سے اس بے دردانہ ظلم کی بازپرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دنیا میں تو کوئی سننے والا نہیں تھا۔ جاہلیت کے معاشرے میں اِسے بالکل جائز رکھا گیا تھا۔ نہ ماں باپ کو اس پر کوئی شرم آتی تھی، نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا، نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلمِ عظیم بالکل ہی بے داد رہ جانا چاہیے؟ ۱۹۵ تا

قتل کا انتقام

جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے اتنی ہی قیمت کا خون اُس خاندان یا قبیلے یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لے لینے سے اُن کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سینکڑوں سے لینا چاہتے تھے۔ ان کا کوئی معزز آدمی اگر دوسرے گروہ کے کسی چھوٹے آدمی کے ہاتھوں مارا گیا ہوتا تو وہ اصل قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ قاتل کے قبیلے کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے، یا اس کے کئی آدمی اُن کے مقتول پر سے صدقہ کیے جائیں۔ برعکس اس کے اگر مقتول ان کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجے کا شخص اور قاتل کوئی زیادہ قدر و عزت رکھنے والا شخص ہوتا تو وہ اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لی جائے۔ ۲۹۶ے

تصورِ لباس و برہنگی

یہ لوگ (اہلِ عرب) لباس کو صرف زینت اور موسمی اثرات سے جسم کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے لیکن اس کی سب سے پہلی بنیادی غرض یعنی جسم کے قابلِ شرم حصوں کی پردہ پوشی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ انہیں اپنے ستر دوسروں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظرِ عام پر نہا لینا، راہ چلتے قضائے حاجت کے لیے بیٹھ جانا، ازار کھل جائے تو ستر کے بے پردہ ہو جانے کی پروا نہ کرنا ان کے شب و روز کے معمولات تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے بکثرت لوگ حج کے موقع پر کعبہ کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کی عورتیں ان کے مردوں سے بھی کچھ زیادہ بے حیا تھیں۔ اُن کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور نیک کام سمجھ کر وہ اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ ۲۹۷ے

عرب میں پھیلی ہوئی عام بدامنی وطوائف الملوکی

عرب میں بدامنی عام پھیلی ہوئی تھی جس سے سارا ملک تنگ آیا ہوا تھا۔ ہر طرف کشت و خون برپا تھا۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور کوئی شخص بھی رات چین سے نہیں گزار سکتا تھا کیونکہ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کب کوئی دشمن صبح سویرے اس کی بستی پر لوٹ پڑے۔ یہ ایسی حالت تھی جسے عرب کے سارے ہی لوگ جانتے تھے اور اس کی قباحت کو محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ لوٹنے والا اس پر ماتم کرتا تھا اور لوٹنے والا اس پر خوش ہوتا تھا، لیکن جب کسی وقت لوٹنے والے کی اپنی شامت آجاتی تھی تو وہ بھی یہ محسوس کر لیتا تھا کہ یہ کیسی بری حالت ہے جس میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ ۲۹۸ے

اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی بستی پر انہیں چھاپہ مارنا ہوتا تو رات کے اندھیرے میں چل کر جاتے تاکہ

دشمن خبردار نہ ہو سکے، اور صبح سویرے اچانک اُس پر ٹوٹ پڑتے تھے تاکہ صبح کی روشنی میں ہر چیز نظر آسکے؛ اور دن اتنا زیادہ روشن بھی نہ ہو کہ دشمن دُور سے ان کو آتا دیکھ لے اور مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے[۳۹۹] عرب کا حال اُس دَور میں یہ تھا کہ پورے ملک میں کوئی بستی ایسی نہ تھی جس کے لوگ راتوں کو چین سے سو سکتے ہوں، کیونکہ ہر وقت ان کو یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کب کوئی غارت گر گروہ اچانک اُس پر چھاپا مار دے۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنے قبیلے کے حدود سے باہر قدم رکھنے کی ہمت کر سکے، کیونکہ اکا دُکا آدمی کا زندہ بچ کر واپس آجانا، یا گرفتار ہو کر غلام بن جانے سے محفوظ رہنا گویا امرِ محال تھا۔ کوئی قافلہ ایسا نہ تھا جو اطمینان سے سفر کر سکے، کیونکہ راستے میں جگہ جگہ اُس پر ڈاکہ پڑنے کا خطرہ تھا، اور راستے بھر کے با اثر قبائلی سرداروں کو رشوتیں دے کر تجارتی قافلے بخیریت گزر سکتے تھے۔[۴۰۰]

باب ۱۵

عربوں کے چند دیگر مذاہب

فصل ۱

حُنَفَاء

دین کا تفصیلی علم چاہے اُس جاہلیت کے زمانہ میں لوگوں کے پاس نہ رہا ہو، مگر یہ بات اُس زمانے میں بھی لوگوں سے پوشیدہ نہ تھی کہ اصل دین توحید ہے اور انبیاء علیہم السلام نے کبھی بت پرستی نہیں سکھائی ہے۔ یہ حقیقت اُن روایات میں بھی محفوظ تھی جو عرب کے لوگوں کو اپنی سرزمین کے انبیاءؑ سے پہنچی تھیں اور اس کے قریب کی سرزمین میں آنے ہوئے انبیاء حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سُلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی تعلیمات کے واسطے سے بھی وہ جانتے تھے۔

عرب کی روایات میں یہ بات مشہور و معروف تھی کہ قدیم زمانہ میں عرب کا اصل دین، دینِ ابراہیمی تھا اور بُت پرستی اُن کے ہاں عَمرو بن لُحَیّ نامی ایک شخص نے شروع کی تھی۔ شرک و بُت پرستی کے رواجِ عام کے باوجود عرب کے مختلف حصّوں میں جگہ جگہ ایسے لوگ موجود تھے جو شرک سے انکار کرتے تھے، توحید کا اعلان کرتے تھے اور بُتوں پر قربانیاں کرنے کی علانیہ مذمت کرتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد سے بالکل قریب زمانے میں قُسّ بن ساعِدۃ الایادی، اُمیّہ بن ابی الصَّلت، سُوَید بن عَمرو المُصطَلِقی، وَکیع بن سَلَمہ بن زُہیر الایادی، عَمرو بن جُندُب الجُہَنی، ابو قَیس صَرمہ بن ابی اَنَس، زَید بن عَمرو بن نُفَیل، وَرَقہ بن نَوفَل، عُثمان بن الحُوَیرِث، عبیداللہ بن جَحش، عامر بن الظَّرِب العَدوانی، عَلّاف بن شِہاب التّمیمی، المُتَلَمِّس بن اُمیّۃ الکِنانی، زُہیر بن ابی سُلمیٰ، خالد بن سِنان بن غَیث العَبسی، عبداللہ القُضاعی اور ایسے ہی بہت سے لوگوں کے حالات ہمیں تاریخوں میں ملتے ہیں جنہیں **حُنَفاء** کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سب لوگ علی الاعلان توحید کو اصل دین کہتے تھے اور مشرکین کے مذہب سے اپنی بے تعلقی کا صاف صاف اظہار کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں یہ تخیّل انبیاء علیہم السلام کی سابقہ تعلیمات کے باقی ماندہ اثرات ہی سے آیا تھا۔ اس کے علاوہ یمن میں چوتھی پانچویں صدی عیسوی کے جو کتبات آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں برآمد ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دَور میں وہاں ایک توحیدی مذہب موجود تھا جس کے پیرو الرَّحمٰن اور ربُّ السَّماء والارض ہی کو الٰہِ واحد تسلیم

کرتے تھے ۳۰۰ء کا ایک کتبہ ایک عبادت گاہ کے کھنڈر سے ملا ہے جس میں لکھا ہے کہ یہ "معبد الٰہ ذو سموی" یعنی إلٰہ السماء یا ربّ السماء کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے۔ ۳۷۸ء کے ایک کتبے میں بنصر ورداٰ الٰہن بعل سمین و ارضین (بنصر و بعون الإلٰہ ربّ السماء والارض) کے الفاظ لکھے ہیں جو عقیدۂ توحید پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ اسی دور کا ایک اور کتبہ ایک قبر پر ملا ہے جس میں بخیل رحمنن (یعني أستعین بحول الرحمٰن) کے الفاظ لکھے ہیں۔ اسی طرح شمالِ عرب میں دریائے فرات اور قنسرین کے درمیان زبد کے مقام پر ۵۱۲ء کا ایک کتبہ ملا ہے جس میں بسم الإلٰہ، لا عزّ إلّا لہٗ، لا شکر إلّا لہٗ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے انبیاءِ سابقین کی تعلیمات کے آثار عرب سے بالکل مٹ نہیں گئے تھے، اور کم از کم اتنی بات یاد دلانے کے لیے بہت سے ذرائع موجود تھے کہ "تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔" [illegible]

اہل عرب میں جو موحدین پائے جاتے تھے وہ ان تین گناہوں سے پرہیز کرتے تھے جن میں اہل عرب کثرت سے مبتلا تھے۔ ایک شرک باللہ، دوسرے قتلِ ناحق، تیسرے زنا۔[1]

---

[1] اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ سے پوچھا گیا، سب سے بڑا گناہ کیا ہے۔ فرمایا ان تجعل للہ ندًّا وھو خلقك "یہ کہ تو کسی کو اللہ کا مدّمقابل اور ہمسر ٹھیرائے، حالانکہ تجھے پیدا اللہ نے کیا ہے۔" پوچھا گیا اس کے بعد؟ فرمایا ان تقتل ولدك خشیة ان یطعم معك "یہ کہ تو اپنے بچے کو اس خوف سے قتل کر ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گا۔" پوچھا گیا پھر؟ فرمایا ان تزانی حلیلة جارك "یہ کہ تو اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے۔" (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، احمد)۔ اگرچہ کبیرہ گناہ اور بھی بہت سے ہیں لیکن عرب سوسائٹی پر اس وقت سب سے زیادہ تسلط انہی تین گناہوں کا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی اس خصوصیت کو نمایاں کیا گیا کہ پورے معاشرے میں چند لوگ ہیں جو ان برائیوں سے بچ گئے ہیں۔ [2]

فصل ۲

صابئین

صابئی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے۔ ایک حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیرو، جو بالائی عراق (یعنی الجزیرہ) کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے اور حضرت یحییٰ کی پیروی میں اصطباغ (بپتسمہ) کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پر سیاروں کی اور سیاروں پر فرشتوں کی فرماں روائی کے قائل تھے۔ ان کا مرکز حرّان تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفہ و سائنس اور فنِ طب کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا ہے لیکن اغلب یہ ہے کہ سورۂ الحج میں جن صابئین کا ذکر کیا گیا ہے ان سے پہلا گروہ مراد ہے۔ کیونکہ دوسرا گروہ غالباً نزولِ قرآن کے زمانے میں اس نام سے موسوم نہ تھا۔[1]

---

[1] حاشیہ من جانب مرتبین :۔

اس سلسلے میں محمود شکری آلوسی نے یہ معلومات جمع کی ہیں :

" صابئہ بڑی اُمتوں میں سے ایک اُمّت ہے۔ لوگوں کو ان کے دین کے متعلق جس قدر معرفت حاصل ہوئی ہے اسی قدر ان کے متعلق اختلافِ رائے پایا گیا ہے۔ ان کی دو قسمیں ہیں : مومن اور کافر۔ (اس سلسلے میں آیت ۲ : ۴۴ ۲۲ کا حوالہ دیا گیا ہے)

یہ لوگ حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام کی قوم تھے۔ حضرت ابراہیم انہی کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا مسکن حرّان تھا اور یہی صابئیوں کا گھر ہے۔ ان کی دو قسمیں تھیں : ایک قسم دینِ حنیف پر قائم تھی اور دوسری مشرک تھی۔ ان میں سے جو مشرک تھے وہ سات ستاروں اور بارہ برجوں کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اپنے مندروں میں ان کی تصویریں بنا کر رکھتے تھے۔ ان ستاروں کے لیے ان کے ہاں مخصوص مندر پائے جاتے تھے یہی ان کے بڑے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۹)

عبادت خانے تھے، ایسے ہی جیسے عیسائیوں کے گرجے اور یہودیوں کے بیعے۔ چنانچہ انہوں نے ایک بڑا مندر سورج کے لیے بنا رکھا تھا، ایک چاند کے لیے، ایک زہرہ کے لیے، ایک مشتری کے لیے، ایک عطارد کے لیے، ایک مریخ کے لیے، ایک زحل کے لیے اور ایک مندر علّت اولیٰ کے لیے۔ ان کے نزدیک ہر ستارے کے لیے مخصوص عبادت اور مخصوص دعا ہے ۔۔۔۔۔۔ مسلمانوں کی طرح ان کے ہاں بھی پانچ نمازیں ہیں

ان میں سے کچھ لوگ رمضان کے مہینے میں روزے بھی رکھتے ہیں، اور کعبے کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے ہیں مکّے کی بھی تعظیم کرتے ہیں اور حج کے لیے مکّے جانے کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ مُردار، خون اور سؤر کے گوشت کو حرام قرار دیتے ہیں۔ شادی کے معاملے میں انہی رشتہ داروں کو حرام قرار دیتے ہیں جنہیں مسلمان حرام قرار دیتے ہیں۔ بغداد کے ارکانِ سلطنت کی ایک جماعت اسی مذہب پر کاربند تھی۔ انہی میں سے ہلال بن المحسن الصابی تھے جو دیوان انشا کے افسر اور مشہور رسائل کے مصنف ہیں۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھا کرتے، ان کے ساتھ عبادت کیا کرتے، ان کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے اور حرام چیزوں کو حرام قرار دیتے ۔۔۔۔۔۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس دین کی اصل یہ تھی کہ یہ لوگ دنیا کے مذاہب کی خوبیاں لے لیا کرتے تھے اور ان کی بُرائیوں سے قولاً اور عملاً علیحدگی اختیار کرتے تھے، اسی لیے انہیں صابئہ کہا گیا یعنی خارج (۲: ۲۲۵)۔ چنانچہ یہ لوگ ہر مذہب کی جملہ تفصیلی باتوں سے نکل گئے اور صرف اُن امور پر کاربند رہے جنہیں انہوں نے حق سمجھا

کفارِ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہا کرتے تھے اور آپ کے اصحاب کو صُباۃ۔ محاورے میں کہتے ہیں صَبَأ الوحل، جب آدمی ایک چیز سے نکل کر دوسری چیز میں چلا جاتا ہے۔ اور صَبَا یَصْبُو اُس وقت بولتے ہیں جب وہ مائل ہو جاتا ہے۔

(اقتباسات از اردو ترجمہ بلوغ الارب، ج ۳ ص ۱۱۷، ۱۲۰)

فصل ۳

مجوس

ان دو گروہوں (یعنی یہود و نصاریٰ) کے علاوہ جن دوسری قوموں کے پاس کتابیں بھیجی گئی تھیں انہوں نے چونکہ اپنی کتابوں کو بالکل گم یا مسخ کر دیا اور ان کے اعتقاد و عمل میں کوئی چیز بھی تعلیماتِ انبیاء پر باقی نہیں رہی، اس لیے ان پر لفظ اہلِ کتاب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کو اہلِ کتاب قرار نہیں دیا، حالانکہ وہ زردشت کو مانتے ہیں جس پر نبی ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ ہجر کے مجوسیوں سے جب معاملہ پیش آیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ "سنوا بهم سنة اهل الكتاب" ان کے ساتھ اہلِ کتاب کا سا معاملہ کرو" یہ نہیں فرمایا کہ وہ اہلِ کتاب ہیں۔ پھر جو نامۂ مبارک آپؐ نے مجوسِ ہجر کو لکھا تھا اس میں صراحت کے ساتھ یہ تحریر فرما دیا تھا کہ:

"فان اسلمتم فلكم ما لنا وعليكم ما علينا ومن ابى فعليه الجزية غير اكل ذبائحهم ولا نكاح نسائهم" اگر تم اسلام قبول کرو گے تو تمہارے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور تم پر وہی واجبات ہوں گے جو ہم پر ہیں اور جو لوگ تم میں سے انکار کریں گے ان پر جزیہ عائد کر دیا جائے گا مگر نہ اُن کا ذبیحہ کھایا جائے گا اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے گا۔

ایران کے آتش پرست[1] جو روشنی اور تاریکی کے دو خدا مانتے تھے اور اپنے آپ کو زردشت کا پیرو کہتے تھے، اُن کے مذہب و اخلاق کو مزدک کی گمراہیوں نے بُری طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا، حتیٰ کہ سگی بہن سے نکاح تک ان میں رواج پا گیا تھا۔

---

[1] حاشیہ من جانب مرتبین:

عرب آتش پرستوں کے متعلق محمود شکری آلوسی نے لکھا ہے کہ:

"ایسے لوگ عربوں میں متفرق تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب ایرانیوں اور مجوسیوں کے ذریعے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

ان میں سرایت کر گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ آگ کی پرستش دنیا میں قابیل کے عہد سے چلی آ رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قابیل پہلا شخص ہے جس نے آتشکدہ بنایا اور اس کی عبادت کی پھر یہ مذہب مجوسیوں میں سرایت کر گیا۔ اور انہوں نے آگ کے بہت سے گھر بنائے اور اس کے لیے وقف، محافظ اور دربان مقرر کیے وہ اسے ایک لحظہ کے لیے بھی بجھنے نہ دیتے تھے چنانچہ فریدون نے ایک آتشکدہ طوس میں تعمیر کرایا اور ایک بخارا میں بہمن نے سجستان میں ایک آتشکدہ تعمیر کیا۔ ابو قباذ نے ایک آتشکدہ بخارا کی جانب تعمیر کیا۔

آتش پرستوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ وہ ہے جو آگ میں کسی نفس کے ڈالنے اور آگ سے بدن کے جلنے کو حرام قرار دیتا ہے ۔ ۔ ۔ آتش پرستوں کا ایک اور فرقہ ہے جو اس کی پوجا کرنے میں اس حد تک چلے گئے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو آگ پر قربان کر دیتے ہیں۔

آتش پرستوں میں سے بعض لوگ زاہد اور عابد ہیں جو آگ کے گرد روزہ رکھ کر بیٹھتے اور چلے کاٹتے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ اچھے اخلاق مثلاً صدق، وفا، امانت داری، پارسائی، عفت اور عدل کی ترغیب دیتے ہیں۔

ابن قتیبہ کتاب المعارف میں کہتا ہے: "مجوسیت کا رواج بنی تمیم میں تھا۔ زرارہ بن عدس التمیمی اور اس کا بیٹا حاجب بن زرارہ انہی میں سے تھا۔ اس نے اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی، مگر بعد میں نادم ہوا۔ انہی میں سے اقرع بن حابس تھا (یہ بعد میں اسلام لائے اور صحابہ میں شمار ہیں)۔ وکیع بن حسان کا دادا ابوالاسود بھی مجوسی تھا۔"

(اقتباسات از اردو ترجمہ بلوغ الارب، ج ۳ ص ۲۴۸ تا ۱۴۱)

حاشیہ از مرتبین:

ہمارا خیال ہے کہ مجوسیت کے مختلف اجزاء اور مختلف شکلیں عربوں کے ہاں پہنچیں۔ عربوں میں زردشتی گروہ کے دو خداؤں اور عقیدہ نور و ظلمت کے پائے جانے کے متعلق محمود شکری آلوسی نے ایک فصل لکھی ہے جس کا عنوان ہے: "ثنویہ کے عقائد کا بیان"۔ اس کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

"یہ وہ لوگ ہیں جن کا کہنا ہے کہ بنانے والے دو ہیں: خیر کا بنانے والا نور ہے اور شر کا ظلمت۔ اور یہ دونوں قدیم، ازلی اور ابدی ہیں، قوی ہیں، حساس ہیں، ادراک کے مالک ہیں، سمیع ہیں اور بصیر ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں: خدا سبحانہ مدت تک تنہا رہنے سے اداس ہو گیا، لہٰذا اس کے دل میں برا خیال آیا (العیاذ باللہ) اور یہ خیال جسمیت اختیار کر کے تاریکی بن گیا۔ پھر اس سے ابلیس پیدا ہوا۔"

(اقتباسات از اردو ترجمہ بلوغ الارب، ج ۳ صفحہ ۱۳۰-۱۳۱) (باقی صفحہ ۳۰۳ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

صاحب بلوغ الارب نے زندیق کے نام سے ایک اور مذہبی گروہ کا ذکر الگ کیا ہے، مگر فی الحقیقت وہ بھی مجوسیت سے الگ کوئی چیز نہیں، اور اس کا سرچشمہ بھی ایران ہی تھا جیسا کہ خود ذیل کے اقتباس سے واضح ہے :

"ابن قتیبہ کتاب المعارف میں عہد جاہلیت کے مذاہب اہل عرب سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زندیقی مذہب قریش میں پایا جاتا تھا۔ انہوں نے اسے حیرہ سے لیا تھا۔ القاموس میں ہے: الزندیق (کسرہ کے ساتھ) یہ دو خداؤں کو ماننے والوں میں سے ہیں، یا وہ لوگ جو نور اور ظلمت کے قائل ہیں، یا وہ جو آخرت اور ربوبیت پر ایمان نہیں رکھتے، یا وہ جو در پردہ کافر ہوں اور بظاہر مومن۔ یا یہ لفظ "زن دین" یعنی "عورت کا دین" سے معرب ہے۔ (غالباً یہ قیاس عورت کے متعلق مشہور مزدکی فلسفہ کی بنا پر کیا گیا ہو)۔ اس کے صحیح ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے، جیسا کہ ظاہر ہے، مزید اس کتاب کا نام ہے جسے مزدک نے پیش کیا تھا، اور وہ ثنویہ فرقوں میں سے مزدکیہ فرقے کا رئیس تھا۔"

(اردو ترجمہ بلوغ الارب۔ ج ۳۔ ص ۱۲۹)

فصل سوم

دہریت

دہریت کی حقیقت

دنیا کی زندگی سطح بین انسانوں کو مختلف قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ جینا اور مرنا جو کچھ ہے بس اسی دنیا میں ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں، لہٰذا جتنا کچھ بھی تمہیں کرنا ہے بس یہیں کر لو۔ [1]

بعض لوگ سرے سے یہی نہیں مانتے کہ ان ساری چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ محض مادے کے ہیجان کا نتیجہ ہے، یا ایک حادثہ ہے جس میں کسی حکمت اور صناعی کا کوئی دخل نہیں۔ [2]

اپنے معبودوں کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی قوم سمیت تمام مشرکین کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ بجز دہریوں کے اور کسی کو بھی دنیا میں اللہ کے خالق کائنات ہونے سے انکار نہیں رہا ہے۔ [3]

درحقیقت شرک اور دہریت اور انکار آخرت کے عقائد کوئی شخص بھی یقین کی بنا پر اختیار نہیں کرتا اور نہ ہی کر سکتا۔ اس لیے کہ یقین صرف علم سے حاصل ہوتا ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ علم حاصل نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے یا بہت سے خدا ہیں، یا خدائی کے اختیارات میں بہت سی ہستیوں کو دخل حاصل ہے، یا آخرت نہیں ہونی چاہیے۔ پس جس نے بھی دنیا میں یہ عقائد اختیار کیے ہیں اس نے محض قیاس و گمان پر ایک عمارت کھڑی کر لی ہے جس کی اصل بنیاد شک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ شک انہیں سخت گمراہی کی طرف لے گیا ہے۔ انہیں خدا کے وجود میں شک ہوا۔ انہیں توحید کی صداقت میں شک ہوا۔ انہیں آخرت کے آنے میں شک ہوا۔ حتیٰ کہ اس شک کو انہوں نے یقین کی طرح دلوں میں بٹھا کر انبیاء کی کوئی بات نہ مانی۔ [4]

۱؎ واضح رہے کہ قرآن میں ملحد دہریوں کا اجمالی تذکرہ بھی موجود ہے اور ان کے نظریات کا ابطال بھی کیا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ گروہ بھی عرب میں موجود تھا لیکن تھا قلیل التعداد اسی بنا پر مولانا مودودی صاحب نے بھی اس گروہ کا مختصر تذکرہ،

میں نے جہاں تک قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہے اور جس حد تک تاریخی معلومات میرے پاس ہیں، ان دونوں سے یہ بات مجھے قریب بہ یقین معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں کبھی کسی قوم یا کوئی ہیئت اجتماعی Community

۲- کتاب عرب کے دہریوں کے متعلق علامہ محمود شکری آلوسی نے جو معلوماتی نوٹ لکھے ہیں ان کے اقتباسات پیش خدمت ہیں:

"عربوں میں ایک قسم دہریوں کی تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مصنوعات کو صانع سے بالکل الگ تھلگ قرار دے رکھا ہے۔ ان لوگوں کا قول جیسا کہ خدا تعالیٰ نے بیان کیا ہے یہ ہے (آیت اِنْ ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا ــ وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ) کہ زندگی تو صرف دنیائی زندگی ہے ہم مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں، اور ہمیں زمانے کے سوا کوئی چیز ہلاک نہیں کرتی۔"

ان کے دو فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے، زیادہ معقول تصور والے فرقے کے خیالات یوں بیان کیے گئے ہیں:

"۔۔۔ اشیا کی قطعاً کوئی ابتدا نہیں۔ اشیا دراصل قوت سے فعل کی طرف نکل کر آتی ہیں۔ لہٰذا جو چیز پہلے بالقوہ ہو جب وہ فعل کی طرف نکل کر آ جاتی ہے تو اشیا کے مرکبات اور بسائط خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ کسی اور چیز سے نہیں پیدا ہوتے۔ نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جہان ازل سے ہے اور اسی طرح ابد تک چلتا رہے گا۔ نہ ہی اس میں تغیر پیدا ہو گا اور نہ ہی اس کے فعل کے باوجود اسے زوال ہو گا۔ اور یہ جہان خود ہی ان اجزا کو جو اس کے اندر ہیں مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے۔"

"شہرستانی کی کتاب الملل والنحل میں دہریہ سے بحث کی گئی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خلق کے دوبارہ زندہ کیے جانے کا اور لوٹائے جانے کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں طبیعت (فطرت) زندہ کرنے والی ہے اور زمانہ فنا کرنے والا ہے۔ ۔۔۔۔ آمدی نے اپنی کتاب ابکار الافکار میں طبیعت کے ماننے والوں کے ساتھ بہت لطیف بحث کی ہے۔"

"جو لوگ دہر کے معتقد ہیں، انہوں نے اس کے لیے صفات کمال بھی ثابت کی ہیں، مثلاً علم، قدرت وغیرہ۔" (عربی شعرا کے کلام میں ایسی باتیں مذکور ہیں جن کا علامہ نے حوالہ دیا ہے)۔

"دہر کو ماننے والوں اور طبیعت پر اعتقاد رکھنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے ان میں فرق روا رکھا ہے۔"

(اقتباسات از اردو ترجمہ بلوغ الارب۔ ج ۲، ص ۱۰۹ تا ۱۱۶)

(مرتبین)

ایسی نہیں گزری ہے جو بحیثیت مجموعی خدا کی منکر اور دہریہ رہی ہو۔ افراد اور چھوٹے چھوٹے فلسفیانہ گروہ ایسے ضرور رہے ہیں لیکن وہ اتنے قابلِ لحاظ نہ تھے کہ براہِ راست ان کو خطاب کرنے کے لیے کوئی نبی بھیجا جاتا یا کتاب نازل کی جاتی ۔ اسی لیے قرآن مجید میں ایسے گروہوں کے متعلق کہیں کہیں مختصر اشارات تو ضرور کیے گئے ہیں لیکن دعوت کا براہِ راست خطاب مشرکین ہی کی طرف رہا ہے، اور عموماً توحید پر جو دلائل دیے گئے ہیں وہ اس انداز سے دیے گئے ہیں کہ شرک کے ابطال کے ساتھ دہریت کا ابطال بھی انہی سے ہو جاتا ہے ۔ اس کے خلاف الگ سے دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی ۔ [لہ]

شرک کے ساتھ دہریت کا ابطال

اس سلسلے میں ملاحظہ ہو سورۃ النمل کی آیت ۶۰ :

"بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے وہ خوشنما باغ اگائے جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ ـــــ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے ؟ (نہیں!) بلکہ یہی لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔ (ترجمہ از تفہیم القرآن)

اس سوال اور اس کے بعد کے سوالات میں صرف مشرکین ہی کے شرک کا ابطال نہیں ہے بلکہ دہریوں کی دہریت کا ابطال بھی ہے [لہ] مثلاً اس پہلے سوال میں پوچھا گیا ہے کہ یہ بارش برسانے والا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی نباتات اگانے والا کون ہے ؟ اب غور کیجیے، زمین میں اُس مواد کا ٹھیک سطح پر یا سطح سے متصل موجود ہونا جو بے شمار مختلف اقسام کی نباتی زندگی کے لیے درکار ہے، اور پانی کے اندر وہ اوصاف موجود ہونا جو حیوانی اور نباتی زندگی کی ضروریات کے مطابق ہیں، اور اس پانی کا پے در پے سمندروں سے اٹھایا جانا اور زمین کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً ایک باقاعدگی کے ساتھ برسایا جانا، اور زمین، ہوا، پانی اور درجۂ حرارت وغیرہ مختلف قوتوں کے درمیان ایسا متناسب تعاون قائم کرنا کہ اس سے نباتی زندگی کو نشوونما

لہ اس سلسلے میں مولانا مودودی کی بعض اہم تحریریں کو یہاں اس خیال سے بھی پیش کیا تر دری سمجھا گیا ہے کہ دورِ حاضر میں دہریت نے فلسفے میں بھی اپنا راستہ بنا لیا ہے اور سیاست و اقتصادیات کے روپ میں وہ ذہنوں پر حملہ آور ہے۔ مولانا مودودی نے کائنات و حیات کے نظم و توافق پر اپنی جامع اور مختصر بحثیں ایسے انداز میں کی ہیں کہ ایک ذی شعور شخص صاحب ارادہ اور حکیم و قدیر خدا کا وجود تسلیم کیے بغیر عالم موجودات کی کوئی تعبیر ممکن نہیں۔ دوسرے لفظوں میں مولانا نے سائنس کی دریافتوں کو وجودِ باری کی ناقابلِ تردید شہادتوں کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ (مرتبین)

نصیب ہوا اور وہ ہر طرح کی حیوانی زندگی کے لیے اس کی بے شمار ضروریات پوری کرے۔ کیا یہ سب کچھ ایک حکیم کی منصوبہ بندی اور دانشمندانہ تدبیر اور غالب قوت و ارادہ کے بغیر خود بخود اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ مسلسل ہزارہا برس بلکہ لاکھوں کروڑوں برس تک اسی باقاعدگی سے رونما ہوتا چلا جائے؟ صرف ایک ہٹ دھرم آدمی ہی جو تعصب میں اندھا ہو چکا ہو اسے ایک امر اتفاقی کہہ سکتا ہے۔ کسی راستی پسند، عاقل انسان کے لیے ایسا لغو دعویٰ کرنا اور ماننا ممکن نہیں ہے۔[1]

نظم و توافق اتفاقی حادثہ نہیں

"زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لیے جائے قرار ہونا (اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا۔۔۔) بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ ۔۔۔۔ یہ کرہ فضائے بسیط میں معلق ہے، کسی چیز پر ٹکا ہوا نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب و اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا جس کے خطرناک نتائج کا ہم کبھی زلزلہ آ جانے سے بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی۔ یہ کرہ باقاعدگی سے سورج کے سامنے آتا اور چھپتا ہے ۔۔۔ اگر اس کا ایک ہی رخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا رخ ہر وقت چھپا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی۔۔۔۔ اس کرہ پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کا ایک کثیف ردا چڑھا دیا گیا ہے جو شہابوں کی خوفناک بمباری سے اسے بچائے ہوئے ہے (ورنہ روزانہ دو کروڑ شہاب ۳۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں) ۔۔۔ یہی ہوا درجہ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے، یہی سمندروں سے بادل اٹھاتی اور زمین کے مختلف حصوں تک آب رسانی کی خدمت انجام دیتی ہے۔ اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گیسیں فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لیے جائے قرار نہ بن سکتی۔ اس کرے کی سطح سے بالکل متصل وہ معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزاء بڑے پیمانے پر فراہم کر دیئے گئے ہیں جو نباتی، حیوانی اور انسانی زندگی کے لیے مطلوب ہیں ۔۔۔۔ اس کرے پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیر زمین سوتوں کی شکل میں پانی کا بڑا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے، اور پہاڑوں پر بھی اس کے بڑے بڑے ذخائر کو منجمد کر لینے اور پھر پگھلا کر بہانے کا انتظام کیا گیا ہے ۔۔۔۔ پھر اس پانی، ہوا اور تمام ان اشیاء کو جو زمین پر پائی جاتی ہیں سمیٹے رکھنے کے لیے اس کرے میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے ۔۔۔۔۔ علاوہ بریں اس کرے کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے جو آبادی کے لیے مناسب ترین ہے ۔۔۔

یہ صرف چند وہ مناسبتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لیے جائے قرار بنی ہے۔ کوئی شخص

---

[1] یہی آواز ہمارے لیے آوازوں کا وسیلہ ترسیل و قبولیت ہے جس کے بغیر نظم کا سلسلہ ممکن نہ ہوتا (مرتبین)

جو عقل رکھتا ہو اور ان اُمور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ کسی خالق حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں ایک حادثے کے نتیجے میں خود بخود قائم ہو گئی ہیں، اور نہ یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے کو بنانے اور برروئے عمل لانے میں کسی دیوی، دیوتا یا جن یا نبی و ولی یا فرشتے کا کوئی دخل ہے۔[۱۱]

حیات اور اس کا اعادہ

حیات کی پیدائش کے لیے جتنے عوامل درکار ہیں اُن سب کا ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آجانا دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانون بخت و اتفاق (Law of Chance) کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا۔

زندگی محض ایک مجرد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار متنوع صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وقت تک روئے زمین پر حیوانات کی تقریباً ۱۰لاکھ اور نباتات کی تقریباً دو لاکھ انواع کا پتہ چلا ہے۔ یہ لکھوکھا انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں۔ اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورتِ نوعیہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آرہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (Design) کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوّع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے۔

اب ذرا اعادۂ خلق پر غور کیجیے۔ خالق نے ہر نوعِ حیوانی اور نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظامِ عمل (Mechanism) رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد و حساب نسل ٹھیک اسی کی صورتِ نوعیہ اور مزاج و خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے، اور کبھی بھولوں بھی ان کروڑہا کروڑ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانۂ تناسل کسی دوسری نوع کا ایک نمونہ نکال کر پھینک دے۔ جدید علمِ تناسل کے مشاہدات اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں۔ ہر پودے میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کا ایسا مکمل انتظام کرے جس سے آنے والی نسل اس کی نوع کی تمام امتیازی خصوصیات کی حامل ہو، اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورتِ نوعیہ میں ممیّز ہو۔ یہ بقائے نوع اور تناسل کا سامان ہر پودے کے ایک خلیے (Cell) کے ایک حصّے میں ہوتا ہے جسے بمشکل انتہائی طاقت ور خورد بین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینئر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نشوونما کو ٹھیک اُسی راستے پر ڈالتا ہے جو اس کی

اپنی صورت توجیہ کا راستہ ہے۔ ... ... ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ناقابلِ تصور وسیع پیمانے پر ہر طرف اعادۂ تخلیق کا ایک عظیم کارخانہ چل رہا ہے جو ہر نوع کے افراد سے پیہم اُسی نوع کے بے شمار افراد وجود میں لاتا چلا جا رہا ہے۔ ... ... یہ چیز نہ صرف اپنی ابتدا کے لیے ایک صانعِ حکیم چاہتی ہے بلکہ ہر آن اپنے درست طریقہ پر چلتے رہنے کے لیے بھی ایک ناظم و مدبّر اور ایک حیّ و قیوم کی طالب ہے جو ایک لحظہ کے لیے بھی اِن کارخانوں کی نگرانی اور رہنمائی سے غافل نہ ہو۔

یہ حقائق ایک دہریے کے انکارِ خدا کی بھی اُسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مشرک کے شرک کی۔ ۲۱۳ھ

حقیقتِ کائنات کے دو پہلو

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى۔ (الروم۔ آیت ۸)

کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں برحق اور ایک مقرر مدت ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔

اس فقرے میں آخرت کی دو مزید دلیلیں دی گئی ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے وجود سے باہر کے نظامِ کائنات کو بنظرِ غور دیکھے تو اسے دو حقیقتیں نمایاں نظر آئیں گی:

ایک یہ کہ یہ کائنات برحق بنائی گئی ہے۔ یہ کسی بچے کا کھیل نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے اُس نے ایک بے ڈھنگا سا گھروندا بنا لیا ہو جس کی تعمیر اور تخریب دونوں ہی بے معنی ہوں، بلکہ یہ ایک سنجیدہ نظام ہے جس کا ایک ایک ذرہ اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ اسے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے جس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے جس کی ہر شے بامقصد ہے۔ انسان کا سارا تمدن اور اس کی پوری معیشت اور اس کے تمام علوم و فنون خود اس بات پر گواہ ہیں کہ دنیا کی ہر چیز کے پیچھے کام کرنے والے قوانین کو دریافت کر کے اور ہر شے جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اسے تلاش کر کے ہی انسان یہاں یہ سب کچھ تعمیر کر سکا ہے، ورنہ ایک بے ضابطہ اور بے مقصد کھلونے میں اگر ایک کھلنڈرے کی حیثیت سے اس کو رکھ دیا گیا ہوتا تو کسی سائنس اور کسی تہذیب و تمدن کا تصور تک نہ کیا جا سکتا تھا۔ اب آخر یہ بات تمہاری عقل میں کیسے سما جاتی ہے کہ جس حکیم نے اس حکمت اور مقصدیت کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے اور اس کے اندر تم جیسی ایک مخلوق کو اعلیٰ درجہ کی ذہنی و جسمانی طاقتیں دے کر، اختیارات دے کر، آزادی بخش کر،

دے کر انسان کی جس دے کر اپنی دنیا کا بے شمار سروسامان تمہارے حوالہ کیا ہے، اس نے تمہیں بے مقصد ہی پیدا کر دیا ہوگا؟ تم دنیا میں تعمیر و تخریب، اور نیکی و بدی، ظلم و عدل، اور راستی و ناراستی کے سارے ہنگامے برپا کرنے کے بعد بس یونہی مر کر مٹی میں مل جاؤ گے اور تمہارے کسی اچھے یا برے کام کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا؟ تم اپنے ایک ایک عمل سے اپنی اور اپنے جیسے ہزاروں انسانوں کی زندگی پر اور دنیا کی بے شمار اشیاء پر بہت سے مفید یا مضر اثرات ڈال کر چلے جاؤ گے اور تمہارے مرتے ہی یہ سارا دفتر عمل بس یونہی لپیٹ کر دریا برد کر دیا جائے گا۔

دوسری حقیقت جو اس کائنات کے نظام کا مطالعہ کرنے سے صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کسی چیز کے لیے ہمیشگی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک عمر مقرر ہے جسے پہنچنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے اور یہی معاملہ بحیثیت مجموعی پوری کائنات کا بھی ہے۔ یہاں جتنی طاقتیں کام کر رہی ہیں وہ سب محدود ہیں۔ ایک وقت تک ہی وہ کام کر رہی ہیں، اور کسی وقت پر انہیں لامحالہ خرچ ہو جانا اور اس انتظام کو ختم ہو جانا ہے۔ قدیم زمانے میں تو علم کی کمی کے باعث اُن فلسفیوں اور سائنسدانوں کی بات کچھ چل بھی جاتی تھی جو دنیا کو ازلی و ابدی قرار دیتے تھے۔ مگر موجودہ سائنس نے عالم کے حدوث و قدم کی اس بحث میں، جو ایک مدت دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی، قریب قریب حتمی طور پر اپنا ووٹ خدا پرستوں کے حق میں ڈال دیا ہے۔ اب دہریوں کے لیے عقل اور حکمت کا نام لے کر یہ دعویٰ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی۔ پرانی مادہ پرستی کا سارا انحصار اس تخیل پر تھا کہ مادہ فنا نہیں ہو سکتا۔ صرف صورت بدل جا سکتی ہے، مگر ہر تغیر کے بعد مادہ مادہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ اس عالم مادی کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ لیکن اب جوہری توانائی (Atomic Energy) کے انکشاف نے اس پورے تخیل کی بساط الٹ کر رکھ دی ہے۔ اب یہ بات کھل گئی ہے کہ قوت مادے میں تبدیل ہوتی ہے اور مادہ پھر قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ نہ صورت باقی رہتی ہے نہ ہیولیٰ۔ اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون (Second Law of Thermo Dynamics) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ عالم مادی نہ ازلی ہو سکتا ہے نہ ابدی۔ اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا چاہیے۔ اس لیے سائنس کی بنیاد پر اب قیامت کا انکار ممکن نہیں رہا ہے اور ظاہر بات ہے کہ جب سائنس ہتھیار ڈال دے تو فلسفہ کن ٹانگوں پر اٹھ کر قیامت کا انکار کرے گا؟ جبکہ

باب ۱۶

یہود اور یہودیت

فصل ۱

حضرتِ موسیٰؑ سے قبل کا دَور

حضرت اسحٰقؑ کی اولاد، جن میں حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے دوسرے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے حضرت یعقوبؑ کی نسل سے تھے ان کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا انہوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی ان کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو ان سے الگ رہیں مگر مذہباً ان کی متبع رہیں۔ اسی تاریخ میں جب پستی و تنزل کا دَور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔ ۱؎

اس قوم کی روایات یہ ہیں کہ ان کے مورثِ اعلیٰ حضرت یعقوبؑ سے اللہ تعالیٰ نے کشتی لڑی۔ رات بھر کشتی ہوتی رہی، اور صبح تک لڑ کر بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہ پچھاڑ سکا۔ پھر جب صبح ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا: "اب مجھے جانے دے" تو انہوں نے کہا "میں تجھے نہ جانے دوں گا جب تک تو مجھے برکت نہ دے۔" اللہ تعالیٰ نے پوچھا: "تمہارا نام کیا ہے؟" انہوں نے کہا: "یعقوب"۔ اللہ نے فرمایا کہ "آئندہ تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔" ۲؎

بنی اسرائیل کا وسیع و عظیم ماضی

ایک طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر

۱؎ ملاحظہ ہو: یہودیوں کا جدید ترین ترجمہ کتب مقدسہ The Holy Sepulchre (شائع کردہ جیوش پبلیکیشنز سوسائٹی آف امریکا ۱۹۵۴ء) کتاب پیدائش، باب ۳۲، آیات ۲۵ تا ۲۹۔ عیسائیوں کے ترجمۂ بائبل میں بھی یہ مضمون اسی طرح بیان ہوا ہے۔ یہودی ترجمہ کے حاشیہ میں اسرائیل کے معنی He who striveth with God لکھے گئے ہیں یعنی "جو خدا سے زور آزمائی کرے" اور انسائیکلوپیڈیا آف بائبل لٹریچر میں عیسائی علماء نے اسرائیل کے معنی کی تشریح یہ کی ہے کہ Wrestler with God یعنی خدا سے کشتی لڑنے والا۔ پھر بائبل کی کتاب ہوسیع باب ۱۲ آیت ۳ میں حضرت یعقوبؑ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی توانائی کے ایام میں خدا سے کشتی لڑا، پھر فرشتے سے کشتی لڑا اور غالب آیا۔

ان کی قوم میں پیدا ہوئے۔ اور وہ ہمری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اور ان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ مدّت دراز تک یہی اس زمانے کی مہذب دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے، اور ان ہی کا سکہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔

عموماً لوگ بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰؑ سے شروع کرتے ہیں لیکن قرآن اس مقام پر (المائدہ-۲۰) تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانۂ عروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا تھا جسے خود حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے ۱۱۴ے

یہودیت کی ابتدا اور وجہ تسمیہ

اصل دین جو حضرت موسیٰؑ اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاءؑ لاتے تھے وہ تو اسلام ہی تھا ان انبیاءؑ میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا، اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مذہب اس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اُس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جب سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تو یہ خاندان اُس ریاست کا مالک ہوا جو یہودیہ کے نام سے موسوم ہوئی، اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کر لی جو سامریہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر اسیریا نے نہ صرف یہ کہ سامریہ کو برباد کر دیا بلکہ اُن اسرائیلی قبیلوں کا بھی نام و نشان مٹا دیا جو اس ریاست کے بانی تھے۔ اس کے بعد صرف یہوداہ اور اس کے ساتھ بن یامین کی نسل باقی رہ گئی جس پر یہوداہ کی نسل کے غلبے کی وجہ سے یہود ہی کے لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ اس نسل کے اندر کاہنوں اور ربیوں اور احبار نے اپنے اپنے خیالات اور رجحانات کے مطابق عقائد اور رسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچہ صدیہا برس میں تیار کیا اس کا نام یہودیت ہے۔ یہ ڈھانچہ چوتھی صدی قبل مسیح سے بننا شروع ہوا اور پانچویں صدی عیسوی تک بنتا رہا۔ اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی ربانی ہدایت کا بہت تھوڑا ہی عنصر اس میں شامل ہے اور اس کا حلیہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ان کو "اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے — یعنی اے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے ہو۔ ان میں سب کے سب اسرائیلی ہی نہ تھے بلکہ وہ غیر اسرائیلی لوگ بھی تھے جنہوں نے یہودیت قبول کر لی تھی قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے، وہاں بنی اسرائیل کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اور جہاں مذہب یہود کے پیروؤں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں "اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ۱۱۹ے

یہود حضرت یوسفؑ کے دور میں

موجودہ زمانے کے محققین جنہوں نے بائیبل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے، عام رائے یہ رکھتے ہیں کہ

چرواہے بادشاہوں Hyksos Kings میں سے جس فرماں روا کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس (Apophis) ملتا ہے وہی حضرت یوسفؑ کا ہم عصر تھا

مصر کا دارالسلطنت ممفیس (منف) تھا جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۱۴ میل کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں وہاں پہنچے۔ دو تین سال عزیز مصر کے گھر رہے۔ آٹھ سال جیل میں گزارے ۳۰ سال کی عمر میں ملک کے فرماں روا ہوئے اور ۸۰ سال تک بلا شرکت غیرے تمام مملکت مصر پر حکومت کرتے رہے۔ اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال انہوں نے حضرت یعقوبؑ کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلا لیا اور اُس علاقے میں آباد کیا جو دمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اس علاقے کا نام جُشن یا گوشن بتایا گیا ہے لہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور انتقال کے وقت بنی اسرائیل کو وصیت کی کہ جب تم مصر سے نکلو تو میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے کر جانا۔ ۲۲۰

حضرت یوسفؑ جن کی بدولت مصر میں اُن کے قدم جمے، خود پیغمبر تھے۔ ان کے بعد چار پانچ سدی تک کا اقتدار انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ اِس دوران میں یقیناً انہوں نے مصر میں اسلام کی خوب تبلیغ کی ہو گی۔ اہل مصر میں سے جو لوگ اسلام لاتے ہوں گے ان کا مذہب ہی نہیں، ان کا تمدن اور پورا طریق زندگی غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے ہم رنگ ہو گیا ہو گا۔ مصریوں نے ان سب کو اسی طرح اجنبی ٹھہرایا ہو گا جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ ان کے اوپر بنی اسرائیل کا لفظ اُسی طرح چسپاں کر دیا ہو گا جس طرح غیر عرب مسلمانوں پر "محمڈن" کا لفظ آج چسپاں کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی دینی و تہذیبی روابط اور شادی بیاہ کے تعلقات کی وجہ سے غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مصر میں قوم پرستی کا طوفان اُٹھا تو مظالم صرف بنی اسرائیل ہی پر نہیں ہوتے بلکہ مصری مسلمان بھی ان کے ساتھ یکساں لپیٹ لیے گئے۔ اور جب بنی اسرائیل نے ملک چھوڑا تو مصری مسلمان بھی ان کے ساتھ نکلے اور ان سب کا شمار اسرائیلیوں ہی میں ہونے لگا کلہ ۲۲۲

لہ تلمود میں آیا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ کی آمد کی خبر دارالسلطنت میں پہنچی تو حضرت یوسفؑ سلطنت کے بڑے بڑے امراء و اہل مناصب اور فوج فراہم کر کے ان کے استقبال کے لیے نکلے اور پورے تزک و احتشام کے ساتھ ان کو شہر میں لائے۔ وہ دن وہاں جشن کا دن تھا۔ عورت، مرد، بچے، سب اس جلوس کو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے اور سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

لکہ ہمارے اس قیاس کی تائید بائیبل کے متعدد اشارات سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "خروج" میں جہاں بنی اسرائیل کے

مصر میں قوم پرستانہ انقلاب

حضرت یوسف علیہ السلام کا دور گزر جانے کے بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب ہوا۔ اور قبطیوں کے ہاتھ جب دوبارہ اقتدار آیا تو نئی قوم پرست حکومت نے بنی اسرائیل کا زور توڑنے کی پوری کوشش کی۔ اس سلسلے میں محض اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا گیا کہ اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کیا جاتا اور انہیں ادنیٰ درجے کی خدمات کے لیے مخصوص کر لیا جاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹائی جائے اور ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے تاکہ رفتہ رفتہ ان کی عورتیں قبطیوں کے تصرف میں آتی جائیں اور ان سے اسرائیل کے بجائے قبطی نسل پیدا ہو۔ تلمود اس کی مزید تفصیل یہ دیتی ہے کہ حضرت یوسفؑ کی وفات پر ایک صدی سے کچھ زیادہ مدت گزر جانے کے بعد یہ انقلاب ہوا تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ نئی قوم پرست حکومت نے پہلے تو بنی اسرائیل کو ان کی زرخیز زمینوں اور ان کے مکانات اور جائیدادوں سے محروم کیا پھر ان کو حکومت کے تمام مناصب سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد بھی جب قبطی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل اور ان کے ہم مذہب مصری کافی طاقت ور ہیں تو انہوں نے اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کرنا شروع کیا، اور ان سے سخت محنت کے کام قلیل معاوضوں پر یا بلا معاوضہ لیے جانے لگے۔ یہ تفسیر ہے قرآن کے اس بیان کی کہ فرعون مصر کی آبادی کے ایک گروہ کو ذلیل کرتا تھا (یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً) اور سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ آلِ فرعون بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیتے تھے۔ ۲۲۲

مصر سے نکلنے کا حال بیان ہوا ہے۔ بائبل کا مصنف کہتا ہے کہ ان کے ساتھ ایک ملی جلی بھیڑ بھی گئی" (۱۲: ۳۸)، پھر بتدریج ان غیر اسرائیلی مسلمانوں کے لیے اجنبی اور پردیسی کی اصطلاحیں استعمال ہونے لگیں۔ چنانچہ توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کو جو احکام دیئے گئے ان میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے: "تمہارے لیے اور اس پردیسی کے لیے جو تم میں رہتا ہے نسل در نسل سدا ایک ہی آئین رہے گا۔ خداوند کے آگے پردیسی بھی ویسے ہی ہوں گے جیسے تم ہو" (۱۵: ۱۵ [illegible]) [illegible] ۲۲۳

بعثتِ موسیٰ علیہ السلام

بنی اسرائیل کئی صدیوں تک مصر میں انتہائی ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا، ان کے ذریعہ سے اس قوم کو غلامی کی حالت سے نکالا، پھر ان پر کتاب نازل کی، اور اس کے فیض سے وہی دبی اور پسی ہوئی قوم ہدایت پاکر دنیا میں ایک نامور قوم بن گئی۔

حضرت موسیٰؑ کی دعوت

حضرت موسیٰؑ دو چیزوں کی دعوت لے کر فرعون کے پاس گئے تھے: ایک یہ کہ وہ اللہ کی بندگی (اسلام) قبول کرلے، دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل کی قوم کو جو پہلے سے مسلمان تھی، اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر دے۔ ۲۲۶

دوسری طرف انہوں نے بنی اسرائیل کو یہ تعلیم و ترغیب دی کہ:

"اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ آخری کامیابی انہی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔"

بنی اسرائیل کی ذہنی پستی

اس پُرخطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علمبردارِ حق (حضرت موسیٰؑ) کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ ان کو خطرات سے پُرنظر آرہا تھا۔ بلکہ وہ اُلٹے ان نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰؑ کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہوگے اور ہم پر بھی آفت لاؤگے۔ ۲۲۷

ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں حضرت موسیٰؑ کے صادق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اور خصوصاً ان کے اکابر و اشراف حضرت موسیٰؑ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیری کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نسلی اور مذہبی دونوں

پشتوں سے ابراہیم، اسحٰق، یعقوب اور یوسف علیہم السّلام کے اُمتی تھے، اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے، لیکن ایک مدت دراز کے اخلاقی انحطاط نے اور اُس پست ہمتی نے جو زیر دستی سے پیدا ہوتی تھی، ان میں اتنا بل بوتا باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر و ضلالت کی فرماں روائی کے مقابلے میں ایمان و ہدایت کا علم لے خود اُٹھتے یا جو اُٹھا تھا اُس کا ساتھ دیتے۔ ؁۴۲۸

واضح رہے کہ ایک دورِ ستم وہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے رعمسیس ثانی کے زمانے میں جاری ہوا تھا، اور دوسرا دورِ ستم یہ تھا جو فرعون منفتاح کے دور میں، موسیٰ علیہ السّلام کی بعثت کے بعد شروع ہوا۔ دونوں ادوار میں یہ بات مشترک تھی کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کیا جاتا اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جاتا تھا۔ ؁۴۲۹

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی اِس کشمکش میں عام اسرائیلیوں کا طرزِ عمل کیا تھا اس کا اندازہ بائبل کی اِس عبارت سے ہو سکتا ہے:۔

"جب وہ فرعون کے پاس سے نکلے آرہے تھے تو ان کو موسیٰؑ اور ہارونؑ ملاقات کے لیے راستے پر کھڑے ملے۔ تب انہوں نے ان سے کہا کہ خداوند ہی دیکھے اور تمہارا انصاف کرے، تم نے ہم کو فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ میں ایسا گھناؤنا کیا ہے کہ ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے۔ (خروج ۲۰:۶-۲۱)۔

تلمود میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰؑ اور ہارونؑ علیہما السّلام سے کہتے تھے:۔

"ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیے نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے آکر اس کو بچانے کی کوشش کی، اور دونوں کی کشمکش میں بکری کے ٹکڑے اڑ گئے۔ بس اسی طرح تمہاری اور فرعون کی کھینچ تان میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا۔" ؁۴۳۰

مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت[1]

اللہ تعالیٰ نے آخر کار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام اسرائیلی اور غیر اسرائیلی مسلمانوں کو مصر کے ہر حصّے سے ہجرت کے لیے نکل پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔

۱۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے سامنے کس کس طرح دعوت دی، ان پر کیا کیا الزامات لگاتے چلے گئے، ان کے دور میں فرعونیوں پر کیا کیا تباہی عذاب آتے، نیز خود بنی اسرائیل کے احوال کیا تھے، ان ساری تفاصیل کو چھوڑ کر ہم تاریخی بات کا بیان آگے سے رہے ہیں کہ چونکہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا جواب فرعون نے مسلسل انکار اور سرکشی سے دیا، اس لیے اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو نجات دلانے کے لیے ہجرت کی راہ پر نکل کھڑے ہوتے۔ (مرتب)۔

۔۔ ۔ حضرت موسیٰ نے بحر احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا ۔۔۔ لیکن ادھر سے فرعون ایک لشکر عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اُس موقع پر آ پہنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سورۃ الشعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کا قافلہ لشکرِ فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل گھر چکا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنا عصا سمندر پر مار۔ چنانچہ فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں صرف یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا بلکہ بیچ کا یہ حصہ خشک ہو کر سوکھی سڑک کی طرح بن گیا۔ اس سڑک سے مہاجرین کے گزرتے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اس درمیانی راستے میں اُتر آیا، اور سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دبوچ لیا۔ [۴۳]

قومِ موسیٰ کا دورِ صحرا نوردی

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر جزیرہ نمائے سینا میں مارہ، ایلیم، اور رفیدیم کے راستے کوہِ سینا کی طرف آئے، اور ایک سال سے کچھ زائد مدت تک اس مقام پر ٹھہرے رہے۔[لہ] یہیں تورات کے بیشتر احکام آپ پر نازل ہوئے۔

فلسطین پر چڑھائی کا حکم

پھر آپ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین کی طرف جاؤ اور اسے فتح کر لو کہ وہ تمہاری میراث میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیے ہوئے تبعیرا اور حصیرات کے راستے دشتِ فاران میں تشریف لائے۔ یہاں سے آپ نے ایک وفد فلسطین کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے بھیجا۔ قادس کے مقام پر اس وفد نے آکر اپنی رپورٹ پیش کی۔ حضرت یوشع اور کالب کے سوا پورے وفد کی رپورٹ حوصلہ شکن تھی جسے سن کر بنی اسرائیل چیخ اٹھے اور انہوں نے فلسطین کی مہم پر جانے سے انکار کر دیا

دوسرا دورِ صحرا نوردی بطورِ سزا

تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب یہ چالیس برس تک اس علاقے میں بھٹکتے رہیں گے، اور ان کی موجودہ نسل یوشع اور کالب کے سوا فلسطین کی شکل نہ دیکھنے پائے گی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل دشتِ فاران، بیابانِ شور، اور دشتِ صین کے درمیان مارے مارے پھرتے رہے اور عمالقہ، اموریوں، ادومیوں، مدیانیوں اور موآب کے لوگوں سے لڑتے بھڑتے رہے۔

لہ بنی اسرائیل کے دورِ صحرا نوردی کی داستان کے بہت سے پہلو بڑے اہم ہیں۔ اس دور میں ان پر معجزانہ صورت میں خاص انعامات ہوتے تھے، اس دور میں ان کے اندر غلامانہ ماضی کے اثرات طرح طرح کی غلط حرکات کی صورت میں ظاہر ہوتے جن کی اصلاح کے لیے حضرت موسیٰ نے شدید محنت کی۔ اس لحاظ سے یہ زمانہ تربیت تھا۔ (مرتبین)

فصل ۳

فلسطین کی فتح اور دورِ مابعد

فلسطین کی فتح

جب چالیس سال گزرنے کے قریب آتے تو ادوم کی سرحد کے قریب کوہِ ہور پر حضرت ہارون علیہ السلام نے وفات پائی۔ پھر حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لیے ہوئے موآب کے علاقے میں داخل ہوئے اور اس پورے علاقے کو فتح کرتے ہوئے حسبون اور شطیم تک پہنچ گئے۔ یہاں کوہِ عباریم پر حضرت موسیٰؑ کا انتقال ہوا۔ اور ان کے بعد ان کے خلیفۂ اوّل حضرت یوشعؑ نے مشرق کی جانب سے دریائے اردن کو پار کر کے شہر یریحو (اریحا) کو فتح کیا۔ یہ فلسطین کا پہلا شہر تھا جو بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا۔ پھر ایک قلیل مدت ہی میں پورا فلسطین فتح ہو گیا۔[1]

بنو اسرائیل کو بگاڑ سے بچانے کے لیے حضرت موسیٰؑ کا انتباہ

سورۂ ابراہیم آیت نمبر ۷ میں حضرت موسیٰؑ کی وصیت یوں مذکور ہے :

"اور یاد رکھو، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا، اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔"[2]

---

۱ فلسطین کی فتح سے پہلے بنی اسرائیل طرح طرح کے فتنوں میں مبتلا ہوتے اور فتح پانے کے بعد پھر ان میں شر و فساد نے مختلف شکلوں میں سر اٹھایا۔ پھر انہوں نے اس کا خمیازہ بھگتا۔ (مرتب)

۲ اس طرح کی وصیتوں کی ضرورت یہ تھی کہ بنی اسرائیل انعاماتِ الٰہی سے متمتع ہونے کے بعد بار بار ناشکریاں کرتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ بار بار ان کی اصلاح کی سعی کرتے اور ان میں توبہ و انابت کا جذبہ ابھارتے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں یہ اندیشہ بے جا نہ تھا کہ جب یہ فتحِ فلسطین کے نقطۂ عروج تک پہنچیں گے تو ان میں شیطان بڑی آسانی سے سرکشی پیدا کر دے گا۔ اس لیے انہیں پہلے سے اس قانونِ الٰہی کی طرف توجہ دلانا ضروری تھا جو انعام یافتہ قوم کی سرکشی کی صورت میں کارفرما ہے۔ (مرتب)

استثناء کی تقریر: بائیبل کی کتاب استثناء میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ اس تقریر میں حضرت موسیٰؑ اپنی وفات سے چند روز پہلے بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے سارے اہم واقعات یاد دلاتے ہیں، پھر توراۃ کے ان تمام احکام کو دہراتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بھیجے تھے پھر ایک طویل خطبہ دیتے ہیں۔ . . . . . اس کے بعض بعض مقامات کمال درجہ موثر و عبرت انگیز ہیں، مثال کے طور پر اس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں :-

"اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جانفشانی سے مان کر اس کے ان سب حکموں پر جو میں آج کے دن تجھے دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا . . . . لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل نہ کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر ہوں گی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی۔ . . . . . وبا تجھ سے لپٹی رہے گی . . . آسمان جو تیرے سر پر ہے پیتل کا اور زمین جو تیرے نیچے ہے، لوہے کی ہو جائے گی . . . خداوند تجھے تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا . . . . عورت سے منگنی تو تو کرے گا مگر دوسرا اس سے مباشرت کرے گا۔ تو گھر بنائے گا مگر اس میں بسنے نہ پائے گا۔ تو تاکستان لگائے گا پر اس کا پھل نہ کھا سکے گا۔ تیرا بیل تیری آنکھوں کے سامنے ذبح کیا جائے گا . . . . . . بھوکا اور پیاسا اور ننگا اور سب چیزوں کا محتاج ہو کر تو اپنے ان دشمنوں کی خدمت کرے گا جن کو خداوند تیرے برخلاف بھیجے گا، اور غنیم تیری گردن پر لوہے کا جوا رکھے گا جب تک وہ تیرا ناس نہ کر دے . . . . . خداوند تجھ کو زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کر دے گا۔"[1]

حضرت یوشعؑ کی دعوت اصلاح

بنی اسرائیل کی ذہنیت کو اہل مصر کی غلامی نے جیسا کچھ بگاڑ دیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ مصر سے نکل آنے کے ۴۰ برس بعد جبکہ بنی اسرائیل جنت پر ستی پر اتر آئے تھے، مرتب، حضرت موسیٰؑ کے خلیفۂ اول حضرت یوشعؑ بن نون اپنی آخری تقریر میں بنی اسرائیل کے مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تم خداوند کا خوف رکھو اور نیک نیتی اور صداقت کے ساتھ اس کی پرستش کرو، اور ان دیوتاؤں کو دور کرو جن کی پرستش تمہارے باپ دادا بڑے دریا کے پار مصر میں کرتے تھے، اور خداوند کی پرستش

[1] باب ۲۸، آیت ۱۵ تا ۶۴ (اقتباس و تلخیص)

کرو۔ اور اگر خداوند کی پرستش تم کو بری معلوم ہوتی ہو تو آج ہی تم اسے جس کی پرستش کرو گے چُن لو۔ . . . . . . اب رہی میری اور میرے گھرانے کی بات سو ہم تو خداوند ہی کی پرستش کریں گے۔[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴۰ سال تک حضرت موسیٰؑ کی اور ۲۸ سال تک حضرت یوشع کی تربیت و رہنمائی میں زندگی بسر کر لینے کے بعد بھی یہ قوم اپنے اندر سے ان اثرات کو نہ نکال سکی جو فراعنۂ مصر کی بندگی کے دور میں اس کی رگ رگ کے اندر اُتر گئے تھے۔[2] ۴۴۴

فتح فلسطین کے بعد

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف قومیں آباد تھیں۔ حتّی، اموری، کنعانی، فرزّی، حوی، یبوسی، فلستی وغیرہ۔ ان قوموں میں بدترین قسم کا شرک پایا جاتا تھا۔ . . . . ساری خدائی بہت سے معبودوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ . . . . ان دیوتاؤں اور دیویوں کی طرف ایسے ایسے ذلیل اوصاف اور اعمال منسوب تھے کہ اخلاقی حیثیت سے انتہائی بدکردار انسان بھی ان کے ساتھ منسوب ہونا پسند نہ کرے۔ . . . . ان کے ہاں بچوں کی قربانی کا عام رواج تھا۔ ان کے معابد زناکاری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ عورتوں کو دیوداسیاں بنا کر عبادت گاہوں میں رکھنا اور ان سے بدکاریاں کرنا عبادت کے اجزاء میں داخل تھا۔

توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو جو ہدایات دی گئی تھیں ان میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تم ان قوموں کو ہلاک کر کے ان کے قبضے سے فلسطین کی زمین چھین لینا اور ان کے ساتھ رہنے بسنے اور ان کی اخلاقی و اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔

لیکن بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو وہ اس ہدایت کو بھول گئے۔ انہوں نے اپنی کوئی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقوں کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔[3] اس تفرقے سے ان کا کوئی قبیلہ بھی اتنا طاقتور نہ ہو سکا کہ اپنے علاقے کو

---

[1] یشوع ۲۴ (۱۴-۱۵) [2] اس قوم کی کج فطرتی اور دوں ہمتی کے مظاہر کو قرآن نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مصر میں حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر لبیک کہنے سے گریز، آزادی پاتے ہی سامری کے زیرِ اثر آ کر گوسالہ پرستی، گائے ذبح کرنے کے حکم کی مخلصانہ تعمیل کے بجائے حضرت موسیٰؑ سے سوال در سوال کا سلسلہ، صحرا میں من و سلویٰ کے بطور انعامِ الٰہی مفت حاصل ہونے پر شکر ادا کرنے کے بجائے پرانی شہری غذاؤں کا مطالبہ، جہاد کے موقع پر تعمیلِ حکم سے انکار، یوم سبت کے احکام میں تقلب زنی، تحریفِ کتاب، قتلِ انبیاء اور ان پر بہتان بازی، علم فروشی، کتمانِ حق، غرضیکہ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ اس قسم کے سیاہ اوراق سے بھری پڑی ہے (مرتبین)۔ [3] فلسطین کا مختصر سا علاقہ بنی اسرائیل کے جن قبائل میں تقسیم ہو گیا وہ یہ تھے: بنی یہوداہ، بنی شمعون، بنی دان، بنی بنیمین، بنی افرائیم، بنی روبن، بنی جد، بنی منسی، بنی اشکار، بنی زبلون، بنی نفتالی، بنی آشر (مطابق تحقیق ...)

مشرکین سے پوری طرح پاک کر دیتا۔ آخر کار انہیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں بسیں۔

اس کا پہلا خمیازہ تو بنی اسرائیل کو یہ بھگتنا پڑا کہ ان قوموں کے ذریعہ سے ان کے اندر شرک گھس آیا۔ اور اس کے ساتھ بتدریج دوسری اخلاقی گندگیاں بھی راہ پانے لگیں۔[1]

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت کے عہد تک صیدا، صور، دور، مجدو، بیت شان، جزر، یروشلم وغیرہ شہر مشرکوں کے قبضے میں رہے اور ان شہروں کی مشرکانہ تہذیب کا بنی اسرائیل پر گہرا اثر پڑتا رہا۔ مزید براں اسرائیلی قبائل کی سرحدوں پر فلستیوں، اَدومیوں، موآبیوں اور عمونیوں کی طاقتور ریاستیں بھی بدستور قائم تھیں اور انہوں نے بعد میں پے در پے حملے کر کے بہت سا علاقہ اسرائیلیوں سے چھین لیا حتیٰ کہ نوبت یہ آگئی کہ فلستین سے بنی اسرائیل بالکل ہی نکال دیے جاتے اگر عین وقت پر اللہ تعالیٰ طالوت کی قیادت میں اسرائیلیوں کو جمع نہ کر دیتا۔[2]

بنی اسرائیل کا پہلا بڑا دورِ فساد

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انہوں نے آپس میں لڑ کر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شمالی فلسطین اور شرق اردن میں سلطنت اسرائیل، جس کا پایۂ تخت آخر کار سامریہ قرار پایا، اور جنوبی فلسطین اور اَدوم کے علاقے میں سلطنت یہودیہ جس کا پایۂ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش اول روز سے شروع ہو گئی اور آخر تک رہی۔

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ حضرت الیاس اور حضرت الیسع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر یہ قوم جس تنزل کی طرف جا رہی تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخر کار اللہ کا غضب آشوریوں کی شکل میں دولتِ اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر آشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

---

[1] دوسرا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انہوں نے چھوڑ دی تھیں، انہوں نے اور فلستیوں نے جن کا پورا علاقہ غیر مغلوب رہ گیا تھا، بنی اسرائیل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور پے در پے حملے کر کے فلسطین کے بڑے حصے سے ان کو بے دخل کر دیا۔ حتیٰ کہ ان سے خداوند کے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) تک چھین لیا۔ آخر کار بنی اسرائیل کو ایک فرماں روا کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ اس متحدہ سلطنت کے تین فرماں روا ہوئے حضرت طالوت، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام۔ ان فرمانرواؤں نے اس کام کو مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ (تفہیم، ج ۲)

سنہ ۷۲۱ قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرماں روا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا۔ بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی تھی وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلدی شرک اور بد اخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔

اگرچہ دولتِ اسرائیل کی طرح اس پر بھی اشوریوں نے پے در پے حملے کیے، اس کے شہروں کو تباہ کیا، اس کے پایۂ تخت کا محاصرہ کیا، لیکن یہ ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم نہ ہو سکی۔ بلکہ صرف باجگزار بن کر رہ گئی .... آخر سنہ ۵۹۸ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کر دیا۔[۲۸]

خدا کی طرف سے ایک اور موقع دیا گیا

جہاں تک سامریہ اور اسرائیل کے لوگوں کا تعلق ہے وہ تو اشوریوں کی فتح کے بعد اخلاقی اور اعتقادی زوال کی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اُٹھے۔ مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت دینے والا تھا۔ اس نے اُن لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے کھچے رہ گئے تھے، اور اُن لوگوں کو بھی توبہ و انابت کی ترغیب دی جو بابل اور دوسرے علاقوں میں جلا وطن کر دیئے گئے تھے۔ آخرکار رحمتِ الٰہی ان کی مددگار ہوئی۔ بابل کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ۵۳۹ قبل مسیح میں ایرانی فاتح سائرس (خورس یا خسرو) نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے فرمان جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت ہے۔

سائرس نے یہودیوں کو ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی اجازت بھی دی۔ مگر ایک عرصے تک ہمسایہ قومیں جو اس علاقے میں آباد ہو گئی تھیں، مزاحمت کرتی رہیں۔ آخر دارا (داریوس) اوّل نے ۵۲۲ قبل مسیح میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے پوتے زرُبابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے حجی نبی، زکریاہ نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکل مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔

اس زمانے میں حضرت عُزیر نے دینِ موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ انہوں نے یہودی قوم کے تمام اہلِ خیر و صلاح لوگوں کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائیبل کی کتب مقدسہ کو جن میں توراۃ تھی، مرتب کر کے شائع کیا، یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا، قوانین شریعت کو نافذ کر کے اُن اعتقادی اور اخلاقی برائیوں کو دُور کرنا شروع کیا۔ جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گھس آئی تھیں۔ اُن تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جن سے یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے۔ اور بنی اسرائیل سے ازسرِ نو

خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا میثاق لیا۔

ڈیڑھ سو سال بعد بیت المقدس پھر سے آباد ہوا اور یہودی مذہب و تہذیب کا مرکز بن گیا۔

یونانی تسلّط اور مکابی تحریک

انٹیوکس ثالث (سلوقی سلطنت کا فرمانروا جس کا پایۂ تخت انطاکیہ تھا) نے ۱۹۸ ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یہ یونانی فاتح جو مذہباً مشرک اور اخلاقاً اباحیت پسند تھے، یہودی مذہب و تہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی دباؤ سے یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کیا اور خود یہودیوں میں سے ایک اچھا خاصا عنصر ان کا آلۂ کار بن گیا۔ اس خارجی مداخلت نے یہودی قوم میں تفرقہ ڈال دیا۔ ایک گروہ نے یونانی لباس، یونانی زبان، یونانی طرزِ معاشرت اور یونانی کھیلوں کو اپنا لیا اور دوسرا گروہ اپنی تہذیب پر سختی سے قائم رہا۔

۱۷۵ ق م میں انٹیوکس چہارم (جس کا لقب ایپی فانیس یعنی مظہرِ خدا تھا) جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری جابرانہ قوت سے یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔ ... لیکن یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکابی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس کشمکش میں یونانیت زدہ یہودیوں کی ساری ہمدردیاں یونانیوں کے ساتھ تھیں اور انہوں نے عملاً مکابی بغاوت کو کچلنے میں انطاکیہ کے ظالموں کا پورا ساتھ دیا، لیکن عام یہودیوں میں حضرت عزیر کی پھونکی ہوئی روحِ دینداری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مکابیوں کے ساتھ ہو گئے اور آخر کار انہوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کر لی جو ۶۷ قبل مسیح تک قائم رہی۔ اس ریاست کے حدود پھیل کر رفتہ رفتہ پورے اس رقبے پر حاوی ہو گئے جو کبھی یہودیہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے زیرِ نگیں تھے۔ بلکہ فلستیہ کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں آ گیا جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بھی مسخر نہ ہوا تھا۔[1]

دوسرا دورِ فساد اور اس کا خمیازہ

مکابیوں کی تحریک جس اخلاقی و دینی روح کے ساتھ اٹھی تھی وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ خالص دنیا پرستی اور بے روح ظاہرداری نے لے لی۔ آخر کار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپی ۶۳ ق م میں اس ملک کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے

ل اس سلسلے میں ان تفصیلی احکام کا تذکرہ چھوڑ دیا گیا ہے جن کے ذریعے یہودیوں کے عام عقائد، عبادات، رسوم اور اصولِ معاشرت کو ختم کیا گیا تھا۔ (تفہیم)

بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن رومی فاتحین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ وہ مفتوحہ علاقوں پر براہِ راست اپنا نظم و نسق قائم کرنے کی بہ نسبت مقامی حکمرانوں کے ذریعہ سے بالواسطہ اپنا کام نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے فلسطین میں اپنے زیر سایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی جو بالآخر سنہ ۴۰ ق م میں ایک ہوشیار یہودی ہیرود نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرود اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ . . . . . اس نے ایک طرف مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کر کے یہودیوں کو خوش رکھا، اور دوسری طرف رومی تہذیب کو فروغ دے کر اور رومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے قیصر کی بھی خوشنودی حاصل کی۔ اس زمانے میں یہودیوں کی دینی و اخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

سنہ ۴۱ء میں ہیرود اعظم کے پوتے ہیرود اگرپا کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرماں روا بنا دیا جن پر ہیرود اعظم اپنے زمانے میں حکمران تھا۔ اس شخص نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کر دی۔

اِس دَور میں عام یہودیوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی جو حالت تھی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان تنقیدوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مسیح علیہ السلام نے اپنے خطبوں میں اُن پر کی ہیں۔

اِس قوم کی آنکھوں کے سامنے یحییٰ علیہ السّلام جیسے پاکیزہ انسان کا سر قلم کیا گیا، مگر ایک آواز بھی اس ظلم عظیم کے خلاف نہ اٹھی۔ اور پوری قوم کے مذہبی پیشواؤں نے مسیح علیہ السلام کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا۔ . . . . حد یہ ہے کہ جب پنطس پیلاطس نے ان شامت زدہ لوگوں سے پوچھا کہ . . . . بتاؤ یسوع کو چھوڑوں یا برابّا ڈاکو کو؟ تو ان کے پورے مجمع نے بیک آواز ہو کر کہا کہ برابّا کو چھوڑ دے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت تھی جو اس قوم پر قائم کی گئی۔

اس پر تھوڑا زمانہ ہی گزرا تھا کہ یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی اور ۶۴ء اور ۶۶ء کے درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کر دی۔ . . . . آخر کار رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی سے اس بغاوت کو کچل ڈالا اور سنہ ۷۰ء میں ٹیٹس نے بزورِ شمشیر یروشلم کو فتح کر لیا اس موقع پر قتل عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار آدمی مارے گئے، ۶۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنائے گئے، ہزارہا آدمی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیئے گئے۔ ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لیے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لیے چن لی گئیں، اور یروشلم کے شہر اور ہیکل کو پیوند خاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد فلسطین

سے یہودی اثر ایسا مٹا کہ دو ہزار برس تک اس کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا![۴۴]

تورات میں تحریف[۱]

کتاب استثنا میں حضرت موسٰی کی جو آخری تقریر نقل کی گئی ہے اس میں وہ بار بار بنی اسرائیل سے عہد لیتے ہیں کہ جو احکام میں نے تم کو پہنچائے ہیں انہیں اپنے دل پر نقش کرنا، اپنی آئندہ نسلوں کو سکھانا، گھر بیٹھے اور راہ چلتے، اور اٹھتے اور لیٹتے ہر وقت ان کا چرچا کرنا، اپنے گھر کی چوکھٹوں پر ان کو لکھ دینا۔[۲] پھر اپنی آخری وصیت میں انہوں نے تاکید کی کہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ کوہ عیبال پر بڑے بڑے پتھر نصب کر کے توراۃ کے احکام ان پر کندہ کر دینا۔[۳] نیز بنی لاوی کو توراۃ کا ایک نسخہ دے کر ہدایت فرمائی کہ ہر ساتویں برس عید خیام کے موقع پر قوم کے مردوں، عورتوں، بچوں سب کو جگہ جگہ جمع کر کے یہ پوری کتاب لفظ بلفظ ان کو سناتے رہنا۔ لیکن اس پر بھی کتاب اللہ سے بنی اسرائیل کی غفلت رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ حضرت موسٰی کے سات سو برس بعد ہیکل سلیمانی کے سجادہ نشین اور یروشلم کے یہودی فرمانروا تک کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں توراۃ نامی کوئی کتاب موجود ہے۔[۴]

علمائے یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انہوں نے کتاب اللہ کے علم کی اشاعت کرنے کے بجائے اس کو ربیوں اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود طبقے میں مقید کر رکھا تھا، اور عامۃ خلائق تو درکنار، خود یہودی عوام تک کو اس کی ہوا نہ لگنے دیتے تھے پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گمراہیاں پھیلیں تو علما نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوشش نہ کی بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اس ضلالت اور بدعت کو جس کا رواج عام ہو جاتا، اپنے قول و عمل سے، یا اپنے سکوت سے اُلٹی سند جواز عطا کرنے لگے۔[۴۳]

ان لوگوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلام الٰہی کے معنی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ بائیبل میں اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو، اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلام الٰہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔[۵] اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے

---

[۱] توریت میں کلام الٰہی کے تھوڑے بہت اجزا کے ساتھ یہودی مسلکوں، مفسروں، واعظوں اور فقیہوں نے جو بدعتیں اپنی طرف سے بڑھائے ہیں، انہی سے یہودیت کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ (مرتبین) [۲] ۶: ۴-۹ [۳] ۲۷: ۲-۴۔

[۲] اس وصیت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس دین کو قائم رکھنا ہو اس کی تعلیمات کو پھیلانا ہی اس کی حفاظت کا ذریعہ ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے نظام تعلیم و تربیت میں کتاب الٰہی کو اولیت اور مرکزیت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ (مرتبین) [۴] سلاطین ۲۲: ۸-۱۳۔

[۵] قرآن کے الفاظ میں علمائے یہود کا حال یہ تھا کہ "اکثر علما اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل م

سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی فلسفہ، ہر مفسر کی تاویل، ہر متکلم کا الہیاتی عقیدہ اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد، جس نے مجموعۂ کتب مقدسہ (بائیبل) میں جگہ پائی۔ اللہ کا قول (Word of God) بن کر رہ گیا۔ اس پر ایمان لانا فرض ہوگیا۔ اور اس سے پھرنے کے معنی دین سے پھرنے کے ہوگئے۔

ہماری تحقیق یہ ہے کہ عہد عتیق (Old Testament) کی کتب خمسہ (Pentateuch) اصل تورات نہیں ہیں بلکہ اصل تورات دنیا سے ناپید ہو چکی ہے۔ اس نظریہ کی تائید خود عہد عتیق سے ہوتی ہے۔ اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں حضرت یشوع (یعنی یوشع) کی مدد سے تورات کو مرتب کرکے ایک صندوق میں رکھوا دیا تھا۔[1] ان کے انتقال کے بعد چھٹی صدی ق م میں جب بخت نصر نے بیت المقدس کو آگ لگا دی تو وہ مقدس صندوق ان تمام کتابوں سمیت جل گیا جو حضرت موسیٰؑ کے بعد شریعت موسوی کے مجددین نے مرتب کی تھیں۔ اس تباہی کے دو ڈھائی سو برس بعد حضرت عزیرؑ نے خود بائیبل کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے کاہنوں اور راویوں کے ساتھ مل کر آسمانی الہام سے اس کتاب کو از سر نو مرتب کیا۔[2] مگر حوادث زمانہ نے اس نئے نسخے کو بھی اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہنے دیا۔ سکندر اعظم کی عالمگیر فتوحات کا سیلاب جب یونانی حکومت کے ساتھ علوم و آداب کو لے کر مشرق اوسط پر پھیل گیا تو سنہ ۲۵۸ ق م میں تورات کی تمام کتابیں یونانی زبان میں منتقل کر دی گئیں، اور رفتہ رفتہ اصل عبرانی نسخہ متروک ہوکر یونانی ترجمہ رائج ہوگیا۔ پس آج جو تورات ہمارے سامنے ہے اس کی سند کسی طرح حضرت موسیٰؑ تک نہیں پہنچتی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودہ تورات میں اصل تورات کا کوئی جزو بھی شامل نہیں ہے، یا یہ سراسر جعلی ہے۔ دراصل جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس تورات میں اصل

م طلب نفعوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں" (توبہ-۳۴) یعنی ظالم صرف یہی ستم نہیں کرتے کہ فتوے بیچتے ہیں، رشوتیں کھاتے ہیں، نذرانے لوٹتے ہیں۔ ایسے ایسے مذہبی ضابطے اور مراسم ایجاد کرتے ہیں جن کی وجہ سے لوگ اپنی نجات ان سے خریدیں، اور ان کا مرنا جینا اور شادی و غم کچھ بھی ان کو کھلائے بغیر نہ ہو سکے۔ اور وہ اپنی قسمتیں بننے اور بگاڑنے کے ٹھیکیدار ان کو سمجھ لیں۔ بلکہ مزید برآں اپنی انہی اغراض کی خاطر یہ حضرات خلق خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے ہیں۔ اور جب کبھی کوئی دعوت حق اصلاح کے لیے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنی عالمانہ فریب کاریوں اور مکاریوں کے حربے لے لے کر اس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

[1] استثناء: ۳۱: ۲۴ - ۲۶۔

[2] ایڈ وراس، جزو دوم، باب چہاردہم۔

تورات کے ساتھ بہت سی دوسری چیزیں مل جل گئی ہیں، اور بعید نہیں کہ اُس کی بعض چیزیں اس میں غائب بھی ہو گئی ہوں۔ آج جو شخص بھی محققانہ نگاہ سے اس کتاب کو پڑھے گا وہ صریح طور پر یہ محسوس کرے گا کہ اس میں خدا کے کلام کے ساتھ یہودی علماء کی تفسیریں، بنی اسرائیل کی قومی تاریخ، اسرائیلی فقہاء کے قانونی اجتہادات اور دوسری بہت سی چیزیں خلط ملط ہو گئی ہیں جنہیں الگ کر کے کلامِ الٰہی کو چھانٹ نکالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے تورات کا دین وہی تھا جو خود قرآن کا دین ہے، اور موسیٰ علیہ السلام اسی طرح اسلام کے پیغمبر تھے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ بنی اسرائیل ابتدا میں اسی دین کے پیرو تھے، مگر بعد میں انہوں نے اصل دین میں اپنی خواہشات کے مطابق بہت کچھ کمی بیشی کر کے ایک نیا مذہبی نظام "یہودیت" کے نام سے بنا لیا۔[1]

دراصل تورات سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران میں ان پر نازل ہوئے۔ ان میں سے دس احکام تو وہ تھے جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کندہ کر کے انہیں دیے تھے۔ باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰؑ نے لکھوا کر اس کی بارہ نقلیں بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں کو دے دی تھیں، اور ایک نقل بنی لاوی کے حوالے کی تھی تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام تورات تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المقدس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک کاپی جو بنی لاوی کے حوالے کی گئی تھی، پتھر کی لوحوں سمیت، عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی، اور بنی اسرائیل اس کو توریت ہی کے نام سے جانتے تھے۔ اُس سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکل سلیمانی کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سجادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) کو ایک جگہ توریت رکھی ہوئی مل گئی، اور اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی منشی کو دیا اور شاہی منشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہے۔[2] یہی وجہ ہے کہ جب بخت نصر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو بنی اسرائیل نے تورات کے وہ اصل نسخے جو ان کے ہاں طاقِ نسیاں پر رکھے ہوئے تھے، اور بہت ہی تھوڑی تعداد میں تھے، ہمیشہ کے لیے گم کر دیے۔ پھر جب عزرا کاہن (حضرت عزیر) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کھچے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المقدس تعمیر ہوا تو عزرا نے اپنی قوم کے چند دوسرے بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مرتب کی جو اب بائیبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب یعنی

۱؎ یعنی موجودہ تورات حضرت موسیٰؑ کے لائے ہوئے اسلام کی نہیں، بلکہ اس دینِ اسلام کی مسخ شدہ صورت "یہودیت" کی آئینہ دار ہے۔

۲؎ سلاطین ۲۔ باب ۲۲ (مرتب)

خروج، احبار، گنتی، استثنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں اور اس سیرت ہی میں تاریخ نزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسب موقع درج کر دی گئی ہیں جو عزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہو سکیں پس اب تورات ان منتشر اجزا ہی کا نام ہے جو سیرت موسیٰ کے اندر بکھرے ہوئے ہیں ہم انہیں صرف اس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اس تاریخی بیان کے دوران جہاں کہیں سیرت موسیٰ کا مصنف کہتا ہے "خدا نے موسیٰ سے یہ فرمایا" یا "موسیٰ نے کہا خداوند تمہارا خدا یہ کہتا ہے" وہاں سے تورات کا ایک جز شروع ہوتا ہے اور جہاں پھر سیرت کی تقریر شروع ہوتی ہے وہاں وہ جز ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز بائبل کے مصنف نے تفسیر و تشریح کے طور پر بڑھا دی ہے وہاں ایک عام آدمی کے لیے یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصہ ہے یا شرح و تفسیر[1]

۱؎ یہی تحریف شدہ تورات یہودیت کا ماخذ تھی، مگر عبرتناک امر یہ ہے کہ جس شکل میں یہودی تورات کو مانتے تھے اس شکل میں بھی وہ نہ تو اس کی اقامت کے لیے کوشاں تھے اور نہ دیانت داری سے اس کے مندرجہ احکام ہی کی تبلیغ و تعمیل کرتے تھے۔ اسی لیے قرآن نے اعتراض کیا تھا کہ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ ۔ (مرتبین)

فصل ۴

بعثتِ خاتم النبیینؐ کے وقت یہود کے مذہبی و معاشی حالات

عرب کے یہودیوں کی مستند تاریخ موجود نہیں

عرب کے یہودیوں کی کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ انہوں نے خود اپنی کوئی ایسی تحریر کسی کتاب یا کتبے کی شکل میں نہیں چھوڑی ہے جس سے اُن کے ماضی پر کوئی روشنی پڑ سکے۔ اور عرب سے باہر کے یہودی مؤرخین و مصنفین نے اُن کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جزیرۃ العرب میں آکر وہ اپنے بقیہ ابنائے ملت سے بچھڑ گئے تھے۔ اور دنیا کے یہودی سب سے ان کو اپنوں میں شمار ہی نہیں کرتے تھے، کیونکہ انہوں نے عبرانی تہذیب، زبان، حتیٰ کہ نام تک چھوڑ کر عربیت اختیار کر لی تھی۔ حجاز کے آثارِ قدیمہ میں جو کتبات ملے ہیں اُن میں پہلی صدی عیسوی سے قبل یہودیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا، اور ان میں بھی صرف چند یہودی نام پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہودِ عرب کی تاریخ کا بیشتر انحصار اُن زبانی روایات پر ہے جو اہلِ عرب میں مشہور تھیں، اور ان میں اچھا خاصا حصہ خود یہودیوں کا اپنا پھیلایا ہوا تھا۔

حجاز کے یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ سب سے پہلے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری عہد میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ اس کا قصہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک لشکر یثرب کے علاقے سے عمالقہ کو نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ اِس قوم کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑیں۔ بنی اسرائیل کے اس لشکر نے یہاں آکر فرمانِ نبی کی تعمیل کی، مگر عمالقہ کے بادشاہ کا ایک لڑکا بڑا خوبصورت جوان تھا، اسے انہوں نے زندہ رہنے دیا اور اس کو ساتھ لیے ہوئے فلسطین واپس پہنچے۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے جانشینوں نے اس بات پر سخت اعتراض کیا کہ ایک عمالیقی کو زندہ چھوڑ دینا نبی کے فرمان اور شریعتِ موسویؑ کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے اس لشکر کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا اور اسے مجبوراً واپس یثرب آکر یہیں بس جانا پڑا (کتاب الاغانی، ج ۱۹، ص ۹۴)۔ اس طرح یہودی گویا اس بات کے مدعی تھے کہ وہ ۱۲۰۰ سو برس قبل مسیح سے یہاں آباد ہیں لیکن درحقیقت اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ اور اغلب یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ افسانہ اس لیے

گھڑا تھا کہ اہلِ عرب پر اپنے قدیم الاصل اور عالی النسب ہونے کی دھونس جمائیں۔

دوسری یہودی مہاجرت، خود یہودیوں کی اپنی روایت کے مطابق ۵۸۷ قبل ... بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کر کے یہودیوں کو دنیا بھر میں تتر بتر کر دیا تھا۔ عرب ... تھے کہ اس زمانے میں ہمارے متعدد قبائل آ کر وادی القریٰ، تیماء، اور یثرب میں آباد ہو گئے تھے (فتوح البلدان، البلاذری)۔ لیکن اس کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ اس سے بھی وہ اپنی قدامت ثابت کرنا چاہتے ہوں۔

درحقیقت جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتلِ عام کیا، پھر ۱۳۲ء میں انہیں اس سرزمین سے نکال باہر کیا، اُس دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزین ہوئے تھے، کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آ کر انہوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ اور سود خواری کی وجہ سے اُن پر قبضہ جما لیا۔ ایلہ، مقنا، تبوک، تیماء، وادی القریٰ، فدک، اور خیبر پر ان کا تسلط اسی دور میں قائم ہوا، اور بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی بہدل، اور بنی قینقاع بھی اسی دور میں آ کر یثرب پر قابض ہوئے۔

یثرب میں آباد ہونے والے قبائل میں سے بنی نضیر اور بنی قریظہ زیادہ ممتاز تھے، کیونکہ وہ کاہنوں (Cohens یا Priests) کے طبقہ میں سے تھے۔ انہیں یہودیوں میں عالی نسب مانا جاتا تھا اور ان کو اپنی ملت میں مذہبی ریاست حاصل تھی۔ یہ لوگ جب مدینہ میں آ کر آباد ہوئے تو اس وقت کچھ دوسرے عرب قبائل یہاں رہتے تھے جن کو انہوں نے دبا لیا اور عملاً اس سرسبز و شاداب مقام کے مالک بن بیٹھے۔ اس کے تقریباً تین صدی بعد ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں یمن کے اُس سیلابِ عظیم کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ سبا کے دوسرے رکوع میں آیا ہے۔ اس سیلاب کی وجہ سے قوم سبا کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل جانے پر مجبور ہو گئے۔ ان میں سے غسانی شام میں، لخمی حیرہ (عراق) میں، بنی خزاعہ جدہ و مکہ کے درمیان اور اوس و خزرج یثرب میں جا کر آباد ہوئے۔ یثرب پر چونکہ یہودی چھائے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اوّل اوّل اوس و خزرج کی دال نہ گلنے دی اور یہ دونوں عرب قبیلے چار و ناچار بنجر زمینوں پر بس گئے جہاں ان کو قوتِ لایموت بھی مشکل سے حاصل ہوتا تھا۔ آخرکار ان کے سرداروں میں سے ایک شخص اپنے غسانی بھائیوں سے مدد مانگنے کے لیے شام گیا اور وہاں سے ایک لشکر لا کر اس نے یہودیوں کا زور توڑ دیا۔ اس طرح اوس و خزرج کو یثرب پر پورا غلبہ حاصل ہو گیا، یہودیوں کے دو بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ شہر کے باہر جا کر بسنے پر مجبور ہو گئے۔ تیسرے قبیلے بنی قینقاع کی چونکہ ان دونوں یہودی قبیلوں سے اَن بَن تھی، اس لیے وہ شہر کے اندر ہی مقیم رہا۔ مگر یہاں رہنے کے لیے اسے قبیلۂ خزرج کی پناہ لینی پڑی۔ اور اس کے مقابلہ میں بنی نضیر و بنی قریظہ نے اوس کی پناہ لی، تاکہ اطرافِ یثرب میں امن کے ساتھ

رہ سکیں۔

آنحضورؐ کی بعثت کے وقت یہود کی پوزیشن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے آغازِ ہجرت تک حجاز میں عموماً اور یثرب میں خصوصاً یہودیوں کی پوزیشن کے نمایاں خدوخال یہ تھے:

زبان، لباس، تہذیب و تمدّن، ہر لحاظ سے انہوں نے پوری عربیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا حتّٰی کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہو گئے تھے۔ بارہ یہودی قبیلے جو حجاز میں آباد ہوئے تھے، اُن میں سے بنی زعوراء کے سوا کسی قبیلے کا نام عبرانی نہ تھا۔ ان کے چند گنے چنے علماء کے سوا کوئی عبرانی جانتا تک نہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے یہودی شاعروں کا جو کلام ہمیں ملتا ہے ان کی زبان، اور خیالات اور مضامین میں شعرائے عرب سے الگ کوئی امتیازی شان نہیں پائی جاتی جو انہیں ممیّز کرتی ہو۔ ان کے اور عربوں کے درمیان شادی بیاہ تک کے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ درحقیقت ان میں اور عام عربوں میں دین کے سوا کوئی فرق باقی نہ رہا تھا لیکن ان ساری باتوں کے باوجود وہ عربوں میں جذب بالکل نہ ہوئے تھے اور انہوں نے شدت کے ساتھ اپنی یہودی عصبیت برقرار رکھی تھی۔ یہ ظاہری عربیت انہوں نے صرف اس لیے اختیار کی تھی کہ اس کے بغیر وہ عرب میں رہ نہ سکتے تھے۔

ان کی اس عربیت کی وجہ سے مغربی مستشرقین کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ شاید یہ بنی اسرائیل نہ تھے بلکہ یہودی مذہب قبول کرنے والے عرب تھے یا کم از کم ان کی اکثریت عرب یہودیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہودیوں نے حجاز میں کبھی کوئی تبلیغی سرگرمی دکھائی ہو، یا ان کے علماء نصرانی پادریوں اور مشنریوں کی طرح اہلِ عرب کو دینِ یہود کی طرف دعوت دیتے ہوں۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر اسرائیلیت کا شدید تعصب اور نسلی فخر و غرور پایا جاتا تھا۔ اہلِ عرب کو وہ اُمّی (Priests/Gentiles) کہتے تھے جس کے معنی صرف اَن پڑھ کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان اُمیّوں کو وہ انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں جو اسرائیلیوں کے لیے ہیں اور ان کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے مار کھانا اسرائیلیوں کے لیے حلال اور طیّب ہے۔ سردارانِ عرب کے ماسوا، عام عربوں کو وہ اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ ان کو دینِ یہود میں داخل کر کے برابر کا درجہ دے دیں۔ تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، نہ روایاتِ عرب میں ایسی کوئی شہادت ملتی ہے کہ کسی عرب قبیلے یا کسی بڑے خاندان نے یہودیت قبول کی ہو۔ البتہ بعض افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے جو یہودی ہو گئے تھے۔ ویسے بھی یہودیوں کو تبلیغِ دین کے بجائے صرف اپنے کاروبار سے دلچسپی تھی۔ اسی لیے حجاز میں یہودیت ایک دین کی حیثیت سے نہیں پھیلی بلکہ محض چند اسرائیلی قبیلوں کا سرمایۂ فخر و ناز بنی رہی۔ البتہ یہودی علماء نے تعویذ گنڈوں اور فال گیری اور جادوگری کا کاروبار خوب چمکا رکھا تھا جس کی وجہ سے عرب پر اُن کے "عِلم" اور "عمل" کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

ان کی معاشی پوزیشن

معاشی حیثیت سے ان کی پوزیشن عرب قبائل کی بہ نسبت زیادہ مضبوط تھی چونکہ وہ فلسطین و شام کے زیادہ متمدن علاقوں سے آئے تھے اس لیے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہل عرب میں رائج نہ تھے۔ اور باہر کی دنیا سے ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔ ان وجوہ سے یثرب اور بالائی حجاز میں غلے کی درآمد اور یہاں سے چھوہاروں کی برآمد ان کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ مرغ بانی اور ماہی گیری پر بھی زیادہ تر ان ہی کا قبضہ تھا۔ پارچہ بافی کا کام بھی انہی کے ہاں ہوتا تھا۔ جگہ جگہ مے خانے بھی انہوں نے قائم کر رکھے تھے جہاں شام سے شراب لا کر فروخت کی جاتی تھی بنی قینقاع زیادہ تر سنار اور لوہار اور ظروف سازی کا پیشہ کرتے تھے۔ اس سارے بیوپار میں یہ یہودی بے تحاشا منافع خوری کرتے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا کاروبار سود خواری کا تھا جس کے جال میں انہوں نے گردو پیش کی عرب آبادیوں کو پھانس رکھا تھا، اور خاص طور پر عرب قبائل کے شیوخ اور سردار، جنہیں قرض لے لے کر ٹھاٹھ جمانے اور شیخی بگھارنے کی بیماری لگی ہوئی تھی، ان کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ بھاری شرح سود پر قرض دیتے اور پھر سود در سود کا چکر چلاتے تھے جس کی گرفت میں آجانے کے بعد مشکل ہی سے کوئی نکل سکتا تھا۔ اس طرح انہوں نے عربوں کو معاشی حیثیت سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ مگر اس کا فطری نتیجہ یہ بھی تھا کہ عربوں میں بالعموم ان کے خلاف ایک گہری نفرت پائی جاتی تھی

اُن کے تجارتی اور مالی مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ عربوں میں سے کسی کے دوست بن کر کسی سے نہ بگاڑیں اور نہ ان کی باہمی لڑائیوں میں حصّہ لیں لیکن دوسری طرف اُن کے مفاد ہی کا تقاضا یہ بھی تھا کہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیں اور انہیں ایک دوسرے سے لڑاتے رہیں کیونکہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ جب بھی عرب قبیلے باہم متحد ہوئے، وہ انہیں اُن بڑی بڑی جائیدادوں، باغات اور سرسبز زمینوں پر قابض نہ رہنے دیں گے جو انہوں نے اپنی منافع خوری اور سود خوری سے پیدا کی تھیں۔ مزید برآں اپنی حفاظت کے لیے ان کے ہر قبیلے کو کسی نہ کسی طاقتور عرب قبیلے سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کرنے پڑتے تھے تاکہ کوئی دوسرا زبردست قبیلہ ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس بنا پر انہیں نہ صرف عرب قبائل کی باہمی لڑائیوں میں حصّہ لینا پڑتا تھا، بلکہ بسا اوقات ایک یہودی قبیلہ اپنے حلیف عرب قبیلہ کے ساتھ مل کر کسی دوسرے یہودی قبیلے کے خلاف جنگ آزما ہو جاتا تھا جس کے حلیفانہ تعلقات فریق مخالف کے ساتھ ہوتے تھے۔ یثرب میں بنی قریظہ اور بنی نضیر اوس کے حلیف تھے۔ اور بنی قینقاع خزرج کے۔ ہجرت سے تھوڑی مدت پہلے اوس اور خزرج کے درمیان جو خونریز لڑائی بُعاث کے مقام پر ہوئی تھی اس میں یہ اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ [illegible]

مذہبیت کا نمائشی ڈھانچہ

یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اُس ضابطۂ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی

طرف سے اُن کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور اصولاً ان کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے لیکن صدیوں کے انحطاط نے ان کو اصل دین سے بہت دُور ہٹا دیا تھا۔[1] ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہو گئی تھی جن کے لیے توراۃ میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے مراسم اور طریقے رواج پا گئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے توراۃ میں کوئی ثبوت نہ تھا۔ خود توراۃ کو انہوں نے انسانی کلام کے اندر خلط ملط کر دیا تھا اور خدا کا کلام جس حد تک لفظاً یا معنیً محفوظ تھا اس کو بھی انہوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی روح ان میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیت کا محض ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا جس کو وہ سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ اُن کے علماء اور مشائخ، اُن کے سرداران قوم اور اُن کے عوام، سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی اور اپنے بگاڑ سے ان کو ایسی محبت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ انہیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، موشگافیوں اور فرقہ بندیوں، استخواں گیری و مغز افگنی، خدا فراموشی و دُنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصلی نام "مسلم" تک بھول گئے تھے، محض "یہودی" بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انہوں نے محض نسلِ اسرائیل کی آبائی وراثت بنا کر رکھ دیا تھا ۹ ۱۳۲۹

مذہبی اور نسلی عصبیت

(یہودیوں کا خیال تھا کہ) امانت اور دیانت کا لحاظ صرف یہودیوں سے معاملہ کرنے میں ہونا چاہیے غیر یہودی کا مال اگر مار لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ محض یہودی عوام کا جاہلانہ خیال ہی نہیں تھا۔ دراصل یہودیت کا پُورا مذہبی نظام ایسا بنا دیا گیا تھا کہ وہ اخلاقی احکام میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان قدم قدم پر تفریق کرتا ہے۔ ایک ہی چیز اسرائیلی کے ساتھ کی جائے تو ناجائز ہے مگر اسی کا ارتکاب غیر اسرائیلی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہی چیز اسرائیلی کے لیے حق ہے مگر غیر اسرائیلی کے لیے حق نہیں ہے۔ مثلاً بائیبل میں حکم ہے کہ جو قرض ایک شخص نے دوسرے کو دیا ہو وہ سات سال گزر جانے پر ضرور معاف کر دیا جائے "مگر پردیسی سے تو اس کا مطالبہ کر سکتا ہے" (استثناء ۱۵: ۳)۔ ایک اور جگہ سُود لینے سے منع کیا گیا ہے، مگر "تو پردیسی کو سُود پر قرض دے تو

---

[1] اس وقت حضرت موسیٰ کو گزرے ہوئے تقریباً اُنیس صدیاں گزر چکی تھیں۔ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ نے ۱۲۷۲ قبل مسیح میں وفات پائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶۱۰ بعد مسیح میں منصب نبوّت پر سرفراز ہوئے۔ (مؤلف)

دے باپ بھائی کو سُود پر قرض نہ دینا۔ (استثناء ۲۳: ۲۰) ایک اور جگہ لکھا ہے "اگر کوئی شخص اپنے اسرائیلی بھائیوں میں سے کسی کو غلام بنانے یا بیچنے کی نیت سے چُراتا ہُوا پکڑا جائے تو وہ چور مار ڈالا جائے (استثناء ۲۴: ۷)۔ تلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کرے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ گری پڑی چیز مل جائے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد و پیش کی آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔ ربی اشماعیل کہتا ہے کہ اگر امی اور اسرائیلی کا مقدمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جتوا سکتا ہو تو اس کے مطابق جتوائے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے۔ اور اگر امیوں کے قانون کے مطابق جتوا سکتا ہو تو اس کے تحت جتوائے اور کہے کہ یہ تمہارا قانون ہے۔ اور اگر دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو کرے۔ ربی شموائیل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اصولوں سے انحراف، جزئیات میں انہماک

علمائے یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے بلکہ اُن کا سارا وقت اُن جزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جو اُن کے فقیہوں نے استنباط در استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے، اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انہیں کوئی مضائقہ نظر آتا تھا۔

اکابر کے لیے شریعت میں تحریف

یہود اپنے مذہبی احکام سے جس طرح روگردانی کیے ہوئے تھے اس کی ایک مثال وہ مقدمہ ہے جو خیبر کے یہودی فیصلہ کرانے کی غرض سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے۔ مقدمہ یہ تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق پایا گیا۔ تورات کی رو سے ان کی سزا رجم تھی، یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے (استثناء باب ۲۲ آیت ۲۳، ۲۴)۔ لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پنچ بنایا جائے۔ اگر وہ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کر لیا جائے اور رجم ہی کا حکم دیں تو نہ قبول کیا جائے۔ چنانچہ مقدمہ آپ کے سامنے لایا گیا۔ آپ نے رجم کا حکم دیا۔ انہوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا۔ اس پر آپ نے پوچھا تمہارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا۔ آپ نے اُن کے علماء کو قسم دے کر اُن سے پوچھا کیا تورات میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انہوں نے پھر وہی جھوٹا جواب دیا۔ لیکن

ان میں سے ایک شخص ابن صوریا جو خود یہودیوں کے بیان کے مطابق اپنے وقت میں توراۃ کا سب سے بڑا عالم تھا خاموش رہا۔ آپؐ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں تجھے اُس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور طُور پر تمہیں شریعت عطا کی، کیا واقعی توراۃ میں زنا کی سزا یہی لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "اگر آپؐ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زنا کی سزا تو رجم ہی ہے مگر ہمارے ہاں جب زنا کی کثرت ہُوئی تو ہمارے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انہیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انہیں رجم کر دیا جاتا۔ پھر جب اس سے عوام میں ناراضی پیدا ہونے لگی تو ہم نے توراۃ کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنا لیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور انہیں مُنہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹے مُنہ سوار کیا جائے۔"[۲۵۲]

حِلّت و حُرمت کے شرعی احکام میں ردّ و بدل

اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہُوئی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور آپ اپنے شارع بن بیٹھے تو انہوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی موشگافیوں سے خود حرام کر لیا۔ ان اشیاء میں ایک تو ناخن والے جانور ہیں یعنی شتر مُرغ، قاز، بط وغیرہ۔ دوسرے گائے اور بکری کی چربی۔ بائیبل میں ان دونوں قسم کی حرمتوں کو احکام توراۃ میں داخل کر دیا گیا ہے (حالانکہ یہ چیزیں توراۃ میں حرام نہ تھیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بعد حرام ہُوئی ہیں اور تاریخ بھی شہادت دیتی ہے کہ موجودہ یہُودی شریعت کی تدوین دوسری صدی عیسوی کے آخر میں ربّی یہوداہ کے ہاتھوں مکمل ہُوئی ہے۔[۲۵۳]

آنحضورؐ کے متعلق یہود کا نامعقول رویّہ

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرہ آیت ۸۹)

"اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے، اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی آمد سے پہلے یہُودی بے چینی کے ساتھ اُس نبی کے منتظر تھے جس کی بعثت کی پیشگوئیاں[۱]

---

[۱] یہ پیشینگوئیاں اس وجہ سے عیسائیوں کی فصل میں بیان کی گئی ہیں کہ مؤلف کی نظروں میں تورات اور انجیل کی پیشین گوئیاں باہم دگر مربوط ہیں (مرتبین)

ان کے انبیاء نے کی تھیں۔ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہلِ مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدیؐ سے پہلے یہی اُن کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پر جیا کرتے تھے اور اُن کا آئے دن کا تکیہ کلام یہی تھا کہ "اچھا، اب تو جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کر لے جب وہ نبی آئے گا تو ہم ان سب ظالموں کو دیکھ لیں گے۔" اہلِ مدینہ یہ باتیں سُنے ہوئے تھے، اسی لیے جب انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں چلو پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں۔ مگر اُن کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف بن گئے۔

اور یہ جو فرمایا کہ "وہ اس کو پہچان بھی گئے" تو اس کے متعدد ثبوت اسی زمانے میں مل گئے تھے۔ سب سے زیادہ معتبر شہادت ام المومنین حضرت صفیہؓ کی ہے جو خود ایک بڑے یہودی عالم کی بیٹی اور دوسرے عالم کی بھتیجی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو میرے باپ اور چچا دونوں آپؐ سے ملنے گئے۔ بڑی دیر تک آپؐ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے تو میں نے اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سُنا:

چچا: کیا واقعی یہ وہی نبی ہے جس کی خبریں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟

والد: خدا کی قسم ہاں۔

چچا: کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

والد: ہاں

چچا: پھر کیا ارادہ ہے؟

والد: جب تک جان میں جان ہے اس کی مخالفت کرونگا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔

(ابنِ ہشام۔ جلد دوم، صفحہ ۱۶۵، طبع جدید ۱۳۵۵ھ)

یہود کی معاندانہ فتنہ پردازیاں

اہلِ عرب بالعموم ناخواندہ لوگ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودیوں میں ویسے بھی تعلیم کا چرچا زیادہ تھا، اور انفرادی طور پر ان میں ایسے ایسے جلیل القدر علماء پائے جاتے تھے جن کی شہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے یہودیوں کا عربوں پر علمی رُعب بہت زیادہ تھا پھر ان کے علماء اور مشائخ نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان جما کر اور اپنی جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا کاروبار چلا کر اس رعب کو اور بھی باڈھ گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اہلِ مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے، کیونکہ ان کے آس پاس بڑے

بڑے یہودی قبائل آباد تھے، رات دن کا ان سے میل جول تھا، اور اس میل جول میں وہ اُن سے اسی طرح شدت کے ساتھ متاثر تھے جس طرح ایک ان پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدّن اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو فطرتی بات تھی کہ اَن پڑھ عرب اہل کتاب یہودیوں سے جا کر پوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں اور ایک کتاب کو مانتے ہیں، آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو ہمارے اندر نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھے ہیں ان کے متعلق اور ان کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلّم مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہودی علماء کے پاس جا جا کر یہی بات پوچھتے تھے مگر ان علماء نے لوگوں کو کبھی صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ توحید جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں غلط ہے، یا انبیاء اور کتب آسمانی اور ملائکہ اور آخرت کے بارے میں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس میں کوئی غلطی ہے، یا وہ اخلاقی اصول جن کی آپ تعلیم دے رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز غلط ہے، لیکن وہ صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں وہ صحیح ہے وہ نہ سچائی کی کھلی کھلی تردید کر سکتے تھے نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ہر سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف، آپ کی جماعت کے خلاف اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے، کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے تھے، کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں اور طرح طرح کے الجھن میں ڈال دینے والے سوالات چھیڑ دیتے تھے تاکہ لوگ ان میں خود بھی اُلجھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے پیروؤں کو بھی اُلجھانے کی کوشش کریں۔ ان کا یہی رویہ تھا جس کی بنا پر ان سے سورۂ بقرہ آیت ۴۲ میں فرمایا گیا ہے کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو، نہ جھوٹے پروپیگنڈے اور شریرانہ شبہات و اعتراضات سے حق کو دبانے اور چھپانے کی کوشش نہ کرو، اور حق و باطل کو خلط ملط کر کے دنیا کو دھوکہ نہ دو۔ لہ

لہ یہودیوں کی شرانگیزیوں کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ انہی کی دسیسہ کاریوں سے اسلامی جماعت میں منافقین پیدا ہوئے پھر انہوں نے حضورؐ کے خلاف ہر اہم موقع پر کوئی نہ کوئی شرارت اٹھائی، آپؐ کے قتل کے لیے بار بار کوششیں کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جنگ کے فیصلہ کن لمحوں میں تباہ کن تخریبی کاروائیاں کیں۔ یہودیوں کی ان شرانگیزیوں کا تذکرہ واقعات کے سلسلے میں مناسب مواقع پر آتا رہے گا۔ (مرتبین)

باب ۱۷

نصاریٰ اور عیسائیت

فصل ۱

عیسائیت کا ظہور اور نشو و نما

لفظ نصاریٰ کی تشریح

بعض لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ "نصاریٰ" کا لفظ "ناصرہ" سے ماخوذ ہے جو مسیح علیہ السّلام کا وطن تھا۔ دراصل اس کا ماخذ "نصرت" ہے اور اس کی بنا وہ قول ہے جو مسیح علیہ السّلام کے سوال مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں) کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ (ہم اللہ کے کام میں مددگار رہیں)۔ عیسائی مصنفین کو بالعموم محض ظاہری مشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ میں ناصریہ Nazarenes کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا اور جنہیں حقارت کے ساتھ ناصری اور ابیونی کہا جاتا تھا، انہی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے لیکن قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ انہوں نے خود کہا تھا کہ ہم "نصاریٰ" ہیں (آل عمران۔ ۵۲) اور یہ ظاہر ہے کہ عیسائیوں نے کبھی اپنا نام ناصری نہیں رکھا[۲۵۹]۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عیسیٰ علیہ السّلام نے اپنے پیرو‌وں کا نام کبھی "عیسائی" یا "مسیحی" نہیں رکھا تھا کیونکہ وہ اپنے نام سے کسی نئے مذہب کی بنا ڈالنے نہیں آئے تھے۔ ان کی دعوت اُسی دین کو تازہ کرنے کی طرف تھی جسے حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء علیہم السّلام لے کر آتے تھے۔ اس لیے انہوں نے عام بنی اسرائیل اور پیروان شریعت موسوی سے الگ نہ کوئی جماعت بنائی اور نہ اس کا کوئی مستقل نام رکھا۔ ان کے ابتدائی پیرو خود بھی نہ اپنے آپ کو اسرائیلی ملت سے الگ سمجھتے تھے، نہ ایک مستقل گروہ بن کر رہے، اور نہ انہوں نے اپنے لیے کوئی امتیازی نام اور نشان قرار دیا۔ وہ عام یہودیوں کے ساتھ بیت المقدس ہی کے ہیکل میں عبادت کرنے کے لیے جاتے تھے اور اپنے آپ کو موسوی شریعت ہی پر عمل کرنے کا پابند سمجھتے تھے (ملاحظہ ہو کتاب اعمال ۳: ۱۔ ۱۰: ۱۴۔۱۵: ۱، ۵۔ ۲۱: ۲۱)۔

عیسائیوں کی عامۂ بنی اسرائیل سے علیحدگی

آگے چل کر جدائی کا عمل دو جانب سے شروع ہوا۔ ایک طرف حضرت عیسیٰؑ کے پیرو‌وں میں سے پولس

(سینٹ پال) نے شریعت کی پابندی ختم کر کے یہ اعلان کر دیا کہ بس مسیحؑ پر ایمان لے آنا نجات کے لیے کافی ہے۔ اور دوسری طرف یہودی علماء نے پیروانِ مسیح کو ایک گمراہ فرقہ قرار دے کر عاقبت بنی اسرائیل سے کاٹ دیا لیکن اس جدائی کے باوجود ابتداءً اس نئے فرقے کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ خود پیروانِ مسیح اپنے لیے کبھی "شاگرد" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کبھی اپنے رفقاء کا ذکر "بھائیوں" (اخوان)، "ایمان والوں" (مؤمنین)، "جو ایمان لائے" (اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) اور "مقدسوں" کے الفاظ سے کرتے تھے۔ (کتاب اعمال ۲:۴۴-۴۷ ؛ ۴:۳۲ - ۹:۲۶ ؛ ۱۱:۲۹ ؛ ۱۲:۱۴ - ۵۲ ؛ ۱۵:۱-۲۳؛ رومیوں ۱۵:۲۵؛ کلسیوں ۱:۲)۔ بخلاف اس کے یہودی ان لوگوں کو کبھی "گلیلی" کہتے تھے اور کبھی "ناصریوں کا بدعتی فرقہ" کہہ کر پکارتے تھے (اعمال ۲۴:۵۔ لوقا ۱۳:۲)۔ یہ نام دھرنے کی کوشش انہوں نے ازراہِ طنز و تشنیع اس بنا پر کی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا وطن ناصرہ تھا اور وہ فلسطین کے ضلع گلیل میں واقع تھا لیکن یہ طنزیہ الفاظ اس حد تک رائج نہ ہو سکے کہ پیروانِ مسیح کے لیے نام کی حیثیت اختیار کر جاتے۔

ان کا نام "مسیحی" کیسے پڑا؟

اس گروہ کا موجودہ نام "مسیحی" (Christian) پہلی مرتبہ ۴۳ء یا ۴۴ء میں انطاکیہ کے مشرک باشندوں نے رکھا تھا جب کہ سینٹ پال اور برنباس نے وہاں پہنچ کر اپنے مذہب کی تبلیغ عام شروع کی (اعمال ۱۱:۲۶)۔ یہ نام بھی دراصل طنز و تمسخر کے طور پر مخالفین کی طرف سے رکھا گیا تھا، اور پیروانِ مسیح اسے خود اپنے نام کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن جب ان کے دشمنوں نے ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا تو ان کے لیڈروں نے کہا کہ اگر تمہیں مسیح کی طرف نسبت دے کر "مسیحی" کہا جاتا ہے تو تمہیں اس پر شرمانے کی کیا ضرورت ہے (۱۔ پطرس ۴:۱۶)۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ لوگ خود بھی اپنے آپ کو اسی نام سے موسوم کرنے لگے جس سے ان کے دشمنوں نے طنزاً انہیں موسوم کیا تھا، یہاں تک کہ آخر کار ان کے اندر سے یہ احساس ہی ختم ہو گیا کہ یہ دراصل بُرا لقب تھا جو انہیں دیا گیا تھا۔

قرآن مجید نے اسی لیے مسیحؑ کے ماننے والوں کو مسیحی یا عیسائی کے نام سے یاد نہیں کیا ہے۔ بلکہ انہیں یاد دلایا ہے کہ تم دراصل ان لوگوں کے نام لیوا ہو جنہیں عیسیٰؑ ابن مریمؑ نے پکارا تھا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ، کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری مدد کرے گا اور انہوں نے جواب دیا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ، ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں؟ اس لیے تم اپنی ابتدائی اور بنیادی حقیقت کے اعتبار سے نصارٰی یا انصار ہو لیکن آج عیسائی مشنری اس یاد دہانی پر قرآن کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اُلٹی شکایت کر رہے ہیں کہ قرآن نے ان کو مسیحی کہنے کے بجائے نصارٰی کے نام سے کیوں موسوم کیا ہے؟

عیسائیت کا زمانۂ ظہور

یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں "یہودیت" اپنے اس نام اور مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور عیسائیت جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آتے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسر ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے تو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء اور نیک لوگ جو ان مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے ظاہر ہے وہ "یہودیت" اور "عیسائیت" نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار اُن مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں بلکہ دراصل اس کا مدار اُس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے۔ جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدا کی صفات و خصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اُس راہِ راست سے منحرف ہو گئی ہیں جس پر حضرت ابراہیمؑ چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہو گئی ہے۔ [۴۵۸]

عیسائیوں کا حضرت عیسٰیؑ کو خدا قرار دینا

عیسائیوں نے ابتداءً مسیحؑ کی شخصیت کو انسانیت اور الوہیت کا مرکب قرار دے کر ایک ایسی غلطی کی تھی جس کے نتیجے میں ان کے لیے مسیحؑ کی حقیقت ایک معمّا بن کر رہ گئی۔ ان کے علماء نے لفاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے اس معمّے کو حل کرنے کی جتنی کوشش کی اتنے ہی زیادہ اُلجھتے چلے گئے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر اس مرکب شخصیت کے جزوِ انسانی نے غلبہ کیا اس نے مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا۔ اور جس کے ذہن پر جزوِ الوہیت کا اثر زیادہ غالب ہوا اس نے مسیحؑ کو اللہ کا جسمانی ظہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت ہی سے اس کی عبادت کی۔ ان کے درمیان بیچ کی راہ جنہوں نے نکالنی چاہی انہوں نے سارا زور ایسی لفظی تعبیریں فراہم کرنے پر صرف کر دیا جن سے مسیحؑ کو انسان بھی کہا جاتا رہے اور اس کے ساتھ خدا بھی سمجھا جا سکے۔ خدا اور مسیحؑ الگ الگ بھی ہوں اور پھر ایک بھی رہیں۔ [۴۵۹]

حضرت عیسیٰؑ کے کلمۃ اللہ ہونے کا مفہوم

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ (النساء، آیت ۱۷۱)

"مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا"

اصل میں لفظ "کلمہ" استعمال ہوا ہے۔ مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مریم علیہا السلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ وہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کر لے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح علیہ السلام کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا، مگر انہوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو "کلام" یا "نطق" (Logos) کا ہم معنی سمجھ لیا پھر اس کلام و نطق سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

عقیدۂ تثلیث

سورۃ نساء کی آیت ۱۷۱ میں حضرت مسیح کو رُوحٌ مِّنْهُ (خدا کی طرف سے ایک روح) کہا گیا ہے اور سورۃ البقرہ میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (ہم نے پاک روح سے مسیح کی مدد کی) دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی۔ سراسر حقانیت اور راست بازی تھی اور از سرتاپا فضیلت اخلاق تھی۔ یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی مگر انہوں نے اس میں بھی غلو کیا۔ روح من اللہ کو عین روح اللہ قرار دے لیا اور روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ کی اپنی روح مقدس تھی جو مسیح کے اندر حلول کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور مسیح کے ساتھ ایک تیسرا خدا روح القدس کو بنا ڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ آج بھی انجیل متی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ "فرشتے نے اسے یعنی یوسف نجار کو خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابن داؤد، اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر، کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے" (باب ۱ آیت ۲۰) الخ

حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ان کے لیے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اصل دین ہے۔

مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتدا میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلام اللہ نے مسیحؑ کی شکل میں ظہور کیا اور روح اللہ نے اس میں حلول کیا، اس کی وجہ سے انہوں نے مسیحؑ اور روح القدس کی اُلوہیت کو بھی خداوند عالم کی اُلوہیت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ اپنے اُوپر لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ایک ناقابلِ حل چیستان بن گیا کہ عقیدۂ توحید کے باوجود عقیدۂ تثلیث کو، اور عقیدۂ تثلیث کے باوجود عقیدۂ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ۱۸ سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں۔ اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے ہیں۔ اسی پر ان کے سارے علم کلام کا زور صرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی نہ اُس کے بھیجے ہوئے مسیحؑ نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف اُن کے غلُو نے پیدا کیا ہے اس کا صرف یہی حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں، مسیحؑ اور روح القدس کی اُلوہیت کا تخیل چھوڑ دیں، صرف اللہ کو اِلٰہ واحد تسلیم کر لیں اور مسیحؑ کو صرف اس کا پیغمبر قرار دیں نہ کہ کسی طور پر شریک فی الالُوہیت۔ ؎۴۲

شرک اور اولیاء پرستی

پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیاء پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا۔ بزرگوں کے آستانے پوجے جا رہے تھے۔ اور مسیحؑ، مریمؑ اور حواریوں کے مجسمے گرجوں میں رکھے جا رہے تھے۔ اصحابِ کہف کے بعث سے چند ہی سال پہلے ۴۳۱ء میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی افسوس کے مقام پر منعقد ہو چکی تھی جس میں مسیح علیہ السلام کی اُلوہیت اور حضرت مریمؑ کے "مادرِ خدا" ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ "الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ" سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچے پیروانِ مسیحؑ کے مقابلے میں اُس وقت عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہ کار بنے ہوئے تھے۔ اور مذہبی و سیاسی امور کی باگیں جن کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہی لوگ دراصل شرک کے علمبردار تھے۔ اور انہوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحابِ کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنایا جائے۔ ؎۴۳

موجودہ عیسائیت اور سینٹ پال

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے

؎ یہ الفاظ سورۂ کہف کی آیت نمبر ۲۱ میں وارد ہوئے ہیں اور فاضل مؤلف نے انہیں شرک اور قبر پرستی کے علمبردار علماء کا قول قرار دیا ہے

تھے۔ عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح تسلیم کرکے ان پر ایمان لاتے تھے اور وہ ان کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اس جماعت میں داخل ہُوا تو اس نے رُومیوں، یونانیوں اور دوسرے غیر یہُودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی، اور اس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد اور اصول اور احکام اُس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے پیش کیا تھا۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰؑ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی بلکہ اُن کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیروؤں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہو کر اس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا اُس وقت بھی اس نے حضرت عیسیٰؑ کے کسی قول کی سند نہیں پیش کی بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا۔ اس نئے دین کی تشکیل میں اُس کے پیشِ نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہُودی (Gentile) دنیا قبول کر لے۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی شریعتِ یہُود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام و حلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے ختنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا جو غیر یہُودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا۔ حتیٰ کہ اس نے مسیحؑ کی اُلُوہیت اور اُن کے ابنِ خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر اولادِ آدمؑ کے پیدائشی گناہ کا کفارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت مناسبت رکھتا تھا۔ مسیحؑ کے ابتدائی پیروؤں نے اِن بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے غیر یہُودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھیر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیحؑ کے اُلُوہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔

پولوسی عقاید چھا گئے

مگر چوتھی صدی کے آغاز (۳۲۵ء) میں نیقیہ (Nicaea) کی کونسل نے پولوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مستقل مذہب قرار دے دیا۔ پھر رُومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈوسیس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں، مردود قرار دے دی جاتیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھیرائی جاتیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس (Athanasius) کے ایک خط کے ذریعے معتبر و مسلّم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا۔ پھر اس کی توثیق ۳۸۲ء میں پوپ ڈیماسیس (Damasius) کے زیر صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس (Gelasius)

نے اس مجموعہ کو مُسلّم قرار دینے کے ساتھ ساتھ اُن کتابوں کی ایک فہرست مرتّب کر دی جو غیر مسلّم تھیں حالانکہ جن پولوسی عقائد کو بنیاد بنا کر مذہبی کتابوں کے مُعتبر اور غیر معتبر ہونے کا یہ فیصلہ کیا گیا تھا، ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کر سکا ہے کہ اُن میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے دی تھی بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰؑ کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔ ~~

رہبانیّت کا ظہُور اور اس کے اسباب

حضرت عیسیٰؑ کے بعد دو سو سال تک عیسائی کلیسا رہبانیت سے نا آشنا تھا۔ مگر ابتدا ہی سے مسیحیت (تحریف شدہ) میں اس کے جراثیم پائے جاتے تھے اور وہ تخیّلات اس کے اندر موجود تھے جو اس چیز کو جنم دیتے تھے۔ ترک و تجرید کو اخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھنا ہی رہبانیت کی بنیاد ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں مسیحیت میں ابتدا سے موجود تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ تجرّد کو تقدّس کا ہم معنی سمجھنے کی وجہ سے کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے لیے یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھی کہ وہ شادی کریں، بال بچوں والے ہوں اور خانہ داری کے بکھیڑوں میں پڑیں۔ اس چیز نے تیسری صدی تک پہنچتے پہنچتے ایک فتنے کی شکل اختیار کر لی، اور رہبانیت ایک وبا کی طرح مسیحیت میں پھیلنی شروع ہوئی۔

تین اسباب

تاریخی طور پر اس کے تین بڑے اسباب تھے:

ایک یہ کہ قدیم مُشرک سوسائٹی میں شہوانیت، بدکرداری اور دنیا پرستی جس شدّت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی اس کا توڑ کرنے کے لیے عیسائی علماء نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے بجائے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی۔ انہوں نے عفّت پر اتنا زور دیا کہ عورت و مرد کا تعلق بجائے خود نجس قرار پا گیا خواہ وہ نکاح کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔[1] انہوں نے دنیا پرستی کے خلاف اتنی شدّت برتی کہ آخر کار ایک دیندار آدمی کے لیے سرے سے کسی قسم کی اَملاک رکھنا ہی گناہ بن گیا اور اخلاق کا معیار یہ ہو گیا کہ آدمی بالکل مُفلس اور ہر لحاظ سے تارکِ دنیا

---

[1] آج اسی انتہا پسندی کا ردِّ عمل یہ دوسری انتہا پسندی ہے کہ عورت و مرد کے درمیان نکاح کے دائرے کے باہر بھی جنسی تعلق کی کھلی چھوٹ ہے، اور اب اس تعلق میں کسی اہتمام رازداری کی ضرورت بھی نہیں۔ (مرتّبین)

ہو۔ اسی طرح مشرک سوسائٹی کی لذت پرستی کے جواب میں وہ اس انتہا تک جا پہنچے کہ ترکِ لذات، نفس کو مارنا اور خواہشات کا قلع قمع کر دینا اخلاق کا مقصود بن گیا۔ اور طرح طرح کی ریاضتوں سے جسم کو اذیتیں دینا روحانیت کا کمال اور اس کا ثبوت سمجھا جانے لگا۔

دوسرے یہ کہ مسیحیت جب کامیابی کے دور میں داخل ہو کر عوام میں پھیلنی شروع ہوئی تو اپنے مذہب کی توسیع و اشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اُس بُرائی کو اپنے دائرے میں داخل کرتا چلا گیا جو عام لوگوں میں مقبول تھی۔ اولیاء پرستی نے قدیم بُتوں کی جگہ لے لی۔ حورس (Horus) اور آئسیس (Isis) کے مجسّموں کی جگہ مسیح اور مریم کے بُت پُوجے جانے لگے۔ سیٹرنیلیا (Saturnalia) کی جگہ کرسمس کا تہوار منایا جانے لگا۔ قدیم زمانے کے تعویذ گنڈے، عملیات، فال گیری، غیب گوئی اور جِن بھوت بھگانے کے عمل سب عیسائی درویشوں نے شروع کر دیئے۔

اسی طرح چونکہ عوام اُس شخص کو خدا رسیدہ سمجھتے تھے جو گندا اور ننگا ہو اور کسی بھٹ یا کھوہ میں رہے، اس لیے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصوّر مقبول ہو گیا اور ایسے ہی لوگوں کی کرامتوں کے قصّوں سے عیسائیوں کے ہاں تذکرۃ الاولیاء قسم کی کتابیں تیار ہو گئیں۔

تیسرے یہ کہ عیسائیوں کے پاس دین کی سرحدیں متعین کرنے کے لیے کوئی مفصّل شریعت اور کوئی واضح سُنّت موجود نہ تھی۔ شریعتِ موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے، اور تنہا انجیل کے اندر کوئی مکمّل ہدایت نامہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس لیے مسیحی علماء کچھ باہر کے فلسفوں اور طور طریقوں سے متأثر ہو کر اور کچھ خود اپنے رُجحانات کی بنا پر طرح طرح کی بدعتیں دین میں داخل کرتے چلے گئے۔ رہبانیت بھی انہی بدعتوں میں سے ایک تھی۔

رہبانیت کے مآخذ اور اس کے قائدین

مسیحی مذہب کے علماء اور ائمہ نے اس کا فلسفہ اور اس کا طریق کار بُدھ مت کے بھکشوؤں سے، ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں سے اور قدیم مصری فقراء (Anchorites) سے، ایران کے مانویوں اور افلاطون اور فلاطینوس کے پیرو اشراقیوں سے اخذ کیا۔ اور اسی کو تزکیۂ نفس کا طریقہ، روحانی ترقی کا ذریعہ اور تقرّب الی اللہ کا وسیلہ قرار دے لیا تھا۔

اس غلطی کے مرتکب کوئی معمولی درجے کے لوگ نہ تھے۔ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک (یعنی نزولِ قرآن کے زمانے تک)، جو لوگ مشرق اور مغرب میں مسیحیت کے اکابر علماء، بزرگ ترین پیشوا اور امام مانے جاتے ہیں ـــ سینٹ اتھاناسیوس، سینٹ باسل، سینٹ گریگوری، سینٹ نازیانزین، سینٹ سرائی سوسٹم، سینٹ ایمبروز، سینٹ جیروم، سینٹ آگسٹائن، سینٹ بینیڈکٹ، گریگوری اعظم ـــ

سب کے سب خود راہب اور رہبانیت کے زبردست علمبردار تھے۔ انہی کی کوششوں سے کلیسا میں رہبانیت نے رواج پایا۔

پہلا راہب اور پہلی خانقاہ

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز مصر سے ہوا۔ اس کا بانی سینٹ اینتھنی St. Anthonw تھا جو ۲۵۰ء میں پیدا ہوا اور ۳۵۰ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔ اسے پہلا مسیحی راہب قرار دیا جاتا ہے۔ اُس نے فیوم کے علاقے میں پسپیر کے مقام پر جو اب دیر المیمون کے نام سے معروف ہے پہلی خانقاہ قائم کی۔ اس کے بعد دوسری خانقاہ اس نے بحر احمر کے ساحل پر قائم کی جسے اب دیر مار انطونیوس کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں رہبانیت کے بنیادی قواعد اسی کی تحریروں اور ہدایات سے ماخوذ ہیں۔

جا بجا خانقاہوں کا قیام

اس آغاز کے بعد یہ سلسلہ مصر میں سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور راہبات کے لیے خانقاہیں قائم ہو گئیں جن میں بعض میں تین تین ہزار راہب بیک وقت رہتے تھے۔ ۳۲۵ء میں مصر ہی کے اندر ایک مسیحی ولی پاخومیوس نمودار ہوا جس نے دس بڑی خانقاہیں راہبوں اور راہبات کے لیے بنائیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ شام و فلسطین اور افریقہ و یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیلتا چلا گیا۔ کلیسائی نظام کو اول اول اس رہبانیت کے معاملے میں سخت الجھن سے سابقہ پیش آیا کیونکہ وہ ترک دنیا اور تجرد اور غریبی و مفلسی کو روحانی زندگی کا آئیڈیل تو سمجھتا تھا مگر راہبوں کی طرح شادی بیاہ اور اولاد پیدا کرنے اور ملکیت رکھنے کو گناہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ بالآخر سینٹ اتھاناسیوس (متوفی ۳۷۳ء) اور سینٹ باسل (متوفی ۳۷۹ء) اور سینٹ آگسٹائن (متوفی ۴۳۰ء) اور گریگوری اعظم (متوفی ۶۰۴ء) جیسے لوگوں کے اثر سے رہبانیت کے بہت سے قواعد چرچ کے نظام میں باقاعدہ داخل ہو گئے۔

سلسلۂ رہبانیت کی خصوصیات

اس راہبانہ بدعت کی چند خصوصیات تھیں جن کو ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

۱۔ سخت ریاضتوں اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کو اذیتیں دینا ان کی اولین خصوصیت تھی

۲۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ہر وقت گندے رہتے تھے اور صفائی سے سخت پرہیز کرتے تھے نہانا یا جسم کو پانی لگانا ان کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا۔ جسم کی صفائی کو وہ روح کی نجاست سمجھتے تھے۔

؎ مؤلف کے مختصر بیان سے ہم نے عبرتناک مثالیں اور دلچسپ تفصیلات سے ساقط کر کے مزید تلخیص کر دی ہے (مرتبین)

۳- اس رہبانیت نے ازدواجی زندگی کو عملاً بالکل حرام کر دیا اور نکاح کے رشتے کو کاٹ پھینکنے میں سخت بیدردی سے کام لیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی کی تمام تحریریں اس خیال سے بھری ہوئی ہیں کہ تجرد سب سے بڑی اخلاقی قدر ہے اور عفت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی جنسی تعلق سے قطعی احتراز کرے، خواہ وہ میاں اور بیوی کا تعلق ہی کیوں نہ ہو۔ پاکیزہ زندگی کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنے نفس کو بالکل مار دے اور اس میں جسمانی لذت کی کوئی خواہش تک باقی نہ چھوڑے۔ ان لوگوں کے نزدیک خواہش کو مار دینا اس لیے ضروری تھا کہ اس سے حیوانیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ ان کے نزدیک لذت اور گناہ ہم معنی تھے، حتیٰ کہ مسرت بھی ان کی نگاہ میں خدا فراموشی کے مترادف تھی۔ سینٹ باسل ہنسنے اور مسکرانے تک کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ انہی تصورات کی بنا پر عورت اور مرد کے درمیان شادی کا تعلق ان کے ہاں قطعی نجس قرار پا گیا تھا۔ راہب کے لیے ضروری تھا کہ وہ شادی کرنا تو درکنار، عورت کی شکل تک نہ دیکھے، اور اگر شادی شدہ ہو تو بیوی کو چھوڑ کر نکل جائے۔ مردوں کی طرح عورتوں کے دل میں بھی یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ وہ اگر آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ کنواری رہیں، اور شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہر سے الگ ہو جائیں۔ سینٹ جیروم جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ جو عورت مسیح کی خاطر راہبہ بن کر ساری عمر کنواری رہتی ہے وہ مسیح کی دلہن ہے اور اس عورت کی ماں کو خدا یعنی مسیح کی ساس (Mother in law of God) ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک اور مقام پر سینٹ جیروم کہتا ہے کہ "عفت کی کلہاڑی سے ازدواجی تعلق کی لکڑی کو کاٹ پھینکنا سالک کا اولین کام ہے۔" ان تعلیمات کی وجہ سے مذہبی جذبہ طاری ہونے کے بعد ایک مسیحی مرد یا ایک مسیحی عورت پر اس کا پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کی خوشگوار ازدواجی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی تھی۔

کلیسا کا نظام تین صدیوں تک اپنے حدود میں ان انتہاپسندانہ تصورات کی کسی نہ کسی طرح مزاحمت کرتا رہا۔ . . . . رفتہ رفتہ چوتھی صدی میں یہ خیال پوری طرح زور پکڑ گیا کہ جو شخص کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دیتا ہو اس کے لیے شادی شدہ ہونا بڑی گھناؤنی بات ہے۔ ۳۶۲ء کی گنگرا کونسل (Council of Gangra) آخری مجلس تھی جس میں اس طرح کے خیالات کو خلافِ مذہب ٹھیرایا گیا۔ مگر اس کے تھوڑی ہی مدت بعد ۳۸۶ء کی رومن سینوڈ (Roman Synod) نے تمام پادریوں کو مشورہ دیا کہ وہ ازدواجی تعلقات سے کنارہ کش رہیں، اور دوسرے سال پوپ سائیریسیس (Siricius) نے حکم دے دیا کہ جو پادری شادی کرے، یا شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنی بیوی سے تعلق رکھے اس کو منصب سے معزول کر دیا جائے۔

۴- سب سے زیادہ دردناک باب اس رہبانیت کا یہ ہے کہ اس نے ماں باپ، بھائی بہنوں اور اولاد

تک سے آدمی کا رشتہ کاٹ دیا۔ مسیحی ولیوں کی نگاہ میں بیٹے کے لیے ماں باپ کی محبت، بھائی کے لیے بھائی بہنوں کی محبت اور باپ کے لیے اولاد کی محبت بھی ایک گناہ تھی۔ ان کے نزدیک رُوحانی ترقی کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ آدمی ان سارے تعلقات کو توڑ دے۔ (مثالیں ترک کر دی گئیں)

مسیحی رہبانیت کا نقطۂ نظر ان معاملات میں یہ تھا کہ جو شخص خدا کی محبت چاہتا ہو وہ اسے انسانی محبت کی وہ ساری زنجیریں کاٹ دینی چاہییں جو دنیا میں اس کو اپنے والدین، بھائی بہنوں اور بال بچوں کے ساتھ باندھتی ہیں۔

۵۔ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ بے رحمی، سنگدلی اور قساوت برتنے کی جو مشق یہ لوگ کرتے تھے اس کی وجہ سے ان کے انسانی جذبات مرجاتے تھے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے انہیں مذہبی اختلاف ہوتا ان کے مقابلے میں یہ ظلم و ستم کی انتہا کر دیتے تھے۔ چوتھی صدی تک پہنچتے پہنچتے مسیحیت میں ۸۰، ۹۰ فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ سینٹ آگسٹائن نے اپنے زمانے میں ۸۸ فرقے گنائے ہیں یہ فرقے ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت رکھتے تھے۔ اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راہب تھے اور اس میں مخالف گروہوں کو جلا کر خاک کر دینے کی کوششوں میں بھی راہب ہی پیش پیش ہوتے تھے اسکندریہ اس فرقہ وارانہ کشمکش کا بڑا اکھاڑا تھا۔ (ان فرقہ وارانہ تصادموں کی دردناک مثالیں حذف کر دی گئیں)

۶۔ اس ترک و تجرد اور فقر و درویشی کے ساتھ دولت دنیا سمیٹنے میں بھی کمی نہ کی گئی۔ پانچویں صدی کے آغاز میں یہ حالت ہو چکی تھی کہ رُوم کا بشپ بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تھی تو اس کے ٹھاٹھ باٹھ قیصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے . . . . . خانقاہوں اور کلیسوں کی طرف دولت کا بہاؤ ساتویں صدی (نزولِ قرآن کے زمانے) تک پہنچتے پہنچتے سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا . . . . . خاص طور پر جو چیز اس تنزل کی موجب ہوئی وہ یہ تھی کہ راہبوں کی غیر معمولی ریاضتیں اور ان کی نفس کشی کے کمالات دیکھ کر جب عوام میں اُن کے لیے بے پناہ عقیدت پیدا ہو گئی تو بہت سے دنیا پرست لوگ لباس درویشی پہن کر راہبوں کے گروہ میں داخل ہو گئے اور انہوں نے ترک دنیا کے بھیس میں جلب دنیا کا کاروبار ایسا چمکایا کہ بڑے بڑے طالبین دنیا اُن سے مات کھا گئے۔

۷۔ عفت کے معاملہ میں بھی فطرت سے لڑ کر رہبانیت نے بار بار شکست کھائی۔ . . . . . خانقاہوں میں نفس کشی کی کچھ مشقیں ایسی بھی تھیں جن میں راہب اور راہبات مل کر ایک جگہ ہی رہتے تھے اور بعض اوقات زرا زیادہ مشق کرنے کے لیے ایک ہی بستر میں رات گزارتے تھے۔ (نفس کشی کا کمال حاصل کرنے والے عورتوں کے ساتھ مل کر نہاتے اور ان کی دید، ان کے لمس اور ان کی ہم آغوشی سے بھی فطرت ان پر غلبہ نہ پا سکتی . . . . .) انسانی فطرت اُن لوگوں سے انتقام لیے بغیر نہیں رہتی جو اس سے جنگ کریں۔ رہبانیت اس سے لڑ کر بالآخر

بداخلاقی کے جس گڑھے میں جا گری اس کی داستان آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی عیسوی تک کی مذہبی تاریخ کا بدنما ترین داغ ہے ...... قرون متوسطہ کے مصنفین کی کتابیں ان شکایتوں سے بھری ہوئی ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں بداخلاقی کے چکلے بن گئی ہیں ان کی چار دیواریوں میں نوزائیدہ بچوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ پادریوں اور چرچ کے مذہبی کارکنوں میں محرمات تک سے ناجائز تعلقات اور خانقاہوں میں خلاف وضع فطری جرائم تک پھیل گئے ہیں۔[۳۶۵]

فصل ۲

انجیلی صحائف کی تاریخی حیثیت

[یہودیوں کی طرح عیسائیوں کے ہاں بھی الہامی کتاب ہدایت محفوظ نہیں رہ سکی۔ اسی وجہ سے دین میں تحریف کے راستے سے غلط عقاید و احکام داخل ہوئے۔ اصل انجیل اگر محفوظ ہوتی تو عیسائیت اپنی موجودہ شکل میں ظہور نہ پا سکتی۔ ذیل میں اناجیل کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحقیق پیش کی جا رہی ہے۔ (مرتبین)]

ماخذ کی تحقیق

آج ہم جس مجموعہ کو انجیل کہتے ہیں وہ دراصل چار بڑے صحیفوں پر مشتمل ہے، متی، مرقس، لوقا، یوحنا۔ لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ بھی حضرت عیسیٰ کا نہیں ہے۔ جس طرح قرآن مجید میں وہ تمام منزل من اللہ آیات اور سورتیں جمع ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی تھیں اس طرح کسی کتاب میں وہ وحیاں ہم کو کجا نہیں ملتیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتی تھیں۔ پھر وہ مواعظ و نصائح بھی ہم کو خود حضرت عیسیٰ کے اپنے الفاظ میں کہیں نہیں ملتے جو انہوں نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے زمانہ میں مختلف مواقع پر ارشاد فرماتے تھے۔ یہ صحیفے جو ہم تک پہنچے ہیں نہ خدا کا کلام ہیں نہ حضرت عیسیٰ کا، بلکہ وہ دراصل حضرت عیسیٰ کے حواریوں بلکہ حواریوں کے بھی شاگردوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جن میں ان لوگوں نے اپنے اپنے علم و فہم کے مطابق حضرت کے حالات اور ان کی تعلیمات کو جمع کیا ہے۔

متی سے منسوب نسخہ

لیکن یہ کتابیں خود اس قدر مجہول الاصل ہیں کہ ان پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی کتاب مسیح کے حواری متی کی طرف منسوب ہے اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ متی کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ متی کی اصل کتاب جس کا نام لوجیا (Logia) تھا، مفقود ہے۔ جو کتاب متی کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس کا مصنف کوئی گمنام شخص ہے جس نے دوسری کتابوں کے ساتھ لوجیا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ خود متی کا ذکر اس میں اس

طرح کیا گیا ہے جیسے کسی غیر آدمی کا کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر مرقس کی انجیل سے ماخوذ ہے کیونکہ اس کی ۱۰۶۰ آیات میں سے ۶۰۰ بعینہٖ وہی ہیں جو مرقس کی انجیل میں آئی ہیں۔ حالانکہ اگر اس کا مصنف حواری ہوتا تو اس کو ایک ایسے شخص کی کتاب سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہ تھی جو نہ حواری تھا اور نہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی ملا تھا۔ مسیحی علماء کا خیال ہے کہ یہ کتاب سنہ ۶۵ء میں یعنی مسیحؑ سے ۴۱ برس بعد لکھی گئی ہے اور بعض کا خیال ہے کہ سنہ ۹۰ء کی تصنیف ہے۔

مرقس سے منسوب نسخہ

دوسری کتاب مرقس کی طرف منسوب ہے اور عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرقس خود ہی اس کا مصنف ہے۔ لیکن یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی نہیں ملا اور نہ اُن کا مرید ہوا۔[1] وہ دراصل پطرس حواری (St. Peters) کا مرید تھا اور جو کچھ اُن سے سنتا تھا اسے یونانی زبان میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے عیسائی مصنفین اس کو عموماً "پطرس کا ترجمان" کہا کرتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب سنہ ۶۰ء اور سنہ ۷۰ء کے درمیان کسی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

لُوقا سے منسوب نسخہ

تیسری کتاب لُوقا کی طرف منسوب ہے اور یہ بالکل مسلّم ہے کہ لُوقا نے کبھی مسیحؑ کو نہیں دیکھا اور نہ ان سے استفادہ کیا۔ وہ پولوس (St. Paul) کا مرید تھا، ہمیشہ اُسی کی صحبت میں رہا اور اُس نے اپنی انجیل میں اُسی کے خیالات کی ترجمانی کی۔ چنانچہ خود پولوس اس کی انجیل کو اپنی انجیل کہتا ہے۔ لیکن یہ ثابت ہے کہ سینٹ پال خود بھی مسیحؑ کی صحبت سے محروم تھا اور مسیحی روایات کے مطابق واقعۂ صلیب کے ۷ برس بعد اِس مذہب میں داخل ہوا۔ اِس لیے لُوقا اور مسیحؑ کے درمیان سلسلۂ روایت کی ایک کڑی بالکل غائب ہے۔ انجیل لُوقا کی تاریخ تحریر بھی متعین نہیں ہے۔ بعض اس کو سنہ ۸۰ء کی تصنیف بتاتے ہیں اور بعض سنہ ۶۳ء کی۔ مگر ہارنک، میکگفرٹ اور پلومر جیسے محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ سنہ ۶۳ء سے پہلے نہیں لکھی گئی۔

متی باب ۹ آیت ۹ میں لکھا ہے:

"یسُوع نے وہاں سے آگے بڑھ کر متی نام ایک شخص کو محصول کی چوکی پر دیکھا"۔ ظاہر ہے کہ مصنف خود اپنا تذکرہ اس طرح نہیں کر سکتا تھا۔

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دیتے جانے کے وقت وہ تماشائی کی حیثیت سے موجود تھا مگر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (مؤلف)

یوحنّا سے منسوب نسخہ

چوتھی کتاب جو یوحنّا کی انجیل کہلاتی ہے جدید تحقیقات کے مطابق مشہور یوحنّا حواری کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ کسی اور مجہول الاحوال شخص کی ہے جس کا نام یوحنّا تھا۔ یہ کتاب مسیح سے بہت بعد سنہ ۹۰ء میں یا اس کے بھی بعد لکھی گئی ہے۔ یا کم از کم اس مدت کو سنہ ۱۱۰ء تک بڑھا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں سے کسی ایک کا سلسلہ بھی مسیح تک نہیں پہنچتا اور ان کی سند پر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مسیح نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا۔ لیکن زیادہ عمیق تحقیقات سے ان کتابوں کی دستاویزی حیثیت اور بھی زیادہ مشکوک ہو جاتی ہے۔

اناجیل کے غیر مستند ہونے کے چھ وجوہ

اوّلاً چاروں انجیلوں کے بیانات میں اختلاف ہے، حتیٰ کہ پہاڑی کے وعظ کو بھی، جو مسیحی تعلیم کا اصل الاصول ہے، متی، مرقس اور لوقا تینوں نے مختلف اور متضاد طریقوں سے بیان کیا ہے۔

ثانیاً، چاروں انجیلوں میں ان کے مصنّفین کے خیالات و تأثرات صاف طور پر نمایاں ہیں۔ متی کے مخاطب یہودی معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان پر اتمامِ حجت کرتا نظر آتا ہے۔ مرقس کے مخاطب رومی ہیں اور وہ ان کو اسرائیلیات سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔ لوقا سینٹ پال کا وکیل ہے اور دوسرے حواریوں کے خلاف اس کے دعاوی کی تائید کرنا چاہتا ہے۔ یوحنّا ان فلسفیانہ خیالات سے متاثر نظر آتا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں مسیحیوں کے درمیان پھیل گئے تھے۔ اس طرح ان چاروں انجیلوں کے درمیان معنوی اختلاف، لفظی اختلاف سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

ثالثاً، اناجیل سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں، حالانکہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے تمام حواریوں کی زبان سُریانی تھی۔ زبان کے اختلاف سے خیالات کی تعبیر میں اختلاف ہو جانا قدرتی بات ہے۔

رابعاً، اناجیل کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش دوسری صدی عیسوی سے پہلے نہیں کی گئی۔ سن ۱۵۰ء تک عام خیال یہ تھا کہ زبانی روایت تحریر سے زیادہ مفید ہے۔ دوسری صدی کے آخر میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا لیکن اس زمانہ کی تحریروں کو مستند نہیں سمجھا جاتا۔ "عہدِ جدید" (New Testament) کا پہلا مستند متن قرطاجنہ کی کونسل میں منظور کیا گیا جو سنہ ۳۹۷ء میں منعقد ہوئی تھی۔

خامساً اناجیل کا قدیم ترین نسخہ جو اس وقت دنیا میں موجود ہے، چوتھی صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔ دوسرا نسخہ پانچویں صدی کا اور تیسرا ناقص نسخہ بھی جو پاپائے روم کے کتب خانہ میں ہے، چوتھی صدی سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ پس یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلی تین صدیوں میں جو انجیلیں رائج تھیں ان سے موجودہ اناجیل کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں۔

سادساً، اناجیل کو قرآن کی طرح حفظ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کی اشاعت کا انحصار ابتداءً روایت بالمعنی پر رہا جس میں حافظے کے اختلال اور راویوں کے ذاتی خیالات کا اثر آنا قدرتی امر ہے بعد میں جب کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ نقل نویسوں کے رحم پر تھا۔ نقل کرتے وقت ہر شخص کے لیے آسان تھا کہ جس چیز کو اپنے عقائد کے خلاف دیکھے حذف کر دے اور جس کی کمی پائے بڑھا دے۔[۱]

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اناجیلِ اربعہ میں ہم کو مسیح کی اصل تعلیم ملتی ہے۔

---

[۱] یہ پوری بحث ذیل کی کتابوں سے ماخوذ ہے:

Dumellow, Commentary on the Holy Bible.

T. K. Cheyne, Encyclopaedia Biblica.

Millman, History of Christianity.

فصل ۳

حضرت عیسیٰ کی حقیقی تعلیمات

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کا بہترین ریکارڈ

. . . حضرت عیسیٰؑ کے صحیح حالات اور آپ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا بھی معتبر ذریعہ وہ چار انجیلیں نہیں ہیں جن کو مسیحی کلیسا نے معتبر و مُسلّم اناجیل (Canonical Gospels) قرار دے رکھا ہے۔ بلکہ اُس کا زیادہ قابل اعتماد ذریعہ انجیل برناباس ہے جسے کلیسا غیر قانونی اور مشکوک الصحت (Apocryphal) کہتا ہے اور عیسائیوں نے اسے چھپانے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ صدیوں تک یہ دُنیا سے ناپید رہی ہے[1]۔

مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ انگریزی ترجمہ کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، اور مَیں نے اسے لفظ بلفظ پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ کتاب ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے عیسائیوں نے محض

---

[1] سولھویں صدی میں اس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سکسٹس (Sixtus) کے کتب خانے میں پایا جاتا تھا، اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ لگا۔ پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرتا ہوا ۱۷۳۸ء میں ویانا کی امپیریل لائبریری میں پہنچ گیا۔ ۱۹۰۷ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس میں شائع ہو گیا تھا، مگر غالباً اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دنیا میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ کتاب تو اُس مذہب کی جڑ ہی کاٹے دے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰؑ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے مطبوعہ نسخے کسی خاص تدبیر سے غائب کر دیئے گئے، اور پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آسکی۔ (یہ ہے مغرب کی علمی کشادہ ظرفی کا حال کہ ایک کتاب کو محض تحقیق کی خاطر یا بحیثیت تاریخی ریکارڈ کے بھی موجود نہیں رہنے دیا گیا۔ مرتبین)۔ دوسرا ایک نسخہ اسی اطالوی ترجمہ سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہوا اٹھارویں صدی میں پایا جاتا تھا جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مگر وہ بھی کہیں غائب کر دیا گیا۔ اور آج اس کا بھی کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ (مؤلف)

تعصّب[1] اور ضد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

بائبل میں جو چار وں انجیلیں قانونی اور معتبر قرار دے کر شامل کر دی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسٰیؑ کا صحابی نہ تھا، اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ اُس نے آنحضرت کے صحابیوں سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہیں۔ جن ذرائع سے ان لوگوں نے معلومات حاصل کی ہیں ان کا کوئی حوالہ انہوں نے نہیں دیا ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ راوی نے خود وہ واقعات دیکھے اور اقوال سُنے ہیں جنہیں وہ بیان کر رہا ہے یا ایک یا چند واسطوں سے یہ باتیں اسے پہنچی ہیں[2]۔ بخلاف اس کے انجیل برنا باس کا مصنّف کہتا ہے

---

[1] مسیحی لٹریچر میں جہاں کہیں اس انجیل کا ذکر آتا ہے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برنا باس کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صرف اس بنا پر بول دیا گیا ہے کہ اس میں جگہ جگہ بصراحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اوّل تو اس انجیل کو پڑھنے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے، اگر یہ کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت سے پھیلی ہوتی، اور علمائے اسلام کی تصنیفات میں بکثرت اس کا ذکر پایا جاتا۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی مقدمۂ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک کا علم نہ تھا۔ طبری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابنِ حزم اور دوسرے مصنّفین جو مسلمانوں میں مسیحی لٹریچر پر اطلاع رکھنے والے تھے ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل برنا باس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں، ان کی بہترین فہرستیں ابن ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ہیں۔ اور وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برنا باس کا نام تک نہیں لیا ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے ۷۵ سال پہلے گلاسیس اوّل (Gelasius) کے زمانے میں جن کتابوں کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا ان میں انجیل برنا باس (Evangelium Barnabe) بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت کونسا مسلمان تھا جس نے یہ جعلی انجیل تیار کی تھی؟ (مؤلف)

[2] مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہار الحق کے مشرح ترجمے میں مستند انجیلوں کے مندرجات میں ۱۲۴ اختلافات اور ۱۱۰ غلطیاں برآمد کر کے پیش کی گئی ہیں، نیز اناجیل اور متعلقہ خطوں اور نوشتوں میں سے مختلف کی صحت یا الہامی حیثیت کا انکار کرنے والوں میں بے شمار عیسائی اکابر اور ادارے شامل ہیں (ملاحظہ ہو: انجیل سے قرآن تک، ج ا فصل ۴ ترجمہ از مولانا اکبر علی صاحب۔ شرح و تحقیق از محمد تقی عثمانی صاحب)۔ (مرتبین)

کہ میں[1] مسیح کے اوّلین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں، شروع سے آخر وقت تک مسیح کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سُنے اقوال اِس کتاب میں درج کر رہا ہوں یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ دُنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت مسیح نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور صحیح حالات دُنیا کے سامنے لانا تیری ذمّہ داری ہے۔

انجیل برنباس کی امتیازی خصوصیات

اِس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصّب کے بغیر کھلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ان چاروں انجیلوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰؑ کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، اور اس طرح بیان ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص فی الواقع وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا، اور ان واقعات میں خود شریک تھا چاروں انجیلوں کی بے ربط داستانوں کے مقابلے میں یہ تاریخی بیان زیادہ مربوط بھی ہے اور اس سے سلسلۂ واقعات بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی صحیح تعلیمات اور مؤثر پیرایۂ بیان

حضرت مسیحؑ کی تعلیمات اس میں چاروں انجیلوں کی بہ نسبت زیادہ واضح اور مفصّل اور مؤثر طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔ توحید کی تعلیم، شرک کی تردید، صفاتِ باری تعالیٰ، عبادات کی رُوح اور اخلاقِ فاضلہ کے

---

[1] یہ برنباس کون تھا؟ بائیبل کی کتاب اعمال میں بڑی کثرت سے اِس نام کے ایک شخص کا ذکر آتا ہے جو قبرص کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مسیحیت کی تبلیغ اور پیروانِ مسیح کی مدد و اعانت کے سلسلے میں اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کب دینِ مسیح میں داخل ہوا۔ اور ابتدائی بارہ حواریوں کی جو فہرست تین انجیلوں میں دی گئی ہے اس میں بھی کہیں اس کا نام درج نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس انجیل کا مصنّف وہی برنباس ہے یا کوئی اور۔ متی اور مرقس نے حواریوں (Apostles) کی جو فہرست دی ہے، برنباس کی دی ہوئی فہرست اس سے صرف دو ناموں میں مختلف ہے۔ ایک توما جس کے بجائے برنباس خود اپنا نام دے رہا ہے۔ دوسرا شمعون قنانی جس کی جگہ وہ یہوداہ بن یعقوب کا نام دیتا ہے لوقا کی انجیل میں یہ دوسرا نام بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ بعد میں کسی وقت برنباس کو حواریوں سے خارج کرنے کے لیے توما کا نام داخل کیا گیا ہے تاکہ اس کی انجیل سے پیچھا چھڑایا جا سکے، اور اس طرح کے تغیرات اپنی مذہبی کتابوں میں کر لینا ان حضرات کے ہاں کوئی ناجائز کام نہیں رہا ہے۔ (مؤلف)

مضامین بڑے ہی پُر زور اور مدلل و مفصل ہیں۔ جن سبق آموز تمثیلات کے پیرایہ میں مسیحؑ نے یہ مضامین بیان کیے ہیں ان کا عشرِ عشیر بھی چاروں انجیلوں میں نہیں پایا جاتا۔ اِس سے یہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کس حکیمانہ طریقے سے فرماتے تھے۔ حضرت عیسٰیؑ کی زبان، طرزِ بیان اور طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر کچھ بھی آشنا ہو تو وہ اِس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہ کوئی جعلی داستان نہیں ہے جو بعد میں کسی نے گھڑلی ہو۔ بلکہ اس میں حضرت مسیحؑ اناجیلِ اربعہ کی بہ نسبت اپنی اصلی شان میں زیادہ نمایاں ہوکر ہمارے سامنے آتے ہیں، اور اس میں ان تضادات کا نام و نشان بھی نہیں ملتا جو اناجیلِ اربعہ میں آنجناب کے مختلف اقوال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

تمام انبیاءؑ کی تعلیمات سے ہم آہنگی

اِس انجیل میں حضرت عیسٰیؑ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات ٹھیک ٹھیک ایک نبی کی زندگی اور تعلیمات کے مطابق نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، تمام پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں، صاف کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے سوا معرفتِ حق کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور جو انبیاءؑ کو چھوڑ دیتا ہے وہ دراصل خدا کو چھوڑتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتے ہیں جن کی تعلیم تمام انبیاءؑ نے دی ہے، نماز، روزے اور زکوٰۃ کی تلقین کرتے ہیں، ان کی نمازوں کا جو ذکر بکثرت مقامات پر برناباس نے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور تہجد کے اوقات تھے جن میں وہ نماز پڑھتے تھے اور ہمیشہ نماز سے پہلے وضو فرماتے تھے۔ انبیاءؑ میں سے وہ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کو نبی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کو انبیاءؑ کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کو وہ ذبیح قرار دیتے ہیں۔ اور ایک یہودی عالم سے اقرار کراتے ہیں کہ فی الواقع حضرت اسمٰعیلؑ ہی ذبیح تھے اور بنی اسرائیل نے کھینچ تان کر حضرت اسحٰقؑ کو ذبیح بنا رکھا ہے۔ آخرت، قیامت اور جنت و دوزخ کے متعلق ان کی تعلیمات قریب قریب وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

مصنّف کا مقصدِ تصنیف

اس کا مصنّف (جیسا کہ اوپر بیان ہُوا) کتاب کے آغاز ہی میں اپنا مقصدِ تصنیف یہ بیان کرتا ہے کہ "اُن لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جائے جو شیطان کے دھوکے میں آکر یسوعؑ کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں، ختنہ کو غیر ضروری ٹھیراتے ہیں، اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں، جن میں سے ایک دھوکہ کھانے والا پولوس بھی ہے۔"

وہ بتاتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ جب دنیا میں موجود تھے، اُس زمانے میں اُن کے معجزات کو دیکھ کر سب سے پہلے

فشرک رُومی سپاہیوں نے اُن کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا۔ پھر یہ چُھوت بنی اسرائیل کے عوام کو لگ گئی۔ اس پر حضرت عیسٰیؑ سخت پریشان ہُوئے۔ انہوں نے بار بار نہایت شدت کے ساتھ اپنے متعلق اس غلط عقیدے کی تردید کی اور اُن لوگوں پر لعنت بھیجی جو اُن کے متعلق ایسی باتیں کہتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو پُورے یہودیہ میں اِس عقیدے کی تردید کے لیے بھیجا اور اُن کی دُعا سے شاگردوں کے ہاتھوں بھی وہی معجزے صادر کرائے گئے، تاکہ لوگ اِس غلط خیال سے باز آجائیں کہ جس شخص سے یہ معجزے صادر ہو رہے ہیں وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔ اِس سلسلے میں وہ حضرت عیسٰیؑ کی مفصّل تحریریں نقل کرتا ہے جن میں انہوں نے بڑی سختی کے ساتھ اِس غلط عقیدے کی تردید کی تھی، اور جگہ جگہ یہ بتاتا ہے کہ آنجنابؑ اِس گمراہی کے پھیلنے پر کس درجہ پریشان تھے۔

مزید برآں وہ اس پولوسی عقیدے کی بھی صاف صاف تردید کرتا ہے کہ مسیحؑ نے صلیب پر جان دی تھی۔ وہ اپنے چشم دید حالات یہ بیان کرتا ہے کہ جب یہوداہ اسکریوتی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر حضرت عیسٰیؑ کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالٰی کے حکم سے چار فرشتے آنجنابؑ کو اُٹھا لے گئے، اور خود یہوداہ اسکریوتی کی شکل اور آواز بالکل وہی کر دی گئی جو حضرت عیسٰیؑ کی تھی۔ صلیب پر وہی چڑھایا گیا تھا، نہ کہ حضرت عیسٰیؑ۔ اس طرح یہ انجیل پولوسی مسیحیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور قرآن کے بیان کی پُوری توثیق کرتی ہے حالانکہ نزولِ قرآن سے ۱۱۵ سال پہلے اس کے ان بیانات ہی کی بنا پر مسیحی پادری اسے رد کر چکے تھے۔[1]

مرّوجہ چار انجیلوں میں تعلیماتِ عیسوی[2]

چونکہ ہمارے زمانے کے موجودہ حالات اُن حالات سے بہت ملتے جُلتے ہیں جن میں سیّدنا مسیحؑ نے اہلِ فلسطین کو حکومتِ الٰہیہ کی دعوت دی تھی، اِس لیے اُن کے طریقِ عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں ذیل

---

[1] یہ عیسائیوں کی اپنی بدقسمتی ہے کہ اس انجیل کے ذریعے سے اپنے عقاید کی تصحیح اور مسیحؑ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا جو موقع انہیں ملا تھا، اسے محض ضد کی بنا پر انہوں نے کھو دیا (مؤلف)

[2] فاضل مؤلف نے بڑی عرق ریزی سے عیسائیوں کی اختیار کردہ چار انجیلوں میں سے وہ اجزاء ڈھونڈ نکالے ہیں جو قرآن کی روشنی میں حضرت عیسٰیؑ کی صحیح پیغمبرانہ تعلیمات کے آئینہ دار ہیں پھر مؤلف نے ان کے استعاراتی اور تمثیلی اندازِ بیان کی حسن و خوبی سے گرہ کشائی کی ہے۔ نیز ان کو ایسے طریق سے مرتب کیا ہے کہ یہ تعلیمات حکمت اور نیکی کے متفرق کلمات کی صورت میں سامنے نہیں آتیں بلکہ ایک جامع تحریک اصلاح کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔
(مرتب)

ذیل میں ہم ان کے بعض ارشادات نقل کرتے ہیں :

دعوتِ توحید

"فقیہوں میں سے ایک نے ۔ ۔ ۔ ۔ اُس سے پُوچھا کہ سب حکموں میں سے اوّل حکم کونسا ہے۔ یسُوع نے جواب دیا کہ اوّل یہ ہے :" اے اسرائیل سُن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ ۔ ۔ ۔ ۔ فقیہ نے اس سے کہا ۔ اے اُستاد، کیا خوب! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں" (مرقس ۔ ۱۲ : ۲۸ ۔ ۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اُسی کی عبادت کر" (لوقا ۴ : ۸)

حکومتِ الٰہی

"پس تم اِس طرح دُعا مانگو کہ اے ہمارے باپ! تُو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پُوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو" (متی ۶ : ۹ ۔ ۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیحؑ نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ عام غلط فہمی پھیلی ہوتی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد رُوحانی بادشاہت تھی۔ یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ ان کا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکم شرعی اُسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اس کا قانونِ طبعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

حق و باطل کی کشمکش کا پیغام

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور اس کی بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جُدا کر دُوں۔ اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں"

راہِ حق میں آزمائش ضروری ہے

"اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے[1] اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اُسے کھوئے گا۔ اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اُسے بچائے گا" (متی ۱۰ ۔ ۳۴ ۔ ۳۹)

---

[1] اپنی صلیب اٹھانے سے مراد مرنے کے لیے تیار رہنا ہے جس طرح اُردو محاورہ میں ہے "سر ہتھیلی پر رکھنا"۔ (مؤلف)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی[1] سے انکار کرے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے۔ (متی ۱۶ : ۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔" (متی ۱۰ : ۲۱-۲۲)

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں ۔۔۔۔ آدمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔" (۱۰ : ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں، بھائیوں اور بہنوں اور اپنی جان سے بھی دشمنی[2] نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اُٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر ہنسنا شروع کریں کہ اس شخص نے عمارت شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا۔ ۔۔۔ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ (لوقا ۱۴ : ۲۶-۳۳)

ایک انقلابی تحریک

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں اُٹھے تھے بلکہ پورے نظامِ تمدن و سیاست کو بدل دینا ان کے پیش نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار اور فی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوا سے تفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے۔ اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

---

[1] اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراضِ ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔ (مؤلف)

[2] دشمنی کرنے سے مراد اُن کی محبت اور اُن کے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کر دینا ہے۔ (مؤلف)

مسلکِ صبر کی تلقین

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔" (متی ۵: ۳۹-۴۱)

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور رُوح کو قتل نہیں کرتے ان سے نہ ڈرو۔ بلکہ اسی سے ڈرو جو رُوح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔ (متی ۱۰-۲۸)

حُبِّ دُنیا سے اجتناب اور فکرِ آخرت کی دعوت

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو۔ جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے۔ اور جہاں چور نقب لگاتے اور چُراتے ہیں بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو۔" (متی ۶: ۱۹-۲۰)

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا ... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے۔ اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی کی مانند پوشاک پہنے ہُوئے نہ تھا پس جب خدا میدان کی گھاس کو، جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی۔ ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ تم پہلے اس کی بادشاہت اور اس کی راست بازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔

(متی ۶-۲۴-۳۳)

"مانگو تو تمہیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔"
(متی ۷: ۷)

تحمّلِ شدائد کی تعلیم کا مقصد

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی ہے۔ حالانکہ اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمّلِ شدائد اور توکّل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظامِ تمدّن و سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہُوا ہو اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اس کے قبضہ اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لیے اُٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت دل سے نکال

خد و سے ، سختیاں اُٹھانے کو تیار نہ ہو جاتے ، اپنے بہت سے نقصانات کو گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاصلِ مدعا الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہوتا ہے - یہ کام جنہیں کرنا ہو انہیں ایک تھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیے - کُرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑ دینے کے لیے آمادہ ہونا چاہیے - اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہونا چاہیے ۔ خزائنِ رزق فی الوقت جن کے ہاتھ میں ہیں ظاہر ہے کہ اُن سے لڑ کر رزق پانے کی اُمید نہیں کی جا سکتی - لہٰذا جو اسباب سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسہ پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی اُن سے لڑ سکتا ہے ۔

حکومتِ الٰہیہ کا جامع مینی فسٹو

"اے محنت اُٹھانے والو! بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ ۔ میں تمہیں آرام دُوں گا کیونکہ میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا" (متی ۱۱ : ۲۸ - ۳۰)

شاید حکومتِ الٰہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پُر اثر الفاظ میں مُرتّب نہیں کیا جا سکتا ۔ انسان پر انسانی حکومت کا جُوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے - اِس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جُوا میں تمہارے اُوپر رکھنا چاہتا ہُوں وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی ۔

حکومت خدمت ہے

"غیر قوموں کے بادشاہ اُن پر حکومت چلاتے ہیں ۔ مگر تم ایسے نہ ہونا ، بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کی مانند ہے" (لوقا ۲۲ : ۲۵ - ۲۶)

حضرت مسیحؑ یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے ۔ اِس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں - ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جانا ۔

یہودی علماء و مشائخ پر تنقید

"فقیہ اور فریسی[1] مُوسیٰ کی گدّی پر بیٹھے ہیں پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن اُن کے سے کام نہ کرو ۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں ۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اُٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں ۔ مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے ہلانا بھی نہیں چاہتے ۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں - اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے

---

[1] فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں - (مؤلف)

دیکھتے اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو۔ اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنّم کا فرزند بنا دیتے ہو۔"

"اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے۔ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔" (متی ۲۳: ۲-۲۸)

یہ اُس وقت کے حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے۔ اور اس انقلاب کے راستہ میں رومی قیاصرہ سے بڑھ کر یہی حائل تھے۔

حضرت عیسٰیؑ کے خلاف مذہبی اکابر کی سازش

"اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں[1] کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انہوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اے اُستاد! ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا۔ ہمیں بتا کہ تو کیا سمجھتا ہے قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے اُن کی شرارت جان کر کہا اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکّہ مجھے دکھاؤ۔ وہ دینار اس کے پاس لے آئے۔ اُس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اُس نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو ادا کرو۔"
(متی ۲۲: ۱۵-۲۱)

---

[1] مسیح کے زمانے میں فلسطین کے ایک حصّہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنتِ رُوم کی تابع فرمان تھی۔ اس کے بانی ہیرودس کے نام پر اس کو عموماً ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔ (مؤلف)

اِس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک چال تھی۔ فریسی اِس تحریک کو ختم کرنے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ حضرت مسیحؑ کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جائے اور تحریک کو جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اُسے کچلوا ڈالا جائے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے یہ سوال اٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں؟ جواب میں حضرت مسیحؑ نے جو ذو معنی بات کہی اس کو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانہ میں موجود ہو۔ لیکن دراصل مسیحؑ نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے، کیونکہ ایسا کہنا اُن کی دعوت کے خلاف تھا۔ اور یہ فرمایا کہ اُسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اُس وقت تک اُن کی تحریک اس مرحلے پر نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا۔ اِس لیے انہوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کر دو اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کرو۔ اِس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیحؑ کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دیکر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیحؑ کو گرفتار کرائے جب کہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ اسکریوتی نے مسیحؑ کو پکڑوا دیا۔

حضرت عیسٰیؑ کے خلاف اکابر یہود کا مقدمہ

"پھر اُن کی ساری جماعت اُٹھ کر اُسے پیلاطس رومی حاکم کے پاس لے گئی اور انہوں نے الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا ہے ۔۔۔ پیلاطس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کوئی قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے ۔۔۔ وہ چلّا چلّا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلّانا کارگر ہوا۔"

(لوقا ۲۳: ۱-۲۳)

حضورؐ کے مکی دورِ دعوت سے مماثلت

اِس طرح دنیا میں مسیحؑ کا مشن اُن لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو حضرت موسٰیؑ کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رُو سے حضرت مسیحؑ کی دعوت کا کُل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اِس مختصر مدت میں انہوں نے اتنا ہی کام کیا جتنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکی زندگی کے ابتدائی تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورہ بالا آیات کا مقابلہ قرآن مجید کی مکی سورتوں اور زمانہ قیام مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔[۴۹]

فصل ۴

عیسائیوں کی گمراہی کے حقیقی اسباب

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۔ (المائدہ - ۷۷)

"کہو اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور "سواء السبیل" سے بھٹک گئے۔"

عیسائیوں میں غلو اور تقلید اغیار کی بیماری

یہ اشارہ ہے اُن گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے خصوصاً فلاسفۂ یونان کی طرف جن کے تخیلات سے متاثر ہو کر عیسائی اس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداءً ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اُس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت اور تعظیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے خیالات کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دور کا واسطہ بھی نہ رہا

"ایک عیسائی عالم کا ناقدانہ جائزہ"

اس باب میں خود ایک مسیحی عالم دینیات (ریورنڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابل ملاحظہ ہے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں "یسوع مسیح" (Jesus Christ) کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

"پہلی تین انجیلوں (متی، مرقس، لوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا۔ ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے خود متی اس کا ذکر "بڑھئی کے بیٹے" کی حیثیت سے کرتا ہے

اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو "مسیح" تسلیم کرنے کے بعد "الگ ایک طرف لے جا کر اسے ملامت کی" (متی ۱۶: ۲۲)۔ لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعۂ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ "وہ خدا اور ساری اُمت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا" (لوقا ۲۴: ۱۹)۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ مرقس کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لیے لفظ "خداوند" (Lord) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں، بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسوع کے ابتلاء کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعے کے شایانِ شان ہے، مگر مرقس کی "فدیہ" والی عبارت (مرقس ۱۰: ۴۵) اور آخری فسح کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہنائے گئے جو بعد میں پہنائے گئے۔ حتیٰ کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ مسیح کی موت کا انسان کے گناہ اور اس کے کفارے سے کوئی تعلق تھا۔"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:

"یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا اناجیل کی متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ "مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو" (لوقا ۱۳: ۳۳)۔ وہ اکثر اپنا ذکر "ابنِ آدم" کے نام سے کرتا ہے ... ... یسوع کہیں اپنے آپ کو "ابن اللہ" نہیں کہتا۔ اس کے دوسرے ہم عصر جب اس کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً ان کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو خدا کا ممسوح سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً "بیٹے" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے ...... مزید برآں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لیے بھی "باپ" کا لفظ اسی اطلاقی شان میں استعمال کرتا ہے، ..... اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا، بلکہ ابتدائی دور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اس خاص گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا۔ البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعہ نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے۔"

پھر یہی مصنف لکھتا ہے:

"عیدِ پنتکست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ "ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا" یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے ..... انجیلوں سے

ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشوونما کے مدارج سے گزرا۔ اس کو بھوک پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا تھا اور سوتا تھا، اور حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا۔ اُس نے دکھ اٹھایا اور مرا۔ اُس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے .... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جاتے تو یہ اس پورے تصوّر کے بالکل خلاف ہوگا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دھوے کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گزریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی۔ تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے، یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثناء تھا تو وہ صرف اُسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادرِ مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ "یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں مل سکتی" اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کے تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اُس زمانہ سے پہلے مکمل نہ ہوئی تھی جبکہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا، پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیح کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیح اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔"

اس کے بعد یہ مصنّف پھر لکھتا ہے :

" وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعۂ رفع کے وقت اِسی فعلِ رفع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ ابن اللہ کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا .... یہ ابن اللہ کا لفظ یقینی طور پر ذاتی الوہیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو "خدا کا اپنا بیٹا" کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال جس نے مسیح کے لیے "خداوند" کا خطاب اصل مذہبی معنی میں استعمال کیا۔ شاید یہ فعل متقدم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنی میں بولنا شروع کیا۔ پھر اپنے مدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ "خداوند یسوع مسیح" کی طرف بہت سے وہ تصوّرات

اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیئے جو قدیم کتب مقدسہ میں خداوند یہوہ[1] (اللہ تعالیٰ) کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور لفظی معنی میں خدا کا بیٹا ٹھہرایا۔ تاہم متعدد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے برابر کہہ دینے کے باوجود پال اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔"

ایک دوسرے عیسائی محقق کا تجزیہ

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون "مسیحیت" (Christianity) میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے۔ مذہبی خیالات بائیبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صورتوں میں۔"

"باپ بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کی تھی، اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا۔ تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت کے اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے۔ (اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم (باپ بیٹے اور روح) کے درمیان تعلق کی حیثیت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدے میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔"

تاریخ کلیسا سے ایک شہادت

اسی سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک اور مضمون "تاریخ کلیسا" (Church History) کی یہ عبارت بھی قابلِ ملاحظہ ہے:

"تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلامِ" کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تھا تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی

---

[1] یہودیوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے یہی لفظ مخصوص تھا (مؤلف)

ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیا کی کونسل نے اُلوہیتِ مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا لیکن آخری فتح نیقیا ہی کے فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی اُلوہیت کے ساتھ رُوح کی اُلوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیا میں مسیح کا جو تصوّر قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزوِ لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کہ بیٹے کی اُلوہیت مسیح کی ذات میں مجسّم ہوئی تھی" ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں اُلوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلّق ہے؟ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں جمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت، دوسری انسانی طبیعت، اور یہ دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جُداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیّر و تبدّل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیتیں بھی رکھتی ہیں، یعنی مسیح بیک وقت دو مشیتوں کا حامل ہے . . .

. . . اسی دوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل کے مسئلہ پر بھی خاص توجّہ کی اور یہ سوال مدتوں زیرِ بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا؟ آخر کار ۵۲۹ء میں اورنج کی دوسری کونسل میں . . . . . . یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہبوطِ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک وہ اُس فضلِ خداوندی سے، جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے، نئی زندگی نہ حاصل کرے۔ اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں استمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے، اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اُسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسّط سے حاصل رہ سکتی ہے۔"

حاصلِ بحث

مسیحی علماء کے ان بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداءً جس چیز نے مسیحیوں کو گمراہ کیا وہ عقیدت اور محبّت کا غلو تھا۔ اسی غلو کی بنا پر مسیح علیہ السلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، خدائی صفات ان کی طرف منسوب کی گئیں، اور کفّارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ حالانکہ حضرت مسیح کی تعلیمات

میں ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب فلسفہ کی ہوا مسیحیوں کو لگی تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اِس ابتدائی گمراہی کو سمجھ کر اس سے نکلنے کی سعی کرتے، انہوں نے اپنے گزشتہ پیشواؤں کی غلطیوں کو نباہنے کے لیے اُن کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیح کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کیے بغیر محض منطق و فلسفہ کی مدد سے عقیدہ پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے۔ یہی وہ ضلالت ہے جس پر قرآن نے ان آیات میں مسیحیوں کو متنبہ فرمایا ہے۔[191]

انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کا عقیدہ

[redacted]

سیرتِ سرورِ عالم

صلی اللہ علیہ وسلم

جلد دوم

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن ○ لاہور

ناشر : سید حسین فاروق مودودی
ناظم ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور

طابع : قاضی ظفر اقبال

مطبع : الحمرا آرٹ پرنٹرز۔ لاہور

اشاعتِ اوّل

ذیقعد ۱۳۹۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۸ء ——— ۶۰۰۰

قیمت : [illegible]
قسم اول : [redacted]/- روپے

قسم دوم ۸۰ روپے

——— باہتمام ———
چودھری بشیر احمد خاں

کتابت : محمد صدیق خوشنویس۔ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاح

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۚ ......
رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ

(النساء: ۱۶۳-۱۶۴)

"اے محمدؐ، ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اُس کے بعد آنے والے نبیوں کی طرف بھیجی تھی . . . . . یہ سب رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ اُن کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے۔"

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ

(النحل: ۳۶)

"اور ہم نے ہر اُمّت میں ایک رسول (یہ دعوت دینے کے لیے) بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (کی بندگی) سے بچو۔"

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید: ۲۵)

"ہم نے اپنے رسولوں کو بیّنات کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان (معیارِ حق و باطل) نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔"

○

یٰسٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ (یٰسٓ: ۱-۴)

"قرآنِ حکیم کی قسم، اے محمدؐ، تم یقیناً رسُولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو۔"

○

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ (الاعراف: ۱۵۸)

"اے محمدؐ، کہہ دو کہ اے انسانو، مَیں تم سب کی طرف اُس خدا کا بھیجا ہُوا رسُول ہُوں جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے۔"

○

وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ (الانعام: ۱۹)

"اور یہ قرآن میری طرف اس لیے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے کہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے اُسے خبردار کر دُوں۔"

○

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ (البینہ: ۱-۳)

"اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے وہ (اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آجاتی (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک ایسا رسول جو (تمام آمیزشوں سے) پاک صحیفے پڑھ کر سناتے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔"

○

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ (الجمعہ: ۲)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔"

○

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (النساء: ۶۴)

"ہم نے جو رسُول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔"

○

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء: ۸۰)

"جو رسُول کی اطاعت کرے اُس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔"

○

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (الاحزاب: ۳۶)

"کسی ایمان لانے والے مرد اور کسی ایمان لانے والی عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسُول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو پھر اُسے اپنے معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسُول کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔"

○

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ (النساء: ۱۰۵)

"اے نبیؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو

(راہِ راست) اللہ نے تم کو دکھائی ہے اُس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔"

○

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ (النمل: ۹۲)

"پھر جو ہدایت اختیار کرے وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اُس سے کہہ دو کہ میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں۔"

○

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ (بنی اسرائیل، ۹۰-۹۳)

"اور انھوں نے کہا ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کردے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا نہ ہو اور تو اس میں نہریں رواں کردے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہمارے اُوپر گرادے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو

رُو در رُو ہمارے سامنے لے آتے ۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جاتے یا تُو آسمان پر چڑھ جاتے ، اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک تو ہمارے اُوپر ایک ایسی تحریر نہ اُتار لاتے جسے ہم پڑھیں "۔ اَے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو "پاک ہے میرا پروردگار ، کیا مَیں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہُوں ؟"

○

مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (العنکبوت : ۴۸)

"اَے نبیؐ ، تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے ، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے "۔

○

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ

(القصص : ۸۶)

"اور اَے نبیؐ ، تم اِس بات کے ہرگز اُمیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائیگی یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی ہے (کہ یہ تم پر نازل ہُوئی ہے) "۔

فہرست مضامین

باب - ۱

قرآن اپنے لانے والے کو کس حیثیت میں پیش کرتا ہے ۲۵ تا ۴۸

باب — ۲

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خاندان ۴۹ تا ۹۰

باب — ۳

پیدائش سے آغازِ نبوّت تک ۹۳ تا ۱۲۶

باب — ۴

آغازِ رسالت اور خُفیہ دعوت کے ابتدائی تین سال ۱۲۹ تا ۱۶۲

باب — ۵

دعوتِ حق کے لیے ہدایات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئیں ۱۶۵ تا ۱۸۹

باب — ۶

دعوتِ اسلامی کی حقیقی نوعیت ۱۹۱ تا ۲۸۵

فصلِ اوّل ۔ توحید کی تعلیم اور شرک کی تردید ۱۹۲ تا ۲۲۹

فصلِ دوم ۔ رسالتِ محمدیؐ پر ایمان کی دعوت ۲۳۰ تا ۲۹۲

فصل سوم۔ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان کی دعوت ۲۹۳ تا ۳۲۲

فصل چہارم۔ آخرت پر ایمان لانے کی دعوت ۳۲۳ تا ۳۸۷

فصل پنجم ۔ اخلاقی تعلیمات ۳۸۷ تا ۴۳۹

فصل ششم ۔ عالمگیر امتِ مسلمہ کی تاسیس ۴۴۱ تا ۴۷۷

فصل ہفتم: نبی اور غیر نبی کے کام کا فرق ۴۷۷ تا ۴۸۴

باب — ۷

دعوتِ عام کی اِبتدا ۴۹۳ تا ۵۱۲

باب — ۸

دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے قُریش کی تدبیریں ۵۱۵ تا ۵۵۹

باب — ۹

ہجرتِ حبشہ ۵۶۳ تا ۵۹۹

باب — ۱۰

سنہ ۶ بعد بعثت سے سنہ ۱۰ بعد بعثت تک ۶۰۳ تا ۶۳۹

باب — ۱۱

اسراء و معراج ۶۴۳ تا ۶۷۹

باب ۱۲

مکّی دور کے آخری تین سال

باب ۱۳

ہجرت اِلی المدینہ ۷۱۲ء تا ۷۴۸ء

باب ـ ۱۴

تصاویر

نقشہ جات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

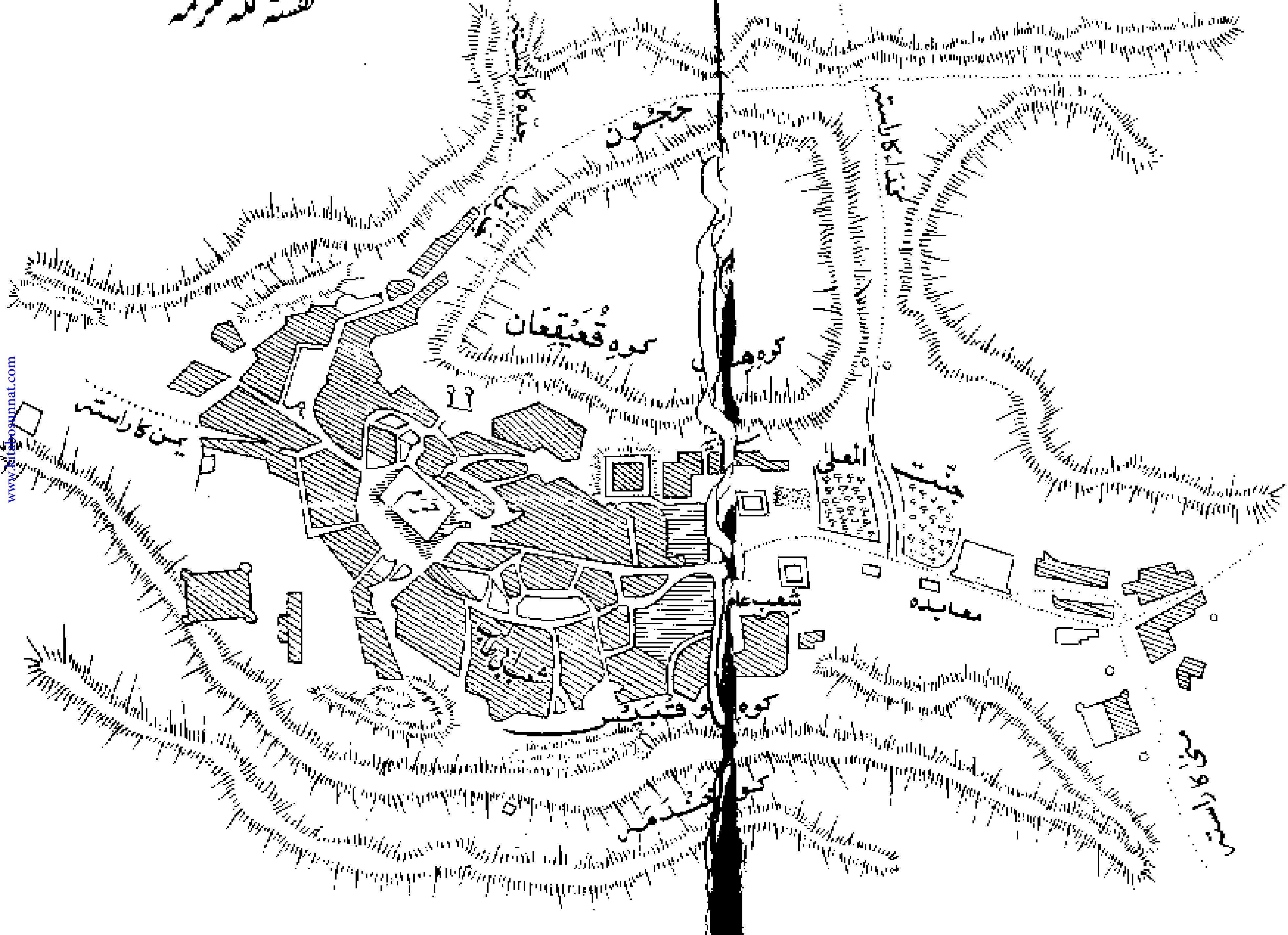
دیباچہ

اس کتاب کی پہلی جلد تمام تر اُن مضامین پر مشتمل تھی جو جناب نعیم صدیقی صاحب اور جناب عبدالوکیل علوی صاحب نے رسالت اور سیرتِ پاک سے تعلق رکھنے والے مختلف مباحث پر میری تحریروں سے نہایت خوبی کے ساتھ جمع اور مرتب کیے تھے۔ اس میں مجھے کسی حذف و اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

لیکن اِس دُوسری جلد کے لیے میرے جو مضامین اُنہوں نے جمع کیے تھے اُن کے درمیان جگہ جگہ ایسے خلا باقی رہ گئے تھے جن کی موجودگی میں یہ کسی طرح سیرت کی کتاب نہ بن سکتی تھی۔ اِس لیے مَیں نے اس میں بکثرت اضافے کر کے اِسے ایک مُسلسل اور مربوط کتابِ سیرت بنا دیا ہے۔ یہ جلد ہجرت کے بیان پر ختم ہوئی ہے۔ آگے مدنی دَور شروع ہوتا ہے جو درحقیقت ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ مجھے اس کتاب کو مکمل کرنے کی طاقت اور توفیق عطا فرمائے اور اِس کو اپنے بندوں کے لیے مُفید بنائے

ابوالاعلیٰ

نقشہ مکہ مکرمہ



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

باب (۱)

قرآن اپنے لانے والے کو کس حیثیت میں پیش کرتا ہے؟

دنیا میں انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہمیشہ ایسے پاک نفوس پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اپنی زبان اور اپنے عمل سے اس کو حق و صداقت کا سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ لیکن انسان اکثر ان کے اس احسان کا بدلہ ظلم کی شکل میں دیتا رہا ہے۔ ان پر ظلم صرف ان کے مخالفوں ہی نے نہیں کیے کہ ان کے پیغام سے بے رخی برتی، ان کی صداقت سے انکار کیا، ان کی دعوت کو رد کر دیا، انسان کو تکلیفیں دے کر راہِ حق سے پھیرنے کی کوشش کی، بلکہ ان پر ظلم ان کے عقیدت مندوں نے بھی کیا کہ ان کے بعد ان کی تعلیمات کو مسخ کیا، ان کی ہدایتوں کو بدل ڈالا، ان کی لائی ہوئی کتابوں میں تحریف کی، خود ان کی شخصیتوں کو اپنی عجائب پسندی کا کھلونا بنا کر الوہیت اور خدائی کا رنگ دے دیا۔ پہلی قسم کا ظلم تو ان نفوسِ قدسیہ کی زندگی تک، یا حد سے حد اس کے چند سال بعد تک ہی محدود رہا۔ مگر یہ دوسری قسم کا ظلم ان کے بعد صدیوں تک ہوتا رہا اور بہت سے بزرگوں کے ساتھ اب تک ہوئے جا رہا ہے۔

دنیا میں آج تک جتنے داعیانِ حق مبعوث ہوتے ہیں سب نے اپنی زندگی ان جھوٹے خداؤں کی خدائی ختم کرنے میں صرف کی ہے جنہیں انسان نے خدائے واحد کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا لیا تھا۔ لیکن ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ ان کے بعد ان کے پیرووں نے جاہلانہ عقیدت کی بنا پر خود انہی کو خدا، یا خدائی میں خدا کا شریک بنا لیا اور وہ بھی ان بتوں میں شامل کر لیے گئے جنہیں توڑنے میں انہوں نے اپنی تمام عمر کی محنتیں صرف کر دی تھیں۔

دراصل انسان اپنے آپ سے کچھ ایسا بدگمان ہے کہ اسے انسانیت میں قدسی و ملکوتی صفات کے امکان اور وجود کا بہت کم یقین آتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو محض کمزوریوں اور پستیوں ہی کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ اس کا ذہن اس حقیقتِ کبریٰ کے علم و اذعان سے عموماً خالی رہتا ہے کہ اس کالبدِ خاکی میں حق جل مجدہ نے وہ

توتیں بھی ودیعت کی ہیں جو اس کو بشر ہونے اور بشری صفات سے متصف رہنے کے باوجود عالمِ پاک میں ملائکہ مقربین سے بھی بلند درجہ تک پہنچا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اِس دنیا میں کسی انسان نے اپنے آپ کو خدا کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا ----- اس کے ہم جنسوں نے پہلے تو یہ دیکھ کر کہ یہ تو ہماری ہی طرح گوشت پوست کا انسان ہے، اُسے خدارسیدہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اور جب بالآخر اُس کی ذات میں غیرمعمولی محاسن کا جلوہ دیکھ کر سرِ عقیدت جھکایا تو پھر کہا کہ جو ہستی ایسی غیرمعمولی خوبیوں کی مالک ہو وہ ہرگز بشر نہیں ہو سکتی۔ پھر کسی گروہ نے اس کو خدا بنایا، کسی نے حلول کا عقیدہ ایجاد کر کے یقین کر لیا کہ خدا نے اس کی شکل میں ظہور کیا تھا۔ کسی نے اس کے اندر خدائی صفات اور خداوندانہ اختیارات کا گمان کیا، اور کسی نے حکم لگا دیا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ۔

مختلف اہلِ مذاہب کے تصوّرات اپنے بانیٔ مذہب کے متعلق

دُنیا کے کسی پیشوائے دین کی زندگی کو لے لو، تم دیکھو گے کہ اُس کی ذات پر سب سے زیادہ ظلم اس کے معتقدین ہی نے کیا ہے۔ انہوں نے اُس پر اپنے تخیلات و اَوہام کے اتنے پردے ڈال دیے ہیں کہ اس کی شکل و صورت دیکھنا ہی بالکل محال ہو گیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ان کی محرّف کتابوں سے یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اُس کی اصلی تعلیم کیا تھی، بلکہ ہم ان سے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ خود اصل میں کیا تھا۔ اس کی پیدائش میں اُعجوبگی، اس کی طفولیت میں اُعجوبگی، اس کی جوانی اور بڑھاپے میں اُعجوبگی، اُس کی زندگی کی ہر ہر بات میں اُعجوبگی، اور اس کی موت تک میں اعجوبگی۔ بغرض ابتدا سے لے کر انتہا تک وہ ایک افسانہ ہی افسانہ نظر آتا ہے اور اُس کو اس شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ یا تو وہ خود خدا تھا، یا خدا کا بیٹا تھا، یا خدا اُس میں حلول کر گیا تھا، یا کم از کم وہ خدائی میں کسی حد تک شریک و سہیم تھا۔

بُدھ

مثال کے طور پر گوتم بُدھ کو دیکھو۔ بُدھ مذہب کے نہایت گہرے مطالعے سے صرف اتنا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس اولوالعزم انسان نے برہمنیت کے بہت سے نقائص کی اصلاح کی تھی اور خصوصیت کے ساتھ اُن بے شمار ہستیوں کی خدائی کا بطلان کیا تھا جن کو اُس عہد کے لوگوں نے اپنا معبود بنا لیا تھا۔ مگر اُس کے انتقال کو پوری ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ ویسالی کی کونسل میں اس کے پیروؤں نے اس کی تمام تعلیمات کو بدل ڈالا، اصل سُوتروں کے بجائے نئے سُوتر بنا لیے اور اُصول اور فروع میں اپنے آہوا و افکار کے مطابق جس طرح چاہا تصرّف کر ڈالا۔ ایک طرف انہوں نے بودھ کے نام سے اپنے مذہب کے ایسے عقائد مقرر کر لیے جن میں خدا کا سرے سے وجود ہی نہ تھا، اور دوسری طرف بودھ کو عقلِ کل، مدارِ کائنات اور ایک ایسی ہستی قرار دے لیا جو ہر عہد میں دنیا کی اصلاح کے لیے بُدھ بن کر آیا کرتی ہے۔ اس کی پیدائش، زندگی اور گذشتہ و آئندہ جنموں کے

متعلق ایسے ایسے عجیب افسانے بنا لیے جن کو پڑھ کر پروفیسر ولسن جیسے محقّقین حیران ہو کر یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ تاریخ میں فی الواقع بُدھ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ تین چار صدی کے اندر ان افسانوں نے بُدھ میں اُلوہیت کا رنگ بھر دیا اور کنشک کے زمانے میں بُدھ مت کے آعیان و ائمّہ کی ایک بہت بڑی کونسل نے جو کشمیر میں منعقد ہُوئی تھی، فیصلہ تک دے دیا کہ بُدھ دراصل خدا کا مادّی ظہور تھا، یا بالفاظ دیگر خدا اُس کے جسم میں حُلول کر گیا تھا۔

رام

یہی سلوک رام چندر جی کے ساتھ ہُوا۔ رامائن کے مطالعہ سے صاف مُترشح ہوتا ہے کہ راجہ رام چندر جی محض ایک انسان تھے نیک دل، انصاف، شجاعت، فیاضی، تواضع، حِلم اور ایثار میں کمال کا مرتبہ تو انہیں ضرور حاصل تھا، مگر اُلوہیت کا شائبہ تک ان میں نہ تھا۔ لیکن بشریّت اور ان اعلیٰ صفات کا اجتماع ایک ایسا مُعمّا ثابت ہُوا کہ اہلِ ہند کی عقل اس کو حل نہ کر سکی۔ چنانچہ رام چندر کی وفات پر ایک زمانہ گزرنے کے بعد یہ عقیدہ تسلیم کر لیا گیا کہ اُن کے اندر وِشنو[1] دیوتا حُلول کیا تھا اور وہ اُن ہستیوں میں سے ایک تھے جن کی شکل میں وِشنو جی سنسار کی اصلاح کے لیے باوقاتِ مختلفہ ظہور کرتے رہتے ہیں۔

کرشن

سری کرشن اس معاملے میں ان دونوں سے زیادہ مظلوم ہیں۔ بھگوت گیتا تحریف و تمسیخ کے کئی عملوں سے نکل کر جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے اس کے عمیق مطالعہ سے کم از کم اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن جی ایک مُوحّد تھے اور انہوں نے ہستیِ باری تعالیٰ کے ہمہ گیر قادرِ مُطلق اور شدید القُویٰ ہونے کا وعظ کہا تھا۔ لیکن مہابھارت، وِشنو پُران، بھاگوت پُران وغیرہ کتابیں، اور خود گیتا اُن کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ ایک طرف وہ وِشنو کے جسمانی مظہر، خالقِ موجودات اور مُدبّرِ کائنات نظر آتے ہیں، اور دوسری طرف ایسی ایسی کمزوریاں ان کی طرف منسوب ہیں کہ انہیں خدا تو خُدا، پاکیزہ اخلاق کا انسان بھی تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ گیتا میں کرشن جی کے یہ اقوال ملتے ہیں:

---

[1] وِشنو ہندوؤں کے موجودہ عقائد کے مطابق کائنات کی پرورش کرنے والے خدا یا دیوتا کا نام ہے۔ غالباً اصل میں یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیّت کا تصوّر تھا جسے بعد میں ایک مستقل شخصیت قرار دے لیا گیا۔ ہندوؤں میں دیوتا پرستی کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہر صفت کو انہوں نے ذاتِ حق سے الگ کر کے بجائے خود ایک خدا ٹھیرا لیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

"اس دنیا کا میں باپ، سہارا[1] اور بابا میں ہی ہوں۔ جو کچھ پاکیزہ یا جو کچھ جاننے کے قابل ہے وہ سب اوم اونکار، رگ وید، یجر وید، سام وید بھی میں ہی ہوں۔ سب کا پالنے والا، مالک، گواہ، جائے قیام، جائے پناہ، باعث پیدائش، باعث خاتمہ، باعث قیام، خزانہ اور پیدائش کا لازوال بیج بھی میں ہی ہوں۔ اے ارجن، میں گرمی دیتا ہوں، میں پانی روکتا ہوں، میں برساتا ہوں، میں امرت ہوں اور موت، ست اور است[2] بھی میں ہی ہوں" (۹: ۱۷-۱۹)

"تمام دیوتا گن[3] اور مہرشی[4] میری پیدائش کو نہیں جانتے کیونکہ سب دیوتاؤں اور مہرشیوں کی ابتداء بہرحال مجھ ہی سے ہے۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ میں پرتھوی[5] وغیرہ سب لوکوں[6] کا بڑا ایشور ہوں اور بے جنم یعنی آغاز نہیں رکھتا، وہ انسانوں میں موہ[7] سے آزاد ہو کر سب پاپوں سے چھوٹ جاتا ہے" (۱۰: ۲-۳)

"اے گڈاکیش[8] سب جانداروں میں رہنے والی آتما[9] میں ہوں۔ سب جانداروں کا آغاز، وسط اور انجام بھی میں ہی ہوں۔ بارہ آدتیوں میں وشنو[10] میں ہوں۔ تجلیوں[11] میں کرنوں کی مالا والا سورج، مرتوں[12] میں مریچی اور نکشتروں میں چندرماں[13] بھی میں ہوں" (۱۰: ۲۰-۲۱)

"ایسا کوئی متحرک یا ساکن جاندار نہیں جو مجھ سے باہر ہو ...... میں صرف اپنے ایک ہی حصے سے اس تمام جگت میں پھیلا ہوا ہوں" (۱۰: ۳۹-۴۲)

"اے پانڈو، جو شخص اس بدھی[14] کے ساتھ کرم کرتا[15] ہے کہ یہ سب کرم میرے یعنی پرمیشور کے ہیں، جو میرا بھروسہ رکھ کر اور سب تعلقات چھوڑ کر سب جانداروں کے بارے میں نربیر[16] رہتا ہے وہ میرا بھگت مجھ میں مل جاتا ہے۔" (۱۱: ۵۵)

"میں سب جانداروں کا مالک ہوں اور پیدائش سے بالاتر ہوں۔ اگرچہ میرے آتم سروپ میں کبھی تغیر نہیں ہوتا[17] مگر پھر بھی میں اپنی پرکرتی (فطرت) میں قائم ہو کر اپنی مایا[18] سے جنم لیا کرتا ہوں۔"

---

[1] واحد کارگزار [2] یعنی سچ اور جھوٹ [3] یعنی دیوتا لوگ [4] یعنی اولیاء [5] زمین [6] لوک یعنی جہان [7] یعنی لگاؤ۔ دنیا کی محبت۔ [8] یعنی اے کنتی کے بیٹے یا بالوں والے مراد ارجن ہے۔ [9] یعنی تمام جانداروں کی روح [10] ہندوؤں کے تمام دیوتاؤں میں سے ۱۲ دیوتا جنہیں وہ آدتیہ کہتے ہیں اور وشنو ان میں سب سے بڑا دیوتا ہے۔ یہ ۱۲ آدتیہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ادیتی کے بیٹے تھے۔ [11] تجلیوں یعنی نور۔ [12] ہندوؤں کی اصطلاح میں مرت اُن ۴۹ دیوتاؤں کا نام ہے جو ہوا کا انتظام کرتے ہیں اور ان کے سردار کا نام مریچی ہے۔ [13] یعنی آسمان میں چاند۔ [14] بدھی یعنی فہم۔ [15] یعنی فعل، کام۔ [16] عداوت سے مبرا۔ [17] یعنی میری ذات میں کبھی تغیر نہیں ہوتا۔ [18] مایا یعنی قدرت یا تدبیر۔ (ترجمہ حواشی از مؤلف)

"اے بھارت[1]، جب دھرم کا تنزل ہوتا ہے اور اَدھرم کا زور پھیل جاتا ہے تب میں خود ہی جنم لیا کرتا ہوں۔ نیکوں کی حفاظت اور بُروں کا ناش کرنے کے لیے اور یگ یگ[2] میں دھرم قائم کرنے کے لیے میں جنم لیا کرتا ہوں" (۴: ۷-۸)

اِن اقوال میں صاف طور پر گیتا کے کرشن نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے[3]۔ مگر دوسری طرف بھاگوت پُران انہی کرشن جی کو اس شکل میں پیش کرتی ہے کہ وہ نہاتے ہیں گوپیوں کے کپڑے چھپا لیتے ہیں، اُن سے لطف اندوز ہونے کے لیے اُتنے ہی جسم پیدا کر لیتے ہیں جتنی گوپیاں تھیں، اور جب شک پرشی سے راجہ پریکشت پوچھتا ہے کہ وہ خدا تو اوتار کی شکل میں اس لیے ظاہر ہوتا ہے کہ سچا دھرم پھیلائے تھے، پھر یہ کیا تماشہ ہے کہ دھرم کے تمام اصولوں کے خلاف دُوسروں کی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے، تو رشی کو یہ اعتراض رفع کرنے کے لیے اس حیلہ کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے کہ "خود دیوتا بھی بعض اوقات نیکی کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں، مگر اُن کے گناہ اُن کی ذات پر اُسی طرح اثر نہیں کرتے جس طرح آگ تمام چیزوں کو جلانے کے باوجود مورد الزام نہیں ہو سکتی۔"

کوئی سلیم العقل آدمی یہ باور نہیں کر سکتا کہ کسی بلند پایہ معلّمِ دین کی زندگی ایسی ناپاک ہو سکتی ہے، اور نہ وہ یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ کسی سچّے مذہبی پیشوا نے فی الحقیقت اپنے آپ کو انسانوں کے اور کائنات کے رب کی حیثیت سے پیش کیا ہو گا۔ لیکن قرآن اور بائیبل کے متقابل مطالعہ سے یہ حقیقت واضح طور پر ہمارے سامنے روشن ہو جاتی ہے کہ قوموں نے اپنے ذہنی انحطاط اور اخلاقی زوال کے دَور میں کس طرح دنیا کے پاکیزہ ترین انسانوں کی سیرتوں کو ایک طرف گندی سے گندی شکل میں ڈھالا ہے تاکہ خود اپنی کمزوریوں کے لیے وجہ جواز پیدا کریں، اور دوسری طرف اُن کی شخصیتوں کے گرد کیسے کیسے وہمی افسانے جمع کر دیتے ہیں۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہی سب کچھ کرشن جی کے ساتھ بھی ہُوا ہو گا اور اُن کی اصل تعلیم اور اصل شخصیت اُس سے بالکل مختلف ہو گی جیسی ہندوؤں کی

---

[1] بھارت یعنی نیک۔

[2] یگ یعنی زمانہ۔

[3] اگر گیتا خود اس بات کی مدّعی ہوتی کہ وہ خدا کی کتاب ہے اور کرشن اس کے پیش کرنے والے نبی ہیں تو مذکورہ بالا اقوال بجز خدا کے قرار پا سکتے تھے، اور کرشن جی کی طرف خدائی کا دعویٰ منسوب نہ ہوتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کتاب خود اپنے آپ کو کرشن کے اُپدیش (وعظ) کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ پوری گیتا میں کہیں کوئی اشارہ تک بھی اس بات کی طرف نہیں ہے کہ وہ کلام الٰہی ہے جو وحی یا الہام کے ذریعہ سے کرشن جی پر نازل ہُوا ہے۔ (جملہ حواشی از مؤلف)

کتابیں اُسے پیش کرتی ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

جن بزرگوں کی نبوت معلوم و مسلّم ہے اُن میں سب سے بڑھ کر ظلم سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام پر کیا گیا ہے حضرت عیسیٰ ویسے ہی ایک انسان تھے جیسے سب انسان ہوا کرتے ہیں بشریت کی تمام خصوصیتیں ان میں بھی اُسی طرح موجود تھیں جس طرح ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت و نبوت، اور اعجازانہ کی قوتیں عطا فرما کر ایک بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کے لیے مامور فرمایا تھا۔ لیکن اوّل تو اُن کی قوم نے ان کو جھٹلایا اور پورے تین سال بھی ان کے وجود مسعود کو برداشت نہ کر سکی، یہاں تک کہ عین عالم شباب میں ان کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر جب وہ ان کے بعد اُن کی عظمت کی قائل ہوئی تو اس قدر حد سے تجاوز کر گئی کہ ان کو خدا کا بیٹا بلکہ عین خدا بنا دیا، اور یہ عقیدہ اُن کی طرف منسوب کیا کہ خدا مسیح کی شکل میں اس لیے نمودار ہوا تھا کہ صلیب پر چڑھ کر انسان کے گناہوں کا کفّارہ ادا کرے، کیونکہ انسان فطرۃً گناہگار تھا اور خود اپنے عمل سے اپنے لیے نجات حاصل نہ کر سکتا تھا۔ معاذ اللہ! ایک نبی صادق اپنے پروردگار پر اتنا بڑا بہتان کس طرح لگا سکتا تھا۔ مگر اس کے معتقدوں نے جوشِ عقیدت میں اُس پر یہ بہتان لگایا اور اس کی تعلیمات میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق اتنی تحریف کی کہ آج دنیا کی کسی کتاب میں سوائے قرآن کے مسیح کی اصلی تعلیم اور خود ان کی حقیقت کا نشان نہیں ملتا۔ بائیبل کے عہد جدید میں جو کتابیں اناجیل اربعہ کے نام سے موجود ہیں انہیں اٹھا کر دیکھ جاؤ، سب حلول، ابنیت اور عینیت کے فاسد تخیلات سے آلودہ ہیں۔ کہیں حضرت مریم کو بشارت ہوتی ہے کہ تیرا بچہ خدا کا بیٹا کہلائے گا (لوقا ۱ : ۳۵)، کہیں خدا کی روح کبوتر کے مانند یسوع پر اُترآتی ہے اور پکار کر کہتی ہے کہ "یہ میرا پیارا بیٹا ہے" متی (۳ : ۱۷)، کہیں مسیح خود کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور تم مجھے قادرِ مطلق کے داہنی جانب بیٹھے ہوئے دیکھو گے (مرقس ۱۴ : ۶۲)، کہیں روزِ جزا میں خدا کے بجائے مسیح کو تختِ جلال پر بٹھایا جاتا ہے اور وہ سزا و جزا کے فرمان نافذ کرتا ہے (متی ۲۵ : ۳۱ - ۴۶)۔ کہیں مسیح کے منہ سے کہلوایا جاتا ہے کہ "باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں ہوں" (یوحنا ۱۰ : ۳۸)۔ کہیں اُس راست گو انسان کی زبان سے یہ غلط الفاظ نکلوائے جاتے ہیں کہ "میں خدا میں سے نکل کر آیا ہوں" (یوحنا ۸ : ۴۲)۔ کہیں اُس کو اور خدا کو بالکل ایک کر دیا جاتا ہے اور اس کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا" اور "باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے" (یوحنا ۱۴ : ۹ - ۱۰)۔ کہیں خدا کی تمام چیزیں مسیح کی طرف منتقل کر دی جاتی ہیں (یوحنا ۳ : ۳۵) اور خدا اپنی خدائی کا سارا کاروبار مسیح کے سپرد کر دیتا ہے (یوحنا ۵ : ۲۰ - ۲۲)۔

ان مختلف قوموں نے اپنے پیشواؤں اور رہنماؤں پر جتنے بہتان و افترا کے ردے چڑھائے ہیں اُن کی اصل وجہ وہی غلو ہے جس کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا ہے۔ پھر اس خرابی کو سب سے زیادہ جس چیز سے مدد ملی وہ یہ تھی کہ ان

بزرگوں کے بعد اکثر حالات میں تو ان کی ہدایات اور تعلیمات کو تحریری شکل میں قلم بند ہی نہ کیا گیا، اور بعض حالات میں ان طرف توجہ کی بھی گئی تو اس کی حفاظت کا کوئی خاص اہتمام نہ کیا گیا۔ اس لیے تھوڑا زمانہ گزرنے کے بعد اس میں اتنی آمیزش اور تحریف و ترمیم ہو گئی کہ اصل و جعل میں امتیاز کرنا محال ہو گیا۔ اس طرح کسی واضح ہدایت کے موجود نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنا جتنا زمانہ گزرتا گیا حقیقت پر اوہام غالب آتے گئے اور چند صدیوں میں ساری حقیقت گم ہو گئی، صرف افسانے ہی افسانے باقی رہ گئے۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا کے تمام ہادیوں میں یہ خصوصیت صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کی تعلیم اور آپ کی شخصیت ۱۴ صدیوں سے بالکل اپنے حقیقی رنگ میں محفوظ ہے اور خدا کے فضل سے کچھ ایسا انتظام ہو گیا ہے کہ اب اس کا بدلنا غیر ممکن ہے۔ انسان کی اوہام پرستی اور اعجوبہ پسندی سے بعید نہ تھا کہ وہ اس برگزیدہ ہستی کو بھی، جو کمال کے سب سے اعلیٰ درجے پر پہنچی ہوئی تھی، افسانہ بنا کر الوہیت سے کسی نہ کسی طرح متصف کر ڈالتی اور پیروی کے بجائے محض ایک تحیر و استعجاب اور عبادت و پرستش کا موضوع بنا لیتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو بعثتِ انبیاء کے آخری مرحلہ میں ایک ایسا ہادی و رہنما بھیجنا منظور تھا جس کی ذات انسان کے لیے دائمی نمونۂ عمل اور عالمگیر سرچشمۂ ہدایت ہو۔ اس لیے اس نے محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اس ظلم سے محفوظ رکھا جو جاہل معتقدوں کے ہاتھوں دوسرے انبیاء اور ہادیانِ اقوام کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ اوّل تو آپ کے صحابہؓ و تابعینؒ اور بعد کے محدثین نے پچھلی امتوں کے برعکس اپنے نبی کی سیرت کو محفوظ رکھنے کا خود ہی غیر معمولی اہتمام کیا ہے جس کی وجہ سے ہم آپ کی شخصیت کو چودہ سو برس گزر جانے پر بھی آج تقریباً اتنے ہی قریب سے دیکھ سکتے ہیں جتنے قریب سے خود آپ کے عہد کے لوگ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اگر کتابوں کا وہ تمام ذخیرہ دنیا سے مٹ جاتے جو ائمۂ اسلام نے سالہا سال کی محنتوں سے مہیا کیا ہے، حدیث و سیر کا ایک ورق بھی دنیا میں نہ رہے جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہو، اور صرف کتاب اللہ (قرآن) ہی باقی رہ جائے تب بھی ہم اس کتاب سے ان تمام بنیادی سوالات کا جواب حاصل کر سکتے ہیں جو اس کے لانے والے کے متعلق ایک طالب علم کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے؟

رسول کی بشریت

قرآن مجید نے رسالت کے معاملہ میں سب سے پہلے جس مسئلہ کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ رسول کی بشریت ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے صدیوں کے معتقدات نے یہ ایک طے شدہ مسئلہ بنا دیا تھا کہ انسان کبھی اللہ کا رسول اور نائب نہیں بن سکتا۔ دنیا کی اصلاح کے لیے جب کبھی ضرورت ہوتی ہے خدا خود ہی انسان کی صورت

میں ظاہر ہُوا کرتا ہے، یا کسی فرشتے یا دیوتا کو بھیج دیتا ہے، اور یہ کہ جتنے بزرگ دُنیا میں اصلاح کے لیے آتے ہیں وُہ سب کے سب فوق البشر ہستی تھے۔ اِس عقیدے نے انسان کے ذہن میں اتنی گہری جڑیں پکڑلی تھیں کہ جب کبھی اللہ کا کوئی نیک بندہ لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے آتا تو سب سے پہلے لوگ حیرت سے پُوچھتے تھے، یہ کیسا نبی ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا، سوتا اور چلتا پھرتا ہے؟ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ ہماری طرح تمام عوارض اس کو بھی لاحق ہوتے ہیں؟ بیمار ہوتا ہے، تکلیف اور راحت میں مبتلا ہوتا ہے اور رنج و مسرت سے متاثر ہُوا کرتا ہے۔ اگر اللہ کو ہماری ہدایت مقصود ہوتی تو وہ ہم جیسا ایک کمزور انسان کیوں بھیجتا؟ کیا خدا خود نہیں آسکتا تھا؟ یہ سوالات ہر نبی کی بعثت پر ہوتے تھے اور انہی کو حجّت بنا کر لوگ انبیاء کا انکار کیا کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السّلام جب اپنی قوم کی طرف پیغام لے کر آتے تو کہا گیا:

"مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ" (المؤمنون۔ آیت ۲۴)

"یہ شخص اِس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تم ہی جیسا ایک انسان ہے جو تم پر فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اگر خدا چاہتا تو فرشتوں کو اُتارتا۔ یہ انوکھی بات تو ہم نے اپنے بزرگوں سے کبھی سُنی ہی نہ تھی (کہ انسان خدا کا پیغمبر بن کر آتے)۔"

جب حضرت ہُود علیہ السّلام اپنی قوم کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تو ان پر بھی سب سے پہلے یہی اعتراض ہُوا:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (المؤمنون۔ آیات ۳۳،۳۴)

"یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا۔ وہی کچھ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو بڑے ٹوٹے میں رہو گے۔"

جب حضرت مُوسیٰ اور ہارون علیہما السّلام فرعون کے پاس صداقت کا پیغام لے کر پہنچے تو ان کی بات ماننے سے بھی اسی بنا پر انکار کر دیا گیا:

اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا (المؤمنون۔ ۴۷)

"کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟"

چنانچہ ٹھیک یہی سوال اُس وقت بھی اُٹھا جب مکّہ کے ایک اُمّی انسان نے چالیس برس تک خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد دفعتہً اعلان کیا کہ مَیں خدا کی طرف سے رسُول مقرر کیا گیا ہوں۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ ایک شخص جو ہماری طرح ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک، اور جسم و جان رکھتا ہے اللہ کا رسُول کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ حیران ہو کر

پوچھتے تھے کہ

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ - لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (الفرقان - آیات ۷-۸)

"یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس پر کوئی فرشتہ اُترا کہ اس کے ساتھ رہ کر لوگوں کو ڈراتا؟ یا کم از کم اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اُتارا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس کے پھل یہ کھاتا۔"

یہ غلط فہمی چونکہ رسالت کے تسلیم کیے جانے میں سب سے زیادہ مانع ہو رہی تھی اس لیے قرآن مجید میں پُورے زور کے ساتھ اس کی تردید کی گئی اور دلائل کے ساتھ بتایا گیا کہ انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی زیادہ موزوں ہو سکتا ہے، کیونکہ بعثت کا مقصود صرف تعلیم ہی دینا نہیں ہے بلکہ خود عمل کر کے دکھانا اور تقلید و پیروی کے لیے ایک نمونہ پیش کرنا بھی ہے، اور اس مقصد کے لیے اگر ایک فرشتہ یا اور کوئی فوق البشر ہستی بھیجی جائے جس میں بشری خصائص اور کمزوریاں موجود نہ ہوں، تو انسان کہہ سکتا ہے کہ ہم اس کی طرح کیونکر عمل کر سکتے ہیں جب کہ وہ ہماری طرح نفس اور نفسانی خواہشات ہی نہیں رکھتا اور اس کی فطرت میں وہ قوتیں ہی نہیں ہیں جو انسان کو گناہ کی طرف راغب کرتی ہیں۔

لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - آیت ۹۵)

"اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو البتہ ہم بھی اُن پر آسمان کے کسی فرشتے کو رسُول بنا کر اُتارتے۔"

پھر صاف طور پر تصریح کی کہ اس سے پہلے جتنے انبیاء اور ہادیانِ برحق مختلف قوموں میں بھیجے گئے ہیں وہ سب ایسے ہی انسان تھے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اسی طرح کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے جس طرح ہر انسان کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (انبیاء - آیات ۷-۸)

"ہم نے تم سے پہلے جن رسُولوں کو بھیجا تھا وہ بھی آدمی ہی تھے جن پر ہم وحی نازل کرتے تھے۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔ ہم نے اُن انبیاء کو ایسے جسم نہیں دیئے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ غیر فانی تھے۔"

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ

(الفرقان - آیت ۲۰)

"اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے تھے وہ سب کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے"

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (الرعد - آیت ۳۸)

"اور ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے رسُول بھیجے تھے اور ان کے لیے ہم نے بیویاں بھی پیدا کی تھیں اور اُن کو اولاد بھی دی تھی"

اس کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو حکم دیا گیا کہ آپؐ اپنے بشر ہونے کا صاف اعلان کریں تاکہ آپؐ کے بعد لوگ آپؐ کو بھی اُسی طرح اُلوہیّت سے متصف نہ کرنے لگیں جس طرح آپؐ سے پہلے دوسرے انبیاء کو کر چکے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں متعدد جگہ یہ آیت آئی ہے:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (الکہف، آیت ۱۱۰ حٰم السجدہ ۶)

"اے محمدؐ، کہہ دو کہ میں تو محض تم ہی جیسا ایک انسان ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے"

اِن تصریحات نے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کے متعلق تمام فاسد عقائد کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ تمام انبیاء سابقین و بزرگانِ دین کی ذات سے بھی اِس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا۔

رسُول کی قوّت و قدرت

دوسری چیز جس کو نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے وہ نبی کی قوت و قدرت کا مسئلہ ہے۔ جہل و نادانی نے جب خدا رسیدگی کو خدائی کا ہم معنی بنا دیا تو طبعاً اس کے ساتھ یہ عقیدہ بھی پیدا ہو گیا کہ خدا رسیدہ لوگوں میں غیر معمولی طاقتیں ہوتی ہیں۔ خدا کے کارخانے میں ان کو کچھ خاص اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جزا و سزا میں ان کو دخل ہوتا ہے۔ غیب و شہادت سب کچھ اُن پر روشن ہوتا ہے۔ قسمتوں کے فیصلے اُن کی مرضی اور رائے سے اُلٹتے پلٹتے ہیں۔ نفع و ضرر پر اُن کو اقتدار ہوتا ہے۔ خیر و شر کے وہ مالک ہوتے ہیں۔ کائنات کی تمام قوتیں ان کی تابع فرمان ہوتی ہیں۔ اور وہ ایک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر اُن کی ظلمت و ضلالت کو دُور کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی خیالات تھے جن کی بنا پر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا

كِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۔ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل۔ آیات ۹۰ تا ۹۳)

" انہوں نے کہا ہم تو تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین میں سے ایک چشمہ نہ نکال دو، یا تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور اس میں تم نہریں رواں کر دو، یا جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دو، یا اللہ اور ملائکہ کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرو، یا تمہارے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ، اور تمہارے چڑھنے کا بھی اُس وقت تک ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تم ہمارے اوپر ایسی ایک تحریر نازل نہ کرو جسے ہم پڑھیں ۔ اَے محمدؐ، ان سے کہو، پاک ہے میرا رب، کیا میں ایک پیغمبر انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟"

خدا رسیدگی اور بزرگی کے متعلق یہ جتنے غلط تصورات لوگوں میں پائے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سب کی تردید فرمائی اور صاف بتا دیا کہ رسُول کا خدائی طاقتوں اور خدائی کاموں میں ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں ہے چنانچہ فرمایا نبی ہمارے اذن کے بغیر دوسروں کو ضرر سے بچانا تو درکنار خود اپنے آپ سے بھی ضرر کو دفع کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ (الانعام۔ ۱۷)

" اور اَے نبیؐ، اگر خدا تمہیں کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس نقصان کو دُور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تمہیں فائدہ پہنچانا چاہے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (یونس۔ آیت ۴۹)

" اَے محمدؐ، کہو میں تو اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کی قدرت نہیں رکھتا سوائے اُس کے جو خدا چاہے۔"

اور فرمایا کہ نبیؐ کے پاس اللہ کے خزانوں کی کنجیاں نہیں ہیں، نہ وہ علم غیب رکھتا ہے اور نہ اس کو فوق البشری قوتیں حاصل ہیں:-

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَیَّ (الانعام۔ آیت ۵۰)

" اَے محمدؐ، کہو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا حال جانتا

ہُوں اور نہ مَیں تم سے یہ کہتا ہُوں کہ مَیں فرشتہ ہُوں (یعنی انسانی کمزوریوں سے پاک ہوں)۔ مَیں تو صرف اُس چیز کی پیروی کرتا ہُوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔"

وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف۔ آیت ۱۸۸)

"اور اگر مَیں غیب جاننے والا ہوتا تو اپنے لیے بہت کچھ فائدے سمیٹ لیتا اور مجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ مَیں تو محض ایک متنبّہ کرنے والا ہوں اور جو میری بات مان لیں ان کو خوشخبری دینے والا ہُوں۔"

اور فرمایا کہ حساب کتاب اور جزا و سزا میں بھی نبی کا کچھ دخل نہیں۔ اس کا کام صرف پیغام پہنچانا اور سیدھی راہ دکھا دینا ہے۔ آگے محاسبہ اور مواخذہ کرنا اور لوگوں کو جزا و سزا دینا خدا کا کام ہے۔

قُلْ إِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ، مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ۔ قُلْ لَّوْ أَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۔ (الانعام۔ آیات ۵۷-۵۸)

"اے محمدؐ، ان لوگوں سے کہو کہ مَیں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہُوں۔ اور تم نے اُسے جھٹلا دیا ہے۔ اب یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے کہ جس عذاب کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو وہ مَیں خود تمہارے اُوپر نازل کر دُوں۔ فیصلہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی امرِ حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اِن سے کہو کہ اگر کہیں وہ عذاب میرے اختیار میں ہوتا جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، مگر اللہ ہی ظالموں سے نمٹنا خوب جانتا ہے۔"

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد۔ آیت ۴۰)

"اے نبیؐ تمہارا کام تو بس پیغام پہنچا دینا ہے، حساب لینا ہمارا کام ہے۔"

إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (الزمر۔ آیت ۴۱)

"اے نبیؐ، ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے لیے تم پر یہ کتاب حق کے ساتھ اُتاری ہے۔ اب جو کوئی ہدایت قبول کرتا ہے اپنے ہی لیے اچھا کرتا ہے۔ اور جو گمراہی میں پڑتا ہے اپنے ہی حق میں بُرا کرتا ہے۔ اور تم ان پر کوئی حوالہ دار نہیں ہو۔"

اور فرمایا لوگوں کے دلوں کو پھیر دینا اور جن لوگوں میں قبولِ حق کی آمادگی نہ ہو ان میں ایمان پیدا کر دینا نبی کے

بس کی بات نہیں ہے۔ وہ ہادی صرف اس معنی میں ہے کہ نصیحت و تذکیر کا جو حق ہے اس کو وہ پورا پورا ادا کر دیتا ہے اور جو راستہ دیکھنا چاہے اُسے راستہ دکھا دیتا ہے۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ وَمَا أَنْتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ

(النمل۔آیات ۸۰-۸۱)

"تم مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں تک آواز پہنچا سکتے ہو جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر لوٹ جائیں۔ اور نہ تم اندھوں کو گمراہی سے نکال کر سیدھے راستے پر ڈال سکتے ہو۔ تم تو صرف انہی لوگوں کو سُنا سکتے ہو جو ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں اور پھر سرِ اطاعت جھکا دیتے ہیں۔"

وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (فاطر۔آیات ۲۲-۲۴)

"تم قبر کے مُردوں کو سُنانے والے نہیں ہو۔ تم تو صرف آگاہ کر دینے والے ہو۔ اور ہم نے تم کو حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے[1]۔"

---

[1] قرآن میں ایک اور مقام پر یہ بات نہایت واضح الفاظ میں ارشاد ہُوئی ہے:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔ (القصص: ۵۶)	اے نبیؐ، تم جسے چاہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں۔

صحیحین کی روایت ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابُوطالب کے معاملہ میں نازل ہُوئی ہے۔ اُن کا جب آخری وقت آیا تو حضورؐ نے اپنی حد تک انتہائی کوشش کی کہ وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ پر ایمان لے آئیں تاکہ اُن کا خاتمہ بالخیر ہو، مگر انہوں نے مِلّتِ عبدالمطّلب پر ہی جان دینے کو ترجیح دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَحْبَبْتَ۔ لیکن محدثین و مفسّرین کا یہ طریقہ معلوم و معروف ہے کہ ایک آیت عہدِ نبوی کے جس معاملہ پر چسپاں ہوتی ہو اُسے وہ آیت کی شانِ نزول کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس لیے اس روایت اور اس مضمون کی اُن دوسری روایات سے جو ترمذی اور مُسنداحمد وغیرہ میں حضرات ابُوہریرہؓ، ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ وغیرہم سے مروی ہیں، لازماً یہی نتیجہ نہیں نکلتا کہ سُورۂ قصص کی یہ آیت جناب ابوطالب کی وفات کے وقت نازل ہُوئی تھی۔ بلکہ ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے مضمون کی

پھر یہ بھی صاف بتا دیا کہ نبیؐ کو جو کچھ قدر و عزت اور علوِ مرتبت حاصل ہے سب اس بنا پر ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے، اس کے احکام پر ٹھیک ٹھیک چلتا ہے، اور جو کچھ کلام اس پر نازل کیا جاتا ہے اسے جوں کا توں اللہ کے بندوں تک پہنچا دیتا ہے۔ ورنہ اگر وہ اطاعت سے منہ موڑے اور اللہ کے کلام میں اپنے دل سے گھڑ کر باتیں ملا دے تو اس کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے بلکہ وہ خدا کی پکڑ سے بچ بھی نہ سکے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ

(البقرہ۔ آیت ۱۴۵)۔

"اور اے نبیؐ، اگر تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اُس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آ گیا ہے، تو یقیناً اس صورت میں تم ظالم ہو گے۔"

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (البقرہ۔ آیت ۱۲۰)۔

"اور اگر اے نبیؐ، تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آیا ہے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو تمہیں اللہ کی سزا سے بچانے والا کوئی حامی اور مددگار نہ ہو گا۔"

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (یونس۔ آیت ۱۵)

"اے محمدؐ، ان سے کہو، مجھ کو اس کلام میں اپنی طرف سے کچھ رد و بدل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ میں تو صرف اُس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔"

۴۔ صراحت سب سے زیادہ اس موقع پر ظاہر ہوئی۔ اگرچہ حضورؐ کی دلی خواہش تو ہر بندۂ خدا کو راہِ راست پر لانے کی تھی، لیکن سب سے بڑھ کر اگر کسی شخص کا کفر پر رہنا حضورؐ کو شاق ہو سکتا تھا، اور ذاتی محبت و تعلق کی بنا پر سب سے زیادہ کسی شخص کی ہدایت کے آپ آرزومند ہو سکتے تھے تو وہ ابو طالب تھے۔ لیکن جب ان کو بھی ہدایت دینے پر آپؐ قادر نہ ہوئے تو یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی کہ کسی کو ہدایت بخشنا اور کسی کو اس سے محروم رکھنا نبی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ معاملہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اللہ کے ہاں سے یہ دولت کسی رشتہ داری و برادری کی بنا پر نہیں بلکہ آدمی کی قبولیت و استعداد اور مخلصانہ صداقت پسندی کی بنا پر عطا ہوتی ہے۔ (۱)

یہ باتیں اس لیے نہیں کہی گئی ہیں کہ معاذ اللہ رسولِ اکرمؐ سے کسی نافرمانی یا تحریف و تلبیس کا ادنیٰ سا اندیشہ بھی تھا۔ دراصل ان سے مقصود دنیا پر یہ حقیقت واضح کرنا تھا کہ نبی کو بارگاہِ ربّ العزت میں جو تقرّب حاصل ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ نبی کی ذات سے اللہ کا کوئی رشتہ ہے، بلکہ اس کے مقرّب ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کا نہایت درجہ مطیع فرمان اور دل وجان سے اس کا بندہ ہے۔

حضورؐ جماعتِ انبیاء کے ایک فرد ہیں

تیسری چیز جس کا بارہا نہایت صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نئے نبی نہیں ہیں، بلکہ جماعتِ انبیاء کے ایک فرد اور اُس سلسلۂ نبوت کی ایک کڑی ہیں جو ابتدائے آفرینش سے لے کر آپ کی بعثت تک جاری رہا اور جس میں ہر قوم اور ہر زمانے کے انبیاء و رُسل شامل ہیں۔ قرآنِ حکیم نبوت و رسالت کو کسی ایک ذات یا ایک ملک یا ایک قوم سے مخصوص نہیں کرتا۔ بلکہ وہ صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانے میں ایسے مقدس نفوس پیدا کیے ہیں جنہوں نے انسان کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دی ہے اور گمراہی کے بُرے نتائج سے ڈرایا ہے:

وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر۔ آیت ۲۴)

"کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں کوئی متنبّہ کرنے والا نہ آیا ہو۔"

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (النحل آیت ۳۶)

"اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا (اس پیغام کے ساتھ کہ) اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے پرہیز کرو۔"

اور انہی پیغمبروں اور ڈرانے والوں میں سے ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ ارشاد ہوتا ہے:

هَٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ (النجم۔ آیت ۵۶)

"یہ ایک ڈرانے والا ہے اگلے ڈرانے والوں میں سے۔"

إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (یٰسٓ۔ ۳)

"اے محمدؐ، یقیناً تم پیغمبروں میں سے ہو۔"

قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (الاحقاف۔ آیت ۹)۔

"اے محمدؐ، کہو میں کوئی نرالا رسول نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ برتا جائیگا اور تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ میں تو اُس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے اور میں

محض ایک دُہرانے والا مُبلّغ صاف صاف ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ (آلِ عمران۔آیت ۱۴۴)

"محمدؐ کچھ نہیں ہیں مگر ایک رسُول اور اُن سے پہلے بھی رسُول گزر چکے ہیں"

یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ رسُولِ عربی کی دعوت وہی دعوت ہے جس کی طرف ابتدائے آفرینش سے ہر داعیِ حق بلاتا رہا ہے، اور آپؐ اُسی دینِ فطرت کی تلقین کرتے ہیں جس کی تلقین ہمیشہ اللہ کے ہر نبی اور رسُول نے کی ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (البقرہ۔ آیات ۱۳۶ - ۱۳۷)

"کہو، ہم ایمان لاتے اللہ پر اور اُس تعلیم پر جو ہماری طرف اُتاری گئی ہے اور اُس پر جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اُتاری گئی اور جو موسٰیؑ اور عیسٰیؑ اور دوسرے نبیوں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مطیع فرمان ہیں۔ پس اگر یہ لوگ بھی اُسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو وہ سیدھے راستے پر ہیں"

قرآن مجید کی یہ تصریحات اس حقیقت میں کسی شک وشُبہ کی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے تھے اور نہ پچھلے پیغمبروں میں سے کسی کی تکذیب یا کسی کے لائے ہُوئے پیغام کی تردید کرنے کے لیے تشریف لائے تھے بلکہ آپؐ اس لیے بھیجے گئے تھے کہ اُسی سچّے دین کو جو اوّل دن سے تمام قوموں کے پیغمبر پیش کرتے چلے آتے تھے، بعد کے لوگوں کی ملاوٹوں سے پاک کرکے پیش کردیں۔

حضورؐ کے مقاصدِ بعثت

اِس طرح قرآن مجید اپنے لانے والے کی صحیح حیثیت واضح کرنے کے بعد اُن کاموں کی تفصیل بیان کرتا ہے جن کے لیے اللہ نے اُسے بھیجا تھا۔ یہ کام بحیثیتِ مجموعی دو شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک شعبۂ تعلیمی۔ دوسرا شعبۂ عملی۔

آپؐ کا تعلیمی کام

اِس شعبے کے کام حسبِ ذیل ہیں:

(۱) تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفوس، اور تعلیم کتاب وحکمت۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (آل عمران آیت ۱۶۴)۔

"درحقیقت ایمان لانے والوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اُن کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا رسول اٹھایا جو انہیں اُس کی آیات سُناتا ہے، اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے"۔

تلاوتِ آیات سے مُراد اللہ کے فرامین اور ارشادات جوں کے توں سُنا دینا ہے۔ تزکیہ سے مُراد یہ ہے کہ لوگوں کے اخلاق اور ان کی زندگی کو بُری صفات، بُری رسموں اور بُرے طریقوں سے پاک کیا جائے اور ان کے اندر اچھے اور صاف پاکیزہ اخلاق اور صحیح طریقوں کو نشوونما دیا جائے۔ تعلیم کتاب و حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کی کتاب کا صحیح منشا و مدعا سمجھایا جائے، ان کے اندر ایسی بصیرت پیدا کی جائے کہ وہ کتاب کی اصل رُوح تک پہنچ سکیں، اور انہیں وہ حکمت سکھائی جائے جس سے وہ اپنی زندگی کے تمام مختلف وسعت پذیر پہلوؤں کو کتاب اللہ کے مطابق ڈھالتے چلے جائیں۔

(۲) تکمیلِ دین

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

(المائدہ ۳)

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کے طریقے کو پسند کیا"۔

دوسرے الفاظ میں قرآن کے بھیجنے والے نے اُس کے لانے والے سے صرف اتنی ہی خدمت نہیں لی کہ وہ اُس کی آیات کی تلاوت کر دے، نفوس کا تزکیہ کر دے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے دے، بلکہ اُس نے اپنے اُسی نیک بندے کے ذریعے سے اِس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ جو آیات نوعِ انسانی تک بھیجنی تھیں وہ سب اُس کے واسطے سے بھیج دیں۔ جن خرابیوں سے انسانی زندگی کو پاک کرنا مقصود تھا وہ سب اس کے ہاتھوں سے دُور کرا کے دکھا دیں۔ جن خوبیوں کا نشوونما جس شان کے ساتھ افراد اور سوسائٹی میں ہونا چاہیے تھا اُس کا بہترین نمونہ اسی کی رہنمائی میں پیش کرا دیا۔ اور کتاب و حکمت کی ایسی تعلیم اس کے ذریعے سے دلوا دی کہ آنے والے تمام زمانوں میں مقصودِ کتاب کے مطابق انسانی زندگی کی تشکیل و تعمیر کی جا سکتی ہے۔

(۳) اُن تمام اختلافات کی حقیقت واضح کر دینا جو اصل دین میں پچھلے انبیاء کی اُمتوں کے درمیان پیدا ہو گئے تھے، اور تمام پردوں کو ہٹا کر، تمام آمیزشوں کو چھانٹ کر، تمام اُلجھنوں کو صاف کر کے، اُس راہِ راست کو

پوری روشنی میں نمایاں کر دیا جس کی پیروی ہمیشہ سے خدا کی رضا کو پہنچنے کی ایک ہی راہ رہی ہے:

تَاللَّهِ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ ۙ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (النحل۔ آیات ۶۳-۶۴)

"بخدا کہ ہم نے (اے محمدؐ) تم سے پہلے مختلف امتوں کی طرف ہدایت بھیجی، مگر اس کے بعد شیطان نے اُن کے غلط اعمال کو اُن کے لیے خوشنما بنا دیا۔ چنانچہ آج وہی اُن کا سرپرست بنا ہوا ہے اور وہ دردناک عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں۔ اور ہم نے تم پر یہ کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ اُس حقیقت کو اُن کے سامنے واضح کر دو جس میں اُن کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور اس لیے کہ یہ کتاب ہدایت اور رحمت بن کر اُن لوگوں کے لیے جو اس کی پیروی قبول کریں۔"

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ ۚ قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ۝ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (المائدہ۔ آیات ۱۵-۱۶)

"اے اہلِ کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے جو تمہارے سامنے بہت سی اُن چیزوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جنہیں تم کتاب میں سے چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کتاب آ گئی ہے جس کے ذریعہ سے اللہ اُن لوگوں کو جو اس کی پسند کے مطابق چلتے ہیں امن و سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور انہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔"

(۴) نافرمانوں کو ڈرانا، فرمانبرداروں کو رحمتِ الٰہی کی خوشخبری دینا اور اللہ کے دین کی اشاعت کرنا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (الاحزاب۔ آیات ۴۵-۴۶)

"اے نبیؐ، ہم نے تم کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔"

آپؐ کا عملی کام

عملی زندگی اور اس کے معاملات کے سلسلے میں جو کام حضورؐ کے سپرد کیے گئے تھے وہ یہ ہیں:

(۱) نیکی کا حکم دینا، بُرائی سے روکنا، حرام و حلال کی حدود قائم کرنا اور انسان کو خدا کے سوا دوسروں کی عائد کردہ پابندیوں سے آزاد اور ان کے لادے ہوئے بوجھوں سے ہلکا کرنا:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

(الاعراف، آیت ۱۵۷)

"وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

(۲) بندگانِ خدا میں حق اور عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا:

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا (النساء، ۱۰۵)

"اے محمدؐ! ہم نے تم پر حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم اللہ کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرو اور خیانت کرنے والوں کے وکیل نہ بنو۔"

(۳) اللہ کے دین کو اس طرح قائم کر دینا کہ انسانی زندگی کا پورا نظام اُسی کے تابع ہو اور دوسرے سب طریقے اُس کے مقابلے میں دب کر رہ جائیں:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (الفتح، ۲۸)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے نبی کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے۔"

اس طرح نبی کے کام کا یہ شعبہ سیاست، عدالت، اصلاحِ اخلاق و تمدن اور قیامِ تہذیبِ صالح کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو جاتا ہے۔

نبوتِ محمدی کی عالمگیریت اور ابدیت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کام کسی ایک قوم یا ملک یا دور کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے عام ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

(سبا۔ آیت ۲۸)

"اے محمدؐ، ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (الاعراف۔ آیت ۱۵۸)

"اے محمدؐ، کہو اے انسانو، میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں، اُس خدا کا رسول، جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے، جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، جو جلانے اور جلانے والا ہے پس ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول نبیٔ اُمی پر جو خدا اور اس کے فرامین پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی پیروی کرو، اُمید ہے کہ تم راہِ راست پا لوگے۔"

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام۔ آیت ۱۹)

"(اے محمدؐ، کہو) اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے سے تم کو متنبہ کروں اور ہر اُس شخص کو جسے یہ پہنچے۔"

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ۔ (التکویر آیات ۲۷-۲۸)

"یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے تمام دُنیا والوں کے لیے، ہر اُس شخص کے لیے جو تم میں سے راست رَو بننا چاہے۔"

ختمِ نبوّت

نبوتِ محمدیؐ کی ایک اور خصوصیت قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اُس پر سلسلۂ نبوت و رسالت ختم کر دیا گیا اور اس کے بعد دنیا کو پھر کسی نبی کی حاجت باقی نہ رہی:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔ (الاحزاب۔ ۴۰)

"محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسُول ہیں اور نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں۔"

یہ حقیقت لازمی نتیجہ ہے نبوتِ محمدیؐ کی عالمگیری اور ابدیت اور تکمیلِ دین کا۔ چونکہ قرآن کے مذکورۂ بالا بیانات کی رُو سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ہے نہ کہ ایک قوم کے لیے،

اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے نہ کہ ایک زمانہ کے لیے، اور آپ کے ذریعہ وہ کام بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے جس کے لیے دنیا میں انبیاء کے آنے کی ضرورت تھی۔ اس لیے یہ سراسر معقول بات ہے کہ آپ پر سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا گیا۔ اس مضمون کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین اسلوب کے ساتھ ایک حدیث میں واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میری مثال نبیوں میں ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک نہایت خوب صورت مکان بنایا اور تمام عمارت بنا کر صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ اب جو لوگوں نے اس کے گرد چکر لگایا تو وہ خالی جگہ انہیں کھٹکنے لگی اور وہ کہنے لگے کہ اگر یہ آخری اینٹ بھی رکھ دی جاتی تو مکان بالکل مکمل ہو جاتا۔ سو وہ آخری اینٹ جس کی جگہ نبوت کے محل میں باقی رہ گئی تھی، میں ہی ہوں۔ اب میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس مثال سے ختم نبوت کی وجہ صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ جب دین کامل ہو چکا، آیاتِ الٰہی پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکیں، اوامر و نواہی، عقائد و عبادات، تمدن و معاشرت، حکومت و سیاست، غرض انسانی زندگی کے ہر شعبے کے متعلق پورے پورے احکام بیان کر دیے گئے، اور دنیا کے سامنے اللہ کا کلام اور اللہ کے رسول کا اسوۂ حسنہ اس طرح پیش کر دیا گیا کہ ہر قسم کی تحریف و تبدیل سے وہ پاک ہے اور ہر عہد میں اُس سے ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے، تو نبوت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ صرف تجدید و تذکیر کی ضرورت رہ گئی ہے جس کے لیے علمائے حق اور مومنین صادقین کی جماعت کافی ہے۔

حضورؐ کے اوصافِ حمیدہ

آخری سوال جو دریافت طلب رہ جاتا ہے یہ ہے کہ اس کتاب کا لانے والا ذاتی طور پر کس قسم کے اخلاق کا انسان تھا؟ اس سوال کے جواب میں قرآن مجید نے دوسری سابق الوقت کتابوں کی طرح اپنے لانے والے کی تعریف کے پل نہیں باندھے ہیں، نہ آپ کی تعریف کو ایک مستقل موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ البتہ آیات میں محض اشارۃً آنحضرتؐ کی اخلاقی خصوصیات ظاہر کی ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس وجودِ مسعود میں کمالِ انسانیت کے بہترین خصائص موجود تھے۔

(۱) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا اخلاق کے نہایت بلند مقام پر تھا:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (ن - ۴)

"اور اے محمدؐ یقیناً تم اخلاق کے بڑے بلند مرتبے پر ہو۔"

(۲) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا ایک ایسا راسخ العزم، مستقیم الارادہ اور اللہ پر ہر حال میں بھروسا کرنے والا انسان تھا کہ جس وقت اُس کی ساری قوم اُسے مٹا دینے پر آمادہ ہو گئی تھی اور وہ صرف ایک مددگار کے ساتھ ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا، اُس سخت خطرے کے موقع پر بھی اُس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے عزم پر قائم رہا:

إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ

إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ۔ آیت ۴۰)

"یاد کرو جب کہ کافروں نے اس کو نکال دیا تھا جبکہ وہ غار میں صرف ایک آدمی کے ساتھ تھا جبکہ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

(۳) وہ بتاتا ہے کہ اس کو لانے والا ایک نہایت فراخ حوصلہ اور دریا دل انسان تھا جس نے اپنے بدترین دشمنوں کے لیے بھی بخشش کی دعا کی اور آخر اللہ تعالیٰ کو اسے اپنا یہ قطعی فیصلہ سنا دینا پڑا کہ وہ ان لوگوں کو نہیں بخشے گا:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (التوبہ۔ آیت ۸۰)

"چاہے تم ان کے لیے معافی مانگو چاہے نہ مانگو، اگر تم ستر بار بھی ان کے لیے معافی مانگو گے تب بھی اللہ ان کو معاف نہ کرے گا۔"

(۴) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کا مزاج نہایت نرم تھا، وہ کبھی کسی کے ساتھ درشتی سے پیش نہیں آتا تھا اور اسی لیے دنیا اس کی گرویدہ ہو گئی تھی:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران۔ آیت ۱۵۹)

"یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان کے ساتھ نرم ہو ورنہ اگر تم زبان کے تیز اور دل کے سخت ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ کر الگ ہو جاتے۔"

(۵) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا بندگانِ خدا کو راہِ راست پر لانے کی سچی تڑپ دل میں رکھتا تھا اور ان کے گمراہی پر اصرار کرنے سے اس کی روح کو شدید صدمہ پہنچتا تھا حتیٰ کہ وہ ان کے غم میں گھلا جاتا تھا:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (الکہف)

"اے محمدؐ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ان کے پیچھے رنج و غم میں اپنی جان کھو دو گے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔"

(۶) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کو اپنی اُمت سے بے حد محبت تھی۔ وہ ان کی بھلائی کا حریص تھا، ان کے نقصان میں پڑنے سے کڑھتا تھا اور ان کے حق میں سراپا شفقت و رحمت تھا:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (التوبہ ۔ ۱۲۸)

"تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے جسے ہر وہ چیز شاق گزرتی ہے جو

تمہیں نقصان پہنچانے والی نہو، جو تمہاری فلاح کا حریص ہے اور اہلِ ایمان کے ساتھ نہایت شفیق و رحیم ہے۔"

(۷) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا صرف اپنی قوم ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالم کے لیے اللہ کی رحمت تھا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء۔ ۱۰۷)

"اے محمدؐ، ہم نے تم کو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

(۸) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا راتوں کو گھنٹوں اللہ کی عبادت کرتا اور خدا کی یاد میں کھڑا رہتا تھا:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ (المزمل۔ ۲۰)

"اے محمدؐ، تمہارا رب جانتا ہے کہ تم رات کو تقریباً دو تہائی حصہ تک اور کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی حصہ تک نماز میں کھڑے رہتے ہو۔"

(۹) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا ایک سچا انسان تھا، نہ کبھی اپنی زندگی میں راہِ حق سے بھٹکا، نہ فاسد خیالات سے متاثر ہوا اور نہ کبھی اس نے ایک لفظ خواہشِ نفس کی پیروی میں حق کے خلاف زبان سے نکالا:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (النجم۔ آیات ۲۔۳)

"لوگو، تمہارا صاحب نہ کبھی سیدھی راہ سے بھٹکا اور نہ غلط خیالات سے بہکا اور نہ وہ خواہشِ نفس سے بولتا ہے۔"

(۱۰) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کی ذات تمام عالم کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ تھی اور اس کی پوری زندگی کمالِ اخلاق کا صحیح معیار تھی:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۔ آیت ۲۱)

"تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے۔"

قرآن مجید کا تتبع کرنے سے صاحبِ قرآن کی بعض اور خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے، لیکن اس مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ جو کوئی قرآن کا مطالعہ کرے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ بخلاف دوسری موجود الوقت مذہبی کتابوں کے یہ کتاب اپنے لانے والے کو جس رنگ میں پیش کرتی ہے وہ کس قدر صاف، واضح اور آلودگی سے پاک ہے۔ اس میں نہ اُلوہیت کا کوئی شائبہ ہے، نہ تعریف و ثنا میں کوئی مبالغہ ہے، نہ غیر معمولی قوتیں آپؐ کی طرف منسوب کی گئی ہیں، نہ آپؐ کو خدا کے کاروبار میں شریک و سہیم بنایا گیا ہے، اور نہ آپؐ کو ایسی کمزوریوں سے متہم کیا گیا ہے جو ایک ہادی اور داعی الی الحق کی شان سے گری ہوئی ہوں۔ اگر اسلامی لٹریچر کی دوسری تمام کتابیں دُنیا سے ناپید ہو جائیں اور صرف قرآن مجید ہی باقی رہ جائے تب بھی رسولِ اکرمؐ کی شخصیت

کے متعلق کسی غلط فہمی، کسی شک و شبہ اور کسی لغزشِ عقیدت کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ ہم اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کتاب کا لانے والا ایک کامل انسان تھا، بہترین اخلاق سے متصف تھا، انبیاء سابقین کی تصدیق کرتا تھا، کسی نئے مذہب کا بانی نہ تھا، اور کسی فوق البشر حیثیت کا مدعی نہ تھا۔ اُس کی دعوت تمام عالم کے لیے تھی، اُس کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے چند مقرر خدمات پر مامور کیا گیا تھا اور جب اُس نے ان خدمات کو پوری طرح انجام دے دیا تو نبوت کا سلسلہ اس کی ذات پر ختم ہو گیا۔[1] (۲)

---

[1] دراصل یہ مضمون ۱۹۴۷ء میں اخبار "الجمعیۃ" دہلی کے حبیب نمبر کے لیے لکھا گیا تھا۔ پھر ۱۹۴۳ء میں اس کو دوبارہ ترجمان القرآن میں شائع کیا گیا، اور اس کے بعد تفہیمات جلد دوم میں شامل کر دیا گیا۔ اب اس کتاب میں درج کرتے وقت اس کے اندر بعض اضافے کر دیے گئے ہیں۔ (مؤلف)

حوالہ جات

(۱) تفہیم القرآن، جلد سوم۔ القصص۔ آیت ۴۹۔
(۲) تفہیمات، حصہ دوم، صفحات ۶ تا ۴۸۔

باب (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان

حضرت ابراہیم علیہ السلام

یہ بات تاریخی طور پر مسلّم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کی اُس شاخ سے تھا جو اُن کے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ سے چلی ہے اور بنی اسماعیل کہلاتی ہے۔ حضورؐ کی سیرت سے اِس معاملہ کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ آپؐ کے ذکرِ مبارک کو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے حالات ہی سے شروع ہونا چاہیے، کیونکہ اس کے بغیر نہ یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ عراق کا یہ خاندان اندرونِ عرب کے ایک دُور دراز مقام، مکّہ کیسے پہنچا، یہاں قبلۂ اہلِ توحید کی بنا کیسے پڑی، اور عرب کے اکثر و بیشتر قبائل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا رشتہ تھا جس کی وجہ سے آپؐ اِس ملک میں ایک غیر معروف نہیں بلکہ خوب جانی بوجھی شخصیت تھے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے حضرت ابراہیمؑ عراق کے رہنے والے تھے۔ اُن کا وطن اُر، عراق کے نمرود خاندان کا دارالسلطنت تھا۔ ۲۱۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں، جو بالعموم محققین کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ کے ظہور کا زمانہ سمجھا جاتا ہے، یہ ایک بہت بڑا مرکزِ تمدن و تجارت تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ اُس قوم کے شرک کا گڑھ بھی یہی تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اس قوم میں شرک کی مخالفت اور توحید کی دعوت کا آغاز کیا، تو ملک کی حکومت، ساری قوم، اُن کا اپنا خاندان، حتّٰی کہ اُن کا باپ بھی اُن کا دشمن ہوگیا، اور جب وہ سب اُن کو ڈرا دھمکا کر اِس کام سے باز رکھنے میں ناکام ہوگئے تو آخرکار انہوں نے متفق ہو کر آنجناب کو زندہ جلا دینے کے لیے آگ سے بھری ہوئی ایک خندق میں پھینک دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؑ کے لیے آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور آپؑ اِس خندق سے زندہ و سلامت نکل آئے۔ یہ قصّہ تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں مذکور ہے (ملاحظہ ہو الانبیاء آیات ۶۸ - ۶۹۔ العنکبوت، آیت ۲۴۔ الصّٰفّٰت، ۹۷ - ۹۸)۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ اس کے بعد آپؑ اپنا وطن چھوڑ کر سرزمین شام و فلسطین کی طرف ہجرت کر گئے جو اُس زمانہ میں ارضِ کنعان کہلاتی تھی۔ اِس ہجرت میں اُن کے بھتیجے حضرت لوطؑ اُن کے ساتھ تھے کیونکہ وہی اُن کی قوم

میں سے ایمان لاتے تھے اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو بھی نبوّت سے سرفراز فرمایا۔ دوسری رفیق حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سارہؓ تھیں جنہوں نے مرتے دم تک آپؑ کا ساتھ دیا۔ اس باب میں قرآن مجید کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿﴾ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ﴿﴾ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ (الصّٰفّٰت: ۹۷-۹۹)

"انہوں نے آپس میں کہا، اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دو۔ انہوں نے اُس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا۔ اور ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں (یعنی ہجرت کرتا ہوں)، وہی میری رہنمائی فرمائے گا۔"

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ ... فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ ۘ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (العنکبوت: ۲۴، ۲۶)

"پھر اُس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا، اسے قتل کر دو یا جلا ڈالو۔ آخر کار اللہ نے اُسے آگ سے بچا لیا ..... اُس وقت لوطؑ نے اُس کو (یعنی حضرت ابراہیمؑ کو) مانا اور ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں، وہ زبردست اور حکیم ہے۔"

وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ (الانبیاء: ۷۱)

"اور ہم اُسے (یعنی حضرت ابراہیمؑ کو) اور لوطؑ کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔"[1]

وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (الانبیاء: ۷۴)

"اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم بخشا (یعنی نبوت عطا کی)۔"

وَإِنَّ لُوطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِينَ (الصّٰفّٰت: ۱۳۳)

"اور لوطؑ بھی اُن لوگوں میں سے تھا جو رسول بنائے گئے ہیں۔"

حضرت ابراہیمؑ کی اس ہجرت کے بعد ان کی قوم کا کیا انجام ہوا اس کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں نہیں آئی ہے، مگر سورۃ توبہ آیت ۷۰ میں اس کا ذکر بھی اُن قوموں میں کیا گیا ہے جو عذاب میں مبتلا کی گئیں۔

---

[1] برکت والی زمین اور بستیوں سے مراد شام و فلسطین کا علاقہ ہے جیسے سورۂ اعراف آیت ۱۳۷، بنی اسرائیل آیت ۱، اور الانبیاء آیت ۸۱ میں بھی اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے (تفہیم القرآن، جلد چہارم، سبا، حاشیہ ۲۷)۔

رہی یہ بات کہ ہجرت میں حضرت لوطؑ کے ساتھ حضرت سارہؑ بھی حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ تھیں، تو اس کی تصریح اگرچہ قرآن میں نہیں کی گئی ہے، لیکن قرآن کے بعض بیانات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہجرت کے وقت حضرت ابراہیمؑ شادی شدہ تھے اور ان کی اہلیہ ہجرت میں ان کے ساتھ شریک تھیں۔ مثلاً سورۂ صافات میں ہے کہ ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِينَ "میرے پروردگار مجھے صالح اولاد عطا فرما"۔ یہ دعا ایک شادی شدہ آدمی ہی کر سکتا تھا اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ وطن سے ہجرت کرتے وقت یہ دعا کر رہا ہو۔ بائیبل کے تاریخی بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس ہجرت میں حضرت سارہؑ شامل تھیں لیکن اس سلسلہ میں بائیبل کے دوسرے بیانات بالکل بے سروپا ہیں۔ مثلاً وہ کہتی ہے کہ حضرت سارہ حضرت لوطؑ کی حقیقی بہن اور حضرت ابراہیمؑ کی سگی بھتیجی تھیں جن سے انھوں نے نکاح کیا تھا اور اس ہجرت میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کا باپ بھی شریک تھا (پیدائش، باب ۱۱۔ فقرات ۲۷ تا ۳۲)۔ حالانکہ صرف قرآن ہی نہیں تلمود بھی یہ شہادت دیتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر دعوت توحید کی پاداش میں جو مظالم کیے گئے تھے ان میں خود ان کا باپ بھی شریک تھا۔ (منتخبات تلمود از ایچ پولانو، لندن، صفحہ ۳۰ تا ۴۲) نیز یہ بات خدا کی کسی شریعت میں بھی جائز نہ تھی کہ کوئی شخص اپنی سگی بھتیجی سے شادی کرے، کجا کہ ایک نبی اس کا مرتکب ہو۔ (1)

حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغی سرگرمیاں

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انہوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستان عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں خلیفہ مقرر کیے۔ شرق اردن میں اپنے بھتیجے لوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے چھوٹے بیٹے حضرت اسحٰقؑ کو، اور اندرون عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں، ایک حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب کے قبیلے نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ ان کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے، اس لیے وہ اپنا سلسلہ انہی سے جوڑتے تھے۔[1] دوسرے

---

[1] چونکہ حضورؐ کے دور تک ڈھائی ہزار سال کے زمانے میں اولاد اسماعیلؑ کے مختلف خاندانوں نے اہل عرب کے دوسرے بہت سے خاندانوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کیے تھے، اس لیے جیسا کہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے، یہ دوسرے

حضرت اسحٰقؑ کی اولاد جن میں حضرات یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے تھے، اور حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا، انھوں نے یا تو اپنی انفرادیت بھی اُن کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو اُن سے الگ رہے، مگر مذہباً ان کے متبع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔

حضرت ابراہیمؑ کا اصل کام دُنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے مطابق انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام درست کرنا تھا۔ وہ خود اللہ کے مُطیع تھے، اس کے دیے ہوئے علم کی پیروی کرتے تھے، دُنیا میں اُس علم کو پھیلاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سب انسان مالکِ کائنات کے مُطیع ہو کر رہیں۔ یہی خدمت تھی جس کے لیے وہ دنیا کے امام و پیشوا بنائے گئے۔ اُن کے بعد یہ امامت کا منصب اُن کی نسل کی اُس شاخ کو ملا جو حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ سے چلی اور بنی اسرائیل کہلائی۔ اُسی میں انبیاء پیدا ہوتے رہے، اسی کو راہِ راست کا علم دیا گیا، اسی کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ اس راہِ راست کی طرف اقوامِ عالم کی رہنمائی کرے، اور یہی وہ نعمت تھی جسے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بار بار اس نسل کے لوگوں کو یاد دلایا ہے۔ اس شاخ نے حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بیت المقدس کو اپنا مرکز قرار دیا۔ اس لیے جب تک یہ شاخ امامت کے منصب پر قائم رہی، بیت المقدس ہی دعوت الیٰ اللہ کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔ (۲)

حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش

اولادِ ابراہیمؑ کی دوسری شاخ، بنی اسرائیل میں جو دوسرے عیوب پیدا ہو گئے اُن میں سے ایک عیب یہ بھی تھا کہ تاریخ کو مسخ کر کے ہر فخر کو وہ اپنے لیے مخصوص کرنے لگے، اور جن بھی دوسری قوموں سے تاریخ کے دوران میں ان کی کشمکش یا رقابت رہی اُن سب کا گنہ کالا کرنے کی انھوں نے پوری کوشش کی۔ بائیبل میں اس کی بہت سی مثالوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس کے نزدیک حضرت لُوطؑ سرے سے پیغمبر ہی نہ تھے اور کسی دعوت کے کام پر حضرت ابراہیمؑ نے اُن کو مامور کر کے ارضِ سدوم میں نہیں بھیجا تھا، بلکہ دونوں چچا بھتیجے میں جھگڑا ہو گیا تھا اور چچا نے بھتیجے کو الگ کہیں اور جا بسنے کے لیے کہہ دیا تھا (پیدائش، باب ۱۳، فقرات ۵ تا ۱۲)۔ دوسری اس سے بھی زیادہ گھناؤنی مثال یہ ہے کہ بائیبل کی رُو سے جب قومِ لُوطؑ پر عذاب آیا تو حضرت لُوطؑ اپنی دو بیٹیوں کو لے کر وہاں سے نکل گئے

۲۔ خاندان بھی اِس مقدس خاندان کے ساتھ رشتہ داری کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اپنے نسب ناموں میں اس کا ذکر کرتے تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

اور اپنے چچا کے پاس نہیں گئے جو ارضِ سدوم سے قریب ہی فلسطین کے شہر حبرون میں رہتے تھے، بلکہ ایک غار میں جا کر رہنے لگے۔ وہاں معاذ اللہ ان کی دونوں بیٹیوں نے ان کو شراب پلا کر ان سے ہم آغوشی کی جس سے دونوں حاملہ ہو گئیں۔ ایک سے موآب پیدا ہوا جو موآبیوں کا باپ ہے، اور دوسری سے بن عمی پیدا ہوا جو بنی عمون کا باپ ہے (پیدائش، باب ۱۹۔ فقرات ۳۰ تا ۳۸)۔ یہ ڈھنگ ہے جس سے بنی اسرائیل نے موآبیوں اور عمونیوں کے خلاف اپنے دل کا بغض نکالا ہے، کیونکہ بعد کی تاریخ میں ان قبیلوں سے اُن کی سخت کشمکش برپا رہی ہے۔

ایسا ہی معاملہ ان لوگوں نے بنی اسماعیل سے بھی کیا ہے۔ بائیبل میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ حضرت ہاجرہؑ، حضرت سارہؑ کی کنیز تھیں۔ حضرت سارہؑ نے یہ دیکھ کر کہ وہ بے اولاد ہیں، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ آپ میری لونڈی کے پاس جائیں تاکہ میرا گھر کسی طرح آباد ہو۔ چنانچہ ان کے کہنے پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہؑ سے تمتع کیا اور ان سے حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے (پیدائش، باب ۱۶۔ فقرات ۱ تا ۴۔ ۱۵۔ ۱۶)۔ حالانکہ بائیبل کی اسی کتاب پیدائش کے باب ۱۲ فقرہ ۱۶ میں بتایا گیا ہے کہ اُس وقت کے فرعون نے بہت مال مویشی اور غلام اور کنیزیں حضرت ابراہیمؑ کو ہدیے میں دی تھیں جن میں سے ایک حضرت ہاجرہؑ بھی تھیں [1]۔ اس لیے حضرت ہاجرہؑ کو حضرت سارہؑ کی کنیز قرار دینا خود بائیبل کی رُو سے غلط ہے، اور ان سے تمتع کرنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ حضرت سارہؑ کی اجازت کے محتاج نہ تھے۔

پھر بائیبل بیان کرتی ہے کہ حضرت اسماعیلؑ فلسطین ہی میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ جب وہ ۱۴ برس کے تھے اُس وقت حضرت ابراہیمؑ کے ہاں حضرت سارہؑ سے حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے (پیدائش، باب ۱۷۔ فقرات ۲۴ تا ۲۶۔ اور باب ۲۱۔ فقرات ۱ تا ۵)۔ اس کے بعد بائیبل کہتی ہے:

"اور وہ لڑکا (یعنی حضرت اسحٰقؑ) بڑھا اور اُس کا دودھ چھڑایا گیا اور اضحاق کے دودھ چھڑانے کے دن ابراہام نے بڑی ضیافت کی۔ اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابراہام سے پیدا ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔ پر ابراہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات بہت بری معلوم ہوئی۔ اور خدا نے ابراہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے۔ جو کچھ

---

[1] حضرت ہاجرہؑ ایک قریہ کی رہنے والی تھیں جس کو اُمّ العرب یا اُمّ العریک کہتے ہیں۔ یہ شرقی مصر میں فرما یا الطینہ کے آگے بحرِ روم کے ساحل سے ۱۰ میل کے فاصلے پر واقع تھا اور فراعنہ کے زمانے میں یہاں ایک قلعہ بنا ہوا تھا۔ آج کل اسے تل الفرما کہا جاتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف) * مرجوہ الخلیل

سارہ تجھ سے کہتی ہے تو اُس کی بات مان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب ابراہام نے صبح اُٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے ساتھ رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیرسبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی۔ اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے مقابل ایک تیر کے ٹپے پر دُور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں۔ سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی۔ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہُوا؟ مت ڈر، کیونکہ خدا نے اُس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سُن لی ہے۔ اُٹھ اور لڑکے کو اُٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہُوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لیے بیوی لی" (پیدائش۔ باب ۲۱۔ فقرات ۹ تا ۲۱)۔

یہ یہودی جھوٹی داستان اس لیے گھڑی گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا عرب، اور مکہ اور کعبہ اور زمزم سے کوئی تعلق سرے سے ظاہر ہی نہ ہو، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کے سفر عرب پر بالکل پردہ ڈال دینے، اور حضرت اسماعیلؑ کے ۱۴ برس تک فلسطین میں قیام اور اس کے بعد بالآخر بیابان فاران میں اُن کے رہنے اور وہیں پانی کا کنواں برآمد ہونے اور مصر کی کسی عورت سے اُن کی شادی ہونے کا ذکر اسلام کی تاریخ کے اُس پورے باب پر خطِ نسخ پھیر دیتا ہے جس کا تعلق دینِ ابراہیمؑ کے عربی مرکز سے ہے۔ بائیبل میں فاران کے بیابان کا جو ذکر مختلف مقامات پر کیا گیا ہے اس کی رُو سے وہ فلسطین کے جنوب، وادیٔ غزہ کے مغرب، دشتِ سینا کے شمال اور مصر و بحرِ قلزم کے مشرق میں واقع تھا، عرب کے حجازی فاران سے اُس کا کوئی تعلق نہ تھا جس میں مکہ واقع ہے۔ اس پر مزید حضرت سارہؓ اور حضرت ابراہیمؑ کی جو گھناؤنی سیرت اس داستان میں پیش کی گئی ہے، اور جس میں ساتھ ساتھ خود اللہ تعالیٰ کو بھی ملوث کر دیا گیا ہے، اس سے خود بنی اسرائیل کے اخلاقی تصورات کی پستی ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں ایک پیغمبر (حضرت ابراہیمؑ) کی بیوی اور دوسرے پیغمبر (حضرت اسحاقؑ) کی والدہ اس صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں کہ وہ سوکن کے نوجوان بیٹے کا ہنسنا تک برداشت نہیں کرتیں اور شوہر کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اسے اور اس کے لڑکے کو اپنی وراثت سے محروم کر کے گھر سے نکال دے۔ شوہر جو ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں اس شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں کہ وہ اپنے ۱۵-۱۶ برس کے بیٹے کو اس کی ماں سمیت صرف روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ دے کر بیابان میں چھوڑ دیتے ہیں اور پھر اس کی پروا نہیں کرتے کہ وہ مرتے ہیں یا جیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ

کی یہ شان ہمیں دکھائی جاتی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے جدِ امجد حضرت اسحٰقؑ اور ان کی ماں کی خاطر حضرت ابراہیمؑ کو یہ ہدایت فرماتا ہے کہ اسحٰق کی ماں سوکناپے کے جلاپے کی بنا پر اُن سے جس ظلم کی فرمائش کر رہی ہیں اس کا وہ ارتکاب کر ڈالیں۔ یہ ساری داستان خود اپنی داخلی شہادت کی بنا پر جھوٹ کی ایک پوٹ ہے۔ تاریخ کے باعزت نام سے اس کو موسوم کرنا لفظ تاریخ کی توہین ہے۔

اس کے مقابلے میں صحیح تاریخ ہم کو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس کی تائید ہم ہزار برس کی متواتر روایات کرتی ہیں جو اہلِ عرب میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہی ہیں۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وطن سے ہجرت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ "میرے پروردگار مجھے صالح اولاد عطا فرما" (الصّٰفّٰت - ۱۰۰)۔ یہ دعا ایک طویل مدت گزرنے کے بعد پوری ہوئی جب کہ حضرت ابراہیمؑ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید ہی میں حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ "شکر ہے اُس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ عطا کیے" (ابراہیم - ۳۹)۔ ان دونوں صاحبزادوں کی پیدائش سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اُن کے پیدا ہونے کی بشارت دی تھی۔ پہلے حضرت اسماعیلؑ کی بشارت ان الفاظ میں دی گئی کہ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ "پس ہم نے اس کو ایک بُردبار لڑکے کی بشارت دی" (الصّٰفّٰت - ۱۰۱)۔ اور اس کے کئی سال بعد جب حضرت اسماعیلؑ جوانی کی عمر کے قریب پہنچ چکے تھے، دوسرے صاحبزادے کی بشارت یُوں دی گئی وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ "اور فرشتوں نے اُن کو (یعنی حضرت ابراہیمؑ کو) ایک ذی علم لڑکے کی خوشخبری دی" (الذّٰریٰت - ۲۸)۔ یہ دوسری بشارت جب دی گئی تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ "کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ بھلا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت ہے جو تم دے رہے ہو؟" (الحجر - ۵۴)۔ اور حضرت سارہ کا بشارت سن کر یہ حال ہُوا فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ "اُن کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی بوڑھی بانجھ" (الذّٰریٰت - ۲۹)۔ اور اسی بنا پر بائبل کے اس بیان کو صحیح سمجھا جا سکتا ہے کہ ۸۶ سال کی عمر میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاں حضرت اسماعیلؑ اور سو سال کی عمر میں حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے تھے۔

(پیدائش باب ۱۶۔ فقرہ ۱۶ اور باب ۲۱۔ فقرہ ۵)۔

حضرت اسماعیلؑ کا مکہ میں آباد کیا جانا

اوپر کے بیان سے یہ بات تو معلوم ہو چکی کہ حضرت اسماعیلؑ اپنے والد ماجد کے پہلے بیٹے تھے جو بڑھاپے میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک عام باپ کو اس عمر میں پہلی اولاد نصیب ہونا اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ اس بچے کو دل و جان سے

ہی نہیں بلکہ چودہ برس تک اکلوتا بھی تھا، سینے سے لگا کر رکھتا اور آنکھوں سے اُس کا اوجھل ہونا بھی گوارا نہ کرتا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ پیغمبر تھے جن کے لیے سب سے مقدم چیز وہ دعوتِ حق تھی جس کی خاطر اُنہوں نے وطن میں جفائیں سہیں، ہجرت کی، دیارِ غیر کی برسوں خاک چھانتے پھرے، اور ہر جگہ خدا کا پیغام پہنچانے میں اپنی ساری طاقتیں اور محنتیں خرچ کر دیں۔ اس عزیز و محبوب بچے کی پیدائش کے بعد ان کو سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ عرب میں دعوتِ توحید کے اُس مرکز کی بنا ڈال دیں جہاں سے دُنیا میں آخری نبوت کا ظہور ہونا تھا اور جسے قیامت تک کے لیے اس دعوت کا مرکز رہنا تھا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ کو اُس مقام کی نشاندہی کر دی تھی جہاں اس مرکز کی تعمیر مطلوب تھی، چنانچہ سورۂ حج میں ارشاد ہوا ہے کہ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ "یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اِس گھر (خانۂ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی" (آیت ۲۶)۔ اس ہدایت کے مطابق اللہ کے اُس عظیم بندے نے اپنے چھوٹے سے بچے کو، جو ابھی دُودھ ہی پی رہا تھا، اُس کی حیرت انگیز صبر و توکل رکھنے والی ماں کے ساتھ، ٹھیک اُس مقام پر لے جا کر بٹھا دیا، بالکل بے سہارا چھوڑ دیا جہاں آخرکار اُن کو خانۂ کعبہ تعمیر کرنا تھا۔

بخاری میں اِس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس روایت میں جس طرح ابن عباسؓ نے جگہ جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نقل کیے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں وہ حضورؐ سے سُن کر بیان کر رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؓ اور ان کے بیٹے اسماعیلؑ کو، جبکہ وہ ابھی دُودھ پی رہے تھے، لے کر آئے اور ان کو ایک درخت کے نیچے اُس جگہ چھوڑ دیا جہاں بعد میں زمزم نکلا۔ مکّہ کی سنسان وادی میں اُس وقت کوئی ایک انسان بھی موجود نہ تھا اور نہ کہیں پانی پایا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے چمڑے کا ایک تھیلا جس میں کھجوریں تھیں، اور پانی کا ایک مشکیزہ حضرت ہاجرہ کو دیا اور واپس روانہ ہو گئے۔ وہ اُن کے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں "اے ابراہیمؑ کہاں جا رہے ہو؟ اور ہمیں اس سنسان بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑے جاتے ہو؟" یہ بات حضرت ہاجرہؓ نے کئی مرتبہ کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے پلٹ کر نہ دیکھا۔[1] آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ جواب میں انہوں نے بس

---

[1] پلٹ کر نہ دیکھنے کی وجہ بے دردی اور بے پروائی نہ تھی۔ حضرت ابراہیمؑ پیغمبرِ عظیم ہی سہی، بہر حال تھے تو انسان ہی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اتنا بڑا خطرہ مول لے رہے تھے کہ پہاڑوں کے درمیان ایک سنسان وادی میں اپنے دُودھ پیتے بچے اور اس کی ماں کو چھوڑے جا رہے تھے۔ اُس وقت اُن کے دل پر جو کچھ گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ اُس صورتِ حال کا تصوّر کر کے ہر شخص کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر وہ بیوی اور بچے کی طرف پلٹ کر دیکھتے تو ممکن ہے کہ دل بھر آتا اور ارادے میں تزلزل پیدا ہو جاتا۔ اِس لیے سینے پر پتھر رکھ کر چل پڑے اور جب پیچھے آنے والی بیوی نے بار بار پوچھا تو اس کی طرف دیکھے بغیر بس ہاں کہہ دیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

اتنا فرمایا کہ ہاں۔ اس پر وہ بولیں کہ اگر یہ بات ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا، اور پلٹ کر بیٹے کے پاس آبیٹھیں۔
حضرت ابراہیمؑ جب پہاڑ کی اوٹ میں پہنچے جہاں سے یہ ماں بیٹے نظر نہ آتے تھے تو بیت اللہ کی طرف (یعنی اس جگہ کی طرف جہاں آخر کار انہیں بیت اللہ تعمیر کرنا تھا) رُخ کیا اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ "پروردگار، میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے تاکہ اُسے پروردگار، یہ یہاں نماز قائم کریں، لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے شاید کہ یہ شکر گزار بنیں" (ابراہیمؑ۔ ۳۷)۔ ادھر اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ان کو دُودھ پلاتی رہیں اور مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں، جب پانی ختم ہو گیا تو انہیں اور بچے کو پیاس لگنی شروع ہوئی۔ وہ بچے کو تڑپتا ہُوا دیکھتی رہیں۔ آخر بچے کی حالت ان سے نہ دیکھی گئی اور وادی کی طرف یہ دیکھنے کے لیے چل پڑیں کہ کوئی آدمی نظر آتے، مگر کوئی نظر نہ آیا۔ پھر صَفا کی پہاڑی سے اُتر کر وادی کے بیچ میں آئیں اور اپنا بازو اٹھا کر اس طرح دوڑیں جیسے کوئی مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ پھر مَروَہ کی پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں کہ کوئی آدمی نظر آتا ہے یا نہیں۔ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ یہ فعل انہوں نے سات مرتبہ (صفا اور مَروہ کے درمیان) کیا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی وجہ سے لوگ صفا اور مَروَہ کے درمیان سعی کرتے ہیں[1]۔ آخری مرتبہ جب وہ مَروَہ کی پہاڑی پر چڑھیں تو انہوں نے ایک آواز سنی۔ اپنے آپ سے کہنے لگیں "چپ رہ" (یعنی شور مچانا بند کر اور غور سے سُننے لگیں۔ آواز پھر آئی۔ انہوں نے کہا " اے شخص، تُو نے اپنی آواز مجھے سُنا دی، کیا تیرے پاس میری فریاد رسی کے لیے کچھ ہے؟" یکایک انہوں نے زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ دیکھا (ابراہیم بن نافع اور ابن جُریج کی روایت میں ہے کہ جبریلؑ کو دیکھا)، کہ وہ اپنی ایڑی یا بازو سے زمین کھود رہے ہیں، یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ لپ بھر بھر کر وہ پانی مشکیزہ میں بھرنے لگیں اور جیسے جیسے وہ پانی بھرتی گئیں پانی اُبل اُبل کر اُوپر آتا رہا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ اسماعیلؑ کی ماں پر رحمت فرمائے، اگر وہ زمزم کو اسی حالت پر چھوڑ

---

[1] یہ اس واقعہ کا اہم ترین تاریخی ثبوت ہے کہ کعبہ کی تعمیر کے بعد جب سے حج کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے زمانے میں شروع ہُوا اُسی وقت سے آج تک سینکڑوں، پھر ہزاروں، پھر لاکھوں، پھر کروڑوں انسان اس واقعہ کی یاد میں سَعی بین الصَّفا والمرْوَہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ہزاروں برس کا متواتر عمل جو بلا انقطاع اُس وقت سے آج تک ہو رہا ہے، اس واقعہ کا ایسا ثبوت ہے جس سے بڑھ کر کسی تاریخی واقعہ کا ثبوت دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس بائیبل بیابان فاران کا جو واقعہ بیان کرتی ہے وہاں نہ پہلے کبھی اس طرح کی سعی ہُوئی، نہ آج ہو رہی ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

دیتیں (یعنی چاروں طرف مٹی ڈال کر اُسے گھیر لیتیں) تو زمزم بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔" اس طرح حضرت ہاجرہ پانی پینے لگیں اور اپنے بچے کو دودھ پلانے لگیں۔ فرشتے نے ان سے کہا "ضائع ہونے کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ دونوں تعمیر کریں گے اور اللہ اس گھر کے لوگوں کو ضائع نہیں کرے گا۔" یہ حالت کچھ مدت رہی تھی کہ قبیلہ جرہم[1] کے کچھ لوگ کدا کی طرف سے آئے اور مکہ کے نشیبی حصے کی طرف ٹھیرے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ ایک مقام کے گرد اُڑ رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "یہ پرندہ تو پانی پر چکر لگا رہا ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی اس وادی سے گزرے ہیں مگر یہاں کوئی پانی نہ تھا۔" پھر انہوں نے اپنے ایک دو آدمی بھیجے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں پانی موجود ہے۔ انہوں نے واپس جا کر اُن لوگوں کو اس کی خبر دی۔ وہ آئے تو حضرت اسماعیلؑ کی والدہ کو وہاں پایا۔ انہوں نے کہا کیا تم ہمیں اجازت دیتی ہو کہ ہم تمہارے پاس اُتر جائیں؟ انہوں نے کہا ہاں، مگر پانی تمہارا نہیں بلکہ میرا ہے۔ انہوں نے یہ بات مان لی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس چیز نے اسماعیلؑ کی ماں کو مضطر پایا، اور وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ کچھ انسان یہاں آباد ہوں۔" چنانچہ وہ لوگ وہاں ٹھیر گئے اور اپنے خاندان والوں کو بھی وہاں بلا لیا یہاں تک کہ کئی خاندان وہاں بس گئے۔ حضرت اسماعیلؑ انہی لوگوں میں پلے بڑھے اور انہی سے عربی زبان سیکھی[2]۔ جرہمیوں کو یہ لڑکا بہت پسند آیا اور وہ یہ چاہنے لگے کہ انہی کے ہاں اس لڑکے کی شادی ہو۔

بیٹے کی قربانی کا واقعہ

حضرت ابراہیمؑ اپنے پیارے بیٹے اور بیوی کو اس وادی میں چھوڑ کر ان سے بے پروا نہیں ہو گئے تھے بلکہ وقتاً فوقتاً خبر گیری کے لیے آتے اور کچھ مدت تک قیام فرماتے رہتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس جگہ اپنی بیوی اور شیرخوار بچے کو چھوڑتے وقت دعا مانگی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا "اے میرے رب! اس کو پُر امن شہر بنا دے" ٹھیک اسی دعا کے مطابق وہی سنسان مقام اب ایک بستی بن چکا تھا اور یہ بات قرین قیاس ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس دوران میں اس جگہ بسنے والے جرہمیوں کے اندر اسلام کی تبلیغ بھی ضرور کی ہوگی۔ اس کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جو تاریخ انسانی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، یعنی حضرت ابراہیمؑ اپنے بڑھاپے کی اولاد، اپنے پہلوٹھے اور اکلوتے بیٹے کو، ایسی حالت میں جبکہ وہ جوانی کی عمر کے قریب پہنچ رہا تھا، اپنے رب کا اشارہ پاتے ہی قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

---

[1] یہ یمن کے قدیم قحطانی عربوں کا ایک قبیلہ تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] عربی حضرت ابراہیمؑ کی زبان نہ تھی کیونکہ وہ عراق کے رہنے والے تھے اور پھر کنعان میں آباد ہو گئے تھے۔ حضرت ہاجرہ کی زبان بھی عربی نہ تھی کیونکہ وہ مصری تھیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۔ قَالَ يٰٓاَبَتِ
افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَ
نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ
الْبَلٰۗـؤُا الْمُبِيْنُ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۔ (الصّٰفّٰت ۔ ۱۰۲ تا ۱۰۷)

"پھر جب وہ لڑکا اُس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے کہا "بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب تو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟" اُس نے کہا "ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اُسے کر ڈالیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔" آخر کو جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ "اے ابراہیمؑ، تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔" اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اُس بچے کو چھڑا لیا۔"

یہ واقعہ مکہ[1] میں پیش آیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ جس مقام پر بیٹے کو قربانی کے لیے لے گئے تھے وہ منیٰ کا مقام تھا جہاں آج تک اُسی تاریخ (۱۰ ذی الحجہ) کو قربانیاں کی جا رہی ہیں[2]۔ نیز یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا تھا جب حضرت اسماعیلؑ کی عمر ۱۲-۱۳ سال سے زیادہ نہ تھی اور حضرت اسحٰقؑ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے، کیونکہ اسی سورۂ صافات میں اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ "اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے" (آیت ۱۱۲)۔

مذکورہ بالا آیات میں چند امور تشریح طلب ہیں جن کی ہم یہاں وضاحت کرتے ہیں:

(۱) حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ انہوں نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے بلکہ یہ دیکھا تھا کہ وہ

---

[1] قرآن مجید میں اس مقام کا نام بکہ بھی آیا ہے (آل عمران: ۹۶) لیکن ابن ہشام (جلد اول صفحہ ۱۲۹) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کا قدیم نام نہیں ہے بلکہ بعد میں جب اسے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تب اسے اس نام سے بھی پکارا جانے لگا۔ ابن ہشام کا قول ہے کہ مکہ کو بکہ اس لیے کہا گیا کہ اِنَّهَا تَبُكُّ اَعْنَاقَ الْجَبَابِرَةِ (وہ جباروں کی گردن توڑ دیتا ہے)۔ اس کے بعد وہ اس کی مزید تشریح یہ کرتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانہ میں مکہ کسی ظلم اور زیادتی کو برقرار نہیں رہنے دیتا تھا، اور جس نے بھی اس میں زیادتی کی اُسے اس شہر نے نکال پھینکا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] منیٰ لے جانا اس لیے ضروری تھا کہ مکہ میں اس وقت آبادی ہو چکی تھی اور حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ماجدہ بھی وہاں موجود تھیں، اسی وجہ سے آپ مکے سے باہر منیٰ کی سنسان پہاڑیوں میں بیٹے کو لے گئے۔ (حاشیہ از مترجم)

اسے ذبح کر رہے ہیں لیکن اُس وقت اُنہوں نے خواب کا مطلب یہی سمجھا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے صدقِ ایمانی کا امتحان لینے کے لیے بیٹے کی قسربانی طلب فرما رہا ہے، اس لیے وہ ٹھنڈے دل سے اپنے لختِ جگر کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

(۲) صاحبزادے سے پوچھنے کا مقصد یہ نہ تھا کہ تو راضی ہو تو اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کروں ورنہ نہ کروں۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جس صالح اولاد کے عطا کیے جانے کی دُعا مانگی تھی وہ فی الواقع کس قدر صالح ہے؟ اگر وہ خود بھی اللہ کی خوشنودی پر جان دینے کے لیے تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دُعا مکمل طور پر قبول ہوئی ہے اور بیٹا محض جسمانی حیثیت ہی سے ان کی اولاد نہیں ہے بلکہ اخلاقی و رُوحانی حیثیت سے بھی یہ حقیقی اُن کا سپوت ہے۔

(۳) حضرت اسماعیلؑ کا یہ کہنا کہ "جس چیز کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے آسے کر ڈالیے" یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنے پیغمبر باپ کے خواب کو اللہ کا حکم اور بمنزلۂ وحی سمجھتے تھے۔ اگر ان کا یہ خیال صحیح نہ ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ فرماتے کہ یہ محض خواب ہے حکم نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اِن آیات میں ان کے اس خیال کی تردید فرما دیتا۔ یہ بات منجملہ اُن دلائل کے ہے جن کی بنا پر اسلام میں نبی کے خواب کو بھی اقسامِ وحی مانا جاتا ہے۔

(۴) حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے چت نہیں لٹایا بلکہ پیشانی کے بل لٹایا تاکہ بچے کا منہ دیکھ کر پدرانہ شفقت ہاتھ میں لرزش نہ پیدا کر دے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ نیچے سے ہاتھ ڈال کر گلے پر چھری چلائیں۔

(۵) قبل اس کے کہ حضرت ابراہیمؑ بیٹے کو ذبح کرتے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "اے ابراہیمؑ تُو نے خواب سچ کر دکھایا" اس بنا پر بالکل بجا اور درست تھا کہ خواب میں یہ نہیں دکھایا گیا تھا کہ آپؑ نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے، بلکہ یہ دکھایا گیا تھا کہ آپ ایسا کر رہے ہیں۔ اس لیے جب آپ نے وہ بات پوری کر دی جو خواب میں دکھائی گئی تھی تو ارشاد ہوا کہ تم نے خواب سچ کر دکھایا اور اس عظیم آزمائش میں پورے اُتر گئے جس میں ہم نے تم کو ڈالا تھا۔ ہم اپنے نیک بندوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں جیسی تم کو دی ہے کہ تمہارے ہاتھ سے بیٹے کو قتل کرائے بغیر یہ ظاہر ہو تم سے کرا دیا کہ تم ہماری محبت میں اپنی اولاد تک کو قربان کر سکتے ہو۔

(۶) بڑی قربانی سے مراد وہ مینڈھا بھی ہے جو حضرت اسماعیلؑ کے فدیے میں ذبح کرانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے ان کو لا کر دیا، اور وہ قربانی بھی ہے جو اُس وقت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد تک حج کے زمانے میں کی جاتی رہی، اور پھر حضورؐ کے عہد سے آج تک حج اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمان

کر رہے ہیں

(۴) قربانی حضرت اسحٰقؑ کی دی گئی تھی یا حضرت اسماعیلؑ کی؟

جیسا کہ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں بنی اسرائیل کی یہ عادت رہی ہے کہ ہر قابلِ فخر بات کو وہ اپنی نسل کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور دوسری نسلوں کے لیے ان کے ہاں یا تو جھوٹے الزامات ہیں، یا پھر کم از کم یہ کہ جو فخر ان کو حاصل ہُوا ہو اُسے بھی چھین کر اپنے حساب میں لکھ لیں۔ اسی عادت کے مطابق بیٹے کی قربانی کے اس واقعہ کو بھی اُنہوں نے حضرت اسماعیلؑ کے بجائے حضرت اسحٰقؑ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بائبل کا بیان ہے:

"خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابرہام ۔۔۔۔ تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے، ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔" (پیدائش باب ۲۲۔ فقرات ۱۔۲)۔

اِس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اِکلوتے تھے۔ حالانکہ خود بائیبل ہی کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحٰقؑ اِکلوتے نہ تھے۔ اِس کے لیے ذرا بائیبل ہی کی حسبِ ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں۔

"اور ابرام کی بیوی ساریؔ کے کوئی اولاد نہ ہُوئی۔ اُس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ اور ساریؔ نے ابرام سے کہا کہ "دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے۔ سو تُو میری لونڈی کے پاس جا۔ شاید اُس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرام نے ساریؔ کی بات مانی۔ اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے ہُوئے دس برس ہو گئے تھے جب اُس کی بیوی ساریؔ نے اپنی مصری لونڈی اُسے دی کہ اس کی بیوی بنے۔ اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہُوئی۔" (پیدائش ۱۶: ۱۔۳)

"خدا کے فرشتے نے اُس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام اسماعیل رکھنا" (پیدائش۔ ۱۶: ۱۱)

"جب ابرام سے ہاجرہ کو اسماعیل پیدا ہُوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔" (پیدائش ۱۶: ۱۶)

"اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ ساریؔ جو تیری بیوی ہے ۔۔۔۔ اُس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا ۔۔۔۔ تو اس کا نام اضحاق رکھنا ۔۔۔۔ جو اگلے سال اسی وقتِ معیّن پر سارہ سے پیدا ہوگا ۔۔۔۔ تب ابرام نے اپنے بیٹے اسماعیل اور گھر کے سب مردوں کو لیا۔ اور اُسی روز خدا کے حکم کے مطابق اُن کا ختنہ کیا۔ ابرام ننانوے برس کا تھا جب اُس کا ختنہ ہُوا۔ اور جب اسماعیلؑ کا ختنہ ہُوا تو وہ تیرہ برس کا تھا۔" (پیدائش ۱۷: ۱۵۔۲۵)۔

"اور جب اُس کا بیٹا اضحاق اُس سے پیدا ہُوا تو ابرام سو برس کا تھا!" (پیدائش ۲۱: ۵)

اِس سے بائیبل کی تضاد بیانی صاف کُھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۴ برس تک تنہا حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اِکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحٰقؑ کی نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی تھی کیونکہ وہی اِکلوتے تھے۔ اور اگر حضرت اسحٰقؑ کی قربانی مانگی گئی تھی تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

اس کے بعد ہم اسلامی روایات کو دیکھتے ہیں تو ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔

مفسّرین نے صحابہؓ و تابعین کی جو روایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحٰقؑ تھے، اور اِس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں:

حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت عباسؓ بن عبدالمطّلب۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس۔ حضرت ابوہریرہؓ۔ قتادہؒ۔ عکرمہؒ۔ حسن بصریؒ۔ سعید بن جُبیرؒ۔ مجاہدؒ۔ شَعبیؒ۔ مسروقؒ۔ مکحولؒ۔ زُہریؒ۔ عطاءؒ۔ مُقاتلؒ۔ سُدّیؒ۔ کعبِ احبارؒ۔ زیدؒ بن اسلم وغیرہم۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ تھے، اور اِس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ۔ حضرت معاویہؓ۔ عکرمہؒ۔ مجاہدؒ۔ یوسف بن مِہرانؒ۔ حسن بصریؒ۔ محمد بن کعب القُرظیؒ۔ شَعبیؒ۔ سعید بن المُسیّبؒ۔ ضحّاکؒ۔ محمد بن علی بن حسینؒ (امام محمد الباقرؒ)۔ ربیعؒ بن اَنَس۔ احمدؒ بن حنبل وغیرہم

ان دونوں فہرستوں کا تقابل کیا جائے تو متعدد نام ان میں مشترک نظر آئیں گے۔ یعنی ایک ہی بزرگ سے دو مختلف قول منقول ہُوئے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے عکرمہ یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحٰقؑ تھے۔ مگر اُنہی سے عطاء بن ابی رَباح یہ بات نقل کرتے ہیں کہ "یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسحٰقؑ تھے۔ مگر یہودی جھُوٹ کہتے ہیں"۔ اسی طرح حضرت حسن بصری سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ حضرت اسحٰقؑ کے ذبیح ہونے کے قائل تھے۔ مگر عَمرو بن عُبید کہتے ہیں کہ حسن بصری کو اِس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہُوا تھا وہ اسماعیل علیہ السّلام تھے۔

اِس اختلافِ روایات کا نتیجہ یہ ہُوا کہ علماءِ اسلام میں سے بعض تو پُورے جزم و وثُوق کے ساتھ حضرت اسحٰقؑ کے حق میں رائے دیتے ہیں، مثلاً ابن جریرؒ اور قاضی عیاضؒ۔ اور بعض قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہی تھے، مثلاً ابن کثیرؒ۔ اور بعض مذبذب ہیں، مثلاً جلال الدّین سُیُوطیؒ۔ لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک و شُبہ سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

(۱) سورۂ صافات میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے ایک صالح بیٹے کی دعا کی تھی، اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی تھی۔ فحوائے کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ دعا اُس وقت کی گئی تھی جب آپؑ بے اولاد تھے اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی تھی وہ آپ کا پہلوٹھا بچہ تھا۔ پھر یہ بھی اسی سورہ کے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کے قابل ہوا تو اُسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹھے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ تھے نہ کہ حضرت اسحٰقؑ۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ط (ابراہیم۔ ۳۹)

"شکر ہے اُس خدا کا جس نے بڑھاپے میں مجھ کو اسماعیل اور اسحٰق عطا کیے۔"

(۲) قرآن مجید میں جہاں حضرت اسحٰق کی بشارت دی گئی ہے وہاں اُن کے لیے غلامٍ علیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ ہیں (الذاریات آیت۔ ۲۸) اور لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الحجر۔ ۵۳)۔ مگر سورۂ صافات میں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اُس کے لیے غلامٍ حلیم (بردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحبزادوں کی نمایاں صفات الگ الگ تھیں اور ذبح کا حکم غلامِ علیم کے لیے نہیں بلکہ غلامِ حلیم کے لیے تھا کیونکہ بیٹے کی قربانی کا واقعہ اُسی بچے کے پیدا ہونے اور جوانی کے قریب پہنچنے کے بعد ہوا ہے اور دوسرے بچے کی پیدائش کی بشارت اس کے بعد دی گئی ہے۔

(۳) قرآن مجید میں حضرت اسحٰق کی پیدائش کی خوش خبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی دے دی گئی تھی کہ اُن کے ہاں یعقوبؑ جیسا بیٹا پیدا ہوگا۔ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ (ہود۔ ۷۱)۔ اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جا چکی ہو کہ اُس کے ہاں ایک لائق لڑکا پیدا ہوگا اُس کے متعلق اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اُسے ذبح کر رہے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ اُس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے، کیونکہ اسے قربان کر دینے کے بعد اُس کے ہاں بیٹے (یعنی حضرت یعقوبؑ) کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علامہ ابن جریر اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیمؑ کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحٰقؑ کے ہاں حضرت یعقوبؑ پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس دلیل کا نہایت ہی بودا جواب ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑتے پھرنے کے قابل ہو گیا" تب یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اُس کے

سامنے آٹھ دس یا حد سے حد ۱۲-۱۳ برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ جوان اور صاحبِ اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں گے۔

(۴) اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے "کہ ہم نے اسے اسحٰق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا، بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی، پھر جب وہ باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ پھر جب حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تب ان کو ایک اور بیٹے اسحٰقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیب واقعات قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحٰقؑ نہ تھے بلکہ وہ اُن سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابن جریر اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ پہلے حضرت اسحٰقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ اُن کے نبی ہونے کی خوشخبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس سلسلۂ کلام میں یُوں نہ فرماتا "کہ ہم نے اُسے اسحٰقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔" بلکہ یُوں فرماتا کہ "ہم نے اس کو یہ بشارت دی کہ تمہارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے۔"

(۵) معتبر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے فدیہ میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا اُس کے سینگ خانۂ کعبہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجاج بن یوسف نے حرم میں ابن زبیرؓ کا محاصرہ کیا اور خانۂ کعبہ کو مسمار کر دیا تو وہ سینگ بھی ضائع ہو گئے۔ ابن عباسؓ اور عامر شعبیؒ دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انہوں نے خود خانۂ کعبہ میں یہ سینگ دیکھے ہیں (ابن کثیر)۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا یہ واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا، اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اسی لیے تو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے تعمیر کردہ خانۂ کعبہ میں اُس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

(۶) یہ بات صدیوں سے عرب کی روایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ منیٰ میں پیش آیا تھا۔ اور یہ صرف روایت ہی نہیں تھی بلکہ اُس وقت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مناسک حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آرہا تھا کہ اُسی مقام منیٰ میں جا کر لوگ اُسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی جانور قربان کیا کرتے تھے پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپؐ نے بھی اُس طریقے کو جاری رکھا حتیٰ کہ آج تک حج کے موقع پر دس ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار سال کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیلؑ ہوتے ہیں نہ کہ بنی اسحٰق۔ حضرت اسحٰقؑ کی نسل میں

ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی ہے جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابلِ تعجب نظر آتی ہے کہ خود اُمتِ مُسلمہ میں حضرت اسحٰقؑ کے ذبیح ہونے کا خیال آخر پھیل کیسے گیا؟ یہودیوں نے اگر حضرت اسماعیلؑ کو اس شرف سے محروم کر کے اپنے دادا حضرت اسحٰقؑ کی طرف اسے منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہِ کثیر نے ان کی اس دھاندلی کو کیسے قبول کر لیا؟ اس سوال کا بہت شافی جواب علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحٰقؑ کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں) کعب احبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصاریٰ کی قدیم کتابوں کے مندرجات اُن کو سنایا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ انہیں سن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے اور ہر رطب و یابس جو وہ بیان کیا کرتے تھے انہیں روایت کرنے لگے۔ حالانکہ اس اُمّت کو ان کے اس ذخیرۂ معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔"

اس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قرظی کی ایک روایت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحٰقؑ تھے یا حضرت اسماعیلؑ؟ اس وقت ایک صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علماء میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا "امیر المومنین، خدا کی قسم وہ اسماعیلؑ ہی تھے، اور یہودی اس بات کو جانتے ہیں، مگر وہ عربوں سے حسد کی بنا پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسحٰقؑ تھے۔" (ابن جریر)

ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پروپیگنڈا تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا۔ اور مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں، اس لیے اُن میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالے سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصب کارفرما ہے۔ (۴)

بنائے کعبہ

پہلے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ زمزم کی برکت سے قبیلۂ جرہم کے مختلف خاندان آ کر حضرت ہاجرہؑ و اسماعیلؑ کے پاس بس گئے تھے اور مکہ ایک شہر بنتا جا رہا تھا۔ یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ کی ملنساری کی وجہ سے ان

زر آباد کاروں کے ساتھ دونوں ماں بیٹوں کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ انہی کے درمیان پلے بڑھے تھے اور جب وہ جوان ہوئے تو ان کے بہترین اخلاق اور عمدہ اوصاف کی وجہ سے جرہمیوں کی خود یہ خواہش تھی کہ ان کی شادی انہی کے ہاں ہو۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ پہلے ایک لڑکی سے ان کی شادی ہوئی، مگر حضرت ابراہیمؑ کو وہ بہو پسند نہ آئی اس لیے حضرت اسماعیلؑ نے اسے چھوڑ کر دوسری لڑکی سے شادی کی جسے حضرت ابراہیمؑ نے پسند فرمایا اور اسی سے ان کے ہاں بارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ حضرت ہاجرہ کا انتقال بخاری کی اس روایت کے مطابق اپنے بیٹے کی پہلی شادی کے بعد ہی ہو چکا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اس اصل کام کے لیے مکہ تشریف لائے جس کی خاطر انہوں نے کئی برس پہلے اپنی ذریت کے اس حصے کو اس بے آب و گیاہ وادی میں لاکر بسایا تھا۔ بخاری میں ابن عباسؓ کی جس روایت کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے اس میں آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ ایک روز زمزم کے پاس درخت کے نیچے حضرت اسماعیل بیٹھے اپنے تیر بنا رہے تھے کہ یکایک حضرت ابراہیمؑ وہاں پہنچے۔ حضرت اسماعیلؑ انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور دونوں باپ بیٹے اسی طرح ملے جس طرح بیٹے اپنے باپوں سے اور باپ اپنے بیٹوں سے ملا کرتے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اسماعیلؑ! اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے رب نے جس کام کا حکم دیا ہے آپ اسے ضرور کریں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا تم اس میں میری مدد کرو گے؟ انہوں نے کہا جی ہاں، میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے وادی کے اُس حصہ کی طرف اشارہ کیا جو اپنے گرد و پیش کی زمین سے کچھ اٹھا ہوا تھا اور فرمایا کہ اللہ نے مجھے یہاں ایک گھر بنانے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹوں نے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھائیں۔ حضرت اسماعیلؑ پتھر لاتے تھے اور حضرت ابراہیمؑ ان کو نصب کرتے جاتے تھے۔ جب دیواریں کافی بلند ہو گئیں تو حضرت ابراہیمؑ وہ پتھر اٹھا لائے جو مقامِ ابراہیمؑ کے نام سے مشہور ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر پتھر نصب کرنے شروع کر دیے اور دیواروں کو مزید بلند کر دیا۔ (ف)

عرب اور پوری دنیا میں کعبہ کی حیثیت

یہ عمارت محض ایک عبادت گاہ ہی نہ تھی، جیسے مسجدیں ہوا کرتی ہیں، بلکہ اول روز ہی سے اس کو دینِ اسلام کی عالمگیر تحریک کا مرکز تبلیغ و اشاعت قرار دیا گیا تھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ایک خدا کو ماننے والے ہر جگہ سے کھنچ کھنچ کر یہاں جمع ہوا کریں، مل کر خدا کی عبادت کریں، اور اسلام کا پیغام لے کر پھر اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں۔ یہی اجتماع تھا جس کا نام "حج" رکھا گیا۔ اس کی پوری تفصیل کہ یہ مرکز کس طرح تعمیر ہوا، کن جذبات اور کن دعاؤں کے ساتھ دونوں باپ بیٹوں نے اس عمارت کی دیواریں اٹھائیں، اور کیسے حج کی ابتدا ہوئی، قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ إِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (آلِ عمران: ۹۶-۹۷)

"یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وُہی تھا جو مکّہ میں تعمیر ہُوا۔ برکت والا گھر اور سارے جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت۔ اس میں اللہ کی کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔ مقامِ ابراہیمؑ ہے۔ اور جو کوئی اس میں داخل ہو جاتا ہے، اس کو امن مل جاتا ہے۔"

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ (العنکبوت: ۶۷)

"کیا لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کیسا پُرامن حرم بنایا ہے۔ حالانکہ اس کے گرد و پیش لوگ اُچک لیے جاتے ہیں۔"

یعنی جب کہ عرب میں دو ہزار برس تک ہر طرف لُوٹ مار، قتل و غارتگری اور جنگ و جدل کا بازار گرم رہا، اس حرم میں ہمیشہ امن ہی رہا، حتّٰی کہ وحشی بدو تک اس کے حدود میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ پاتے تو اُس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرتے۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ إِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَا إِلٰى إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ أَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔۔۔۔۔ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ (البقرہ: ۱۲۵-۱۲۹)

"اور یاد کرو جب ہم نے اِس گھر کو لوگوں کے لیے مرکز و مرجع اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیمؑ کے مقامِ عبادت کو جائے نماز بنا لو۔ اور ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو ہدایت کی کہ میرے گھر کو طواف کرنے

لہ واضح رہے کہ بیت المقدس خانۂ کعبہ کے ایک ہزار برس بعد حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں تعمیر ہُوا تھا، اس لیے کعبہ ہی وہ مرکزِ توحید ہے جو دُنیا میں سب سے پہلے تعمیر کیا گیا۔ (حاشیہ از مؤلّف)

والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو، اور جب ابراہیمؑ نے دعا کی کہ پروردگار، اس جگہ کو ایک پُرامن شہر بنا دے اور یہاں کے باشندوں کو پھلوں کا رزق بہم پہنچا، جو بھی اُن میں سے اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والا ہو۔ . . . . . اور جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اس گھر کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے (تو دعا کرتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار، ہماری اس کوشش کو قبول فرما، تو سب کچھ سننا اور جاننا ہے۔ پروردگار اور تو ہم دونوں کو اپنا مسلم (اطاعت گزار) بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اُٹھا جو تیری مسلم ہو، اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہم پر عنایت کی نظر رکھ کہ تو بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ پروردگار، اور تو ان لوگوں میں انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول بھیجو جو انہیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق درست کرے، یقیناً تو بڑی قوت والا اور بڑا حکیم ہے۔"

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۔ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۔ (ابراہیم: ۳۵-۳۷)

"اور جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی کہ پروردگار، اس شہر کو پُرامن شہر بنا دے اور مجھ کو اور میرے بچوں کو بُت پرستی سے بچا۔ پروردگار، ان بُتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ سو جو کوئی میرے طریقے کی پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میرے طریقے سے پھر جائے تو یقیناً تو غفور اور رحیم ہے۔ پروردگار، میں نے اپنی نسل کے ایک حصّہ کو تیرے اس عزت والے گھر کے پاس اس بے آب و گیاہ وادی میں لا بسایا ہے تاکہ اے پروردگار یہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دلوں میں ایسا شوق ڈال کہ وہ ان کی طرف کھنچ کھنچ کر آئیں اور ان کو پھلوں سے رزق پہنچا۔ اُمید ہے کہ یہ شکر گزار بنیں گے۔"

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۙ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۔ (الحج: ۲۶-۲۸)

"اور جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اِس گھر کی جگہ مقرر کی اِس ہدایت کے ساتھ کہ کسی کو میرے ساتھ شریک نہ کرنا۔ اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا اور (حکم دیا کہ) لوگوں میں حج کی عام منادی کر دو کہ تمہارے پاس آئیں، خواہ پیدل آئیں یا ہر دُور دراز مقام سے دُبلی اونٹنیوں پر آئیں تاکہ یہاں آکر دیکھیں کہ اُن کے لیے کیسے کیسے دینی و دُنیوی) منافع ہیں اور اِن چند مقرر دنوں میں اُن جانوروں پر جو اللہ نے اُن کو دیے ہوں، اللہ کا نام لیں (یعنی قربانی کریں) اور اس میں سے خود بھی کھائیں اور تنگ دست و محتاج لوگوں کو بھی کھلائیں" (۵)

عہدِ جاہلیت میں کعبہ کی برکات

عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدّس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہُوا تھا۔ حج اور عمرے کے لیے سارا ملک اُس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اِس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہُوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہو جاتا تھا۔ مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی، اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا تھا۔ بس یہی زمانہ ایسا تھا جس میں اُن کے قافلے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت آتے جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے قلّادوں کی موجودگی سے قافلوں کی نقل و حرکت میں بڑی مدد ملتی تھی، کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹے پڑے ہوتے انہیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جُھک جاتیں، اور کسی غارت گر قبیلے کو اُن پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔ (۶)

حضرت اسماعیلؑ کی رسالت اور عرب میں اُس کے اثرات

اغلب یہ ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا اور اس گھر کو مرکز و مرجع قرار دے کر ہر سال اس کی طرف حج کرنے کا اذنِ عام لوگوں کو دیا، وہی وقت تھا جب حضرت اسماعیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے

ـلہ حرام مہینوں سے مُراد ہیں رجب عُمرے کے لیے، اور ذی القعدہ، ذی الحجہ اور مُحرّم حج کے لیے۔ اِن مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں، اور حج و عمرہ کے لیے جانے والوں کو راستے میں کوئی نہ چھیڑ سکتا تھا۔

(حاشیہ از مؤلف)

رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا تاکہ وہ عرب میں دینِ اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیں۔ قرآن مجید میں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے :

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِسْمٰعِيْلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۔ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ۔ (مریم: ۵۴-۵۵)

"اور اس کتاب میں اسماعیلؑ کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا اور رسُول نبی تھا۔[1] وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔"

اگرچہ تاریخ میں حضرت اسماعیلؑ کی زندگی کے حالات اور ان کی رسالت کے کام کی کچھ تفصیلات نہیں ملتیں، لیکن اُن کی رسالت کے کامیاب ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ خانہ کعبہ کو تمام عرب میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ حج اور عُمرے کے لیے عرب کے تمام اطراف و نواحی سے لوگ کھنچ کھنچ کر آتے رہتے تھے۔ مناسکِ حج تقریباً وہی رہے جو ابتدا میں مقرر کیے گئے تھے۔ صفا اور مروہ کی سعی اور ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانی کا طریقہ بھی عربوں میں رائج رہا جو بلاشبہ حضرت ہاجرہ کی سعی اور حضرت ابراہیمؑ کی قربانی ہی کی یادگار تھا۔ حج اور عمرے کی خاطر چار مہینوں کی حُرمت بھی تمام اہلِ عرب میں مسلّم رہی۔ اور دینِ ابراہیمیؑ کے دوسرے بہت سے شعائر بھی عربوں میں مروّج رہے، مثلاً ختنہ، غُسلِ جنابت، جانوروں کو ذبح کرنے اور اونٹوں کو نحر کرنے کا طریقہ، مُردوں کو دفن کرنا، نکاح اور طلاق اور عدّت اور دیگر سوگ، سگے قاعدے، بیٹیوں، ماؤں اور بہنوں کو حرام سمجھنا، قصاص اور دیّت اور قسامت کے احکام وغیرہ۔ اس کے علاوہ بعض حکمائے عرب وضو بھی کرتے تھے۔ بعض نماز بھی پڑھتے تھے جیسے قس بن ساعدۃ الایادی۔ حضرت ابوذرؓ بھی اسلام قبول کرنے سے تین سال پہلے ہی نماز پڑھنے لگے تھے، اگرچہ معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کی نماز تھی۔ اس کے علاوہ عربوں میں روزہ کا بھی ایک طریقہ رائج تھا۔ وہ اعتکاف بھی کرتے تھے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جاہلیت میں ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی تھی۔ بہت سی چیزوں کو اہلِ عرب نیکی کا کام سمجھتے اور ان کی طرح کرتے تھے، مثلاً مہمان اور مسافر کی ضیافت، مساکین کی مدد کرنا اور صلۂ رحمی کرنا۔ اگر حضرت اسماعیلؑ کی رسالت کو عرب میں غیر معمولی کامیابی حاصل نہ ہوئی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ڈھائی ہزار برس جاہلیت کی تاریکی میں ڈوبے رہنے کے باوجود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک اُن کے پھیلائے ہوئے دین کے آثار باقی اور تمام عرب میں جاری و ساری رہتے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کی اور اُن سے متاثر ہونے والوں کی تبلیغ ہی کا یہ اثر تھا کہ اہلِ عرب میں حضورؐ کی بعثت کے زمانے تک اللہ تعالیٰ کے متعلق جو تصوّرات پائے جاتے تھے جن کا

---

[1] یعنی ایسا نبی تھا جسے رسالت کا منصب عطا کیا گیا تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ کیا گیا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ زخرف، آیت ۲۸۔ سورۂ عنکبوت، آیات ۱۶ تا ۲۲۔ سورۂ مومنون، آیات ۱۷ تا ۲۲۔ سورۂ یونس، آیات ۷۱ تا ۷۳ و ۸۳۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۷۷)۔

اور یہ بھی رسالتِ اسماعیلی کا اثر ہی تھا کہ بعثتِ محمدی کے وقت تک عرب میں ایسے لوگوں کا ایک گروہ موجود رہا جنہیں تاریخ میں حنفاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب کے مختلف قبائل میں جگہ جگہ پائے جاتے تھے۔ شرک سے انکار اور توحید کا اقرار کرتے تھے اور دینِ ابراہیمی کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے تفہیم القرآن، جلد چہارم میں صفحہ ۱۸۰ پر ان لوگوں کی فہرست درج کی ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے بعض کے حالات لکھتے ہیں:

النابغۃ الجعدی۔ یہ بنی عامر بن صعصعہ میں سے تھے۔ جاہلیت کے زمانے میں دینِ ابراہیمی اور حنیفیت کا ذکر کیا کرتے تھے۔ روزے رکھتے اور استغفار کرتے تھے۔ ان کے زمانۂ جاہلیت کے کلام میں توحید اور حیات بعد موت اور جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں انہوں نے اسلام قبول کیا (الاستیعاب ج ۱، ص ۳۱۰)۔

جرمز بن انس۔ یہ بنی عدی بن نجار میں سے تھے۔ جاہلیت کے زمانے میں درویشی اختیار کر لی تھی بت پرستی چھوڑ دی تھی، غسل جنابت کرتے اور حائضہ سے پرہیز کرتے تھے۔ شراب اور ہر نشہ آور چیز کو ناپسند کرتے تھے۔ پہلے عیسائی ہونے کا ارادہ کیا، پھر رک گئے اور ایک مسجد سی بنا لی جس میں کسی جنبی یا حائضہ کو نہیں آنے دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ میں ربِّ ابراہیم کی عبادت کرتا ہوں اور دینِ ابراہیمی کا پیرو ہوں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

الحمد للہ ربی لا شریک لہ
من لم یقلہا فنفسہ ظلما

"تعریف میرے رب اللہ کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ جو شخص اس کا قائل نہیں ہے وہ اپنے نفس پر آپ ظلم کرتا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے حاضر ہو کر اسلام قبول کیا (الاستیعاب، ج ۱، ص ۲۰۵۔ الاصابہ، ج ۲، ص ۹۵۔ ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۵۶)۔

عمرو بن عبسہ۔ یہ بنی سلیم میں سے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اسلام سے پہلے انہوں نے بتوں کی پرستش چھوڑ دی تھی۔ امام احمدؒ نے ان کا اپنا قول نقل کیا ہے کہ میں جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کو گمراہی پر سمجھتا تھا اور بتوں کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ کچھ نہیں ہیں۔ ان کا ایک اور قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ میرے دل میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ بتوں کی پرستش باطل ہے۔ ایک شخص نے میری یہ باتیں سنیں تو کہا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو ایسی ہی

یانیں کہتا ہے۔ چنانچہ میں مکہ آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر آپ کی تعلیمات دریافت کیں اور آپ کی رسالت پر ایمان لے آیا (الاستیعاب، ج ۱، ص ۱۳۱ - ۴۴)۔

سب سے زیادہ سبق آموز قصہ زید بن عَمرو بن نُفیل کا ہے جو حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی اور حضرت سعیدؓ بن زید (حضرت عمرؓ کے بہنوئی اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک) کے والد تھے۔ یہ توحید کے عقیدے میں بہت سخت تھے۔ بُت پرستی اور مُردار اور خون اور بُتوں پر کی ہُوئی قربانی کو حرام سمجھتے تھے۔ بیٹیوں کے قتل کو بہت بُرا جانتے تھے اور ان کو بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہودیت اور نصرانیت کو بھی انہوں نے رد کر دیا تھا اور کہتے تھے کہ ہماری قوم کے شرک اور اُن کے شرک میں آخر فرق ہی کیا ہے۔ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ کا بیان ہے کہ "میں نے زید بن عمرو کو دیکھا کہ وہ کعبہ کی دیوار کے سہارے بیٹھے تھے اور کہتے تھے کہ قریش کے لوگو، خدا کی قسم میں کسی ایسے جانور کا گوشت نہیں کھاؤں گا جو اللہ کے سوا کسی کے لیے ذبح کیا گیا ہو۔ خدا کی قسم دینِ ابراہیمؑ پر میرے سوا کوئی نہیں ہے۔" وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "خدایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری عبادت کا کونسا طریقہ تجھے سب سے زیادہ محبوب ہے تو میں اُسی طرح تیری عبادت کرتا۔" پھر وہ اپنی ہتھیلی پر سر رکھ کر سجدہ کرتے۔ انہوں نے دینِ ابراہیمؑ کی تلاش میں شام کا سفر کیا مگر وہ نہ یہود میں ملا نہ نصاریٰ میں۔ اس پر انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "خدایا میں تجھے گواہ کرتا ہوں کہ میں دینِ ابراہیمؑ پر ہوں۔" آخرکار بلادِ لخم میں حضورؐ کی بعثت سے پانچ سال پہلے کسی نے انہیں قتل کر دیا۔ ان کا چچا اور ماں جایا بھائی خطاب[1] اُن کو دینِ آبائی سے پھر جانے پر سخت تنگ کرتا تھا حتیٰ کہ اس نے انہیں مکہ سے نکل جانے پر مجبور کر دیا اور قریش کے شہداء کو اُن کے پیچھے لگا دیا کہ اسے شہر میں نہ گھسنے دو۔ زمانۂ اسلام میں حضرت عمرؓ اور حضرت سعیدؓ بن زید نے حضورؐ سے عرض کیا کہ زید کے خیالات آپ کو معلوم ہیں، کیا ہم اُن کے لیے دعائے مغفرت کریں؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں، قیامت کے روز وہ تنہا ایک اُمت کی حیثیت سے اُٹھیں گے۔" (الاستیعاب، ج ۲، ص ۵۳۵ - الاصابہ، ج ۱، ص ۵۶۹ - ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۴۹ - ۲۴۰)۔

تاہم عام اہلِ عرب جس شرک میں مبتلا تھے اُس کی نوعیت اُن کے اُس تلبیہ سے معلوم ہوتی ہے جو وہ حج کے

---

[1] اصل میں زید کی ماں پہلے نُفیل بن عبدالعُزّیٰ کے نکاح میں تھی جس سے حضرت عمرؓ کا باپ خطّاب پیدا ہُوا پھر نُفیل کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے عَمرو نے اپنی سوتیلی ماں (یعنی خطّاب کی ماں) سے نکاح کر لیا جس سے زید پیدا ہُوئے اس طرح زید خطّاب کے بھتیجے بھی تھے اور ماں جائے بھائی بھی۔ زمانۂ جاہلیت میں سوتیلی ماں سے نکاح کا طریقہ عام طور پر رائج تھا جسے آخر قرآن نے حرام کیا (الاغانی جلد ۳۔ ص ۱۲۳)۔

(حاشیہ از مؤلف)

موقع پر کرتے تھے۔ اُن کا تلبیہ یہ تھا:

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ، تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ۔

"میں حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں، کوئی تیرا شریک نہیں سوائے اُس شریک کے جو تیرا ہی ہے، تو اُس کا بھی مالک ہے اور ہر اُس چیز کا بھی مالک جس کا وہ مالک ہے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے بہت سے مفروضہ خداؤں کو معبود ماننے کے باوجود ایک رب اعلیٰ کی حیثیت سے اللہ کو مانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کے تمام معبود اُس بزرگ و برتر ہستی کے بندے اور مملوک ہیں۔ اس کو رسالت اسماعیلی کے اثرات کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ انتہائی جاہلیت اور بدترین شرک میں ڈوب کر بھی اللہ کے بارے میں اُن کے اندر یہ عقیدہ موجود تھا۔

حضرت اسماعیلؑ کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت

حضرت اسماعیلؑ جب تک زندہ رہے، خانہ کعبہ کی تولیت انہی کے ہاتھ میں رہی اور ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت متولی ہوئے۔ لیکن نابت کی وفات کے بعد جُرہُم کے لوگ، جو مکہ میں حضرت ہاجرہ کے وقت سے بسے ہوئے تھے، اس گھر کی تولیت پر قابض ہو گئے کیونکہ اولاد اسماعیلؑ کی تعداد کم تھی، اور مکہ میں جُرہُمیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ اُن کے ساتھ عمالیق کی ایک شاخ قَطُورا اور بنی قَطُورا بھی ایک مدت تک مکہ کی عملداری میں شریک رہی۔ شہر کے بالائی حصوں سے جو آتا اس سے جُرہُم عُشر وصول کرتے، اور نشیبی علاقوں (اَجیاد) کی طرف سے آنے والوں کو عمالیق عُشر دینے پر مجبور کرتے۔ حتیٰ کہ کچھ مدت تک کعبہ کی تولیت بھی عمالیق ہی کے قبضہ میں رہی۔ مگر بالآخر جُرہُم نے لڑ کر ان کو مکہ سے نکال دیا اور پھر وہی اس کے بعد صدیوں تک کعبہ اور مکہ پر قابض رہے (مُرُوجُ الذّہب، مسعودی، ج ۲، ص ۵۰۔ ابن ہشام، ج ا، ص ۱۱۸)۔ ان لوگوں میں رفتہ رفتہ اتنا بگاڑ پیدا ہو گیا کہ انہوں نے مکہ کی حُرمت کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ کعبہ میں جو مال ہدیۃً دیا جاتا تھا اسے ناجائز طور پر کھانے لگے۔ زیارت کے لیے آنے والوں کو ستانے لگے۔ یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کو زنا کے لیے کوئی جگہ نہ ملتی تو وہ خانۂ کعبہ میں جا کر یہ گناہ کرتا تھا۔ اُسی زمانے کا یہ واقعہ ہے کہ ایک شخص اِساف نے ایک عورت نائلہ کے ساتھ کعبہ میں فعلِ حرام کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو مسخ کر دیا۔ کچھ مدت تک تو یہ واقعہ نشانِ عبرت بنا رہا، مگر ایک مدت بعد ان دونوں کے بُت بنا کر ایک کو صَفا پر اور دوسرے کو مَروہ پر رکھ کر ان کی عبادت کی جانے لگی۔ یہ اُس تنزّل کی انتہا تھی جس میں خانۂ کعبہ کے متولّی مبتلا ہو گئے تھے۔

آخر کار جب جُرہُمیوں کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو بنی کنانہ میں سے بنی بکر بن عبدمَناۃ اور بنی خُزاعہ میں سے

غبشان نے مل کر اُن سے جنگ کی اور اُن کو مکّہ سے نکال دیا۔ چلتے ہوئے یہ لوگ کعبہ کا خزانہ زمزم میں ڈال کر اور پھر زمزم کو بند کر کے اُس کا نشان تک مٹا گئے اور اپنے اصل وطن یمن کا راستہ لیا۔ ان کے بعد کعبہ کی تولیت بنی خزاعہ کی اُس شاخ کے قبضے میں آگئی جو غبشان کے نام سے موسُوم ہے۔ تین چار سو برس تک وہی اس مقدس گھر کے متولّی رہے اور اُنہی کے زمانہ میں خانۂ کعبہ ایک پُورا بُت خانہ بن گیا۔ اِس کی ابتدا اِس طرح ہُوئی کہ اِس قبیلے کا سردار عَمرو بن لُحَیّ اپنی دولت اور داد و دہش کی وجہ سے خزاعہ کا شاہِ بے تاج بنا ہُوا تھا اور جو بدعت بھی وہ نکالتا پُورا قبیلہ بے چُون وچرا اس کی پیروی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ شام گیا اور اُس نے وہاں کے عمالیق کو بُتوں کی پرستش کرتے دیکھا۔ اُسے یہ چیز بہت پسند آئی، وہاں سے ہُبَل نامی ایک بُت لے آیا اور کعبہ میں اسے نصب کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس پر مزید بُتوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انہی میں حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور حضرت مریمؑ کے بُت بھی شامل تھے۔ حضرت مریمؑ کا بُت غالباً اس لیے رکھا گیا تھا کہ عیسائی عرب بھی کعبہ کی طرف رجُوع کریں۔ بخاری، کتاب الانبیاء میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں بھی تھیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی صورت اِس شکل میں تھی کہ دونوں کے ہاتھوں میں اَزلام (پانسے) تھے۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ بَحِیرہ اور سائبہ اور وَصیلہ اور حام کی بدعتیں بھی عَمرو بن لُحَیّ کی ایجاد کردہ تھیں جن کی تردید سُورۂ مائدہ آیت ۳۔ ایمں کی گئی ہے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ دینِ ابراہیمی کے پیروؤں میں بُت پرستی کا آغاز اسی شخص نے کیا تھا۔ ابنِ اسحٰق کا بیان ہے کہ مکّہ کو چھوڑ چھوڑ کر جو لوگ عرب کے مختلف حصّوں میں جانے پر مجبور ہوتے تھے وہ اپنے ساتھ مکّہ کا ایک پتھر لے کر چلے جاتے اور پھر جہاں بھی مقیم ہوتے وہاں اسے نصب کر کے اس کا طواف کرنے لگتے۔

(ابن ہشام ج ۱ ص ۷۹-۸۰)

کعبہ کی تولیت پر خزاعہ کا قبضہ اُس وقت ختم ہُوا جب قریش میں سے قُصَیّ بن کلاب نے اُسے اپنے خزاعی خُسر سے حاصل کیا، جیسا کہ آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔

اولادِ اسماعیل علیہ السّلام

عرب کے علماءِ اَنساب اور راویانِ اخبار کا متفقہ بیان یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ مگر جب مکّہ پر جُرہم کا قبضہ ہو گیا تو اولادِ اسماعیلؑ کا بہت تھوڑا حصّہ اِس شہر میں بسا رہ گیا، باقی سب عرب کے مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے۔ تاریخ اس باب میں خاموش ہے کہ ان بارہ بیٹوں کی اولاد کہاں کہاں گئی اور کون کون سے قبائل ان کی نسل سے پیدا ہوئے۔ البتہ عرب کے علم الانساب میں جو چیز محفوظ اور متواتر ہے اور جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے وہ یہ ہے کہ عدنان حضرت اسماعیلؑ کے بڑے بیٹے نابِت کی اولاد میں سے تھا۔ عدنان سے پہلے حضرت اسماعیلؑ تک کتنی پشتیں گزری ہیں، اس میں سخت اختلاف ہے، اور عدنان سے اُوپر کا کوئی شجرۂ نسب محفوظ نہیں ہے۔ عَدّ وہ

بن زبیر کا قول ہے کہ ہمیں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو عدنان اور حضرت اسماعیلؑ کے درمیان کا نسب نامہ جانتا ہو۔ ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ، دونوں کہتے ہیں کہ عدنان سے اُوپر کا نسب نامہ جو لوگ بیان کرتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ نسب نامہ صرف عدنان تک بیان کرنا چاہیے۔ طبقات ابن سعد اور بلاذری کی أنساب الأشراف میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ منقول ہے کہ آپ مَعَد بن عدنان بن أُدَد تک نسب بیان کرنے کے بعد فرماتے کذب النسّابون "آگے کا نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں۔" لیکن اُوپر کا شجرۂ نسب محفوظ نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عدنان کا اولادِ اسماعیلؑ میں سے ہونا کسی درجہ میں بھی مشکوک ہے۔ تمام اہلِ عرب اس بات پر متفق تھے کہ عدنان بنی اسماعیل میں سے تھا، اور اہلِ عرب کا اس پر بالکل متفق ہونا اس کے صحیح ہونے کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے، کیونکہ عرب کے لوگ نسب کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور ان کے لیے کسی کے نسب پر متفق ہو جانا اُس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک اُن کے ہاں نسلاً بعد نسلٍ اس کے بارے میں متواتر روایات موجود نہ ہوں۔

رسُولِ اکرمؐ کا نسب نامہ اور قبائلِ عرب سے آپؐ کا رشتہ

عدنان کے بعد تمام اُن قبائلِ عرب کا نسب نامہ محفوظ ہے جو اولادِ عدنان میں سے ہیں اور اس میں علمائے انساب کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم یہاں پہلے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب درج کرتے ہیں، اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ کس کس پُشت پر عرب کے کون کون سے قبائل آپ کے ساتھ نسب میں شریک ہو جاتے ہیں۔ حضورؐ کا شجرۂ نسب یہ ہے:

مُحمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بن عبداللہ، بن عبدالمُطّلب، بن ہاشم، بن عبدِ مَناف، بن قُصَیّ بن کِلاب، بن مُرّہ، بن کَعْب، بن لُؤَیّ، بن غالِب، بن فِہْر، بن مالِک، بن النَّضْر بن کِنانہ، بن خُزَیمہ، بن مُدْرِکہ، بن اَلْیاس[1]، بن مُضَر بن نِزار، بن مَعَد، بن عَدنان۔

اِس سلسلۂ نسب میں ہر پُشت کے جدِّ اعلیٰ پر عرب کے حسبِ ذیل قبائل حضورؐ کے ہم نسب ہوتے چلے جاتے ہیں:

عدنان پر اِس کے دوسرے بیٹے عَک کی اولاد جو یمن جا کر بس گئی اور اَشعریوں میں (جو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا قبیلہ تھا) اُس کے شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو گئے۔

مَعَد پر بنی قُضاعہ اور بنی اِیاد۔

---

[1] بعض مُصنّفین نے اِس نام کا تلفّظ اِلیاس لکھا ہے لیکن سُہیلی نے روض الأنف میں اَلْیاس ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔ بلاذری نے بھی انساب الاشراف میں اس نام کا یہی تلفظ لکھا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

بزار پر بنی انمار، خثعم اور بجیلہ، تمام قبائل ربیعہ (جن میں بنی بکر بن وائل، تغلب اور عبدیلہ وغیرہ شامل ہیں)، بنی عبدالقیس، عنزہ اور نمر بن قاسط۔

مضر پر تمام قبائل قیس (سُلیم، مازن، فزارہ، عبس، اشجع، مرّہ، ذبیان، غطفان، عقیل، قشیر، خثعم، ثقیف، باہلہ، بنی سعد بن بکر اور تمام بنی ہوازن وغیرہ) حضورؐ کی رضاعی والدہ حلیمہ بنی سعد بن بکر میں سے تھیں۔

الیاس پر بنی تمیم، بنی ضبہ، مزینہ، خزاعہ، اسلم، عکل، تیم وغیرہ۔

مدرکہ پر ہذیل۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسی قبیلہ سے تھے۔

خزیمہ پر بنی اسد، قارہ اور تمام بنی الہون بن خزیمہ۔

کنانہ پر بنی عبد مناۃ (جن میں بنی بکر اور بنی ضمرہ شامل ہیں)، بنی مالک، بنی ملکان یا ملکان اور بنی مدلج وغیرہ بنی فراس اور بنی قعیم بھی اولاد کنانہ میں سے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ کا قبیلہ غفار بنی ملکان میں سے تھا۔

قریش

علمائے انساب کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ النضر بن کنانہ ہی کا لقب قریش تھا لیکن محققین کہتے ہیں کہ قریش دراصل النضر کے پوتے اور مالک بن النضر کے بیٹے فہر کا لقب تھا۔ جو لوگ اُس کی اولاد ہیں وہ قریش میں شامل ہیں اور جو اُس کی اولاد نہیں ہیں وہ قریش میں سے نہیں ہیں[1]۔

اب حضورؐ کے نسب نامہ کی طرف پھر رجوع کیجیے اور دیکھیے کہ قریش کے کون کون سے خاندان کس پُشت میں حضورؐ کے ساتھ نسب میں شریک ہوتے ہیں۔

فہر پر بنی محارب، اور بنی الحارث۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح بنی الحارث کی ایک شاخ سے تھے۔

غالب بن فہر پر بنی تیم الادرم۔

---

[1] قریش کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک معنی پراگندہ ہونے کے بعد جمع ہونے کے ہیں۔ مگر اس معنی کے لحاظ سے قریش قُصیّ بن کلاب ہی کا لقب ہو سکتا ہے کیونکہ اُسی کے زمانے میں قریش کے تمام خاندان مکہ میں جمع ہوئے۔ دُوسرے معنی کسب تجارت کے ہیں جو قریش کا پیشہ تھا تیسرے معنی تفتیش کے ہیں۔ اس لحاظ سے قریش نضر بن کنانہ کا لقب قرار پاتا ہے، کیونکہ اُس کے متعلق عرب کی روایات میں یہ منقول ہے کہ وہ حاجتمند لوگوں کی حاجات کا تجسس کرتا تھا اور اُن کی مدد کیا کرتا تھا۔ ایک اور معنی یہ ہیں کہ قریش سمندر کے ایک بڑے جانور کا نام ہے جو ہر چیز کو کھا جاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ قریش بن بدر بنی نضر بن کنانہ میں سے ایک شخص تھا جو اپنے قبیلے کے قافلوں کے لیے بدرقے اور رسد رسانی کا انتظام کرتا تھا۔ اس لیے عرب اس قبیلے کے قافلہ کو دیکھ کر کہتے تھے کہ قریش کا قافلہ آ گیا۔ یہ مختلف اقوال ہیں۔ مگر تحقیق یہی ہے کہ قریش بنی فہر کا لقب ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

لُوَیّ بن غالب پر بنی عامر۔ اسی خاندان کی ایک شاخ سے فاطمہ بنت زائدہ اُمّ المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی والدہ تھیں۔ اسی خاندان کی ایک دوسری شاخ سے سُہَیل بن عَمرو تھے جنہوں نے کفر کی حالت میں صلح حُدیبیہ کی شرائط طے کی تھیں اور اپنے بیٹے ابو جَندل پر سخت ظلم ڈھائے تھے۔ پھر فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور حضورؐ کی وفات کے بعد جب مکہ میں اِرتداد کا میلان اُبھرنے لگا تو یہی اُس کو روکنے کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ اسی خاندان کی ایک اور شاخ سے اُمّ المومنین حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

کَعْب بن لُوَیّ پر بنی عَدِی، بنی جُمَح اور بنی سَہْم۔ حضرت عمرؓ بنی عَدی کے ایک خاندان سے تھے۔ حضرت عثمانؓ بن مَظعُون بنی جُمَح میں سے تھے۔ اور حضرت عَمروؓ بن عاص کا تعلق بنو سَہم کے ایک خاندان سے تھا۔

مُرّہ بن کعب پر بنی تَیم اور بنی مَخزُوم۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بنی تَیم میں سے تھے۔ حضرت طلحہؓ بھی اِسی خاندان سے تھے۔ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سَلَمہؓ اور اُن کے پہلے شوہر حضرت ابُو سَلَمہؓ بنی مخزُوم میں سے تھے اور اسی خاندان کا ایک فرد ابوجہل تھا۔ حضرت عُمرؓ کی ماں حَنْتَمَہ بنت ہِشام اِسی خاندان سے تھی اور اس رشتے سے ابوجہل بن ہِشام اُن کا ماموں ہوتا تھا۔ حضرت اَرقَمؓ، جن کا دارِ اَرقم حضورؐ کی دعوتِ رسالت کے دَور میں بڑی اہمیت رکھتا تھا، وہ بھی مَخزُومی تھے۔ اِسی خاندان کی ایک شاخ سے حضرت خالد بن ولیدؓ تھے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی دادی فاطمہ بنت عَمرو بھی مخزومیہ تھیں جن سے حضورؐ کے والد اور آپؐ کے چچا ابُوطالب اور زُبَیر پیدا ہُوئے۔

کِلاب بن مُرّہ پر بنی زُہرہ۔ حضورؐ کی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ، حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف بنی زُہرہ ہی میں سے تھے۔ حضرت حمزہؓ کی والدہ ہالہ بنت اُہَیب بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور وہ حضورؐ کی والدہ بی بی آمنہ کی چچا زاد بہن تھیں۔

قُصَیّ بن کِلاب پر بنی عبدالعُزّیٰ، بنی عبدالدّار اور بنی عبد بن قُصَیّ (یا عبدِ قُصَیّ)۔ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ، حضرت زُبَیرؓ بن العوّام، وَرَقہ بن نَوفَل اور حضرت حکیمؓ بن حِزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) سب بنی عبدالعُزّیٰ میں سے تھے۔ حضورؐ کی نانی بَرّہ بنی عبدالدّار میں سے تھیں اور اسی خاندان کی ایک شاخ سے حضرت مُصعَبؓ بن عُمَیر کا تعلق تھا۔

عبدِمَناف بن قُصَیّ پر بنی المُطَّلِب، بنی عبدِ شَمس اور بنی نَوفَل۔ تمام بنی اُمَیّہ عبدِ شمس کی اولاد تھے۔ اِس

ﷺ یہ شخص عرب میں بڑا عظیم القدر تھا۔ واقعۂ فیل سے پہلے عرب کے لوگ اسی کی وفات کے وقت سے تاریخوں کا حساب کرتے تھے اسی نے یوم العَروبہ (جمعہ) کو اپنی قوم کے اجتماع کا دن مقرر کیا تھا جس میں یہ لوگوں کو مکارمِ اخلاق کی تلقین کیا کرتا تھا۔ نیز ابن اثیر۔ بلاذری۔ (حاشیہ از مؤلف)

خاندان کی ایک شاخ سے مشہور دشمنِ اسلام عُقبہ بن ابی مُعَیط تھا، دوسری شاخ سے اُمِّ جمیل (ابولہب کی بیوی، حَمَّالَۃَ الحَطَب) ، ابوسفیان اور اُن کی بیٹی اُمّ المومنین حضرت اُمِّ حَبِیبَہؓ تھیں۔ تیسری شاخ سے امیرالمومنین حضرت عثمانؓ بن عفان تھے، اور چوتھی شاخ سے مروان کا باپ حَکَم۔ عبد شمس کی اولاد ہی میں سے مشہور دشمنِ اسلام عُتبہ اور شَیبہ بھی تھے۔ عُتبہ کی بیٹی ہِند (ابوسفیان کی بیوی) ، اور بیٹے حضرت ابوحُذَیفہ تھے۔ بنی نوفل میں سے حضرت جُبَیر بن مُطعِم تھے۔ اور بنی المُطَّلِب وہ خاندان تھا جس نے زمانۂ رسالت سے پہلے بھی ہر تنگی و ترشی میں بنی ہاشم کا ساتھ دیا اور زمانۂ رسالت کے بعد بھی وہ بنی ہاشم کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں سینہ سپر رہا۔ مُطَّلِب کو اس کی خوبصورتی کی بنا پر قمر کہا جاتا تھا۔

ہاشم بن عبدمناف پر تمام بنی ہاشم۔ ہاشم کی ایک بیوی بنی قُضاعہ سے تھی۔ نَضلہ بن ہاشم اور شِفاء بنت ہاشم اسی بیوی سے تھے۔ ان کی دوسری بیوی بنی مازن سے تھی جس سے خالدہ بنت ہاشم اور ضعیفہ بنت ہاشم پیدا ہوئیں۔ تیسری بیوی بنو خُزاعہ سے تھی جس سے اسد بن ہاشم پیدا ہوا۔ چوتھی بیوی مدینے کی ہند بنت عَمرو بن ثعلبہ خزرجیہ تھی جس سے ایک بیٹی حَیَّہ پیدا ہوئی اور ایک بیٹا ابوصَیفی۔ پانچویں بیوی بھی مدینہ کے ایک اور خزرجی خاندان بنی النّجّار میں سے تھیں جن کا نام سلمیٰ بنت عَمرو تھا۔ یہی عبدالمطّلب اور ان کی ایک بہن رُقَیّہ کی ماں تھیں۔ اس طرح پہلے ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری اہلِ مدینہ سے قائم ہو چکی تھی۔

عبدالمطّلب پر تمام بنی عبدالمطّلب۔ ان کی ایک بیوی فاطمہ بنت عَمرو بن عائذ بنی مَخزُوم میں سے تھیں جن سے حضورؐ کے والد ماجد عبداللہ، اور دو چچا ابوطالب اور زُبَیر، اور پانچ پھوپھیاں بَرّہ، اُمّ الحکیم البَیضاء، عاتکہ، اُمَیمہ اور اَرْویٰ پیدا ہوئیں۔ حضرت ابوسَلَمہؓ اور ابوسَبرہ بَرّہ کے بیٹے تھے۔ اُمّ الحکیم البَیضاء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نانی تھیں۔ اُمَیمہ حضرت عبداللہ بن جَحشؓ اور اُمّ المومنین حضرت زینبؓ کی والدہ تھیں۔ عاتکہ کے بیٹے زُہَیر بن ابی اُمَیّہ اور عبداللہ بن ابی اُمَیّہ مخزومی تھے۔ عبدالمطّلب کی دوسری بیوی ہالہ بنت اُہَیب بنی زُہرہ میں سے تھیں اور حضورؐ کی والدہ بی بی آمنہ کی چچازاد بہن تھیں۔ ان سے حضورؐ کے تین چچا، حضرت حمزہؓ، مُقَوِّم اور حَجَل پیدا ہوئے۔ آپ کی پھوپھی حضرت صَفِیّہ بھی انہی بیوی کے بطن سے تھیں جن کے صاحبزادے حضرت زبیرؓ بن العوام تھے۔ حضرت زبیرؓ کے والد عَوّام بن خُوَیلد حضرت خدیجہؓ کے بھائی تھے۔ عبدالمطّلب کی تیسری بیوی نُتَیلہ بنت جَناب بنی النَّمِر بن قاسط میں سے تھی جس سے حضرت عباسؓ اور ضِرار پیدا ہوئے۔ ان کی ایک اور بیوی سَمراء بنت جُندَب بنی بکر بن ہَوازِن میں سے تھی جس سے حارث بن عبدالمطّلب پیدا ہوا۔ ان کی ایک اور بیوی لُبنیٰ بنت ہاجرہ بنی خُزاعہ میں سے تھی جس سے ابولہب پیدا ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نسب نامے اور قبائلِ عرب کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ آپ کے

تعلق کی ان تفصیلات پر نگاہ ڈالنے سے چند باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔

اوّل، یہ کہ دنیا کے کسی ایک مذہب کے پیشوا اور کسی ایک دنیوی نظام کے بانی کے متعلق بھی تاریخ میں اتنی معلومات موجود نہیں ہیں جن سے اس قدر تفصیل کے ساتھ اس کے حسب نسب اور اس کی اصل نسل کا پتہ چلتا ہو جتنی تفصیل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چلتا ہے۔ اس لیے دنیا کے اکابر رجال میں حضورؐ کی شخصیت وہ واحد شخصیت ہے جو تاریخ کی پوری روشنی میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

دوم یہ کہ حضورؐ کے سوا کسی بڑے مذہبی یا دنیوی رہنما کے متعلق ہمیں اتنی تفصیل کے ساتھ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اپنے معاشرے میں اُس کی جڑیں کتنی گہری اور کتنی دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اہلِ عرب کے لیے آپؐ کوئی غیر معروف شخص نہیں تھے، بلکہ جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب تک پورے عرب میں پھیلے ہوئے سیکڑوں قبائل کو معلوم تھا کہ آپؐ کس خاندان کے فرد ہیں اور اُس خاندان کے ساتھ اُن کا اپنا نسبی رشتہ کیا ہے۔

سوم یہ کہ قریش کے جتنے خاندان مکہ اور اس کے اطراف میں آباد تھے اُن میں سے کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس سے آپؐ کا کسی نہ کسی طرح کی رشتہ داری کا تعلق نہ ہو۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ:

لَمْ يَكُنْ بَطْنٌ مِنْ قُرَيْشٍ إِلَّا وَلَهُ فِيهِ قَرَابَةٌ۔

"قریش کے ہر خاندان سے آپؐ کا کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور تھا۔"

قریش کا مکہ میں جمع ہونا اور کعبہ کی تولیت حاصل کرنا

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ مکہ پر جُرہم کے تسلّط کے بعد اولادِ اسماعیلؑ عرب کے مختلف خطّوں میں منتشر ہو گئی تھی۔ یہی کیفیت بنی خزاعہ کی ایک شاخ غُبشان کی تولیتِ کعبہ کے دَور میں بھی رہی۔ بنی اسماعیلؑ کی دوسری شاخوں کی طرح قریش بھی بنی کنانہ کی مختلف بستیوں میں بکھرے ہوئے تھے اور اُن کا بہت تھوڑا حصہ مکہ میں آباد تھا۔ سنہ ۴۴۰ء کے لگ بھگ زمانے میں قُصَیّ بن کِلاب کے ہاتھوں یہ صورتِ حال ختم ہوئی اور مکہ قریش کے قبضہ میں اور خانۂ کعبہ انہی کی تولیت میں آ گیا۔

اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قُصَیّ کا باپ کِلاب بن مُرّہ جب مر گیا تو اس کی ماں فاطمہ بنت سعد جو اَزدِ شنوءہ

---

[1] ابن کثیر کی روایت ہے کہ کعب بن لُؤَیّ (قُصَیّ کے پردادا) کی موت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان ۵۶۰ برس کا فصل ہے۔ اس لحاظ سے شاید غالب بن فِہر حضرت مسیحؑ کا ہم عصر تھا۔ ابن کثیر ہی نے سُہیلی اور دوسرے ائمہ کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مَعَد بن عدنان کا زمانہ وہ تھا جب بخت نصّر یروشلم کو تباہ کر کے اور یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا۔ یہ حضرت مسیحؑ سے تقریباً ۶۰۰ برس قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ بلاذُری نے مَعَد بن عدنان کو بخت نصّر کا ہمعصر بتایا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

میں سے تھی، بنی قُضاعہ کے ایک شخص رَبِیعہ بن حَرام کے ساتھ نکاح کر کے شام چلی گئی اور وہاں اِس دوسرے شوہر سے اس کے ہاں ایک اور لڑکا رِزاح بن رَبِیعہ پیدا ہُوا جب قُصَیّ جوان ہُوا تو ایک مرتبہ بنی قضاعہ میں سے ایک شخص سے اس کی لڑائی ہو گئی اور اس نے قُصَیّ کو طعنہ دیا کہ تو یہ ہمارے ہاں پل کر ہم ہی پر غرّاتا ہے، اپنے لوگوں میں کیوں نہیں جاتا؟ اس پر قُصَیّ نے اپنی ماں سے پُوچھا کہ میں کون ہُوں؟ اُس نے بتایا کہ تُو کِلاب کا بیٹا اور قبیلۂ قریش کا فرزند ہے اور تیری قوم بیت الحرام کے پاس شہر مکّہ اور اس کے گردو نواح میں رہتی ہے۔ تب قُصَیّ نے اصرار کیا کہ میں اپنے لوگوں میں جاؤں گا۔ چنانچہ جب حج کا زمانہ آیا تو وہ بنی قضاعہ کے حاجیوں کے ساتھ مکّہ پہنچ گیا۔ یہاں اُس کا حقیقی بھائی زُہرہ، جو کِلاب کی وفات کے وقت جوان تھا، پہلے سے آباد تھا۔ وہ اسی کے پاس ٹھیر گیا اور اُس نے حُلَیل بن حُبْشِیَہ خُزاعی سے (جو اُس وقت کعبہ کا متولّی اور مکّہ کا صاحبِ امر تھا) اُس کی لڑکی حُبّٰی کا رشتہ مانگا جسے اُس نے قُصَیّ کی شرافتِ نسبی اور شاندار شخصیت دیکھ کر بخوشی قبول کر لیا۔ اس کے بعد کعبہ کی تولیّت اور مکّہ کی سرداری کس طرح اُس کے قبضہ میں آئی، اِس باب میں روایات مختلف ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ حُلَیل نے خود وصیّت کر دی تھی کہ اُس کے بعد قُصَیّ ولایتِ کعبہ کا اہل ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حُلَیل کے مرنے کے بعد قُصَیّ نے دعویٰ کیا کہ میں دوسروں سے بڑھ کر اِس منصب کا اہل ہوں، اور جب بنی خُزاعہ اور بنی بَکر نے نہ مانا تو اُس نے اپنے ماں جائے بھائی رِزاح اور بنی کِنانہ اور قضاعہ کو مدد کے لیے بُلا لیا، اور مکّہ کے اطراف میں قریش کے جو لوگ آباد تھے اُن کو بھی جمع کر لیا اور بزورِ خُزاعہ اور بنی بَکر کو مکّہ سے نکال دیا۔ بعد میں جب فریقین نے یَعمَر بن عَوف کو جو بنی عبدِ مَناۃ بن کِنانہ میں سے تھا، پنچ بنایا تو اس نے فیصلہ دیا کہ خُزاعہ کے مقابلہ میں قُصَیّ ولایتِ کعبہ کا زیادہ حقدار ہے کیونکہ وہ اور اُس کا خاندان قطعی اور صریح طور پر آلِ اسماعیلؑ میں سے ہے۔

خُزاعہ کے قضیہ سے فارغ ہو کر قُصَیّ نے بنی الغَوث بن مُرّ کے معاملہ کی طرف توجّہ کی جو صُوفَہ کہلاتے تھے اور جُرہُم و خُزاعہ کے زمانے سے انہوں نے یہ منصب سنبھال رکھا تھا کہ حج کے موقع پر عرفات سے اِفاضہ ان کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ منیٰ بھی ان کی اجازت ہی سے لوگ جا سکتے تھے۔ اور پھر منیٰ سے لوگ اُس وقت تک اپنے گھروں کو روانہ نہ ہو سکتے تھے جب تک کہ صُوفہ پہلے رَمیِ جِمار نہ کر لیں۔ اُن کے بعد ہی دوسرے حاجی رَمی کر کے روانہ ہو سکتے تھے۔ ایک طویل مدّت کے عمل سے یہ بھی گویا ایک دین بن گیا تھا جس کی پیروی لازم سمجھی جاتی تھی۔ قُصَیّ نے حج کے موقع پر صُوفہ سے جنگ کی اور انہیں اس منصب سے بے دخل کیا (ابن ہشام)۔

اس طرح جب قُصَیّ نے کعبہ کی تولیّت اور مکّہ کی سرداری حاصل کر لی تو اُس نے فِہر کی ساری اولاد کو (جو قُرَیش کہلاتی تھی) عرب کے مختلف حصّوں سے مکّہ میں جمع کر لیا اور مکّہ کو اُن کے درمیان بانٹ کر شہر کے ایک ایک حصّہ میں ایک ایک خاندان کو آباد کر دیا[1]۔ اِسی بنا پر قریش اُسے مُجَمِّع (جمع کرنے والا) کہتے ہیں۔ چنانچہ

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے

حذافہ بن غانم عدوی کہتا ہے:

أَبُوكُمْ قُصَيٌّ كَانَ يُدْعَى مُجَمِّعًا
بِهِ جَمَعَ اللّٰهُ الْقَبَائِلَ مِنْ فِهْرِ

"تمہارا باپ قصیّ مجمّع کہلاتا تھا۔ اسی کے ذریعہ سے اللہ نے فہر کے قبائل کو جمع کیا۔"

مکّہ کی شہری ریاست اور حج کا انتظام

قصیّ کی انہی خدمات کی بنا پر اُس کو تمام قبائل قُریش نے اپنا سردار مان لیا۔ قُریش کے کسی گھرانے میں جو لڑکی بھی جوان ہوتی اُسے قمیص قصیّ کے گھر ہی میں پہنائی جاتی۔ جو نکاح بھی ہوتا قصیّ کے گھر ہی میں ہوتا۔ کوئی اہم معاملہ پیش آتا، یا کسی قبیلے سے جنگ کی نوبت آتی تو اسی گھر میں سب گھرانوں کے سردار مشورے کے لیے جمع ہوتے۔ اسی وجہ سے یہ گھر دارالنَّدوَہ کہلاتا تھا اور اس کا ایک دروازہ حرم کی طرف کھلتا تھا۔ جنگ کے موقع پر قصیّ ہی کی اولاد میں سے کسی کو علمبردار بنایا جاتا۔ اِس منصب کا نام اللّواء تھا۔ حج کے سارے انتظامات بھی قصیّ کے ہاتھ میں تھے۔ ان میں سے ایک کا نام السِّقَایَہ تھا، یعنی حاجیوں کو پانی پلانا۔ دوسرا الرِّفَادَہ تھا، یعنی حاجیوں کو کھانا کھلانے کا بندوبست جس کے لیے قریش کے سارے گھرانے چندہ اکٹھا کر کے قصیّ کو دیتے تھے اور وہ حج سے واپسی تک تمام اُن حاجیوں کے لیے کھانے کا انتظام کرتا تھا جو اپنے کھانے کا خود انتظام نہ کر سکتے۔ تیسرا الحِجَابہ تھا یعنی خانہ کعبہ کی کلید برداری اور زائرین کے لیے کعبہ کو کھولنا اور بند کرنا۔

قصیّ اپنی زندگی میں مکّہ کی ریاست کا بلا شرکت غیرے مالک رہا۔ جب اس کا آخر وقت آیا تو اُس نے یہ دیکھ کر کہ اس کا بیٹا عبدِ مَناف پہلے ہی عرب میں ناموری حاصل کر چکا ہے اور اس کا شرف تسلیم کیا جانے لگا ہے، مکّہ کی ریاست کے تمام مناصب (نَدوہ، حِجابہ، سِقایہ، رِفادہ اور لِواء) اپنے دوسرے بیٹے عبدالدّار کو دے دیے۔ قصیّ کی وفات کے بعد ایک مدّت تک اس کے فیصلے کا احترام کیا گیا، لیکن پھر کسی وقت اس کی اولاد میں ان مناصب کی تقسیم یہ

(حاشیہ صفحہ سابق)

لہ قصیّ نے مکہ کو قریش کے خاندانوں کے درمیان اس طرح تقسیم کیا تھا کہ حَرَم کے آس پاس کے علاقے اور دونوں طرف کے پہاڑوں کی گھاٹیوں اور بلندیوں میں بنی کعب بن لُؤَیّ کی مختلف شاخوں کو آباد کیا جن میں بنی عدی، بنی جُمَح، بنی سَہم، بنی تَیم، بنی مخزوم، بنی زُہرہ، بنی عبدالعُزّیٰ، بنی عبدالدّار، بنی المُطّلب، بنی ہاشم، بنی عبد شمس اور بنی نوفل شامل تھے۔ ان کو قریش البطاح کہا جاتا تھا، یعنی یہ مکّہ کے اندرونی حصّہ میں رہنے والے اور اصل اہلِ حَرَم تھے۔

کعب سے اوپر فہر کی اولاد کے خاندان (بنی مُحارِب، بنی الحارث، بنی تَیم الاَدرم، بنی عامر بن لُؤَیّ وغیرہ) قریش الظّواہر تھے اور ان کو مکہ کا بیرونی حصّہ دیا گیا تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

جھگڑا ہو گیا، جس میں قریش کے کچھ گھرانے بنی عبدالدّار کے ساتھ اور کچھ بنی عبد مناف کے ساتھ ہو گئے[1]۔ قریب تھا کہ یہ جھگڑا طول کھینچ جاتا، لیکن خانہ جنگی تک نوبت پہنچنے سے پہلے آپس میں تصفیہ ہو گیا جس کے تحت حجابہ، لواء اور ندوہ بنی عبدالدّار کے پاس رہے، اور سقایہ اور رفادہ بنی عبد مناف کو دے دیے گئے۔ آلِ عبد مناف نے آپس کے مشورے سے یہ دونوں منصب ہاشم کو دے دیے[2]۔

ہاشم

ہاشم کا اصل نام عَمرو تھا۔ "ہاشم" کا لقب اسے اُس وقت دیا گیا جب مکّہ میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا، اور اُس نے شام سے غلّہ لا کر روٹیاں پکوائیں اور بہت سے اُونٹ کٹوا کر سالن تیار کرایا اور روٹیوں کو اُس میں چُور کر لوگوں کو اس کا ثرید (مالیدہ) کھلایا۔ ہَشم کے معنی توڑنے اور کچلنے کے ہیں۔ روٹیاں توڑ کر سالن میں مالیدہ تیار کرنے کی وجہ سے اُس کو ہاشم کہا جانے لگا۔ رفادہ اور سقایہ کا منصب ہاتھ میں آنے کے بعد ہاشم کا قاعدہ یہ تھا کہ جب حج کا زمانہ آتا تو وہ قریش کے لوگوں کو جمع کر کے کہتا: "یہ اللہ کے پڑوسی اور اُس کے گھر کے لوگ اِس زمانے میں زیارت کے لیے تمہارے پاس آتے ہیں۔ یہ اللہ کے مہمان ہیں، اور سب سے زیادہ ضیافت کے حقدار اللہ ہی کے مہمان ہوتے ہیں۔ اللہ نے تم کو یہ خصوصیت بخشی ہے اور اسی کی بدولت تمہیں عزّت دی ہے اور تمہاری ایسی حفاظت کی ہے جیسی کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کی نہیں کرتا۔ لہٰذا اس کے مہمانوں اور زائروں کا اکرام کرو جو گرد آلود اور پراگندہ حال ہر دُور دراز علاقہ سے دُبلی اُونٹنیوں پر، جو سُوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں، آ رہے ہیں۔ اُن کے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ اُن میں جُوئیں پڑ گئی ہیں۔ اُن کا زادِ راہ ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا ان کو کھانا کھلاؤ اور پانی پلاؤ۔" اس پر قریش کے سارے خاندانوں سے چندہ آتا اور خود ہاشم زرِ کثیر اپنے پاس سے خرچ کرتا۔ پھر چمڑے کے بڑے بڑے حوضوں میں مکّہ کے سارے کنووں سے (کیونکہ زمزم کو تو جُرہم بند کر گئے تھے اور اس کا نشان تک باقی نہ تھا) پانی لا لا کر ان میں

---

[1] قریش کے جن خاندانوں نے بنی عبد مناف کا ساتھ دیا وہ بنو اسد بن عبدالعُزّٰی، بنو زُہرہ بن کلاب، بنو تَیم بن مُرّہ، اور بنو الحارث بن فِہر تھے، اور اس جتھے کا سردار عبد شمس تھا۔ اور جن خاندانوں نے بنی عبدالدّار کا ساتھ دیا وہ بنو مخزوم، بنو سَہم، بنو جُمَح اور بنو عَدِی تھے۔ ان کا سردار عامر بن ہاشم تھا۔ بنی عامر بن لُؤَیّ اور بنی محارب بن فِہر اس جھگڑے میں غیر جانبدار رہے۔

[2] رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دستِ مبارک پر مکّہ فتح ہونے تک یہ مناصب اُسی طرح قائم رہے جس طرح یہ اُس مصالحت کے موقع پر دونوں خاندانوں میں تقسیم کیے گئے تھے۔ فتح کے بعد حضورؐ نے حجابہ اور سقایہ کے سوا باقی سب کو منسوخ کر دیا۔ حجابہ آج تک بنی عبدالدّار کی ایک شاخ شَیبہ بن عثمان کے ہاتھ میں چلی آ رہی ہے۔ البتہ سقایہ جو آخر کار حضرت عبّاس بن عبدالمطّلب کے ہاتھ میں آ گئی ایک مدّت تک بنی عبّاس کے ہاتھ میں رہی، پھر پہلے عبّاسی خلیفہ نے اسے خود چھوڑ دیا۔ (حاشیہ از مؤلّف)

حاجیوں کے لیے بھرا جاتا۔ روٹیاں اور سالن پکا کر ان کا ثرید بنایا جاتا۔ روٹی اور دودھ کا ملیدا بھی بنایا جاتا، ستّو اور کھجوریں وغیرہ فراہم کی جاتیں اور حاجیوں کے منیٰ سے رخصت ہونے تک اُن کی ضیافت کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسی چیز نے ہاشم کو عرب کے تمام قبائل میں مقبول بنا دیا تھا کیونکہ ان سب کو ہر سال حج میں اُس کی اس فیّاضانہ خدمت سے استفادے کا موقع ملتا تھا۔ (ے)

قریش کی تجارت اور اس کی ترقی

قریش کی وہ تجارت جس کا ذکر سورۂ قریش میں رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ (گرمی اور جاڑے کے سفروں) کے نام سے اللہ کے ایک فضل کے طور پر کیا گیا ہے، اس کا خیال بھی سب سے پہلے ہاشم ہی کے ذہن میں پیدا ہُوا۔ اُس نے اپنے تینوں بھائیوں، عبدِشمس، مُطّلِب اور نوفل کو ساتھ ملا کر یہ منصوبہ بنایا کہ اُس بین الاقوامی تجارت میں حصّہ لیا جائے جو عرب کے راستے بلادِ مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی، اور ساتھ ساتھ اہلِ عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے تاکہ راستے کے قبائل اُن سے مال خریدیں، اور مکّے کی منڈی میں اندرونِ ملک کے تُجّار خریداری کے لیے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اُس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلّط قائم کر چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستوں سے رُومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔ اِسی وجہ سے جنوبی عرب سے بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا اُس کا کاروبار بہت چمک اُٹھا تھا۔ عرب کے دوسرے تجارتی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیتُ اللہ کے خُدّام ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ حج کے زمانے میں نہایت فیّاضی کے ساتھ حاجیوں کی جو خدمت قریش کے لوگ کرتے تھے اس کی بنا پر سب اُن کے احسان مند تھے۔ اُنہیں اِس امر کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ راستے میں کہیں ان کے قافلوں پر ڈاکہ مارا جائے گا۔ راستے کے قبائل اُن سے رہگزر کے وہ بھاری ٹیکس بھی وصول نہ کر سکتے تھے جو دوسرے قافلوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے اِنہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اپنی اس سکیم میں اپنے تینوں بھائیوں کو شامل کیا۔ شام کے غسّانی بادشاہ سے ہاشم نے، حَبَش کے بادشاہ سے عبدِشمس نے، یمنی اُمراء سے مُطّلب نے اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی مراعات حاصل کیں[1]۔ اِس طرح اِن لوگوں کی تجارت بڑی تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی۔ اِسی بنا پر یہ چاروں بھائی مُتَّجِرِین (تجارت پیشہ) کے نام سے مشہور ہو گئے، اور جو روابط

[1] طبری کا بیان ہے کہ ہاشم نے قیصرِ روم اور تمام و غسان کے بادشاہوں سے، عبدِشمس نے حبش کے بادشاہ نجاشی سے، نوفل نے شاہانِ فارس سے، اور مُطّلب نے شاہانِ حمیر سے تجارتی مراعات اور سفر میں حفاظت کے پروانے حاصل کیے تھے۔ ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ قیصرِ روم کے ہاں ہاشم کو خاص اعزاز حاصل تھا اور وہ کاروبار کے سلسلے میں اَنقرہ تک جاتا تھا (حاشیہ از مؤلف)۔

انہوں نے گردو پیش کے قبائل اور ریاستوں سے قائم کیے تھے اُن کی بنا پر ان کو اصحاب الایلاف بھی کہا جاتا تھا جس کے لفظی معنی تو "الفت پیدا کرنے والوں" کے ہیں، لیکن اصطلاحاً ایلاف سے مراد ایسا دوستانہ تعلق تھا جس کی بنا پر راستے سے گزرنے کا امن اور دوست قبیلے کے علاقے میں منزل کرنے کا امن حاصل ہو۔ یہ حلیف (Alliance) سے مختلف نوعیت کا معاہدہ ہوتا تھا۔

اس کاروبار کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن، اور حبش کے ممالک سے تعلقات کے وہ مواقع حاصل ہوئے، اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہ راست سابقہ پیش آنے کے باعث اُن کا معیارِ دانش و بینش اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ اُن کی ٹکر کا نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی وہ عرب میں سب پر فائق ہو گئے اور مکہ جزیرۃ العرب کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ اِن بین الاقوامی تعلقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہُوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے کے لیے استعمال ہُوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قریش قادۃ الناس "قریش لوگوں کے لیڈر ہیں" (مسند احمد، مرویاتِ عمرو بن العاص)۔ اور حضرت علیؓ کی روایت بیہقی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

كان هٰذا الامر فی حِمْيَرَ فنزعه الله منهم وجعله فی قریش۔

"پہلے عرب کی سرداری قبیلۂ حِمْیَر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن سے سلب کر کے قریش کو دے دی"۔

قریش اسی طرح ترقی پر ترقی کرتے چلے جا رہے تھے کہ مکہ پر اَبْرَہہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آ گیا۔ اگر اُس وقت اَبْرَہہ اِس شہرِ مقدس کو فتح کرنے اور کعبے کو ڈھا دینے میں کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب کا یہ عقیدہ متزلزل ہو جاتا کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ قریش کو اِس گھر کے خادم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پورے ملک میں حاصل تھا وہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رُومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکے کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضے میں لے لیتی۔ اور قریش اُس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قُصَیّ بن کِلاب سے پہلے مبتلا تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ پرندوں کے لشکروں نے سنگریزے مار مار کر اَبْرَہہ کی لائی ہوئی ۶۰ ہزار حبشی فوج کو تباہ و برباد کر دیا، اور مکے سے یمن تک سارے راستے میں جگہ جگہ اس تباہ شدہ فوج کے آدمی گر گر کر مرتے چلے گئے تو کعبے کے بیت اللہ ہونے پر تمام اہلِ عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہا زیادہ مضبوط ہو گیا اور اس کے ساتھ قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ بیٹھ گئی۔ اب عربوں کو یقین ہو گیا کہ ان

لوگوں پر اللہ کا فضلِ خاص ہے۔ وہ بے کھٹکے عرب کے ہر حصے میں جاتے اور اپنے تجارتی قافلے لے کر ہر علاقے سے گزرتے۔ کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کو چھیڑتا۔ اُنہیں چھیڑنا تو درکنار، اُن کی امان میں کوئی غیر قریشی بھی ہوتا تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا۔ (۸)

عبدالمطّلب بن ہاشم

ہاشم اپنے تجارتی سفروں کے سلسلے میں اکثر شام جاتے ہوئے مدینے ٹھیرا کرتا تھا، اور وہاں قبیلہ خزرج کی ایک عورت سے وہ پہلے ہی شادی کر چکا تھا جس سے اس کے دو بچے خیرہ (لڑکی) اور ابو صَیفی (لڑکا) پیدا ہوئے تھے۔ ایک اور سفر میں اس نے خزرج ہی کے ایک خاندان بنی نجار کی ایک نوجوان عورت سلمٰی بنت عَمرو بن زید کو بازار میں ایک اُونچے مقام پر بیٹھے دیکھا جو حکم دیتی جا رہی تھی کہ اُس کے لیے کیا خریدا جائے اور اُس کی طرف سے کیا بیچا جائے۔ ہاشم کو اس کے حُسن و جمال اور اس کی شان و شوکت اور ذکاوت و ذہانت نے بہت متاثر کیا اور اُس نے شادی کی درخواست اُس سے کر دی۔ وہ کسی سے اِس شرط کے بغیر شادی کے لیے تیار نہ تھی کہ وہ اپنی مرضی کی مختار ہوگی اور کسی شخص کو پسند نہ کرے گی تو علیحدگی اختیار کر لے گی۔ ہاشم نے اس کی شرط مان لی اور اس نے ہاشم کی خاندانی شرافت اور ذاتی وجاہت کو دیکھ کر اس کا پیغام قبول کر لیا۔ مدینے ہی میں دونوں کی شادی ہوئی اور یہیں اِس خاتون کے بطن سے حضورؐ کے دادا عبدالمطّلب تقریباً ۵۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ اِسی سفر میں ہاشم جب غزّہ پہنچا تو بیمار ہوگیا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔ اِس طرح عبدالمطّلب جوانی کی عمر کے قریب پہنچنے تک اپنی ماں کے پاس مدینے ہی میں رہے۔ ہاشم نے مرتے وقت وصیت کی کہ اُس کے بعد اُس کا بھائی مُطّلب اُس کی جگہ سقایہ اور رِفادہ کا متولی ہوگا اور وہی اس کے اہل و عیال اور اس کی جائداد کی دیکھ بھال کرے گا۔ اُس وقت سے بنی ہاشم اور بنی المطّلب یک جان و دو قالب ہوگئے اور آخر تک رہے۔ اس کے برعکس بنی عبدِ شمس (جن میں بنی اُمیّہ تھے) اور بنی نوفل ایک دوسرے کے حلیف بنے اور بعد تک رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت میں جب قریش کے سب قبیلوں نے آپ کا مقاطعہ کیا اور شعبِ ابی طالب میں آپ کو محصور کیا گیا تو بنی ہاشم کے ساتھ بنی المطّلب بھی اِس محصوری میں آپ کے ساتھ شامل ہوئے تھے، بخلاف اس کے بنی نوفل اور بنی عبدِ شمس نے مخالفین کا ساتھ دیا۔

عبدالمطّلب (جن کا اصل نام شَیبہ تھا اور اپنی خوبیوں کے باعث شَیبۃ الحمد بھی کہلاتے تھے) مدینہ میں پرورش پا رہے تھے کہ ایک مرتبہ ثابت بن مُنذِر (جو حضرت حسّانؓ بن ثابت کا باپ تھا) مکّے گیا اور مُطّلب سے ملا جس کے ساتھ اس کا پہلے سے میل جول تھا۔ دورانِ گفتگو میں اُس نے کہا کہ تم کہیں اپنے بھتیجے شَیبہ کو دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے۔ بڑا شاندار شخصیت اور خوبرو جوان اُٹھا ہے۔ یہ حالات سُن کر مُطّلب بے تاب ہوگیا اور جا کر بھتیجے کو اپنے

ساتھ اُونٹ پر بٹھا کر لے آیا۔ قریش کے لوگوں نے اس نوجوان لڑکے کو مُطّلب کے ساتھ آتے دیکھا تو کہنے لگے یہ عَبدُ المُطّلب (مُطّلب کا غلام) ہے۔ مُطّلب نے لوگوں کو ڈانٹا بھی کہ یہ میرے بھائی ہاشم کا لڑکا شَیبہ ہے، میرا غلام نہیں ہے، مگر عبدالمطلب کا نام کچھ ایسا مشہور ہُوا کہ اصلی نام اس کے نیچے دب کر رہ گیا۔ کچھ مدت کے بعد مُطّلب ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں یمن گیا اور وہیں مر گیا۔ عبدالمُطّلب اُس کے جانشین ہوئے اور سِقایہ و رِفادہ کے دونوں منصب اُن کو مل گئے۔ ابن سعد اُن کی تعریف میں کہتا ہے کہ "وہ قریش میں سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ تنومند، سب سے زیادہ سنجیدہ و بُردبار، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ اُن برائیوں سے دُور تھے جو مَردوں کو بگاڑنے والی ہوتی ہیں"۔ ابن ہشام کا قول ہے کہ "ان کو اپنی قوم میں عزت و شرف کا وہ مرتبہ حاصل ہُوا جس تک ان کے آباء میں سے کوئی نہ پہنچا تھا۔ اُن کی قوم اُن سے محبت کرتی تھی اور لوگوں میں وہ بڑی منزلت رکھتے تھے"۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ "عبدالمُطّلب بھی ماہِ رمضان میں ہر سال غارِ حرا میں جاکر تحنّث (عبادت) کیا کرتے تھے اور پورے مہینے مساکین کو کھانا کھلاتے رہتے تھے"۔

طبری، ابن اثیر اور بلاذری نے لکھا ہے کہ عبدالمُطّلب کے چچا نوفل نے ہاشم کے چھوڑے ہوئے ترکہ میں سے ایک حصہ غصب کر لیا تھا۔ عبدالمُطّلب نے پہلے قریش کے بڑے بڑے لوگوں سے شکایت کی، مگر سب نے چچا اور بھتیجے کے جھگڑے میں دخل دینے سے انکار کر دیا۔ پھر عبدالمُطّلب نے اپنی ننھیال (مدینہ کے بنی عدی بن نجّار) کو مدد کے لیے بلایا۔ اس پر ان کا ماموں ابو سعید بن عدس ۸۰ آدمی لے کر مکہ پہنچ گیا اور اس نے زبردستی نوفل سے اپنے بھانجے کا حق دلوایا۔ اس کے بعد نوفل بھی بنی ہاشم کے خلاف بنی عبدِ شمس سے مل گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت تک بنی نوفل اُسی جتھے میں شامل رہے جو بنی ہاشم کا مخالف اور بنی عبدِ شمس کا حامی تھا۔ عبدالمُطّلب نے جب یہ دیکھا کہ بنی نوفل ان کے مخالف جتھے سے جا ملے ہیں تو انہوں نے خُزاعہ کے سرداروں سے بات چیت کی اور اُن کے ساتھ حِلف (اتحاد و اعانت باہمی) کا معاہدہ کر لیا اور کعبہ میں جاکر انہوں نے باقاعدہ معاہدہ کی تحریر لکھی۔ ابن سعد اور بلاذری کا بیان اس سے ذرا مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بنی خُزاعہ نے عبدالمُطّلب سے خود درخواست کر کے باہمی دوستی و معاونت کا معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدہ میں بنی المطّلب اور بنی ہاشم، دونوں خاندان شریک ہوئے اور بنی عبدشمس اور بنی نوفل اس سے الگ رہے۔ یہ معاہدہ دارالندوہ میں لکھا گیا اور کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا۔ اس کے مطابق عبدالمُطّلب نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ بنی خُزاعہ کے ساتھ ہمیشہ دوستی نباہنا۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ صلح حُدیبیہ کے موقع پر جب شرائطِ معاہدہ میں سے ایک شرط یہ طے ہوئی کہ قبائلِ عرب میں سے جو چاہے فریقین میں سے کسی ایک کے ساتھ شریک ہو جائے تو خُزاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔

عبدالمطلب کا زمزم کو ازسرِنو برآمد کرنا

یہ فخر بھی جناب عبدالمطلب ہی کو حاصل ہُوا کہ زمزم جسے جُرہُم بند کرکے اس کا نشان تک مٹا گئے تھے اُن کے ہاتھوں برآمد ہُوا۔ محمد بن اسحاق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ خواب میں جناب عبدالمطلب کو زمزم کا مقام بتا یا گیا اور انہیں ہدایت کی گئی کہ اس جگہ کو کھود کر یہ مقدس کنواں برآمد کریں۔ اُس وقت اُن کا کوئی بیٹا حارث کے سوا نہ تھا۔ اسی کو لے کر وہ کدال پھاوڑا لیے ہوئے وہاں پہنچے اور کھدائی شروع کر دی۔ جب پانی نمودار ہُوا تو عبدالمطلب نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اِس سے قریش کے لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ زمزم نکل آیا ہے۔ وہ سب اکٹھے ہوگئے اور کہنے لگے کہ "اے عبدالمطلب یہ تو ہمارے باپ اسماعیلؑ کا کنواں ہے اور اس میں ہمارا بھی حق ہے، ہمیں اس میں اپنے ساتھ شریک کرو۔" انہوں نے جواب دیا "میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ خاص طور پر مجھے دیا گیا ہے، تم میں سے کسی کو نہیں دیا گیا۔" وہ جھگڑے پر آمادہ ہوگئے۔ عبدالمطلب نے کہا "اچھا تو کسی کو حَکَم بنا لو۔" انہوں نے بنی سعد بن ہُذیم کی کاہنہ کا نام تجویز کیا جو شام کے بالائی علاقوں میں رہتی تھی۔ عبدالمطلب نے یہ بات مان لی اور اپنے چند ساتھیوں کو لے کر وہ بنی اُمیّہ اور قبائلِ قریش میں سے ہر قبیلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں ایک بے آب و گیاہ بیابان آیا جہاں عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں کا پانی ختم ہوگیا اور انہیں یقین ہوگیا کہ ہم پیاس سے مر جائیں گے۔ انہوں نے اپنے ہم سفر دوسرے اہلِ قریش سے پانی مانگا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہاں پانی کا دُور دُور کہیں نام و نشان نہیں ہے، ہم اگر پانی میں تمہیں شریک کریں تو ہم بھی اسی ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں گے جس کا تمہیں خطرہ ہے۔ آخر کار عبدالمطلب نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابھی جبکہ ہاتھ پاؤں میں کچھ جان ہے۔ آؤ، ہم میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک گڑھا کھود لے اور جو جو مرتا جائے اس کو اسی گڑھے میں دفن کیا جاتا رہے۔ چنانچہ ہر ایک نے گڑھا کھود لیا اور سب موت کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ پھر عبدالمطلب نے ساتھیوں سے کہا کہ ہم نے اپنے آپ کو یونہی موت کے حوالے کر دیا۔ آؤ ہمت کرکے چلیں، شاید کہیں ہمیں پانی مل جائے۔ یہ کہہ کر سب کوچ کے لیے تیار ہوگئے۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ جب عبدالمطلب نے اپنے اونٹ کو اُٹھایا اور اس کا پاؤں زمین پر پڑا تو یکایک اس کے نیچے سے میٹھے پانی کا ایک چشمہ نکل آیا۔ اس پر عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اُتر کر خوب پانی پیا اور اپنے مشکیزے پانی سے بھر لیے۔ پھر عبدالمطلب نے اُن دوسرے اہلِ قریش کو جنہوں نے پانی دینے سے انکار کیا تھا، پکارا اور کہا "آؤ، اللہ نے ہمیں پانی دے دیا ہے، تم بھی پیو اور پانی بھر لو۔" چنانچہ وہ آئے، سب پانی سے سیراب ہوئے اور پھر کہا کہ "اے عبدالمطلب، خدا ہی نے ہمارے خلاف تمہارے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ خدا کی قسم اب ہم زمزم کے معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں گے جس خدا نے تمہیں اس بیابان میں پانی دیا ہے اُسی خدا نے زمزم بھی تمہیں عطا کیا ہے۔ اب اپنے پانی کی طرف بخیر و خوبی

واپس چلو۔ اِس طرح سب اُس کاہنہ کے پاس جانے کے بجائے کعبے واپس ہو گئے۔

یہ سقایہ کا منصب، جس میں اب سب سے اہم زمزم کی سقایت تھی، زندگی بھر عبدالمطلب کے پاس رہا۔ ان کے بعد یہ ان کے بیٹے ابوطالب کو ملا۔ مگر ابوطالب اپنی فیاضی کے باعث اپنی مالی استطاعت سے بہت بڑھ کر حاجیوں کو پانی، شربت، دودھ وغیرہ پلانے میں خرچ کرنے لگے، جس کی وجہ سے انہیں کئی مرتبہ اپنے بھائی عباس سے قرض لینا پڑا اور اُسے ادا نہ کر سکے۔ آخر کار حضرت عباس نے شرط لگائی کہ اب اگر آپ ادا نہ کر سکیں گے تو سقایت کا منصب آپ کو میرے لیے چھوڑ دینا ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ سقایت حضرت عباس کو مل گئی۔ یہ زمانۂ قبل اسلام کی بات ہے۔ زمانۂ اسلام میں بھی یہ منصب بنی عباس ہی میں رہا۔

عبداللہ بن عبدالمطلب

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ زمزم کی کھدائی کے وقت جب عبدالمطلب نے دیکھا کہ ان کے ساتھ صرف ان کا ایک بیٹا ہے اور قریش سارے مل کر آگئے ہیں، تو انہوں نے نذر مانی کہ اللہ مجھے دس بیٹے عطا کرے جو میری حمایت کے لیے کھڑے ہو سکیں، تو ان میں سے ایک کو کعبہ کے پاس اللہ کی راہ میں قربان کر دوں گا۔ اللہ نے ان کی یہ دعا پوری کی اور ۱۰ بیٹے ان کو دے دیے اور وہ جوانی کی عمر کو پہنچ گئے۔ آخر کار ایک روز عبدالمطلب نے سب کو جمع کیا اور اپنی نذر کا اُن سے ذکر کیا۔ سب نے کہا اللہ سے جو نذر آپ نے مانی ہے اُسے پورا کیجیے۔ اس پر عبدالمطلب سب بیٹوں کو لے کر کعبہ میں ہُبَل نامی بُت کے پاس گئے جہاں فال نکالی جاتی تھی، اور فال اس بات کے لیے نکلوائی کہ ان دس میں سے کس بیٹے کو قربان کریں[1]۔ اس میں نام جناب عبداللہ کا نکلا جو عبدالمطلب کے سب سے خوبصورت اور باپ کے سب سے زیادہ پیارے بیٹے تھے[2]۔ عبدالمطلب بلاتکلف عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر اور

---

[1] ابن ہشام نے اس کا بڑا دلچسپ قصہ لکھا ہے کہ کعبہ میں ہبل کا بت اُس کنوئیں پر نصب تھا جس میں کعبہ کے لیے نذر کیے ہوئے ہدایا رکھے جاتے تھے۔ اُس کے پاس سات قدح (پانسے یا فال نکالنے کے تیر) رکھے رہتے تھے جن پر مخصوص الفاظ لکھے ہوئے تھے اور ان کے ذریعہ سے فال نکالی جاتی تھی۔ فال نکلوانے والا صاحب القداح کے پاس جاتا، ۱۰۰ درہم اور ایک اونٹ نذر کرتا اور جس مقصد کے لیے فال نکلوانا چاہتا وہ بیان کرتا۔ صاحب القداح جب پانسے ڈالنے لگتا تو وہ شخص دعا مانگتا کہ اے ہمارے معبود، یہ فلاں بن فلاں تجھ سے فیصلہ چاہتا ہے اس لیے اس کے حق میں جو ٹھیک بات ہو اس کا فیصلہ کر دے۔ عبدالمطلب نے بھی اسی طریقے کے مطابق فال نکلوائی تھی۔ (حاشیہ از مرتب)

[2] یہ بات بعض سیرت نگاروں نے غلط لکھی ہے کہ جناب عبداللہ عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ سُہَیلی نے لکھا ہے کہ ان سے بہت چھوٹے حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ تھے۔ حضرت حمزہؓ کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً

چھری لے کر اساف و نائلہ کی طرف لے چلے تاکہ وہاں اُن کو ذبح کر دیں۔ قریش کے لوگ یہ دیکھ کر اپنی اپنی مجلسوں سے دَوڑ پڑے اور کہنے لگے "عبدالمطلب، یہ کیا کرتے ہو، اگر تم نے ایسا کیا تو آئے دن کوئی نہ کوئی اپنے بیٹے کو لاکر ذبح کرنے لگے گا۔ چلو، حجاز کی فلاں عَرّافہ (سیانی) کے پاس چلو اور جو وہ کہے وہی کرو، ممکن ہے کہ وہ اِس مشکل کا کوئی حل بتا دے"۔ اِس تجویز کے مطابق یہ لوگ مدینے پہنچے اور وہاں معلوم ہُوا کہ وہ آج کل خیبر میں ہے۔ وہاں جاکر اس سے ماجرا بیان کیا۔ اس نے کہا تمہارے ہاں آدمی کی دِیَت کیا ہوتی ہے؟ لوگوں نے کہا ۱۰ اونٹ۔ وہ بولی واپس جاؤ اور اب فال اس بات پر نکالو کہ عبداللہ کو قربان کیا جائے یا دس اونٹوں کو؟ اگر پھر لڑکے کے نام کی فال نکلے تو دس اونٹ اَور بڑھاؤ اور پھر فال نکالو۔ اس طرح دس دس اونٹ بڑھا بڑھا کر فال نکالتے چلے جاؤ جب اُونٹوں پر فال نکل آئے تو اس کے معنی یہ سمجھ لو کہ تمہارا رب بیٹے کے بجائے اتنے اونٹوں کی قربانی پر راضی ہے۔ عرّافہ کی یہ بات قبول کر کے سب مکّے پلٹے اور فال نکالنی شروع کی۔ ۱۰۔ ۲۰۔ ۳۰ حتیٰ کہ ۹۰ تک فال عبداللہ ہی کے نام کی نکلتی رہی۔ آخر ۱۰۰ اونٹ پر پہنچ کر فال اونٹوں پر نکلی۔ قریش کے لوگوں نے کہا اب تو تمہارے رب کی رضا معلوم ہو گئی عبداللہ کو چھوڑ کر اونٹ ذبح کر دو۔ مگر عبدالمطلب نہ مانے اور انہوں نے کہا کہ مَیں تین دفعہ فال نکلواؤں گا۔ چنانچہ تین مرتبہ پانسہ ڈالا گیا اور ہر مرتبہ اونٹوں ہی پر پانسہ پڑا۔ تب عبدالمطلب نے ۱۰۰ اونٹ ذبح کیے اور اذنِ عام دے دیا کہ آدمی، جانور، حتیٰ کہ درندہ بھی جتنا چاہے گوشت لے لے۔

اس طرح ایک مرتبہ پھر آلِ ابراہیمؑ میں قربانی کا وہ واقعہ دُہرایا گیا جو مکّہ میں اِس مبارک خاندان کی آبادی کے آغاز کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اگرچہ رُوح اور معنی کے اعتبار سے دونوں واقعات میں بڑا فرق ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کارخانے کی حکمتیں عجیب ہیں۔ پہلے اِس خاندان کے اُس فردِ اوّل کی قربانی کسی اور طرح مانگی گئی تھی جسے عرب میں دینِ اسلام کی دعوت کا آغاز کرنا تھا۔ اب اُس آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے والد کی قربانی

---

۲ - ۳ سال زیادہ تھی۔ اور حضرت عباس آپؐ سے عمر میں تین سال بڑے تھے۔ حضرت عباس کی اپنی روایت یہ ہے کہ جب حضورؐ پیدا ہُوئے تو میں تین سال کا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ گھر کی عورتیں مجھے حضورؐ کے پاس لائیں اور کہا "بھائی کو پیار کرو"، چنانچہ مَیں نے آپ کو پیار کیا۔ روض الانف۔ (حاشیہ از مؤلف)

لہ سُہیلی نے اس عورت کا نام قُطْبَہ لکھا ہے اور وہ مدینے کے پاس بحُر نامی بستی میں رہتی تھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

لہ اس سے معلوم ہُوا کہ عرب میں پہلے آدمی کی دِیت ۱۰ اُونٹ تھی۔ اس واقعہ کے بعد اہلِ عرب نے ۱۰۰ اُونٹ ہی کو مستقل طور پر آدمی کا خونبہا قرار دے دیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

کسی اور طرح مانگی گئی جسے تمام عالم انسانی میں اُسی دعوت کو پھیلانا تھا۔ پہلی قربانی کا فدیہ ایک مینڈھا تھا، اور دوسری کا فدیہ ۱۰۰ اونٹ۔

جناب عبداللہ کی شادی

جناب عبداللہ ۲۵ سال کے تھے جب ان کے والد نے ان کی شادی بنی زہرہ بن کلاب کے سردار وہب بن عبد مناف کی صاحبزادی آمنہ خاتون سے کر دی، جو اپنی قوم کی بہترین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ چند مہینے کی ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد جب کہ بی بی آمنہ حاملہ تھیں، وہ ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ فلسطین کے شہر غزہ گئے۔ وہاں سے پلٹ کر جب مدینہ پہنچے تو بیمار ہو گئے۔ ساتھیوں سے کہا کہ تم مکہ واپس جاؤ اور میں اپنی دادی کے خاندان بنی عدی بن نجار میں ٹھیرتا ہوں۔ ایک مہینہ وہاں ٹھیرے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور دار النابغۃ الجعدی میں دفن کر دیے گئے۔ ساتھیوں نے مکہ پہنچ کر جب عبدالمطلب کو ان کی بیماری کا حال سنایا تو انہوں نے فوراً اپنے بڑے بیٹے حارث کو مدینے بھیجا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے جناب عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔

یہ صحیح ترین روایت ہے جسے عموماً اہل علم نے تسلیم کیا ہے۔ ورنہ کسی روایت میں یہ ہے کہ ان کا انتقال اس وقت ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۸ مہینے کے تھے کسی میں سات مہینے، اور کسی میں دو مہینے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن معتبر اور مسلّم یہی ہے کہ حضورؐ ابھی بطن مادر ہی میں تھے کہ آپؐ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اسی چیز کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے کہ:

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۞

"اے نبی، کیا ہم نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟" (۹)

فہرست حوالہ جات باب (۲)

① ــــ اضافہ از مؤلف
② ــــ تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۲۲ ۔
③ ــــ اضافہ از مؤلف
④ ــــ تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصّٰفّٰت، حاشیہ ۶۰ ۔
⑤ ــــ خطبات، صفحات ۲۶۵ تا ۲۶۶ ۔
⑥ تفہیم القرآن، جلد اوّل، المائدہ، حاشیہ ۱۱۳ ۔
⑦ اضافہ از مؤلف
⑧ تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۂ قریش ۔
⑨ اضافہ از مؤلف

باب (۳)

پیدائش سے آغازِ نبوّت تک

ولادتِ مُبارکہ

آخرکار وہ وقت آپہنچا جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنی ذُرّیت کے ایک حصّہ کو مکّہ کی بے آب وگیاہ وادی میں لاکر بسایا تھا اور جس کے لیے خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت انہوں نے اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ نے دُعا مانگی تھی کہ:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ (البقرہ۔۱۲۹)

"اے ہمارے رب، اور تو ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسُول اُٹھائیو جو انہیں تیری آیات سُناتے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔"

اِس مبارک ساعت کے آنے سے تھوڑی مدّت پہلے ابرہہ ۶۰ ہزار فوج لے کر اپنی تقدیر سے لڑنے آیا تھا مگر وہ ۶۰ ہزار نہیں، ۶۰ لاکھ بھی لاتا تو اس کا وہی انجام ہوتا جو ہُوا۔ جہاں اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا منصوبہ کام کر رہا ہو کہ اس مقام پر وہ ہستی وجود میں لائی جانے جو دنیا کی تاریخ بدل ڈالنے والی تھی، جو تمام نبوّتوں کی آخری اور سب سے بڑی نبوّت تھی اور جس کے لیے ڈھائی ہزار برس پہلے سے تیاری کی جا رہی تھی، وہاں کوئی بڑی سے بڑی انسانی طاقت بھی اللہ کی طاقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

محدّثین اور مؤرخین کا اِس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ (یعنی مکّہ پر ابرہہ کا حملہ) مُحرّم میں پیش آیا تھا اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیدائش ربیع الاوّل میں ہُوئی۔ ولادت پیر کے روز ہُوئی تھی، یہ بات خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک اعرابی کے سوال پر بیان فرمائی ہے (صحیح مسلم بروایت ابوقتادہؓ)۔ ربیع الاوّل کی تاریخ کون سی تھی؟ اِس میں اختلاف ہے لیکن ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت جابر بن عبداللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ ۱۲ ربیع الاوّل کو پیدا ہُوئے تھے۔ اِسی کی تصریح محمد بن اسحاق

نے کی ہے اور جمہور اہلِ علم میں یہی تاریخ مشہور ہے۔ واقعۂ فیل اور حضورؐ کی پیدائش میں فصل کتنا تھا؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ مگر مشہور ترین قول یہ ہے کہ آپؐ اس واقعہ کے ۵۰ دن بعد پیدا ہوئے۔ شمسی اور قمری مہینوں اور سالوں کے درمیان مطابقت ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اس لیے قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ پیدائش کا شمسی سال اور مہینہ کونسا تھا۔ عموماً آپؐ کا سنہ پیدائش سنہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء بیان کیا جاتا ہے۔ سہیلی نے روض الانف میں ۲۰ اپریل (نیسان) تاریخ بتائی ہے، مگر سال کا ذکر نہیں کیا۔ بعض اہلِ تحقیق نے اسے ۲۳ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق قرار دیا ہے۔ محمود پاشا فلکی نے ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تاریخ ولادت قرار دی ہے اور اسے ۹ ربیع الاوّل بروز دوشنبہ کے مطابق بتایا ہے۔ کوسان ڈی پرسیفال (Caussin De Perceval) اپنی کتاب تاریخ عرب میں ۲۰ اگست ۵۷۰ء تاریخ پیدائش متعین کرتا ہے۔ حتّی (Hitti) کہتا ہے کہ آپؐ ۵۷۱ء یا اس کے لگ بھگ زمانے میں پیدا ہوئے۔ اور بعض مستشرقین ۴ سال پیچھے جا کر ۵۶۷ء آپؐ کا سالِ پیدائش بیان کرتے ہیں۔ ولادتِ مبارکہ کا وقت معتبر روایات میں صبح صادق بیان کیا گیا ہے۔

بشارات اور اسمِ گرامی

معتبر روایات میں آیا ہے کہ زمانۂ حمل میں بی بی آمنہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کے اندر سے ایک نُور نکلا ہے جس سے شام کے محلات تک روشن ہو گئے ہیں۔ ایک اور مرتبہ خواب میں ان سے کہا گیا کہ تمہارے پیٹ میں اس اُمت کا سردار ہے، جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام محمدؐ رکھنا۔ ابنِ سعد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ خواب میں آپؐ کا نام احمدؐ رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی[1]۔ ممکن ہے کہ یہ دو نام دو مختلف خوابوں میں بتائے گئے ہوں، کیونکہ

---

[1] لفظ محمدؐ تو پہلے بھی عرب میں شاذ و نادر بعض لوگوں کا نام تھا، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ پہلے کسی کا نام احمد ہو۔ اس کی وجہ جس کو ہم نے تفہیم القرآن جلد پنجم، سورۂ صف، حاشیہ ۸ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے ذریعے اہلِ عرب کو کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے جس کا نام محمدؐ ہوگا اور وہ بنی اسماعیل میں سے ہوگا۔ یہ باتیں سن کر عرب کے بعض لوگوں نے اپنے بیٹوں کے نام محمد رکھے تھے تاکہ شاید وہی نبی ہو جائے۔ قاضی عیاض نے ایسے لوگوں کی تعداد جن کے نام حضورؐ سے پہلے محمد تھے ۶ بتائی ہے، ابنِ خالویہ اور سہیلی نے تین، اور عبدان المروزی نے چار، لیکن حافظ ابنِ حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ میں نے تلاش و جستجو سے ۱۵ ایسے اشخاص کے نام معلوم کیے ہیں۔ پھر اصابہ میں انہوں نے بتایا ہے کہ ان میں سے بعض نے حضورؐ کا زمانہ پایا اور اسلام بھی قبول کیا۔ محمد بن عدی بن ربیعہ کے حالات میں وہ لکھتے ہیں کہ ان سے پُوچھا گیا کہ جاہلیت میں آپ کے والد نے آپ کا نام محمد کیسے رکھ دیا؟ انہوں نے کہا کہ ہم شام میں سفر کر رہے تھے۔ ایک دَیر (عیسائی خانقاہ) پر پہنچے تو صاحبِ دَیر نے کہا کہ تمہاری قوم میں ایک نبی آنے والا ہے جو آخری نبی ہوگا۔ ہم نے پُوچھا کہ اس کا نام کیا ہوگا۔ اس نے کہا محمدؐ۔ اس کے بعد ہمارے ہاں جو لڑکا بھی پیدا ہوا اس کا نام محمد رکھا گیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

حضورؐ کے یہ دونوں ہی نام احادیث سے ثابت ہیں۔ بکثرت روایات میں بی بی آمنہ کا یہ بیان بھی نقل ہُوا ہے کہ جب آپؐ پیدا ہُوئے تو مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ میرے اندر سے ایک نُور نکلا ہے جس سے مشرق و مغرب روشن ہو گئے ہیں۔ بیہقی اور ابن عبد البَرّ نے عثمان بن ابی العاص الثقفی کی ماں کا بیان نقل کیا ہے کہ حضورؐ کی ولادت کے وقت وہ بی بی آمنہ کے پاس موجود تھی، اُس وقت جدھر نظر جاتی تھی نُور ہی نُور نظر آتا تھا۔ ولادت کے وقت دایہ کی خدمت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی والدہ شفاء بنت عوف بن عبد الحارث زُہری نے انجام دی۔

پیدائش کے ساتویں روز جناب عبدالمطّلب نے آپؐ کا عقیقہ[1] کیا اور قریش کے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے بعد لوگوں نے پُوچھا "اے عبدالمطّلب، آپ نے اپنے جس بیٹے کے لیے ہماری یہ ضیافت کی ہے اس کا نام کیا رکھا ہے؟" انہوں نے کہا میں نے اس کا نام محمّدؐ رکھا ہے۔ لوگ کہنے لگے آپ نے اپنے خاندان کے مروّجہ لوگوں کے ناموں سے مختلف نام کیسے رکھ دیا؟ عبدالمطّلب نے کہا میں چاہتا ہُوں کہ آسمان میں اللہ اور زمین میں خلق اس کی تعریف کرے۔

غربت سے زندگی کی ابتداء

جناب عبداللہ شادی کے وقت نوجوان ہی تھے اور اپنے کاروبار کی انہوں نے ابتدا ہی کی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے وہ اپنے یتیم بچے اور اپنی بیوہ کے لیے کوئی بڑی دولت چھوڑ کر نہ جا سکے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ انہوں نے پانچ اُونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ، اور ایک لونڈی ترکہ میں چھوڑی تھی[2]۔ لونڈی وہی اُمّ اَیمنؓ تھیں جنہوں نے بڑی محبت سے حضورؐ کو پالا۔ ان کا اصل نام بَرَکہ تھا اور حبشی الاصل تھیں۔ بعد میں حضورؐ نے ان کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہؓ سے کیا جن سے اُسامہؓ بن زیدؓ پیدا ہُوئے۔

حیاتِ طیّبہ کی اِسی غریبانہ زندگی کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے کہ:

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (الضحیٰ - ۸)

"اور اللہ نے تم کو غریب پایا پھر غنی کر دیا۔"

رضاعت

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ابتداءً چند روز تک ابولہب کی لونڈی ثُوَیبہ کا دُودھ پیا۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ اُسی کا دُودھ حضرت ابو سلمہؓ (اُمّ المؤمنین اُمّ سلمہؓ کے پہلے شوہر) نے بھی پیا تھا۔ ابن سعد اور ابن ہشام

---

[1] یہ عقیقہ بھی بقایائے دین ابراہیمی میں سے تھا جو زمانۂ جاہلیت میں بھی اہلِ عرب کے ہاں جاری رہا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] ایک روایت یہ بھی ہے کہ ترکہ میں صرف ایک اونٹ تھا اور ایک لونڈی۔ (حاشیہ از مؤلف)

کا بیان ہے کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن جحش (اُم المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی) نے بھی اُسی کا دُودھ پیا تھا۔ اس لیے یہ حضرات حضورؐ کے رضاعی بھائی تھے۔ اسی خدمت کے صلہ میں حضورؐ جوان ہونے کے بعد ہمیشہ ثُوَیبَہ کے ساتھ حُسنِ سلوک فرماتے رہتے تھے اور حضورؐ کی شادی ہونے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی اس کی تکریم اور اس کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرتی تھیں۔ پھر حضرت خدیجہ نے چاہا کہ اسے خرید کر آزاد کر دیں مگر ابولہب نے انکار کیا بعد میں اس نے خود ہی اُسے آزاد کر دیا۔ ہجرت کے بعد بھی آپؐ مدینہ سے اس کے لیے کپڑا اور خرچ بھیجا کرتے تھے۔ سنہ ۷ھ میں آپؐ کو اس کی وفات کی خبر ملی تو آپؐ نے اس کے بیٹے مَسرُوح کا حال دریافت کیا جس نے آپؐ کے ساتھ اس کا دودھ پیا تھا۔ معلوم ہُوا کہ وہ بھی مر گیا اور اس کا دنیا میں کوئی باقی نہ رہا۔

حلیمہ سَعدیہ

شُرفائے مکّہ کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے بچّوں کو دُودھ پلانے کے لیے صحرائی علاقوں کے اچھے قبائل میں بھیج دیتے تھے تاکہ کھُلی آب و ہوا میں پرورش پائیں اور خالص عربی بھی سیکھ لیں۔ اس غرض کے لیے باہر کے قبیلوں کی عورتیں وقتاً فوقتاً مکّہ آتی تھیں اور سرداروں کے بچّے لے جاتی تھیں جن سے ان کو معقول معاوضے ملتے تھے اور بعد میں بھی حُسنِ سلوک کی توقع ہوتی تھی۔ اسی سلسلہ میں حضورؐ کی ولادت کے کچھ مدّت بعد بنی سَعد بن بَکر (قبیلہ ہَوازن کی ایک شاخ) کی کچھ عورتیں بچّے لینے کے لیے مکّہ گئیں جن میں حلیمہ بنت ابی ذُؤیب بھی اپنے شوہر حارث بن عبدالعُزّیٰ کے ساتھ شامل تھیں۔ ابن ہشام نے حلیمہ کا اپنا بیان نقل کیا ہے کہ ہم بہت خستہ حال تھے۔ ہمارا علاقہ قحط زدہ تھا۔ دوسری عورتوں کی بہ نسبت ہماری حالت زیادہ ہی خراب تھی۔ ہماری گدھی اس قدر کمزور تھی کہ قافلے کے پیچھے رہ جاتی تھی۔ ہماری اُونٹنی بھی ذرا دُودھ نہ دیتی تھی۔ میری چھاتیوں میں بھی دُودھ اتنا کم تھا کہ میرے بچّے کا پیٹ نہ بھر سکتا تھا۔ رات بھر روتا رہتا تھا اور ہم بھی نہ سو سکتے تھے۔ مکّہ پہنچے تو کوئی عورت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لینے پر راضی نہ ہُوئی۔ ہر ایک کہتی تھی کہ یتیم ہے۔ باپ ہوتا تو ہم اس سے کچھ حُسنِ سلوک کی امید رکھتے۔ بیوہ ماں اور دادا سے معلوم نہیں کچھ ملے یا نہ ملے۔ دوسری سب عورتوں نے دوسرے بچّے لے لیے اور مجھے کوئی بچّہ نہ ملا۔ جب سب واپس چلنے کے لیے تیار ہوئیں تو مَیں نے اپنے شوہر سے کہا کہ مَیں خالی ہاتھ جانا پسند نہیں کرتی۔ جا کر اُسی یتیم بچّے کو لیے لیتی ہُوں۔ شوہر نے کہا کیا مضائقہ ہے اگر تُو ایسا کرے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اُسی میں ہمیں برکت دے دے۔ چنانچہ مَیں گئی اور صرف اس لیے اُس بچّے کو لے لیا کہ کوئی اور بچّہ مجھے نہ ملا تھا۔ اپنے پڑاؤ پر پہنچ کر اُس بچّے کے مُنہ میں اپنی چھاتی دی تو اِتنا دُودھ اُترا کہ وہ بھی سیر ہو گیا اور اُس کے دُودھ شریک بھائی نے بھی (جس کا نام عبداللہ تھا) خُوب پیٹ بھر کر پی لیا۔ پھر میرے شوہر نے اونٹنی کا دُودھ نچوڑنا شروع کیا تو اُس نے اتنا دُودھ دیا کہ ہم دونوں اچھی طرح سیر ہو گئے اور رات ہم نے بڑے آرام سے گزاری۔ صبح میرے شوہر نے کہا خدا کی قسم، حلیمہ، تُو نے تو بڑا ہی

مُبارک بچّہ لیا ہے۔

حلیمہ کہتی ہیں کہ واپسی کے سفر میں ہماری گدھی کی شان ہی کچھ اور تھی۔ قافلے کے سارے گدھوں کو اُس نے پیچھے چھوڑ دیا۔ میری ساتھی عورتیں کہنے لگیں کہ حلیمہ، کیا یہ تیری وہی گدھی ہے جس پر تو ہمارے ساتھ آئی تھی؟ میں نے کہا ہاں۔ وہ بولیں، واللہ، اس کی تو حالت ہی بدلی ہوئی ہے۔ ہم وطن واپس پہنچے تو زمین پر شاید ہی کوئی علاقہ اُس وقت اتنا اُجاڑ ہو جتنا ہمارا تھا مگر میری بکریاں جہاں جاتیں پیٹ بھر کر چارہ کھاتیں اور خوب دُودھ دیتیں۔ اِس طرح ہم روز بروز اُس بچّے کی برکتیں زیادہ ہی دیکھتے رہے۔ دو سال گزرے اور دُودھ چھُڑانے کا وقت آیا تو وہ بچّہ سارے قبیلے کے بچّوں سے زیادہ تندرست و توانا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے چار برس کا ہو۔ ہم اسے مکّہ اس کی ماں کے پاس واپس لے گئے، مگر ہمارا جی چاہتا تھا کہ وہ ہمارے پاس کچھ مدّت اور رہے۔ میں نے اُس کی ماں سے کہا کہ میرے اِس بیٹے کو میرے پاس ابھی اور رہنے دو تاکہ یہ خوب پل کر تنومند ہو جائے، مجھے اندیشہ ہے کہ مکّہ کی خراب آب و ہوا اِس کی صحت پر بُرا اثر نہ ڈالے۔ غرض میں نے اتنا اصرار کیا کہ وہ اسے پھر میرے ساتھ بھیجنے پر راضی ہو گئیں۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ اس طرح حضورؐ دو سال اور حلیمہؓ کے ہاں رہے۔ مگر ابنِ اسحاق کی روایت اس سے مختلف ہے جو ہم آگے نقل کرتے ہیں۔

شقِ صدر

حلیمہ کا بیان ہے کہ واپس آ کر ہم ابھی دو تین ہی مہینے رہے تھے کہ ایک روز وہ بچّہ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ ہمارے گھروں کے پیچھے ہماری بکریوں میں تھا۔ اتنے میں اُس کا بھائی دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ میرے اُس قریشی بھائی کے پاس دو سفید پوش آدمی آئے اور انہوں نے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ میں اور میرا شوہر دونوں بھاگتے ہوئے گئے تو دیکھا کہ وہ بچّہ کھڑا ہے اور اُس کا رنگ فق ہے۔ اُس کے باپ نے اُسے چمٹا لیا اور پوچھا بیٹا تجھے کیا ہو گیا؟ اُس نے کہا دو آدمی سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے، مجھے لٹا کر میرا پیٹ چاک کیا اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر پھینک دی اور پیٹ کو پھر ویسا ہی کر دیا جیسا وہ تھا (دوسری روایت میں یہ ہے کہ وہ میرے پیٹ میں کوئی چیز تلاش کرتے رہے، معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی)۔[1] حلیمہ کہتی ہیں کہ ہم اُسے گھر واپس لائے تو میرے شوہر نے کہا، حلیمہ، مجھے ڈر ہے کہ اس بچّے کو کچھ ہو نہ جائے، بہتر یہی ہے کہ اسے اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ہم اسے

---

[1] واضح رہے کہ یہ شقِ صدر کا واقعہ اسرارِ الٰہی میں سے ہے جس کی کُنہ کو انسان نہیں پہنچ سکتا۔ انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ ایسے عجیب واقعات بے شمار پیش آتے ہیں جن کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن توجیہ کا ممکن نہ ہونا اس کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ان کا انکار کر دیا جائے۔ (حاشیہ از مؤلف)

اُس کی ماں کے پاس لے گئے۔ انہوں نے کہا "آنا، تم کیسے اس کو واپس لے آئیں، تم تو اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے بڑی حریص تھیں؟" میں نے کہا "اللہ نے اب بچے کو خوب پال کر بڑا کر دیا ہے اور میری جو ذمہ داری تھی وہ میں نے پوری کر دی ہے۔ اب مجھے اندیشہ ہے کہ اسے کچھ حوادث پیش نہ آ جائیں"۔ بی بی آمنہ نے کہا "اصل بات کیا ہے، مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ"۔ حلیمہؓ نے ان کے اصرار پر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ انہوں نے کہا "کیا تمہیں اس بچے کے معاملہ میں شیطان کا خوف ہے؟" حلیمہؓ نے کہا "ہاں"۔ انہوں نے کہا "خدا کی قسم، شیطان کے لیے اس پر کوئی راہ نہیں، میرے اس بچے کی بڑی شان ہے"۔ پھر بی بی آمنہ نے حلیمہؓ کو زمانۂ حمل کے واقعات اور پیدائش کے وقت کے حالات بتائے۔

بچپن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قیامِ صحرا کی وجہ سے آپ کی عربی زبان نہایت فصیح ہوگئی تھی، کیونکہ آپ قریشی تھے اور بنی سعد میں آپ نے بچپن گزارا تھا جن کی زبان ٹھیٹھ عربی تھی۔ اسی بنا پر آپ فرمایا کرتے تھے:

اَنَا اَعْرَبُكُمْ، انا قرشی واسترضعت فی بنی سعد بن بکر۔

"میں تم میں سب سے زیادہ عربی داں ہوں، میں قریشی ہوں اور بنی سعد بن بکر میں میری رضاعت کا زمانہ گزرا ہے۔"

حلیمہ کے ساتھ بھی ثُوَیبہ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نہایت محبت اور احسان کا برتاؤ فرماتے رہے۔ حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کی شادی ہونے کے بعد ایک مرتبہ وہ آئیں اور انہوں نے شکایت کی کہ ہمارے علاقہ میں سخت قحط ہے اور مویشی مر گئے ہیں۔ آپ نے ان کو ۴۰ بکریاں اور سامان سے لدا ہوا ایک اونٹ مرحمت فرمایا۔ ابن سعد نے محمد بن منکدر کی روایت نقل کی ہے کہ ایک عورت نے حضورؐ کے پاس حاضر ہونے کی اجازت مانگی جس نے بچپن میں آپ کو دودھ پلایا تھا۔ وہ آئی تو آپ میری ماں، میری ماں کہتے ہوئے اُٹھے اور اپنی چادر بچھا کر اسے بٹھایا۔ فتح مکہ کے موقع پر حلیمہ کی بہن حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کو حلیمہ کے انتقال کی خبر دی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ پھر آپ نے اس کو دو سو درہم اور کپڑے دیے اور سواری کے لیے کجاوے سمیت ایک اونٹ عطا فرمایا۔ غزوۂ ہوازن کے موقع پر جو لوگ قید ہو کر آئے تھے ان میں حلیمہ کی وہ لڑکی شیماء بھی شامل تھی جو بچپن میں حضورؐ کو گود میں لیے پھرتی تھی۔ آپ نے اسے پہچان لیا، بہت مہربانی کے ساتھ اس سے پیش آئے اور عزت کے ساتھ اس کے خاندان والوں کے پاس بھیج دیا۔ ہوازن کے وفد نے جب آپ سے رحم کی درخواست کی اور کہا کہ ان قیدیوں میں آپ کی خالائیں بھی ہیں، آپ کی انائیں بھی ہیں جنہوں نے بچپن میں آپ کو گودوں میں کھلایا ہے تو آپ نے فرمایا جو میرا اور بنی عبدالمطلب کا حصہ ہے وہ میں نے چھوڑا۔ انصار

نے کہا جو ہمارا حصہ ہے وہ ہم نے اللہ اور رسُول کے لیے چھوڑ دیا ۔ اس طرح ۶ ہزار قیدی رہا کر دیے گئے اور جو مال ان کو واپس دیا گیا اس کی قیمت ۵ کروڑ درہم تھی ۔ حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی اس خاندان کا خاص لحاظ رکھتے اور اس سے حُسنِ سلوک اور تکریم کے ساتھ پیش آتے رہے [1]۔

والدہ ماجدہ کا انتقال

ابن سعد اور ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ آپؐ ۶ سال کے تھے ، اور ابنِ حزم اور ابن القیّم کا بیان ہے کہ ابھی آپؐ کا ساتواں سال پورا نہ ہُوا تھا کہ بی بی آمنہ آپؐ کی پردادی (جناب عبدالمطّلب کی والدہ) کے خاندان بنی عدی بن نجّار سے ملانے کے لیے آپؐ کو اُمِّ اَیمن کے ساتھ مدینے لے گئیں اور ایک مہینہ وہاں رہیں ۔ انہوں نے وہ مکان آپؐ کو دکھایا جہاں آپؐ کے والد جناب عبداللہ کا انتقال ہُوا تھا ۔ وہ جگہ دکھائی جہاں وہ مدفون تھے ۔ اِس سفر کے واقعات آپؐ کو بعد میں اچھی طرح یاد رہے ۔ ہجرت کے بعد جب آپؐ مدینہ تشریف لے گئے تو آپؐ اپنے اصحاب کو اس پہلے سفرِ مدینہ کے حالات سناتے تھے جو آپؐ نے اِس چھوٹی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ کیا تھا ۔ بنی عدی بن نجّار کی گڑھی کو دیکھ کر آپؐ فوراً اسے پہچان گئے ۔ فرمایا یہاں میں انصار کی ایک لڑکی اُنیسہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور اپنے دادا کی ننھیال کے لڑکوں کے ساتھ یہاں اُترنے والے پرندوں کو اُڑایا کرتا تھا ۔ دار النّابغہ کو دیکھ کر فرمایا یہاں میں اپنی والدہ کے ساتھ اُترا تھا اور اسی گھر میں میرے والد کی قبر ہے ۔ میں نے بنی عدی بن نجّار کے کنویں میں تیراکی کی خوب مشق کر لی تھی ۔

اس کے بعد جب آپؐ کی والدہ صاحبہ آپؐ کو لے کر مکّہ روانہ ہوئیں تو اَبواء کے مقام پر ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں وہ دفن ہُوئیں ۔ اُمِّ اَیمن حضورؐ کو لے کر مکّہ واپس پہنچیں ۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضورؐ کو وہ جگہ بھی یاد تھی جہاں آپؐ کی والدہ دفن ہُوئی تھیں ۔ چنانچہ عُمرۂ حُدَیبیہ کے موقع پر جب آپؐ اَبواء پر سے گزرے

---

[1] حلیمہ کے متعلق ابن کثیر کا بیان ہے کہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا ۔ مگر استیعاب میں ابن عبدالبر نے عطاء بن یسار کی روایت درج کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں حلیمہؓ جنگِ حُنین کے موقع پر آئیں تو حضورؐ ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور اپنی چادر بچھا کر انہیں اس پر بٹھایا ۔ نیز انہوں نے لکھا ہے کہ حلیمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے ، اور اُن سے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے روایت نقل کی ہے ۔ حافظ ابو یعلیٰ اور ابن حبّان نے عبداللہ بن جعفرؓ کے حوالہ سے حلیمہ کی روایت بیان کی ہے ۔ اصابہ میں حافظ ابن حجرؒ نے حلیمہ کے شوہر حارث کے متعلق ابن اسحٰق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ مکّہ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لائے ۔ مگر ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ حارث کے بیٹے عبداللہ کا قصّہ ہے جو حضورؐ کے رضاعی بھائی تھے ۔ اصابہ میں شیما کے متعلق بھی ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے کہ وہ مسلمان ہو گئی تھیں ۔
(حاشیہ از مؤلف)

تو فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذِنَ لِمُحَمَّدٍ فِیْ زِیَارَۃِ قَبْرِ اُمِّہٖ ۔

"اللہ نے محمدؐ کو اپنی ماں کی قبر پر جانے کی اجازت دے دی ہے۔"

پھر آپؐ وہاں تشریف لے گئے، قبر کو درست کیا اور بے اختیار رو دیے۔ آپؐ کو دیکھ کر مسلمان بھی رونے لگے۔ عرض کیا گیا کہ آپؐ تو رونے سے منع فرماتے ہیں۔ فرمایا:

اَدْرَکَتْنِیْ رَحْمَتُھَا فَبَکَیْتُ ۔

"اُن کی ممتا مجھے یاد آگئی اور میں رو دیا۔"

اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر حضورؐ کے تشریف لے جانے اور آپؐ کے اُوپر رقت طاری ہونے کا ذکر متعدد احادیث میں بھی آیا ہے جو مسند احمد، بیہقی اور طبقات ابن سعد میں حضرت بُریدہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، اور حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہوئی ہیں۔

جناب عبدالمطّلب کی کفالت میں

بی بی آمنہ کے بعد حضورؐ کے دادا جناب عبدالمطّلب نے آپؐ کو اپنے ساتھ رکھا اور اپنی تمام اولاد سے بڑھ کر آپؐ کو چاہا۔ وہ آپؐ کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے قریب بٹھاتے تھے۔ آپؐ جس وقت چاہتے ان کے پاس چلے جاتے تھے خواہ وہ تخلیہ میں ہوں یا سوتے ہوئے ہوں، حالانکہ ان کی دوسری اولاد ان کی ہیبت کی وجہ سے یہ جرأت نہ کر سکتی تھی۔ وہ اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک آپ اس میں شریک نہ ہوں اور کبھی کبھی کھانے کے وقت آپؐ کو گود میں بٹھا لیتے تھے۔ کعبہ کی دیوار کے سایہ میں ان کے لیے ایک فرش بچھایا جاتا تھا جس پر ان کے ادب کی وجہ سے ان کی اولاد میں سے کوئی نہ بیٹھتا تھا بلکہ سب اس کے اردگرد بیٹھا کرتے تھے۔ مگر حضورؐ جو اس وقت ایک خوب تنومند لڑکے تھے آکر سیدھے اُسی فرش پر بیٹھ جاتے تھے۔ آپؐ کے چچا آپؐ کو ہٹانا چاہتے تو عبدالمطّلب کہتے "میرے بیٹے کو چھوڑ دو، خدا کی قسم اس کی شان ہی کچھ اور ہے میں اُمید رکھتا ہوں کہ یہ ایسے بلند مرتبے پر پہنچے گا جس پر اس سے پہلے کوئی عرب نہیں پہنچا۔" بعض روایات میں ہے کہ عبدالمطّلب کہتے اس کا مزاج شاہانہ ہے، پھر وہ آپؐ کو اپنے پاس بٹھا کر آپؐ کی پیٹھ اور سر پر ہاتھ پھیرتے، آپ کا منہ چومتے اور آپؐ کی حرکات و سکنات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ قبیلۂ بنی مُدلج، جو قیافہ شناسی میں مشہور تھا، اُس کے چند لوگوں نے عبدالمطّلب سے کہا کہ اس بچے کی خاص حفاظت کریں کیونکہ ہم نے کوئی نشانِ قدم ایسا نہیں دیکھا جو مقامِ ابراہیمؑ پر حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے نشانِ قدم سے اس قدر مشابہت رکھتا ہو جیسی اس بچے کا نشانِ قدم رکھتا ہے۔ اس موقع پر ابو طالب موجود تھے۔ عبدالمطّلب نے ان سے کہا کہ جو

بات یہ لوگ کہہ رہے ہیں اسے غور سے سنو اور اس کی حفاظت کرو۔

لیکن دادا کی یہ شفقت بھی حضورؐ کو زیادہ دیر تک حاصل نہ رہی۔ آپ آٹھ سال کے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ابنِ سعد اور حافظ سخاوی نے اُمّ ایمن کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ جب ان کا انتقال ہو رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سرہانے کھڑے رو رہے ہیں۔ بعد کے زمانے میں جب حضورؐ سے پوچھا گیا کیا آپ کو اپنے دادا صاحب کی وفات یاد ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا ہاں، میں اس وقت آٹھ برس کا تھا۔

جنابِ ابُوطالب کی کفالت میں

عبدالمطّلب کی وفات کے بعد بعض روایات کی رُو سے اُن کی وصیت کے مطابق، اور بعض دوسری روایات کے مطابق بطورِ خود ابُوطالب نے حضورؐ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ ان کا اصل نام عبدِ مَناف تھا، مگر اپنے بڑے بیٹے طالب کی وجہ سے ان کی کنیت ابُوطالب اتنی مشہور ہوئی کہ اصل نام اس کے نیچے دب گیا۔ یہ لڑکا حضورؐ کا تقریباً ہم عمر تھا اور اس کو حضورؐ سے بے انتہا محبت تھی۔ جنگِ بدر میں جب قُریش کے لوگ بنی ہاشم کو مجبور کر کے لڑنے کے لیے لے گئے تو ان میں طالب بھی تھا، لیکن اس نے جنگ میں کوئی حصّہ نہ لیا اور بعد میں نہ مقتولوں میں اس کا کہیں پتہ چلا نہ زخمیوں میں، اور نہ وہ مکّہ واپس پہنچا۔ پھر کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں چلا گیا۔

ابوطالب حضورؐ کے حقیقی چچا تھے۔ انہوں نے آپؐ کو خود اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر عزیز رکھا۔ اپنے پاس سُلاتے تھے۔ جہاں جاتے ساتھ لے جاتے تھے۔ کھانے کے وقت کوشش کرتے تھے کہ پہلے آپ آکر شریک ہوں تب دوسرے کھانا شروع کریں۔ واقدی نے مختلف سندوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ابوطالب کے اہل و عیال اگر حضورؐ کے بغیر کھانا کھاتے خواہ الگ الگ کھائیں یا مل کر، کسی کا پیٹ نہ بھرتا۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ کھاتے تو سب کا پیٹ بھر کر بھی کھانا بچ رہتا۔ آپؐ کی یہ برکت دیکھ کر ابُوطالب نے قاعدہ بنا لیا کہ جب سب کھانے کے لیے بیٹھتے تو وہ کہتے کہ ٹھیر جاؤ جب تک میرا بیٹا نہ آجائے۔ پھر جب حضورؐ آجاتے تو کھانا شروع کیا جاتا۔ اور ابوطالب کہتے کہ بیٹے تم بڑے مبارک ہو۔ کھانے پر حسبِ قاعدہ جب بچّے چھین جھپٹ کرنے لگتے تھے تو حضورؐ ہاتھ روک کر بیٹھ جاتے۔ ابُوطالب یہ حالت دیکھ کر آپؐ کے لیے الگ کھانا نکال کر دینے لگے۔ ابُوطالب کے لیے الگ مَسنَد بچھائی جاتی تھی جس پر کوئی اور نہ بیٹھتا تھا، مگر حضورؐ ان کے ساتھ ہی جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اس پر ابوطالب کہا کرتے کہ "رَبیعہ کے خدا کی قسم، میرے اِس بھتیجے پر سرداری سجتی ہے۔"

حضورؐ کا بکریاں چرانا

غالباً یہ اسی دور کا واقعہ ہو گا کہ آپؐ نے چچا کی کمزور مالی حالت اور کثیر العیالی کو دیکھ کر خود کچھ کمانے کی فکر کی ہوگی۔ بچپن میں جب آپ اپنی رضاعی والدہ کے ہاں تھے تو اپنے دُودھ شریک بھائی بہنوں کے ساتھ ان کے گھر

کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ یہی کام ہوش سنبھال کر آپؐ نے مکہ میں اُجرت پر کرنا شروع کر دیا۔ حدیث میں عُبَید بن عُمیر کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چَرائی ہوں۔ لوگوں نے عرض کیا کیا آپؐ نے بھی چَرائی ہیں؟ فرمایا ہاں۔ دوسری روایت بخاری کتاب الاجارہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی ہے جس میں اِسی سوال کا جواب دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا مَیں اہلِ مکہ کی بکریاں کچھ قراریط پر چَرایا کرتا تھا[1] (قراریط قیراط کی جمع ہے جو ایک دینار کے دسویں یا بیسویں حصّے کو کہتے تھے)۔ ابوسَلَمہؓ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ لوگ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ پیلو کے درختوں میں سے گزرے تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کے جو پھل سیاہ ہو گئے ہوں وہ توڑو کیونکہ جب مَیں بکریاں چَراتا تھا اُس زمانے میں یہی پھل توڑا کرتا تھا۔ (ابن سعد طبع لیدن ص ۸۱۔۸۰)

اِبتدائے عُمر سے آپؐ کی غیر معمُولی شخصیّت کا اظہار

اُمرِ حضورؐ کی پیدائش کے وقت سے ۱۰۔۱۲ برس کی عُمر تک کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ بچپن ہی سے جن لوگوں کو آپؐ سے سابقہ پیش آ رہا تھا اُن کے ذہن پر یہ نقش ثبت ہوتا چلا گیا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی شخصیت ہے جو ان کے درمیان پیدا ہُوئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ آپؐ کی ذات سے عجیب عجیب برکات کا ظہور ہو رہا تھا، بلکہ آپؐ کی عادات و خصائل عام بچّوں سے بالکل مختلف تھیں، اور آپؐ کے بُشرے سے بھی آپؐ کی شخصیت کا غیر معمولی پن نمایاں ہو رہا تھا۔

بَیْہَقی اور ابن جَریر نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا میرے اندر دو مرتبہ سے زیادہ کبھی اُن کاموں سے دلچسپی پیدا نہیں ہُوئی جو اہلِ جاہلیت کیا کرتے تھے، اور دونوں مرتبہ اللہ عزّوجلّ نے مجھے ان سے محفوظ رکھا اور اس کے بعد پھر میرے دل میں ان کا خیال تک نہ آیا۔ ایک روز مَیں نے اُس لڑکے سے جو میرے ساتھ بکریاں چَرایا کرتا تھا، کہا کہ تُو ذرا میری بکریوں کی دیکھ بھال کر تاکہ مَیں مکہ میں جا کر رات کی اُن دلچسپیوں میں حصّہ لُوں جن میں دُوسرے لڑکے حصّہ لیتے ہیں۔ وہ راضی ہو گیا چنانچہ مَیں شہر کی طرف چلا اور مَیں نے پہلے ہی گھر میں گانے بجانے کی آوازیں سُنیں۔ مَیں نے پُوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ فلاں اور فلاں کی شادی ہے۔ مَیں بیٹھ گیا اور یکایک

---

[1] ابن ماجہ نے سُوَید بن سعید کے حوالے سے جو روایت نقل کی ہے اس میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں: کنت ارعاھا لاھل مکۃ بالقراریط "مَیں اہلِ مکہ کی بکریاں کچھ قراریط کے بدلے چرایا کرتا تھا"۔ یہ روایت بخاری کی روایت کے یہ معنی متعیّن کر دیتی ہے کہ آپؐ اُجرت پر اہلِ مکّہ کی بکریاں چَراتے تھے لیکن ابراہیم الحربیؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ قراریط سے مراد نقد رقم نہیں، بلکہ یہ اَجیاد کے قریب ایک مقام تھا جہاں آپؐ بکریاں چَراتے تھے۔ اسی کی تائید ابن الجوزی اور علّامہ عَینی نے کی ہے۔ لیکن اوّل تو مکّہ کے جغرافیہ میں کسی مقام کا نام قراریط ہونا ثابت نہیں ہے۔ دوسرے اُجرت پر بکریاں چَرانا کوئی عیب نہیں ہے کہ اس سے حضورؐ کا دامن صاف کرنے کے لیے یہ تکلّف کیا جائے۔ (حاشیہ از مُرتّب)

مجھے نیند آگئی یہاں تک کہ دن نکل آیا اور سورج کی گرمی سے میری آنکھ کھلی۔ میں واپس گیا تو میرے ساتھی نے حال پُوچھا۔ میں نے اسے ماجرا سُنا دیا۔ دوسری رات میں نے اپنے ساتھی سے پھر وہی بات کہی اور اس نے مان لی۔ میں مکہ میں داخل ہُوا تو وہی گانا بجانا پھر ہو رہا تھا۔ میں یہ تماشا دیکھنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر سو گیا اور دن نکلنے تک سویا رہا۔ واپس جاکر میں نے اپنے ساتھی کو بتا دیا کہ آج بھی میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کے بعد میرے اندر اس طرح کی کسی چیز کی طرف میلان ہی پیدا نہ ہُوا۔

ابن سعد نے اُمِّ اَیمن کی روایت نقل کی ہے کہ بُوانہ ایک بُت تھا جس کی زیارت کے لیے قریش کے لوگ جایا کرتے تھے، وہاں نذریں اور نیازیں چڑھاتے تھے، پورے ایک دن اس کے استھان میں اعتکاف کیا جاتا تھا اور پھر قربانی کرکے سر منڈوائے جاتے تھے۔ ابو طالب بھی اس طریقے کے مطابق اپنے خاندان کے ساتھ وہاں جایا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، جو اُس وقت ایک نوخیز لڑکے تھے، آپؐ سے بھی کہا جاتا تھا کہ آپ سب کے ساتھ چلیں۔ مگر ہر سال یہی جھگڑا ہوتا تھا کہ آپؐ ساتھ جانے سے انکار کر دیتے اور اس پر آپؐ کے چچا اور پھوپھیاں سخت ناراض ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپؐ گھر کے بڑوں کی اس ملامت اور فضیحتے سے تنگ آکر اس تہوار کے موقع پر چلے گئے اور بڑی دیر تک کہیں غائب رہے حتّٰی کہ سب گھر والے آپؐ کے لیے پریشان ہو گئے۔ واپس آئے تو سخت خوف زدہ تھے اور چہرے کا رنگ فق تھا۔ پھوپھیاں آپ کو دیکھ کر لپکیں اور پُوچھا: بیٹے تجھے یہ کیا ہو گیا؟ آپؐ نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ مجھے کچھ ہو نہ جائے۔ پھوپھیوں نے کہا "اللہ تجھے کبھی شیطان کے شر میں مبتلا نہ کرے گا جب کہ تیرے اندر ایسی اور ایسی خوبیاں ہیں۔" آپؐ نے کہا جب کبھی میں اس بُت خانے میں کسی بُت کی طرف جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی گورے رنگ کا لمبا تڑنگا آدمی کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ "اے محمدؐ، دُور رہو، اسے مت چھونا۔" اُمِّ اَیمن کہتی ہیں کہ اس کے بعد آپؐ کبھی اس تہوار میں نہیں گئے۔

ابن ہشام نے ابن اسحٰق کا بیان نقل کیا ہے کہ مکہ میں قبیلۂ لِہْب (اَزْدِ شَنُوْءَہ کی ایک شاخ) سے تعلق رکھنے والا ایک ماہرِ علمِ قیافہ آیا کرتا تھا اور جب کبھی وہ آتا، قریش کے لوگ اپنے اپنے بچّوں کو اس کے پاس لے جاتے تھے تاکہ وہ ان کے قیافے سے ان کے متعلق کچھ بتائے۔ ایک مرتبہ جب وہ آیا تو ابو طالب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے بچّوں کے ساتھ اس کے پاس لے گئے۔ اس نے آپؐ کو دیکھا اور پھر کسی اور طرف مشغول ہو گیا۔ اُدھر سے فارغ ہو کر اُس نے کہا اُس لڑکے کو لاؤ جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا۔ ابو طالب نے جب دیکھا کہ وہ آپؐ کو دیکھنے کے لیے بڑی بے تابی کا اظہار کر رہا ہے تو انہوں نے آپؐ کو غائب کر دیا۔ اس نے کہا اسے میرے پاس لاؤ، خدا کی قسم وہ بہت بڑا آدمی بننے والا ہے۔

محمد بن اسحٰق کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک روز قریش کے لڑکوں کے ساتھ

کھیلتے ہُوئے مَیں بھی پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا اور سب لڑکوں نے پتھر اٹھانے کے لیے اپنی اپنی اِزار (تہبند) اُتار کر گلے میں باندھ رکھی تھی جس سے سب ننگے ہو جاتے تھے۔ مَیں نے جو ایسا کیا تو یکایک مجھ پر ایک زور کا گھونسا پڑا اور مجھ سے کسی نے کہا کہ "اپنی اِزار باندھو"۔ چنانچہ مَیں نے اپنی اِزار باندھ لی۔ اِس طرح لڑکپن ہی میں آپ کو عریانی سے روک دیا گیا۔ اسی سے ملتی جلتی صورت اُس وقت پیش آئی جب ۳۵ عام الفیل میں (جبکہ حضورؐ ۳۵ سال کے تھے اور آپؐ کے نبوّت پر سرفراز ہونے میں ابھی پانچ سال باقی تھے) قریش نے از سرِ نو کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ اِس موقع پر قریش کے سب لوگ اپنی اپنی اِزاریں گلے میں باندھے پتھر ڈھو ڈھو کر لا رہے تھے اور بڑے چھوٹے کسی کو برہنگی کا احساس تک نہ تھا۔ حضرت عباسؓ نے حضورؐ سے کہا آپؐ بھی ایسا کریں۔ مگر آپؐ نے ایسا کیا ہی تھا کہ آپ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اور نظریں آسمان پر جم گئیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا "میری اِزار"۔ چنانچہ وہ باندھ دی گئی تب آپ اُٹھے۔ یہ واقعہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے صحیحین میں نقل ہُوا ہے۔ عبدالرزّاق، طبرانی اور حاکم نے ابوالطّفیل سے روایت نقل کی ہے کہ غیب سے آواز آئی "اے محمدؐ اپنا ستر چھپاؤ"۔ مگر کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضورؐ اُس وقت بالکل برہنہ ہو گئے تھے۔ قبل اِس کے کہ اِزار برہنگی کی حد تک اُٹھتی بے ہوشی آپ پر طاری ہو گئی۔

بُت پرستی سے نفرت

بچپن ہی سے آپ کو شرک و بُت پرستی اور اس کے تمام مظاہر و لوازم سے سخت نفرت تھی، اور قبلِ نبوّت کی زندگی میں آپؐ کا دامن کبھی اس کے غبار تک سے آلودہ نہیں ہُوا۔ بخاری ابوابِ المناقب میں حدیث زید بن عَمرو بن نُفَیل کے زیرِ عنوان حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے بتوں کے چڑھاوے کا کھانا اور اُن کے لیے قربان کیے ہوئے جانور کا گوشت پیش کیا گیا تو آپؐ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا۔ مُسند احمد میں حضرت عُروَہ بن زُبَیر روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایک پڑوسی نے بیان کیا کہ ایک روز مَیں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہؓ سے یہ فرماتے سُنا کہ اِی خدیجۃ، واللہ لا اعبد اللّات والعُزّٰی، واللہ لا اعبد ابدًا "اے خدیجہ، خدا کی قسم مَیں ہرگز لات اور عُزّٰی کی عبادت نہ کروں گا، خدا کی قسم مَیں کبھی ان کی عبادت نہ کروں گا"۔ جواب میں حضرت خدیجہؓ کہہ رہی تھیں کہ "چھوڑیے لات کو اور چھوڑیے عُزّٰی کو"۔ اِس واقعہ کو بیان کر کے اُس پڑوسی نے حضرت عُروَہ کو بتایا کہ اُس زمانے میں قریش کے لوگ رات کو سونے سے پہلے اِن بُتوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اغلب یہ ہے کہ یہ حضورؐ کی ابتدائی زندگی کے آغاز کا واقعہ ہوگا۔

سفرِ شام اور بَحِیرٰی راہب کا واقعہ

ایک مرتبہ ابوطالب ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام جانے لگے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عُمر اِس وقت

۱۲ سال تھی[1]۔ جب ابوطالب چلنے لگے تو حضورؐ ان سے لپٹ گئے اور (ابن سعد کی روایت کے مطابق) آپؐ نے اُن سے کہا "چچا جان، آپ مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہیں، میری نہ ماں ہے نہ باپ جو میری دیکھ بھال کرے" اس پر ابوطالب کا دل پگھل گیا اور انہوں نے کہا "خدا کی قسم میں نہ اسے جُدا کر سکوں گا نہ اس سے جدا ہوں گا۔ یہ میرے ساتھ جائے گا۔"
یہ قافلہ جب شام کے علاقے میں بُصریٰ پہنچا اور بحیریٰ (بحیرا) راہب کے صومعے کے پاس ٹھہرا تو اپنے معمول کے خلاف وہ باہر نکل کر آیا، حالانکہ وہ کبھی کسی قافلے کے لیے اپنے صومعے سے نہ نکلتا تھا۔ اس نے اس سارے قافلے کے لیے کھانا پکوایا اور دعوت دی کہ سب لوگ کھانے کے لیے آئیں، کوئی پیچھے نہ رہے۔ دعوت کے وقت سب قافلے والے گئے، مگر حضورؐ کو آپؐ کی کم سنی کے باعث اپنے پڑاؤ میں چھوڑ گئے۔ بحیریٰ نے کہا کیا سب لوگ آگئے ہیں؟ لوگوں نے کہا بس ایک کم سن لڑکا ہے جسے ہم اپنے سامان کے ساتھ پڑاؤ میں چھوڑ آئے ہیں۔ اس نے کہا نہیں اسے بھی بلاؤ۔ قریش میں سے ایک آدمی نے کہا لات اور عزیٰ کی قسم، یہ ہمارے لیے بُری بات ہو گی کہ محمدؐ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہو۔ چنانچہ وہ گیا اور آپؐ کو لے آیا۔ آپؐ کے آنے کے بعد بحیریٰ آپؐ کو بڑے غور سے دیکھتا رہا اور آپؐ کے جسم کا جائزہ لیتا رہا۔ کھانے کے بعد وہ آپؐ کے پاس آیا اور کہا "میاں لڑکے میں تم کو لات و عزیٰ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب دو" حضورؐ نے فرمایا "مجھے لات و عزیٰ کی قسم نہ دو، میں اُن سے بڑھ کر کسی چیز سے بغض نہیں رکھتا۔" اس نے کہا "اچھا تو اللہ کے واسطے مجھے اُن باتوں کا جواب دو جو میں پوچھوں۔" آپؐ نے فرمایا جو چاہو پوچھو۔ اس کے بعد اس نے آپؐ سے حالات، آپؐ کی نیند، آپؐ کی ہیئت اور دوسرے اُمور کے متعلق دریافت کیا اور آپؐ جواب دیتے رہے۔ پھر وہ آپؐ کے گرد پھر کر آپؐ کی پشت کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے بعد ابوطالب سے اس نے پوچھا کہ یہ آپ کا کون ہے؟ انہوں نے کہا میرا بیٹا ہے۔ بحیریٰ نے کہا اس لڑکے کا باپ زندہ نہیں ہو سکتا۔ ابوطالب نے کہا یہ میرا بھتیجا ہے۔ اس نے کہا اس کے باپ کو کیا ہوا؟ ابوطالب نے جواب دیا یہ ابھی بطنِ مادر میں تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس نے کہا تم نے سچ کہا۔ پھر بحیریٰ نے کہا "اپنے بھتیجے کو اپنے وطن واپس لے جاؤ اور یہودیوں سے اس کو بچاؤ۔ واللہ، اگر انہوں نے اس کو دیکھ کر وہ باتیں پہچان لیں جو میں نے پہچانی ہیں تو وہ اس کے ساتھ کوئی شرارت کریں گے کیونکہ تمہارا یہ بھتیجا بڑی عظیم شخصیت کا مالک ہے۔" چنانچہ ابوطالب نے جلدی جلدی اپنا تجارتی کام انجام دیا اور آپؐ کو لے کر واپس چلے گئے۔

یہ وہ قصہ ہے جس پر مستشرقین نے بہت سے قیاسات کی عمارت اٹھائی ہے اور اُن لوگوں کو جو رسولؐ ہونے

---

[1] طبری وغیرہ نے ۹ سال عمر بتائی ہے اور ابن عبد البرؒ نے ۱۳ سال مگر اکثریت کا قول ۱۲ سال ہی ہے اور یہی صحیح ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کے بعد آپؐ سے ظاہر ہوئے تھے، عیسائی راہبوں سے حاصل کردہ معلومات قرار دیا ہے۔ اس پر مزید خود ہمارے ہاں کی بعض روایات بھی ایسی ہیں جو ایک حد تک ان قیاسات کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ دراصل یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ ایک تارک الدنیا مرتاض آدمی، جس نے مجاہدوں سے اپنی رُوحانی قوتوں کو نشوونما دیا ہو، کچھ غیر معمولی برکات کے آثار دیکھ کر محسوس کر لے کہ اس قافلے میں کوئی عظیم شخصیت موجود ہے، اور آپؐ کو دیکھ کر اسے اپنے اندازوں کی تصدیق ہو گئی ہو، نیز اُس نے اس خیال سے کہ یہودی ایک حاسد قوم ہیں اور وہ عرب کے اُمیوں میں کسی عظیم شخصیت کے ظہور کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر اس کے درپے آزار ہو سکتے ہیں، ابوطالب کو ان سے بچانے کا مشورہ دیا ہو۔ لیکن یہ بات قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ اُس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ آپؐ ہی وہ ہونے والے نبی ہیں جن کے آنے کی خبر پچھلی کتابوں میں دی گئی ہے۔ کیونکہ پیشین گوئیوں سے یہ تو ضرور معلوم تھا کہ ایک نبی آنے والے ہیں اور ان کا نام محمدؐ ہو گا لیکن تعیّن کے ساتھ یہ معلوم کر لینا ممکن نہ تھا کہ حضورؐ ہی وہ نبی ہیں۔

اِس سلسلے میں جو روایات ہمارے محدثین اور اہلِ سیر نے نقل کی ہیں ان پر ہم ایک مجموعی نگاہ ڈالتے ہیں۔ ترمذی، بیہقی (فی الدلائل)، ابنِ عساکر، حاکم، ابونعیم، ابوبکر الخرائطی اور ابن ابی شیبہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ بحیرٰی نے حضورؐ کا ہاتھ پکڑ کر کہا "یہ سیدالمرسلین ہیں، یہ سید العٰلمین ہیں، ان کو اللہ عنقریب رحمۃ للعٰلمین بنا کر مبعوث فرمانے والا ہے"۔ اُس سے پوچھا گیا (اور ترمذی وغیرہ بعض محدثین کی روایت میں ہے کہ قریش کے شیوخ نے اس سے پُوچھا) کہ تمہیں اس کا علم کیسے ہُوا؟ اُس نے کہا جب تم سامنے سے آ رہے تھے تو ہر شجر و حجر سجدہ ریز تھا اور یہ ایک نبی کے سوا کسی کے لیے سجدہ ریز نہیں ہوتے۔ اور میں ان کو اُس مُہرِ نبوت سے بھی پہچانتا ہوں جو ان کی پُشت پر دونوں شانوں کے درمیان ہے، اور ہم ان کا ذکر اپنی کتابوں میں پاتے ہیں۔ پھر اس نے ابوطالب سے کہا کہ یہود سے ان کو خطرہ ہے اس لیے انہیں واپس بھیج دو۔ ابن ابی شیبہ نے ابوموسیٰ اشعریؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ ذکر بھی ہے کہ جب حضورؐ صومعے کی طرف آ رہے تھے تو ایک بادل آپؐ پر سایہ کر رہا تھا۔ اس کے بعد انہی روایات میں سے بعض میں یہ ہے کہ اُس کے اصرار پر ابوطالب نے حضورؐ کو ابوبکرؓ اور بلالؓ کے ساتھ واپس مکہ بھیج دیا۔ حالانکہ ابوبکرؓ اس وقت ۱۰ سال کے ہوں گے اور بلالؓ ان سے بھی چھوٹے۔ ایک بارہ سال کے لڑکے کو اُس سے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ حفاظت کے لیے بھیجا جانا اوّل تو بجائے خود عجیب ہے، دوسرے بلالؓ کا بھیجا جانا اس سے بھی عجیب تر ہے، کیونکہ اُس وقت بنی عبدالمطلب سے اُن کا کوئی واسطہ نہ تھا کہ ابوطالبؓ اُن سے کوئی خدمت لے سکتے۔ اِسی سفر کے متعلق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ سات رُومی حضورؐ کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے اور بحیرٰی کے صومعے پر پہنچے۔ بحیرٰی نے پُوچھا کس لیے آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں معلوم ہُوا کہ یہ نبی اِس مہینے اِدھر آنے والا ہے، اس لیے ہر طرف آدمی دوڑا دیے گئے ہیں، اور ہم یہاں آئے ہیں۔ بحیرٰی نے کہا تمہارا

کیا خیال ہے، جس کام کے کرنے کا اللہ نے فیصلہ کر لیا ہو اُسے کوئی شخص روک سکتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے ارادے سے باز آگئے۔

اِس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی حضورؐ ۱۲ برس ہی کے تھے کہ آپ کو خود بھی اور قریش کے لوگوں کو بھی اور رُوم تک کے ارباب اقتدار کو بھی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آپ نبی ہونے والے ہیں۔

پھر اس واقعہ کے ۱۳ برس بعد ۲۵ سال کی عمر میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لیکر شام گئے تو ابو سعید نیشا پوری کی کتاب شرف المصطفیٰ کے حوالہ سے حافظ ابن حجرؒ اصابہ میں نقل کرتے ہیں کہ بحیریٰ سے آپ کی دوبارہ ملاقات ہوئی اور اس موقع پر اُس نے کہا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد انک رسول اللہ النبی الامی الذی بشر بہ عیسیٰ ابن مریم "میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسُول ہیں، وہ نبی امی جن کی بشارت عیسیٰ ابن مریمؑ نے دی تھی" اسی بنا پر ابن مَندَہ اور ابو نُعیم نے بحیریٰ کو صحابہؓ میں شمار کیا ہے، اور حافظ ذہبیؒ نے تجرید الصحابہؓ میں لکھا ہے کہ وہ آپ کی بعثت سے پہلے آپ پر ایمان لایا تھا۔

اِسی دوسرے سفرِ شام کے سلسلے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بُصریٰ میں حضورؐ ایک درخت کے نیچے ٹھیرے جو نسطُورا راہب کے صَومعے کے پاس تھا۔ نسطُورا باہر نکل کر آیا اور اُس نے حضرت خدیجہؓ کے غلام مَیسرہ سے، جو حضورؐ کے ساتھ تھا، دریافت کیا کہ اس درخت کے نیچے کون ٹھیرا ہے؟ اُس نے کہا "قریش، اہلِ حَرم میں سے ایک شخص"۔ واقدی اور ابن اسحٰق کی روایت ہے کہ اِس پر نسطُورا بولا کہ اِس درخت کے نیچے عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آج تک (یعنی تقریباً ۶ سو برس تک)، نبی کے سوا کوئی نہیں ٹھیرا۔ ابو سعید نے شرف المصطفیٰ میں اس کے بعد یہ اضافہ کیا ہے کہ پھر نسطُورا آپؐ کے پاس آیا، آپؐ کا سر اور آپؐ کے قدم چُومے اور کہا کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسُول، وہ نبی اُمّی ہیں جن کی بشارت عیسیٰؑ نے دی تھی اور کہا تھا کہ میرے بعد اس درخت کے نیچے نبی اُمّی ہاشمی العربی المکّی صاحب الحوض والشفاعۃ اور صاحب لواء الحمد کے سوا کوئی نہیں ٹھیرے گا"۔ مَیسرہ نے اُس کے اِس قول کو ذہن نشین کر لیا۔ اِس کے بعد حضورؐ بُصریٰ کے بازار میں خرید و فروخت کے لیے نکلے۔ اِس موقع پر ایک شخص سے قیمت کے معاملہ میں آپؐ کا اختلاف ہو گیا۔ اُس شخص نے کہا لات اور عُزّیٰ کی قسم کھائیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تو کبھی ان کی قسم نہیں کھائی۔ اِس پر اُس نے کہا پھر میں آپ ہی کی بات مانتا ہوں۔ اور الگ لے جاکر مَیسرہؓ سے کہا "یہ نبی ہیں، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہ وُہی ہیں جن کا ذکر ہمارے احبار اپنی کتابوں میں پاتے ہیں"۔ مَیسرہ نے یہ بات بھی ذہن نشین کر لی۔

ابو نُعیم کی روایت ہے کہ اِس سفر میں مَیسرہ نے دیکھا کہ دو فرشتے آپؐ پر سایہ کیے رہتے ہیں۔ جب یہ

"قافلہ مکہ پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا۔ حضرت خدیجہؓ اُس وقت اپنے بالاخانے پر تھیں۔ انہوں نے بھی دیکھا کہ حضورؐ اپنے اُونٹ پر چلے آ رہے ہیں اور دو فرشتے آپ پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ ابو نُعیم کے سوا دُوسروں نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے ساتھ کی دُوسری عورتوں کو بھی یہ منظر دکھایا اور وہ اس پر تعجّب کرنے لگیں۔ پھر جب مَیسَرہ حضرت خدیجہؓ کے پاس آیا تو انہوں نے اُسے بتایا کہ مَیں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ اُس نے کہا کہ مَیں تو شام سے یہی کچھ دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس کے بعد اُس نے اُن کو وہ باتیں بھی سُنائیں جو نسطُورا سے اُس نے سُنی تھیں اور وہ واقعہ بھی بیان کیا جو شام کے ایک تاجر کے ساتھ مال کی قیمت پر اختلاف کے سلسلے میں پیش آیا تھا۔

اِن روایات کو اگر تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نبوّت سے ۱۵ سال پہلے حضورؐ کو پھر یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آپؐ نبی ہونے والے ہیں۔ مَیسَرہ اور حضرت خدیجہؓ اور ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی قُریش کی متعدد خواتین کو بھی اس کا علم ہو چکا تھا۔ اور قُریش کے جس قافلے کے ساتھ آپؐ شام گئے تھے وہ بھی اور مکّہ کے لوگ بھی اس بات سے بے خبر نہ رہے ہوں گے کہ فرشتے آپؐ پر سایہ کر رہے ہیں، کیونکہ جب مَیسَرہ اور حضرت خدیجہؓ اور دوسری خواتین ان کو دیکھ رہی تھیں تو دوسرے لوگوں سے یہ منظر کیسے مخفی رہتا؟

ہمارے نزدیک یہ ساری باتیں اگرچہ اکابر اہلِ علم و روایت سے منقول ہیں مگر کئی وجوہ سے ناقابلِ قبول ہیں۔ اوّل تو یہ صریح قرآن کے خلاف پڑتی ہیں جس میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ (القصص - ۸۶)

"اور تم ہرگز اِس کے اُمیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی"

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (الشُّوریٰ - ۵۲)

"تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے"

یہ آیات اِس باب میں بالکل قطعی الثبوت ہیں کہ نبوّت کے منصب پر سرفراز ہونے سے پہلے آپؐ اِس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ آپؐ نبی بنائے جانے والے ہیں، حالانکہ اگر ۲۵ برس کی عُمر ہی میں آپؐ کو یہ معلوم ہو چکا ہوتا اور ۴۰ سال کی عُمر میں اس کی مزید تصدیق ہو گئی ہوتی، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ اپنے اُوپر کتاب کے نزول کی اُمید نہ رکھتے اور اِس خیال سے خالی الذہن ہوتے کہ آپؐ کو ایک وقت اپنے اُوپر ایمان لانے کی دعوت لوگوں کو دینی ہوگی۔

قرآن مجید کے بعد یہ روایات اُن صحیح ترین روایات کے بھی خلاف پڑتی ہیں جو حضورؐ پر پہلی وحی کے نزول اور اُس پر آپؐ کی کیفیت اور حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کی گفتگو کے متعلق منقول ہوئی ہیں۔ اُس وقت آپ پر جو کیفیت طاری

ہوتی وہ کیسے طاری ہوتی اگر آپ ۴۰ برس سے یہ جانتے ہوتے کہ آپ نبی ہونے والے ہیں؟ اس حالت میں تو نزولِ وحی آپ کی عین توقع کے مطابق ہوتا پھر حضرت خدیجہؓ نے آپ سے حرا کا واقعہ سننے کے بعد جو کچھ کہا وہ ایسی حالت میں ہرگز نہ کہتیں جبکہ انہیں ۱۵ برس سے یہ معلوم ہوتا کہ آپ نبی ہونے والے ہیں۔ اس صورت میں تو وہ یہ فرماتیں کہ یہ وہی کچھ پیش آیا ہے جس کی ہم پہلے سے توقع رکھتے تھے۔

اسی طرح یہ روایات اُس پوری تاریخ کے خلاف پڑتی ہیں جو کثیر اور متواتر روایات کی رُو سے آپ کے اعلانِ نبوت کے بعد مکہ میں پیش آئی۔ اگر قریش کے لوگ ۱۲ سال سے یہ جانتے ہوئے ہوتے کہ آپ نبی ہونے والے ہیں تو آپ کا اعلانِ نبوت اُن کی توقعات کے خلاف نہ ہوتا اور اس پر اُن کا ردِعمل بھی اُس سے بہت مختلف ہوتا جو بالکل ایک خلافِ توقع معاملہ پیش آنے سے ہوا۔

حربِ فجار

اب ہم پھر تاریخی سلسلۂ واقعات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ حضورؐ ۱۴-۱۵ سال کے تھے جب حربِ فجار واقع ہوئی[1]۔ ابن اسحاق، ابن سعد، بلاذری اور ابن جریر طبری کا بیان ہے کہ یہ جنگ ۲۰ سنہ عام الفیل[2] میں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے آپ کی عمر اس وقت ۲۰ سال ہونی چاہیے۔ اس میں ایک فریق بنی کنانہ تھے (جن میں قریش بھی شامل تھے) اور دوسری طرف قیس عیلان تھے (جن میں ثقیف اور ہوازن وغیرہ شامل تھے)۔ جنگ اِس بات پر چھڑی تھی کہ بنی ہوازن میں سے عُروۃ الرّحّال نامی ایک سردار نے نعمان بن منذر کے تجارتی قافلہ کو اپنی امان میں بازارِ عکاظ لے جانے کے لیے پناہ دی تھی۔ بنی کنانہ کے ایک سردار بَرّاض بن قیس نے کہا کیا تو کنانہ کے مقابلہ میں بھی اس کو امان دے رہا ہے؟ اس نے کہا "ہاں اور تمام دنیا کے مقابلے میں بھی"۔ اس پر برّاض کو تاؤ آگیا اور اس نے تیمن کے بالائی علاقہ میں تیمن کے مقام پر عروہ کو قتل کر دیا۔ قریش

---

[1] ... الجوہری کی صحاح میں ہے کہ اس سے پہلے تین مرتبہ حربِ فجار ہو چکی تھی علاوہ ازیں یہ آخری حربِ فجار تھی جس میں حضورؐ نے حصہ لیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ جنگ شوال سنہ عام الفیل میں ہوئی تھی۔ جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ قریش نے اس جنگ کو فجار کے نام سے اس لیے موسوم کیا کہ یہ ماہِ حرام میں ہوئی تھی۔ اور ماہِ حرام میں لڑنا چونکہ فجور ہے اس بنا پر قریش نے کہا قد فجرنا "ہم نے فجور کا ارتکاب کیا ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چار لڑائیاں جو حرام مہینوں میں ہوئیں "حربِ فجار" کہلائیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] عام الفیل سے مراد ہے ہاتھیوں کا سال یعنی جس سال اصحاب الفیل نے مکہ پر حملہ کیا تھا۔ یہ ایسا غیر معمولی واقعہ تھا کہ اس کے بعد اہلِ عرب اسی سال سے تاریخوں کا حساب کرنے لگے تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

ابھی عکاظ کے بازار ہی میں تھے کہ اُن کو اس کی خبر پہنچ گئی اس لیے وہ فوراً حَرَم کی طرف روانہ ہو گئے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ حدودِ حرم میں داخل ہوتے، ہوازن نے اُن کو جا لیا اور دن بھر لڑائی ہوتی رہی۔ رات کو قریش حَرَم کے حدود میں پہنچ گئے اور ہوازن رُک گئے۔ اس کے بعد چند روز تک لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ان میں سے بعض لڑائیوں میں صرف اِس حد تک شریک ہوئے کہ جو تیر دشمن کی طرف سے آتے تھے اُنھیں اٹھا کر آپ اپنے چچاؤں کو دے دیا کرتے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ بعد میں حضوؐر فرمایا کرتے تھے کہ مَیں اس میں اِتنا حصّہ بھی نہ لیتا تو اچھا ہوتا۔ سُہیلی نے لکھا ہے کہ آپؐ اس جنگ میں اپنے چچاؤں کے ساتھ گئے ضرور تھے مگر آپؐ نے لڑائی میں عملاً کوئی حصّہ نہ لیا۔

اِس ایک واقعہ کے سوا غزواتِ نبویؐ سے پہلے آپؐ نے کبھی کسی جنگ میں شرکت نہ کی اور نہ آپؐ کو کسی قسم کا جنگی تجربہ حاصل ہُوا۔ اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا دامن جاہلیت کی لڑائیوں سے پاک رہا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبوّت کے غزوات میں آپؐ سے جو عظیم قائدانہ صلاحیتیں ظاہر ہوئیں وہ سراسر خدا داد تھیں۔ آپؐ پیشہ ور سپہ سالار نہیں بلکہ پیدائشی سپہ سالار تھے۔

حِلفُ الفُضُول

حضوؐر ۲۰ سال کے تھے جب قریش کے چند قبائل نے ایک مُعاہدہ کیا جس کو حِلف الفضول کہا جاتا ہے۔ اسے لفظ "فُضُول" سے تعبیر کرنے کی وجہ ابن اثیر نے نہایہ میں یہ بیان کی ہے کہ جُرہُم کے زمانے میں بھی ایسا ہی ایک حِلف (مُعاہدہ) ہُوا تھا جس کے طے کرنے والے سب آدمیوں کے نام فَضل تھے، اس لیے اسے حِلف الفُضُول کہا گیا تھا لیکن صحیح وجہ وہ ہے جسے حافظ ابن کثیرؒ نے حُمَیدی کے حوالے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادوں محمد اور عبدالرحمٰن سے نقل کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"مَیں عبداللہ بن جُدعان کے گھر میں ایک ایسے حِلف (مُعاہدہ) میں شریک ہُوا جس میں شرکت کی اگر مجھے اسلام کے زمانے میں بھی دعوت دی جاتی تو مَیں اسے پسند کروں گا۔" پھر اس معاہدہ کی تشریح آپؐ نے یہ فرمائی تحالفوا ان یردّوا الفضول علی اھلھا والّا یعزّ ظالم مظلوما۔ "انہوں نے اس بات پر باہم معاہدہ کیا کہ فضول کو اس کے حقداروں کی طرف پلٹائیں گے اور ظالم مظلوم پر زیادتی نہ کرنے پائے گا۔" (البدایہ والنہایہ، جلد ۲، ص ۲۹۱) "فضول کو اُس کے حقداروں کی طرف پلٹانے" کا مطلب یہ ہے کہ جو فضل کسی ظالم نے زبردستی صاحبِ حق سے چھینا ہو اُسے واپس دلوایا جاتے۔ اور ظالم کو اس کے ظُلم پر قائم نہ رہنے دیا جائے۔ ابن سعد نے اس معاہدے کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے باہم طے کیا کہ ہم مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اُس کا حق اُسے دلوا کر رہیں گے۔ ابن ہشام نے معاہدے کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ مکّہ میں شہر کے کسی باشندے یا باہر سے کسی آنے والے پر

کوئی ظلم نہ ہونے دیں گے اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی مدد کریں گے۔ ابن سعد نے اس معاہدے کی تاریخ ذی القعدہ سنہ عام الفیل لکھی ہے۔

اس کا سبب یہ ہوا کہ زبید (یمن کے ایک قبیلے) کا ایک شخص کچھ تجارتی سامان لے کر مکّہ آیا اور اس سے مکّہ کے ایک سردار عاص بن وائل نے مال خرید لیا مگر قیمت نہ دی۔ اس نے بنی عبدالدار، بنی مخزوم، بنی جمح، بنی سہم، بنی عدی میں سے ایک ایک کے پاس جا کر فریاد کی مگر سب نے اسے جھڑک دیا اور عاص بن وائل سہمی کے مقابلے میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ سب طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد وہ صبح کے وقت کوہ ابو قبیس پر چڑھ گیا اور اس نے بلند آواز سے آلِ فہر کو پکار کر اپنی مظلومیت سے آگاہ کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زبیر بن عبدالمطلب اٹھے اور انہوں نے کہا کہ یہ معاملہ اس طرح نہیں چھوڑا جا سکتا۔ پھر انہوں نے بنی ہاشم، بنی المطلب، بنی اسد بن عبدالعزّیٰ، بنی زہرہ اور بنی تیم کو عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع کیا (جو حضرت عائشہؓ کا چچازاد بھائی تھا) اور وہاں سب نے عہد کیا کہ مکّہ میں شہر کا یا باہر کا جو شخص بھی مظلوم ہوگا اس کی مدد کریں گے اور ظالم سے اس کا حق دلوا کر چھوڑیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد سب مل کر عاص کے پاس گئے اور اس سے زبیدی کا سامان واپس لے کر دیا۔

محمد بن اسحاق نے امام زہری کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں عبداللہ بن جدعان کے ہاں ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا کہ اگر مجھے سرخ اونٹ بھی اس کے بدلے ملتے تو میں اسے چھوڑ کر انہیں قبول نہ کرتا اور اگر آج دورِ اسلام میں بھی ایسے کسی معاہدے کی طرف دعوت دی جاتے تو میں اسے قبول کروں گا۔

حضرت خدیجہؓ کے ساتھ تجارت میں شرکت

۲۰ اور ۲۵ سال کی عمر کے درمیان حضورؐ کے وہ جوہر ساری قوم پر (اور قوم سے مراد یہاں آپؐ کا قبیلہ قریش ہے) عیاں ہوتے چلے گئے جو بچپن سے اب تک ایک محدود دائرہ میں معلوم و معروف تھے۔ آپؐ کی شرافت، دیانت و امانت، صداقت شعاری، حسنِ اخلاق، نیک نفسی، سنجیدگی و دانشمندی، ضبطِ نفس اور حلم و وقار، عالی حوصلگی اور بلند شان، غرض ایک ایک خوبی نمایاں ہونے لگی جس کی وجہ سے آپؐ کا غیر معمولی احترام اور اعتماد اور نفوذ و اثر لوگوں میں قائم ہوتا چلا گیا۔ یہی زمانہ ہے جب حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے ساتھ تجارتی شرکت کا معاملہ کیا۔

حضرت خدیجہؓ قریش میں اپنی عفت اور پاکیزہ سیرت کی بنا پر طاہرہ کے لقب سے معروف تھیں۔ مجھے قبیلے میں ان کی دانائی اور فہم و فراست اور اخلاق و اوصاف کے لحاظ سے ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو حسن و جمال کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ قریش کی کوئی عورت اُن سے زیادہ مالدار نہ تھی۔ لہٰذا اوقات قریش کا آدھا قافلہ تجارت صرف ان کے مال پر مشتمل ہوتا تھا۔ پہلے ان کی شادی ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی تھی جس سے دو لڑکے ہند اور

بالہ پیدا ہوئے اور دورِ رسالت میں دونوں مسلمان ہو گئے۔ ابو ہالہ کی وفات کے بعد اُن کی شادی عتیق بن عائذ المخزومی سے ہوئی جس سے اُن کی صاحبزادی ہند پیدا ہوئیں اور عہدِ نبوت میں وہ بھی مسلمان ہو گئیں[1]۔ اِس دوسرے شوہر کی وفات کے بعد وہ بیوہ ہی رہیں۔ قریش کے بہت سے سرداروں نے چاہا کہ وہ اُن میں سے کسی کے ساتھ شادی کر لیں، مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔ اپنے مال سے وہ تجارت کرتی تھیں اور کسی نہ کسی شخص سے معاملہ کر لیتی تھیں کہ وہ ان کی طرف سے تجارتی قافلوں میں جائے اور مقرر حصہ لے لے۔

اُنہیں جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق اور امانت اور بلند اخلاق کا حال معلوم ہُوا تو انہوں نے آپؐ سے کہا کہ آپ میرا مالِ تجارت شام لے جائیں، مَیں دوسروں کو جتنا حصہ دیتی ہُوں، آپؐ کو اس سے زیادہ دُوں گی۔ یہ ابنِ اسحاق کی روایت ہے۔

دوسری روایت جو ابنِ سعد نے نُفَیسہ بنت مُنیَہ سے نقل کی ہے اور جس کی مزید تفصیل زرقانی نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ ابو طالب نے حضورؐ سے کہا "بھتیجے مَیں مالدار آدمی نہیں ہُوں، ہمارے حالات خراب ہو رہے ہیں، اور ہمارے پاس کوئی مالِ تجارت بھی نہیں ہے۔ یہ قافلہ جو تمہاری قوم شام کی طرف بھیج رہی ہے اس کے چلنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس میں خدیجہؓ بھی اپنا مال بعض لوگوں کے ہاتھ تجارت کے لیے بھیجنا چاہتی ہیں۔ اگر تم ان کے پاس جاؤ تو وہ تمہیں دوسروں پر ترجیح دیں گی۔ کیونکہ انہیں تمہاری پاکیزہ سیرت کا حال معلوم ہے۔" حضورؐ نے فرمایا شاید خدیجہؓ مجھے خود اِس کام کے لیے بلوائیں گی۔ ابو طالب نے کہا مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ کسی دوسرے کو منتخب نہ کر لیں۔ چچا بھتیجے کی یہ گفتگو حضرت خدیجہؓ تک پہنچ گئی، مگر حضورؐ کا اندازہ بالکل صحیح نکلا، کیونکہ وہ پہلے ہی حضورؐ کو وہ پیغام بھیج چکی تھیں جس کا ذکر اوپر ابنِ اسحاق کے حوالہ سے کیا جا چکا ہے۔

طبقات ابنِ سعد میں ایک روایت یہ بھی ہے جو محمد بن عقیل سے مروی ہے کہ ابو طالب نے حضرت خدیجہؓ سے جا کر کہا کہ اُسے خدیجہؓ کیا تم پسند کرو گی کہ اپنی تجارت کے لیے کسی اور کی خدمات حاصل کرنے کے بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاملہ کر لو۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ آپ اگر کسی دُور کے ناپسندیدہ آدمی کے لیے بھی فرماتے تو مَیں مان لیتی۔ آپ تو ایسے شخص کے لیے کہہ رہے ہیں جو حبیب قریب ہے۔

غرض حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کا تجارتی معاملہ طے ہو گیا اور انہوں نے اپنے غلام مَیسرہ کو آپؐ کے ساتھ اِس تجارتی سفر پر شام بھیج دیا۔ یہ سفر ۱۵ یا ۱۶ ذی الحجہ ۲۵ عام الفیل کو شروع ہُوا۔ راستے میں مَیسرہ نے حضورؐ کے اخلاق، عادات اور خصائل کی وہ خوبیاں دیکھیں جن سے وہ آپؐ کا گرویدہ ہو گیا۔ واپس آ کر اُس نے حضرت خدیجہؓ کو تفصیل کے ساتھ بتایا

---

[1] بعض لوگوں نے اس کے برعکس عتیق کو اُن کا پہلا شوہر اور ابو ہالہ کو دوسرا شوہر بیان کیا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کہ اُس نے آپ کو کیسا پایا ہے۔ تجارت میں بھی حضورؐ نہایت کامیاب رہے۔ ابن سعد نے نُفَیسہ بنت مُنیہ کا بیان نقل کیا ہے کہ پہلے جتنا کچھ منافع کما کر دوسرے لوگ حضرت خدیجہؓ کو لا کر دیتے تھے آپؐ نے اس سے دُگنا منافع لا کر دیا اور حضرت خدیجہؓ نے بھی آپؐ کو جتنا دینے کا وعدہ کیا تھا اُس سے دوگنا دیا۔[۱]

آپؐ کا حضرت خدیجہؓ سے نکاح

میسَرہ جو مکّہ سے شام تک اور واپسی پر مکّہ تک کے طویل سفر میں شب و روز آپؐ کے ساتھ رہا تھا اور ہر پہلو سے آپؐ کی زندگی کو دیکھ کر آپ کا بندۂ بے دام بن چکا تھا، اس سے آپؐ کے حالات سُن کر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ سے شادی کا عزم کر لیا۔ اگرچہ پہلے بھی وہ آپؐ سے ناواقف نہ تھیں، اور قریش میں آپؐ کے جو محاسن معلوم عوام ہوتے جا رہے تھے اُن کا چرچا وہ سُن چکی تھیں۔ لیکن اب انہوں نے طے کر لیا کہ حضورؐ سے بہتر شوہر اُنہیں کوئی نہیں مل سکتا۔ نکاح کا معاملہ کس طرح طے ہُوا، اِس کے متعلق کچھ روایات میں اختلاف ہے۔

ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خود حضورؐ سے براہِ راست بات کی اور کہا کہ اے ابنِ عم آپ سے میری قرابت بھی ہے اور میں آپؐ کی امانت و صداقت اور حسنِ خُلق اور شرافتِ نسبی اور دیگر صفاتِ حمیدہ کی وجہ سے بھی یہ چاہتی ہوں کہ آپ سے شادی کر لوں۔

دوسری روایت ابن سعد کی ہے جو انہوں نے نُفَیسہ بنتِ مُنیہؓ[۲] سے نقل کی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ حضرت خدیجہؓ نے نکاح کی خواہش ظاہر کرنے سے پہلے مجھے آپ کے پاس بھیجا تاکہ آپ کی مرضی معلوم کر لوں۔ میں نے جا کر آپؐ سے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" فرمایا "میرے پاس کیا رکھا ہے کہ میں شادی کروں؟" میں نے کہا "اس کا انتظام ہو گیا ہے، اور آپؐ کو ایک ایسی جگہ شادی کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے جہاں جمال بھی

---

[۱] اس ایک سفر کے علاوہ حضورؐ کے متعدد دوسرے تجارتی سفروں کا حال بھی حدیث و سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے جن کے دوران میں آپؐ کو عرب کے بہت سے علاقوں کو بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔ حاکم نے مُستدرک میں جُرَش (یمن کے ایک مشہور مقام) کی طرف آپؐ کے دو سفروں کا ذکر کیا ہے اور امام ذہبیؒ نے اس کی توثیق کی ہے۔ مُسندِ احمد میں ذکر ہے کہ بحرین سے عبدالقیس کا وفد جب آیا تو آپؐ نے وہاں کے ایک ایک مقام کا نام لے کر اس کا حال پُوچھا۔ لوگوں نے اس پر تعجّب کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہارے ملک میں خوب پھرا ہُوں (مُسند، جلد ۳، ص ۲۰۶)۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اُس زمانے میں بحرین عرب کے پُورے مشرقی ساحل کا نام تھا، نہ کہ اُس جزیرے کا جسے اب بحرین کہا جاتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[۲] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ (حضرت زُبیرؓ کی والدہ) حضرت خدیجہؓ کی بھاوج تھیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

[۳] بعض مصنّفین نے بنتِ اُمیّہ لکھا ہے لیکن صحیح بنتِ مُنیہ ہی ہے۔ یہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہُوئیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

ہے، مال بھی ہے، شرف بھی ہے اور قابلیت بھی۔ کیا آپ اسے قبول کریں گے؟ فرمایا وہ کون ہے؟ میں نے کہا خدیجہ۔ فرمایا میری ان سے شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا اسے آپ میرے اوپر چھوڑ دیں۔ آپؐ نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو میں تیار ہوں۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ نے پیغام بھیجا کہ فلاں فلاں وقت آ جائیے۔ اور اپنے چچا عمرو بن اسد کو کہلا بھیجا کہ آ کر میری شادی کر دیں (حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد کا انتقال ہو چکا تھا)۔ اس طرح اُدھر سے عمرو بن اسد اور اِدھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچاؤں حضرت حمزہ اور ابو طالب کو لے کر پہنچ گئے اور شادی[1] ہو گئی۔ عقد کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ اور روساے مُضَر اور سرداران قریش شریک تھے۔ مہر میں حضورؐ نے ۲۰ اونٹ دیے[2]۔ ابن عبد البرّ نے لکھا ہے کہ یہ شادی سفر شام سے حضورؐ کی واپسی کے دو مہینے ۲۵ دن بعد ہوئی۔ حضورؐ کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی اور حضرت خدیجہؓ ۴۰ سال کی تھیں[3]۔

حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کی اولاد

حضورؐ کی ساری اولاد ماسوائے حضرت ابراہیمؓ کے (جو ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے) حضرت خدیجہؓ ہی سے تھی۔ ان میں سے دو صاحبزادے تھے اور چار صاحبزادیاں (۱) القاسمؓ جن کی نسبت سے آپ ابو القاسمؐ کہلاتے تھے (۲) عبد اللہؓ جن کو طیب اور طاہر بھی کہا جاتا تھا۔ (۳) حضرت زینبؓ (۴) حضرت رقیہؓ (۵) حضرت اُم کلثومؓ (۶) حضرت فاطمہؓ۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے کون کس سے بڑا تھا لیکن یہ معلوم ہے کہ حضرت زینبؓ اُس وقت پیدا ہوئیں جب حضورؐ کی عمر ۳۰ سال تھی (اصابہ) اور حضرت فاطمہؓ کی ولادت اُس وقت ہوئی جب آپؐ ۴۱ سال کے تھے (شرح مواہب)۔ نیز یہ بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلی ہجرت حبشہ جو ۵ بعد بعثت میں ہوئی اس میں حضرت رقیہؓ اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے ساتھ گئی تھیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرت زینبؓ سے ایک دو سال ہی چھوٹی ہوں گی تب ہی تو ۵ بعد بعثت میں شادی شدہ تھیں۔ (۱)

---

[1] ابن سعد نے لکھا ہے کہ ہماری تحقیق میں وہ تمام روایات غلط ہیں جن میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کا نکاح ان کے باپ خویلد نے پڑھایا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ واہی تباہی روایت یہ ہے کہ خویلد کو شراب پلائی گئی اور نشے کی حالت میں اُس نے نکاح پڑھا دیا اور ہوش میں آنے کے بعد وہ سخت ناراض ہوا۔ ہمارے نزدیک اہل علم سے جو بات ثابت اور محفوظ ہے وہ یہ ہے کہ خویلد حرب فجار سے پہلے مر چکا تھا اور حضرت خدیجہؓ کا نکاح ان کے چچا عمرو بن اسد نے کیا تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے مہر میں ۴۰۰ دینار دیے اور بعض میں ۵۰۰ درہم کا ذکر ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[3] ملاحظہ ہو اصابہ ...

ایک گروہ کی قبیح جسارت

بعض لوگ خدا سے بالکل بے خوف ہو کر بے تکلف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تھیں اور باقی صاحبزادیاں حضورؐ کی اپنی صُلب سے نہ تھیں بلکہ گیپڑ تھیں۔ حالانکہ یہ صریح قرآن کا انکار ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ "اے نبیؐ اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو" (الاحزاب۔ آیت ۵۹)۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ حضورؐ کی ایک نہیں بلکہ کئی بیٹیاں تھیں۔ اور یہ بات تاریخ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ ماریہ قبطیہؓ کے سوا حضورؐ کی باقی ازواج میں سے کسی کی کوئی اولاد آپؐ کی صُلب سے نہ تھی۔ لہٰذا لامحالہ یہ بیٹیاں حضرت خدیجہؓ ہی کے بطن سے تھیں۔ یہ لوگ تعصب میں اندھے ہو کر یہ بھی نہیں سوچتے کہ اولادِ رسولؐ کے نسب سے انکار کر کے وہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اس کی کیسی سخت جواب دہی انھیں آخرت میں کرنی ہوگی۔ تمام معتبر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہؓ ہی نہ تھیں بلکہ تین اور بیٹیاں بھی تھیں۔ حضورؐ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحٰق حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کے نکاح کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "ابراہیم کے سوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد انہی کے بطن سے پیدا ہوئی اور ان کے نام یہ ہیں: قاسمؓ، طاہرؓ و طیبؓ، اور زینبؓ، اور رقیہؓ، اور امّ کلثومؓ اور فاطمہؓ۔" (سیرت ابن ہشام، جلد اوّل، ص ۲۰۲)۔ مشہور ماہرِ علم الانساب ہشام بن محمد بن السائب کلبی نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ "مکہ میں نبوت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سب سے پہلے قاسمؓ پیدا ہوئے، پھر زینبؓ، پھر رقیہؓ، پھر فاطمہؓ، پھر امّ کلثومؓ۔ اور نبوت کے بعد عبداللہؓ پیدا ہوئے جن کو طیب و طاہر کہا گیا۔ ان سب کی والدہ حضرت خدیجہؓ تھیں" (طبقات ابن سعد، جلد اوّل، ص ۱۳۳)۔ ابن حزم نے جوامع السیرۃ میں لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی چار لڑکیاں تھیں، سب سے بڑی حضرت زینبؓ، ان سے چھوٹی حضرت رقیہؓ، ان سے چھوٹی فاطمہؓ، اور ان سے چھوٹی امّ کلثومؓ (ص ۳۸ تا ۳۹)۔ طبری، ابن سعد، ابوجعفر محمد بن حبیب صاحب کتاب المحبر اور ابن عبد البر صاحب کتاب الاستیعاب، مستند حوالوں سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت خدیجہؓ کے دو شوہر گزر چکے تھے۔ ایک ابوہالہ تمیمی جس سے ان کے ہاں ہند اور ہالہ پیدا ہوئے۔ دوسرے عتیق بن عابد مخزومی جس سے ان کے ہاں ایک لڑکی ہند نامی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ان کا نکاح

۱؎ ابن القیمؒ نے زاد المعاد میں، سُہیلی نے روض الانف میں اور ابن قتیبہ نے المعارف میں لکھا ہے کہ طاہر و طیب دو الگ بیٹے نہ تھے بلکہ یہ حضرت عبداللہ بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے القاب تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

حضورؐ سے ہُوا اور تمام علمائے انساب متفق ہیں کہ آپؐ کی صُلب سے ان کے ہاں وہ چاروں صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کے نام اوپر مذکور ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو طبری، جلد ۲، ص ۴۱۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۸، ص ۱۶ تا ۲۴۔ کتاب المحبّر، ص ۷۸، ۷۹، ۵۳، ۴۵۴۔ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۷۱۸)۔ ان تمام بیانات کو قرآن مجید کی یہ تصریح قطعی الثبوت بنا دیتی ہے کہ حضورؐ کی ایک ہی صاحبزادی نہ تھیں بلکہ کئی صاحبزادیاں تھیں۔ (۲)

ازدواجی زندگی

اگرچہ حضورؐ کی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر میں ۱۵ سال کا فرق تھا، لیکن دونوں کے درمیان اتنی محبت تھی کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپؐ تمام عمر ان کو یاد کرتے رہے۔ بخاری میں حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ آپؐ فرماتے تھے: خیر نسائھا مریم و خیر نسائھا خدیجۃ۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اپنی اُمّت کی بہترین عورت مریم تھیں اور اس اُمّت کی بہترین عورت خدیجہؓ ہیں۔ لیکن مسلم میں یہ روایت وکیع کے حوالہ سے آئی ہے اور اسے بیان کرتے ہوئے وکیع نے آسمان و زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضورؐ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وکیع نے یا جن لوگوں سے یہ روایت اُن کو پہنچی تھی انہوں نے اس کا مطلب یہ لیا کہ دُنیا کی بہترین خواتین یہ دو ہیں۔

بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے کسی پر مجھے اتنا رشک نہیں آتا تھا جتنا حضرت خدیجہؓ پر آتا تھا، حالانکہ آپؐ سے میری شادی ہونے سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اکثر آپؐ کو اُن کا ذکر کرتے سُنتی تھی، اور جب کبھی آپؐ کوئی بکری ذبح فرماتے تو اس میں سے ضرور حضرت خدیجہؓ کی ملنے والیوں کو ہدیہ بھیجتے تھے۔ بخاری کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت خدیجہؓ کی بہن حضرت ہالہؓ بنت خُویلد آئیں اور انہوں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حضورؐ ان کی آواز سُن کر تڑپ گئے اور فرمایا اَللّٰھُمَّ ھَالَہ (خدایا یہ ہالہ ہوں) کیونکہ ان کی آواز حضرت خدیجہؓ سے مشابہ محسوس ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس پر میں جل گئی اور میں نے کہا: "آپ قُریش کی ایک بُڑھی عورت کو اتنا یاد کرتے ہیں جسے انتقال کیے

؎ بیہقی نے مُصعب بن عبداللہ الزُّبیری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے لڑکے قاسمؓ تھے، پھر صاحبزادی زینبؓ، پھر صاحبزادے عبداللہؓ، پھر اُمّ کلثومؓ، پھر فاطمہؓ، پھر رقیہؓ۔ یُونس بن بُکیر نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے ہاں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں پیدا ہُوئیں، القاسمؓ، عبداللہؓ، فاطمہؓ، اُمّ کلثومؓ، زینبؓ اور رقیہؓ۔ عبدالرزاق نے اپنی کتاب المُصنّف میں ابن جُریج کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کے ہاں دو لڑکے عبداللہؓ اور قاسمؓ پیدا ہوئے اور چار لڑکیاں جن میں حضرت زینبؓ سب سے بڑی اور حضرت فاطمہؓ سب سے چھوٹی تھیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

مدت گزر گئی اور اللہ نے آپ کو اُس سے اچھی بیوی دے دی ''۔ مسند احمد اور طبرانی کی روایت میں اِس پر یہ اضافہ ہے کہ میری اِس بات پر حضورؐ کو غصہ آگیا اور میں نے آپ کو ناراض دیکھ کر عرض کیا کہ قسم ہے اُس خدا کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں آئندہ کبھی اُن کا ذکر بھلائی کے سوا کسی طرح نہ کروں گی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص بھی گرفتار ہو کر آئے تھے۔ حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے (جو اُس وقت مکہ میں تھیں) اُن کو چھڑانے کے لیے ایک فدیہ بھیجا جس میں حضرت خدیجہؓ کا وہ ہار بھی تھا جو انہوں نے ابوالعاص سے اُن کی شادی کے وقت زمانۂ جاہلیت میں دیا تھا۔ اس ہار کو دیکھ کر حضورؐ پر رقت طاری ہو گئی اور آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو زینبؓ کے قیدی کو ویسے ہی چھوڑ دو اور اس کا فدیہ واپس کر دو۔ سب لوگ اس پر راضی ہو گئے اور ابوالعاص فدیہ کے بغیر چھوڑ دیے گئے۔ بلاذری نے انساب الاشراف میں حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک کالے رنگ کی عورت حضورؐ کے پاس حاضر ہوئی تو آپؐ نے بڑی مسرت کے ساتھ اس کا استقبال فرمایا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا کہ اس عورت کی آمد پر آپ کے اِس قدر خوش ہونے کی کیا وجہ تھی؟ فرمایا یہ اکثر خدیجہؓ کے پاس آیا کرتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی گہری محبت تھی جو ان کی وفات کے بعد بھی عمر بھر آپؐ کے دل میں تازہ رہی۔

۱۵ سال حضرت خدیجہؓ نبوت سے پہلے اور دس سال نبوت کے بعد آپؐ کی بیوی رہیں۔ نبوت کے دسویں سال ان کا انتقال ہوا جبکہ آپؐ پچاس سال کے تھے اور وہ ۶۵ سال کی تھیں۔ لیکن آپؐ نے اپنی ساری جوانی انہی ایک سن رسیدہ بیوی کے ساتھ گزار دی، اور کسی دوسری عورت کا خیال تک نہ کیا، حالانکہ اُس وقت اہل عرب میں کسی شخص کا ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا کسی درجہ میں بھی معیوب نہ تھا اور نہ بیویاں ہی اس میں مانع ہوتی تھیں۔ خود حضرت خدیجہؓ کے خاندان سمیت، قریش کے تمام ہی خاندانوں میں ایک ایک شخص کی کئی کئی بیویاں ہونے کی بے شمار مثالیں موجود تھیں۔ اس کے باوجود آپؐ کا پچاس برس کی عمر تک ایک ایسی بیوی پر قانع رہنا جن کی عمر ۶۵ سال کی ہو چکی تھی اُن تمام معترضین کے لیے عملاً ایک منہ توڑ جواب ہے جو عمرِ شریف کے آخری دس سالوں میں حضورؐ کی کثرتِ ازدواج کو معاذ اللہ نفس پرستی پر محمول کرتے ہیں۔ آگے چل کر ہم بحث کریں گے کہ عمر کے آخری دور میں وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر آپؐ نے متعدد نکاح کیے۔

خوشحالی کا دور اور آپؐ کے اخلاقی فضائل کا نمایاں ہونا

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد حضورؐ کی مفلسی کا دور ختم ہو گیا۔ پہلے وہ دوسروں کے ذریعہ سے تجارت کرتی تھیں جس میں ان کو نفع کم ملتا تھا، کیونکہ دوسرے لوگ جس اخلاقی حالت میں مبتلا تھے اُس میں یہ امر کم متوقع ہو سکتا تھا کہ وہ غیر کے مال میں بد دیانتی نہ کریں یا نہایت دیانتداری اور خیرخواہی سے کام لیں گے۔ مگر جب ان کی تجارت رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم جیسے امین اور فرزانہ شخص کے ہاتھ میں آئی جو فطری خیر خواہی کے ساتھ شوہر ہونے کے باعث بھی اپنی اہلیہ کے حق میں کمال درجہ کے خیر خواہ تھے، تو آپؐ کی تجارت چمک اُٹھی اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پُورا ہُوا :

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى (الضحیٰ - ۸)

"اور اللہ نے آپؐ کو غریب پایا پھر غنی کر دیا۔"

اِس دَور میں آپؐ کی صداقت و امانت، معاملات میں اِنتہائی راستبازی، سخاوت اور جود و کرم، بھلائی، بیکسوں کی مدد، غربا پروری، اور دانائی و فرزانگی کے وہ اوصاف تمام قریش اور گرد و نواح کے قبائل پر عیاں ہو گئے جو پہلے اپنے ظہور کے مواقع نہ پانے کی وجہ سے مخفی تھے۔ اب معاشرے میں بھی آپؐ کا مرتبہ محض اخلاقی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مادّی حیثیت سے بھی اتنا بلند ہو گیا کہ آپؐ کا شمار سردارانِ قریش میں ہونے لگا۔ آپؐ کے اُوپر لوگوں کا اتنا اعتماد قائم ہو گیا کہ وہ اپنی قیمتی امانتیں آپؐ کے پاس رکھوانے لگے حتّیٰ کہ یہ سلسلہ اُس وقت بھی جاری رہا جب اعلانِ نبوت کے بعد مکّہ کے عوام و خواص آپؐ کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ اِس دُشمنی کے باوجود وہ اپنی امانتیں آپؐ ہی کی حفاظت میں دیتے رہے اور ہجرت کے وقت آپؐ کو اپنے پیچھے صرف اِس لیے حضرت علیؓ کو چھوڑنا پڑا کہ ہر ایک کی امانت اسے واپس کر کے آئیں۔ یہ اِس بات کی کھُلی علامت تھی کہ نبوت سے پہلے ہی نہیں، نبوت کے بعد بھی دشمنانِ اسلام کے دلوں میں آپؐ کی دیانت و امانت کا نقش بیٹھا ہُوا تھا، اور وہ اپنے درمیان آپؐ کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد آدمی سمجھتے تھے۔

تجارتی معاملات میں آپؐ اِس قدر کھرے تھے کہ ایک صاحب جو زمانۂ جاہلیت میں آپؐ کے شریکِ تجارت رہ چکے تھے وہ بتاتے ہیں کہ آپؐ بہترین شریک تھے کبھی دھوکا نہ دیا، کبھی کوئی چالبازی نہ کی، اور کبھی جھگڑا نہ کیا۔ ان صاحب کا نام مختلف روایتوں میں مختلف آیا ہے۔ ابن عبد البَرّ نے استیعاب میں قیس بن السائب بن عُویمر مخزومی لکھا ہے۔ مُسندِ احمد کی کسی روایت میں سائب بن عبداللہ المخزومی بیان کیا گیا ہے اور کسی میں سائب بن ابی السائب المخزومی (کتاب الادب، باب فی کراھیۃ المراء) میں ان کا نام سائب ہی بیان کیا گیا ہے اور خود ان کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہُوا تو لوگ میری تعریف کرنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا میں اِن کو تم سے زیادہ جانتا ہُوں۔ میں نے عرض کیا "میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، آپؐ نے سچ فرمایا، آپؐ میرے شریکِ تجارت تھے لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا، نہ کبھی دھوکا دیا، نہ جھگڑا کیا۔" ابوداؤد ہی میں ایک اور صاحب عبداللہ بن ابی الحمساء کی یہ روایت ہے کہ ایک دفعہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے خرید و فروخت کا معاملہ کیا۔ کچھ معاملہ طے ہُوا تھا اور کچھ باقی تھا۔ میں نے کہا کہ میں ابھی اِسی جگہ آکر آپؐ سے پھر ملوں گا۔ اس کے بعد میں بھُول گیا۔ تین دن گزر جانے کے بعد مجھے یاد آیا اور میں اُس جگہ پہنچا دیکھا

کہ آپؐ وہاں موجود ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "اے جوان! تم نے مجھے بڑی تکلیف دی، تین دن سے میں یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" (کتاب الادب، باب فی العدۃ) (۴)

زید بن حارثہ کا واقعہ

سب سے زیادہ جو واقعہ آپؐ کے بلند ترین اخلاق کی شہادت دیتا ہے وہ حضرت زید بن حارثہ کا ہے۔ یہ قبیلۂ کلب کے ایک شخص حارثہ بن شرحبیل (یا شراحیل) کے بیٹے تھے اور ان کی ماں سُعدیٰ بنت ثعلبہ قبیلۂ طے کی شاخ بنی معن سے تھیں۔ جب یہ آٹھ سال کے بچے تھے اُس وقت ان کی ماں انہیں اپنے میکے لے گئیں۔ وہاں بنی قین بن جسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لُوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ لے گئے ان میں حضرت زیدؓ بھی تھے۔ پھر انہوں نے طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں لے جا کر ان کو بیچ دیا۔ خریدنے والے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انہوں نے مکہ لا کر اپنی پھوپھی صاحبہ کی خدمت میں انہیں نذر کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح ہُوا تو حضورؐ نے اُن کے ہاں زیدؓ کو دیکھا اور ان کی عادات و اطوار آپؐ کو اس قدر پسند آئیں کہ آپؐ نے انہیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا۔ اس طرح یہ خوش قسمت لڑکا اُس خیر الخلائق ہستی کی خدمت میں پہنچ گیا جسے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نبی بنانے والا تھا۔ اُس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کچھ مدت بعد ان کے باپ اور چچا کو پتہ چلا کہ ہمارا بچہ مکہ میں ہے۔ وہ انہیں تلاش کرتے ہُوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپؐ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں، آپ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بُلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہُوں کہ وہ تمہارے پاس جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لُوں گا اور اسے یُوں ہی چھوڑ دُوں گا۔ لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہُوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہو اسے خواہ مخواہ نکال دُوں۔ انہوں نے کہا یہ تو آپؐ نے انصاف سے بھی بڑھ کر درست بات فرمائی ہے۔ آپؐ بچے کو بُلا کر پُوچھ لیجیے۔ حضورؐ نے زیدؓ کو بُلایا اور اُن سے کہا ان دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا "جی ہاں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا۔" آپؐ نے فرمایا "اچھا، تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمہیں پُوری آزادی ہے، چاہو تو ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو تو میرے ساتھ رہو۔" انہوں نے جواب دیا "میں آپ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔" ان کے باپ اور چچا نے کہا "زید، کیا تُو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟" انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے اس شخص کے جو اوصاف دیکھے ہیں ان کا تجربہ کر لینے کے بعد اب میں دُنیا میں کسی کو بھی اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔" زیدؓ کا یہ جواب سُن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضورؐ نے اُسی وقت زیدؓ کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمعِ عام میں اعلان فرمایا کہ "آپ سب لوگ گواہ رہیں، آج سے زید

میرا بیٹا ہے، یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے"۔ اسی بنا پر لوگ ان کو زید بن محمدؐ کہنے لگے۔ یہ سب واقعات نبوت سے پہلے کے ہیں حضورؐ جب منصب نبوت پر سرفراز ہوئے اُس وقت حضرت زیدؓ کو آپؐ کی خدمت میں رہتے ہوتے ۱۵ سال گزر چکے تھے اور ایمان لانے کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال تھی۔

حضرت علیؓ حضورؐ کی سرپرستی میں

اِس زمانہ میں حضورؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے اُن احسانات کو بھی یاد رکھا جو بچپن سے جوانی تک انہوں نے آپؐ پر کیے تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جب مکہ اور اس کے اطراف میں شدید گرانی رونما تھی، آپؐ کو خیال آیا کہ میرے چچا کی مالی حالت کمزور ہے اور وہ کثیر العیال آدمی ہیں۔ ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ چنانچہ آپ اپنے دوسرے چچا حضرت عباسؓ کے پاس گئے جو مالدار آدمی تھے اور اُن سے کہا کہ آپ کے بھائی کا کنبہ بڑا ہے، مالی حالت اچھی نہیں ہے، اور لوگ جس شدید گرانی کی حالت میں مبتلا ہیں وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں چلیے، ہم ان کا بار ہلکا کرنے کے لیے ان سے بات کریں اور ان کے ایک بیٹے کو آپ اپنی کفالت میں لے لیں اور ایک کو میں لیے لیتا ہوں"۔ حضرت عباسؓ اس بات پر راضی ہو گئے اور دونوں چچا بھتیجوں نے ابو طالب کے پاس جا کر مدعا بیان کیا۔ انہوں نے کہا عقیل اور (بقول ابن ہشام) طالب کو میرے لیے چھوڑ دو، باقی جس کو تم میں سے جو لینا چاہے لے لے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو اپنے ہاں لے گئے اور حضرت عباسؓ نے حضرت جعفرؓ کو لے لیا۔ حضرت علیؓ ان میں سب سے چھوٹے تھے۔ حضرت جعفرؓ اُن سے دس برس بڑے، حضرت عقیلؓ اُن سے دس برس بڑے اور طالب اُن سے بھی دس برس بڑے تھے۔ ان کے علاوہ ابو طالب کے دوسرے بچے بھی تھے۔

اس طرح حضرت علیؓ بچپن ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں آگئے تھے اور حضورؐ نے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی عمر اُس وقت ۴۔۵ برس سے زیادہ نہ تھی۔

کعبہ کی تعمیر نو

حضورؐ ۳۵ سال کے تھے اور نبوت میں ابھی پانچ سال باقی تھے کہ قریش نے کعبہ کو از سر نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ اس کی عمارت بہت بوسیدہ ہو گئی تھی، سیلابوں نے اس کو منہدم ہونے کے قریب پہنچا دیا تھا، دیواریں بھی نیچی تھیں، اوپر کوئی چھت بھی نہ تھی، اور تعمیر اس طرح ہوئی تھی کہ بس پتھر پر پتھر رکھے ہوئے تھے، کسی چیز سے ان کو جوڑا نہیں گیا تھا، دروازہ بھی زمین کے برابر تھا۔ کعبہ کا خزانہ اُس وقت ایک کنویں میں تھا جو عمارت کے اندر بنا ہوا تھا۔ بعض لوگ دیواریں پھاند کر وہاں پہنچ جاتے اور چوری کر لیتے تھے۔ چنانچہ تعمیر جدید کا فیصلہ ہو

سے پہلے بنی ملیح کے ایک غلام دُویک نے کعبہ کا مال چُرا لیا تھا، یا چوروں نے مال لے کر دُویک کے پاس رکھوا دیا تھا اور اُسی کے پاس سے وہ برآمد ہُوا تھا[1]۔ اِن وجوہ سے قریش کے لوگ چاہتے تھے کہ بلند اور پختہ عمارت بنا کر اوپر چھت ڈال دیں۔ اسی زمانہ میں ایک رُومی تاجر کے جہاز کو سمندر کی موجوں اور طُوفانی ہواؤں نے بقول ابن اسحٰق جُدّہ کے بندرگاہ پر، اور بقول ابن سعد شُعَیبہ پر (جو جُدّہ سے پہلے حجاز کا بندرگاہ تھا) لاکر پٹخ دیا جس سے اس کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ اُس میں باقُوم نامی ایک رُومی معمار بھی تھا، اور مکہ میں ایک قبطی نجار لکڑی کا کام کرنے کے لیے بھی موجود تھا۔ جہاز ٹوٹنے کی خبر سُن کر ولید بن مُغیرہ قریش کے چند آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور جہاز کی لکڑیاں خرید لیں۔ باقُوم سے بات چیت کر کے اِن لوگوں نے اس کو بھی راضی کر لیا کہ تعمیرِ کعبہ کا کام وہ انجام دے۔ اس کے بعد بنی مخزوم میں سے ایک شخص ابو وہب بن عَمرو بن عائذ (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا ماموں تھا) اُٹھا اور اس نے کعبہ کا ایک پتھر نکال کر اس کی جگہ واپس رکھا اور پھر قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے کہا "اے قریش کے لوگو، اِس کی تعمیر میں اپنی حلال کی کمائی لگانا۔ اس میں زنا کاری کی کمائی، سُود کی کمائی، یا کسی شخص پر ظلم کر کے حاصل کی ہُوئی کمائی داخل نہ ہونے پائے۔" ایک اور روایت میں اُس کے الفاظ یہ ہیں کہ "اِس گھر کی تعمیر میں کوئی ایسا مال نہ لگاؤ جو تم نے غصب کر کے، یا قطع رحمی کر کے، یا کسی ذمّہ کو جو تمہارے اور کسی دوسرے انسان کے درمیان ہو توڑ کر حاصل کیا ہو[2]۔" لیکن قریش کے لوگ کعبہ کو منہدم کرتے ہُوئے ڈر رہے تھے۔ آخرکار ولید بن مُغیرہ نے سابق عمارت کو ڈھانے کے لیے کدال ہاتھ میں لی اور کہا "اے اللہ، ہم دین سے منحرف نہیں ہو رہے ہیں۔ ہم خیر کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے" (یعنی کسی بُری نیت سے تیرے گھر کو نہیں ڈھا رہے ہیں)۔ یہ کہہ کر اُس نے کعبہ کے ایک حصہ پر ضرب لگائی اور پھر رُک گیا۔ رات بھر سب لوگ اس انتظار میں رہے کہ ولید پر کوئی آفت آتی ہے یا نہیں۔ اگر آفت آجائے تو ہم کام روک دیں گے اور جو پتھر اُکھڑا ہے اُسے اُسی کی جگہ پر لگا دیں گے۔ اور اگر کوئی آفت نہ آئے تو کام جاری رکھیں گے۔ صبح سب ولید پر اس فعل کا کوئی وبال نہ پڑا تو عمارت کو منہدم کرنے کا کام مختلف سمتوں سے مختلف قبیلوں نے اپنے اپنے ذمّہ لیا اور پہلے ابراہیمی کی بنیاد تک دیواریں توڑ دی گئیں۔ پھر سارے قبیلوں کے لوگ پتھر اُٹھا اُٹھا کر لانے اور عمارت

---

[1] ابن اثیر نے لکھا ہے کہ چوری کا شبہ دراصل تین آدمیوں پر تھا جن میں سے ایک ابولہب بھی تھا لیکن مال چونکہ دُویک کے قبضہ سے برآمد ہُوا تھا اس لیے اسی کو سزا دی گئی۔ (جلد ۲۔ ص ۲۷-۲۸)۔ (حاشیہ از مؤلّف)

[2] یہ ابن اسحٰق کا بیان ہے۔ موسیٰ بن عُقبہ نے مغازی میں اِسے ولید بن مُغیرہ کا قول لکھا ہے۔ (حاشیہ از مؤلّف)

تعمیر کرنے میں شریک ہوئے[1]۔ جب اُس مقام تک پہنچ گئے جہاں حجرِ اَسوَد نصب کیا جاتا تھا تو ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ شرف اُسے حاصل ہو۔ اس پر اتنا جھگڑا ہوا کہ آپس میں لڑائی تک کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ چار پانچ روز بھی جھگڑا چلتا رہا۔ آخر ایک روز حرم میں سب مشورہ کے لیے جمع ہوئے۔ بنی مخزوم میں سے ایک شخص ابو اُمیہ بن المغیرہ (ولید بن مغیرہ کے بھائی ہوتے) جو اُس وقت سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا، اُٹھ کر تجویز پیش کی کہ "اے قریش کے لوگو، اپنے اِس اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے اِس بات پر اتفاق کر لو کہ سب سے پہلے جو شخص اِس مسجد کے دروازے[2] سے داخل ہو وہ اس کا فیصلہ کر دے" اس تجویز کو سب نے مان لیا۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ سب سے پہلے داخل ہونے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ لوگوں نے آپ کو دیکھتے ہی کہا ھذا الامین، رضینا، ھذا محمد "یہ امین ہیں، ہم راضی ہو گئے۔ یہ تو محمد ہیں" مسند احمد کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے آپ کو دیکھتے ہی کہا اتاکم الامین "تمہارے پاس امین آگیا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہُوا کہ اب اِس قضیہ کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے تو آپ نے فرمایا ایک کپڑا لاؤ۔ لوگ کپڑا لے آئے۔ آپ نے حجرِ اَسود کو اُس کپڑے پر رکھ دیا، پھر فرمایا ہر قبیلہ ایک ایک طرف سے اِس کپڑے کو پکڑ لے اور سب مل کر حجرِ اسود کو اُٹھائیں۔ جب پتھر اُس مقام تک پہنچ گیا جہاں اس کو لگانا تھا تو آپ نے اُسے اپنے ہاتھ سے وہاں لگا دیا۔

یہ نبوت سے صرف پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اُس وقت ساری قوم نے بالاتفاق حضورؐ کے امین ہونے کی شہادت دی تھی۔ اور ساری قوم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ آپ کس قدر دانشمند انسان ہیں کہ اتنے

---

[1] اِس نئی تعمیر کے موقع پر سامان کی کمی کے باعث کعبہ کے ایک حصّے کو باہر چھوڑ دیا گیا اور اُس کے گرد دیوار کھینچ دی گئی تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ یہ کعبہ کا ایک حصّہ ہے۔ اِس کو حِجر بھی کہتے ہیں اور حطیم بھی۔ اِسی جگہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام مدفون تھے (ابن ہشام)۔ ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ قریش نے بیت اللہ کا دروازہ اتنا بلند کیا جتنا اب ہے۔ وہ پیر اور جمعرات کو دروازہ کھولتے اور حاجب دروازے پر کھڑے رہتے۔ چڑھنے والا جب سیڑھیاں چڑھ کر اندر جانے لگتا تو جس کو وہ داخل ہونے دینا چاہتے اُسے داخل کر لیتے اور جسے داخل نہ ہونے دینا چاہتے اسے دھکا دے کر گرا دیتے تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] دروازے سے مراد باب بنی شیبہ ہے۔ ایک روایت میں اس کا قول یہ ہے کہ جو شخص سب سے پہلے باب الصفا سے داخل ہو وہ اس کا فیصلہ کرے۔ موسیٰ بن عقبہ کا قول ہے کہ یہ مشورہ خود ولید نے دیا تھا۔ لیکن الفاکہی اور واقدی اور ابن اسحٰق ابو اُمیہ کا نام لیتے ہیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

خطرناک قضیئے کو بہترین طریقے سے حل کر کے آپؐ نے اپنی قوم کو خانہ جنگی سے بچا لیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ صرف یہی ایک موقع نہ تھا جبکہ حضورؐ نے قریش کے ایک قضیئے کا فیصلہ کیا ہو بلکہ نبوت سے قبل اکثر لوگ اپنے معاملات کا تصفیہ کرانے کے لیے آپؐ سے رجوع کرتے تھے۔

نبوت سے پہلے حضورؐ کو قریب سے جاننے والے

نبوت سے قبل جن لوگوں کو سب سے زیادہ قریب سے آپؐ کی زندگی دیکھنے اور آپؐ کے حالات جاننے کا موقع ملا تھا اُن میں کچھ تو آپؐ کے اپنے گھر کے لوگ تھے، یعنی حضرت خدیجہؓ جو ۱۵ سال سے آپؐ کی زوجۂ محترمہ تھیں، حضرت علیؓ جنہوں نے بچپن سے آپؐ کے گھر میں پرورش پائی تھی، حضرت زید بن حارثہؓ جنہوں نے ماں باپ کو چھوڑ کر آپؐ کے ساتھ رہنا قبول کیا تھا اور آپؐ نے ان کو بیٹا بنا لیا تھا، اور حضرت اُمّ ایمنؓ جنہوں نے بچپن سے آپؐ کو پالا تھا اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ہمیشہ آپؐ کے ساتھ رہی تھیں، جنہیں حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ "میری ماں کے بعد یہ میری ماں ہیں"، اور جن کو آپؐ یا اُمَّہ (اے میری ماں) کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ گھر سے باہر کے متعدد اصحاب ایسے تھے جنہیں آپؐ کی ہم نشینی کا شرف حاصل تھا اور جو ایک مدت سے آپؐ کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے۔

ان میں سب سے زیادہ آپؐ کے قریبی دوست حضرت ابوبکرؓ تھے۔ ابن مَنْدَہ نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ یہ ۱۸ سال کی عمر سے حضورؐ کی صحبت میں بیٹھتے تھے جبکہ حضورؐ کی عمر ۲۰ سال تھی۔ اُس وقت سے دونوں کے درمیان دوستی چلی آ رہی تھی، کیونکہ مکہ میں کوئی دو آدمی ایسے نہ تھے جن کا مزاج، عادات، خصائل اور اخلاق ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ ہوں جتنے حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے تھے۔ جاہلیت کے زمانہ میں یہ بڑے ذی وجاہت اور رؤسائے قوم میں سے ایک رئیس تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اپنے اخلاق کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ یہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جاہلیت میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ قریش نے دِیَت کے معاملات ان کے سپرد کر رکھے تھے، جس دِیَت کا بار یہ قبول کر لیتے، سارا قبیلہ اسے اٹھانے پر راضی ہو جاتا اور جس بار کو کوئی دوسرا قبول کرتا تو لوگ اس کی توثیق سے انکار کر دیتے تھے۔ انساب کے معاملہ میں قریش کے لوگ سب سے زیادہ ان کے علم پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کا یہ اخلاقی اثر نہ صرف قریش میں، بلکہ آس پاس کے قبائل تک میں تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مکہ میں مسلمانوں پر ظلم کی انتہا ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ بھی ہجرت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک دن یا دو دن کی مسافت طے کی تھی کہ اَحابیش[1] کا سردار

---

[1] احابیش تین قبیلوں کا مجموعہ تھا جن میں بنو الحارث بن عبد مَناۃ بن کنانہ، بنی الہون بن خزیمہ بن مُدرِکہ (یعنی عَضَل، قارہ)،

ابن الدُّغُنّہ راستے میں ملا۔ اُس نے پوچھا ابوبکرؓ، تم کہاں جا رہے ہو؟ اُنہوں نے کہا "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، سخت اذیتیں دی ہیں اور میری زندگی تنگ کر دی ہے۔" اُس نے کہا "کیوں؟ خدا کی قسم تم تو معاشرہ کی زینت ہو، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہو، نیک کام کرتے ہو، غریبوں کی مدد کرتے ہو۔ چلو میں تم کو پناہ دیتا ہوںؓ" پھر وہ انہیں لے کر مکہ میں آیا اور اُس نے اعلان کیا کہ "میں نے ابنِ ابی قحافہ کو اپنی پناہ دی ہے۔ اب کوئی ان سے بھلائی کے سوا کسی اور طرح تعرّض نہ کرے۔"

دوسرے صاحب حضرت صُہَیبؓ بن سِنان رُومی تھے۔ اصل میں بنی نَمِر بن قاسِط میں سے تھے جن کا علاقہ ایران کی حکومت میں موصل کے قریب واقع تھا۔ بچپن میں رُوم و ایران کی ایک لڑائی کے موقع پر گرفتار ہو گئے اور ایک مُدّت تک رُومیوں کی غلامی میں رہنے کے بعد فروخت ہوتے ہوتے مکہ پہنچے جہاں عبداللہ بن جُدعان نے ان کو خرید لیا۔ ابنِ جُدعان چونکہ حضرت ابُوبکرؓ کا قریبی رشتہ دار تھا اس لیے اُن کے توسُّط سے یہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعارف ہُوئے اور آپؐ سے مانوس ہو کر اکثر آپؐ کی صحبت میں بیٹھنے لگے۔ ان کا مرتبہ یہ تھا کہ جب حضرت عُمرؓ کی وفات ہونے لگی تو انہوں نے وصیّت کی کہ جب تک شُوریٰ کسی ایک خلیفہ پر متفق نہ ہو جائے یہی مسجدِ نبویؐ میں نماز پڑھاتے رہیں۔

تیسرے حضرت عمّار بن یاسرؓ تھے جن کا اپنا قول بَیہقیؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کا حال مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔ میں آپؐ کا ہم نشیں، دوست، اور آپؐ سے بہت مانُوس تھا۔ حضرت صہیبؓ اور یہ ایک ساتھ ایمان لائے۔

چوتھے حضرت حکیم بن حِزامؓ تھے۔ قریش کے مُعزز رؤسا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ رِفادہ کا منصب ان کے سپرد تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ عمر اُن کی حضورؐ سے پانچ سال زیادہ تھی۔ مُسندِ احمد میں عِراک بن مالک کی روایت ہے کہ ان سے خود حضرت حکیم نے بیان کیا کہ جاہلیت کے زمانہ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھ کو سب سے زیادہ محبت تھی۔ زُبیر بن بَکّار کہتے ہیں کہ نبوّت کے بعد بھی حضورؐ کے ساتھ ان کی محبت جُوں کی تُوں قائم رہی، اگرچہ ایمان وہ فتحِ مکہ کے بعد لائے۔

پانچویں صاحب اَزدِ شَنُوءَہ کے قبیلے سے تعلق رکھنے والے ضِماد بن ثَعلبہ تھے جو طِب اور جرّاحی کا پیشہ کرتے تھے۔ ابنِ عبدالبر لکھتے ہیں کہ وہ جاہلیت کے زمانہ میں حضورؐ کے دوست تھے۔ مُسندِ احمد میں ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ زمانۂ نبوت میں جب یہ مکہ میں آئے تو لوگوں نے انہیں بتایا کہ حضورؐ مجنون ہو گئے ہیں۔ وہ سیدھے آپؐ کے پاس پہنچے اور کہا مجھے بتائیے، آپ کو کیا تکلیف ہے، میں آپ کا علاج کروں گا۔ حضورؐ نے جواب میں ان کو چند مؤثر جملے سنائے جو آپؐ خطبۂ مسنونہ میں شامل ہیں۔

م۔ اور قریش کے قبائل، اور خُزاعہ میں سے بنو المُصطَلِق شامل تھے۔ انہوں نے مل کر مکہ کے زیریں علاقہ میں اُحبُش نامی ایک وادی کے اندر باہم دوستی اور امداد باہمی کا معاہدہ کیا تھا، اس وجہ سے یہ اَحابِیش کہلاتے تھے (حاشیہ از مؤلف)

لہ یہ تقریباً وہی صفات ہیں جو نزولِ وحی کے بعد حضرت خدیجہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی تھیں (حاشیہ از مؤلف)

اُنہیں سُن کر مسلمان ہو گئے۔

پھر کچھ لوگ وہ تھے جو قریبی رشتہ داری کی وجہ سے آپؐ کو خوب جانتے تھے اور جن سے آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو چھپا ہُوا نہ تھا۔ مثلاً حضرت عثمانؓ بن عفان، جو آپؐ کی پھوپھی اُمّ حکیم البیضاء کے نواسے تھے حضرت زبیرؓ بن العوام، جو آپ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کے بیٹے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عُمیرؓ بن ابی وقاص جو حضورؐ کی والدہ ماجدہ کے رشتہ دار تھے۔ حضرت ابو سلمہؓ جو آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے اور دُودھ شریک بھائی بھی۔ حضرت عبداللہ بن جحش جو آپؐ کی پھوپھی اُمیمہ کے بیٹے تھے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب جو آپؐ کے چچا زاد بھائی تھے۔

یہ لوگ سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے ہیں اور ان کا اسلام لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ حضورؐ کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر ان کے دلوں پر آپؐ کے فضائل اخلاق کا نقش پہلے ہی اِس طرح ثبت ہو چکا تھا کہ انہیں آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر لینے میں کوئی تامّل نہ ہُوا۔ اِس ایمان کو رشتہ داری یا دوستی یا ذاتی محبت پر محمول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اِن چیزوں کی بنا پر کوئی شخص کسی کی خاطر اپنا دین تبدیل نہیں کیا کرتا۔

حُلیہ شریف

زمانۂ قبلِ نبوت کے حالات کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا حُلیہ شریف بھی بیان کر دیا جائے، کیونکہ آدمی کی شخصیت سے اُس کے حُلیے کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ بخاری، مسلم، مُسندِ احمد، ترمذی، نسائی، بیہقی، حاکم، دارقطنی وغیرہ کتبِ حدیث میں حضرت علیؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ، حضرت براءؓ بن عازب، حضرت جابرؓ بن سَمُرہ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن بُسر، حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ[1] اور بعض دوسرے صحابہؓ کرام سے اِس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں، ان کو جمع کر کے ہم مجموعی طور پر آپؐ کا حُلیہ مبارک یہاں بیان کرتے ہیں۔

آپؐ کا قد نہ بہت لمبا تھا نہ ٹھگنا، بلکہ متوسط قامت سے کچھ نکلتا ہُوا تھا، اور کسی مجمع میں آپؐ ہوتے تو نمایاں نظر آتے تھے۔ چہرہ نہ لمبوترا تھا نہ بالکل گول، بلکہ کچھ گولائی لیے ہوئے تھا۔ رنگ نہ گندمی تھا نہ سُرخ، نہ بالکل سفید، بلکہ گورا سُرخی مائل اور روشن تھا۔ سر بڑا تھا۔ سینہ چوڑا تھا اور دونوں شانوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ جسم گٹھا ہُوا تھا مگر موٹا نہ تھا۔ جوڑ بند بہت مضبوط تھے۔ بازو بھرے ہوئے اور پنڈلیاں جسم سے متناسب تھیں۔ بازوؤں اور پنڈلیوں پر ہلکے ہلکے بال تھے، باقی جسم بالوں سے

---

[1] حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر کے بیٹے۔ (حاشیہ از مؤلف)

صاف تھا اور سینے پر بالوں کی ایک لکیر سی ناف تک جاتی تھی۔ سر اور ڈاڑھی کے بال گھنے تھے۔ بالوں میں نہ حبشیوں کی طرح گھونگھریالا پن تھا، نہ بالکل سیدھے تھے، بلکہ ہلکا سا گھونگھر تھا۔ آخر عمر تک سر اور ڈاڑھی میں مشکل سے ۲۰ بال سفید ہوئے تھے اور وہ بھی اُس وقت نمایاں ہوتے تھے جب آپؐ نے تیل نہ لگایا ہوتا تھا۔ سر کے بال کبھی نصف کان تک، کبھی کان کی لَو تک اور کبھی اس سے بھی نیچے تک لمبے رکھتے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور بہت خوبصورت تھیں، سُرمہ لگائے بغیر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سُرمہ لگائے ہوئے ہیں۔ آنکھوں کے ڈھیلوں میں ہلکے ہلکے سُرخ ڈورے سے تھے۔ پلکیں گھنی اور لمبی تھیں۔ بھویں ایک دوسری سے الگ تھیں، ملی ہوئی نہ تھیں۔ منہ بڑا تھا جو عربوں میں اسی کو خوبصورتی سمجھا جاتا تھا اور چھوٹے منہ کو پسند نہ کیا جاتا تھا۔ ایڑیاں ہلکی تھیں اور ہاتھ پاؤں کی انگلیاں لمبی اور بھاری تھیں۔ پاؤں کی بیچ کی انگلی انگوٹھے سے کچھ نکلتی ہوئی تھی۔ ہتھیلیاں اور تلوے بھرے بھرے تھے۔ پہلی نظر میں جو دیکھتا مرعوب ہو جاتا تھا، مگر جس قدر آپ سے قریب ہوتا اتنا ہی آپؐ کی نرم مزاجی اور حُسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر آپؐ سے مانوس ہو جاتا تھا۔ چلتے تھے تو قدم جما کر اس طرح چلتے تھے جیسے گہرائی میں اُتر رہے ہوں یا چڑھائی پر چڑھ رہے ہوں۔ کسی طرف متوجہ ہوتے تو پوری طرح ہو کر اور کسی طرف سے رُخ پھیرتے تو پوری طرح پھیرتے تھے، دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے یا صرف گردن موڑ کر دیکھنے کی عادت نہ تھی۔ چہرے پر تبسّم طاری رہتا۔ کبھی ہنستے تو ٹھٹھا مار کر نہ ہنستے تھے جسمانی طاقت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ رکانہ نے جو قریش کا سب سے زیادہ طاقتور پہلوان سمجھا جاتا تھا، جسے کبھی کوئی نہ پچھاڑ سکا تھا، آپؐ سے کشتی لڑی اور آپؐ نے اسے پچھاڑ کر بے بس کر دیا۔ وہ پھر اُٹھ کر مقابلہ پر آیا۔ آپؐ نے پھر اُسے پچھاڑ دیا۔ اُس نے کہا "اے محمدؐ، تعجب ہے، تم مجھے پچھاڑ دیتے ہو" اُس کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ نے کبھی ورزشیں کیں نہ پہلوانی کی، پھر بھی آپؐ نے اسے دو دفعہ پچھاڑ کر حیران کر دیا (بعد میں یہ صاحب بھی مسلمان ہو گئے تھے رضی اللہ عنہ)۔ حضورؐ کے لڑکپن کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن جُدعان کے ہاں ایک دعوت کے موقع پر ابوجہل آپؐ سے اُلجھ پڑا۔ وہ بھی تقریباً آپؐ کے برابر ہی کا لڑکا تھا۔ آپؐ نے اُٹھا کر اُسے اس طرح پٹخا کہ اس کا گھٹنا زخمی ہو گیا اور اس زخم کا اثر عمر بھر اس کے گھٹنے پر باقی رہا۔ ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ جنگِ بدر میں جب ابوجہل مارا گیا تو حضورؐ نے فرمایا اس کی لاش مقتولوں میں تلاش کی جائے اور اس کے گھٹنے کو دیکھا جائے، اس پر ایک زخم کا نشان ہوگا۔ چنانچہ جب اس کی لاش ملی تو نشان وہاں موجود تھا۔ پھر آپؐ نے خود یہ قصہ بیان فرمایا کہ اسے یہ زخم کیسے لگا تھا۔

اِس تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضورؐ صرف حُسنِ اخلاق ہی کا مجسمہ نہ تھے بلکہ مردانہ حُسن اور جوانمردی کا بھی بہترین نمونہ تھے۔ (۵)

حوالہ جات باب (۴)

① ــــــ اضافہ از مؤلف
② ــــــ تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب حاشیہ ۱۰۱ ۔
③ ــــــ اضافہ از مؤلف
④ ــــــ تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۹۸ ۔
⑤ ــــــ اضافہ از مؤلف

(بسلسلہ حاشیہ ۳ صفحہ ۱۱۴)

نکاح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمروں کے بارے میں مشہور و مقبول روایت یہی ہے کہ اس وقت حضورؐ کی عمر ۲۵ سال تھی اور حضرت خدیجہؓ کی ۴۰ سال لیکن شاذ روایات میں حضورؐ کی عمر ۲۱ - ۲۹ - ۳۰ اور ۳۷ سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر ۲۵ - ۲۸ - ۳۰ - ۳۵ اور ۴۵ سال تک بیان کی گئی ہے۔ اکثر اہل علم نے ان کو قبول نہیں کیا ہے، مگر بعض حضرات نے اس بنا پر حضرت خدیجہؓ کی عمر کے بارے میں ۲۸ سے ۳۰ سال تک کی روایات کو ترجیح دی ہے کہ ان کے نزدیک ۴۰ سال کی خاتون کے ہاں ۶ بچے پیدا ہونے ممکن نہیں ہیں، کیونکہ اوسطاً اگر ہر بچے کے درمیان ڈیڑھ سال کا فرق بھی ہو تو آخری بچہ ۴۹ سال کی عمر میں پیدا ہونا چاہیے، اور اگر ان روایات کو بھی ملحوظ رکھا جائے جن میں بعثت کے بعد حضرت خدیجہؓ کے ہاں اولاد ہونے کا ذکر کیا گیا ہے تو ان کی عمر اس وقت ۵۰ سال ہونی چاہیے، جو بعید از امکان ہے۔

ہمارے نزدیک یہ رائے علمی حیثیت سے درست نہیں ہے۔ طب النساء کے فن میں (Gynaecology) ایک مستند کتاب ہے جس کو اس فن کے دس استادوں نے ڈاکٹر اسٹینلے کلیٹن (Stanley G. Clayton) کے زیر ہدایت مرتب کیا ہے۔ اس کے بارھویں ایڈیشن میں اس مسئلے پر حسب ذیل تحقیقی رائے ظاہر کی گئی ہے:

"۴۵ اور ۵۰ سال کی عمر میں حیض بالعموم بند ہو جاتا ہے، لیکن بعض اوقات سن ایاس ۵۵ سال کی عمر تک، بلکہ اس سے بھی زیادہ دیر تک مؤخر ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض حالات میں ۳۵-۴۰ سال بلکہ اس سے بھی کم عمر میں واقع ہو جاتا ہے۔ عورت جلدی بالغ ہو جائے تو سن ایاس دیر میں رونما ہوتا ہے، اور حیض کی آمد دیر سے شروع ہو تو اکثر وہ جلدی بند ہو جاتا ہے۔" (صفحہ ۱۰۱)

اس فنی رائے کی بنا پر یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے ہاں ۵۵ - ۶۰ سال کی عمر تک بچے پیدا ہوتے رہے۔ روایات میں بیان ہوا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ولادت اس وقت ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ۴۱ سال اور سیدہ خدیجہؓ کی ۵۶ سال تھی۔

باب (۴)

آغازِ رسالت اور خفیہ دعوت کے ابتدائی تین سال

بعثت سے قبل انبیاء کا ذہنی سفر

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اُس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی۔ ان کے پاس نزولِ وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعۂ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے کو حاصل نہ ہو۔ چنانچہ حضورؐ سے فرمایا گیا :

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ۔ (الشوریٰ - ۵۲)

"آپ پہلے تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔"

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى۔ (الضحیٰ - ۷)

"اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ناواقفِ راہ پایا، پھر تمہیں راستہ بتایا۔"

عقلی معرفت سے الہامی ایمان تک

اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے علم و معرفت کے اُنہی عام ذرائع سے، جو دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں، ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے ہوتے تھے، وحی آکر جو کچھ کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر اُن کا دل گواہی دیتا تھا، اب اُنہی کے متعلق وحی یقینی اور قطعی شہادت دے دیتی تھی کہ وہ حق ہیں اور اُنہی صداقتوں کا مشاہدہ اُنہیں کرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے وثوق سے دُنیا کے سامنے اُن کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون متعدد مقامات میں بار بار بتکرار بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا :

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً۔ (ہود۔ ۱۷)

"پھر کیا وہ شخص جو پہلے اپنے رب کی طرف سے ایک دلیلِ روشن پر تھا یعنی عقلی و فطری

ہدایت پر)، اُس کے بعد خدا کی طرف سے ایک گواہ بھی اس کے پاس آگیا (یعنی قرآن)، اور اُس سے پہلے مُوسیٰ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت کے طور پر موجود تھی۔ (کیا وہ اِس صداقت کے بارے میں شک کر سکتا ہے؟)"۔

پھر اس کے بعد یہی مضمون حضرت نوحؑ کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۔ (آیت - ۲۸)

"اے میری قوم کے لوگو! غور تو کرو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا اور اس کے بعد اُس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت (یعنی نبوّت) سے بھی نوازا اور وہ چیز تم کو نظر نہیں آتی، تو اب کیا ہم زبردستی اُسے تمہارے سر چپیک دیں؟"

پھر اسی مضمون کو آیت ۶۳ میں حضرت صالحؑ اور آیت ۸۸ میں حضرت شعیبؑ دُہراتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے حقیقت کا براہِ راست علم پانے سے پہلے انبیاء علیہم السلام مشاہدے اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر استعمال کر کے (جسے اُوپر کی آیات میں "بَيِّنَةٍ مِّنْ الرَّبِّ" سے تعبیر کیا گیا ہے) توحید اور معاد کی حقیقتوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اور ان کی یہ رسائی وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انہیں علم وحی عطا کرتا تھا اور یہ چیز کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی تھی۔

یہ مشاہدۂ آثار اور غور و فکر اور عقلِ عام (Common Sense) کا استعمال اُن قیاس آرائیوں اور اُس ظن و تخمین (Speculation) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے جس کا ارتکاب فلاسفر کیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر قرآن مجید ہر انسان کو خود آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اس سے کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر خدا کی قدرت کے آثار دیکھو اور اُن سے صحیح نتیجہ اخذ کرو۔ اِس طرح آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ایک غیر متعصب طالبِ حق حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ (۱)

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانۂ قبلِ نبوّت کے جو حالات ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں ان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نبی ہونے سے پہلے ہی شرک سے پاک اور توحید کے قائل تھے۔ آپؐ نے ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی اپنی قوم کے مشرکانہ عقائد کو قبول نہیں کیا، اس کی مشرکانہ عبادات میں حصّہ نہیں لیا، تمام اور بُت پرستی سے ہمیشہ بیزار رہے، اور بُتوں پر جو قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں ان سے اجتناب فرماتے رہے۔ زمانۂ قبلِ نبوّت میں آپؐ کا حال اپنی قوم کے ان حُنفاء سے ملتا جُلتا تھا جن کا ذکر ہم اِس جلد کے دوسرے باب میں کر چکے ہیں۔ جاہلیّت کے زمانہ میں جُرہُم اور خُزاعہ نے دینِ ابراہیمی میں جتنی تحریفات کی تھیں ان میں سے کسی کو

آپؐ نے نبوت سے پہلے بھی کبھی قبول نہیں کیا۔ اسی طرح قریش نے اپنے دَور میں جن تحریفات کا اضافہ کیا، ان سے بھی آپؐ مجتنب رہے۔ مثال کے طور پر قریش نے اپنے لیے کچھ ایسے امتیازات قائم کر لیے تھے جن سے وہ دوسرے عربوں کے مقابلہ میں اپنی فضیلت جتانا چاہتے تھے۔ ابن ہشام اور ابن سعد کا بیان ہے کہ انہوں نے حج کے موقع پر عرفہ جانا اور وہاں سے افاضہ کرنا چھوڑ دیا تھا، صرف مزدلفہ تک جا کر پلٹ آتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اہلِ حرم ہیں اور ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ عام حاجیوں کی طرح حرم سے باہر جا کر وقوفِ عرفہ کریں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو حرم سے باہر کے لوگوں اور ہمارے درمیان کوئی فرق نہ رہے گا اور ہماری حیثیت گر جائے گی۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ عرفہ جانا اور وہاں ٹھیرنا اور پھر وہاں سے مزدلفہ اور منیٰ کی طرف پلٹنا اُن مشاعرِ حج میں سے ہے جو دینِ ابراہیمی میں شامل ہیں۔ رفتہ رفتہ ان امتیازات میں حرم سے باہر کے رہنے والے وہ قبائل بھی شریک ہو گئے جن سے قریش کی رشتہ داریاں تھیں، جیسے بنی کنانہ، اور خزاعہ اور بنی عامر بن صعصعہ۔ حتّٰی کہ جو قبائل قریش کے حلیف تھے ان کی شان بھی عام عربوں سے اونچی ہو گئی اور انہوں نے بھی عرفہ جانا چھوڑ دیا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے ہی اس بدعت کو رد کر دیا تھا۔ جُبیر بن مُطعِم سے ابن اسحاق کی روایت ہے کہ میں نے نزولِ وحی سے پہلے حضورؐ کو عام عربوں کے ساتھ وقوفِ عرفہ کرتے دیکھا ہے۔

قریش کی رائج کردہ بدعتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ حرم سے باہر کا رہنے والا اگر حج یا عمرے کے لیے آئے تو وہ باہر سے لایا ہوا نہ کھانا کھا سکتا ہے نہ باہر کے کپڑوں میں طواف کر سکتا ہے۔ کھانا وہ حرم کا کھائے اور کپڑا اگر حرم کا نہ ملے تو برہنہ طواف کرے۔ اگر اس نے بیرونی کپڑوں میں طواف کر لیا ہو تو اسے چاہیے کہ ان کپڑوں کو پھینک دے، نہ خود ان کو پہنے اور نہ کوئی ان کو ہاتھ لگائے۔ اہلِ عرب نے اس بدعت کو بے چون و چرا دین کی حیثیت سے قبول کر لیا اور اس طرح برہنہ طواف نے رواج پایا۔ حضورؐ نبوت سے پہلے بھی ان بدعتوں کو غلط سمجھتے تھے۔ (۲)

حضورؐ کا دَورِ بعثت

محدثین نے آغازِ وحی کا قصہ اپنی اپنی سندوں کے ساتھ امام زُہری سے، اور انہوں نے حضرت عُروہ بن زُبیر سے اور انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سچے (اور بعض روایات میں ہے اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپؐ جو خواب بھی دیکھتے وہ ایسا ہوتا کہ جیسے آپ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپؐ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی

لہ بیہقی کی روایت ہے کہ یہ کیفیت نزولِ وحی سے ۶ مہینے پہلے شروع ہو گئی تھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

کئی شب و روز غارِ حراء میں رہ کر عبادت کرنے لگے۔ [1] حضرت عائشہؓ نے تَحَنُّث کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زہری نے تَعَبُّد سے کی ہے۔ یہ کسی طرح کی عبادت تھی جو آپ کرتے تھے، کیونکہ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا۔ آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس آتے اور وہ مزید چند روز کے لیے سامان آپؐ کے لیے مہیا کر دیتی تھیں۔ (۴)

غارِ حراء میں خلوت گزینی کی وجہ

اِس دور میں جن وجوہ سے آپؐ مکہ کی آبادی کو چھوڑ کر سنسان پہاڑیوں کے درمیان حراء کے غار میں خلوت گزیں ہوتے تھے اس کے وجوہ پر کچھ روشنی سورۃ الم نشرح کی اِس آیت سے پڑتی ہے:

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (آیات ۲-۳)

"اور ہم نے تم پر سے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔"

اِس آیت میں وِزر کے معنی بھاری بوجھ کے ہیں اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا وہ بوجھ ہے جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیت کو دیکھ دیکھ کر آپؐ کی حساس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپؐ کے سامنے بُت پُوجے جا رہے تھے۔ شرک اور مشرکانہ اوہام و رسوم کا بازار گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں فساد عام تھا۔ زور دار وں کی زیادتیوں سے بے زور پس رہے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اوقات سَو سَو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پُشت پر کوئی مضبوط جتھا نہ ہو۔ یہ حالات دیکھ دیکھ کر آپؐ کڑھتے تھے مگر اس بگاڑ کو دُور کرنے کی کوئی صورت آپؐ کو نظر نہ آتی تھی۔ یہی فکر آپؐ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارِ گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپؐ

---

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ کیفیت کے بعد آپؐ اور زیادہ خلوت پسند ہو گئے تھے۔ ورنہ آپؐ کی خلوت پسندی اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ ابن ہشام اور طبری کی روایت کے مطابق ابن اسحاق اور عبداللہ بن زبیر نے عُبید بن عُمیر اللَّیثی سے نقل کیا ہے کہ آپؐ ہر سال ایک مہینہ حراء میں گزارتے۔ چند روز کا سامانِ خوراک لے کر جاتے، پھر واپس آ کر پہلے کعبہ کے سات طواف کرتے اور اس کے بعد گھر سے مزید چند روز کا سامان لے جاتے تھے۔ نیز اُن کا بیان ہے کہ اس اعتکاف اور تحنُّث کے زمانے میں آپ مساکین کو کثرت سے کھانا کھلاتے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ حضورؐ نے حراء میں جا جا کر قیام فرمانے کا یہ سلسلہ کب سے شروع کیا تھا۔ تاہم یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ عمل چند سال سے جاری تھا۔

(حاشیہ از مؤلف)

کے اُوپر سے اُتار دیا اور نبوّت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپؐ کو معلوم ہو گیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا قفل کھولا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس رہنمائی نے آپؐ کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپؐ پوری طرح مطمئن ہو گئے کہ اس ذریعہ سے آپؐ نہ صرف عرب بلکہ پوری نوعِ انسانی کو ان خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اُس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔ (۴)

سچّے خواب

جیسا کہ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتداء سچّے خوابوں سے ہُوئی تھی (بخاری و مسلم)۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی زمانۂ نبوّت کے ہر دَور میں جاری رہا ہے، چنانچہ احادیث میں آپؐ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپؐ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے یا کسی بات پر مطلع کیا گیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی آپؐ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے (الفتح آیت ۲۷)۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، فلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے، یا مجھے یہ بتایا گیا ہے یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اِس سے منع کیا گیا ہے۔ احادیثِ قُدسیہ زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔ (۵)

اِبتدائے وحی

جب آپؐ کی عمر چالیس سال ۶ مہینے کی ہو گئی[1] تو ایک روز ماہِ رمضان میں یکایک آپؐ پر غارِ حرا میں وحی نازل ہُوئی اور فرشتے نے نمودار ہو کر آپؐ کے سامنے آکر آپؐ سے کہا پڑھو[2]۔ بخاری میں کئی جگہ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے نقل ہُوا ہے۔ وہ خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان کرتی ہیں کہ میں نے کہا "میں تو پڑھا

---

[1] عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ ۴۰ سال کی عمر میں حضورؐ نبوّت سے سرفراز فرمائے گئے تھے لیکن آپؐ کی ولادت ۹ ربیع الاوّل سنہ عام الفیل میں ہُوئی۔ اور نبوّت آپؐ کو رمضان سنہ ۴۱ عام الفیل میں عطا ہوئی۔ اس لیے آغازِ نبوّت کے وقت عمرِ مبارک ٹھیک ۴۰ سال چھ مہینے تھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] عبداللہ بن زبیرؓ اور ابن اسحاق نے عُبید بن عُمیر اللّیثی سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا خواب میں جبریلؑ نے آکر ایک ریشمی کپڑے میں لکھی ہُوئی تحریر مجھے دکھائی جس میں سُورۂ علق کی ابتدائی آیات لکھی ہُوئی تھیں اور مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں پڑھا ہُوا نہیں ہُوں، پھر انہوں نے مجھے اس طرح بھینچا کہ میں سمجھا کہ میری جان نکل جائے گی پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھو اور اقرأ سے مالم یعلم تک مجھے پڑھوایا۔ جب میں نیند سے بیدار ہُوا تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ تحریر میرے سینہ میں لکھی ہُوئی ہے (طبری، ابن ہشام، سہیلی)۔ ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے کہتے ہیں کہ یہ گویا تمہید تھی اُس معاملہ کی جو جاگنے کے بعد بیداری میں پیش آیا جس کا ذکر حضرت عائشہؓ والی حدیث میں آیا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

ہُوا نہیں ہُوں"۔ اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا، یہاں تک کہ میری قوّتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ مَیں نے کہا "مَیں تو پڑھا ہُوا نہیں ہُوں"۔ اُس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوّتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ مَیں نے پھر کہا "مَیں پڑھا ہُوا نہیں ہُوں"۔[1] اُس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوّتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ (پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا) یہاں تک کہ مَا لَمْ یَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کانپتے لرزتے ہُوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر کہا "مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ"۔ چنانچہ آپ کو اُڑھا دیا گیا۔ جب آپؐ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا "اے خدیجہؓ، یہ مجھے کیا ہوگیا ہے"۔ پھر سارا قصّہ آپؐ نے اُن کو سُنایا اور کہا "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"۔[1] انہوں نے کہا "ہرگز نہیں، آپؐ خوش ہو جائیے۔ خدا کی قسم آپؐ کو اللہ تعالیٰ کبھی رُسوا نہ کرے گا۔[2] آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں) بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں (اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپؐ کے اخلاق کریمانہ ہیں)"۔ پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر وَرَقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو اُن کے چچا زاد بھائی تھے، زمانۂ جاہلیّت میں بُت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہوگئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بڈھے اور نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے اُن سے کہا بھائی جان، ذرا اپنے بھتیجے کا قصّہ سُنیے۔[3]

---

[1] اس خوف کے بہت سے وجوہ عُلماء نے بیان کیے ہیں جن کی تعداد ۱۲ تک پہنچتی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ نبوّت کے بارِ گراں کا تصوّر کرکے حضورؐ لرز رہے تھے اور آپؐ کو بار بار خیال آتا تھا کہ مَیں اتنا بڑا بوجھ کیسے اُٹھا سکوں گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ اپنے آپ کو کوئی بڑی ہستی نہ سمجھتے تھے اور کوئی ایسا اِدّعا آپؐ کے ذہن میں نہ تھا کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہی ہونا چاہیے اور کوئی زعم آپ کو نہ تھا کہ میں ہی یہ عظیم کام انجام دینے کی قوّت و اہلیت رکھتا ہُوں۔ (حاشیہ از مؤلّف)

[2] ایک روایت میں الفاظ ہیں "اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو رنج میں مُبتلا نہ کرے گا"۔ (حاشیہ از مؤلّف)

[3] حضورؐ کو اُن کا بھتیجا اس لیے کہا کہ ان کی تیسری پُشت میں عبدالعُزّٰی حضورؐ کی چوتھی پُشت میں عبدِمناف کا بھائی تھا۔ (حاشیہ از مؤلّف)

(ابو نعیم کی روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خود سارا قصہ ورقہ کو سنایا)۔ ورقہ نے حضورؐ سے کہا بھتیجے تم کو کیا نظر آیا ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ ورقہ نے کہا "یہ وہی ناموس (عالم بالا سے وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا[1]۔ کاش میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اُس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے ؟" ورقہ نے کہا ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لاتے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا"۔ مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔ (۶)

اس واقعہ سے کیا نتائج نکلتے ہیں ؟

یہ قصہ خود اپنے مُنہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اس چیز کا طالب یا متوقع ہونا تو درکنار، آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپ کے ساتھ پیش آئے گا۔ وحی کا نزول اور فرشتے کا اِس طرح سامنے آنا آپ کے لیے اچانک ایک حادثہ تھا جس کا پہلا اثر آپ کے اوپر وہی ہُوا جو ایک بے خبر انسان پر اتنے بڑے ایک حادثہ کے پیش آنے سے فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے مگر ان میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اِس قصے سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوت سے پہلے آپ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپ کا کردار کتنا بلند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کوئی کم سِن خاتون نہ تھیں بلکہ اِس واقعہ کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی اور پندرہ سال سے وہ حضورؐ کی شریکِ زندگی تھیں۔ بیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اِس طویل ازدواجی زندگی میں آپ کو اِتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب حضورؐ نے اُن کو غارِ حرا میں پیش آنے والا واقعہ سُنایا تو بلا تامّل انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپ کے پاس وحی لے کر آیا تھا۔ اِسی طرح ورقہ بن نوفل بھی مکہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آ رہے تھے، اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی جب یہ واقعہ سُنا تو اسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی بول اُٹھے کہ یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہُوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ کا

---

[1] حضرت عیسیٰؑ کے بجائے حضرت موسیٰؑ کا ذکر غالباً اس لیے کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے نبوت کی بشارت پیدائش سے بھی پہلے دے دی گئی تھی۔ البتہ حضرت موسیٰؑ کو نبوت اسی طرح اچانک ملی جس طرح حضورؐ کو دی گئی۔ (حاشیہ از مؤلف)

نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہ تھا۔ (۷)

صورت واقعہ کا تجزیہ

نزولِ وحی کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اچانک اِس صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا تھا۔ آپؐ کو اس سے پہلے کبھی یہ گمان بھی نہ گزرا تھا کہ آپؐ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ نہ اِس کی کوئی خواہش آپؐ کے دل کے کسی گوشے میں موجود تھی۔ نہ اس کے لیے کوئی تیاری آپؐ پہلے سے کر رہے تھے اور نہاس کے متوقع تھے کہ ایک فرشتہ اُوپر سے پیغام لے کر آئے گا۔ آپؐ خلوت میں بیٹھ بیٹھ کر مراقبہ اور عبادت ضرور فرماتے تھے۔ لیکن نبی بنائے جانے کا کوئی تصوّر آپ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ اِس حالت میں جب یکایک غارِ حراء کی اُس تنہائی میں فرشتہ آیا تو آپؐ کے اوپر اِس پہلے عظیم اور غیر معمولی تجربے سے وہی گھبراہٹ طاری ہوئی جو لامحالہ ایسے حالات میں ایک بشر پر طاری ہونی چاہیے، قطع نظر اس سے کہ وہ کیسا ہی عظیم الشان بشر ہو۔ یہ گھبراہٹ بسیط نہیں بلکہ مرکب نوعیت کی تھی۔ طرح طرح کے سوالات حضورؐ کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے جنہوں نے طبعِ مبارک کو سخت خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیا واقعی میں نبی بنایا گیا ہوں؟ کہیں مجھے کسی سخت آزمائش میں تو نہیں ڈال دیا گیا ہے؟ یہ بارِ عظیم آخر میں کیسے اُٹھاؤں گا؟ لوگوں سے کیسے کہوں کہ میں تمہاری طرف نبی مقرر ہوا ہوں؟ لوگ میری بات کیسے مان لیں گے؟ آج تک جس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہا ہوں۔ اب اسی معاشرے کے لوگ میرا مذاق اڑائیں گے اور مجھے دیوانہ کہیں گے۔ اِس جاہلیت کے ماحول سے آخر میں کیسے لڑ سکوں گا؟ غرض اس طرح کے نہ معلوم کتنے سوالات ہوں گے جو آپؐ کو پریشان کر رہے ہوں گے۔

اسی وجہ سے جب آپؐ گھر پہنچے تو کانپ رہے تھے۔ جاتے ہی فرمایا کہ "مجھے اُڑھا دو، مجھے اُڑھا دو" گھر والوں نے آپؐ کو اُڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا دل ٹھیرا تو سیدہ خدیجہؓ رضی اللہ عنہا کو سارا واقعہ سنایا اور فرمایا:

لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰی نَفْسِيْ "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے"

---

(۷) بے نظیر شخصیت کے مالک ہونے پر بھی وہ ذات عجب و خود پسندی سے اِس درجہ خالی تھی کہ جب آپؐ نبوت کے منصبِ عظیم پر یکایک مامور کر دیئے گئے اُس وقت بھی کافی دیر تک آپؐ کو یہ اطمینان نہ ہوتا تھا کہ دنیا کے کروڑوں انسانوں میں سے تنہا ایک میں ہی اِس قابل ہوں کہ اِس منصب کے لیے ربّ کائنات کی نگاہِ انتخاب میرے اُوپر پڑے۔ (۸)

انہوں نے آپؐ کو اطمینان دلایا کہ:

کلا واللّٰہ ما یخزیک اللّٰہ ابدًا۔ انک لتصل الرحم وتصدق الحدیث وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔

"ہرگز نہیں، خدا کی قسم! آپؐ کو اللہ کبھی رنج نہیں دے گا۔ آپؐ تو رشتہ داروں کے کام آتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بیکسوں کی مدد کرتے ہیں، نادار کی دستگیری کرتے ہیں، مہمان کی تواضع کرتے ہیں، اور تمام نیک کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔"

پھر وہ وَرَقہ بن نوفل کے پاس آپؐ کو لے گئیں، کیونکہ وہ اہلِ کتاب میں سے تھے اور انبیائے سابقین کے حالات سے باخبر تھے۔ اُنہوں نے حضورؐ سے کیفیت سُن کر بلا تأمل تصدیق کی کہ "یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰؑ پر آیا تھا۔" اس لیے کہ وہ بچپن سے جوانی تک آپؐ کی انتہائی پاکیزہ سیرت سے خوب واقف تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں پہلے سے نبوت کے دعوے کی کسی تیاری کا شائبہ تک نہیں پایا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں کو جب انہوں نے اس واقعہ سے ملایا کہ یکایک غیب سے ایک ہستی آکر ایسے شخص کو ان حالات میں وہ پیغام دیتی ہے جو عین تعلیمات انبیاء کے مطابق ہے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ ضرور ہی نبوت ہے۔ (۹)

اگر پہلے سے شوقِ نبوت ہوتا

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مراقبے کر کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے، تو غارِ حرا والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اُچھل پڑتے اور بڑے دم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اُتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھہرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غارِ حرا کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی امیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے؟

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے۔ اگر ان کے تجربے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوتی ہوتی کہ میاں نبوت کے اُمیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو، جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو اب پیری کی دکان چمکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں لیکن

وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں، اس کی بنا پر انہیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آسکتا، نہ اللہ اُس کو کسی بُری آزمائش میں ڈال سکتا ہے، اُس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر حقیقت ہے۔ اور یہی معاملہ ورقہ بن نوفل کا بھی تھا۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضورؐ کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادرِ نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنّع سے تمیز کر سکتے تھے۔ عمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپؐ کی پوری زندگی بچپن سے اُس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے بھی آپؐ کی زبان سے حرا کی سرگزشت سُنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السّلام پر وحی لاتا تھا کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادھا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اُس کے حصُول کا تصوّر تک اُس کے حاشیہ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے، اور اچانک وہ پُورے ہوش و حواس کی حالت میں عَلانیہ اِس تجربہ سے دوچار ہوتا ہے۔ اِسی چیز نے ان کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تأمّل اِس نتیجے پر پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریبِ نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے بلکہ اِس سچے انسان نے اپنے کسی ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے وہ دراصل حقیقت ہی کا مشاہدہ ہے۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیلِ نبوّت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے[1]۔ (10)

پہلی وحی کا مضمُون

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر پہلی وحی جو بھیجی گئی تھی وہ سُورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی جس میں حضورؐ سے یہ فرمایا گیا تھا کہ:

"پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یہ نزولِ وحی کا پہلا تجربہ تھا جو اچانک حضورؐ کو پیش آیا تھا۔ اِس پیغام میں آپؐ کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آپؐ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں، اور آگے کیا کچھ آپؐ کو کرنا ہے۔ بلکہ ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپؐ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ آپؐ کی طبیعت پر جو شدید بار اِس پہلے تجربے سے پڑا ہے اُس کا اثر دُور ہو جائے، اور

---

[1] مثلاً سُورۂ یونس کی آیت قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ . . . الخ
نیز سُورۂ شوریٰ کی آیت مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ . . . الخ (حاشیہ از مرتب)

آپ ذہنی طور پر آئندہ وحی وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔[1] (۱۱)

مضمونِ وحی کی تشریح

یہ پہلی وحی جو حضور پر نازل ہوئی اس کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ (العلق۔ آیت ۱)

"پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔"

فرشتے نے جب حضور سے کہا کہ پڑھو، تو حضور نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے یہ الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیے تھے اور انہیں پڑھنے کے لیے کہا تھا کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولتا ہوں آپ اسی طرح پڑھتے جائیں تو حضور کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

"اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھو" یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھو، یا بالفاظ دیگر بسم اللہ کہو اور پڑھو۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وحی کے آنے سے پہلے ہی صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔ اسی لیے یہ کہنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپ کا رب کون ہے بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھو یعنی جس رب کو تم جانتے ہو اُسی کا نام لے کر پڑھو۔

"جس نے پیدا کیا" یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس نے کس کو پیدا کیا۔ اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس رب کا نام لے کر پڑھو جو خالق ہے، جس نے ساری کائنات کو اور اس کی ہر چیز کو پیدا کیا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ (آیت ۲)

"جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔"

کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے اس کی تخلیق کی ابتدا کر کے اسے پورا انسان بنایا۔ عَلَق جمع ہے عَلَقَہ کی جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی حالت ہے جو استقرارِ حمل کے بعد چند دنوں میں رونما ہوتی ہے، پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔[2]

---

[1] اس وقفہ کے بعد جب دوبارہ نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلی مرتبہ آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ اٹھیں اور خلقِ خدا کو اُس روش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے۔ اس سلسلے کی تفصیل آگے آئے گی۔ (حاشیہ از مرتب)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، الحج، آیت ۵، حواشی ۵ تا ۷۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (آیات ۳-۴)

"پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔"

یعنی یہ اُس کا انتہائی کرم ہے کہ اِس حقیر ترین حالت سے ابتدا کر کے اس نے انسان کو صاحبِ علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے، اور صرف صاحبِ علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی، اور نسلاً بعد نسلٍ اُس کے بقا اور تحفظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اسے نشوونما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (آیت ۵)

"انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا، اسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اللہ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اُس پر کھلتے چلے گئے۔ یہی بات ہے جو آیۃ الکرسی میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ:

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔ (البقرہ ۲۵۵)

"اور لوگ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اُس کے جو وہ خود چاہے۔"

جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے، درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ تعالیٰ ہی نے جب چاہا اُن کا علم اُسے دیا بغیر اس کے کہ انسان یہ محسوس کرتا کہ یہ علم اللہ اسے دے رہا ہے۔

یہاں تک وہ آیات ہیں جو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئیں جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ پہلا تجربہ اتنا سخت تھا کہ حضورؐ اس سے زیادہ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اُس وقت صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ رب جس کو آپ پہلے سے جانتے اور مانتے ہیں، آپ سے براہِ راست مخاطب ہے، اُس کی طرف سے آپ پر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اور آپ کو اُس نے اپنا نبی بنا لیا ہے۔ اس کے ایک مدت بعد سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں آپ کو بتایا گیا کہ نبوت پر مامور ہونے کے بعد اب آپ کو کام کیا کرنا ہے[1] (۴)

---

[1] اِس موقع پر یہ جان لینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو صرف دو مرتبہ اُن کی اصلی صورت میں دیکھا ہے، ورنہ وہ ہمیشہ انسانی شکل میں آپ کے سامنے آیا کرتے تھے، جیسا کہ بخاری کتاب التوحید میں حضرت عائشہؓ

نُزولِ وحی کی ابتدا کب ہوئی؟

یہ اوّلین وحی جو سورۂ علق کی پہلی پانچ آیتوں پر مشتمل ہے، کب نازل ہوئی؟ اس کے بارے میں اہلِ روایت کے مختلف اقوال ہیں۔ ابن عبد البَر اور مسعودی نے کہا ہے کہ حضورؐ کی بعثت ۸ ربیع الاوّل سنہ ۴۱ عام الفیل کو ہوئی، اور ابن القیم نے زاد المعاد میں اس کو قول الاکثرین کہا ہے۔ لیکن جن لوگوں کا یہ قول ہے انہوں نے غالباً بعثت کی ابتدا اُس وقت سے قرار دی ہے جب آپؐ کو بروایتِ بیہقی نزولِ وحی سے ۶ مہینے پہلے سچے خواب نظر آنے شروع ہوئے تھے۔ رہا نُزولِ وحی تو اس باب میں قرآن مجید کا بیان صاف ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ: ۱۸۵) "رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا"۔ اس صریح نصِ قرآنی کے خلاف ظاہر ہے کہ کوئی دوسرا قول معتبر نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رمضان کی وہ کونسی تاریخ تھی جب نزولِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس باب میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ بعض لوگ ۷ رمضان بتاتے ہیں۔ ابن سعد نے ایک جگہ ۱۲، اور دوسری جگہ امام محمد الباقرؒ کے حوالہ سے ۱۷ رمضان تاریخ لکھی ہے۔ بلاذری نے بھی امام محمد الباقر کی اس روایت کو نقل کیا ہے، اور مزید برآں حضرت عائشہؓ سے بھی یہی تاریخ روایت کی ہے۔ طبری و ابن اثیر نے ابوقلابہ الجرمی کے حوالہ سے ۱۸ رمضان، اور بعض اور لوگوں نے ۲۱ رمضان تاریخ بیان کی ہے۔ واثلہ بن الاسقع، جابرؓ بن عبداللہ اور ابو الجلد کی روایت ۲۴ رمضان کی ہے لیکن قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ "ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا"۔

م؎ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، اور مسلم کتاب الایمان میں حضرت عائشہؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ پہلی مرتبہ وہ آسمان کے مشرقی کنارے سے نمودار ہوئے (جیسے سورۂ نجم میں اُفُقِ الاعلیٰ اور سورۂ تکویر میں اُفُقِ مبین کہا گیا ہے) اور رفتہ رفتہ حضورؐ کی طرف بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ آپؐ کے اوپر آ کر فضا میں معلق ہو گئے۔ پھر وہ آپؐ کی طرف جھکے اور اس قدر قریب آ گئے کہ آپؐ کے اور اُن کے درمیان صرف دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ [illegible] (بخاری)۔ خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ میں نے ان کو اس صورت میں دیکھا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے اور ان کی عظیم ہستی سے آسمان و زمین کے درمیان کی ساری فضا بھر گئی تھی (مسلم)۔ دوسری مرتبہ آپؐ نے ان کو سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰی کے پاس دیکھا۔ مسند احمد میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میں نے جبریل کو سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰی کے پاس دیکھا، اُن کے چھ سو بازو تھے"۔

(تفہیم القرآن، جلد پنجم، النجم، خلاصہ حواشی ۵-۷-۱۰-۱۱-۱۴)

اور علمائے اُمت کی بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے کوئی ایک طاق رات شب قدر ہے، بلکہ ان میں بھی زیادہ تر لوگ ستائیسویں رات کو شب قدر سمجھتے ہیں۔ (۱۳)

تاریخ نزولِ قرآن کے بارے میں معتبر احادیث

اِس معاملہ میں جو معتبر احادیث منقول ہوئی ہیں انہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا وہ ستائیسویں یا انتیسویں رات ہے (ابوداؤد طیالسی)۔ دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ سے یہ ہے کہ وہ رمضان کی آخری رات ہے (مُسندِ احمد)

حضرت اُبَیّ بن کعب سے زِرّ بن حُبَیش نے شب قدر کے متعلق پُوچھا تو انہوں نے حلفاً کہا اور استثناء نہ کیا کہ وہ ستائیسویں رات ہے (احمد، مُسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حِبّان)۔

حضرت ابُوذرؓ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ، حضرت حُذَیفہؓ اور اصحابِؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بہت سے لوگوں کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے (ابن ابی شیبہ)۔

حضرت عُبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات ہے، اکیسویں، یا تئیسویں، یا پچیسویں، یا ستائیسویں، یا انتیسویں، یا آخری (مُسندِ احمدؒ)۔

حضرت عبداللہؓ بن عباس کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسے رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو، جب مہینہ ختم ہونے میں ۹ دن باقی ہوں، یا سات دن باقی، یا پانچ دن باقی (بخاری)۔ اکثر اہلِ علم نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضورؐ کی مُراد طاق راتوں سے تھی۔

حضرت ابوبکرہؓ کی روایت ہے کہ ۹ دن باقی ہوں، یا سات دن، یا پانچ دن، یا تین دن، یا آخری رات۔ مراد یہ تھی کہ ان تاریخوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو (ترمذی، نسائی)۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ قدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات میں تلاش کرو (بخاری، مُسلم، احمد، ترمذی)۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ بھی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تا زیست رمضان کی آخری دس راتوں میں اعتکاف فرمایا ہے۔

اس معاملہ میں جو روایات حضرت معاویہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں ان کی بنا پر علمائے سلف کی بڑی تعداد ستائیسویں رمضان ہی کو شب قدر سمجھتی ہے۔ (۱۴)

نبوّت کے بعد پہلا فرض، نماز

طبری نے لکھا ہے کہ سب سے پہلی چیز جو اقرارِ توحید اور بتوں سے براءت کے بعد شرائعِ اسلام میں سے فرض کی گئی وہ نماز تھی۔ ابنِ ہشام نے بھی محمد بن اسحٰق کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ سب سے پہلے حضورؐ پر جو چیز فرض کی گئی وہ نماز تھی اور وہ ابتدا میں دو دو رکعت تھی۔ امام احمدؒ نے ابن لَہیعہ کی روایت حضرت زیدؓ بن حارثہ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہونے کے بعد جبریلؑ آپؐ کے پاس آئے اور انہوں نے آپؐ کو وضو کی تعلیم دی۔ ابن ماجہ اور طبرانی (فی الاوسط) میں بھی یہ واقعہ کچھ سندوں کے اختلاف کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ اس کی تشریح ابن اسحٰق کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ حضورؐ مکہ کے بالائی حصہ میں تھے جبریلؑ بہترین صورت اور بہترین خوشبو کے ساتھ آپؐ کے سامنے ظاہر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اے محمدؐ، اللہ نے آپؐ کو سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ آپؐ جن وانس کی طرف میرے رسول ہیں اس لیے آپؐ قولِ لاالٰہ الا اللہ کی طرف اُن کو دعوت دیں۔ پھر انہوں نے زمین پر پاؤں مارا جس سے پانی کا ایک چشمہ اُبل پڑا اور انہوں نے وُضو کیا تاکہ آپؐ نماز کے لیے پاک ہونے کا طریقہ سیکھ لیں۔ پھر آپؐ سے کہا کہ اب آپؐ وضو کریں۔ پھر جبریلؑ نے حضورؐ کے ساتھ دو رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ پڑھیں۔ اس کے بعد حضورؐ حضرت خدیجہؓ کو وہاں لائے اور وُضو کرایا اور دو رکعتیں ان کے ساتھ پڑھیں۔ ابنِ ہشام، ابن جریر اور ابن کثیرؒ نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

امام احمدؒ، ابن ماجہ اور طبرانی (فی الاوسط) وغیرہم نے اُسامہؓ بن زیدؓ سے اور انہوں نے اپنے والد حضرت زیدؓ بن حارثہ سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ پر وحی آنے کے بعد پہلا کام یہ ہُوا کہ جبریلؑ نے آکر آپؐ کو وُضو کا طریقہ بتایا پھر جبریلؑ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور آپؐ سے کہا کہ آپؐ اُن کے ساتھ نماز پڑھیں۔ پھر حضورؐ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا۔ وہ خوشی کے مارے مدہوش ہوگئیں۔ پھر حضورؐ نے اُن کو اُسی طرح وُضو کرنے کے لیے کہا اور اُن کو ساتھ لے کر اُسی طرح نماز پڑھی جس طرح آپؐ نے جبریلؑ کے ساتھ پڑھی تھی۔ پس یہ پہلا فرض تھا جو نزولِ اِقرأ کے بعد مقرر کیا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ اُسی رات کی صبح کا واقعہ ہے جس رات اِقْرَأْ نازل ہُوئی۔ اس کے بعد حضورؐ اور حضرت خدیجہؓ خفیہ طریقہ سے نماز پڑھتے رہے۔

پہلے چار مسلمان

یہ بات مُتّفق علیہ ہے کہ سب سے پہلی مُسلمان حضرت خدیجہؓ تھیں۔ اس کے بعد اس امر میں اختلاف ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ میں سے کون سب سے پہلے اسلام لایا۔ بہرحال یہ بالاتفاق تسلیم کیا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد اوّلین اسلام لانے والے یہی تین حضرات تھے[1]۔

---

[1] تاریخ و سیرت کی کتابوں میں یہی ابتدائی چار مسلمانوں کا نام لیا جاتا ہے لیکن یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ حضورؐ کی جو صاحبزادیاں

حضرت علیؓ کے متعلق حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں ابن اسحٰق کی روایت اور بلا ذری نے واقدی کی روایت نقل کی ہے کہ جب حضورؐ اور حضرت خدیجہؓ نے خفیہ طریقے سے نماز پڑھنی شروع کی تو اس کے ایک دن بعد حضرت علیؓ نے ان کو حالتِ نماز میں دیکھ لیا۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا "یہ اللہ کا دین ہے جس کو اس نے اپنے لیے پسند فرمایا ہے اور جس کے ساتھ اس نے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ لہٰذا میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کو مانو اور اس کی عبادت کرو اور لات و عزّیٰ کا انکار کر دو"۔ حضرت علیؓ جو اُس وقت دس سال کے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یہ ایسی بات ہے جو آج سے پہلے میں نے کبھی نہ سُنی تھی، میں فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک اپنے والد سے نہ پوچھ لوں۔ حضورؐ اُس وقت یہ نہ چاہتے تھے کہ آپؐ کا راز قبل از وقت ظاہر ہو جائے، اس لیے آپؐ نے فرمایا اگر تم قبول نہیں کرتے تو اس بات کو مخفی رکھو۔ اُس رات حضرت علیؓ نے توقّف کیا۔ پھر اللہ نے ان کے دل میں اسلام ڈال دیا اور صبح اُنھوں نے حاضر ہو کر پوچھا کہ کل آپؐ نے میرے سامنے کیا بات پیش فرمائی تھی؟ حضورؐ نے فرمایا یہ کہ "تم گواہی دو کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور لات و عزّیٰ کا انکار کر دو، اور اللہ کے سوا دوسرے شریکوں سے قطع تعلق کر لو"۔ حضرت علیؓ نے فوراً اسے قبول کر لیا، لیکن ابوطالب کے خوف سے اپنا اسلام مخفی رکھا۔ البتہ وہ بھی حضورؐ کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔

امام احمد، ابن جریر طبری اور ابن عبد البرؒ نے عفیف کِندیؓ (اشعثؓ بن قیس کے ماں جائے اور چچا زاد بھائی) کا بیان نقل کیا ہے کہ عباسؓ بن عبد المطّلب میرے پُرانے دوست تھے اور اکثر یمن آ کر عطر خریدتے اور حج کے زمانے میں فروخت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایّامِ حج میں جب میں اُن سے منیٰ میں ملا تو میں نے دیکھا کہ ایک شاندار مرد آیا اور اس نے خوب اچھی طرح وضو کیا، پھر وہ نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ایک عورت آئی اور اس نے بھی وضو کیا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک لڑکا جو ابھی بلوغ کی عمر سے کم تھا آیا اور اس نے بھی وضو کیا اور پہلے شخص کے پہلو میں نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا "اے عباسؓ یہ کیا دین ہے، اسے تو میں نہیں جانتا"۔ عباسؓ نے کہا "یہ میرے بھائی کے بیٹے محمدؐ بن عبد اللہ بن عبد المطّلب ہیں، ان کا دعویٰ ہے

۲۔ اُس وقت ہوشمندی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں وہ اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ ایمان لے آئی ہوں گی۔ حضرت زینبؓ کی عمر حضورؐ کے منصبِ نبوّت پر سرفراز ہونے کے وقت ۱۰ سال کی تھی۔ حضرت اُمّ کلثومؓ اور حضرت رقیہؓ کی عمر بھی اتنی تھی کہ دعوتِ عام کے آغاز سے پہلے حضورؐ نے اُن کی شادیاں ابولہب کے لڑکوں سے کر دی تھیں۔ البتہ حضرت فاطمہؓ نبوّت کے ایک سال بعد پیدا ہوئی تھیں اور انھوں نے آنکھیں ہی اسلام کی گود میں کھولی تھیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک پہلی تین صاحبزادیوں کا شمار ابتدائی مسلمانوں میں کیا جانا چاہیے، اور حضرت فاطمہؓ کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ انہوں نے ہوش ہی ایک مُسلمہ و مومنہ کی حیثیت سے سنبھالا۔

(حاشیہ از مؤلف)

کہ اللہ نے اِن کو رسُول بنا کر بھیجا ہے (اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ "اِن کا دعوٰی ہے کہ قیصر و کسرٰی کے خزانے ان کے لیے فتح ہو جائیں گے") ۔ اور یہ دوسرا میرا بھتیجا علیؓ بن ابی طالب ہے جس نے ان کے دین میں ان کی پیروی اختیار کی ہے۔ اور یہ ان کی بیوی خدیجہؓ بنت خُویلد ہیں اور انہوں نے بھی ان کے دین میں ان کی پیروی کی ہے"۔ بعد میں جب عفیف کندیؓ خود مسلمان ہو گئے تو وہ حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ کاش اُس وقت مَیں اُن میں کا چوتھا ہوتا۔

ابن ہشام اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ بعد میں کسی وقت ابُوطالب نے بھی حضرت علیؓ کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ پوچھا بیٹا یہ کیا دین ہے جس پر تو چل رہا ہے ؟" اُنہوں نے کہا " ابا جان، مَیں اللہ اور اس کے رسُول محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لایا ہُوں اور ان کی تصدیق کی ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی ہے"۔ ابوطالب نے کہا " وہ تمہیں بھلائی کے سوا کبھی کسی چیز کی طرف دعوت نہ دیں گے۔ تم ان کے ساتھ لگے رہو"۔ ابن کثیر نے ابوطالب کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں " اپنے چچازاد بھائی کا ساتھ دو اور اُن کی مدد کرو "۔

حضرت ابُوبکرؓ کے متعلق زُرقانی نے شرح مَواہب میں لکھا ہے کہ وہ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حِزام کے ہاں بیٹھے ہُوئے تھے۔ اتنے میں حضرت حکیم کی لونڈی اُن کے پاس آئی اور اُس نے کہا کہ آپ کی پھوپھی آج کہہ رہی تھیں کہ اُن کے شوہر حضرت مُوسٰی کی طرح نبی ہیں جنہیں اللہ نے بھیجا ہے۔ یہ سُنتے ہی حضرت ابوبکرؓ سیدھے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس پہنچے اور یہ معلوم کرتے ہی کہ اُس لونڈی کا بیان صحیح تھا، بلا تامّل ایمان لے آئے۔ ابن اسحٰق نے عبداللہ بن الحُصَین التّمِیمی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ مَیں نے جس کے سامنے بھی اسلام پیش کیا اُس نے کچھ نہ کچھ تردّد کیا اور سوچا، مگر ابوبکرؓ سے جونہی مَیں نے اس کا ذکر کیا انہوں نے کوئی تردّد نہ کیا اور تسلیم کرنے میں ذرا سی دیر بھی نہیں لگائی۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ کے متعلق کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے کہ وہ کیسے ایمان لائے۔ مگر وہ ۱۵ سال سے حضورؐ کے ساتھ آپ کے گھر کے ایک فرد کی طرح رہتے تھے۔ ضرور ہے کہ حضورؐ اور حضرت خدیجہؓ کو انہوں نے بھی نماز پڑھتے دیکھا ہوگا اور یہی اُن کے اسلام لانے کا سبب بنا ہوگا۔

اِن واقعات سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ حضورؐ ابتدا میں پوشیدہ طریقے سے کام کر رہے تھے، لیکن آپ کے اور حضرت خدیجہؓ کے قریبی رشتہ داروں کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آپ دینِ آبائی کے خلاف ایک دوسرا دین پیش کر رہے ہیں، اللہ کی طرف سے نبی مقرر ہونے کا دعوٰی کر رہے ہیں، اور آپ کے اِس دعوے کو نہ صرف یہ کہ آپ کے اہلِ خانہ اور کم از کم ایک دوست نے مان لیا ہے، بلکہ اس کے مطابق عبادت بھی دوسرے طریقے پر شروع کر دی ہے۔ تاہم چونکہ یہ علم دشمنوں کو نہیں بلکہ آپ کے خیر خواہوں اور آپ سے گہری محبت رکھنے والوں کو ہُوا تھا، اِس لیے انہوں نے اُس پردے کو پڑا رہنے دیا جو آغاز میں حضورؐ ڈالے رکھنا چاہتے تھے۔

اور اس بات کا کوئی چرچا نہ کیا کہ قبل از وقت مخالفت شروع ہو جاتی۔

کیا ابتدائی تین سالوں میں حضرت اسرافیلؑ آپؐ کی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے تھے؟

ابن جریر نے اپنی تاریخ میں، اور ابن سعد نے طبقات میں اور قسطلانی نے مَوَاہبُ اللَّدُنِّیَّہ میں اور زُرقانی نے شرح مَواہب میں مشہور تابعی امام شَعْبی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ نبوت کے بعد ابتدائی تین سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت اسرافیل کو تعلیم کے لیے لگا دیا گیا تھا۔ وہ وحی نہیں لاتے تھے کیونکہ وحی لانا صرف جبریل علیہ السلام کا کام تھا، البتہ وہ وحی کے سوا کسی اور طریقے سے حضورؐ کو علوم کی تعلیم دیتے تھے[1]۔ امام احمد بن حنبل اور یعقوب بن سُفیان الحافظ اور بَیْہقی نے بھی امام شَعْبی کی اس روایت کو نقل کیا ہے، اور اُن تک اِس کی سند صحیح ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ خود شَعْبی کو یہ خبر کس ذریعہ سے پہنچی، کیونکہ انہوں نے حضورؐ تک اس کی سند بیان نہیں کی ہے۔ ابن سعد اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ واقدی نے اس کی صحت سے قطعی انکار کیا ہے اور حتمی طور پر یہ کہا ہے کہ حضورؐ کے ساتھ جبریلؑ کے سوا کوئی دوسرا فرشتہ نہیں لگایا گیا۔

یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا نہ قطعی انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ قطعی اقرار۔ انکار اس لیے مشکل ہے کہ شَعْبی ایک ثقہ محدّث ہیں اور اُن کی مُرسَل روایت بھی ایسی کمزور نہیں ہو سکتی کہ اسے بالکل رد کر دیا جائے لیکن اس کو ایک یقینی واقعہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے ایسی مضبوط بھی نہیں ہے کہ اسے ضرور تسلیم ہی کر لیا جائے۔ تاہم یہ امر بعید از امکان نہیں ہے کہ نبوت کے بعد حضورؐ کے اقوال اور اعمال میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق علم و دانش کا جو ہمہ گیر اور اتھاہ خزانہ ہمیں ملتا ہے، جس سے حدیث و سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں، اور جس کی کوئی نظیر کسی دوسرے انسان کے اقوال و اعمال میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی نہیں ملتی، وہ عالمِ غیب سے آپ پر القا ہوتے ہوں گے، اور کیا عجب کہ اس خزانے کو آپؐ کے سینے میں بھر دینے کی خدمت اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل علیہ السلام سے لی ہو۔

فَترۃُ الوَحی

پہلی وحی نازل ہونے کے بعد ایک مدت تک جبریل علیہ السلام کوئی وحی نہ لائے اور اس پر آپؐ کا رنج و غم اتنا ہی بڑھتا چلا گیا جتنی یہ مدت طویل ہوتی گئی، حتیٰ کہ آپ بے خودی کے عالم میں کبھی ثَبِیر (مکہ کے ایک پہاڑ) اور کبھی حراء پر جا کر ارادہ فرماتے تھے کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں۔ اِس حالت میں جب کہ آپؐ کسی پہاڑ کے کنارے کا رُخ کر رہے تھے، آپؐ نے آسمان سے ایک آواز سُنی اور آپ ٹھیر گئے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو جبریلؑ آسمان و زمین کے

---

[1] ممکن ہے کہ یہ طریقہ خواب ہو، یا دل میں القا ہو، یا بالمشافہہ تلقین ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

درمیان کرسی پر بیٹھے نظر آتے اور انہوں نے کہا کہ "اے محمدؐ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں"۔ ابنِ سعد نے اس کا قصہ حضرت عبداللہ بن عباس سے اور ابن جریر نے اپنی تفسیر اور عبدالرزاق نے اپنی المصنف میں امام زہری سے نقل کیا ہے۔ بخاری و مسلم اور مسند احمد میں بھی اس کی تفصیلات مذکور ہیں۔ (۱۵)

امام زہری کی روایت یہ ہے:

"ایک مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا اور اس زمانے میں آپ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی کہ بعض اوقات آپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ لیکن جب کبھی آپ کسی چوٹی کے کنارے پر پہنچتے جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ سے کہتے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، اس سے آپ کے دل کو سکون ہو جاتا تھا، اور وہ اضطراب کی کیفیت دُور ہو جاتی تھی۔" (ابن جریر)

اِس کے بعد امام زہری حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فترۃ الوحی (وحی بند رہنے کے زمانے) کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا "ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا، یکایک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی۔ سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا، اور گھر پہنچ کر میں نے کہا مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف (یا کمبل) اُڑھا دیا۔ اس وقت اللہ نے وحی نازل کی یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ۔ پھر لگاتار مجھ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا۔" (بخاری، مسلم، مسند احمد، ابن جریر) (۱۶)

سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات کا نزول

اِس طرح فترۃ الوحی کا زمانہ ختم ہوا اور سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات نازل ہوئیں جن میں حضورؐ کو منصبِ رسالت پر مامور کرنے کے ساتھ ضروری ہدایات دی گئیں جو اس منصب کے فرائض ادا کرنے کے لیے درکار تھیں۔ یہاں اس غرض کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات صرف یہ ظاہر کرتی تھیں کہ آپ پر نزولِ وحی کا آغاز ہو گیا ہے اور آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی بنا دیے گئے ہیں۔ اب سورۂ مدثر کی ان آیات میں آپ کو نبوت کے ساتھ ساتھ فریضۂ رسالت بھی سونپ دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ آپ اٹھ کر اس فرض کو ادا کرنا شروع کر دیں۔ ان آیات کے متعلق بعض روایات میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہی قرآن مجید کی اوّلین آیات ہیں چنانچہ بخاری، مسلم، ترمذی، اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری سے اس کی صراحت منقول ہوئی ہے۔ لیکن اُمت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مسلّم ہے کہ سب سے پہلے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ

سے مَا لَمْ یَعْلَمْ تک پانچ آیات نازل ہُوئی تھیں۔ اس کے بعد بقول ابنِ اثیر زمانۂ فَتْرَۃ (وحی بند رہنے کا زمانہ) سُورۂ مُدَّثِّر کی ان آیات کے نزول تک رہا پھر اس کے بعد وحی کا سلسلہ از سرِ نَو شروع ہو گیا خود حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے امام زُہری نے یہ بات نقل کی ہے کہ ان آیات کے نُزول سے پہلے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی فرشتے کو آسمان و زمین کے درمیان کُرسی پر بیٹھے دیکھا تھا جو حرا میں آپ کے پاس آیا تھا۔ یہ روایت ہم اُوپر بخاری و مُسلم وغیرہ کے حوالہ سے درج کر چکے ہیں۔ (۱۷)

وہ ہدایات جو اِس سُورہ میں دی گئیں

اب سُورۂ مُدَّثِّر کی اِن آیات کو ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ ان میں کیا ہدایات دی گئی تھیں:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ (آیت ۱)

"اَے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے"۔

اِس موقع پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ یا يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ کہہ کر مخاطب کرنے کے بجائے يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ کہہ کر کیوں مخاطب کیا گیا ہے؟ چونکہ حضورؐ یکایک جبریل علیہ السلام کو آسمان و زمین کے درمیان ایک کُرسی پر بیٹھے دیکھ کر ہیبت زدہ ہو گئے تھے اور اسی حالت میں گھر پہنچ کر آپ نے اپنے اہلِ خانہ سے فرمایا تھا کہ مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ کہہ کر خطاب فرمایا۔ اِس لطیف طرزِ خطاب سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اَے میرے پیارے بندے، تم اوڑھ لپیٹ کر لیٹ کہاں گئے، تم پر تو ایک کارِ عظیم کا بار ڈالا گیا ہے جسے انجام دینے کے لیے تمہیں پُورے عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

قُمْ فَأَنْذِرْ۔ (آیت ۲)

"اُٹھو اور خبردار کرو"۔

یہ اُسی نوعیت کا حکم ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو نبوّت کے منصب پر مامُور کرتے ہوئے دیا گیا تھا کہ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ "اپنی قوم کے لوگوں کو ڈرا دو قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے"۔ (نوح۔۱)۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اَے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اُٹھو اور تمہارے گرد و پیش خُدا کے جو بندے خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ان کو چونکا دو۔ انہیں اُس انجام سے ڈراؤ جس سے یقیناً وہ دوچار ہوں گے اگر اسی حالت میں مبتلا رہے۔ اُنہیں خبردار کر دو کہ وہ کسی اندھیر نگری میں نہیں بستے ہیں جس میں وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں اور ان کے کسی عمل کی کوئی باز پُرس نہ ہو۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (آیت ۳)

"اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو"۔

یہ ایک نبی کا اوّلین کام ہے جسے اِس دنیا میں اُسے انجام دینا ہوتا ہے۔ اُس کا پہلا کام ہی یہ ہے کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں اُن سب کی نفی کر دے اور ہانکے پکارے دُنیا بھر میں یہ اعلان کر دے کہ اِس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمۂ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اذان کی ابتدا ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے۔ نماز میں بھی مسلمان اللہ اکبر کہہ کر داخل ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اُٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی پھیرتا ہے تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرۂ تکبیر آج ساری دُنیا میں مسلمان کا سب سے زیادہ نمایاں امتیازی شعار ہے، کیونکہ اِس اُمّت کے نبیؐ نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع کیا تھا۔

اِس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جیسا کہ اِن آیات کی شانِ نزول سے معلوم ہو چکا ہے، یہ پہلا موقع تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کا عظیم الشان فریضہ انجام دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا، اور یہ بات ظاہر تھی کہ جس شہر اور معاشرے میں یہ مشن لے کر اُٹھنے کا آپؐ کو حکم دیا جا رہا تھا وہ شرک کا گڑھ تھا۔ بات صرف اتنی ہی نہ تھی کہ وہاں کے لوگ عام عربوں کی طرح مشرک تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مکّہ معظمہ مشرکینِ عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بنا ہوا تھا اور قریش کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ ایسی جگہ کسی شخص کا تن تنہا اُٹھنا اور شرک کے مقابلے میں توحید کا علم لے کر دنیا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ اِسی لیے "اُٹھو اور خبردار کرو" کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ "اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو" اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے کہ جو ہولناک طاقتیں اِس کام میں تمہیں مزاحم نظر آتی ہیں اُن کی ذرا پروا نہ کرو، اور صاف صاف کہہ دو کہ میرا رب اُن سب سے بڑا ہے جو میری اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی ہمّت افزائی ہے جو اللہ کا کام شروع کرنے والے کسی شخص کی کی جا سکتی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا نقش جس آدمی کے دل پر گہرا جما ہوا ہو وہ اللہ کی خاطر اکیلا ساری دُنیا سے لڑ جانے میں بھی ذرّہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (آیت ۴)

"اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔"

یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور رُوح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ رُوح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصوّرات تک سے خالی تھا، اور حضورؐ کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اِس لیے آپؐ کو ہدایت فرمائی

گئی کہ آپ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے نوعِ انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب تو درکنار، آج اِس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دُنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو "طہارت" کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اِسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطّہارت سے ہوتا ہے جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیل جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مفہوم اِن الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف سُتھرا رکھو۔ راہبانہ تصوّرات نے دُنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ مَیلا کُچیلا ہو اُتنا ہی زیادہ وہ مُقدّس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اُجلے کپڑے بھی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دُنیا دار انسان ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت مَیل کچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو وہ صاف ستھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طبائع کو اس سے متنفر کرنے والی ہو۔

تیسرا مفہوم اِس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو۔ تمہارا لباس صاف سُتھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو، مگر اُس میں فخر و غرور، ریا اور نمائش، ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ لباس وہ اوّلین چیز ہے جو آدمی کی شخصیّت کا تعارُف لوگوں سے کراتی ہے۔ جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ وروں کے لباس، متکبّر اور برخود غلط لوگوں کے لباس، چھچھورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بدقوارہ اور آوارہ منش لوگوں کے لباس، سب اپنے پہننے والوں کے مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ان سب لوگوں سے فطرۃً مختلف ہوتا ہے، اِس لیے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہیے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ ایک شریف اور شائستہ انسان ہے جو نفس کی کسی بُرائی میں مبتلا نہیں ہے۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اُردُو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ اخلاقی بُرائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابنِ عباسؓ، ابراہیم نخعیؒ، شعبیؒ، عطاءؒ، مجاہدؒ، قتادہؒ، سعید بن جُبیرؒ، حسن بصریؒ اور دوسرے اکابر مفسّرین رحمہم اللہ نے اس آیت

کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں کہ فُلَانٌ طَاهِرُ الثِّیَابِ اور فُلَانٌ طَاهِرُ الذَّیْلِ "فلاں شخص کے کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے" اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں فُلَانٌ دَنِسُ الثِّیَابِ "اُس شخص کے کپڑے گندے ہیں" اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بدمعاملہ آدمی ہے، اس کے قول وقرار کا کوئی اعتبار نہیں۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (آیت ۵)

"اور گندگی سے دُور رہو"

گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے۔ خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو، یا اخلاق و اعمال کی، یا جسم و لباس اور رہن سہن کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے گردو پیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص کبھی تم پر یہ حرف نہ رکھ سکے کہ جن برائیوں سے تم لوگوں کو روک رہے ہو، اُن میں سے کسی کا کوئی شائبہ تمہاری اپنی زندگی میں بھی پایا جاتا ہے۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (آیت ۶)

"اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے"

ان الفاظ کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں ان کا ترجمہ کر کے پورا مطلب ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جس پر بھی احسان کرو بے غرضانہ کرو۔ تمہاری عطا اور بخشش اور سخاوت اور حسنِ سلوک محض اللہ کے لیے ہو۔ اس میں کوئی شائبہ اس خواہش کا نہ ہو کہ احسان کے بدلے میں تمہیں کسی قسم کے دُنیوی فوائد حاصل ہوں۔ بالفاظِ دیگر اللہ کے لیے احسان کرو، فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوئی احسان نہ کرو۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نبوت کا جو کام تم کر رہے ہو یہ اگرچہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ تمہاری بدولت خلقِ خدا کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احسان لوگوں پر نہ جتاؤ اور اس کا کوئی فائدہ اپنی ذات کے لیے حاصل نہ کرو۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ تم اگرچہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہو، مگر اپنی نگاہ میں اپنے عمل کو کبھی بڑا عمل نہ سمجھو اور کبھی یہ خیال تمہارے دل میں نہ آئے کہ نبوت کا یہ فریضہ انجام دے کر اور اس کام میں جان لڑا کر تم اپنے رب پر کوئی احسان کر رہے ہو۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (آیت ۷)

"اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو"

یعنی یہ کام جو تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے، بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں سخت مصائب اور مشکلات اور تکلیفوں سے تمہیں سابقہ پیش آئے گا۔ تمہاری اپنی قوم تمہاری دشمن ہو جائے گی۔ سارا عرب تمہارے خلاف

صعب آسا ہو جائے گا۔ مگر جو کچھ بھی اس راہ میں پیش آئے، اپنے رب کی خاطر اس پر صبر کرنا اور اپنے فرض کو پوری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دینا۔ اُس سے باز رکھنے کے لیے خوف، طمع، لالچ، دوستی، دشمنی، محبت ہر چیز تمہارے راستے میں حائل ہوگی۔ ان سب کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہنا۔

یہ تھیں وہ اوّلین ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُول کو اُس وقت دی تھیں جب اُس نے آپؐ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپؐ اٹھ کر رسالت کے کام کا آغاز فرمائیں۔ کوئی شخص اگر ان چھوٹے چھوٹے فقروں پر اور ان کے معانی پر غور کرے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ ایک نبی کو نبوت کا کام شروع کرتے وقت اس سے بہتر کوئی ہدایات نہیں دی جا سکتی تھیں۔ ان میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آپؐ کو کام کیا کرنا ہے، اور یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ یہ کام کس نیت، کس ذہنیت اور کس طرزِ فکر کے ساتھ انجام دینا ہے، اور اس بات سے بھی خبردار کر دیا گیا کہ اس کام میں آپؐ کو کن حالات سے سابقہ پیش آئے گا اور ان کا مقابلہ آپؐ کو کس طرح کرنا ہوگا۔ آج جو لوگ تعصّب میں اندھے ہو کر یہ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ صرع کے دَوروں میں یہ کلام رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہو جایا کرتا تھا وہ ذرا آنکھیں کھول کر ان فقروں کو دیکھیں اور خود سوچیں کہ یہ صرع کے کسی دَورے میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں یا ایک خدا کی ہدایات ہیں جو رسالت کے کام پر مامور کرتے ہوئے وہ اپنے بندے کو دے رہا ہے۔ (۱۸)

وحی اخذ کرنے کی مشق

جیسا کہ ہم پہلے حضرت جابرؓ بن عبداللہ کے حوالہ سے نقل کر چکے ہیں، سُورۂ مدثّر کے بعد حضورؐ پر پے درپے وحی کا نزول شروع ہو گیا۔ مگر ابتدائی زمانے میں آپؐ کو نزولِ وحی کے وقت یہ دقّت پیش آتی تھی کہ کبھی آپؐ بھول جانے کے اندیشے سے اس کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے، اور کبھی دورانِ نزول ہی میں کسی بات کا مطلب پوچھنے لگتے تھے۔ اس لیے اس دَور میں یہ بھی ضروری تھا کہ آپؐ کو وحی اخذ کرنے کا طریقہ اچھی طرح سکھا دیا جائے۔ سُورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۔ (آیت ۱۱۴)

"پس بالا و برتر ہے اللہ، بادشاہِ حقیقی۔ اور دیکھو (اے نبیؐ) قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے اور دعا کرو کہ اے میرے پروردگار مجھے مزید علم عطا فرما۔"

اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ پر تقریر ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد رخصت ہوتے

ہوئے فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بات پر خبردار کرتا ہے جو وحی نازل کرنے کے دوران میں اُس کے مشاہدے میں آئی۔ بیچ میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا گیا اس لیے پیغام کی ترسیل مکمل کرنے کے بعد اُس نے حضورؐ کو اُس بات پر متنبہ کیا۔ بات کیا تھی جس پر یہ تنبیہ کی گئی؟ اسے خود تنبیہ کے الفاظ ہی ظاہر کر رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا پیغام وصول کرنے کے دوران میں اُسے یاد کرنے اور زبان سے دُہرانے کی کوشش فرما رہے ہوں گے۔ اِس کوشش کی وجہ سے آپؐ کی توجہ بار بار بٹ جاتی ہوگی۔ سلسلۂ اخذِ وحی میں خلل واقع ہو رہا ہوگا۔ پیغام کی سماعت پر توجہ پوری طرح مرکوز نہ ہو رہی ہوگی۔ اِس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ آپؐ کو پیغامِ وحی وصول کرنے کا صحیح طریقہ سمجھایا جائے اور بیچ بیچ میں یاد کرنے کی کوشش جو آپؐ کرتے ہیں اس سے منع کر دیا جائے۔

سُورۂ قیامہ کے نزول کے موقع پر بھی یہی صورت پیش آئی تھی، اس لیے سلسلۂ کلام کو توڑ کر آپؐ کو ٹوکا گیا کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ ”اسے یاد کرنے کی جلدی میں اپنی زبان کو بار بار حرکت نہ دو، اسے یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لہٰذا جب ہم اسے سُنا رہے ہوں تو غور سے سُنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔“[1]

سُورۂ اعلیٰ میں بھی آپؐ کو اطمینان دلایا گیا کہ ہم اسے آپؐ کو پڑھوا دیں گے اور آپ پھر بھولیں گے نہیں سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى [2] بعد میں جب آپؐ کو پیغاماتِ وحی وصول کرنے کی اچھی مہارت حاصل ہو گئی تو اس طرح کی کیفیات

---

[1] سورۂ قیامہ کے اندر یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ آنے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے بلکہ معتبر روایات میں اس کی یہی وجہ بیان ہوئی ہے۔ مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور دوسرے محدثین نے متعدد سندوں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب حضورؐ پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپؐ اس خوف سے کہ کہیں کوئی چیز بھول نہ جائیں جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ وحی کے الفاظ دہراتے جاتے تھے اس پر فرمایا لَا تُحَرِّكْ ... یہی بات شعبی، ابن زید، ضحاک، حسن بصری، قتادہ، مجاہد اور دوسرے بہت سے اکابر مفسرین سے منقول ہے۔ (۱۸)

[2] حاکم نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے اور ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ کو اس خوف سے دُہراتے جاتے تھے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ مجاہد اور کلبی کہتے ہیں کہ جبریل وحی سنا کر فارغ نہ ہوتے تھے کہ حضورؐ بھول جانے کے اندیشے سے ابتدائی حصہ دُہرانے لگتے تھے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا کہ وحی کے نزول کے وقت آپؐ خاموشی سے سنتے رہیں، ہم آپؐ کو اسے پڑھوا دیں گے اور وہ ہمیشہ کے لیے آپؐ کو یاد ہو جائے گی۔ اس بات کا کوئی اندیشہ آپؐ نہ کریں کہ اس کا کوئی لفظ آپ بھول جائیں گے۔ (۱۹)

آپ پر طاری ہوئی بند ہو گئیں۔ اسی وجہ سے بعد کی سُورتوں میں ایسی کوئی تنبیہ ہمیں نہیں ملتی۔ (۴۰)

خفیہ تبلیغ کا تین سالہ دَور

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تبلیغِ رسالت کی جو حکمت سکھائی تھی اس کے مطابق آپ نے اپنا کام چھوٹتے ہی اعلانِ نبوت کر دینے اور لوگوں کو دعوتِ عام دینے سے نہیں کیا بلکہ ابتدائی تین سال تک آپ خفیہ طریقے سے اسلام کو اُن سعید رُوحوں تک پہنچاتے رہے جو محض دلیل و برہان اور تفہیم و تذکیر سے توحید کو قبول کرنے اور شرک چھوڑ دینے پر آمادہ ہو سکتی تھیں، اور اس کے ساتھ جن پر یہ اعتماد بھی کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس تحریک کو اُس وقت تک راز میں رکھیں گی جب تک اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہادیٔ برحق اعلانِ عام اور واشگاف دعوت الی اللہ شروع کر دینے کا فیصلہ نہ فرمائیں۔ اِس کام میں سب سے زیادہ حضرت ابوبکر[1] رضی اللہ عنہ کے اثرات کارگر ثابت ہوئے۔ اِس کی وجہ طبری اور ابنِ ہشام نے یہ لکھی ہے کہ وہ نہایت ملنسار، خوش خلق اور اپنی قوم میں اپنی خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول و محبوب تھے۔ قریش میں کوئی شخص اُن سے زیادہ انساب کا علم نہ رکھتا تھا اور نہ اُن سے زیادہ کوئی یہ جانتا تھا کہ قریش میں اچھے اور بُرے کون ہیں اور کس کے کیا اوصاف ہیں۔ تجارت پیشہ تھے اور اپنے حُسنِ معاملہ کے لیے مشہور تھے۔ ان کی قوم کے لوگ ان کے علم، ان کی تجارت اور ان کے عمدہ برتاؤ کی وجہ سے بکثرت ان سے ملتے اور ان کے پاس آ کر بیٹھتے تھے۔ اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے جن جن لوگوں پر اعتماد کیا ان تک دعوت پہنچائی اور ایک اچھی خاصی تعداد ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئی۔ پھر جو جو مسلمان ہوتا گیا وہ آگے اپنے حلقۂ احباب میں نیک رُوحوں کو تلاش کر کر کے اندر ہی اندر اسلام پھیلاتا گیا۔ اُس زمانہ میں مُسلمان چھپ چھپ کر مکہ کی سنسان گھاٹیوں میں نماز پڑھتے تھے تاکہ کسی کو ان کی تبدیلیٔ دین کا پتہ نہ چل سکے۔

دارِ ارقم میں مرکزِ تبلیغ و اجتماع کا قیام

ڈھائی سال سے کچھ زیادہ مدت ہی گزری تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس سے اندیشہ ہُوا کہ کہیں کفارِ مکہ سے قبل از وقت تصادم شروع نہ ہو جائے۔ ابنِ اسحٰق کا بیان ہے کہ ایک روز مسلمان مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کے ایک گروہ نے انہیں دیکھ لیا اور ان کو سخت سُست کہنا شروع کیا۔ بات بڑھتے بڑھتے لڑائی تک پہنچ گئی اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک شخص کو اُونٹ کی ہڈی کھینچ ماری جس سے اُس کا سر پھٹ گیا۔

---

[1] آپ کا اصل نام عبداللہ بن عثمان تھا لیکن ابوبکر آپ کی کنیت اِس قدر مشہور ہوئی کہ اصل نام اس کے پیچھے چھپ گیا۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ ان کو پاکیزہ خصلتوں میں اَبْکار (پیش پیش ہونے) کی وجہ سے ابوبکر کہا جاتا تھا۔ جاہلیت ہی میں وہ اِس نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

ابن جریر اور ابن ہشام نے اس واقعہ کو مختصراً بیان کیا ہے، مگر حافظ اُموی نے اپنی مغازی میں اس کی پوری تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ وہ شخص جس کا سر پھٹا تھا وہ بنی تیم کا عبداللہ بن خطل تھا۔ اس کے بعد حضورؐ نے بلاتاخیر حضرت اَرقم بن ابی اَرقم کے مکان کو، جو صفا کے قریب واقع تھا، مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت و تبلیغ کا مرکز بنا دیا تاکہ مسلمان یہیں جمع ہو کر نماز بھی پڑھیں اور جو جو لوگ خفیہ طریقہ سے مسلمان ہوتے جائیں وہ یہاں آتے رہیں۔ اسلام کی تاریخ میں اس دارِ اَرقم کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ تین سال کی خفیہ دعوت کا دَور ختم ہونے اور علانیہ دعوتِ عام شروع ہو جانے کے بعد بھی یہ مسلمانوں کا مرکز رہا۔ اسی میں حضورؐ تشریف فرما رہتے تھے، یہیں آ کر مسلمان آپؐ کے پاس جمع ہوتے تھے، اور شعبِ ابی طالب کی محصوری تک (جس کا ذکر ہم آگے کریں گے) اسی کو دعوتِ اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔

تین سال کی خفیہ دعوت میں کتنا کام ہُوا

اب قبل اس کے کہ ہم علانیہ دعوت کے دَور پر کلام شروع کریں ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ خفیہ دعوت کے اس تین سالہ دَور میں کتنا کام ہُوا تھا، قریش کے کن کن قبیلوں کے کون کون اور کتنے لوگ مسلمان ہو چکے تھے، اور قریش سے باہر کے لوگوں اور موالی[1] اور غلاموں اور لونڈیوں میں سے کس کس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ذیل میں ہم ان کی وہ فہرست دیتے ہیں جو بڑی تلاش و تجسس کے بعد ہم نے جمع کی ہے، کیونکہ ان کی پوری فہرست کسی جگہ بھی یکجا نہیں ملتی۔

بنی ہاشم میں سے : (۱) جعفرؓ بن ابی طالب
(۲) اُن کی بیوی اسماءؓ بنت عُمیس خَثعَمِیّہ (یہ غیر قریش میں سے تھیں)
(۳) صَفیّہؓ بنت عبدالمُطّلِب (حضورؐ کی پھوپھی اور حضرت زبیرؓ کی والدہ)۔[2]
(۴) اَرویٰؓ بنت عبدالمُطّلِب (طُلَیبؓ بن عُمیر کی والدہ اور حضورؐ کی پھوپھی)۔

بنی المُطّلِب میں سے : (۵) عُبَیدہؓ بن الحارث بن مُطّلِب

بنی عبدِ شمس بن عبدِ مناف میں سے : (۶) ابو حُذَیفہؓ بن عُتبہ بن رَبیعہ

---

[1] موالی جمع ہے مولیٰ کی۔ مولیٰ اس غلام کو کہتے تھے جسے اس کے مالک نے آزاد کر دیا ہو، مگر آزاد ہونے کے بعد بھی وہ اپنے سابق آقا سے وابستہ رہتا تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] خواتین کا ذکر ہم زیادہ تر ان کے شوہروں یا بیٹوں کے ساتھ کریں گے۔ البتہ کہیں کہیں ان کا ذکر اُن کے اپنے خاندان کی نسبت سے بھی کر دیں گے۔ (حاشیہ از مؤلف)

(۷) اُن کی بیوی سہلہؓ بنت سُہیل بن عمرو

بنی اُمیّہ میں سے: (۸) عثمانؓ بن عفّان

(۹) اُن کی والدہ اَروٰیؓ بنت کُریز

(۱۰) خالدؓ بن سعید بن العاص بن اُمیّہ (ابواُحیحہ ان کے باپ سعید کی کنیت تھی)

(۱۱) اُن کی بیوی اُمیمہؓ بنت خلف الخزاعیّہ (بعض نے اُن کا نام اُمینہ لکھا ہے)۔

(۱۲) اُمّ حبیبہؓ بنت ابی سفیان (پہلے عُبَیداللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں، بعد میں ان کو اُمّ المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا)۔

حلفائے بنی اُمیّہ میں سے: (۱۳) عبداللہؓ بن جحش بن رِیاب، (۱۴) ابواحمدؓ بن جحش، (۱۵) عبیداللہؓ بن جحش[1] — یہ بنی غنم بن دودان میں سے تھے حضورؐ کی پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے اور اُمّ المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی تھے۔

بنی تیم میں سے: (۱۶) اسماءؓ بنت ابی بکرؓ

(۱۷) اُمّ رومانؓ (حضرت ابوبکرؓ کی اہلیہ اور حضرت عائشہؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر کی والدہ)۔

(۱۸) طلحہؓ بن عبیداللہ

(۱۹) اُن کی والدہ صعبہؓ بنت الحضرمی

(۲۰) حارثؓ بن خالد

حلفائے بنی تیم میں سے: (۲۱) صُہیبؓ بن سنان الرّومی

بنی اَسد بن عبدالعزّیٰ میں سے: (۲۲) زبیرؓ بن العوّام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی)۔

(۲۳) خالدؓ بن حزام (حکیم بن حزام کے بھائی اور حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے)۔

(۲۴) اَسودؓ بن نوفل

(۲۵) عمروؓ بن اُمیّہ

بنی عبدالعزّیٰ بن قُصَیّ میں سے: (۲۶) یزیدؓ بن زمعہ بن الاسود

بنی زُہرہ میں سے: (۲۷) عبدالرحمٰنؓ بن عوف

(۲۸) اُن کی والدہ شفاءؓ بنت عوف۔

---

[1] اِس شخص نے اپنی بیوی حضرت اُمّ حبیبہؓ کے ساتھ حبش کی طرف ہجرت کی، پھر وہاں عیسائی ہو کر مر گیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

(۲۹) سعدؓ بن ابی وقاص (ابو وقاص کا اصل نام مالک بن اُہَیب تھا)

(۳۰) ان کے بھائی عُمیرؓ بن ابی وقاص

(۳۱) ان کے بھائی عامرؓ بن ابی وقاص

(۳۲) مُطّلبؓ بن اَزہر (عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے چچا زاد بھائی)۔

(۳۳) ان کی بیوی رَمْلَہؓ بنت ابی عوف سَہمِیّہ

(۳۴) طُلَیبؓ بن اَزہر

(۳۵) عبداللہؓ بن شہاب (یہ ننھیال کی طرف سے امام زُہری کے جد تھے)۔

حُلفائے بنی زُہرہ میں سے: (۳۶) عبداللہؓ بن مسعود (یہ قبیلہ ھُذَیل میں سے تھے اور مکہ میں بنی زُہرہ کے حلیف کی حیثیت سے رہتے تھے)۔

(۳۷) عُتبہؓ بن مسعود (برادر عبداللہؓ بن مسعود)

(۳۸) مِقدادؓ بن عَمرو الکِندی (اَسوَد بن عبد یَغُوث زُہری نے ان کو اپنا حلیف اور مُتبنّٰی بنا رکھا تھا)۔

(۳۹) خبّابؓ بن الاَرَتّ

(۴۰) شُرَحْبِیلؓ بن حَسَنَہ الکِندی

(۴۱) جابرؓ بن حَسَنہ (شُرحبیلؓ بن حسنہ کے بھائی)

(۴۲) جُنادہؓ بن حَسَنہ (" " ")

بنی عدی میں سے: (۴۳) سعیدؓ بن زید بن عَمرو بن نُفَیل (حضرت عمرؓ کے بہنوئی اور چچا زاد بھائی)۔

(۴۴) ان کی بیوی فاطمہؓ بنت الخطّاب (حضرت عمرؓ کی بہن)۔

(۴۵) زیدؓ بن الخطّاب (حضرت عمرؓ کے بڑے بھائی)

(۴۶) عامرؓ بن ربیعہ العَنْزی (حلیف بنی عدی۔ خطّاب نے ان کو بیٹا بنا رکھا تھا۔ ان کی کنیت ابو عبداللہ العنزی تھی)۔

(۴۷) ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حَثْمَہ

(۴۸) مَعْمَرؓ بن عبداللہ بن نَضْلہ

(۴۹) نُعَیمؓ بن عبداللہ النَّحّام

(۵۰) عَدِیؓ بن نَضْلَہ

(۵۱) عروہؓ بن ابی اثاثہ (عمرو بن العاص کے ماں جائے بھائی)۔

(۵۲) مسعودؓ بن سوید بن حارثہ بن نضلہ

حلفائے بنی عدی میں سے: (۵۳) واقدؓ بن عبداللہ (ان کو عمرؓ بن خطاب نے حلیف اور متبنّیٰ بنا رکھا تھا)۔

(۵۴) خالدؓ بن بکیر بن عبد یالیل اللیثی

(۵۵) ایاسؓ " "

(۵۶) عامرؓ " "

(۵۷) عاقلؓ " "

بنی عبدالدار میں سے: (۵۸) مصعبؓ بن عمیر

(۵۹) ابوالرومؓ بن عمیر (مصعبؓ بن عمیر کے بھائی)۔

(۶۰) فراسؓ بن النضر

(۶۱) جہمؓ بن قیس

بنی جمح میں سے: (۶۲) عثمانؓ بن مظعون

(۶۳) ان کے بھائی قدامہؓ بن مظعون

(۶۴) ان کے بھائی عبدؓاللہ بن مظعون

(۶۵) سائبؓ بن عثمانؓ بن مظعون

(۶۶) معمرؓ بن الحارث بن معمر

(۶۷) ان کے بھائی حاطبؓ بن الحارث

(۶۸) ان کی بیوی فاطمہؓ بنت مجلل العامریہ

(۶۹) معمرؓ کے بھائی حطابؓ بن الحارث

(۷۰) ان کی بیوی فکیہہؓ بنت یسار

(۷۱) سفیانؓ بن معمر

(۷۲) نبیہؓ بن عثمان

بنی سہم میں سے: (۷۳) عبدؓاللہ بن حذافہ

(۷۴) خنیسؓ بن حذافہ (حضرت عمرؓ کے داماد، ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پہلے شوہر)۔

(۷۵) ہشامؓ بن العاص بن وائل

(۷۶) حارثؓ بن قیس
(۷۷) ان کے بیٹے بشیرؓ بن حارث
(۷۸) ان کے دوسرے بیٹے معمرؓ بن حارث
(۷۹) قیسؓ بن حُذافہ (عبداللہؓ بن حذافہ کے بھائی)۔
(۸۰) ابو قیسؓ بن الحارث
(۸۱) عبداللہؓ بن الحارث
(۸۲) سائبؓ بن الحارث
(۸۳) حجاجؓ بن الحارث
(۸۴) بشرؓ بن الحارث
(۸۵) سعیدؓ بن الحارث

بنی سہم میں سے: (۸۶) عُمیرؓ بن رِئاب
(۸۷) مَحمیۃؓ بن الجَزْءِ (یہ حضرت عباسؓ کی بیوی اُمِّ الفضلؓ کے ماں جائے بھائی تھے)۔

بنی مخزوم میں سے: (۸۸) ابو سلمہ عبداللہؓ بن عبدالاسد (حضورؐ کے پھوپھی زاد اور رضاعی بھائی۔ امّ المومنین اُمّ سلمہؓ کے پہلے شوہر)۔
(۸۹) ان کی بیوی اُمّ سلمہؓ (یہ اور ان کے شوہر ابو سلمہؓ ابوجہل کے قریبی رشتہ دار تھے)۔
(۹۰) اَرقمؓ بن ابی الارقم (جن کے دارِ ارقم کا پہلے ذکر ہو چکا ہے)۔
(۹۱) عیاشؓ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی۔ حضرت خالدؓ بن ولید کے چچازاد بھائی)۔
(۹۲) ان کی بیوی اسماءؓ بنت سلامہ تمیمیہ
(۹۳) ولیدؓ بن ولید بن مُغیرہ
(۹۴) ہشامؓ بن ابی حُذیفہ
(۹۵) سلمہؓ بن ہشام
(۹۶) ہاشمؓ بن ابی حُذیفہ
(۹۷) ہبّارؓ بن سفیان
(۹۸) ان کے بھائی عبداللہؓ بن سفیان

حلفائے بنی مخزوم میں سے: (۹۹) یاسرؓ (عمارؓ بن یاسر کے والد)

(۱۰۰) عمارؓ بن یاسر

(۱۰۱) اُن کے بھائی عبداللہؓ بن یاسر

بنی عامر بن لؤی میں سے: (۱۰۲) ابو سبرہؓ بن ابی رُہم (حضورؐ کی پھوپھی بَرّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے)۔

(۱۰۳) ان کی بیوی اُمِّ کلثومؓ بنت سُہیل بن عمرو (ابو جندلؓ کی بہن)۔

(۱۰۴) عبداللہؓ بن سُہیل بن عمرو

(۱۰۵) حاطبؓ بن عمرو (سُہیل بن عمرو کے بھائی)

(۱۰۶) سَلیطؓ بن عمرو (سُہیل بن عمرو کے بھائی۔ اصابہ میں ان کو سُہیل بن عمرو کا بھتیجا لکھا ہے)۔

(۱۰۷) سَکرانؓ بن عمرو (سُہیل بن عمرو کے بھائی۔ یہ اُمّ المومنین حضرت سَودہؓ بنت زَمعہ کے پہلے شوہر تھے)۔

(۱۰۸) ان کی بیوی سَودہؓ بنت زَمعہ[1] (جو سکرانؓ کی وفات کے بعد اُمّ المومنین بنیں)۔

(۱۰۹) سَلیطؓ بن عمرو کی بیوی یَقَظہؓ بنت عَلقمہ (اصابہ میں اُمّ یقظہ لکھا ہے اور ابن سعد نے فاطمہ بنتِ عَلقمہ ان کا نام بتایا ہے)۔

(۱۱۰) مالکؓ بن زَمعہ (حضرت سَودہؓ کے بھائی)۔

(۱۱۱) ابن اُمِّ مکتومؓ

بنی فہر بن مالک میں سے: (۱۱۲) ابو عُبیدہؓ بن الجراح

(۱۱۳) سُہیلؓ بن بَیضاء

(۱۱۴) سعدؓ بن قیس

(۱۱۵) عمروؓ بن الحارث بن زُہیر

(۱۱۶) عثمانؓ بن عبد غَنم بن زُہیر (حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے پھوپھی زاد بھائی)۔

(۱۱۷) حارثؓ بن سعید

بنی عبد قُصیّ میں سے: (۱۱۸) طُلَیبؓ بن عُمَیر (حضورؐ کی پھوپھی اَروٰی بنت عبدالمطلب کے بیٹے)۔

یہ وہ لوگ تھے جو قریش کے بڑے بڑے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک اچھی خاصی تعداد موالی

---

[1] اس نام کا تلفظ زَمعہ بھی کیا گیا ہے اور زَمَعَہ بھی۔ (حاشیہ از مرتب)

غلاموں اور لونڈیوں کی بھی تھی جنہوں نے خفیہ دعوت کے اِن تین سالوں میں اسلام قبول کیا۔ ان کے نام یہ ہیں:-

(۱۹) اُمِّ اَیمنؓ بَرکہ بنتِ ثَعلبہ جنہوں نے بچپن سے حضورؐ کو گود میں پالا تھا۔

(۲۰) زِنّیرہؓ رُومیہ عَمرو بن المُؤمّل کی آزاد کردہ لونڈی۔

(۲۱) بلالؓ بن رَباح - یہ اُمیّہ بن خلف کے غلام تھے۔

(۲۲) اُن کی والدہ حَمامہؓ

(۲۳) ابُو فُکیہہؓ یَسار الجُہَنی صفوان بن اُمیّہ کے آزاد کردہ غلام۔

(۲۴) لُبَینہؓ، مُؤمّل بن حبیب کی لونڈی

(۲۵) اُمِّ عُبَیسؓ، بنی تیم بن مُرّہ یا بنی زُہرہ کی لونڈی (پہلا قول زُبیر بن بکّار کا ہے اور دوسرا بَلاذُری کا)۔

(۲۶) عامرؓ بن فُہَیرہ، طُفیل بن عبداللہ کے غلام

(۲۷) سُمَیّہؓ (حضرت عمّارؓ بن یاسر کی والدہ اور اَبُوحذیفہ بن مُغیرہ مخزومی کی لونڈی)۔

اِن کے علاوہ غیر قُریش میں سے جن لوگوں نے مکّہ کے اِس ابتدائی دَور میں اِسلام قبول کیا وہ یہ تھے:

(۲۸) مِحجَنؓ بن الاَدرع الاَسلَمی

(۲۹) مسعودؓ بن رَبیعہ بن عَمرو - یہ بنی الہُون بن خُزَیمہ کے قبیلۂ قارہ سے تھے۔

اِس طرح ابتدائی چار مسلمانوں کے ساتھ ان ۲۹ کے ملنے سے اُن لوگوں کی کُل تعداد ۳۳ بن جاتی ہے جو حضورؐ کی دعوتِ عام شروع ہونے سے پہلے آپؐ پر ایمان لاکر جماعتِ مُسلمین میں شامل ہو چکے تھے۔[1] یہ وہ صحیح الفکر اور سلیم الفطرت لوگ تھے جنہوں نے محض دلیل اور افہام وتفہیم سے شرک کی بُرائی کو سمجھا، توحید کی حقیقت کو مانا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسُول تسلیم کیا، قرآن کو کلامِ الٰہی کی حیثیت سے اپنے لیے سرچشمۂ ہدایت

---

[1] اَلاِستیعاب میں ابن عبدالبّر نے، اور اُسدُ الغابہ میں ابن اَثیر نے لکھا ہے: "کہا جاتا ہے کہ حضرت عباسؓ کی بیوی اُمُّ الفضلؓ پہلی عورت تھیں جو حضرت خدیجہؓ کے بعد مسلمان ہُوئیں"۔ یہ قول اگر صحیح ہے تو اس ابتدائی دَور کے مسلمانوں کی تعداد ۳۴ ہو جاتی ہے۔ ان خاتون کا اصل نام لُبابہ بنت الحارث تھا۔ یہ اُمُّ المومنین حضرت میمونہؓ کی بہن، حضرت خالدؓ بن ولید کی خالہ، اور حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی بیوی اسماء بنت عُمیس کی ماں جائی بہن تھیں۔ ہم نے فہرست میں ان کا نام اِس لیے درج نہیں کیا کہ "کہا جاتا ہے" کے کمزور الفاظ میں اسے بیان کیا گیا ہے۔

(حاشیہ از مؤلف)

قرار دیا، اور آخرت کی زندگی کو یقینی حقیقت سمجھا۔ اتنے مخلص اور دینی فہم رکھنے والے کارکن تیار کر لینے کے بعد حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے علی الاعلان دعوتِ اسلام کا کام شروع فرمایا۔ (۲۱)

حوالہ جات باب ۴

(۱) ـــــ رسائل و مسائل حصہ اول، ص ۲۹

(۲) ـــــ اضافہ از مؤلف

(۳) ـــــ تفہیم القرآن جلد ششم، دیباچہ سورۃ علق۔

(۴) ـــــ " " " " ، الم نشرح، حاشیہ ۲۔

(۵) ـــــ " " جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۸۳۔

(۶) ـــــ " " جلد ششم، دیباچہ سورۃ علق۔

(۷) ـــــ تفہیم القرآن جلد ششم، دیباچہ سورہ العلق۔

(۸) ـــــ رسائل و مسائل حصہ سوم، ص ۲۳۲۔

(۹) ـــــ " " حصہ سوم، ص ۲۲۹ تا ۲۳۲۔

(۱۰) ـــــ تفہیم القرآن، جلد سوم، القصص، حاشیہ ۱۰۹۔

(۱۱) ـــــ " " ، جلد ششم، دیباچہ سورۃ مدثر۔

(۱۲) ـــــ " " ، جلد ششم، العلق، حواشی ۱ تا ۴۔

(۱۳) ـــــ اضافہ از مؤلف

(۱۴) ـــــ تفہیم القرآن، جلد ششم، القدر، حاشیہ ۱

(۱۵) ـــــ اضافہ از مؤلف

(۱۶) ـــــ تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۃ مدثر

(۱۷) ـــــ اضافہ از مؤلف

(۱۸) ـــــ تفہیم القرآن، جلد ششم، القیامہ، حاشیہ ۱۱۔

(۱۹) ـــــ " " ، جلد ششم، الاعلیٰ، حاشیہ ۷۔

(۲۰) ـــــ " " ، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۹۱۔ جلد ششم، القیامہ، حاشیہ ۱۱۔ الاعلیٰ، حاشیہ ۷۔

(۲۱) ـــــ اضافہ از مؤلف

باب (۵)

دعوتِ حق کے لیے ہدایات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئیں

مخفیہ تبلیغ کے ابتدائی ۳ برسوں کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ اب دعوتِ عام کے دس سالہ مکی دور کی تاریخ بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی میں دو چیزیں اچھی طرح واضح کر دی جائیں جن سے بعد کے پیش آنے والے واقعات بہتر طور پر سمجھے جا سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کارِ رسالت انجام دینے کے لیے کیا ہدایات دی گئی تھیں جو اتنی کارگر تھیں کہ انہوں نے دلوں اور روحوں کو مسخر کر کے چھوڑا، دماغوں کی ٹیڑھ نکال کر چھوڑی، اور ایک اُجڈ قوم کو بدل کر رکھ دیا۔

دوسرے یہ کہ اسلامی دعوت کی حقیقی نوعیت کیا تھی جس کی وجہ سے آپؐ کے خلاف عداوت کا وہ طوفان اُٹھا جو عرب میں محض شرک سے انکار اور توحید کا اقرار کرنے والوں کے خلاف کبھی نہ اُٹھا تھا، مگر یہ دعوت کیسی زبردست قوت کے ساتھ پیش کی گئی تھی کہ اس نے جاہلیت کے علمبرداروں کو آخرکار بے بس کر دیا۔

اس باب میں ہم صرف پہلے موضوع سے بحث کریں گے اور دوسرے موضوع پر بعد کے باب اور اس کی فصلوں میں کلام کیا جائے گا۔

(۱)

ابتدائے دعوت کے متعلق اجمالی بیان

اللہ تعالیٰ نے عرب کے مشہور مرکزی شہر مکہ میں اپنے ایک بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا اور حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلے (قریش) سے دعوت کی ابتدا کریں۔ یہ کام شروع کرنے کے لیے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں۔

ایک، پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لیے کس طرح تیار کریں اور کس طرز

پر کام کریں۔

دوسرے، حقیقتِ نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں اُن غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو کہ دورِ پیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے اُن کا رویّہ غلط ہو رہا تھا۔

تیسرے، صحیح رویّہ کی طرف دعوت اور ہدایتِ الٰہی کے اُن بنیادی اصولِ اخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کے لیے فلاح و سعادت ہے۔

شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائے دعوت کی مناسبت سے چند چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل ہوتے تھے جن کی زبان نہایت شستہ، نہایت شیریں اور نہایت پُر اثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے ہوتی تھی، تاکہ دلوں میں یہ بول تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود اُن کے ترنم کی وجہ سے اُن کی طرف متوجہ ہوں اور زبانیں اِن کے حُسنِ تناسب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر انہیں دُہرانے لگیں پھر ان میں مقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان تو کی جا رہی تھیں عالمگیر صداقتیں، مگر ان کے لیے دلائل و شواہد اور مثالیں اُس قریب ترین ماحول سے لی گئی تھیں جس سے مخاطب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ اُنہی کی تاریخ، اُنہی کی روایات، اُنہی کے روز مرہ مشاہدے میں آنے والے آثار اور اُنہی کی اعتقادی و اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں پر ساری گفتگو تھی تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں۔

دعوت کا یہ ابتدائی مرحلہ تقریباً چار پانچ سال تک جاری رہا جن میں پہلے تین سال خفیہ دعوت کے تھے، اور اس مرحلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا ردِّ عمل تین صورتوں میں ظاہر ہُوا:

۱۔ چند صالح آدمی اِس دعوت کو قبول کر کے اُمّتِ مُسلِمہ بننے کے لیے تیار ہو گئے۔

۲۔ ایک کثیر تعداد جہالت یا خود غرضی کی بنا پر یا باپ دادا کے دین کی محبت کے باعث مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔

۳۔ مکّہ اور قُریش کی حُدود سے نکل کر اس نئی دعوت کی آواز نسبتاً زیادہ وسیع حلقے میں پہنچنے لگی۔

یہاں سے اِس دعوت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اِس مرحلے میں اسلام کی اِس تحریک اور پُرانی جاہلیت کے درمیان ایک سخت جاں گُسل کشمکش برپا ہُوئی جس کا سلسلہ آٹھ نو سال تک چلتا رہا۔ نہ صرف مکّے میں، نہ صرف قبیلۂ قُریش میں بلکہ عرب کے بیشتر حصّوں میں بھی جو لوگ پُرانی جاہلیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے وہ اس تحریک کو بزور مٹا دینے پر تُل گئے۔ انہوں نے اسے دبانے کے لیے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔ جھوٹا پروپگنڈا کیا، الزامات اور شبہات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کی، عوام الناس کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے اندازیاں کیں، ناواقف لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سُننے سے روکنے کی کوششیں کیں، اسلام قبول کرنے والوں پر نہایت وحشیانہ ظلم و ستم

ڈھاتے، ان کا معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کیا، اور ان کو اتنا تنگ کیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ دو دفعہ اپنے گھر چھوڑ کر حبش کی طرف ہجرت کر جانے پر مجبور ہوئے اور بالآخر تیسری مرتبہ ان سب کو مدینے کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ لیکن اس شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ مکّے میں کوئی خاندان اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس کے کسی نہ کسی فرد نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو۔ بیشتر مخالفینِ اسلام کی دشمنی میں شدت اور تلخی کی وجہ یہی تھی کہ اُن کے اپنے بھائی، بھتیجے، بیٹے، داماد، بیٹیاں، بہنیں اور بہنوئی دعوتِ اسلام کے نہ صرف پیرو بلکہ جان نثار حامی ہو گئے تھے اور ان کے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے ہی ان سے برسرِ پیکار ہونے کو تیار تھے۔ پھر لطف یہ ہے کہ جو لوگ پُرانی جاہلیت سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس نوخیز تحریک کی طرف آ رہے تھے وہ پہلے بھی اپنے معاشرے کے بہترین لوگ سمجھے جاتے تھے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے بعد وہ اتنے راست باز اور اتنے پاکیزہ اخلاق کے انسان بن جاتے تھے کہ دُنیا اُس دعوت کی برتری محسوس کیے بغیر رہ نہیں سکتی تھی جو ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور اُنہیں یہ کچھ بنا رہی تھی۔

اس طویل اور شدید کشمکش کے دوران میں اللہ تعالیٰ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت اپنے نبی پر ایسے پُرجوش خطبے نازل کرتا رہا جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تُند آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہلِ ایمان کو ان کے ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انہیں تقویٰ اور فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگیٔ سیرت کی تعلیم دی گئی، ان کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدوں اور جنّت کی بشارتوں سے ان کی ہمّت بندھائی گئی، انہیں صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے پر اُبھارا گیا اور فداکاری کا ایسا زبردست جوش اور ولولہ ان میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دوسری طرف مخالفین اور راہِ راست سے مُنہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والوں کو اُن قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے، اُن تباہ شُدہ بستیوں کے آثار سے عبرت دلائی گئی جن کے کھنڈروں پر سے شب و روز اپنے سفروں میں اُن کا گزر ہوتا تھا، توحید اور آخرت کی دلیلیں اُن کھلی کھلی نشانیوں سے دی گئیں جو رات دن زمین اور آسمان میں اُن کی آنکھوں کے سامنے نمایاں تھیں اور جن کو وہ خود اپنی زندگی میں بھی ہر وقت دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، شرک اور دعوائے خود مختاری اور انکارِ آخرت اور تقلیدِ آبائی کی غلطیاں ایسے بیّن دلائل سے واضح کی گئیں جو دل کو لگتے اور دماغ میں اُتر جانے والے تھے۔ پھر ان کے ایک ایک شبہ کو رفع کیا گیا، ایک ایک اعتراض کا معقول جواب دیا گیا، ایک ایک اُلجھن جس میں وہ خود پڑے ہوئے تھے یا دوسروں کو اُلجھانے کی کوشش کرتے تھے، صاف کی گئی، اور ہر طرف سے گھیر کر جاہلیت کو ایسا تنگ پکڑا گیا کہ عقل و خرد کی

دُنیا میں اُس کے لیے ٹھہرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ اس کے ساتھ پھر اُن کو خدا کے غضب اور قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے عذاب کا خوف دلایا گیا۔ اُن کے بُرے اخلاق اور غلط طرزِ زندگی اور جاہلانہ رُسوم اور حق دشمنی اور مومن آزاری پر انہیں ملامت کی گئی، اور اخلاق و تمدّن کے وہ بڑے بڑے بنیادی اصول ان کے سامنے پیش کیے گئے جن پر ہمیشہ سے خدا کی پسندیدہ صالح تہذیبوں کی تعمیر ہوتی چلی آرہی ہے۔

یہ مرحلہ بجائے خود مختلف منزلوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر منزل میں دعوت زیادہ وسیع ہوتی گئی، جدوجہد اور مزاحمت زیادہ سخت ہوتی گئی، مختلف عقائد اور مختلف طرزِ عمل رکھنے والے گروہوں سے سابقہ پیش آتا گیا اور اسی کے مطابق اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں مضامین کا تنوّع بڑھتا گیا۔ (۲)

دعوتِ اسلامی کے اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مفصل ہدایات دی گئیں اُن پر غور کرنے سے آدمی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکہ کے شدید مخالفانہ دَور میں کس عظیم اخلاقی طاقت نے اسلامی تبلیغ کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ صاف کیا اور کس مؤثر ترین تعلیم نے اس تبلیغ سے متاثر ہونے والوں کو خدا کی راہ میں ہر قوت سے ٹکرا جانے اور ہر مصیبت جھیل جانے پر آمادہ کر دیا۔ ذیل میں ہم ان ہدایات میں سے ایک ایک کو بیان کرتے ہیں۔

دعوت میں حکمت و موعظت کا لحاظ

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل آیت ۱۲۵)

"اے نبی، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔"

اس میں بتایا گیا ہے کہ دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہییں۔ ایک حکمت۔ دوسرے عمدہ نصیحت۔

حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے، پہلے اُس کے مرض کی تشخیص کی جائے، پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے۔ بُرائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے، بلکہ انسان کی فطرت میں اُن کے لیے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اُسے بھی اُبھارا جائے، اور اُن کے بُرے نتائج کا خوف دلایا جائے۔ ہدایت اور عملِ صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ اُن کی طرف رغبت اور

شوق بھی پیدا کیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے جس سے دلسوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اُسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے۔ بلکہ اُسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اُس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اُس کی بھلائی چاہتا ہے۔ بحث و گفتگو کی نوعیت مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصود حریف مقابل کو چپ کر دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو۔ اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو۔ معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اُتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گمراہی میں زیادہ دور نہ نکل جائے۔ (۳)

دعوتِ حق کے لیے ٹھنڈا اور سنجیدہ اسلوب

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۔ (بنی اسرائیل۔ ۵۳، ۵۴)

"اور اے محمدؐ، میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ تمہارا رب تمہارے حال سے زیادہ واقف ہے، وہ چاہے تو تم پر رحم کرے اور چاہے تو تمہیں عذاب دے دے۔ اور اے نبیؐ، ہم نے تم کو لوگوں پر حوالہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔"

یعنی اہل ایمان کفار اور مشرکین سے اور اپنے دین کے مخالفین سے گفتگو اور مباحثے میں تیز کلامی اور مبالغے اور غلو سے کام نہ لیں۔ مخالفین خواہ کیسی ہی ناگوار باتیں کریں مسلمانوں کو بہر حال نہ تو کوئی بات خلافِ حق زبان سے نکالنی چاہیے اور نہ غصے میں آپے سے باہر ہو کر بیہودگی کا جواب بیہودگی سے دینا چاہیے۔ انہیں ٹھنڈے دل سے وہی بات کہنی چاہیے جو جچی تلی ہو، برحق ہو اور اُن کی دعوت کے وقار کے مطابق ہو۔

اور جب کبھی تمہیں مخالفین کی بات کا جواب دیتے وقت غصے کی آگ اپنے اندر بھڑکتی محسوس ہو اور طبیعت بے اختیار جوش میں آتی نظر آئے تو فوراً یہ سمجھ لو کہ یہ شیطان ہے جو تمہیں اکسا رہا ہے تاکہ دعوتِ دین کا کام خراب ہو۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اپنے مخالفین کی طرح اصلاح کا کام چھوڑ کر اسی جھگڑے اور فساد میں لگ جاؤ جس میں وہ نوعِ انسانی کو مشغول رکھنا چاہتا ہے۔

اور اہلِ ایمان کی زبان پر کبھی ایسے دعوے بھی نہ آنے چاہییں کہ ہم جنتی ہیں اور فلاں شخص یا گروہ دوزخی ہے۔ اس کا فیصلہ تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ خود نبی کا کام صرف دعوت دینا ہے۔ لوگوں کی قسمتیں اُس کے ہاتھ میں نہیں دے دی گئی ہیں کہ وہ کسی کے حق میں رحمت کا اور کسی کے حق میں عذاب کا فیصلہ صادر کر دے۔ (۴)

داعی کا منصب اور اس کی ذمہ داری

• قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ۔ (الانعام-۱۰۴)

" دیکھو، تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں۔ اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا۔ میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں۔"

• میں تم پر پاسبان نہیں ہوں" یعنی میرا کام صرف اتنا ہے کہ اُس روشنی کو تمہارے سامنے پیش کر دوں جو تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے۔ اس کے بعد آنکھیں کھول کر دیکھنا یا نہ دیکھنا تمہارا اپنا کام ہے میرے سپرد یہ خدمت نہیں کی گئی ہے کہ جنہوں نے خود آنکھیں بند کر رکھی ہیں اُن کی آنکھیں زبردستی کھولوں اور جو کچھ وہ نہیں دیکھتے وہ انہیں دکھا کر ہی چھوڑوں۔ (۵)

اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ، لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ، وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكُوا، وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا، وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ۔

(الانعام: ۱۰۶-۱۰۷)

" اے نبیؐ! اُس وحی کی پیروی کیے جاؤ جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اُس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ یہ لوگ شرک نہ کریں) تو یہ شرک نہ کرتے۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو۔"

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمہیں ان کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کر دو اور اظہارِ حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کو نہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو، اور نہ تمہاری ذمہ داری و جواب دہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا کیا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے۔

اگر فی الواقع حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کرکے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمہارے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھا دی گئی ہے اُس کے اُجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو، اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں انہیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں، اور جو اسے قبول نہ کریں اُن کے پیچھے نہ پڑو، جس انجامِ بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مُصر ہیں اس کی طرف جانے کے لیے انہیں چھوڑ دو۔ (۶)

تبلیغ کا آسان طریقہ

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ‎۔ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ‎- (الاعلیٰ: ۸-۹)

"اور اے نبی! ہم تم کو آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں، پس نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو۔"

یعنی اے نبی! ہم تبلیغِ دین کے معاملہ میں تم کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے کہ تم بہروں کو سُناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ۔ بلکہ آسان طریقہ تمہارے لیے میسّر کیے دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ نصیحت کرو جہاں تمہیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کون اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے اور کون نہیں ہے؟ تو ظاہر ہے کہ اس کا پتہ تبلیغ عام ہی سے چل سکتا ہے۔ اس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے مگر اس سے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے بندوں میں سے اُن لوگوں کو تلاش کیا جائے جو اس سے فائدہ اُٹھا کر راہِ راست اختیار کرلیں۔ یہی لوگ تمہاری نگاہِ التفات کے مستحق ہیں اور انہی کی تعلیم و تربیت پر تمہیں توجہ صرف کرنی چاہیے۔ ان کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے جن کے متعلق تجربے سے تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی نصیحت قبول نہیں کرنا چاہتے۔ (۷)

تبلیغِ اسلام کے نقطۂ نظر سے اصل اہمیت کن لوگوں کی ہے

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ‎۔ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ‎۔ (الانعام-۵۲)

"اور اُسے نبی جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں انہیں اپنے سے دُور نہ پھینکو۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار اُن پر نہیں۔ پھر بھی تم انہیں دُور پھینکو گے تو ظالم ہو گے۔"

جو لوگ ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے تھے اُن میں بکثرت ایسے بھی تھے جو غریب یا محنت پیشہ تھے۔ قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جن بے شمار اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپ کے گرد و پیش ہماری قوم کے غلام، موالی اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اس شخص کو ساتھی بھی کیسے کیسے "معزز" لوگ ملے ہیں، بلالؓ، عمارؓ، صُہَیبؓ، خبابؓ۔ بس یہی لوگ اللہ کو ہمارے درمیان ایسے ملے ہیں جن کو برگزیدہ کیا جا سکتا تھا! پھر وہ ایمان لانے والوں کی خستہ حالی کا مذاق اُڑانے پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ان میں سے جس کسی سے کبھی کوئی اخلاقی کمزوری ایمان لانے سے پہلے ظاہر ہوئی تھی اس پر حرف گیریاں کرتے اور کہتے تھے کہ فلاں جو کل تک یہ تھا اور فلاں جس نے یہ کیا تھا آج وہ بھی اس "برگزیدہ گروہ" میں شامل ہے۔ چنانچہ اسی سُورہ انعام کی آیت ۵۳ میں اُن کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "کیا یہی ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہُوا ہے؟" انہی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ طالبِ حق بن کر تمہارے پاس آتے ہیں انہیں ان بڑے بڑے لوگوں کی خاطر اپنے سے دُور نہ پھینکو۔ اسلام لانے سے پہلے کوئی کسی غلطی کا مرتکب ہوا بھی تھا تو اس کی ذمہ داری تم پر تو عائد نہیں ہوتی۔ (۸)

حضرت ابنِ اُمِّ مکتوم کا واقعہ

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مکہ معظمہ کے چند بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضورؐ ان کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے[1]۔ اتنے میں ابنِ اُمِّ مکتوم نامی ایک نابینا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپؐ سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا۔ حضورؐ کو اُن کا

---

[1] حضورؐ کی مجلس میں جو لوگ اُس وقت بیٹھے تھے مختلف روایات میں اُن کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔ اس فہرست میں ہمیں عُتبہ، شَیبَہ، ابوجہل، اُمیّہ بن خَلَف، اُبَی بن خَلَف جیسے بدترین دشمنانِ اسلام کے نام ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا اور کشمکش اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپؐ کے ہاں اُن کی آمد و رفت اور آپ کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

یہ مداخلت ناگوار ہوئی اور آپؐ نے اُن سے بے رُخی برتی۔ اِس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سُورۂ عَبَسَ نازل ہُوئی:۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ۔ (آیات ۱-۲)

"وہ ترش رُو ہُوا اور بے رُخی برتی اِس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آگیا۔"

بظاہر کلام کے آغاز کا اندازِ بیان دیکھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ نابینا سے بے رُخی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرف توجہ کرنے کی بنا پر اِس سُورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن پُوری سُورت پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل عتاب کفارِ قریش کے اُن سرداروں پر کیا گیا ہے جو اپنے تکبر اور ہٹ دھرمی اور صداقت سے بے نیازی کی بنا پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ حق کو حقارت کے ساتھ رد کر رہے تھے، اور حضورؐ کو تبلیغ کا صحیح طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ اُس طریقے کی غلطی سمجھائی گئی ہے جو اپنی رسالت کے کام کی ابتدا میں آپؐ اختیار فرما رہے تھے۔ آپؐ کا ایک نابینا سے بے رُخی برتنا اور سردارانِ قریش کی طرف توجہ کرنا کچھ اِس بنا پر نہ تھا کہ آپؐ بڑے لوگوں کو معزز اور ایک بیچارے نابینا کو حقیر سمجھتے تھے، اور معاذ اللہ یہ کوئی کج خلقی آپؐ کے اندر پائی جاتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ بلکہ معاملہ کی اصل نوعیت یہ ہے کہ ایک داعی جب اپنی دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اس کا رُجحان اِس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے با اثر لوگ اس کی دعوت قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے، ورنہ عام بے اثر، معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔ قریب قریب یہی طرزِ عمل دعوت کی ابتدا میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا تھا جس کا محرک سراسر اخلاص اور دعوتِ حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تخیل۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اِس دعوت کے نقطۂ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالبِ حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر، یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اِس لیے آپؐ اسلام کی تعلیمات تو علی الاعلان سب کو سُنائیں، مگر آپؐ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبولِ حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپؐ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فروتر ہے کہ آپؐ اِسے اُن مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ اُن کو آپؐ کی نہیں بلکہ آپؐ کو اُن کی ضرورت ہے۔ اِسی سلسلے میں آگے فرمایا:

وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی ۔ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی ۔ وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ۔ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی وَھُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْہُ

تَذَکّٰی ۔ کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ ۔ (آیات ۳ تا ۱۲)

" اُسے نبیؐ تمہیں کیا خبر، شاید کہ وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو ؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمّہ داری ہے ؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے "۔

یہی وہ اصل نکتہ ہے جسے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تبلیغِ دین کے معاملہ میں اس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا اور اسی کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ابن اُمّ مکتوم کے ساتھ آپؐ کے طرزِ عمل پر گرفت فرمائی، پھر آپؐ کو بتایا کہ داعیِ حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیت کس چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہ ہونی چاہیے۔ ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صاف بتا رہی ہے کہ وُہ طالبِ حق ہے، اِس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کر کے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اِس لیے وہ راہِ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کا رویّہ صریحاً یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اُسے راہِ راست بتائی جائے۔ اِن دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا، بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر کے سُدھرنے کے لیے تیار ہے اور کون اِس متاعِ گراں مایہ کا سرے سے قدر دان ہی نہیں ہے۔ پہلی قسم کا آدمی خواہ اندھا ہو، لنگڑا ہو، لُولا ہو، فقیر بے نوا ہو، بظاہر دین کے فروغ میں کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو، بہرحال داعیِ حق کے لیے وہی قیمتی آدمی ہے۔ اُسی کی طرف اُسے توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ اس دعوت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی اِصلاح ہے، اور اِس شخص کا حال یہ بتا رہا ہے کہ اُسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کرے گا۔ رہا دوسری قسم کا آدمی تو خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی با اثر ہو، اس کے پیچھے پڑنے کی داعیِ حق کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اُس کی رَوِش علانیہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ سُدھرنا نہیں چاہتا، اِس لیے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صرف کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ وہ اگر نہ سُدھرنا چاہے تو نہ سُدھرے، نقصان اُس کا اپنا ہوگا، داعیِ حق پر اس کی کوئی ذمّہ داری نہیں۔

جن نابینا کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد مشہور صحابی حضرت ابن اُمّ مکتومؓ ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں اور حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں بیان کیا ہے کہ یہ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کی ماں اُمّ مکتوم اور حضرت خدیجہؓ کے والد خُویلد آپس میں بہن بھائی تھے۔ حضورؐ کے ساتھ ان کا یہ رشتہ

معلوم ہو جانے کے بعد اس شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپؐ نے اُن کو غریب یا کم حیثیت آدمی سمجھ کر اُن سے بے رُخی برتی اور بڑے آدمیوں کی طرف توجہ فرمائی تھی، کیونکہ یہ حضورؐ کے برادرِ نسبتی تھے، خاندانی آدمی تھے، کوئی گرے پڑے آدمی نہ تھے۔ اصل وجہ جس کی بنا پر آپؐ نے ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا، لفظ اَعمٰی (نابینا) سے معلوم ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی بے اعتنائی کے سبب کی حیثیت سے خود بیان فرما دیا ہے یعنی حضورؐ کا خیال یہ تھا کہ میں اِس وقت جن لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں اُن میں سے کوئی ایک آدمی بھی ہدایت پالے تو اسلام کی تقویت کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے۔ بخلاف اس کے ابنِ مکتومؓ ایک نابینا آدمی ہیں، اپنی معذوری کے باعث یہ اسلام کے لیے اُس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جس قدر ان سرداروں میں سے کوئی مسلمان ہو کر مفید ہو سکتا ہے، اِس لیے ان کو اس موقع پر گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، یہ جو کچھ سمجھنا یا معلوم کرنا چاہتے ہیں اُسے بعد میں کسی وقت بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ (۹)

حکمتِ تبلیغ

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ (العنکبوت۔ آیت ۴۶)

"اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے۔"

یعنی مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں، اور افہام و تفہیم کی سپرٹ میں ہونا چاہیے تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ مبلغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اُتار دے اور اسے راہِ راست پر لائے۔ اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیے جس کا مقصد اپنے مدِ مقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے، بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہیے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ نہ بڑھ جائے، اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفا یاب ہو جائے۔ یہ ہدایت اِس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہلِ کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے، مگر یہ اہلِ کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ تبلیغِ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے مثلاً:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ (النحل۔ آیت ۱۲۵)

"دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔"

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۔ (حٰم السجدہ۔ آیت ۳۴)

"بھلائی اور برائی یکساں نہیں ہیں (مخالفین کے حملوں کی) مدافعت ایسے طریقہ سے کرو جو بہترین ہو تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے گرمجوش دوست ہے۔"

ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ۔ (المومنون۔ آیت ۹۶)

"تم بدی کو اچھے ہی طریقہ سے دفع کرو۔ ہمیں معلوم ہے جو باتیں وہ (تمہارے خلاف) بناتے ہیں۔" (۱۰)

دعوتِ حق کے لیے صحیح طریق کار

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۔ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۔ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ، وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ ۔ (الاعراف۔ آیات ۱۹۹ تا ۲۰۲)

"اے نبیؐ، نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو، وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے (کہ ان کے لیے صحیح طریق کار کیا ہے)۔ رہے ان کے (یعنی شیاطین کے) بھائی بند، تو وہ انہیں ان کی کج روی میں کھینچے لیے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔"

ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نکات بتائے گئے ہیں اور مقصود صرف حضورؐ ہی کو تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ حضورؐ کے ذریعہ سے ان سب لوگوں کو یہی حکمت سکھانا ہے جو حضورؐ کے قائم مقام بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے اٹھیں۔ ان نکات کو سلسلہ وار دیکھنا چاہیے:

(۱) داعیِ حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خو، متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عامۃ الناس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رفقاء کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید

سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے۔ مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذا رسانی، اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے۔ سخت گیری، درشت خوئی، تلخ گفتاری اور منتقمانہ اشتعالِ طبع اس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے، بنتا نہیں ہے۔ اسی چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ "غضب اور رضا، دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں، جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں، جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔" اور اسی چیز کی ہدایت آپ ان لوگوں کو دیتے تھے جنہیں آپ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے کہ بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا وَيَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا یعنی "جہاں تم جاؤ وہاں تمہاری آمد لوگوں کے لیے مژدۂ جانفزا ہو نہ کہ باعثِ نفرت، اور لوگوں کے لیے تم سہولت کے موجب بنو نہ کہ تنگی و سختی کے۔" اور اسی چیز کی تعریف اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ یعنی "یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم ہو ورنہ اگر تم درشت خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔" (آل عمران، ۱۵۹)

(۲) دعوتِ حق کی کامیابی کا گُر یہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معروف یعنی ان سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے جنہیں بالعموم سارے ہی انسان جانتے ہیں یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقلِ عام (Common Sense) کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس طرح داعیِ حق کی اپیل عوام و خواص سب کو متاثر کرتی ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ آپ نکال لیتی ہے۔ ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش برپا کرتے ہیں وہ خود اپنی ناکامی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ عام انسان، خواہ وہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر رہے ہیں تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفینِ حق سے پھرتے اور داعیِ حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ آخرکار میدانِ مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے ذاتی مفاد نظامِ باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہوں، یا پھر جن کے دلوں میں تقلیدِ اسلاف اور جاہلانہ تعصبات نے کسی روشنی کے قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہ چھوڑی ہو۔ یہی وہ حکمت تھی جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر آپ کے بعد تھوڑی ہی مدت میں اسلام کا سیلاب قریب کے ملکوں پر اس طرح پھیل گیا کہ کہیں ... فی صدی اور کہیں

۸۰ اور ۹۰ فی صدی باشندے مسلمان ہو گئے۔

(۳) اس دعوت کے کام میں یہ بات قطعی ضروری ہے کہ طالبینِ خیر کو معروف کی تلقین کی جائے اتنی ہی یہ بات بھی ضروری ہے کہ جاہلوں سے نہ الجھا جائے خواہ وہ الجھنے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ داعی کو اس معاملہ میں سخت محتاط ہونا چاہیے کہ اس کا خطاب صرف اُن لوگوں سے رہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔ اور جب کوئی شخص جہالت پر اتر آئے اور حجت بازی، جھگڑالو پن اور طعن و تشنیع شروع کر دے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس جھگڑے میں الجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعتِ دعوت اور اصلاحِ نفوس میں خرچ ہونا چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہو جاتی ہے۔

(۴) اوپر نمبر ۳ میں جو ہدایت دی گئی ہے اسی کے سلسلہ میں مزید ہدایت یہ ہے کہ جب کبھی داعیِ حق مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضات و الزامات پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ نزغِ شیطانی (یعنی شیطان کی اُکساہٹ) ہے اور اسی وقت اُسے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں بہکنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اُس سے دعوتِ حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ دعوتِ حق کا کام بہرحال ٹھنڈے دل ہی سے ہو سکتا ہے اور وہی قدم صحیح اٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر، خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے۔ لیکن شیطان، جو اس کام کو فروغ پاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا، ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعیِ حق پر طرح طرح کے حملے کرائے اور پھر ہر حملے پر داعیِ حق کو اُکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ملنا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے، اکثر بڑی بڑی پُرفریب تاویلوں اور مذہبی اصطلاحوں کے غلاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے، لیکن اس کی تہ میں بجز نفسانیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے آخری دو آیتوں میں فرمایا کہ جو لوگ متقی (یعنی خدا ترس اور بدی سے بچنے کے خواہشمند) ہیں وہ تو اپنے نفس میں کسی شیطانی تحریک کا اثر اور کسی بُرے خیال کی کھٹک محسوس کرتے ہی فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آجاتا ہے کہ اس موقع پر دعوتِ دین کا مفاد کس طرزِ عمل کے اختیار کرنے میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے کام میں نفسانیت کی لاگ لگی ہوئی ہے اور اس وجہ سے جن کا شیاطین کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق ہے، تو وہ شیطانی تحریک کے مقابلہ میں نہیں ٹھیر سکتے اور اس سے مغلوب ہو کر غلط راہ پر چل نکلتے ہیں۔ پھر جس جس وادی میں شیطان چاہتا ہے انہیں لیے پھرتا ہے اور کہیں جا کر ان کے قدم نہیں رکتے۔ مخالف کی ہر گالی کے جواب میں ان کے پاس ایک گالی اور ہر چال کے جواب میں اس سے بڑھ کر ایک چال موجود ہوتی ہے۔

اِس ارشاد کا ایک عمومی محل بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اہلِ تقویٰ کا طریقہ بالعموم اپنی زندگی میں غیر متقی لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ جو لوگ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ بُرائی سے بچیں اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ بُرے خیال کا ایک ذرا سا غبار بھی اُن کے دل کو چھو جاتا ہے تو اُنہیں ویسی ہی کھٹک محسوس ہونے لگتی ہے جیسی کھٹک اُنگلی میں پھانس چُبھ جانے یا آنکھ میں کسی تنکے کے گر جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بُرے خیالات، بُری خواہشات اور بُری نیتوں کے خوگر نہیں ہوتے، اِس وجہ سے یہ چیزیں اُن کے لیے اُسی طرح خلافِ مزاج ہوتی ہیں جس طرح اُنگلی کے لیے پھانس، یا آنکھ کے لیے ذرّہ، یا ایک نفیس طبع اور صفائی پسند آدمی کے لیے کپڑوں پر سیاہی کا ایک داغ یا گندگی کی ایک چھینٹ۔ پھر جب یہ کھٹک انہیں محسوس ہو جاتی ہے تو اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کا ضمیر بیدار ہو کر اس غبار کو اپنے اُوپر سے جھاڑ دینے میں لگ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ نہ خدا سے ڈرتے ہیں، نہ بدی سے بچنا چاہتے ہیں، اور جن کی شیطان سے لاگ لگی ہوئی ہوتی ہے اُن کے نفس میں بُرے خیالات، بُرے ارادے، بُرے مقاصد پکتے رہتے ہیں اور وہ ان گندی چیزوں سے کوئی اُوپراہٹ اپنے اندر محسوس نہیں کرتے، بالکل اُسی طرح جیسے کسی دیگچی میں سؤر کا گوشت پک رہا ہو اور وہ بے خبر ہو کہ اس کے اندر کیا پک رہا ہے، یا جیسے کسی بھنگی کا جسم اور اس کے کپڑے غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہوں اور اسے کچھ احساس نہ ہو کہ وہ کن چیزوں میں آلودہ ہے۔ (۱۱)

سخت مخالفانہ ماحول میں دعوت الی اللہ

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

(حٰمٓ السجدہ: آیت ۳۳)

"اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔"

اس سے پہلے کی آیات میں اہلِ ایمان کو تسکین دی گئی تھی اور ان کی ہمّت بندھائی گئی تھی۔ اُس کے بعد اِن آیات میں اُن کو اس اصل کام کی طرف رغبت دلائی گئی ہے جس کے لیے وہ مسلمان ہوئے تھے۔ پچھلی آیات میں اُن کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنت کا مستحق بناتی ہے۔ اب اُن کو بتایا جا رہا ہے کہ آگے کا درجہ، جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں۔ اس ارشاد کی

پوری اہمیت سمجھنے کے لیے اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اسے یکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اُسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لیے زبان کھولی اُس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ ان حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اس سے نہ ہٹنا بلاشبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اٹھ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں، اور نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خلق خدا کو دعوت دے، اور اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔ (۱۴)

بدی کا مقابلہ بہترین نیکی سے کرنا

آگے چل کر فرمایا:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۔ (آیت ۳۴)

"اے نبیؐ! نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔"

اِس ارشاد کی پوری معنویت سمجھنے کے لیے بھی وہ حالات نگاہ میں رہنے چاہییں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور آپؐ کے واسطے سے آپ کے پیروؤں کو، یہ ہدایت دی گئی تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ دعوتِ حق کا مقابلہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخت جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا۔ ہر طرح کے ہتھکنڈے آپؐ کو بدنام کرنے اور آپؐ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے الزامات آپؐ پر چسپاں کیے جا رہے تھے۔ اور مخالفانہ پروپیگنڈا کرنے والوں کی ایک فوج کی فوج آپؐ کے خلاف دلوں میں وسوسے ڈالتی پھر رہی تھی۔ ہر قسم کی اذیتیں آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں، جن سے تنگ آ کر مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پھر آپؐ کی تبلیغ کو روک دینے کے لیے پروگرام یہ بنایا گیا تھا کہ ہُلّڑ مچانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپؐ کی تاک میں لگا رہے اور جب بھی آپؐ دعوتِ حق کے لیے زبان کھولیں، اتنا شور برپا کر دیا جائے کہ کوئی آپؐ کی بات نہ سن سکے۔ یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے۔ اُس وقت مخالفتوں کا زور توڑنے کے لیے یہ نسخہ حضورؐ کو بتایا گیا۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ یعنی بظاہر تمہارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوفناک طوفان اُٹھا لائے ہوں جس کے مقابلے میں نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہو، لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر وہ کمزوری رکھتی ہے جو آخرکار اس کا بھٹہ بٹھا دیتی ہے کیونکہ انسان جب تک انسان ہے اُس کی فطرت بدی سے نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بدی کے ساتھی ہی نہیں، خود اُس کے علمبردار تک اپنے دلوں میں جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، ظالم ہیں، اور اپنی اغراض کے لیے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ یہ چیز دوسروں کے دلوں میں اُن کا وقار پیدا کرنا تو درکنار، انہیں خود اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور اُن کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت اُن کے عزم و ہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے۔ اس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس نظر آتی ہے، مسلسل کام کرتی چلی جائے، تو آخرکار وہ غالب آکر رہتی ہے کیونکہ اوّل تو نیکی میں بجائے خود ایک طاقت ہے جو دلوں کو مسخر کرتی ہے، اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اپنے دل میں اُس کی قدر محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروفِ پیکار ہوں اور کھل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہو کر منظرِ عام پر آئیں، تو ایسی حالت میں ایک مدت کی کش مکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفر اور نیکی کے گرویدہ نہ ہو جائیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں بلکہ اُس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمہارے ساتھ بُرائی کرے اور تم اس کو معاف کر دو، یہ محض نیکی ہے۔ اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے بُرا سلوک کرے تم موقع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔

اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخرکار جگری دوست بن جائے گا، اس لیے کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں، بے شک یہ ایک نیکی ہو گی، مگر گالی دینے والے کی زبان بند نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر آپ گالی کے جواب میں دعائے خیر کریں تو بڑے سے بڑا بے حیا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا اور مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بدکلامی کے لیے کھل سکے گی۔ کوئی شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیتا ہو اور آپ اس کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر اور زیادہ دلیر ہو جائے۔ لیکن اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو اور آپ اسے بچا لیں تو وہ آپ کے قدموں میں آ رہے گا، کیونکہ کوئی شرارت مشکل ہی سے اس نیکی کے مقابلے میں کھڑی رہ سکتی ہے۔ تاہم اس قاعدۂ کلیہ کو اس معنی میں لینا درست نہیں ہے کہ اس اعلیٰ درجے کی نیکی سے لازماً ہر دشمن جگری دوست ہی بن جائے گا۔ دُنیا میں ایسے خبیث النفس لوگ بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان کی زیادتیوں سے درگزر کرنے اور ان کی بُرائی کا جواب بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں، ان کے نیشِ عقرب کا زہر ذرہ برابر بھی

کم نہیں ہوتا لیکن اس طرح کے شرِ مجسم انسان قریب قریب اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیرِ مجسم انسان کمیاب ہیں۔ (۱۳)

دعوتِ حق میں صبر کی اہمیت

پھر ارشاد ہوا:

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (آیت ۳۵)

"یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر اُن لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔"

یعنی یہ نسخہ ہے تو بڑا کارگر، مگر اسے استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے اس کے لیے بڑا عزم، بڑا حوصلہ، بڑی قوتِ برداشت اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے۔ وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلے میں بڑی نیکی برت سکتا ہے، یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن جہاں کسی شخص کو سالہا سال تک اُن باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اخلاق کی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کرتے ہوں، اور پھر طاقت اور اختیارات کے نشے میں بھی بدمست ہو رہے ہوں، وہاں بدی کا مقابلہ نیکی سے اور بدتر بدی کا بھی اعلیٰ درجے کی نیکی سے کرتے چلے جانا، اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو ٹھنڈے دل سے حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہو، جس نے پوری طرح اپنے نفس کو عقل و شعور کے تابع کر لیا ہو، جس کے اندر نیکی و راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہو کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اسے اس کے مقام بلند سے نیچے اتار لانے اور بے صبر کر دینے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔

اور یہ جو فرمایا کہ "یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں"، تو یہ قانونِ فطرت ہے۔ بڑے ہی بلند مرتبے کا انسان ان صفات سے متصف ہوا کرتا ہے، اور جو شخص یہ صفات رکھتا ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ گھٹیا درجے کے لوگ اپنی کمینہ چالوں، ذلیل ہتھکنڈوں، اور رکیک حرکتوں سے اس کو شکست دے دیں۔ (۱۴)

شیطان کی اشتعال انگیزی سے خدا کی پناہ

آخر میں فرمایا:

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (آیت ۳۶)

"اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو۔"

شیطان کو سخت تشویش لاحق ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں کمینگی کا مقابلہ شرافت کے ساتھ اور بدی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک ہی مرتبہ سہی حق کے لیے لڑنے والوں اور خصوصاً ان کے سربرآوردہ لوگوں، اور سب سے بڑھ کر ان کے رہنما سے کوئی ایسی غلطی کروا دے جس کی بنا پر عامۃ الناس سے یہ کہا جا سکے کہ دیکھیے صاحب، برائی یک طرفہ نہیں ہے، ایک طرف سے اگر گھٹیا حرکتیں کی جا رہی ہیں تو دوسری طرف کے لوگ بھی کچھ بہت اونچے درجے کے انسان نہیں ہیں، فلاں رکیک حرکت تو آخر انہوں نے بھی کی ہے۔ عامۃ الناس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ٹھیک انصاف کے ساتھ ایک طرف کی زیادتیوں اور دوسری طرف کی جوابی کارروائی کے درمیان موازنہ کر سکیں۔ وہ جب تک یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ مخالفین ہر طرح کی ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں، مگر یہ لوگ شائستگی و شرافت اور نیکی و راستبازی کے راستے سے ذرا نہیں ہٹتے، اس وقت تک وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں ان کی طرف سے کوئی بے جا حرکت، یا ان کے مرتبے سے گری ہوئی کوئی حرکت سرزد ہو جائے، خواہ وہ کسی بہت ہی بڑی زیادتی کے جواب ہی میں کیوں نہ ہو، تو ان کی نگاہ میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی ایک سخت بات کا جواب ہزار گالیوں سے دینے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ شیطان کے فریب سے چوکنے رہو۔ وہ بڑا دردمند اور خیر خواہ بن کر تمہیں اشتعال دلائے گا کہ فلاں زیادتی تو ہرگز برداشت نہ کی جانی چاہیے، اور فلاں بات کا تو منہ توڑ جواب دیا جانا چاہیے، اور اس حملے کے جواب میں تو لڑ جانا چاہیے، ورنہ تمہیں بزدل سمجھا جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ایسے ہر موقع پر جب تمہیں اپنے اندر اس طرح کا کوئی نامناسب اشتعال محسوس ہو تو خبردار ہو جاؤ کہ یہ شیطان کا اکساوا ہے جو غصہ دلا کر تم سے کوئی غلطی کرانا چاہتا ہے۔ اور خبردار ہو جانے کے بعد اس زعم میں نہ مبتلا ہو جاؤ کہ میں اپنے مزاج پر بڑا قابو رکھتا ہوں، شیطان مجھ سے کوئی غلطی نہیں کرا سکتا۔ یہ اپنی قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی کا زعم شیطان کا دوسرا اور زیادہ خطرناک فریب ہوگا۔ اس کے بجائے تم کو خدا سے پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی توفیق دے اور حفاظت کرے تو آدمی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔

اس مقام کی بہترین تفسیر وہ واقعہ ہے جو امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ حضرت ابوبکرؓ خاموشی کے ساتھ اس کی گالیاں سنتے رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ کر مسکراتے رہے۔ آخر کار جناب صدیقؓ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے بھی جواب میں ایک سخت بات کہہ دی۔ اُن کی زبان سے وہ بات نکلتے ہی حضورؐ پر شدید انقباض طاری ہوا جو چہرۂ مبارک پر نمایاں ہونے لگا اور آپ فوراً اٹھ کر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی اٹھ کر آپ کے پیچھے ہو لیے اور راستے میں عرض کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے، وہ مجھے گالیاں دیتا

رہا اور آپ خاموش مسکراتے رہے، مگر جب میں نے اُسے جواب دیا تو آپ ناراض ہو گئے، فرمایا: جب تک تم خاموش تھے، ایک فرشتہ تمہارے ساتھ رہا اور تمہاری طرف سے اُس کو جواب دیتا رہا، مگر جب تم بول پڑے تو فرشتے کی جگہ شیطان آ گیا، میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔" (۱۵)

داعیِ حق کا اپنے کام میں بے غرض ہونا

دعوتِ حق میں داعی کا ہر ذاتی غرض سے پاک ہونا اُس کے مخلص اور راستباز ہونے کی ایک نہایت اہم اور صریح دلیل ہے۔ قرآن پاک میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ نبی دعوت الی اللہ کا جو کام کر رہا ہے اس سے خود اس کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہے، بلکہ وہ صرف خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے اس کام میں اپنی جان کھپا رہا ہے۔ سورۂ انعام میں فرمایا:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰي لِلْعٰلَمِيْنَ (آیت ۹۰)

"اے نبی! کہہ دو کہ میں اس (تبلیغ و ہدایت کے کام) پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دُنیا والوں کے لیے۔"

سورۂ یوسف میں فرمایا:

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (آیت ۱۰۴)

"اور اے نبی! تم اس کام پر ان سے کوئی اجر نہیں مانگ رہے ہو، یہ تو ایک نصیحت ہے جو دُنیا والوں کے لیے عام ہے۔"

اس خطاب کا رُخ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، مگر اصل مخاطب کفار کا مجمع ہے اور اُس کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اللہ کے بندو! غور کرو، تمہاری یہ ہٹ دھرمی کس قدر بے جا ہے۔ اگر پیغمبر نے اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے دعوت و تبلیغ کا یہ کام جاری کیا ہوتا، یا اُس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی چاہا ہوتا تو بے شک تمہارے لیے یہ کہنے کا موقع تھا کہ ہم اس مطلبی آدمی کی بات کیوں مانیں۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ یہ شخص بے غرض ہے، تمہاری اور دُنیا بھر کی بھلائی کے لیے نصیحت کر رہا ہے اور اس میں اُس کا اپنا کوئی مفاد پوشیدہ نہیں ہے۔ پھر اُس کا مقابلہ اس ہٹ دھرمی کے ساتھ کرنے میں آخر کیا معقولیت ہے؟ جو انسان سب کے بھلے کے لیے ایک بات بے غرضی کے ساتھ پیش کرے اس سے کسی کو خواہ مخواہ کیوں ضد ہو؟ کھلے دل سے اس کی بات سنو، دل کو لگتی ہو تو مانو، نہ لگتی ہو تو نہ مانو۔ (۱۴)

سورۂ مومنون میں فرمایا:

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ڰ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ - (آیت ۷۲)

"اے نبی، کیا تم اُن سے کچھ مانگ رہے ہو؟ تمہارے لیے تمہارے رب کا دیا ہی بہتر ہے اور وہ بہترین رازق ہے۔"

یعنی کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ آپ پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ آپ یہ سارے پاپڑ اس لیے بیل رہے ہیں کہ کوئی نفسانی غرض آپ کے پیشِ نظر ہے۔ اچھی خاصی تجارت چمک رہی تھی، اب افلاس میں مبتلا ہو گئے۔ قوم میں عزّت کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ ہر شخص ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا۔ اب گالیاں اور پتھر کھا رہے ہیں، بلکہ جان تک کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ چین سے اپنے بیوی بچوں میں ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے، اب ایک ایسی سخت کشمکش میں پڑ گئے ہیں جو کسی دم قرار نہیں لینے دیتی۔ اس پر مزید یہ کہ بات وہ لے کر اُٹھے ہیں جس کی بدولت سارا ملک دشمن ہو گیا ہے، حتیٰ کہ خود اپنے ہی بھائی بند خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک خود غرض آدمی کے کرنے کا کام ہے؟ خود غرض آدمی اپنی قوم اور قبیلے کے تعصبات کا علمبردار بن کر جوڑ توڑ سے سرداری حاصل کرنے کی کوشش کرتا، نہ کہ وہ بات لے کر اُٹھتا جو صرف یہی نہیں کہ تمام قومی تعصبات کے خلاف ایک چیلنج ہے، بلکہ سرے سے اُس چیز کی جڑ ہی کاٹے دے رہی ہے جس پر مشرکین عرب میں اُس کے قبیلے (قریش) کی چودھراہٹ قائم ہے۔ (۱۷)

سُورۂ سبا میں فرمایا:

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ـ (آیت ۴۷)

"اے نبی، کہو کہ اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تمہارے ہی لیے ہے۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمّہ ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔"

پہلے فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تم ہی کو مبارک رہے۔ دوسرے یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تمہاری اپنی بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ الزام لگانے والے جو چاہیں الزام لگاتے رہیں، مگر اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ گواہ ہے کہ میں ایک بے غرض انسان ہوں، یہ کام اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔ (۱۸)

سُورۂ صٓ میں فرمایا:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ـ (آیت ۸۶)

"اے نبی، کہہ دو کہ میں تم سے کسی قسم کا اجر نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹی آدمیوں میں سے ہوں۔"

یعنی میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے جھوٹے دعوے لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے

ہیں اور وہ کچھ بن بیٹھتے ہیں جو وہ نہیں ہوتے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے محض کفارِ مکہ کی اطلاع کے لیے نہیں کہوائی گئی ہے، بلکہ اس کے پیچھے حضورؐ کی وہ پوری زندگی شہادت کے طور پر موجود ہے جو نبوت سے پہلے انہی کفار کے درمیان چالیس برس تک گزر چکی تھی۔ سکے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بناوٹی آدمی نہیں ہیں۔ پوری قوم میں کسی شخص نے کبھی ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ سُنی تھی جس سے یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہوتی کہ وہ کچھ بننا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ (۱۹)

سُورۂ طُور اور سُورۂ القلم میں فرمایا:

اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (طور، آیت ۴۰، القلم، آیت ۴۶)۔

"اے نبیؐ، کیا تم ان سے کوئی اجر مانگ رہے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں؟"

سوال کا اصل رُخ حضورؐ کی طرف نہیں بلکہ کفار کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر رسول تم سے کوئی غرض رکھتا اور اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے یہ ساری دوڑ دھوپ کر رہا ہوتا تو اس سے تمہارے بھاگنے کی کم از کم ایک معقول وجہ تو ہوتی۔ مگر تم خود جانتے ہو کہ وہ اپنی اس دعوت میں بالکل بے غرض ہے اور محض تمہاری بھلائی کے لیے اپنی جان کھپا رہا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم اس کی بات ٹھنڈے دل سے سُننے تک کے روادار نہیں ہو؟ اس سوال میں ایک لطیف تعریض بھی ہے۔ ساری دُنیا کے بناوٹی پیشواؤں اور مذہبی آستانوں کے مجاوروں کی طرح عرب میں بھی مشرکین کے پیشوا اور پنڈت اور پروہت کھلا کھلا مذہبی کاروبار چلا رہے تھے۔ اس پر یہ سوال ان کے سامنے رکھ دیا گیا کہ ایک طرف یہ مذہب کے تاجر ہیں جو علانیہ تم سے نذریں اور نیازیں اور ہر مذہبی خدمت کی اُجرتیں طلب کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص کامل بے غرضی کے ساتھ، بلکہ اپنے تجارتی کاروبار کو برباد کر کے تمہیں نہایت معقول دلائل سے دین کا سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب یہ صریح بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم اس سے بھاگتے اور اُن کی طرف دوڑتے ہو؟ (۲۰)

اس سلسلے میں صرف ایک آیت ایسی ہے جس کے بارے میں کچھ بحث پیدا ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (الشوریٰ۔ آیت ۲۳)

"اے نبی، کہو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا بجز قرابت کی محبت کے۔"

اس آیت میں لفظ قُربیٰ جو استعمال ہوا ہے اس کے معنی میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف ہو گیا ہے۔ ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنی میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی اہلِ قریش) کم از کم اُس رشتہ داری کا

تو لحاظ کرو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تُل گئے ہو۔" یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے حوالہ سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور ابن سعد وغیرہم نے نقل کیا ہے، اور یہی تفسیر مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سُدّی، ابو مالک، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ضحاک، عطاء بن دینار اور دوسرے اکابر مفسرین نے بھی بیان کی ہے۔

دوسرا گروہ "قُربیٰ" کو قُرب اور تقرّب کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر اللہ کے قُرب کی چاہت پیدا ہو جائے۔" یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ، بس یہی میرا اجر ہے۔ یہ تفسیر حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے، اور ایک قول قتادہ سے بھی اس کی تائید میں نقل ہوا ہے، بلکہ طبرانی کی ایک روایت میں ابن عباسؓ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہی مضمون ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (الفرقان۔ ۵۷)

"ان سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔"

تیسرا گروہ "قُربیٰ" کو اقارب (رشتہ داروں) کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبت کرو۔" پھر اس گروہ کے بعض حضرات اقارب سے تمام بنی عبدالمطلب مراد لیتے ہیں، اور بعض اسے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر سعید بن جُبَیر اور عَمرو بن شُعَیب سے منقول ہے، اور بعض روایات میں یہی تفسیر ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ بن حسین (زین العابدین) کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن متعدد وجوہ سے یہ تفسیر کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو جس وقت مکہ معظمہ میں سورۂ شوریٰ نازل ہوئی ہے اُس وقت حضرت علیؓ و فاطمہؓ کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اولاد کا کیا سوال۔ اور بنی عبدالمطلب میں سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، بلکہ اُن میں سے بعض کھُلّم کھُلّا دشمنوں کے ساتھی تھے، اور ابولہب کی عداوت کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمطلب ہی نہ تھے۔ آپؐ کی والدۂ ماجدہ، آپؐ کے والد ماجد اور آپؐ کی زوجۂ محترمہ کے واسطے سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپؐ کی رشتہ داریاں تھیں۔ اور ان سب گھرانوں میں آپؐ کے بہترین صحابی بھی تھے اور بدترین دشمن بھی۔ آخر حضورؐ کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان سب اقرباء میں سے آپؐ صرف بنی عبدالمطلب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس

مطالبۂ محبّت کو اُنہی کے لیے مخصوص رکھتے۔ تیسری بات، جو اِن سب سے زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ ایک نبی جیسی بلند مقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے، اُس مقام سے اِس کارِ عظیم پر یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہوگی اور نبیؐ نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہوگی۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصّے آئے ہیں اُن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی اُٹھ کر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ رب العٰلمین کے ذمّہ ہے (یُونس ۷۲۔ ہود ۲۹-۵۱۔ الشعراء ۱۰۹-۱۲۷-۱۴۵-۱۶۴-۱۸۰)۔ سورۂ یٰسین میں نبی کی صداقت جانچنے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے (آیت ۲۱)۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے قرآن پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں جیسا کہ اوپر ہم نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع ہے کہ میں اللہ کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں اس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ پھر یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اِس تقریر کے مخاطب اہلِ ایمان نہیں بلکہ کفّار ہیں۔ اوپر سے ساری تقریر اُنہی سے خطاب کرتے ہوئے ہوتی چلی آ رہی ہے، اور آگے بھی روئے سخن اُنہی کی طرف ہے۔ اِس سلسلۂ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا آخر سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اجر تو اُن لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اُس کام کی کوئی قدر ہو جو کسی شخص نے اُن کے لیے انجام دیا ہو۔ کفّار حضورؐ کے اِس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپ اُن سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمہاری انجام دی ہے اس پر تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرنا۔ وہ تو اُلٹا اسے جُرم سمجھ رہے تھے اور اُس کی بنا پر آپ کی جان کے درپے تھے۔ (۲۱)

آغازِ دعوت میں عقیدۂ آخرت پر زیادہ زور دینا

مکّہ معظّمہ میں جب اوّل اوّل رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسری یہ کہ آپؐ کو اللہ نے اپنا رسُول مقرر کیا ہے۔ تیسری یہ کہ اِس دُنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں تمام اوّلین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اُسی جسم کے ساتھ اُٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انہوں نے دُنیا میں کام کیا تھا، پھر اُن کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا اور اِس محاسبہ میں جو لوگ مومن و صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں جائیں گے اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔

ان میں سے پہلی بات اگرچہ اہلِ مکّہ کو سخت ناگوار تھی، لیکن بہر حال وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، اُس کے رَبِّ اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسرے جن جن کو وہ معبود قرار دیتے

ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں، اس لیے جھگڑا صرف اس امر میں تھا کہ خدائی کی صفات و اختیارات اور اُلوہیت کی ذات میں اُن معبودوں کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔

دوسری بات کو ماننے کے لیے لوگ تیار نہ تھے، مگر اس سے انکار کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی حضورؐ نے دعوائے رسالت سے پہلے اُنہی کے درمیان گزاری تھی، اُس میں اُنہوں نے کبھی آپ کو جھوٹا یا فریب کار یا نفسانی اغراض کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے والا نہ پایا تھا۔ وہ خود آپ کی دانائی و فرزانگی، سلامت روی اور اخلاق کی بلندی کے قائل و معترف تھے۔ اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انہیں دوسروں کو باور کرانا تو درکنار اپنی جگہ خود بھی یہ باور کرنے میں سخت مشکل پیش آرہی تھی کہ حضورؐ سارے معاملات میں تو راستباز ہیں مگر صرف رسالت کے دعوے میں معاذ اللہ جھوٹے ہیں۔

اس طرح پہلی دو باتیں اہلِ مکہ کے لیے اصل اتنی زیادہ اُلجھن کی موجب نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔ اُس کو جب اُن کے سامنے پیش کیا گیا تو اُنہوں نے سب سے زیادہ اُسی کا مذاق اڑایا، اسی پر سب سے بڑھ کر حیرانی اور تعجب کا اظہار کیا اور اُسے بالکل بعید از عقل و امکان سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابلِ تصور ہونے کے چرچے شروع کر دیے۔ مگر اسلام کی راہ پر اُن کو لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ اُن کے ذہن میں اُتار جاتے، کیونکہ اس عقیدے کو مانے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملہ میں ان کا طرزِ فکر سنجیدہ ہو سکتا، خیر و شر کے معاملہ میں ان کا معیارِ اقدار بدل سکتا اور وہ دُنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اُس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام ان کو چلانا چاہتا تھا یہی وجہ ہے کہ مکّہ معظمہ کے ابتدائی دَور کی سُورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دلوں میں بٹھانے پر صرف کیا گیا ہے، البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیے گئے ہیں جن سے توحید کا تصوّر بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے اور بیچ بیچ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصراً دے دیے گئے ہیں۔ (۲۲)

فہرست حوالہ جات باب (۵)

(۱) اضافہ از مؤلف

(۲) تفہیم القرآن، جلد اوّل، خلاصۂ مقدمہ

(۳) 〃 〃 ، جلد دوم، النحل، حواشی ۱۲۲-۱۲۳

(۴) 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ، بنی اسرائیل، خلاصہ حواشی ۵۷ تا ۶۱

(۵) 〃 〃 ، جلد اوّل ، الانعام، حاشیہ ۶۹

(۶) 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۷۱

(۷) 〃 〃 ، جلد ششم ، الاعلیٰ، حاشیہ ۱۰

(۸) 〃 〃 ، جلد اوّل، الانعام ، خلاصہ حواشی ۳۴-۳۵

(۹) 〃 〃 ، جلد ششم ، عبس، خلاصہ دیباچہ و حواشی ۱-۲

(۱۰) 〃 〃 ، جلد سوم ، العنکبوت ، حاشیہ ۸۱

(۱۱) 〃 〃 ، جلد دوم ، الاعراف ، حاشیہ ۱۵۰

(۱۲) 〃 〃 ، جلد چہارم ، حٰم السجدہ ، حاشیہ ۳۷

(۱۳) 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۳۷

(۱۴) 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۳۸-۳۹

(۱۵) 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۴۰

(۱۶) 〃 〃 ، جلد دوم ، یوسف ، حاشیہ ۳۷

(۱۷) 〃 〃 ، جلد سوم ، المؤمنون ، حاشیہ ۷۰

(۱۸) 〃 〃 ، جلد چہارم ، سبا ، حواشی ۶۸-۶۹

(۱۹) 〃 〃 〃 〃 ، صٓ ، حاشیہ ۲۷

(۲۰) 〃 〃 ، جلد پنجم ، الطّور، حاشیہ ۳۱

(۲۱) 〃 〃 ، جلد چہارم ، الشوریٰ، حاشیہ ۴۱

(۲۲) 〃 〃 ، جلد ششم ، دیباچہ سورۃ النّبا

باب (۶)

دعوتِ اسلامی کی حقیقی نوعیّت

مُشرکین کی عداوت کے اسباب اور ان کی ناکامی کے وجوہ

اب ہمیں اس بحث کے دوسرے حصے کو لینا ہے جو گذشتہ باب میں چھیڑی گئی تھی۔ پچھلے باب میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ حضورؐ کو، اور آپؐ کے ذریعہ سے آپؐ کے ساتھیوں کو اسلام کی دعوت پھیلانے کے لیے کیا ہدایات دی گئی تھیں تاکہ وہ جاہلیت کے علمبرداروں کی مخالفت کا مقابلہ اخلاق کے ہتھیاروں سے کریں، دلوں کو حکمت، حالی ظرفی، اور صبر و تحمل سے مسخر کریں، ہٹ دھرمی، تعصب اور ضد کی چٹانوں کو معقول اور دل لگتے دلائل سے توڑ کر دعوتِ حق کو آگے بڑھانے کے لیے راستہ نکالیں، اور انسانوں کے جمگھٹ میں سے اُن لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر اپنے ساتھ ملاتے جائیں جن کے اندر حق پسندی و حق پرستی کا جوہر پایا جاتا ہو۔

اس کے بعد اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو دعوت لے کر اُٹھے تھے اس کی حقیقی نوعیت کیا تھی، اس کے امتیازی اوصاف کیا تھے، وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر سب سے پہلے قریش اور پھر عرب کے دوسرے لوگ اس کی مخالفت پر تُل گئے، اور پھر اس دعوت میں وہ کیا قوت تھی جس نے بالآخر تمام مخالفین کو بے بس کر کے وہ عظیم کامیابی حاصل کی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہ بحث چونکہ بڑی تفصیل چاہتی ہے، اس لیے ہم سات فصلوں میں اسے بیان کریں گے:

(۱) توحید کی تعلیم اور شرک کی تردید۔

(۲) رسالتِ محمدیہ پر ایمان کی دعوت۔

(۳) قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان کی دعوت۔

(۴) آخرت پر ایمان کی دعوت۔

(۵) اخلاقی تعلیمات۔

(۶) عالمگیر نبوتِ محمدیہ کی تاسیس۔

(۷) نبی اور غیرِ نبی کے طریقِ کار کا فرق۔

فصلِ اوّل

توحید کی تعلیم اور شرک کی تردید

دعوتِ اسلامی کے نکات میں سے اوّلین، سب سے اہم اور بنیادی نکتہ توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال تھا۔ اگرچہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بعثت سے قبل توحید کے قائل اور شرک کے منکر تھے، اور آپ کے معصرین میں بھی اور آپ کے زمانے سے پہلے گزرے ہُوئے اہلِ عرب میں بھی اِس عقیدے کے لوگ پائے جاتے تھے مگر بہت فرق ہے اِس بات میں کہ کوئی شخص اقرارِ توحید و انکارِ شرک کا محض عقیدہ رکھتا ہو، یا زیادہ سے زیادہ بس اُس کا اظہار کر دینے پر اکتفا کرتا ہو، اور اِس بات میں کہ کوئی شخص لوگوں کے اندر اِس عقیدے کو پھیلانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو اور عام دعوت دے کہ لوگ شرک چھوڑ دیں اور توحید کو تسلیم کر لیں۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر جو چیز اُس سادہ سے عقیدے اور اِس عملی تبلیغ و دعوت کے درمیان فرقِ عظیم پیدا کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اِس کام کا بیڑا اُٹھائے وہ بار بار بڑے زور دار دلائل کے ساتھ شرک کے ایک ایک پہلو کی تردید کرے اور نہایت مفصّل طریقے سے خدا کی محض وحدانیت ہی بدلائل ثابت نہ کرے بلکہ اِس وحدانیت کے معنی و مفہوم اور اِس کو ماننے کے مقتضیات بھی بیان کر کے لوگوں کو پیہم دعوت دے کہ وہ اِس تفصیل کے ساتھ اللہ کی توحید پر ایمان لائیں۔

یہی کام تھا جو منصبِ رسالت پر مامور ہونے کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور یہی کفّار سے آپ کی نزاع کا پہلا سبب بنا کیونکہ اِس کا ہر جُز اُن کے عقائد، تعصّبات اور صدیوں کے جمے ہُوئے تصوّرات سے ٹکراتا تھا۔

توحید کی صاف صاف اور بے لاگ تعلیم

عرب کے مُشرک معاشرے میں اصل مسئلہ اللہ تعالیٰ کے وجود کو نہیں بلکہ اُس کی وحدانیت کو تسلیم کرانے کا تھا۔ مشرکین اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ وہ اُسی کو اپنا اور ساری کائنات کا خالق مانتے تھے۔ اُنہیں اُس کے رب اور الٰہ ہونے سے بھی انکار نہ تھا، اور اُس کی عبادت کے بھی وہ مخالف نہ تھے۔ البتہ جس گمراہی

میں وہ مبتلا تھے وہ یہ تھی کہ وہ اُلُوہیت اور رُبُوبیت کو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بہت سے الٰہوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھیراتے تھے اور اللہ کی عبادت کے ساتھ اُن کی عبادت کے بھی قائل تھے۔① اِس معاملہ میں ان کی شدت کا حال یہ تھا کہ:

وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا ۔ (بنی اسرائیل: ۴۶)

"اور اے نبی، جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ موڑ کر پلٹ جاتے ہیں۔"

یعنی انہیں یہ بات سخت ناگوار ہوتی ہے کہ تم بس اللہ ہی کو رب قرار دیتے ہو، اُن کے بنائے ہوئے دوسرے ارباب کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ اُن کو یہ "وہابیت" ایک آن پسند نہیں آتی کہ آدمی بس اللہ ہی اللہ کی رٹ لگاتے چلا جائے۔ نہ بزرگوں کے تصرفات کا کوئی ذکر، نہ آستانوں کی فیض رسانی کا کوئی اعتراف، نہ اُن شخصیتوں کی خدمت میں کوئی خراجِ تحسین جن پر اُن کے خیال میں اللہ نے اپنی خدائی کے اختیارات بانٹ رکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ عجیب شخص ہے جس کے نزدیک علمِ غیب ہے تو اللہ کو، قدرت ہے تو اللہ کی، تصرفات و اختیارات ہیں تو بس ایک اللہ ہی کے۔ آخر یہ ہمارے آستانوں والے بھی کوئی چیز ہیں یا نہیں، جن کے ہاں سے ہمیں اولاد ملتی ہے، بیماروں کو شفا نصیب ہوتی ہے، کاروبار چمکتے ہیں اور منہ مانگی مرادیں برآتی ہیں! ②

دوسری جگہ قرآن میں اُن کی توحید سے بیزاری اور شرک میں اُن کے استغراق کا حال اِس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ (الزمر: ۴۵)

"اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں، اور جب اُس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کھل اُٹھتے ہیں۔"

یہ بات قریب قریب ساری دُنیا کے مشرکانہ ذوق رکھنے والوں میں مشترک ہے۔ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ اکیلے اللہ کا ذکر کیجیے تو ان کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص ضرور بزرگوں اور اولیاء کو نہیں مانتا، جبھی تو بس اللہ ہی اللہ کی باتیں کیے جاتا ہے۔ اور اگر دوسروں کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں کی کلی کھل جاتی ہے اور بشاشت سے ان کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کو اصل میں دلچسپی اور محبت کس سے ہے۔ ③

إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُو آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ۝ (الصّٰفّٰت: ۳۵-۳۶)

"ان کا حال یہ تھا کہ جب ان سے کہا جاتا "اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے" تو گھمنڈ میں آجاتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک دیوانے شاعر کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟"

اُن کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت اعتراض تھا کہ:

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ (ص: ۵)

"کیا اس شخص نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا قرار دے دیا؟ یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے۔"

اس معاشرے اور ان خیالات کے لوگوں میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُٹھ کر بار بار اور تکرار اور پُورے زور کے ساتھ اعلان کیا کہ اللہ ہی ایک الٰہ اور رب ہے، اور کسی دوسرے کا اُلوہیت و ربوبیت میں کوئی حصہ نہیں:

إِنَّمَا إِلَٰهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ: ۹۸)

"تمہارا خدا تو بس وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ ہر چیز پر اس کا علم وسیع ہے۔"

بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ (الانبیاء۔ ۵۶)

"بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور جس نے اُن کو پیدا کیا ہے۔"

إِنَّ إِلَٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝ رَّبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝ (الصّٰفّٰت ۴تا۵)

"درحقیقت تمہارا خدا صرف ایک ہے، آسمانوں اور زمین کا اور اُن کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب اور سارے مشرقوں کا رب۔"

یعنی جو کائنات کا مالک و فرمانروا (رب) ہے وہی انسانوں کا خدا (الٰہ اور معبود) ہے، اور وہی درحقیقت معبود ہو سکتا ہے، اور اُسی کو معبود ہونا چاہیے۔ یہ بات قطعی غلط ہے کہ کائنات اور تم سمیت کائنات کی ہر چیز کا رب (یعنی مالک اور حاکم اور مربّی اور پروردگار) تو کوئی ہو اور الٰہ (عبادت کا مستحق) کوئی اور ہو جائے۔"

قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنذِرٌ ۖ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ۝ قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ ۝ أَنتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ۝ (ص ۶۵ تا ۶۸)

"اے نبی، کہو کہ میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں۔ اور کوئی خدا اُس ایک اللہ کے سوا نہیں جو سب پر غالب ہے، جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا رب ہے، بڑا زبردست اور بڑا درگزر کرنے والا ہے۔ اے نبی، کہو کہ یہ ایک بڑی خبر ہے جس سے تم منہ موڑ رہے ہو۔"

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ (النحل ۵۱)

"اور اللہ نے فرمایا ہے کہ دو الٰہ (خدا اور معبود) نہ بنالو، خدا تو بس وہ ایک ہی ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو۔"

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (الزخرف - ۸۴)

"اور وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا اور وہی حکیم اور علیم ہے۔"

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (القصص - ۸۸)

"اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ ہر چیز ہلاک ہو جانے والی ہے اُس کی ذات کے سوا۔ فرمانروائی اُسی کی ہے اور اُسی کی طرف تم سب پلٹنے جانے والے ہو۔"

مشرکین نے حضورؐ سے پُوچھا کہ جس رب کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کا نسب ہمیں بتاؤ۔ وہ کس چیز سے بنا ہُوا ہے، کس سے اُس نے دُنیا کی وراثت پائی ہے، اور کون اس کے بعد یہ وراثت پائے گا؟ اس کے جواب میں توحید کی ایسی واضح، جامع اور مختصر تعریف بیان کی گئی جو دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہو جانے والی تھی، جس کے ساتھ شرک کا شائبہ تک دماغ میں جگہ نہ پا سکتا تھا، جس کا ایک ایک لفظ توحید کے تصور کو نکھار کر پیش کر رہا تھا، اور اس کے ساتھ کمال یہ تھا کہ چار مختصر اور بلیغ فقروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کسی سُننے والے کے بس میں یہ نہ تھا کہ اسے اپنے حافظہ سے نکال دے اور وہ زبانوں پر چڑھے بغیر رہ جائے۔ ارشاد ہُوا:

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ (اخلاص)

"اے نبی، کہو وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اُس کا ہمسر نہیں ہے۔"

پہلے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ میرے جس رب کے متعلق تم مجھ سے پوچھتے ہو، اور جس کو میں ربِّ واحد ماننا اور منوانا چاہتا ہوں، وہ کوئی نیا اور نرالا اور میرا اپنا گھڑا ہُوا رب نہیں ہے، بلکہ وہی ہے جس کو تم خود اپنی زبان میں اللہ کہتے ہو، جس کے اس گھر (کعبہ) کو بیتُ اللہ کہتے ہو، جس سے ابرہہ کے حملہ کے وقت تم نے ابھی چالیس پچاس برس پہلے دُعائیں مانگی تھیں کہ وہ تم کو بچالے اور اُس وقت اپنے دوسرے سب الٰہوں کو تم بھول گئے تھے، جس کے متعلق تم خود مانتے ہو کہ تمہارا اور زمین و آسمان کا اور دُنیا کی ہر چیز کا خالق وہی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ اَحَد ہے۔ ہر عرب اِس بات کو جانتا تھا کہ یہاں اللہ کو واحد کہنے کے بجائے اَحَد کہنے کے معنی کیا ہیں۔ واحد (ایک) کا لفظ عربی زبان میں ہر اُس چیز کے لیے بولتے ہیں جو بعض کسی خاص حیثیت سے ایک ہو، خواہ دوسری بے شمار حیثیتوں سے اُس کے اندر طرح طرح کی کثرتیں پائی جاتی ہوں۔ مثلاً ایک گھر، ایک آدمی، ایک خاندان، ایک قوم، ایک ملک، ایک دنیا۔ اس کے برعکس اَحَد کے لفظ کو صفت کے طور پر کسی ہستی کے لیے بولنا عربی زبان میں کسی کی وحدانیت بیان کرنے کے لیے ایک غیر معمولی استعمال تھا جس کی کوئی نظیر سورۂ اخلاص کے نزول سے پہلے لغتِ عرب کے استعمالات میں نہیں پائی جاتی تھی[1]۔ پس اللہ کو اَحَد کہنا خود یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ ہر لحاظ سے یکتا و یگانہ ہے۔ وہ خداؤں کی کسی جنس کا فرد نہیں ہے کہ اس کے ہم جنس دوسرے افراد بھی خدا ہوں، بلکہ وجود میں وہ فرد و فرید اور خدائی میں وہ بالکل اکیلا ہے۔ اس کے اندر کسی حیثیت سے بھی کوئی کثرت نہیں ہے۔ وہ اجزا سے مرکّب وجود نہیں ہے جو قابلِ تجزیہ و تقسیم ہو، جو کوئی شکل و صورت رکھتا ہو، جو کسی جگہ میں رہتا ہو، جس سے کوئی چیز نکلتی ہو یا کوئی چیز اس کے اندر داخل ہوتی ہو، جس کا کوئی رنگ ہو، جس کے کچھ اعضاء ہوں، جس کی کوئی سمت اور جہت ہو، اور جس کے اندر کسی قسم کا تغیّر و تبدّل ہوتا ہو۔ تمام اقسام کی کثرتوں سے پاک اور منزّہ وہ ایک ہی ذاتِ خداوندی ہے جو ہر لحاظ سے اَحَد ہے۔ اور جب وہ اَحَد ہے تو الوہیت اور ربوبیت میں کوئی اُس کا شریک نہیں ہو سکتا۔ اُس کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں کوئی اس کا حصہ دار نہیں ہو سکتا۔ موجوداتِ عالم میں سے کوئی اس کے مشابہ اور مماثل نہیں ہو سکتا۔

پھر فرمایا کہ وہ الصَّمَد ہے۔ لفظ صَمَد عربی میں کثرت سے مستعمل تھا اور ہر عرب اس کے معنی جانتا تھا۔ وہ ہر اُس شخص کے لیے بولا جاتا تھا جو دوسروں کا محتاج نہ ہو اور لوگ جس کی طرف اپنی حاجات میں رجوع کرتے ہوں، جو دوسروں سے برتر ہو اور کوئی اُس سے بالاتر نہ ہو، جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور جس کے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کیا جاتا ہو، جس میں کوئی کمزوری نہ ہو، جو بے عیب ہو، جس پر کوئی آفت نہ آتی ہو، جو اپنی مرضی سے جو چاہے فیصلہ کرے اور کوئی اس کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا نہ ہو، اور جو سرداری کی صفات میں کامل

---

[1] واضح رہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے تنہا لفظ واحد کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا لفظ لگا کر اللہ کے ایک ہونے کی حیثیت کو دنیا کی دوسری اشیاء میں سے کسی کے ایک ہونے کی حیثیت سے الگ کر دیا گیا ہے، مثلاً اِلٰـهًا وَّاحِدًا، یا اَللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ، لیکن سورۂ اخلاص میں لفظ اَحَدٌ اللہ کے لیے مطلقاً بلا وصف استعمال کیا گیا ہے اور یہ استعمال ذاتِ الٰہی کے لیے خاص ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

ہو۔ پھر یہ لفظ ایسی چیز کے لیے بھی بولا جاتا تھا جو ٹھوس ہو جس میں کوئی خول اور جھول نہ ہو جس سے نہ کوئی چیز نکلتی ہو اور نہ جس کے اندر کوئی چیز داخل ہوتی ہو جو دائم اور بلند و بالا ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے محض صَمَد نہیں بلکہ اَلصَّمَد کا لفظ استعمال کیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ دوسری تمام ہستیاں اور اشیاء تو کسی ایک لحاظ سے صَمَد ہیں اور دوسرے بہت سے لحاظوں سے صَمَد نہیں ہیں، مگر ہر لحاظ سے کامل طور پر الصَّمَد صرف اللہ ہی ہے۔

پھر فرمایا کہ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ یہ فقرہ اُن تمام مشرکانہ خیالات کی جڑ کاٹ دیتا تھا جن کی بنا پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ خداؤں کی بھی کوئی جنس ہے جس میں اُسی طرح تَوالُد و تَناسُل کا سلسلہ چلتا ہے جس طرح انسانوں میں چلتا ہے۔ اس تصوّر کی بیخ کنی کر کے لوگوں کو بتا دیا گیا کہ وہی اکیلا خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ اس سے پہلے کوئی خدا تھا جس سے وہ پیدا ہُوا ہو اور نہ اس کے بعد کوئی خدا ہے یا ہو سکتا ہے جو اُس سے پیدا ہو۔

آخر میں ارشاد ہُوا کہ کوئی اُس کا کُفُوْ نہیں ہے۔ کُفُو کے معنی ہیں نظیر، مُشابہ، مُماثِل، ہم رتبہ، ہمسر، مساوی۔ یہ فقرہ ارشاد فرما کر لوگوں کو بتا دیا گیا کہ ساری کائنات میں کوئی نہیں ہے، نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے جو اللہ کے مانند، یا اس کا ہم مرتبہ ہو، یا اپنی صفات، افعال اور اختیارات میں اس سے کسی طرح کی مشابہت رکھتا ہو۔

توحید کے دلائل

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مُشرک معاشرے کے سامنے توحید کے اس صاف اور خالص تصوّر کو پیش کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بڑے مضبوط اور ناقابلِ انکار دلائل کے ساتھ اسے ثابت بھی کیا۔

(۱) تمام انبیاء توحید کی تعلیم دیتے تھے

اس سلسلے میں ایک نہایت وزنی دلیل یہ تھی کہ آپ سے پہلے جتنے انبیاء بھی دنیا میں آئے ان سب نے توحید ہی کی تعلیم دی تھی اور شرک سے منع کیا تھا۔ چنانچہ قرآن میں پہلے مجموعی طور پر تمام انبیاء کے متعلق فرمایا گیا کہ:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔ (النحل: ۳۶)

"ہم نے ہر اُمّت میں ایک رسُول بھیجا اِس تعلیم کے ساتھ کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت[1] کی بندگی سے بچو۔"

---

[1] علمِ تفسیر کے مشہور امام ابن جریر طبری نے طاغوت کی تشریح یہ کی ہے: "ہر وہ ہستی جو اللہ کے مقابلے میں سرکشی کرے اور اللہ کے سوا جس کی بندگی کی جائے، خواہ بندگی کرنے والا اس کے جبر سے مجبور ہو کر اس کی بندگی کرے یا اپنی رضا و رغبت سے ایسا کرے، وہ طاغوت ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا شیطان یا بُت یا اور کوئی چیز"۔ (جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۳ صفحہ ۱۳) (حاشیہ از مؤلف)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔

(الانبیآء: ۲۵)

"اور تم سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے لہٰذا تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔"

اور پچھلی تمام اُمتوں کے متعلق بتایا گیا کہ:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔ (البیّنۃ: ۵)

"اور اُن کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اُس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسُو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے"

پھر ایک ایک نبی کے متعلق بتایا کہ اس کی تعلیم یہی تھی۔ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ میں سے ہر ایک اپنی قوم کو سب سے پہلے یہی تلقین کرتے ہیں کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے" (الاعراف ۵۹-۶۵-۷۳-۸۵-ہود ۵۰-۶۱-۸۴۔ المؤمنون ۲۳-۳۲)۔ حضرت یعقوبؑ مرتے وقت اپنی اولاد سے پوچھتے ہیں کہ میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ "ہم اُس ایک ہی خدا کی بندگی کریں گے جو آپ کا اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ کا معبود رہا ہے" (البقرہ ۱۳۳)۔ حضرت یوسفؑ اپنے قید خانے کے ساتھیوں سے کہتے ہیں:

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (یوسف: ۳۹-۴۰)

"اے قید خانے کے ساتھیو، بہت سے متفرق رب اچھے ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اُس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اُس کا حکم ہے کہ خود اُس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

حضرت موسیٰ پر پہلی وحی یہی نازل ہوئی کہ :

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ۝ (طٰهٰ : ۱۴)

"میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں، پس تو میری ہی عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔"

پھر جب بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی کی تو حضرت موسیٰ ان پر سخت غضبناک ہوئے اور ان کے بنائے ہوئے معبود کو جلا کر خاک کر ڈالا اور فرمایا :

إِنَّمَا إِلَٰهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۔ (طٰهٰ : ۹۸)

"تمہارا حقیقی معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے بار بار کہا :

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (آل عمران - ۵۱، مریم ۳۶، الزخرف ۶۴)

"درحقیقت اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، پس تم اُسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔"

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝ (المائدہ : ۷۲)

"اے بنی اسرائیل، اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کیا اُس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔"

مشرکین قریش کے لیے خصوصاً اور مشرکین عرب کے لیے عموماً سب سے زیادہ زبردست دلیل وہ تھی جو قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے سے پیش کی گئی، کیونکہ تمام مشرکین عرب اُن کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے تھے، اپنے دین کو اُن کا دین قرار دیتے تھے، اور قریش کا تو سارا فخر و ناز اور نفوذ و اثر ہی اُن سے نسبی تعلق اور اُن کے تعمیر کردہ بیت اللہ کی مجاوری پر تھا۔ قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ قریش اور اہل عرب کو بتایا گیا کہ نمرود کی سلطنت (عراق) سے تمہارے باپ اور پیشوا کا نکلنا اسی جھگڑے کی بنا پر تو ہوا تھا کہ اُن کا باپ اور اُن کی قوم اور اُن کے ملک کی حکومت، سب کے سب مشرک تھے۔ اُنہوں نے اس شرک کی کھلم کھلا تردید کی، قوم کو توحید کی علی الاعلان دعوت دی، بتوں کو توڑا اور اس کی پاداش میں اُن کو آگ سے بھرے ہوئے الاؤ میں پھینک دیا گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے زندہ و سلامت نکال دیا۔ آخر کار وہ ملک چھوڑ کر ارضِ کنعان کی طرف نکل گئے، پھر مکہ پہنچ کر یہ خانہ کعبہ اسی لیے بنایا کہ یہاں خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت

ذکی جاتے، اور اپنی اولاد کے لیے دُعا کی کہ وہ بُت پرستی کی گمراہی میں مبتلا نہ ہو۔ اِس قصّے کی تفصیلات قرآن میں مختلف مقامات پر جیسے پُرزور اور اثر انگیز طریقے سے بیان کی گئی ہیں اُن کو پڑھ کر آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ جب مکہ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے انہیں سُنایا ہوگا تو قریش اور عام مشرکین کس طرح ہل کر رہ گئے ہوں گے۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم یہاں صرف آیات کا ترجمہ درج کرتے ہیں:

"اور ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جبکہ اُس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کیا آپ بتوں کو خدا بناتے ہیں؟ میں تو آپ کو اور آپ کی قوم کو کھُلی گمراہی میں پاتا ہوں ..... ابراہیمؑ نے کہا اے میری قوم کے لوگو، میں اُن سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو۔ میں نے تو یکسُو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اُس کی قوم اُس سے جھگڑنے لگی۔ اُس نے کہا کیا تم اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے صحیح راہ دکھا دی ہے؟ اور میں تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا، ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے، میرے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جبکہ تم اللہ کے ساتھ اُن چیزوں کو شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے (شریکِ خدا ہونے کے) لیے اُس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ پھر بتاؤ، اگر تم کچھ علم رکھتے ہو کہ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی اور اطمینان کا مستحق ہے؟" (الانعام۔ ۷۴ تا ۸۱)

"اور اے محمدؐ، اِس کتاب میں ابراہیمؑ کا ذکر کرو، بے شک وہ ایک راست باز انسان اور نبی تھا۔ (انہیں اُس موقع کا حال سناؤ) جب اُس نے اپنے باپ سے کہا ابّا جان، آپ کیوں اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سُنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں۔ ابّا جان، میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابّا جان، آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابّا جان، مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمان کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔ باپ نے کہا ابراہیم، کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔ ابراہیمؑ نے کہا سلام ہے آپ کو، میں اپنے رب سے دُعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے، میرا رب مجھ پر بہت مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو

پکاروں گا، اُمید ہے کہ مَیں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا۔" (مریم - ۴۱ تا ۴۸)

▪ اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دُعا کرنا صرف اُس وعدے کی بنا پر تھا جو اُس نے اُس سے کیا تھا۔ مگر جب اُس پر یہ بات کھل گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اُس سے بَری الذمّہ ہو گیا۔" (التوبہ - ۱۱۴)

▪ "اِس سے پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اُس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اُس کو خوب جانتے تھے۔ یاد کرو وہ موقع جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔ اُس نے کہا تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کیا تُو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟ اُس نے کہا نہیں، بلکہ تمہارا رب اصل میں وہی آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے اُن کو پیدا کیا ہے، اور مَیں اِس پر تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔ اور خدا کی قسم مَیں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا۔ چنانچہ اُس نے اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف اُن کے بڑے کو چھوڑ دیا تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ (اُن لوگوں نے آکر اپنے بتوں کا یہ حال دیکھا تو) بولے کہ ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ۔ (بعض لوگ) کہنے لگے کہ ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سُنا تھا جسے ابراہیم کہتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا تو پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں (کہ اس کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے)۔ (ابراہیمؑ کے آنے پر) لوگوں نے کہا، ابراہیمؑ کیا تُو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ اس نے کہا بلکہ یہ ان کے اِس سردار کا کیا دھرا ہے، اِنہی سے پُوچھ لو اگر یہ کچھ بولتے ہیں۔ یہ بات سُن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے کہ واقعی تم خود ہی ظالم ہو (کہ اِن بے بس خداؤں کو پُوج رہے ہو) پھر اُن کی مت پلٹ گئی اور کہنے لگے کہ تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔ ابراہیمؑ نے کہا اچھا تو تم اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ تُف ہے تم پر اور تمہارے اِن معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پُوجا کر رہے ہو۔ انہوں نے کہا جلا دو اِس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے۔ ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر۔ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ بُرائی کریں مگر ہم نے اُنہی کو ناکام و نامراد کر دیا۔" (الانبیاء - ۵۱ تا ۷۰)

▪ "اور انہیں ابراہیمؑ کا قصہ سُناؤ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ تم کن چیزوں

کی عبادت کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا یہ کچھ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور انہی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں۔ اس نے کہا کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا (یہ سب کچھ تو ہم نہیں جانتے) بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) دیکھا بھی کہ یہ چیزیں ہیں کیا جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بجا لاتے رہے؟ میرے تو یہ سب دشمن ہیں بجز رب العالمین کے جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے موت دیگا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا، اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرمائے گا۔" (الشعراء۔ ۷۰ تا ۸۲)

"اور ہم نے ابراہیمؑ کو بھیجا جب اس نے اپنی قوم سے کہا اللہ کی بندگی کرو اور اسی سے ڈرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ کو چھوڑ کر جنہیں تم پوج رہے ہو وہ تو محض بت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ درحقیقت تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ ..... تو اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ قتل کر دو یا جلا ڈالو اس کو۔ مگر اللہ نے اس کو آگ سے بچا لیا۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے۔ اور ابراہیمؑ نے کہا کہ تم لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو دنیا میں تو آپس کی محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار کروگے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے، آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ پھر لوطؑ نے ابراہیمؑ کو مانا اور ابراہیمؑ نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں، وہی زبردست اور حکیم ہے۔" (العنکبوت ۱۶ تا ۲۶)

"اور نوحؑ ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور کھوٹ سے پاک دل لے کر آیا۔ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ کن چیزوں کی عبادت تم کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹے گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر رب العالمین کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے؟ پھر اس نے تاروں کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور (قوم کے لوگوں سے) کہا میری طبیعت خراب ہے۔ چنانچہ وہ لوگ اسے چھوڑ کر (اپنے میلے میں) چلے گئے۔ ان کے پیچھے وہ چپکے سے ان کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا "آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں؟ آپ کو کیا ہو گیا، بولتے بھی نہیں؟" اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔ (واپس آ کر قوم کے) لوگ بھاگے بھاگے

اُس کے پاس آئے تو اُس نے کہا کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور اُن چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو۔ اُنہوں نے کہا اس کے لیے ایک اَلاؤ تیار کرو اور اِسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔ اُنہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے اُنہی کو نیچا دکھا دیا۔ اور ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں (یعنی ہجرت کرتا ہوں)، وہی میری رہنمائی کرے گا۔" (الصّٰفّٰت ۔ ۹۳ تا ۹۹)۔

حضرت ابراہیمؑ کو ملک کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا کیونکہ وہ رب ہونے کا مدّعی تھا اور آپؑ اللہ کے سوا کسی کو رب ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اُس سے اُن کی جو گفتگو ہوئی اُسے قرآن اس طرح نقل کرتا ہے:۔

"جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے تو اس نے کہا کہ زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا، اچھا تو اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تُو اسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سُن کر وہ کافر ششدر رہ گیا۔" (البقرہ ۔ ۲۵۸)

اِس طرح جب شرک کی مخالفت اور توحید کی دعوت کے باعث حضرت ابراہیمؑ کے لیے وطن کی سرزمین تنگ ہو گئی اور وہ اپنا ملک، اپنی قوم، اپنے خاندان، حتیٰ کہ اپنے باپ کو بھی چھوڑ کر ہجرت کے لیے نکل کھڑے ہوئے تو چلتے ہوئے انہوں نے اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والوں نے صاف صاف اپنی قوم سے کہہ دیا کہ:

"ہم تم سے اور تمہارے اِن معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بَیر پڑ گیا جب تک تم اکیلے اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔" (الممتحنہ ۔ ۴)

اِس کے ساتھ ہی قرآن مجید میں یہ بھی بتایا گیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے مکہ آ کر جب اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی جگہ پر اِس خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تو یہ اِس لیے نہ تھی کہ اسے بُت خانہ اور مشرکین کا تیرتھ بنایا جائے اور یہاں غیراللہ کی عبادت ہو اور غیراللہ کے لیے قربانیاں کی جائیں۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۔ (الحج، ۲۶ تا ۲۸)

"اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر (خانۂ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دینا کہ وہ تمہارے پاس ہر دُور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں اُن کے لیے ہیں اور چند مقرر دنوں میں اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں بخشے ہیں۔"

نیز قرآن میں لوگوں کو یہ بھی یاد دلایا گیا کہ مکہ کی آبادی اور اپنی آئندہ نسل کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے جو دُعا مانگی تھی وہ کیا تھی :

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (ابراہیم : ۳۵-۳۶)

"اَے میرے رب، اِس شہر کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پرستش کریں۔ اَے میرے رب، اِن بتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہی میں ڈالا ہے پس جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو تو درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

حضرت ابراہیمؑ کی یہ مثال قریش اور مشرکینِ عرب کے مذہب کی کمر توڑ دینے والی تھی جس پر وہ بلبلا تو سکتے تھے، مگر اُس کا انکار نہ کر سکتے تھے، کیونکہ ان کے ہاں پہلے سے یہ بات مُسلّم تھی کہ حضرت ابراہیمؑ مشرک و بُت پرست نہ تھے، کعبہ اُنہوں نے صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا تھا اور شرک اُن کے بہت بعد اہلِ عرب میں شروع ہُوا۔ اُن کے ہاں روایات میں یہ بات تک محفوظ تھی کہ مکہ میں شرک کب سے شروع ہُوا اور کون سا بُت کب، کہاں سے، کون لایا۔ اِسی لیے قرآن نے بانگِ پکار سے لوگوں کو دعوت دی کہ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ "پس یکسُو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرو، اور وہ مشرکین میں سے نہ تھا" (آلِ عمران - ۹۵) - اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ "ابراہیم سے نسبت رکھنے کے سب سے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں جنہوں نے اُس کے طریقے کی پیروی کی اور یہ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ماننے والے ہیں۔ اللہ ایمان لانے والوں ہی کا حامی و ناصر ہے۔" (آلِ عمران - ۶۸)

(۲) مشرکین کے اپنے نفس کی شہادت سے استدلال

توحید کے لیے دوسری زبردست دلیل یہ پیش کی گئی کہ مشرکین پر جب کوئی سخت وقت آتا ہے اور انہیں موت یا تباہی سامنے کھڑی نظر آنے لگتی ہے تو وہ اپنے سب بناوٹی معبودوں کو بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا مانگنے لگتے ہیں۔ قرآن مجید میں اُن کی اِس کیفیت کو نہایت مؤثر طریقے سے بیان کر کے انہیں یہ احساس دلایا گیا کہ تمہارے اپنے نفس میں شرک کے باطل اور توحید کے برحق ہونے کی شہادت موجود ہے جو آزمائش کے وقت علانیہ ابھر آتی ہے اور وہ وقت گزر جانے کے بعد تم اُس پر غفلت کا پردہ ڈال دیتے ہو۔ (۴)

قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۔ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ۔ (الانعام: ۴۰-۴۱)

"اے نبیؐ، اِن سے کہو، ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی اللہ کا عذاب تم پر آ جاتے یا آخری گھڑی تمہارے اُوپر آ جاتی تو کیا اللہ کے سوا تم کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم (اپنے شرک میں) سچے ہو۔ بلکہ اُس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اُس مصیبت کو ٹال دیتا ہے جس سے بچانے کے لیے تم دعا کر رہے تھے اور اِس وقت تم اُن کو بھول جاتے ہو جنہیں تم خدائی میں شریک کرتے تھے۔"

ابوجہل کے بیٹے عکرمہؓ کو اسی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی جب مکہ معظمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر فتح ہو گیا تو عکرمہ جدہ کی طرف بھاگے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر حبش کی راہ لی۔ راستہ میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرے میں پڑ گئی۔ اول اول تو دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا۔ مگر جب طوفان کی شدت بڑھی اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی تو سب کہنے لگے کہ یہ وقت اللہ کے سوا کسی کو پکارنے کا نہیں ہے وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں۔ اُس وقت عکرمہ کی آنکھیں کھلیں اور اُن کے دل نے آواز دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو؟ یہی تو وہ بات ہے جو اللہ کا وہ نیک بندہ ہمیں بیس برس سے سمجھا رہا ہے اور ہم خواہ مخواہ اُس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عکرمہ کی زندگی میں فیصلہ کن لمحہ تھا۔ اُنہوں نے اُسی وقت خدا سے عہد کیا کہ اگر میں اِس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے

اس عہد کو ٹھپا کیا اور بعد میں آ کر نہ صرف مسلمان ہوتے بلکہ اپنی بقیہ عمر اسلام کے لیے جہاد کرتے گذار دی" (۵)
یہ استدلال قرآن مجید میں جگہ جگہ کیا گیا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے یہاں ہم صرف آیات کا ترجمہ درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:۔

"وہ اللہ ہی ہے جو تم کو زمین اور سمندر میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اُس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس بلا سے بچا لیا تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔ مگر جب وہ اُن کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں" (یونس: ۲۲-۲۳)

"تمہارا حقیقی رب تو وہ ہے جو سمندر میں تمہاری کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل (یعنی رزق) تلاش کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارے حال پر نہایت مہربان ہے۔ اور جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اُس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں۔ مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم منہ پھیر جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے" (بنی اسرائیل ۶۶-۶۷)۔

"اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اُسے پکارتے ہیں پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انہیں چکھا دیتا ہے تو یکایک اُن میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہیں (یعنی دوسرے معبودوں کی نذریں اور نیازیں چڑھانی شروع کر دیتے ہیں) تاکہ ہمارے کیے ہوئے احسان کی ناشکری کریں" (الروم۔ ۳۲-۳۳)۔ (۶)

"اور جب انسان پر کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اُسے پکارتا ہے، پھر جب اُس کا رب اپنی نعمت سے اُس کو نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو ہمسر ٹھیرانے لگتا ہے، تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے" (الزمر۔ ۸)

یعنی خود گمراہ ہونے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی یہ کہہ کہہ کر گمراہ کرتا ہے کہ جو آفت مجھ پر آئی تھی وہ فلاں حضرت، یا فلاں بزرگ، یا فلاں دیوی یا دیوتا کے صدقے میں ٹل گئی۔

اِس سے دوسرے بہت سے لوگ بھی اُن معبودانِ غیر اللہ کے معتقد ہو جاتے ہیں اور ہر جاہل اپنے اِسی طرح کے تجربات بیان کر کر کے عوام کی اِس گمراہی کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ (۷)

یہ مشرکین کی دُکھتی ہُوئی رگ تھی جس کو قرآن مجید میں جگہ جگہ چھیڑ کر اُن کے اندر سوتے ہوئے احساسِ توحید کو جگایا گیا۔ عرب کی زمین آفات سے بھری ہوئی تھی۔ ملک کی عام بدامنی ہر شخص کے لیے خطرات سے پُر تھی۔ بیماریوں میں دُور دُور تک کہیں دوا اور علاج کا انتظام نہ تھا۔ صحرا کی خوفناک طوفانی آندھیوں میں لوگوں کے حواس باختہ ہو جاتے تھے۔ ان حالات میں ہر مشرک کو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی ایسی مصیبت سے سابقہ پیش آجاتا تھا جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اللہ وحدہٗ لاشریک کے آگے دُعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اِس وقت اُس ذاتِ پاک کے سوا کوئی اُس کی مدد نہیں کر سکتا۔ خصوصاً بحری سفروں میں تو اِس طرح کے مواقع اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ خود قریش پر ابرہہ کے حملے کے وقت یہی کیفیت گزر چکی تھی کہ سارے بناوٹی خداؤں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کو انہوں نے مدد کے لیے پکارا تھا اور نزولِ قرآن کے زمانے میں بہت سے وہ لوگ زندہ موجود تھے جو اِس واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ اِسی کی طرف سُورۂ فیل میں اُن کو توجہ دلائی گئی کہ اُس وقت تمہارے اصلی اور حقیقی رب کے سوا اور کون تھا جس نے ۶۰ ہزار حملہ آوروں کا قلع قمع کر کے تمہیں تباہی سے بچا لیا؟ اور اِسی کی طرف سُورۂ قریش میں اُن کو توجہ دلائی گئی کہ اُس خدائے بزرگ و برتر کی بندگی کرو جس کے گھر کی پناہ میں آکر تم تباہی سے محفوظ ہوئے اور تم کو عرب میں یہ امن، یہ بے خوفی اور یہ خوشحالی نصیب ہوئی۔ اِس نعمت کا دینے والا وہی اللہ ہے، نہ کہ وہ معبود جنہیں تم نے اُس کے گھر میں جمع کر رکھا ہے اور جن کے متعلق تم خود جانتے ہو کہ وہ تمہیں تباہ ہونے سے نہ بچا سکتے تھے۔

(۳) نظامِ کائنات سے استدلال

اُوپر کی دو دلیلوں کے ساتھ قرآن مجید میں جگہ جگہ بڑی تفصیل کے ساتھ کائنات کے پُورے نظام سے اِس بات پر نہایت پُرزور دلائل پیش کیے گئے کہ اِس سارے عالمِ ہست و بود کا خدا ایک ہی ہے اور ایک ہی ہو سکتا ہے۔ یہاں بھی ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف آیات کے ترجمے نقل کرنے پر اکتفا کریں گے:

"لوگو، بندگی کرو اپنے اُس رب کی جس نے تم کو اور اُن سب لوگوں کو پیدا کیا ہے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ توقع ہے کہ تم (دوسروں کی بندگی کے انجام سے) بچ جاؤ گے۔ وہ رب جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے ہر طرح کی پیداوار نکالی کہ تمہارے لیے رزق بنے۔ پس تم جانتے بوجھتے دوسروں کو اللہ کا مدِمقابل

نہ ٹھیراؤ۔" (البقرہ: ۲۱-۲۲)

" اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر یکایک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں علم رکھنے والوں کے لیے۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور اُس کے فضل (رزق) کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے بات کو) سُنتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی، اور آسمان سے پانی برساتا ہے اور اُس کے ذریعہ سے زمین کو اُس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جونہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پُکارا، بس ایک ہی پکار میں تم اچانک نکل آؤ گے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اس کے بندے ہیں، سب اُسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی اُس کا اعادہ کرے گا اور یہ اُس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اُس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔" (الرّوم: ۲۰ تا ۲۷)

" درحقیقت تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش (کائنات کے تخت سلطنت) پر جلوہ فرما ہُوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا آتا ہے۔ جس نے سورج اور چاند اور تاروں کو پیدا کیا۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو، خلق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا۔ بڑا بابرکت ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔" (الاعراف: ۵۴)۔

" پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے زمین سے اُگنے والی چیزوں میں بھی، اور تمہارے اپنے نفوس (یعنی نوعِ انسانی) میں بھی، اور اُن چیزوں میں بھی جن کو لوگ نہیں جانتے۔ اور لوگوں کے لیے ایک نشانی رات ہے جس کے اُوپر سے ہم دن کو ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علم رکھنے والے کا باندھا ہُوا

حساب سے ہے۔ اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ چاند کو جا لے، اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔ اور لوگوں کے لیے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی (کشتی نوحؑ) میں سوار کر دیا اور (بعد میں) ویسی ہی کشتیاں اور پیدا کر دیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں، پھر کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو اور نہ یہ کسی طرح بچائے جا سکیں۔ بس ہماری ہی رحمت ہے جو انہیں پار لگاتی ہے اور ایک وقت خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقع دیتی ہے" (یٰسٓ ۳۹ تا ۴۴)۔

"وہ اس کا کام تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے پس پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو" (یٰسٓ: ۸۲۔۸۳)۔

"اے محمدؐ، کہو کیا اللہ کے سوا میں کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ ہر چیز کا رب تو وہی ہے" (الانعام۔۱۶۴)۔

"زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کہاں (مرکر) وہ سونپا جاتا ہے۔ سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے" (ہود۔۶)۔

"وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے، اور جو کچھ آسمانوں سے اترتا ہے اور جو کچھ ان میں چڑھتا ہے۔ اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی تم ہو، اور جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملات رجوع کیے جاتے ہیں۔ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور وہ دلوں کے حال تک خوب جانتا ہے" (الحدید۔۴تا۶)۔

"وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے پھر اس کی روداد اوپر اس کے حضور ایک ایسے دن میں جاتی ہے جس کی مقدار تمہارے حساب سے ایک ہزار برس ہے۔ وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، زبردست اور رحیم، جس نے ہر چیز جو بنائی خوب ہی بنائی۔ اور انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح

نکالتا ہے" (السجدہ ۔ ۵ تا ۹)۔

"دانے اور گٹھلی کو (زمین کی تہوں میں) پھاڑنے والا اللہ ہی ہے۔ وہی زندہ کو مردہ میں سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ میں سے نکالنے والا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے جارہے ہو؟ پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے، اور رات کو اس نے سکون کا وقت بنایا ہے اور اس نے سورج اور چاند کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ سب اس زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں تمہارے لیے راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ دیکھو، ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تم کو ایک متنفس سے پیدا کیا، پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک اُس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں"
(الانعام: ۹۵ تا ۹۸)۔

"اے نبیؐ، ان سے کہو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو رد کر دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟" (الفتح ۔ ۱۱)۔

"اور اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالنا چاہے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے۔ اور اگر وہ تیرے حق میں بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل کو پھیر دینے والا بھی کوئی نہیں" (یونس ۔ ۱۰۷)

"اللہ جس رحمت کا راستہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روک دینے والا نہیں اور جسے وہ بند کر دے اُسے اللہ کے بعد پھر کھول دینے والا بھی کوئی نہیں ۔۔۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ کوئی خدا اس کے سوا نہیں، پھر تم کہاں سے دھوکا کھا رہے ہو؟ (فاطر: ۲۔۳)

"اے نبیؐ، اِن سے پوچھو کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دی جاسکتی؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو۔ وہ ضرور کہیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہو پھر کہاں سے تم دھوکا کھا رہے ہو؟" (المومنون ۹)

"اللہ حکومت کر رہا ہے اور کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے" (الرعد ۔ ۴۱)

"اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان کا نظام بگڑ

جاتا پس پاک ہے اللہ عرش کا مالک، اُن باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کے لیے کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔ کیا اِن لوگوں نے اُس کے سوا دوسرے خدا بنا رکھے ہیں؟ اِن سے کہو لاؤ اپنی دلیل" (الانبیاء: ۲۲ تا ۲۴)۔

"اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ دُوسرا کوئی خدا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ اُن باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں" (المومنون۔ ۹۱)۔

"اے نبیؐ، اِن سے کہو اگر اُس کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو وہ مالکِ عرش کے مقام پر پہنچنے کی ضرور کوشش کرتے۔ پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں" (بنی اسرائیل: ۴۲-۴۳)۔

یہ اُن بہت سی آیات میں سے چند ہیں جن میں توحید کے ایسے مضبوط دلائل دیئے گئے ہیں کہ کوئی شخص ذرا سی عقل بھی رکھتا ہو تو یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ زمین سے آسمانوں تک اِس کائنات کا عظیم الشان نظام ایک خدا کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اُسی کے بناتے یہ بنا ہے اور اسی کے چلائے یہ چل رہا ہے۔ اِس میں جو حکمت، جو علم، جو قدرت، جو شانِ رحمت و ربوبیت، جو ضبط و نظم اور باقاعدگی اور کائنات کی بے حد و حساب اشیاء میں جو ہم آہنگی و مناسبت پائی جاتی ہے، وہ صاف بتا رہی ہے کہ یہ سب کچھ ایک خدا کی خدائی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اِس میں کسی دوسرے کے پاس ذرّہ برابر بھی خداوندانہ اختیارات کے ہونے کا کوئی امکان نہیں، ورنہ یہ نظام اِس باقاعدگی کے ساتھ اور اِتنی حکمتوں اور مناسبتوں کے ساتھ کبھی نہ چل سکتا۔ اب ظاہر ہے کہ جب خالق بھی وہ ہے، رازق بھی وہ، نفع و نقصان پہنچانے کا اختیار بھی وہ، اور سارے اختیارات کا مالک بھی وہ، تو دوسرے کون ہیں جن کو معبود ہونے کا حق پہنچتا ہو؟ اور اُس کی خلق میں کسی دوسرے کا حکم کیسے چل سکتا ہے؟ انسان اگر کسی کی بندگی کرتا ہے تو یہی سمجھ کر کرتا ہے کہ وہ کسی قسم کے اختیارات رکھتا ہے اور اُس کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت حاصل ہے۔ مگر جب اسے معلوم ہو جائے کہ اُسے کوئی قدرت و اختیار حاصل نہیں ہے تو کوئی شخص اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ خواہ مخواہ اُس کی بندگی بجا لائے۔

(۲) شرک کی تردید کے دلائل

جس قوت کے ساتھ قرآن میں توحید کو ثابت کیا گیا، اُسی قوت کے ساتھ شرک کی تردید میں ایسے دلائل دیئے گئے جو اُس کو بالکل پاش پاش کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہاں بھی ہم صرف آیات کے تراجم درج کریں گے۔

"آگاہ رہو، آسمان کے بسنے والے ہوں یا زمین کے، سب اللہ کے مملوک ہیں۔ اور جو لوگ

اللہ کے سوا کچھ دوسرے شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم و گمان کی پیروی اور محض قیاس آرائی کر رہے ہیں" (یُونس - ۶۶) ۔

"اُس کو چھوڑ کر جن کی تم بندگی کر رہے ہو وہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے اُن کے (معبود یا شریکِ خدائی ہونے) کی کوئی سند نازل نہیں کی" (یُوسف - ۴۰)

"پس تم اُن معبُودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہو جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اُسی طرح پُوجا پاٹ کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے اِن کے باپ دادا کرتے تھے" (ہُود - ۱۰۹) ۔

"اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ (باپ دادا ہی کی تقلید کرتے رہیں گے) خواہ شیطان اُن کو بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب ہی کی طرف بلاتا رہا ہو؟" (لُقمان - ۲۱) ۔

"کیا اِس سے پہلے ہم نے کوئی کتاب اِن کو دی تھی جس کی سند (اپنی ملائکہ پرستی کے لیے) یہ اپنے پاس رکھتے ہوں؟ نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ اِسی طرح، اے محمدؐ، تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی متنبہ کرنے والا بھیجا، اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے اُن سے پُوچھا کیا تم اُسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ اُس راستے سے زیادہ صحیح راستہ میں تمہیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسُولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو اس کے ہم منکر ہیں" (الزُّخرُف - ۲۱ تا ۲۴) ۔

"اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن کی بندگی کر رہے ہیں جن کے (معبُود ہونے کی) اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے اور نہ اِن کے پاس (اُن کے خدائی میں حصہ دار اور عبادت کے مستحق ہونے کا) کوئی علم ہے" (الحج - ۷۱) ۔

اِن آیات اور ایسی ہی دوسری آیات میں صاف صاف یہ بتا دیا گیا کہ مشرکین کے پاس دوسروں کو خدا کا شریک اور عبادت کا مستحق ٹھہرانے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے ۔ وہ صرف باپ دادا کی اندھی تقلید کر رہے

ہیں اور اپنی جگہ محض قیاس و گمان سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ فلاں فلاں ہستیوں کو خدائی کے اختیارات میں سے کوئی حصہ ملا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ ان کی مرادیں برلاتی ہیں، حالانکہ خدا نے کبھی کسی ذریعہ سے انہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ میں نے اپنے اختیارات کا فلاں حصہ فلاں ہستی کو دے دیا ہے، نہ ان کے پاس براہِ راست اس کا کوئی علم ہے کہ فلاں حضرت یا بزرگ یا دیوی یا دیوتا کو خدائی کے اختیارات میں سے یہ یہ اختیارات حاصل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن میں پے در پے شرک کے غلط اور بے حقیقت ہونے کے دلائل بھی دیئے گئے :-

"بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے وہ خوشنما باغ اگائے جن کے درختوں کا اُگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں، بلکہ یہی لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔ اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں (کھاری اور میٹھے) کے درمیان پردے حائل کر دیئے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں بلکہ ان میں سے اکثر لوگ بے علم ہیں۔ کون ہے جو بے بس کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اُسے پکارے؟ اور کون اُس کی تکلیف کو دُور کرتا ہے؟ اور کون تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔ کون ہے جو تم کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ دکھاتا ہے؟ اور کون ہواؤں کو اپنی رحمت (بارش) سے آگے خوشخبری لے کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (یہ کام کرتا) ہے؟ اللہ بہت بالاتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کون تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون تمہیں آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصہ دار) ہے؟ اے نبیؐ، ان سے کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم (اپنے شرک میں) سچے ہو"

(النمل، ۶۰ تا ۶۴)۔

"نہایت مبارک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ دنیا جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والا ہو۔ وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اُس کی ایک تقدیر مقرر کر دی۔ لوگوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، جو اپنے لیے کسی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، جو نہ مار سکتے

ہیں نہ جلا سکتے ہیں نہ مرے ہوئے کو پھر اُٹھا سکتے ہیں" (الفرقان - ۱-۳)۔

سُورۂ نحل میں آیت ۳ سے ۱۶ تک اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے بہت سے کرشمے بیان کرنے کے بعد فرمایا:

"پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، دونوں یکساں ہیں؟ کیا تم ہوش میں نہیں آتے؟ (آیت: ۱۷)۔

"اے نبیؐ، ان سے پوچھو آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ کہو اللہ پھر ان سے کہو کیا اس کو چھوڑ کر تم نے دوسروں کو اپنا کارساز ٹھیرا لیا جو خود اپنے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے؟ ان سے کہو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہوا کرتے ہیں؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟ ان لوگوں نے جن کو اللہ کا شریک ٹھیرا رکھا ہے کیا انہوں نے بھی کچھ اللہ کی طرح پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے لیے تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟ ان سے کہو اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ یکتا ہے سب پر غالب" (الرعد-۱۶)۔

"اے نبیؐ، ان سے کہو کبھی تم نے دیکھا بھی ہے اپنے اُن شریکوں کو جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ مجھے بتاؤ اُنہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں میں اُن کی کوئی شرکت ہے؟ یا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس کی بنا پر یہ (اپنے شرک کے لیے) کوئی صاف سند رکھتے ہوں؟ کچھ نہیں، بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے دیے جا رہے ہیں" (فاطر-۴۰)۔

"اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ ان سے کہو، پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ تمہاری دیویاں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو مجھے اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچا لیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اُس کی رحمت کو روک دیں گی؟ (اگر وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایسا کر سکتی ہیں تو) ان سے کہہ دو کہ میرے لیے بس اللہ ہی کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں" (الزمر-۳۸)۔

مشرکین کہتے تھے کہ ہمارے معبود اللہ کے ہاں ہمارے لیے ذریعۂ تقرب اور ہماری سفارش کرنے والے ہیں، اس لیے ہم اُن کی عبادت کرتے ہیں، ان سے دُعائیں مانگتے ہیں، ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں، تاکہ وہ ہمارے پشتیبان ہوں، ہمیں نفع پہنچائیں اور نقصان سے بچائیں۔ اُن کے اس خیال کی بھی مفصل تردید قرآن میں کی گئی۔

"یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے نبیؐ، ان سے کہو کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے

رہے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟ پاک ہے وہ اور بالاتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں" (یونس - ۱۸)۔

"اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ اپنے دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو اُن کی عبادت صرف اِس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں۔ اللہ یقیناً اُن کے درمیان اُن تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکرِ حق ہو" (الزمر - ۳)۔

"اِن لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ اور خدا بنا رکھے ہیں تاکہ وہ اِن کے پشتیبان ہوں۔ کوئی پشتیبان نہ ہوگا۔ وہ سب اُن کی عبادت کا انکار کریں گے اور (آخرت میں) اُلٹے اِن کے مخالف بن جائیں گے" (مریم - ۸۱ - ۸۲)۔

"اِن لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ دوسرے خدا بنا رکھے ہیں اور یہ اُمید رکھتے ہیں کہ اِن کی مدد کی جائیگی۔ وہ اِن کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ اُلٹے اُن کے لیے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں (جن کی بدولت اُن کی خدائی چل رہی ہے)" (یٰسٓ ۷۴ - ۷۵)۔

"کون ہے جو اللہ کے ہاں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟" (البقرہ ۲۵۵)۔

"اے نبیؐ (اِن مشرکوں سے) کہو کہ پکار دیکھو اُن کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ ذرہ برابر کسی چیز کے مالک نہیں ہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں (نہ زمین و آسمان کی خدائی میں) ان کی کوئی شرکت ہے، اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے۔ اور اللہ کے ہاں شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی سوائے اُس کے جسے (شفاعت کرنے اور جس کے حق میں شفاعت کرنے کی) اللہ نے اجازت دی ہو" (سبا: ۲۲-۲۳)۔

"اور اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پکارے جو قیامت تک اُسے کوئی جواب نہیں دے سکتے بلکہ وہ اِس سے بھی بے خبر ہیں کہ یہ لوگ اُن سے دُعا مانگ رہے ہیں، اور جب لوگ حشر میں جمع کیے جائیں گے اس وقت وہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے" (الاحقاف: ۵-۶)۔

"اللہ ہی کو پکارنا برحق ہے۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اُس کو چھوڑ کر یہ پکار رہے ہیں وہ اِن کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انہیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص ہاتھ پھیلا کر پانی سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا، حالانکہ پانی اُس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اِسی

طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف" (الرعد۔۱۴)۔

"جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ کچھ علم رکھتے" (العنکبوت۔۴۱)۔

"لوگو، ایک مثال دی جاتی ہے ذرا اُسے غور سے سنو۔ اللہ کو چھوڑ کر جن کو تم پکارتے ہو انہوں نے ایک مکھی بھی پیدا نہیں کی ہے چاہے وہ سب مل کر ایسا کرنا چاہیں۔ بلکہ اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر پہچانی ہی نہیں جیسا کہ اس کی قدر پہچاننے کا حق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوت والا اور زبردست تو اللہ ہی ہے" (الحج: ۷۳-۷۴)۔

"کیا یہ لوگ اُن کو خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں؟ جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں نہ آپ اپنی مدد کرنے پر قادر ہیں" (الاعراف ۱۹۱-۱۹۲)۔

سُورۂ نحل میں آیت ۶۵ سے ۷۲ تک انسان پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اس کی نعمتوں کو بیان کرنے کے بعد ارشاد ہُوا۔

"تو کیا لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہُوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احسان کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کرتے ہیں جن کے اختیار میں نہ آسمانوں سے ان کو کوئی رزق دینا ہے نہ زمین سے اور نہ وہ یہ کام کر ہی سکتے ہیں" (النحل: ۷۲-۷۳)۔

"کیا اللہ کو چھوڑ کر ان لوگوں نے کچھ ہستیوں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ اُن کے اختیار میں کچھ بھی نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک وہی ہے۔ پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو" (الزُّمر: ۴۳-۴۴)۔

"تمہارے گرد و پیش بہت سی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ ہم نے آیات بھیج کر طرح طرح سے اُن کو سمجھایا کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔ پھر کیوں نہ اُن ہستیوں نے اُن کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر اُنہوں نے تقرّب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہُوئے معبود بنا لیا تھا؟ بلکہ (عذاب آنے کے وقت) وہ اُن سے گم ہو گئے (اور یہ تھا اُن کے جھوٹ اور اُن بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے" (الاحقاف۔ ۲۷-۲۸)۔

سُورۂ فاطر میں آیت ۱ سے ۱۳ تک اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے بیان کرنے کے بعد فرمایا:

"وہی اللہ (جس کے یہ سارے کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اُسی کی ہے۔ اُسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو وہ پرکاہ کے برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری دُعائیں سُن نہیں سکتے، اور سُن بھی لیں تو تمہیں اُن کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کریں گے" (فاطر: ۱۳-۱۴)۔

"اللہ ہی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ رہے وہ جن کو (یہ مشرکین) اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ نہیں کرتے۔ درحقیقت اللہ ہی سب کچھ سُننے اور دیکھنے والا ہے" (المؤمن: ۲۰)۔

پھر لوگوں کو بتایا گیا کہ جو کوئی عزت (کسی پشتیبان طاقت کی مدد) چاہتا ہو اسے کوئی سفارشی اور ذریعۂ تقرّب الیٰ اللہ تلاش کرنے اور اس کے آگے دُعائیں اور التجائیں اور نذر و نیاز پیش کرنے کی حاجت نہیں۔ اس کا ذریعہ صرف ایک ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ
وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۔ (فاطر: ۱۰)

"جو کوئی عزت چاہتا ہو تو (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔ اُس کی طرف جو چیز اُوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے اور نیک عمل اُسے چڑھاتا ہے"۔

مشرکین اللہ کے لیے اولاد بھی تجویز کرتے تھے اور ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور ان کی عبادت بجالاتے تھے۔ اس پر قرآن میں بڑی سخت تنقید کر کے اس عقیدے کی لغویت ثابت کی گئی:

"ان لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک بنا دیا حالانکہ اس نے اُنہیں پیدا کیا ہے، اور انہوں نے اُس کے لیے بے جانے بُوجھے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں۔ پاک ہے وہ اور بالاتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کی کوئی اولاد کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس کی کوئی شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب، کوئی خدا اس کے سوا نہیں، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اُسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے" (الانعام: ۱۰۰-۱۰۲)۔

"یہ کہتے ہیں کہ رحمان اولاد رکھتا ہے۔ سبحان اللہ، وہ (یعنی فرشتے) تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔ اُس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ جو کچھ

اُن کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے سوائے اُس کے جس کے حق میں سفارش سُننے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور کہیں اُن میں سے کوئی کہہ بیٹھے کہ اللہ کے سوا میں بھی خدا یا معبود ہُوں تو اس کو ہم جہنم کی سزا دیں۔ ایسی ہی جزا ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں" (الانبیاء: ۲۶ تا ۲۹)۔

"اِن لوگوں نے اللہ کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جُز بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھُلا احسان فراموش ہے۔ کیا اپنی مخلوقات میں سے اُس نے خود تو بیٹیاں لیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اُس خدائے رحمان کی طرف منسوب کرتے ہیں اُس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اُس کے منہ پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا پُوری طرح ادا بھی نہیں کر سکتی؟ اور ملائکہ کو جو رحمان کے بندے ہیں انہوں نے عورتیں قرار دے لیا۔ کیا اُن کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے؟ ان کی شہادت لی جائے گی اور ان کو اس کی جواب دہی کرنی ہو گی" (الزخرف: ۱۵-۱۹)۔

"پھر ذرا ان سے پوچھو کیا (اِن کے دِل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے؟ کیا ہم نے فرشتوں کو عورتیں بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سُن رکھو، دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کر لیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے حکم لگا رہے ہو؟ کیا تمہیں ہوش نہیں آتا؟ یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے تو لاؤ اپنی وہ کتاب (جس میں یہ لکھا ہو) اگر تم سچے ہو" (الصّٰفّٰت: ۱۴۹ تا ۱۵۷)۔

"تم نے کبھی اِس لات اور عُزّٰی اور تیسری ایک اور دیوی مَنات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا؟ کیا بیٹے تمہارے لیے ہیں اور بیٹیاں اللہ کے لیے؟ یہ تو بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی (جس میں اس نے خود کہا ہو کہ یہ میری بیٹیاں ہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشاتِ نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں، حالانکہ اُن کے رب کی طرف سے اُن کے پاس ہدایت آ چکی ہے" (النجم: ۱۹ تا ۲۳)۔

شرک کے ایک ایک پہلو کی تردید کرتے ہوئے مشرکین کو قرآن میں یہ بھی بتایا گیا کہ تمہارے معبودوں کا مصرف اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تم اُن کے آگے نذر و نیاز چڑھاتے اور پرستش کے مراسم بجالاتے رہو اور ان سے دعائیں مانگتے رہو کہ وہ دنیا میں تمہارے کام بناتے رہیں۔ تمہارا کوئی معبود بھی ایسا نہیں ہے جو تمہیں یہ ہدایت دیتا ہو کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے صحیح اصول کون سے ہیں اور غلط کون سے، کونسا طریقہ برحق ہے اور کونسا باطل۔ حالانکہ عبادت کا مستحق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ جو اپنے بندوں اور پرستاروں کی رہنمائی بھی کرتا ہو:

"ان سے پوچھو تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ ان سے کہو وہ تو صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر کیا وہ جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے پیروی کا زیادہ حق دار ہے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الّا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ درحقیقت ان میں سے اکثر لوگ گمان و قیاس کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا" (یونس - ۳۶)۔

اس طرح دلائل سے شرک کا پوری طرح قلع قمع کر کے لوگوں کو صاف صاف خبردار کر دیا گیا کہ شرک وہ گناہ ہے جس کی معافی خدا کے ہاں کبھی نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اس سے توبہ نہ کرے، اور اس گناہ کے ساتھ آدمی اپنے زعم میں خواہ کتنے ہی نیک اعمال کرتا رہے وہ سب ضائع ہو جائیں گے:

"اللہ اس بات کو ہرگز معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا جائے۔ اس کے سوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ گھڑا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی" (النساء - ۴۸)۔

"اے محمدؐ، ان سے کہو: پھر کیا اے نادانو، تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو؟ حالانکہ تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام نبیوں کی طرف یہ وحی بھیجی گئی تھی کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا سارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم نامراد ہو کر رہو گے۔ لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں شامل ہو" (الزمر، ۶۴-۶۶)۔

(۵) توحید کے تقاضے

توحید کو حق اور شرک کو ہر لحاظ سے باطل ثابت کرنے کے ساتھ قرآن میں یہ بھی کھول کھول کر بیان کر دیا گیا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کو رب اور معبود ماننے کے بعد لازم کیا آتا ہے:

(۱) اُس سے لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت اور پرستش نہ کی جائے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (الذاریات: ۵۶)

"میں نے جن اور انسانوں کو کسی اور کی عبادت کے لیے نہیں بلکہ، اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔"

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔[1] (حٰمٓ السجدہ - ۳۷)۔

"نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ اُس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر فی الواقع تم اُسی کی عبادت کرنے والے ہو۔"

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۔ (الزُّمَر: ۲-۳)

"اے محمدؐ، ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف برحق نازل کی ہے لہٰذا تم اللہ ہی کی عبادت کرو دین کو اس کے لیے خالص کر کے۔ خبردار رہو دین خالص اللہ ہی کا حق ہے۔"

قُلْ إِنِّيْ نُهِيْتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (المومن - ۶۶)

"کہہ دو کہ مجھے اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ اُن کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔"

(۲) اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگی جائے، کسی کو فوق الفطری (Super Natural) طور پر حاجت روا اور کارساز سمجھ کر اُس سے اپنی حاجات میں مدد نہ مانگی جائے:[2]

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ (الفاتحہ)

"(اے اللہ) تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔"

---

[1] یہ آیت سجدہ ہے۔ اسے پڑھ کر سجدہ کر لیا جائے۔

[2] ایک مدد وہ ہے جو دنیا کے مادی قوانین کے تحت ایک شخص کسی دوسرے شخص یا چیز یا ادارے سے مانگتا ہے۔ یہ توحید کے خلاف نہیں ہے۔ توحید کے خلاف یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ وہ غیبی طور پر جاری دعائیں سنتا ہے اور یہ خیال کرتے ہوئے اس سے مدد مانگی جائے کہ عالم اسباب پر اُس کی حکمرانی ہے یا حکمرانی میں اُس کا کوئی حصہ ہے اور عالم مادی اسباب سے بالاتر طریقہ پر وہ ہماری حاجتیں پوری کر سکتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ - (یونس - ۱۰۶)

" اور اللہ کے سوا کسی اور کو (مدد کے لیے) نہ پکارو جو نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔"

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ - (القصص - ۸۸)

" اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو (مدد کے لیے) نہ پکارو۔ کوئی حقیقی معبود اُس کے سوا نہیں ہے۔"

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ - (المومن - ۶۰)

" اور تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو، میں تمہاری دُعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے مُنہ موڑتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔"[1]

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ - (البقرہ - ۱۸۶)

" اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو میں قریب ہی ہوں[2]، دُعا مانگنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا کا جواب دیتا ہوں[3]۔"

(۳) اِس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا عالم الغیب کسی کو نہ مانا جائے کسی دوسرے کے متعلق یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ کائنات کی تمام پوشیدہ اور ظاہر حقیقتوں کو جانتا ہے اور ماضی سے مستقبل تک ہر چیز کا اُسے علم ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ - (النمل - ۶۵)

" کہو، آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اُن میں سے کوئی بھی غیب کا علم اللہ کے سوا نہیں رکھتا۔"

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ

---

[1] اِس آیت سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ دُعا اور عبادت کی حقیقت ایک ہی ہے جو شخص کسی سے دُعا مانگتا ہے وہ درحقیقت اس کی عبادت کرتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] یعنی مجھ سے دُعا مانگنے کے لیے کسی واسطے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں براہِ راست دعا سنتا ہوں (حاشیہ از مؤلف)

[3] جواب سے مراد ایسا جواب نہیں ہے جو دُعا مانگنے والا بھی سُنے، بلکہ اس سے مُراد یہ ہے کہ تمام درخواستوں پر جوابی کارروائی میں ہی کرتا ہوں۔ (حاشیہ از مؤلف)

مُّبِيْنٍ - (الانعام - ۵۹)

"اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ خشکی اور سمندر میں جو کچھ ہے اُسے وہی جانتا ہے۔ کسی درخت کا ایک پتہ بھی جھڑتا ہے تو وہ اسے جانتا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں اور نہ کوئی خشک و تر ایسا ہے جو ایک واضح دفتر میں درج نہ ہو"

(۴) اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے نام پر یا کسی آستانے پر کوئی جانور ذبح یا قربان نہ کیا جائے، اور ہر ایسا جانور حرام ہو جسے ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام نہ لیا جائے، یا اللہ کے ساتھ کسی اور کا بھی نام لیا جائے۔ قرآن میں ۴ مقامات پر صاف صاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو وہ حرام ہے (البقرہ: ۱۷۳ - المائدہ: ۳ - الانعام: ۱۴۵ - النحل: ۱۱۵)۔ سُورۃ مائدہ میں یہ بھی تصریح ہے کہ غیر اللہ کے لیے نذر کے طور پر قربانیاں چڑھانے کے لیے جو آستانے مشرکین نے بنا رکھے تھے ان پر ذبح کیا ہوا جانور بھی حرام ہے (آیت ۳)۔ پھر سُورۃ انعام میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا:

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (آیت: ۱۱۸)

"پس کھاؤ اُس جانور کے گوشت میں سے جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو"

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ (آیت: ۱۲۱)

"اور نہ کھاؤ کسی ایسے جانور کے گوشت کو جس پر ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، کیونکہ یہ فسق ہے"

(۵) اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو خدا ساری کائنات کی حاکمیت و اقتدار کا لاشریک مالک ہے اُسی خدا کی حاکمیت اور اُسی کے اقتدارِ اعلیٰ کو جملہ انسانی معاملات (اخلاق، تہذیب، تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون، عدالت اور صلح و جنگ وغیرہ) میں بھی تسلیم کیا جائے۔ اُسی کا قانون، قانون ہو کسی دوسرے کو اس کے مقابلے میں قانون سازی کا اختیار نہ ہو۔ اسی کا حرام کیا ہوا حرام اور اسی کا حلال کیا ہوا حلال ہو، کسی کو یہ حق نہ ہو کہ بطورِ خود حلال و حرام تجویز کرے۔ انسان بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت نہ خود مختار بن کر اپنی مرضی چلائے، اور نہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کی مرضی کا قانون و قاعدہ تسلیم کرے۔ انسانی معاملات میں فیصلہ کا اختیار اللہ کو ہو نہ کہ بندوں کو۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (الشوریٰ - ۱۰)

"تمہارے درمیان جس چیز میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے"۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ (الشوریٰ - ۲۱)

"کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والی

ایسی شریعت مقرر کر دی ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا ہے؟

"اس آیت کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں شریکوں سے مراد وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں، جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، جن کے آگے پوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں، بلکہ لامحالہ ان سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے، جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اخلاقی اصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، اور جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور رواجات کو اپنے مذہبی مراسم، اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں اور اپنی سیاست اور حکومت میں اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی ان کو کرنی چاہیے۔" (۸)

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ (التوبہ ۳۱)

انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک خدا کے سوا کسی کی بندگی کا حکم نہیں دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق نہیں۔ پاک ہے وہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

"حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عدیؓ بن حاتم، جو پہلے عیسائی تھے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر مسلمان ہوئے تو انہوں نے منجملہ اور سوالات کے ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ اس آیت میں ہم پر اپنے علماء اور درویشوں کو خدا بنا لینے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کی اصلیت کیا ہے۔ جواب میں حضورؐ نے فرمایا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو کچھ وہ حرام قرار دیتے ہیں اسے تم حرام مان لیتے ہو اور جو کچھ وہ حلال قرار دیتے ہیں اسے حلال مان لیتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا یہ تو ضرور ہم کرتے رہے ہیں۔ فرمایا بس یہی ان کو خدا مان لینا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی سند کے بغیر جو لوگ انسانی زندگی کے لیے جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرتے ہیں وہ دراصل خدائی کے مقام پر بزعم خود متمکن ہوتے ہیں اور جو ان کے اس حق شریعت سازی کو تسلیم کرتے ہیں وہ انہیں خدا بناتے ہیں۔" (۹)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۔ (یونس ۵۹)

"اے نبیؐ، ان سے کہو تم نے کبھی سوچا بھی کہ جو سامان رزق اللہ نے تمہارے لیے نازل کیا تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھیرا لیا؟ ان سے پوچھو کیا اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی

تمہیں یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ۔ (النحل - ۱۱۶)

"اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگاتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔"

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ . . . هُمُ الظَّالِمُونَ . . . هُمُ الْفَاسِقُونَ (المائدہ: ۴۴، ۴۵، ۴۷)

"اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں . . . وہی ظالم ہیں . . . وہی فاسق ہیں۔"

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (الجاثیہ - ۲۳)

"پھر تم نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا (یعنی خود مختار بن گیا اور اپنے نفس کی بندگی کرنے لگا)۔"

اس طرح وہ توحید جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے تھے اُس کا تقاضا صرف یہی نہ تھا کہ لوگ خدائے واحد کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، کسی سے دُعا نہ مانگیں، کسی کے لیے قربانیاں نہ کریں، بلکہ یہ بھی تھا کہ لوگ اپنے تمام رسمی اور رواجی قاعدوں، اور تمام خود ساختہ یا دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین اور ضوابط کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کو قانون دینے والا مانیں اور اسی کے بھیجے ہوئے قانون کی پیروی کریں۔ اس معاملہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کوئی استثناء نہ تھا۔ آپ کو بھی یہ حکم تھا کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کا اتباع کریں اور اپنی مرضی سے خود کسی چیز کو حلال یا حرام نہ کریں۔

اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۔ (الانعام - ۱۰۶)

"اے محمدؐ، پیروی کرو اُس چیز کی جو بذریعہ وحی تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے بھیجی گئی ہے۔"

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۔ (التحریم - ۱)

"اے نبیؐ، تم کیوں اُس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے؟"

یہ گویا ایک ہمہ گیر انقلاب کی دعوت تھی جو صرف مذہب ہی کو نہیں بلکہ پورے نظامِ زندگی کو بدل ڈالنا

جا رہی تھی۔ اِس سے مشرکین عرب میں تو کھلبلی مچنی ہی تھی، مگر خاص طور پر قریش کے مفاد پر اس کی جو شدید ضرب پڑتی تھی اُس پر وہ تلملا اُٹھے، کیونکہ خود ان کے قبیلے اور ان کے اپنے شہر سے اِس دعوت کے اُٹھنے میں اُن کو اپنی صریح تباہی نظر آتی تھی۔ (۱۰)

قریش کی مخالفت کی بڑی اور بنیادی وجہ

قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ قریش کے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت قبول کرنے میں جو خطرہ نظر آتا تھا وہ یہ تھا:

وَقَالُوْا اِنْ نَّتَّبِعِ الْھُدٰی مَعَکَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا۔ (القصص - ۵۷)

"وہ کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ اِس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے۔"

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے کفر و انکار کا سب سے اہم بنیادی سبب یہی تھا۔ اس بات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ تاریخی طور پر اُس زمانے میں قریش کی پوزیشن کیا تھی جس پر ضرب پڑنے کا انہیں اندیشہ تھا۔

قریش کو ابتداءً جس چیز نے عرب میں اہمیت دی وہ یہ تھی کہ ان کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونا انسابِ عرب کی رُو سے بالکل ثابت تھا اور اِس بنا پر اُن کا خاندان عربوں کی نگاہ میں پیرزادوں کا خاندان تھا۔ پھر جب قُصَیّ بن کِلاب کے حُسنِ تدبیر سے یہ لوگ کعبہ کے متولی ہو گئے اور مکہ ان کا مسکن بن گیا تو ان کی اہمیت پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی۔ اِس لیے کہ اب وہ عرب کے سب سے بڑے تیرتھ[1] کے مجاور تھے، تمام قبائلِ عرب میں ان کو مذہبی پیشوائی کا مقام حاصل تھا اور حج کی وجہ سے عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو اُن سے تعلقات نہ رکھتا ہو۔ اِس مرکزی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر قریش نے بتدریج تجارتی ترقی شروع کی اور خوش قسمتی سے روم و ایران کی سیاسی کشمکش نے ان کو بین الاقوامی تجارت میں ایک اہم مقام عطا کر دیا۔ اس زمانے میں روم و یونان اور مصر و شام کی جتنی تجارت بھی چین، ہندوستان، انڈونیشیا اور مشرقی افریقہ کے ساتھ تھی اُس کے سارے ناکے ایران نے روک دیے تھے۔ آخری راستہ بحرِ احمر کا رہ گیا تھا۔ سو یمن پر ایران کے قبضہ نے اسے بھی روک دیا۔ اس کے بعد کوئی صورت اِس تجارت کو جاری رکھنے کے لیے اِس کے سوا نہیں رہ گئی تھی کہ عرب کے تاجر ایک طرف رومی مقبوضات کا مال بحرِ عرب اور خلیج فارس کے بندرگاہوں پر پہنچائیں اور دوسری طرف اُنہی بندرگاہوں سے مشرقی اموالِ تجارت لے کر رومی مقبوضات میں پہنچیں۔ اِس صورتِ حال نے مکہ کو بین الاقوامی تجارت کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔ اُس وقت قریش ہی تھے جنہیں اِس کاروبار کا اجارہ حاصل تھا۔ لیکن عرب کی

---

[1] مُراد یہ ہے کہ خُدا کے ...... کو ایک مت ...... اور ...... کی شکل دے رکھی تھی اور ...... تیرتھ

طوائف الملوکی کے ماحول میں یہ تجارتی نقل و حرکت اِس کے بغیر نہ ہو سکتی تھی کہ تجارتی شاہراہیں جن قبائل کے علاقوں سے گزرتی تھیں ان کے ساتھ قریش کے گہرے تعلقات ہوں۔ سردارانِ قُریش اِس غرض کے لیے صرف اپنے مذہبی اثر پر اکتفا نہ کر سکتے تھے۔ اِس کے لیے انہوں نے تمام قبائل کے ساتھ معاہدات کر رکھے تھے۔ تجارتی منافع میں سے بھی وہ اُن کو حصّہ دیتے تھے۔ شیوخِ قبائل اور با اثر سرداروں کو تحائف و ہدایا سے بھی خوش رکھتے تھے۔ اور سودی کاروبار کا بھی ایک جال انہوں نے پھیلا رکھا تھا جس میں قریب قریب تمام ہمسایہ قبائل کے تجّار اور سردار جکڑے ہوئے تھے۔

اِن حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوتِ توحید اُٹھی تو دینِ آبائی کے تعصّب سے بھی بڑھ کر جو چیز قُریش کے لیے اُس کے خلاف وجہِ اشتعال بنی وہ یہ تھی کہ اِس دعوت کی بدولت اُنہیں اپنا مفاد خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ معقول دلائل اور حجّتوں سے شرک و بُت پرستی غلط اور توحید صحیح بھی ہو تو اُس کو چھوڑنا اور اسے قبول کر لینا ہمارے لیے تباہ کُن ہے۔ ایسا کرتے ہی تمام عرب ہمارے خلاف بھڑک اُٹھے گا۔ ہمیں کعبہ کی تولیت سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ بُت پرست قبائل کے ساتھ ہمارے وہ تمام مُعاہدانہ تعلقات ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے ہمارے تجارتی قافلے رات دن عرب کے مختلف حصّوں سے گزرتے ہیں۔ اِس طرح یہ دین ہمارے مذہبی رسوخ و اثر کا بھی خاتمہ کر دے گا اور ہماری معاشی خوشحالی کا بھی۔ بلکہ بعید نہیں کہ تمام قبائلِ عرب ہمیں سرے سے مکّہ ہی چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔

یہاں پہنچ کر دنیا پرستوں کی بے بصیرتی کا عجیب نقشہ انسان کے سامنے آتا ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بار بار انھیں یقین دلاتے تھے کہ یہ کلمہ جو مَیں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اسے مان لو تو عرب و عجم تمہارے تابع ہو جائیں گے۔ مگر اُنہیں اِس میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو دولت، اثر، رسُوخ ہمیں آج حاصل ہے یہ بھی اِس دعوت کو ماننے سے ختم ہو جائے گا کجا کہ عرب و عجم ہمارے تابع ہوں۔ اُن کو اندیشہ تھا کہ یہ کلمہ قبول کرتے ہی ہم اِس سرزمین میں ایسے بے یار و مددگار ہو جائیں گے کہ چیل کوّے جس طرح گوشت لپک لے جاتے ہیں اُسی طرح ہم اِس سرزمین سے اُچک لیے جائیں گے اور ہمارا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔ اُن کی کوتاہ نظری وہ وقت نہ دیکھ سکتی تھی جب چند ہی سال بعد تمام عرب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ماتحت ایک مرکزی سلطنت کا تابع فرمان ہونے والا تھا، پھر اُسی نسل کی زندگی میں ایران، عراق، شام، مصر، سب ایک ایک کر کے اس سلطنت کے زیرِ نگیں ہو جانے والے تھے، اور اِس قول پر ایک صدی گزرنے سے بھی پہلے قُریش ہی کے خلفاء سندھ سے لے کر اسپین تک اور قفقاز سے لے کر یمن کے سواحل تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے پر حکمرانی کرنے والے تھے۔

اُن کے اس عُذر پر قرآن کا جواب

قرآن مجید میں ان کے اس عُذر کا جو مفصل جواب اسی سُورۃ قصص میں دیا گیا ہے اسے دیکھیے کہ وہ کتنا اثر انگیز تھا۔ فرمایا:

أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّن لَّدُنَّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۔ (القصص۔ ۵۷)

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پُرامن حرم کو ان کے لیے ایک جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں، ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے عذر کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حرم جس کے امن و امان اور جس کی مرکزیت کی بدولت آج تم اس قابل ہوئے ہو کہ دنیا بھر کا مالِ تجارت اس وادیٔ غیر ذی زرع میں چلا آ رہا ہے، کیا اس کو یہ امن اور یہ مرکزیت کا مقام تمہاری کسی تدبیر نے دیا ہے؟ ڈھائی ہزار برس پہلے چٹیل پہاڑوں کے درمیان اس بے آب و گیاہ وادی میں ایک اللہ کا بندہ اپنی بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو لے کر آیا تھا۔ اس نے یہاں پتھروں پر پتھر رکھ کر ایک حُجرہ تعمیر کر دیا اور پکار دیا کہ اللہ نے اسے حرم بنایا ہے آؤ اس گھر کی طرف اور اس کا طواف کرو۔ اب یہ اللہ کی دی ہوئی برکت نہیں تو اور کیا ہے کہ ۲۵ صدیوں سے یہ جگہ عرب کا مرکز بنی ہوئی ہے، سخت بدامنی کے ماحول میں ملک کا صرف یہی گوشہ ایسا ہے جہاں امن میسر ہے، اس کو عرب کا بچہ بچہ احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور ہر سال ہزارہا انسان اس کے طواف کے لیے چلے آتے ہیں۔ اسی نعمت کا ثمرہ تو ہے کہ تم عرب کے سردار بنے ہوئے ہو اور دُنیا کی تجارت کا ایک بڑا حصہ تمہارے قبضے میں ہے۔ اب کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس خدا نے یہ نعمت تمہیں بخشی ہے، اُس سے منحرف اور باغی ہو کر تو تم پھلو پھولو گے، مگر اس کے دین کی پیروی اختیار کرتے ہی برباد ہو جاؤ گے؟

پھر فرمایا:

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ۔ (القصص۔ ۵۸)

"اور کتنی ہی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو، وہ اُن کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں اُن کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے۔ آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔"

یہ اُن کے عذر کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مال و دولت اور خوشحالی پر تم اترائے پھرتے ہو اور جس کے کھوئے جانے کے خطرے سے تم باطل پر جمنا اور حق سے منہ موڑنا چاہتے ہو، یہی چیز کبھی عاد اور ثمود اور سبا اور مدین اور قوم لوط کے لوگوں کو بھی حاصل تھی۔ پھر کیا یہ چیز ان کو تباہی سے بچا سکی؟ آخر معیارِ زندگی کی بلندی ہی تو ایک مقصود نہیں ہے کہ آدمی حق و باطل سے بے نیاز ہو کر بس اُسی کے پیچھے پڑا رہے اور راہِ راست کو صرف اس لیے قبول کرنے سے انکار کر دے کہ ایسا کرنے سے یہ گوہرِ مقصود ہاتھ سے جانے کا خطرہ ہے۔ کیا تمہارے پاس اس کی کوئی ضمانت ہے کہ جن گمراہیوں اور بدکاریوں نے پچھلی خوشحال قوموں کو تباہ کیا اُنہی پر اصرار کر کے تم بچے رہ جاؤ گے اور اُن کی طرح تمہاری شامت کبھی نہ آئے گی؟

آگے فرمایا:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۔ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۔ (القصص: ۵۹)

"اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ اُن کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دے جو اُن کو ہماری آیات سناتے۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے۔"

یہ اُن کے عذر کا تیسرا جواب ہے۔ پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں ان کے لوگ ظالم ہو چکے تھے، مگر خدا نے ان کو تباہ کرنے سے پہلے اپنے رسول بھیج کر انہیں متنبہ کیا، اور جب ان کی تنبیہ پر بھی وہ اپنی کج روی سے باز نہ آئے تو انہیں ہلاک کر دیا۔ یہی معاملہ اب تمہیں درپیش ہے۔ تم بھی ظالم ہو چکے ہو، اور ایک رسول تمہیں بھی متنبہ کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ اب تم کفر و انکار کی روش اختیار کر کے اپنے عیش اور اپنی خوشحالی کو بچاؤ گے نہیں بلکہ اُلٹا خطرے میں ڈالو گے۔ جس تباہی کا تمہیں اندیشہ ہے وہ ایمان سے نہیں بلکہ انکار کرنے سے آئے گی۔

اس کے بعد ارشاد ہوا:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۔ (القصص آیت ۶۰-۶۱)

"تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو کبھی اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے

جسے ہم نے صرف حیاتِ دنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟"

یہ ان کے عذر کا چوتھا جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہییں۔

اوّل یہ کہ دنیا کی موجودہ زندگی جس کی مقدار کسی کے لیے بھی چند سالوں سے زیادہ نہیں ہوتی، محض ایک سفر کا عارضی مرحلہ ہے۔ اصل زندگی جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، آگے آنی ہے۔ موجودہ عارضی زندگی میں انسان خواہ کتنا ہی سروسامان جمع کر لے اور چند سال کیسے ہی عیش کے ساتھ بسر کر لے، بہرحال اسے ختم ہونا ہے اور یہاں کا سب سروسامان آدمی کو یونہی چھوڑ کر اٹھ جانا ہے۔ اس عیش کے مقابلے میں ایک عقل مند اس کو ترجیح دے گا کہ یہاں چند سال مصیبتیں بھگت لے، مگر یہاں سے وہ بھلائیاں کما کر لے جائے جو بعد کی دائمی زندگی میں اس کے لیے ہمیشگی کی موجب بنیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کا دین انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اس دنیا کی متاعِ حیات سے استفادہ نہ کرے اور اس کی زینت کو خواہ مخواہ لات ہی مار دے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کا عیش کم تر ہے اور آخرت کا عیش بہتر۔ اس لیے دنیا کی وہ متاع اور زینت تو آدمی کو ضرور حاصل کرنی چاہیے جو آخرت کی باقی رہنے والی زندگی میں سرخرو کرے، یا کم از کم یہ کہ اسے وہاں کے ابدی خسارے میں مبتلا نہ کرے۔ لیکن جہاں معاملہ مقابلے کا آ پڑے، یعنی دنیا کی کامیابی اور آخرت کی کامیابی ایک دوسرے کی ضد ہو جائیں، وہاں دینِ حق کا مطالبہ انسان سے یہ ہے، اور یہی عقلِ سلیم کا مطالبہ بھی ہے، کہ آدمی دنیا کو آخرت پر قربان کر دے اور اس دنیا کی عارضی متاع و زینت کی خاطر وہ راہ ہرگز اختیار نہ کرے جس سے ہمیشہ کے لیے اس کی عاقبت خراب ہوتی ہو۔

ان دو باتوں کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ اللہ اوپر کے فقروں میں کفارِ مکہ سے کیا فرما رہا ہے۔ وہ یہ نہیں فرماتا کہ تم اپنی تجارت لپیٹ دو، اپنے کاروبار ختم کر دو، اور ہمارے پیغمبر کو مان کر فقیر ہو جاؤ۔ بلکہ وہ یہ فرماتا ہے کہ یہ دنیا کی دولت جس پر تم ریجھے ہوئے ہو، بہت تھوڑی دولت ہے اور بہت تھوڑے دنوں کے لیے تم اس کا فائدہ اس حیاتِ دنیا میں اٹھا سکتے ہو۔ اس کے برعکس اللہ کے ہاں جو کچھ ہے وہ اس کی بہ نسبت کم و کیف (Quantity اور Quality) میں بھی بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی ہے۔ اس لیے تم سخت حماقت کرو گے اگر اس عارضی زندگی کی محدود نعمتوں سے متمتع ہونے کی خاطر وہ روش اختیار کرو جس کا نتیجہ آخرت کے دائمی خسارے کی شکل میں تمہیں بھگتنا پڑے۔ تم خود مقابلہ کر کے دیکھ لو کہ کامیاب آیا وہ شخص ہے

جو محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنے رب کی خدمت بجا لاتے اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کے انعام سے سرفراز ہو، یا وہ شخص جو گرفتار ہو کر مجرم کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کیا جانے والا ہو اور گرفتاری سے پہلے محض چند روز حرام کی دولت سے مزے لوٹ لینے کا اس کو موقع مل جائے؟

آخر میں فرمایا:

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ۔ (القصص۔۶۲)

"اور (بھول نہ جائیں یہ لوگ) اس دن کو جب کہ وہ ان کو پکارے گا، "کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے"۔

یہ تقریر بھی اسی چوتھے جواب کے سلسلے میں ہے، اور اس کا تعلق اُوپر کی آیت کے آخری فقرے سے ہے۔ اس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ محض اپنے دنیوی مفاد کی خاطر شرک و بت پرستی اور انکارِ نبوت کی جس گمراہی پر یہ لوگ اصرار کر رہے ہیں، آخرت کی ابدی زندگی میں اس کا کیسا بُرا نتیجہ انہیں دیکھنا پڑے گا۔ اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ فرض کرو دُنیا میں تم پر کوئی آفت نہ بھی آئے، اور یہاں کی مختصر سی زندگی میں تم حیاتِ دُنیا کی متاع و زینت سے خوب بہرہ اندوز بھی ہو لو، تب بھی اگر آخرت میں اس کا انجام یہی کچھ ہونا ہے تو خود سوچ لو کہ یہ نفع کا سودا ہے جو تم کر رہے ہو یا سراسر خسارے کا سودا؟ (۱۱)

فصل دوم

رسالتِ محمدی پر ایمان کی دعوت

دعوتِ اسلامی کا دوسرا اہم نکتہ یہ تھا کہ لوگ اللہ وحدہٗ لاشریک کو واحد معبود اور واحد حاکم و مقتدرِ اعلیٰ ماننے کے بعد یہ تسلیم کریں کہ رسول ہی وہ ایک مستند و معتبر پیغامبر ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ انسانوں کو ہدایت دیتا ہے، احکام دیتا ہے، عبادت کا صحیح طریقہ بتاتا ہے، صحیح عقائد کی تعلیم دیتا ہے، اخلاق اور اعمال کے صحیح اور غلط اصولوں اور طریقوں کی تمیز سکھاتا ہے، اور اپنے وہ قوانین بھیجتا ہے جن کی پیروی لوگوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں کرنی چاہیے۔ اس لیے اللہ کی توحید پر ایمان لانے کے بعد لوگوں کے لیے یہ لازم ہے

کہ وہ رسُول کی رسالت پر ایمان لائیں، اُس کو منبع الہٰی کا واحد نمائندہ مانیں، سب کی پیروی چھوڑ کر اُس کی پیروی اختیار کریں، اور سب کی اطاعت ترک کر کے اُن احکام و ہدایات کی اطاعت کریں جو رسُول اپنے بھیجنے والے خدائے واحد کی طرف سے دے۔ اس طرح یہ رسالت کا عقیدہ اُس عظیم انقلاب کو عملی شکل دے رہا تھا جو اللہ کی توحید تسلیم کرا کے اسلام انسانی زندگی میں برپا کرنا چاہتا تھا کیونکہ جب توحید کو مان کر انسان اس بات کا قائل ہو جاتے کہ اب اُسے اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرنی ہے اور اُسی کی ہدایت پر چلنا ہے، تو فوراً ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس عقیدے کو عمل میں کیسے لاتے؟ کس ذریعہ سے اس کو یہ معلوم ہو کہ اللہ کی بندگی و عبادت کا صحیح طریقہ کیا ہے اور اُس کی وہ ہدایت کیا ہے جس کی اب اُسے پیروی کرنی چاہیے؟ قرآن نے بتایا کہ وہ ذریعہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو اپنا رسُول بنا کر اُس کو اُن چیزوں کا علم دیتا ہے جن پر عمل کرنا اُس کی مرضی کے مطابق ہے، اور اُس کی بندگی بجا لانے کے لیے کوئی عملی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ رسُول کی رسالت مان کر اُس کی پیروی و اطاعت کی جائے۔ یوں تمام مختلف عقائد و افکار، اوہام و تخیلات، مذاہب و ادیان، رسُوم و قوانین، اور ارباب متفرقین کی پیروی و اطاعت میں بٹی ہوئی انسانیت ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے اور وہ دین عملاً قائم ہو جاتا ہے جس پر نوعِ انسانی کو مجتمع کرنا اسلام کی دعوت کا مقصود ہے۔

اِس سلسلے میں قرآن مجید کی تعلیمات کو حسبِ ذیل ترتیب کے ساتھ اگر دیکھا جائے تو بات پُوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔

اِبتدائے آفرینش میں انبیاء کی بعثت کا اعلان

نبوت کے متعلق پہلی بات جو قرآن میں بتائی گئی وہ یہ تھی کہ زمین پر نوعِ انسانی کے آغاز ہی کے وقت اولادِ آدم کو خبردار کر دیا گیا تھا کہ رسُولوں کے ذریعہ سے جو ہدایت اُن کو بھیجی جائے گی اُس کی پیروی انہیں کرنی ہو گی:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ (الأعراف: ۳۵-۳۶)

"اے بنی آدم، اگر تمہارے پاس خود تمہی میں سے (یعنی انسانوں میں سے) ایسے رسُول آئیں جو تمہیں میری آیات سُنا رہے ہوں تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویّے کی اصلاح کرے گا اس کے لیے خوف اور رنج کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے

مقابلے میں سرکشی برتیں گے وہی اہلِ دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

رسولوں کو ماننے یا نہ ماننے پر انسان کی فلاح و خسران کا انحصار

یہی بات سورۃ البقرہ آیات ۳۸-۳۹ اور سورۃ طٰہٰ آیات ۱۲۳-۱۲۴ میں بیان کی گئی جہاں زمین پر آدم و حوا علیہما السّلام کے اُتارے جانے کا ذکر آیا ہے۔ اس میں صرف یہی خبر نہیں دی گئی تھی کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے رسول بھیجے جائیں گے بلکہ یہ بھی متنبّہ کر دیا گیا تھا کہ ان کی فلاح و خسران کا انحصار اسی بات پر ہوگا کہ وہ رسولوں کی ہدایت کو قبول کر کے تقویٰ اور صلاح کی راہ اختیار کرتے ہیں یا نہیں۔ نہ کریں گے تو دنیا میں بھی سزا پائیں گے اور جہنّم کا عذاب بھی مول لیں گے۔ چنانچہ جگہ جگہ دنیا میں قوموں پر عذاب آنے کی وجہ یہی بیان کی گئی کہ انہوں نے اپنے ہاں آنے والے رسولوں کی بات ماننے سے انکار کیا تھا۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا:

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ - وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ - ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ - إِنَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ - (المؤمن: ۲۱-۲۲)

"اور کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اُن لوگوں کا انجام اِنہیں نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے (یعنی قریش سے) زیادہ طاقت ور تھے اور اِن سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے۔ پھر اللہ نے اُن کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ اُن کا انجام اس لیے ہُوا کہ ان کے پاس رسول بیّنات[1] لے کر آتے تھے مگر انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخرکار اللہ نے انہیں پکڑ لیا۔ یقیناً وہ بڑی قوّت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔"

قریب قریب یہی بات سورۃ فاطر آیات ۲۵-۲۶ اور سورۃ تغابن آیات ۵-۶ میں بیان کی گئی ہے، اور قرآن اُن قوموں کے قصّوں سے بھرا پڑا ہے جنہوں نے اپنے اپنے عہد کے رسولوں کی تکذیب کی اور آخرکار

---

[1] بیّنات سے مُراد تین چیزیں ہیں (۱) ایسی نمایاں علامات اور نشانیاں جو اُن کے مامور من اللہ ہونے پر شاہد تھیں (۲) ایسی روشن دلیلیں جو ان کی پیش کردہ تعلیمات کے حق ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں (۳) زندگی کے مسائل و معاملات کے متعلق ایسی واضح ہدایات جنہیں دیکھ کر ہر معقول آدمی یہ جان سکتا تھا کہ ایسی پاکیزہ تعلیم کوئی جھوٹا خود غرض آدمی نہیں دے سکتا۔ (حاشیہ از مؤلف)

دنیا ہی میں اُن پر عذاب آگیا ۔

پھر آخرت کے متعلق بتایا گیا کہ وہاں انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت بھی اس بنیاد پر قائم ہوگی کہ تمہارے پاس رسول بھیج کر تمہیں حق اور باطل کا فرق ، اور سیدھا راستہ صاف صاف بتا دیا گیا تھا ، اِس کے باوجود تم نے اُن کو نہ مانا اور ان کی اطاعت نہ کی ، اس لیے اب تم عذاب جہنم کے مستحق ہو ۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيِّينَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ...... رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى ٱللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ ٱلرُّسُلِ (النساء: ۱۶۳ تا ۱۶۵)

" اے محمدؐ ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اُس کے بعد آنے والے نبیوں کی طرف بھیجی تھی ...... یہ سب رسُول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ اُن کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے ۔"

یعنی ان سب پیغمبروں کا کام یہ تھا کہ جو لوگ ان کی لائی ہوئی تعلیم پر ایمان لاکر اپنے طرزِ فکر و عمل کو اس کے مطابق درست کر لیں ان کو فلاح و سعادت کی خوشخبری سُنا دیں ، اور جو نہ ایمان لائیں نہ فکر و عمل کی غلط راہوں پر چلنا چھوڑیں اُن کو انجامِ بد سے ڈرا دیں ۔ اور ان سب پیغمبروں کو بھیجنے کی غرض یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے راہِ حق صاف صاف بتا کر نوعِ انسانی پر حجت تمام کر دینا چاہتا تھا تاکہ آخرت کی عدالت میں کوئی کافر و مجرم یہ عذر نہ پیش کر سکے کہ ہم کو حقیقت بتانے کا تو کوئی انتظام کیا نہیں گیا اور اب ہم بےخبری میں پکڑے جا رہے ہیں ۔

آخرت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں خبردار کر دیا گیا کہ منکرین اور مخالفینِ رسالت کے تمام اعمال (جن کو وہ اپنے نزدیک نیک سمجھ کر کرتے رہے) وہاں ضائع ہو جائیں گے اور جب ان لوگوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا تو اُن سے کہا جائے گا کہ تم پر رسُولوں کے ذریعہ سے حجت تمام ہو چکی تھی ، اس لیے اب جو سزا تم بھگت رہے ہو اس کے تم فی الواقع مستحق ہو ۔

إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَصَدُّوا۟ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَشَآقُّوا۟ ٱلرَّسُولَ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ ٱلْهُدَىٰ لَن يَضُرُّوا۟ ٱللَّهَ شَيْـًٔا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَٰلَهُمْ ۔ (محمد ۔ ۳۲)

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کیا[1] اور اللہ کی راہ سے روکا[2] اور رسُول سے جھگڑا کیا جبکہ

---

[1] یعنی رسُول کو اور اس کی لائی ہوئی تعلیم کو ماننے سے انکار کیا ۔ (حاشیہ از مؤلف) [2] اصل میں صَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ہے

راہِ راست اُن پر واضح ہو چکی تھی، وہ اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا۔"

اِس موقع پر اللہ تعالیٰ اُن سے پُوچھے گا:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۔ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا ۔ وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۔ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (الانعام: ۱۳۰-۱۳۱)۔

"اے گروہِ جن و انس، کیا تمہارے پاس خود تم ہی میں سے وہ رسُول نہ آئے تھے جو تم کو میری آیات سُناتے تھے اور اِس دن کے انجام سے ڈراتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ "ہم اپنے خلاف خود شہادت دیتے ہیں"۔ دُنیا کی زندگی نے اُن کو دھوکے میں ڈال رکھا تھا (مگر آخرت میں) وہ اپنے اُوپر خود گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔ (یہ شہادت ان سے اس لیے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ) تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جبکہ اُن کے بسنے والے (حق سے) بے خبر ہوں۔"

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۔ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۔ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۔ فَاعْتَرَفُوْا

الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ صدّ کا لفظ عربی زبان میں لازم اور متعدّی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اِس لیے اِن الفاظ کے معنی یہ بھی ہیں کہ خود اللہ کا راستہ اختیار کرنے سے باز رہے۔ اور یہ معنی بھی ہیں کہ انھوں نے دوسروں کو اس راہ پر آنے سے روکا۔ روکنے کی بھی کئی صُورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زبردستی کسی کو ایمان لانے سے روک دے۔ دوسرے یہ کہ ایمان لانے والوں پر ایسا ظلم و ستم ڈھائے کہ ان کا ایمان پر قائم رہنا اور دوسروں کا ایسے خوفناک حالات میں ایمان لانا مشکل ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے دین اور اس کے پیش کرنے والے رسُول کے خلاف لوگوں کو ورغلائے اور ایسے وسوسے دلوں میں ڈالے کہ لوگ بدگمان ہو کر خدا کے راستے پر آنے سے رُک جائیں۔ اِس کے علاوہ ہر کافر معاشرہ خدا کے راستے میں ایک سنگِ گراں ہے کیونکہ وہ اپنی تعلیم و تربیت، اپنے اجتماعی نظام، اپنے رسم و رواج اور اپنے تعصّبات سے دینِ حق کے پھیلنے میں شدید رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (الملک ۸ تا ۱۱)

وہ جب بھی کوئی انبوہ جہنم میں ڈالا جائے گا اُس کے کارندے اُن لوگوں سے پوچھیں گے "کیا تمہارے پاس کوئی نذیر (خبردار کرنے والا) نہیں آیا تھا؟"[1] وہ جواب دیں گے: "ہاں نذیر آیا تھا مگر ہم نے اُسے جھٹلایا اور کہا اللہ نے کچھ نازل نہیں کیا ہے اور تم بڑی گمراہی میں مبتلا ہو۔" پھر وہ کہیں گے "کاش ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو آج اِس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں شامل نہ ہوتے۔" اِس طرح وہ اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے لعنت ہے ان دوزخیوں پر۔
اِسی سے ملتا جلتا مضمون سورۂ زمر آیات ۷۱-۷۲ میں بیان ہوا ہے۔ اِس سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام میں رسالت کی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ اسی کے ماننے یا نہ ماننے پر دنیا سے آخرت تک انسان کی نیک بختی یا بدبختی کا دارومدار ہے۔

تمام قوموں میں انبیاء آئے اور سب کی دعوت ایک ہی تھی

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا کہ آغاز آفرینش سے تمام قوموں میں انبیاء آتے رہے ہیں۔ اُن سب کا دین ایک تھا، سب کی دعوت بھی ایک تھی، سب کی بعثت کا مقصد بھی ایک تھا، اور اُن سب کا مطالبہ یہ تھا کہ لوگ اللہ کی نافرمانی سے بچیں اور اُن کی اطاعت کریں۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر-۲۴)

"کوئی اُمت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔"

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد-۷)

"ہر قوم کے لیے ایک ہادی تھا۔"

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ (الشعراء-۲۰۸)۔

"ہم نے کوئی بستی ایسی ہلاک نہیں کی جس میں خبردار کرنے والے نہ آئے ہوں۔"

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

---

[1] اِس سوال کی نوعیت یہ نہ ہوگی کہ جہنم کے کارندے اُن سے یہ پوچھنا چاہتے ہوں کہ تمہارے پاس کوئی نذیر آیا تھا یا نہیں بلکہ اس سے مقصود ان کو اِس بات کا قائل کرنا ہوگا کہ انہیں جہنم میں ڈال کر اُن سے بے انصافی نہیں کی جا رہی ہے، اِس لیے وہ خود اُن کی زبان سے یہ اقرار کرانا چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بے خبر نہیں رکھا تھا، ان کے پاس انبیاء بھیجے گئے تھے مگر انہوں نے اُن کی بات نہ مانی اس لیے جو سزا انہیں دی جا رہی ہے اس کے وہ مستحق ہیں۔ (حاشیہ از مرتب)

(النحل : ۳۶)

"اور ہم نے ہر اُمّت میں ایک رسُول (یہ دعوت دینے کے لیے) بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔"

حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک قرآن مجید میں نبی پر نبی کا نام لے کر بیان کیا گیا کہ ہر ایک نے اپنی قوم سے یہی کہا کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ "اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو" (ملاحظہ ہو آل عمران: ۵۰۔ الشعراء: ۱۰۸-۱۱۰-۱۲۶-۱۳۱-۱۴۴-۱۵۰-۱۶۳-۱۷۹۔ الزخرف: ۶۳۔ نوحؑ: ۳)۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد

پھر بتایا گیا کہ سب انبیاء کی بعثت کا مقصد یہ تھا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید: ۲۵)

"ہم نے اپنے رسُولوں کو بیّنات کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان (معیار حق و باطل) نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔"

"انصاف پر قائم ہوں" یعنی اپنے ساتھ انصاف، اپنے خدا کے ساتھ انصاف، ہر اُس انسان کے ساتھ انصاف جس سے اُن کا معاملہ پیش آئے، اپنے معاشرے میں انصاف، اپنے بین دین میں انصاف، اپنی تہذیب و تمدّن میں انصاف، اپنی سیاست و حکومت میں انصاف، اپنی عدالت میں انصاف، بین الاقوامی تعلقات میں انصاف، غرض انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو میں انصاف کا قیام اُن سب کی بعثت کا مقصد تھا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت

نبوّت و رسالت کی تاریخ اور اُس کی حقیقت کے اِس پس منظر میں پہلے قریش کو، پھر اہل عرب کو، پھر ساری دُنیا کو یہ بتایا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُنہی رسُولوں میں سے ہیں جو پہلے بھیجے جاتے رہے ہیں، وہی دین لے کر آئے ہیں جو ابتدائے آفرینش سے تمام رسُولوں کا دین تھا، اُسی دین کو تمام آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک کر کے اُس کی اصل خالص صورت میں پیش کرنے کے لیے آئے ہیں، اور اب خدا کا دین، اُس کی شریعت، اُس کا قانون، اُس کا حکم وہ ہے جو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی بھیجی ہوئی وحی کی بنا پر آپؐ پیش کر رہے ہیں۔ آپؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت اور آپؐ کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ لہٰذا لوگوں کو محض اِس بات پر ہی ایمان نہیں لانا چاہیے کہ آپؐ خدا کے رسُول ہیں، بلکہ ایمان لانے کے بعد ہر ایک کی اطاعت

و پیروی چھوڑ کر بے چون و چرا آپ کی اطاعت و پیروی بھی کرنی چاہیے، کیونکہ آپ کی ہدایت سے انحراف عین اُس خدا کی اطاعت سے انحراف ہے جس نے آپؐ کو رسُول بنا کر بھیجا ہے۔

حضورؐ کی بعثت سے پہلے اہلِ عرب خود ایک نبی مانگ رہے تھے

قبل اس کے کہ اُوپر کے بیانات کی تفصیل پیش کی جائے، یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اہلِ عرب اپنے گردوپیش کے عیسائیوں اور یہودیوں اور ادیانِ سابقہ کے پیروؤں کی گری ہُوئی اخلاقی حالت اور اُن کی بدکرداریاں دیکھ دیکھ کر خود یہ کہتے تھے کہ اگر ہمارے پاس وہ چیز آئی ہوتی جو اِن قوموں کے پاس آئی تھی یعنی رسالت اور خدا کی بھیجی ہُوئی ہدایت، تو ہم اِن سب سے بہتر اُمّت بن کر دکھا دیتے۔ یہ بات قرآن مجید میں ڈنکے کی چوٹ کہی گئی ہے اور منکرین میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اِس امرِ واقعہ کا انکار کرتا:

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ أَهْدَىٰ مِنْ إِحْدَى الْأُمَمِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا ۝ اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (فاطر: ۴۲-۴۳)

"یہ لوگ (یعنی قریش اور اہلِ عرب) کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا (یعنی رسُول) اِن کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دُنیا کی ہر دوسری قوم سے زیادہ راست رو ہوتے۔ مگر جب خبردار کرنے والا اِن کے ہاں آگیا تو اُس کی آمد نے، اِن کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ یہ زمین میں اور زیادہ استکبار کرنے لگے اور بُری بُری چالیں (اُس کو زک دینے کے لیے) چلنے لگے، حالانکہ بُری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔"

وَإِن كَانُوا لَيَقُولُونَ ۝ لَوْ أَنَّ عِندَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۝ لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۝ فَكَفَرُوا بِهِ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (الصّٰفّٰت: ۱۶۷ تا ۱۷۰)۔

"یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس وہ "ذکر" (اللہ کا پیغامِ نصیحت) ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے (مگر جب وہ آگیا) تو انہوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اب عنقریب اِنہیں اس کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔"

اس سے معلوم ہُوا کہ رسُول کی آمد اُن کی مُنہ مانگی مراد تھی، مگر جب وہ نعمت میسّر آگئی تو وہ مخالفت، ضد اور ہٹ دھرمی پر اُتر آئے۔

حضورؐ انبیاءؑ میں سے ہیں اور آپؐ کا ذریعۂ علم وہی وحی ہے جو تمام انبیاءؑ کا تھا

اِن حقائق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ حضورؐ کی رسالت کا تعارف قرآن نے کس طرح کرایا اور آپؐ کی کیا

حیثیت پیش کی۔

یٰسٓ، وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ، اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ
(یٰس: ۱تا۴)

"قرآن حکیم کی قسم، اے محمدؐ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو۔"
یعنی تم رسولوں میں سے ہو اور تمہاری رسالت کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ یہ حکمت سے لبریز قرآن تم پیش کر رہے ہو۔

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا۔(الشوریٰ:۷)
"اور اسی طرح ہم نے (اے محمدؐ) یہ قرآنِ عربی تمہاری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم بستیوں کے مرکز (مکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو۔"

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا۔(الفرقان-۱)
"بڑی برکت والا ہے وہ جس نے یہ فرقان (حق و باطل کا فرق بتانے والا کلام) اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ دُنیا جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والا ہو۔"

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَاِ الَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الاعراف۔۱۵۸)

"اے محمدؐ، کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اُس خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے۔"

اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ، وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَاَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ، وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (النساء-۱۶۳)

"اے محمدؐ، ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی۔ ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی بھیجی اور ہم نے داؤدؑ کو زبور دی۔"

آپؐ کی بعثت کے مقاصد

اگرچہ آپؐ کی بعثت کا مقصد وہی تھا جو تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد ہم اس سے پہلے سورۂ حدید، آیت ۲۵ کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں۔ مگر قرآن مجید میں خصوصیت کے ساتھ آپؐ کو رسول مقرر کرنے کے

مقامد پوری وضاحت کے ساتھ قریش اور اہلِ عرب کے سامنے بیان کیے گئے جن کو ہم سلسلہ وار نقل کرتے ہیں:

آپؐ کی نبوّت ابدی اور عالمگیر ہے

آپؐ کسی ایک قوم کے لیے نہیں اور اپنے زمانے کے تمام انسانوں کے لیے بھی نہیں بلکہ قیامت تک ان سب لوگوں کے لیے رسُول ہیں جن تک آپ کا پیغام پہنچے:

وَأُوْحِيَ إِلَيَّ هَـٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ۔ (الانعام: ۱۹)

" اور یہ قرآن میری طرف اس لیے بذریعۂ وحی بھیجا گیا ہے کہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے اُسے خبردار کر دوں۔"

آپؐ تمام تحریفات سے پاک خالص دین پیش کرنے والے ہیں

آپؐ اپنے سے پہلے آتے ہوئے انبیاء کی لائی ہوئی تعلیمات کی تردید نہیں بلکہ اُن کی تصدیق کرنے والے ہیں، اور آپؐ کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ پچھلے انبیاء کی تعلیمات میں جو آمیزشیں بعد کے زمانوں میں کر دی گئی تھیں اُن سب کو چھانٹ کر اُس اصل دین کو اپنی خالص صورت میں پیش کر دیں جو ابتدائے آفرینش سے نوعِ انسانی کے لیے خدا کا مقرر کردہ ایک ہی دینِ حق تھا۔

یہ بات کہ آپؐ پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تردید کرنے والے نہیں بلکہ تصدیق کرنے والے ہیں، قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ (الصّٰفّٰت۔ ۳۷)

" بلکہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) حق لے کر آئے اور انہوں نے (خدا کے بھیجے ہوئے تمام) رسُولوں کی تصدیق کی۔"

وَمَا كَانَ هَـٰذَا الْقُرْآنُ أَن يُفْتَرَىٰ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَـٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ (یونس۔ ۳۷)

" اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو خدا (کی وحی) کے بغیر خود گھڑ لی جائے۔ بلکہ یہ تو جو کچھ اِس سے پہلے آیا ہُوا تھا اُس کی تصدیق اور الکتاب (یعنی خدا کی طرف سے آئی ہُوئی ہر کتاب) کی تفصیل ہے۔ اِس کے ربّ العٰلمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شک نہیں۔"

* کتاب کی تفصیل سے مُراد یہ ہے کہ تمام وہ اصُولی تعلیمات و ہدایات جو خدا کی کتابوں میں پہلے آئی تھیں ان سب کا لُبِّ لُباب اِس کتاب میں آگیا ہے، بلکہ اس میں اُن کو زیادہ مفصّل طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔

یہ بات بھی قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان کی گئی کہ پچھلی کتابوں کے جو لوگ وارث ہُوئے تھے انہوں نے اپنی

طرف سے اُن میں بہت سی باتیں تبدیل یا داخل کر دی تھیں، اس لیے حضورؐ کا یہ کام بھی ہے کہ ان کو الگ کر کے خدا کی شریعت میں جو اصل حرام ہے اسے حرام اور جو اصل حلال ہے اُسے حلال کریں:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (البقرہ - ۷۹)

"پس ہلاکت اور تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جو خود اپنے ہاتھوں سے ایک کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے"

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔ (آل عمران - ۷۸)

"ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی اور وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں"

اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ تمام آمیزشوں سے پاک، خالص دینِ حق کی تعلیم پیش کریں، اور جو کچھ اس میں حرام ہے اُسی کو حرام اور جو کچھ اس میں حلال ہے اُسی کو حلال قرار دیں۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۔ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۔ (البینہ: ۱-۳)

"اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے وہ (اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ اُن کے پاس دلیلِ روشن نہ آجاتی (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک ایسا رسُول جو (تمام آمیزشوں سے) پاک صحیفے پڑھ کر سناتے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہُوئی ہوں"

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۔ (الاعراف - ۱۵۷)

"(یہ رسُول نبیِ اُمّی) اُن کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے منع کرتا ہے۔ اُن کے لیے پاک

چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے (یعنی اُن کے بطورِ خود ٹھیرائے ہُوئے حلال و حرام کو منسوخ کرتا ہے) اور اُن پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے اور وہ بندشیں کھولتا ہے (جو اُن کے فقیہوں اور مذہبی پیشواؤں کی موشگافیوں اور ان کے جاہل عوام کے رسوم اور توہمات کی بدولت) اُن پر مسلط تھے۔"

احکامِ الٰہی کی قولاً و عملاً تشریح اور تزکیۂ نفوس

آپؐ کے سپرد صرف یہی کام نہیں کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ جو علم آپؐ کو دیا جاتے اُسے لوگوں تک پہنچا دیں بلکہ یہ کام بھی کیا گیا ہے کہ خود اللہ ہی کی طرف سے اُن احکام کا جو مطلب آپؐ کو بتا یا جائے اس کے مطابق اپنے قول اور عمل سے دین کے عقائد، احکام، ہدایات اور قوانین کی توضیح کریں اور اُسی کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کر کے اُن کی بگڑی ہوئی زندگی کو سنواریں:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (القیامۃ: ۱۷ تا ۱۹)

"اس قرآن کو تمہیں یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمّہ ہے لہٰذا، اے نبیؐ، جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو تم اس کی قرأت کو سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمّہ ہے۔"

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل-۴۴)

"اور اے نبیؐ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے نازل کی گئی ہے۔[1]"

---

[1] یہ ارشاد فرما کر اللہ تعالیٰ نے وہ حکمت بیان کر دی جس کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ "ذِکر" کے ساتھ ایک انسان کو پیغمبر بنا کر بھیجا جاتے۔ ذکر تو فرشتوں کے ذریعہ سے بھیجا جا سکتا تھا اور براہِ راست چھاپ کر ہر انسان تک اسے پہنچا دینا بھی اللہ کی قدرت سے دُور نہ تھا۔ مگر اس سے اصل مقصد پُورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایک قابل ترین انسان اسے لے کر آئے۔ جن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے انہیں اُس کا پُورا مطلب سمجھائے جنہیں کچھ شک ہو اُن کا شک رفع کرے۔ جنہیں کوئی اعتراض ہو اُن کے اعتراض کا جواب دے۔ جو نہ مانیں اور مخالفت و مزاحمت کریں ان کے مقابلے میں وہ رویّہ برت کر دکھائے جو اِس ذکر کے لانے والے کے شایانِ شان ہو اور جو مان لیں اُنہیں زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کے متعلق ہدایات دے، ان کے سامنے خود اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرے اور اُن کو تربیت دے کر ساری دنیا کے سامنے ایک ایسا مثالی معاشرہ بنا کر دکھا دے جس کا اجتماعی نظام اس "ذکر" کے منشا کی شرح ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۔ (الجمعہ۔۲)

" وہ اللہ ہی ہے جس نے اُمیّوں کے اندر ایک رسُول خود انہی میں سے اُٹھایا جو انہیں اس کی آیات سُناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے۔ اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے "

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (الحدید:۹)

" وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلّم) پر صاف صاف آیات نازل کرتا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے "

دینِ حق کو پُورے نظامِ زندگی پر غالب کر دینا

آپؐ کی بعثت کا آخری مقصد اس دین و ہدایت کو تمام اقسام کی اطاعتوں اور زندگی کے تمام طریقوں پر غالب کر دینا ہے جسے آپؐ خدا کی طرف سے لائے ہیں۔ اِس مقصد کی صراحت قرآن میں تین مقامات پر کی گئی۔ سُورۂ توبہ اور الصّٰفّٰت میں فرمایا: وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اُسے پُوری جنسِ دین پر غالب کر دے[1]۔ خواہ مُشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

---

[1] آیت میں اَلدِّین کا لفظ استعمال ہُوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے "جنسِ دین" کیا ہے۔ دین کا لفظ عربی زبان میں اُس نظامِ زندگی یا طریقِ زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے قائم کرنے والے کو سَند اور مُطاع تسلیم کر کے اُس کا اِتّباع کیا جائے۔ پس بعثتِ رسول کی غرض اِس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دینِ حق کو خدا کی طرف سے اُس کا رسُول لے کر آیا ہے اُسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسُول کی بعثت کبھی اِس غرض کے لیے نہیں ہُوئی ہے کہ جو نظامِ زندگی اللہ کے سوا دوسروں کو سَند اور مُطاع مان کر چل رہا ہو، رسُول کا لایا ہُوا دین اُس کا تابع اور مغلوب بن کر اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہے، بلکہ رسُول تو بادشاہِ ارض و سما کا نمائندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو سب طریقوں اور نظاموں پر غالب کرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظامِ زندگی دنیا میں رہے بھی تو اُسے خدائی نظام کی بخشی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے جیسا کہ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں ذمّیوں کا نظامِ زندگی رہتا ہے۔ (حاشیہ از مترجم)

(التوبہ: آیت ۳۳۔ الصف آیت ۹۔ یہی مضمون سُورۂ فتح میں بیان کر کے فرمایا گیا ہے" اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے" (آیت ۲۸)۔

حضورؐ پر ایمان اور آپؐ کی اطاعت کا حکم

انہی مقاصد کے عین مطابق لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ آپؐ پر ایمان لائیں، آپ کی پیروی کریں، آپؐ کی اطاعت کریں اور ایسے سب لوگوں کی اطاعت چھوڑ دیں جو اللہ سے غافل اور حدِ بندگی سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

(التغابن: ۸)۔

"پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسُول پر اور اُس نُور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔"

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (الاعراف۔ ۱۵۸)

"پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے بھیجے ہُوئے نبیِّ اُمّی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہے اور پیروی اختیار کرو اُس کی تاکہ تمہیں راہِ راست مل جائے۔"

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ (الاعراف۔۳)

"پیروی کرو اُس ہدایت کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے بھیجی گئی ہے اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔"[1]

---

[1] یعنی تم کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لیے جو علم تمہیں درکار ہے، اور اپنے مذہب، اخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدّن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصُولوں کے تم محتاج ہو، اُن سب کے لیے تمہیں صرف اُس ہدایت کی پیروی کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے رسُول کے ذریعہ سے بھیجی ہے۔ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے رجوع کرنا اور اپنے آپ کو اُس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر ایک غلط طریقِ کار ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے اور ہمیشہ تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔ یہاں "اولیاء" (سرپرستوں) کا لفظ اس معنی میں استعمال ہُوا ہے کہ انسان جس کی رہنمائی پر چلتا ہے اُسے درحقیقت اپنا ولی و سرپرست بناتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء-٦٤)

"ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اُس کی اطاعت کی جائے۔"[1]

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء-٨٠)

"جو رسول کی اطاعت کرے اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔"

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر-٧)۔

"جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ۔"

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (النور: ٥٢)

"اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اُس کی نافرمانی سے بچے، ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔"

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب ٣٦)۔

"کسی ایمان لانے والے مرد یا کسی ایمان لانے والی عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔"

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف: ٢٨)۔

"اور کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور

---

[1] یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اُس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف اُنہی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہ نہ کیا تو پھر اُس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ (حاشیہ از مؤلف)

جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کی اور جس کا طریقِ کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔"

وَلَا تُطِيعُوٓا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشعراء: ۱۵۱-۱۵۲)۔

"اور اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔"

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۔

(آل عمران: ۳۲)

"اے نبیؐ، کہہ دو کہ اللہ اور رسُول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ (اس بات کو قبول کرنے سے) منہ موڑیں تو اللہ ایسے کافروں کو پسند نہیں کرتا۔"

اب قانون وہ ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دیا ہے

اسی طرح حضورؐ کی رسالت کے اعلان اور آپؐ کی اطاعت و پیروی کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ اب خدا کا قانون وہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دیا گیا ہے، کسی کو اس میں آپ سے نزاع کا حق نہیں ہے اس کے خلاف جو کچھ ہے جاہلیت اور طاغوت کی بندگی ہے، اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے مقرر کردہ حاکم ہیں جن کا کام یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق کریں۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

(الجاثیہ: ۱۸)

"پھر (بنی اسرائیل کے بعد) اے نبیؐ، ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کر دیا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو اور اُن لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔"

لِّكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۖ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ ۚ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ

۱؎ یعنی اپنے اُن اُمراء و رؤساء اور ان رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمہارا یہ فاسد نظامِ زندگی چل رہا ہے۔ یہ حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں۔ اخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شترِ بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جس نظام کو چلائیں گے اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمہارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر اللہ کے نبی کی اطاعت کرو۔ (حاشیہ از مؤلف)

إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ۔ (الحج - ۶۷)

"ہر امّت کے لیے ہم نے ایک طریقِ عبادت (یا طریقِ بندگی) مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے پس اے محمدؐ! اس معاملہ میں وہ تم سے جھگڑا نہ کریں[1]۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔"

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۔ (النساء ۔ ۱۰۵)

"اے نبیؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو (راہِ راست) اللہ نے تم کو دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔"

قرآن مجید میں جگہ جگہ انسانی معاشرے کے لیے جو قواعد بیان کیے گئے اُن کے لیے "حدود اللہ" کے الفاظ استعمال فرمائے گئے یعنی یہ وہ حدیں ہیں جن کے اندر رہنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ پھر کہیں سختی کے ساتھ متنبہ کیا گیا کہ ان سرحدوں کے قریب نہ پھٹکنا، کہیں فرمایا گیا کہ ان سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں، کہیں ارشاد ہوا کہ ان سے تجاوز کرنے والے اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں، اور کہیں خبردار کیا گیا کہ تجاوز کرنے والوں کے لیے نارِ جہنّم یا عذابِ الیم ہے۔ (ملاحظہ ہو البقرہ، آیات ۱۸۷- ۲۲۹- ۲۳۰- النساء ۱۳-۱۴- المجادلہ ۴- الطلاق ۱- التوبہ ۹۷)

اس سے معلوم ہو گیا کہ اُس قانون کی اہمیت کیا ہے جو حضورؐ کے ذریعہ سے انسانوں کو دیا گیا ہے اور پھر صاف صاف خبردار کر دیا گیا کہ:

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ

(المائدہ - ۵۰)

"تو پھر کیا یہ لوگ جاہلیت[2] کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے اللہ سے بہتر حکم کس کا ہو سکتا ہے؟"

يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ

---

[1] یعنی جس طرح پہلی اُمّتوں کے انبیاء اپنے اپنے دَور کے لیے ایک منسک (طریقِ عبادت و بندگی) لاتے تھے اسی طرح اِس دَور کی اُمّت کے لیے تم ایک منسک لائے ہو۔ اب کسی کو تم سے نزاع کا حق نہیں ہے، کیونکہ اِس دَور کے لیے اللہ کا منظور کردہ منسک یہی ہے جو تم لاتے ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے، جاہلیت کا طریقہ ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (النساء - ۶۰)

"وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں[۱] حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ وہ گمراہی میں دور نکل جائیں۔"

دین کے معاملہ میں کسی مصالحت و مداہنت کی گنجائش نہیں

اطاعت و اتباعِ رسول کے اِس صاف صاف حکم کے ساتھ لوگوں کو خبردار کر دیا گیا کہ خدا کے دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت و مداہنت نہیں ہو سکتی۔ کسی عقیدے، کسی اصول، کسی ضابطے اور قاعدے اور کسی حکم کے اندر کسی کی خاطر ادنیٰ سا رد و بدل بھی نہیں ہو سکتا۔ جس کو ماننا ہو وہ اُس پورے دین کو مانے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے ہیں، اور جسے نہ ماننا ہو وہ نہ مانے۔ مانے گا تو اپنا ہی بھلا کرے گا، نہ مانے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ یہاں کسی سودے بازی اور لین دین پر سمجھوتے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ - وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم: ۸-۹)

"پس اے نبیؐ، جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو وہ بھی مداہنت کریں (یعنی تم اسلام کی تبلیغ میں کچھ ڈھیل اختیار کرو تو یہ بھی تمہاری مخالفت میں کچھ نرمی اختیار کر لیں، یا تم اِن کی گمراہیوں کی رعایت کر کے اپنے دین میں کچھ ترمیم کر لو تو یہ تمہارے ساتھ مصالحت کر لیں)۔"

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ - قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ (یونس - ۱۵)

"اور جب انہیں ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ (آخرت میں) ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اِس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ، یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔[۲]"

---

[۱] یہاں صریح طور پر طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور وہ نظامِ عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہو اور نہ اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی ہدایت کو آخری سند مانتا ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

[۲] مشرکین کا یہ قول اوّل تو اس مفروضے پر مبنی تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ خدا کی طرف

اے محمدؐ، اِن سے کہو مجھے یہ حق نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں میں تو بس اُس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔"

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف: ۲۹)

"اور کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔"

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (النمل-۹۲)

"پھر جو ہدایت اختیار کرے وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں۔"

قریش اور مشرکین عرب کا ردِّ عمل

اِس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دعوتِ اسلامی کا دوسرا نکتہ یعنی لوگوں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرانا اور اُن کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ عقائد و عبادات سے لے کر

سے نہیں ہے بلکہ اُن کے اپنے دماغ کی تصنیف ہے اور اس کو خدا کی طرف منسوب کر کے انہوں نے صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ ان کی بات کا وزن بڑھ جائے۔ دوسرے اُن کا مطلب یہ تھا کہ یہ تم نے توحید اور آخرت اور اخلاقی پابندیوں کی بحث کیا چھیڑ دی ہے؟ اگر رہنمائی کے لیے اٹھے ہو تو کوئی ایسی چیز پیش کرو جس سے قوم کا بھلا ہو اور اس کی دنیا بنتی نظر آئے تاہم اگر تم اپنی اس دعوت کو بالکل نہیں بدلنا چاہتے تو کم از کم اس میں کچھ لچک ہی پیدا کرو تاکہ ہمارے اور تمہارے درمیان کم و بیش پر مصالحت ہو سکے۔ کچھ ہم تمہاری مانیں کچھ تم ہماری مان لو۔ تمہاری توحید میں کچھ ہمارے شرک کے لیے، تمہاری خدا پرستی میں کچھ ہماری نفس پرستی اور دنیا پرستی کے لیے، اور تمہارے عقیدۂ آخرت میں کچھ ہماری ان اُمیدوں کے لیے بھی گنجائش نکلنی چاہیے کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کرتے رہیں، آخرت میں ہماری کسی نہ کسی طرح نجات ضرور ہو جائے گی۔ پھر تمہارے یہ قطعی اور حتمی اخلاقی اصول بھی ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہیں۔ ان میں کچھ ہمارے تعصبات کے لیے، کچھ ہمارے رسم و رواج کے لیے، کچھ ہماری شخصی اور قومی اغراض کے لیے، اور کچھ ہماری خواہشاتِ نفس کے لیے بھی جگہ نکلنی چاہیے کیوں نہ ایسا ہو کہ دین کے مطالبات کا مناسب دائرہ ہماری اور تمہاری رضامندی سے طے ہو جائے اور اس میں ہم خدا کا حق ادا کر دیا کریں۔ اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس جس طرح اپنی دنیا کے کام چلانا چاہتے ہیں چلائیں مگر تم یہ غضب کر رہے ہو کہ پوری زندگی کو اور سارے معاملات کو توحید و آخرت کے عقیدے اور شریعت کے ضابطہ میں کس دینا چاہتے ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

زندگی کے ہر شعبے تک تمام معاملات میں آپ کی مکمل اطاعت و پیروی قبول کرلیں، اپنے اندر کیا اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی اہمیت یہ تھی کہ دین اس کے بغیر عملاً قائم نہ ہو سکتا تھا، اور رسول پر ایمان اور بالفعل اس کی اطاعت کے بغیر محض خدا کی توحید کو تسلیم کرلینا لاحاصل تھا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو انسان محسوس کر سکتا ہے کہ اللہ کی توحید کو مان لینا قریش اور عام مشرکین عرب کے لیے جتنا مشکل تھا، اس سے بہت زیادہ مشکل رسالت کو ماننا تھا۔ اوّل تو یہی بات ان کے لیے کچھ آسان نہ تھی کہ جو شخص چالیس برس تک ان کے ہاں عام انسانوں کی طرح رہا بسا تھا اس کے متعلق وہ یہ باور کرلیں کہ یکایک وہ اللہ کا رسول مقرر ہو گیا ہے اور اس کے پاس وحی آنے لگی ہے۔ پھر جو لوگ صدیوں سے بے لگام آزادی کے عادی تھے، ان کے لیے اب ایک شخص کی بے چون و چرا اطاعت اور اپنی پوری زندگی میں اس کے دیئے ہوئے قانون کی پیروی قبول کر لینا بھی کچھ کم دشوار نہ تھا۔ اور اس سے زیادہ سخت دشواری ان سرداروں کے لیے تھی جو اب تک اپنے اپنے قبیلوں اور گروہوں کے صاحب امر بنے ہوئے تھے، ان مذہبی پیشواؤں کے لیے تھی جو ملک بھر میں شرک کے بڑے بڑے مراکز کا کاروبار چلا رہے تھے، ان کاہنوں کے لیے تھی جو غیب دانی کے مدعی تھے اور جن کی طرف اپنی گم شدہ چیزوں کے پتے پوچھنے اور اپنے مستقبل کا حال معلوم کرنے کے لیے لوگ رجوع کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے یہ رسالت گویا کھلا کھلا پیغام موت تھی جسے قبول کرنا تو درکنار، ٹھنڈے دل سے سننا بھی ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ غرض ہر وہ شخص جس کا مفاد پرانے جاہلیت کے نظام کی برقراری سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ تھا، اس کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو مان لیں اور یہ تسلیم کرکے ان کے تابع فرمان بن جائیں کہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں وہ خداوند ارض و سماء کی طرف سے ہے تو پھر معاشرے میں اس کا چراغ کسی طرح نہ جل سکے گا۔ اس وجہ سے یہ سارے ہی لوگ اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے اس بات پر تل گئے کہ رسالت کی اس دعوت کو کسی طرح نہ چلنے دیں کیونکہ [illegible] ایک [illegible] کی پیروی اور ایک [illegible] من اللہ [illegible] اطاعت کرنی [illegible] اور مطاع کے بجائے مطیع بن کر رہنا پڑے گا۔

ایک طرف یہ دشواریاں تھیں تو دوسری طرف ایک اور دشواری اور بڑی سخت دشواری اُن کے لیے یہ تھی کہ رسالت کا دعویٰ لے کر ان کے درمیان ایک ایسا شخص اٹھا تھا جو ان کی قوم کا بہترین آدمی تھا، جس کی اخلاقی فضیلت کو ساری قوم مانتی تھی، جس کو پانچ ہی سال پہلے ساری قوم نے بالاتفاق امین کہا تھا، جس نے اپنی رسالت کا دعویٰ پیش کرنے سے عین پہلے کوہ صفا پر چڑھ کر جب پوچھا تھا کہ

"اگر میں تمہیں خبر دُوں کہ پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہے تو کیا تم میری بات مانوگے؟" تو سب نے کہا تھا کہ "ہاں، ہم مان لیں گے کیونکہ ہمیں تم سے کبھی جھوٹ کا تجربہ نہیں ہُوا ہے۔" اِس کے بعد ان کے لیے اُسی شخص کو جھوٹا قرار دینا، اور لوگوں کو بھی اِس بات کا قائل کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا کہ جو عمر بھر دنیا کے کسی معاملہ میں جو شخص کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا وہ آتنا بڑا "جھوٹ" لے کر اُٹھ کھڑا ہُوا ہے کہ خدا نے اُسے رسُول مقرر کیا ہے اور خدا کا کلام اس پر نازل ہوتا ہے۔

اس کے متعلق قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (الانعام - ۳۳)۔

"اَے محمدؐ، ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن سے تمہیں رنج ہوتا ہے لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔"

یہ اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی آیات سنانی شروع نہ کی تھیں، آپ کی قوم کے سب لوگ آپ کو امین اور صادق سمجھتے تھے اور آپ کی راستبازی پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ انہوں نے آپ کو جھٹلایا اُس وقت جب آپ نے اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانا شروع کیا اور اِس دوسرے دَور میں بھی کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شخصی حیثیت سے آپ کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہو۔ آپؐ کے کسی سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپؐ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپؐ دنیا کے کسی معاملہ میں کبھی جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ جتنی بھی انہوں نے آپ کی تکذیب کی نبی ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپؐ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل تھا، اور حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ خود اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اِنَّا لَا نُكَذِّبُكَ وَلٰكِنْ نُكَذِّبُ مَا جِئْتَ بِهٖ "ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے، مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں اُسے جھُوٹ قرار دیتے ہیں۔"[1] جنگ بدر کے موقع پر اخنس بن شریق نے تخلیہ میں ابوجہل سے پوچھا کہ "یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں ہے، سچ بتاؤ کہ محمدؐ کو تم جھوٹا سمجھتے ہو یا سچا؟" اُس نے جواب دیا "خدا کی قسم محمدؐ ایک سچا آدمی ہے، عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ مگر جب لِواء اور حجابت اور سقایت اور نبوّت سب کچھ بنی قُصَیّ ہی کے حصے میں آجائے تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا؟"[2] اسی بنا پر اِس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو

---

[1] یہ روایت امام سفیان ثوری اور حاکم نے حضرت علیؓ سے نقل کی ہے (حاشیہ از مؤلف)

[2] یہ روایت ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔ اخنس بن شریق جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، بنی زہرہ

تسلی دی جا رہی ہے کہ تکذیب دراصل تمہاری نہیں بلکہ ہماری کی جا رہی ہے، اور جب ہم تحمل و بُردباری کے ساتھ اُسے برداشت کیے جا رہے ہیں اور ڈھیل پر ڈھیل دیے جاتے ہیں تو تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟

اعتراضات، الزامات اور عجیب عجیب مطالبات

اس ذہنی مشکل سے دوچار ہونے کے بعد قریش اور دوسرے مشرکین کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ حضورؐ کی رسالت کو نہ ماننے کے لیے طرح طرح کے اعتراضات کریں، مختلف اور متضاد الزامات آپ پر لگائیں، اور عجیب عجیب معجزات دکھانے کا آپ سے مطالبہ کریں۔ لیکن جیسا کہ توحید کے معاملہ میں آپ نے دیکھا کہ شرک کی تردید اور وحدانیت خداوندی کے اثبات کے لیے ایسے ایسے زبردست دلائل پیش کیے گئے تھے جن سے کسی معقول آدمی کے لیے ان حقائق کا انکار کرنے کی گنجائش نہیں رہی تھی، ٹھیک اُسی طرح رسالت کے خلاف بھی مشرکین کے ان تمام حربوں کا مقابلہ ایسے مدلل طریقے سے کیا گیا کہ جس کے دماغ میں بھی کچھ عقل تھی وہ دل میں قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا، خواہ ضد اور ہٹ دھرمی سے وہ مخالفت کرتا رہے۔ (۱۴)

حضورؐ کے انسان ہونے پر اعتراض

ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ ہم ایک ایسے شخص کو خدا کا رسول کیسے مان لیں جو ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے؟ کھاتا ہے، پیتا ہے، بال بچے رکھتا ہے، اور دنیا داری کے وہ سب کام کرتا ہے جو دوسرے انسان کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے اس اعتراض کو نقل کر کے مختلف مقامات پر اس کے جوابات دیئے گئے۔

وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ (الانبیاء۔۳)

"اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص آخر تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے؟"

یہ سرگوشیاں کفارِ مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار آپس میں بیٹھ بیٹھ کر کیا کرتے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کرنے کی بڑی فکر لاحق تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص بہر حال نبی تو ہو نہیں

ہو (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھیالی خاندان کا حلیف تھا۔ اگرچہ جنگ میں قریش کے ساتھ آیا تھا، مگر ابن ہشام کا بیان ہے کہ اس نے اور بنی زہرہ نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

سکتا، کیونکہ ہم ہی جیسا انسان ہے کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جو اس کو ہم سے ممتاز کرتی ہو اور ہماری بہ نسبت اس کو خدا سے ایک غیر معمولی تعلق کا مستحق بناتی ہو؟ البتہ اس شخص کی باتوں میں اور اس کی شخصیت میں ایک جادو ضرور ہے کہ جو بھی اس کی بات کان لگا کر سنتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے اس لیے اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو نہ اس کی سنو اور نہ اس سے میل جول رکھو، کیونکہ اس کی باتیں سننا اور اس کے قریب جانا گویا آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنسنا ہے۔" (۱۳)

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ - لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ۝ أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا - (الفرقان: ۷-۸)

"اور وہ کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا؟ یا اور کچھ نہیں تو اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا گیا ہوتا، یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (اطمینان کی) روزی حاصل کرتا۔ اور ظالم کہتے ہیں "تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔"

اُن کا مطلب یہ تھا کہ اوّل تو انسان کا رسول ہونا ہی عجیب بات ہے۔ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہو۔ تاہم اگر آدمی ہی رسول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک اعلیٰ پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور باریابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا، نہ یہ کہ ایک ایسا عام آدمی خداوند عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں چلتا پھرتا ہو۔ بھلا اس آدمی کو کون خاطر میں لاتے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اُس کے اندر کوئی غیر معمولی پن نہ پایا جاتا ہو۔ بالفاظ دیگر، اُن کی رائے میں رسول کی ضرورت اگر تھی تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ عجوبہ دکھانے یا ٹھاٹھ باٹھ سے دھونس جمانے کے لیے تھی۔

پھر وہ کہتے تھے کہ اگر آدمی ہی کو نبی بنایا گیا تھا تو کم از کم ایک فرشتہ تو اس کے ساتھ کر دیا جاتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ مانو اس کی بات ورنہ ابھی خدا کا عذاب برپا دیتا ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کا مالک ایک شخص کو نبوت کا جلیل القدر منصب

عطا کر کے بس یونہی اکیلا چھوڑ دے اور وہ لوگوں سے گالیاں اور پتھر کھاتا پھرے۔ بدرجۂ آخر اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ اللہ میاں کم از کم اتنا تو کرتے کہ اپنے رسُول کے لیے معاش کا کوئی اچھا انتظام کر دیتے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا رسول ہمارے معمولی رئیسوں سے بھی گیا گزرا ہو۔ نہ خرچ کے لیے مال میسّر، نہ پھل کھانے کو کوئی باغ نصیب، اور دعویٰ یہ کہ ہم اللہ رب العالمین کے پیغمبر ہیں۔ یہ باتیں بنا کر آخر کار وہ کہتے تھے کہ یہ شخص سحر زدہ ہے، یعنی کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اُوپر ان کا جو قول منقول ہوا ہے اس میں وہ آپ کو ساحر کہتے تھے، اور یہاں وہ آپ کو مسحور قرار دیتے ہیں۔ اس پر ایک اور رد شاعر ہونے کی تہمت کا بھی تھا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ (۱۴)

اِس اعتراض کا جواب

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ط (الرعد: ۳۸)

”تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسُول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا۔“

یہ اُس اعتراض کا جواب ہے جو وہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے کہ یہ اچھا نبی ہے جو بیوی بچے رکھتا ہے۔ بھلا پیغمبروں کو بھی خواہشاتِ نفسانی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ فرمایا گیا کہ پہلے جو رسُول بھیجے گئے تھے آخر وہ بھی تو بیوی بچے رکھتے تھے۔ حضرت نوحؑ کو تم خود پیغمبر مانتے ہو۔ اگر وہ بال بچوں والے نہ ہوتے تو تم اُن کی نسل سے کیسے پیدا ہوتے؟ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا پیغمبر ہونا تو تمہارے نزدیک مسلّم ہے۔ انہی سے تو تم اپنا نسب ملاتے ہو۔ پھر وہ بال بچوں والے نہ ہوتے تو تم کہاں سے بنی اسماعیل بن جاتے۔ (۱۵)

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (الانبیاء ۷، ۸)

”اور آپ سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لو۔ اُن رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں، اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔“

یعنی یہ یہودی، جو آج اسلام کی دشمنی میں تمہارے ہم نوا ہیں اور تم کو مخالفت کے داؤ پیچ سکھایا کرتے ہیں، انہی سے پوچھ لو کہ موسیٰؑ اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کون تھے؟ انسان تھے یا

کوئی اور مخلوق ؟ (۱۶)

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوا وَّاسْتَغْنَى اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۔ (التغابن: ۵-۶)

"کیا تمہیں اُن لوگوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اِس سے پہلے کفر کیا اور پھر اپنی شامتِ اعمال کا مزہ چکھ لیا؟ اور آگے (آخرت میں) اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اِس انجام کے مستحق وہ اِس لیے ہوئے کہ اُن کے پاس اُن کے رسول کھلی کھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے، مگر انہوں نے کہا "کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟" اِس طرح انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا، تب اللہ بھی اُن سے بے پروا ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود۔"

یعنی انبیاء ایسی صریح علامات اور نشانیاں لے کر آتے تھے جو اُن کے مامور من اللہ ہونے کی کھلی کھلی شہادت دیتی تھیں۔ وہ جو بات بھی پیش کرتے تھے نہایت معقول اور روشن دلیلوں کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ اُن کی تعلیم میں کوئی اِبہام نہ تھا، بلکہ وہ صاف صاف بتاتے تھے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا؟ کس راہ پر انسان کو چلنا چاہیے اور کس راہ پر نہ چلنا چاہیے؟ لیکن لوگوں نے یہ کہہ کر اُن کی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ "کیا اب انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟" اور یہی چیز اُن کی تباہی کی موجب ہوئی۔ کیونکہ نوعِ انسانی کو دنیا میں صحیح راہِ عمل اِس کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی تھی کہ اِس کا خالق اُسے صحیح علم دے، اور خالق کی طرف سے علم دیئے جانے کی عملی صورت اِس کے سوا کچھ نہ ہو سکتی تھی کہ وہ انسانوں ہی میں سے بعض افراد کو علم عطا کر کے دوسروں تک اُسے پہنچانے کی خدمت سپرد کرے۔ اِس غرض کے لیے اس نے انبیاء کو بیّنات کے ساتھ بھیجا تاکہ لوگوں کے لیے اُن کے برحق ہونے میں شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ رہے۔ مگر انہوں نے سرے سے یہی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ بشر خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ اِس کے بعد اُن کے لیے ہدایت پانے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اِس معاملہ میں گمراہ انسانوں کی جہالت و نادانی کا یہ عجیب کرشمہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ بشر کی رہنمائی قبول کرنے میں تو انہوں نے کبھی تامل نہیں کیا ہے، حتیٰ کہ کچھ انسانوں ہی کی رہنمائی میں لکڑی اور پتھر کے بتوں تک کو انہوں نے معبود بنا لیا، خود انسانوں کو خدا اور خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا تک مان لیا، اور گمراہ کن لیڈروں کی اندھی پیروی میں ایسے عجیب مسلک اختیار کر لیے جنہوں نے انسانی تہذیب و تمدن اور اخلاق کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ مگر جب خدا کے

رسول اُن کے پاس حق لے کر آئے اور انھوں نے ہر ذاتی غرض سے بالاتر ہو کر بے لاگ سچائی ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے کہا "کیا اب بشر ہمیں ہدایت دیں گے"؟ اس کے معنی یہ تھے کہ بشر اگر گمراہ کرے تو سر آنکھوں پہ، لیکن اگر وہ راہِ راست دکھاتا ہے تو اس کی رہنمائی قابلِ قبول نہیں ہے۔

پس جب انہوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے استغنا برتا تو پھر اللہ کو بھی اِس کی کچھ پروا نہ رہی کہ وہ کس گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ اللہ کی کوئی غرض تو ان سے اٹکی ہوئی نہ تھی کہ وہ اُسے خدا مانیں گے تو وہ خدا رہے گا ورنہ خدائی کا تخت اُس سے چھن جائے گا۔ وہ نہ اُن کی عبادت کا محتاج تھا، نہ ان کی حمد و ثنا کا۔ وہ تو اُن کی اپنی بھلائی کے لیے اُنہیں راہِ راست دکھانا چاہتا تھا مگر جب وہ اس سے منہ پھیر گئے تو اللہ بھی ان سے بے پروا ہو گیا۔ پھر نہ اُس نے اُن کو ہدایت دی، نہ اُن کی حفاظت اپنے ذمہ لی، نہ اُن کو ہلاکت میں پڑنے سے بچایا اور نہ انہیں اپنے اوپر تباہی لانے سے روکا، کیونکہ وہ خود اس کی ہدایت اور ولایت کے طالب نہ تھے۔ (۱۰)

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ۔ قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا ۔ (بنی اسرائیل: ۹۴-۹۵)

"لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے اُن کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر اُن کے اِسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟" ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے آرام سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو اُن کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے"

یعنی پیغمبر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ آ کر خدا کا پیغام سنا دیا کرے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اُس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح کرے۔ اُسے انسانی احوال پر اُس پیغام کے اصولوں کا انطباق کرنا ہوتا ہے۔ اُسے خود اپنی زندگی میں اُن اصولوں کا عملی مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ اُسے اُن بے شمار مختلف انسانوں کے ذہن کی گتھیاں سلجھانی پڑتی ہیں جو اُس کا پیغام سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے ماننے والوں کی تعلیم اور تربیت کرنی ہوتی ہے تاکہ اُس پیغام کی تعلیمات کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آئے۔ اُسے انکار اور مخالفت و مزاحمت کرنے والوں کے مقابلہ میں جدوجہد کرنی ہوتی ہے تاکہ بگاڑ کی حمایت کرنے والی طاقتوں کو نیچا دکھایا جائے اور وہ اصلاح عمل میں آسکے جس کے لیے خدا نے اپنا پیغمبر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سارے کام جبکہ انسانوں ہی کے درمیان کرنے کے ہیں تو ان کے لیے انسان نہیں تو اور کون بھیجا جاتا؟ فرشتہ تو زیادہ سے زیادہ بس یہی کرتا کہ آتا اور پیغام پہنچا کر چلا جاتا۔

انسانوں میں انسان کی طرح رہ کر انسان کے سے کام کرتا اور پھر انسانی زندگی میں مشیّتِ الٰہی کے مطابق اصلاح کر کے دکھا دیتا کسی فرشتے کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے تو ایک انسان ہی موزوں ہو سکتا تھا۔ (۱۸)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف - ۱۰۹)

"اے محمدؐ، تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ سب انہی بستیوں کے رہنے والے انسان تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔"

یہاں ایک بہت بڑے مضمون کو ایک ہی جملے میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کو اگر کسی تفصیلی عبارت میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے:

"اے نبیؐ، یہ لوگ تمہاری بات کی طرف اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ جو شخص کل اُن کے شہر میں پیدا ہُوا اور انہی کے درمیان بچے سے جوان اور جوان سے بُوڑھا ہُوا اس کے متعلق ہم یہ کیسے مان لیں کہ یکا یک ایک روز خدا نے اسے اپنا پیغمبر مقرر کر دیا۔ لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے جس سے آج دُنیا میں پہلی مرتبہ انہی کو سابقہ پیش آیا ہو۔ اس سے پہلے بھی خدا اپنے نبی بھیج چکا ہے اور وہ بھی سب انسان ہی تھے پھر یہ بھی کبھی نہیں ہُوا کہ اچانک ایک اجنبی شخص کسی شہر میں نمودار ہو گیا ہو اور اُس نے کہا ہو کہ میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہُوں۔ بلکہ جو لوگ بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے اٹھائے گئے وہ سب اپنی اپنی بستیوں ہی کے رہنے والوں میں سے تھے۔ مسیحؑ، موسیٰؑ، ابراہیمؑ، نوح علیہم السلام آخر کون تھے؟ اُنہی شہروں میں سے اُٹھے تھے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے یا کہیں اور سے آ گئے تھے؟" (۱۹)

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (یونس - ۲)

"کیا لوگوں کے لیے یہ بات بڑی عجیب ہو گئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی کی طرف وحی بھیجی کہ لوگوں کو خبردار کر دے اور ایمان لانے والوں کو بشارت دے دے کہ اُن کے لیے ان کے رب کے ہاں سچی عزت و سرفرازی ہے؟ (کیا یہی وہ بات ہے جس پر منکرین نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے؟"

یعنی آخر اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟ انسانوں کو ہوشیار کرنے کے لیے انسان مقرر نہ کیا جاتا تو کیا فرشتہ یا جن یا حیوان مقرر کیا جاتا؟ اور اگر انسان حقیقت سے غافل ہو کر غلط طریقے سے زندگی بسر کر رہے ہوں تو تعجب کے قابل بات یہ ہے کہ اُن کا خالق و پروردگار انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دے

یا یہ کہ وہ ان کی ہدایت و رہنمائی کا کوئی انتظام کرے؟ اور خدا کی طرف سے عزت و سرفرازی اُن کے لیے ہونی چاہیے جو اُسے مان لیں یا اُن کے لیے جو اُسے رد کر دیں؟ پس تعجب کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ آخر وہ بات کیا ہے جس پر وہ تعجب کر رہے ہیں۔

رہا اُن کا اُس خبردار کرنے والے کو ساحر قرار دینا، تو انہیں سوچنا چاہیے کہ یہ تہمت اُس پر چسپاں بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ صرف یہ بات کہ کوئی شخص اعلیٰ درجہ کی خطابت سے کام لے کر دلوں اور دماغوں کو مسخر کر رہا ہے، اُس پر یہ الزام عائد کر دینے کے لیے تو کافی نہیں ہو سکتی کہ وہ جادوگری کر رہا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اِس خطابت میں وہ بات کیا کہتا ہے، کس غرض کے لیے قوتِ تقریر استعمال کر رہا ہے، اور جو اثرات اس کی تقریر سے ایمان لانے والوں کی زندگی پر مترتب ہو رہے ہیں وہ کس نوعیت کے ہیں۔ جو خطیب کسی ناجائز غرض سے جادو بیانی کی طاقت استعمال کرتا ہے وہ تو ایک مُنہ پھٹ، بے لگام، غیر ذمہ دار مقرر ہوتا ہے۔ حق اور صداقت سے بے نیاز ہو کر ہر وہ بات کہہ ڈالتا ہے جو بس سننے والوں کو متاثر کر دے، خواہ بجائے خود وہ کتنی ہی جھوٹی، مبالغہ آمیز اور غیر منصفانہ ہو۔ اس کی باتوں میں حکمت کے بجائے عوام فریبی ہوتی ہے۔ کسی منظّم فکر کے بجائے تناقض اور ناہمواری ہوتی ہے۔ اعتدال کے بجائے بے اعتدالی ہوا کرتی ہے۔ وہ تو محض اپنا سکہ جمانے کے لیے زبان درازی کرتا ہے یا پھر لوگوں کو لڑانے اور ایک گروہ کو دوسرے کے مقابلے میں اُبھارنے کے لیے خطابت کی شراب پلاتا ہے۔ اُس کے اثر سے لوگوں میں نہ کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہوتی ہے، نہ ان کی زندگیوں میں کوئی مفید تغیر رونما ہوتا ہے، نہ کوئی صالح فکر یا صالح عملی حالت وجود میں آتی ہے، بلکہ لوگ پہلے سے بدتر صفات کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہاں تم دیکھ رہے ہو کہ پیغمبر جو کلام پیش کر رہا ہے اُس میں حکمت ہے، ایک متناسب نظامِ فکر ہے، غایت درجے کا اعتدال اور حق و صداقت کا سخت التزام ہے، لفظ لفظ تُلا ہوا اور بات بات کانٹے کی تول پوری ہے۔ اُس کی خطابت میں تم خلقِ خدا کی اصلاح کے سوا کسی دوسری غرض کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اس میں اُس کی اپنی ذاتی یا خاندانی یا قومی یا کسی قسم کی دنیوی غرض کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ لوگ جن غلطیوں میں پڑے ہوئے ہیں اُن کے بُرے نتائج سے ان کو خبردار کر دے اور انہیں اُس طریقے کی طرف بلائے جس میں اُن کا اپنا بھلا ہے۔ پھر اس کی تقریر سے جو اثرات مترتب ہو رہے ہیں وہ بھی جادو بیان قسم کے خطیبوں کی خطابت کے اثرات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں جس نے بھی اُس کا اثر قبول کیا ہے اُس کی زندگی سنور گئی ہے، وہ پہلے سے زیادہ بہتر اخلاق کا انسان بن گیا ہے اور اُس کے طرزِ عمل میں خیر و صلاح کی شان نمایاں ہو گئی ہے۔ اب تم ہی سوچ لو کیا جادوگر ایسی ہی باتیں کہتے ہیں اور ان کا جادو ایسے ہی نتائج پیدا کیا کرتا ہے؟ (۴۰)

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّيْنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۔ (بنی اسرائیل ۵۵)

"اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض سے بڑھ کر مرتبے دیے، اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی۔"

جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے اس میں داؤد علیہ السلام کو کتاب (زبور) دینے کا الگ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ بادشاہ تھے اور اس کے باوجود پیغمبر تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین جس وجہ سے آپ کی پیغمبری اور خدا رسیدگی ماننے سے انکار کرتے تھے وہ ان کے اپنے بیان کے مطابق یہ تھی کہ آپ عام انسانوں کی طرح بیوی بچے رکھتے تھے، کھاتے پیتے تھے، بازاروں میں چل پھر کر خرید و فروخت کرتے تھے، اور وہ سارے ہی کام کرتے تھے جو کوئی دنیادار آدمی اپنی انسانی حاجات کے لیے کیا کرتا ہے۔ کفارِ مکہ کا کہنا یہ تھا کہ تم تو ایک دنیادار آدمی ہو، تمہیں خدا رسیدگی سے کیا تعلق؟ پہنچے ہوئے لوگ تو وہ ہوتے ہیں جنہیں اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہتا، بس ایک گوشے میں بیٹھے اللہ کی یاد میں غرق رہتے ہیں، وہ کہاں! ادھر گھر کے آٹے دال کی فکر کہاں! اس پر بتایا جا رہا ہے کہ ایک پوری بادشاہت کے انتظام سے بڑھ کر دنیاداری اور کیا ہوگی مگر اس کے باوجود داؤد کو نبوت اور کتاب سے سرفراز کیا گیا (۴۱)

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ (الاحقاف ۹)

"(اے نبی) ان لوگوں سے کہو، میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اور نہ یہ جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے، اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔"

اس ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو مکے کے لوگ اس پر طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو بال بچے رکھتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اور ہم جیسے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جس میں یہ عام انسانوں سے مختلف ہو، اور ہم یہ سمجھیں کہ خاص طور پر اسی شخص کو خدا نے اپنا رسول بنایا ہے۔ پھر وہ کہتے تھے کہ اگر اس شخص کو خدا نے رسول بنایا ہوتا تو وہ اس کی اردلی میں کوئی فرشتہ بھیجتا جو اعلان کرتا کہ یہ خدا کا رسول ہے اور ہر اس شخص پر خدا کا کوڑا برسا دیتا جو اس کی شان میں کوئی ذرا سی گستاخی کر بیٹھتا۔ یہ آخر کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اپنا رسول مقرر کرے اور پھر اسے یوں بے کسی کی گلیوں میں پھرنے اور ہر طرح کی زیادتیاں سہنے کے لیے بے سہارا چھوڑ دے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی ہوتا کہ خدا اپنے رسول کے لیے ایک شاندار محل اور ایک لہلہاتا ہوا باغ ہی پیدا کر دیتا۔ یہ تو نہ ہوتا کہ اس کے رسول کی بیوی کا مال جب ختم ہو جائے تو اسے فاقوں کی نوبت آ جائے اور طائف جانے کے لیے اسے سواری تک میسر نہ ہو۔ پھر وہ لوگ آپ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور غیب کی باتیں آپ سے پوچھتے تھے۔ ان کے خیال میں کسی شخص کا رسولِ خدا ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ فوق البشری طاقتوں کا مالک ہو۔ اس کے

ایک اشارے سے پہاڑ ٹل جائیں اور ریگ زار دیکھتے دیکھتے کشتِ زاروں میں تبدیل ہو جائیں۔ اس کو تمام ماکان و مایکون کا علم ہو اور پردۂ غیب میں چھپی ہوئی ہر چیز اس پر روشن ہو۔

ان باتوں کے جواب میں فرمایا کہ ان سے کہو "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں" یعنی میرا رسول بنایا جانا دنیا کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ تو نہیں ہے کہ تمہیں یہ سمجھنے میں پریشانی لاحق ہو کہ رسول کیسا ہوتا ہے اور کیسا نہیں ہوتا۔ مجھ سے پہلے بہت سے رسول آ چکے ہیں اور میں اُن سے مختلف نہیں ہوں۔ آخر دنیا میں کب کوئی رسول ایسا آیا ہے جو بال بچے نہ رکھتا ہو؟ کھاتا پیتا نہ ہو؟ یا عام انسانوں کی سی زندگی بسر نہ کرتا ہو؟ کس رسول کے ساتھ کوئی فرشتہ اُترا ہے جو اس کی رسالت کا اعلان کرتا ہو اور اس کے آگے آگے ہاتھ میں کوڑا لیے پھرتا ہو؟ کس رسول کے لیے باغ اور محلات پیدا کیے گئے اور کس نے خدا کی طرف بُلانے میں وہ سختیاں نہیں جھیلیں جو میں جھیل رہا ہوں؟ کون سا رسول ایسا گزرا ہے جو اپنے اختیار سے کوئی معجزہ دکھا سکتا ہو یا اپنے علم سے سب کچھ جانتا ہو؟ پھر یہ نرالے معیار میری ہی رسالت کو پرکھنے کے لیے تم کہاں سے لیے چلے آرہے ہو؟

پھر اس کے بعد ان کے جواب میں یہ بھی کہا گیا کہ "میں نہیں جانتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ کیا، میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے بھیجی جاتی ہے" یعنی میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ماضی، حال، مستقبل سب مجھ پر روشن ہوں اور دنیا کی ہر چیز کا مجھے علم ہو۔ تمہارا مستقبل تو درکنار، مجھے تو اپنا مستقبل بھی معلوم نہیں ہے جس چیز کا وحی کے ذریعے سے مجھے علم دے دیا جاتا ہے بس اس کو میں جانتا ہوں۔ اُس سے زائد کوئی علم رکھنے کا میں نے کب دعویٰ کیا ہے اور کونسا رسول ایسے علم کا مالک کبھی دنیا میں گزرا ہے کہ تم میری رسالت کو جانچنے کے لیے میری غیب دانی کا امتحان لیتے پھرتے ہو۔ رسول کا یہ کام کب سے ہو گیا کہ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کے پتے بتاتے، یا یہ بتاتے کہ حاملہ عورت لڑکا جنے گی یا لڑکی، یا یہ بتاتے کہ مریض اچھا ہو جائے گا یا مر جائے گا؟ ۲۲

دوسرا اعتراض کہ حضورؐ ہی کیوں نبی بنائے گئے

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر خدا کو نبی ہی بھیجنا تھا، اور انسانوں ہی میں سے کسی کو بھیجنا تھا تو کیا محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہمارے درمیان اس کام کے لیے اُس کو ملے؟ مکے اور طائف کے بڑے بڑے لوگ مر گئے تھے کہ ان میں سے کسی کو اس کے لیے منتخب نہ کیا گیا؟ ان کا کہنا یہ تھا کہ:

ءَ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا (ص-۸)

"کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر ذکر (خدا کا پیغامِ نصیحت) نازل کیا گیا؟"

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ (الزخرف: ۳۱-۳۲)

"اور وہ کہتے ہیں "یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟" کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں اُن کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے اُن کے درمیان تقسیم کیے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے، تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اُس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔"

دونوں شہروں سے مراد مکہ اور طائف ہیں۔ کفار کا کہنا یہ تھا کہ اگر واقعی خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا اور وہ اُس پر اپنی کتاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا تو ہمارے شہروں میں سے کسی بڑے آدمی کو اس غرض کے لیے منتخب کرتا۔ رسول بنانے کے لیے اللہ میاں کو ملا بھی تو وہ شخص جو یتیم پیدا ہوا، جس کے حصے میں کوئی میراث نہ آئی، جس نے بکریاں چرا کر جوانی گزار دی، جو اب گزر اوقات بھی کرتا ہے تو بیوی کے مال سے تجارت کر کے، اور جو کسی قبیلے کا شیخ یا کسی خاندان کا سربراہ نہیں ہے۔ کیا مکہ میں ولید بن مغیرہ اور عتبہ بن ربیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے؟ کیا طائف میں عروہ بن مسعود، حبیب بن عمرو، کنانہ بن عبد عمرو، اور ابن عبدیالیل جیسے رئیس موجود نہ تھے؟ یہ تھا اُن لوگوں کا استدلال۔ پہلے تو وہ یہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کوئی بشر بھی رسول ہو سکتا ہے۔ مگر جب قرآن مجید میں پے در پے دلائل دے کر ان کے اس خیال کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا، اور اُن سے کہا گیا کہ اس سے پہلے ہمیشہ بشر ہی رسول ہو کر آتے رہے ہیں، اور انسانوں کی ہدایت کے لیے بشر ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ غیر بشر، اور جو رسول بھی دنیا میں آئے ہیں وہ یکایک آسمان سے نہیں اُتر آتے تھے بلکہ انہی انسانی بستیوں میں پیدا ہوتے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بال بچوں والے تھے اور کھانے پینے سے مُبرّا نہ تھے، تو انہوں نے دوسرا پینترا بدلا کہ اچھا، بشر ہی رسول سہی، مگر وہ کوئی بڑا آدمی تو ہونا چاہیے۔ مالدار ہو، بااثر ہو، بڑے جتھے والا ہو، لوگوں میں اس کی شخصیت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہو۔ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس مرتبے کے لیے کیسے موزوں ہو سکتے ہیں؟ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے چند مختصر الفاظ میں بہت سی اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔

پہلی بات یہ کہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنا ان کے سپرد کب سے ہو گیا؟ کیا یہ طے کرنا ان کا کام ہے

کہ اللہ اپنی رحمت سے کس کو نوازے اور کس کو نہ نوازے؟ (یہاں رب کی رحمت سے مراد اس کی رحمت عام ہے جس میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملتا رہتا ہے)۔

دوسری بات یہ کہ نبوّت تو خیر بہت بڑی چیز ہے، دنیا میں زندگی بسر کرنے کے جو عام ذرائع ہیں، ان کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے، کسی اور کے حوالے نہیں کر دی۔ ہم کسی کو حسین اور کسی کو بدصورت، کسی کو خوش آواز اور کسی کو بد آواز، کسی کو تندرست اور کسی کو اپاہج یا اندھا یا گونگا یا بہرا، کسی کو امیرزادہ اور کسی کو فقیر زادہ، کسی کو ترقی یافتہ قوم کا فرد اور کسی کو غلام یا پس ماندہ قوم کا فرد پیدا کرتے ہیں پس پیدائشی قسمت میں کوئی ذرّہ برابر بھی دخل نہیں دے سکتا۔ جس کو ہم نے جو کچھ بنا دیا ہے وہی کچھ بننے پر وہ مجبور ہے۔ اور ان مختلف پیدائشی حالتوں کا جو اثر بھی کسی کی تقدیر پر پڑتا ہے، اُسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان رزق، طاقت، عزّت، شہرت، دولت، حکومت وغیرہ کی تقسیم بھی ہم ہی کر رہے ہیں۔ جس کو ہماری طرف سے اقبال نصیب ہوتا ہے اسے کوئی گرا نہیں سکتا، اور جس پر ہماری طرف سے ادبار آ جاتا ہے اُسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ ہمارے فیصلوں کے مقابلے میں انسانوں کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس عالمگیر خدائی نظام میں یہ لوگ کہاں فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کائنات کا مالک کسے اپنا نبی بنائے اور کسے نہ بنائے۔

تیسری بات یہ کہ اس خدائی انتظام میں یہ مستقل قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سب کچھ ایک ہی کو، یا سب کچھ سب کو نہ دے دیا جائے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ہر طرف تمہیں بندوں کے درمیان ہر پہلو میں تفاوُت ہی تفاوُت نظر آئے گا۔ کسی کو ہم نے کوئی چیز دی ہے تو دوسری کسی چیز سے اُس کو محروم کر دیا ہے، اور وہ کسی اور کو عطا کر دی ہے۔ یہ اس حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے کہ کوئی انسان دوسرے سے بے نیاز نہ ہو، بلکہ ہر ایک کسی نہ کسی معاملہ میں دوسرے کا محتاج رہے۔ اب یہ کیسا احمقانہ خیال تمہارے دماغ میں سمایا ہے کہ جسے ہم نے ریاست اور وجاہت دی ہے اُسی کو نبوت بھی دے دی جائے؟ کیا اسی طرح تم یہ بھی کہو گے کہ عقل، علم، دولت، حسن، طاقت، اقتدار اور دوسرے تمام کمالات ایک ہی شخص میں جمع کر دیے جائیں، اور جس کو ایک چیز نہیں ملی ہے اُسے دوسری بھی کوئی چیز نہ دی جائے؟

آخری فقرے میں رب کی رحمت سے مراد اُس کی رحمت خاص، یعنی نبوّت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جن رئیسوں کو اُن کی دولت و وجاہت اور مشیخت کی وجہ سے بڑی چیز سمجھ رہے ہو، وہ اُس دولت کے قابل نہیں ہیں جو محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دی گئی ہے۔ یہ دولت اُس دولت سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ درجے کی ہے اور اس کے لیے موزونیت کا معیار کچھ اور ہے۔ تم نے اگر یہ سمجھ رکھا ہے کہ

تمہارا ہر چودھری اور سیٹھ نبی بننے کا اہل ہے تو یہ تمہارے اپنے ذہن کی پستی ہے۔ اللہ سے اس نادانی کی توقع کیوں رکھتے ہو؟ (۴۳)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ (المؤمن ۵۶)

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سند و حجت کے بغیر جو اُن کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیات میں جھگڑے کر رہے ہیں اُن کے دلوں میں کبر بھرا ہوا ہے، مگر وہ اُس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جس کا وہ گھمنڈ رکھتے ہیں۔ بس اللہ کی پناہ مانگ لو، وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔"

یعنی ان لوگوں کی بے دلیل مخالفت اور ان کی غیر معقول کج بحثیوں کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کی آیات میں جو سچائیاں اور خیر و صلاح کی باتیں اُن کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتیں اس لیے یہ نیک نیتی کے ساتھ اُن کو سمجھنے کی خاطر بحثیں کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے اس رویّہ کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا غرورِ نفس یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ان کے ہوتے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشوائی و رہنمائی تسلیم کر لی جائے اور بالآخر ایک روز انہیں خود بھی اُس شخص کی قیادت ماننی پڑے جس کے مقابلے میں یہ اپنے آپ کو سرداری کا زیادہ حقدار سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کسی طرح نہ چلنے پائے، اور اس مقصد کے لیے انہیں کوئی ذلیل سے ذلیل حربہ استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ نے بڑا بنایا ہے وہی بڑا بن کر رہے گا اور یہ چھوٹے لوگ اپنی بڑائی قائم رکھنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں وہ سب آخرکار ناکام ہو جائیں گی۔ (۴۴)

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (النحل۔ آیت ۲)

"وہ اس روح (یعنی وحیِ نبوت) کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے فرشتوں کے ذریعے نازل فرماتا ہے۔"

یہ کفار کے اُن اعتراضات کا جواب ہے جو وہ حضورؐ پر کرتے تھے کہ اگر خدا کو نبی ہی بھیجنا تھا تو کیا بس محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی اس کام کے لیے رہ گئے تھے؟ مکے اور طائف کے سارے بڑے بڑے سردار مر گئے تھے کہ ان میں سے کسی پر بھی نگاہ نہ پڑ سکی؟ اس طرح کے بیہودہ اعتراضات کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، اور یہی متعدد مقامات پر قرآن میں دیا گیا ہے کہ خدا اپنے کام کو خود جانتا ہے، تم سے مشورہ لینے کی اُسے حاجت نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھتا ہے آپ ہی اپنے کام کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ (۴۵)

یہ اعتراض کہ اگر یہ حق ہوتا تو قوم کے بڑے لوگ ایمان لاتے

مشرکین کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں وہ اگر حق ہوتا تو سب سے پہلے قوم کے بڑے لوگ ایمان لاتے، نہ کہ چند ناسمجھ نوجوان، چند غلام اور چند غریب آدمی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۔ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۔ (الاحقاف۔ آیت ۱۱)

"جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا وہ ایمان لانے والوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ حق ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے" چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔"

یہ اُن دلائل میں سے ایک ہے جو قریش کے سردار عوام الناس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہکانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ قرآن برحق ہوتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک صحیح بات کی طرف دعوت دے رہے ہوتے تو قوم کے سردار اور شیوخ اور معززین آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چند ناتجربہ کار لڑکے اور چند ادنیٰ درجہ کے غلام تو ایک معقول بات کو مان لیں اور قوم کے بڑے بڑے لوگ جو دانا اور جہاندیدہ ہیں، اور جن کی عقل و تدبیر پر آج تک قوم اعتماد کرتی رہی ہے، اس کو رد کر دیں؟ اس پُرفریب استدلال سے وہ عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ اس نئی دعوت میں ضرور کچھ خرابی ہے، اسی لیے تو قوم کے اکابر اس کو نہیں مان رہے ہیں، لہٰذا تم لوگ بھی اس سے دُور بھاگو۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو حق و باطل کا معیار قرار دے رکھا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جس ہدایت کو یہ قبول نہ کریں وہ ضرور ضلالت ہونی چاہیے۔ [illegible] کی ہمت نہیں رکھتے، کیونکہ اس سے پہلے بھی انبیاء علیہم السلام یہی تعلیمات پیش کرتے رہے ہیں اور تمام کتب آسمانی جو اہل کتاب کے پاس موجود ہیں انہی عقائد اور انہی ہدایات سے بھری پڑی ہیں۔ اس لیے یہ اسے "پرانا جھوٹ" کہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ سب لوگ بھی دانائی سے محروم تھے جو ہزاروں برس سے ان حقائق کو پیش کرتے اور مانتے چلے آرہے ہیں، اور تمام دانائی صرف ان کے حصہ میں آگئی ہے۔ (۲۶)

ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صہیبؓ اور عمارؓ اور خبابؓ اور ابن مسعودؓ جیسے غریب لوگ جو تمہاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں ان کے

ساتھ تو ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تمہاری مجلس میں آسکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔
قیصرِ روم، ہرقل کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ملا اور اس نے ابوسفیان کو بلا کر آپؐ کے متعلق چند سوالات کیے تو ابوسفیان نے ان کا جواب دیتے ہوئے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ بھی کہ تَبِعَهٗ مِنَّا الضعفاء و المساکین "اس شخص کی پیروی ہمارے کمزور اور مسکین لوگوں نے قبول کی ہے"۔ گویا ان لوگوں کا طرزِ فکر یہ تھا کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ رہے چھوٹے لوگ، تو ان کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں۔ اس لیے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا اسے رد کر دینا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزن بات ہے۔ ٹھیک یہی بات حضرت نوحؑ سے ان کی قوم کے سرداروں نے کہی تھی کہ کیا "ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے"۔ اور سورۂ ہود آیت ۲۷ میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تیری پیروی صرف اُن لوگوں نے بے سمجھے بوجھے کی ہے جو ہمارے ہاں کے اراذل ہیں"۔ (۲۷)

یہ الزام کہ حضورؐ اپنی بڑائی چاہتے ہیں

تفہیم میں ذکر آیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سردارانِ قریش کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو حاضرین نے منجملہ دوسرے اعتراضات کے یہ بھی کہا کہ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ "یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کی جا رہی ہے" یعنی دراصل یہ دعوت اس لیے دی جا رہی ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابع فرمان بن جائیں اور یہ ہم پر حکم چلائیں۔ (۲۸)

ظاہر ہے کہ یہ محض ایک الزام تھا جس کی کوئی بنیاد بدگمانی کے سوا نہ تھی۔ اس لیے اس کا کوئی جواب دینے کے بجائے قرآن مجید میں یہ بتایا گیا کہ قدیم زمانے میں بھی جو اللہ کا بندہ اصلاحِ خلق کے لیے اٹھا اس پر یہی الزام لگا دیا گیا۔ مثلاً حضرت موسیٰ اور ہارون سے فرعون کے درباریوں نے کہا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ "اے موسیٰ، کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں بھائیوں کی قائم ہو جائے"۔ (یونس-۷۸) یہی بات حضرت نوحؑ سے اُن کی قوم کے سرداروں نے کہی تھی کہ

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُرِیْدُ اَنْ یَّتَفَضَّلَ عَلَیْكُمْ (المؤمنون-۲۴)

"یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ بس یہ چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے"۔

مخالفینِ حق کا ایک قدیم ترین حربہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اصلاح کے لیے کوشش کرنے اٹھے اُس پر فوراً یہ الزام چسپاں کر دیتے ہیں کہ کچھ نہیں، بس یہ اقتدار کا بھوکا ہے۔ یہی الزام فرعون نے حضرت موسیٰ اور

ہارونؑ پر لگایا تھا کہ تم اس لیے اُٹھے ہو کہ تمہیں ملک میں بڑائی حاصل ہو جائے۔ یہی الزام حضرت عیسیٰؑ پر لگایا گیا کہ یہ شخص یہودیوں کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اور اسی کا شبہہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سرداران قریش ظاہر کرتے تھے، چنانچہ کئی مرتبہ انہوں نے آپ سے یہ سودا کرنے کی کوشش کی کہ اگر اقتدار کے طالب ہو تو "اپنی تبلیغ چھوڑ کر حزبِ اقتدار" میں شامل ہو جاؤ، ہم تمہیں بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ ساری عمر دنیا اور اس کے مادی فائدوں اور اس کی شان و شوکت ہی کے لیے اپنی جان کھپاتے رہتے ہیں اُن کے لیے یہ تصور کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے کہ اسی دُنیا میں کوئی انسان خلوص، نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ فلاحِ انسانیت کی خاطر بھی اپنی جان کھپا سکتا ہے۔ وہ خود چونکہ اپنا اثر و اقتدار جمانے کے لیے دلفریب نعرے اور اصلاح کے جھوٹے وعدے شب و روز استعمال کرتے رہتے ہیں، اس لیے یہ مکاری و فریب کاری ان کی نگاہ میں بالکل ایک فطری چیز ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اصلاح کا نام مکر و فریب کے سوا کبھی صداقت اور خلوص کے ساتھ لیا ہی نہیں جا سکتا، یہ نام جو بھی لیتا ہے ضرور وہ اُن کا اپنا "ہم جنس" ہی ہو گا۔ اور لطف یہ ہے کہ مصلحین کے خلاف "اقتدار کی بھوک" کا یہ الزام ہمیشہ برسرِ اقتدار لوگ اور ان کے خوشامدی حاشیہ نشین ہی استعمال کرتے رہے ہیں۔ گویا خود انہیں اور ان کے آقایانِ نامدار کو جو اقتدار حاصل ہے وہ تو ان کا پیدائشی حق ہے، اس کے حاصل کرنے اور اس پر قابض رہنے میں وہ کسی الزام کے مستحق نہیں ہیں، البتہ نہایت قابلِ ملامت ہے وہ جس کے لیے یہ "غذا" پیدائشی حق نہ تھی اور اب یہ لوگ اس کے اندر اس چیز کی "بھوک" محسوس کر رہے ہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص بھی رائج الوقت نظامِ زندگی کی خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے اُٹھے گا اور اس کے مقابلے میں اصلاحی نظریہ و نظام پیش کرے گا اس کے لیے بہر حال یہ بات ناگزیر ہو گی کہ اصلاح کی راہ میں جو طاقتیں بھی سدِ راہ ہوں انہیں ہٹانے کی کوشش کرے اور ان طاقتوں کو برسرِ اقتدار لائے جو اصلاحی نظریہ و نظام کو عملاً نافذ کر سکیں۔ نیز ایسے شخص کی دعوت جب بھی کامیاب ہو گی اس کا فطری نتیجہ یہی ہو گا کہ وہ لوگوں کا مقتدا و پیشوا بن جائے گا اور نئے نظام میں اقتدار کی باگیں یا تو اس کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہوں گی، یا اس کے حامیوں اور پیروؤں کے ہاتھ ان پر قابض ہوں گے۔ آخر انبیاء اور مصلحینِ عالم میں سے کون ہے جس کی کوششوں کا مقصد اپنی دعوت کو عملاً نافذ کرنا نہ تھا؟ اور کون ہے جس کی دعوت کی کامیابی نے فی الواقع اس کو پیشوا نہیں بنا دیا؟ پھر کیا یہ امر واقعی کسی پر یہ الزام چسپاں کر دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ دراصل اقتدار کا بھوکا تھا اور اس کی اصل غرض وہی پیشوائی تھی جو اس نے حاصل کر لی؟ ظاہر ہے کہ بدطینت دشمنانِ حق کے سوا اس سوال کا جواب کوئی بھی اثبات میں نہ دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اقتدار کے بجائے خود مطلوب ہونے اور کسی مقصد خیر کے لیے مطلوب ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اتنا ہی بڑا فرق جتنا ڈاکو کے خنجر اور ڈاکٹر کے نشتر میں ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اس بنا پر ڈاکو اور ڈاکٹر کو ایک کر دے کہ دونوں بالارادہ جسم چیرتے ہیں اور نتیجہ میں مال دونوں کے ہاتھ آتا ہے، تو یہ اس کے اپنے ہی دماغ یا دل کا قصور ہے۔ ورنہ دونوں کی نیت، دونوں کے طریق کار، اور دونوں کے مجموعی کردار میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ کوئی صاحب عقل آدمی ڈاکو کو ڈاکو اور ڈاکٹر کو ڈاکٹر سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ (۳۰)

یہی معاملہ حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ ان کی قوم کے سرداروں نے بھی اپنے عوام کو مخاطب کر کے کہا:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۔ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۔ (المومنون۔ ۳۳-۳۴)

"یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو تم گھاٹے ہی میں رہو گے۔"

سرداران قوم کو جب خطرہ ہوا کہ عوام پیغمبر کی پاکیزہ شخصیت اور دل لگتی باتوں سے متاثر ہو جائیں گے اور اُن کے متاثر ہو جانے کے بعد ہماری سرداری پھر کس پر چلے گی، تو انہوں نے یہ تقریریں کر کر کے عام لوگوں کو بہکانا شروع کیا۔ وہ کہتے تھے کہ "یہ خدا کی طرف سے پیغمبری ویغمبری کچھ نہیں ہے محض اقتدار کی بھوک ہے جو اس شخص سے یہ باتیں کرا رہی ہے۔ بھائیو، ذرا غور تو کرو کہ آخر یہ شخص تم سے کس چیز میں مختلف ہے؟ ویسا ہی گوشت پوست کا آدمی ہے جیسے تم ہو۔ کوئی فرق اس میں اور تم میں نہیں ہے۔ پھر یہ کیوں بڑا بنے اور تم اس کے فرمان کی اطاعت کیوں کرو۔" ان تقریروں میں یہ بات گویا بلا نزاع تسلیم شدہ تھی کہ بشر ہونے کے باوجود ہم جو تمہارے سردار ہیں تو ہمیں تو ہونا ہی چاہیے۔ ہمارے گوشت پوست اور کھانے پینے کی نوعیت کی طرف دیکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ زیر بحث ہماری سرداری نہیں ہے کیونکہ وہ تو آپ سے آپ قائم اور مسلّم ہے البتہ زیر بحث یہ نئی سرداری ہے جو اب قائم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس طرح اُن لوگوں کی بات سرداران قوم نوح علیہ السلام کی بات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی جن کے نزدیک قابل الزام اگر کوئی چیز تھی تو "اقتدار کی وہ بھوک" تھی جو کسی نئے آنے والے کے اندر محسوس ہو یا جس کے ہونے کا شبہہ کیا جا سکے۔ رہا ان کا اپنا پیٹ، تو وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار بہرحال اس کی فطری خوراک ہے جس سے اگر وہ بدہضمی کی حد تک بھی بھر جائے تو قابل اعتراض نہیں۔ (۳۱)

آپ پر یہ الزام کہ آپ کاہن ہیں اور شیاطین آپ پر نازل ہوتے ہیں۔

کفارِ مکہ آپ پر یہ الزام بھی لگاتے تھے کہ آپ کاہن ہیں، اور یہ قرآن جو آپ پیش کر رہے ہیں اسے فرشتے نہیں بلکہ شیاطین آپ پر نازل کرتے ہیں۔ اس کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر کیا گیا اور اس کا جواب دیا گیا۔

فَذَكِّرْ فَمَآ أَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۔ (الطور ۔ ۲۹)

"پس اے نبی، تم نصیحت کیے جاؤ، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون"

"کاہن" عربی زبان میں جوتشی، غیب گو اور سیانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یہ ایک مستقل پیشہ تھا۔ کاہنوں کا دعویٰ تھا، اور ان کے بارے میں ضعیف الاعتقاد لوگ بھی یہ سمجھتے تھے کہ وہ ستارہ شناس ہیں، یا ارواح اور شیاطین اور جنوں سے اُن کا خاص تعلق ہے جس کی بدولت وہ غیب کی خبریں معلوم کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز اگر کھوئی جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں پڑی ہے۔ کسی کے ہاں چوری ہو جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ چور کون ہے۔ کوئی اپنی قسمت پوچھے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ انہی اغراض کے لیے لوگ اُن کے پاس جاتے تھے اور وہ کچھ نذر نیاز لے کر انہیں غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی بسا اوقات بستیوں میں آواز لگاتے پھرتے تھے تاکہ لوگ اُن کی طرف رجوع کریں۔ ان کی ایک خاص وضع قطع ہوتی تھی جس سے وہ الگ پہچانے جاتے تھے۔ ان کی زبان بھی عام بول چال سے مختلف ہوتی تھی۔ وہ مُقفّیٰ اور مُسجّع فقرے خاص لہجے میں ذرا ترنم کے ساتھ بولتے تھے اور بالعموم ایسے گول مول الفاظ استعمال کرتے تھے جن سے ہر شخص اپنے مطلب کی بات نکال لے۔ قریش کے سرداروں نے عوام کو فریب دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کاہن ہونے کا الزام صرف اس بنا پر لگا دیا کہ آپ اُن حقائق کی خبر دے رہے تھے جو لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں، اور آپ کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا کی طرف سے ایک فرشتہ آکر آپ پر وحی نازل کرتا ہے، اور خدا کا جو کلام آپ پیش فرما رہے تھے وہ بھی مُقفّیٰ تھا۔ لیکن عرب میں کوئی شخص بھی اُن کے اس الزام سے دھوکا نہ کھا سکتا تھا۔ اس لیے کہ کاہنوں کے پیشے اور اُن کی وضع قطع اور ان کی زبان اور ان کے کاروبار سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ کیا کام کرتے ہیں، کس غرض کے لیے لوگ ان کے پاس جاتے ہیں، کیا باتیں وہ ان کو بتاتے ہیں، ان کے مسجع فقرے کیسے ہوتے ہیں اور کن مضامین پر وہ مشتمل ہوتے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی کاہن کا سرے سے یہ کام ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ قوم میں رائج الوقت عقائد کے خلاف ایک عقیدہ لے کر اٹھتا اور شب و روز اس کی تبلیغ میں اپنی جان کھپاتا اور اس کی خاطر ساری قوم کی دشمنی مول لیتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہانت کا یہ الزام برائے نام بھی کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا کہ یہ پھبتی آپ پر چسپاں ہو سکتی اور عرب

کا کوئی کُند ذہن سے کُند ذہن آدمی بھی اس سے دھوکا کھا جاتا۔ اِسی بنا پر اُن کے اس الزام کی تردید میں کوئی دلیل پیش کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت محسوس نہ کی گئی، کیونکہ یہ آپ اپنی ہی تردید تھا۔ بس یہ فرمانے پر اکتفا کیا گیا کہ اے نبی، تم اِن کے الزامات کی پروا کیے بغیر بندگانِ خدا کو غفلت سے چونکانے اور حقیقت سے خبردار کرنے کا کام کیے چلے جاؤ، کیونکہ نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون۔ (۴۳)

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝ (التکویر: ۲۵-۲۶)

"اور یہ کسی شیطانِ مردود کا قول نہیں ہے، پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو؟"

یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی شیطان آکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ باتیں پھونک دیتا ہے۔ شیطان کا آخر یہ کام کب ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کو شرک اور بُت پرستی اور دہریت والحاد سے ہٹا کر خدا پرستی اور توحید کی تعلیم دے۔ انسان کو شترِ بے مہار بن کر رہنے کے بجائے خدا کے حضور ذمہ داری اور جوابدہی کا احساس دلائے۔ جاہلانہ رسوم اور ظلم اور بداخلاقی اور بدکرداری سے منع کر کے پاکیزہ زندگی، عدل اور تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف رہنمائی کرے۔ (۴۴)

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝ (الشعراء۔ ۲۱۰ تا ۲۱۲)

"اِس کتاب کو شیاطین لے کر نہیں اُترے ہیں، نہ یہ کام اُن کو سجتا ہے اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں۔ وہ تو اِس کی سماعت سے بھی دُور رکھے گئے ہیں۔"

کفارِ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جھوٹ کی جو مہم چلا رکھی تھی اس میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آرہی تھی کہ اُس حیرت انگیز کلام کی کیا توجیہ کی جائے جو قرآن کی شکل میں لوگوں کے سامنے آرہا تھا اور دلوں میں اُترتا چلا جاتا تھا۔ یہ بات تو اُن کے بس میں نہ تھی کہ لوگوں تک اس کے پہنچنے کو روک سکیں۔ اب پریشان کن مسئلہ اُن کے لیے یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بدگمان کرنے اور اس کی تاثیر سے بچانے کے لیے کیا بات بنائیں۔ اس گھبراہٹ میں جو الزامات انہوں نے عوام میں پھیلاتے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ کاہن ہیں اور عام کاہنوں کی طرح ان پر بھی یہ کلام شیاطین اِلقا کرتے ہیں۔ اِس الزام کو وہ اپنا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ کسی کے پاس یہ جانچنے کے لیے آخر کیا ذریعہ ہو سکتا ہے کہ یہ کلام کوئی فرشتہ لاتا ہے یا شیطان؟ اور شیطانی اِلقاء کی تردید کوئی کرے گا تو آخر کیسے؟

اللہ تعالیٰ نے اس پر فرمایا کہ یہ کلام اور یہ مضامین شیاطین کے منہ پر پھبتے ہی نہیں۔ کوئی عقل رکھتا ہو تو خود سمجھ سکتا ہے کہ کہیں یہ باتیں جو قرآن میں کہی جا رہی ہیں شیاطین کی طرف سے بھی ہو سکتی ہیں؟ کیا

تمہاری بستیوں میں کاہن موجود نہیں ہیں اور شیاطین سے ربط ضبط رکھ کر جو باتیں وہ کرتے ہیں تم نے کبھی نہیں سنیں؟ کیا تم نے کبھی سنا کہ کسی شیطان نے کسی کاہن کے ذریعے سے لوگوں کو خدا پرستی اور خدا ترسی کی تعلیم دی ہو؟ شرک و بُت پرستی سے روکا ہو؟ آخرت کی بازپرس کا خوف دلایا ہو؟ ظلم اور بدکاری اور بداخلاقیوں سے منع کیا ہو؟ نیکوکاری اور راستبازی اور خلقِ خدا کے ساتھ احسان کی تلقین کی ہو؟ شیاطین کا یہ مزاج کہاں ہے؟ اُن کا مزاج تو یہ ہے کہ لوگوں میں فساد ڈلوائیں اور انہیں بُرائیوں کی طرف رغبت دلائیں۔ ان سے تعلق رکھنے والے کاہنوں کے پاس تو لوگ یہ پوچھنے جاتے ہیں کہ عاشق کو معشوق ملے گا یا نہیں؟ جوئے میں کون سا داؤں مفید رہے گا؟ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے کیا چال چلی جائے؟ اور فلاں شخص کا اُونٹ کس نے چرایا ہے؟ یہ معاملات چھوڑ کر کاہنوں اور ان کے سرپرست شیاطین کو خلقِ خدا کی اصلاح، بھلائیوں کی تعلیم اور بُرائیوں کے استیصال کی فکر کب سے لاحق ہو گئی؟ شیاطین اگر چاہیں بھی تو یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے آپ کو انسانوں کے سچے معلّم اور حقیقی مزکّی کے مقام پر رکھ کر خالص حق اور خالص خیر کی وہ تعلیم دے سکیں جو قرآن دے رہا ہے۔ وہ دھوکا دینے کی خاطر بھی یہ بہروپ دھاریں تو ان کا کام ایسی آمیزشوں سے خالی نہیں ہو سکتا جو ان کی جہالت اور ان کے اندر چھپی ہوئی شیطانی فطرت کی غمّازی نہ کر دیں۔ نیت کی خرابی، ارادوں کی ناپاکی، مقاصد کی خباثت اور اخلاق کی گندگی اُس شخص کی زندگی میں بھی اور اس کی تعلیم میں بھی جھلک کر رہے گی جو شیاطین سے الہام حاصل کر کے پیشوا بن بیٹھا ہو۔ بے آمیز راستی اور خالص نیکی نہ شیاطین القاء کر سکتے ہیں اور نہ ان سے ربط ضبط رکھنے والے اس کے حامل ہو سکتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ شیاطین کا قرآن کے القاء میں دخیل ہونا تو درکنار، جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح الامین اس کو لے کر چلتا ہے اور جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر وہ اس کو نازل کرتا ہے، اِس پورے سلسلے میں کسی جگہ بھی شیاطین کو کان لگا کر سُننے تک کا موقع نہیں ملتا۔ وہ آس پاس کہیں پھٹکنے بھی نہیں پاتے کہ سُن گُن لے کر ہی کوئی بات اُچک لے جائیں اور جا کر اپنے دوستوں کو پہلے سے یہ بتا دیں کہ آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پیغام سُنانے والے ہیں، یا ان کی تقریر میں فلاں بات کا بھی ذکر آنے والا ہے۔ (۲۴۳)

یہ الزام کہ آپ کو کچھ دوسرے لوگ سکھاتے پڑھاتے ہیں

کفارِ قریش ایک طرف تو یہ کہتے تھے کہ معاذ اللہ شیاطین آپ پر قرآن کا القاء کرتے ہیں، اور دوسری طرف اس کے بالکل برعکس وہ یہ الزام بھی لگاتے تھے کہ آپ کچھ دوسرے لوگوں سے سیکھ پڑھ کر یہ قرآن پیش کرتے ہیں:

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۔ (الدُّخان۔۱۴)

"پھر انہوں نے رسول کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہنے لگے "یہ تو سکھایا پڑھایا ہوا مجنون ہے"۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ بے چارا تو سیدھا سادھا آدمی تھا، کچھ دوسرے لوگوں نے اِسے بھڑ پر چڑھا لیا، وہ در پردہ قرآن کی آیتیں گھڑ گھڑ کر اسے پڑھا دیتے ہیں، یہ آ کر عام لوگوں کے سامنے انہیں پیش کر دیتا ہے، وہ مزے سے بیٹھے رہتے ہیں، اور یہ گالیاں اور پتھر کھاتا پھرتا ہے۔ اس طرح ایک چلتا ہوا فقرہ کہہ کر وہ اُن ساری دلیلوں اور نصیحتوں اور مفید تعلیمات کو اُڑا دیتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سول سے ان کے سامنے پیش کر کر کے تھکے جا رہے تھے۔ وہ نہ اُن معقول باتوں پر کوئی توجہ کرتے تھے جو قرآن مجید میں بیان کی جا رہی تھیں، نہ یہ دیکھتے تھے کہ جو شخص یہ باتیں پیش کر رہا ہے وہ کس پائے کا آدمی ہے اور نہ یہ الزام رکھتے وقت ہی وہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے کہ ہم یہ کیا کیواس کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص در پردہ بیٹھ کر سکھانے پڑھانے والا ہوتا تو وہ حضرت خدیجہؓ اور ابوبکرؓ اور علیؓ اور زید بن حارثہ اور دوسرے ابتدائی مسلمانوں سے آخر کیسے چھپ جاتا جن سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب اور سرو قت کا ساتھی کوئی نہ تھا؟ پھر کیا وجہ ہے کہ یہی لوگ سب سے بڑھ کر حضور کے گرویدہ اور معتقد تھے؟ حالانکہ در پردہ کسی دوسرے شخص کے سکھانے پڑھانے سے نبوت کا کاروبار چلایا گیا ہوتا تو یہی لوگ آپ کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ (۳۵)

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ۗ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ - (النحل - ۱۰۳)

"ہمیں معلوم ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے۔ حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے"۔

روایات میں مختلف اشخاص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ کفارِ مکہ اُن میں سے کسی پر یہ گمان کرتے تھے۔ ایک روایت میں اُس کا نام جَبر بیان کیا گیا ہے جو عامر بن الحضرمی کا ایک رُومی غلام تھا۔ دوسری روایت میں حُوَیطِب بن عبدُ العُزّیٰ کے ایک غلام کا نام لیا گیا ہے جسے عائش یا یَعیش کہتے تھے۔ ایک اور روایت میں یَسار کا نام لیا گیا ہے جس کی کُنیت ابو فُکَیہَہ تھی اور جو مکے کی ایک عورت کا یہودی غلام تھا۔ ایک اور روایت بُلعان یا بَلعام نامی ایک رُومی غلام سے متعلق ہے۔ بہرحال ان میں سے جو بھی ہو، کفارِ مکہ نے محض یہ دیکھ کر کہ ایک شخص توراۃ اور انجیل پڑھتا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے ملاقات ہے، بے تکلف یہ الزام گھڑ دیا کہ اس قرآن کو دراصل وہ تصنیف کر رہا ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے اپنی طرف سے خدا کا نام لے لے کر پیش کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے مخالفین آپ کے خلاف افترا پردازیاں کرنے میں کس قدر بے باک تھے بلکہ یہ سبق بھی ملتا ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کی قدر و قیمت پہچاننے میں کتنے بے انصاف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے تاریخ انسانی کی ایک ایسی عظیم شخصیت تھی جس کی نظیر نہ اُس وقت دُنیا بھر میں کہیں موجود تھی اور نہ آج تک پائی گئی ہے۔ مگر اُن عقل کے اندھوں کو اُس کے مقابلہ میں ایک عجمی غلام جو کچھ توراۃ و انجیل پڑھ لیتا تھا، قابلِ تر نظر آ رہا تھا اور وہ گمان کر رہے تھے کہ یہ گوہرِ نایاب اِس کوئلے سے چمک حاصل کر رہا ہے۔ (۴۶)

حضورؐ کے صاحبِ وحی ہونے کا ایک صریح ثبوت

قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

"(اے نبیؐ) تم اُس وقت مغربی گوشے (یعنی طُورِ سینا کے دامن میں) موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا اور نہ تم اِس واقعہ کے شاہدین میں سے تھے۔ بلکہ اس کے بعد تمہارے زمانے تک ہم بہت سی نسلیں اُٹھا چکے ہیں اور اُن پر بہت زمانہ بیت چکا ہے۔ تم اہلِ مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ اُن کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے۔ مگر (اُس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور تم طُور کے دامن میں اُس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو (پہلی مرتبہ) پکارا تھا۔ مگر یہ تمہارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں) تاکہ تم ایک ایسی قوم کو خبردار کر دو جس کے پاس تم سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ یہ لوگ ہوش میں آئیں۔" (القصص۔ ۴۴ تا ۴۶)

یہ تینوں باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں کہ یہ معلومات حاصل ہونے کا کوئی ذریعہ آپؐ کے پاس اللہ کی وحی کے سوا نہیں ہے۔ جس وقت قرآن مجید میں یہ باتیں کہی گئی تھیں اس وقت مکہ کے تمام سردار اور عام کفار اس بات پر تُلے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کو غیر نبی اور معاذ اللہ جھوٹا مدعیِ نبوت ثابت کر دیں۔ ان کی مدد کے لیے یہود کے علماء اور عیسائیوں کے راہب بھی حجاز کی بستیوں میں موجود تھے۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں عالمِ بالا سے آ کر یہ قرآن نہیں سُنا جاتے تھے بلکہ اُسی مکہ کے رہنے والے تھے اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ آپ کی بستی اور آپ کے قبیلے کے لوگوں سے چھپا ہوا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت اِس کھلے چیلنج کے انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے طور پر یہ تین باتیں ارشاد فرمائی گئیں، اُس وقت مکے اور حجاز اور پورے عرب میں کوئی ایک شخص بھی اُٹھ کر وہ بے ہودہ بات نہ کہہ سکا جو آج کے مستشرقین کہتے ہیں۔ اگرچہ جھوٹ گھڑنے میں وہ لوگ ان سے کچھ کم نہ تھے، لیکن ایسا دروغِ بے فروغ آخر وہ کیسے بول سکتے تھے جو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چل سکتا ہو۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمدؐ

(صلی اللہ علیہ وسلم) تم فلاں فلاں یہودی عالموں اور عیسائی راہبوں سے یہ معلومات حاصل کر لاتے ہو، کیونکہ پورے ملک میں وہ اِس غرض کے لیے کسی کا نام نہیں لے سکتے تھے جس کا نام بھی وہ لیتے فوراً ہی یہ ثابت ہو جاتا کہ اُس سے آنحضرتؐ نے کوئی معلومات حاصل نہیں کی ہیں۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، تمہارے پاس پچھلی تاریخ اور علوم و آداب کی ایک لائبریری موجود ہے جس کی مدد سے تم یہ ساری تقریریں کر رہے ہو، کیونکہ لائبریری تو در کنار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کہیں سے وہ ایک کاغذ کا پُرزہ بھی برآمد نہیں کر سکتے تھے جس میں یہ معلومات لکھی ہُوئی ہوں۔ مکے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھے پڑھے آدمی نہیں ہیں اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ نے کچھ مترجمین کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو عبرانی اور سُریانی اور یُونانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے آپ کو دیتے ہیں۔ پھر اِن میں سے کوئی بڑے سے بڑا بے حیا آدمی بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا کہ شام و فلسطین کے تجارتی سفروں میں آپ یہ معلومات حاصل کر آئے تھے، کیونکہ یہ سفر تنہا نہیں ہوتے تھے۔ مکے ہی کے تجارتی قافلے ہر سفر میں آپ کے ساتھ لگے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس وقت ایسا دعویٰ کرتا تو سینکڑوں زندہ شاہد یہ شہادت دے دیتے کہ وہاں آپ نے کسی سے کوئی درس نہیں لیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد تو دو سال کے اندر ہی رومی سلطنت سے مسلمان برسرِ پیکار ہو گئے تھے۔ اگر کہیں جھوٹوں بھی شام و فلسطین میں کسی عیسائی راہب یا یہُودی رَبّی سے حضورؐ نے کوئی مذاکرہ کیا ہوتا تو رُومی سلطنت رائی کا پہاڑ بنا کر یہ پروپیگنڈا کرنے میں ذرا دریغ نہ کرتی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاذ اللہ سب کچھ یہاں سے سیکھ گئے تھے اور مکے جا کر نبی بن بیٹھے۔ غرض اُس زمانے میں جبکہ قرآن کا یہ چیلنج قریش کے کفّار و مشرکین کے لیے پیغامِ موت کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کو جھٹلانے کی ضرورت موجودہ زمانے کے مستشرقین کی بہ نسبت اُن لوگوں کو بدرجہا زیادہ لاحق تھی، کوئی شخص بھی کہیں سے ایسا کوئی مواد فراہم کر کے نہ لا سکا جس سے وہ یہ ثابت کر سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کے سوا اِن معلومات کے حصُول کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود ہے جس کی نشاندہی کی جا سکتی ہو۔ (۳۴)

حضورؐ پر مجنُون ہونے کا الزام

جب بے سروپا الزامات کفارِ قریش حضورؐ پر لگا رہے تھے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپ معاذ اللہ مجنون ہیں۔ اِسی معنی میں وہ آپ کو مسحور (سحر زدہ یا جادو کا مارا ہوا آدمی) بھی کہتے تھے، اور یہی اُن کے اِس قول کا مطلب بھی تھا کہ آپ پر جِنّ کا اثر ہے۔ قرآن مجید میں اُن کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ،

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوٓا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ۔ (الصّٰفّٰت۔ ۳۶)

"اور وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم اپنے معبُودوں کو ایک مجنون شاعر کی خاطر چھوڑ بیٹھیں؟"

دوسری جگہ اُن کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ:

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ (الفرقان۔ ۸)

"اور یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم تو بس ایک جادو کے مارے ہوئے آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو"

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ۔ (المؤمنون۔ ۷۰)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ اِس پر جن کا اثر ہے؟ (یعنی جن کے اثر سے یہ مجنون ہو گیا ہے؟)"

اِن سارے اعتراضات کا مطلب ایک ہی تھا، کیونکہ اہلِ عرب کے نزدیک آدمی کی دیوانگی کے وجوہ دو ہی تھے۔ یا تو کسی نے جادو کر کے اُسے پاگل بنا دیا ہو، یا کوئی جن اس پر مسلط ہو گیا ہو۔ (۳۸)

قرآن مجید میں اُن کے یہ اعتراضات دراصل یہ بتانے کے لیے نقل کیے گئے تھے کہ معترضین کس قدر عناد اور تعصب میں اندھے ہو چکے ہیں۔ اُن کے جو اعتراضات یہاں اور دوسرے مقامات پر بیان کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس لائق نہ تھا کہ اُس پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی جاتی۔ ان کا بس ذکر کر دینا ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ مخالفین کا دامن دلائل سے کس قدر خالی ہے اور وہ کیسی لچر اور پوچ باتوں سے ایک مدلل اصلاحی دعوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے لوگو! یہ شرک جس پر تمہارے مذہب و تمدن کی بنیاد قائم ہے ایک غلط عقیدہ ہے اور اس کے غلط ہونے کے یہ اور یہ دلائل ہیں۔ جواب میں شرک کے برحق ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی۔ بس آوازہ کس دیا جاتا ہے کہ یہ جادو کا مارا ہوا آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کا سارا نظام توحید پر چل رہا ہے اور یہ یہ حقائق ہیں جو اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جواب میں شور بلند ہوتا ہے جادوگر ہے۔ وہ کہتا ہے تم دُنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیئے گئے ہو بلکہ تمہیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے، دوسری زندگی میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس حقیقت پر یہ اخلاقی اور یہ تاریخی اور یہ عقلی و نقلی اُمور دلالت کر رہے ہیں۔ جواب میں کہا جاتا ہے شاعر ہے۔ وہ کہتا ہے میں خدا کی طرف سے تمہارے لیے تعلیمِ حق لے کر آیا ہوں اور یہ ہے وہ تعلیم۔ جواب میں اُس تعلیم پر کوئی بحث و تنقید نہیں ہوتی۔ بس بلا ثبوت ایک الزام چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کہیں سے نقل کر لیا گیا ہے۔ وہ اپنی رسالت کے ثبوت میں خدا کے معجزانہ کلام کو پیش کرتا ہے، خود اپنی زندگی اور اپنی سیرت و کردار کو پیش کرتا ہے اور اُس اخلاقی انقلاب کو پیش کرتا ہے جو اس کے اثر سے اس کے پیروؤں کی زندگی میں ہو رہا تھا۔ مگر مخالفت کرنے والے ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے۔ پوچھتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں کہ تم کھاتے کیوں ہو؟ بازاروں میں کیوں چلتے پھرتے ہو؟ تمہارے آردل میں کوئی فرشتہ کیوں

نہیں آیا ہے؟ تمہارے پاس کوئی خزانہ یا باغ کیوں نہیں ہے؟ یہ باتیں خود ہی بتا رہی تھیں کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور کون اس کے مقابلے میں عاجز آ کر بے تکی ہانک رہا ہے۔ (۳۹)

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (سبا - ۴۶)

"اے نبی، ان سے کہو کہ "میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو، تمہارے رفیق میں آخر ایسی کونسی بات ہے جو جنون کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تمہیں متنبہ کرنے والا ہے"۔

یعنی اغراض اور خواہشات اور تعصبات سے پاک ہو کر خالصتہً للہ غور کرو۔ ہر شخص الگ الگ بھی نیک نیتی کے ساتھ سوچے اور دو دو چار چار آدمی سر جوڑ کر بھی بے لاگ طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ بحث کر کے تحقیق کریں کہ آخر وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر آج تم اس شخص کو مجنون ٹھیرا رہے ہو جسے کل تک تم اپنے درمیان نہایت دانا آدمی سمجھتے تھے؟ آخر نبوت سے تھوڑی ہی مدت پہلے کا تو واقعہ تھا کہ تعمیر کعبہ کے بعد حجر اسود نصب کرنے کے مسئلہ پر جب قبائل قریش باہم لڑ پڑے تھے تو تم ہی لوگوں نے بالاتفاق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تسلیم کیا تھا اور انہوں نے ایسے طریقے سے اس جھگڑے کو چکایا تھا جس پر تم سب مطمئن ہو گئے تھے۔ جس شخص کی عقل و دانش کا یہ تجربہ تمہاری ساری قوم کو ہو چکا ہے اب کیا بات ایسی ہو گئی کہ تم اسے مجنون کہنے لگے؟ ہٹ دھرمی اور ضد کی بات تو دوسری ہے، مگر کیا واقعی تم اپنے دلوں میں بھی وہی کچھ سمجھتے ہو جو اپنی زبانوں سے کہتے ہو؟ وہ تمہیں ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے خبردار کر رہا ہے۔ کیا یہی وہ قصور ہے جس کی بنا پر تم اسے جنون کا مریض ٹھیراتے ہو؟ کیا تمہارے نزدیک عقلمند وہ ہے جو تمہیں تباہی کے راستے پر جاتے دیکھ کر کہے کہ شاباش، بہت اچھے جا رہے ہو؟ اور مجنون وہ ہے جو تمہیں برا وقت آنے سے پہلے خبردار کر دے اور فساد کی جگہ صلاح کی راہ بتائے؟ (۴۰)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ (المؤمنون - ۷۰)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص کو جنون ہے"؟

یعنی کیا ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ واقعی یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون سمجھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ اس کی اصل وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ زبان سے چاہے وہ کچھ ہی کہتے رہیں، دلوں میں تو وہ ان کی دانائی و زیرکی کے قائل ہیں۔ علاوہ بریں ایک پاگل اور ایک ہوشمند آدمی کا فرق کوئی ایسا چھپا ہوا

تو نہیں ہوتا کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو۔ آخر ایک ہٹ دھرم اور بے حیا آدمی کے سوا کون اس کلام کو سن کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی دیوانے کا کلام ہے؟ اور اس شخص کی زندگی کو دیکھ کر کون یہ رائے ظاہر کر سکتا ہے کہ یہ کسی مخبوط الحواس آدمی کی زندگی ہے؟ بڑا ہی عجیب ہے وہ جنون دیا منتشرقین مغرب کی تفسیر اس کے مطابق مرگی کا دورہ، جس میں آدمی کی زبان سے قرآن جیسا کلام نکلے اور جس میں آدمی ایک تحریک کی ایسی کامیاب رہنمائی کرے کہ اپنے ہی ملک کی نہیں، دنیا بھر کی قسمت بدل ڈالے۔ (۲۱)

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (القلم: ۲تا۴)

"اے نبی! تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔ اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔"

اس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں خطاب بظاہر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا، لیکن اصل مقصود کفار کو ان کی تہمت کا جواب دینا تھا۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ شبہہ نہ ہو کہ یہ آیت حضورؐ کو یہ اطمینان دلانے کے لیے نازل ہوئی تھی کہ آپ مجنون نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کو اپنے متعلق تو ایسا کوئی شبہہ نہ تھا کہ اُسے دُور کرنے کے لیے آپ کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی۔ مدعا کفار سے یہ کہنا تھا کہ تم جس قرآن کی وجہ سے اُس کے پیش کرنے والے کو مجنون کہہ رہے ہو وہی تمہارے اس الزام کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ البتہ حضورؐ کو جس بات کی تسلی دی گئی تھی وہ یہ تھی کہ آپ کے لیے بے حساب اور لازوال اجر ہے کیونکہ آپ خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے جو کوششیں کر رہے ہیں اُن کے جواب میں آپ کو ایسی ایسی اذیت ناک باتیں سننی پڑ رہی ہیں اور پھر بھی آپ اپنے اس فرض کو انجام دیے چلے جا رہے ہیں۔

پھر یہ بتایا گیا کہ آپ کے بلند اخلاق اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کفار آپ پر دیوانگی کی جو تہمت رکھ رہے ہیں وہ سراسر جھوٹی ہے۔ کیونکہ اخلاق کی بلندی اور دیوانگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دیوانہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہو اور جس کے مزاج میں اعتدال باقی نہ رہا ہو۔ اس کے برعکس آدمی کے بلند اخلاق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت انسان ہے اور اُس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ متوازن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق جیسے کچھ تھے، اہلِ مکہ ان سے ناواقف نہ تھے۔ اس لیے ان کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ مکہ کا ہر معقول آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ لوگ کس قدر بے شرم ہیں جو ایسے بلند اخلاق آدمی کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ ان کی یہ بیہودگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں بلکہ خود ان

کے لیے نقصان دہ تھی کہ مخالفت کے جوش میں پاگل ہو کر وہ آپ کے متعلق ایسی بات کہہ رہے تھے جسے کوئی ذی فہم آدمی قابلِ تصور نہ مان سکتا تھا۔ یہی معاملہ اُن مدعیانِ علم و تحقیق کا بھی ہے جو اس زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مرگی اور جنون کی تہمت رکھ رہے ہیں۔ قرآنِ پاک دنیا میں ہر جگہ مل سکتا ہے، اور حضورؐ کی سیرت بھی اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ لکھی ہُوئی موجود ہے۔ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو لوگ اِس بے مثل کتاب کے پیش کرنے والے اور ایسے بلند اخلاق رکھنے والے انسان کو ذہنی مریض قرار دیتے ہیں وہ عداوت کے اندھے جذبے سے مغلوب ہو کر کیسی لغویات کہہ رہے ہیں۔ (۴۲)

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِم مِّن جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۔ (الاعراف: ۱۸۴)

"کیا اِن لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا ہے۔"

رفیق سے مُراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ مکّہ ہی کے لوگوں میں پیدا ہُوئے، انہی کے درمیان رہے بسے، بچے سے جوان اور جوان سے بڑھے ہُوئے۔ نبوت سے پہلے ساری قوم آپؐ کو ایک نہایت سلیم الطبع اور صحیح الدماغ آدمی کی حیثیت سے جانتی تھی۔ نبوت کے بعد جب آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچانا شروع کیا تو یکایک آپ کو مجنون کہنے لگی۔ ظاہر ہے کہ یہ حکمِ جنون اُن باتوں پر نہ تھا جو آپؐ نبی ہونے سے پہلے کرتے تھے، بلکہ صرف اُنہی باتوں پر لگایا جا رہا تھا جن کی آپ نے نبی ہونے کے بعد تبلیغ شروع کی۔ اسی وجہ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اِن لوگوں نے کبھی سوچا بھی ہے؟ آخر اِن باتوں میں سے کون سی بات جنون کی ہے؟ کونسی بات بے تکی، بے اصل اور غیر معقول ہے؟ اگر یہ آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے یا خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کو بھی بنظرِ تامّل دیکھتے تو انہیں خود معلوم ہو جاتا کہ شرک کی تردید، توحید کے اثبات، بندگیِ رب کی دعوت اور انسان کی ذمّہ داری و جوابدہی کے بارے میں جو کچھ اِن کا بھائی انہیں سمجھا رہا ہے اس کی صداقت پر یہ پُورا نظامِ کائنات اور خلق اللہ کا ذرّہ ذرّہ شہادت دے رہا ہے۔ (۴۳)

شاعری کا الزام

کفارِ قریش حضورؐ پر شاعر ہونے کا الزام بھی رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک شاعرِ مجنون کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا:

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝ (الشعراء۔ آیت ۲۲۴)

"اور شعراء کے پیچھے تو بہکے ہُوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔"

یعنی شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اپنے اخلاق، عادات وخصائل اور اُفتادِ مزاج میں اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا فرق ایسا کھُلا ہُوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے۔ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راستبازی اور خدا ترسی ہے۔ بات بات میں ذمّہ داری کا احساس ہے۔ برتاؤ میں لوگوں کے حقوق کا پاس و لحاظ ہے۔ معاملات میں کمال درجہ کی دیانت و امانت ہے۔ اور زبان جب کھُلتی ہے خیر ہی کے لیے کھُلتی ہے، شر کا کلمہ اُس سے کبھی ادا نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان لوگوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دُھن میں یہ رات دن لگے رہتے ہیں اور ان کی ساری زندگی ایک مقصدِ عظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اُچھل اُچھل کر اُن پر داد دے رہے ہیں۔ کہیں کسی زنِ بازاری یا کسی گھر کی بہو بیٹی کا حُسن موضوعِ سخن ہے اور سُننے والے اس پر مزے لے رہے ہیں۔ کہیں جنسی مواصلت کی حکایت بیان ہو رہی ہے اور پورے مجمع پر شہوات کا بھُوت مُسلّط ہے۔ کہیں ہزل بکا جا رہا ہے یا مسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجمع میں ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں۔ کہیں کسی کی ہجو گائی جا رہی ہے اور لوگ اُس سے لُطف لے رہے ہیں۔ کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اور اُس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں۔ اور کہیں کسی کے خلاف نفرت، عداوت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں اور سُننے والوں کے دلوں میں ان سے آگ سی لگ جاتی ہے۔ اِن مجلسوں میں شاعروں کے کلام سُننے کے لیے جو ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگتے ہیں اور بڑے بڑے شاعروں کے پیچھے جو لوگ لگے پھرتے ہیں ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات و خواہشات کی رَو میں بہنے والے، اور لُطف ولذّت کے پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھُو بھی نہیں گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند مقصد اور نصب العین بھی ہو سکتا ہے۔ اِن دونوں گروہوں کا کھُلا کھُلا فرق دانستہ اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو وہ اندھا ہے، اور اگر سب کچھ دیکھ کر بھی کوئی محض حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایمان کُش کر یہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے گرد جمع ہونے والے لوگ اُسی قبیل کے ہیں جیسے شعراء اور ان کے پیچھے لگے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں، تو وہ جھوٹ بولنے میں بے حیائی کی ساری حدیں پار کر گیا ہے۔ (۱۴۴)

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝ (الشعراء۔ آیت ۲۲۵)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ (یعنی شعراء) ہر وادی میں بھٹکتے ہیں؟"

یعنی کوئی ایک متعین راہ نہیں ہے جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوتِ گویائی صرف کرتے ہوں بلکہ اُن کا توسنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جذبات و خواہشات اور اغراض و مقاصد کی ہر نئی رَو اُن کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے جسے سوچنے اور بیان کرنے میں اِس بات کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق اور صدق بھی ہے۔ کبھی ایک لہر اٹھی تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں، اور کبھی دوسری لہر آئی تو اُسی زبان سے انتہائی گندے سفلی جذبات کا ترشح شروع ہوگیا۔ کبھی کسی سے خوش ہوئے تو اُسے آسمان پر چڑھا دیا اور کبھی بگڑ بیٹھے تو اُسی کو تحت الثریٰ میں جا گرایا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بُزدل کو رستم و اسفندیار پر فضیلت دینے میں انہیں ذرا تأمل نہیں ہوتا اگر اُس سے کوئی غرض وابستہ ہو۔ اِس کے برعکس کسی سے رنج پہنچ جائے تو اُس کی پاک زندگی پر دھبہ لگانے اور اُس کی عزت پر خاک پھینکنے میں، بلکہ اس کے نسب پر طعن کرنے میں بھی ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ خدا پرستی اور دہریت، مادہ پرستی اور روحانیت، حسنِ اخلاق اور بداخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل، قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائے گا۔ شعراء کی اِن معروف خصوصیات سے جو شخص بھی واقف تھا اس کے دماغ میں یہ بات کیسے اتر سکتی تھی کہ اِس قرآن کے لانے والے پر شاعری کی تہمت رکھی جائے جس کی تقریر جچی تُلی، جس کی بات دو ٹوک، جس کی راہ بالکل واضح اور متعیّن ہے، اور جس نے حق اور راستی اور بھلائی کی دعوت سے ہٹ کر کبھی ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ آپ کے مزاج کو تو شاعری کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰسٓ آیت ۶۹) "ہم نے اُس کو شعر نہیں سکھایا ہے نہ یہ اُس کے کرنے کا کام ہے۔" یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جو لوگ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے وہ سب اِسے جانتے تھے۔ معتبر روایات میں آیا ہے کہ کوئی شعر پورا حضورؐ کو یاد نہ تھا۔ دورانِ گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبانِ مبارک پر آتا بھی تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے یا اس میں الفاظ کا اُلٹ پھیر ہو جاتا تھا۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دورانِ تقریر میں آپؐ نے شاعر کا مصرع یُوں نقل کیا:

كفى بالاسلام والشيب للمرء ناهيا

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسولَ اللہ! اصل مصرع یُوں ہے:

کفی الشیب والاسلام للمرء ناهیاً
ایک مرتبہ عباس بن مرداس سُلمی سے آپ نے پوچھا کیا تم ہی نے یہ شعر کہا ہے:
اتجعل نھبی ونھب العبید بین الاقرع وعُیَینہ
انہوں نے عرض کیا آخری فقرہ یوں نہیں ہے بلکہ یوں ہے، بَیْنَ عُیَیْنَۃَ والاقرع۔ آپ نے فرمایا معنی میں تو دونوں یکساں ہیں۔
حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ کبھی اشعار بھی اپنی تقریروں میں استعمال فرماتے تھے؟ انہوں نے فرمایا شعر سے بڑھ کر آپ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھار بنی قیس کے شاعر کا ایک شعر پڑھتے تھے مگر اوّل کو آخر اور آخر کو اوّل پڑھ جاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ عرض کرتے یا رسول اللہ یوں نہیں بلکہ یوں ہے، تو آپؐ فرماتے "بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے۔" جس قسم کے مضامین سے عرب کی شاعری لبریز تھی وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے، یا شراب نوشی کے، یا قبائلی منافرت اور جنگ وجدل کے، یا نسلی فخر وغرور کے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں اُن میں بہت ہی کم پائی جاتی تھیں۔ پھر جھوٹ، مُبالغہ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، شیخیں، طعن، پھبتیاں اور مشرکانہ خرافات تو اس شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں۔ اِس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس شاعری کے متعلق یہ تھی کہ لان یمتلئ جوف احدکم قیحًا خیرلہ من ان یمتلئ شعرًا۔ "تم میں سے کسی شخص کا جوف پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے۔" تاہم جس شعر میں کوئی اچھی بات ہوتی تھی آپ اس کی داد بھی دیتے تھے اور آپ کا ارشاد تھا کہ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً۔ "بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں" اُمیّہ بن ابی الصّلت کا کلام سُن کر آپ نے فرمایا اٰمَنَ شِعْرُہٗ وکفرقَلْبُہٗ۔ "اس کا شعر مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے۔" ایک مرتبہ ایک صحابی نے سَو کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپ کو سُنائے اور آپ فرماتے گئے ھیہ "اور سناؤ۔" (۴۵)

وَاَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ۔ (الشعراء، آیت ۲۲۶)

"اور وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔"

یہ شاعروں کی ایک اور خصوصیت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کی عین ضد تھی۔ حضورؐ کے متعلق آپ کا ہر جاننے والا جانتا تھا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ آپؐ کے قول اور فعل کی مطابقت ایسی صریح حقیقت تھی جس سے آپ کے گردوپیش کے معاشرے میں کوئی انکار نہ کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس شعراء کے متعلق کس کو معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں کہنے کی باتیں اور ہیں اور کرنے

کی اور سخاوت کا مضمون اِس زور شور سے بیان کریں گے کہ آدمی سمجھے کہ شاید ان سے بڑھ کر دریا دل کوئی نہ ہوگا، مگر عمل میں کوئی دیکھے تو معلوم ہوگا کہ سخت بخیل ہیں۔ بہادری کی باتیں کریں گے مگر خود بزدل ہوں گے۔ بے نیازی اور قناعت اور خودداری کے مضامین باندھیں گے مگر خود حرص و طمع میں ذلت کی آخری حد کو پار کر جائیں گے۔ دوسروں کی ادنیٰ کمزوریوں پر گرفت کریں گے مگر خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوں گے۔ (۴۹)

مخالفین کے الزامات کا تضاد اور اس پر قرآن کی گرفت

پچھلے صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر متضاد الزامات لگاتے تھے اور کوئی ایک الزام تیقن کے ساتھ انہوں نے کبھی نہیں لگایا۔ قرآن مجید میں اُن کی اِسی کمزوری پر گرفت کر کے ان کا جھوٹا ہونا ثابت کیا گیا۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ (الطور: ۲۹ تا ۳۲)

"پس اے نبیؐ! تم نصیحت کیے جاؤ، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون کیا لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردشِ ایام کا انتظار کر رہے ہیں؟ ان سے کہو اچھا انتظار کرو، مَیں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ کیا ان کی عقلیں انہیں ایسی ہی باتیں کرنے کے لیے کہتی ہیں؟ یا درحقیقت یہ عناد میں حد سے گزر گئے ہیں؟"

اِن چند فقروں میں مخالفین کے سارے پروپیگنڈے کی ہوا نکال کر انہیں بالکل بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ قریش کے سردار اور شیوخ بڑے عقلمند بنے پھرتے ہیں، مگر کیا ان کی عقل یہی کہتی ہے کہ جو شخص شاعر نہیں ہے اسے شاعر کہو، جسے ساری قوم ایک دانا آدمی کی حیثیت سے جانتی ہے اُسے مجنون کہو، اور جس شخص کا کہانت سے کوئی دُور دراز کا تعلق بھی نہیں ہے اُسے خواہ مخواہ کاہن قرار دو۔ پھر اگر عقل ہی کی بنا پر یہ لوگ حکم لگاتے تو کوئی ایک حکم لگاتے بہت سے متضاد حکم تو ایک ساتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ ایک شخص آخر بیک وقت شاعر، مجنون اور کاہن کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مجنون ہے تو نہ کاہن ہو سکتا ہے نہ شاعر۔ کاہن ہے تو شاعر نہیں ہو سکتا اور شاعر ہے تو کاہن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شعر کی زبان اور اس کے موضوعات بحث الگ ہوتے ہیں اور کہانت کی زبان اور اس کے مضامین الگ۔ ایک ہی کلام کو بیک وقت شعر بھی کہنا اور کہانت بھی قرار دینا کسی ایسے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا جو شعر

اور کہانت کا فرق جانتا ہو نہیں یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں یہ متضاد باتیں عقل سے نہیں بلکہ سراسر ضد اور ہٹ دھرمی سے کی جا رہی ہیں۔ اور قوم کے یہ بڑے بڑے سردار دشمنی کے جوش میں اندھے ہو کر محض بے سروپا الزامات لگا رہے ہیں جنہیں کوئی سنجیدہ انسان قابلِ اعتنا نہیں سمجھ سکتا۔ (۱۴)

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا۔ (بنی اسرائیل ۴۸)

"اے نبی، دیکھو کیسی باتیں ہیں جو یہ لوگ تم پر چھانٹتے ہیں۔ یہ بھٹک گئے ہیں، انہیں راستہ نہیں ملتا۔"

یعنی یہ تمہارے متعلق کوئی ایک رائے ظاہر نہیں کرتے بلکہ مختلف اوقات میں بالکل مختلف اور متضاد باتیں کہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں تم خود جادوگر ہو۔ کبھی کہتے ہیں تم پر کسی اور نے جادو کر دیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں تم شاعر ہو۔ کبھی کہتے ہیں تم مجنون ہو۔ اور کبھی یہ کہ کاہن ہو۔ ان کی یہ متضاد باتیں خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ حقیقت ان کو معلوم نہیں ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ آئے دن ایک نئی بات چھانٹنے کے بجائے کوئی ایک ہی قطعی رائے ظاہر کرتے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے کسی قول پر بھی مطمئن نہیں ہیں۔ ایک الزام رکھتے ہیں، پھر آپ ہی محسوس کرتے ہیں کہ یہ چسپاں نہیں ہوتا، اس کے بعد دوسرا الزام لگاتے ہیں اور اسے بھی لگتا ہوا نہ پا کر ایک تیسرا الزام تصنیف کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا ہر نیا الزام ان کے پہلے الزام کی تردید کر دیتا ہے اور اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ صداقت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے، محض عداوت کی بنا پر ایک سے ایک بڑھ کر جھوٹ گھڑے جا رہے ہیں۔ ([illegible])

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْۤ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ۔ (ق-۵)

"بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان کے پاس آیا اسی وقت اسے صاف جھٹلا دیا۔ اسی وجہ سے اب یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔"

اس مختصر سے فقرے میں بھی ایک بہت بڑا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے صرف تعجب کرنے اور بعید از عقل ٹھہرانے ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوتِ حق پیش کی اسی وقت بلا تامل اُسے قطعی جھوٹ قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ ہونا تھا اور یہی ہوا کہ انہیں اس دعوت اور اس کے پیش کرنے والے رسول کے معاملہ میں کسی ایک موقف پر قرار نہیں ہے۔ کبھی آپ کو شاعر کہتے ہیں تو کبھی کاہن اور کبھی مجنون۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ جادوگر ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے خود یہ چیز بنا لایا ہے اور کبھی یہ

الزام تراشتے ہیں کہ اس کے پس پُشت کچھ دوسرے لوگ ہیں جو یہ کلام گھڑ گھڑ کر اُسے دیتے ہیں۔ یہ متضاد باتیں خود ظاہر کرتی ہیں کہ یہ لوگ اپنے موقف میں بالکل الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اس اُلجھن میں یہ ہرگز نہ پڑتے اگر جلد بازی کر کے نبیؐ کو پہلے ہی قدم پر جھٹلا نہ دیتے اور بلا فکر و تامل ایک پیشگی فیصلہ صادر کر دینے سے پہلے سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے کہ یہ دعوت کون پیش کر رہا ہے، کیا بات کہہ رہا ہے اور اس کے لیے دلیل کیا دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔ کہیں سے اچانک ان کے درمیان نہ آ کھڑا ہُوا تھا۔ ان کی اپنی ہی قوم کا فرد تھا۔ ان کا اپنا دیکھا بھالا آدمی تھا۔ یہ اُس کی سیرت و کردار اور اُس کی قابلیت سے ناواقف نہ تھے۔ ایسے آدمی کی طرف سے جب ایک بات پیش کی گئی تھی تو چاہیے اسے فوراً قبول نہ کر لیا جاتا، مگر وہ اس کی مستحق بھی تو نہ تھی کہ سنتے ہی اسے رد کر دیا جاتا۔ پھر وہ بات بے دلیل بھی نہ تھی۔ وہ اس کے لیے دلائل پیش کر رہا تھا۔ چاہیے تھا کہ اُس کے دلائل کھلے کانوں سے سُنے جاتے اور تعصب کے بغیر اُن کو جانچ کر دیکھا جاتا کہ وہ کہاں تک معقول ہیں۔ لیکن یہ روش اختیار کرنے کے بجائے جب ان لوگوں نے ضد میں آ کر ابتدا ہی میں اُسے جھٹلا دیا تو اُس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک حقیقت تک پہنچنے کا دروازہ تو انہوں نے اپنے لیے خود بند کر لیا اور ہر طرف بھٹکتے پھرنے کے بہت سے راستے کھول لیے۔ اب یہ اپنی ابتدائی غلطی کو نباہنے کے لیے دس متضاد باتیں تو بنا سکتے ہیں، مگر اس ایک بات کو سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ نبی سچا بھی ہو سکتا ہے اور اُس کی پیش کردہ بات حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔ (۴۹)

وَإِذَا رَأَوْكَ إِنْ يَتَّخِذُوْنَكَ إِلَّا هُزُوًا ۔ أَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۔ إِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا
عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ أَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۔ (الفرقان۔ ۴۱-۴۲)

"اے نبیؐ، یہ لوگ جب تمہیں دیکھتے ہیں تو بس تمہارا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ (کہتے ہیں)
کیا یہ شخص ہے جسے خدا نے رسُول بنا کر بھیجا ہے؟ اس نے تو ہمیں گمراہ کر کے اپنے معبودوں
سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم اُن کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے۔"

کفار کی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ پہلی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو حقیر سمجھ رہے ہیں اور مذاق اڑا کر آپ کی قدر گرانا چاہتے ہیں، گویا ان کے نزدیک آنحضرتؐ نے اپنی حیثیت سے بہت اونچا دعویٰ کر دیا تھا۔ دوسری بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کے دلائل کی قوت اور آپؐ کی شخصیت کا لوہا مان رہے ہیں اور بے ساختہ اعتراف کرتے ہیں کہ اگر ہم تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے خداؤں کی بندگی پر جم نہ گئے ہوتے تو یہ شخص ہمارے قدم اکھاڑ چکا ہوتا۔ یہ متضاد باتیں خود بتا رہی ہیں کہ اسلامی تحریک نے ان لوگوں کو کس قدر بوکھلا دیا تھا۔ کھسیانے ہو کر مذاق بھی اُڑاتے تھے تو

احساسِ کمتری بلا ارادہ ان کی زبان سے وہ باتیں نکلوا دیتا تھا جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دلوں میں وہ اس طاقت سے کس قدر مرعوب ہیں۔ (۵۰)

طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ

الزامات کی بوچھاڑ کرنے کے ساتھ ساتھ کفارِ قریش بار بار آپؐ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ ان مطالبات کا ذکر آیا ہے اور ان کا جواب دیا گیا ہے:

وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل۔ ۹۰ تا ۹۳)

"اور انہوں نے کہا "ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے، اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں"۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو "پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟"

معجزات کے مطالبے کا ایک جواب اسی سورہ کی آیت وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ میں گزر چکا ہے[1]۔ اب یہاں اسی مطالبے کا دوسرا جواب دیا گیا ہے۔ اس مختصر سے جواب کی بلاغت تعریف

---

[1] وہ جواب یہ تھا کہ جو معجزات کسی نبی کی دلیلِ نبوت کے طور پر پیش کیے گئے ہوں ان کو دیکھ کر بھی جب کوئی قوم نبی کو جھٹلا دیتی ہے تو اس پر لامحالہ خدا کا عذاب نازل ہو جاتا ہے اور اس کی بکثرت مثالیں تاریخ میں گزر چکی ہیں۔ اب یہ سراسر اللہ کی رحمت ہے کہ وہ ایسا کوئی معجزہ نہیں بھیج رہا ہے۔ مگر تم لوگ ایسے نادان ہو کہ اس کا مطالبہ کر رہے ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

سے بالاتر ہے۔ مخالفین کا مطالبہ تھا کہ اگر تم پیغمبر ہو تو ابھی زمین کی طرف اشارہ کرو اور یکایک ایک چشمہ پھوٹ بہے۔ یا فوراً ایک لہلہاتا باغ پیدا ہو جائے اور اس میں نہریں جاری ہو جائیں۔ آسمان کی طرف اشارہ کرو اور تمہارے جھٹلانے والوں پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جائے۔ ایک پھونک مارو اور چشم زدن میں سونے کا ایک محل بن کر تیار ہو جائے۔ ایک آواز دو اور ہمارے سامنے خدا اور اس کے فرشتے فوراً آ کھڑے ہوں اور وہ شہادت دیں کہ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ یا ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ کر جاؤ اور اللہ میاں سے ایک خط ہمارے نام لکھوا لاؤ جسے ہم ہاتھ سے چھوئیں اور آنکھوں سے پڑھیں ـــــــ ان لمبے چوڑے مطالبوں کا بس یہ جواب دے کر چھوڑ دیا گیا کہ "ان سے کہو، پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟" یعنی بے وقوفو! کیا میں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا کہ تم یہ مطالبے مجھ سے کرنے لگے؟ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میں قادرِ مطلق ہوں؟ میں نے کب کہا تھا کہ زمین و آسمان پر میری حکومت چل رہی ہے؟ میرا دعویٰ تو اوّل روز سے یہی تھا کہ میں خدا کی طرف سے پیغام لانے والا ایک انسان ہوں۔ تمہیں جانچنا ہے تو میرے پیغام کو جانچو۔ ایمان لانا ہے تو اس پیغام کی صداقت و معقولیت دیکھ کر ایمان لاؤ۔ انکار کرنا ہے تو اس پیغام میں کوئی نقص نکال کر دکھاؤ۔ میری صداقت کا اطمینان کرنا ہے تو ایک انسان ہونے کی حیثیت سے میری زندگی کو، میرے کام کو دیکھو۔ یہ سب چھوڑ کر تم مجھ سے یہ کیا مطالبے کرنے لگے کہ زمین پھاڑ دو اور آسمان گرا دو؟ آخر پیغمبری کا ان کاموں سے کیا تعلق ہے؟ (۵۸)

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَ
إِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (العنکبوت: ۵۰-۵۱)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں (یعنی معجزات) اس کے رب کی طرف سے؟ اسے نبی کہو، نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں بس ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں۔ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"

یعنی اُمّی ہونے کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا، کیا یہ بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ آپ کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے یہ کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے

کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو انہوں نے دیکھے اُن کے لیے وہ معجزے تھے مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمہارے سامنے ہے تمہیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔ (۶۳)

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۝
كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ۔ (المدثر ۵۲-۵۵)

"بلکہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے نام کھلے خط بھیجے جائیں، ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے، ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کر لے۔"

یعنی یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مقرر فرمایا ہے تو وہ مکہ کے ایک ایک سردار اور ایک ایک شیخ کے نام ایک خط لکھ کر بھیجے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نبی ہیں تم ان کی پیروی قبول کر لو، اور یہ خط ایسے ہوں جنہیں دیکھ کر انہیں یقین آ جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ لکھ کر بھیجے ہیں۔ ایک اور مقام پر قرآن مجید میں کفار مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہم نہ مانیں گے جب تک وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے" (الانعام، ۱۲۴)۔ ایک دوسری جگہ ان کا یہ مطالبہ نقل کیا گیا ہے کہ "آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لا کر ہمیں دیں جسے ہم پڑھیں" (بنی اسرائیل۔۹۳)۔ جواب میں فرمایا گیا کہ ان کا یہ مطالبہ ہرگز پورا نہیں کیا جائے گا۔ ان کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ یہ ہے ہی نہیں کہ ان کے یہ مطالبے پورے نہیں کیے جاتے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت سے بے خوف ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اسی دنیا کو سمجھ رکھا ہے اور انہیں یہ خیال نہیں ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس میں ان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں بے فکر اور غیر ذمہ دار بنا دیا ہے۔ یہ حق اور باطل کے سوال کو سرے سے بے معنی سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں دنیا میں کوئی حق ایسا نظر نہیں آتا جس کی پیروی کا نتیجہ دنیا میں لازماً اچھا ہی نکلتا ہو، اور نہ کوئی باطل ایسا نظر آتا ہے جس کا نتیجہ دنیا میں ضرور برا ہی نکلا کرتا ہو۔ اس لیے یہ اس مسئلے پر غور کرنا فضول سمجھتے ہیں کہ فی الواقع حق کیا ہے اور باطل کیا؟ یہ مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ اگر قابلِ غور ہو سکتا ہے

---

۱ سورۂ انعام میں اس کا مختصر جواب یہ دیا گیا ہے کہ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ "اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغمبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔" (حاشیہ از مؤلف)

تو صرف اُس شخص کے لیے جو دنیا کی موجودہ زندگی کو ایک عارضی زندگی سمجھتا ہو اور یہ تسلیم کرتا ہو کہ اصلی اور ابدی زندگی آخرت کی زندگی ہے جہاں حق کا انجام لازماً اچھا ہوگا اور باطل کا انجام لازماً بُرا ہوگا ایسا شخص قرآن معقول دلائل اور اُن پاکیزہ تعلیمات کو دیکھ کر ایمان لائے گا جو قرآن میں پیش کی گئی ہیں، اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ قرآن جن عقائد اور اعمال کو غلط کہہ رہا ہے ان میں فی الواقع کیا غلطی ہے لیکن آخرت کا منکر جو سرے سے تلاشِ حق ہی میں سنجیدہ ہی نہیں ہے وہ ایمان نہ لانے کے لیے آئے دن نت نئے مطالبے پیش کرے گا، حالانکہ اس کا خواہ کوئی مطالبہ بھی پورا کر دیا جائے وہ انکار کرنے کے لیے کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈ نکالے گا یہی بات ہے جو سورۂ انعام میں فرمائی گئی ہے کہ "اے نبیؐ! اگر ہم تمہارے اوپر کاغذ میں لکھی لکھائی کوئی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اُسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے" (انعام-۷) (۵۴)

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۝ (الانعام-۸-۹)

"وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اُتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انہیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔ اور اگر ہم فرشتے کو اُتارتے تب بھی اسے انسانی شکل میں اُتارتے اور اس طرح انہیں اسی شبہ میں ڈال دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں"

اُن لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ جب یہ شخص خدا کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے تو آسمان سے ایک فرشتہ اُترنا چاہیے تھا جو لوگوں سے کہتا کہ یہ خدا کا پیغمبر ہے، اس کی بات مانو ورنہ تمہیں سزا دی جائے گی۔ جاہل معترضین کو اس بات پر تعجب تھا کہ خالقِ ارض و سماء کسی کو پیغمبر مقرر کرے اور پھر اس طرح اسے بے یار و مددگار پتھر کھانے اور گالیاں سننے کے لیے چھوڑ دے۔ اتنے بڑے بادشاہ کا سفیر اگر کسی بڑے اسٹاف کے ساتھ نہ آیا تھا تو کم از کم ایک فرشتہ تو اس کی اردلی میں دینا چاہیے تھا تاکہ وہ اس کی حفاظت کرتا اس کا رُعب بٹھاتا، اس کی مامورّیت کا یقین دلاتا اور فوق الفطری طریقے سے اس کے کام انجام دیتا۔

اس کا پہلا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر فرشتہ اپنی اصلی صورت میں بھیج دیا جاتا تو فیصلہ چکا دینے کا وقت آجاتا اور پھر مہلت نہ دی جاتی۔ ایمان لانے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینے کے لیے جو مہلت تمہیں مل رہی ہے یہ اُسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ جہاں غیب کا پردہ چاک ہوا، پھر مہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ اُس کے بعد تو صرف حساب ہی لینا باقی

رہ جاتے گا ۔ اس لیے کہ دنیا کی زندگی تمہارے لیے ایک امتحان کا زمانہ ہے اور امتحان اس امر کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر عقل و فکر کے صحیح استعمال سے اُس کا ادراک کرتے ہو یا نہیں اور ادراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کے مطابق درست رکھتے ہو یا نہیں۔ اس امتحان کے لیے غیب کا غیب رہنا شرط لازم ہے۔ اور تمہاری دنیوی زندگی جو دراصل مہلتِ امتحان ہے، اُسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک غیب، غیب ہے۔ جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہُوا، یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کے بجائے نتیجۂ امتحان نکلنے کا وقت آ پہنچے گا۔ لہٰذا تمہارے مطالبہ کے جواب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے سامنے فرشتے کو اُس کی اصلی صورت میں نمایاں کر دیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ ابھی تمہارے امتحان کی مدّت ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اس کے بعد دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر فرشتہ انسانی صورت میں آتا تو تمہیں وہی شبہات لاحق ہوتے جو اب نبی کے بارے میں لاحق ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فرشتے کے آنے کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے علانیہ اپنی اصلی غیبی صورت میں ظاہر ہوتا لیکن اُوپر بتا دیا گیا ہے کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اب دوسری صورت یہ باقی رہ گئی کہ وہ انسانی صورت میں آئے۔ اس کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ انسانی صورت میں آتے تو اُس کے مامور من اللہ ہونے میں بھی تم کو وہی اشتباہ پیش آتے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے مامور من اللہ ہونے میں پیش آ رہا ہے۔ (۴۳)

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۞ وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم ۚ مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۞ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمٌّ وَبُكْمٌ فِي الظُّلُمَاتِ ۗ (الانعام: ۳۷-۳۹)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس (نبی) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی (یعنی محسوس معجزہ) کیوں نہیں اُتاری گئی؟ اِن سے کہو کہ اللہ نشانی اُتارنے کی پُوری قدرت رکھتا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔ زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔ ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔"

اِس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہ دکھانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ اس کے دکھانے پر قادر نہیں ہے

بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے جسے تم لوگ اپنی نادانی کی وجہ سے نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر تمہیں محض تماشہ بینی کا شوق نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ معلوم کرنے کے لیے نشانی دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے وہ امرِ حق ہے یا نہیں، تو آنکھیں کھول کر دیکھو، تمہارے گرد و پیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ زمین کے جانوروں اور ہوا کے پرندوں کی کسی ایک نوع کو لے کر اُس کی زندگی پر غور کرو کس طرح اُس کی ساخت ٹھیک ٹھیک اُس کے مناسبِ حال بنائی گئی ہے کس طرح اُس کی جبلت میں اُس کی فطری ضرورتوں کے عین مطابق قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ کس طرح اُس کی رزق رسانی کا انتظام ہو رہا ہے۔ کس طرح اس کی ایک تقدیر مقرر ہے جس کے حدود سے نہ وہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ کس طرح ان میں سے ایک ایک جانور اور ایک ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کی اُسی مقام پر جہاں وہ ہے خبر گیری، نگرانی، حفاظت اور رہنمائی کی جا رہی ہے۔ کس طرح اُس سے ایک مقرر اسکیم کے مطابق کام لیا جا رہا ہے۔ کس طرح اُسے ایک ضابطہ کا پابند بنا کر رکھا گیا ہے اور کس طرح اس کی پیدائش، تناسل اور موت کا سلسلہ پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اگر خدا کی بے شمار نشانیوں میں سے صرف اسی ایک نشانی پر غور کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ خدا کی توحید اور اُس کی صفات کا جو تصور یہ پیغمبر تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے اور اُس تصور کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس رویّے کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہے وہ عین حق ہے۔ لیکن تم لوگ نہ خود اپنی آنکھیں کھول کر دیکھتے ہو نہ کسی سمجھانے والے کی بات سنتے ہو۔ جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہو اور چاہتے ہو کہ عجائبِ قدرت کے کرشمے دکھا کر تمہارا دل بہلایا جائے۔ ([illegible])

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ

(الرعد-۳۱)

اور کیا ہو جاتا اگر کوئی قرآن ایسا اُتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے، یا زمین شق ہو جاتی، یا مُردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟

اس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس میں خطاب کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ مسلمان جب بار بار کفار کی طرف سے نشانی کا مطالبہ سنتے تھے تو ان کے دلوں میں بے چینی پیدا ہوتی تھی کہ کاش ان لوگوں کو کوئی ایسی نشانی دکھا دی جاتی جس سے یہ لوگ قائل ہو جاتے۔ پھر جب وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کی کسی نشانی کے نہ آنے کی وجہ سے کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شبہات پھیلانے کا موقع مل رہا ہے تو ان کی یہ بے چینی اور بھی زیادہ بڑھ

جاتی تھی۔ اس پر مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ اگر قرآن کی کسی صورت کے ساتھ ایسی اور ایسی نشانیاں بھی ایک دکھا بھی دی جائیں تو کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آتے؟ کیا تمہیں ان سے یہ خوش گمانی ہے کہ یہ قبولِ حق کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں، صرف ایک نشانی کے ظہور کی کسر ہے؟ جن لوگوں کو قرآن کی تعلیم میں، کائنات کے آثار میں، نبیؐ کی پاکیزہ زندگی میں، اصحابِ نبیؐ کے انقلابِ حیات میں توحید کی نظر نہ آیا کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ پہاڑوں کے چلنے اور زمین کے پھٹنے اور مُردوں کے قبروں سے نکل آنے میں کوئی روشنی پا لیں گے؟ (۶۱)

حضورؐ کی رسالت کا صریح ثبوت

اس طرح کفار نے جتنے بھی الزامات و اعتراضات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کیے اور اُس کا ثبوت مانگنے کے لیے جتنے بھی معجزات دکھانے کے مطالبات کیے، ان میں سے ایک ایک کا نہایت معقول جواب دے کر یہ گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی کہ کوئی شخص عقل و استدلال کی بنیاد پر آپؐ کی رسالت کو مشتبہ ثابت کر سکتا۔ پھر تین ایسے صریح ثبوت آپؐ کی رسالت کے حق میں پیش کیے گئے جن کے بعد اس کے خلاف میں بسنے والے کسی شخص کے لیے انکار کی گنجائش نہیں۔ ذیل میں ہم ان کو سلسلہ وار پیش کرتے ہیں:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ۔ (العنکبوت ـ ۴۸)

"(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔"

اس آیت میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے۔ آپ کے اہلِ وطن اور رشتہ دار برادری کے لوگ جن کے درمیان سنِ پیدائش سے سنِ کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ قلم ہاتھ میں لیا۔ اس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیاء سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے اسے کبھی کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل کیا گیا ہے لیکن اس کی اُمّیت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص

ہٹ دھرمی کے سوا اس کی نبوّت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجہ میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔ (۵۷)

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (یونس - ۱۶)

"(اے نبیؐ) ان سے کہو کہ " اگر اللہ کی مشیّت یہی ہوتی (کہ میں نبی نہ بنایا جاؤں) تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سُناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ؟"

یہ ایک زبردست دلیل تھی، کفارِ مکّہ کے اِس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور حضورؐ کے اِس دعوے کی تائید میں کہ آپ خود اس کے مُصنّف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی آپؐ پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو بہت دُور کی چیز تھے، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی تو ان لوگوں کے سامنے کی چیز تھی۔ آپؐ نے نبوّت سے پہلے پورے چالیس سال اُن کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہُوئے، اُن کی آنکھوں کے سامنے بچپن گزارا، جوان ہُوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے، رہنا سہنا، ملنا جُلنا، لین دین، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشی تعلق انہی کے ساتھ تھا اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو اُن سے چُھپا ہُوا نہ تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی ؟

آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنہیں مکّہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا: ایک یہ کہ نبوّت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی تھی جس سے آپ کو یہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوّت کے ساتھ ہی آپؐ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہُوئے، اُن مباحث پر گفتگو کرتے ہُوئے، اور اُن خیالات کا اظہار کرتے ہُوئے نہیں دیکھے گئے تھے جو اب قرآن کی ان پے در پے سُورتوں میں زیر بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اِس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپؐ کے کسی گہرے سے گہرے دوست اور کسی قریب سے قریب رشتہ دار نے بھی آپؐ کی باتوں اور آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی تھی جسے اُس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا جو آپؐ نے اچانک چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپؐ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ خارج سے آپؐ کے اندر آتی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے

کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقا کے واضح نشانات اُس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں یہی وجہ ہے کہ مکّہ کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپؐ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ مکّہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے؟

دوسری بات جو آپؐ کی سابق زندگی میں بالکل نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں آپ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اُسے ہُوا ہے۔ برعکس اِس کے جن جن لوگوں کو بھی آپ سے سابقہ پیش آیا تھا وہ آپ کو ایک نہایت سچّے، بے داغ، اور قابلِ اعتماد، امین انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ، جعل اور فریب سے کام نہ لیا تھا وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل و فریب لے کر اُٹھ کھڑا ہُوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور اور تحدّی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔ اِس بنا پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُن کے اِس بیہودہ الزام کے جواب میں ان سے کہو کہ اللہ کے بندو، کچھ عقل سے تو کام لو۔ میں کوئی باہر سے آیا ہُوا اجنبی آدمی تو نہیں ہوں، تمہارے درمیان ایک عمر اس سے پہلے گزار چکا ہوں۔ میری سابق زندگی کو دیکھتے ہوئے تم کیسے یہ توقع مجھ سے کر سکتے ہو کہ میں خدا کی تعلیم اور اس کے حکم کے بغیر یہ قرآن تمہارے سامنے پیش کر سکتا تھا؟ (۵۸)

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ - (القصص۔ ۸۶)

"اور (اے نبیؐ) تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی۔ یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی ہے (کہ یہ تم پر نازل ہوئی ہے)۔"

یہ ایک اور دلیل تھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے ثبوت میں پیش کی گئی۔ جس طرح موسیٰ علیہ السّلام بالکل بے خبر تھے کہ انہیں نبی بنایا جانے والا ہے اور ایک عظیم الشان مشن پر وہ مامور کیے جانے والے ہیں، اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی اِس کا ارادہ یا خواہش تو درکنار، اس کی توقع تک کبھی نہ گزری تھی، بس یکایک راہ چلتے اُنہیں کھینچ بلایا گیا اور نبی بنا کر وہ حیرت انگیز کام اُن سے لیا گیا جو ان کی سابق زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا

تھا ٹھیک ایسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکے کے لوگ خود جانتے تھے کہ غار حرا سے جس روز آپ نبوت کا پیغام لے کر اترے اس سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی کیا تھی، آپ کے مشاغل کیا تھے، آپ کی بات چیت کیا تھی، آپ کی گفتگو کے موضوعات کیا تھے، آپ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں۔ یہ پوری زندگی صداقت، دیانت، امانت اور پاکبازی سے لبریز ضرور تھی، اس میں انتہائی شرافت، امن پسندی، پاسِ عہد، ادائے حقوق اور خدمتِ خلق کا رنگ بھی غیر معمولی شان کے ساتھ نمایاں تھا، مگر اس میں کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال گزر سکتا کہ یہ نیک بندہ کل نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ آپ سے قریب ترین ربط ضبط رکھنے والوں میں، آپ کے رشتہ داروں، ہمسایوں اور دوستوں میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپ پہلے سے نبی بننے کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے اُن مضامین اور مسائل اور موضوعات کے متعلق کبھی ایک لفظ تک آپ کی زبان سے نہ سنا تھا جو غار حرا کی اُس انقلابی ساعت کے بعد یکایک آپ کی زبان پر جاری ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے آپ کو وہ مخصوص زبان اور وہ الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتے نہ سنا تھا جو یکایک قرآن کی صورت میں لوگ آپ سے سننے لگے۔ کبھی آپ وعظ کہنے کھڑے نہ ہوئے تھے۔ کبھی کوئی دعوت اور تحریک لے کر نہ اُٹھے تھے۔ بلکہ کبھی آپ کی کسی سرگرمی سے یہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ آپ اجتماعی مسائل کے حل، یا مذہبی اصلاح، یا اخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کام شروع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اُس انقلابی ساعت سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی ایک ایسے تاجر کی زندگی نظر آتی تھی جو سیدھے سادے جائز طریقوں سے اپنی روزی کماتا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا ہے، مہمانوں کی تواضع، غریبوں کی مدد اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرتا ہے، اور کبھی کبھی عبادت کرنے کے لیے خلوت میں جا بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کا یکایک ایک عالمگیر زلزلہ ڈال دینے والی خطابت کے ساتھ اُٹھنا، ایک انقلاب انگیز دعوت شروع کر دینا، ایک نرالا لٹریچر پیدا کر دینا، ایک مستقل فلسفۂ حیات اور نظامِ فکر و اخلاق و تمدن لے کر سامنے آجانا، اتنا بڑا تغیر تھا جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے کسی بناوٹ اور تیاری اور ارادی کوشش کے نتیجے میں قطعاً رونما نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ ایسی ہر کوشش اور تیاری بہرحال تدریجی ارتقاء کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل اُن لوگوں سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتے جن کے درمیان آدمی شب و روز زندگی گزار رہا ہو۔ اگر آنحضرتؐ کی زندگی ان مراحل سے گزری ہوتی تو مکے میں سینکڑوں زبانیں یہ کہنے والی ہوتیں کہ ہم نہ کہتے تھے کہ یہ شخص ایک دن کوئی بڑا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کفارِ مکہ نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے مگر یہ اعتراض کرنے والا ان میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تھا۔

پھر یہ بات کہ آپؐ خود بھی نبوت کے خواہشمند یا اس کے لیے متوقع اور منتظر تھے، بلکہ پوری بے خبری کی حالت میں اچانک آپؐ کو اس معاملے سے سابقہ پیش آ گیا، اس کا ثبوت اُس واقعے سے ملتا ہے جو احادیث میں آغازِ وحی کی کیفیت کے متعلق موجود ہے۔ (چونکہ اس سے پہلے ہم "آغازِ رسالت" کے باب میں اس کی تفصیل درج کر چکے ہیں، اس لیے یہاں اس کے اعادے کی حاجت نہیں ہے) (۴۹)

فصل سوم

قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان کی دعوت

دعوتِ اسلامی کا تیسرا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ لوگ قرآن مجید کو اللہ کی کتاب تسلیم کریں، اس کی ہر بات کو حق اور مِن جانب اللہ مانیں، اُس میں عقائد، افکار، اخلاق، عبادات اور معاملات کے متعلق جو تعلیم بھی دی گئی ہے اُسے اپنی زندگی کے لیے اساسی قانون قرار دیں، اور ہر اُس چیز کو رد کر دیں جو اس کی ہدایت کے خلاف ہو۔ اس عقیدے میں یہ ماننا بھی لازماً شامل تھا کہ قرآن لفظ بلفظ اللہ کا کلام ہے جو جبریل علیہ السلام کے ذریعہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف معانی آپؐ کے دل میں ڈال دیے گئے ہوں اور آپؐ نے اپنے الفاظ میں اُن کو ادا کر دیا ہو۔ نیز اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ یہ کتاب جن الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے ٹھیک اُنہی الفاظ میں وہ جوں کی توں محفوظ کر دی گئی ہے، اس میں نہ کوئی تغیر و تبدل ہوا ہے، نہ کوئی کمی بیشی ہوئی ہے اور نہ باطل اس میں کسی طرح داخل ہو سکتا ہے۔ علاوہ بریں چونکہ یہ براہِ راست اللہ رب العالمین کا کلام ہے اس لیے یہ خود رسولؐ پر بھی حاکم ہے۔ اگرچہ یہ آیا رسولؐ ہی کے ذریعہ سے ہے، مگر رسولؐ اس کا تابع ہے، اُس کے اتباع پر مامور ہے، اس کے اندر اپنی طرف سے کچھ گھٹانے یا بڑھانے کا مجاز نہیں ہے، بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے وہ خود اس کی پیروی کرے، اور پھر اس کے منشا کے مطابق دین اور پورے نظامِ حیات کو قائم کر دے۔

یہ عقیدہ اُس انقلاب کو اور زیادہ مستحکم کر دینے والا تھا جو برپا کرنا اسلام کے پیشِ نظر تھا، اس لیے کہ اس نے خدا کی طرف سے ایک مستقل کتاب فراہم کر دی تھی جس میں خدا نے خود اپنے الفاظ میں صاف صاف بتا دیا

تھا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اب لوگ ہر وقت ہر زمانے میں اس کی طرف رجوع کر کے معلوم کر سکتے ہیں کہ اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ ایک انسان کو نبی بنانے کے ساتھ ایک کتاب بھی اس کے ساتھ نازل کر دینا اور لوگوں کو دونوں پر ایمان لانے اور دونوں کی اطاعت کرنے کا حکم دینا، لازمی طور پر یہ معنی رکھتا تھا کہ انسانی افراد اور معاشروں میں جہاں بھی اس ایمان اور اس اطاعت کو قبول کر لیا جائے وہاں سے من مانی کرنے کی آزادی رخصت ہو جائے، فرد اپنی انفرادی حیثیت میں اور معاشرہ اپنی اجتماعی حیثیت میں ایک رہنما اور ایک کتاب آئین کا تابع فرمان ہو جائے، رہنما کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد بھی کتاب آئین ہر وقت یہ بتانے کے لیے دنیا میں موجود رہے کہ خدا نے کس چیز کا حکم دیا ہے اور کس سے منع کیا ہے، اور رہنما کی چھوڑی ہوئی سُنّت (جو خود قرآن کی رو سے کلام الٰہی کی مستند سرکاری تشریح و توضیح ہے) اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دے کہ خواہشات نفس کے بندے یا دوسرے نظریاتِ زندگی کے معتقد، کتابِ آئین کو اس کے اصل معنی و مدعا سے پھیر کر اس کی غلط تعبیریں کرنے لگیں۔

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی تبلیغ کے آغاز ہی میں توحید اور رسالت محمدیہ کے ساتھ قرآن پر ایمان لانے اور اس کو کلام الٰہی کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی دعوت دینا بھی کیوں ضروری تھا اور اس کی کیا اہمیت تھی۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے کہ جس وقت اس قرآن کو پیش کیا گیا تھا اس وقت اس کی حیثیت کیا بیان کی گئی تھی، اور جو لوگ اس کو کتاب اللہ ماننے سے انکار کر رہے تھے ان کے سامنے کس قدر مضبوط دلائل کے ساتھ اس کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت پیش کیا گیا تھا۔

قرآن خدا کا کلام ہے جو لفظاً بلفظ حضورؐ پر وحی کیا گیا ہے

یہ اوّلین بات تھی جسے پورے زور کے ساتھ قرآن میں اس قدر کثرت کے ساتھ بیان کیا گیا کہ اس مضمون کی ساری آیات یہاں نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ پورے قرآن میں کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہو کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے۔ ساری کتاب اس حیثیت ہی سے پیش کی گئی ہے کہ یہ خدا کی نازل کردہ وحی ہے۔ مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ ۴۸)

"اور (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی ہے جو حق لے کر آئی ہے اور کتب الٰہیہ میں سے جو کچھ اس سے پہلے آیا ہوا موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔

پس تم لوگوں کے درمیان اُس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کی ہے اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔"

اس آیت میں صراحتہ نہ صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق لے کر آئی ہے، بلکہ دو باتیں اور بھی بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ہر اُس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کے اندر اپنی اصلی اور صحیح صورت میں موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ اُن کتابوں کی محافظ و نگہبان ہے یعنی اس نے اُن تمام برحق تعلیمات کو اپنے اندر لے کر محفوظ کر دیا ہے جو اُن میں پائی جاتی ہیں، اور جو خلافِ حق باتیں ان کے اندر شامل کر دی گئی ہیں انہیں اس کتاب کی مدد سے چھانٹ کر الگ کیا جا سکتا ہے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا

(بنی اسرائیل - ۱۰۵)

"اور اِس (قرآن) کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہُوا ہے اور (اے محمدؐ) ہم نے تمہیں اِس کے سوا کسی کام کے لیے رسُول بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ (جو مان لے اُسے) بشارت دے دو اور (جو نہ مانے) اُسے ڈرا دو۔"

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ (الکہف - ۲۷)

"اور (اے نبیؐ) تمہارے رب کی جو کتاب تم پر وحی کی گئی ہے اُسے پڑھ کر سُناؤ۔"

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (الزمر - ۴۱)

"(اے محمدؐ) ہم نے تم پر یہ کتاب لوگوں کے لیے حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ اب جو ہدایت قبول کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا اور جو گمراہ ہوگا اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا۔ تم اُن کے ذمہ دار نہیں ہو۔"

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (الشوریٰ - ۷)

"اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف عربی زبان کا قرآن وحی کیا تاکہ تم بستیوں کے مرکز (مکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو۔"

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔ (الاحقاف - ۲)

"اِس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔"

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص-۲۹)

"یہ ایک کتاب ہے برکت والی جسے (اے محمدؐ) ہم نے تم پر نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔"

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (النمل-۶)

"اور (اے محمدؐ) یقیناً تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو (یعنی اُس ہستی کی طرف سے جو علم اور حکمت میں کامل ہے)۔"

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۔ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۔ (الشعراء-۱۹۲ تا ۱۹۵)

"اور بے شبہ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ اسے لے کر ایک امانت دار روح[۱] تمہارے قلب پر اتری ہے، تاکہ (اے محمدؐ) تم تنبیہ (خلقِ خدا کو خبردار کرنے والے انبیاء) میں سے ہو جاؤ، صاف صاف عربی زبان میں۔"

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ (القیامۃ: ۱۶ تا ۱۹)

"اے نبیؐ! اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔"

یہ آیات نہ صرف اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ یہ پوری کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوئی ہے، بلکہ آخری دو آیتیں اس باب میں قطعی صریح ہیں کہ اس کے محض معانی حضورؐ پر القاء نہیں ہوتے ہیں جنہیں آپ اپنے الفاظ میں ادا کرتے ہوں، بلکہ اس کے الفاظ بھی اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔ روح الامین کا رب العالمین کی طرف سے عربی زبان میں وحی لے کر نازل ہونا، اُسے آپ کے سامنے پڑھنا، آپ کا اُسے جلدی جلدی یاد کرنے کی کوشش کرنا، اور اللہ تعالیٰ

---

۱ امانت دار روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جو قرآن لے کر آتے تھے۔ یہاں ان کا نام لینے کے بجائے امانت دار روح کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ خالص روح ہیں بلا شائبۂ مادیت، اور ایسے امین ہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ اُن کے ذریعے سے وحی بھیجتا ہے بالکل اسی طرح وہ بلا کم و کاست نبی تک پہنچا دیتے ہیں۔ (حاشیہ از مترجم)

کا یہ فرمایا کہ آپ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ جب یہ پڑھا جا رہا ہو اُس وقت اِسے سُنتے رہیں، پھر اُسے یاد کرا دینا، اُسے پڑھوا دینا اور اس کا مطلب سمجھا دینا، سب کچھ ہمارے ذمہ ہے، یہ ساری باتیں اُسی صورت میں با معنی ہوتی ہیں جبکہ وحی کے الفاظ بھی اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتے ہوں۔ ورنہ قلبِ رسُول پر محض معانی اور خیالات کا اِلقاء ہونے کی صورت میں اس کے پڑھنے اور سُننے اور یاد کرنے اور زبانِ عربی اس کے نازل ہونے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم خود بھی قرآن کے اِتّباع پر مامُور ہیں

قرآن میں اِس بات کی بھی صاف صاف صراحت کر دی گئی کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قرآن کے تابع امر ہیں، اُس کی پیروی پر مامُور ہیں اور آپ کو اس میں کچھ گھٹانے یا بڑھانے یا کسی قسم کا ردّ و بدل کر دینے کا اختیار نہیں ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۔ (الاحزاب ۲)

"اور (اے نبیؐ) پیروی کرو اُس چیز کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے وحی کی جا رہی ہے۔ جو کچھ تم لوگ کرتے ہو، اللہ اُس سے یقیناً باخبر ہے"

اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۔

(الانعام - ۱۰۶)

"(اے محمدؐ) جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے وحی کیا گیا ہے اُسی کی پیروی کرو۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اور مشرکین سے بے پروا ہو جاؤ"

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۔ (الاحقاف - ۹)

(اے محمدؐ) ان سے کہو "میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے شخص کے سوا اور کچھ نہیں ہوں"

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِم بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۔ (الاعراف ۲۰۳)

"اور (اے نبیؐ) جب تم اِن لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لیے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ اِن سے کہو میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میری طرف بھیجی جاتی ہے۔ یہ (قرآن کی آیات) بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کے لیے

جو ان پر ایمان لائیں۔"

یعنی میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو، یا جس چیز کی میں خود ضرورت محسوس کروں اُسے خود ایجاد یا تصنیف کر کے پیش کر دوں۔ میں تو ایک رسول ہوں اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں۔ معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے وہ یہ قرآن ہے۔ اِس کے اندر بصیرت افروز روشنیاں موجود ہیں اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اسے مان لیتے ہیں ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے اور ان کے اخلاقِ حسنہ میں رحمتِ الٰہی کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (یونس-١٥)

"اور جب اُن کو ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو (آخرت میں) ہم سے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ، یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ (اے محمدؐ) اِن سے کہو مجھے یہ حق نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تبدیلی کر لوں۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔"

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝ (الحاقہ-٤٤ تا ٤٧)

"اور اگر یہ (نبی) خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگِ گردن کاٹ دیتے، پھر تم میں سے کوئی اِس میں حائل ہونے والا نہ ہوتا۔"

قرآن ہر لحاظ سے محفوظ ہے اور اس کی ہر بات اٹل ہے

یہ بات بھی قرآن میں صاف صاف کہہ دی گئی کہ قرآن کو لفظ بلفظ محفوظ رکھنے کا اللہ نے خود ذمہ لیا ہے، اس کی ہر بات اٹل ہے، اس میں باطل کسی طرف سے راہ نہیں پا سکتا، اور اللہ تعالیٰ آفاق اور انفس میں مسلسل ایسی نشانیاں دکھاتا چلا جائے گا جن سے اس کا حق ہونا ثابت ہو جائے گا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (الحجر-٩)

"ہم ہی نے اِس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

یعنی یہ براہِ راست ہماری حفاظت میں ہے۔ نہ کسی کے مٹائے مٹ سکے گا، نہ کسی کے دبائے دب سکے گا، نہ کسی کے طعنوں اور اعتراضوں سے اس کی قدر گھٹ سکے گی، نہ کسی کے روکے اس کی دعوت رُک سکے گی نہ اس میں تحریف اور ردّ و بدل کا کسی کو موقع مل سکے گا۔"

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۔ (البروج - ۲۱-۲۲)

بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے اُس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے۔"

یعنی اِس قرآن کا لکھا اَمِٹ ہے، اٹل ہے، خدا کی اُس لوحِ محفوظ میں ثبت ہے جس کے اندر کوئی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ جو بات اِس میں لکھ دی گئی ہے وہ پوری ہو کر رہنے والی ہے تمام دنیا مل کر بھی اسے باطل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۔ (حٰمٓ السجدہ - ۴۲)

" اور حقیقت یہ ہے کہ یہ (قرآن) ایک زبردست کتاب ہے، باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ اُس ہستی کی نازل کردہ چیز ہے جو حکمت والی ہے اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔"

سامنے سے باطل کے نہ آسکنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پر براہِ راست حملہ کر کے کوئی شخص اس کی کسی بات کو غلط اور کسی تعلیم کو باطل و فاسد ثابت کرنا چاہے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پیچھے سے نہ آسکنے کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں کبھی کوئی حقیقت و صداقت ایسی منکشف نہیں ہو سکتی جو قرآن کے پیش کردہ حقائق کے خلاف ہو، کوئی علم ایسا نہیں آسکتا جو فی الواقع "علم" ہو اور قرآن کے بیان کردہ علم کی تردید کرتا ہو، کوئی تجربہ اور مشاہدہ ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ ثابت کر دے کہ قرآن نے عقائد، اخلاق، قانون، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور سیاستِ مدن کے باب میں انسان کی جو رہنمائی کی ہے وہ غلط ہے۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (حٰمٓ السجدہ - ۵۳)

" عنقریب ہم اِن کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور اِن کے اپنے نفس میں بھی دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ (قرآن) واقعی برحق ہے۔"

اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ عنقریب اِس قرآن کی دعوت دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھا جائے گی اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس کی بدولت انسانی زندگی میں کیسا عظیم مذہبی، اخلاقی،

ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدنی و معاشی انقلاب برپا ہوتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں آفاق ارض و سماء اور خود انسان کے اپنے وجود کے بارے میں انسانی علم کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا قرآن کا برحق ہونا اور زیادہ کھلتا چلا جائے گا۔

قرآن کا انکار کفر ہے

ایمان بالقرآن اسلامی دعوت کا اتنا ہی اہم جزو ہے جتنا توحید اور رسالت پر ایمان، اس لیے کسی لگی لپٹی کے بغیر لوگوں کو دعوت دی گئی کہ اس کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان لاؤ، اور جو اس پر ایمان نہ لاتے وہ کافر ہے۔ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات میں جن لوگوں کو برسرِ ہدایت قرار دیا گیا ہے ان کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۔ (البقرہ۔۴)

"اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اُس کتاب پر جو (اے نبیؐ) تم پر نازل ہوئی ہے اور اُن کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں"۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۔ (بنی اسرائیل۔۸۲)

"ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو (اس پر) ایمان لانے والوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے اور (ایمان نہ لانے والے) ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا"۔

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۔ (العنکبوت۔۴۷)

"اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں"۔

کفّار کا ردّعمل

اس حیثیت سے جب قرآن کو پیش کیا گیا تو کفارِ قریش اور عام مشرکین عرب کے لیے اس کو ماننا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو خدا کا رسول ماننے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا۔ کیونکہ حضورؐ کو رسول مان کر وہ آپ کی اطاعت و پیروی قبول کر بھی لیتے تو یہ اُمید کر سکتے تھے کہ آپ کے دُنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد وہ یہ قلادہ اپنی گردن سے اُتار پھینکیں گے۔ لیکن یہاں تو ایک کتاب بھی اِس حیثیت سے پیش کی جا رہی تھی کہ اس کا لفظ لفظ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ اس کتاب کو مسلمان حرفاً حرفاً یاد کر رہے تھے، کیونکہ نماز میں اس کی تلاوت لازم تھی۔ اور حضورؐ ہر وحی کے نزول کے بعد اُسے لکھواتے بھی جا رہے تھے۔ اس چیز سے پیچھا چھوٹنے

کی وہ کوئی اُمید نہ کر سکتے تھے، اور وہ سمجھتے تھے کہ اسے اللہ کا کلام مان لینے کے بعد اُن کی زندگی مستقل طور پر ایک ضابطہ میں کس دی جاتی گی، جس سے انحراف کے معنی خداوند عالم سے انحراف کے ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے قرآن کے کلام اللہ ہونے سے انکار کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا پُورا زور لگا دیا، اور ہر ممکن تدبیر اس مقصد کے لیے استعمال کر ڈالی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات ہرگز نہ چلنے پائے۔

تمام کتب الٰہیہ کا انکار

اس سلسلے میں اُن کا سب سے پہلا حربہ یہ تھا کہ سرے سے تمام کُتُبِ الٰہیہ کا انکار کر دیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۔(سبا ۳۱)

"اور جن لوگوں نے کفر کیا انہوں نے کہا کہ ہم ہرگز نہ اِس قرآن کو مانیں گے، نہ اِس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو۔"

لیکن اُن کی یہ بات خود اہلِ عرب میں کسی طرح نہ چل سکتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کو تو وہ خود مانتے تھے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے، چنانچہ قرآن میں دو جگہ اُن کا حوالہ اِس طرح دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہلِ عرب کے نزدیک مسلّم تھے اگرچہ ان کا کوئی نسخہ ان کے پاس محفوظ نہ تھا[40]۔ اس کے علاوہ عرب میں یہود و نصاریٰ بھی کثرت سے موجود تھے جو کُتُبِ الٰہیہ کو مانتے تھے، اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کفارِ عرب کو ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے اس موقف پر زیادہ اصرار نہ کیا۔ (۴۰)

حضورؐ پر قرآن کو خود تصنیف کر لینے کا الزام

پھر انہوں نے سب سے زیادہ زور اپنے اِس الزام پر دیا کہ حضورؐ اِس کو خود تصنیف کر کے اللہ کی طرف منسوب فرما رہے ہیں۔ اس کے بڑے مفصل جوابات قرآن میں دیے گئے اور پُر زور دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا کہ یہ کلامِ الٰہی ہے:

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (السجدہ۔۲)

"اِس کلام کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔"

قرآن مجید کی متعدد سُورتیں اس طرح کے کسی نہ کسی تعارفی فقرہ سے شروع ہوتی ہیں جس سے مقصود آغازِ کلام ہی میں یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ کلام کہاں سے آ رہا ہے۔ یہ بظاہر اُسی طرح کا ایک تمہیدی فقرہ ہے جیسے ریڈیو پر

---

[40] یہ حوالے النجم، آیت ۳۶، اور الاعلیٰ آیت ۱۹ میں موجود ہیں۔(حاشیہ از مؤلف)

اعلان کرنے والا پروگرام کے آغاز میں کہتا ہے کہ ہم فلاں اسٹیشن سے بول رہے ہیں لیکن ریڈیو کے اس معمولی اعلان کے برعکس قرآن مجید کی کسی سُورت کا آغاز جب اِس غیر معمولی اعلان سے ہوتا ہے کہ یہ پیغام فرمانروائے کائنات کی طرف سے آرہا ہے تو یہ محض مصدرِ کلام کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اُس میں ایک بہت بڑا دعویٰ، ایک عظیم چیلنج اور ایک سخت اِنذار بھی شامل ہوتا ہے۔ اِس لیے کہ وہ چھوٹتے ہی اِتنی بڑی خبر دیتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے، خداوندِ عالم کا کلام ہے۔ یہ اعلان فوراً ہی یہ بھاری سوال آدمی کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے کہ اِس دعوے کو تسلیم کروں یا نہ کروں؟ تسلیم کرتا ہوں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا ہوگا، پھر میرے لیے اس کے مقابلہ میں کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ تسلیم نہیں کرتا تو لامحالہ یہ خطرہ مُول لیتا ہُوں کہ اگر واقعی یہ خداوندِ عالم کا کلام ہے تو اسے رد کرنے کا نتیجہ مجھ کو ابدی شقاوت و بدبختی کی صورت میں دیکھنا پڑے گا۔ اس بنا پر یہ تمہیدی فقرہ مجرّد اپنی اِس غیر معمولی نوعیّت ہی کی بنا پر آدمی کو مجبور کر دیتا ہے کہ چوکنّا ہو کر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اِس کلام کو سُنے اور یہ فیصلہ کرے کہ اِس کو کلامِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے یا نہیں۔

یہاں صرف اِتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب رب العٰلمین کی طرف سے نازل ہُوئی ہے بلکہ مزید براں پُورے زور کے ساتھ یہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ لَا رَیۡبَ فِیۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ "بیشک یہ خدا کی کتاب ہے، اِس کے مُنزَّل من اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں ہے"۔ اِس تاکیدی فقرے کو اگر نزولِ قرآن کے واقعاتی پس منظر اور خود قرآن کے اپنے سیاق میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اِس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے، اور یہ دلیل مکّہ معظمہ کے اُن باشندوں سے پوشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اِس کتاب کے پیش کرنے والے کی پُوری زندگی اُن کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی بھی اور اس کے بعد کی بھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو شخص اِس دعوے کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا ہے وہ ہماری قوم کا سب سے زیادہ راستباز، سنجیدہ اور پاک سیرت انسان ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دعوائے نبوّت سے ایک دن پہلے تک بھی کسی نے اُس سے وہ باتیں نہ سُنی تھیں جو دعوائے نبوّت کے بعد یکایک اُس نے بیان کرنی شروع کر دیں۔ وہ اِس کتاب کی زبان اور طرزِ بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرزِ بیان میں نمایاں فرق پاتے تھے اور اِس بات کو بداہۃً جانتے تھے کہ ایک ہی شخص کے دو طرزِ بیان اِتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ اِس کتاب کے انتہائی معجزانہ ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہلِ زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ اُن کے سارے ادیب اور شاعر اِس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اِس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ اُن کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور

اِس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے، اور جو پاکیزہ مضامین اِس کلام میں بیان کیے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ اُنہیں اِس کتاب میں، اور اِس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دُور دُور بھی اُس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی جھوٹے مدّعی کا کام اور کلام کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ خوردبین لگا کر بھی اس امر کی نشاندہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوّت کا یہ دعویٰ کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم اور قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کام میں ان کی اپنی کیا غرض پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف اُن کی قوم کے کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں اور اس سے وابستہ ہو کر ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ یہ ساری باتیں مل جل کر خود دلیلِ دعویٰ بنی ہوئی تھیں۔ اسی لیے اِس پس منظر میں یہ کہنا بالکل کافی تھا کہ اس کتاب کا ربّ العٰلمین کی طرف سے نازل شدہ ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس پر کسی دلیل کے اضافے کی کوئی حاجت نہ تھی ۹۱

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿﴾ (السجدہ ۳)

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اِسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبّہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبّہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پائیں۔"

پچھلے تمہیدی فقرے کے بعد مشرکینِ مکّہ کے پہلے اعتراض کو لیا جا رہا ہے جو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت پر کرتے تھے۔ یہ محض سوال و استفہام نہیں ہے بلکہ اس میں سخت تعجب کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن ساری باتوں کے باوجود جن کی بنا پر اِس کتاب کا مُنزّل من اللہ ہونا ہر شک و شبہہ سے بالاتر ہے، کیا یہ لوگ ایسی صریح ہٹ دھرمی کی بات کہہ رہے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے اسے خود تصنیف کر کے جھوٹ موٹ اللہ ربّ العالمین کی طرف منسوب کر دیا ہے؟ اتنا لغو اور بے سروپا الزام رکھتے ہوئے کوئی شرم ان کو نہیں آتی؟ انہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا کہ جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو اور اُن کے کام اور کلام کو جانتے ہیں اور اِس کتاب کو بھی سمجھتے ہیں، وہ اس بیہودہ الزام کو سُن کر کیا رائے قائم کریں گے۔

جس طرح پہلی آیت میں لَا رَیْبَ فِیْہِ کہنا کافی سمجھا گیا تھا اور اس سے بڑھ کر کوئی استدلال قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے حق میں پیش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی، اُسی طرح اِس آیت میں بھی کفّارِ مکّہ کے الزامِ افترا پر صرف اتنی بات ہی کہنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے کہ "یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔" اِس کی وجہ بھی ہے جو اُوپر آیت ۲ کی تشریح میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ کون، کس ماحول میں، کس شان کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا تھا، یہ سب کچھ سامعین کے سامنے موجود تھا۔ اور یہ کتاب بھی اپنی زبان اور اپنے ادب اور مضامین کے

ساتھ سب کے سامنے تھی۔ اور اس کے اثرات و نتائج بھی مکّے کی اُس سوسائٹی میں سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اِس صورتِ حال میں اس کتاب کا رب العالمین کی طرف سے آیا ہُوا ہونا ایسا صریح امرِ واقعہ تھا جسے صرف حتمی طور پر بیان کر دینا ہی کفّار کے الزام کی تردید کے لیے کافی تھا۔ اس پر کسی استدلال کی کوشش بات کو مضبوط کرنے کے بجائے اُلٹی اسے کمزور کرنے کی موجب ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت سُورج چمک رہا ہو اور کوئی ڈھیٹ آدمی کہے کہ یہ اندھیری رات ہے۔ اس کے جواب میں صرف یہی کہنا کافی ہے کہ تم اِسے رات کہتے ہو؟ یہ روزِ روشن تو سامنے موجود ہے۔ اِس کے بعد دن کے موجود ہونے پر اگر آپ منطقی دلیلیں قائم کریں گے تو اپنے جواب کے زور میں کوئی اضافہ نہیں کریں گے بلکہ درحقیقت اس کے زور کو کچھ کم ہی کریں گے۔ ۹۴

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿ (یونس - ۳۷)

"اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے۔ بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔"

"جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق ہے" یعنی ابتداء سے جو اصولی تعلیمات انبیاء علیہم السلام کے ذریعے انسان کو بھیجی جاتی رہی ہیں، یہ قرآن اُن سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ اُنہی کی تصدیق و توثیق کر رہا ہے۔ اگر یہ کسی نئے مذہب کے بانی کی ذہنی اُپج کا نتیجہ ہوتا تو اس میں ضرور یہ کوشش پائی جاتی کہ پُرانی صداقتوں کے ساتھ کچھ اپنا نرالا رنگ بھی ملا کر اپنی شانِ امتیاز نمایاں کی جائے۔ "الکتاب کی تفصیل" ہے، یعنی اُن اصولی تعلیمات کو جو تمام کُتبِ آسمانی کا لُبِّ لباب (الکتاب) ہیں، اِس میں پھیلا کر، دلائل و شواہد کے ساتھ، تلقین و تفہیم کے ساتھ، تشریح و توضیح کے ساتھ، اور عملی حالات پر انطباق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ۹۳

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿ (بنی اسرائیل - ۸۸)

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر بھی اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔"

یہ چیلنج اس مقام کے علاوہ قرآن مجید میں چار دوسرے مقامات پر بھی دیا گیا ہے: سُورۂ بقرہ، آیات ۲۳، ۲۴۔ سُورۂ یونس، آیت ۳۸۔ سورۂ ہود، آیت ۱۳۔ اور سُورۂ طور، آیات ۳۳، ۳۴۔ اِن سب مقامات پر یہ بات کفّار کے اِس الزام کے جواب میں ارشاد ہُوئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود یہ قرآن تصنیف کر لیا ہے اور خواہ مخواہ وہ اِسے خدا کا کلام بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ مزید برآں سورۂ یونس، آیت ۱۶ میں اِسی الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا کہ

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔

" (اے محمدؐ) ان سے کہو کہ اگر اللہ نے چاہا ہوتا کہ میں یہ قرآن تمہیں نہ سناؤں، تو میں ہرگز نہ سنا سکتا تھا بلکہ اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ؟"

ان آیات میں قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر جو استدلال کیا گیا ہے وہ دراصل تین دلیلوں سے مرکّب ہے:

ایک یہ کہ قرآن اپنی زبان، اسلوب بیان، طرز استدلال، مضامین، مباحث، تعلیمات اور اخبار غیب کے لحاظ سے ایک معجزہ ہے جس کی نظیر لانا انسانی قدرت سے باہر ہے۔ تم کہتے ہو کہ اسے ایک انسان نے تصنیف کیا ہے، مگر ہم کہتے ہیں کہ تمام دنیا کے انسان مل کر بھی اس شان کی کتاب تصنیف نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر وہ جن جنہیں مشرکین نے اپنا معبود بنا رکھا ہے، اور جن کی معبودیت پر یہ کتاب علانیہ ضرب لگا رہی ہے، منکرین قرآن کی مدد پر اکٹھے ہو جائیں تو وہ بھی ان کو اس قابل نہیں بنا سکتے کہ قرآن کے پایہ کی کتاب تصنیف کر کے اس چیلنج کو رد کر سکیں۔

دوسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر سے یکایک تمہارے درمیان نمودار نہیں ہو گئے ہیں، بلکہ اس قرآن کے نزول سے پہلے بھی چالیس سال تمہارے درمیان رہ چکے ہیں۔ کیا دعوائے نبوّت سے ایک دن پہلے بھی کبھی تم نے ان کی زبان سے اس طرز کا کلام، اور ان مسائل اور مضامین پر مشتمل کلام سنا تھا؟ اگر نہیں سنا تھا اور یقیناً نہیں سنا تھا تو کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے کہ کسی شخص کی زبان، خیالات، معلومات اور طرز فکر و بیان میں یکایک ایسا عظیم تغیر واقع ہو سکتا ہے؟

تیسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں قرآن سنا کر کہیں غائب نہیں ہو جاتے بلکہ تمہارے درمیان ہی رہتے سہتے ہیں۔ تم ان کی زبان سے قرآن بھی سنتے ہو اور دوسری گفتگوئیں اور تقریریں بھی سنا کرتے ہو۔ قرآن کے کلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب بیان کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف طرز کلام کبھی ہو نہیں سکتے۔ یہ فرق صرف اُسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے، بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپؐ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ عربی زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔ (۴۳)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ (ہود: ۱۳-۱۴)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو "اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمہارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انہیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو۔ اب اگر وہ (تمہارے معبود) تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا تم (اس امر حقیقی کے آگے) سر تسلیم خم کرتے ہو؟"

یہاں ایک ہی دلیل سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت بھی دیا گیا ہے اور توحید کا ثبوت بھی۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اگر تمہارے نزدیک یہ انسانی کلام ہے تو انسان کو ایسے کلام پر قادر ہونا چاہیے۔ لہٰذا تمہارا یہ دعویٰ کہ میں نے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے) اسے خود تصنیف کیا ہے صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ تم ایسی ایک کتاب تصنیف کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر بار بار چیلنج دینے پر بھی تم سب مل کر اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتے تو میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ میں اس کتاب کا مصنّف نہیں ہوں بلکہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے۔

۲۔ پھر جب کہ اس کتاب میں تمہارے معبودوں کی بھی علی الاعلان کھلا مخالفت کی گئی ہے اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ ان کی عبادت چھوڑ دو کیونکہ اُلوہیت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہے، تو ضروری ہے کہ تمہارے معبودوں کو بھی (اگر فی الواقع ان میں کوئی طاقت ہے) میرے دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے اور اس کتاب کی نظیر پیش کرنے میں تمہاری مدد کرنی چاہیے لیکن اگر وہ اس فیصلے کی گھڑی میں بھی تمہاری مدد نہیں کرتے اور تمہارے اندر ایسی کوئی طاقت نہیں پھونک سکتے کہ تم اس کتاب کی نظیر تیار کر سکو، تو اس سے صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ تم نے خواہ مخواہ ان کو معبود بنا رکھا ہے، ورنہ درحقیقت ان کے اندر کوئی قدرت اور کوئی شائبہ اُلوہیت نہیں ہے جس کی بنا پر وہ معبود ہونے کے مستحق ہوں۔ (۶۵)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (یونس-۳۸)

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو "اگر تم اپنے الزام میں سچے ہو تو ایک ہی سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو مدد کے لیے

بلاغت

عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چیلنج محض قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے تھا۔ اعجاز قرآن پر جس انداز سے بحثیں کی گئی ہیں اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونی کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا مقام اس سے بلند تر ہے کہ وہ اپنی یکتائی و بے نظیری کے دعوے کی بنیاد محض اپنے لفظی محاسن پر رکھے۔ بلاشبہ قرآن اپنی زبان کے لحاظ سے بھی لاجواب ہے، مگر وہ اصل چیز جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسانی دماغ ایسی کتاب تصنیف نہیں کر سکتا، اس کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہیں۔ اس میں اعجاز کے جو جو پہلو ہیں اور جن وجوہ سے اُن کا من جانب اللہ ہونا یقینی ہے اور انسان کا ایسی تصنیف پر قادر ہونا غیر ممکن ہے، اُن کو خود قرآن میں مختلف مواقع پر بیان کر دیا گیا ہے۔ (۴۹)

أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ ۚ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ ۝ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ۝ (الطور۔ ۳۳-۳۴)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اس شان کا ایک کلام بنا لائیں۔"

دوسرے الفاظ میں اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریش کے جو لوگ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تصنیف کردہ کلام کہتے ہیں خود اُن کا دل یہ جانتا ہے کہ یہ آپ کا کلام نہیں ہو سکتا اور دوسرے وہ لوگ بھی جو اہلِ زبان ہیں نہ صرف یہ کہ اسے سن کر صاف محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ انسانی کلام سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے بلکہ اُن میں سے جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف ہے وہ کبھی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ واقعی یہ آپ ہی کا کلام ہے۔ پس صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ قرآن کو آپ کی تصنیف قرار دینے والے دراصل ایمان نہیں لانا چاہتے اس لیے وہ طرح طرح کے جھوٹے بہانے گھڑ رہے ہیں جن میں سے ایک بہانہ یہ بھی ہے۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ سرے سے انسانی کلام ہی نہیں ہے اور یہ بات انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ ایسا کلام تصنیف کر سکے۔ اگر تم اسے انسانی کلام کہتے ہو تو اس پائے کا کوئی کلام لا کر دکھاؤ جسے کسی انسان نے تصنیف کیا ہو۔ یہ چیلنج نہ صرف قریش کو، بلکہ تمام دنیا کے منکرین کو سب سے پہلے اس آیت میں دیا گیا تھا۔ اس کے بعد تین مرتبہ مکہ معظمہ میں اور پھر آخری بار مدینہ منورہ میں اسے دہرایا گیا (ملاحظہ ہو سورۂ یونس، آیت ۳۸۔ سورۂ ہود ۱۳۔ سورۂ بنی اسرائیل، ۸۸۔ سورۂ البقرہ، ۲۳)۔ مگر کوئی اس کا جواب دینے کی نہ اُس وقت ہمت کر سکا نہ اُس کے بعد آج تک کسی کی جرأت ہوئی کہ قرآن کے مقابلہ میں کسی انسانی تصنیف کو لے آئے۔

بعض لوگ اِس چیلنج کی حقیقی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ایک قرآن ہی کیا، کسی شخص کے طرزِ فن بھی دوسرا کوئی شخص نثر یا نظم لکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ ہومر، رومی، شیکسپیئر، گوئٹے، غالب، ٹیگور اور اقبال سب ہی اس لحاظ سے بے مثل ہیں کہ ان کی نقل اُتار کر انہی جیسا کلام بنا لانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ قرآن کے چیلنج کا یہ جواب دینے والے دراصل اس غلط فہمی میں پڑے ہیں کہ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ کا مطلب قرآن کے طرزِ بیان کے مطابق اِس جیسی کوئی کتاب لکھ دینا ہے۔ حالانکہ اس سے مُراد طرز میں مماثلت نہیں ہے، بلکہ مُراد یہ ہے کہ اِس پائے اور اِس شان اور اِس مرتبے کی کوئی کتاب لے آؤ جو صرف عربی ہی میں نہیں دُنیا کی کسی زبان میں اُن خصوصیات کے لحاظ سے قرآن کی مدِمقابل قرار پاسکے جن کی بنا پر قرآن ایک معجزہ ہے۔ مختصراً چند بڑی بڑی خصوصیات ملاحظہ ہوں جن کی بنا پر قرآن پہلے بھی معجزہ تھا اور آج بھی معجزہ ہے۔

۱۔ جس زبان میں قرآن مجید نازل ہُوا ہے اُس کے ادب کا وہ بلند ترین اور مکمل ترین نمونہ ہے۔ پُوری کتاب میں ایک لفظ اور ایک جملہ بھی معیار سے گرا ہُوا نہیں ہے۔ جس مضمون کو بھی ادا کیا گیا ہے موزوں ترین الفاظ اور مناسب ترین انداز بیان میں ادا کیا گیا ہے۔ ایک ہی مضمون بار بار ادا ہُوا ہے اور ہر مرتبہ پیرایۂ بیان نیا ہے جس سے تکرار کی بدنمائی کہیں پیدا نہیں ہوتی۔ اوّل سے لے کر آخر تک ساری کتاب میں الفاظ کی نشست ایسی ہے جیسے نگینے تراش تراش کر جڑے گئے ہوں۔ کلام اتنا مؤثر ہے کہ کوئی زبان داں آدمی اُسے سُن کر سر دُھنے بغیر نہیں رہ سکتا، حتیٰ کہ منکر اور مخالف کی رُوح بھی وجد کرنے لگتی ہے۔ چودہ سو برس گزرنے کے بعد بھی آج تک یہ کتاب عربی زبان کے ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جس کے برابر تو درکنار، جس کے قریب بھی اس زبان کی کوئی کتاب اپنی ادبی قدر و قیمت میں نہیں پہنچتی۔ یہی نہیں، بلکہ یہ کتاب عربی زبان کو اِس طرح پکڑ کر بیٹھ گئی ہے کہ چودہ صدیاں گزر جانے پر بھی اِس زبان کا معیارِ فصاحت وہی ہے جو اِس کتاب نے قائم کر دیا تھا، حالانکہ اتنی طویل مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو اتنی صدیوں تک اِملا، انشاء، محاورے، قواعدِ زبان اور استعمالِ الفاظ میں ایک ہی شان پر باقی رہ گئی ہو۔ لیکن یہ صرف قرآن کی طاقت ہے جس نے عربی زبان کو اپنے مقام سے ہلنے نہ دیا۔ اُس کا ایک لفظ بھی آج تک متروک نہیں ہُوا ہے۔ اُس کا ہر محاورہ آج تک عربی ادب میں مستعمل ہے۔ اُس کا ادب آج بھی عربی کا معیاری ادب ہے۔ اور تقریر و تحریر میں آج بھی فصیح زبان وہی مانی جاتی ہے جو چودہ سو برس پہلے قرآن میں استعمال ہوئی تھی۔ کیا دنیا کی کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف اِس شان کی ہے؟

۲۔ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر اتنی وسعت، اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ پہلے اس کی تاثیر نے ایک

قوم کو بدلا اور پھر اُس قوم نے اُٹھ کر دُنیا کے ایک بہت بڑے حصّے کو بدل ڈالا۔ کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو۔ یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی ہوئی نہیں رہ گئی ہے بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور ایک مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ چودہ سو برس سے اس کے اِن اثرات کا سلسلہ جاری ہے، اور روز بروز اس کے یہ اثرات پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

۳۔ جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پُوری کائنات پر حاوی ہے۔ وہ کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس کے نظم و آئین پر کلام کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق اور ناظم و مدبّر کون ہے، کیا اس کی صفات ہیں، کیا اس کے اختیارات ہیں، اور وہ حقیقتِ نفس الامری کیا ہے جس پر اُس نے یہ پُورا نظام قائم کیا ہے۔ وہ اِس جہان میں انسان کی حیثیت اور اس کا مقام ٹھیک ٹھیک مشخّص کر کے بتاتی ہے کہ یہ اُس کا فطری مقام ہے اور یہ اُس کی پیدائشی حیثیت ہے جسے بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اِس مقام اور اِس حیثیت کے لحاظ سے انسان کے لیے فکر و عمل کا صحیح راستہ کیا ہے جو حقیقت سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور غلط راستے کون سے ہیں جو حقیقت سے متصادم ہوتے ہیں۔ صحیح راستے کے صحیح ہونے اور غلط راستوں کے غلط ہونے پر وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز سے، نظامِ کائنات کے ایک ایک گوشے سے، انسان کے اپنے نفس اور اس کے وجود سے اور انسان کی اپنی پُوری تاریخ سے بے شمار دلائل پیش کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان غلط راستوں پر کیسے اور کن اسباب سے پڑتا رہا ہے، اور صحیح راستہ، جو ہمیشہ سے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا، کس ذریعہ سے اس کو معلوم ہو سکتا ہے اور کس طرح ہر زمانے میں وہ اُس کو بتایا جاتا رہا ہے۔ وہ صحیح راستے کی صرف نشان دہی کر کے نہیں رہ جاتی بلکہ اُس راستے پر چلنے کے لیے ایک پورے نظامِ زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے جس میں عقائد، اخلاق، تزکیۂ نفس، عبادات، معاشرت، تہذیب، تمدّن، معیشت، سیاست، عدالت، قانون، غرض حیاتِ انسانی کے ہر پہلو سے متعلق ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں وہ پُوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اس صحیح راستے کی پیروی کرنے اور اُن غلط راستوں پر چلنے کے کیا نتائج اِس دُنیا میں ہیں اور کیا نتائج دنیا کا موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے عالم میں رُونما ہونے والے ہیں۔ وہ اس دُنیا کے ختم ہونے اور دوسرا عالم برپا ہونے کی نہایت مفصل کیفیت بیان کرتی ہے، اِس تغیّر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے بتاتی ہے، دوسرے عالم کا پُورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے، اور پھر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہاں انسان

کیسے ایک دوسری زندگی پائے گا، کس طرح اس کی دنیوی زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا، کن اُمور کی اُس سے بازپرس ہوگی، کیسی ناقابلِ انکار صورت میں اُس کا پُورا نامۂ اعمال اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا، کیسی زبردست شہادتیں اس کے ثبوت میں پیش کی جائیں گی، جزا اور سزا پانے والے کیوں جزا اور سزا پائیں گے، جزا پانے والوں کو کیسے انعامات ملیں گے اور سزا پانے والے کس کس شکل میں اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ اِس وسیع مضمون پر جو کلام اِس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اِس حیثیت سے نہیں ہے کہ اس کا مصنّف کچھ صُغریٰ کُبریٰ جوڑ کر چند قیاسات کی ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے، بلکہ اِس حیثیت سے ہے کہ اس کا مصنّف حقیقت کا براہِ راست علم رکھتا ہے، اُس کی نگاہ ازل سے ابد تک سب کچھ دیکھ رہی ہے، تمام حقائق اُس پر عیاں ہیں، کائنات پُوری کی پُوری اُس کے سامنے ایک کھُلی کتاب کی طرح ہے، نوعِ انسانی کے آغاز سے اُس کے خاتمے تک ہی نہیں بلکہ خاتمے کے بعد اُس کی دوسری زندگی تک بھی وہ اُس کو بیک نظر دیکھ رہا ہے، اور قیاس و گمان کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر انسان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جن حقیقتوں کو علم کی حیثیت سے وہ پیش کرتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی آج تک غلط ثابت نہیں کی جا سکی ہے۔ جو تصوّر کائنات و انسان وہ پیش کرتا ہے وہ تمام مظاہر اور واقعات کی مکمل توجیہ کرتا ہے اور ہر شعبۂ علم میں تحقیق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ فلسفہ و سائنس اور علومِ عمران کے تمام آخری مسائل کے جوابات اس کے کلام میں موجود ہیں اور ان سب کے درمیان ایسا منطقی ربط ہے کہ اُن پر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر قائم ہوتا ہے۔ پھر عملی حیثیت سے جو رہنمائی اس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو دی ہے وہ صرف انتہائی معقول اور انتہائی پاکیزہ ہی نہیں ہے بلکہ چودہ سو برس سے رُوئے زمین کے مختلف گوشوں میں بے شمار انسان بالفعل اس کی پیروی کر رہے ہیں اور تجربے نے اس کو بہترین ثابت کیا ہے۔ کیا اِس شان کی کوئی انسانی تصنیف دنیا میں موجود ہے یا کبھی موجود رہی ہے جسے اِس کتاب کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہو؟

۴- یہ کتاب پُوری کی پُوری بیک وقت لکھ کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کر دی گئی تھی بلکہ چند ابتدائی ہدایات کے ساتھ ایک تحریکِ اصلاح کا آغاز کیا گیا تھا اور اس کے بعد ۲۳ سال تک وہ تحریک جن جن مرحلوں سے گزرتی رہی اُن کے حالات اور اُن کی ضروریات کے مطابق اس کے اجزاء اُس تحریک کے رہنما کی زبان سے کبھی طویل خطبوں اور کبھی مختصر جملوں کی شکل میں ادا ہوتے رہے۔ پھر اِس مشن کی تکمیل پر مختلف اوقات میں صادر ہونے والے یہ اجزاء اُس مکمل کی صورت میں مرتّب کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیے گئے جسے "قرآن" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تحریک کے رہنما کا بیان ہے کہ یہ خطبے اور جملے اس کے طبعزاد نہیں ہیں بلکہ خداوندِ عالم کی طرف سے اُس پر نازل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص انہیں خود اُس رہنما

کے معجزات قرار دیتا ہے تو وہ دُنیا کی تاریخ سے کوئی نظیر ایسی پیش کرے کہ کسی انسان نے سالہا سال تک مسلسل ایک زبردست اجتماعی تحریک کی بطورِ خود رہنمائی کرتے ہوئے کبھی ایک واعظ اور معلّمِ اخلاق کی حیثیت سے، کبھی ایک مظلوم جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے، کبھی ایک مملکت کے فرمانروا کی حیثیت سے، کبھی ایک برسرِ جنگ فوج کے قائد کی حیثیت سے، کبھی ایک فاتح کی حیثیت سے، کبھی ایک شارع اور مُقنّن کی حیثیت سے، کبھی ایک قاضی اور جج کی حیثیت سے، غرض بکثرت مختلف حالات اور اوقات میں بہت سی مختلف حیثیتوں سے جو مختلف تقریریں کی ہوں یا باتیں کہی ہوں وہ جمع ہو کر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر و عمل بنا دیں، اُن میں کہیں کوئی تناقض اور تضاد نہ پایا جائے، ان میں ابتدا سے انتہا تک ایک ہی مرکزی تخیّل اور سلسلۂ فکر کارفرما نظر آئے، اُس نے اول روز سے اپنی دعوت کی جو بنیاد بیان کی ہو آخری دن تک اُسی بنیاد پر وہ عقائد و اعمال کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام بناتا چلا جائے جس کا ہر جُز دوسرے اجزاء سے کامل مطابقت رکھتا ہو، اور اُس مجموعہ کو پڑھنے والا کوئی صاحبِ بصیرت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ تحریک کا آغاز کرتے وقت اُس کے محرّک کے سامنے آخری مرحلے تک کا پورا نقشہ موجود تھا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بیچ کے کسی مقام پر اُس کے ذہن میں کوئی ایسا خیال آیا ہو جو پہلے اُس پر منکشف نہ تھا یا جسے بعد میں اس کو بدلنا پڑا۔ اِس شان کا کوئی انسان اگر کبھی گزرا ہو جس نے اپنے ذہن کی خلّاقی کا یہ کمال دکھایا ہو تو اس کی نشان دہی کی جائے۔

۵- جس رہنما کی زبان پر یہ خطبے اور جملے جاری ہوتے تھے وہ یکایک کسی گوشے سے نکل کر صرف اِن کو سنانے کے لیے نہیں آجاتا تھا اور اُنہیں سُنانے کے بعد کہیں چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ اس تحریک کے آغاز سے پہلے بھی انسانی معاشرے میں زندگی بسر کر چکا تھا اور اُس کے بعد بھی وہ زندگی کی آخری ساعت تک ہر وقت اُسی معاشرے میں رہتا تھا۔ اس کی گفتگو اور تقریروں کی زبان اور طرزِ بیان سے لوگ بخوبی آشنا تھے۔ احادیث میں اُن کا ایک بڑا حصّہ اب بھی محفوظ ہے جسے بعد کے عربی داں لوگ پڑھ کر خود بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ اُس رہنما کا اپنا طرزِ کلام کیا تھا۔ اُس کے ہم زبان لوگ اُس وقت بھی صاف محسوس کرتے تھے اور آج بھی عربی زبان کے جاننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کتاب کی زبان اور اس کا اُسلوب اُس رہنما کی زبان اور اُس کے اُسلوب سے بہت مختلف ہے۔ حتّٰی کہ جہاں اُس کے کسی خطبے کے بیچ میں اس کتاب کی کوئی عبارت آجاتی ہے وہاں دونوں کی زبان کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں کوئی انسان کبھی اس بات پر قادر ہوا ہے یا ہو سکتا ہے کہ سالہا سال تک دو قطعی مختلف اُسلوبوں میں کلام کرنے کا تکلّف نباہتا چلا جائے اور کبھی یہ راز فاش نہ ہو سکے کہ یہ دو الگ اُسلوب دراصل ایک ہی شخص

سکے ہیں، عارضی اور وقتی طور پر اس قسم کے تصنّع میں کامیاب ہو جانا تو ممکن ہے لیکن مسلسل ۲۳ سال تک ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص جب خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر کلام کرے تو اس کی زبان اور اسلوب کچھ ہو، اور جب خود اپنی طرف سے گفتگو یا تقریر کرے تو اس کی زبان اور اس کا اسلوب بالکل ہی کچھ اور ہو۔

۶۔ وہ رہنما اس تحریک کی قیادت کے دوران میں مختلف حالات سے دوچار ہوتا رہا۔ کبھی برسوں وہ اپنے ہم وطنوں اور اپنے قبیلے والوں کی تضحیک، توہین اور سخت ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔ کبھی اس کے ساتھیوں پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔ کبھی دشمنوں نے اس کے قتل کی سازشیں کیں۔ کبھی خود اُسے اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ کبھی اس کو انتہائی عسرت اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنی پڑی۔ کبھی خود اُسے پیہم لڑائیوں سے سابقہ پیش آیا جن میں شکست اور فتح، دونوں ہی ہوتی رہیں۔ کبھی وہ دشمنوں پر غالب آیا اور وہی دشمن جنہوں نے اُس پر ظلم توڑے تھے، اس کے سامنے سرنگوں نظر آئے۔ کبھی اسے وہ اقتدار نصیب ہوا جو کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ان تمام حالات میں ایک انسان کے جذبات ظاہر ہے کہ یکساں نہیں رہ سکتے۔ اس رہنما نے ان مختلف مواقع پر خود اپنی ذاتی حیثیت میں جب کبھی کلام کیا، اس میں اُن جذبات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے جو ایسے مواقع پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر ان مختلف حالات میں جو کلام اُس کی زبان سے سُنا گیا وہ انسانی جذبات سے بالکل خالی تھا اور آج بھی خالی نظر آتا ہے۔ کسی ایک مقام پر بھی کوئی بڑے سے بڑا نقاد انگلی رکھ کر قرآن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہاں انسانی جذبات کارفرما نظر آتے ہیں۔

۷۔ جو وسیع اور جامع علم اس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ اُس زمانے کے اہلِ عرب اور اہلِ روم و یونان و ایران تو درکنار، اس بیسویں صدی کے اکابر اہلِ علم میں سے بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس اور علومِ عمران کی کسی ایک شاخ کے مطالعہ میں اپنی عمر کھپا دینے کے بعد آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ اُس شعبۂ علم کے آخری مسائل کیا ہیں، اور پھر جب وہ غائر نگاہ سے قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں اُن مسائل کا ایک واضح جواب موجود ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک علم تک محدود نہیں ہے بلکہ اُن تمام علوم کے باب میں صحیح ہے جو کائنات اور انسان سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ چودہ سو برس پہلے ریگستانِ عرب میں ایک اُمّی کو علم کے ہر گوشے پر اتنی وسیع نظر حاصل تھی اور اُس نے ہر بنیادی مسئلے پر غور و خوض کر کے اس کا ایک صاف اور قطعی جواب سوچ لیا تھا؟

اعجازِ قرآن کے اگرچہ اور بھی متعدد وجوہ ہیں، لیکن صرف ان چند وجوہ ہی پر اگر آدمی غور کرے تو

بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اگر قرآن کا معجزہ ہونا جتنا نزولِ قرآن کے زمانے میں واضح تھا اُس سے بہت زیادہ آج واضح ہے اور اِن شاء اللہ قیامت تک یہ واضح تر ہوتا چلا جائے گا ۔ (۴۶)

یہ اعتراض کہ سارا قرآن یک وقت کیوں نہ نازل ہو گیا؟

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے، اگرچہ اس سے قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں کسی شک کی گنجائش باقی نہ رہی تھی مگر کفارِ قریش اس کو انسانی کلام قرار دینے کے لیے ایسا ہر بات کا سہارا لیتے تھے وہ یہ بھی کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل کر دیا جاتا۔ اس کا وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا کرکے ہمارے سامنے پیش کیا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے سوچ سوچ کر تصنیف کیا جا رہا ہے۔ قرآن میں ان کے اس اعتراض کو نقل کرکے یا اس کی طرف اشارہ کرکے بڑے دل نشین انداز میں ان کو بتایا گیا کہ یہ تدریجاً کیوں نازل کیا جاتا ہے؟ اور اس تدریج کی حکمت کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۔ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۔

(الفرقان ۔ ۳۲-۳۳)

منکرین کہتے ہیں کہ اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟ ـــــ ہاں ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے اور اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ جب کبھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے اس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں بتا دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔

یہ کفارِ مکہ کا نہایت پسندیدہ اعتراض تھا جسے وہ اپنے نزدیک نہایت زوردار اعتراض سمجھ کر بار بار دہراتے تھے مگر قرآن میں اس کے مدلل جوابات دے کر اس کا بھی پوری طرح قلع قمع کر دیا گیا۔ ان کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ شخص خود سوچ سوچ کر یا کسی سے پوچھ پوچھ کر اور کتابوں سے نقل کر کرکے یہ مضامین نہیں لا رہا ہے بلکہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے تو اکٹھی ایک ہی وقت کیوں نہیں آجاتی؟ خدا تو جانتا ہے کہ پوری بات کیا ہے جو وہ فرمانا چاہتا ہے۔ وہ نازل کرنے والا ہوتا تو سب کچھ بیک وقت فرما دیتا۔ یہ جو سوچ سوچ کر کبھی کچھ مضمون لایا جاتا ہے اور کبھی کچھ، یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ وحی اوپر سے نہیں آتی، یہیں کہیں سے حاصل کی جاتی ہے، یا خود گھڑ گھڑ کر لائی جاتی ہے۔

اس کے جواب میں قرآن کو تدریجاً نازل کرنے کی بہت سی حکمتیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) ایسا اس لیے کیا جا رہا ہے کہ وہ لفظ بلفظ حافظہ میں محفوظ ہو سکے، کیونکہ اس کی تبلیغ و اشاعت تحریری صورت میں نہیں بلکہ ایک اَن پڑھ نبیؐ کے ذریعہ سے اَن پڑھ سامعین کے سامنے زبانی تقریر کی شکل میں ہو رہی ہے۔

(۲) تاکہ اُس کی تعلیمات اچھی طرح ذہن نشین ہو سکیں۔ اس غرض کے لیے ٹھیر ٹھیر کر تھوڑی تھوڑی بات کہنا اور ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے بیان کرنا زیادہ مفید ہے۔

(۳) تاکہ اُس کے بتائے ہوئے طریقِ زندگی پر دل جمتا جائے۔ اس غرض کے لیے احکام و ہدایات کا بتدریج نازل کرنا زیادہ مبنی بر حکمت ہے، ورنہ اگر سارا قانون اور پورا نظامِ حیات بیک وقت بیان کر کے اُسے قائم کرنے کا حکم دے دیا جاتا تو ہوش پراگندہ ہو جاتے۔ علاوہ بریں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر حکم اگر مناسب موقع پر دیا جائے تو اس کی حکمت اور رُوح زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے بہ نسبت اس کے کہ تمام احکام دفعہ وار مرتب کر کے بیک وقت دے دیے جائیں۔

(۴) تاکہ تحریکِ اسلامی کے دوران میں، جبکہ حق اور باطل کی مسلسل کشمکش چل رہی ہو، نبی اور اُس کے پیروؤں کی ہمت بندھائی جاتی رہے۔ اس لیے خدا کی طرف سے بار بار، وقتاً فوقتاً، موقع بموقع پیغام آنا زیادہ کارگر ہے بہ نسبت اس کے کہ بس ایک دفعہ ایک لمبا چوڑا ہدایت نامہ دے کر اُنہیں دنیا بھر کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یُوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ پہلی صورت میں آدمی محسوس کرتا ہے کہ جس خدا نے اُسے اس کام پر مامور کیا ہے وہ اُس کی طرف متوجہ ہے، اس کے کام سے دلچسپی لے رہا ہے، اس کے حالات پر نگاہ رکھتا ہے، اس کی مشکلات میں رہنمائی کر رہا ہے، اور ہر ضرورت کے موقع پر اُسے شرفِ باریابی و مخاطبت عطا فرما کر اُس کے ساتھ اپنے تعلق کو تازہ کرتا رہتا ہے۔ یہ چیز حوصلہ بڑھانے والی اور عزم کو مضبوط رکھنے والی ہے۔ دوسری صورت میں آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس وہ ہے اور طوفان کی موجیں۔

آخر میں تنزیل کے لیے تدریج کا طریقہ اختیار کرنے کی ایک اور حکمت بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی شانِ نزول یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ "ہدایت" کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرنا چاہتا ہے اور اس کی اشاعت کے لیے اس نے نبیؐ کو ایجنٹ بنایا ہے۔ بات اگر یہ ہوتی تو یہ مطالبہ بجا ہوتا کہ پوری کتاب تصنیف کر کے بیک وقت ایجنٹ کے حوالے کر دی جائے۔ لیکن دراصل اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر اور جاہلیت اور فسق کے مقابلے میں ایمان و اسلام اور اطاعت و تقویٰ کی ایک تحریک برپا کرنا چاہتا ہے، اور اس کے لیے اس نے ایک نبی کو داعی و قائد بنا کر اٹھایا ہے۔ اس تحریک کے دوران میں اگر ایک طرف قائد اور اس کے پیروؤں کو حسبِ ضرورت تعلیم اور ہدایات دینا اس نے اپنے ذمہ لیا ہے تو دوسری طرف

یہ کام بھی اپنے ہی ذمّہ رکھا ہے کہ مخالفین جب کبھی کوئی اعتراض یا شُبہ یا اُلجھن پیش کریں اُسے وہ صاف کر دے، اور جب بھی وہ کسی بات کو غلط معنی پہنائیں، وہ اس کی صحیح تشریح و تفسیر کر دے۔ اِن مختلف ضروریات کے لیے جو تقریریں اللہ کی طرف سے نازل ہوتی رہی ہیں ان کے مجموعے کا نام قرآن ہے، اور یہ کتابِ آئین یا کتابِ اخلاق و فلسفہ نہیں بلکہ کتابِ تحریک ہے، جس کے مَعرضِ وجود میں آنے کی صحیح فطری صورت یہی ہے کہ تحریک کے اوّلین لمحۂ آغاز کے ساتھ شروع ہو اور آخری لمحات تک جیسے جیسے تحریک چلتی رہے یہ بھی ساتھ ساتھ حسبِ موقع و ضرورت نازل ہوتی رہے۔ (۶۸)

وَإِذَا بَدَّلْنَآ ءَايَةً مَّكَانَ ءَايَةٍ ۙ وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوٓا۟ إِنَّمَآ أَنتَ مُفْتَرٍۭ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ قُلْ نَزَّلَهُۥ رُوحُ ٱلْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِٱلْحَقِّ لِيُثَبِّتَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ۝ (النحل ۱۰۱-۱۰۲)

"جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں ـــ اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کرے ـــ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ان سے کہو کہ اسے تو رُوح القدس نے ٹھیک ٹھیک میرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے تاکہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو پختہ کرے اور فرماں برداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں فلاح و سعادت کی خوشخبری دے۔"

ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے سے مُراد ایک حکم کے بعد دوسرا حکم بھیجنا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں اور بارہا ایک ہی معاملہ میں چند سال کے وقفوں سے یکے بعد دیگرے دو دو، تین تین حکم بھیجے گئے ہیں۔ مثلاً شراب کا معاملہ، یا زنا کی سزا کا معاملہ۔ لیکن ہم کو یہ معنی لینے میں اس بنا پر تامل ہے کہ سُورۂ نحل کی یہ آیت مکّی دَور میں نازل ہوئی ہے، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اُس دَور میں تدریج فی الاحکام کی کوئی مثال پیش نہیں آئی تھی۔ اس لیے ہم یہاں "ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے" کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے مختلف مقامات پر کبھی ایک مضمون کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے اور کبھی وہی مضمون سمجھانے کے لیے دوسری مثال سے کام لیا گیا ہے۔ ایک ہی قصّہ بار بار آیا ہے اور ہر مرتبہ اسے دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک معاملہ کا کبھی ایک پہلو پیش کیا گیا ہے اور کبھی اُسی معاملے کا دوسرا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک بات کے لیے کبھی ایک دلیل پیش کی گئی ہے اور کبھی دوسری دلیل۔ ایک بات ایک وقت میں مجمل طور پر کہی گئی ہے اور وہی دوسرے وقت میں مفصّل۔ یہی چیز تھی جسے کفارِ مکّہ اس بات کی دلیل ٹھیراتے تھے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم، معاذ اللہ، یہ قرآن خود تصنیف کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر اس کلام کا منبع علم الٰہی ہوتا تو پوری بات بیک وقت کہہ دی جاتی۔ اللہ بھی انسان کی طرح ناقص العلم تھوڑا ہی ہے کہ سوچ سوچ کر بات کرے، تھوڑی تھوڑی معلومات حاصل کرتا رہے، اور ایک بات ٹھیک نہ بیٹھتی نظر آئے تو دوسرے طریقہ سے بات کرے۔ یہ تو انسانی علم کی کمزوریاں ہیں جو تمہارے اس کلام میں نظر آ رہی ہیں۔

اس کے جواب میں پہلے بیان کیا گیا کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے "روح القدس" لے کر آ رہا ہے۔ "روح القدس" کا لفظی ترجمہ "پاک روح" یا "پاکیزگی کی روح" ہے، اور اصطلاحاً یہ لقب حضرت جبریلؑ کو دیا گیا ہے۔ دوسری جگہ (سورۂ شعراء میں) انہی کے لیے "روح الامین" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، یعنی امانت دار روح۔ یہاں وحی لانے والے فرشتے کا نام لینے کے بجائے اس کا لقب استعمال کرنے سے سامعین کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ اس کلام کو ایک ایسی روح لے کر آ رہی ہے جو بشری کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ وہ نہ خائن ہے کہ اللہ کچھ بھیجے اور وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر کے کچھ اور بنا دے۔ نہ کذاب و مفتری ہے کہ خود کوئی بات گھڑ کے اللہ کے نام سے بیان کر دے۔ نہ بدنیت ہے کہ اپنی کسی نفسانی غرض کی بنا پر دھوکے اور فریب سے کام لے۔ وہ سراسر ایک مقدس و مطہر روح ہے جو اللہ کا کلام پوری امانت کے ساتھ لا کر پہنچاتی ہے۔

پھر بتایا گیا کہ اس کے بتدریج اس کلام کو لے کر آنے اور بیک وقت سب کچھ نہ لے آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے علم و دانش میں کوئی نقص ہے جیسا کہ تم نے اپنی نادانی سے سمجھ لیا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی قوت فہم اور قوت اخذ میں نقص ہے جس کے سبب سے وہ بیک وقت ساری بات کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ایک وقت کی سیکھی ہوئی بات میں پختہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ روح القدس اس کلام کو تھوڑا تھوڑا کر کے لائے، کبھی اجمال سے کام لے اور کبھی اسی بات کی تفصیل بتائے، کبھی ایک طریقے سے بات سمجھائے اور کبھی دوسرے طریقے سے، کبھی ایک پیرایۂ بیان اختیار کرے اور کبھی دوسرا، اور ایک ہی بات کو بار بار طرح طرح سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرے، تاکہ مختلف قابلیتوں اور استعدادوں کے طالبین حق ایمان لا سکیں، اور ایمان لانے کے بعد علم و یقین اور فہم و ادراک میں پختہ ہو سکیں۔

اس تدریج کی دوسری مصلحت یہ بتائی گئی کہ جو لوگ ایمان لا کر فرمانبرداری کی راہ چل رہے ہیں ان کو دعوتِ اسلامی کے کام میں اور زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں جس وقت جس قسم کی ہدایات درکار ہوں وہ بروقت دے دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں قبل از وقت بھیجنا مناسب نہیں ہو سکتا، اور نہ بیک وقت ساری ہدایات دے دینا مفید ہے۔

تیسری مصلحت یہ بات بتانی تھی کہ قرآن کے پیرواروں کو جن مزاحمتوں اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آ رہا ہے اور جس جس طرح انہیں ستایا اور تنگ کیا جا رہا ہے، اور دعوتِ اسلامی کی راہ میں مشکلات کے جو پہاڑ سدِ راہ ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے وہ بار بار اس کے حاجتمند ہوتے ہیں کہ غیب سے ان کی ہمت بندھائی جاتی رہے اور ان کو آخری نتائج کی کامیابی کا یقین دلایا جاتا رہے تاکہ وہ پُرامید رہیں اور دل شکستہ ہونے نہ پائیں۔ (۴۴)

یہ الزام کہ کچھ دوسرے لوگ قرآن تصنیف کر کے حضورؐ کو دے رہے ہیں

پچھلے الزام کے بالکل برعکس تھا یہ ایک دوسرا الزام یہ لگاتے تھے کہ حضورؐ کو اس قرآن کے تصنیف کرنے میں کچھ دوسرے لوگ مدد دے رہے ہیں اور پرانے زمانے کی لکھی ہوئی چیزیں نقل کرا کرا کے آپ ان سے سنا کرتے ہیں، اور یہ کام شب و روز ہو رہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِنْ هٰذَآ إِلَّآ إِفْكٌ افْتَرٰىهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُونَ ۖ فَقَدْ جَآءُو ظُلْمًا وَزُورًا ۔ وَقَالُوٓا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۔ قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۔ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۔ (الفرقان: ۴-۶)

"جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔ ان سے کہو، اسے تو اس نے نازل کیا ہے جو زمین و آسمان کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔"

ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص خود تو ان پڑھ ہے۔ مطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل کر نہیں سکتا۔ پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا۔ چالیس برس کی عمر تک ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ جانتا تھا جو آج اس کی زبان سے نکل رہی ہیں۔ اب آخر یہ معلومات آ کہاں سے رہی ہیں؟ لامحالہ ان کا سرچشمہ کچھ اگلے لوگوں کی کتابیں ہیں جن کے اقتباسات راتوں کو چھپکے چھپکے ترجمہ اور نقل کرائے جاتے ہیں، انہیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے، اور پھر انہیں یاد کر کے ہمیں سناتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہلِ کتاب میں سے پڑھے لکھے تھے اور مکے ہی میں رہتے تھے۔ ایک عدّاس تھا جو حویطب بن عبدالعزیٰ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ دوسرا یسار تھا جو علاء بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام تھا۔ اور تیسرا جبر تھا جو عامر بن ربیعہ کا

آزاد کردہ غلام۔

بظاہر یہ بڑا وزنی اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ وحی کے دعوے کو رد کرنے کے لیے نبی کے ماخذِ علم کی نشان دہی کر دینے سے بڑھ کر وزنی اعتراض اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر آدمی پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ ایسے زبردست اعتراض کے جواب میں کوئی دلیل پیش کرنے کے بجائے صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو، صریح بے انصافی کی بات کہہ رہے ہو، سخت جھوٹ کا طوفان اٹھا رہے ہو، یہ تو اُس خدا کا کلام ہے جو زمین و آسمان کا بھید جانتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اُس شدید مخالفت کے ماحول میں جب ایسا زوردار اعتراض پیش کیا گیا تو اُسے یوں حقارت کے ساتھ کیوں رد کر دیا گیا؟ اور خود مخالفین نے اس کا صاف صاف مفصّل جواب کیوں نہ مانگا؟ اُنہوں نے کیوں نہ کہا کہ ہمارے اعتراض کو محض ظلم اور جھوٹ کہہ کر بات ٹالی جا رہی ہے؟ پھر نئے نئے مسلمان ہونے والوں کے دلوں میں اس اعتراض سے کوئی شک کیوں نہ پیدا ہُوا؟

اس کا جواب مکے ہی کے اُس ماحول پر تھوڑا سا غور کرنے سے مل جاتا ہے جس میں یہ اعتراض کیا گیا تھا۔ پہلی بات یہ ہے کہ مکّے کے وہ ظالم سردار جو اُس وقت ایک ایک مسلمان کو مار رہے تھے، کوٹ رہے تھے اور تنگ کر رہے تھے اُن کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن لوگوں پر وہ الزام لگا رہے تھے کہ یہ پرانی پرانی کتابوں کے ترجمے کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سُناتے ہیں، اُن کے گھروں پر اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر چھاپہ مار کر وہ سارا ذخیرہ برآمد کر لیتے جو اُن کے زعم میں اس کام کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا اور اسے عوام کے سامنے لا کر رکھ دیتے۔ بلکہ وہ عین اُس وقت چھاپہ مار سکتے تھے جب یہ کام ہو رہا ہو۔ مگر انہوں نے ایک دن بھی یہ اقدام کر کے اپنے الزام کا ثبوت پیش نہ کیا۔

پھر جن لوگوں کے نام وہ اس سلسلے میں پیش کرتے تھے وہ شہر مکّہ ہی کے رہنے والے تھے اور اُن کی قابلیتیں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ قرآن جس شان کا کلام ہے اس کے تصنیف کرنے میں یہ لوگ کسی درجے میں بھی حصّہ دار ہو سکتے ہیں۔

مزید برآں یہ لوگ دراصل مکّے ہی کے چند سرداروں کے آزاد کردہ غلام تھے اور عرب کی قبائلی زندگی میں ایک غلام آزاد ہو کر بھی اپنے سابق مالک کی سرپرستی کے بغیر جی نہیں سکتا تھا۔ اب یہ کیسے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ یہ کمزور لوگ اپنے سرپرستوں کی ناراضی مول لے کر ظلم و ستم کے اُس خوفناک ماحول میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاذ اللہ نبوت کی اس "سازش" میں شریک ہونے کی ہمت کر سکتے تھے؟

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ تینوں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے تھے اور

آپ سے وہی گہری عقیدت رکھتے تھے جو دوسرے صحابۂ کرامؓ کو آپؐ سے تھی۔ اسی ایمان کی بدولت وہ بھی دوسرے صحابہؓ کے ساتھ ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں کون یہ باور کر سکتا تھا کہ جو لوگ خود قرآن کے تصنیف کرنے میں حصّہ لے رہے ہوں وہ اُس پر اور اُس کے پیش کرنے والے نبی پر ایمان لائیں اور اُس کی عقیدت کے جُرم میں ظلم و ستم برداشت کریں! (۵۰)

کُفّار کی ہٹ دھرمی کا ایک عجیب نمونہ

اپنے ہر الزام اور اعتراض کا معقول جواب پا کر کفّار کی ہٹ دھرمی نے ایک نرالی صورت اختیار کی، اور وہ یہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو نبی تو ہم اُس وقت مانتے جب یہ کسی ایسی زبان میں فرفر قرآن سُناتے جس سے یہ واقف نہیں ہیں۔ قرآن میں اس کا جو جواب دیا گیا وہ یہ تھا:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ (حٰم السجدہ: ۴۴)

"اگر ہم اِس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے "کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی۔" اِن سے کہو یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ اُن کا حال تو ایسا ہے جیسے اُن کو دور سے پُکارا جا رہا ہو۔"

یہ اُس ہٹ دھرمی کا ایک اور نمونہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ کُفّار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) عرب ہیں، عربی اُن کی مادری زبان ہے، وہ اگر عربی میں قرآن پیش کرتے ہیں تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کلام اُنہوں نے خود نہیں گھڑ لیا ہے بلکہ اُن پر خدا نے نازل کیا ہے۔ اُن کے اِس کلام کو خدا کا نازل کیا ہُوا کلام تو اُس وقت مانا جا سکتا تھا جب یہ کسی ایسی زبان میں یکایک دھواں دھار تقریر کرنا شروع کر دیتے جسے یہ نہیں جانتے، مثلاً فارسی یا رُومی یا یُونانی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب اِن کی اپنی زبان میں قرآن بھیجا گیا ہے جسے یہ سمجھ سکیں تو ان کو یہ اعتراض ہے کہ عرب کے ذریعہ سے عربوں کے لیے عربی زبان میں یہ کلام کیوں نازل کیا گیا؟ لیکن اگر کسی دوسری زبان میں یہ بھیجا جاتا تو اُس وقت یہی لوگ یہ اعتراض کرتے کہ یہ معاملہ بھی خوب ہے، عرب قوم میں ایک عرب کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مگر کلام اُس پر ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے جسے نہ رسول سمجھتا ہے

اُن کے اِس لغو اعتراض کو رد کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انہیں یہ بھی سمجھایا گیا کہ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے تمہاری اپنی زبان میں ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جسے تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو اور جان سکتے ہو کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اس سے منہ موڑ کر تم اپنا ہی نقصان کر رہے ہو۔

تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ: ۲-۴)

"یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔ مگر اِن لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سُن کر نہیں دیتے۔"

اس میں پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے یعنی تم جیسے چاہو یہ رٹ لگاتے رہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود تصنیف کر رہے ہیں، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کلام کا نزول خداوند عالم کی طرف سے ہے۔ مزید برآں یہ ارشاد فرما کر مخاطبین کو متنبہ کیا گیا کہ تم اگر اس کلام کو سُن کر بگڑتے ہو تو تمہارا یہ غصہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہیں بلکہ خدا کے خلاف ہے، اگر اسے رد کرتے ہو تو ایک انسان کی بات نہیں بلکہ خدا کی بات رد کرتے ہو، اور اگر اس سے بے رخی برتتے ہو تو ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے منہ موڑتے ہو۔

دوسری بات یہ ارشاد ہوئی کہ اس کا نازل کرنے والا وہ خدا ہے جو اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان اور رحیم ہے۔ نازل کرنے والے خدا کی دوسری صفات کے بجائے اُس کی صفتِ رحمت کا ذکر اِس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ اُس نے اپنی رحیمی کے تقاضے سے یہ کلام نازل کیا ہے۔ اِس سے مخاطبین کو خبردار کر دیا گیا کہ اس کلام سے اگر کوئی بے رُخی برتتا ہے یا اسے رد کرتا ہے، یا اس پر چیں بجبیں ہوتا ہے تو درحقیقت اپنے آپ سے دشمنی کرتا ہے۔ یہ تو ایک نعمتِ عظمیٰ ہے جو خدا نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر انسانوں کی رہنمائی اور فلاح و سعادت کے لیے نازل کی ہے۔ خدا اگر انسان سے بے رخی برتتا تو انہیں اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور کچھ پروا نہ کرتا کہ یہ کس گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ لیکن یہ اُس کا فضل و کرم ہے کہ پیدا کرنے اور روزی دینے کے ساتھ اُن کی زندگی سنوارنے کے لیے علم کی روشنی دکھانا بھی وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اسی بنا پر یہ کلام وہ اپنے ایک بندے پر نازل کر رہا ہے۔ اب اُس شخص سے بڑھ کر ناشکرا اور آپ اپنا

دشمن کون ہوگا جو اس رحمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے الٹا اس سے لڑنے کے لیے دوڑے۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ اس کتاب کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں یعنی اس میں کوئی بات گنجلک اور پیچیدہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اس بنا پر اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر سکے کہ اس کی سمجھ میں اس کتاب کے مضامین آتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں تو صاف صاف بتایا گیا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، صحیح عقائد کون سے ہیں اور غلط عقائد کون سے، اچھے اخلاق کیا ہیں اور برے اخلاق کیا، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، کس طریقے کی پیروی میں انسان کی بھلائی ہے اور کس طریقے کو اختیار کرنے میں اس کا اپنا خسارہ ہے۔ ایسی صاف اور کھلی ہوئی ہدایت کو اگر کوئی شخص رد کرتا ہے یا اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتا۔ اس کے اس رویے کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود ہی سرے سے غلط رہنا چاہتا ہے۔

چوتھی بات یہ فرمائی گئی کہ یہ عربی زبان کا قرآن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کسی غیر زبان میں آتا تو اہل عرب یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ ہم اس زبان ہی سے نابلد ہیں جس میں خدا نے اپنی کتاب بھیجی ہے۔ لیکن یہ تو ان کی اپنی زبان میں ہے۔ اسے نہ سمجھ سکنے کا بہانہ یہ نہیں بنا سکتے۔

پانچویں بات یہ فرمائی گئی کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہے جو علم رکھتے ہیں یعنی اس سے فائدہ صرف دانا لوگ ہی اٹھا سکتے ہیں۔ نادان لوگوں کے لیے یہ اسی طرح بے فائدہ ہے جس طرح ایک قیمتی ہیرا اس شخص کے لیے بے فائدہ ہے جو ہیرے اور پتھر کا فرق نہ جانتا ہو۔

چھٹی بات یہ فرمائی گئی کہ یہ کتاب بشارت دینے والی اور ڈرا دینے والی ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ محض ایک تخیل، ایک فلسفہ اور ایک نمونۂ انشا پیش کرتی ہو جسے ماننے یا نہ ماننے کا کچھ حاصل نہ ہو۔ بلکہ یہ پکار پکار کر تمام دنیا کو خبردار کر رہی ہے کہ اسے ماننے کے نتائج نہایت شاندار اور نہ ماننے کے نتائج انتہائی ہولناک ہیں۔ ایسی کتاب کو صرف ایک بے وقوف ہی سرسری طور پر نظر انداز کر سکتا ہے۔ (۴۷)

قرآن کی دعوت کو روکنے کے لیے کفار کی تدبیریں

ان سب تدبیروں میں ناکام ہونے کے بعد ان کا آخری حربہ یہ تھا کہ کھلی کھلی ہٹ دھرمی پر اتر آئیں، قرآن کی دعوت کو زبردستی روکنے کی کوشش کریں، اور جب قرآن سنایا جانے لگے تو خوب شور مچائیں اور ہر طرف سے اس کا مذاق اڑانے اور اس پر آوازے کسنے کے لیے ٹوٹ پڑیں۔ قرآن کریم میں ان کی یہ سب چالیں ایک ایک کر کے بیان کی گئی ہیں جن سے ہر معقول آدمی کو معلوم ہو گیا کہ کفار کے پاس اب دلیل کے جواب میں دلیل نہیں ہے بلکہ اس میدان میں شکست کھا کر اب وہ تعصب، زبردستی اور بیہودگی سے حق کی آواز کو دبانے پر اتر آتے ہیں۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۔ (حٰم السجدہ ۔ ۵)

" اور انہوں نے کہہ دیا کہ جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں (یعنی ہمارے دلوں تک اس کے پہنچنے کا کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں ہے)، ہمارے کانوں میں گرانی ہے، (یعنی ہم اسے نہیں سنتے)، اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے (یعنی جدائی پڑ گئی ہے) پس تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کر رہے ہیں (یعنی تیری مخالفت میں سرگرم ہیں)۔"

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ (القلم: ۵۱-۵۲)

" جب یہ کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ (اپنی غضبناک) نظروں سے تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو مجنون ہے۔ حالانکہ یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔"

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۔ (حٰم السجدہ ۔ ۲۶)

" اور یہ منکرین حق کہتے ہیں کہ اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور شور مچا کر اس میں خلل ڈالو شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ۔"

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۔ (المعارج: ۳۶-۳۷)

" پس (اے نبیؐ) کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے تمہاری طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں؟ (یعنی تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر مذاق اڑانے اور آوازے کسنے کے لیے ہر طرف سے دوڑ پڑے ہیں)۔" (۶۳)

فصل چہارم

آخرت پر ایمان لانے کی دعوت

دعوتِ اسلامی کا چوتھا نکتہ یہ تھا کہ لوگ آخرت پر ایمان لائیں۔ یہ ایک محض مختصر سا نکتہ نہ تھا بلکہ اس میں بہت سی اہم حقیقتیں شامل تھیں جنہیں تسلیم کرنے کا مجموعی نام ایمان بالآخرۃ تھا۔

اوّل یہ کہ دنیا میں انسان غیر ذمہ دار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ یہاں جو کچھ بھی وہ چاہے کرتا رہے، کوئی اُس سے باز پُرس کرنے والا نہ ہو، بلکہ یہ دُنیا دارالامتحان ہے جس میں انسان آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے اور جو کچھ بھی وہ یہاں کرتا ہے اس کی جواب دہی اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے کرنی ہوگی۔

دوم یہ کہ اِس جواب دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔ نوعِ انسانی کو دُنیا میں کام کرنے کے لیے جتنی مہلت دینے کا اللہ فیصلہ فرما چکا ہے، اس کے ختم ہونے پر قیامت برپا ہو گی جس میں یہ سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظامِ عالم قائم کیا جائے گا اور ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جتنے انسان گزر چکے ہوں گے وہ سب بیک وقت زندہ کر کے از سرِ نو اُس عالم میں اُٹھائے جائیں گے۔ یہ دوسری زندگی دُنیا کی موجودہ زندگی کی طرح عارضی نہیں بلکہ ابدی ہو گی۔ موت اس میں کبھی نہ آئے گی۔

سوم یہ کہ اُس وقت تمام اگلے پچھلے انسانوں کو جمع کر کے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اور وہاں ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں اُن اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی جو اُس نے خود اپنی ذمہ داری پر دُنیا میں کیے ہوں گے۔

چہارم یہ کہ دنیا میں انسان جو کچھ بھی کر رہا ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ اس کو براہِ راست جانتا ہے، مگر عدل کی تمام شرائط پوری کرنے کے لیے وہ اُس کا مکمل اور بالکل صحیح نامۂ اعمال تیار کرا رہا ہے۔ بے شمار شہادتیں اس کے ایک ایک قول و فعل کے لیے فراہم کر رہا ہے خواہ وہ اُس نے علانیہ کیا ہو یا چھُپ کر، بلکہ جس نیت اور جس ارادے سے اس نے کوئی بات کی یا کہی ہے اور جو جو خیالات اُس نے اپنے دل میں رکھے ہیں، ان

سب کا ثبوت بھی بے محفوظ کیا جا رہا ہے۔ پھر اس بات کے گواہ بھی اس نے تیار کر رکھے ہیں کہ انسان کو حق اور باطل کا فرق بتلانے اور غلط راستوں کے درمیان سیدھا راستہ بتانے کے لیے اس کی طرف سے پورا انتظام کر دیا گیا تھا۔ یہ سب شہادتیں اللہ کی عدالت میں اس شان سے پیش ہوں گی کہ انسان ان کا انکار نہ کر سکے گا۔

پنجم یہ کہ اللہ کی عدالت میں کوئی رشوت، بے جا سفارش، اور خلافِ حق وکالت نہ چل سکے گی۔ کسی کا بوجھ کسی دوسرے پر نہ ڈالا جائے گا اور نہ کوئی عزیز سے عزیز اور قریب سے قریب شخص اپنے عزیز و قریب کا بوجھ اپنے اوپر لے گا۔ جن واقعی یا خیالی ہستیوں کو آدمی اپنا ولی و ناصر سمجھتا ہے وہ اس کے کسی کام نہ آئیں گی۔ انسان وہاں تن تنہا بالکل بے یار و مددگار کھڑا ہوا اپنے کارنامۂ حیات کا حساب آپ دے رہا ہوگا۔ اور فیصلہ بالکل اللہ کے اختیار میں ہوگا۔

ششم یہ کہ فیصلے کا مدار کلیتہً اس بات پر ہوگا کہ انسان نے دنیا میں انبیاء کے بتائے ہوئے حق کو مان کر اس کے مطابق اللہ کی ٹھیک ٹھیک بندگی کی یا نہیں، اور آخرت میں اپنی جواب دہی کے احساس کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی بسر کی یا اسے بھول کر سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتا رہا۔ پہلی صورت میں اس کے لیے جنت ہے اور دوسری صورت میں جہنم۔

یہ آخرت کا عقیدہ اسلامی دعوت کے لیے اتنا ہی اہم تھا جتنا توحید، رسالت اور قرآن کو کلامِ الٰہی ماننے کا عقیدہ۔ کیونکہ اسلام جس طرزِ فکر و عمل کی طرف بلا رہا تھا اور جس راہ پر چلنے کی دعوت دے رہا تھا اس پر ایک قدم چلنا بھی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے جب تک وہ دنیا کو امتحان گاہ، اور اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ نہ سمجھ لے، اور جب تک اس کے دماغ سے یہ خیال نکل نہ جائے کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے جس میں ظاہر ہونے والے نتائج ہی خیر و شر کا اصل معیار ہیں، اور وہ سچے دل سے یہ بات نہ مان لے کہ اصلی اور ابدی زندگی وہ ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے، اور خیر و شر کا حقیقی معیار یہ ہے کہ کس راہ پر چل کر آدمی اس دوسری زندگی میں کامیاب ہوگا اور کس پر چل کر برا انجام دیکھے گا۔ یہ عقیدہ نہ ہو تو آدمی سرے سے توحید و رسالت اور ایمان بالقرآن کی دعوت کو قابلِ التفات ہی نہ سمجھے گا، اور اگر کسی وجہ سے اس کو مان بھی لے تو خدا کی بندگی، رسول کی اطاعت اور قرآن کی پیروی میں ہرگز سنجیدہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جب آدمی یہ سمجھتا ہو کہ آخرکار سب کو مر کر مٹی میں مل جانا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی پیروی کرنے کی جزا اور نہ کرنے کی سزا ملنے والی ہو، تو وہ کبھی ایمانداری کے ساتھ اپنے آپ کو اس ضابطے میں جکڑوا دینے کے لیے تیار نہ ہوگا جس میں اسلام اس کو باندھنا چاہتا ہے، بلکہ زندگی کے ہر معاملہ میں وہ طریقہ اختیار کرے گا جس سے دنیا میں کچھ فائدہ، کچھ لذت اور کچھ قوت حاصل ہو

اور پھر اس طریقے سے اجتناب کرے گا جس کی بدولت وہ حیاتِ دنیا کے فائدوں اور لذتوں سے محروم ہوتا ہو یا نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہوتا ہو۔

قریش کا آخرت کو بعید از عقل اور ناممکن سمجھنا

اس عقیدے کی یہی اہمیت تھی جس کی وجہ سے قریش اور مشرکین عرب کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیش کیا تو وہ سب سے زیادہ اسی پر چونکتے ہوئے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر اس کو ہم مان لیں تو ہماری ساری آزادیاں ختم ہو جائیں گی۔ ہم تنہائی میں بھی، جہاں ہمیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، کوئی ایسا فعل جسے خدا اور رسول اور قرآن نے حرام کیا ہے نہ کر سکیں گے۔ ہم جہاں کوئی ناجائز فائدہ یا لطف یا قوت حاصل کرنے پر پوری طرح قادر رہیں گے وہاں بھی یہ عقیدہ ہمارے ہاتھ باندھ کر رکھ دے گا۔ یہ تو ایک غیر محسوس سپاہی ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ لگا دے گا جو کسی حالت میں بھی ہم کو من مانی نہ کرنے دیگا۔ اسی بنا پر وہ پوری قوت کے ساتھ اس پر حملہ آور ہو گئے، اور انہوں نے بڑے زور شور سے لوگوں میں یہ خیال پھیلانے کی کوشش کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات قطعی خلافِ عقل ہے، بعید از امکان، سراسر دیوانگی بلکہ محض قابل مضحکہ ہے۔ (۴۳)

آخرت کو مشکوک سمجھنے والوں کے خیالات

کفار میں سے ایک قلیل گروہ ایسا بھی تھا جو کہتا تھا کہ ہم گمان کی حد تک تو سمجھتے ہیں کہ شاید آخرت ہو مگر ہمیں اس کا یقین نہیں ہے۔ اس گروہ کا ذکر صرف ایک جگہ قرآن میں آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کے لوگ بہت کم پائے جاتے تھے:

وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُم مَّا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ إِن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ ۔ (الجاثیہ۔ ۳۲)

"اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہوتی ہے، ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں ہے"۔

بظاہر اس گروہ اور منکرین آخرت کے درمیان اس لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ وہ آخرت کے بالکل منکر ہیں اور یہ گروہ اس کے ممکن ہونے کا گمان رکھتا ہے۔ لیکن نتیجے اور انجام کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ آخرت کے انکار اور اس پر یقین نہ ہونے کے اخلاقی نتائج بالکل ایک جیسے ہیں۔ کوئی شخص خواہ آخرت کو نہ مانتا ہو، یا اس کا صرف گمان رکھتا ہو اور یقین نہ رکھتا ہو، دونوں صورتوں میں لازماً وہ خدا

کے سامنے اپنی جوابدہی کے احساس سے خالی ہوگا اور یہ عدمِ احساس اس کو لازماً فکر و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا کرکے رہے گا۔ صرف آخرت کا یقین ہی دنیا میں آدمی کے رویے کو درست رکھ سکتا ہے۔ یہ اگر نہ ہو تو شک اور انکار دونوں اسے ایک ہی طرح کی غیر ذمہ دارانہ روش پر ڈال دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہی غیر ذمہ دارانہ روش آخرت کی بدانجامی کا اصل سبب ہے، اس لیے دوزخ میں جانے سے نہ انکار کرنے والا بچ سکتا ہے، نہ یقین نہ رکھنے والا۔ (۵۵)

منکرینِ آخرت کے خیالات

اِس ایک مقام کو چھوڑ کر باقی تمام مقامات پر قرآن میں آخرت کا کھُلا کھُلا انکار کرنے والوں کے اقوال نقل کیے گئے ہیں:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۔ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۔ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۔ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا ائْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۔ (الجاثیہ: ۲۴ – ۲۵)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ "زندگی بس یہی ہماری دُنیا کی زندگی ہے یہیں ہمیں مرنا اور جینا ہے اور گردشِ ایّام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو" درحقیقت اس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں اور جب ہماری واضح آیات (جو آخرت پر دلالت کرتی ہیں) انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ "اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو"۔

یعنی کوئی ذریعۂ علم ایسا نہیں ہے جس سے اِن کو بتحقیق یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اس زندگی کے بعد انسان کے لیے کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، اور یہ بات بھی انہیں معلوم ہو گئی ہو کہ انسان کی رُوح کسی خدا کے حکم سے قبض نہیں کی جاتی بلکہ آدمی محض گردشِ ایّام سے مر کر فنا ہو جاتا ہے۔ منکرینِ آخرت یہ باتیں کسی علم کی بنا پر نہیں بلکہ محض گمان کی بنا پر کرتے ہیں۔ علمی حیثیت سے اگر وہ بات کریں تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ بس یہ ہے کہ "ہم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں" لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم جانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے"۔ اسی طرح علمی طریقہ پر وہ یہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آدمی کی رُوح خدا کے حکم سے نکالی نہیں جاتی ہے بلکہ انسان محض اُسی طرح مر کر ختم ہو جاتا ہے جیسے ایک گھڑی چلتے چلتے رُک جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ "ہم ان دونوں میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں جانتے کہ فی الواقع کیا صورت پیش آتی ہے"۔ اب سوال یہ ہے کہ جب انسانی ذرائعِ علم

کی حد تک زندگی بعد موت کے ہونے یا نہ ہونے، اور قبضِ رُوح واقع ہونے یا گردشِ ایام سے آپ ہی آپ مرجانے کا یکساں احتمال ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ امکانِ آخرت کے احتمال کو چھوڑ کر حتمی طور پر انکارِ آخرت کے حق میں فیصلہ کر ڈالتے ہیں؟ کیا اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور ہے کہ دراصل مسئلے کا آخری فیصلہ وہ دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی خواہشات کی بنا پر کرتے ہیں؟ چونکہ اُن کا دل یہ نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہو اور موت کی حقیقت نیستی اور عدم نہیں، بلکہ خدا کی طرف سے قبضِ روح ہو، اس لیے وہ اپنے دل کی مانگ کو اپنا عقیدہ بنا لیتے ہیں اور دوسری بات کا انکار کر دیتے ہیں۔ (۴۹)

قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۔ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۔ (المومنون: ۸۲-۸۳)

" یہ کہتے ہیں "کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کے پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہم کو پھر زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟ ہم نے بھی یہ وعدے بہت سُنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سُنتے رہے ہیں۔ یہ محض افسانہائے پارینہ ہیں۔"

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۔ (الرعد-۵)

"اور اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ "جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔"

یعنی ان کا آخرت سے انکار اور اسے بعید از امکان سمجھنا دراصل خدا سے اور اس کی قدرت اور حکمت سے انکار ہے۔ یہ صرف اتنا ہی نہیں کہتے کہ ہمارا مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ پیدا ہونا غیر ممکن ہے، بلکہ ان کے اسی قول میں یہ خیال بھی پوشیدہ ہے کہ معاذ اللہ وہ خدا عاجز و درماندہ اور نادان و بے خرد ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ (۵۰)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۔ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۔ (سبا: ۷-۸)

"منکرین لوگوں سے کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہوگا اُس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہے۔"

قریش کے سردار قطعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا کہہ دینے کی ہمت نہ رکھتے تھے کیونکہ پوری قوم آپ کو صادق القول جانتی تھی اور کبھی ساری عمر کسی نے آپ کی زبان سے کوئی جھوٹی بات نہ سنی تھی۔ اس لیے وہ لوگوں کے سامنے اپنا الزام اس شکل میں پیش کرتے تھے کہ یہ شخص جب زندگی بعد موت جیسی اَن ہونی بات زبان سے نکالتا ہے تو لا محالہ اس کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو (معاذ اللہ) یہ شخص جان بوجھ کر ایک جھوٹی بات کہہ رہا ہے، یا پھر یہ مجنون ہے۔ لیکن یہ مجنون والی بات بھی اتنی ہی بے سروپا تھی جتنی جھوٹ والی بات۔ اس لیے کہ کوئی عقل کا اندھا ہی ایک کامل درجے کے عاقل و فہیم آدمی کو مجنون مان سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیہودہ بات کے جواب میں کسی استدلال کی ضرورت محسوس نہ فرمائی اور کلام صرف اُن کے اس استعجاب پر کیا جو زندگی بعد موت کے امکان پر وہ ظاہر کرتے تھے۔ (۴۸)

يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ۝ أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ (النازعات: ۱۰-۱۲)

"یہ لوگ کہتے ہیں کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے جائیں گے؟ کیا جب ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے؟ کہنے لگے یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہوگی۔"

یعنی جب اُن کو جواب دیا گیا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا تو وہ مذاق کے طور پر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یار، اگر واقعی ہمیں پلٹ کر دوبارہ زندگی کی حالت میں واپس آنا پڑا تو ہم مارے گئے، اس کے بعد تو پھر ہماری خیر نہیں۔ (۴۹)

وَكَانُوا يَقُولُونَ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ۝ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ۝ قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ۝ لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ۝

(الواقعہ۔ ۴۷ تا ۵۰)

"اور وہ کہتے تھے کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کے پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟ اے نبی! ان لوگوں سے کہو، یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔"

امکانِ آخرت کے دلائل

منکرینِ آخرت اپنے انکار کے حق میں جو کچھ کہتے تھے اس کو نقل کر کے قرآن مجید میں جگہ جگہ وہ دلائل دیے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آخرت کا آنا عقلی طور پر ممکن ہے، اور اسے ممکن سمجھنا نہیں بلکہ غیر ممکن

سمجھنا خلافِ عقل ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ - وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ - قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ - (یٰس۔ ۷۷ تا ۷۹)

"کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اُسے ایک بُوند سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟ اس سے کہو، اِنہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے اِنہیں پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔"

یعنی وہ یہ بات بھُول جاتا ہے کہ ہم نے بے جان مادّہ سے وہ ابتدائی جرثومۂ حیات پیدا کیا جو اُس کا ذریعۂ تخلیق بنا، اور پھر اُس جرثومے کو پرورش کر کے اُسے یہاں تک بڑھا لائے کہ آج وہ ہمارے سامنے باتیں چھانٹنے کے قابل ہوا ہے۔ وہ ہمیں بھی عام مخلوقات کی طرح عاجز سمجھ رہا ہے اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہے کہ جس طرح انسان مُردے کو زندہ نہیں کر سکتا اسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لیے پوچھتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ ابن عباسؓ، قتادہؓ اور سعید بن جُبیرؒ کی روایت ہے کہ اس موقع پر کفارِ مکّہ میں سے ایک شخص قبرستان سے کسی مُردے کی ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آگیا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے اسے توڑ کر اور اس کے منتشر اجزاء ہوا میں اُڑا کر آپ سے کہا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) تم کہتے ہو کہ مُردے زندہ کر کے پھر اُٹھائے جائیں گے۔ اب بتاؤ، ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟" اس کا مختصر ترین اور بلیغ ترین جواب یہ دیا گیا کہ وہی جس نے اسے پہلے پیدا کیا تھا۔ (۸۰)

وَقَالُوا أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۔ قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ۔ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا ۖ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ ۖ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ قَرِيبًا ۔ يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۔ (بنی اسرائیل ۴۹ تا ۵۲)

"وہ کہتے ہیں" جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟ ـــ ان سے کہو "تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمہارے ذہن میں قبولِ حیات سے بعید تر ہو، پھر بھی تم اٹھ کر رہو گے۔" وہ مزید پوچھیں گے "کون ہے

جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا کر لائے گا؟" جواب میں کہو "وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا"۔ وہ (مذاق اُڑانے کے انداز میں) سر ہلا ہلا کر پوچھیں گے "اچھا، تو یہ ہوگا کب؟" تم کہو "کیا عجب کہ وہ وقت قریب ہی آ لگا ہو جس روز وہ تمہیں پکارے گا، تم اس کی حمد کرتے ہوئے اُس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اُس وقت یہ ہوگا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں"۔

یعنی دنیا میں مرنے کے وقت سے لے کر قیامت میں اٹھنے کے وقت تک کی مدت تم کو چند گھنٹوں سے زیادہ محسوس نہ ہوگی۔ تم اُس وقت یہ سمجھو گے کہ ہم ذرا دیر سوتے پڑے تھے کہ یکایک اس شورِ محشر نے ہمیں جگا اٹھایا۔ (۸۱)

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا - أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (مریم ۶۶ تا ۶۷)

"انسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں رہا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟"

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ -

(الحج : ۵)

"لوگو، اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) کہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقتِ خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اُس پر مینہ برسایا، یکایک وہ پھبک اُٹھی اور پھول گئی اور اُس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اُگلنی شروع کر دی"۔

مٹی سے پیدا کرنے کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ہر انسان اُن مادّوں سے پیدا کیا جاتا ہے جو سب کے سب زمین سے حاصل ہوتے ہیں اور اس تخلیق کی ابتدا نطفے سے ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نوعِ انسانی کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا جو براہِ راست مٹی سے بنائے گئے تھے، اور پھر آگے نسلِ انسانی کا سلسلہ نطفے سے چلا، جیسا کہ سورۂ سجدہ میں فرمایا:

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ۔

(آیات ۷-۸)

"انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل ایک سَت سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے۔"

دونوں صورتوں میں یہ بہر حال ثابت ہے کہ زندہ انسان کی تخلیق بے جان مادّوں کو جمع کر کے کی گئی ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اُن مختلف اطوار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے استقرارِ حمل کے بعد بچہ ماں کے پیٹ میں گزرتا ہے۔ اُن کی وہ تفصیلات بیان نہیں کی گئیں جو آج کل صرف طاقت ور خوردبینوں ہی سے نظر آ سکتی ہیں، بلکہ اُن بڑے بڑے نمایاں تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اُس زمانے کے عام بدو بھی واقف تھے۔ یعنی نطفہ قرار پانے کے بعد ابتداً جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا سا ہوتا ہے، پھر وہ گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل ہوتا ہے جس میں پہلے شکل صورت کچھ نہیں ہوتی اور آگے چل کر انسانی شکل نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اِستقرار کی مختلف حالتوں میں چونکہ تخلیقِ انسانی کے یہ سب مراحل لوگوں کے مشاہدے میں آتے تھے، اس لیے انہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس سوال کا جواب انسان کے اپنے فہم پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو خدا انسان کو اس طرح پیدا کرتا ہے اور پروان چڑھاتا ہے اس کے لیے آخر اسے دوبارہ پیدا کرنا کیوں ناممکن ہو؟ (۴۴)

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝

(السجدہ - ۱۰-۱۱)

"اور یہ لوگ کہتے ہیں: 'جب ہم مٹی میں رَل مِل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟' اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ ان سے کہو 'موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے۔'"

پہلے فقرے اور آخری فقرے کے درمیان پوری ایک داستان کی داستان ہے جسے سامع کے ذہن پر چھوڑ

دیا گیا ہے۔ کفار کا جو اعتراض پہلے فقرے میں نقل کیا گیا ہے وہ اتنا مہمل تھا کہ اس کی تردید کی حاجت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کا محض نقل کر دینا ہی اس کی لغویت ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا۔ اس لیے کہ اُن کا اعتراض جن دو اجزاء پر مشتمل ہے وہ دونوں ہی سراسر غیر معقول ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ "ہم مٹی میں رَل مِل گئے ہوں گے" آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ "ہم" جس چیز کا نام ہے وہ کب مٹی میں رَلتی مِلتی ہے؟ مٹی میں تو صرف وہ جسم ملتا ہے جس سے "ہم" نکل چکا ہوتا ہے۔ اُس جسم کا نام "ہم" نہیں ہے۔ زندگی کی حالت میں جب اس جسم کے اعضاء کاٹے جاتے ہیں تو عضو پر عضو کٹتا چلا جاتا ہے مگر "ہم" پورا کا پورا اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ اُس کا کوئی جزء بھی کسی کٹے ہوئے عضو کے ساتھ نہیں جاتا۔ اور جب یہ "ہم" کسی جسم میں سے نکل جاتا ہے تو پھر پورا جسم موجود ہوتے ہوئے بھی اُس پر اِس "ہم" کے کسی ادنیٰ شائبے تک کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو ایک عاشق جان نثار اپنے معشوق کے مُردہ جسم کو لے جا کر دفن کر دیتا ہے، کیونکہ معشوق اُس جسم سے نکل چکا ہوتا ہے اور عاشق اپنے معشوق کو نہیں بلکہ اس خالی جسم کو دفن کرتا ہے جس میں کبھی اُس کا معشوق رہتا تھا۔ پس معترضین کے اعتراض کا پہلا مقدمہ ہی بے بنیاد ہے۔ رہا اُس کا دوسرا جزء کہ "کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" تو یہ انکار و تعجب کے انداز کا سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا اگر معترضین نے بات کرنے سے پہلے اِس "ہم" اور اس کے پیدا کیے جانے کے مفہوم پر ایک لمحہ کے لیے بھی کچھ غور کر لیا ہوتا۔ اِس "ہم" کی موجودہ پیدائش اِس کے سوا کیا ہے کہ کہیں سے کوئلہ اور کہیں سے لوہا اور کہیں سے چونا اور ایسی طرح کے دوسرے اجزاء جمع ہوئے اور اِس کالبدِ خاکی میں یہ "ہم" براجمان ہو گیا۔ پھر اس کی موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اِس کالبدِ خاکی میں سے جب "ہم" نکل جاتا ہے تو اُس کا مکان تعمیر کرنے کے لیے جو اجزاء زمین کے مختلف حصوں سے فراہم کیے گئے تھے وہ سب اُسی زمین میں واپس چلے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس نے پہلے اِس "ہم" کو یہ مکان بنا کر دیا تھا، کیا وہ دوبارہ اُسی سروسامان سے وہی مکان بنا کر اُسے از سرِ نو اُس میں نہیں بسا سکتا؟ یہ چیز جب پہلے ممکن تھی اور ممکن کیا معنی، واقعہ کی صورت میں رُونما ہو بھی چکی ہے، تو دوبارہ اس کے ممکن ہونے اور واقعہ بننے میں آخر کیا امر مانع ہے؟ یہ باتیں ایسی ہیں جنہیں ذرا سی عقل آدمی استعمال کرے تو خود ہی سمجھ سکتا ہے لیکن وہ اپنی عقل کو اس رُخ پر کیوں نہیں جانے دیتا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے حیات بعد الموت اور آخرت پر اِس طرح کے لایعنی اعتراضات جڑتا ہے؟ بیچ کی ساری بحث چھوڑ کر اللہ تعالیٰ دوسرے فقرے میں اِسی سوال کا جواب دیتا ہے کہ "دراصل یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔ یعنی اصل بات یہ نہیں ہے کہ دوبارہ پیدائش کوئی بڑی ہی اور بعید از امکان بات ہے جو اِن کی سمجھ میں نہ آ سکتی ہو، بلکہ دراصل جو چیز انہیں یہ بات سمجھنے سے روکتی ہے وہ اِن کی یہ خواہش ہے کہ ہم زمین میں چھوٹے پھریں اور دل کھول کر گناہ کریں اور پھر بچ کر (Scot free

یہاں سے نکل جائیں، پھر ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہو، پھر اپنے کرتوتوں کا کوئی حساب ہمیں نہ دینا پڑے۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ تمہارا "ہم" جس مکان میں رہتا ہے وہ تو ضرور مٹی میں رَل مِل جائے گا، مگر خود یہ "ہم" مٹی میں نہ ملے گا بلکہ اس کی مہلتِ عمل ختم ہوتے ہی خدا کا فرشتۂ موت آئے گا اور اُسے جسم سے نکال کر سمٹوا اپنے قبضے میں لے لے گا۔ اُس کا کوئی ادنیٰ سا جز بھی جسم کے ساتھ مٹی میں نہ جا سکے گا۔ وہ پورا کا پورا حراست (Custody) میں لے لیا جائے گا اور اپنے رب کے حضور پیش کر دیا جائے گا:

اس مختصر سی آیت میں بہت سے حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر سے سرسری طور پر نہ گزر جانا چاہیے :۔

۱ - اس میں تصریح ہے کہ موت کچھ یونہی نہیں آ جاتی کہ ایک گھڑی چل رہی تھی، کوک ختم ہوئی اور وہ چلتے چلتے یکایک بند ہو گئی۔ بلکہ دراصل اِس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو آ کر روح کو ٹھیک اُسی طرح باقاعدہ وصول کرتا ہے جس طرح ایک سرکاری تفویض امین (Official Receiver) کسی چیز کو اپنے قبضے میں لیتا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر اس کی مزید تفصیلات جو بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس افسرِ موت کے ماتحت فرشتوں کا ایک پورا عملہ ہے جو موت وارد کرنے اور روح کو جسم سے نکالنے اور اس کو قبضے میں لینے کی بہت سی مختلف النوع خدمات انجام دیتا ہے۔ نیز یہ کہ اُس عملے کا برتاؤ مجرم روح کے ساتھ کچھ اور ہوتا ہے اور مومن صالح روح کے ساتھ کچھ اور۔ (ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ نساء آیت ۹۷۔ الانعام، ۹۳۔ النحل، ۲۸۔ الواقعہ، ۸۳-۹۴)۔

۲ - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا، بلکہ اُس کی روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے۔ قرآن کے الفاظ "موت کا فرشتہ تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا" اِسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی۔ قبضے میں لینے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ مقبوضہ چیز قابض کے پاس رہے۔

۳ - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت جو چیز قبضے میں لی جاتی ہے وہ آدمی کی حیوانی زندگی (Biological Life) نہیں بلکہ اس کی وہ خودی، اس کی وہ اَنا (Ego) ہے جو "میں" اور "ہم" اور "تم" کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ اَنا دنیا میں کام کر کے جیسی کچھ شخصیت بھی بنتی ہے وہ پوری کی پوری، جوں کی توں (Intact) نکال لی جاتی ہے، بغیر اس کے کہ اُس کے اوصاف میں کوئی کمی بیشی ہو۔ اور یہی چیز موت کے بعد اپنے رب کی طرف پلٹائی جاتی ہے، اِسی کو آخرت میں نیا جنم اور نیا جسم دیا جائے گا، اِسی پر مقدمہ قائم کیا جائے گا، اِسی سے حساب لیا جائے گا اور اِسی کو جزا و سزا

دیکھنی ہوگی۔ (۴۳)

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۚ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ۔
(الصّٰفّٰت۔ ۱۱)

"پھر ذرا ان سے پوچھو، ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟ ان کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔"

یہ کفارِ مکہ کے اس شبہ کا جواب تھا جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوئے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے جواب میں امکانِ آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اُن کے سامنے یہ سوال رکھا کہ اگر تمہارے نزدیک مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمہارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان اور یہ بے شمار اشیاء جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، ان کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جس خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کر چکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے۔ پھر فرمایا کہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اسی مٹی سے دوبارہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس کا سارا مادّۂ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا سے بنتا ہے، اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزا سے مرکب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخر کار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور اُن حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔ اس جواب میں بنائے استدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کیے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمہارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اسی مٹی سے تمہاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہوگی؟ (۴۴)

لَخَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ
(المؤمن۔ ۵۷)

"آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے کی بہ نسبت زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

یہ کفار کے اس خیال کا جواب تھا کہ انسان کا مر کر دوبارہ جی اٹھنا غیر ممکن ہے۔ اس پر ارشاد فرمایا گیا

کہ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ درحقیقت نادان ہیں۔ اگر عقل سے کام لیں تو ان کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ ہو کہ جس خدا نے یہ عظیم الشان کائنات بنائی ہے اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کوئی دشوار کام نہیں ہو سکتا۔ (۸۵)

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا۔ (النّٰزعٰت - ۲۷) کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اس کو بنایا۔

تخلیق سے مراد انسانوں کی دوبارہ تخلیق ہے اور آسمان سے مراد وہ پورا عالم بالا ہے جس میں بے شمار تارے اور سیارے بے حد و حساب شمسی نظام اور ان گنت کہکشاں پائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو کوئی بڑا ہی امر محال سمجھتے ہو، اور بار بار کہتے ہو کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہوں اُس حالت میں ہمارے پراگندہ اجزاء تن جسم پھر سے جمع کر دیئے جائیں اور ان میں جان ڈال دی جائے، کبھی اس بات پر بھی غور کرتے ہو کہ اس عظیم کائنات کا بنانا زیادہ سخت کام ہے یا تمہیں ایک مرتبہ پیدا کر چکنے کے بعد دوبارہ اسی شکل میں پیدا کر دینا؟ جس خدا کے لیے وہ کوئی مشکل کام نہ تھا اس کے لیے آخر یہ کیوں ایسا مشکل کام ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے؟ (۸۶)

وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝

اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دٰخِرُوْنَ ۝ فَاِنَّمَا هِىَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ

يَنْظُرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ (الصّٰفّٰت - ۱۵ تا ۲۰)

"اور کہتے ہیں "یہ تو صریح جادو ہے۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اُس وقت ہم پھر زندہ کر کے اُٹھا کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباؤ اجداد بھی اُٹھائے جائیں گے؟" ان سے کہو ہاں، اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو۔ بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں گے۔ اُس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی! یہ تو یوم الجزاء ہے۔"

ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ تو عالم طلسمات کی باتیں ہیں۔ کوئی جادو کی دنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے جس میں مُردے اُٹھیں گے، عدالت ہوگی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہوں گے۔ ان کے اس قول کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا اور تم اپنے خدا کے آگے بے بس ہو۔ وہ جو کچھ بھی تمہیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے جب آج

جا یا اُس کے ایک اشارے پر تم موجود ہیں آگئے۔ جب وہ چاہے گا اُس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمہیں اُٹھا کھڑا کرے گا۔ اِس کام کا وقت جب آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کر دینا کوئی بڑا لمبا چوڑا کام نہ ہوگا۔ بس ایک ہی جھڑکی سوتوں کو جگا اٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔ "جھڑکی" کا لفظ یہاں بہت معنی خیز ہے۔ اِس سے بعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوتے پڑے تھے، یکایک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے "اُٹھ جاؤ" اور بس آن کی آن میں سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ (۸۷)

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۔ (الغاشیہ: ۱۷ تا ۲۰)

"(یہ لوگ آخرت کو نہیں مانتے) تو کیا اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟"

یعنی اگر یہ لوگ آخرت کی یہ باتیں سُن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے تو کیا خود اپنے گرد و پیش کی دُنیا پر نظر ڈال کر انہوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ اُونٹ کیسے بن گئے؟ یہ آسمان کیسے بلند ہو گیا؟ یہ پہاڑ کیسے قائم ہو گئے؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی تھیں اور بنی ہوئی اِن کے سامنے موجود ہیں تو قیامت کیوں نہیں آسکتی؟ آخرت میں ایک دوسری دُنیا کیوں نہیں بن سکتی؟ دوزخ اور جنت کیوں نہیں ہو سکتیں؟ یہ تو ایک بے عقل اور بے فکر آدمی کا کام ہے کہ دُنیا میں آنکھیں کھولتے ہی جن چیزوں کو اُس نے موجود پایا ہے اُن کے متعلق تو وہ یہ سمجھ لے کہ اُن کا وجود میں آنا تو ممکن ہے کیونکہ وہ وجود میں آئی ہوتی ہیں، مگر جو چیزیں اُس کے مشاہدے اور تجربے میں ابھی نہیں آئی ہیں اُن کے بارے میں وہ بے تکلف یہ فیصلہ صادر کر دے کہ اُن کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اُس کے دماغ میں اگر عقل ہے تو اُسے سوچنا چاہیے کہ جو کچھ موجود ہے یہ آخر کیسے وجود میں آ گیا؟ یہ اُونٹ ٹھیک اُن خصوصیات کے مطابق کیسے بن گئے جن خصوصیات کے جانوروں کی عرب کے صحرا میں رہنے والے انسانوں کو ضرورت تھی؟ یہ آسمان کیسے بن گیا جس کی فضا میں سانس لینے کے لیے ہوا بھری ہوئی ہے، جس کے بادل بارش لے کر آتے ہیں، جس کا سُورج دن کی روشنی اور گرمی فراہم کرتا ہے، جس کے چاند اور تارے رات کو چمکتے ہیں؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی جس پر انسان رہتا بستا ہے، جس کی پیداوار سے اُس کی تمام ضروریات پُوری ہوتی ہیں، جس کے چشموں اور کنوؤں پر اس کی زندگی کا انحصار ہے؟ یہ پہاڑ زمین کی سطح پر کیسے اُبھر آئے جو رنگ برنگ کی مٹی اور پتھر اور طرح طرح کی معدنیات لیے ہوئے جمے کھڑے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مطلق، صانعِ حکیم کی

کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے؟ کوئی سوچنے اور سمجھنے والا دماغ اِس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا۔ وہ اگر ضدّی اور ہٹ دھرم نہیں ہے تو اُسے ماننا پڑے گا کہ ان میں سے ہر چیز ناممکن تھی اگر کسی زبردست قدرت اور حکمت والے نے اُسے ممکن نہ بنایا ہوتا۔ اور جب ایک قادر کی قدرت سے دُنیا کی اِن چیزوں کا بننا ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جن چیزوں کے آئندہ وجود میں آنے کی خبر دی جا رہی ہے اُن کو بعید از امکان سمجھا جاتے۔ (۸۸)

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ - ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ - فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ - أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ - (القیٰمۃ - ۴۰) .

"کیا انسان ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحمِ مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے۔ پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے؟"

یہ حیات بعد موت کے امکان کی ایک اور دلیل تھی جو کفّار کے سامنے پیش کی گئی۔ جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق تھا جو یہ مانتے تھے کہ ابتدائی نطفے سے تخلیق کا آغاز کر کے پورا انسان بنا دینے تک کا سارا فعل اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہے، ان کے لیے تو فی الحقیقت اِس دلیل کا کوئی جواب تھا ہی نہیں، کیونکہ وہ خواہ کتنی ہی ڈھٹائی برتتے، ان کی عقل یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی تھی کہ جو خدا اس طرح انسان کو دنیا میں پیدا کرتا ہے وہ دوبارہ بھی اسی انسان کو وجود میں لے آنے پر قادر ہے۔ لیکن جو دہریے اِس صریح حکیمانہ فعل کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے تھے، وہ زبان سے چاہے کتنی ہی ہٹ دھرمی کا اظہار کرتے، حقیقت میں اُن کے لیے اِس بات کی کوئی توجیہ ممکن نہ تھی کہ آغازِ آفرینش سے آج تک دنیا کے ہر حصّے اور ہر قوم میں کس طرح ایک ہی نوعیت کے تخلیقی فعل کے نتیجے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش مسلسل اِس تناسب سے ہوتی چلی جا رہی ہے کہ کہیں کسی زمانے میں بھی ایسا نہیں ہُوا کہ کسی انسانی آبادی میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جائیں اور آئندہ اُس کی نسل چلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ وہ خواہ کتنے ہی ڈھیٹ ہوتے، بہرحال ان کے لیے یہ دعوٰی کرنا ممکن نہ تھا کہ یہ بھی اتفاقاً ہی ہوتے چلا جا رہا ہے۔ اور جب ایک دفعہ ان کے دل یہ گواہی دے دیتے کہ یہ سب کچھ ایک صانعِ حکیم کی حکمت اور کاریگری کا کرشمہ ہے تو اُن کے لیے یہ ماننے بغیر کوئی چارہ نہ تھا کہ وہی دانا کاریگر اپنی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا سکتا ہے۔ (۸۹)

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝ (الطارق - ۵ تا ۸)

"پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اُچھلنے والے پانی سے

پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے یقیناً وہ (خالق) اُسے دوبارہ
پیدا کرنے پر قادر ہے۔"

یعنی انسان ذرا اپنی ہستی ہی پر غور کر لے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ آخر وہ کون ہے جو ماں اور باپ کی
بہت سی مواصلتوں میں سے کسی ایک کو استقرارِ حمل کا ذریعہ بنا دیتا ہے اور اسے ایک خاص انسان کی پیدائش
کا سبب بنا تا ہے؟[1] پھر کون ہے جو استقرارِ حمل کے بعد سے ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ نشو و نما دے کر اُسے
اِس حد کو پہنچاتا ہے کہ وہ ایک زندہ بچے کی شکل میں پیدا ہو؟ پھر کون ہے جو رحمِ مادر ہی میں اُس کے جسم کی ساخت
اور اس کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کا تناسب قائم کر دیتا ہے؟ پھر کون ہے جو پیدائش سے لے کر موت کے وقت
تک اُس کی مسلسل نگہبانی کرتا رہتا ہے؟ اُسے بیماریوں سے بچاتا ہے۔ حادثات سے بچاتا ہے۔ طرح طرح کی
آفات سے بچاتا ہے۔ اُس کے لیے زندگی کے اِتنے ذرائع بہم پہنچاتا ہے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اور اُس کے
لیے ہر قدم پر دنیا میں باقی رہنے کے وہ مواقع فراہم کرتا ہے جن میں سے اکثر کا اُسے شعور تک نہیں ہوتا کجا

[1] یہ مسئلہ اُس وقت کے عربوں کے لیے جتنا پیچیدہ تھا اُس سے بدرجہا زیادہ پیچیدہ جدید علمی تحقیقات کی بدولت آج
اِس زمانے کے لوگوں کے لیے ہو گیا ہے۔ اب جو انکشافات ہوتے ہیں اُن کی رُو سے مرد اور عورت کی ازدواجی
زندگی کے دوران میں اربوں جرثومے (Sperm) مرد کے جسم سے خارج ہو کر عورت کے جسم میں داخل ہوتے
ہیں، اور عورت کے اندر بھی بیرون تک ایسے بیضے (Ova) مسلسل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن میں سے ہر بیضے میں
مرد کے کسی ایک جرثومے کے ساتھ مل جانے سے استقرارِ حمل کی استعداد موجود ہوتی ہے۔ پھر یہ سب یکساں بھی نہیں ہیں بلکہ
ہر جرثومہ اور ہر بیضہ بالکل جداگانہ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، اور ان کے ہر جوڑے کی مواصلت سے ایک خاص قسم کا
انسان پیدا ہو سکتا ہے جو لازماً کسی دوسرے جوڑے کی مواصلت سے پیدا ہونے والے انسان سے مختلف ہوگا۔ سوال
یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے والا آخر کون ہے کہ مرد کے بے شمار جرثوموں میں کس جرثومے کو عورت کے بہت سے بیضوں میں سے
کس بیضے کے ساتھ ملا کر کس وقت کس قسم کا انسان پیدا کیا جائے؟ مرد اور عورت دونوں اس معاملے میں بالکل بے اختیار ہیں۔
کوئی حکیم یا ڈاکٹر بھی اِس میں قطعاً دخل انداز نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ کسی جرثومے کا کسی بیضے کے ساتھ مل جانا محض ایک
اتفاقی امر ہے کیونکہ اس حیرت انگیز تخلیقی عمل کے نتیجے میں مختلف بلکہ متضاد قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں وہ انسانی تاریخ
کے لا انتہا ادوار میں فیصلہ کن اثر رکھتے ہیں، اور یہ اثر ایسی مدبرانہ حکمتوں کے ساتھ مترتب ہوتا ہے جن کی بدولت انسان کے ذہن میں یہ تصور پیدا
ہو اگر تاریخ کا کوئی فلسفہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر انسان کسی کی حکمت کے بغیر الل ٹپ پیدا ہوا کرتے تو ان کی تاریخ کے کسی فلسفے کا تصور ہرگز نہ کیا جا سکتا۔
لہٰذا یہ مانے بغیر چارہ ہی نہیں ہے کہ اس پچھلے سوتے پانی سے انسانوں کی تخلیق ایک خداوندِ حکیم و دانا ہی اپنے خاص منصوبے کے مطابق کر رہا ہے۔

(حاشیہ از مؤلف)

وہ انہیں خود فراہم کرنے پر قادر ہو گیا یہ سب کچھ ایک خدا کی تدبیر اور نگرانی کے بغیر ہو رہا ہے؟ اگر کوئی صاحب عقل آدمی اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا تو یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ جس طرح وہ انسان کو وجود میں لاتا ہے اور استقرار حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی نگہبانی کرتا ہے، یہی اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ وہ اُسے موت کے بعد پلٹا کر پھر وجود میں لا سکتا ہے۔ اگر وہ پہلی چیز پر قادر تھا اور اُسی قدرت کی بدولت انسان اس وقت دُنیا میں زندہ موجود ہے، تو آخر کیا معقول دلیل یہ گمان کرنے کے لیے پیش کی جا سکتی ہے کہ دوسری چیز پر وہ قادر نہیں ہے۔ اِس قدرت کا انکار کرنے کے لیے آدمی کو سرے سے اِس بات ہی کا انکار کرنا ہوگا کہ خدا اُسے وجود میں لایا ہے، اور جو شخص اِس کا انکار کر سکتا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ ایک روز اُس کے دماغ کی خرابی اُس سے یہ دعویٰ بھی کرا دے کہ دُنیا کی تمام کتابیں ایک حادثے کے طور پر چھپ گئی ہیں، دنیا کے تمام شہر ایک حادثے کے طور پر بن گئے ہیں، اور زمین پر کوئی اتفاقی حادثہ ایسا ہو گیا تھا جس سے تمام کارخانے بن کر خود بخود چلنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کے جسم کی بناوٹ اور اس کے اندر کام کرنے والی قوتوں اور صلاحیتوں کا پیدا ہونا اور اس کا ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے باقی رہنا اُن تمام کاموں سے بدرجہا زیادہ پیچیدہ عمل ہے جو انسان کے ہاتھوں دنیا میں ہوتے اور ہو رہے ہیں۔ اتنا بڑا پیچیدہ عمل اِس حکمت اور تناسب اور تنظیم کے ساتھ اگر اتفاقی حادثے کے طور پر ہزاروں لاکھوں برس تک ایک تسلسل کے ساتھ ہو سکتا ہے تو پھر کونسی چیز ہے جسے ایک دماغی مریض حادثہ نہ کہہ سکے؟ (۹۰)

بَلْ عَجِبُوٓا أَن جَآءَهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ ٱلْكَـٰفِرُونَ هَـٰذَا شَىْءٌ عَجِيبٌ ۝ أَءِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۖ ذَٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنقُصُ ٱلْأَرْضُ مِنْهُمْ ۖ وَعِندَنَا كِتَـٰبٌ حَفِيظٌۢ۔ (ق: ۲تا۴)

"بلکہ اِن لوگوں کو تعجب اِس بات پر ہُوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود انہی میں سے اِن کے پاس آگیا۔ پھر منکرین کہنے لگے "یہ تو عجیب بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اُٹھائے جائیں گے؟) یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے۔" (حالانکہ) زمین اِن کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔"

اُن لوگوں کو پہلا تعجب تو اس بات پر تھا کہ اُنہی کی جنس اور قوم کے ایک فرد نے اُٹھ کر دعویٰ کیا تھا کہ مَیں خدا کی طرف سے تمہیں خبردار کرنے کے لیے آیا ہُوں۔ اس کے بعد مزید تعجب انہیں اِس بات پر ہُوا کہ وہ شخص انہیں جس چیز سے خبردار کر رہا تھا وہ یہ تھی کہ تمام انسان مرنے کے بعد از سرِ نَو زندہ کیے جائیں گے، اور ان

سب کو اکٹھا کر کے اللہ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اور وہاں ان کے اعمال کا محاسبہ کرنے کے بعد جزا اور سزا دی جائے گی۔ اِس پر فرمایا گیا کہ یہ بات اگر ان لوگوں کی عقل میں نہیں سماتی تو یہ اِن کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے۔ اِس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اللہ کا علم اور اس کی قدرت بھی تنگ ہو جائے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک مرنے والے بے شمار انسانوں کے اجزائے جسم جو زمین میں بکھر چکے ہیں اور آئندہ بکھرتے چلے جائیں گے اُن کو جمع کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ہر جُز جس شکل میں جہاں بھی ہے، اللہ تعالیٰ براہِ راست اُس کو جانتا ہے اور مزید برآں اُس کا پورا ریکارڈ اللہ کے دفتر میں محفوظ کیا جا رہا ہے جس سے کوئی ایک ذرہ بھی چھوٹا ہوا نہیں ہے۔ جس وقت اللہ کا حکم ہو گا اُسی وقت آناً فاناً اُس کے فرشتے اس ریکارڈ سے رجوع کر کے ایک ایک ذرے کو نکال لائیں گے اور تمام انسانوں کے وہی جسم پھر بنا دیں گے جن میں رہ کر اُنہوں نے دُنیا کی زندگی میں کام کیا تھا۔

یہ آیت بھی منجملہ اُن آیات کے ہے جن میں اِس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ آخرت کی زندگی نہ صرف یہ کہ ویسی ہی جسمانی زندگی ہوگی جیسی اِس دنیا میں ہے، بلکہ جسم بھی ہر شخص کا وہی ہوگا جو اِس دُنیا میں تھا۔ اگر حقیقت یہ نہ ہوتی تو کفار کی بات کے جواب میں یہ کہنا بالکل بے معنی تھا کہ زمین تمہارے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ذرے ذرے کا ریکارڈ موجود ہے۔ (۹۱)

أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ۔ (قٓ ۔ ۱۵)

"تو کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں"

چند مختصر الفاظ میں یہ ایسی صاف اور سیدھی بات منکرینِ آخرت کے مقابلے میں پیش کی گئی تھی جو ہر معقول آدمی کے دماغ میں پیوست ہو گئی ہو گی۔ کوئی شخص اگر خدا کا منکر نہ ہو اور حماقت کی اس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اِس منظم کائنات اور اِس کے اندر انسان کی پیدائش کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے لگے، اس کے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ خدا ہی نے ہمیں اور اِس پوری کائنات کو بنایا ہے۔ اب یہ امرِ واقعہ کہ ہم اِس دنیا میں موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، آپ ہی اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اِس کائنات کو پیدا کرنے سے عاجز نہ تھا۔ اِس کے بعد اگر کوئی کہتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے بعد وہی خدا ایک دوسرا نظامِ عالم نہ بنا سکے گا، اور موت کے بعد وہ ہمیں پھر پیدا نہ کر سکے گا، تو وہ محض ایک خلافِ عقل بات کہتا ہے۔ خدا عاجز ہوتا تو پہلے ہی پیدا نہ کر سکتا۔ جب وہ پہلے پیدا کر چکا ہے اور اُسی تخلیق کی بدولت ہم خود وجود میں آئے بیٹھے ہیں، تو یہ فرض کر لینے کے لیے آخر کیا معقول بنیاد ہو سکتی ہے

کر اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا دینے سے وہ عاجز ہو جائے گا۔ (۹۲)

آخرت کے وجوب کے دلائل

قرآن میں صرف اِس پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ ناقابلِ انکار دلائل سے آخرت کا ممکن ہونا ثابت کر دیا گیا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی ثابت کیا گیا کہ اُس کا برپا ہونا ضروری ہے۔ عقل چاہتی ہے، انصاف چاہتا ہے، اخلاق کے تقاضے چاہتے ہیں کہ آخرت ہو اور اُس میں انسان کے تمام اُن اعمال کا محاسبہ کیا جائے جو اُس نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے مرتے دم تک کیے، اور اپنے پیچھے اپنے اُن اعمال کے ایسے اچھے یا بُرے اثرات چھوڑ گیا جو بعد میں مدتہائے دراز تک آنے والی نسلوں کو متاثر کرتے رہے۔ یہ محاسبہ نہ ہو، اور اچھے اعمال کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا نہ ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی یہ دنیا انصاف سے خالی ہے، اور انسان کو یہاں عقل و شعور دے کر، اخلاق کے خیر و شر کی تمیز دے کر، اور بے شمار اشیاء اور دوسرے انسانوں پر اختیارات دے کر فضول اور بے معنی ہی پیدا کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک دنیا کی موجودہ زندگی کا تعلق ہے، اِس میں نہ پورا محاسبہ ممکن ہے، نہ پورا انصاف، اور نہ پوری جزا و سزا۔ اِس لیے لازماً ایک دوسرا عالم برپا ہونا چاہیے جس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک وجود میں آنے والے تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کیا جائے، تمام کھلے اور چھپے اعمال کا اور اُن سے پیدا ہونے والے نتائج کا محاسبہ کر کے ایک ایک شخص کی ذمہ داری متعین کی جائے، اور اُس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ ابدی ہو تاکہ جو شخص جتنی سزا کا مستحق ہے وہ پوری بھگت سکے اور جتنے انعام و اکرام کا مستحق ہے وہ اسے پورا دیا جا سکے۔

اس مضمون کو قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا تاکہ کفار کے پاس انکارِ آخرت کے لیے کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ (۹۳)

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۔ (القیٰمۃ: ۳۶)

"کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟"

عربی زبان میں اِبِلٌ سُدًی اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو یونہی چھوٹا پھر رہا ہو۔ جدھر چاہے چرتا پھرے۔ کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ اسی معنی میں ہم شترِ بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شترِ بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اُسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہو؟ کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو؟ کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو؟ اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اُس کے اعمال کی باز پُرس کی جائے؟ یہی بات ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید میں اس طرح بیان کی گئی کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ "کیا تم نے

یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر آنا نہیں ہے؟" (المؤمنون ۱۱۵)

اِن دونوں مقامات پر زندگی بعدِ موت کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے؟ کیا تمہیں اپنے اور جانوروں میں یہ کھلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے، اور تم با اختیار، اُس کے افعال میں اخلاقی حُسن و قبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمہارے افعال میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے؟ پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح جانور غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ ہیں اُسی طرح تم بھی ہو؟ جانور کے دوبارہ زندہ کر کے نہ اُٹھائے جانے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ اُس نے صرف اپنی جبلّت کے لگے بندھے تقاضے پورے کیے ہیں، اپنی عقل سے کام لے کر کوئی فلسفہ تصنیف نہیں کیا، کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا، کسی کو معبود نہیں بنایا نہ خود کسی کا معبود بنا، کوئی کام ایسا نہیں کیا جسے نیک یا بد کہا جا سکتا ہو، کوئی اچھی یا بُری سنّت جاری نہیں کی جس کے اثرات نسل در نسل چلتے رہیں اور وہ اُن پر کسی اجر یا سزا کا مستحق ہو۔ لہٰذا وہ اگر مر کر فنا ہو جائے تو یہ سمجھ میں آنے کے قابل بات ہے، کیونکہ اُس پر اپنے کسی عمل کی ذمہ داری عائد ہی نہیں ہوتی جس کی باز پُرس کے لیے اُسے دوبارہ زندہ کر کے اُٹھانے کی کوئی حاجت ہو۔ لیکن تم حیات بعدِ موت سے کیسے معاف کیے جا سکتے ہو جبکہ عین اپنی موت کے وقت تک تم ایسے اخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزا و سزا کے مستوجب ہونے کا تمہاری عقل خود حکم لگاتی ہے؟ جس آدمی نے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور فوراً ہی کسی حادثے کا شکار ہو گیا، کیا تمہارے نزدیک اس کو بالکل (Scot free) چھوٹ جانا چاہیے اور اس ظلم کا بدلہ اُسے کبھی نہ ملنا چاہیے؟ جو آدمی دنیا میں کسی ایسے فساد کا بیج بو گیا جس کا خمیازہ اُس کے بعد صدیوں تک انسانی نسلیں بھگتتی رہیں، کیا تمہاری عقل واقعی اس بات پر مطمئن ہے کہ اُسے بھی کسی پتنگے یا ٹڈّے کی طرح مر کر فنا ہو جانا چاہیے اور کبھی اُٹھ کر اپنے اُن کرتوتوں کی جواب دہی نہیں کرنی چاہیے جن کی بدولت ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیاں خراب ہوئیں؟ جس آدمی نے عمر بھر حق و انصاف اور خیر و صلاح کے لیے اپنی جان لڑائی اور جیتے جی مصیبتیں ہی بھگتتا رہا، کیا تمہارے خیال میں وہ بھی حشرات الارض ہی کی قسم کی کوئی مخلوق ہے جسے اپنے اِس عمل کی جزا پانے کا کوئی حق نہیں ہے؟ [illegible]

لَآ أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۔ (القیامۃ: ۱-۲)

"نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے روز کی، اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔"

یعنی تمہارا خیال غلط ہے کہ قیامت نہیں آئے گی۔ میں قسم کھاتا ہوں قیامت کی اور ملامت کرنے والے نفس کی کہ وہ ضرور آئے گی۔

اِس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم جس بات پر کھائی تھی اُسے بیان نہیں کیا، کیونکہ بعد کا فقرہ خود اُس پر دلالت کر رہا تھا۔ قسم اِس بات پر کھائی گئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا اور وہ ایسا کرنے پر پُوری طرح قادر ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ اِس بات پر اِن دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی؟ یہ مناسبت سوچنے سمجھنے والے انسان کے لیے اُس وقت جتنی واضح تھی اس سے زیادہ آج واضح ہے۔

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اُس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا آنا یقینی ہے۔ پُوری کائنات کا نظام اِس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ اِس کی نوعیت ہی خود یہ بتا رہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ انسان کی عقل پہلے بھی اِس گمان بے اصل کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہ پاتی تھی کہ یہ ہر آن بدلنے والی دنیا کبھی قدیم اور غیر فانی بھی ہو سکتی ہے لیکن جتنا جتنا اِس دنیا کے متعلق انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اُتنا ہی زیادہ یہ امر خود انسان کے نزدیک بھی یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اِس ہنگامۂ ہستی و بُود کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا، اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد یہ نہ رہیگا۔ اِس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت ہی کی قسم کھائی ہے، اور یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے ہم کسی شکّی انسان کو، جو اپنے موجود ہونے ہی میں شک کر رہا ہو، خطاب کر کے کہیں کہ تمہاری جان کی قسم تم موجود ہو، یعنی تمہارا وجود خود تمہارے موجود ہونے پر شاہد ہے۔

لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اُس کے بعد پھر انسان دوبارہ اُٹھایا جائے گا اور اُس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا اور وہ اپنے کیے کا اچھا یا بُرا نتیجہ دیکھے گا، تو اِس کے لیے دوسری قسم نفسِ لوّامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اِس ضمیر میں لازماً بھلائی اور بُرائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے، اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اُس کا ضمیر اُسے کوئی بُرائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے قطع نظر اِس سے کہ اُس نے بھلائی اور بُرائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نِرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے، اُس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور بُرائی کی تمیز پائی جاتی ہے، وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے، اور جس بُرائی کا ارتکاب اُس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو اُس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دبا کر خوش بھی ہو لے، تو اِس کے برعکس صورت میں، جبکہ اُسی بُرائی کا ارتکاب کسی دوسرے نے اُس کے ساتھ کیا ہو، اُس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اِس زیادتی کا مرتکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔ اب اگر انسان کے وجود میں

اس طرح کے نفسِ لوامہ کی موجودگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہی نفسِ لوامہ زندگی بعد موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے اور بُرے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے اُن کی جزا یا سزا اُس کو ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعد موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پُورا نہیں ہو سکتا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اِس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرنے کے بعد اگر آدمی معدوم ہو جائے تو اُس کی بہت سی بھلائیاں ایسی ہیں جن کے اجر سے وہ لازماً محروم ہو کر رہ جائے گا، اور اُس کی بہت سی بُرائیاں ایسی ہیں جن کی منصفانہ سزا پانے سے وہ ضرور بچ نکلے گا۔ اس لیے جب تک آدمی اس بیہودہ بات کا قائل نہ ہو کہ عقل رکھنے والا انسان ایک غیر معقول نظامِ کائنات میں پیدا ہو گیا ہے اور اخلاقی احساسات رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں جنم لے بیٹھا ہے جو بنیادی طور پر اپنے پُورے نظام میں اخلاق کا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی، اُس وقت تک وہ حیات بعد موت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تناسخ یا آواگون کا فلسفہ بھی فطرت کے اِس مطالبے کا جواب نہیں ہے کیونکہ اگر انسان اپنے اخلاقی اعمال کی سزا یا جزا پانے کے لیے پھر اسی دُنیا میں جنم لیتا چلا جائے تو ہر جنم میں وہ پھر کچھ مزید اخلاقی اعمال کرتا چلا جائیگا جو نئے سرے سے جزا و سزا کے متقاضی ہوں گے اور اِس لامتناہی سلسلے میں بجائے اِس کے کہ اُس کا حساب کبھی چُک سکے، اُلٹا اُس کا حساب بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اِس لیے فطرت کا یہ تقاضا صرف اِسی صورت میں پُورا ہوتا ہے کہ اِس دُنیا میں انسان کی صرف ایک ہی زندگی ہو، اور پھر پوری نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ایک دوسری زندگی ہو جس میں انسان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک حساب کر کے اسے پُوری جزا اور سزا دے دی جائے۔ (٩٥)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۔ (ص ۔ ٢٧، ٢٨)

"ہم نے اِس آسمان اور زمین کو، اور اِس دنیا کو جو اُن کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے۔ یہ تو اُن لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا ہے، اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں، یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں؟"

یعنی اِس کائنات کو ہم نے محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ہے کہ اِس میں کوئی حکمت نہ ہو، کوئی غرض اور مقصد نہ ہو، کوئی عدل اور انصاف نہ ہو، اور کسی اچھے یا بُرے فعل کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ انسان

دنیا یہاں شتر بے مہار کی طرح نہیں چھوڑ دیا گیا ہے اور یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے کہ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے اور اُس پر کوئی باز پُرس نہ ہو۔ جو شخص جزا و سزا کا قائل نہیں ہے اور اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ نیک و بد سب آخر کار مر کر مٹی ہو جائیں گے، کسی سے کوئی محاسبہ نہ ہوگا، نہ کسی کو بھلائی یا بُرائی کا کوئی بدلہ ملے گا، وہ دراصل دُنیا کو ایک کھلونا اور اس کے بنانے والے کو کھلنڈرا سمجھ رہا ہے اور اُس کا خیال یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے دُنیا بنا کر اور اس میں انسان کو پیدا کر کے ایک فعلِ عبث کا ارتکاب کیا ہے۔ کیا فی الحقیقت تمہارے نزدیک یہ بات معقول ہے کہ نیک اور بد دونوں آخر کار یکساں ہو جائیں؟ کیا یہ تصوّر تمہارے لیے اطمینان بخش ہے کہ کسی نیک انسان کو اُس کی نیکی کا کوئی صلہ اور کسی بد آدمی کو اس کی بدی کا کوئی بدلہ نہ ملے؟ ظاہر بات ہے کہ اگر آخرت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی محاسبہ نہ ہو اور انسانی افعال کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو اس سے اللہ کی حکمت اور اُس کے عدل دونوں کی نفی ہو جاتی ہے اور کائنات کا پورا نظام ایک اندھا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ اِس مفروضے پر تو دُنیا میں بھلائی کے لیے کوئی محرّک اور بُرائی سے روکنے کے لیے کوئی مانع سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ خدا کی خدائی اگر معاذ اللہ ایسی ہی اندھیر نگری ہو تو پھر وہ شخص بے وقوف ہے جو اِس زمین پر تکلیفیں اٹھا کر خود صالح زندگی بسر کرتا ہے اور خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کرتا ہے، اور وہ شخص عقل مند ہے جو سازگار مواقع پا کر ہر طرح کی زیادتیوں سے فائدے سمیٹتا اور ہر قسم کے فسق و فجور سے لُطف اندوز ہوتا ہے۔ (۹۶)

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ (التغابن۔ ۷)

"منکرین نے بڑے دعوے سے کہا کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اُٹھائے جائیں گے۔ ان سے کہو نہیں، میرے رب کی قسم تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، پھر ضرور تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے (دُنیا میں) کیا کچھ کیا ہے، اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔"

اگرچہ کسی منکرِ آخرت کے پاس نہ پہلے یہ جاننے کا کوئی ذریعہ تھا، نہ آج ہے، نہ کبھی ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، لیکن ان لوگوں نے ہمیشہ بڑے زور کے ساتھ یہی دعویٰ کیا ہے۔ حالانکہ قطعیّت کے ساتھ آخرت کا انکار کر دینے کے لیے نہ کوئی عقلی بنیاد موجود ہے نہ علمی بنیاد۔

اُن کی اِس بات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نبیؐ سے فرمایا کہ تم ہماری قسم کھا کر کہو کہ تم لوگ ضرور اُٹھائے جاؤ گے اور ضرور تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ تم دنیا میں کیا کر کے آئے ہو۔ قرآن مجید میں یہ تیسرا مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا ہے کہ اپنے رب کی قسم کھا کر لوگوں سے کہو کہ ضرور ایسا ہو کر رہے گا۔ پہلے سورۂ یونس میں فرمایا "وہ پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ حق ہے؟ کہو، میرے رب کی قسم یہ یقیناً حق ہے اور تم

اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو" (آیت ۵۳)۔ پھر سورۂ سبا میں فرمایا "منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آ رہی ہے! کہو، قسم ہے میرے رب کی وہ تم پر آ کر رہے گی" (آیت ۳)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک منکرِ آخرت کے لیے آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ اُسے آخرت کے آنے کی خبر قسم کھا کر دیں یا قسم کھائے بغیر دیں؟ وہ جب اس چیز کو نہیں مانتا تو محض اس بنا پر کیسے مان لے گا کہ آپ قسم کھا کر اُس سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ تھے جو اپنے ذاتی علم اور تجربے کی بنا پر یہ بات خوب جانتے تھے کہ آپ کی زبان سے عمر بھر کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں نکلی ہے، اس لیے چاہے زبان سے وہ آپ کے خلاف کیسے ہی بہتان گھڑتے رہے ہوں، اپنے دلوں میں وہ یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ ایسا سچا انسان کبھی خدا کی قسم کھا کر وہ بات کہہ سکتا ہے جس کے برحق ہونے کا اُسے یقینِ کامل نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آپ محض آخرت کا عقیدہ ہی بیان نہیں کر رہے تھے بلکہ اُس کے لیے نہایت معقول دلائل بھی پیش فرما رہے تھے۔ مگر جو چیز نبی اور غیر نبی کے درمیان فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک غیر نبی آخرت کے حق میں جو مضبوط سے مضبوط دلائل دے سکتا ہے اُن کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس یہی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے نہ ہونے کی بہ نسبت اس کا ہونا معقول تر اور اغلب (Most Probable) تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے برعکس نبی کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالاتر ہے۔ اُس کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ عقلی استدلال سے وہ اس نتیجے پر پہنچا ہو کہ آخرت ہونی چاہیے، بلکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھتا ہے کہ آخرت ہوگی اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ضرور ہو کر رہے گی۔ اس لیے ایک نبی ہی قسم کھا کر یہ بات کہہ سکتا ہے۔ ایک فلسفی اپنے کسی قول پر بھی قسم نہیں کھا سکتا۔ اور آخرت پر ایمان ایک نبی کے بیان ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ فلسفی کا استدلال اپنے اندر یہ قوت نہیں رکھتا کہ دوسرا شخص تو درکنار فلسفی خود بھی اپنی دلیل کی بنا پر اُسے اپنا ایمانی عقیدہ بنا سکے۔ فلسفی اگر واقعی صحیح الفکر فلسفی ہو تو "ہونا چاہیے" سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ "ہے اور یقیناً ہے" کہنا صرف ایک نبی کا کام ہے۔

پھر قسم کھا کر صرف یہی نہیں کہا گیا کہ مرنے کے بعد تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ اُس وقت ضرور تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ دنیا میں تم کیا کر کے آئے ہو۔ یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے بنی آدم کو مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھایا جائے گا، اور اسی میں اس سوال کا جواب بھی آ گیا کہ ایسا کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔ اس برحق کائنات میں جس مخلوق کو کفر و ایمان میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہو، اور جسے اس دنیا میں بہت سی چیزوں پر تصرّف کا اقتدار بھی عطا کیا گیا ہو، اور جس نے کفر یا ایمان کی راہ اختیار کر کے عمر بھر اپنے اس اقتدار کو صحیح یا غلط طریقے سے استعمال کر کے بہت سی بھلائیاں یا بہت سی بُرائیاں خود

اپنی ذمہ داری پر کی ہوں، اُس کے بارے میں یہ تصور کرنا انتہائی غیر معقول ہے کہ یہ سب کچھ جب وہ کر چکے تو آخر کار بھلے کی بھلائی اور بُرے کی بُرائی، دونوں بے نتیجہ رہیں اور سرے سے کوئی وقت ایسا آئے ہی نہیں جب اِس مخلوق کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو۔ جو شخص ایسی غیر معقول بات کہتا ہے وہ لامحالہ دو حماقتوں میں سے ایک حماقت کا ارتکاب کرتا ہے۔ یا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات ہے تو مبنی بر حکمت، مگر یہاں انسان جیسی با اختیار مخلوق کو غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک اَلل ٹپ بنی ہوئی کائنات ہے جسے بنانے میں سرے سے کسی حکیم کی حکمت کارفرما نہیں ہے۔ پہلی صورت میں وہ ایک متناقض بات کہتا ہے کیونکہ مبنی بر حکمت کائنات میں ایک با اختیار مخلوق کا غیر ذمہ دار ہونا صریحًا خلافِ عقل و حکمت ہے۔ اور دوسری صورت میں وہ اِس بات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتا کہ ایک اَلل ٹپ بنی ہوئی بے حکمت کائنات میں انسان جیسی ذی عقل مخلوق کا وجود میں آنا آخر کیسے ممکن ہُوا؟ اور اُس کے ذہن میں عدل و انصاف کا تصور کہاں سے آگیا؟ بے عقل سے عقل کی پیدائش اور بے عدلی سے عدل کا تصور برآمد ہو جانا ایک ایسی بات ہے جس کا قائل یا تو ایک ہٹ دھرم آدمی ہو سکتا ہے یا پھر وہ جو بہت زیادہ فلسفہ بگھارنے کے بگھارتے دماغی مریض ہو چکا ہو۔

پھر یہ فرمایا کہ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے، یہ آخرت کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل آخرت کے ضروری ہونے کی تھی اور یہ دلیل اس کے ممکن ہونے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس خدا کے لیے کائنات کا اتنا بڑا نظام بنا دینا دُشوار نہ تھا اور جس کے لیے اِس دُنیا میں انسانوں کو پیدا کرنا دُشوار نہیں ہے، اس کے لیے یہ بات آخر کیوں دُشوار ہو گی کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے اپنے سامنے حاضر کرے اور اُن کا حساب لے؟ (97)

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ۝ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ ۝ فَأْتُوا بِآبَائِنَا
إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ أَهْلَكْنَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ
كَانُوا مُجْرِمِينَ ۝ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ۝ مَا خَلَقْنَاهُمَا
إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ۔

(الدُّخان ۳۴ تا ۴۰)

"یہ لوگ کہتے ہیں "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں، اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں۔ اگر تم سچے ہو تو اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو" یہ بہتر ہیں یا تُبّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے اُن کو اِس بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے۔ یہ آسمان و زمین اور اُن کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ اِن کو ہم نے برحق پیدا

کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ان سب کے اُٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے۔"

کفار کا کہنا یہ تھا کہ پہلی دفعہ جب ہم مریں گے تو بس فنا ہو جائیں گے۔ اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے۔ "پہلی موت" کے الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے بعد کوئی دوسری موت بھی ہو۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو اس قول کے صادق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بعد لازماً دوسرا بچہ ہو، بلکہ صرف یہ کافی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی بچہ نہ ہُوا ہو۔ اس لیے کفار "پہلی موت" کا لفظ اس معنی میں استعمال نہیں کرتے تھے کہ اس کے بعد کوئی زندگی اور پھر کوئی دوسری موت ہو، بلکہ وہ پہلی موت کو جو اس دنیا میں آتی ہے ایک ہی اور آخری موت سمجھتے تھے۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ ہم نے کبھی مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی اُٹھتے نہیں دیکھا ہے، اِس لیے ہم یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی۔ تم لوگ اگر دعوٰی کرتے ہو کہ دوسری زندگی ہوگی تو ہمارے آباء و اجداد کو قبروں سے اٹھا لاؤ تاکہ ہمیں زندگی بعدِ موت کا یقین آ جائے۔ یہ کام تم نے نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تمہارا دعوٰی بے بنیاد ہے۔ یہ گویا اُن کے نزدیک حیات بعد الموت کی تردید میں بڑی پختہ دلیل تھی۔ حالانکہ سراسر مہمل تھی۔ آخر اُن سے یہ کہا کس نے تھا کہ مرنے والے دوبارہ زندہ ہو کر اسی دُنیا میں واپس آئیں گے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی مسلمان نے یہ دعوٰی کب کیا تھا کہ ہم مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں؟

اُن کے اعتراض کا پہلا جواب یہ دیا گیا کہ یہ لوگ تُبّع[1] اور اس سے پہلے گذرے ہُوئے لوگوں سے کچھ بہتر تو نہیں ہیں۔ اُن کو ہم نے اُن کے جرائم ہی کی وجہ سے تو ہلاک کیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ انکارِ آخرت وہ چیز ہے جو کسی شخص، گروہ یا قوم کو مجرم بنائے بغیر نہیں رہتی۔ اخلاق کی خرابی اس کا لازمی نتیجہ ہے اور تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ زندگی کے اس نظریے کو جس قوم نے بھی اختیار کیا وہ آخر کار تباہ ہو کر رہی۔ کفارِ مکہ تو اُس خوشحالی اور شوکت و حشمت کو پہنچ بھی نہیں سکے ہیں جو تُبّع کی قوم، اور اُس سے پہلے سبا اور قومِ فرعون اور دوسری قوموں کو حاصل رہی ہے۔ مگر یہ مادی خوشحالی اور دنیوی شان و شوکت اخلاقی زوال کے نتائج سے اُن کو کب بچا سکی تھی کہ یہ اپنی ذرا سی پُونجی اور اپنے ذرائع و وسائل کے بل بوتے پر اُن سے بچ جائیں گے۔

اُن کے اعتراض کا دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ جو شخص بھی حیات بعد الموت اور آخرت کی جزا و سزا کا منکر ہے وہ دراصل اِس کارخانۂ عالم کو کھلونا اور اس کے خالق کو نادان بچہ سمجھتا ہے۔ اسی بنا پر اُس نے یہ رائے قائم کی ہے

---

[1] تُبّع قبیلہ حِمیَر کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ سنہ ۱۱۵ قبل مسیح میں اُن کو یمن پر اقتدار حاصل ہُوا اور ۳۰۰ء تک یہ وہاں حکمران رہے۔ (تفہیم القرآن، جلد چہارم، الدخان، حاشیہ ۳۲)

کہ انسان دنیا میں ہر طرح کے ہنگامے برپا کر کے ایک روز بس یونہی مٹی میں رَل مِل جائے گا اور اُس کے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ حالانکہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کی نہیں بلکہ ایک خالقِ حکیم کی بنائی ہوئی ہے، اور کسی حکیم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ فعلِ عَبَث کا ارتکاب کرے گا۔ انکارِ آخرت کے جواب میں یہ استدلال قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔

رہا اُن کا یہ مطالبہ کہ "اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو" اِس کا جواب یہ دیا گیا کہ زندگی بعدِ موت کوئی تماشا تو نہیں ہے کہ جہاں کوئی اس سے انکار کرے، فوراً ایک مُردہ قبرستان سے اُٹھا کر اِس کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اِس کے لیے تو ربّ العالمین نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے جب تمام اوّلین و آخرین کو وہ بیک وقت زندہ کر کے اپنی عدالت میں جمع کرے گا اور ان کے مقدمات کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ تم مانو چاہے نہ مانو، یہ کام بہرحال اپنے وقتِ مقرّر ہی پر ہو گا۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کیونکہ اس طرح قبل از وقت خبردار ہو کر اُس عدالت سے کامیاب نکلنے کی تیاری کر سکو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، کیونکہ اپنی ساری عمر اِس غلط فہمی میں کھپا دو گے کہ بُرائی اور بھلائی جو کچھ بھی ہے بس اِسی دُنیا کی زندگی تک ہے، مرنے
(۹۸) کے بعد پھر کوئی عدالت نہیں ہونی ہے جس میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا کوئی مستقل نتیجہ نکلتا ہو۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝ وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (الجاثیہ: ۲۱-۲۲)

"کیا وہ لوگ جنہوں نے بُرائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ اُن کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے؟ بہت بُرے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ اللہ نے تو آسمان اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اُس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔"

یہ آخرت کے برحق ہونے پر اخلاقی استدلال ہے۔ اخلاق میں خیر و شر اور اعمال میں نیکی و بدی کے فرق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اچھے اور بُرے لوگوں کا انجام یکساں نہ ہو، بلکہ اچھوں کو ان کی اچھائی کا اچھا بدلہ ملے اور بُرے اپنی بُرائی کا بُرا بدلہ پائیں۔ یہ بات اگر نہ ہو، اور نیکی و بدی کا نتیجہ ایک ہی جیسا ہو تو سرے سے اخلاق میں خوبی و زشتی کی تمیز ہی بے معنی ہو جاتی ہے اور خدا پر بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ جو لوگ دنیا میں بدی کی راہ پر چلتے ہیں وہ تو ضرور یہ چاہتے ہیں کہ کوئی جزا و سزا نہ ہو، کیونکہ یہ تصوّر ہی اُن کے عیش کو منغّص کر دینے والا ہے لیکن خداوندِ عالم کی حکمت اور اس کے عدل سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ نیک و بد سے ایک جیسا

معاملہ کرے اور کچھ نہ دیکھے کہ مومن صالح نے دنیا میں کس طرح زندگی بسر کی ہے اور کافر و فاسق یہاں کیا گل کھلاتا رہا ہے۔ ایک شخص عمر بھر اپنے اوپر اخلاق کی پابندیاں لگاتے رہا۔ حق والوں کے حق ادا کرتا رہا۔ ناجائز فائدوں اور لذتوں سے اپنے آپ کو محروم کیے رہا۔ اور حق و صداقت کی خاطر طرح طرح کے نقصانات برداشت کرتا رہا۔ دوسرے شخص نے اپنی خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کیں۔ نہ خدا کا حق پہچانا اور نہ بندوں کے حقوق پر دست درازی کرنے سے باز آیا جس طرح سے بھی اپنے لیے فائدے اور لذتیں سمیٹ سکتا تھا سمیٹتا چلا گیا۔ کیا خدا سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ ان دونوں قسم کے آدمیوں کی زندگی کے اس فرق کو وہ نظرانداز کر دے گا؟ مرتے دم تک جن کا جینا یکساں نہیں رہا ہے، موت کے بعد اگر ان کا انجام یکساں ہو تو خدا کی خدائی میں اس سے بڑھ کر اور کیا بے انصافی ہو سکتی ہے؟

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق کھیل کے طور پر نہیں کی ہے بلکہ یہ ایک بامقصد حکیمانہ نظام ہے۔ اس نظام میں یہ بات بالکل ناقابلِ تصور ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات اور ذرائع و وسائل کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے جن لوگوں نے اچھا کارنامہ انجام دیا ہو، اور انہیں غلط طریقے سے استعمال کر کے جن دوسرے لوگوں نے ظلم و فساد برپا کیا ہو، یہ دونوں قسم کے انسان آخر کار مر کر مٹی ہو جائیں اور اس موت کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو جس میں انصاف کے مطابق ان کے اچھے اور بُرے اعمال کا کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ نکلے۔ اگر ایسا ہو تو یہ کائنات ایک کھلنڈرے کا کھلونا ہوگی نہ کہ ایک حکیم کا بنایا ہوا بامقصد نظام۔ (۹۹)

سُورۂ جاثیہ میں آیات ۱۲ تا ۲۳ کا سارا مضمون اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ آخرت کا انکار دراصل وہی لوگ کرتے ہیں جو خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنا چاہتے ہیں اور عقیدۂ آخرت کو اپنی اس آزادی میں مانع سمجھتے ہیں پھر جب وہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں تو ان کی بندگیٔ نفس اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ اپنی گمراہی میں روز بروز زیادہ ہی بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی بُرائی ایسی نہیں ہوتی جس کے ارتکاب سے وہ باز رہ جائیں۔ کسی کا حق مارنے میں انہیں تامل نہیں ہوتا۔ کسی ظلم اور زیادتی کا موقع پا جانے کے بعد ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس سے صرف اس لیے رُک جائیں گے کہ حق و انصاف کا کوئی احترام اُن کے دلوں میں ہے۔ جن واقعات کو دیکھ کر کوئی انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے، وہی اُن کی آنکھوں کے سامنے بھی آتے ہیں، مگر وہ اُن سے اُلٹا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں اور ہمیں یہی کچھ کرنا چاہیے۔ کوئی کلمۂ نصیحت اُن پر کارگر نہیں ہوتا۔ جو دلیل بھی کسی انسان کو بُرائی سے روکنے کے لیے مفید ہو سکتی ہے، وہ ان کے دل کو اپیل نہیں کرتی، بلکہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ساری دلیلیں اپنی اس بے قید

آزادی کے حق میں نکالتے چلے جاتے ہیں، اور اُن کے دل و دماغ کسی اچھی فکر کے بجائے شب و روز اپنی اغراض
و خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کرنے کی اُدھیڑ بُن ہی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ اِس بات کا صریح ثبوت ہے
کہ عقیدۂ آخرت کا انکار انسانی اخلاق کے لیے تباہ کُن ہے۔ آدمی کو آدمیت کے دائرے میں اگر کوئی
چیز رکھ سکتی ہے تو وہ صرف یہ احساس ہے کہ ہم غیر ذمّہ دار نہیں ہیں بلکہ ہمیں خدا کے حضور اپنے اعمال کی
جوابدہی کرنی ہوگی۔ اِس احساس سے خالی ہو جانے کے بعد کوئی شخص بڑے سے بڑا عالم بھی ہو تو وہ جانوروں
سے بدتر رویّہ اختیار کیے بغیر نہیں رہتا۔ (۱۰۰)

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ. مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ
تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ
إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ۝ سَلْهُمْ أَيُّهُمْ بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ۝ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا
بِشُرَكَائِهِمْ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ۔ (القلم۔ ۳۵ تا ۴۱)

"کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم
لگاتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی
کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمہارے لیے روزِ قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان
ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ اِن سے پوچھو تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟
یا پھر کیا اِن کے ٹھیرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنہوں نے اِس کا ذمّہ لیا ہو)؟ یہ بات ہے تو لائیں
اپنے شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں۔"

مکہ کے سردار مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم کو جو نعمتیں دنیا میں مل رہی ہیں یہ ہمارے مقبولِ خدا ہونے کی
علامت ہیں، اور تم جس بدحالی میں مبتلا ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم خدا کے مغضوب ہو۔ لہٰذا اگر کوئی آخرت
ہوئی بھی جیسا کہ تم کہتے ہو تو وہاں بھی ہم مزے کریں گے اور عذاب تم پر ہوگا نہ کہ ہم پر۔ اس پر فرمایا گیا کہ یہ بات
عقل کے خلاف ہے کہ خدا فرماں برداروں اور مجرموں میں تمیز نہ کرے۔ تمہاری سمجھ میں آخر کیسے یہ بات آتی ہے کہ کائنات
کا خالق کوئی اندھا راجہ ہے جو یہ نہیں دیکھے گا کہ کن لوگوں نے دنیا میں اُس کے احکام کی اطاعت کی اور بُرے
کاموں سے پرہیز کیا، اور کون لوگ تھے جو اُس سے بے خوف ہو کر ہر طرح کے گناہ اور جرائم اور ظلم و ستم کرتے رہے؟
تم نے ایمان لانے والوں کی خستہ حالی اور اپنی خوشحالی تو دیکھ لی مگر اپنے اور اُن کے اخلاق و اعمال کا فرق نہیں
دیکھا اور بے تکلف حکم لگا دیا کہ خدا کے ہاں فرماں برداروں کے ساتھ تو مجرموں کا سا معاملہ کیا جائے گا، اور تم جیسے
مجرموں کو جنت عطا کر دی جائے گی۔ یہ حکم آخر تم نے کس بنا پر لگایا ہے؟ کیا تمہارے پاس خدا کی کوئی کتاب ہے

جس میں یہ لکھا ہو؟ یا خدا سے تمہارا کوئی عہد و پیمان ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو تم میں سے کون آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس نے اللہ سے تمہارے لیے ایسا کوئی عہد و پیمان لے رکھا ہے؟ اور اگر تمہارے معبودوں میں سے کسی نے یہ کہا ہے تو بلاؤ اُن کو اور پوچھو کہ ان میں سے کس نے خدا سے یہ وعدہ لے لیا ہے۔ غرض تم اپنے حق میں جو حکم لگا رہے ہو اس کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے خدا کی کسی کتاب میں بھی تم یہ لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے۔ تم میں سے کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اس نے خدا سے ایسا کوئی عہد لے لیا ہے۔ اور جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں سے بھی کسی سے تم یہ شہادت نہیں دلوا سکتے کہ خدا کے ہاں تمہیں جنت دلوا دینے کا وہ ذمّہ لیتا ہے۔ پھر یہ غلط فہمی آخر تمہیں کہاں سے لاحق ہو گئی؟ (۱۰۱)

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۔ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (التکویر: ۸-۹)

"اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟"

اِس آیت کے اندازِ بیان میں ایسی شدید غضبناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضبناکی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ قیامت کے روز بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابلِ نفرت ہوں گے کہ اُن کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اِس معصوم کو کیوں قتل کیا؟ بلکہ اُن سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی؟ اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ دفن کر دیا۔ اس کے علاوہ اِس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیے گئے جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اس کے فحویٰ سے ظاہر ہو رہے تھے۔ ایک یہ کہ اس میں اہلِ عرب کو یہ احساس دلایا گیا کہ جاہلیت نے اُن کو اخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ در گور کرتے ہیں، پھر بھی انہیں اصرار ہے کہ اپنی اسی جاہلیت پر قائم رہیں گے اور اُس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں آخرت کے ضروری ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کر دی گئی۔ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا ہے، آخر اس کی کہیں تو داد رسی ہونی چاہیے، اور جن ظالموں نے یہ ظلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب اُن سے اِس بے دردانہ ظلم کی باز پرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دنیا میں تو کوئی سننے والا نہ تھا۔ جاہلیت کے معاشرے میں اِس فعل کو بالکل جائز کر رکھا گیا تھا۔ نہ ماں باپ کو اِس پر شرم آتی تھی۔ نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا۔ نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلمِ عظیم بالکل ہی بے داد رہ جانا چاہیے؟ (۱۰۲)

انکارِ آخرت کے اخلاقی نتائج

قرآن کریم میں آخرت کے امکان اور اس کے وجوب پر اتنے مضبوط دلائل قائم کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ صرف آخرت کا عقیدہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کی سیرت و کردار کو صحیح و مستحکم اخلاقی بنیادوں پر قائم رکھتا ہے۔ یہ نہ ہو تو اُس کو ظلم و ستم، فسق و فجور، بدعہدی و خیانت اور بدکاری و بداطواری سے روکنے والی کوئی چیز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کا انکار کرنے والے زبان سے خواہ کتنی ہی حجتیں بگھارتے رہیں، اُن کے عمل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ دراصل اخلاقی بے قیدیوں کی آزادی چاہتے ہیں اور اُسی کو برقرار رکھنے کے لیے آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ قرآن مجید میں اُن اخلاقی خرابیوں کی نشاندہی کی گئی جو خود عرب کے معاشرے میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں، اور لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھ دیا گیا کہ کیا یہ خرابیاں اُس صورت میں بھی پیدا ہو سکتی تھیں جب لوگوں کو یہ احساس ہوتا کہ ہمیں ایک دن اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ایک ایک فعل کی جواب دہی کرنی ہوگی؟ (۱۰۳)

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ۝ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ ۝
بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ۝ (القیامہ: ۳تا۵)

"کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں، ہم تو اُس کی اُنگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔"

پہلی دو آیتوں میں منکرین کی اُن باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ کہتے تھے کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سینکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں، جن کے جسم کا ذرّہ ذرّہ خاک میں مل کر پراگندہ ہو چکا ہو، جن کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر نہ معلوم زمین میں کہاں کہاں منتشر ہو چکی ہوں، جن میں سے کوئی جل مرا ہو، کوئی درندوں کے پیٹ میں جا چکا ہو، کوئی سمندر میں غرق ہو کر مچھلیوں کی غذا بن چکا ہو، اُن سب کے اجزائے جسم پھر سے جمع ہو جائیں اور ہر انسان پھر وہی شخص بن کر اُٹھ کھڑا ہو جو دس بیس ہزار سال پہلے کبھی وہ تھا؟ اس کا نہایت معقول اور انتہائی پُرزور جواب اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے سوال کی شکل میں دے دیا ہے کہ "کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی جمع نہ کر سکیں گے؟" یعنی اگر تم سے یہ کہا گیا ہوتا کہ تمہارے یہ منتشر اجزائے جسم کسی وقت آپ سے آپ جمع ہو جائیں گے اور تم آپ سے آپ اِسی جسم کے ساتھ جی اُٹھو گے، تو بلاشبہ تمہارا اِس کو ناممکن سمجھنا بجا ہوتا۔ مگر تم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ یہ کام خود نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا کریگا۔ اب کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ کائنات کا خالق، جسے تم خود بھی خالق مانتے ہو، اِس کام سے عاجز ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کے جواب میں کوئی شخص جو خدا کو خالق مانتا ہو، نہ اُس وقت یہ کہہ سکتا تھا اور

نہ آج یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا بھی یہ کام کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا۔ اور اگر کوئی بے وقوف ایسی بات کہے تو اس سے پوچھا جاسکتا ہے کہ تم آج جس جسم میں اِس وقت موجود ہو اس کے لیے تمہارا اجزاء کو ہوا اور پانی اور مٹی اور نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع کرکے اُسی خدا نے کیسے یہ جسم بنا دیا جس کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ پھر ان اجزا کو جمع نہیں کرسکتا؟

پھر فرمایا کہ بڑی بڑی ہڈیوں کو جمع کرکے تمہارا ڈھانچہ پھر سے کھڑا کر دینا تو درکنار، ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ تمہارے نازک ترین اجزائے جسم حتّٰی کہ تمہاری انگلیوں کی پوروں تک کو پھر ویسا ہی بنا دیں جیسی وہ پہلے تھیں۔

آخری فقرے میں منکرینِ آخرت کے اصل مرض کی صاف صاف تشخیص کر دی گئی کہ ان لوگوں کو جو چیز آخرت کے انکار پر آمادہ کر رہی ہے وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ فی الواقع یہ قیامت اور آخرت کو ناممکن سمجھتے ہیں، بلکہ ان کے اِس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کو ماننے سے لازماً ان پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اور انہیں یہ پابندیاں ناگوار ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح یہ اب تک زمین میں بے نتھے بیل کی طرح پھرتے رہے ہیں، اُسی طرح آئندہ بھی پھرتے رہیں۔ جو ظلم، جو بے ایمانیاں، جو فسق و فجور، جو بدکرداریاں یہ اب تک کرتے رہے ہیں، اُن کی کھُلی چھوٹ آئندہ بھی انہیں ملی رہے، اور یہ خیال کبھی ان کو ان روا آزادیاں برتنے سے نہ روکنے پائے کہ ایک دن انہیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ان اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اس لیے دراصل ان کی عقل انہیں آخرت پر ایمان لانے سے نہیں روک رہی ہے بلکہ ان کی خواہشاتِ نفس اِس میں مانع ہیں۔ (۱۰۲)

اور یہی بات ان آیات میں فرمائی گئی ہے:

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۔ (المطففین۔ ۱۲)

"اور اُسے نہیں جھٹلاتا مگر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بدعمل ہے۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۔ (صٓ۔ ۲۶)

"جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں اُن کے لیے سخت عذاب ہے اِس وجہ سے کہ وہ روزِ حساب کو بھول گئے ہیں۔"

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۔ (القیامۃ۔ ۲۰-۲۱)

"ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دُنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔"

یہ منکرین کے انکارِ آخرت کی دوسری وجہ ہے۔ پہلی وجہ تو اُوپر بیان کر دی گئی کہ وہ فجور کی کھلی چھوٹ چاہتے ہیں اور اُن اخلاقی پابندیوں سے بچنا چاہتے ہیں جو آخرت کو ماننے سے لازماً اُن پر عائد ہوتی ہیں، اس لیے دراصل خواہشاتِ نفس اُنہیں انکارِ آخرت پر اُبھارتی ہیں اور پھر وہ عقلی دلیلیں بگھارتے ہیں تاکہ اپنے اِس انکار کو معقول ثابت کریں۔ اب دوسری وجہ یہ بیان کی جا رہی ہے کہ منکرینِ آخرت چونکہ تنگ نظر اور کوتاہ بین ہیں اس لیے اُن کی نگاہ میں ساری اہمیّت اُنہی نتائج کی ہے جو اِسی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں اور اُن نتائج کو وہ کوئی اہمیّت نہیں دیتے جو آخرت میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو فائدہ، یا لذّت، یا خوشی یہاں حاصل ہو جائے اُسی کی طلب میں ساری محنتیں اور کوششیں کھپا دینی چاہییں کیونکہ اُسے پا لیا تو گویا سب کچھ پا لیا، خواہ آخرت میں اس کا انجام کتنا ہی بُرا ہو۔ اِسی طرح اُن کا خیال یہ ہے کہ جو نقصان یا تکلیف یا رنج و غم یہاں پہنچ جائے وہی دراصل بچنے کے قابل چیز ہے، قطع نظر اِس سے کہ اُس کو برداشت کر لینے کا کتنا ہی بڑا اجر آخرت میں مل سکتا ہو۔ وہ نقد سودا چاہتے ہیں۔ آخرت جیسی دُور کی چیز کے لیے وہ نہ آج کے کسی نفع کو چھوڑ سکتے ہیں نہ کسی نقصان کو گوارا کر سکتے ہیں۔ اِس اندازِ فکر کے ساتھ جب وہ آخرت کے مسئلے پر عقلی بحثیں کرتے ہیں تو دراصل وہ خالص عقلیّت نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے یہ اندازِ فکر کام کر رہا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُن کا فیصلہ بہرحال یہی ہوتا ہے کہ آخرت کو نہیں ماننا ہے خواہ اندر سے اُن کا ضمیر پکار پکار کر کہہ رہا ہو کہ آخرت کے امکان و وقوع اور وجوب کی جو دلیلیں قرآن میں دی گئی ہیں وہ نہایت معقول ہیں اور اس کے خلاف جو استدلال وہ کر رہے ہیں وہ نہایت بودا ہے۔ (۱۰۵)

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا۔ (الدھر: ۲۷)

"یہ لوگ تو جلدی حاصل ہونے والی چیز (دُنیا) سے محبّت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اُسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔"

یعنی یہ کفّارِ قریش جس وجہ سے اخلاق اور عقائد کی گمراہیوں پر مُصر ہیں، اور جس بنا پر اللہ کے رسُول کی دعوتِ حق کے لیے اِن کے کان بہرے ہو گئے ہیں، وہ دراصل اِن کی دُنیا پرستی اور آخرت سے بے فکری و بے نیازی ہے۔ اِس لیے ایک سچّے خدا پرست انسان کا راستہ اِن کے راستے سے اِتنا الگ ہے کہ دونوں کے درمیان کسی مصالحت کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (۱۰۶)

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝ (التکاثر: ۱ تا ۸)

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے، یہاں تک کہ (اِسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سُن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اِس روِش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے، پھر (سُن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اُسے دیکھو گے۔ پھر ضرور بالضرور اُس روز تم سے اِن نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔"

لفظ اَلْهٰكُمْ لَہو سے مُشتق ہے جس کے اصل معنیٰ غفلت کے ہیں، لیکن عربی زبان میں یہ لفظ اُس شغل کے لیے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اِتنی بڑھ جائے کہ وہ اُس میں منہمک ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے۔ اِس مادّے سے جب اَلْهٰكُمْ کا لفظ بولا جائے گا تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی لَہو نے تم کو اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ تمہیں کسی اور چیز کا، جو اُس سے اہم تر ہے، ہوش باقی نہیں رہا ہے، اُسی کی دُھن تم پر سوار ہے۔ اُسی کی فکر میں تم لگے ہوئے ہو۔ اور اِس انہماک نے تم کو بالکل غافل کر دیا ہے۔

"تکاثر" کثرت سے ہے، اور اُس کے تین معنی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ لوگ کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اِس بات پر فخر جتائیں کہ انہیں دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔ پس اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ کے معنی ہوئے "تکاثر نے تمہیں اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ اُس کی دُھن نے تمہیں اُس سے اہم تر چیزوں سے غافل کر دیا ہے۔ اِس فقرے میں یہ تصریح نہیں کی گئی ہے کہ تکاثر میں کس چیز کی کثرت اور اَلْهٰكُمْ میں کس چیز سے غافل ہو جانا مراد ہے، اور اَلْهٰكُمْ (تم کو غافل کر دیا ہے) کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ اِس عدمِ تصریح کی وجہ سے اِن الفاظ کا اِطلاق اپنے وسیع ترین مفہوم پر ہو جاتا ہے۔ تکاثر کے معنی محدود نہیں رہتے بلکہ دنیا کے تمام فوائد و منافع، سامانِ عیش، اسبابِ لذّت، اور وسائلِ قوت و اِقتدار کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی سعی و جہد کرنا، اُن کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، اور ایک دوسرے کے مقابلے میں اُن کی کثرت پر فخر جتانا اُس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح اَلْهٰكُمْ کے مخاطب بھی محدود نہیں رہتے بلکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی اُس کے مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اُس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دُنیا حاصل کرنے اور اُس میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے، اور دوسروں کے مقابلے میں اُس پر فخر جتانے کی دُھن افراد پر بھی سوار ہے اور اقوام پر بھی۔ اِسی طرح اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ میں چونکہ اِس امر کی صراحت نہیں کی گئی کہ تکاثر نے

لوگوں کو اپنے اندر منہمک کر کے کس چیز سے غافل کر دیا ہے، اِس لیے اس کے مفہوم میں بھی بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اِس تکاثر کی دُھن نے ہر اُس چیز سے غافل کر دیا ہے جو اس کی بہ نسبت اہم تر ہے۔ وہ خدا سے غافل ہو گئے ہیں۔ عاقبت سے غافل ہو گئے ہیں۔ اخلاقی حدود اور اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ اُنہیں بس معیارِ زندگی بلند کرنے کی فکر ہے، اِس بات کی کوئی فکر نہیں کہ معیارِ آدمیت کس قدر گر رہا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ دولت چاہیے، اِس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کس ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ انہیں عیش و عشرت اور جسمانی لذتوں کے سامان زیادہ سے زیادہ مطلوب ہیں، اِس ہوس رانی میں غرق ہو کر وہ اِس بات سے بالکل غافل ہو گئے ہیں کہ اِس روش کا انجام کیا ہے۔ اُنہیں زیادہ سے زیادہ طاقت، زیادہ سے زیادہ فوجیں، زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر ہے، اور اِس معاملہ میں ان کے درمیان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ جاری ہے، اِس بات کی فکر انہیں نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی زمین کو ظلم سے بھر دینے اور انسانیت کو تباہ و برباد کر دینے کا سروسامان ہے۔ غرض تکاثر کی بے شمار صورتیں ہیں جنہوں نے اشخاص اور اقوام سب کو اپنے اندر ایسا مشغول کر رکھا ہے کہ اُنہیں دُنیا اور اس کے فائدوں اور لذتوں سے بالاتر کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ اور یہ فکر مرتے دم تک اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

اِس غلطی پر لوگوں کو متنبّہ کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ متاعِ دُنیا کی یہ کثرت، اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانا ہی ترقی اور کامیابی ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز ترقی اور کامیابی نہیں ہے۔ عنقریب اس کا برا انجام تمہیں معلوم ہو جائے گا اور تم جان لوگے کہ یہ کتنی بڑی غلطی تھی جس میں تم عمر بھر مبتلا رہے۔ عنقریب سے مراد آخرت بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ جس ہستی کی نگاہ ازل سے ابد تک تمام زمانوں پر حاوی ہے اُس کے لیے چند ہزار یا چند لاکھ سال بھی زمانے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ لیکن اس سے مراد موت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو کسی انسان سے بھی کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔ اور یہ بات مرتے ہی انسان پر کھل جائے گی کہ جن مشاغل میں وہ اپنی ساری عمر کھپا کر آیا ہے وہ اُس کے لیے سعادت و خوش بختی کا ذریعہ تھے یا بد انجامی و بدبختی کا ذریعہ؟ (۱۰۲)

پھر قرآن خود عربی معاشرے میں سے چند سامنے کی مثالیں دے کر بتاتا ہے کہ آخرت سے غفلت نے لوگوں میں کیسی کیسی برائیاں پیدا کر دی ہیں۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (المطففین ۱ تا ۶)

"تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اُس دن جبکہ سب لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔"

لفظ مُطَفِّفِیْن طفیف سے مُشتق ہے جس کے معنی عربی زبان میں چھوٹی اور حقیر چیز کے ہیں، اور تطفیف کا لفظ اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے تھوڑی تھوڑی کمی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ کر یا تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اُڑاتا بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے حصے میں سے تھوڑا تھوڑا اُڑاتا رہتا ہے اور خریدار بیچارے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ تاجر اُسے کیا اور کتنا گھاٹا دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بُرائی جو معاشرے میں عام تھی کبھی نہ پھیل سکتی اگر لوگوں کو آخرت کا کوئی خیال ہوتا۔ (۱۰۸)

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ (الفجر: ۱۷ تا ۲۰)

"ہرگز نہیں (دُنیوی خوشحالی یا بدحالی معیارِ عزّت و ذلّت نہیں ہے)، بلکہ تم یتیم سے عزّت کا سلوک نہیں کرتے، اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اُکساتے، اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو، اور مال کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو۔"

یعنی یہ جو تم نے دُنیوی خوشحالی و بدحالی کو معیارِ عزّت و ذلّت سمجھ رکھا ہے یہ تمہارا مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے۔ ورنہ اصل معیار تو اخلاق کی خوبی و زشتی ہے۔ اور تمہارا حال یہ ہے کہ یتیم کا باپ جب تک زندہ رہتا ہے اُس کے ساتھ تمہارا برتاؤ کچھ اور ہوتا ہے اور جب اس کا باپ مر جاتا ہے تو بیگانے اور دُور کے رشتہ دار تو درکنار چچا اور ماموں اور بڑے بھائی تک اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ تمہارے معاشرے میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا کوئی چرچا نہیں ہے۔ نہ کوئی خود کسی بھوکے کو کھانا کھلانے پر آمادہ ہوتا ہے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک مٹانے کے لیے کوئی فکر کریں اور ایک دوسرے کو اُس کا انتظام کرنے پر اکسائیں۔ میراث میں عورتوں اور بچوں کو تو تم نے ویسے ہی محروم کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور با اثر ہوتا ہے وہ بلا تامل ساری میراث سمیٹ لیتا ہے، اور اُن سب کا حصہ مار کھاتا ہے جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بوتا نہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی اہمیت تمہاری نگاہ میں نہیں ہے کہ ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دو خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ مال کمانے میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز کوئی نہیں۔ جس طریقے سے بھی مال حاصل کیا جا سکتا ہو اُسے

حاصل کرنے میں تمہیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اور خواہ کتنا ہی مال مل جائے تمہاری حرص وطمع کی آگ کبھی نہیں بجھتی (۱۰۹)

اَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ (الماعون ۱تا۳)

"تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے دو نمایاں ترین مثالیں دے کر دراصل یہ بتایا ہے کہ انکار آخرت لوگوں میں کس قسم کی اخلاقی برائیاں پیدا کرتا ہے۔ اصل مقصود ان دو ہی باتوں پر گرفت کرنا نہیں ہے کہ آخرت کو نہ ماننے سے بس یہ دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ یتیموں کو دھتکارتے ہیں اور مسکینوں کا کھانا دینے پر نہیں اکساتے۔ بلکہ جو بے شمار خرابیاں اس گمراہی کے نتیجے میں رونما ہوتی ہیں ان میں سے دو ایسی چیزیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جن کو ہر شریف الطبع اور سلیم الفطرت انسان مانے گا کہ وہ نہایت قبیح اخلاقی رذائل ہیں۔ اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ اگر یہی شخص خدا کے حضور اپنی حاضری اور جواب دہی کا قائل ہوتا تو اس سے ایسی کمینہ حرکتیں سرزد نہ ہوتیں کہ یتیم کا حق مارے، اس پر ظلم ڈھائے، اس کو دھتکارے، اور مسکین کو نہ خود کھلائے نہ کسی سے یہ کہے کہ اس کا کھانا اس کو دو۔ آخرت کا یقین رکھنے والوں کے اوصاف تو وہ ہیں جو سورۂ بلد اور سورۂ عصر میں بیان کیے گئے ہیں کہ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (وہ ایک دوسرے کو خلق خدا پر رحم کھانے کی نصیحت کرتے ہیں) اور وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (وہ ایک دوسرے کو حق پرستی اور ادائے حقوق کی نصیحت کرتے ہیں)۔ (۱۱۰)

دنیا میں انسان امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے

ایک طرف قرآن نے اس طریقے سے آخرت کے امکان اور اس کی ضرورت کے متعلق لوگوں کے ہر شبہ کو نہایت معقول طریقے سے رفع کیا اور دوسری طرف اس نے ان کو یہ بھی بتایا کہ تم اپنی غفلت کی وجہ سے دنیا کو محض ایک چراگاہ یا تفریح گاہ سمجھے بیٹھے ہو، حالانکہ یہ ایک امتحان گاہ ہے جہاں ہر وقت اپنی زندگی کے ہر انفرادی اور اجتماعی معاملہ میں تم دراصل امتحان دے رہے ہو۔ اور یہ امتحان تمہیں بے خبر رکھ کر نہیں لیا جا رہا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ بتانے کا پورا انتظام کر دیا ہے کہ اس میں تمہاری کامیابی و ناکامی کا مدار کس چیز پر ہے۔

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۔ (الملک ۲)

"جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔"

یعنی دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے شروع کیا ہے کہ ان کا امتحان

لے اور یہ دیکھے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اِس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ موت اور حیات اُسی کی طرف سے ہے۔ کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔ دوسرے یہ کہ انسان جیسی ایک مخلوق جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اُس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ موت۔ خالق نے اُسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اُس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ اِسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے تاکہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا بُرائی کا اظہار کر سکے اور عملاً یہ دکھا دے کہ وہ کیسا انسان ہے۔ چوتھے یہ کہ خالق ہی دراصل اِس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا بُرا۔ اعمال کی اچھائی اور بُرائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والے کا کام نہیں ہے بلکہ امتحان لینے والا کا کام ہے۔ لہٰذا جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہیے اُسے یہ معلوم کرنا ہو گا کہ ممتحن کے نزدیک حُسنِ عمل کیا ہے۔ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ جس شخص کا جیسا عمل ہو گا اس کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی، کیونکہ اگر جزا نہ ہو تو سرے سے امتحان لینے کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔ (۱۱۱)

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝ (الدھر: ۲-۳)

”ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اسی غرض کے لیے ہم نے اُسے سُننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر (ناشکری) کرنے والا۔“

یہ ہے دُنیا میں انسان کی اور انسان کے لیے دُنیا کی اصل حیثیت۔ وہ درختوں اور جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصدِ تخلیق یہیں پُورا ہو جائے اور قانونِ فطرت کے مطابق ایک مدت تک اپنے حصے کا کام کر کے وہ یہیں مر کر فنا ہو جائے۔ نیز یہ دُنیا اُس کے لیے نہ دارالعذاب ہے، جیسا کہ راہب سمجھتے ہیں، نہ دارالجزا ہے، جیسا کہ تناسخ کے قائلین سمجھتے ہیں، نہ چراگاہ اور تفریح گاہ ہے، جیسا کہ مادّہ پرست سمجھتے ہیں، اور نہ رزم گاہ، جیسا کہ ڈارون اور مارکس کے پیرو سمجھتے ہیں، بلکہ دراصل یہ اُس کے لیے ایک امتحان گاہ ہے وہ جس چیز کو عمر سمجھتا ہے حقیقت میں وہ امتحان کا وقت ہے جو اُسے یہاں دیا گیا ہے۔ دُنیا میں جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی اُس کو دی گئی ہیں، جن چیزوں پر بھی اُس کو تصرف کے مواقع دیے گئے ہیں، جن حیثیتوں پر بھی وہ یہاں کام کر رہا ہے، اور جو تعلقات بھی اُس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں، وہ سب

اصل میں امتحان کے بے شمار پرچے ہیں، اور زندگی کے آخری سانس تک اس امتحان کا سلسلہ جاری ہے۔ نتیجہ اس کا دنیا میں نہیں نکلنا ہے بلکہ آخرت میں اس کے تمام پرچوں کو جانچ کر یہ فیصلہ ہونا ہے کہ وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام۔ اور اس کی کامیابی و ناکامی کا سارا انحصار اس پر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہوئے یہاں کام کیا اور کس طرح امتحان کے وہ پرچے کیے جو اسے یہاں دیے گئے تھے۔ اگر اس نے اپنے آپ کو بے خدا یا بہت سے خداؤں کا بندہ سمجھا، اور سارے پرچے یہ سمجھتے ہوئے کیے کہ آخرت میں اسے اپنے خالق کے سامنے کوئی جواب دہی نہیں کرنی ہے، تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی غلط ہو گیا۔ اور اگر اس نے اپنے آپ کو خدائے واحد کا بندہ سمجھ کر اس طریقے پر کام کیا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور آخرت کی جواب دہی کو پیشِ نظر رکھا تو وہ امتحان میں کامیاب ہو گیا۔

[یہ مضمون قرآن مجید میں اس کثرت کے ساتھ اور اتنی تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان سب مقامات کا حوالہ دینا یہاں مشکل ہے۔ جو حضرات اسے پوری طرح سمجھنا چاہتے ہوں وہ تفہیم القرآن کی ہر جلد کے آخر میں فہرست موضوعات کے اندر لفظ "آزمائش" نکال کر وہ تمام مقامات دیکھ لیں جہاں قرآن میں مختلف پہلوؤں سے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ قرآن کے سوا دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں یہ حقیقت اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہو]

پھر فرمایا گیا "ہم نے اُسے سمیع و بصیر بنایا"۔ اس کا مفہوم صحیح طور پر "ہوش گوش رکھنے والا بنایا" سے ادا ہوتا ہے، لیکن ہم نے ترجمے کی رعایت سے سمیع کے معنی "سننے والا" اور بصیر کے معنی "دیکھنے والا" کیے ہیں۔ اگرچہ عربی زبان کے اِن الفاظ کا ترجمہ یہی ہے مگر ہر عربی داں جانتا ہے کہ حیوان کے لیے سمیع اور بصیر کے الفاظ کبھی استعمال نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ بھی سننے اور دیکھنے والا ہوتا ہے۔ پس سننے اور دیکھنے سے مراد یہاں سماعت اور بینائی کی وہ قوتیں نہیں ہیں جو حیوانات کو بھی دی گئی ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا اور پھر اس سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ علاوہ بریں سماعت اور بصارت انسان کے ذرائع علم میں چونکہ سب سے زیادہ اہم ہیں اس لیے اختصار کے طور پر صرف انہی کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اصل مراد انسان کو وہ تمام حواس عطا کرنا ہے جن کے ذریعے سے وہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ پھر انسان کو جو حواس دیے گئے ہیں وہ اپنی نوعیت میں اُن حواس سے بالکل مختلف ہیں جو حیوانات کو دیے گئے، کیونکہ اُس کے ہر حاسے کے پیچھے ایک سوچنے والا دماغ موجود ہوتا ہے جو حواس کے ذریعے سے آنے والی معلومات کو جمع کرکے اور ان کو ترتیب دے کر اُن سے نتائج نکالتا ہے، رائے قائم کرتا ہے اور پھر کچھ فیصلوں پر پہنچتا ہے جن پر اس کا رویۂ زندگی مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنے کے بعد کہ انسان کو پیدا کرکے ہم اُس کا امتحان لینا چاہتے تھے یہ ارشاد

فرمایا کہ "اسی غرض کے لیے ہم نے اسے سمیع و بصیر بنایا" دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے علم اور عقل کی طاقتیں دیں تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر مقصودِ کلام یہ نہ ہو اور سمیع و بصیر بنانے کا مطلب محض سماعت و بینائی کی قوتیں رکھنے والا بنانا ہی ہو، تو ایک اندھا اور بہرا آدمی تو پھر امتحان سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے، حالانکہ جب تک کوئی علم و عقل سے بالکل محروم نہ ہو، امتحان سے اس کے مستثنیٰ ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے اُسے محض علم و عقل کی قوتیں دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی بھی کی تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ شکر کا راستہ کون سا ہے اور کفر کا راستہ کونسا، اور اس کے بعد جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہو۔ سُورۂ بَلَد میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ "اور ہم نے اسے دونوں راستے (یعنی خیر و شر کے راستے) نمایاں کر کے بتا دیے"۔ اور سُورۂ شمس میں یہی بات اِس طرح بیان کی گئی ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، "اور قسم ہے (انسان کے) نفس کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے (تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے ساتھ) اُستوار کیا، پھر اُس کا فجور اور اُس کا تقویٰ دونوں اُس پر الہام کر دیے"۔ ان تمام تصریحات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے اور ساتھ ساتھ قرآن مجید کے اُن تفصیلی بیانات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کی ہدایت کے لیے دُنیا میں کیا کیا انتظامات کیے ہیں، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اِس آیت میں "راستہ دکھانے" سے مراد رہنمائی کی کوئی ایک ہی صُورت نہیں ہے بلکہ بہت سی صورتیں ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

ا۔ ہر انسان کو علم و عقل کی صلاحیتیں دینے کے ساتھ ایک اخلاقی حِس بھی دی گئی ہے جس کی بدولت وہ فطری طور پر بھلائی اور بُرائی میں امتیاز کرتا ہے، بعض افعال اور اوصاف کو بُرا جانتا ہے اگرچہ وہ خود اُن میں مبتلا ہو، اور بعض افعال و اوصاف کو اچھا جانتا ہے اگرچہ وہ خود اُن سے اجتناب کر رہا ہو۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے اپنی اغراض و خواہشات کی خاطر ایسے فلسفے گھڑ لیے ہیں جن کی بنا پر بہت سی بُرائیوں کو انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیا ہے، اُن کا حال بھی یہ ہے کہ وہی بُرائیاں اگر کوئی دوسرا اُن کے ساتھ کرے تو وہ اُس پر چیخ اٹھتے ہیں اور اُس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے جھُوٹے فلسفوں کے باوجود حقیقت میں وہ اُن کو بُرا ہی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح نیک اعمال و اوصاف کو خواہ کسی نے جہالت اور حماقت اور دقیانوسیت ہی قرار دے رکھا ہو، لیکن جب کسی انسان سے خود اس کی ذات کو کسی نیک سلوک کا فائدہ پہنچتا ہے تو اس کی فطرت اُسے قابلِ قدر سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

۲۔ ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ضمیر (نفسِ لوّامہ) نام کی ایک چیز رکھ دی ہے جو اُسے ہر اُس موقع پر ٹوکتی ہے جب وہ کوئی بُرائی کرنے والا ہو، یا کر رہا ہو، یا کر چکا ہو۔ اِس ضمیر کو انسان خواہ کتنی ہی تھپکیاں دے کر سُلائے، اور اُس کو بے حس بنانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کرے، لیکن وہ اُسے بالکل فنا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ دُنیا میں ڈھیٹ بن کر وہ اپنے آپ کو قطعی بے ضمیر ثابت کر سکتا ہے۔ وہ حجتیں بگھار کر دُنیا کو دھوکا دینے کی بھی ہر کوشش کر سکتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو بھی فریب دینے کے لیے اپنے افعال کے لیے بے شمار عذرات تراش سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اللہ نے اُس کی فطرت میں جو محاسب بٹھا رکھا ہے وہ اِتنا جاندار ہے کہ کسی بُرے انسان سے بھی یہ بات چھُپی نہیں رہتی کہ وہ حقیقت میں کیا ہے۔ یہی بات ہے جو سُورۂ قیامہ میں فرمائی گئی ہے کہ "انسان خود اپنے آپ کو خوب جانتا ہے خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔" (آیت ۱۵)

۳۔ انسان کے اپنے وجود میں اور اس کے گرد و پیش زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات میں ہر طرف ایسی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو خبر دے رہی ہیں کہ یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر نہیں ہو سکتا، نہ بہت سے خدا اِس کارخانۂ ہستی کے بنانے اور چلانے والے ہو سکتے ہیں۔ اِسی طرح آفاق اور انفس کی یہی نشانیاں قیامت اور آخرت پر بھی صریح دلالت کر رہی ہیں۔ انسان اگر ان سے آنکھیں بند کر لے، یا اپنی عقل سے کام لے کر ان پر غور نہ کرے، یا جن حقائق کی نشان دہی یہ کر رہی ہیں اُن کو تسلیم کرنے سے جی چرائے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تو حقیقت کی خبر دینے والے نشانات اس کے سامنے رکھ دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔

۴۔ انسان کی اپنی زندگی میں، اُس کی ہم عصر دنیا میں، اور اس سے پہلے گزری ہوئی تاریخ کے تجربات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے ہیں اور آتے رہتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک بالاتر حکومت اُس پر اور ساری کائنات پر فرمانروائی کر رہی ہے، جس کے آگے وہ بالکل بے بس ہے، جس کی مشیّت ہر چیز پر غالب ہے اور جس کی مدد کا وہ محتاج ہے۔ یہ تجربات و مشاہدات صرف خارج ہی میں اِس حقیقت کی خبر دینے والے نہیں ہیں، بلکہ انسان کی اپنی فطرت میں بھی اُس بالاتر حکومت کے وجود کی شہادت موجود ہے جس کی بنا پر بڑے سے بڑا دہریہ بھی بُرا وقت آنے پر خدا کے آگے دُعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے، اور سخت سے سخت مُشرک بھی سارے جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔

۵۔ انسان کی عقل اور اس کی فطرت قطعی طور پر یہ حکم لگاتی ہے کہ جُرم کی سزا اور عمدہ خدمات کا صلہ ملنا ضروری ہے۔ اِسی بنا پر تو دنیا کے ہر معاشرے میں عدالت کا نظام کسی نہ کسی صورت میں قائم کیا جاتا ہے اور جن خدمات

کو قابلِ تحسین سمجھا جاتا ہے اُن کا صلہ دینے کی بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اخلاق اور قانونِ مکافات کے درمیان ایک ایسا لازمی تعلق ہے جس سے انکار کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب اگر یہ مسلّم ہے کہ اِس دنیا میں بے شمار جرائم ایسے ہیں جن کی پُوری سزا تو درکنار سرے سے کوئی سزا ہی نہیں دی جا سکتی، اور بے شمار خدمات بھی ایسی ہیں جن کا پُورا صلہ تو کیا، کوئی صلہ بھی خدمت کرنے والے کو نہیں مل سکتا، تو آخرت کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ کوئی بے وقوف یہ فرض کرے، یا کوئی ہٹ دھرم یہ رائے قائم کرنے پر اصرار کرے کہ انصاف کا تصور رکھنے والا انسان ایک ایسی دُنیا میں پیدا ہو گیا ہے جو بجائے خود انصاف کے تصور سے خالی ہے۔ اور پھر اِس سوال کا جواب اُس کے ذمّہ رہ جاتا ہے کہ ایسی دنیا میں پیدا ہونے والے انسان کے اندر یہ انصاف کا تصوّر آخر آ کہاں سے گیا؟

۴۔ اِن تمام ذرائعِ رہنمائی کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی صریح اور واضح رہنمائی کے لیے دُنیا میں انبیاء بھیجے اور کتابیں نازل کیں جن میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ شکر کی راہ کونسی ہے اور کفر کی راہ کونسی، اور ان دونوں راہوں پر چلنے کے نتائج کیا ہیں۔ انبیاء اور کتابوں کی لائی ہوئی یہ تعلیمات محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے اِتنے بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں پھیلی ہیں کہ کوئی انسانی آبادی بھی خدا کے تصوّر، آخرت کے تصوّر، نیکی اور بدی کے فرق، اور اُن کے پیش کردہ اخلاقی اصولوں اور قانونی احکام سے ناواقف نہیں رہ گئی ہے، خواہ اسے یہ معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ علم اُسے انبیاء اور کتابوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی سے حاصل ہُوا ہے۔ آج جو لوگ انبیاء اور کتابوں کے منکر ہیں، یا اُن سے بالکل بے خبر ہیں، وہ بھی اُن بہت سی چیزوں کی پیروی کر رہے ہیں جو دراصل اُنہی سے چیزیں اور کتابوں کی تعلیمات سے چھَن چھَن کر اُن تک پہنچی ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ اِن چیزوں کا اصل ماخذ کونسا ہے۔ (۱۱۴)

فیصلے کا ایک دن مقرر ہے

اس کے بعد قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا کہ اس امتحان کا نتیجہ اسی دنیا میں ظاہر نہ ہوگا بلکہ ایک وقت اِس کے لیے مقرر ہے جب دُنیا کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو دوبارہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا اور اُن سب کا حساب لیا جائے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دی جائے گی۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ (الدّخان-۴۰)

"اِن سب کے لیے فیصلے کا ایک طے شدہ وقت ہے۔"

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (الواقعہ ۴۹-۵۰)

"ان سے کہو یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر ہے"

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۔ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۔ (الزمر ۶۸)

"اور اس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے اُن کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے (مثلاً فرشتے) پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب کے سب اُٹھ کر دیکھ رہے ہوں گے"

وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۔ (الزمر ۲۴)

"اور ظالموں سے کہہ دیا جائے گا کہ اب چکھو مزہ اُس کمائی کا جو تم کرتے رہے تھے"

اصل میں لفظ "کسب" استعمال ہوا ہے جس سے مراد قرآن مجید کی اصطلاح میں جزا و سزا کا وہ استحقاق ہے جو آدمی اپنے عمل کے نتیجے میں کماتا ہے۔ نیک عمل کرنے والے کی اصل کمائی یہ ہے کہ وہ اللہ کے اجر کا مستحق بنتا ہے۔ اور گمراہی و بدراہی اختیار کرنے والے کی کمائی وہ سزا ہے جو اسے آخرت میں ملنے والی ہے۔ (۱۱۳)

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۔ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۔ (المؤمن ۱۷)

"(اس وقت کہا جائے گا) آج ہر متنفس کو اُس کمائی کا بدلہ دیا جائے گا جو اُس نے (دنیا میں) کی تھی۔ آج کسی پر ظلم نہ ہوگا"

یعنی کسی نوعیت کا ظلم بھی نہ ہوگا۔ واضح رہے کہ جزا کے معاملہ میں ظلم کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کسی اجر کا مستحق ہو اور وہ اس کو نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ جتنے اجر کا مستحق ہو اس سے کم دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ سزا کا مستحق نہ ہو مگر اسے سزا دے ڈالی جائے۔ چوتھے یہ کہ جو سزا کا مستحق ہو اُسے سزا نہ دی جائے۔ پانچویں یہ کہ جو کم سزا کا مستحق ہو اُسے زیادہ سزا دے دی جائے۔ چھٹے یہ کہ مظلوم منہ دیکھتا رہ جائے اور ظالم اس کی آنکھوں کے سامنے صاف بری ہو کر نکل جائے۔ ساتویں یہ کہ ایک کے گناہ میں دوسرا پکڑ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ظلم کی تمام نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کا ظلم بھی اُس کی عدالت میں نہ ہونے پائے گا۔ (۱۱۴)

انسان جو کچھ دُنیا میں کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے براہ راست واقف ہے

پھر قرآن میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس دارالامتحان میں انسان جو کچھ بھی کر رہا ہے اللہ تعالیٰ اس سے براہ راست واقف ہے۔ اُس کا کوئی فعل ہی بلکہ اُس کے دل کا کوئی خیال تک اُس سے چھپا ہُوا نہیں ہے۔ اِس لیے یوم الحساب میں انسان کو اُس خدا سے سابقہ پیش آئے گا جو اس کے پُورے کارنامۂ حیات سے پُوری طرح باخبر ہے۔

وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔ (الملک-۱۳)

"تم چھپا کر بات کرو یا زور سے (اُس کے لیے یکساں ہے) وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔"

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ۔ (الزخرف-۸۰)

"کیا وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم اُن کی راز کی باتیں اور اُن کی سرگوشیاں نہیں سُن رہے ہیں؟ ہم سب کچھ سُن رہے ہیں، اور ہمارے فرشتے اُن کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔"

وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ۔ (ق-۱۶)

"اُس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں اور ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہیں۔"

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ (الحدید-۴)

"وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔"

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ۔ (المؤمن: ۱۹-۲۰)

"اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔ اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلہ کرے گا۔" (۱۱۵)

آخرت کی عدالت میں ناقابلِ انکار شہادتوں سے اُس کے اعمال کا ثبوت پیش کیا جائے گا۔

لیکن قرآن مجید میں تصریح فرما دی گئی کہ آخرت میں فیصلہ اللہ تعالیٰ صرف اپنے ذاتی علم کی بنا پر نہ کرے گا بلکہ وہ ہر شخص کے اعمال کا مفصل اور مکمل اور نہایت صحیح ریکارڈ تیار کرا رہا ہے۔ اور عدالتِ الٰہی میں ایسی شہادتیں آدمی کے اعمال کے بارے میں پیش کی جائیں گی جن کا انکار کسی طرح ممکن نہ ہوگا۔

إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ

إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ - (ق - ۱۷-۱۸)

"دو کاتب اُس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اُس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرلینے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔"

مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم خود براہِ راست انسان کی حرکات و سکنات اور اُس کے خیالات کو جانتے ہیں، دوسری طرف ہر انسان پر دو فرشتے مامور ہیں۔ جو اُس کی ایک ایک بات کو نوٹ کر رہے ہیں اور اُس کا کوئی قول و فعل اُن کے ریکارڈ سے نہیں چھوٹتا۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت اللہ کی عدالت میں انسان کی پیشی ہوگی اُس وقت اللہ کو خود بھی معلوم ہوگا کہ کون کیا کرکے آیا ہے، اور اُس پر شہادت دینے کے لیے دو گواہ بھی موجود ہوں گے جو اُس کے اعمال کا دستاویزی ثبوت لاکر سامنے رکھ دیں گے۔ یہ دستاویزی ثبوت کس نوعیت کا ہوگا؟ اِس کا ٹھیک ٹھیک تصوّر کرنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ مگر جو حقائق آج ہمارے سامنے آرہے ہیں انہیں دیکھ کر یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ جس فضا میں انسان رہتا ہے اور کام کرتا ہے اُس میں ہر طرف اُس کی آوازیں، اُس کی تصویریں اور اس کی حرکات و سکنات کے نقوش ذرّے ذرّے پر ثبت ہو رہے ہیں اور اُن میں سے ہر چیز کو بعینہٖ اُنہی شکلوں اور آوازوں میں دوبارہ اِس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ اصل اور نقل میں ذرہ برابر فرق نہ ہو۔ آج انسان یہ کام نہایت ہی محدود پیمانے پر آلات کی مدد سے کر رہا ہے لیکن خدا کے فرشتے نہ اِن آلات کے محتاج ہیں نہ اِن قیود سے مُقیّد۔ انسان کا اپنا جسم اور اس کے گرد و پیش کی ہر چیز اُن کی ٹیپ اور اُن کی فلم ہے جس پر وہ ہر آواز اور ہر تصویر کو اس کی نازک ترین تفصیلات کے ساتھ جُوں کی توں ثبت کرسکتے ہیں اور قیامت کے روز آدمی کو اُس کے اپنے کانوں سے اُس کی اپنی آواز میں اس کی وہ باتیں سُنوا سکتے ہیں جو وہ دُنیا میں کرتا تھا، اور اُس کی اپنی آنکھوں سے اُس کے اپنے تمام کرتوتوں کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا سکتے ہیں جن کی صحت سے انکار کرنا اس کے لیے ممکن نہ رہے۔

اِس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی عدالت میں کسی شخص کو محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر سزا نہ دے گا بلکہ عدل کی تمام شرائط پوری کرکے اس کو سزا دے گا۔ اسی لیے دُنیا میں ہر شخص کے اقوال و افعال کا مکمل ریکارڈ تیار کرایا جا رہا ہے تاکہ اس کی کارگزاریوں کا پورا ثبوت ناقابلِ انکار شہادتوں سے فراہم ہو جائے (۱۱۶)

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ • كِرَامًا كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ - (الانفطار: ۱۰تا۱۲)

"حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں، ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔"

یعنی تم لوگ دار الجزاء کا انکار کردو یا اُس کو جھٹلاؤ یا اُس کا مذاق اُڑاؤ، اِس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ حقیقت

یہ ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں دُنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اُس نے تم میں سے ایک ایک آدمی پر نہایت راست باز نگراں مقرر کر رکھے ہیں جو بالکل بے لاگ طریقے سے تمہارے تمام اچھے اور بُرے اعمال کو ریکارڈ کر رہے ہیں اور ان سے تمہارا کوئی کام چھپا ہُوا نہیں ہے، خواہ تم اندھیرے میں، خلوتوں میں، سُنسان جنگلوں میں، یا اور کسی ایسی حالت میں اُس کا ارتکاب کرو جہاں تمہیں پُورا اطمینان ہو کہ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ نگاہِ خلق سے مخفی رہ گیا ہے۔ اِن نگراں فرشتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے کِرَامًا کَاتِبِیْنَ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں یعنی ایسے کاتب جو کریم (نہایت بزرگ اور معزز) ہیں کسی سے نہ ذاتی محبت رکھتے ہیں نہ عداوت کہ ایک کی بے جا رعایت اور دوسرے کی ناروا مخالفت کر کے خلافِ واقعہ ریکارڈ تیار کر دیں۔ خائن بھی نہیں ہیں کہ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوئے بغیر بطورِ خود غلط سَلط اندراجات کر لیں۔ رشوت خوار بھی نہیں ہیں کہ کچھ لے دے کر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف جھوٹی رپورٹیں کر دیں۔ اُن کا مقام اِن ساری اخلاقی کمزوریوں سے بلند ہے، اس لیے نیک و بد دونوں قسم کے انسانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ہر ایک کی نیکی بے کم و کاست ریکارڈ ہو گی، اور کسی کے ذمہ کوئی ایسی بدی نہ ڈال دی جائے گی جو اس نے نہ کی ہو۔ پھر اُن فرشتوں کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "جو کچھ تم کرتے ہو اُسے وہ جانتے ہیں" یعنی اُن کا حال دُنیا کی سی آئی ڈی اور اطلاعات (Intelligence) کی ایجنسیوں جیسا نہیں ہے کہ ساری تگ و دو کے باوجود بہت سی باتیں اُن سے چھپی رہ جاتی ہیں۔ وہ ہر ایک کے اعمال سے پُوری طرح باخبر ہیں۔ ہر جگہ ہر حال میں ہر شخص کے ساتھ اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے، اور اُنہیں یہ تک معلوم ہوتا ہے کہ کس شخص نے کس نیت سے کوئی کام کیا ہے۔ اس لیے اُن کا مرتب کردہ ریکارڈ ایک مکمل ریکارڈ ہے جس میں درج ہونے سے کوئی بات رہ نہیں گئی ہے اسی کے متعلق سورۂ کہف آیت ۴۹ میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز مجرمین یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اُن کا جو نامۂ اعمال پیش کیا جا رہا ہے اس میں کوئی چھوٹی یا بڑی بات درج ہونے سے نہیں رہ گئی ہے جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب جُوں کا تُوں ان کے سامنے حاضر ہے۔ (۱۱۷)

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۔ (الزلزال: ۲ تا ۵)

"اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی، اور انسان کہے گا کہ یہ اِس کو کیا ہو رہا ہے؟ اُس روز وہ اپنے (اُوپر گزرے ہُوئے) حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اُسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہو گا۔"

یہ وہی مضمون ہے جو سُورۂ انشقاق آیت ۴ میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ" اور جو کچھ اُس کے اندر ہے اُسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی"۔ اِس کے کئی مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مرے ہوئے انسان زمین کے اندر جہاں جہاں جس شکل اور جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے اُن سب کو وہ نکال کر باہر ڈال دیگی، اور بعد کا فقرہ اِس پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے جسم کے تمام بکھرے ہوئے اجزاء جمع ہو کر از سرِ نَو اُسی شکل و صورت میں زندہ ہو جائیں گے جس میں وہ پہلی زندگی کی حالت میں تھے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو اور وہ بالکل ہی نئے آدمی ہوں تو وہ یہ کیسے کہیں گے کہ زمین کو یہ کیا ہو رہا ہے۔ نئے آدمیوں نے زمین کی پہلی حالت کو دیکھا ہی کب ہوگا کہ وہ یہ کہہ سکیں؟ دوسرا مطلب یہ ہے کہ صرف مرے ہوئے انسانوں ہی کو وہ باہر نکال پھینکنے پر اکتفا نہ کرے گی، بلکہ اُن کی پہلی زندگی کے افعال و اقوال اور حرکات و سکنات کی شہادتوں کا جو انبار اس کی تہوں میں دبا پڑا ہے اُس سب کو بھی وہ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اِس پر بعد کا یہ فقرہ دلالت کرتا ہے کہ زمین اپنے اُوپر گزرے ہوئے حالات بیان کرے گی۔ تیسرا مطلب بعض مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سونا، چاندی، جواہر اور ہر قسم کی دولت جو زمین کے پیٹ میں ہے اس کے بھی ڈھیر کے ڈھیر وہ باہر نکال کر رکھ دے گی اور انسان دیکھے گا کہ یہی ہیں وہ چیزیں جن پر وہ دُنیا میں مرا جاتا تھا، جن کی خاطر اُس نے قتل کیے، حق داروں کے حقوق مارے، چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے، خشکی اور تری میں قزاقیاں کیں، جنگ کے معرکے برپا کیے، اور پوری پوری قوموں کو تباہ کر ڈالا۔ آج وہ سب کچھ سامنے موجود ہے اور اُس کے کسی کام کا نہیں بلکہ اُلٹا اس کے لیے عذاب کا سامان بنا ہوا ہے۔

دوسرے فقرے میں انسان سے مُراد ہر انسان بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ زندہ ہو کر ہوش میں آتے ہی پہلا تاثر ہر شخص پر یہی ہوگا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، بعد میں اُس پر یہ بات کھلے گی کہ یہ روزِ حشر ہے۔ اور انسان سے مراد آخرت کا منکر انسان بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ جس چیز کو وہ غیر ممکن سمجھتا تھا وہ اس کے سامنے برپا ہو رہی ہوگی اور وہ اس پر حیران و پریشان ہوگا۔ رہے اہلِ ایمان تو اُنہیں کوئی حیرانی و پریشانی نہ ہوگی، اس لیے کہ سب کچھ ان کے عقیدہ و یقین کے مطابق ہو رہا ہوگا۔

تیسرے فقرے میں فرمایا گیا ہے کہ زمین اپنے حالات سنائے گی، کیونکہ اس کے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ آیت پڑھ کر پُوچھا "جانتے ہو اس کے وہ حالات کیا ہیں؟" لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اُس کے رسُول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا "وہ حالات یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور بندی کے بارے میں اُس عمل کی گواہی دے گی جو اس کی پیٹھ پر اُس نے کیا ہوگا۔ وہ کہے گی کہ اِس نے فلاں دن فلاں کام کیا تھا۔ یہ ہیں وہ حالات جو زمین بیان کرے گی" (مسند احمد، ترمذی،

نسائی، ابن جریر، عَبد بن حُمَید، ابن المُنذِر، حاکم، ابن مَردُویَہ، بَیہَقی فی الشُّعَب)۔ حضرت رَبِیعۃُ الجُرَشِی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "ذرا زمین سے بچ کر رہنا کیونکہ یہ تمہاری جڑ بنیاد ہے اور اس پر عمل کرنے والا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے عمل کی یہ خبر نہ دے خواہ اچھا ہو یا بُرا" (مُعجَم الطَّبَرانی)۔ حضرت اَنَسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "قیامت کے روز زمین ہر اُس عمل کو لے آئے گی جو اُس کی پیٹھ پر کیا گیا ہو گا۔" پھر آپؐ نے یہی آیات تلاوت فرمائیں (ابن مردویہ، بَیہَقی)۔ حضرت علیؓ کے حالات میں لکھا ہے کہ جب آپ بیت المال کا سب روپیہ اہلِ حقوق میں تقسیم کر کے اُسے خالی کر دیتے تو اس میں دو رکعت نماز پڑھتے اور پھر فرماتے "تجھے گواہی دینی ہو گی کہ میں نے تجھ کو حق کے ساتھ بھرا اور حق ہی کے ساتھ خالی کر دیا۔"

زمین کے متعلق یہ بات کہ وہ قیامت کے روز اپنے اُوپر گزرے ہُوئے سب حالات اور واقعات بیان کرے گی، قدیم زمانے کے آدمی کے لیے تو بڑی حیران کُن ہو گی کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی۔ لیکن آج علومِ طبیعی کے انکشافات اور سینما، لاؤڈ سپیکر، ریڈیو، ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈر، الیکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اس دَور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات کیسے بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے اُس کے نقوش ہوا میں، ریڈیائی لہروں میں، گھروں کی دیواروں اور اُن کے فرش اور چھت کے ذرّے ذرّے میں، اور اگر کسی سڑک یا میدان یا کھیت میں آدمی نے بات کی ہو تو اُن سب کے ذرّات میں ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے اِن ساری آوازوں کو ٹھیک اُسی طرح ان چیزوں سے دُہرا سکتا ہے جس طرح کبھی وہ انسان کے مُنہ سے نکلی تھیں۔ انسان اپنے کانوں سے اُس وقت سُن لے گا کہ یہ اُس کی اپنی ہی آوازیں ہیں اور اُس کے سب جاننے والے پہچان لیں گے کہ جو کچھ وہ سُن رہے ہیں وہ اُسی شخص کی آواز اور اُسی کا لہجہ ہے۔ پھر انسان نے زمین پر جہاں جس حالت میں بھی کوئی کام کیا ہے اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اُس کے گرد و پیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہے اور اس کی تصویر اُن پر نقش ہو چکی ہے۔ بالکل گھُپ اندھیرے میں بھی اُس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شعاعیں موجود ہیں جن کے لیے اندھیرا اور اُجالا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہیں۔ یہ ساری تصویریں قیامت کے روز ایک متحرک فلم کی طرح انسان کے سامنے آ جائیں گی اور یہ دکھا دیں گی کہ وہ زندگی بھر کس وقت، کہاں کہاں کیا کچھ کرتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے اعمال کو براہِ راست خود جانتا ہے، مگر آخرت میں جب وہ عدالت قائم کرے گا تو جس کو بھی سزا دے گا، انصاف کے تمام تقاضے پُورے کر کے دے گا۔ اُس کی عدالت میں ہر مجرم انسان کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا جائے گا اُس کو ایسی کھُلی شہادتوں سے ثابت کر دیا جائے گا

کہ اُس کے مجرم ہونے میں کسی کلام کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ سب سے پہلے تو وہ نامۂ اعمال ہے جس میں ہر وقت اُس کے ساتھ لگے ہوئے کراماً کاتبین اس کے ایک ایک قول اور فعل کا ریکارڈ درج کر رہے ہیں۔ یہ نامۂ اعمال اُس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ "پڑھ اپنا کارنامۂ حیات، اپنا حساب لینے کے لیے تو خود کافی ہے" (بنی اسرائیل ۱۴)۔ انسان اُسے پڑھ کر حیران رہ جائے گا کہ کوئی چھوٹی یا بڑی چیز ایسی نہیں ہے جو اُس میں ٹھیک ٹھیک درج نہ ہو (الکہف - ۴۹)۔ اِس کے بعد انسان کا اپنا جسم ہے جس سے اُس نے دُنیا میں کام لیا ہے۔ اللہ کی عدالت میں اُس کی اپنی زبان شہادت دے گی کہ اُس سے وہ کیا کچھ بولتا رہا ہے، اس کے اپنے ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے کہ ان سے کیا کیا کام اُس نے لیے (النور ۲۴)۔ اس کی آنکھیں شہادت دیں گی کہ اُن سے اُس نے کیا کچھ دیکھا۔ اس کے کان شہادت دیں گے کہ اُن سے اُس نے کیا کچھ سُنا۔ اس کے جسم کی پُوری کھال اس کے افعال کی شہادت دے گی۔ وہ حیران ہو کر اپنے اعضا سے کہے گا کہ تم بھی میرے خلاف گواہی دے رہے ہو؟ اُس کے اعضا جواب دیں گے کہ آج جس خدا کے حکم سے ہر چیز بول رہی ہے اُسی کے حکم سے ہم بھی بول رہے ہیں (حٰمٓ السجدہ - ۲۰ تا ۲۲)۔ اِس پر مزید وہ شہادتیں ہیں جو زمین اور اس کے پُورے ماحول سے پیش کی جائیں گی جن میں آدمی اپنی آوازیں خود اپنے کانوں سے سُنے گا اور اپنی حرکات کی ہُو بہُو تصویریں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اِس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ انسان کے دل میں جو خیالات، ارادے اور مقاصد چھُپے ہوئے تھے، اور جن نیّتوں کے ساتھ اس نے اعمال کیے تھے وہ بھی نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے، جیسا کہ سُورۂ عادیات میں بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے قطعی اور صریح اور ناقابلِ انکار ثبوت سامنے آجانے کے بعد انسان دم بخود رہ جائے گا اور اُس کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کا موقع باقی نہ رہے گا، جیسا کہ سُورۂ المرسلات، آیات ۳۵-۳۶ میں ارشاد ہُوا ہے۔ (۱۱۸)

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۔ (الکہف - ۴۹)

○ اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اُس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ "ہائے ہماری کم بختی، یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی یا بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اِس میں درج نہ کی گئی ہو۔" جو جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے، اور تیرا رب کسی پر ظلم نہ

کرے گا۔"

یعنی ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ کسی نے کوئی جرم نہ کیا ہو اور وہ خواہ مخواہ اُس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جائے، اور نہ یہی ہوگا کہ آدمی کو اُس کے جرم سے بڑھ کر سزا دی جائے، یا بے گناہ کو پکڑ کر سزا دے ڈالی جائے۔ (۱۱۹)

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ (القمر: ۵۲-۵۳)

"جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے۔"

یعنی یہ لوگ اِس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ ان کا کیا دھرا کہیں غائب ہو گیا ہے۔ نہیں، ہر شخص، ہر گروہ، اور ہر قوم کا پورا ریکارڈ محفوظ ہے اور اپنے وقت پر وہ سامنے آجائے گا۔ (۱۲۰)

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا أَحْصَاهُ اللَّهُ وَنَسُوهُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (المجادلہ-۶)

"(یہ ذلّت کا عذاب ہونا ہے) اُس دن جب اللہ اُن سب کو پھر سے زندہ کر کے اُٹھائے گا اور اُنہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ وہ بھول گئے ہیں مگر اللہ نے ان کا سب کیا دھرا گن گن کر محفوظ کر رکھا ہے اور اللہ ایک ایک چیز پر شاہد ہے۔"

یعنی اُن کے بھول جانے سے معاملہ رفت گذشت نہیں ہو گیا ہے۔ اُن کے لیے خدا کی نافرمانی اور اُس کے احکام کی خلاف ورزی ایسی معمولی چیز ہو سکتی ہے کہ اُس کا ارتکاب کر کے اسے یاد تک نہ رکھیں، بلکہ اسے کوئی قابلِ اعتراض چیز ہی نہ سمجھیں کہ اُس کی کچھ پروا اُنہیں ہو۔ مگر خدا کے نزدیک یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اُس کے ہاں اُن کا ہر کرتوت نوٹ ہو چکا ہے۔ کس شخص نے، کب، کہاں، کس غرض سے، کیا حرکت کی، اُس حرکت کے بعد اُس کا اپنا ردِّ عمل کیا تھا، اور اس کے کیا نتائج، کہاں کہاں، کس کس شکل میں برآمد ہوئے، یہ سب کچھ اُس کے دفتر میں لکھ لیا گیا ہے۔ (۱۲۱)

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (یٰس-۶۵)

"آج ہم اُن کے مُنہ بند کیے دیتے ہیں، اُن کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دُنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں۔"

یہ حکم اُن ہیکڑ مجرموں کے معاملہ میں دیا جائے گا جو اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کریں گے، گواہیوں

کو بھی جھٹلا دیں گے، اور نامۂ اعمال کی صحت بھی تسلیم نہ کریں گے تب اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ اچھا، اپنی کلو ا بند کرو اور دیکھو کہ تمہارے اپنے اعضاء تمہارے بدن تمہارے کرتوتوں کی کیا رُوداد سناتے ہیں۔ (۱۴۲)

یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔

(النّور۔۲۴)

"وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی زبانیں اور اُن کے اپنے ہاتھ پاؤں اُن کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو سُورۂ یٰسٓ کی اُس آیت میں جو پہلے نقل ہوئی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اُن کے منہ بند کر دیں گے، اور دوسری طرف سُورۃ نُور کی اِس آیت میں فرماتا ہے کہ اُن کی زبانیں گواہی دیں گی۔ اِن دونوں باتوں میں تطابق کیسے ہوگا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ مُنہ بند کر دینے سے مُراد اُن کا اختیارِ کلام سلب کر لینا ہے، یعنی اس کے بعد وہ اپنی زبان سے اپنی مرضی کے مطابق بات نہ کر سکیں گے۔ اور زبانوں کی شہادت سے مُراد یہ ہے کہ اُن کی زبانیں خود یہ داستان شروع کر دیں گی کہ ہم سے اِن ظالموں نے کیا کام لیا تھا، کیسے کیسے کُفر بکے تھے، کیا کیا جھُوٹ بولے تھے، کیا کیا فتنے برپا کیے تھے اور کس کس موقع پر انہوں نے ہمارے ذریعے سے کیا باتیں کی تھیں۔ (۱۴۳)

حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۲۰-۲۱)

"پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو اُن کے کان اور اُن کی آنکھیں اور اُن کے جسم کی کھالیں اُن پر گواہی دیں گی کہ وہ دُنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے "تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" وہ جواب دیں گی "ہمیں اُسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔ اُسی نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور اسی کی طرف تم پلٹائے جا رہے ہو۔"

احادیث میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ جب کوئی ہیکڑ مجرم اپنے جرائم کا انکار ہی کرتا چلا جائیگا اور تمام شہادتوں کو بھی جھٹلانے پر تُل جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے جسم کے اعضاء ایک ایک کر کے شہادت دیں گے کہ اُس نے اُن سے کیا کیا کام لیے تھے۔ یہ مضمون حضرت انسؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور

مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، بزار وغیرہ محدثین نے ان روایات کو نقل کیا ہے۔

یہ آیت منجملہ اُن بہت سی آیات کے ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالمِ آخرت محض ایک روحانی عالم نہیں ہوگا بلکہ انسان وہاں دوبارہ اُسی طرح جسم و روح کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ اب دنیا میں ہیں، بلکہ اُن کو جسم بھی وہی دیا جائے گا جس میں اب وہ رہتے ہیں۔ وہی تمام اجزا اور جواہر (Atoms) جن سے اُن کے بدن اس دنیا میں مرکب تھے، قیامت کے روز جمع کر دیئے جائیں گے اور وہ اپنے اُنہی سابق جسموں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جن کے اندر رہ کر وہ دنیا میں کام کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اعضاء وہاں اُسی صورت میں تو گواہی دے سکتے ہیں جبکہ وہ وہی اعضاء ہوں جن سے اُس نے اپنی پہلی زندگی میں جرم کا ارتکاب کیا تھا، اس مضمون پر قرآن مجید کی حسبِ ذیل آیات بھی دلیل قاطع ہیں: بنی اسرائیل، آیات ۴۹ تا ۵۱ - ۹۸۔ المؤمنون، ۳۵ تا ۳۸ - ۸۲ - ۸۳۔ النور، ۲۴۔ السجدہ، ۱۰۔ یٰسٓ، ۵۱ - ۶۵ - ۷۸ - ۷۹۔ الصافات، ۱۶ تا ۱۸۔ الواقعہ، ۴۷ تا ۵۰۔ النازعات، ۱۰ تا ۱۴۔ (۱۴۲)

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ۝ (یٰسٓ - ۱۲)

"ہم یقیناً ایک روز مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال اُنہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں، اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے۔"

اِس سے معلوم ہوا کہ انسان کا نامۂ اعمال تین قسم کے اندراجات پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ ہر شخص جو کچھ بھی اچھا یا بُرا عمل کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے۔ دوسرے، اپنے گرد و پیش کی اشیاء اور خود اپنے جسم کے اعضاء پر جو نقوش (Impressions) بھی انسان مرتسم کرتا ہے وہ سب کے سب ثبت ہو جاتے ہیں، اور یہ سارے نقوش ایک وقت اِس طرح اُبھر آئیں گے کہ اُس کی اپنی آواز سنی جائے گی، اس کے اپنے خیالات اور نیتوں اور ارادوں کی پوری داستان اس کی لوحِ ذہن پر لکھی نظر آئے گی اور اس کے ایک ایک اچھے اور بُرے فعل اور اس کی تمام حرکات و سکنات کی تصویریں سامنے آ جائیں گی۔ تیسرے، اپنے مرنے کے بعد اپنی آئندہ نسل پر، اپنے معاشرے پر اور پوری انسانیت پر اپنے اچھے اور بُرے اعمال کے جو اثرات وہ چھوڑ گیا ہے وہ جس وقت تک اور جہاں جہاں تک کارفرما رہیں گے وہ سب اس کے حساب میں لکھے جاتے رہیں گے۔ اپنی اولاد کو جو بھی اچھی یا بُری تربیت اُس نے دی ہے، اپنے معاشرے میں جو بھلائیاں یا بُرائیاں بھی اُس نے پھیلائی ہیں، اور انسانیت کے حق میں جو پھول یا کانٹے بھی وہ بو گیا ہے

اُن سب کا پُورا ریکارڈ اُس وقت تک تیار کیا جاتا رہے گا جب تک اس کی لگائی ہُوئی یہ فصل دُنیا میں اپنے اچھے یا بُرے پھل لاتی رہے گی۔ (۱۴۵)

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۗ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔

(الجاثیہ: ۲۸-۲۹)

"اُس وقت تم ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامۂ اعمال دیکھے۔ اُن سے کہا جائے گا: "آج تم لوگوں کو اُن اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے تھے۔ یہ ہمارا تیار کرایا ہُوا نامۂ اعمال ہے جو تمہارے اُوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے۔ جو کچھ بھی تم کرتے تھے اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے"

لکھوانے کی صرف یہی ایک ممکن صورت نہیں ہے کہ کاغذ پر قلم سے لکھوایا جائے۔ انسانی اقوال و افعال کو ثبت کرنے اور دوبارہ اُن کو بعینہٖ اُسی شکل میں پیش کر دینے کی متعدد دوسری صُورتیں اسی دنیا میں خود انسان دریافت کر چکا ہے، اور ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ آگے اس کے اور کیا امکانات پوشیدہ ہیں جو کبھی انسان ہی کی گرفت میں آجائیں گے۔ اب یہ کون جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کس طرح انسان کی ایک ایک بات، اور اس کی حرکات و سکنات میں سے ایک ایک چیز اور اُس کی نیتوں اور ارادوں اور خواہشات اور خیالات میں سے ہر مخفی سے مخفی شے کو ثبت کرا رہا ہے، اور کس طرح وہ ہر آدمی، ہر گروہ اور ہر قوم کا پُورا کارنامۂ حیات بے کم و کاست اس کے سامنے لا کر رکھ دے گا۔ (۱۴۶)

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ؕ (المُرسلٰت۔ ۱۱)

"اور جب رسُولوں کی حاضری کا وقت آپہنچے گا"

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ میدانِ حشر میں جب نوعِ انسانی کا مقدمہ پیش ہوگا تو ہر قوم کے رسُول کو شہادت کے لیے پیش کیا جائے گا تاکہ وہ اِس امر کی گواہی دے کہ اُس نے اللہ کا پیغام اُن لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ یہ گمراہوں اور مجرموں کے خلاف اللہ کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی حجت ہوگی جس سے یہ ثابت کیا جائے گا کہ وہ اپنی غلط روش کے خود ذمہ دار ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو خبردار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں تفہیم القرآن جلد دوم، الاعراف، آیات ۶، ۱۷۲، ۱۷۳۔ حواشی ۴، ۱۳۴، ۱۳۵۔ جلد چہارم، الزُّمر، آیت ۶۹، حاشیہ ۸۰، جلد ششم، المُلک، آیت ۸۔ حاشیہ ۱۴۔ (۱۴۷)

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ (الزمر-۶۹)

"اور کتابِ اعمال لاکر رکھ دی جائے گی، انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیے جائیں گے، لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور اُن پر کوئی ظلم نہ ہوگا"

انبیاء تو اس امر کی گواہی دیں گے کہ انہوں نے خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ ان کے سوا دوسرے گواہوں سے مراد وہ گواہ بھی ہیں جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ انبیاء کے بعد لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا گیا تھا، اور وہ گواہ بھی جو لوگوں کے اعمال کی شہادت پیش کریں گے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ گواہ صرف انسان ہی ہوں۔ فرشتے اور جن اور حیوانات، اور انسانوں کے اپنے اعضاء اور در و دیوار اور شجر و حجر، سب اُن گواہوں میں شامل ہوں گے۔ (۱۲۸)

أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۔ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (العٰدیٰت: ۹-۱۰)

"تو کیا وہ اُس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون) ہے اُسے نکال لیا جائے گا، اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اُسے برآمد کر کے اُس کی جانچ پڑتال کی جائے گی؟"

یعنی مرے ہوئے انسان جہاں جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے وہاں سے اُن کو نکال کر زندہ انسانوں کی شکل میں اُٹھایا جائے گا۔ اور دلوں میں جو ارادے اور نیتیں، جو اغراض و مقاصد، جو خیالات و افکار اور ظاہری افعال کے پیچھے جو محرکات (Motives) چھپے ہوئے ہوں گے وہ سب کھول کر رکھ دیے جائیں گے۔ اور اُن کی جانچ پڑتال کر کے اچھائی کو الگ اور برائی کو الگ چھانٹ دیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر فیصلہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا کہ انسان نے عملاً کیا کچھ کیا، بلکہ دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو بھی نکال کر یہ دیکھا جائے گا کہ جو کام انسان نے کیے وہ کس نیت سے اور کس غرض سے کیے۔ اس بات پر اگر غور کیا جائے تو انسان یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصلی اور مکمل انصاف خدا کی عدالت کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ دُنیا کے لادینی قوانین بھی اصولی حیثیت سے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے محض ظاہری فعل کی بنا پر اُسے سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس نے کس نیت سے وہ فعل کیا ہے، لیکن دنیا کی کسی عدالت کے پاس بھی وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے۔ یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے کہ انسان کے ہر ظاہری فعل کے پیچھے جو باطنی محرکات کارفرما رہے ہیں اُن کی بھی جانچ پڑتال کرے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ وہ کس جزا یا سزا کا مستحق ہے۔ پھر آیت کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ محض اللہ کے اُس علم کی بنا پر نہیں ہوگا جو وہ دلوں کے ارادوں اور نیتوں کے متعلق پہلے ہی سے رکھتا ہے، بلکہ قیامت کے

روز ان رازوں کو کھول کر علانیہ سامنے رکھ دیا جائے گا اور کھلی عدالت میں جانچ پڑتال کر کے یہ دیکھا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھی اور شر کیا تھا۔ اسی لیے مُحَصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ تحصیل کے معنی کسی چیز کو نکال کر باہر لانے کے بھی ہیں، مثلاً چھلکا اُتار کر مغز نکالنا۔ اور مختلف چیزوں کو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لہٰذا دلوں کے اَسرار کی تحصیل میں یہ دونوں
(۱۳۹) معنی شامل ہیں۔ ان کو کھول کر ظاہر کر دینا بھی اور ان کو چھانٹ کر بُرائی اور بھلائی کو الگ کر دینا بھی

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ، وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ إِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔

(الطارق: ۹-۱۴)

"جس روز پوشیدہ اَسرار کی جانچ پڑتال ہوگی اُس وقت انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا۔ قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی اور (نباتات اُگتے وقت) پھٹ جانے والی زمین کی، یہ ایک جچی تلی بات ہے، ہنسی مذاق نہیں ہے۔"

پوشیدہ اَسرار سے مُراد ہر شخص کے وہ اعمال بھی ہیں جو دُنیا میں ایک راز بن کر رہ گئے، اور وہ معاملات بھی ہیں جو اپنی ظاہری صورت میں تو دُنیا کے سامنے آئے مگر اُن کے پیچھے جو نیتیں اور اغراض اور خواہشات کام کر رہی تھیں، اُن کے جو باطنی محرکات تھے، اُن کا حال لوگوں سے چھپا رہ گیا۔ قیامت کے روز یہ سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا اور جانچ پڑتال صرف اِسی بات کی نہیں ہوگی کہ کس شخص نے کیا کچھ کیا، بلکہ اس بات کی بھی ہوگی کہ کس وجہ سے کیا، کس غرض اور کس نیت اور کس مقصد سے کیا۔ اِسی طرح یہ بات بھی ساری دُنیا سے، حتیٰ کہ ایک فعل کرنے والے انسان سے بھی مخفی رہ گئی ہے کہ جو فعل اس نے کیا اُس کے کیا اثرات دُنیا میں ہوئے، کہاں کہاں پہنچے اور کتنی مدت تک چلتے رہے۔ یہ راز بھی قیامت ہی کے روز کھلے گا اور اس کی پُوری جانچ پڑتال ہوگی کہ جو بیج کوئی شخص دنیا میں بو گیا تھا اس کی فصل کس کس شکل میں کب تک کٹتی رہی اور کون کون اسے کاٹتا رہا۔

آخری فقروں کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آسمان سے بارشوں کا برسنا اور زمین کا شق ہو کر نباتات اپنے اندر سے اُگلنا کوئی مذاق نہیں ہے بلکہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے، اُسی طرح قرآن جس چیز کی خبر دے رہا ہے کہ انسان کو پھر اپنے خدا کی طرف پلٹنا ہے، یہ بھی کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے بلکہ ایک دوٹوک بات ہے، ایک سنجیدہ حقیقت ہے، ایک اٹل قول حق ہے جسے پُورا ہو کر رہنا ہے۔ (۱۴۰)

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ ○ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ○ وَّ لَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ○ (القیامہ - ۱۳ تا ۱۵)

"اُس روز انسان کو اُس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا۔ بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔"

اصل الفاظ ہیں بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، اور غالباً وہ سب ہی مُراد ہیں۔ ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ آدمی کو اُس روز یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اپنی دُنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کما کر اُس نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجی تھی اور یہ حساب بھی اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا بُرے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا جو اُس کے بعد مُدتہائے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اُسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اُسے کرنا چاہیے تھا مگر اس نے نہیں کیا اور جو کچھ نہ کرنا چاہیے تھا وہ اُس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اُس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا اُس کا پُورا حساب تاریخ وار اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنی یہ ہیں کہ جو نیکی یا بدی اُس نے کی وہ بھی اُسے بتا دی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اُس سے بھی اُسے آگاہ کر دیا جائے گا۔

مگر آدمی کا نامۂ اعمال اُس کے سامنے رکھنے کی غرض درحقیقت یہ نہیں ہوگی کہ مُجرم کو اُس کا جرم بتایا جائے، بلکہ ایسا کرنا تو اِس وجہ سے ضروری ہوگا کہ انصاف کے تقاضے برسرِعدالت جُرم کا ثبوت پیش کیے بغیر پُورے نہیں ہوتے۔ ورنہ ہر انسان خوب جانتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ اپنے آپ کو جاننے کے لیے وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ اسے کوئی دوسرا بتائے کہ وہ کیا ہے۔ ایک جھُوٹا دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے لیکن اُسے خود تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک چور لاکھ حیلے اپنی چوری چھُپانے کے لیے اختیار کر سکتا ہے، مگر اس کے اپنے نفس سے تو یہ بات مخفی نہیں ہوتی کہ وہ چور ہے۔ ایک گمراہ آدمی ہزار دلیلیں پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ جس کُفر یا دہریت یا شرک کا قائل ہے وہ درحقیقت اُس کی ایماندارانہ رائے ہے، لیکن اس کا اپنا ضمیر تو اس سے بے خبر نہیں ہوتا کہ اِن عقائد پر وہ کیوں جما ہوا ہے اور اِن کی غلطی سمجھنے اور تسلیم کرنے سے دراصل کیا چیز اُسے روک رہی ہے۔ ایک ظالم، ایک بدنیت، ایک بدکردار، ایک حرام خور اپنی بداعمالیوں کے لیے طرح طرح کی معذرتیں پیش کر کے خود اپنے ضمیر تک کا منہ بند کرنے کی کوشش کر سکتا ہے تاکہ وہ اسے ملامت کرنے سے باز آجائے اور یہ مان لے کہ واقعی کچھ مجبوریاں، کچھ مصلحتیں، کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود

اُس کو یہ علم تو بہر حال ہونا ہی ہے کہ اس نے کس پر کیا ظلم کیا ہے، کس کا حق مارا ہے، کس کی عصمت خراب کی ہے، کس کو دھوکا دیا ہے، اور کن ناجائز طریقوں سے کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لیے آخرت کی عدالت میں پیش ہوتے وقت ہر کافر، ہر منافق، ہر فاسق و فاجر اور مجرم خود جانتا ہو گا کہ وہ کیا کر کے آیا ہے اور کس حیثیت میں آج اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہے۔ (۱۳۱)

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى (النازعات، ۳۴-۳۵)

"پھر جب وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہو گا، اُس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا۔"

یعنی جب انسان دیکھ لے گا کہ وہی محاسبے کا دن آ گیا ہے جس کی اُسے دنیا میں خبر دی جا رہی تھی، تو قبل اس کے کہ اُس کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے، اُسے ایک ایک کر کے خود ہی اپنی وہ سب حرکتیں یاد آنے لگیں گی جو وہ دنیا میں کر کے آیا ہو گا۔ بعض لوگوں کو اسی دنیا میں یہ تجربہ ہوتا ہے کہ جب یکایک وہ کسی ایسے خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں جس سے موت اُن کو بالکل قریب کھڑی نظر آنے لگتی ہے تو اپنی پوری زندگی کی فلم اُن کی چشم تصوّر کے سامنے یک لخت پھر جاتی ہے۔ (۱۳۲)

وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ۭ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ (الفجر، ۲۳-۲۴)

"اور جہنم اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی، حالانکہ اُس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا۔"

اصل الفاظ ہیں يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اُس روز انسان یاد کرے گا کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہے اور اس پر نادم ہو گا، مگر اُس وقت یاد کرنے اور نادم ہونے کا کیا فائدہ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اُس روز انسان کو ہوش آئے گا، اُسے نصیحت حاصل ہو گی، اُس کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ جو کچھ اُسے انبیاء نے بتایا تھا وہی صحیح تھا اور اُن کی بات نہ مان کر اُس نے حماقت کی، مگر اُس وقت ہوش میں آنے اور نصیحت پکڑنے اور اپنی غلطی کو سمجھنے کا کیا فائدہ؟ (۱۳۳)

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ (الانفطار، ۵)

"اُس وقت ہر شخص کو اُس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا۔"

اصل الفاظ ہیں مَا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ۔ ان الفاظ کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور وہ سب ہی یہاں مراد ہیں۔ مثلاً:

۱ - جو اچھا یا بُرا عمل آدمی نے کر کے آگے بھیج دیا وہ مَا قَدَّمَتْ ہے اور جس کے کرنے سے وہ باز رہا وہ مَا اَخَّرَتْ - اِس لحاظ سے یہ الفاظ تقریباً انگریزی زبان کے الفاظ commission اور Ommission کے ہم معنی ہیں۔

۲ - جو کچھ پہلے کیا وہ مَا قَدَّمَتْ ہے اور جو کچھ بعد میں کیا وہ مَا اَخَّرَتْ، یعنی آدمی کا پورا نامۂ اعمال ترتیب وار اور تاریخ وار اس کے سامنے آجائے گا۔

۳ - جو اچھے اور بُرے اعمال آدمی نے اپنی زندگی میں کیے وہ مَا قَدَّمَتْ ہیں اور اِن اعمال کے جو آثار و نتائج وہ انسانی معاشرے میں اپنے پیچھے چھوڑ گیا وہ مَا اَخَّرَتْ۔ (۱۴)

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال: ۶تا۸)

"اُس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ اُن کے اعمال اُن کو دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔"

پہلے فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر ایک اکیلا اپنی انفرادی حیثیت میں ہو گا۔ خاندان، جتھے، پارٹیاں، قومیں، سب بکھر جائیں گی۔ یہ بات قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس روز لوگوں سے فرمائے گا کہ "لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا تھا" (آیت ۹۴)۔ اور سورۂ مریم میں فرمایا "یہ اکیلا ہمارے پاس آئے گا" (آیت ۸۰)۔ اور یہ کہ "اُن میں سے ہر ایک قیامت کے روز اللہ کے حضور اکیلا حاضر ہوگا" (آیت ۹۵)۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ تمام لوگ جو ہزارہا برس کے دوران میں جگہ جگہ مرے تھے، زمین کے گوشے گوشے سے گروہ در گروہ چلے آ رہے ہوں گے، جیسا کہ سورۂ نبا میں فرمایا گیا ہے کہ "جس روز صور میں پھونک ماردی جائے گی تم فوج در فوج آجاؤ گے" (آیت ۱۸)۔

اُن کو اُن کے اعمال دکھائے جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہر نیک و بد کو اس کا نامۂ اعمال دے دیا جائے گا کہ وہ دیکھ لے کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کی تصریح فرمائی گئی ہے کہ کافر و مومن، صالح و فاسق، تابع فرمان اور نافرمان، سب کو ان کے نامۂ اعمال دے دیے جائیں گے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الحاقہ، آیات ۱۹، ۲۵، اور الانشقاق، آیات ۷-۱۰)۔ ظاہر ہے کہ کسی کو اُس کے اعمال دکھانے اور اس کا نامۂ اعمال اُس کے حوالے کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ علاوہ بریں زمین جب اپنے اوپر گزرے

ہوتے حالات پیش کرے گی تو حق و باطل کی وہ کشمکش جو ابتدا سے برپا ہے اور قیامت تک برپا رہے گی اُس کا پورا نقشہ بھی سب کے سامنے آجائے گا، اور اس میں سب ہی دیکھ لیں گے کہ حق کے لیے کام کرنے والوں نے کیا کچھ کیا، اور باطل کی حمایت کرنے والوں نے ان کے مقابلے میں کیا کیا حرکتیں کیں۔ بعید نہیں کہ ہدایت کی طرف بلانے والوں اور ضلالت پھیلانے والوں کی ساری تقریریں اور گفتگوئیں لوگ اپنے کانوں سے سُن لیں۔ دونوں طرف کی تحریریں اور لٹریچر کا پورا ریکارڈ جُوں کا تُوں سب کے سامنے لاکر رکھ دیا جائے۔ حق پرستوں پر باطل پرستوں کے ظلم، اور دونوں گروہوں کے درمیان برپا ہونے والے معرکوں کے سارے مناظر میدانِ حشر کے حاضرین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

پھر یہ ارشاد کہ جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا، اِس کا ایک سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آدمی کی کوئی ذرّہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہیں ہوگی جو اس کے نامۂ اعمال میں درج ہونے سے رہ گئی ہو۔ اُسے وہ بہرحال دیکھ لے گا۔ لیکن اگر دیکھنے سے مُراد اُس کی جزا و سزا دیکھنا لیا جائے تو اس کا یہ مطلب لینا بالکل غلط ہے کہ آخرت میں ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی کی جزا اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بدی کی سزا ہر شخص کو الگ الگ دی جائیگی۔ اور کوئی شخص بھی وہاں اپنی کسی نیکی کی جزا اور کسی بدی کی سزا پانے سے نہ بچے گا کیونکہ اوّل تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ایک ایک بُرے عمل کی سزا اور ایک ایک اچھے عمل کی جزا الگ دی جائیگی۔ دوسرے اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا صالح مومن بھی اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے قصور کی سزا پانے سے نہ بچے گا اور کوئی بدترین کافر و ظالم اور بدکار انسان بھی اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے اچھے فعل کا اجر پائے بغیر نہ رہے گا۔ یہ دونوں معنی قرآن اور حدیث کی تصریحات کے بھی خلاف ہیں اور عقل بھی اسے نہیں مانتی کہ یہ تقاضائے انصاف ہے۔ عقل کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات آخر کیسے سمجھ میں آنے کے قابل ہے کہ آپ کا کوئی خادم نہایت وفادار اور خدمت گزار ہو، لیکن آپ اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے قصور کو بھی معاف نہ کریں، اور اس کی ایک ایک خدمت کا اجر و انعام دینے کے ساتھ اس کے ایک ایک قصور کو گِن گِن کر ہر ایک کی سزا بھی اسے دے ڈالیں۔ اسی طرح یہ بھی عقلاً ناقابلِ فہم ہے کہ آپ کا پروردہ کوئی شخص جس پر آپ کے بے شمار احسانات ہوں، وہ آپ سے غدّاری اور بے وفائی کرے اور آپ کے احسانات کا جواب ہمیشہ نمک حرامی ہی سے دیتا رہے، مگر آپ اُس کے مجموعی رویّے کو نظر انداز کر کے اس کی ایک ایک غدّاری کی الگ سزا اور اُس کی ایک ایک خدمت کی، خواہ وہ کسی وقت پانی لاکر دے دینے یا پنکھا جھل دینے ہی کی خدمت ہو، الگ جزا دیں۔ اب رہے قرآن و حدیث، تو وہ وضاحت کے ساتھ مومن، منافق، کافر، مومنِ صالح، مومنِ خطاکار، مومنِ ظالم و فاسق، محض کافر، اور کافرِ مفسد و ظالم وغیرہ مختلف قسم کے لوگوں کی جزا و سزا کا ایک مفصّل قانون بیان کرتے ہیں اور یہ جزا و سزا دُنیا سے آخرت تک

انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔

اِس سلسلے میں قرآن مجید اصُولی طور پر چند باتیں بالکل وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

اوّل یہ کہ کافر، مشرک اور منافق کے اعمال (یعنی وہ اعمال جن کو نیکی سمجھا جاتا ہے) ضائع کر دیے گئے، آخرت میں وہ اُن کا کوئی اجر نہیں پا سکیں گے۔ ان کا اگر کوئی اجر ہے بھی تو وہ دنیا ہی میں اُن کو مل جائے گا۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الاعراف ۱۴۷۔ التوبہ ۱۷-۶۷ تا ۶۹۔ ہود ۱۵-۱۶۔ ابراہیم ۱۸۔ الکہف ۱۰۴-۱۰۵۔ النُّور ۳۹۔ الفرقان ۲۳۔ الاحزاب ۱۹۔ الزُّمر ۶۵۔ الاحقاف ۲۰۔

دوم: یہ کہ بدی کی سزا اُتنی ہی دی جائے گی جتنی بدی کی گئی ہو، مگر نیکیوں کی جزا اصل فعل سے زیادہ دی جائے گی، بلکہ کہیں تصریح ہے کہ ہر نیکی کا اجر اس سے دس گُنا ہے، اور کہیں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ جتنا چاہے نیکی کا اجر بڑھا کر دے۔ ملاحظہ ہو البقرہ ۲۶۱۔ الانعام ۱۶۰۔ یُونس ۲۶-۲۷۔ النُّور ۳۸۔ القصص ۸۴۔ سبا ۳۷۔ المومن ۴۰۔

سوم: یہ کہ مومن اگر بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کریں گے تو اُن کے چھوٹے چھوٹے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ النساء ۳۱۔ الشوریٰ ۳۷۔ النجم ۳۲۔

چہارم: یہ کہ مومنِ صالح سے ہلکا حساب لیا جائے گا، اس کی بُرائیوں سے درگزر کیا جائے گا، اور اس کے بہترین اعمال کے لحاظ سے اس کو اجر دیا جائے گا۔ العنکبوت ۷۔ الزُّمر ۳۵۔ الاحقاف ۱۶۔ الانشقاق ۸۔

احادیث بھی اس معاملہ کو بالکل صاف کر دیتی ہیں۔ ہم سُورۂ انشقاق کی تفسیر میں وہ احادیث نقل کر چکے ہیں جو قیامت کے روز ہلکے حساب اور سخت حساب فہمی کی تشریح کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمائی ہیں (تفہیم القرآن، جلد ششم، الانشقاق، حاشیہ ۶)۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اِتنے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور عرض کیا "یا رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کیا میں اُس ذرّہ برابر بُرائی کا نتیجہ دیکھوں گا جو مجھ سے سرزد ہوئی؟" حضورؐ نے فرمایا "اے ابوبکرؓ، دنیا میں جو معاملہ بھی تمہیں ایسا پیش آتا ہے جو تمہیں ناگوار ہو وہ اُن ذرّہ برابر بُرائیوں کا بدلہ ہے جو تم سے صادر ہوں، اور جو ذرّہ برابر نیکیاں بھی تمہاری ہیں، انہیں اللہ آخرت میں تمہارے لیے محفوظ رکھ رہا ہے۔" (ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی فی الاوسط، بیہقی فی الشعب، ابن المنذر، حاکم، ابن مَرْدُوْیَہ، عبد بن حُمَید)۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اِس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ "تم میں سے جو شخص نیکی کرے گا، اس کی جزا آخرت میں ہے، اور جو کسی قسم کی بدی کرے گا وہ اسی

دُنیا میں اُس کی سزا مصائب اور امراض کی شکل میں بھگت لے گا" (ابن مردویہ)۔ قتادہ نے حضرت انسؓ کے حوالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ مومن پر ظلم نہیں کرتا۔ دُنیا میں اس کی نیکیوں کے بدلے وہ رزق دیتا ہے۔ اور آخرت میں اُن کی جزا دے گا۔ رہا کافر تو دنیا میں اُس کی بھلائیوں کا بدلہ چکا دیا جاتا ہے، پھر جب قیامت ہوگی، تو اُس کے حساب میں کوئی نیکی نہ ہوگی" (ابن جریر)۔ مسروقؒ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "عبداللہ بن جُدعان جاہلیت کے زمانہ میں صلۂ رحمی کرتا تھا، مسکین کو کھانا کھلاتا تھا، مہمان نواز تھا، اسیروں کو رہائی دلواتا تھا۔ کیا آخرت میں یہ اُس کے لیے نافع ہوگا؟" حضورؐ نے فرمایا "نہیں، اُس نے مرتے دم تک کبھی یہ نہیں کہا کہ رَبِّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ " میرے پروردگار، روزِ جزا میں میری خطا معاف کیجیو" (ابن جریر)۔ اسی طرح کے جوابات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اور لوگوں کے بارے میں بھی دیے ہیں جو جاہلیت کے زمانے میں نیک کام کرتے تھے، مگر مرے کفر و شرک ہی کی حالت میں تھے۔ لیکن حضورؐ کے بعض ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی نیکی اُسے جہنم کے عذاب سے تو نہیں بچا سکتی، البتہ جہنم میں اُس کو وہ سخت سزا نہ دی جائے گی جو ظالم اور فاسق اور بدکار کافروں کو دی جائے گی۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ حاتم طائی کی سخاوت کی وجہ سے اُس کو ہلکا عذاب دیا جائے گا (روح المعانی)۔

تاہم یہ آیت انسان کو ایک بہت اہم حقیقت پر متنبّہ کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اپنا ایک وزن اور اپنی ایک قدر رکھتی ہے، اور یہی حال بدی کا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے، یونہی نظر انداز کر دینے والی چیز نہیں ہے۔ اِس لیے کسی چھوٹی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر اُسے چھوڑنا نہیں چاہیے، کیونکہ ایسی بہت سی نیکیاں مل کر اللہ تعالیٰ کے حساب میں ایک بہت بڑی نیکی قرار پا سکتی ہیں، اور کسی چھوٹی سے چھوٹی بدی کا ارتکاب بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح کے بہت سے چھوٹے گناہ مل کر گناہوں کا ایک انبار بن سکتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت عدیؓ بن حاتم سے یہ روایت منقول ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "دوزخ کی آگ سے بچو خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا دینے یا ایک اچھی بات کہنے ہی کے ذریعہ سے ہو"۔ انہی حضرت عدیؓ سے صحیح روایت میں حضورؐ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ "کسی نیک کام کو بھی حقیر نہ سمجھو، خواہ وہ کسی پانی مانگنے والے کے برتن میں ایک ڈول ڈال دینا ہو، یا یہی نیکی ہو کہ تم اپنے کسی بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملو"۔ بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا "اے مسلمان عورتو، کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے ہاں کوئی چیز بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے خواہ وہ بکری کا ایک کھُر ہی کیوں نہ ہو" (مسند احمد،

نسائی، اور ابنِ ماجہ میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ فرمایا کرتے تھے "اے عائشہؓ، اُن گناہوں سے بچی رہنا جن کو چھوٹا سمجھا جاتا ہے کیونکہ اللہ کے ہاں اُن کی پُرسش بھی ہونی ہے"۔ مُسندِ احمد میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "خبردار، چھوٹے گناہوں سے بچ کر رہنا، کیونکہ وہ سب آدمی پر جمع ہو جائیں گے، یہاں تک کہ اسے ہلاک کر دیں گے"۔ (۱۳۵)

آخرت میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔

آخری اہم بات جو قرآن مجید نے آخرت کے سلسلے میں بتائی وہ یہ تھی کہ وہاں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہوگی، کجا کہ کسی کو اپنے باپ، بھائی، بیٹے، بیوی، شوہر، دوست یا مُرید اور پیر وغیرہ کو بچانے کی فکر ہو۔ ہر شخص اپنے اعمال کا بوجھ خود اُٹھائے گا، کوئی نہ کسی کا بوجھ رتّی برابر بھی اُٹھانے کے لیے تیار ہوگا، اور نہ خدا کا انصاف یہ گوارا کرے گا کہ ایک کا بارِ گناہ دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ فیصلہ اُس وقت بالکل اللہ ربّ العالمین کے ہاتھ میں ہوگا جو مالکِ یوم الدین ہے۔ اُس دربار میں بولنے کا یارا کسی کو نہ ہوگا اِلّا یہ کہ اللہ خود اجازت دے اور عرض کرنے والا شخص ٹھیک بات کہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ (الفاطر:۱۸)

"کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔ اور اگر کوئی لدا ہُوا نفس اپنا بوجھ اُٹھانے کے لیے پکارے گا تو اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصّہ بھی بٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو"۔

"بوجھ" سے مُراد اعمال کی ذمّہ داریوں کا بوجھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمّہ دار ہے، اور ہر ایک پر صرف اُس کے اپنے ہی عمل کی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔ اِس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک شخص کی ذمّہ داری کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی ذمّہ داری کا بار خود اپنے اُوپر لے لے اور اُسے بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس کے جرم میں پکڑوا دے۔ یہ بات یہاں اس بنا پر فرمائی گئی تھی کہ مکّہ معظمہ میں جو لوگ ۳۲
اسلام قبول کر رہے تھے اُن سے اُن کے مشرک رشتہ دار اور برادری کے لوگ کہتے تھے کہ تم ہمارے کہنے سے اس نئے دین کو چھوڑ دو اور دینِ آبائی پر قائم رہو، عذاب ثواب ہماری گردن پر۔

پہلے فقرے میں اللہ کے قانونِ عدل کا بیان ہے کہ وہ ایک کے گناہ میں دوسرے کو نہ پکڑے گا، بلکہ ہر ایک کو اُس کے اپنے ہی گناہ کا ذمّہ دار ٹھہرائے گا۔ اور بعد کے فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو

لوگ آج یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم ہماری ذمہ داری پر کفر و معصیت کا ارتکاب کرو، قیامت کے روز ہم تمہارا بارِ گناہ اپنے اُوپر لے لیں گے، وہ دراصل محض ایک جھوٹا بھروسہ دلا رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی اور لوگ دیکھ لیں گے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں تو ہر ایک کو اپنی پڑ جائے گی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے منہ موڑ لے گا۔ اور کوئی کسی کا ذرّہ برابر بوجھ بھی اپنے اُوپر لینے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ (۱۳۹)

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۔ (عبس: ۳۴ تا ۳۷)

"اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ اُن میں سے ہر شخص پر اُس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اُسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔"

بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اُن عزیزوں کو جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ پیارے تھے مصیبت میں مبتلا دیکھ کر، بجائے اِس کے کہ اُن کی مدد کو دوڑے، اُلٹا اُن سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اُسے مدد کے لیے نہ پکار بیٹھیں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر یہ سب جس طرح ایک دوسرے کی خاطر گناہ کرتے اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اُس کے بُرے نتائج سامنے آتے دیکھ کر اُن میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہ گاریوں کی ذمہ داری اُس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی سے، اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے خلاف مقدمے کے گواہ بننے والے ہیں۔ (۱۴۰)

وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۝ يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۝ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۝ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۔ (المعارج: ۱۰ تا ۱۴)

"اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اُسے پناہ دینے والا تھا، اور رُوئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔"

یعنی ایسا نہ ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہے ہوں گے اس لیے نہ پوچھیں گے۔ بلکہ ہر ایک اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا کہ دوسرے پر کیا بن رہی ہے اور پھر وہ اسے نہ پوچھے گا کیونکہ اس کو اپنی ہی پڑی ہوگی۔

اس کے برعکس وہ چاہے گا کہ ان سب کو فدیہ میں دے کر خود چھوٹ جائے۔ (۱۳۸)

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ۔ (المؤمن - ۱۸)

"ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے"۔

ظالم سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے حق پر ظلم کر کے ناحق اور ناراستی کا طریقہ اختیار کیا ہو۔ حمیم سے مراد کسی شخص کا ایسا دوست ہے جو اس کو پٹتے دیکھ کر جوش میں آتے اور اُسے بچانے کے لیے دوڑے۔ آخری بات بر سبیل تنزل، کفار کے عقیدۂ شفاعت کی تردید کرتے ہوئے فرمائی گئی ہے حقیقت میں تو وہاں ظالموں کا کوئی شفیع سرے سے ہوگا ہی نہیں، کیونکہ شفاعت کرنے کی اجازت اگر مل بھی سکتی ہے تو اللہ کے نیک بندوں کو مل سکتی ہے، اور اللہ کے نیک بندے کبھی کافروں اور مشرکوں اور فساق و فجار کے دوست نہیں ہو سکتے کہ وہ انہیں بچانے کے لیے سفارش کا خیال بھی کریں لیکن چونکہ کفار و مشرکین اور گمراہ لوگوں کا بالعموم یہ عقیدہ رہا ہے، اور آج بھی ہے، کہ ہم جن بزرگوں کے دامن گرفتہ ہیں وہ کبھی ہمیں دوزخ میں نہ جانے دیں گے بلکہ اڑ کر کھڑے ہو جائیں گے اور ہم کو بخشوا کر ہی چھوڑیں گے، اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ایسا شفیع کوئی بھی نہ ہوگا جس کی بات مانی جائے، اور جس کی سفارش اللہ کو لازماً قبول ہی کرنی پڑے۔ (۱۳۹)

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ (النبا - ۳۸)

"جس روز روح (جبرئیل) اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بولے گا سوائے اُس کے جس کو رحمان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے"۔

یعنی میدانِ حشر میں دربارِ الٰہی کے رعب کا یہ عالم ہوگا کہ اہل زمین ہوں یا اہلِ آسمان، کسی کی بھی یہ مجال نہ ہوگی کہ از خود اللہ تعالیٰ کے حضور زبان کھولے، یا عدالت کے کام میں مداخلت کر سکے۔ بولنے سے مراد شفاعت ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہوگی۔ ایک یہ کہ جس شخص کو کسی گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی صرف وہی شخص اُسی شخص کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ شفاعت کرنے والا بجائے خود درست بات کہے، بے جا نوعیت کی سفارش نہ کرے۔ اس میں مزید ایک شرط یہ بھی نکلتی ہے کہ جس کے معاملہ میں وہ سفارش کرے وہ دنیا میں کم از کم کلمۂ حق کا قائل رہا ہو یعنی محض گنہگار ہو، کافر نہ ہو۔ (۱۴۰)

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ۔ (الانفطار - ۱۹)

"یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا اور فیصلہ اُس دن بالکل

اللہ کے اختیار میں ہوگا۔"

خلاصۂ بحث

یہ تھا دعوتِ اسلامی کا چوتھا نکتہ جس کو اس زور کے ساتھ، اس معقول انداز میں، اتنی وضاحت سے پیش کیا گیا کہ اُس کے سامنے کفّار کے محض ٹھٹھے، اور یہ احمقانہ مطالبے کہ تم اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو، کسی طرح ٹھیر نہ سکتے تھے۔ جو لوگ اپنی اغراض اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے لڑ رہے تھے، اور جن کو بہر حال لڑنا ہی تھا، اُن کو چھوڑ کر ہر ذی ہوش آدمی یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ آخرت کا برپا ہونا نہ امکان سے خارج ہے، نہ عقل کے خلاف ہے، نہ یہ ممکن ہے کہ خدا کے سامنے جواب دہی کے احساس سے خالی ہو کر دنیا میں انسان کا طرزِ عمل حق اور انصاف کے مستقل اصولوں پر ضبط کے ساتھ قائم ہو سکے، اور نہ انسان کو حقیقی اور مکمل انصاف اس کے سوا کسی اور طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ موجودہ نظامِ عالم ختم ہونے کے بعد قیامت اور حشر برپا ہو، تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جمع کر کے مالکِ کائنات کے سامنے پیش کیا جائے، اور بالکل بے لاگ طریقے سے ہر شخص کی ذمہ داری مُشخّص کر کے جزا یا سزا جس کا بھی وہ مستحق ہو اُسے دی جائے۔ (۱۴۱)

فصل پنجم

اخلاقی تعلیمات

دعوتِ اسلامی نے یہ عقائد اپنے مدلّل اور مؤثر طریقے سے پیش کرنے کے ساتھ اخلاق کا بھی ایک نہایت واضح تصور لوگوں کے سامنے رکھ دیا جس سے قرآن کے سننے اور پڑھنے والے ہر شخص کو صاف صاف معلوم ہو گیا کہ اسلام کس قسم کے اخلاق پسند اور کس قسم کے ناپسند کرتا ہے۔ انسانیت کا کونسا نمونہ اس کے نزدیک بُرا ہے جسے وہ بدلنا اور مٹانا چاہتا ہے اور کونسا نمونہ اچھا ہے جسے وہ تیار کرنا، پروان چڑھانا اور فروغ دینا چاہتا ہے۔ بُرائی اُس کی نگاہ میں کیا ہے، کیا اُس کے پیدا ہونے کے اسباب ہیں، کیا شکلیں وہ انسانی زندگی میں اختیار کرتی ہے، اور کیا چیزیں اسے نشو و نما دیتی ہیں۔ اس کے برعکس بھلائی اس کی نظر میں کیا ہے، کیا چیز اس کا اصل سرچشمہ ہے، کس طرح اُس کے ظہور کی راہیں کھلتی ہیں، اور کن شکلوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اس نے بتایا کہ

اسلام کا مقصد ہی بُرائی کے اسباب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اور بھلائی کی راہوں کو ہموار کرنا، زیادہ سے زیادہ کشادہ کرنا اور افراد سے لے کر معاشرے تک ہر شعبہ حیات میں بُرائیوں کی جگہ بھلائیوں کو قائم کر دینا ہے۔ یہ بیان اسلامی دعوت میں اتنا مفصّل، اتنا صریح، اتنا دل نشین اور عقلِ عام کے لیے اس قدر قابلِ فہم تھا کہ جاہلیت کے معاشرے میں صدیوں سے جو لوگ اخلاقی پستیوں میں مبتلا تھے اُن کے لیے بھی یہ سمجھنا کچھ دشوار نہ تھا کہ واقعی انسانیت کا وہ نمونہ بدترین ہے جسے اسلام بُرا کہہ رہا ہے اور وہی نمونہ بہترین ہے جس کے سانچے میں وہ افراد اور معاشرے کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ (۱۲۴)

اخلاق کے مسئلے میں چند بنیادی حقائق

اس سلسلے میں سب سے پہلے چند حقائق لوگوں کے سامنے پیش کیے گئے تاکہ اخلاق کا مسئلہ بنیادی طور پر اُن کی سمجھ میں آ جائے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ (الشمس: ۷ تا ۱۰)

"اور قسم ہے نفسِ انسانی کی، اور اُس ذات کی جس نے اُسے ہموار کیا، پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہو گیا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔"

نفسِ انسانی کو ہموار کرنے سے مُراد یہ ہے کہ خالق نے اُس کو ایسا جسم عطا کیا جو اپنے قامتِ راست، اپنے ہاتھ پاؤں، اور اپنے دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے موزوں ترین تھا۔ اس کو دیکھنے، سُننے، چھونے، چکھنے اور سُونگھنے کے ایسے حواس عطا کیے جو اپنے تناسب اور اپنی خصوصیات کی بنا پر اُس کے لیے بہترین ذریعۂ علم بن سکتے تھے۔ اُس کو قوتِ عقل و فکر، قوتِ استدلال و استنباط، قوتِ خیال، قوتِ حافظہ، قوتِ تمیز، قوتِ فیصلہ، قوتِ ارادی، اور دوسری ذہنی قوتیں عطا کیں جن کی بدولت وہ دُنیا میں اُس کام کے قابل ہوا جو انسان کے کرنے کا ہے۔ اُسے جبلّی بدمعاش اور پیدائشی گناہ گار بنا کر نہیں بلکہ راست اور سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس کی ساخت میں کوئی کجی نہیں رکھ دی کہ وہ سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔

اِلہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصوّر یا خیال کو غیر شعوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اُتار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفسِ انسانی پر اُس کی بدی اور نیکی و پرہیزگاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی، دونوں کے رُجحانات و میلانات رکھ

دیئے ہیں، اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات ودیعت کر دیئے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز برائی، اچھے اخلاق و اعمال اور برے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں، فجور (بدکاری) ایک قبیح چیز ہے اور تقویٰ (برائیوں سے اجتناب) ایک اچھی چیز۔ یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ اُس کی فطرت اِن سے آشنا ہے اور خالق نے برے اور بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر اُس کو عطا کر دی ہے۔

تزکیہ، پاک کرنے، اُبھارنے اور نشوونما دینے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس تدسیہ، دبانے چھپانے، بہکانے اور گمراہ کرنے کا ہم معنی ہے۔ آیت میں یہ بات فیصلہ کن طریقے سے کہی گئی ہے کہ انسان کی فلاح اور نامرادی کا سارا انحصار اِس سوال پر ہے کہ اللہ نے جو قوتیں اُس کو دی ہیں اُنہیں استعمال کر کے وہ اپنے نفس کے اچھے اور برے رُجحانات میں سے کس کو اُبھارتا اور کس کو دباتا ہے۔ فلاح صرف اُس شخص کے لیے ہے جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے اور اُس کو اُبھار کر تقویٰ کی بلندیوں پر لے جائے اور اُس کے اندر بھلائیوں کو نشوونما دے۔ اور نامراد ہے وہ جو اپنے اندر پائے جانے والے نیکی کے رجحانات کو دبا دے اور اپنے نفس کو بہکا کر برائی کے رجحانات کی طرف لے جائے اور فجور کو اُس پر اتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اُس کے نیچے اِس طرح چھپ کر رہ جائے جیسے ایک لاش قبر پر مٹی ڈال دینے کے بعد چھپ جاتی ہے۔ (۱۴۲)

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا - إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۔ (الدھر ۲-۳)

"ہم نے انسان کو (ماں اور باپ کے) ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اُس کا امتحان لیں اور اِس غرض کے لیے ہم نے اُسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا"

ماں اور باپ کے مخلوط نطفے سے تو انسان کی طرح جانور بھی پیدا ہوتا ہے، مگر انسان اور جانور میں فرق یہ ہے کہ جانور اِس دنیا میں امتحان کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے اور انسان امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اِسی وجہ سے جانوروں کے برعکس اللہ تعالیٰ نے اُس کو سمیع و بصیر بنایا یعنی علم و عقل کی طاقتیں بخشیں تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ پھر محض یہ طاقتیں دے کر اُسے چھوڑ نہیں دیا بلکہ اُس کی رہنمائی بھی کی تاکہ وہ یہ جان لے کہ بندہ خدا ہونے کی حیثیت سے اُس کے لیے شکر کا راستہ کونسا ہے اور کفر (ناشکری) کا راستہ کونسا۔ اب اُس کا امتحان اِس امر میں ہے کہ دونوں راہوں کے فرق سے آگاہ ہونے کے بعد وہ اپنی اِن طاقتوں سے کام لے کر شکر کی راہ اختیار کرتا ہے یا کفر کی راہ۔ (۱۴۳)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۔ (البلد: ۸ تا ۱۰)

"کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور دونوں نمایاں راستے اُسے نہیں دکھا دیے؟"

دو آنکھوں سے مُراد گائے بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اُسے ہر طرف وہ نشانات نظر آتیں جو حقیقت کا پتہ دیتے ہیں اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مُراد بھی محض بولنے کے آلات نہیں ہیں، بلکہ نفسِ ناطقہ (Reasoning mind) ہے جو ان آلات کی پشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا اور ان سے اظہار مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے اُسے یونہی چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے، بلکہ اس کی رہنمائی کے لیے اُس کے سامنے بھلائی اور بُرائی، نیکی اور بدی کے دونوں راستے بھی نمایاں کر کے رکھ دیئے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمہ داری پر اختیار کرے۔ (۴۵)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ (التین: ۴ تا ۶)

"ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اُلٹا پھیر کر ہم نے اُسے سب نیچوں سے نیچ کر دیا، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ اعلیٰ درجے کا جسم عطا کیا ہے جو کسی دوسری جاندار مخلوق کو نہیں دیا، اور اسے فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشیں۔ مگر جب وہ ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے بُرائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے گراوٹ کی اس انتہا کو پہنچا دیتا ہے کہ کوئی رذیل ترین مخلوق بھی اُس تک نہیں پہنچتی۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، غیظ و غضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں سے جس خصلت میں بھی آدمی مستغرق ہوتا ہے اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب نیچوں سے نیچ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف اسی ایک بات کو دیکھیے کہ ایک قوم جب دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو کس طرح درندگی میں سب درندوں کو مات کر دیتی ہے۔ درندہ تو صرف اپنی غذا کے لیے کسی جانور کا شکار کرتا ہے، جانوروں کا قتلِ عام نہیں کرتا۔ مگر انسان خود اپنے ہی ہم جنس انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے۔ درندہ صرف اپنے

پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے مگر یہ احسنِ تقویم پر پیدا کیا ہوا انسان اپنی عقل اور قوتِ ایجاد سے کام لے کر ایک سے ایک مہلک ہتھیار بناتا چلا جاتا ہے تاکہ پوری پوری بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دے۔ درندہ صرف زخمی یا ہلاک کرتا ہے۔ مگر انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے ایسے ایسے دردناک طریقے ایجاد کرتا ہے جن کا تصور بھی کسی درندے کے دماغ میں کبھی نہیں آسکتا۔ پھر یہ اپنی دشمنی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے کمینہ پن کی اِس انتہا کو پہنچ جاتا ہے کہ دشمن کی عورتوں کے ننگے جلوس نکالتا ہے۔ ایک ایک عورت کو دس دس بیس بیس آدمی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ باپوں اور بھائیوں اور شوہروں کے سامنے اُن کی بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں کی عصمت لوٹتے ہیں۔ بچوں کو ان کے ماں باپ کے سامنے قتل کرتے ہیں۔ ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کرتے ہیں۔ انسانوں کو زندہ جلاتے اور زندہ دفن کرتے ہیں۔ دُنیا میں وحشی سے وحشی جانوروں کی بھی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جو انسانوں کی اِس وحشت کا کسی درجے میں بھی مقابلہ کر سکتی ہو۔ یہی حال دوسری بُری صفات کا بھی ہے کہ ان میں سے جس کی طرف بھی انسان رُخ کرتا ہے، اپنے آپ کو اَرذل المخلوقات ثابت کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ مذہب، جو انسان کے لیے مقدس ترین شے ہے، اُس کو بھی وہ اِتنا گرا دیتا ہے کہ درختوں اور جانوروں اور پتھروں کو پوجتے پوجتے پستی کی انتہا کو پہنچ کر مرد و عورت کے اعضائے جنسی تک کو پوج ڈالتا ہے اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے عبادت گاہوں میں دیوداسیاں رکھتا ہے جن سے زنا کا ارتکاب کارِ ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے جن ہستیوں کو وہ معبود کا درجہ دیتا ہے اُن کی طرف اُس کی دیومالا (Mythology) میں ایسے ایسے گندے قصے منسوب ہوتے ہیں جو ذلیل ترین انسانوں کے لیے بھی باعثِ شرم ہیں۔ (۱۴۹)

اِن حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ قرآن نے واضح طور پر نفسِ انسانی کی تین الگ الگ قسمیں بیان کیں۔ ایک نفسِ امّارہ، جو آدمی کو برائیوں پر اُکساتا ہے (یوسف ۵۳)۔ دوسرا نفسِ لوّامہ، جو انسان کو برائی کے خیال، خواہش، ارادے اور فیصلے تک ہر مرحلے پر ٹوکتا ہے اور اس کا ارتکاب کر گزرنے کے بعد ملامت کرتا رہتا ہے (القیامہ ۲)۔ تیسرا نفسِ مطمئنہ، جو پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ برائی کی راہ چھوڑ کر بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے اور اُسے اس بات پر کوئی حسرت لاحق نہیں ہوتی کہ اُس نے برائی کی لذتوں اور فائدوں کو کیوں چھوڑا اور بھلائی کی خاطر کیوں محرومیاں، قربانیاں، تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کیں۔ اِس پر حسرت تو درکنار، اُس کا دل اِس بات پر خوش ہوتا ہے کہ وہ برائی کی گندگی سے بچ گیا، اور بھلائی کی پاکیزگی اُسے حاصل ہو گئی۔ یہی تیسری قسم کے نفس کو قرآن نے خدا کا پسندیدہ نفس قرار دیا ہے اور اُسے جنت کی خوشخبری سنائی ہے (الفجر ۲۷ تا ۳۰)

اسبابِ ضلالت

اِس کے بعد قرآن مجید میں ایک ایک کر کے اُن اسباب کو بیان کیا گیا جن کی بدولت انسان بالعموم گمراہی میں مبتلا ہوتے رہے ہیں اور عرب کے کفار بھی اُنہی کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہو رہے تھے۔

۱- باپ دادا کی اندھی تقلید

ان میں سے اوّلین چیز دینِ آبائی کی اندھی تقلید ہے جو صرف اِس بنا پر کی جاتی رہی ہے کہ باپ دادا سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے، اور کبھی خود اپنی عقل سے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی کہ باپ دادا جو کچھ کرتے تھے وہ درست اور معقول بھی تھا یا نہیں۔ اِس اندھی تقلید کے لیے کوئی دلیل اس کے سوا نہ تھی کہ یہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن نے تاریخ سے بکثرت مثالیں پیش کیں۔

حضرت ہودؑ نے جب عاد کو اُن کی بے راہ روی پر ٹوکا اور انہیں راہِ راست پر آنے کی تلقین کی تو اُنہوں نے صرف یہ کہہ کر اُن کی تمام دلیلوں اور نصیحتوں کو رد کر دیا کہ "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آتے ہیں؟" (الاعراف۔ ۷۰)۔

حضرت صالحؑ نے جب ثمود کو سمجھانے کی کوشش کی تو اُن کا جواب یہ تھا کہ "اے صالح اِس سے پہلے تو ہمارے درمیان تو ایسا شخص تھا جس سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ جس طریقے کی طرف تو ہم کو بلا رہا ہے اُس کے بارے میں ہمیں سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال دیا ہے" (ہود۔ ۶۲)

حضرت شعیبؑ نے جب اہلِ مدین کو اُن کی صریح گمراہیوں پر متنبہ کیا تو اُن کا جواب بھی یہی تھا کہ "اے شعیبؑ کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" (ہود۔ ۸۷)

حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا کہ "یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو" تو اُن کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے" حضرت ابراہیمؑ نے اِس پر اُن سے صاف کہہ دیا کہ "تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" (الانبیاء۔ ۵۲ تا ۵۴) حضرت ابراہیمؑ نے ان سے پوچھا کہ یہ تمہاری دعائیں کو سنتے بھی ہیں؟ اور تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں؟ مگر اُن کا جواب یہ تھا کہ ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں، ہم تو بس صرف اس لیے کرتے ہیں کہ "ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے" (الشعراء: ۷۰ تا ۷۴)۔

حضرت موسیٰؑ نے جب کھلے کھلے معجزات کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کو دعوتِ حق دی تو اُنہوں نے بھی یہی کہا کہ "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟" (یونس۔ ۷۸)۔

اِن مثالوں کو پیش کرتے ہوئے قرآن مجید نے بتایا کہ تمام جاہل قوموں نے اپنے انبیاء کی دعوت کو اسی حجّت بے حجّت سے رد کیا ہے۔ چنانچہ پہلی قوموں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سب ہی نے اپنے انبیاء

کی صاف صاف دلیلوں، نصیحتوں اور فہمائشوں کا اگر کوئی جواب دیا تو یہ کہ "تم کچھ نہیں ہو مگر ہمارے ہی جیسے انسان چاہتے یہ ہو کہ ہم کو اُن معبودوں کی بندگی سے روک دو جن کی بندگی ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں" (ابراہیم : ۱۰)۔ دوسری جگہ فرمایا "اِسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی خبردار کرنے والا بھیجا، اُس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ہر نبی نے اُن سے پوچھا کیا تم اُسی ڈگر پر چلتے رہو گے خواہ میں اُس راستے سے زیادہ سیدھا راستہ تمہیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس چیز کی طرف بُلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو ہم اُس کے کافر ہیں" (الزُّخرف ۲۳، ۲۴)۔

اور یہ کچھ پچھلی قوموں ہی کا حال نہیں تھا بلکہ ہر زمانے کے جاہل لوگوں کا طریقہ یہی ہے اور رہا ہے کہ وہ کسی علم اور ہدایت اور روشنی دکھانے والی کتاب کے بغیر اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس تعلیم کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ ہم اُس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، خواہ شیطان اُن کے باپ دادا کو جہنم ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو" (لقمان : ۲۰-۲۱)۔

یہ مثالیں پیش کر کے قرآن نے براہِ راست قُریش اور اہلِ عرب کو متنبّہ کیا کہ تم بھی اُنہی لوگوں کی طرح ہو۔ نہ خود اپنی عقل سے کام لے کر یہ سوچتے ہو کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو یہ صحیح بھی ہے یا نہیں، اور نہ دلیل و حجّت کے ساتھ تمہارے مذہب، رسُوم اور اطوار کی جو غلطی تمہیں سمجھائی جاتی ہے اُس پر کچھ غور کرتے ہو۔ بس صرف اِس وجہ سے ایک غلط چیز پر اِصرار کر رہے ہو کہ یہ باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ سُورۂ صافّات میں فرمایا "اِن لوگوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا، لہٰذا یہ اُنہی کے پیچھے دوڑ چلے، حالانکہ اِن سے پہلے اکثر گزرے ہوئے لوگ گمراہ ہو چکے تھے" (آیات ۶۹ تا ۷۱)۔ سُورۂ ہُود میں رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا "تم اُن معبُودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہو جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ بس اُسی طرح عبادت کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے اِن کے باپ دادا کرتے تھے" (آیت ۱۰۹)۔

یہ ننگی و عُریانی جیسی کھُلی شرمناک بات پر جب قُریش اور اہلِ عرب کو ٹوکا گیا اور انہیں اِس بات پر شرم دلائی گئی کہ کعبے کے گرد بھی وہ برہنہ طواف کرنے میں تامّل نہیں کرتے جس سے زیادہ صریح گندا اور ناقص کوئی فعل نہیں ہو سکتا، تو انہوں نے اسے بھی تقلیدِ آبائی کی بنیاد پر جائز ٹھیرانے کی کوشش کی۔ چنانچہ سُورۂ اعراف میں ہے "جب یہ لوگ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے

اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ آپ نبیؐ، اِن سے کہو، اللہ بے حیائی کا کبھی حکم نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ کا نام لیکر وہ باتیں کہتے ہو جن کو تم نہیں جانتے کہ اللہ نے ان کا حکم دیا ہے؟" (آیت ۲۸)۔

کفّارِ عرب طرح طرح کی غیر معقول جاہلانہ رسموں پر جمے ہوئے تھے اور بلا کسی دلیل کے یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ سب اللہ کی مقرر کردہ ہیں۔ اِس کے متعلق سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا "اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس تعلیم کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسُول کی طرف تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے بس وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے جائیں گے خواہ وہ کوئی علم نہ رکھتے ہوں اور راہِ راست پر نہ ہوں؟" (آیت ۱۰۴)۔

اسی طرح کفّارِ عرب نے حلال و حرام کی بہت سی خود ساختہ پابندیاں صرف اِس دلیل سے اپنے اُوپر لازم کر لی تھیں کہ یہ پہلے سے چلی آرہی ہیں، اور اُن میں بہت سی حلال چیزیں حرام، اور بہت سی حرام و شرمناک اور قبیح چیزیں حلال کر لی گئی تھیں۔ ان کے متعلق سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا کہ "جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُس ہدایت کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں، نہیں، بلکہ ہم تو اُس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اور کیا یہ اُنہی کی پیروی کیے جائیں گے خواہ اِن کے باپ دادا نہ کسی چیز کی سمجھ رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں؟" (آیت ۱۷۰)

سُورۂ انعام میں اس اندھی تقلید کو ایسے پُر زور طریقے سے نامعقول ثابت کیا گیا کہ عرب کے ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم لوگ بھی ایک دفعہ تو اپنے دلوں میں مان گئے ہوں گے کہ فی الواقع ہم نہایت ہی لغو باتوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ فرمایا:

> "یہ لوگ اللہ کے لیے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور جانوروں میں سے ایک حصّہ مقرر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کے لیے ہے، بزعمِ خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے۔ پھر جو اِن کے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا، مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ اِن کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے[1]۔ کیسے بُرے فیصلے ہیں جو

---

[1] یعنی جو غلّے یا پھل وغیرہ اللہ کے نام پر نکالے جاتے تھے اُن میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شریکوں کے حصّے میں شامل کر دیا جاتا تھا، اور اگر شریکوں کے حصّے میں سے گرتا یا خدا کے حصّے میں مل جاتا تو اسے اُنہی کے حصّے میں واپس کیا جاتا تھا۔ کھیت کا جو حصّہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لیے مخصوص ہوتا تھا اُس میں سے اگر کبھی پانی اُس حصّے کی طرف پھوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصّہ میں داخل کر دی جاتی تھی، لیکن اگر اس کے برعکس صورت پیش آجاتی تو خدا کے حصّے میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا حصّہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو

یہ لوگ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے اُن کے شُرکاء نے خود اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ اُن کو ہلاکت میں ڈالیں اور اُن پر اُن کے دین کو مشتبہ بنا دیں؂۱ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ مویشی اور کھیتیاں محفوظ ہیں، اِن کو کوئی نہیں کھا سکتا سوائے اُس کے جسے ہم کھلانا چاہیں، بزعم خود۔ اور کچھ جانور ہیں جن کی سواری و بار برداری حرام کر دی گئی ہے، اور کچھ جانور ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے اللہ پر افترا کرتے ہوئے (یعنی یہ جھوٹ گھڑتے ہوئے کہ اللہ نے ان پر اپنا نام لینے سے منع کر دیا ہے)۔ ۔ ۔ ۔ اور کہتے ہیں کہ ان جانوروں کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام۔ لیکن اگر وہ مُردہ ہو تو مرد اور عورت سب اس میں شریک ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو، یہ آٹھ نر و مادہ ہیں، دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے۔ اے نبی، ان سے پوچھو کہ اللہ نے اِن کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ذرا ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ اِن سے پوچھو ان کے نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں؟ کیا تم اُس وقت حاضر تھے جب اللہ نے اِن کے حرام ہونے کا تمہیں حکم دیا تھا؟ پھر اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط رہنمائی کرے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔" (آیات ۱۳۶ تا ۱۴۴)

۲۔ بڑے لوگوں اور پیشواؤں کی غلط پیروی

تقلیدِ آبائی سے قریب تر ایک اور سبب گمراہی کی قرآن نے نشاندہی کی جو لوگوں کو بگاڑنے اور معاشرے کو خراب کرنے میں اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے، اور وہ ہے اپنی قوم، یا دُنیا کے بڑے لوگوں، لیڈروں، مذہبی پیشواؤں، اور دولت مند سرداروں کی پیروی جو یہ دیکھے بغیر کہ وہ کدھرے جا رہے ہیں، صرف اِس بنا پر کیا جا

٭ خدا کا حصّہ کہلاتے تھے مگر شریکوں کے حصّہ کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصّے میں کچھ کمی آجاتی تو وہ خدا کے حصّے سے پُوری کی جاتی تھی لیکن خدا کے حصّے میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصّہ میں سے ایک حبّہ بھی خدا کے حصّے میں نہ ڈالا جاتا۔ (حاشیہ از مؤلف)

؂۱ یعنی انہیں اِس غلط فہمی میں ڈال دیں کہ یہی اُسی دین کا کوئی حصّہ ہے جو اُنہیں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام سے ملا تھا۔ اِس مقام پر ظاہر ہے کہ شریکوں سے مُراد دیوتا اور معبود نہیں بلکہ وہ مذہبی پیشوا ہیں جنہوں نے بعد کے دور میں غلط جاہلانہ اور مذہبی رسوم کو رواج دیا اور لوگوں نے اِس طرح پیروی کی جیسی خدا کے قانون کی کرنی چاہیے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کردہ ہیں بڑے لوگ۔ قرآن نے لوگوں کو آگاہ کیا کہ قیامت کے روز اِس طرح کی پیروی کرنے والے پچھتا پچھتا کر کہیں گے :

" اَے ہمارے پروردگار، ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کی اطاعت کی اور اُنہوں نے ہمیں راستے سے بے راہ کر دیا۔ اَے ہمارے رب، ان کو دُہرا عذاب دے اور اُن پر سخت لعنت کر" (الاحزاب : ۶۷ - ۶۸)۔

" اَے ہمارے پروردگار ہمیں اُن جنوں اور انسانوں کو دکھا جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا، ہم اُنہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں" (حٰم السجدہ - ۲۹)

" (جب اللہ تعالیٰ سزا دے گا) اُس وقت وہی پیشوا اور رہنما جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی اپنے پیروؤں سے لاتعلقی ظاہر کریں گے، مگر عذاب دیکھ کر رہیں گے اور اُن کے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا۔ اور وہ لوگ جو دُنیا میں اُن کی پیروی کرتے تھے کہیں گے کہ کاش ہم کو ایک موقع پھر مل جاتا تو ہم اِن سے اُسی طرح بیزار ہو کر دکھا دیتے جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں۔ یُوں اللہ اِن لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دُنیا میں کر رہے ہیں اِن کے سامنے اِس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں سے ہاتھ ملتے رہیں گے۔ مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے" (البقرہ : ۱۶۶ - ۱۶۷)۔

" کاش تم اِن ظالموں کا حال اُس وقت دیکھو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور ایک دوسرے سے دُو بدُو جھگڑا کریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بنے والوں سے کہیں گے "تم نہ ہوتے تو ہم مُسلمان ہوتے"۔ وہ بڑے بنے والے اُن دبے ہوئے لوگوں سے کہیں گے کہ "کیا ہم نے تم کو ہدایت قبول کرنے سے روکا تھا جبکہ وہ تمہارے پاس آئی تھی؟ تم تو خود ہی مُجرم تھے"۔ وہ دبے ہوئے لوگ اُن بڑے بنے والوں سے کہیں گے "نہیں، بلکہ وہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اُس کا ہمسر ٹھیرائیں"۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے" (سبا : ۳۱ تا ۳۳)

اِس حقیقت کو قرآن نے بطور ایک عالمگیر قانون کے بیان کیا کہ کسی معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کے کھاتے پیتے، خوشحال اور اُونچے طبقوں کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اُس کے دولت مند اور صاحبِ اثر و اقتدار لوگ فسق و فجور پر اُتر آتے ہیں، ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے

لگتے ہیں، اور آخر یہی فسق پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔ (آیت ۱۶)

"اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اُس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اُس میں فسق کرنے لگتے ہیں تب عذاب کا فیصلہ اُس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔"

۳۔ غرور و تکبّر

تیسرا اہم سببِ ضلالت جس کی قرآن نے نشان دہی کی وہ یہ ہے کہ انسان حق بات ماننے سے صرف اس لیے انکار کرتا ہے کہ اُسے اپنے رویّہ کی غلطی تسلیم کرنے میں اپنی ہیٹی ہوتی نظر آتی ہے، یا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ میں اس حق کو تسلیم کر لوں گا تو گمراہ معاشرے میں جو اُونچا مقام مجھے حاصل ہے وہ مجھ سے چھن جائے گا، یا وہ خیال کرتا ہے کہ اپنی بات چھوڑ کر دوسرے کی بات مان لینا اُس کے مقامِ بلند سے فروتر ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ بات کتنی ہی غلط ہو جس پر وہ اَڑا ہوا ہے اور وہ بات کتنی ہی برحق ہو جسے دوسرا شخص پیش کر رہا ہے۔ قرآن مجید میں اس سببِ ضلالت کو بار بار لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا تاکہ اُن کا اپنا غرور بھی ٹوٹے جو قبولِ حق میں مانع ہو رہا تھا، اور اُن نہفتہ سے علمبردارانِ ضلالت کی گمراہی کے اصل سبب سے بھی وہ واقف ہو جائیں جو اُن کے اپنے زمانے میں، یا اُن سے پہلے گزرے ہوئے زمانے میں حق کا راستہ روکنے والے تھے۔

مثال کے طور پر سورۂ نوح میں حضرت نوحؑ کا یہ قول نقل کیا گیا کہ "اے میرے رب میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز راہِ حق کی طرف آنے کے لیے پکارا، مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے ان کو دعوت دی تاکہ تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبّر کیا"[1] (آیات ۶-۷)

سورۂ المؤمن میں یہ قصہ بیان کیا گیا کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تو اُسی کے اہلِ دربار میں سے ایک حق پسند آدمی نے بڑے دردمندانہ اور خیر خواہانہ انداز میں نہایت مدلّل طریقے سے اُس کو

---

[1] تکبّر سے مراد یہ ہے کہ اُنہوں نے حق کے آگے سر جھکا دینے اور خدا کے رسُول کی نصیحت قبول کرنے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بھلا آدمی کسی بگڑے ہوئے شخص کو نصیحت کرے اور وہ جواب میں سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہو اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جائے تو یہ تکبّر کے ساتھ کلامِ نصیحت کو ردّ کرنا ہو گا۔ (حاشیہ از مؤلف)

سمجھانے اور غلط رویّہ چھوڑ کر راست روی اختیار کرنے کی تلقین کی، مگر اُس نے اِن باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (آیت ۳۵)

"اِس طرح اللہ ٹھپّہ لگا دیتا ہے ہر متکبّر و جبّار کے دل پر"

یعنی تکبّر اور جبّاریت کی ہوا جس دل میں بھر جاتی ہے پھر اُس کے دروازے ہر کلمۂ نصیحت اور ہر قولِ حق کے لیے بند ہو جاتے ہیں اور اللہ پھر اُس پر لعنت کی ایسی مُہر لگا دیتا ہے کہ خواہ کوئی اسے راہِ راست پر لانے کی کتنی ہی کوشش کرے، وہ کسی طرح سیدھا نہیں ہوتا۔

سُورۂ اعراف میں بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو جب تختیوں پر ایک ہدایت نامہ لکھ کر دیا تو اس کے ساتھ ہی متنبّہ فرما دیا کہ "میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو کسی حق کے بغیر زمین میں تکبّر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، کبھی اُس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اُسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اُسے اختیار کر لیں گے" (آیت ۱۴۶)

سُورہ بقرہ میں فرمایا "انسانوں میں کوئی ایسا ہوتا ہے جس کی باتیں دُنیا کی زندگی میں تم کو بہت بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی پر بار بار اللہ کو گواہ ٹھیراتا ہے، مگر وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے۔ یہ باتیں بنا کر جب وہ پلٹتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دَوڑ دُھوپ فساد برپا کرنے اور کھیتیوں اور نسلوں کو برباد کرنے میں صرف ہوتی ہے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب اُس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اپنے وقار کا گھمنڈ اس کو گناہ پر جما دیتا ہے" (آیات ۲۰۴ تا ۲۰۶)

سُورۂ مُدّثّر میں خود مکّہ کے ایک سردار کا کردار پیش کیا گیا جس نے قریش کے سوالوں سے صاف صاف کہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات تم لوگ لگاتے ہو وہ سب جھوٹے ہیں، اور قرآن ایک ایسا کلام ہے جس میں بڑی حلاوت ہے، اس کی جڑ بڑی گہری ہے اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں۔ مگر جب اُس کے سامنے یہ سوال آیا کہ اِس رسول اور اِس کلام کو حق مان کر میں اپنی سرداری کھو بیٹھوں، یا اس پر جھوٹا الزام لگا کر اپنی سرداری بچا لوں، تو اُس نے دوسری چیز کو ترجیح دی اور اپنے ضمیر سے لڑ کر آخر کار ایک الزام تصنیف کر ڈالا جسے اس کا دل خود جانتا تھا کہ وہ محض اپنی بڑائی قائم رکھنے کے لیے ایک صریح جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ قرآن نے اُس کی یہ تصویر پیش کر کے اُسے بالکل بے نقاب کر دیا:

"اُس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی، تو خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں، خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا پھر

پیشانی سُکیڑی اور مُنہ بنایا پھر پلٹا اور تکبّر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آ رہا ہے، یہ تو ایک انسانی کلام ہے" (آیات ۱۸ تا ۲۵)۔

۳۔ دُنیا کی خوشحالی و بدحالی کو خیر و شر کا معیار سمجھنا

پھر قرآن نے بتایا کہ گمراہی کا ایک اور بڑا سبب یہ خیال ہے کہ دُنیا میں جو نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہی معیارِ خیر و شر ہیں۔ یہاں اگر کوئی خوشحال ہے خواہ اُس کی خوشحالی کیسی ہی بدکرداریوں کا نتیجہ ہو، وہ کامیاب ہے اور یہاں جو خستہ حال ہے خواہ اس کی خستہ حالی کیسی ہی نیک عمل کے ساتھ ہو، وہ بہر حال ناکام ہے۔ گویا خیر وہ ہے جس کا نتیجہ یہاں بظاہر اچھا نظر آ رہا ہے، اور شر وہ ہے جس کا نتیجہ یہاں بظاہر بُرا دیکھا جا رہا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس ظاہری "خیر" کے پیچھے کتنی ہی حرام خوریاں اور بداخلاقیاں پائی جاتی ہوں، اور وہ "شر" اپنے پیچھے کتنا ہی حسنِ عمل اور بلندیِ اخلاق کا سرمایہ رکھتا ہو۔ قرآن نے اس غلط نقطۂ نظر کی مثالیں پچھلی تاریخ سے بھی پیش کیں، اور خود مکّہ اور عرب کے لوگوں کی گفتار و کردار میں بھی اس کو نمایاں کر کے دکھایا۔

حضرت نوحؑ کے قصّہ میں بتایا کہ اُن کی قوم کے سرداروں نے یہ کہہ کر اُن کی تعلیم و ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا کہ اُن پر ایمان لانے والے غریب لوگ تھے جنہیں معاشرہ میں کوئی بلند مرتبہ حاصل نہ تھا۔ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ "اُنہوں نے کہا کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے کی ہے ؟" (الشعراء آیت ۱۱۱)۔

حضرت صالحؑ کے قصّے میں قرآن نے صراحت کی کہ اُن کے غریب پیروؤں سے اُن کی قوم کے بڑے لوگوں نے کہا اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے ؟" اُنہوں نے کہا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ "ہم تو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں" اِس پر اُن بڑے لوگوں نے کہا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ "ہم اُس چیز کو ماننے والے نہیں جس پر تم ایمان لاتے ہو" (الاعراف ۷۵-۷۶) یعنی تم جیسے حقیر لوگوں نے جس چیز کو مانا ہے اسے ہم نہیں مان سکتے۔

پھر تمام انبیاء کے بارے میں قرآن نے بتایا کہ اُن سب کے مخالف اُن کی قوم کے خوشحال لوگ تھے اور اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جس کو دُنیا میں خوب مال و اولاد نصیب ہے وہی حق پر ہے ۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۔ (سبا: ۳۴-۳۵)

" اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اُس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو ماننے والے نہیں

اور انہوں نے کہا ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔"
یہی سوچنے کا انداز رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کفار مکہ اور اہلِ عرب کا تھا جس کے غلط ہونے پر قرآن مجید میں بار بار اُن کو ٹوکا گیا۔
سُورۂ مریم میں فرمایا: "اِن لوگوں کو جب ہماری کھُلی کھُلی آیات سُنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں شاندار ہیں؟ حالانکہ اِن سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو اِن سے زیادہ سروسامان رکھتی تھیں اور ظاہری شان و شوکت میں اِن سے بڑھی ہوئی تھیں" (آیات ۷۳، ۷۴)۔
سُورۂ مومنون میں فرمایا "کیا یہ لوگ اِس خیال میں ہیں کہ ہم جو اِن کو مال اور اولاد سے نوازے جا رہے ہیں تو انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں، اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے۔ درحقیقت جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں، اور جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، اور جن کا حال یہ ہے کہ (اپنے رب کی خوشنودی کے لیے) جو نیک کام وہ بجا لاتے ہیں اُن کے بعد بھی اُن کے دل اِس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، وہی دراصل بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کر کے اُنہیں پالینے والے ہیں" (آیات ۵۵ تا ۶۱)۔
اِسی بات کو سمجھانے کے لیے سُورۂ فجر میں پہلے عاد اور ثمود اور فرعون جیسی زبردست ترقی یافتہ قوموں اور سلطنتوں کی طُغیانی و سرکشی کا انجام بیان کیا اور پھر فرمایا کہ انسان اب بھی اِس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ دُنیا کی نعمت و دولت ہی اصل عزّت ہے اور یہاں کی غربت و تنگ دستی ہی اصل ذلّت ہے، حالانکہ نعمت و دولت ہو یا غربت و تنگ دستی، دونوں ہی انسان کی آزمائش کے لیے ہیں، اور اِن میں سے کوئی بھی اصل عزّت و ذلّت کا معیار نہیں ہے (ملاحظہ ہو الفجر، آیات ۱۵-۱۶)۔

۵۔ خواہشِ نفس اور قیاس و گمان کی پیروی

گمراہی کے اسباب بتاتے ہوئے قرآن نے ایک اور اہم سبب کی بھی نشاندہی کی اور وہ یہ کہ انسان محض قیاس و گمان کی بنا پر کسی چیز کو حق اور کسی دوسری چیز کو باطل سمجھ بیٹھے، یا اپنی خواہشاتِ نفس کو اپنا خدا بنا کر اُن کی ایسی بندگی کرے کہ جدھر جدھر وہ چاہیں اُسے گھسیٹے لیے پھریں، مگر کبھی خدا کی دی ہوئی عقل اور اس کے بخشے ہوئے ذرائعِ علم سے کام لے کر وہ یہ نہ دیکھے کہ اپنے گمانوں اور قیاسات کی بنا پر اُس نے جو راستہ اختیار کیا ہے، یا اپنی خواہشات کی پیروی میں جس راہ پر وہ چلا جا رہا ہے وہ صحیح اور معقول بھی ہے یا نہیں۔ اِس غلطی پر قرآن نے بار بار لوگوں کو متنبہ کیا تاکہ وہ خیالات اور خواہشات کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے عقل و خرد کی سیدھی

راہ پا تیں۔

سورۂ اعراف میں ایک شخص کی مثال پیش کی گئی جو علم رکھنے کے باوجود خواہشاتِ نفس کی پیروی میں دُنیا کا گرویدہ بن کر رہ گیا تھا، پھر اُس جیسے لوگوں کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: "ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں۔ اُن کے پاس دل ہیں، مگر وہ اُن سے سوچتے نہیں۔ اُن کے پاس آنکھیں ہیں، مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں۔ اُن کے پاس کان ہیں، مگر وہ اُن سے سُنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔" (آیات ۱۷۲ تا ۱۷۹)

سُورۂ انفال میں اُن لوگوں کا ذکر کیا گیا جو سب کچھ سُننے کے بعد بھی گویا کچھ نہ سنتے تھے، اور پھر فرمایا: "درحقیقت اللہ کے نزدیک تمام جاندار مخلوقات میں سے بدترین مخلوق وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔" (آیت ۲۲) - بہرے اور گونگے سے مراد جسمانی بہرے اور گونگے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو نہ حق سُنتے ہیں اور نہ حق بولتے ہیں۔

سُورۂ یونس میں آیت ۳۱ سے ۳۵ تک پے در پے یہ دلائل دینے کے بعد کہ جن جن معبودوں کو مشرکین نے خدائی میں ربِ کائنات کا شریک بنا رکھا ہے اُن میں سے کوئی بھی خدائی صفات اور اختیارات نہیں رکھتا، صاف فرمایا گیا کہ اُن کو معبود کسی علم کی بنا پر نہیں بنایا گیا ہے بلکہ محض گمان و قیاس سے اپنی جگہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ بھی خدائی میں کچھ حصہ رکھتے ہیں۔ "ان میں سے اکثر لوگ گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے ہیں، حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا۔" (آیت ۳۶)

سُورۂ حج میں پچھلی گذری ہوئی غلط کار قوموں کی تباہی کے آثار کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا "کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ (اُن کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈر دیکھ کر) ان کے دل سمجھنے والے یا اِن کے کان سُننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔" (آیت ۴۶)۔

اِسی طرح سُورۂ فرقان میں قومِ نوحؑ، عاد، ثمود، اصحاب الرّس، قومِ فرعون اور قومِ لوطؑ کے انجام کی طرف توجہ دلانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟ کیا تم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سُنتے ہیں یا عقل سے کام لیتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے۔" (آیات ۴۳، ۴۴)

یہی بات سُورۂ جاثیہ میں بھی فرمائی کہ "اے نبی، کیا تم نے کبھی اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی

خواہشِ نفس ہی کو اپنا خدا بنا لیا اور علم کے باوجود اللہ نے اُسے گمراہی میں پھینک دیا، اُس کے دل اور کانوں پر مُہر لگا دی اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اب اللہ کے بعد اور کون ہے جو اُسے ہدایت دے؟" (آیت ۲۳)۔

۶۔ بُرائی کو خوبی سمجھنا اور غیر حق پر مگن رہنا

ایک اور چیز جس کو قرآن نے افراد اور معاشرے کی گمراہی کے بڑے اسباب میں شمار کیا وہ یہ بھی کہ انسان بُرے کاموں کو اچھا سمجھنے لگے، حق کے خلاف چلتے ہوئے سرے سے کوئی بے اطمینانی محسوس ہی نہ کرے، بلکہ اُلٹا اُس پر مگن ہو، اُس پہ اِترائے، اور حق جاننے کی ضرورت سے بالکل بے نیاز ہو۔ چنانچہ سورۂ فاطر میں فرمایا "بھلا کچھ ٹھکانا بھی ہے اُس شخص کی گمراہی کا جس کے لیے اُس کا بُرا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اُسے اچھا سمجھ رہا ہو" (آیت ۸)۔ اور سورۂ مومن میں فرمایا کہ "جہنم میں جب لوگوں کو عذاب دیا جا رہا ہو گا اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا کہ تم زمین میں غیر حق پر مگن تھے اور اُس پر اتراتے تھے" (آیت ۷۵)۔

۷۔ یہ خیال کہ نیکی اور حق پرستی سے انسان کی دُنیا برباد ہو جاتی ہے

قرآن مجید میں اِس خیال کو بھی ایک بڑا سبب گمراہی بتایا گیا۔ سورۂ اَعراف میں ہے کہ جب حضرت شُعَیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی کرنے اور قافلے لُوٹنے اور رہزنی کرنے سے روکا تو قوم کے سرداروں نے لوگوں سے کہا کہ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ "اگر تم نے شُعیبؑ کی پیروی کی تو تم یقیناً تباہ ہو جاؤ گے" (آیت ۹۰)۔ گویا اُن کا مطلب یہ تھا کہ بھلا کہیں تجارت میں ایمانداری برتنے سے بھی کاروبار چل سکتا ہے؟ اور ہم جو تجارتی قافلوں کے راستے پر آباد ہیں، اگر رہزنی نہ کریں، اور راستوں کو پُرخطر بنا کر قافلوں سے بھاری رہگذر وصول نہ کریں تو ہماری یہ خوشحالی کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ یہی بات قریش کے سرداروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھی کہ إِن نَّتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا "اگر ہم تمہارے ساتھ اِس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو ہم اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے" (القصص۔ ۵۷)۔ یعنی ہمارا جو کچھ اثر عرب کے لوگوں پر ہے وہ اِسی وجہ سے ہے کہ ہم یہاں مُشرکین عرب کے مذہبی پیشوا بنے ہوئے ہیں۔ اِسی وجہ سے ہماری تجارت چمک رہی ہے۔ اِسی وجہ سے ہمارے قافلوں کو سارے ملک کے راستوں میں امن میسر ہے۔ اور اِسی وجہ سے عرب کے تمام قبائل ہمارا احترام کرتے ہیں۔ اگر ہم آپ کی بات مان کر وہ راہ اختیار کر لیں جو آپ پیش کر رہے ہیں تو سارا عرب ہمارا مخالف ہو جائے گا، جو حیثیت ہمیں ملک میں حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی، اور ہمارا مکے میں بھی امن چین سے رہنا ممکن نہ رہے گا۔

۸۔ شفاعت کا مشرکانہ عقیدہ

یہ قدیم ترین زمانے سے ہر دور میں گمراہی کا ایک بڑا سبب رہا ہے اور عرب میں جب اسلام کی دعوت اٹھی تو اس کو بھی اس سے سابقہ پیش آیا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے کچھ پیارے بندے ایسے ہیں جن کی بات کسی طرح نہیں ٹل سکتی۔ اُن کا دامن آدمی تھام لے، نذر نیاز اور پوجا پاٹ سے اُن کو خوش کرتا رہے پھر دنیا میں جو چاہے کرے، اُن کی سفارش ہر جرم و گناہ کی سزا سے اُسے بچالے گی۔ اللہ کی بخشش اور مہربانیاں حاصل کرنے اور اپنے دل کی مرادیں پانے کا یہ آسان راستہ موجود ہوتے ہوئے کسی کو کیا پڑی ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی بیڑیاں اپنے پاؤں میں ڈال کر ہر گناہ کی لذت اور ہر ظلم و زیادتی کے فائدے سے اپنے آپ کو محروم کرلے۔ کفارِ عرب کا کہنا یہ تھا کہ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ "ہم تو اُن کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں" (الزمر۔۳) یعنی اللہ کی بارگاہ بہت اونچی ہے۔ اُس تک براہِ راست ہماری پہنچ کہاں ہو سکتی ہے اس لیے ہم ان بزرگ ہستیوں کو اس تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ نیز وہ کہتے تھے کہ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ "یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں" (یونس ۱۸)۔

اس غلط عقیدے کی موجودگی میں نیکی اور بھلائی کی کوئی دعوت کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے قرآن میں پے درپے اس پر ضرب لگائی گئی اور اس کا سراسر بے بنیاد ہونا ایسے دلائل کے ساتھ ثابت کردیا گیا کہ کسی معقول آدمی کے لیے ایسی احمقانہ شفاعت کا قائل ہونا ممکن نہ رہا۔

سورۃ مومن میں فرمایا: "اے نبی، ان لوگوں کو اُس دن سے ڈرا دو جو قریب آلگا ہے، جبکہ کلیجے منہ کو آرہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ پیے کھڑے ہوں گے۔ ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔ اور اللہ ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ رہے وہ معبود جنہیں یہ لوگ اُسے چھوڑ کر پکارتے ہیں، تو وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔ حقیقت میں اللہ ہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے" (آیات ۱۸ تا ۲۰)۔

ان آیات میں شفاعت کے اس مشرکانہ عقیدے کو بالکل پاش پاش کرکے رکھ دیا گیا ہے۔ اوّل تو بجائے خود یہ بات خلافِ عقل و انصاف ہے کہ ظالم کی سفارش کی جائے۔ پھر یہ خدا کی شانِ خدائی کے قطعی خلاف ہے کہ اُس کے بندوں میں سے کوئی ایسا سفارشی ہو جس کی اطاعت کی جائے یعنی خدا اُس کی سفارش ماننے پر مجبور ہو۔ اس پر مزید یہ بات کسی طرح تصوّر کرنے کے لائق نہیں ہے کہ خدا کے ہاں ایسے لوگوں کی سفارش چلے جو دنیا میں ظلم کرکے آنے والے مجرم کی حمایت پر اٹھیں اور یہ چاہیں کہ خدا اُس کو اُن کی خاطر معاف کردے۔ اس سے بھی بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ ایک حاکم جو کسی شخص کے جرائم سے خوب واقف ہے، بلا رعایت انصاف کے ساتھ اُس کے مقدمے کا فیصلہ کرنا ہے، وہ ایسے لوگوں کو اس کی سفارش کا حق دے دے جو یہ جانتے ہی نہیں کہ

وہ شخص کیا کچھ کر سکے آیا ہے۔

دوسری جگہ اس تصورِ شفاعت کی تردید ایک اور پُر زور دلیل سے کی گئی۔ فرمایا: "اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، اِلّا یہ کہ (اس کا دعوےٰ کرنے والے) حق کے ساتھ شہادت دیں اور وہ جانتے ہوں" (الزخرف۔۸۶) یعنی جو شخص کسی دیوی، دیوتا یا بزرگ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اُسے لازماً شفاعت کے اختیارات حاصل ہیں اور اس کو ایسی شفاعت کا اختیار ہے جو رد نہیں کی جا سکتی، وہ سامنے آئے اور علم کی بنا پر اس بات کی برحق شہادت دے محض سُنی سُنائی باتوں پر، یا محض قیاس و وہم و گمان پر ایسا ایک عقیدہ مان لینا سراسر لغو ہے جس کے حق ہونے کی شہادت علم کی بنا پر نہیں دی جا سکتی۔ بالفاظِ دیگر جو لوگ کچھ ہستیوں کے لیے ایسے اختیارات کا دعویٰ کر رہے ہیں وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو "معلوم" ہے کہ انہیں یہ اختیارات حاصل ہیں اور ہم اس کی سچی "شہادت" دیتے ہیں۔

لیکن قرآن نے شفاعت کا قطعی انکار نہیں کیا، بلکہ بار بار یہ بتایا کہ شفاعت صرف وہ کر سکتا ہے جس کو اللہ نے اس کی اجازت دی ہو، اور صرف اُس کے حق میں کر سکتا ہے جس کے لیے شفاعت سُننے پر اللہ راضی ہو، اور اس پر مزید شرط یہ ہے کہ وہ حق کے مطابق شفاعت کرے، خلافِ حق و انصاف بات نہ کرے۔ پھر بھی شفاعت قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ کے اختیار میں ہے، وہ ہرگز کسی کی شفاعت ماننے پر مجبور نہیں ہے۔ اس باب میں قرآن کی تصریحات یہ ہیں:

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۔ (البقرہ۔۲۵۵)۔

"کون ہے جو اُس کے حضور اُس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے؟"

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ (سبا۔۲۳)

"اور اُس کے حضور شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی سوائے اُس شخص کے جس کے لیے اُس نے اجازت دی ہو"۔

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (النبا۔۳۸)

"جس روز رُوح (یعنی جبرئیلؑ) اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کوئی نہ بولے گا سوائے اُس کے جسے رحمان نے اجازت دی ہو اور وہ ٹھیک بات کہے۔"

قُلْ لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا، لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (الزمر۔۴۴)

"اے نبیؐ، کہہ دو کہ شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی

بادشاہی اُسی کی ہے۔"

یعنی شفاعت سُننا یا نہ سُننا اور اُسے قبول کرنا یا رد کر دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ کائنات کی بادشاہی کا مالک ہے۔ کسی کی یہ مجال نہیں کہ اُس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے، اور کسی کا یہ مرتبہ نہیں کہ اُس کی شفاعت اللہ کو ضرور سُننی اور ماننی ہی پڑے۔

تاریخِ انسانی سے اچھے اور بُرے کرداروں کی مثالیں

اسبابِ ضلالت کی یہ تفصیلات جو قرآن میں بیان کی گئی تھیں، قریش اور عرب کے معاشرے میں یہ سب پائی جاتی تھیں اور ایک ایک شخص جو ان کو سُنتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا کہ فی الواقع جاہلانہ گمراہی کے یہ سارے اسباب کارفرما ہیں۔ اس کے بعد قرآن مجید میں تاریخِ انسانی سے پے در پے ایسے کرداروں کی مثالیں بھی پیش کی گئیں جو بہترین تھے اور ایسے کرداروں کی مثالوں کو بھی نمایاں کر کے بیان کیا گیا جو بدترین تھے، تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ اسلام کیسے انسان بنانا چاہتا ہے، اور کیسے انسان اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں جن کی یا تو اصلاح ہونی چاہیے، یا پھر ان کے وجود سے معاشرے کو پاک کر دینا چاہیے، یا جن کو اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے غضب کا نشانہ بنا کر اس دنیا میں تباہ کر دیا۔ قرآن کے اس بیان کو ذرا سلسلہ وار تاریخی ترتیب کے ساتھ دیکھتے جائیے۔

آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا واقعہ

سب سے پہلا عبرتناک واقعہ جو تاریخِ انسانی میں پیش آیا وہ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ہے جس میں دو کردار ایک دوسرے کے مقابلے میں سامنے آتے ہیں۔ دونوں بھائی قربانی کرتے ہیں۔ ایک کی قربانی مقبول ہوتی ہے، دوسرے کی نہیں ہوتی۔ وہ حسد میں آ کر اپنے بھائی سے کہتا ہے کہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اُس کا بھائی کہتا ہے "اللہ تو پرہیزگاروں کی قربانی قبول کیا کرتا ہے" (یعنی تیری قربانی قبول نہ ہونے میں میرا کوئی قصور نہیں، تو اپنے اخلاق و اعمال کی اُس خامی کو دُور کرنے کی فکر کر جس کی وجہ سے تیری قربانی قبول نہ ہوئی)، "لیکن اگر تو میرے قتل ہی کے درپے ہو گا تو میں تیرے قتل کے درپے نہیں ہوں گا، کیونکہ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ تجھے قتل کر کے میں بھی تیرے ساتھ خونِ ناحق کے گناہ میں شریک ہوں میں اس کو ترجیح دوں گا کہ میرے اور اپنے گناہ کو تو خود ہی سمیٹ لے۔" آخر کار وہ ظالم بھائی اپنے نیک بھائی کو قتل کر دیتا ہے اور پھر اس پر بہت پچھتاتا ہے۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد دیکھیے کہ عرب کے اُس ماحول میں، جہاں انسانی جان کی کوئی حرمت نہ تھی اور ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم تھا، قرآن نے کتنی عظیم بات کہی کہ "جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی ایک جان کو بچایا اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی" (المائدہ، آیات ۲۷ تا ۳۲)۔

حضرت نوحؑ اور اُن کی قوم

تاریخ کی پہلی قوم جس نے زمین میں سرکشی کا طوفان اُٹھایا وہ حضرت نوحؑ کی قوم تھی۔ قرآن میں کئی جگہ اس کا قصہ بیان کر کے ایک طرف اُس قوم اور اُس کے سرداروں کا کردار پیش کیا گیا جس کی وجہ سے آخرکار وہ سب مبتلائے عذاب ہوئے تھے، اور دوسری طرف خود حضرت نوحؑ کے کردار کی درخشاں مثالیں پیش کی گئیں۔ سورۂ عنکبوت میں بتایا گیا کہ انتہائی شدید مخالفت و مزاحمت کے مقابلے میں ساڑھے نو سو برس تک وہ انتہائی صبر کے ساتھ اُس قوم کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے رہے (آیت ۱۴)۔ اُنہوں نے ہر ممکن طریقے سے نہایت دردمندی کے ساتھ لوگوں کو راہِ راست دکھانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، مگر قوم کے سرداروں نے اُن کی ایک نہ چلنے دی (سورۂ نوح مکمل)۔ اُن کو مجنون کہا گیا اور سخت ڈانٹ پھٹکار کی گئی (القمر-۹)۔ اُن کی اور ان پر ایمان لانے والے غریب لوگوں کی تذلیل کی گئی (ہود: ۲۷- الشعراء: ۱۱۱)۔ اُن کو دھمکی دی گئی کہ تم اگر باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا (الشعراء: ۱۱۶)۔ مگر انہوں نے ڈٹ کر کہا کہ میرا وجود اور میری نصیحتیں تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہیں تو جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ میرے خلاف کر ڈالو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، میرا بھروسا اللہ پر ہے (یونس-۷۱)۔ پھر جب کشمکش انتہا کو پہنچ گئی تو اُن کی قوم نے کہا کہ تم جس طوفان کا ڈراوا ہمیں دیتے ہو وہ لے آؤ۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے اُن کی آنکھوں کے سامنے وہ کشتی بنانی شروع کی جس میں بیٹھ کر وہ اور اُن کے ساتھ اہلِ ایمان اُس آنے والے طوفان سے بچنے والے تھے۔ مگر اُن کی قوم کے لوگ اُنہیں کشتی بناتے دیکھ کر اُن کا مذاق اُڑاتے پھرتے تھے کہ بڑے میاں کی دیوانگی آخر یہاں تک پہنچ گئی کہ خشکی پر جہاز چلانے کی تیاری کر رہے ہیں، اور اُنہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ عنقریب یہی خشکی ایسا سمندر بننے والی ہے جہاں ایک ایک موج پہاڑوں کے برابر ہو گی جس میں خود حضرت نوحؑ کے بیٹے سمیت سب غرق ہو جائیں گے اور یہی سطحِ زمین پر رکھی ہوئی کشتی جودی پہاڑ پر جا لگے گی (ہود: ۴۲ تا ۴۴)۔ آخری منظر اس قصے کا یہ پیش کیا گیا کہ حضرت نوحؑ نے جب اپنے بیٹے کو بھی دوسرے کافروں کے ساتھ ڈوبتے دیکھا تو بشریت سے مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اُس کو بچا لیا جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو ڈانٹ دیا کہ جاہل نہ بنو، یہ تمہارا بیٹا ہی سہی، لیکن تمہارا "اہل" نہیں ہے بلکہ عمل غیر صالح ہے، اس لیے ایسی درخواست مجھ سے نہ کرو۔ حضرت نوحؑ نے بارگاہِ الٰہی سے اپنی دُعا کا یہ جواب سُنتے ہی فوراً معافی مانگی اور عرض کیا "اے میرے پروردگار، میں اِس سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں، اگر تُو نے مجھے معاف نہ کیا اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا" (ہود: ۴۵ تا ۴۷)۔

قوم عاد اور حضرت ہودؑ علیہ السلام

عرب کی مشہور قوم، عاد، جس سے اہلِ عرب کا بچہ بچہ اُس زمانے میں واقف تھا جس کے متعلق لوگ

یہ بھی جانتے تھے کہ وہ خدا کے عذاب سے تباہ ہوئی تھی، اُس کے بارے میں قرآن نے بتایا کہ شرک و بُت پرستی کے ساتھ اُس کے اندر کیا اخلاقی عیوب پائے جاتے تھے۔ سُورۂ حٰم السجدہ میں ہے کہ "اُنہوں نے زمین میں حق کے بغیر تکبّر کیا اور کہا کون ہے ہم سے زیادہ زور آور" (آیت-۱۵) سُورۂ فجر میں ہے کہ اُنہوں نے "دُنیا میں بڑی سرکشی دکھائی اور بہت فساد برپا کیا" (آیات ۶ تا ۱۲)۔ سُورۂ شُعراء میں ہے کہ حضرت ہُودؑ نے ان سے فرمایا "یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ ہر اُونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو، اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو، جبّارین کر ڈالتے ہو" (آیات ۱۲۸ تا ۱۳۰)۔ سُورۂ ہُود میں ہے کہ "اُنہوں نے ہر جبّار دُشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی" (آیت ۵۹)۔ حضرت ہُودؑ نے ان کو سمجھانے کی جتنی کوششیں کیں اُن سب کا جواب وہ تمرّد اور عناد اور مخالفانہ چالوں ہی کے ساتھ دیتے چلے گئے حتیٰ کہ حضرت نوحؑ کی طرح انہیں بھی اپنی قوم سے کہنا پڑا کہ "تم سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھو اور مجھے ذرا مُہلت نہ دو، میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اُس کے ہاتھ میں نہ ہو" (ہُود: ۵۵-۵۶)۔ آخر کار اُنہوں نے خدا کے پیغمبر سے کہہ دیا کہ "اگر تو سچا ہے تو لے آ وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے" پھر جب وہ عذاب سامنے سے آتا نظر آیا تو وہ عین وقت یہ سمجھے کہ یہ بادل ہے جو ہماری وادیوں کو سیراب کرے گا، مگر وہ ایک تباہ کن آندھی تھی جس نے ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا (الاحقاف ۲۲ تا ۲۵)۔

ثمود اور حضرت صالح علیہ السلام

عاد کے بعد ثمود عرب کی اقوامِ قدیمہ میں سے مشہور ترین قوم تھی جس کے چھوڑے ہوئے آثار پورے شمالی حجاز میں پھیلے ہوئے تھے اور اب تک پھیلے ہوئے ہیں قریش کے تجارتی قافلے اُن پر سے گزرتے ہوئے شام کی طرف جاتے رہتے تھے۔ یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ ایک خوفناک زلزلے نے اس قوم کو تباہ کیا جس کے اثر سے اُس علاقے کے پہاڑ آج تک کھیل کھیل ہو رہے ہیں۔ قرآن میں بتایا گیا کہ اس قوم نے خدا سے بغاوت کر کے صرف شرک و بُت پرستی ہی کا جُرم نہیں کیا تھا بلکہ خدا کی زمین میں سرکشی اور فساد کا طوفان بھی برپا کیا تھا (الفجر آیات ۶ تا ۱۲- الاعراف ۷۴)۔ اُن کے سردار حد سے گزرے ہوئے مُفسد لوگ تھے جن کے ہاتھوں کوئی اصلاح کا کام نہ ہوتا تھا (الشعراء: ۱۵۱-۱۵۲)۔ وہ اپنے عیش اور اپنی شان دکھانے کے لیے میدانی علاقوں میں قصر اور پہاڑوں کو تراش تراش کر عمارتیں بناتے تھے (الاعراف ۷۴- الشعراء ۱۴۹)۔ یہ ایک بگڑے ہوئے معاشرے کی خصوصیت ہوتی ہے کہ ایک طرف غریب لوگ سر چھپانے کو ڈھنگ کی جگہ تک نہیں پاتے اور دوسری طرف بڑے لوگ شاندار محل تعمیر کرتے ہیں۔ اُن بڑے لوگوں کے نزدیک حضرت صالحؑ اس لیے ایمان لانے کے قابل نہ تھے

کہ اُن پر غریب لوگ ایمان لائے تھے (الاعراف ۷۵-۷۶)۔ حضرت صالحؑ نے جب اُن کو خدا پرستی کی دعوت دی اور ظلم و فساد اور عیش پرستی سے روکا تو اُن کے ۹ بڑے بڑے مفسد قبائلی جتھہ داروں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا "خدا کی قسم کھا کر فیصلہ کر لو کہ رات کو صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے، پھر صالحؑ کے ولی (یعنی اُن کے قبیلے کے سردار) سے کہہ دیں گے کہ ہم اُس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں" (النمل: ۴۸-۴۹) لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس چال کو ناکام کر دیا۔ اُنہوں نے حضرت صالحؑ سے معجزے کا مطالبہ کیا اور ان کے اپنے مطالبے ہی پر اللہ تعالیٰ نے ایک اونٹنی اُن کے سامنے لا کر رکھ دی جس کا وجود خود ایک صریح معجزہ تھا۔ اس کے بعد حضرت صالحؑ کے ذریعہ سے اُن کو خبردار کر دیا گیا کہ یہ اونٹنی تمہاری زمینوں میں جہاں چاہے گی چرتی پھرے گی اور ایک دن تنہا یہ پانی پیے گی اور دوسرا دن تم سب اور تمہارے جانوروں کے پینے کا ہے۔ اس کو تم نے بُری نیت سے ہاتھ لگایا تو پھر تمہارے اوپر عذاب آجائے گا (الاعراف ۷۳ ، ہود ۶۴ ، الشعراء ۱۵۵) کچھ مدت تک وہ لوگ اُس اونٹنی سے ڈرتے رہے آخر کار انہوں نے یہ جانتے ہوئے کہ یہ اونٹنی ایک معجزہ ہے، اپنے ایک سب سے زیادہ سرپھرے سردار کو پکارا کہ اس بلا سے ہمارا پیچھا چھڑا، اور اُس نے اس کام کا بیڑا اُٹھا کر اسے مار ڈالا (القمر ۲۹ - الشمس ۱۲-۱۴)۔ یہ سرکشی دکھا کر انہوں نے حضرت صالحؑ کو چیلنج دیا کہ لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے (الاعراف ۷۷) حضرت صالحؑ نے کہا بس اب تین دن اپنے گھروں میں مزے کر لو۔ اس کے بعد وہ زبردست کڑاکے دار زلزلہ آیا جس نے حضرت صالحؑ اور اہلِ ایمان کے سوا پوری قوم کو ہلاک کر دیا اور اُن کے گھر اس طرح پڑے کے پڑے رہ گئے کہ گویا وہاں کبھی کوئی بسا ہی نہ تھا (الاعراف ۷۸ - ہود ۶۵ تا ۶۸ - القمر ۳۱)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

سب سے بڑا مثالی کردار قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کا پیش کیا گیا جنہیں اہلِ عرب اپنے دین کا پیشوا مانتے تھے، اور جن کے ساتھ نسبت ہی پر قریش کے سارے فخر و ناز اور رسوخ و اثر کی بنا قائم تھی۔ قرآن نے اُن کو بتایا کہ ابراہیم علیہ السلام کی وہ کیا خوبیاں تھیں جن کی بنا پر اللہ رب العلمین نے اپنے اُس بندے کو اپنا خلیل (دوست) قرار دیا (النساء-۱۲۵)، اور فرمایا کہ میں تجھے تمام انسانوں کا امام بنانا ہوں (البقرہ-۱۲۴)۔ اُن پر جب یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ اللہ کے سوا کوئی رب اور اِلٰہ نہیں ہے اور اُن کا باپ اور اُن کی قوم سب گمراہ ہیں تو انہوں نے باپ دادا کی اندھی تقلید کو چھوڑ دیا۔ اپنے قومی مذہب کو ترک کر دینے اور بالکل یکسو ہو کر صرف خالقِ ارض و سما کی بندگی اختیار کر لینے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہیں کی، اور صرف اپنی جگہ ہی خالص خدا پرست بن کر نہیں رہ گئے، بلکہ علی الاعلان اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہہ دیا کہ

میں تمہارے اِس دینِ شرک سے بیزار ہوں اور میرے نزدیک تم صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہو (الانعام ۷۴ تا ۸۱)۔ اُنہوں نے باپ سے صاف صاف کہا کہ تم اندھے بہرے بے اختیار معبودوں کی بندگی کرکے دراصل شیطان کی بندگی کر رہا ہے، اور باپ نے انہیں سختی کے ساتھ جھڑک کر گھر سے نکال دیا (مریم ۴۱ تا ۴۸)۔ انہوں نے جب قوم کو دلیلوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور وہ نہ مانی تو موقع پا کر اُس کے بُت خانے میں گھس گئے، اور اُس کے بتوں کو توڑ کر عملاً اُسے یہ دکھا دیا کہ جن کی وہ بندگی کر رہی ہے وہ اُس کو توڑ کیا، خود اپنے آپ کو بھی بچانے پر قادر نہیں ہیں (الانبیاء ۵۱ تا ۶۷۔ الصافات ۸۳ تا ۹۶)۔ اُن کو ملک کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا جو رب ہونے کا مدعی تھا تو اُنہوں نے بالکل بے خوف ہو کر اس سے کہا کہ میں اُس ہستی کے سوا کسی کو رب نہیں مانتا جس کے ہاتھ میں زندگی و موت ہے۔ اس نے کہا زندگی و موت میرے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے یہ منہ توڑ جواب دے کر اُسے مبہوت کر دیا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اُسے مغرب سے نکال کر دکھا دے (البقرہ ۲۵۸)۔ اُن کے لیے آگ کا الاؤ تیار کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ انہیں اُس میں پھینک کر زندہ جلا دیا جائے۔ مگر وہ پھر بھی باطل کے آگے نہ جھکے اور حق کی خاطر جل مرنے پر تیار ہو گئے۔ یہ تو اللہ کا فضل تھا کہ اُس نے آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور اُسے اُن کے لیے بے ضرر بنا دیا، مگر انہوں نے اپنی طرف سے یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کہ وہ آگ میں پھینکا جانا قبول کر سکتے ہیں، حق کو چھوڑ کر باطل کی بندگی کرنا قبول نہیں کر سکتے (الانبیاء ۶۸ تا ۷۰۔ الصافات ۹۷-۹۸)۔ آخرکار جب اُن کے لیے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ دین کو چھوڑیں یا وطن کو؟ تو انہوں نے دین کو نہ چھوڑا اور گھر، خاندان، قوم، وطن سب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر خدا کے بھروسے پر نکل کھڑے ہوئے۔ جانتے تھے کہ غریب الوطنی کیا چیز ہوتی ہے، خصوصاً اُس زمانے میں اپنی قوم کی پناہ سے نکل کر کسی غیر علاقے کا رُخ کرنا جیسا کچھ خطرناک ہو سکتا تھا اُس سے وہ ناواقف نہ تھے۔ مگر انہوں نے بے تکلف کہہ دیا کہ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ "میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہ میری ضرور رہنمائی فرمائے گا" (الصافات ۹۹)۔ بڑھاپے کی عمر میں جب بڑی دعاؤں اور تمناؤں کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو اُن کے رب نے اُن کو ایک اور سخت آزمائش میں ڈالا۔ انہیں اشارہ کیا گیا کہ اِس دودھ پیتے بچے کو اس کی ماں کے ساتھ لے جا کر مکہ کی سنسان بے آب و گیاہ وادی میں اُس جگہ چھوڑ آؤ جہاں ہم اپنا گھر بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اِس حکم کی تعمیل کے لیے بھی بلا تامل آمادہ ہو گئے اور فلسطین سے، جہاں وہ رہتے تھے، سینکڑوں میل دُور لے جا کر بیوی اور بچے کو بالکل خدا کے بھروسے پر چھوڑ دیا (الحج ۲۶۔ ابراہیم ۳۷)۔ پھر ایک اور اُس سے بھی زیادہ شدید آزمائش کی گئی۔ جب وہی لڑکا بڑا ہو کر اس عمر کو پہنچ گیا کہ باپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکے تو اشارہ کیا گیا کہ اسے ہمارے لیے ذبح کر دو۔ وہ اِس فرمان پر بھی عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور بیٹے کے گلے پر چھُری پھیرنے ہی والے تھے

کر اللہ تعالیٰ نے اُن کی قربانی قبول فرما کر ایک "ذبحِ عظیم" کو اُس کے فدیے میں دے دیا۔ (الصّافّات ۱۰۰ تا ۱۰۷)۔ خدا اور اُس کے دین کے معاملے میں وہ کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وطن چھوڑتے چھوڑتے انہوں نے صاف صاف اپنی قوم سے کہا کہ "ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ" (الممتحنہ۔ ۴)۔ اپنے باپ سے انہوں نے دعائے مغفرت کا وعدہ کیا تھا اور دُعا کی بھی، مگر جب اُنہیں احساس ہُوا کہ وہ تو اللہ کا دُشمن تھا تو انہوں نے اُس سے محبت کا یہ تعلق بھی ختم کر دیا (التوبہ۔ ۱۱۴)۔ یہی وہ سیرت اور یہ تھا وہ کردار جسے دعوتِ اسلامی نے نمونے کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

حضرت لُوطؑ اور قومِ لوط

حضرت لُوطؑ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بھتیجے تھے اور اُن کے ساتھ ہی ہجرت کر کے فلسطین کی طرف آئے تھے۔ یہاں جس جگہ انہوں نے اپنا مسکن بنایا تھا اُس کے قریب ہی ایک نہایت خبیث قوم آباد تھی جو دُنیا میں خباثت کے اعتبار سے اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لُوط علیہ السّلام کو اُس کی اصلاح کا کٹھن کام سُپرد کیا اور اُنہیں نبی بنا کر اُس کے علاقے میں بھیج دیا۔ اُس قوم کا حال یہ تھا کہ اُس میں مرد کی مرد سے مباشرت عام تھی جس کا ارتکاب چھُپ کر بھی نہیں بلکہ علانیہ ایک دوسرے کے سامنے اور بھری مجلسوں میں کیا جاتا تھا۔ اِس پر مزید وہ ایک رہزن قوم تھی، کسی شخص یا قافلے کا اُس کے علاقے سے بخیریت گذر جانا ممکن نہ تھا (الحجر۔ ۷۵۔ العنکبوت ۲۹)۔ حضرت لُوطؑ نے برسوں اس کو خدا سے ڈرایا اور اِن حرکتوں سے باز آ جانے کی تلقین کی مگر اُس کا جواب یہ تھا کہ "اے لُوطؑ، اگر تُو نے یہ باتیں نہ چھوڑیں تو ہم تجھے اپنے ہاں سے نکال دیں گے" (الشعراء۔ ۱۶۷)۔ حضرت لُوطؑ نے اِن دھمکیوں کی پروا نہ کی اور اپنی تبلیغ جاری رکھی تو اُن لوگوں نے آپس میں طے کیا کہ "آلِ لُوط کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو، یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں" (الاعراف ۸۲۔ العنکبوت ۵۶)۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے اُن کو سزا دینے کا فیصلہ فرما دیا اور اس پر عمل درآمد کے لیے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا۔ چند فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لُوطؑ کے ہاں مہمان بنا کر بھیج دیے گئے۔ ان کا آنا تھا کہ سارے شہر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور لوگ جوق در جوق حضرت لُوطؑ کے گھر کی طرف بڑھ دوڑے تاکہ اُن لڑکوں کے ساتھ فعلِ بد کریں۔ حضرت لُوطؑ نے ان کی بے انتہا منت سماجت کی کہ میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رُسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟ مگر اُن لوگوں پر ایک نشہ سا سوار تھا۔ انہوں نے حضرت لُوطؑ کی ایک نہ سُنی بلکہ اُلٹا اُن کو ڈانٹا کہ "کیا ہم بارہا تمہیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دُنیا بھر کے ٹھیکیدار نہ بنو" (الحجر۔ ۷۰)۔ تب فرشتوں نے حضرت لُوطؑ سے کہا کہ "ہم خدا کے بھیجے ہُوئے فرشتے ہیں اور اِن پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں، آپ صبح سے پہلے پہلے اپنے

گھر والوں کو دے کر یہاں سے نکل جائیں"۔ جو لوگ اُن کے مکان پر چڑھ آتے تھے اُن کو اُسی وقت اندھا کر دیا گیا (القمر۔ ۳۷)، اور صبح سویرے باقی قوم کا تختہ اُلٹ دیا گیا، اُس کی بستیاں تلپٹ کر دی گئیں، اور اس پر ایسے پتھروں کی بارش کی گئی جن میں سے ہر ایک نشان زدہ تھا کہ کس پتھر کو اُن میں سے کس آدمی کا خاتمہ کرنا ہے (ہُود ۸۲۔ ۸۳)۔ یہ ایسی بدبخت قوم تھی کہ اس کے پُورے علاقے میں ایک حضرت لُوطؑ کے گھر کے سوا کسی با ایمان کا گھر نہ پایا جاتا تھا (الذّاریات۔ ۳۶) اور اُس ایک گھر میں بھی خود حضرت لُوطؑ کی بیوی بے ایمان تھی جس کے متعلق اُن کو حکم دیا گیا کہ اُسے ساتھ نہ لے جاؤ، کیونکہ اُسے بھی مبتلائے عذاب ہونا ہے (ہُود۔ ۸۱)۔ قرآن میں یہ قصّہ جگہ جگہ بیان کر کے لوگوں کو بتایا گیا کہ ایک بدکردار قوم کیسی ہوتی ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے کیسے کیسے سخت حالات میں کام کیا ہے۔

قصّۂ یُوسف علیہ السّلام

اِس کے بعد تاریخی اعتبار سے حضرت یُوسف علیہ السّلام کے قصّے کی باری آتی ہے جس پر ایک پُوری سُورۃ قرآن میں نازل کر کے اچھے اور بُرے کردار ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کر دیے گئے۔ اس میں ایک طرف برادرانِ یُوسف کا کردار ہے جنہوں نے صرف اس بنا پر کہ والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السّلام اپنے کم سن بیٹے یوسفؑ سے زیادہ محبت کرتے ہیں آپس میں طے کیا کہ اُن کو قتل کر دیں یا کہیں پھینک دیں اور اس کے بعد صالح لوگ بن جائیں"۔ باپ کو دھوکا دیکر بھائی کو سیر و تفریح کے بہانے لے گئے، اُس کو اندھے کنوئیں میں ڈال دیا پھر جھوٹ موٹ کا خون اُس کے قمیص پر لگا کر لے آئے اور باپ سے کہا کہ اُسے بھیڑیے نے پھاڑ کھایا۔

اُس تجارتی قافلے والوں کا کردار ہے جنہوں نے حضرت یُوسفؑ کو اندھے کنوئیں میں پایا تھا۔ اُنہوں نے اُس مظلوم بچے کو اپنے لیے مالِ تجارت بنا لیا اور مصر لے جا کر بیچ ڈالا۔

عزیزِ مصر کی بیوی کا کردار ہے جس کے شوہر نے حضرت یُوسفؑ کو خریدا تھا اور جس کے گھر میں پل کر وہ جوان ہوئے تھے۔ اُس کی بے شرمی کا حال یہ تھا کہ اُس نے اُن کو گناہ کی دعوت دی، وہ انکار کر کے بھاگے تو اُن کا پیچھا کیا، عین اُس موقع پر اُس کا شوہر آ گیا تو اُلٹا اِن پر الزام لگایا کہ وہ اُس کی عصمت خراب کرنا چاہتے تھے۔ اُس کا جھوٹ جب صریح طور پر ثابت ہو گیا اور شہر کے اُونچے طبقوں کی عورتوں میں اُس کے عشق کا چرچا ہونے لگا تو اُس نے اُنہیں اپنے ہاں دعوت پر بلا کر حضرت یُوسفؑ کو اُن کے سامنے یہ بتانے کے لیے پیش کیا کہ ایسے حسین جوان پر میں مرمٹی تو آخر کیا کرتی، اور بے تکلف بھری مجلس میں کہا کہ اگر یہ میرے ساتھ ناجائز تعلق پر راضی نہ ہوا تو میں اسے قید کرا دوں گی۔

مصر کے اُونچے طبقے کی عورتوں کا کردار ہے جنہوں نے اُس محفل میں حضرت یُوسفؑ کا حُسن دیکھ کر اپنے

ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ وہ بھی اُن کے پیچھے پڑ گئیں اور اُنہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ مصر کے حاکموں کا کردار ہے جنہوں نے اپنی عورتوں کے اخلاقی بگاڑ کی سزا اُلٹی حضرت یوسف کو دی اور بے قصور اُنہیں قید کر کے برسوں جیل میں ڈالے رکھا۔

دُوسری طرف حضرت یوسف کا کردار ہے جس میں اخلاق کی پاکیزگی کا ایک سے ایک بہتر نمونہ سامنے آتا ہے۔ اُنہوں نے قید ہو جانا گوارا کر لیا مگر اپنے دامن کو گناہ سے داغدار کرنا گوارا نہ کیا۔ اس پر بھی اُنہیں اپنے تقویٰ کا کوئی زعم لاحق نہ ہُوا بلکہ اُنہوں نے بڑی عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ "اے میرے پروردگار! قید مجھے اُس چیز سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ لوگ مجھے دعوت دے رہے ہیں، اور اگر تُو نے اِن عورتوں کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں اِن کی طرف جُھک پڑوں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔"

اُنہوں نے جیل میں بھی خدا کے بندوں کو وعظ و نصیحت کر کے راہِ راست دکھانے کی کوشش کی اور تبلیغِ حق کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس کا صرف ایک واقعہ سورۂ یوسف میں آیت ۳۶ سے ۴۰ تک بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قید کے اِس طویل زمانے میں وہ کس طرح دعوت الی اللہ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔

پھر جب بادشاہِ مصر کے ایک خواب کی تعبیر اُنہوں نے دی اور بادشاہ نے اُس سے متاثر ہو کر اُنہیں رہا کرنا اور اپنے پاس بلانا چاہا تو اُنہوں نے اُس وقت تک رہائی قبول نہ کی جب تک عزیزِ مصر کی بیوی اور اس کے ساتھ کی دوسری عورتوں نے اُن کی پاکدامنی اور خود اپنے قصوروار ہونے کی شہادت نہ دے دی۔

اِس کے بعد وہ دَور آیا جب مصر میں اُنہیں شاہانہ اِقتدار حاصل ہو گیا۔ اُس زمانے میں اُن کے وہی بھائی جنہوں نے اُن کو اندھے کنوئیں میں پھینکا تھا اُن کے پاس بار بار غلہ مانگنے کے لیے آتے رہے اور وہ اُنہیں غلہ دیتے رہے، اور ایک مرتبہ بھی اُن کے دل میں خیال نہ آیا کہ اُن سے اُس ظلم کا بدلہ لیں جو اُنہوں نے اُن کے ساتھ کیا تھا۔ اوّل اوّل تو یہ بھائی اِس بات سے ناواقف تھے کہ مصر کے جس فرمانروا سے وہ غلہ حاصل کر رہے ہیں وہ کون ہے اور صرف حضرت یوسفؑ ہی اُن کو پہچان رہے تھے۔ مگر جب تیسری مرتبہ وہ آئے اور حضرت یوسفؑ نے اُنہیں بتایا کہ میں تمہارا وہی بھائی ہوں جس کے ساتھ تم نے وہ ظلم کیا تھا جو تم جانتے ہو، اور اُنہوں نے اپنے خطاکار ہونے کا اعتراف کیا، تو حضرت یوسفؑ کا جواب یہ تھا کہ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔" پھر صرف یہی نہیں کہ اُنہوں نے اپنے والدِ ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام کو وطن سے مصر بلوایا، بلکہ اِن بھائیوں کو بھی اِن کے سارے اہل و عیال سمیت بُلا کر وہاں عزت کے ساتھ آباد کیا۔

آخری شان اس عظیم انسان کے کردار کی سورۂ یوسف میں یہ دکھائی گئی کہ اپنے اس عروج پر وہ کسی فخر و غرور کا اظہار نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے آگے سرِ بندگی خم کرکے عرض کرتا ہے کہ "اے میرے رب، تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے، تو ہی دُنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ مسلم (فرمانبردار) کی حیثیت سے کر اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔"

حضرت شعیب علیہ السلام اور اہلِ مَدیَن و اصحابُ الاَیکہ

قرآن مجید میں اہلِ مَدیَن اور اصحاب الایکہ کا حال بھی لوگوں سے بیان کیا گیا جن کا علاقہ شمالی حجاز میں واقع تھا۔ ان کے متعلق بتایا گیا کہ خدا کے سوا دوسروں کی عبادت کے ساتھ جو اخلاقی خرابیاں اُن کے اندر خصوصیت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں وہ یہ تھیں کہ وہ ناپ تول میں کمی کرتے تھے، رہزن لوگ تھے اور انہوں نے بڑا فساد برپا کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو مَدیَن میں اپنا نبی بنا کر مبعوث کیا اور اَیکہ والوں کی اِصلاح کا کام بھی اُن کے سپرد فرمایا۔ وہ مُدتوں ان لوگوں کو خدا کا خوف دلا کر ان بُرائیوں سے باز آنے کی تلقین کرتے رہے مگر صرف ایک قلیل تعداد اُن پر ایمان لائی اور باقی سب اپنے کرتوتوں پر اَڑے رہے۔ مَدیَن کے سرداروں نے حضرت شعیبؑ سے کہا "کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں، یا یہ کہ ہم اپنے مالوں میں جو کچھ کرنا چاہیں وہ نہ کریں؟" (ہود۔ ۸۷)۔ بالفاظِ دیگر انہیں اس بات پر بھی اصرار تھا کہ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی بندگی صرف اس وجہ سے کی جائے کہ باپ دادا اُن کی بندگی کرتے رہے ہیں، اور وہ اس بات پر بھی مُصر تھے کہ اپنے مالوں میں انہیں اپنی مرضی کے مطابق ہر طرح کے تصرّف کی آزادی ہونی چاہیے خواہ وہ لوٹ مار ہو، یا تجارت میں بے ایمانی ہو، یا کمزور لوگوں پر ظلم و ستم ہو۔ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ "اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو برباد ہو جاؤ گے" (الاعراف۔ ۹۰)۔ گویا اُن کے نزدیک قوم کا پھلنا پھولنا اسی پر منحصر تھا کہ وہ ہر طرح کے ناجائز طریقوں سے مال و دولت حاصل کرے، اور صرف جائز طریقوں کی پابندی قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ قوم برباد ہو جائے۔ انہوں نے حضرت شعیبؑ کو دھمکیاں دیں کہ "ہم تمہیں اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو نکال باہر کریں گے" (الاعراف۔ ۸۸)۔ اور اُن سے کہا کہ "تم کو تو ہم اپنے درمیان ایک کمزور آدمی دیکھتے ہیں۔ اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تمہارا بل بوتا اتنا نہیں ہے کہ ہم پر تم بھاری ہو" (ہود۔ ۹۱)۔ اس پر حضرت شعیبؑ نے یہ فرما کر انہیں شرم دلائی کہ "میرا قبیلہ کیا تمہارے مقابلے میں اللہ سے زیادہ طاقت ور ہے؟ اُس کو تم نے بالکل پس پشت ڈال دیا؟" (ہود۔ ۹۲)۔ ایسا ہی رویّہ اصحابُ الاَیکہ نے بھی حضرت شعیبؑ کے ساتھ اختیار کیا۔ اُن کی نصیحت کو انہوں نے قبول نہ کیا اور جواب دیا تو یہ کہ "اگر تم سچے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو" (الشعراء۔ ۱۸۷)۔ آخر کار

دونوں قومیں خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئیں اور تباہ کر کے رکھ دی گئیں۔ قریش کے لوگ اپنے تجارتی سفروں میں شام جاتے ہوئے ہمیشہ اُن علاقوں سے گزرتے تھے جہاں یہ قومیں مبتلائے عذاب ہوئی تھیں، اِس لیے وہ قرآن کے اس بیان سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

قصۂ فرعون و موسیٰ علیہ السلام

دنیا بھر میں یہ ہولناک تاریخی واقعہ مشہور تھا کہ فرعون اور اس کا لشکر خدا کے عذاب میں گرفتار ہو کر سمندر میں غرق ہوا تھا، اور عرب میں یہود و نصاریٰ کثرت سے موجود تھے جن کے ذریعہ سے سارے ہی اہلِ عرب جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس کے پاس نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، اور اُنھوں نے حیرت انگیز معجزے دکھا کر اُسے دعوتِ حق دی تھی، مگر وہ کسی معجزے کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لایا تھا۔ خود قریش کے لوگ حضرت موسیٰ کے ان معجزوں سے واقف تھے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُن کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ لَوْلَآ اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی "اِن کو وہ معجزے کیوں نہ دیے گئے جو موسیٰ کو دیے گئے تھے؟" (القصص - ۴۸)۔ اِسی بنا پر قرآن میں جگہ جگہ حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا جس سے اچھے اور برے کردار اپنی خصوصیات کے ساتھ پوری طرح واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آگئے۔

فرعون کے جرائم اس میں ایک ایک کر کے گنائے گئے ہیں۔ "اُس نے زمین میں بڑی سرکشی کی۔ اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ اُن میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اُس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اُس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا" (القصص ۴)۔ یعنی اُس کی حکومت کا قاعدہ یہ نہ تھا کہ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں ہوں اور سب کو برابر کے حقوق دیے جائیں، بلکہ اُس نے سیاست کا یہ طرز اختیار کیا تھا کہ ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جائے، کسی کو مراعات و امتیازات دے کر حکمران گروہ ٹھیرایا جائے، اور کسی کو محکوم بنا کر دبایا اور پیسا جائے۔ اِس دوسرے گروہ میں خصوصیت کے ساتھ بنی اسرائیل پر اُس نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ اُن کے لڑکوں کو وہ قتل کرتا اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دیتا تھا، تاکہ رفتہ رفتہ اُن کی نسل ختم ہو جائے اور اُن کی عورتیں مصریوں کے تصرف میں آکر ایک مصری نسل پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔ اِسی بنا پر جب حضرت موسیٰ ایک اسرائیلی گھر میں پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی والدہ کو اشارہ کیا کہ جب اِس بچے کے قتل کا خطرہ لاحق ہو تو اِسے ایک ٹوکری میں رکھ کر دریا میں ڈال دینا (القصص - ۷)۔

خود اپنی مصری قوم کے ساتھ اُس کا جو معاملہ تھا اس کی پوری تصویر سورۂ زخرف کے صرف ایک فقرے میں کھینچ دی گئی ہے: "اُس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور اُنھوں نے اُس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی

فاسق لوگ" (الزخرف - ۵۴)۔ اِس میں فرعون کی سیاست اور اُس کی قوم کی گری ہوئی اخلاقی حالت، دونوں کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

"جب کوئی شخص کسی ملک میں اپنی مطلق العنانی چلانے کی کوشش کرتا ہے اور اُس کے لیے کھُلّم کھُلّا ہر طرح کی چالیں چلتا ہے، ہر فریب اور مکر و دغا سے کام لیتا ہے، کھُلے بازار میں ضمیروں کی خرید و فروخت کا کاروبار چلاتا ہے، اور جو بکتے نہیں انہیں بے دریغ کچلتا اور رَوندتا ہے تو خواہ وہ زبان سے یہ بات کہے یا نہ کہے، اپنے عمل سے صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ درحقیقت اِس ملک کے باشندوں کو عقل اور اخلاق اور مردانگی کے لحاظ سے ہلکا سمجھتا ہے اور اُس نے اُن کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ میں اِن بیوقوف، بزدل اور بے ضمیر لوگوں کو جدھر چاہوں ہانک کر لے جا سکتا ہوں۔ پھر جب اُس کی یہ تدبیریں ملک میں کامیابی کے ساتھ چل جاتی ہیں اور باشندگانِ ملک اس کے دست بستہ غلام بن کر رہ جاتے ہیں تو وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ اُس خبیث نے جو کچھ انہیں سمجھا تھا، واقعی وہ وہی کچھ ہیں۔ اور اُن کے اِس ذلیل حالت میں مبتلا ہونے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر "فاسق" ہوتے ہیں۔ اُن کو اِس سے کچھ بحث نہیں ہوتی کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ انصاف کیا ہے اور ظلم کیا۔ سچائی اور دیانت اور شرافت قدر کے لائق ہے یا جھُوٹ اور بے ایمانی اور رذالت۔ اِن مسائل کے بجائے ان کے لیے اصل اہمیت صرف اپنے ذاتی مفاد کی ہوتی ہے جس کے لیے وہ ہر ظالم کا ساتھ دینے، ہر جبّار کے آگے دبنے، ہر باطل کو قبول کرنے اور ہر صدائے حق کو دبانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔" (تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزخرف حاشیہ ۵۰)

حضرت موسیٰ علیہ السّلام جب اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ اُس کے دربار میں اللہ جلّ شانہٗ کے پیغمبر کی حیثیت سے پہنچے اور اُنہوں نے ایسے صریح معجزے پے در پے پیش کیے جن کے متعلق ایک بیوقوف سے بیوقوف آدمی بھی یہ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ یہ جادُو کے کرشمے ہیں، اُن کو وہ محض اپنی کبریائی کے زعم میں جادُو ہی کہتا رہا اور اُس کے درباری اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ عصا کے اژدہا بن جانے کو تو خود اُس کے بلائے ہوئے ماہر جادُوگروں نے مان لیا کہ یہ اُن کے فن کی چیز نہیں بلکہ خدا کا معجزہ ہے۔ رہے دوسرے معجزات، مثلاً حضرت موسیٰ کے پیشگی اعلان کے مطابق پُوری سرزمینِ مصر میں قحط برپا ہونا اور اُن کی دعا ہی سے اس کا دُور ہونا، اُن کے اعلان پر سارے ملک میں . . . .

. . . . بارشوں کا ہولناک طوفان آنا اور اُن کی دعا ہی سے اُس کا ختم ہونا، اُن کے

اعلان پر ٹڈی دلوں کا خوفناک حملہ ہونا اور ان کی دُعا ہی سے اس کا رفع ہونا، اسی طرح ان کے اعلان کے مطابق جُوؤں اور سُرسُریوں کا عذاب، مینڈکوں کا عذاب اور خون کا عذاب باری باری یوں پے در پے ملک میں آنا اور صرف اُن کی دُعا سے اُن کا ٹلنا، اِس شُبہ کی اُدنیٰ گنجائش بھی نہ چھوڑتا تھا کہ یہ کسی ساحر کی جادوگری ہے کیونکہ ایسے کام نہ کبھی کوئی جادوگر کر سکا ہے، نہ کر سکتا ہے، صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ سب اللہ ربّ العالمین کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ اسی لیے ہر عذاب کے آنے پر فرعون اور اُس کے اہلِ دربار حضرت موسیٰؑ سے کہتے کہ آپ کو اپنے رب کے ہاں جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر دُعا کیجیے کہ یہ عذاب ہم پر سے ٹل جائے تو ہم آپ کی بات مان لیں گے مگر جب وہ ٹل جاتا تو وہ اپنے عہد سے پھر جاتے تھے (الاعراف ۱۳۴-۱۳۵۔ الزخرف ۴۹-۵۰)۔ قرآن میں صاف کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دلوں میں یقین رکھتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ حق پر ہیں اور پھر ظلم و سرکشی کی وجہ سے انکار کیے چلے جا رہے تھے (النمل-۱۴)۔ یہ حقیقت اُس وقت بالکل کھل گئی جب فرعون اپنے لشکروں سمیت غرق ہونے لگا اور اُس نے پکار کر کہا "میں مان گیا کہ کوئی خدا اُس کے سوا نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لاتے ہیں اور میں اسلام لانے والوں میں سے ہوں" (یونس-۹۰)۔

اِس طرح حق کو حق جان لینے کے باوجود اُس نے اور اُس کے درباریوں نے باطل پرستی اور ظلم و تکبّر کی حد کر دی۔ اُس کے درباریوں نے اُس سے کہا کہ "کیا حضور اِس موسیٰؑ اور اس کی قوم کو اسی طرح چھوڑے رکھیں گے کہ یہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کی اور آپ کے معبودوں کی بندگی چھوڑ دیں"؟ اُس نے کہا "نہیں، ہم ابھی حکم دیتے ہیں کہ ان کے لڑکوں کو قتل کیا جائے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے" (الاعراف-۱۲۷)۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے جو حکم جاری ہوا تھا وہ پھر سے تازہ کیا گیا اور نیا حکم یہ دیا گیا کہ جو جو لوگ موسیٰؑ کے ساتھ ایمان لانے والے ہوں اُن کے لڑکوں کو قتل کیا جائے اور اُن کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے (المؤمن-۲۵)۔ اُس نے حضرت موسیٰؑ سے کہا "اگر میرے سوا تُو نے کسی کو خدا مانا تو میں تجھے قید کر دوں گا" (الشعراء-۲۹)۔ اپنے بھرے دربار میں کہا "اے سردارو، میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور خدا بھی ہے" (القصص-۳۸)۔ بڑے ڈھڑلے سے اعلان کیا کہ "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" (النازعات-۲۴)۔ غایتِ خیرہ چشمی کے ساتھ اپنے وزیر ہامان سے کہا "ذرا ایک اُونچی عمارت تو بنا۔ میں اُس پر چڑھ کر دیکھوں تو سہی کہ موسیٰؑ کا خدا کہاں ہے" (القصص ۳۸۔ المؤمن ۳۶-۳۷)۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ اس نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کا فیصلہ کر ڈالا اور اپنے اہلِ دربار سے کہا "چھوڑو مجھے کہ میں اِس موسیٰؑ کو قتل کر دوں اور یہ اپنے رب کو پکار دیکھے" (المؤمن ۲۶)۔

ایک کردار یہ ہے جو اِس قصے میں فرعون اور اُس کے اعیانِ سلطنت اور اس کی قوم کا نظر آتا ہے۔ دوسرا ایک نہایت عبرت انگیز اور سبق آموز کردار ساحرانِ مصر کا ہے جو اپنے دین کی حمایت میں حضرت موسیٰؑ

کا مقابلہ کرنے کے لیے سارے ملک سے جمع ہو کر آتے تھے جب وہ آتے ہیں تو فرعون سے کہتے ہیں کہ "مگر نہ اگر ہم جیت گئے تو کچھ انعام تو ملے گا نا؟" وہ کہتا ہے "انعام ہی نہیں ملے گا بلکہ تم تو ہمارے مقربین میں شامل ہو جاؤ گے"۔ مگر یہی جادوگر جب حضرت موسیٰ کے معجزے سے اپنے جادو کو مغلوب ہوتے دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہاں جادو نہیں بلکہ خدائی طاقت کام کر رہی ہے، تو سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ "ہم نے مان لیا رب العالمین کو، موسیٰ اور ہارون کے رب کو"۔ اب ان کے اندر یکلخت اتنا بڑا انقلاب واقع ہو جاتا ہے کہ فرعون انہیں ہاتھ پاؤں کٹوانے اور سولی پر چڑھا دینے کی دھمکیاں دیتا ہے اور وہ اس کی کسی دھمکی کی پروا نہیں کرتے۔ اس سے صاف کہتے ہیں کہ تجھے جو کچھ کرنا ہے کر ڈال، ہم تیری خاطر ان کھلی صداقتوں سے جو ہم نے دیکھ لی ہیں، اور اپنے خالق سے منہ نہیں موڑ سکتے (الاعراف ۱۱۳ تا ۱۲۶- طٰہٰ ۷۰ تا ۷۳۔ الشعراء ۴۱ تا ۵۱)۔

ایک اور کردار فرعون کے درباریوں میں سے ایک درباری کا ہے۔ وہ دل میں ایمان لا چکا تھا اور اسے چھپائے ہوئے تھا۔ مگر جب فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ کیا تو وہ بھرے دربار میں بے خوف اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا "کیا تم لوگ ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟" اس کے بعد اس نے ایک طویل اور پر زور وعظ کہا جسے سورۂ مومن میں آیت ۲۸ سے ۴۴ تک مسلسل نقل کیا گیا ہے۔ اس وعظ میں اس نے کھلم کھلا فرعون اور اس کی سلطنت کے اعیان و ارکان اور اس کی قوم کو خدا کے عذاب سے ڈرایا، ان سب کو سیدھا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی، اور اس بات کی کچھ پروا نہ کی کہ اس حق گوئی کا کیا نتیجہ اس کو دیکھنا پڑے گا۔

سب سے زیادہ شاندار کردار اس میں حضرت موسیٰؑ کا سامنے آتا ہے۔ وہ ایک ایسی قوم کے فرد تھے جو مصر میں ذلت کی آخری حد کو پہنچا دی گئی تھی اور اتنی جان بھی نہ رکھتی تھی کہ اپنے بچوں کے قتل پر اف تک کر سکے۔ خود حضرت موسیٰ پر ایک مصری کے قتل کا الزام تھا جس میں ان کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے اور وہ ملک چھوڑ کر کئی سال تک مدین میں پناہ گزین رہے تھے۔ اس حالت میں جب اللہ تعالیٰ نے ان کو نبی مقرر کر کے، اور بس ایک لاٹھی اور ید بیضا کا معجزہ دے کر فرعون جیسے جبار کی حکومت سے جا ٹکرانے کا حکم دیا تو وہ اللہ کی مدد کے بھروسے پر کسی لاؤ لشکر کے بغیر اس کے دربار میں جا کھڑے ہوئے۔ اس کی کسی دھمکی سے مرعوب نہ ہوئے۔ اس کے کسی جبر و ظلم کے آگے نہ دبے۔ سالہا سال تک مسلسل سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور جب فرعون نے علانیہ ان کے قتل کا ارادہ کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کی دھمکی کو اس کے منہ پر مار دیا کہ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ "میں نے پناہ لے لی اپنے اور تمہارے رب کی ہر اس متکبر

سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا" (المومن - ۲۷)۔

دوسری تاریخی مثالیں

اسی طرح قرآن میں دوسری بہت سی تاریخی مثالیں پیش کرکے یہ اچھی طرح واضح کر دیا گیا کہ اسلام کس کردار اور اخلاق کے انسانوں کو پسند کرتا ہے اور کیسے انسان اس کو ناپسند ہیں۔ مثلاً ایک طرف حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام ہیں جو تختِ شاہی پر متمکن ہونے کے باوجود خدا ترسی و آئینِ بندگی سے ذرا نہیں ہٹتے، غرور و تکبر کے بجائے شکر اور اطاعت کے طریقے پر قائم رہتے ہیں، اور جہاں بھی انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے اُن کو آزمائش میں ڈالا گیا ہے، فوراً عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جاتے ہیں (ص: ۱۷ تا ۴۰۔ النمل ۱۹-۴۰ سبا ۱۰-۱۳-۳۵)۔

ملکۂ سبا ہے جو ایک مشرک قوم کی فرمانروا ہونے کے باوجود جب حق سے آگاہ ہو جاتی ہے تو بلا تامل اسے قبول کر لیتی ہے اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتی کہ اس کی مشرک قوم اس کا ساتھ دیتی ہے یا نہیں (النمل - ۴۴)۔
سورۂ یٰسین کا ایک مردِ حق پرست ہے جس کی قوم تین تین پیغمبروں کی شدید مخالفت کرتی ہے اور انہیں سنگسار کر دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے، مگر وہ اس خطرناک حالت میں بھی شہر کے ایک حصے سے دوڑتا ہوا آتا ہے، قوم کو پیغمبروں کی بات مان لینے کی تلقین کرتا ہے، اس کی گمراہی دلیل کے ساتھ ثابت کرتا ہے، اپنے ایمان کا صاف صاف اعلان کرتا ہے، اور اس کی پاداش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، پھر بھی اس کے دل سے ظالموں کے حق میں بددعا نہیں نکلتی، بلکہ وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اس کی قوم کے لوگ اب بھی جان لیں کہ کس چیز کی بدولت اس کے رب کے ہاں اسے عزت اور مغفرت نصیب ہوئی (آیات ۱۳ تا ۲۷)۔
اصحابِ کہف ہیں جو ایک مشرک قوم کے ظلم سے اپنا ایمان بچا لینے کے لیے محض خدا کے بھروسے پر ایک غار میں جا چھپتے ہیں اور اس بات کی کوئی فکر نہیں کرتے کہ اس پناہ گاہ میں وہ کب تک بے سہارا رہ سکیں گے۔ انہیں فکر ہوتی ہے تو بس یہ کہ وہ ایمان کے راستے سے نہ ہٹنے پائیں (الکہف ۱۳ تا ۲۰)۔

دوسری طرف قارون ہے جو حضرت موسیٰ کی قوم کا ایک فرد تھا، مگر دنیا پرستی کی خاطر فرعون کے مقرب درباریوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے حرام کی دولت کے انبار جمع کیے اور ان پر خوب اترایا۔ نیک لوگوں نے اُسے بھلائی کی تلقین کی تو اس نے یہ کہہ کر ان کی بات رد کر دی کہ مجھے جو کچھ ملا ہے وہ میری قابلیت کا نتیجہ ہے۔ دنیا پر فریفتہ لوگ اس کی شان و شوکت دیکھ کر اسے بڑا نصیبے والا سمجھتے اور تمنا کرتے کہ کاش ہمیں بھی یہی نصیب ہو۔ مگر جب اللہ نے اُسے اور اس کے محل اور اس کی دولت کو زمین میں دھنسا دیا تو وہ ان لوگوں کے لیے عبرت بن گیا جو اس کا سا مرتبہ پانے کی آرزو رکھتے تھے (القصص ۷۶ تا ۸۲)۔

قومِ سبا ہے جس کے ملک کو اللہ نے جنت بنا رکھا تھا، مگر جب اس نے اللہ کی ناشکری کا راستہ اختیار کیا تو اللہ نے ایک خوفناک سیلاب سے اس کو تباہ کر دیا، اس کے باغ جھاڑ جھنکاڑ بن گئے، اور وہ ایسی پراگندہ ہوئی کہ عرب میں اس کی پراگندگی ضرب المثل بن کر رہ گئی (سبا ۱۵ تا ۱۹)۔

سب سے زیادہ بدتر مثال یہود کی پیش کی گئی جنھوں نے خدا کی نافرمانیاں کر کے تاریخ میں دو بار فسادِ عظیم برپا کیا اور اس کی سزا یہ بھگتی کہ ایک مرتبہ بابل و آشور کے سخت گیر حکمرانوں نے انھیں غارت کیا اور دوسری مرتبہ رومیوں نے انہیں فلسطین سے نکال کر دنیا بھر میں پراگندہ کر دیا (بنی اسرائیل ۴ تا ۷)۔ اسی آخری پراگندگی کے بعد وہ عرب میں پہنچے تھے اور اُن کا ایک ایک اخلاقی عیب اہلِ عرب کے سامنے تھا جس کی نشان دہی کر کے قرآن نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ اِن صفات کے انسانوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر اپنی دنیوی اغراض اور خواہشات کے لیے خود اپنے مذہب کی تعلیمات کے خلاف اِس بھروسے پر گناہ کرتے تھے کہ ہمیں تو معاف کر ہی دیا جائے گا (الاعراف۔ ۱۶۹)۔ وہ کہتے تھے کہ اُمّیوں (یعنی غیر یہودیوں) کے مال مار کھانے اور اُن کے ساتھ بدمعاملگی کرنے سے ہم پر کوئی گناہ عائد نہیں ہوتا (آلِ عمران۔ ۷۵)۔ اُن کے علما اور درویش لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے تھے (التوبہ۔ ۳۴)۔ سُود خواری اُن میں عام تھی حالانکہ اُن کے دین میں اس سے منع کیا گیا تھا (النساء۔ ۱۶۱)۔ اُنھوں نے جادو ٹونے اور سِفلی عملیات کا شیطانی کاروبار پھیلا رکھا تھا اور اُسے حضرت سُلیمان علیہ السّلام کی طرف جُھوٹ منسوب کرتے تھے (البقرہ۔ ۱۰۲)۔ اُن کے اندر ہر طرح کی بُرائیاں پھیلی ہُوئی تھیں مگر انہوں نے یہ طریقہ چھوڑ دیا تھا کہ ایک دوسرے کو بُرے کاموں سے روکیں، اسی لیے وہ اخلاقی پستیوں میں گرتے چلے جا رہے تھے (المائدہ۔ ۷۹)۔ یہ وہ عیب ہے جسے قرآن نے تمام قوموں کی بربادی کا ایک عام سبب بیان کیا ہے۔ چنانچہ سُورۂ ہود میں پچھلی قوموں کے پے در پے مُبتلائے عذاب ہونے کے واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ "کیوں نہ اُن قوموں میں، جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں، ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے ؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم جن کو ہم نے اُن قوموں میں سے بچا لیا، ورنہ ظالم لوگ تو اُنہی مزوں میں پڑے رہے جن کے سامان اُنہیں فراوانی کے ساتھ دیئے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ اُن کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں" (آیات ۱۱۶ - ۱۱۷)۔

وہ بُرائیاں جن کی قرآن میں مذمّت کی گئی

یہ ایک اُسلوب تھا جس سے قرآن نے تاریخی واقعات کے پیرایے میں اپنی اخلاقی تعلیمات کو بیان کیا۔ اس کے بعد دوسرا اُسلوب یہ ہے کہ اُس نے براہِ راست اُن بُرے اوصاف اور اعمال اور اخلاق کی مذمّت کی جو

قریش، اور عرب اور عام انسانی معاشرے میں پائے جاتے تھے۔ یہ ایسی برائیاں تھیں جن کو اچھا کہنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ ان کے مقابلے میں اس نے بتایا کہ وہ اچھے اوصاف، اخلاق اور اعمال کیا ہیں جن سے اسلام افراد اور معاشرے کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ایسی خوبیاں تھیں جنہیں فضائل اخلاق ماننے سے انکار کر دینا بھی کسی کے بس میں نہ تھا۔

اب ہم پہلے اُن برائیوں کو بیان کریں گے جن کی قرآن میں مذمت کی گئی اور لوگوں کو بتایا گیا کہ اسلام ان سے انسانی زندگی کو پاک کرنا چاہتا ہے۔

—— "تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے، جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا" (الہمزہ: ۱ تا ۳)۔

—— "تم نے دیکھا اُس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وُہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اُکساتا (یعنی نہ خود اپنے نفس کو اس پر آمادہ کرتا ہے نہ دوسروں کو اس بات پر اُکساتا ہے کہ غریب و محتاج لوگوں کی بھوک مٹانے کے لیے کچھ کریں)۔ پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں لوگوں کو دینے سے گریز کرتے ہیں" (الماعون)۔

—— "انسان کا حال یہ ہے کہ اُس کا رب جب اسے آزمائش میں ڈالتا ہے (اور یہ آزمائش کی خاطر) اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اُسے آزمائش میں ڈالتا ہے (اور اس بنا پر) اُس کا رزق تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں (یعنی یہ معیارِ عزت و ذلت نہیں ہے) بلکہ تم لوگ یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اُکساتے، اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو" (الفجر۔ ۱۵ تا ۲۰)۔

—— "جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ تو اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں" (النساء۔ ۱۰)

—— "تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی فکر نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں (یہ کوئی بھلائی نہیں ہے) عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا" (التکاثر۔ ۱ تا ۳)۔

—— "اور کسی ایسے شخص کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے،

طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے، سخت بداعمال ہے، جفاکار ہے، اور ان سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے۔ اس کا رویہ قبول نہ کرو محض اس لیے کہ وہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے" (القلم: ۱۰ تا ۱۴)۔

"تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جو لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جب کہ سب لوگ رب العلمین کے سامنے کھڑے ہوں گے" (المطففین۔ ۱ تا ۶)۔

"انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو" (الرحمٰن ۔۹)۔

(قیامت کے روز اہل جنت) "مجرمین سے پوچھیں گے کہ کیا چیز تمہیں دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور (حق کے خلاف) باتیں بنانے والوں میں ہم بھی شامل ہو جاتے تھے اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے" (المدثر: ۴۲ تا ۴۶)۔

(قیامت کے روز دوزخی کو زنجیروں میں باندھ دیے جانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا جائے گا) "یہ خدائے بزرگ پر ایمان رکھتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے پر اکساتا تھا۔ لہٰذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یار غمخوار ہے اور نہ اس کے لیے زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا" (الحاقہ ۳۳ تا ۳۷)۔

"وہ کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال اُڑا دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا؟" (البلد ۶-۷)۔ (ڈھیروں مال اُڑا دینے سے مطلب اپنی دولت مندی کی نمائش اور اپنے فخر اور بڑائی کے اظہار کے لیے خوب مال خرچ کرنا ہے اور آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فخر جتانے والا کیا یہ سمجھتا ہے کہ کوئی یہ دیکھنے والا نہیں ہے کہ اس نے یہ دولت کس طرح حاصل کی اور کن کاموں میں کس نیت سے اس کو اُڑا دیا؟)

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور اپنے اس خرچ کے بعد کسی پر کوئی احسان نہ جتائیں نہ (اس شخص کو جسے انہوں نے مال دیا ہے) کوئی دکھ دیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے اذیت دی جائے" (البقرہ ۲۶۲-۲۶۳)۔

"اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے" (البقرہ ۲۶۴)۔

"جو لوگ اس مال میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دیا ہے وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے بہتر ہے، بلکہ یہ ان کے لیے بہت برا ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کرتے ہیں وہی قیامت کے

سو وہ اُن کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا" (آل عمران ۔ ۱۸۰) بخل صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنا مال نہ اپنی ذات پر خرچ کرے اور نہ اپنے بال بچوں پر، بلکہ بخل یہ بھی ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اپنے عیش و آرام اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں اور اپنی دولت مندی کی نمائش پر اُڑاتا رہے مگر کسی نیک کام پر خرچ کرنے کے لیے اُس کا دل آمادہ نہ ہو۔

—— "اللہ ایسے لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور اور اپنی بڑائی پر فخر کرنے والے ہیں، جو بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کرنے کے لیے کہتے ہیں اور اللہ نے جو کچھ اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں" (النساء ۔ ۳۶ ۔ ۳۷)۔

—— "جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچ گئے وہی فلاح پانے والے ہیں" (التغابن ۔ ۱۶)۔

—— "لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر اور زمین پر اکڑ کر نہ چل۔ اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے" (لقمان : ۱۸ ۔ ۱۹)۔

—— "اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو" (النساء ۔ ۳۲) کسی کو اپنے مقابلے میں کسی حیثیت سے بڑھا ہوا دیکھ کر بے چین ہو جانا ہی رشک و حسد اور رقابت کی اصل جڑ ہے جس کے باعث آدمی دوسرے سے جلنے لگتا ہے، اپنی بھلائی کے لیے اُس کی برائی چاہتا ہے، اور جو فضل جائز طریقے سے اُسے نہیں ملتا اُسے حاصل کرنے کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرتا ہے۔

—— "اے نبیؐ، لوگوں سے کہو کہ میرے رب نے تو حرام کیے ہیں فحش کام، خواہ کھلے ہوں یا چھپے، اور گناہ، اور ناحق کی زیادتی، اور یہ کہ تم اللہ کے نام پر وہ بات کہو جس کے من جانب اللہ ہونے کا تمہیں علم نہیں ہے" (الاعراف ۔ ۳۳)۔

—— "اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان اصلاح کے کاموں سے باز رہنا ہو" (البقرہ ۔ ۲۲۴)۔

—— "اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے کوئی معاہدہ کیا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر کفیل ٹھیرا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اُس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت کے ساتھ سُوت کاتا اور آپ ہی اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو اپنے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے میں رہے۔ حالانکہ اللہ تم کو اِس (عہد و پیمان) کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالتا ہے" (النحل ۔ ۹۱ ۔ ۹۲)۔

——— "اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں اور اُن رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے (آخرت میں) بُرا ٹھکانا ہے" (الرعد-۲۵)۔

——— "بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اُسے بگاڑ دیتے ہیں اور اُس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں" (النمل-۳۴)۔

——— سورہ الحجرات میں جن اخلاقی بُرائیوں کی مذمت کی گئی ہے وہ ہیں ایک دوسرے کا مذاق اڑانا، ایک دوسرے پر طعن کرنا، لوگوں کے بُرے بُرے لقب رکھنا، بے جا بدگمانیاں کرنا، دوسروں کے حالات کا تجسّس کرنا، اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی بُرائی کرنا (آیات ۱۱-۱۲)۔

——— "قطعاً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے جہالت و نادانی کی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کیا" (الانعام-۱۴۰)۔

——— "جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بُری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا اسے مٹی میں دبا دے" (النحل-۵۸-۵۹)۔

——— "قیامت کے روز جب خدا کے حضور لوگوں کی پیشی ہوگی تو" زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قصور میں ماری گئی؟" (التکویر-۸-۹)۔

——— "جو شخص خود کوئی جُرم یا گناہ کرے اور اُس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دے اُس نے بڑے بہتان اور گناہ کا بار سمیٹ لیا" (النساء-۱۱۲)۔

——— "تم کسی خائن کے حامی نہ بنو۔ ۔ ۔ اللہ کسی خیانت کار اور معصیت پیشہ کو پسند نہیں کرتا" (النساء: ۱۰۵-۱۰۷)۔

——— "خائن اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا پھر ہر شخص کو اُس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور لوگوں پر کوئی ظلم نہ ہوگا" (آلِ عمران-۱۶۱)۔

——— "جانتے بوجھتے ایک دوسرے کی امانتوں میں خیانت نہ کرو" (الانفال-۲۷)۔

——— "جو سُود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتری ہو، اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا۔ اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی کے لیے دو اسی کے دینے والے درحقیقت مال بڑھاتے ہیں" (الروم-۳۹)۔

——— "آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ الّا یہ کہ لین دین ہو تمہارے درمیان آپس کی رضامندی سے۔ ایک دوسرے کو ہلاک نہ کرو۔ ۔ ۔ تم میں سے جو ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا

اس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے" (النساء: ۲۹-۳۰)۔

۔۔۔۔۔ "آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے اُن کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ لوگوں کے مالوں کا کوئی حصہ جان بوجھ کر گناہ کے ساتھ کھا جاؤ" (البقرہ-۱۸۸)۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کرو۔ اور یہ بھی کہ عدالت میں یہ جانتے ہوئے کہ مال دراصل دوسرے شخص کا ہے محض اس بنا پر معاملہ نہ لے جاؤ کہ وہ شخص اپنی ملکیت کا ثبوت نہ دے سکے گا، یا تم کوئی ہیر پھیر کر کے مقدمہ جیت جاؤ گے۔

۔ ۔۔۔ "گواہوں کو شہادت دینے سے انکار نہ کرنا چاہیے جب وہ گواہی کے لیے بلائے جائیں۔۔۔ اور شہادت کو چھپاؤ نہیں۔ جو اُسے چھپائے اُس کا دل گناہ گار ہے" (البقرہ-۲۸۲-۲۸۳)۔

۔۔۔۔ "جھوٹی بات کہنے سے پرہیز کرو" (الحج-۳۰)۔ اسی میں جھوٹی شہادت بھی آجاتی ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عُدِلت شهادة الزور بالاشراك بالله "جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر رکھی گئی ہے"۔

۔ ۔۔۔۔ "جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اُس میں سے حصہ پائے گا اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا" (النساء-۸۵) یعنی اُس کی بھلائی یا اس کی بُرائی میں وہ بھی حصہ دار ہوگا۔

۔ ۔۔۔۔ سورۃ نور میں آیت ۴ سے ۲۳ تک پاکدامن عورتوں پر جھوٹے بہتان گھڑنے، اُن کو سُننے اور آگے پھیلانے اور معاشرے کے اندر فحش کی اشاعت کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے جس کی تفصیلات کو چھوڑ کر ہم صرف آیات کے حوالے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اور یہ معاملہ صرف عورتوں ہی کی حد تک خاص نہیں ہے، مردوں پر بہتان لگانا بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسا عورتوں پر بہتان لگانا۔

۔۔۔۔ "بیویوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو" (النساء-۱۹)۔ "اگر عورتوں کو طلاق دو اور اُن کی عدت پوری ہونے کو آئے تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو، یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ اُن کو ستانے کے لیے نہ روک رکھو تاکہ ان پر زیادتی کرو۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرے گا" (البقرہ-۲۳۱)

۔ ۔۔ "عورتوں سے اُن کے سرپرستوں کی اجازت کے ساتھ نکاح کرو اور ان کے مہر معروف طریقے سے ادا کرو کہ وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں، آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں" (النساء-۲۵)

۔۔۔۔ "اے نبیؐ، عورتوں سے اس بات کا عہد لو کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی

اور کسی امرِ معروف میں (اے نبی) تمہاری نافرمانی نہ کریں گی" (الممتحنہ۔۱۲) بہتان گھڑ کر لانے سے مراد دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی عورت دوسری عورتوں پر غیر مردوں سے آشنائی کا الزام لگاتے اور اس کا چرچا کرتے، دوسرے یہ کہ وہ بچہ تو کسی کا جنے اور شوہر کو اس دھوکے میں رکھے کہ بچہ اُس کا ہے۔

ـــــــ "اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے تاکہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو ڈھانکے اور زینت کا ذریعہ بھی ہو۔۔۔۔ اے بنی آدم تم کو شیطان فتنے میں نہ ڈالے جس طرح اس نے تمہارے والدین (آدمؑ و حوا علیہما السلام) کو جنّت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس اُن پر سے اُتروا دیئے تھے تاکہ اُن کی شرم گاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھول دے" (الاعراف: ۲۶-۲۷)۔

ـــــــ "اے نبیؐ، ان سے کہو کس نے حرام کر دیا اللہ کی اُس زینت کو جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے اور کھانے پینے کی پاک چیزوں کو؟" (الاعراف ۳۲) "رہبانیت کی بدعت (عیسائیوں نے) خود نکالی، ہم نے اُسے اُن پر فرض نہیں کیا تھا" (الحدید۔ ۲۷)۔

ـــــــ "کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے تم نشہ آور چیز بھی بناتے ہو اور اچھا رزق بھی حاصل کرتے ہو" (النحل۔۶۷) یعنی اللہ نے جو اچھا رزق دیا تھا اسے تم ایک بُرے کام، نشہ پیدا کرنے والی چیز بنانے کے لیے استعمال کرتے ہو۔

یہ بُرے اخلاق و اوصاف اور اعمال جن کی قرآن میں مذمت کی گئی تھی، ان کی بُرائی سے انکار کرنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا، نہ قریش اور اہلِ عرب میں سے کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی ہمت رکھتا تھا کہ اُس کا معاشرہ ان بُرائیوں سے پاک ہے، اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ جن بُرائیوں سے قرآن روک رہا ہے اُن میں سے کوئی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب میں پائی جاتی ہے۔ ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کے سوا جو لوگ بھی صاف اور بے تعصّب ذہن رکھتے تھے ان کے لیے یہ ماننے کے سوا چارہ نہ تھا کہ ان بُرائیوں سے واقعی افراد اور معاشرے کو پاک ہونا چاہیے اور یہ شخص کوئی قصور نہیں کر رہا ہے جو انسانی زندگی کو ان سے پاک کرنا چاہتا ہے۔

جامع اخلاقی ہدایات

اِن بُرائیوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ قرآن میں پے درپے ایسی جامع اخلاقی ہدایات دی گئیں جن کی خوبی دلوں میں کھُب جانے والی تھی، اور کسی سلیم الطبع انسان کے لیے ان کو برحق ماننے بغیر چارہ نہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ یہ اس بنا پر اور بھی زیادہ پُرکشش تھیں کہ اُنہیں صرف بیان ہی نہیں کیا گیا، بلکہ ان کو پیش کرنے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم اور اُن پر ایمان لانے والے لوگ رضی اللہ عنہم عملاً ان پر کاربند تھے۔ ذیل میں ہم ان کو سلسلہ وار نقل کرتے ہیں:

—— اللہ عدل اور احسان اور رشتہ داروں کی مدد کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق حاصل کرو۔" (النحل۔ ۹۰)۔

—— "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے کہو: آؤ میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ کہ اُس کے ساتھ (خدائی میں) کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اور اپنی اولاد کو مُفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور اُن کو بھی دیں گے۔ اور فحش کاموں کے قریب نہ جاؤ خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔ اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے قتل نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اُس نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔ اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رُشد کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمّہ داری کا اُتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔ اور جب بات کہو انصاف کی بات کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔[1] ان باتوں کی نصیحت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سبق لو۔" (الانعام۔ ۱۵۱۔۱۵۲)۔

—— "تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُس کی۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو ان کو اُف تک نہ کہو، نہ اُنہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ اُن کے ساتھ احترام سے بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دُعا کیا کرو کہ پروردگار، اُن پر رحم فرما جس طرح اُنہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبّہ ہو کر بندگی کے رویّے کی طرف پلٹ آئیں۔ اور رشتہ دار کو اُس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اُس کا حق۔ اور فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ اور اگر تمہیں اُن سے (یعنی حاجت مندوں سے) اِس بنا پر

---

[1] اللہ کے عہد سے مراد وہ عہد بھی ہے جو انسان اپنے خدا سے کرے، اور وہ عہد بھی جو خدا کا نام لے کر بندوں سے کرے، اور وہ عہد بھی جو انسان اور خدا، اور انسان اور انسانوں کے درمیان اُسی وقت آپ سے آپ بندھ جاتا ہے جب کوئی شخص خدا کی زمین میں ایک انسانی معاشرے کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ یہ آخری عہد وہ فطری عہد (Natural Contract) ہے جس کے باندھنے میں اگرچہ انسان کے ارادہ و شعور کا کوئی دخل نہیں ہے لیکن واجب الاحترام ہونے میں وہ شعوری معاہدہ و پیمان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

پہلو تہی کرنی پڑے کہ ابھی تم اللہ کی اُس رحمت کو جس کے تم اُمیدوار ہو تلاش کر رہے ہو، تو اُنہیں نرمی کے ساتھ جواب دو۔ اور نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ رکھو (کہ بخل کرنے لگو) نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دو (کہ بے اندازہ خرچ کرنے لگو) اور ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، وہ اپنے بندوں کے حال سے خوب باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔ اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت اُن کا قتل ایک بہت بڑی خطا ہے۔ اور زنا کے قریب نہ پھٹکو، وہ بہت فحش کام اور بڑا ہی بُرا راستہ ہے۔ اور قتلِ نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، مگر حق کے ساتھ۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق دیا ہے، پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اُس کی مدد کی جائے گی۔ اور مالِ یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔ اور عہد کو پورا کرو، عہد کے بارے میں باز پرس ہونے والی ہے۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظِ انجام بھی یہی بہتر ہے۔ اور کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ اِن اُمور میں سے ہر ایک کا بُرا پہلو تمہارے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو (اے نبیؐ) تمہارے رب نے تم پر وحی کی ہیں" (بنی اسرائیل۔ ۲۳ تا ۳۹)۔

—— "اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ (بندگی و عبادت میں) کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ اور پڑوسی رشتہ دار سے اجنبی ہمسائے سے، پہلو کے ساتھی سے (یعنی ہم نشین ساتھی سے یا جس سے وقتی طور پر آدمی کا ساتھ ہو جائے) مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہاری ملکیت میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو" (النساء۔ ۳۶)۔

—— "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف (یعنی چند ظاہری مذہبی رسموں کو ادا کر دیا) بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ اور روزِ آخر اور فرشتوں اور کتاب[1] اور پیغمبروں کو سچے دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مدد مانگنے والوں کو دے اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں جو معاہدہ کریں تو

---

[1] یعنی خدا کی کتاب جو اُس نے کسی نبی کے ذریعے سے بھیجی ہو اور خصوصاً قرآن، جو اس نے اپنے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

اپنے عہد کو وفا کریں اور تنگی و مصیبت میں صبر کریں اور (حق و باطل کی) جنگ میں ثابت قدم رہیں۔ یہی راستباز لوگ اور یہی متقی ہیں" (البقرہ۔ ۱۷۷)۔

—— "یقیناً فلاح پائی اُن ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، جو لغویات سے دُور رہتے ہیں، زکوٰۃ (پاکیزگی کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں، جو (حرامکاری اور بدکاری) سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں کے کہ اُن پر (محفوظ نہ رکھنے میں) وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ اور (فلاح پائی اُن ایمان لانے والوں نے) جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں، اور اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں[1]" (المومنون۔ ۱ تا ۹)۔

—— "رحمان کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں[2]، اور جاہل اُن کے منہ آئیں تو کہتے ہیں کہ تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ جو دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب کو ہم سے پھیر دے، اُس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی بُرا مستقر اور مقام ہے۔ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہیں پکارتے، اور کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے جسے اللہ نے حرام کیا ہے، اور زنا نہیں کرتے۔ یہ کام جو کوئی کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائیگا اور اُس میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ اِلّا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی بُرائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔ اور (رحمان کے اصلی بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے، اور کسی لغو چیز پر اُن کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں جنہیں اُن کے رب کی آیات سُنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اُس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔ جو دُعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا" (الفرقان۔ ۶۳ تا ۷۴)۔

—— "جو کچھ بھی تم لوگوں کو (یہاں) دیا گیا ہے وہ محض دُنیا کی چند روزہ زندگی کا سرو سامان ہے، اور

---

[1] یعنی ان کو ضائع نہیں کرتے۔ اُن کی پُوری شرائط اور اُن کے اوقات کی پابندی کے ساتھ ان کو صحیح طریقے سے ادا کرتے ہیں (حاشیہ از مؤلف)

[2] یعنی اکڑ کر نہیں چلتے (حاشیہ از مؤلف)

جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہی بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں[1]۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور فحش کاموں سے بچتے ہیں۔ اگر کبھی انہیں غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں۔ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں، اور جو رزق ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں[2]، اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بُرائی کا بدلہ اتنی ہی بُرائی ہے (جتنی کی گئی ہو)، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو لوگ اپنے اُوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو صبر کرے اور درگزر کر جائے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے" (الشوریٰ - ۳۶ تا ۴۳)۔

—— "انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو جزع فزع کرنے لگتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ اِس عیب سے بچے ہوئے ہیں، جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے[3]۔ جو روزِ جزا کو برحق مانتے ہیں اور اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے

---

[1] یعنی اپنی طاقت اور ذہانت و قابلیت اور ذرائع و وسائل پر نہیں بلکہ اللہ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہیں اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ اُسی کی دی ہوئی ہدایت صحیح و برحق ہے، اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کے ہاں کسی نیکی کا اجر ضائع نہ ہوگا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] رزق سے مراد رزقِ حلال ہے۔ قرآن میں کہیں حرام مال کو اللہ کا رزق نہیں کہا گیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ (۱) جو رزقِ حلال ہم نے ان کو دیا ہے اُسی میں سے خرچ کرتے ہیں، اپنے اخراجات کے لیے حرام مال پر ہاتھ نہیں مارتے۔ (۲) اُس رزق کو سینت سینت کر نہیں رکھتے بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں۔ (۳) اس میں سے راہِ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں، سب کچھ اپنی ذات ہی کے لیے وقف نہیں کر دیتے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[3] یعنی انہوں نے طے کر رکھا ہے کہ اُن کے مالوں میں سے اِتنا سائل اور محروم کا حق ہے جسے وہ ادا کرتے رہیں گے۔ سائل سے مراد وہ محتاج شخص ہے جو اُن سے مدد مانگے۔ اور محروم سے مراد وہ شخص ہے جس کے متعلق اُن کو معلوم ہو جائے کہ یہ بیچارا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے رزق پانے سے محروم رہ گیا ہے۔ وہ خواہ مانگنے نہ آئے، مگر یہ اُس کی حالت سے واقف ہونے کے بعد خود جا کر اُس کی مدد کرتے ہیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

کوئی بے خوف ہو۔ جو (عریانی اور بدکاری سے) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے (جن سے محفوظ نہ رکھنے میں) اُن پر کوئی ملامت نہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس کرتے ہیں۔ جو اپنی گواہیوں میں راستبازی پر قائم رہتے ہیں۔ اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں" (المعارج۔ ۱۹ تا ۳۴)۔

ـــــ (اہل جنت وہ لوگ ہیں) "جو اپنی نذر[1] پوری کرتے ہیں اور اُس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ جو اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمہیں صرف اللہ کے لیے کھلا رہے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکریے کے طالب نہیں ہیں، ہمیں تو اپنے رب سے اُس دن کے عذاب کا ڈر ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا" (الدھر۔ ۷ تا ۱۰)۔

ـــــ "دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف لے جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، جو اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو خوشحالی اور تنگ حالی، ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ایسے ہی نیک لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی بُرا کام اُن سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے) وہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون گناہوں کا معاف کرنے والا ہے؟ وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے" (آل عمران-۳-۱۳۳ تا ۱۳۵)۔

فضائلِ اخلاق کی تعلیم

یہ جامع اخلاقی ہدایات بجائے خود ایسی تھیں جن سے کوئی صلاحیت پسند انسان جس میں کچھ بھی اخلاقی حس اور خیر و شر کی تمیز موجود تھی، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا لیکن قرآن نے صرف انہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ فضائلِ اخلاق میں سے ایک ایک کو نمایاں کر کے بتایا کہ اسلام انسان کو کن بھلائیوں سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ نے عملاً یہ دکھا دیا کہ وہ بھلائیاں صرف زبان سے کہنے ہی کی نہیں ہیں بلکہ اسلام نے جس زندگی میں بھی راہ پائی ہے وہ ان بھلائیوں سے آراستہ ہو گئی ہے۔ یہاں اُن سب کو تفصیل کے ساتھ نقل کرنا مشکل ہے، اس لیے ہم ان میں سے چند کو بطور مثال نقل کرتے ہیں۔

ـــــ "نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ

---

[1] نذر سے مراد کوئی ایسا نیک کام ہے جسے آدمی نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کرنے کا خود عہد کیا ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

سخت سزا دینے والا ہے" (المائدہ-۲)۔

__: (حضرت موسیٰ نے) عرض کیا کہ میرے رب، جو احسان تو نے مجھ پر کیا ہے اس کے بعد میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا" (القصص-۱۷)۔

__: "برائی کی مدافعت ایسی بھلائی سے کرو جو بہترین ہو۔ جو باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں۔ تم دُعا کرو کہ اے میرے پروردگار میں شیطان کی اُکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں[1]" (المومنون-۹۶ تا ۹۸)۔

__: "وہ بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب بیہودہ بات اُنھوں نے سُنی تو اس کا جواب دینے سے پرہیز کیا اور کہا کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ تم کو سلام ہے۔ ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہتے" (القصص-۵۴-۵۵)۔

__: "وہ آخرت کا گھر (یعنی جنت) ہم اُن لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں" (القصص-۸۳)۔

__: (یہ اہلِ ایمان وہ لوگ ہیں) "جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے روکیں گے" (الحج-۴۱)۔

__: (اللہ کے نُور کی طرف ہدایت پانے والے) "اُن گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا، اور جن میں اپنے نام کے ذکر کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ اُن میں ایسے لوگ صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اُلٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آجائے گی" (النور: ۳۶-۳۷)

__: "اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہی خسارے میں رہنے والے ہیں" (المنافقون-۹)۔

__: "اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، انصاف کے علمبردار بنو اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ (تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی) زد تمہارے اپنے اُوپر یا تمہارے والدین اور قریب ترین رشتہ داروں پر ہی

---

[1] یعنی خدا سے پناہ مانگو کہ شیطان کبھی تم کو گالی کا جواب گالی سے، جھوٹ کا جواب جھوٹ سے، ظلم کا جواب ظلم سے، بے انصافی اور حق ماری کا جواب بے انصافی اور حق ماری سے دینے پر آمادہ نہ کر سکے (حاشیہ از مؤلف)

کیوں نہ پڑتی ہو۔ صاحبِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیرخواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے" (النساء۔ ۱۳۵)۔

—— "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے، اور اللہ سے ڈرو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے" (المائدہ۔ ۸)۔

—— "جو لوگ تم سے لڑتے ہیں اُن سے اللہ کی راہ میں لڑو اور حد سے نہ گزر جاؤ۔ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" (البقرہ۔ ۱۹۰)۔

—— "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور راست اور درست بات کیا کرو" (الاحزاب۔ ۷۰)۔

—— "جو کوئی تم پر زیادتی کرے اُس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اُس نے کی ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بُرائی سے بچنے والوں کے ساتھ ہے" (البقرہ۔ ۱۹۴)۔

—— "اگر تم بدلہ لو تو بس اُسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں ہی کے لیے بہتر ہے" (النحل۔ ۱۲۶)۔

—— "تم اہلِ کتاب اور مشرکین سے بُہت اذیت ناک باتیں سنو گے۔ (ان اشتعال انگیز باتوں پر) اگر تم صبر کرو اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے" (آلِ عمران۔ ۱۸۶)۔

—— "اللہ بدگوئی پر زبان کھولنے کو پسند نہیں کرتا اِلّا یہ کہ جس پر ظلم کیا گیا ہو[1]۔ (النساء۔ ۱۴۸)۔

—— "نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں جو اللہ کے عہد کو وفا کرتے ہیں اور معاہدے توڑتے نہیں ہیں، جو اُن روابط کو جوڑتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے اور اِس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں اُن سے سخت حساب نہ لیا جائے، جو اپنے رب کی خوشنودی کی خاطر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ بھی رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں اور بدی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں" (الرعد۔ ۱۹ تا ۲۲)۔

—— "اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے حوالے کرو[2]، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ

---

[1] یعنی مظلوم کو ظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] اِس ارشاد میں مسلم معاشرے کے افراد کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ امانتوں میں خیانت نہ کریں بلکہ جو امانت بھی

کرو تو عدل کے ساتھ کرو" (النساء: ۵۸)۔

—— "اگر تم میں سے کوئی شخص کسی پر اعتماد کر کے کوئی امانت اس کے حوالے کرے تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ اپنے رب سے ڈرے" (البقرہ-۲۸۳)۔

—— "تم نیکی کا مرتبہ نہیں پا سکتے جب تک وہ چیزیں (راہِ خدا میں) خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہیں۔ اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، اللہ کو اس کا علم ہے" (آلِ عمران-۹۲)۔

—— "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے اس میں سے بہتر حصہ (راہِ خدا میں) خرچ کرو اور بُری سے بُری چیز چھانٹ کر نہ دو، حالانکہ تم خود اُسے کبھی نہ لوگے اِلّا یہ کہ اغماض برت جاؤ۔ اللہ (تمہارے ایسے خرچ سے) بے نیاز اور بہترین صفات سے ہے" (البقرہ-۲۶۷)

—— "اگر علانیہ صدقات دو تو یہ بھی اچھا ہے، اور اگر اُن کو مخفی رکھو اور غریب لوگوں کو دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی بُرائیاں (اس طرزِ عمل سے) محو ہو جاتی ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے" (البقرہ-۲۷۱)۔

—— "(صدقات خاص طور پر) اُن فقراء کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں ایسے گھِر گئے ہیں کہ زمین میں (اپنی کسبِ معاش کے لیے) دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ اُن کی خودداری کی وجہ سے ناواقف آدمی اُن کو خوشحال سمجھتا ہے، مگر تم اُن کے بُشرے سے اُن کی حالت جان سکتے ہو۔ وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ نہیں مانگتے۔ ایسے لوگوں پر تم جو مال بھی خرچ کرو گے اللہ کو اس کا علم ہے" (البقرہ-۲۷۳)۔

—— "(جہنم کی آگ سے) وہ نہایت پرہیزگار آدمی دُور رکھا جائے گا جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔ اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اُسے چکانا ہو۔ وہ تو صرف اپنے ربِّ برتر کی خاطر یہ کام کرتا ہے" (الّیل-۱۷ تا ۲۰)۔

—— "اور خرچ کرو اُس مال سے جو ہم نے تم کو دیا ہے قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت آ جائے اور وہ کہے کہ میرے رب، کاش تو مجھے تھوڑی سی مہلت دے دیتا کہ میں صدقہ دیتا اور صالحوں میں سے ہو جاتا۔"

۴۔ ان پر اعتماد کر کے اُن کے سپرد کی گئی ہو اُسے ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔ اور بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کو بطور اجتماعی کے اس فرمان کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ذمہ داری کے مناصب (Positions of Trust) ایسے لوگوں کے حوالے کرو جو بار امانت اُٹھانے کے اہل ہوں۔ مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری اور ملک کی حکمرانی کے مرتبے نااہل، بدیانت، کم ظرف اور بدعمل لوگوں کو نہ دو، کیونکہ بُرے لوگوں کی قیادت پوری قوم کو خراب کر دیتی ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

(المنافقون - ۱۰)[1]

"۔۔۔ اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ، یا بُرائی (کرنے والوں) کو معاف کر دو تو اللہ (کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ) بڑا معاف کرنے والا ہے (حالانکہ سزا دینے پر) پوری قدرت رکھتا ہے" (النساء-۱۴۹)۔

"۔۔۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو" (البقرہ-۲۳۷)۔

"۔۔۔ قرض دار تنگ دست ہو تو اس کا ہاتھ کھلنے تک اُسے مہلت دو، اور اگر صدقہ کر دو (یعنی قرض معاف کر دو) تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو" (البقرہ-۲۸۰)۔

"۔۔۔ یتیموں کے مال اُن کو دو اور اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو اور نہ اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھا جاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے" (النساء-۲)۔

"۔۔۔ یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان کے اندر (اپنے معاملات خود سنبھالنے کی) اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ فضول خرچی کر کے جلدی جلدی ان کا مال اس اندیشے سے کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنا حق مانگیں گے۔ جو شخص مالدار ہو وہ (ان کی جائداد کے انتظام کا معاوضہ لینے میں) پرہیز سے کام لے، اور جو نادار ہو وہ معروف طریقے سے کھائے (یعنی جسے ہر انصاف پسند آدمی معقول معاوضہ قرار دے)۔ پھر جب اُن کے مال انہیں واپس دو تو ان پر گواہ بنا لو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے" (النساء-۶)۔

"۔۔۔ (اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے) اُن یتیم لڑکیوں کے حق میں جن کے واجبی حق تم ادا نہیں کرتے اور اُن کے نکاح کرنے سے باز رہتے ہو، اور اُن بچوں کے حق میں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے، اور ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو" (النساء-۱۲۷)۔

"۔۔۔ جو لوگ نکاح کا موقع نہ پاتے ہوں وہ عفت مآبی اختیار کریں[2] یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے" (النور-۳۳)۔

"۔۔۔ اے نبی، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں (غیر عورتوں کی دید سے) بچا کر رکھیں، اور اپنی

---

[1] یعنی صدقہ ایسی حالت میں کرو جب تم صحیح و تندرست ہو۔ اس کا انتظار نہ کرو کہ مرنے کا وقت آ جائے گا تو صدقہ دے دیں گے۔ صدقے سے مراد ہے سچی نیت کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے مال دینا۔ افسوس ہے کہ اُردو زبان میں یہ لفظ بڑے ہی گھٹیا مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] یعنی غیر شادی شدہ لوگ ناجائز طریقوں سے خواہشات نفس پوری نہ کریں (حاشیہ از مؤلف)

و بدکاری سے) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں . . . اور مومن عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظریں بچائیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنی زینت کا اظہار نہ کریں بجز اُس کے جو خود ظاہر ہو جائے، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں، اور اپنی زینت نہ ظاہر کریں مگر اُن لوگوں کے سامنے (جن کی تفصیل سورۂ نور کی اس آیت میں دی گئی ہے)، اور اپنے پاؤں زمین پر اس طرح مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا کر رکھی ہے اُس کا علم لوگوں کو ہو جائے" (النور: ۳۰-۳۱)۔

—— "اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے اس طرح بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹِک کر بیٹھو اور پچھلے دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو" (الاحزاب: ۳۲-۳۳)۔

—— "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، حرام نہ کر لو اُن پاک چیزوں کو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اللہ نے جو حلال اور پاک رزق تمہیں دیا ہے اسے کھاؤ، اور اُس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو" (المائدہ: ۸۷-۸۸)۔

—— [1] "اور ہم اچھے اور بُرے حالات میں ڈال کر تمہاری آزمائش کر رہے ہیں" (الانبیاء: ۳۵)۔

—— "مومن مرد اور مومن عورتیں سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں" (التوبہ: ۷۱)۔

—— "جو عزت چاہتا ہو (اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ) عزت ساری کی ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے، اُس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے اور عملِ صالح اس کو اوپر چڑھاتا ہے" (فاطر: ۱۰)۔

صالح افراد ہی نہیں، صالح معاشرہ بھی مطلوب ہے

ان فضائل اخلاق کے ساتھ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا کہ اسلام کا مقصود صرف صالح افراد تیار کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انہیں جوڑ کر ایک صالح معاشرہ بنانا بھی ہے، کیونکہ اس کے بغیر نوعِ انسانی کا خسران سے بچنا اور فلاح پانا ممکن نہیں ہے۔ اس مضمون کو اگرچہ بہت سی جگہ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے، مگر ہم صرف دو مقامات

---

[1] یعنی اس بات کی آزمائش کر رہے ہیں کہ اچھے حالات میں تم متکبر، ظالم، خدا فراموش اور بندۂ نفس تو نہیں بن جاتے، اور بُرے حالات میں پست اور ذلیل اور ناجائز طریقے تو اختیار نہیں کرنے لگتے۔ یہ ایک کم ظرف آدمی کا کام ہے کہ اچھے حالات آئیں تو فرعون بن جائے اور بُرے حالات آئیں تو زمین پر ناک رگڑنے لگے یا اُن کو بدلنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرنے پر اُتر آئے۔ مومن کا کام ہر حال میں راست روی پر قائم رہنا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

بطور مثال لیتے ہیں۔

(۱) اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ۔ (البلد۔ ۸ تا ۱۷)

"کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور (اعلائی اور برائی کے) دونوں نمایاں راستے نہیں دکھا دیے؟ مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہ کی اور تم کیا جانو کہ وہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا، یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم کو یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر یہ کہ آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایک دوسرے کو صبر اور رحمدلی کی تلقین کریں۔"

صالح معاشرے کی خصوصیات

اس میں غلام کو آزاد کرانا، یا قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا انفرادی نیکیاں ہیں جنہیں اُن بے شمار انفرادی نیکیوں میں سے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے جو افراد میں ہونی چاہییں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ایسے نیک افراد بکھرے ہوئے نہ رہیں بلکہ اُن لوگوں کے ساتھ مل کر ایک جماعت بن جائیں جو ایمان لانے والے اور ایک دوسرے کو صبر اور خلقِ خدا پر رحم کھانے کی تلقین کرنے والے ہوں، تاکہ ان سے ایک صابر اور رحیم معاشرہ وجود میں آئے۔ ایسا معاشرہ جو پاکیزہ اخلاق پر ثابت قدم ہو۔ برائیوں اور بُرائی کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ راہِ حق کی مشکلات اور مزاحمتوں کا پامردی سے مقابلہ کرے۔ راستی پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔ اور خلقِ خدا کے لیے ظالم و جابر اور سنگدل نہ ہو بلکہ رحیم و شفیق ہو۔ اس قسم کا معاشرہ خدا اور آخرت پر ایمان اور رسُول اور اُس کے لائے ہوئے قانون پر غیر متزلزل یقین و اعتماد کے بغیر نہیں بن سکتا۔ اس لیے لامحالہ یہ خوبیاں ایک مومن معاشرے ہی میں ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہیں جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والی کسی آزمائش میں بھی اپنی خوبیوں سے منحرف نہ ہو سکیں۔

(۲) وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (العصر)

"زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لاتے اور نیک عمل کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

زمانے سے مراد گزرا ہوا زمانہ (یعنی تاریخ) بھی ہے، اور گزرتا ہوا زمانہ بھی جو سرآن گزر رہا ہے۔ اُس کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُس حقیقت پر گواہ ہے جو آگے بیان کی جارہی ہے۔

انسان کا لفظ مطلقاً استعمال ہوا ہے، اِس لیے اِس سے مراد ایک ایک انسان بھی ہے، انسانوں کا ہر مجموعہ بھی، اور پوری نوعِ انسانی بھی۔

خسارے کا لفظ گھاٹے اور نقصان اور ناکامی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جو فلاح، نفع اور کامیابی کی ضد ہے۔

وہ چار صفات جن پر نوعِ انسانی کی فلاح کا مدار ہے

اِن چند مختصر سے جملوں میں قسم کھا کر قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ جو تاریخ گزر چکی ہے، اور جو حال اب گزر رہا ہے، دونوں اِس بات پر گواہ ہیں کہ انسان بحیثیتِ شخص، بحیثیتِ قوم اور بحیثیتِ نوع، فلاح نہیں بلکہ خسارے میں مبتلا ہے۔ اور اِس خسارے سے صرف وہی لوگ محفوظ ہیں اور رہے ہیں جن میں یہ چار صفتیں پائی گئی ہیں اور پائی جاتی ہیں۔

ایمان

یعنی اِس بات پر پورا یقین کہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہی خالق، مالک، رازق، حاجت روا، معبود اور حاکم ہے جس کی بندگی، اطاعت اور پرستش کرنی چاہیے۔ اور اللہ کے رسول کی لائی ہوئی ہدایت ہی برحق ہے جس کی پیروی کرنی چاہیے۔ اور زندگی صرف یہی دنیا کی عارضی زندگی نہیں ہے بلکہ اِس کے بعد ایک دوسری مستقل اور پائیدار زندگی بھی آنے والی ہے جس میں ہم کو اپنے اُن اعمال کا حساب دینا ہے جو ہم نے دنیا میں کیے ہیں اور اُن کی جزا یا سزا پانی ہے۔ یہ ایمان فلاح پانے اور خسارے سے بچنے کے لیے شرطِ اوّل ہے کیونکہ اِس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جو سیرت واخلاق اور کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہو اور جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہو۔ اِس کے بغیر انسانی زندگی خواہ بظاہر کتنی ہی خوشنما ہو، اُس کا حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو اغراض اور خواہشات اور تخیلات کی موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

حُسنِ عمل

ایمان کے ساتھ اِس صفت کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے۔ ایمان وہ بیج ہے جس کے بغیر نیک اعمال کا درخت پیدا نہیں ہو سکتا، خواہ بعض لوگوں کی زندگیوں میں ایمان کے بغیر کچھ ظاہری اور ناپائیدار خوبیاں اور نیکیاں پائی جاتی ہوں۔ اور درخت وہ نیک اعمال ہیں جن کا اُس انسان کی زندگی میں رُونما ہونا اور

نشوونما پانا عقل اور منطق کا لازمی تقاضا ہے جس کے دل میں ایمان کا بیج بویا جا چکا ہو۔ اگر کہیں یہ بیج بویا گیا ہو اور اس سے حسنِ عمل کا درخت پیدا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کا دل اس بیج کی قبر بن گیا ہے اور خسارے سے اُس کے بچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے، کیونکہ ایمان کے ساتھ نیک اعمال خسارے سے بچنے کی دوسری لازمی شرط ہیں۔

مذکورۂ بالا دونوں صفتیں انفرادی حیثیت سے افراد میں پائی جا سکتی ہیں اور وہ صرف انفرادی فلاح کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ مگر اجتماعی فلاح اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ایسے نیک افراد سے ایک معاشرہ بنے اور اس میں وہ مزید دو صفتیں بھی پائی جائیں جنہیں اس سورہ میں خسارے سے بچنے کے لیے بطورِ شرط بیان کیا گیا ہے۔

ایک دوسرے کو حق کی نصیحت

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک، صحیح اور سچی اور مطابق عدل و انصاف اور مطابقِ حقیقت بات خواہ وہ عقیدہ و خیال سے متعلق ہو یا دُنیا کے معاملات سے۔ دُوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا یا خود اپنے نفس کا۔ پس حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صالح اہلِ ایمان کا معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اُس میں باطل سر اُٹھا رہا ہو اور حقوق پامال کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اُس کا تماشا دیکھتے رہیں۔ بلکہ اُس کا اجتماعی ضمیر ایسا زندہ ہو، اور اس کے افراد اِس بات کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوں کہ جہاں بھی باطل سر اُٹھائے یا کوئی حق پامال ہوتا نظر آئے، وہاں باطل کی مخالفت اور حق کی حمایت کرنے کے لیے لوگ اُٹھ کھڑے ہوں۔ کوئی شخص صرف خود ہی حق پرست اور راست باز اور عادل و منصف ہونے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ دوسروں کو بھی اِسی طرزِ عمل کی نصیحت کرے۔ یہی وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی تنزل و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر کوئی معاشرہ اِس عنصر سے خالی ہو تو وہ خسران سے نہیں بچ سکتا، بلکہ اجتماعی بگاڑ بڑھتا رہے تو افراد کا بھی حق پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایک دوسرے کو صبر کی تلقین

صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے یا رُکنے اور باز رہنے کے ہیں۔ اور عربی زبان کے استعمالات میں یہ لفظ تحمل، برداشت، ضبط، ثابت قدمی، ارادے کی مضبوطی، اور ہمت و جرأت کے ساتھ کسی مزاحم طاقت کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں اِس لفظ کو اتنے وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی بن جاتی ہے۔

صبر کا قرآنی مفہوم

قرآن میں سو سے زیادہ مقامات پر یہ لفظ آیا ہے۔ اگر ان سب مقامات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مفہوم میں حسبِ ذیل معانی شامل ہیں:

اپنے جذبات و میلانات اور خواہشات و رغبات کو حدود اللہ کا پابند بنانا۔

خدا کی نافرمانی میں خواہ کیسے ہی فائدے اور کیسی ہی لذتیں حاصل ہونے کے مواقع نظر آتے ہوں، ان کے لالچ میں مبتلا ہو کر پھسل نہ جانا، اور خدا کی فرمانبرداری میں جو نقصانات، تکلیفیں اور محرومیاں بھی پیش آئیں انہیں برداشت کرتے جانا۔

عمر بھر ضبطِ نفس سے کام لے کر گناہ کی جانب شیطان کی ہر ترغیب اور نفس کی ہر خواہش کو رد کرتے رہنا۔ ہر طمع اور ہر خوف کے مقابلے میں حق پرستی پر قائم رہنا۔ ہر اُس اذیت اور نقصان کو گوارا کر لینا جو اس دنیا میں راست بازی اختیار کرنے سے پہنچے، اور ہر اُس فائدے اور لذت کو ٹھکرا دینا جو ناجائز طریقے اختیار کرنے سے حاصل ہو۔

حرام خوروں کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر رشک و تمنا کے جذبات سے بے چین ہونا تو درکنار ان کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھنا اور ٹھنڈے دل سے یہ سمجھ لینا کہ ایک ایماندار آدمی کے لیے اُس چمکدار گندگی سے وہ بے رونق طہارت ہی بہتر ہے جو اللہ اپنے فضل سے اُس کو بخشے۔

ایمان لانے کے ساتھ خطرات کو اپنی جان پر جھیل جانا۔ دشمنانِ حق کے ہر ظلم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا۔ مخالفتوں کے طوفان اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں حق کی حمایت پر جمے رہنا اور باطل کے آگے دبنے یا اُس سے مصالحت کر لینے کا خیال تک دل میں نہ لانا۔

مخالفین کی زیادتیوں، بیہودگیوں اور ان کے طعن و استہزاء اور کذب و افتراء پر بے ساختہ مشتعل نہ ہو جانا بلکہ سکون کے ساتھ اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے تبلیغ و اصلاح کا کام حکمت کے ساتھ کرتے رہنا، خواہ اُس کے نتیجہ خیز ہونے کے امکانات بظاہر کتنے ہی دور دور تک کہیں نظر نہ آتے ہوں۔

اشتعال انگیزیوں پر بے صبر ہو کر جلد بازی میں کوئی ایسا غلط کام نہ کر بیٹھنا جو دعوتِ حق کی مصلحت کے خلاف اور مقصدِ دعوت کے لیے نقصان دہ ہو۔

سالہا سال تک اُن باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر جدوجہد کرتے رہنا جو اخلاق کی ساری حدیں پھاند جاتے ہوں اور طاقت و اقتدار کے نشے میں بدمست ہو رہے ہوں، مگر کسی حال میں راستی سے ہٹ کر اُن کی سی ناروا تدبیریں اختیار کرنے پر نہ اُتر آنا۔

باطل کے مقابلے میں حق کی کمزوری اور اقامتِ حق کی سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں اور ائمۂ باطل کی سرفرازیاں اور کامیابیاں دیکھ کر مایوس و دل شکستہ نہ ہونا کبھی گھبراہٹ اور بے حوصلگی اور بدحواسی میں مبتلا ہوکر یہ نہ سمجھنا کہ اقامتِ حق کی سعی لاحاصل ہے اور اب یہی مناسب ہے کہ اُس ذرا سی دینداری پر قناعت کرکے بیٹھ رہا جائے جس کی گنجائش کفر و فسق کی سلطانی میں مِل رہی ہو۔ بد سے بدتر حالات میں بھی عزم و ہمت کے ساتھ حق کی سربلندی کے لیے کوشش جاری رکھنا۔

ایک مومنِ صابر یہ سب کچھ اس لیے نہیں کرتا کہ اس کے ثمرات و نتائج اِسی دُنیا میں اُسے حاصل ہو جائیں بلکہ اِس اعتماد پر کرتا ہے کہ مرنے کے بعد جو دوسری زندگی آنے والی ہے اُس میں وہ اپنے اِس کیے کا پھل پائے گا۔

پھر وہ ایسا چھچھورا بھی نہیں ہوتا کہ اچھا وقت آئے اور دُنیا میں کامیابیاں اُس کے قدم چومیں تو اکڑ جائے اور فخر و غرور میں مبتلا ہوکر فرعون بن جائے، اور بُرا وقت آئے تو بلبلا اُٹھے اور اُس وقت کو ٹالنے کے لیے کوئی ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے میں بھی تامّل نہ کرے۔

وہ ہر حالت میں اپنا توازن برقرار رکھتا ہے۔ وقت کی ہر گردش کے ساتھ اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ ہمیشہ ایک معقول اور صحیح رویّہ پر قائم رہتا ہے۔ حالات سازگار ہوں اور وہ دولت و اقتدار و ناموری کے آسمانوں پر چڑھ رہا ہو تو اپنی بڑائی کے نشے میں بدمست نہیں ہوتا۔ اور کسی وقت مصائب و مشکلات کی چکّی اُسے پیسے ڈال رہی ہو تو اپنے جوہرِ انسانیت کو اُس میں ضائع نہیں کر دیتا۔ خدا کی طرف سے آزمائش خواہ نعمت کی شکل میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، اُس کی بُردباری اپنے حال پر قائم رہتی ہے۔

سُورہ عصر کا منشا یہ ہے کہ انسان خسارے سے صرف اسی صورت میں بچ سکتا ہے کہ افراد فرداً فرداً بھی مومن، صالح، حق پرست اور صابر ہوں، اور اُن سے ایک ایسا معاشرہ بھی وجود میں آئے جس میں ہر فرد دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرے۔

اخلاقی تعلیم کا یہ ہتھیار وہ زبردست ہتھیار تھا جس کا کوئی توڑ مشرکینِ قریش اور کفارِ عرب کے پاس نہ تھا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف خواہ کیسی ہی الزام تراشیاں وہ کرتے، کوئی معقول آدمی یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ ایسی اعلیٰ درجے کی اخلاقی تعلیم کوئی خود غرض، یا مجنون، یا ساحر یا کاہن دے سکتا ہے۔

فصل ششم

عالمگیر اُمّتِ مُسلمہ کی تاسیس

دعوتِ اسلامی کا ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ تمام دُنیا کے انسان اصل میں ایک، اور آدمی ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں۔ اُن کے درمیان اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے قوموں، نسلوں، قبیلوں، زبانوں، وطنوں اور رنگوں کا جو فرق رکھا ہے وہ محض تعارُف کے لیے ہے تاکہ اُن کے درمیان تعاوُن ہو سکے، نہ اِس لیے کہ اُن کے درمیان اِس سے تفرِقہ رُونما ہو، عداوتیں پڑیں، ایک گروہ دوسرے گروہوں کو کمین اور ذلیل اور اپنے آپ کو افضل و اشرف سمجھے، اور ایک گروہ دوسروں کو دبانے، لُوٹنے اور مٹا دینے پر تُل جائے۔ اِس بنیادی انسانی مساوات کے دائرے میں اگر کوئی چیز لوگوں کے درمیان جائز اور معقول طور پر وجہِ اجتماع بن سکتی ہے تو وہ صحیح عقیدہ و فکر ہے جس پر وہ جمع ہو کر ایک اُمّت بنیں، اور اِس اُمّت میں بجا طور پر کوئی شے اگر سببِ فضیلت بن سکتی ہے تو وہ تقویٰ ہے، یعنی خدا سے ڈرنا، اُس کی نافرمانی سے بچنا اور آخرت کی بازپُرس کو یاد رکھ کر غلط راہوں پر چلنے سے باز رہنا

اِس نظریے پر اسلام نے دنیا بھر کے انسانوں میں صرف ایک تفرِقہ کو باقی رکھا، اور وہ تھی ایمان اور کُفر کی تفریق۔ جو انسان بھی، خواہ وہ کسی ملک، قوم، قبیلے، رنگ یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، اور خواہ وہ کوئی زبان بولتا ہو، اللہ کی توحید کو اُس طرح مان لے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے پیش کیا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام بنی نوعِ انسانی کے لیے اللہ کا آخری رسُول اور قرآن کو اللہ کی آخری کتاب تسلیم کر لے، اور آخرت پر ایمان لے آئے، وہ مومن ہے، مومنوں کا بھائی ہے، جماعتِ مومنین کا ایک رُکن ہے، اُمّتِ مُسلمہ کا ایک فرد ہے، اور مُسلم معاشرے میں اُس کے حقوق ہر لحاظ سے مُساوی ہیں۔ اِس کے برعکس جو شخص اِس عقیدے کو نہ مانے وہ کافر ہے، خواہ وہ مومن کا باپ، ماں، بھائی، بہن، بیٹا، بیٹی، بیوی یا شوہر ہی کیوں نہ ہو، ہم قبیلہ یا ہم وطن، یا ہم رنگ ہونا تو پھر بھی بعد کا درجہ رکھتا ہے۔ مومن اُس کے ساتھ انسانی تعلق تو باقی رکھے گا، لیکن دوسرے ہر لحاظ سے اس کا معاشرہ مسلم معاشرے

سے الگ ہو گا۔ وہ دُنیا کے معاملات میں تو اُس کے ساتھ وہ سب روابط رکھ سکتا ہے جو انسان کے درمیان فطری طور پر ہوتے ہیں، مگر دین کے معاملہ میں وہ اُس سے دوستی اور محبت نہیں رکھ سکتا، اس کے ساتھ مل کر ایک جماعت اور ایک معاشرہ نہیں بنا سکتا حتیٰ کہ اس کا باپ بھی اگر کافر تھا تو وہ اُس کے لیے دعائے مغفرت تک نہیں کر سکتا۔ دین کے معاملہ میں جنگ کی نوبت آجائے تو بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے لڑ جائے گا اور اُسے کاٹ پھینکنے میں ذرا تأمل نہ کرے گا۔ وطن اور قوم دین کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں تو وہ گھر بار اور قوم و وطن سب کو چھوڑ کر ہجرت کر جائے گا مگر اپنے دین کو وطنیت اور قومیت پر ہرگز قربان نہ کرے گا۔

اِس اُمّت کا نام ہمیشہ سے "اُمّتِ مُسلِمہ" تھا، ہر نبی کی اُمّت مُسلم ہی تھی، اور یہی نام اُن لوگوں کا بھی رکھا گیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ اِس کے دروازے رُوئے زمین کے ہر شخص کے لیے کُھلے تھے، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، شمال کا باشندہ ہو یا جنوب کا۔ اِس میں کسی قوم کے لیے کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی جو کسی دوسری قوم کو حاصل نہ ہو۔ اِس کی بنا اتفاقی پیدائش پر نہ تھی بلکہ شعوری ایمان پر تھی۔ اور اِس ایمان میں دنیا بھر کے جو لوگ بھی شریک ہوں وہ بالکل برابر کے حقوق کے ساتھ اِس اُمّت میں شریک ہو سکتے تھے۔

پھر یہ اُمّت محض مان کر بیٹھ جانے والوں کی اُمّت نہ تھی، بلکہ ایک داعی اور مُبلغ اُمّت تھی۔ اِس کا ہر فرد ایک تحریک کا کارکن تھا جس کا سب سے عزیز تر مقصد یہ تھا کہ جو حق اُسے اللہ کے رسولؐ اور اُس کی کتاب کے ذریعہ سے ملا ہے اُسے دوسروں تک پہنچائے اور جتنے اللہ کے بندوں کو بھی دُنیا میں گمراہی سے اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کر سکتا ہو کرے۔

یہ وہ چیز تھی جس پر صرف قریش ہی نہیں بلکہ عرب کے سارے قبائل تلملا اُٹھے۔ ہزار ہا برس سے اُن کا پورا اجتماعی نظام قبائلیت پر مبنی تھا۔ قبیلہ ہی وہ چیز تھی جس سے وابستگی پر اُن کا معاشرہ قائم تھا۔ یہی چیز اُن کی پُشت پناہ تھی۔ خُونی رشتے ہی ان کے درمیان ربط و تعلق اور ہمدردی و مددگاری کی بُنیاد تھے۔ اِسی پر وہ اپنے شرف اور عزت و کرامت کا مدار رکھتے تھے۔ اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے پر اپنا سارا فخر و ناز اس بنا پر جتاتا تھا کہ اُس کے آبا و اَجداد نے فلاں فلاں کارنامے انجام دیے تھے۔ اب جو انہوں نے دیکھا کہ اُن کے درمیان ایک ایسی دعوت اُٹھ رہی ہے جو قبائلیت کی جڑ ہی کاٹے ڈالتی ہے، جو ہر قوم اور قبیلے کے اندر سے آدمی نکال نکال کر اُن کو ایک مستقل جماعت الگ نام سے بنا رہی ہے، جو نہ قوم جانتی ہے نہ قبیلہ، بلکہ ایک عقیدے پر عالمگیر اخوّت اور رفاقت کی بنیاد

رکھ رہی ہے، جو فخر و شرف کے سارے قدیم تصوّرات کا خاتمہ کر کے "رذیل" اور "شریف" سب کو برابر کیے دے رہی ہے، اور کفر و ایمان کے اختلاف کو دوستی و دشمنی کا مدار ٹھیرا کر بیٹے کو باپ سے، بھائی کو بھائی سے، شوہر کو بیوی سے جُدا کر رہی ہے، تو اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اِس عظیم معاشرتی انقلاب کو ہضم کرنا اُن کے بس میں نہ تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کلی کو ابتدا ہی میں مسل ڈالا جاتے تاکہ اس کے کبھی پھُول، اور پھُول سے باغ بننے کی نوبت ہی نہ آسکے۔ لیکن جن لوگوں کے دماغ میں عقل تھی اور جن کے دل پر تعصّبات کے قفل چڑھے ہوئے نہ تھے اُنہوں نے محسُوس کر لیا کہ یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جو قبائلی عداوتوں اور تفرقوں کو مٹا کر تمام عرب کو متحد کر سکتا ہے، اور پھر عرب سے گذر کر دنیا بھر کی قوموں کو ایک لڑی میں پرو سکتا ہے۔

دعوتِ اسلامی کے اس جُز کا ملخّص جو اُوپر بیان کیا گیا ہے اُس کی پُوری اہمیت اُس وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب قرآن مجید سے اس کی تفصیلات آدمی کے سامنے آجائیں۔ (۱۴۸)

تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں اور ان میں فضیلت کا معیار صرف تقوٰی ہے

اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت جو قرآن مجید میں بیان کی گئی وہ یہ تھی کہ پُوری نوعِ انسانی ایک ماں اور باپ کی اولاد ہے اور اس بنا پر تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء-۱)۔

"اے انسانو، ڈرو اپنے اُس رب سے جس نے تم کو ایک فردِ واحد سے پیدا کیا اور اُسی سے اُس کا جوڑا بنایا اور اُن دونوں سے بہت سے مرد و عورت (دنیا میں) پھیلا دیے۔"

اس کے بعد دوسری اہم حقیقت جو قرآن نے دُنیا کے سامنے پیش کی وہ یہ تھی کہ انسانی وحدت کے اندر قوموں اور قبیلوں کی کثرت جو اللہ نے پیدا کی ہے وہ صرف تعارُف کے لیے ہے، اور اُن کے درمیان فضیلت کا معیار نسل و رنگ اور زبان و وطن نہیں بلکہ تقوٰی کی اخلاقی صفت ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (الحجرات-۱۳)

"اے انسانو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے

زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار (یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنے والا) ہے۔"

اس آیت میں پوری نوعِ انسانی کو خطاب کر کے اُس عظیم گمراہی کی نشان دہی کر دی گئی جو دُنیا میں ہمیشہ عالمگیر فساد کی موجب بنی رہی ہے یعنی نسل، رنگ، زبان، وطن اور قومیت کا تعصب۔ قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دَور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اُس نے اپنا اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور اخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی پیدائش (Accident of Birth) کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں کہیں اِن کی بنا ایک خاندان، قبیلے، یا نسل میں پیدا ہو جانا ہے، اور کہیں ایک جغرافی خطے میں، یا ایک خاص رنگ والی، یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہونا پھر اِن بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے وہ صرف اِس حد تک محدود نہیں رہی ہے کہ جنہیں اس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو اُن کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اِس تمیز نے نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اِس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں۔ مذاہب ایجاد کیے گئے ہیں۔ قوانین بنائے گئے ہیں۔ اخلاقی اُصول وضع کیے گئے ہیں۔ قوموں اور سلطنتوں نے اِس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اِس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے اسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق بلکہ ابناءُ اللہ ٹھیرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا جس کی رُو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اُونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھیرائے گئے، اور شودروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، آج اِس بیسویں صدی ہی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے اُنہیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے براعظم امریکہ میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا، اور ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کر کے جو برتاؤ اُن کے ساتھ کیا، اُس کی تہ میں بھی یہی تصور کار فرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کی سرحدوں سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال اور آبرو اُن پر مباح ہے اور اُنہیں حق پہنچتا ہے کہ اُن کو لوٹیں، غلام بنائیں، اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں کے لیے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے اس کی بدترین مثالیں زمانۂ قریب کی لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہیں اور آج دیکھی جا رہی

ہیں خصوصیت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیت اور نارڈک نسل کی برتری کا تصور پچھلی جنگ عظیم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے تین نہایت اہم اصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ تم سب کی اصل ایک ہے، ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے، اور آج تمہاری جتنی نسلیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھی۔ اس سلسلۂ تخلیق میں کسی جگہ بھی اس تفرقے اور اونچ نیچ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے جس کے زعم باطل میں تم مبتلا ہو۔ ایک ہی خدا تمہارا خالق ہے، ایسا نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف خداؤں نے پیدا کیا ہو۔ ایک ہی مادۂ تخلیق سے تم بنے ہو، ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ انسان کسی پاک یا بڑھیا مادے سے بنے ہوں اور کچھ دوسرے انسان کسی ناپاک یا گھٹیا مادے سے بن گئے ہوں۔ ایک ہی ماں باپ کی تم اولاد ہو، یہ بھی نہیں ہے کہ ابتدائی انسانی جوڑے بہت سے رہے ہوں جن سے دنیا کے مختلف خطوں کی آبادیاں الگ الگ پیدا ہوئی ہوں۔

دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ پوری روئے زمین پر سارے انسانوں کا ایک ہی خاندان تو نہیں ہو سکتا تھا۔ نسل بڑھنے کے ساتھ ناگزیر تھا کہ بے شمار خاندان بنیں اور پھر خاندانوں سے قبائل اور اقوام وجود میں آ جائیں۔ اسی طرح زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ، خدوخال، زبانیں اور طرز بود و ماند بھی لامحالہ مختلف ہی ہو جانے تھے، اور ایک خطے کے رہنے والوں کو باہم قریب تر اور دور دراز خطوں کے رہنے والوں کو بعید تر ہی ہونا تھا۔ مگر اس فطری فرق و اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنیاد پر اونچ اور نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کمتر کے امتیازات قائم کیے جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل و حقیر جانیں، ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تفوق جتائے، اور انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح حاصل ہو۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتب کیا تھا وہ صرف یہ تھی کہ ان کے درمیان باہمی تعارف اور تعاون کی فطری صورت یہی تھی۔ اسی طریقے سے ایک خاندان، ایک برادری، ایک قبیلے اور ایک قوم کے لوگ مل کر مشترک معاشرت بنا سکتے تھے، اور زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے مددگار

بن سکتے تھے۔ مگر یہ محض شیطانی جہالت تھی کہ جس چیز کو اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے تعارف کا ذریعہ بنایا تھا اُسے تفاخر اور تنافر کا ذریعہ بنا لیا گیا اور پھر نوبت ظلم و عدوان تک پہنچا دی گئی۔

تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں، کیونکہ اُن کا پیدا کرنے والا ایک ہے، اُن کا مادۂ پیدائش اور طریقِ پیدائش ایک ہی ہے، اور اُن سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا ہے۔ علاوہ بریں کسی شخص کا کسی خاص ملک، قوم یا برادری میں پیدا ہونا ایک اتفاقی امر ہے جس میں اُس کے اپنے ارادہ و انتخاب اور اس کی اپنی سعی و کوشش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہو۔ اصل چیز جس کی بنا پر ایک شخص کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا، برائیوں سے بچنے والا، اور نیکی و پاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو۔ ایسا آدمی خواہ کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنی ذاتی خوبی کی بنا پر قابلِ قدر ہے۔ اور جس کا حال اس کے برعکس ہو وہ بہرحال ایک کمتر درجے کا انسان ہے چاہے وہ کالا ہو یا گورا، مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔

یہی حقائق جو قرآن کی ایک مختصر سی آیت میں بیان کیے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کو اپنے مختلف خطبات اور ارشادات میں زیادہ کھول کر بیان فرمایا۔ فتح مکہ کے موقع پر طوافِ کعبہ کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں فرمایا:

الحمدُ للهِ الّذی اذھب عنکم عُبِّیَّۃَ الجاھلیّۃِ وتکبُّرھا۔ یاَ یُّھا النّاسُ الناس رجلان، بَرٌّ تقیٌّ کریمٌ علی اللہ، وفاجرٌ شقیٌّ ھیّنٌ علی اللہ۔ الناس کلّھم بنو آدم وخلق اللہ آدم من تُرابٍ۔ (بیہقی فی شعب الایمان۔ ترمذی)

"شکر ہے اُس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اُس کا تکبر دُور کر دیا۔ لوگو، تمام انسان بس دو ہی حصّوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار، جو اللہ کی نگاہ میں عزّت والا ہے۔ دوسرا فاجر اور شقی، جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔"

حجۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط میں آپ نے ایک تقریر کی اور اس میں فرمایا:

یَا ایُّھا النّاس، اَلاَ اِنَّ ربّکم واحدٌ، لا فضلَ لِعَربیٍّ علی عجمیٍّ ولا لعجمیٍّ علی عربیٍّ، ولا لِاَسودَ علی احمرَ ولا لاحمرَ علی اسودَ الّا بالتّقوٰی۔ اِنَّ اکرمکم

عند اللہ اتقٰکم۔ الا ھل بلغت؟ قالوا بلیٰ یا رسول اللہ۔ قال فلیبلغ الشاھد الغائب۔ (بیہقی)

"لوگو، خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ، میں نے تمہیں بات پہنچا دی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ فرمایا، اچھا تو جو موجود ہے وہ اُن لوگوں تک یہ بات پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔"

ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے:

کلکم بنو آدم و آدم خلق من تراب۔ ولینتھین قوم یفخرون بآبائھم او لیکونن اھون علی اللہ من الجعلان۔ (بزار)

"تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ وہ اللہ کی نگاہ میں حقیر کیڑوں سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔"

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا:

ان اللہ لا یسئلکم عن احسابکم ولا انسابکم یوم القیامۃ، ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ (ابن جریر)

"اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب نسب نہیں پوچھے گا۔ اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم۔ (مسلم۔ ابن ماجہ)

"اللہ تمہاری صورتیں اور مال نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔"

یہ تعلیمات صرف الفاظ کی حد تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ اسلام نے ان کے مطابق اہل ایمان کی ایک عالمگیر برادری عملاً قائم کر کے دکھا دی جس میں رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں جس میں

اُونچ نیچ اور چھوت چھات اور تفریق و تعصب کا کوئی تصور نہیں، جس میں شریک ہونے والے تمام انسان خواہ وہ کسی نسل و قوم اور ملک و وطن سے تعلق رکھتے ہوں، بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ اسلام کے مخالفین تک کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ انسانی مساوات اور وحدت کے اصول کو جس کامیابی کے ساتھ مسلم معاشرے میں عملی تشکل دی گئی ہے اُس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی دین اور کسی نظام میں نہیں پائی جاتی، نہ کبھی پائی گئی ہے۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے روئے زمین کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی بے شمار نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک عقیدے کی بنا پر ایک اُمّت بنا دیا ہے۔ (۱۴۹)

یہی ابدی قاعدہ آخرت میں بھی جاری ہوگا

اس سے آگے بڑھ کر قرآن نے لوگوں کو اس حقیقت سے باخبر کیا کہ نسل و قوم و وطن کے بجائے عقیدہ و عمل کی بنیاد پر اختلاف اور اجتماع کا یہی قاعدہ موجودہ دنیا کے ختم ہونے کے بعد آخرت کی دوسری زندگی میں بھی اسی طرح جاری ہوگا، اور دوسری بنیادوں پر یہاں جو جتھہ بندیاں قائم ہیں وہ سب تتر بتر ہو جائیں گی۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ (الروم-۱۴)

"جس روز قیامت برپا ہوگی سب انسان اُس روز الگ گروہوں میں بٹ جائیں گے۔"

یعنی دنیا کی وہ تمام جتھہ بندیاں جو آج قوم، نسل، وطن، زبان، قبیلہ و برادری اور معاشی و سیاسی مفادات کی بنیاد پر بنی ہوئی ہیں، اُس روز ٹوٹ جائیں گی، اور خالص عقیدے اور اخلاق و کردار کی بنیاد پر نئے سرے سے ایک دوسری گروہ بندی ہوگی۔ ایک طرف نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی قوموں میں سے مومن و صالح انسان الگ چھانٹ لیے جائیں گے اور ان سب کا ایک گروہ ہوگا۔ دوسری طرف ایک ایک قسم کے گمراہانہ نظریات و عقائد رکھنے والے اور ایک ایک قسم کے بدعمل اور جرائم پیشہ لوگ اس عظیم الشان انسانی بھیڑ میں سے چھانٹ چھانٹ کر الگ نکال لیے جائیں گے اور ان کے الگ الگ گروہ بن جائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اسلام جس چیز کو اس دنیا میں تفریق اور اجتماع کی حقیقی بنیاد قرار دیتا ہے اور جسے جاہلیت کے پرستار یہاں ماننے سے انکار کرتے ہیں، آخرت میں اُسی بنیاد پر تفریق بھی ہوگی اور اجتماع بھی۔ اسلام کہتا ہے کہ انسانوں کو کاٹنے اور جوڑنے والی اصل چیز عقیدہ و اخلاق ہے۔ ایمان لانے والے اور خدائی ہدایت پر نظامِ زندگی کی بنیاد رکھنے والے ایک اُمّت ہیں، خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور کفر و فسق کی راہ اختیار کرنے والے ایک دوسری اُمّت ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی نسل و وطن سے ہو، ان دونوں کی قومیت ایک نہیں ہو سکتی۔ یہ نہ دنیا میں ایک مشترک راہِ زندگی بنا کر ایک ساتھ چل سکتے ہیں اور نہ آخرت میں ان کا انجام ایک ہو سکتا ہے۔ دنیا سے آخرت تک ان کی راہ اور منزل ایک دوسرے سے الگ ہے۔

جاہلیت کے پرستار اس کے برعکس ہر زمانے میں اصرار کرتے رہے ہیں، اور آج بھی اس بات پر مُصر ہیں کہ جتھہ بندی نسل و وطن اور زبان کی بُنیادوں پر ہونی چاہیے۔ ان بُنیادوں کے لحاظ سے جو لوگ مشترک ہوں انہیں بلا لحاظِ مذہب و عقیدہ ایک قوم بن کر دُوسری ایسی ہی قوموں کے مقابلے میں متحد ہونا چاہیے، اور اس قومیت کا ایک ایسا نظامِ زندگی ہونا چاہیے جس میں توحید اور شرک اور دہریت کے معتقدین سب ایک ساتھ مل کر چل سکیں۔ یہی تخیّل ابوجہل اور ابولہب اور سردارانِ قریش کا تھا جب وہ بار بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام رکھتے تھے کہ اس شخص نے آ کر ہماری قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ اسی پر قرآن مجید یہاں مُتنبّہ کر رہا ہے کہ تمہاری یہ تمام جتھہ بندیاں جو تم نے اس دنیا میں غلط بُنیادوں پر قائم کر رکھی ہیں آخرکار ٹوٹ جانے والی ہیں۔ نوعِ انسانی میں مستقل تفریق اُسی عقیدے اور نظریۂ حیات اور اخلاق و کردار کی بُنیاد پر ہونے والی ہے جس پر اسلام دُنیا کی اس زندگی میں کرنا چاہتا ہے۔ جن لوگوں کی منزل ایک نہیں ہے اُن کی راہِ زندگی آخر کیسے ایک ہو سکتی ہے۔ (۱۵۰)

اُمّتِ مُسلِمہ

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا، تمام انسانوں کو ایک قرار دینے کے بعد اسلام اُن کے درمیان صرف تقویٰ کو وجہِ امتیاز قرار دیتا ہے، اور اسلام کے نقطۂ نظر سے تقویٰ کا مطلب ہے اللہ اور اس کے رسُول اور اس کی کتاب کے بیان کردہ عقائد و احکام کو ماننا، اور آخرت کی بازپُرس کو ملحوظ رکھتے ہوئے نافرمانی کی رَوِش چھوڑ کر فرمانبرداری کی رَوِش اختیار کر لینا۔ اس لیے اسلام تمام نوعِ انسانی کو صرف دو حصّوں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جو ایمان لائے، اور دوسرا وہ جو ایمان نہ لائے۔ ایمان لانے والوں کو وہ ایک اُمّت بناتا ہے اور اُس کا نام اُمّتِ مُسلمہ رکھتا ہے جس میں دُنیا کا ہر مومن شریک ہو سکتا ہے۔ اور یہ کوئی نیا نام نہیں ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اُوپر ایمان لانے والوں کے لیے رکھا ہو، بلکہ قدیم ترین زمانے سے تمام انبیاء کی اُمّتوں کا اللہ تعالیٰ نے یہی نام رکھا ہے:

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (الحج - ۷۸)

"اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مُسلم رکھا تھا اور اِس (قرآن) میں بھی۔"

"تمہارا" کا خطاب مخصوص طور پر صرف اُنہی اہلِ ایمان کی طرف نہیں ہے جو اِس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے، یا اِس کے بعد اہلِ ایمان کی صف میں داخل ہوئے۔ بلکہ اس کے مخاطب تمام وہ لوگ ہیں جو آغازِ تاریخِ انسانی سے توحید، آخرت، رسالت اور کُتُبِ الٰہی کے ماننے والے رہے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اِس ملّتِ حق کے ماننے والے پہلے بھی "نوحی"، "ابراہیمی"، "موسوی"، "مسیحی" وغیرہ نہیں کہلاتے تھے بلکہ اُن کا

نام "مُسلم" (اللہ کے تابع فرمان) تھا۔ اور آج بھی وہ "محمدی" نہیں بلکہ "مُسلم" ہیں۔ اِس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں کے لیے یہ سوال معّما بن گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کا نام قرآن سے پہلے "مُسلم" کس کتاب میں رکھا گیا تھا۔ ضروری نہیں کہ ہر زبان میں یہی عربی لفظ "مُسلم" استعمال ہُوا ہو۔ لیکن انبیاء کے ماننے والوں کا جو نام بھی کسی زبان میں رکھا گیا وہ مُسلم ہی کا ہم معنی تھا۔ (۱۵)

اُمّتِ مُسلمہ کی عالمگیری اور اَزلیّت و اَبدیّت

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِہٖ ھُمْ بِہٖ یُؤْمِنُوْنَ۔ وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِہٖٓ اِنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِہٖ مُسْلِمِیْنَ ۔ (القصص: ۵۲-۵۳)۔

"جن لوگوں کو اِس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اِس (قرآن) پر ایمان لا رہے ہیں۔ اور جب یہ اُنہیں سُنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اِس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے سے مُسلم ہیں"۔

یعنی اِس سے پہلے بھی ہم انبیاء اور کُتبِ آسمانی کے ماننے والے تھے، اِس لیے اُس وقت بھی اِسلام کے سوا ہمارا کوئی اور دین نہ تھا۔ پھر اب جو نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب لے کر آیا ہے اُسے بھی ہم نے مان لیا ہے۔ لہٰذا درحقیقت ہمارے دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہُوئی ہے، بلکہ جیسے ہم پہلے مسلمان تھے ویسے ہی اب بھی مسلمان ہیں۔

ایمان لانے والے اہلِ کتاب کا یہ قول جسے قرآن مجید میں نقل کیا گیا ہے، اِس بات کی صاف صراحت کر دیتا ہے کہ اسلام صرف اُس دین کا نام نہیں ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور "مُسلم" کی اصطلاح کا اِطلاق محض حضورؐ کے پیروؤں تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے تمام انبیاء کا دین یہی اسلام تھا اور ہر زمانہ میں اُن سب کے پیرو مسلمان ہی تھے۔ یہ مسلمان اگر کبھی کافر ہُوئے تو صرف اُس وقت جبکہ کسی بعد کے آنے والے نبیِ صادق کو ماننے سے اُنہوں نے انکار کر دیا۔ لیکن جو لوگ پہلے نبی کو مانتے تھے اور بعد کے آنے والے نبی پر بھی ایمان لے آتے اُن کے اسلام میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہُوا۔ وہ جیسے مُسلمان پہلے تھے ویسے ہی بعد میں رہے۔

تعجّب ہے کہ بعض بڑے بڑے اہلِ علم بھی اِس حقیقت کے اِدراک سے عاجز رہ گئے ہیں، حتٰی کہ اِس صریح آیت کو دیکھ کر بھی اُن کا اطمینان نہ ہُوا۔ علامہ سیوطیؒ نے ایک مستقل رسالہ اِس موضوع پر لکھا ہے کہ مُسلم کی اصطلاح صرف اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مختص ہے۔ پھر جب یہ آیت اُن کے سامنے آئی تو خود فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ مَیں نے پھر خدا سے دُعا کی کہ

اس معاملہ میں مجھے شرح صدر عطا کر دے۔ آخر کار اپنی رائے سے رجوع کرنے کے بجائے انہوں نے اُس پر اصرار کیا اور اس آیت کی متعدد تاویلیں کر ڈالیں جو ایک سے ایک بڑھ کر بے وزن ہیں۔ مثلاً اُن کی ایک تاویل یہ ہے کہ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ کے معنی ہیں ہم قرآن کے آنے سے پہلے ہی مسلم بن جانے کا عزم رکھتے تھے، کیونکہ ہمیں اپنی کتابوں سے اس کے آنے کی خبر مل چکی تھی اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ آئے گا تو ہم اسلام قبول کر لیں گے۔ اُن کی دوسری تاویل یہ ہے کہ اِس فقرے میں مُسلمین کے بعد لفظ بہٖ محذوف ہے، یعنی پہلے ہی سے ہم قرآن کو مانتے تھے، کیونکہ اُس کے آنے کی ہم توقع رکھتے تھے اور اس پر پیشگی ایمان لاتے ہوئے تھے، اس لیے توراۃ وانجیل کو ماننے کی بنا پر نہیں بلکہ قرآن کو اُس کے نزول سے پہلے برحق مان لینے کی بنا پر ہم مسلم تھے۔ تیسری تاویل اُن کی یہ ہے کہ تقدیرِ الٰہی میں ہمارے لیے پہلے ہی مقدّر ہو چکا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی آمد پر ہم اسلام قبول کر لیں گے، اس لیے درحقیقت ہم پہلے ہی مسلم تھے۔ ان تاویلوں میں سے کسی کو دیکھ کر بھی محسوس نہیں ہوتا کہ اللہ کے عطا کردہ شرح صدر کا اُس میں کوئی اثر موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں صرف اِسی ایک مقام پر نہیں بلکہ بیسیوں مقامات پر اِس اُصولی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اصل دین صرف "اسلام" (اللہ کی فرمانبرداری) ہے، اور خدا کی کائنات میں خدا کے بندوں کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا دین ہو نہیں سکتا، اور آغازِ آفرینش سے جو نبی بھی انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے وہ یہی دین لے کر آیا ہے، اور انبیاء علیہم السلام ہمیشہ خود مسلم رہے ہیں، اپنے پیروؤں کو انہوں نے مسلم ہی بن کر رہنے کی تاکید کی ہے، اور اُن کے وہ سب متبعین جنہوں نے نبوت کے ذریعے سے آتے ہوئے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا، ہر زمانے میں مسلم ہی تھے۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ (آلِ عمران - ۱۹)

"درحقیقت اللہ کے نزدیک دین تو اسلام ہی ہے۔"

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ (آل عمران - ۸۵)

"اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔"

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (یونس - ۷۲)

"میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلموں میں شامل ہو کر رہوں۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَوَصّٰى بِهَا إِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ۔ قَالُوْا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ اٰبَآئِكَ إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ: ۱۳۱ تا ۱۳۳)۔

"جب اُس کے رب نے اُس سے کہا کہ "مسلم (تابعِ فرمان) ہو جا" تو اُس نے کہا "میں ربُّ العلمین کا مسلم ہو گیا"۔ اور اسی چیز کی وصیّت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی اور یعقوبؑ نے بھی، کہ "اے میرے بچو، اللہ نے تمہارے لیے اِس دین کو پسند کیا ہے لہٰذا تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو"۔ (اے یہودیو) کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی وفات کا وقت آیا؟ جب کہ اُس نے اپنی اولاد سے پوچھا "تم کس کی بندگی کرو گے میرے بعد؟" انہوں نے جواب دیا "ہم بندگی کریں گے آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے معبود کی، اُس کو اکیلا معبود مان کر، اور ہم اُسی کے مسلم ہیں"۔

مَا كَانَ إِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا۔

(آلِ عمران - ۶۷)

"ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ وہ یکسو مسلم تھا"۔

حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ خود دُعا مانگتے ہیں:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ (البقرہ - ۱۲۸)

"اے ہمارے رب، ہم کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک اُمّت پیدا کر جو تیری مسلم ہو"۔

حضرت لوطؑ کے قصے میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (الذاریات - ۳۶)

"ہم نے قومِ لوطؑ کی بستی میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا (یعنی خود حضرت لوطؑ کا گھر)"۔

حضرت یوسفؑ بارگاہِ ربّ العزّت میں عرض کرتے ہیں:

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (یوسف - ۱۰۱)

"مجھ کو مُسلم ہونے کی حالت میں موت دے اور مجھے صالحوں کے ساتھ ملا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السّلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ (یونس - ۸۴)

"اے میری قوم کے لوگو، اگر تم اللہ پر ایمان لاتے ہو تو اُسی پہ بھروسہ کرو اگر تم مُسلم ہو۔"

بنی اسرائیل کا اصل مذہب یہودیت نہیں بلکہ اسلام تھا، اِس بات کو دوست اور دشمن سب جانتے تھے چنانچہ فرعون سمندر میں ڈوبتے وقت آخری کلمہ جو کہتا ہے وہ یہ ہے:

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (یونس - ۹۰)

"میں مان گیا کہ کوئی معبود اُس کے سوا نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لاتے ہیں اور میں مُسلموں میں سے ہوں۔"

تمام انبیاءِ بنی اسرائیل کا دین بھی یہی اسلام تھا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا (المائدہ - ۴۴)

"ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اُسی کے مطابق وہ نبی جو مُسلم تھے اُن لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے جو یہودی بن گئے تھے۔"

یہی حضرت سلیمان علیہ السّلام کا دین تھا، چنانچہ ملکۂ سبا اُن پر ایمان لاتے ہوئے کہتی ہے:

اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (النمل - ۴۴)

"میں سلیمان کے ساتھ ربّ العالمین کی مُسلم ہو گئی۔"

اور یہی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور اُن کے حواریوں کا دین تھا۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ - (المائدہ - ۱۱۱)

"اور جبکہ میں نے حواریوں پر وحی کی کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لاتے اور گواہ رہ کہ ہم مُسلم ہیں۔"

اِس معاملہ میں اگر کوئی شک اِس بنا پر کیا جائے کہ عربی زبان کے الفاظ "اسلام" اور "مُسلم" اِن مختلف

مسلکوں اور مختلف زبانوں میں کیسے مستعمل ہو سکتے تھے، تو ظاہر ہے کہ یہ محض ایک نادانی کی بات ہو گی کیونکہ اصل اعتبار عربی کے اِن الفاظ کا نہیں بلکہ اُس معنی کا ہے جس کے لیے یہ الفاظ عربی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ دراصل جو بات اِن آیات میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آیا ہُوا حقیقی دین مسیحیت یا موسویت یا محمدیت نہیں ہے بلکہ انبیاء اور کُتبِ آسمانی کے ذریعے سے آتے ہوتے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ اطاعت جُھکا دینا ہے، اور یہ رویہ جہاں جس بندۂ خدا نے بھی جس زمانے میں اختیار کیا ہے وہ ایک ہی عالمگیر اَزلی و اَبدی دینِ حق کا مُتبع ہے۔ اِس دین کو جن لوگوں نے ٹھیک ٹھیک شعور اور اخلاص کے ساتھ اختیار کیا ہے اُن کے لیے مُوسیٰ کے بعد مسیح کو اور مسیح کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کو ماننا تبدیلِ مذہب نہیں بلکہ حقیقی دین کے اِتباع کا فطری و منطقی تقاضا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے گروہوں میں بے سوچے سمجھے گُھس آتے یا پیدا ہو گئے اور قومی و نسلی اور گروہی تعصبات نے جن کے لیے اصل مذہب کی حیثیت اختیار کر لی، وہ بس یہودی یا مسیحی بن کر رہ گئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر اُن کی جہالت کی قلعی کھُل گئی کیونکہ انہوں نے اللہ کے آخری نبی کا انکار کر کے نہ صرف یہ کہ آئندہ کے لیے مُسلم رہنا قبول نہ کیا بلکہ اپنی اِس حرکت سے یہ ثابت کر دیا کہ حقیقت میں وہ پہلے بھی "مُسلم" نہ تھے محض ایک نبی یا بعض انبیاء کی شخصی گرویدگی میں مبتلا تھے، یا آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کو دین بنا بیٹھے تھے۔ (۱۵۲)

اُمتِ مُسلمہ کی شانِ ترکیب

اِس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اُس اصل دین کو تازہ کیا جو ابتدا سے چلا آ رہا تھا، بلکہ اُس اُمت کو بھی از سرِ نو قائم کیا جو تمام انبیاء علیہم السلام کے زمانے سے اُمتِ مُسلمہ کہلاتی چلی آ رہی تھی۔ اِس اُمت میں مختلف قبیلوں اور خاندانوں اور علاقوں سے نکل نکل کر جو لوگ شامل ہوتے چلے گئے، آپؐ نے اُن سب کو ایک دوسرے کا حامی و مددگار، ایک دوسرے کا بھائی، ایک دوسرے کا ہمدرد و غمگسار بنایا، سب کی جان، مال، آبرو کو برابر کی حُرمت دی، سب کے حقوق اور فرائض یکساں ٹھہرائے اور کسی کے لیے کوئی ایسا امتیاز نہ رکھا جو دوسرے کو حاصل نہ ہو۔ یہ عرب کے قبیلہ پرست اور عصبیت زدہ ماحول کے لیے ایک عجیب چیز تھی جسے قبول کرنے کے لیے اُن کا دماغ کسی طرح آمادہ نہ ہوتا تھا۔ (۱۵۳)

ابنِ زید کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب نے آپ سے ایک روز پوچھا اگر میں تمہارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اُس نے کہا میرے لیے (یعنی نبی کے چچا کے لیے) بھی کوئی فضیلت نہیں؟ حضورؐ نے فرمایا اور آپ کیا

چاہتے ہیں ؟ اس پر عہد لیا تھا کہ "لاتفعل الذین تیأتی اکون و هٔولاء سواء" اس جاتے، اس دین کا ناس جائے جس میں میں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں" (ابن جریر) (۱۵۴)

اس تصور عصبیت کے بجائے قرآن نے صاف صاف کہا کہ لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (الممتحنہ۔ ۳) "قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کام آئیں گی نہ اولاد" یہ خونی رشتے یہیں دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور وہاں ان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اصل چیز ایمان ہے جو قیامت میں کام آنے والی ہے اس لیے دنیا میں بھی تمہارے رشتہ و تعلق کی بنیاد اسی پر قائم ہونی چاہیے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ۔ (المائدہ : ۵۵)

"تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں"

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ۔ (الحجرات۔ ۱۰)

"مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو"

یہ اور ایسی ہی دوسری آیات تھیں جنہوں نے دنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم کر دی۔ اسی تعلیم کی یہ برکت ہے کہ کسی دوسرے دین یا مسلک کے پیروؤں میں وہ اخوت نہیں پائی گئی ہے جو مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوئی اور آج تک پائی جاتی ہے۔ اس کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت ارشادات میں بیان فرمایا جن سے اس کی پوری روح اور زیادہ اُجاگر ہوگئی۔

حضرت جریرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی۔ ایک یہ کہ نماز قائم کروں گا، دوسری یہ کہ زکوٰۃ دیتا رہوں گا، تیسری یہ کہ ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا" (بخاری، کتاب الایمان)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر" (بخاری، کتاب الایمان۔ مسند احمد میں اسی مضمون کی روایت حضرت سعید بن مالکؓ نے بھی اپنے والد سے نقل کی ہے)۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان

کی جان، مال اور عزت حرام ہے" (مسلم، کتاب البر والصلۃ۔ ترمذی، باب البر والصلۃ)۔

حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا، اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا، اور اس کی تذلیل نہیں کرتا۔ ایک آدمی کے لیے یہی شر بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے" (مسند احمد)۔

حضرت سہلؓ بن سعد ساعدی آپؐ کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں کہ "گروہِ اہلِ ایمان کے ساتھ ایک مومن کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا سر کے ساتھ جسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اہلِ ایمان کی ہر تکلیف کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سر جسم کے ہر حصے کا درد محسوس کرتا ہے" (مسند احمد) (۱۵۵)

حضرت نعمانؓ بن بشیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى (بخاری ومسلم)۔

"مومنوں کی مثال آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی سی ہے کہ اگر ایک عضو میں کوئی تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا (بخاری، مسلم، ترمذی)

"مومن دوسرے مومن کے لیے اس دیوار کی طرح ہے جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔"

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللّٰهُ فِي حَاجَتِهِ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (بخاری ومسلم)۔

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کی مدد سے باز رہتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی کسی حاجت کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہو گا اللہ اس کی حاجت پوری کرنے میں لگ جائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے نکالے گا اللہ تعالیٰ اسے روزِ قیامت کی مصیبتوں سے نکال دے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا اللہ

قیامت کے روز اُس کی عیب پوشی کرے گا۔ (۱۵۹)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ اور ابوطلحہ بن سہل الانصاریؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

ما من امریءٍ یخذل امرأً مُسلِمًا فی موضعٍ تُنتھک فیہ حرمتہٗ وینتقص فیہ من عِرضہ الّا خذلہ اللہ فی مَوطِنٍ یُحِبّ فیہ نُصرَتَہٗ وما من امریءٍ ینصُرُ مُسلمًا فی مَوضعٍ یُنتقصُ فیہ من عرضہ و یُنتھکُ من حُرمتہٖ الّا نصرہ اللہُ فی موطنٍ یُحِبُّ فیہ نُصرَتَہٗ (ابوداؤد)۔

" اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جا رہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اُس کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرے گا جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر کرتا ہے جہاں اُس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو تو اللہ عزّوجلّ اس کی مدد ایسے موقع پر کرے گا جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی مدد کرے۔" (۱۶۰)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

المسلمُ مَن سَلِمَ المُسلمُون مِن لِسانہٖ ویَدِہٖ (بخاری و مسلم)۔

"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔"

حضرت ابوبکرہ نُفیع بن الحارثؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر یوم النحر کی تقریر میں حضورؐ نے فرمایا:

الا فلا ترجعوا بعدی کفّارًا یضرب بعضکم رقاب بعضٍ (بخاری و مسلم)

"خبردار رہو، میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔"

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا "اُنصُر اخاک ظالمًا او مظلومًا" تیرا بھائی ظالم ہو یا مظلوم، اس کی مدد کر۔ ایک شخص نے عرض کیا اگر وہ مظلوم ہو تو میں اس کی مدد کروں گا، مگر وہ ظالم ہو تو میں اس کی مدد کیسے کروں؟ فرمایا تحجزہ او تمنعہ من الظلم فان ذالک نصرہٗ "اس کو ظلم سے روک دے اور باز رکھ، کیونکہ یہی اس کی مدد ہے" (بخاری)۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کی روایت ہے:

المؤمنون تکافأ دماءھم وھم ید علیٰ من سواھم۔
(مسند ابو داؤد طیالسی ۔ حدیث ۲۲۵۸)

"مومنوں کے خون برابر کی قیمت رکھتے ہیں، اور دوسروں کے مقابلے میں وہ سب ایک ہاتھ کی طرح ہیں۔"

حضرت انسؓ بن مالک حضورؐ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اُمِرتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حتّٰی یشھدوا اَنْ لَّا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ واَنَّ محمّداً رسولُ اللّٰہ ۔ فاذا شھدوا واستقبلوا قبلتنا واکلوا ذبیحتنا وصلّوا صلوٰتنا فقد حُرِّمت علینا دماؤھم واموالھم الا بحقّھا۔ لھم ما للمسلمین وعلیھم ما علیھم (نسائی۔ کتاب الایمان۔ مسند احمد، مرویاتِ انسؓ بن مالک)

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور محمدؐ اللہ کا رسول ہے۔ پھر جب وہ یہ شہادت دے دیں، اور ہمارے قبلے کی طرف رُخ کریں اور ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں، تو اُن کے خون اور اُن کے مال ہم پر حرام ہیں سوائے اِس کے کہ کوئی حق اُن پر آتا ہو۔ اُن کے لیے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہیں، اور اُن پر وہی فرائض ہیں جو مسلمانوں پر ہیں۔"

ایک دعوت اور تحریک کی علمبردار اُمّت

مگر یہ اُمّت اس نوعیت کی نہ تھی کہ کچھ لوگ ایمان لا کر بس اپنی جگہ اللہ اللہ کریں، نیک کام کریں، اور آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار اور ہمدرد و غمخوار رہیں، بلکہ اِس سے آگے بڑھ کر اس اُمّت کا کام یہ تھا کہ اِس کا ہر فرد اسلام کی دعوت لوگوں میں پھیلائے، بھلائی کا حکم دے اور بُرائی سے روکے۔ یہ پُوری اُمّت تمام قوموں اور قبیلوں میں سے چھانٹ کر اسی لیے نکالی گئی ہے کہ یہ خلقِ خدا کی اصلاح کرے۔ تمام قوموں سے اِس کا تعلق حق اور انصاف کا تعلق ہو اور ناحق اور بے انصافی کا تعلق کسی سے نہ ہو۔ اگر معاملہ صرف پہلی صورت تک محدود ہوتا تو قریش اور مشرکینِ عرب کسی نہ کسی حد تک اسے برداشت کرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ مگر یہ دوسری صورت ایسی تھی جس میں وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ اُمّت بڑھنے اور پھیلنے کا صرف رُجحان ہی نہیں رکھتی بلکہ فرداً فرداً اس کا ہر شخص، اور اجتماعی طور پر یہ پُوری جماعت اپنی تحریک کو پھیلانے میں سرگرم ہے۔ اِس سے اُن کے اندیشے حدِ برداشت سے بڑھ گئے، کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ روز ٹوٹ ٹوٹ کر اُن کے آدمی اس نئی جماعت میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ (۱۸۸)

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (حٰمٓ السجدہ - ۳۳)۔

"اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں"

اِس سے پہلے آیات ۳۰ تا ۳۲ میں مسلمانوں کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنت کا مستحق بناتی ہے۔ اس کے بعد اس آیت میں اُن کو بتایا گیا کہ آگے کا درجہ جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اُوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں۔ اِس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اُسے یکایک محسوس ہوتا تھا کہ گویا اُس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اُسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لیے زبان کھولی اُس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ اِن حالات میں فرمایا گیا کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اُس سے نہ ہٹنا بلاشبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اُٹھ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں، اور نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی طرف خلقِ خدا کو دعوت دے، اور اپنے اِس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اِتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اُس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی کوئی گنجائش نہ مل سکے۔ (۱۵۹)

مسلمانوں کا اِمامتِ عالَم پر مامور ہونا

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ - ۱۴۳)۔

"اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک اُمّتِ وَسَط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسُول تم پر گواہ"

یہ اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامتِ عالَم کا اعلان تھا۔ "اسی طرح" کا اشارہ اللہ کی اُس رہنمائی کی طرف بھی تھا جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی

اور وہ ترقی کرتے کرتے اِس مرتبے پر پہنچے کہ "اُمّتِ وَسَط" قرار دیے گئے، اور تحویلِ قبلہ کی طرف بھی جسے نادان محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے تھے، حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبے کی طرف سمتِ قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا تھا کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دُنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کیا اور اُمّتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔

"اُمّتِ وَسَط" کا لفظ اِس قدر وسیع معنویّت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اِس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اِس سے مُراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے، جو عدل و انصاف اور توسّط کی روش پر قائم ہو، جو دُنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمہیں "اُمّتِ وَسَط" اِس لیے بنایا گیا ہے کہ "تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسُول تم پر گواہ ہو"، تو اِس کا مطلب یہ تھا اور آج بھی ہے کہ آخرت میں جب پُوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا اُس وقت رسول، اللہ تعالیٰ کے ذمّہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم اللہ نے اُسے دی تھی، وہ اُس نے تم کو بے کم و کاست پُوری کی پُوری پہنچا دی اور عملاً اُس کے مطابق کام کرکے دکھا دیا۔ اِس کے بعد رسُول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عامِ انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اُٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسُول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انہیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسُول نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے اُنہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اِس طرح کسی شخص یا گروہ کا اِس دُنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اُس کا اِمامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اِس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمّہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اِس اُمّت کے لیے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اُسی طرح اِس اُمّت کو بھی تمام دُنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے، حتّٰی کہ اِس کے قول اور عمل اور برتاؤ، ہر چیز کو دیکھ کر دُنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اِس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اِس کو کہتے ہیں، حق پرستی ایسی ہوتی ہے، اور اسلام دُنیا کے انسانوں کو یہ کچھ بنانے آیا ہے۔ (۱۶۰)

اُمّتِ مُسلمہ کی خصوصیات

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَ

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ط (آل عمران-۱۱۰)

"تم دنیا میں وہ بہترین اُمّت ہو جسے (انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے) میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو بتایا گیا کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نااہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں اس پر اب تم مامور کیے گئے ہو۔ اس لیے کہ اخلاق و اعمال کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہو گئی ہیں جو امامتِ عادلہ کے لیے ضروری ہیں، یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ و عمل، اور اللہ وحدہٗ لاشریک کو اعتقاداً و عملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرنا۔ لہٰذا اب امامتِ عالم کا یہ کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے۔ (۱۹۱)

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (التوبہ-۷۱)۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں، سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔"

یعنی مومن مرد و زن ایک ایسا گروہ بن گئے ہیں جس کے افراد میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ نیکی سے وہ اتنی دلچسپی رکھتے ہیں کہ دنیا کو اس کا حکم دیتے ہیں، بدی سے وہ اتنی نفرت کرتے ہیں کہ دنیا کو اس سے روکتے ہیں۔ خدا کی یاد ان کے لیے غذا کی طرح زندگی کی ناگزیر ضروریات میں شامل ہے، راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کے لیے ان کے دل اور ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، اور خدا اور رسول کی اطاعت ان کی زندگی کا وتیرہ ہے۔ اس مشترک اخلاقی مزاج اور طرزِ زندگی نے انہیں آپس میں ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ (۱۹۲)

فدا کاری کا جذبہ

اس اُمّت کے لوگوں میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا گیا کہ وہ اپنے دین کو ہر چیز پر مقدم رکھیں، ہر چیز کو اس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، مگر کسی چیز پر اُسے قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اگر اپنے وطن، خاندان، گھر بار میں رہتے ہوئے خدا کی بندگی کرنا ممکن ہو تو ٹھیک، لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایمان

کا امتحان اسی چیز میں ہے کہ آیا وہ گھر بار، بال بچوں، خاندان اور وطن کی محبت میں خدا کی بندگی کو چھوڑتے ہیں یا خدا کی بندگی کے لیے اِن سب کو چھوڑ کر ہجرت اور جلاوطنی کے خطرات مول لیتے ہیں؟

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (النحل - ۴۱)

"جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں اُن کو ہم دُنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔"

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۣ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَاۗبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ڰ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ڮ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (العنکبوت ۵۶ تا ۶۰)

"اے میرے بندو جو ایمان لاتے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ۔ ہر متنفّس کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اُن کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے ـــــ اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ اُن کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

سُورۂ عنکبوت کی اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا جذبہ تھا جو اُس وقت اُمّتِ مسلمہ میں پھونکا گیا تھا۔

پہلی آیت میں اشارہ ہے ہجرت کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مکّے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ۔ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔ جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ۔ تم کو قوم و وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے۔ اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے۔ جو سچا مومن ہے

وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم، وطن اور ملک کو لات مار دے گا جو جھوٹا مدعیٔ ایمان ہے وہ ایمان کو چھوڑ دے گا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا۔ یہ آیت اس باب میں بالکل صریح ہے کہ ایک سچا خدا پرست انسان محبِّ قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے جس پر دنیا کی ہر چیز کو وہ قربان کر دے گا مگر اُسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔

دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے۔ ہمیشہ رہنے کے لیے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لہٰذا تمہارے لیے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائقِ فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کیے جائیں۔ آخرکار تمہیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے۔ اگر دنیا میں جان بچانے کے لیے ایمان کھو کر آئے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہوگا اور ایمان بچانے کے لیے جان کھو آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہوگا۔ پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے؟ جان پر قربان کیا ہوا ایمان؟ یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان؟

تیسری آیت میں بتایا گیا کہ اگر ایمان اور نیکی کے راستہ پر چل کر بالفرض تم دنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دنیوی نقطۂ نظر سے سراسر ناکام ہی مرے تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہرحال ہوگی اور نری تلافی ہی نہ ہوگی بلکہ بہترین اجر بھی نصیب ہوگا۔

چوتھی آیت میں فرمایا گیا کہ آخرت کا یہ بہترین اجر اُن لوگوں کے لیے ہے جو ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے۔ جنہوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جان پر جھیلا اور منہ نہیں موڑا۔ ترکِ ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اُن کی طرف ذرّہ برابر التفات نہ کیا۔ کفار و فساق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا اور اُن کی دولت و حشمت پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالی جنہوں نے بھروسہ اپنی جائداد و دولت اور اپنے کاروبار اور اپنے کنبے قبیلے پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا، جو اسبابِ دنیوی سے قطع نظر کر کے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ سہنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کے لیے تیار ہو گئے اور وقت آیا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ جنہوں نے اپنے رب پر یہ اعتماد کیا کہ ایمان اور نیکی پر قائم رہنے کا اجر اُس کے ہاں کبھی ضائع نہ ہوگا اور یقین رکھا کہ وہ اپنے مومن و صالح بندوں کی اس دنیا میں بھی دستگیری فرمائے گا اور آخرت میں بھی اُن کے عمل کا بہترین بدلہ دے گا۔

آخری آیت میں فرمایا، ہجرت کرتے ہوئے تمہیں فکرِ جان کی طرح فکرِ روزگار سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے۔ آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا اور خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں، اِن میں سے کون اپنا رزق اُٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو اِن سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے اِن کو کسی نہ کسی طرح رزق مِل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا تم یہ سوچ سوچ کر ہمّت نہ ہارو کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے، تمہیں بھی دے گا۔ (۱۴۲)

اہلِ ایمان سے کُفّار کے تعلق کی نوعیّت

ایک طرف اُمّتِ مُسلمہ کے اندر اُس کے افراد کا باہمی تعلق اور اپنے دین و ایمان سے اُن کی وابستگی کو صاف صاف بیان کیا گیا۔ اور دوسری طرف یہ بھی بتا دیا گیا کہ کفّار سے مسلمانوں کا تعلق کس طرح کا ہونا چاہیے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ (آلِ عمران۔۲۸)

"مومن اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (النسآء:۱۴۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔"

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ (التوبہ۔۱۶)۔

"کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اُس کی راہ میں) جانفشانی کی اور اللہ اور رسُول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا۔"

سُورۂ توبہ کی اِس آیت میں خطاب مدینے کے اُن لوگوں سے کیا گیا ہے جو نئے نئے اسلام لائے تھے۔ اُن سے کہا گیا ہے کہ جب تک تم اِس آزمائش سے گزر کر یہ ثابت نہ کرو گے کہ واقعی تم خُدا اور اُس کے دین کو اپنی جان و مال اور اپنے بھائی بندوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہو، تم سچّے مومن قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اب تک تو ظاہر کے لحاظ سے تمہاری حیثیت یہ ہے کہ اسلام چونکہ مومنینِ صادقین اور سابقین اوّلین کی جانفشانیوں سے غالب آگیا اور مُلک پر چھا گیا اِس لیے تم مسلمان ہو گئے۔ (۱۴۳)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ قُلْ اِنْ كَانَ

اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَ مَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۔ (التوبہ۔۲۳-۲۴)۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو اُن کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔ اے نبی، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اُس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا"۔

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ ج اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ز کَفَرْنَا بِکُمْ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنہ۔۴)۔

"تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور اُس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے اِن معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ"۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ الْحَقِّ یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِیَّاکُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِیْ۔

(الممتحنہ۔۱)

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم اُن کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اُس کو ماننے سے وہ

انکار کر چکے ہیں۔ وہ رسُول کو اور تم کو اس بنا پر نکال باہر کرتے ہیں کہ تم اللہ اپنے رب پر ایمان لاتے ہو۔"

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۔ (المجادلہ۔۲۲)

"تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اُس کے رسُول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ اُن کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے، یا اُن کے بھائی یا اُن کے اہلِ خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک رُوح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔"

سُورۂ مجادلہ کی اِس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک بات اصُولی ہے اور دوسری امرِ واقعی کا بیان۔ اصُولی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ دینِ حق پر ایمان اور اعدائے دین کی محبّت، دو بالکل متضاد چیزیں ہیں جن کا ایک جگہ اجتماع کسی طرح قابلِ تصوّر نہیں ہے۔ یہ بات قطعی ناممکن ہے کہ ایمان اور دشمنانِ خدا و رسُول کی محبت ایک دل میں جمع ہو جائیں، بالکل اُسی طرح جیسے ایک آدمی کے دل میں اپنی ذات کی محبّت اور اپنے دُشمن کی محبّت دونوں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ ایمان کا دعوٰی بھی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اُس نے ایسے لوگوں سے محبّت کا رشتہ بھی جوڑ رکھا ہے جو اسلام کے مخالف ہیں تو یہ غلط فہمی تمہیں ہرگز لاحق نہ ہونی چاہیے کہ شاید وہ اپنی اِس روش کے باوجود ایمان کے دعوے میں سچا ہو۔ اِسی طرح جن لوگوں نے اسلام اور مخالفینِ اسلام سے بیک وقت رشتہ جوڑ رکھا ہے وہ خود بھی اپنی حیثیت پر اچھی طرح غور کر لیں کہ وہ فی الواقع کیا ہیں، مومن ہیں یا منافق؟ اور فی الواقع کیا ہونا چاہتے ہیں، مومن بن کر رہنا چاہتے ہیں یا منافق؟ اگر اُن کے اندر کچھ بھی راستبازی موجود ہے اور وہ کچھ بھی یہ احساس اپنے اندر رکھتے ہیں کہ اخلاقی حیثیت سے منافقت انسان کے لیے ذلیل ترین رویّہ ہے، تو انہیں بیک وقت دو کشتیوں میں سوار رہنے کی کوشش چھوڑ دینی چاہیے۔ ایمان تو اُن سے دو ٹوک فیصلہ چاہتا ہے۔ مومن رہنا چاہتے ہیں تو ہر اُس رشتے اور تعلق کو قربان کر دیں جو اسلام کے ساتھ اُن کے تعلق سے متصادم ہوتا ہو۔ اسلام کے رشتے سے کسی اور رشتے کو عزیز رکھتے ہیں تو بہتر ہے کہ ایمان کا جھوٹا دعوٰی چھوڑ دیں۔

یہ تو ہے اصولی بات۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف اُصول بیان کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اِس امرِ واقعی کو بھی مدعیانِ ایمان کے سامنے نمونے کے طور پر پیش فرما دیا کہ جو لوگ سچے مومن تھے اُنہوں نے فی الواقع سب کی آنکھوں کے سامنے تمام اُن رشتوں کو کاٹ پھینکا جو اللہ کے دین کے ساتھ اُن کے تعلق میں حائل ہوتے تھے۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو بدر و اُحد کے معرکوں میں سارے عرب نے دیکھ لیا تھا۔ مکہ سے جو صحابۂ کرام ہجرت کر کے مدینے آئے تھے وہ صرف خُدا اور اُس کے دین کی خاطر خود اپنے قبیلے اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے لڑ گئے۔ حضرت ابوعُبیدہؓ نے اپنے باپ عبداللہ بن جرّاح کو قتل کیا۔ حضرت مُصعبؓ بن عُمیر نے اپنے بھائی عُبید بن عُمیر کو قتل کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہِشام بن مُغیرہ کو قتل کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ، اور حضرت عُبیدہؓ بن الحارث نے عُتبہ، شَیبہ، اور وَلید بن عُتبہ کو قتل کیا جو ان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ حضرت عمرؓ نے اسیرانِ جنگِ بدر کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے اور ہم میں سے ہر ایک اپنے رشتہ دار کو قتل کرے۔ اسی جنگِ بدر میں حضرت مصعبؓ بن عُمیر کے سگے بھائی ابوعزیز بن عُمیر کو ایک انصاری پکڑ کر باندھ رہا تھا۔ حضرت مُصعبؓ نے دیکھا تو پکار کر کہا "ذرا مضبوط باندھنا، اِس کی ماں بڑی مالدار ہے، اِس کی رہائی کے لیے وہ تمہیں بہت سا فدیہ دے گی"۔ ابوعزیز نے کہا "تم بھائی ہو کر یہ بات کہہ رہے ہو؟" حضرت مُصعبؓ نے جواب دیا "اِس وقت تم میرے بھائی نہیں ہو بلکہ یہ انصاری میرا بھائی ہے جو تمہیں گرفتار کر رہا ہے"۔ اسی جنگِ بدر میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس اور داماد ابوالعاص (حضرت زینبؓ بنت رسولؐ اللہ کے شوہر) گرفتار ہو کر آئے، مگر اُن کے ساتھ رسولؐ کی رشتہ داری کی بنا پر قطعاً کوئی امتیازی سلوک نہ کیا گیا جو دوسرے قیدیوں سے کچھ بھی مختلف ہوتا۔ اِس طرح عالمِ واقعہ میں دُنیا کو یہ دکھا دیا گیا کہ مخلص مُسلمان کیسے ہوتے ہیں اور اللہ اور اُس کے دین کے ساتھ اُن کا تعلق کیسا ہوا کرتا ہے۔

دَیلمی نے حضرت مُعاذؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دُعا نقل کی ہے کہ اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَل لِفَاجِرٍ (وفی روایۃ لفاسقٍ) عَلَیَّ یَدًا وَلَا نِعْمَۃً فَیَوَدُّہٗ قَلْبِی فَاِنِّی وَجَدتُّ فِیمَا اَوْحَیْتَ اِلَیَّ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ "خدایا، کسی فاجر (اور ایک روایت میں ہے فاسق) کا میرے اوپر کوئی احسان نہ ہونے دے کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی محبت پیدا ہو، کیونکہ تیری نازل کردہ وحی میں یہ بات میں نے پائی ہے کہ اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھنے والوں کو تم اللہ اور رسول کے مخالفوں سے محبت کرتے نہ پاؤ گے"۔ (۴۵)

کسی کی خاطر ایمان نہیں چھوڑا جا سکتا

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۝ وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ (لقمان: ۱۴-۱۵)

"اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اُس کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر اُسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اُس کا دودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو (میرا شریک) نہیں جانتا تو اُن کی بات ہرگز نہ مان، البتہ دنیا میں اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔"

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ (العنکبوت: ۸)

"ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی ہدایت کی ہے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔"

سورۂ عنکبوت کی اس آیت کے متعلق مسلم، ترمذی، احمد، ابوداؤد اور نسائی کی روایت ہے کہ یہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ وہ ۱۸-۱۹ سال کے تھے جب اُنہوں نے اسلام قبول کیا۔ اُن کی ماں حمنہ بنت سفیان بن اُمیہ (ابوسفیان کی بھتیجی) کو جب معلوم ہوا کہ بیٹا مسلمان ہو گیا ہے تو اس نے کہا کہ جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے گا میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی نہ سائے میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی ہو گی۔" حضرت سعدؓ اس پر سخت پریشان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ممکن ہے کہ ایسے ہی حالات سے دوسرے وہ نوجوان بھی دوچار ہوئے ہوں جو مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ اسی لیے اس مضمون کو سورۂ لقمان کی اُس آیت میں بھی پورے زور کے ساتھ دہرایا گیا جسے ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ انسان پر مخلوقات میں سے اگر کسی کا حق سب سے بڑھ کر ہے تو وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ لیکن ماں باپ بھی اگر انسان کو شرک پر مجبور کریں تو اُن کی بات قبول نہ کرنی چاہیے، کجا کہ کسی اور کے۔

کہنے پر آدمی ایسا کرے۔ پھر الفاظ یہ ہیں کہ وَاِنْ جَاھَدٰکَ "اگر وہ دونوں تجھے مجبور کرنے کے لیے اپنا پورا زور بھی لگا دیں"۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ کم تر درجے کا دباؤ، یا ماں باپ میں سے کسی ایک کا زور دینا تو بدرجۂ اَولیٰ رَدّ کر دینے کے لائق ہے۔ اِس کے ساتھ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ (جسے تو میرے شریک کی حیثیت سے نہیں جانتا) کا فقرہ بھی قابلِ غور ہے۔ اِس میں اُن کی بات نہ ماننے کے لیے ایک معقول دلیل دی گئی ہے۔ ماں باپ کا یہ حق تو بے شک ہے کہ اولاد اُن کی خدمت کرے، اُن کا ادب و احترام کرے، اُن کی جائز باتوں میں اُن کی اطاعت بھی کرے لیکن یہ حق اُن کو نہیں پہنچتا کہ آدمی اپنے علم کے خلاف اُن کی اندھی تقلید کرے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک بیٹا یا بیٹی صرف اس بنا پر ایک مذہب کی پیروی کیے جائے کہ یہ اُس کے ماں باپ کا مذہب ہے۔ اگر اولاد کو یہ علم حاصل ہو جائے کہ والدین کا مذہب غلط ہے تو اُسے اُس مذہب کو چھوڑ کر صحیح مذہب اختیار کرنا چاہیے اور اُن کے دباؤ ڈالنے پر بھی اُس طریقے کی پیروی نہ کرنی چاہیے جس کی گمراہی اُس پر کُھل چکی ہو۔ اور یہ معاملہ جب والدین کے ساتھ ہے تو پھر دُنیا کے ہر شخص کے ساتھ بھی یہی ہونا چاہیے۔ کسی شخص کی تقلید بھی جائز نہیں ہے جب تک آدمی یہ نہ جان لے کہ وہ شخص حق پر ہے۔ (۱۳۴)

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰکُمْ ؕ وَمَا ھُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰھُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ○ وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَھُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِھِمْ ز وَلَیُسْـَٔلُنَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَمَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ○ (العنکبوت ۱۲-۱۳)

"یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اُوپر لے لیں گے۔ حالانکہ اُن کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اُوپر لینے والے نہیں ہیں، وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں۔ ہاں ضرور وہ اپنے بوجھ بھی اُٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی۔ اور قیامت کے روز یقیناً اُن سے اِن افترا پردازیوں کی بازپرس ہوگی جو وہ کرتے رہے ہیں"

کفّار کے اِس قول کا مطلب یہ تھا کہ اوّل تو زندگی بعدِ موت اور حشر و نشر اور حساب و جزا کی یہ باتیں سب ڈھکوسلا ہیں لیکن اگر بالفرض کوئی دوسری زندگی ہے اور اُس میں کوئی بازپرس بھی ہونی ہے، تو ہم ذمہ لیتے ہیں کہ خدا کے سامنے سارا عذاب ثواب ہم اپنی گردن پر لے لیں گے۔ تم ہمارے کہنے سے اِس نئے دین کو چھوڑ دو اور اپنے دینِ آبائی کی طرف واپس آجاؤ۔ روایات میں متعدد سردارانِ قریش کے متعلق یہ مذکور ہے کہ ابتداءً جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے اُن سے مل کر یہ لوگ اِسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ابوسفیان اور حرب بن اُمیّہ بن خلف نے اُن سے مل کر یہی کہا تھا۔

اس پر فرمایا گیا کہ اوّل تو یہی ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص خدا کے ہاں کسی دوسرے کی ذمّہ داری اپنے اُوپر لے لے اور کسی کے کہنے سے گناہ کرنے والا خود اپنے گناہ کی سزا پانے سے بچ جائے، کیونکہ وہاں تو ہر شخص اپنے کیے کا آپ ذمّہ دار ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو جس وقت کفروشرک کا انجام ایک دہکتی ہوئی جہنّم کی صورت میں سامنے آجائے گا اُس وقت کس کی یہ ہمّت ہوگی کہ دُنیا میں جو وعدہ اُس نے کیا تھا اس کی لاج رکھنے کے لیے یہ کہہ دے کہ حضور میرے کہنے سے جس شخص نے ایمان کو چھوڑ کر ارتداد کی راہ اختیار کی تھی، آپ اسے معاف کر کے جنّت میں بھیج دیں، اور میں جہنّم میں اپنے کفر کے ساتھ اس کے کفر کی سزا بھی بھگتنے کے لیے تیار ہوں؟ (۱۹۷)

کفّار کے لیے استغفار ممنوع ہے

مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِکِیْنَ وَلَوْ کَانُوْٓا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّھُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ۔ (التوبہ - ۱۱۳)

"نبی اور ایمان لانے والوں کا یہ کام نہیں ہے کہ مُشرکوں کے لیے مغفرت کی دُعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ اُن پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنّم کے مستحق ہیں۔"

کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لانا یہ معنی رکھتی ہے کہ اوّل تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابلِ معافی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اُس شخص کے معاملہ میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زُمرے میں شامل ہو اور صرف گنہگار ہو۔ لیکن جو شخص کھُلا ہُوا باغی ہو اُس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنا اور اُس کے جُرم کو قابلِ معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اُصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری اپنی وفاداری مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے، یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق خدا کی وفاداری کے مقتضیات کی بہ نسبت زیادہ قیمتی ہے، اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے، اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ لگا رکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اسی لاگ کو قبول کر لے اور ہمارے رشتہ داروں کو تو ضرور بخش دے خواہ اُسی جُرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے مُجرموں کو جہنّم میں جھونک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں، اخلاص اور وفاداری کے خلاف ہیں اور اُس ایمان کے منافی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بالکل بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اس کا دشمن ہمارا دشمن۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "مشرکین کے لیے

مغفرت کی دُعا نہ کرو" بلکہ یُوں فرمایا ہے کہ تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے، تمہارا یہ کام نہیں ہے، کہ تم اُن کے لیے مغفرت کی دُعا کرو" یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو یہ کچھ بات نہ ہوئی۔ تم میں تو وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جُرم کو قابلِ معافی کھنا تم کو خود اپنے لیے ناز یبا محسوس ہو۔

یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی ہے جو دین کے معاملہ میں دخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دُنیوی تعلقات میں صلۂ رحمی، مواسات اور رحمت و شفقت کا برتاؤ، تو یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ رشتہ دار خواہ کافر ہو یا مومن، اس کے دُنیوی حقوق ضروری ادا کیے جائیں گے۔ مصیبت زدہ انسان کی بہر حال مدد کی جائے گی۔ حاجت مند آدمی کو بہر صورت سہارا دیا جائے گا۔ بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جائے گی۔ یتیم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا۔ ایسے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔ ([illegible])

شادی بیاہ اور وراثت کا تعلق بھی اُن سے جائز نہیں

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ (الممتحنہ۔ ۱۰)

" نہ مسلمان عورتیں کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار اُن کے لیے حلال "

وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ۔ (الممتحنہ۔ ۱۰)

" اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو "

البتہ اِس حکم میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے مسلمان مرد نکاح کر سکتے ہیں جیسا کہ سورۂ مائدہ، آیت ۵ میں فرمایا گیا ہے۔ رہیں مسلمان عورتیں تو وہ مسلمان کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں ہیں۔

وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ (البقرہ۔ ۲۲۱)

" تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو، اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو "

حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لَا یَرِثُ المسلمُ الکافرَ ولا الکافرُ المسلمَ (بخاری، مسلم، نسائی، احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد)۔

"مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے"

کافروں کی دو قسمیں اور اُن کے ساتھ برتاؤ میں فرق

اِس طرح اُمتِ مسلمہ کو کفار سے پوری طرح الگ کر دینے کے بعد صرف ایک اعتبار سے دو قسم کے کافروں کے درمیان مسلمانوں کے برتاؤ میں فرق کیا گیا، اور وہ یہ ہے:

"اللہ تمہیں اِس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا ہے اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم اُن لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ اُن سے جو لوگ دوستی کریں وہ ظالم ہیں" (الممتحنہ آیات ۸-۹)۔

بالفاظِ دیگر مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ انہیں دشمن کافر اور غیر دشمن کافر میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے اور اُن کافروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا چاہیے جنہوں نے کبھی اُن کے ساتھ کوئی بُرائی نہ کی ہو۔ اِس کی بہترین تشریح وہ واقعہ ہے جو حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ اور اُن کی کافرہ ماں کے درمیان پیش آیا تھا حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیوی کافرہ تھیں اور مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ حضرت اسماءؓ انہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب مکے اور مدینے کے درمیان آمد و رفت شروع ہوئی تو وہ بیٹی سے ملنے کے لیے مدینہ آئیں اور کچھ تحفے تحائف بھی لائیں۔ حضرت اسماءؓ کا اپنا بیان ہے کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر پوچھا "اپنی ماں سے مل لوں؟ اور کیا میں اُن سے صلہ رحمی بھی کر سکتی ہوں؟" حضورؐ نے فرمایا ملو بھی اور صلہ رحمی بھی کرو (مسند احمد، بخاری، مسلم)۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اپنے کافر ماں، باپ، بھائی بہن اور رشتہ داروں کی مدد کرنا جائز ہے اگر وہ دشمنِ اسلام نہ ہوں۔ اور اسی طرح ذمّی مساکین پر صدقات بھی صرف کیے جا سکتے ہیں (احکام القرآن للجصاص۔ روح المعانی)۔

اُمتِ مسلمہ کی حقیقی حیثیت

اِس طرح جو جماعت وجود میں آئی تھی وہ کسی معنی میں بھی ایک "قوم" نہ تھی۔ اُس کی حقیقی حیثیت کو اُن

الفاظ سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے جو قرآن اور حدیث میں اس کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

حزب

ایک لفظ حِزْب ہے جو قرآن مجید میں دو جگہ مسلمانوں کے لیے استعمال ہوا ہے (المائدہ۔ آیت ۵۶۔ المجادلہ۔ آیت ۲۲)، اور یہ بعینہٖ پارٹی کا ہم معنی ہے۔ دونوں جگہ مسلمانوں کو حِزْبُ اللّٰہ (اللہ کی پارٹی کے لوگ) کہا گیا ہے، یعنی اُس پارٹی کے لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے کام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اٹھتی ہیں اور پارٹیاں اُصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔ کیونکہ اِن کو تمام دنیا سے الگ اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اُصول اور مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں، اور جن لوگوں سے اِن کا اصول و مسلک میں اشتراک نہیں ہے وہ خواہ اِن سے قریب ترین خونی اور مادّی رشتے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں، اُن کے ساتھ اِن کا کوئی میل نہیں ہے۔

قرآن سطح زمین کی اِس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے۔ ایک اللہ کی پارٹی (حزب اللہ) دوسری شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان)۔ شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اُصول و مسلک کے اعتبار سے کتنے ہی اختلافات ہوں، قرآن اُن سب کو ایک سمجھتا ہے، کیونکہ اُن کا طریقِ فکر اور طریقِ عمل بہرحال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہرحال وہ سب شیطان کے اتباع پر متفق ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (المجادلہ۔ ۱۹)

”شیطان اُن پر مسلط ہو چکا ہے اور اُس نے خدا کی یاد اُن کے دل سے بھلا دی ہے۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو، شیطان کی پارٹی والے ہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔“

برعکس اِس کے اللہ کی پارٹی والے خواہ نسل اور وطن، رنگ اور زبان اور تاریخی روایات کے اعتبار سے باہم کتنے ہی مختلف ہوں، بلکہ چاہے اُن کے آباؤ اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ رہ چکی ہوں، جب وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقِ فکر اور مسلکِ حیات میں متفق ہو گئے تو گویا الٰہی رشتے (حبل اللہ) سے باہم جڑ گئے اور اِس نئی پارٹی میں داخل ہوتے ہی اُن کے تمام تعلقات حزب الشیطان والوں سے کٹ گئے۔

اُمّت

دوسرا لفظ جو مسلمانوں کے لیے پارٹی ہی کے معنی میں قرآن نے چار جگہ (البقرہ۔ ۱۲۸-۱۴۳، آل عمران ۱۰۴-۱۱۰)

استعمال کیا ہے وہ لفظ اُمَّت ہے۔حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔اُمّت اُس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امرِ جامع نے مجتمع کیا ہو۔جن افراد کے درمیان کوئی اصل مشترک ہو اُن کو اُسی اصل کے لحاظ سے "اُمّت" کہا جاتا ہے۔مثلاً ایک زمانے کے لوگ بھی "اُمّت" کہے جاتے ہیں۔ایک نسل یا ایک ملک کے لوگ بھی "اُمّت" کہے جاتے ہیں۔مگر مسلمانوں کو جس اصلِ مشترک کی بنا پر اُمّت کہا گیا ہے وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض وغیرہ نہیں ہیں بلکہ وہ اُن کی زندگی کا مشن اور اُن کی پارٹی کا اُصول اور مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آلِ عمران - ۱۱۰)

"تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔"

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ - ۱۴۳)

"اور اِس طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی اُمّت بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی پر نگراں ہو اور رسُول تم پر نگراں ہو۔"

اِن آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "مُسلمان" دراصل ایک بین الاقوامی پارٹی کا نام ہے۔دُنیا کی ساری قوموں میں سے اُن اشخاص کو چھانٹ کر نکالا گیا ہے جو ایک خاص اصُول کو ماننے،ایک خاص پروگرام کو عمل میں لانے اور ایک مشن کو انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔یہ لوگ چونکہ ہر قوم سے نکلے ہیں اور ایک پارٹی بن جانے کے بعد کسی قوم سے بھی اِن کا تعلّق نہیں رہا ہے،اِس لیے یہ بیچ کی اُمّت ہیں۔لیکن ہر ہر قوم سے تعلق توڑنے کے بعد سب قوموں سے اِن کا ایک دوسرا تعلق قائم کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ دُنیا میں خدائی فوجدار کے فرائض انجام دیں۔"تم نوعِ انسانی پر نگراں ہو" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مُسلمان خدا کی طرف سے دُنیا میں فوجدار مقرر کیا گیا ہے اور "نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے" کا فقرہ صاف کہہ رہا ہے کہ مُسلمان کا مشن ایک عالمگیر مشن ہے۔اِس مشن کا خلاصہ یہ ہے کہ "حزبُ اللہ" کے رہنما سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو فکر و عمل کا جو ضابطہ خدا نے دیا تھا اس کو تمام ذہنی، اخلاقی اور مادّی طاقتوں سے کام لے کر دنیا میں نافذ کیا جائے،اور اُس کے مقابلہ میں دوسرے ہر طریقے کو مغلوب کر دیا جائے۔لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔یہ ہے وہ چیز جس کی بنیاد پر مُسلمان ایک اُمّت بنائے گئے ہیں۔

جماعت

تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ جماعت ہے، اور یہ لفظ بھی "حزب" کی طرح بالکل پارٹی کا ہم معنی ہے۔ علیکم بالجماعۃ، اور یَدُ اللہِ علی الجماعۃِ، اور ایسی ہی بکثرت احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قوم" یا "شعب" یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے قصداً احتراز فرمایا اور ان کے بجائے "جماعت" ہی کی اصطلاح استعمال کی۔ آپ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ "ہمیشہ قوم کے ساتھ رہو" یا "قوم پر خدا کا ہاتھ ہے" بلکہ ایسے تمام مواقع پر آپ جماعت ہی کا لفظ استعمال فرماتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے اور یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے "قوم" کے بجائے "امت"، "جماعت"، "حزب" (پارٹی) کے الفاظ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ قوم کا لفظ جن معنوں میں عموماً مستعمل ہوتا ہے ان کے لحاظ سے ایک شخص خواہ وہ کسی مسلک اور کسی اصول کا پیرو ہو، ایک قوم میں شامل رہ سکتا ہے جبکہ وہ اس قوم میں پیدا ہوا ہو اور اپنے نام، طرزِ زندگی اور معاشرتی تعلقات کے اعتبار سے اس قوم کے ساتھ مشترک ہو۔ لیکن امت، جماعت، حزب اور پارٹی کے الفاظ جن معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں ان کے لحاظ سے اصول اور مسلک ہی پر پارٹی میں شامل ہونے یا اس سے خارج ہونے کا مدار ہوتا ہے۔

اصولی جماعت اور قومی جماعت کا فرق

اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیشِ نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کا ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی پارٹی ہوتی ہے اس لیے وہ اس قوم کا جزو بن کر کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہوئی ہو۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلی نظریہ اور جہانی تصور (World Idea) لے کر اٹھتی ہے جس کے پاس تمام نوعِ انسانی کے لیے بلا لحاظِ قوم و وطن ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے، جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک خاص ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے، جس کا نظریہ و مسلک، عقائد و افکار اور اصولِ اخلاق سے لے کر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، جو ایک مستقل تہذیب (Culture) اور ایک مخصوص تمدن (Civilization) کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جماعت بھی اگرچہ ہوتی ایک جماعت ہی ہے، لیکن یہ اس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جزو بن کر کام کر سکتی ہو۔ یہ محدود قومیتوں سے

بالاتر ہوتی ہے۔ اِس کا نوشن ہی یہ ہوتا ہے کہ اُن تمام تعصّبات کو توڑ ڈالے جن سے دُنیا میں نسل، رنگ، زبان، وطن اور روایات کی بنیاد پر مختلف قومیتیں بنی ہیں۔ یہ اپنے آپ کو اِن قومیتوں کے ساتھ کیسے وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ تو نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت (Rational Nationality) بناتی ہے جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت (Expanding Nationality) بناتی ہے۔ یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو فکری و تہذیبی وحدت کی بنیاد پر رُوئے زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ لیکن اِس معنی میں ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے، کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار اتفاقی پیدائش پر نہیں ہوتا بلکہ اُس خاص نظریّہ و مسلک کی شعوری پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنتی ہے۔

مسلمان دراصل اِس دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے۔ یہ اُس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بنا کرتی ہیں۔ بلکہ یہ اُس قسم کی پارٹی ہے جو ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی اور ایک مستقل نظامِ تہذیب و تمدّن بنانے کے لیے اُٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت (World Nationality) بنانا چاہتی ہے۔ اس کو "قوم" کہنا اِس لحاظ سے تو درست ہوگا کہ یہ اپنے آپ کو دُنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبارِ جذبات وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریۂ حیات (View of Life) اور فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) کے مطابق خود اپنی تہذیب کی عمارت الگ بناتی ہے۔ لیکن اِس معنی کے لحاظ سے ایک الگ "قوم" ہونے کے باوجود حقیقت میں یہ جماعت ہی رہتی ہے کیونکہ محض اتفاقی پیدائش (Mere Accident of Birth) کسی شخص کو اس کا ممبر نہیں بنا سکتی جب تک کہ وہ اِس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو۔ اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اِس امر میں مانع بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اِس قوم میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اِس کے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو۔ پس جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومیت اُن کے ایک جماعت یا پارٹی ہونے ہی کی بنا پر قائم ہے۔ جماعتی حیثیت جڑ کا حکم رکھتی ہے اور قومی حیثیت اس کی فرع ہے۔ اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے اور یہ محض ایک "قوم" بن کر رہ جائے تو یہ اِس کا انحطاط اور تنزّل ہے۔ بلکہ یہ دراصل مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کے وجود کی نفی ہے۔

خلاصۂ بحث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں اُمّتِ مُسلمہ کی یہ جُداگانہ تنظیم، اور ایک مستقل معاشرہ کی حیثیت سے اس کی تاسیس، اور غیر مُسلم معاشرے سے اُس کی قطعی علیحدگی اگرچہ یکلخت نہیں بلکہ بتدریج کئی سال میں ہوئی، لیکن دعوتِ اسلامی کا آغاز جس ڈھنگ پر ہُوا تھا، اُس سے لوگوں نے ابتدا ہی میں یہ بھانپ لیا تھا کہ یہ تحریک کس رُخ پر جاری ہے اور آخر کار یہ کیا رنگ لاتے گی، اِس لیے پُرانے جاہلی معاشرے کو جو لوگ بھی باقی رکھنا چاہتے تھے وہ سب اِس پر بھڑک اٹھے اور اپنے درمیان سے اِس نئی اُمّت کے اُبھرنے کو روکنے کے لیے اُنہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ (۱۷۱)

فصل ہفتم

نبی اور غیر نبی کے کام کا فرق

اِس بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے اس پر ایک مجموعی نظر ڈال لی جائے، کیونکہ یہاں پہنچ کر ایک نبی اور غیر نبی کی قیادت اور اس کے طریقِ کار کا فرق اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب میں اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے تھے اُس وقت دُنیا میں بھی اور خود آپ کے اپنے ملک میں بھی بے شمار اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رُوم اور ایران کے سامراج بھی انتہائی جابرانہ شان کے ساتھ موجود تھے۔ نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی شدّت کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ کمزوروں پر زبردستوں کا ظلم بھی بے تحاشا جاری تھا۔ ہر طرح کا ناجائز معاشی استحصال بھی ہو رہا تھا۔ بدترین اخلاقی بُرائیاں بھی پھیلی ہُوئی تھیں، حتیٰ کہ عبادت خانے تک فواحش کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ عرب اِن سب ملکوں سے زیادہ پیچیدہ مسائل سے دوچار تھا جو ایک لیڈر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ملک میں رہنے والی اور ایک ہی زبان بولنے والی قوم جس کے اندر نسل و نسب کے باہمی رشتے بھی موجود تھے، بے شمار قبائل میں بٹی ہوئی تھی۔ اُس کے اندر "عرب قوم" کا تصوّر سرے سے ناپید تھا۔ لوگ اپنے قبیلے ہی کو اپنی قوم سمجھتے اور کہتے تھے۔ ملک میں ہر طرف طوائف الملوکی، خانہ جنگی، بدامنی، جہالت،

اخلاقی پستی، ظلم و ستم، بھوک اور افلاس کا دَور دورہ تھا۔ بیرونی طاقتیں عرب کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ملک کے اندر گھسی چلی آ رہی تھیں۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رُومی تسلّط پہنچ چکا تھا اور رُومی قیصریت اندرونِ ملک میں سیاسی اور تبشیری پھیلا کر اپنے اثرات کو وسعت دے رہی تھی۔ مغربی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی سلطنت مدّتوں یمن پر حملے اور قبضے کرتی رہی، حتّٰی کہ ایک مرتبہ مکّہ تک بھی اس کی فوجیں پہنچ گئیں۔ ایران عرب کے مشرقی ساحل اور کچھ اندرونی علاقوں پر تو اپنا اندرونی تسلّط جما ہی چکا تھا، بعد میں یمن تک بھی اس کا اقتدار پہنچ گیا۔ حجاز میں اکثر و بیشتر زرخیز حصّوں پر باہر سے آئے ہوئے یہودی صدیوں سے قابض تھے اور اپنی سُود خواری کے جال میں انہوں نے عربوں کو پھانس رکھا تھا۔

اِس حالت میں اگر کوئی مُصلح قسم کا لیڈر عرب سے اُٹھتا تو وہ اپنے کام کا آغاز یا تو جاہلانہ رسموں، اخلاقی خرابیوں اور آپس کی خانہ جنگیوں کو روکنے کی کوششوں سے کرتا، یا پھر امیری و غریبی کا مسئلہ اُٹھا کر غریبوں کو امیروں سے بھڑا دیتا، تاکہ عام لوگوں کی بھوک مٹے اور افلاس دُور ہو۔ اور اگر کوئی سیاسی قسم کا لیڈر اُٹھتا تو وہ عربوں کو یہ لالچ دے کر اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کرتا کہ میں تم کو ایک طاقت ور قوم بناؤں گا، بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کروں گا، عرب کو ایک بڑی سلطنت بنا دوں گا، تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ دوں گا، تمہارے وسائلِ معیشت بڑھاؤں گا، تمہاری بھوک مٹاؤں گا، اور طاقت حاصل کر کے گرد و پیش کے ممالک پر تاخت کروں گا تاکہ تم پر دولت کی بارش ہو۔ اس سارے کام میں اخلاق کا کوئی سوال درمیان میں نہ آتا، اور وہ اپنی سیاسی قیادت کو کامیاب بنانے کے لیے کسی چال، کسی جوڑ توڑ، کسی ہتھکنڈے، کسی زور و زبردستی، اور کسی گٹھ جوڑ سے کام لینے میں ذرا تامّل نہ کرتا۔ پھر بنیادی طور پر دونوں قسم کے لیڈروں کی قیادت ایک قوم پرستانہ قیادت ہوتی۔ اپنے قبیلے کی عصبیت سے وہ بہت آگے بڑھتے بھی تو زیادہ سے زیادہ عربی عصبیت تک پہنچ جاتے۔ دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں تک اُن کی نظر پھیلتی بھی تو عربی مفاد کے لیے پھیلتی۔ انسانیت کے وسیع تر تصوّر تک اس کی رسائی محال تھی۔

اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار

اب ذرا اللہ کے بھیجے ہوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے۔ حالات اور مسائل وہی سب کچھ تھے جو اوپر بیان ہوئے ہیں، اور وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ اہم تھے جنہیں بالکل ناقابلِ توجہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ حضورؐ نے بھی اُن کو ناقابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ وقت آنے پر اُن میں سے ایک ایک کو آپ نے صرف حل ہی نہیں کیا بلکہ وہ انقلابِ عظیم برپا کر کے دکھا دیا جس کا کوئی غیر نبی مُصلح یا سیاسی لیڈر تصوّر تک نہ کر سکتا تھا۔ لیکن آپ نے اپنے کام کے آغاز میں اِن سب سے قطع نظر فرما کر اپنی پوری توجہ صرف ایک

بنیادی اصلاح پر مرکوز کردی جو انسانی زندگی کے سارے مسائل کو حل کرنے کی ایک ہی کلید تھی۔ اگرچہ آپ ایک قبیلے اور ایک شہر میں پیدا ہوئے تھے، لیکن اسلامی تحریک کے پہلے روز ہی سے آپ کے پیشِ نظر نہ قبیلہ تھا، نہ قوم، نہ ملک، نہ وطن، بلکہ پوری نوعِ انسانی پر آپ کی نگاہ تھی جس کو آپ ایک صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دینے کے لیے اُٹھے تھے، اور سب مسائل کو چھوڑ کر جس بنیادی اصلاح پر آپ نے اپنی کوششیں مرکوز کر دی تھیں وہ یہ تھی کہ

(۱) لوگ توحید پر ایمان لائیں، سب کی بندگی چھوڑ کر صرف ایک اللہ کی بندگی اختیار کریں اور اُسی کے حکم کو واجب الاتباع قانون مانیں۔

(۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانیں اور اُس ہدایت، تعلیم اور آئین و قانون کی اطاعت کریں جو اللہ کی طرف سے اُن کے ذریعہ پہنچے۔ رسول پر اس ایمان سے خود محمدؐ بن عبداللہ بھی مستثنیٰ نہ تھے، کجا کہ کوئی اور ہو سکتا۔

(۳) قرآن کو اللہ کا کلام مانیں اور اس کے فرمان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واجب الاذعان تسلیم کریں۔

(۴) آخرت پر ایمان لائیں اور یہ سمجھتے ہوئے دُنیا میں کام کریں کہ آخرکار مرنے کے بعد ہمیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

(۵) اخلاقی حسن و قبح کے اُن ناقابلِ تغیّر اصولوں کی پیروی اختیار کریں جو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب نے پیش کیے ہیں۔

(۶) انسانوں میں سے جو لوگ بھی اِس دعوت کو قبول کرلیں وہ ایک ایسی اُمّت بن جائیں جو اس دعوت کی علمبردار بن کر اُٹھے، اِس کو غالب کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دینے پر تیار ہو جائے، آپس میں پوری طرح متحد ہو، اور اپنا ایک مستقل معاشرہ بنا کر کُفر اور کُفّار سے قلبی محبّت اور عملی معاشرت کے تعلقات توڑ لے۔ (۱۶۲)

اِس طریقِ کار کی اہمیّت

ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر صرف اِسی ایک بنیادی اصلاح پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ اوّل تو یہی تھی کہ یہی امرِ حق ہے اور رسُول کا اصل کام حق ہی پیش کرنا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدّنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی اصل علّت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار و غیر ذمّہ دار رکھنا، اور آپ اپنا اِلٰہ بن جانا یا الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو خدائی اوصاف و اختیارات یا حقوق کا حامل تسلیم کرنا ہے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ خرابی جب تک جڑ میں موجود رہے اسلامی نظریہ کی رُو سے کوئی اُوپری اصلاح انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دُور کرنے میں کامیاب

نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دُور کیا جائے گا تو کسی دُوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اِسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری و غیر جواب دہی کی ہوا نکال دی جائے اور اسے بتا یا جائے کہ تو جس دُنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اُس کا ایک بادشاہ (Sovereign) موجود ہے اور تو اُس کی پیدائشی رعیّت (Born Subject) ہے۔ اُس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے ثبات سے مٹ سکتی ہے اور نہ تو اُس کے حدودِ سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اِس اٹل اور امر واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہوگا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ تو سیدھی طرح اُس کے آگے سر جُھکا دے اور بندہ مطیع (مُسلم) بن کر رہے۔ دوسری طرف اُس کو حقیقت کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اِس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختارِ کُل ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ درحقیقت کسی کا حکم چلتا ہے۔ اِس لیے تو اُس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن، کسی کا حکم نہ مان، کسی کے آگے سر نہ جُھکا۔ یہاں کوئی ہز میجسٹی نہیں ہے، میجسٹی اُسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اُسی کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہائی نس نہیں ہے۔ ہائی نس صرف اُسی ایک کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈ شپ بالکلیہ اُسی ایک کا حصّہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز نہیں ہے۔ قانون اُسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حقدار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی اَن داتا، کوئی شاہ و شہنشاہ، کوئی ولی و کارساز، کوئی مشکل کُشا، کوئی دُعائیں سُننے والا اور کوئی فریاد رَس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کُنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیّت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مَولیٰ صرف ایک ہے۔ لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اُسی ایک کا غلام، مطیع اور پابندِ حکم بن جا۔

یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اِسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت آ دھر کر از سرِ نو ایک خاص نقشے پر بنتی ہے۔ اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدمؑ سے لے کر اب تک پیدا ہوئے ہیں اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اِسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

حضورؐ کی دعوت کا طریق آغاز

محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے اِس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا۔ اُنہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا

کہ پہلے کچھ سیاسی اور سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اُس اثر سے کام لے کر رفتہ رفتہ کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کر لیے جائیں، پھر اُن اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اِس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اُٹھا اور چھوٹتے ہی اُس نے لا اِلٰہ اِلا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اِس سے کم کسی چیز پر اُس کی نگاہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ ٹھیری۔ اِس کی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش ہی نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اِس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آدمی کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اِس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ اِس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو بلانے والے کی طرف لا اِلٰہ اِلا اللہ کی آواز سُن کر ہی آئیں اِسی چیز میں اُن کے لیے کشش ہو، اِسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں اور اِسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں۔ لہٰذا اسلامی تحریک چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبّر اور حکمتِ عملی کی ضرورت ہے اُس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز توحید کی دعوت ہی سے کیا جائے۔

توحید کے تصوّر کی وسعت

توحید کا یہ تصوّر محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ اِس سے انفرادی و اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری یا غیر اللہ کی حاکمیّت و ألوہیّت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اُکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دُنیا مؤذّن کو اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی صدا بلند کرتے ہوئے اِس لیے ٹھنڈے پیٹوں سُن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ میں کیا پُکار رہا ہُوں نہ سُننے والوں کو اِس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اِس اعلان کا مقصد موجود الوقت پُورے نظام سے بغاوت اور اُس کی جگہ ایک دوسرا نظام تعمیر کرنا ہے تو یقین جانیے کہ اِس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دُنیا خود آپ سے لڑنے آ جائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یُوں محسوس ہو گا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دُشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھّو اور درندے ہی درندے ہیں۔

اِس طریقِ کار کی کامیابی کے اسباب

یہی صورت اُس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے علانیہ یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پُکارا تھا، اور سُننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اِس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اِس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اِس آواز کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پُجاریوں اور پیشواؤں کو اپنی برہمنیت و

یا پائیت کا خطرہ اِس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوّق کا، رسم پرستوں کو اپنی رسُوم کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیّت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقے کا، غرض ہر بُت کے پرستار کو اپنے بُت کے ٹوٹنے کا خطرہ اِسی ایک آواز میں محسُوس ہُوا۔ اِس لیے اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کے مصداق وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اِس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اِس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف آتے جن کا ذہن صاف تھا۔ جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے۔ جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کُود نے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اِس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک، دو دو، چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی کسی کا روزگار چھوٹا کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا کسی کو تپتی ہُوئی ریت پر گھسیٹا گیا کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت، ریاست، غرض ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں۔ اِن کا آنا ضروری تھا۔ اِن کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ آگے بڑھ سکتی تھی۔

کام کے آدمی چھانٹنے اور انہیں تربیّت دینے کا فطری طریقہ

اِن کا لازمی فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے، کمزور سیرت و کردار اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اِس طرف آہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جس کی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اِس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آتے وہ اِس بھٹّی میں سے گزر کر آتے۔ پھر جو لوگ آئے اُن کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ انہوں نے جو کچھ بھی سہا صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اس کی رضا کے لیے سہا۔ اسی کے لیے وہ پٹے، اسی کے لیے وہ بھُوکے مرے، اسی کے لیے دُنیا بھر کی جفا کاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی چلی گئی جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر مضبوط اور قابلِ اعتماد اسلامی کردار پیدا ہُوا۔ اُن کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اِس زبردست تربیت گاہ میں کیفیتِ اسلامی کا طاری ہونا ایک فطری امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اُٹھتا ہے اور اُس کی خاطر کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلا وطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اس ذاتی تجربے کی بدولت

اُس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اُس کی پُوری شخصیت اُسی مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اِس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے سب سے پہلے نماز اُن پر فرض کی گئی تاکہ فکر کی پراگندگی کا ہر امکان دُور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر اُن کی نگاہ جمی رہے جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اُس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدے میں وہ مضبوط ہو جائیں جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اُس کا عالم الغیب والشہادہ ہونا، اُس کا مالکِ یوم الدّین ہونا، اُس کا قاہر فوق عبادہ ہونا پُوری طرح اُن کے ذہن نشین ہو جائے۔ اور کسی حال میں اس کی اطاعت کے سوا دوسرے کسی کی اطاعت کا خیال تک اُن کے دلوں میں نہ آئے۔

اِسلامی دعوت کے پھیلنے کے وجُوہ

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اِس طرح ہو رہی تھی، اور دوسری طرف اِسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند لوگ پیٹے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں گھروں سے نکالے جا رہے ہیں تو خواہ مخواہ اُن کے اندر یہ معلوم کرنے کی جستجو پیدا ہوتی تھی کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب اُنہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین، کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی اِن کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اِس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت اِن پر منکشف ہُوئی ہے تو اُن کے دلوں میں آپ سے آپ یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر وہ ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لاالٰہ الّا اللہ اور اِس سے انسانی زندگی میں اِس نوعیت کا انقلاب رُونما ہوتا ہے، اور اِس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اُٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دُنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو اُن کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اُن کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوتے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اِس پس منظر میں یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبّر، یا آبا و پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اِس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا۔ مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند بے لوث آدمی کو اِس کی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

حضُور کی سیرت کا غیر معمولی اثر

اِس دوران میں تحریک کے رہنما صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اُصولوں کا اور ہر اُس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اُٹھی تھی، پُورا پُورا مظاہرہ کیا۔ اُن کی ہر بات، ہر فعل اور ہر حرکت سے

اسلام کی حقیقی رُوح جھلکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔

اُن کی بیوی حضرت خدیجہؓ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار خاتون تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو اُن کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے میں چند سال کے اندر لُٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب سنہ ۱۰ بعد نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا اس کو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسّر نہ ہُوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرتؐ کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے۔ عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دے دیں گے۔ دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے۔ بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اُٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمدؐ، ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سُنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مُفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد پیش جمع کر رکھا ہے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اُونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا، اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ آپ کے لیے ایمان لانے والے غیر اپنے تھے، اور ایمان نہ لانے والے اپنے غیر تھے۔ اسی چیز نے دُنیا کو آپ کی حق پرستی کا قائل کیا۔ اسی چیز نے دُنیا کو یقین دلایا کہ آپؐ انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اُٹھے ہیں۔ اور اسی چیز نے آپؐ کی دعوت کی طرف ہر ملک اور ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپؐ اس بات کے لیے بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو کسی طرح بچا لوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپؐ عرب کی برتری کے لیے اُٹھتے تو حبش کے بلالؓ، روم کے صُہیبؓ، اور ایران کے سلمانؓ کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں آپؐ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔ (۱۴۳)

حوالہ جات باب ۶

(۱) اضافہ از مؤلف
(۲) تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل حاشیہ ۹۲
(۳) 〃 ، جلد چہارم، الزُّمَر، حاشیہ ۶۴
(۴) اضافہ از مؤلف
(۵) تفہیم القرآن، جلد اوّل، الأنعام، حاشیہ ۲۹
(۶) اضافہ از مؤلف
(۷) تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّمَر، حاشیہ ۲۷
(۸) 〃 ، 〃 ، 〃 ، الشوریٰ، حاشیہ ۳۸
(۹) 〃 ، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱
(۱۰) اضافہ از مؤلف
(۱۱) تفہیم القرآن ، جلد سوم، القصص، حواشی ۸۰ تا ۸۵
(۱۲) اضافہ از مؤلف
(۱۳) تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۵
(۱۴) 〃 ، 〃 ، 〃 ، الفرقان، حواشی ۴ تا ۱۷
(۱۵) اضافہ از مؤلف
(۱۶) تفہیم القرآن ، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۱۰
(۱۷) 〃 ، جلد پنجم، التغابن، حواشی ۱۱ تا ۱۳ -
(۱۸) تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۸
(۱۹) 〃 ، 〃 ، 〃 ، یوسف، حاشیہ ۶۹
(۲۰) اضافہ از مؤلف
(۲۱) تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۶۳

(۲۲) تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحقاف، حاشیہ ۱۲
(۲۳) 〃 〃 〃 ، الزخرف، حواشی ۳۰ تا ۳۲
(۲۴) 〃 〃 〃 ، المؤمن، حواشی ۷۵-۷۶
(۲۵) 〃 〃 جلد دوم، النحل، حاشیہ ۴
(۲۶) 〃 جلد چہارم، الاحقاف، حواشی ۱۵-۱۶
(۲۷) 〃 جلد سوم، الشعراء، خلاصہ حاشیہ ۸۱
(۲۸) 〃 ، جلد چہارم، صٓ، حاشیہ ۸
(۲۹) اضافہ از مؤلف
(۳۰) تفہیم القرآن، جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۲۷
(۳۱) 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۳۶
(۳۲) 〃 ، جلد پنجم، الطور، خلاصہ حاشیہ ۲۲
(۳۳) 〃 ، جلد ششم، التکویر، حاشیہ ۲۱
(۳۴) 〃 جلد سوم، الشعراء، حواشی ۱۳۰ تا ۱۳۲
(۳۵) 〃 ، جلد چہارم، الدخان، حاشیہ ۱۲
(۳۶) 〃 ، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۰۷
(۳۷) 〃 ، جلد سوم، القصص، حاشیہ ۶۴
(۳۸) اضافہ از مؤلف
(۳۹) تفہیم القرآن، جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۱۸
(۴۰) 〃 ، جلد چہارم، سبا، حواشی ۶۶-۶۷
(۴۱) 〃 ، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۹۷
(۴۲) 〃 ، جلد ششم، القلم، خلاصہ حواشی ۲ تا ۴
(۴۳) 〃 ، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۴۳
(۴۴) 〃 ، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۱۴۲
(۴۵) 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۴۳
(۴۶) 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۴۴

(۴۷) تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، الطور ، حاشیہ ۲۵
(۴۸) " " جلد دوم ، بنی اسرائیل ، حاشیہ ۵۳
(۴۹) " " جلد پنجم ، ق ، حاشیہ ۵
(۵۰) " " جلد سوم ، الفرقان ، حاشیہ ۵۵
(۵۱) " " جلد دوم ، بنی اسرائیل ، حاشیہ ۱۰۶
(۵۲) " " جلد سوم ، العنکبوت ، حاشیہ ۹۱
(۵۳) " " جلد ششم ، المدثر ، حاشیہ ۳۹
(۵۴) " " جلد اول ، الانعام ، حواشی ۵ تا ۷
(۵۵) " " " " " ۲۶ - ۲۷
(۵۶) " " جلد دوم ، الرعد ، حاشیہ ۴۷
(۵۷) " " جلد سوم ، العنکبوت ، حاشیہ ۹۸
(۵۸) " " جلد دوم ، یونس ، حاشیہ ۲۱
(۵۹) " " جلد سوم ، القصص ، حاشیہ ۱۰۹
(۶۰) اضافہ از مؤلف
(۶۱) تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، السجدہ ، حاشیہ ۱
(۶۲) " " " " " حواشی ۲-۳-۴
(۶۳) " " جلد دوم ، یونس ، حاشیہ ۵۳
(۶۴) " " " بنی اسرائیل ، حاشیہ ۱۰۵
(۶۵) " " " ہود ، حاشیہ ۱۴
(۶۶) " " " یونس ، حاشیہ ۴۶
(۶۷) " " جلد پنجم ، الطور ، حواشی ۲۶ - ۲۷
(۶۸) " " جلد سوم ، الفرقان ، حواشی ۴۳ تا ۴۶
(۶۹) " " جلد دوم ، النحل ، حواشی ۱۰۲ تا ۱۰۶
(۷۰) " " جلد سوم ، الفرقان ، خلاصہ حاشیہ ۱۲
(۷۱) " " جلد چہارم ، حم السجدہ ، حاشیہ ۴۵

(٧٢) تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، حٰمٓ السجدہ ، حاشیہ ۱

(٧٣) اضافہ از مؤلف

(٧٤) اضافہ از مؤلف

(٧٥) تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، الجاثیہ ، حاشیہ ۴۴

(٧٦) ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ، حاشیہ ۳۴

(٧٧) ؍؍ ، جلد دوم ، الرّعد ، حاشیہ ۱۲

(٧٨) ؍؍ ، جلد چہارم ، سبا ، حاشیہ ۱۰

(٧٩) ؍؍ ، جلد ششم ، النّازعات ، حاشیہ ۴

(٨٠) ؍؍ ، جلد چہارم ، یٰسٓ ، خلاصہ حواشی ۴۶ تا ۴۷

(٨١) ؍؍ ، جلد دوم ، بنی اسرائیل ، حاشیہ ۵۶

(٨٢) ؍؍ ، جلد سوم ، الحج ، خلاصہ حواشی ۵-۶

(٨٣) ؍؍ ، جلد چہارم ، السجدہ ، حواشی ۲۰-۲۱

(٨٤) ؍؍ ؍؍ ؍؍ ، الصّٰفّٰت ، حواشی ۸-۹

(٨٥) ؍؍ ؍؍ ؍؍ ، المومن ، حاشیہ ۷۹

(٨٦) ؍؍ ، جلد ششم ، النّٰزعٰت ، حاشیہ ۱۴

(٨٧) ؍؍ ، جلد چہارم ، الصّٰفّٰت ، حواشی ۸ تا ۱۲

(٨٨) ؍؍ ، جلد ششم ، الغاشیہ ، حاشیہ ۷

(٨٩) ؍؍ ؍؍ ؍؍ ، القیٰمۃ ، حاشیہ ۲۵

(٩٠) ؍؍ ؍؍ ؍؍ ، الطارق ، حواشی ۲-۳

(٩١) ؍؍ ، جلد پنجم ، قٓ ، حاشیہ ۴

(٩٢) ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ، حاشیہ ۱۸

(٩٣) اضافہ از مؤلف

(٩٤) تفہیم القرآن ، جلد ششم ، القیٰمۃ ، حاشیہ ۲۴

(٩٥) ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ، حاشیہ ۲

(٩٦) ؍؍ ، جلد چہارم ، صٓ ، حواشی ۲۹-۳۰

(۹۷) تفہیم القرآن، جلد پنجم، التغابن، حواشی ۱۵ تا ۱۷

(۹۸) 〃 ، جلد چہارم ، الدخان ، حواشی ۳۱ ۔ ۳۲

(۹۹) 〃 ، 〃 ، الجاثیہ ، حواشی ۲۷ ۔ ۲۸

(۱۰۰) 〃 ، 〃 ، 〃 ، حاشیہ ۳۴

(۱۰۱) 〃 ، جلد ششم ، القلم ، حواشی ۱۹ تا ۲۳

(۱۰۲) 〃 ، 〃 ، بحم تنکیریہ ، حاشیہ ۹

(۱۰۳) اضافہ از مؤلف

(۱۰۴) تفہیم القرآن، جلد ششم، القیٰمۃ، حواشی ۳ تا ۵

(۱۰۵) تفہیم القرآن، 〃 ، 〃 ، حاشیہ ۱۵

(۱۰۶) 〃 ، 〃 ، الدّہر ، حاشیہ ۲۱

(۱۰۷) 〃 ، 〃 ، التکاثر ، حواشی ۱ تا ۳

(۱۰۸) 〃 ، 〃 ، المطففین ، حاشیہ ۱

(۱۰۹) 〃 ، 〃 ، الفجر ، حواشی ۱۱ تا ۱۴

(۱۱۰) 〃 ، 〃 ، الماعون ، حاشیہ ۷

(۱۱۱) 〃 ، 〃 ، الملک ، حاشیہ ۴

(۱۱۲) 〃 ، 〃 ، الدّہر ، حواشی ۳ تا ۵

(۱۱۳) 〃 ، جلد چہارم ، الزمر ، حاشیہ ۴۵

(۱۱۴) 〃 ، 〃 ، المؤمن ، حاشیہ ۲۸

(۱۱۵) اضافہ از مؤلف

(۱۱۶) تفہیم القرآن، جلد پنجم، قٓ ، حاشیہ ۲۱

(۱۱۷) 〃 ، جلد ششم ، الانفطار ، حاشیہ ۷

(۱۱۸) 〃 ، 〃 ، الزلزال ، حواشی ۲ تا ۴

(۱۱۹) 〃 ، جلد سوم ، الکہف ، حاشیہ ۴۶

(۱۲۰) 〃 ، جلد پنجم ، القمر ، حاشیہ ۲۸

(۱۲۱) 〃 ، 〃 ، المجادلہ ، حاشیہ ۱۷

(۱۲۲) تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسٓ، حاشیہ ۵۵
(۱۲۳) " " " " ، حاشیہ ۵۵
(۱۲۴) " " " ، حٰم السجدہ، حاشیہ ۲۵
(۱۲۵) " " " ، یٰسٓ، حاشیہ ۹
(۱۲۶) " " " ، الجاثیہ، حاشیہ ۴۲
(۱۲۷) " " جلد ششم، المرسلات، حاشیہ ۶
(۱۲۸) " " جلد چہارم، الزمر، حاشیہ ۸۰
(۱۲۹) " " جلد ششم، العادیات، حاشیہ ۸
(۱۳۰) " " " ، الطارق، حواشی ۵ تا ۷
(۱۳۱) " " " ، النجم، حواشی ۹ تا ۱۰
(۱۳۲) " " " ، النازعات، حاشیہ ۲۰
(۱۳۳) " " " ، الفجر، حاشیہ ۱۷
(۱۳۴) " " " ، الانفطار، حاشیہ ۳
(۱۳۵) " " " ، الزلزال، حواشی ۵ تا ۷
(۱۳۶) " " جلد چہارم، الفاطر، حواشی ۳۹ - ۴۰
(۱۳۷) " " جلد ششم، عبس، حاشیہ ۲۲
(۱۳۸) " " " ، المعارج، حاشیہ ۱۱
(۱۳۹) " " جلد چہارم، المؤمن، حواشی ۳۱ - ۳۲
(۱۴۰) " " جلد ششم، النبا، حواشی ۲۳ - ۲۴
(۱۴۱) اضافہ از مؤلف
(۱۴۲) اضافہ از مؤلف
(۱۴۳) تفہیم القرآن، جلد ششم، الشمس، خلاصہ حواشی ۴ - ۵ - ۶
(۱۴۴) اضافہ از مؤلف
(۱۴۵) تفہیم القرآن، جلد ششم، البلد، خلاصہ حواشی ۹ - ۱۰
(۱۴۶) " " ، التین، خلاصہ حواشی ۲ - ۴

(۱۴۷) اضافہ از مؤلف

(۱۴۸) اضافہ از مؤلف

(۱۴۹) تفہیم القرآن، جلد پنجم، الحجرات، حاشیہ ۲۰

(۱۵۰) " " جلد سوم، الروم، حاشیہ ۱۸

(۱۵۱) " " " " الحج، حاشیہ ۱۳۲

(۱۵۲) " " " " ، القصص، حاشیہ ۷۳

(۱۵۳) اضافہ از مؤلف

(۱۵۴) تفہیم القرآن، جلد ششم، اللہب، دیباچہ

(۱۵۵) " " جلد پنجم، الحجرات، حاشیہ ۱۸

(۱۵۶) " " جلد ششم، البلد، حاشیہ ۱۴

(۱۵۷) " " جلد پنجم، الحجرات، حاشیہ ۲۶

(۱۵۸) اضافہ از مؤلف

(۱۵۹) تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، حاشیہ ۱۳۶

(۱۶۰) " " جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۱۴۴

(۱۶۱) " " " " ، آل عمران، حاشیہ ۸۸

(۱۶۲) " " جلد دوم، التوبہ، خلاصہ حاشیہ ۔ ۸

(۱۶۳) " " جلد سوم، العنکبوت، حواشی ۹۴ تا ۹۹

(۱۶۴) " " جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۱۸

(۱۶۵) " " جلد پنجم، المجادلہ، حاشیہ ۳۷

(۱۶۶) " " جلد سوم، العنکبوت، حاشیہ ۱۱

(۱۶۷) " " " " " ، حاشیہ ۱۷-۱۸

(۱۶۸) " " جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۱۱۱

(۱۶۹) " " جلد پنجم، الممتحنہ، خلاصہ حاشیہ ۱۳

(۱۷۰) ماخوذ از "اسلامی ریاست"، صفحہ ۱۵۹ تا ۱۶۷

(۱۷۱) اضافہ از مؤلف

(۱۴۲) اضافہ از مؤلف

(۱۴۳) ماخوذ از رسالہ "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟"

باب (۷)

دعوتِ عام کی اِبتدا

پچھلے دو ابواب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سال کی خفیہ دعوت کے بعد جب علی الاعلان اسلام کی تبلیغ شروع کی تو اس پر قریش اور عام اہلِ عرب کے اس قدر برگشتہ ہو جانے کی وجہ کیا تھی اور کیوں وہ آپؐ کے مقابلے میں شدید مخالفت و مزاحمت اور عداوت و شقاوت پر تُل گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اس بحث سے بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ اسلام کی یہ دعوت دلائل اور اخلاق کے کیسے زبردست ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اٹھی تھی کہ اس کے سامنے مخالفت کی اپنی ساری تدبیریں، چال بازیاں، اور ظلم و ستم کے با وجود بے بس ہو کر رہ گئی۔ اب ہم تاریخی بیان کا سلسلہ پھر اُسی مقام سے جوڑتے ہیں جہاں ہم نے اسے چوتھے باب میں چھوڑا تھا۔

اِسلام کا اوّلین اظہار

اگرچہ مؤرخین اور اہلِ سیر نے کہیں اس بات کی صراحت نہیں کی ہے، لیکن قرآن مجید میں سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتوں کے بعد جس طرح یکایک آیت ۸ سے ۹ تک یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے اللہ کے ایک بندے کو نماز پڑھنے سے منع کیا اور دھمکیاں دے کر اسے روکنا چاہا، اور احادیث کی معتبر کتابوں میں اس واقعہ کی جو تشریح کی گئی ہے کہ وہ نماز پڑھنے والے خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور آپؐ کو روکنے والا ابوجہل تھا، اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ نے اپنے دین کا اظہار سب سے پہلے حَرَم میں اسلامی طریقے پر نماز پڑھ کر کیا۔ اُس وقت تک مسلمان چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور کوئی حرم کعبہ تو درکنار کسی کھلی جگہ بھی علانیہ نماز پڑھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ صرف ایک دفعہ مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک سنسان گھاٹی میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے مشرکین نے مسلمانوں کو دیکھ لیا تھا تو اس پر مار کٹائی کی نوبت آگئی تھی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ہُوا کہ اسلام کا کھُلم کھُلا اظہار کیا جائے، تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر حرم میں جا کر نماز پڑھنی شروع کر دی جس

ہمت آپ کے سوا اور کوئی نہ کر سکتا تھا۔ (۱)

اسی چیز سے قریش کے عام لوگوں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ آپ کا دین اُن کے دین سے بدل گیا ہے۔ دوسرے دیکھنے والے تو اس پر حیران ہی تھے، مگر ابوجہل کی رگِ جاہلیت اِس پر بھڑک اُٹھی اور اُس نے آپ کو دھمکیاں دے کر اس سے روکنے کی کئی مرتبہ کوشش کی۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ابوجہل نے قریش کے لوگوں سے پوچھا "کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے سامنے زمین پر اپنا منہ ٹکاتے ہیں؟" لوگوں نے کہا ہاں۔ اُس نے کہا "لات اور عُزّیٰ کی قسم، اگر میں نے اُن کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو اُن کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور ان کا منہ زمین میں رگڑ دوں گا۔" پھر ایسا ہوا کہ حضورؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا تا کہ آپؐ کی گردن پر پاؤں رکھے، مگر یکایک لوگوں نے دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس سے پوچھا گیا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا؟ اُس نے کہا میرے اور اُن کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہولناک چیز تھی اور کچھ پر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو ملائکہ اُس کے چیتھڑے اُڑا دیتے (احمد، مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابو نعیم اصفہانی، بیہقی)۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابوجہل نے کہا اگر میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبہ کے پاس نماز پڑھتے دیکھ لیا تو اُن کی گردن پاؤں تلے دبا دوں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر اُس نے ایسا کیا تو ملائکہ علانیہ اُسے آ پکڑیں گے (بخاری، ترمذی، نسائی، ابن جریر، عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن مردویہ)۔

ابن عباسؓ کی ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل کا اُدھر سے گزر ہوا تو اُس نے کہا "اے محمدؐ، کیا میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟" اور اُس نے آپؐ کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا۔ اِس پر اُس نے کہا "اے محمدؐ، تم کس بل پر مجھے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم، اِس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔" (احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، طبرانی، ابن مردویہ) (۲)

اس کے بعد قریش کے دوسرے لوگ بھی ہجوم کر کر کے آپؐ کو حرم میں نماز پڑھنے سے روکنے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ آپؐ کو اس سے باز رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا "اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اُس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے" (الجن-۱۹)۔ یہاں بھی مفسرین نے "اللہ کے بندے" سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی مراد لی ہے۔ اور یہ آیت بتاتی ہے کہ حضورؐ نے علانیہ نماز پڑھنے کا سلسلہ

نہ چھوڑا اگرچہ ابُوجہل کے علاوہ قریش کے دوسرے لوگ بھی آپ پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہوتے رہتے۔

اپنے قریب ترین خاندان والوں کو دعوت

دوسرا قدم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ اُٹھایا کہ اپنے قریب ترین خاندان والوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (الشعراء - ۲۱۴) کے مطابق اپنے ہاں مدعو کیا جن میں بنی عبدالمطّلب اور بنی ہاشم کے علاوہ کچھ بنی المطّلب اور بنی عبدِمناف بھی تھے۔ بلاذری اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس دعوت میں جملہ ۴۵ آدمی شریک ہوئے تھے۔ مگر قبل اس کے کہ حضورؐ اپنی بات کہتے، ابولہب بول اُٹھا کہ "یہ تمہارے چچا اور چچا زاد بھائی موجود ہیں۔ جو کچھ چاہو کہو، مگر دین سے پھرنے کی بات نہ کرو۔ تم کو جان لینا چاہیے کہ تمہاری قوم تمام عرب سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اور تمہارا ہاتھ پکڑنے اور تمہیں روکنے کے سب سے زیادہ حق دار تمہارے اپنے خاندان کے لوگ ہیں۔ اگر تم اس کام پر قائم رہے جو تم کر رہے ہو تو تمہیں روکنا اُن کے لیے اس سے زیادہ ہلکی بات ہے کہ تم پر قریش کے دوسرے خاندان ٹوٹ پڑیں اور عرب اُن کی مدد کریں۔ میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو اپنے خاندان والوں پر اس سے زیادہ سخت آفت لایا ہو جو تم لے آئے ہو"۔ اس طرح ابولہب نے پہلی مجلس کو خراب کر دیا۔ دوسرے روز حضورؐ نے پھر خاندان والوں کو بلایا اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ جناب ابوطالب نے کہا کہ "میں دینِ عبدالمطّلب کو تو نہیں چھوڑنا چاہتا، مگر جس کام کا تم کو حکم دیا گیا ہے اسے تم کرو اور میں تمہاری حمایت و حفاظت کروں گا۔" ابولہب بولا "خدا کی قسم یہ بہت بُری بات ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ لو قبل اس کے کہ دوسرے اس کو پکڑیں۔" ابوطالب نے کہا کہ "خدا کی قسم ہم اس کی حفاظت کریں گے جب تک ہماری جان میں جان ہے۔" یہ روایت بلاذری اور ابن اثیر نے جعفر بن عبداللہ بن ابی الحکم کے حوالے سے نقل کی ہے جو ایک ثقہ راوی ہیں (انساب الاشراف للبلاذری، جلد اوّل، ص ۱۱۸ - ۱۱۹۔ تاریخ الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۴۰ - ۴۱)۔ (۳)

معتبر روایات میں آیا ہے کہ اس موقع پر حضورؐ نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں نام لے لے کر فرمایا یا بنی عبد المطلب، یا عباس، یا صفیۃ عمۃ رسُول اللّٰہ، یا فاطمۃ بنت محمدؐ، انقذوا انفسکم من النار فانی لا املک لکم من اللّٰہ شیئًا، سلونی من مالی ما شئتم "اے اولادِ عبدالمطّلب، اے عباس، اے صفیہ رسُول اللہ کی پھوپھی، اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی، تم لوگ اپنے آپ کو جہنّم کی آگ سے بچاؤ کیونکہ میں اللہ کی پکڑ سے تم کو بچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا، البتہ میرے مال میں سے تم جو چاہو مجھ سے مانگ سکتے ہو۔" یہ صرف رشتہ داروں کو دعوتِ حق ہی نہیں تھی، بلکہ اس میں اس بات کا اظہار بھی تھا کہ خدا کا دین بے لاگ ہے، اس میں نبی تک کی ذات اور اس کے قریب ترین عزیزوں کے لیے بھی رعایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں جس کے ساتھ بھی کوئی معاملہ ہے اس کے اوصاف (Marits) کے لحاظ سے ہے کسی کا نسب اور کسی کے ساتھ

آدمی کا تعلق کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ گمراہی و بدعملی پر خدا کے عذاب کا خوف سب کے لیے یکساں ہے ایسا نہیں ہے کہ اور سب تو اِن چیزوں پر پکڑے جائیں مگر نبی کے رشتہ دار بچے رہ جائیں۔ اِسی اصول کو واضح کرنا چونکہ مقصود تھا اِس لیے حضورؐ نے اِس خطاب میں خود اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کا نام بھی لیا، حالانکہ ان کی عمر اُس وقت دو ڈھائی سال سے زیادہ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ سرے سے مکلف ہی نہ تھیں کہ ان کے بارے میں کسی عذاب یا ثواب کا سوال پیدا ہوتا۔ لیکن مقصودِ کلام اِس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ دین میں نبی اور اس کے خاندان کے لیے کوئی امتیازی مراعات نہیں ہیں جن سے دوسرے محروم ہوں۔ جو چیز زہرِ قاتل ہے وہ سب ہی کے لیے قاتل ہے۔ نبی کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے اُس سے خود بچے اور اپنے قریبی لوگوں کو اس سے ڈرائے، پھر ہر خاص و عام کو متنبّہ کر دے کہ جو بھی اسے کھائے گا ہلاک ہو جائے گا۔ اور جو چیز نافع ہے وہ سب ہی کے لیے نافع ہے۔ نبی کا منصب یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے خود اختیار کرے اور اپنے عزیزوں کو اس کی تلقین کرے تاکہ ہر شخص دیکھ لے کہ یہ وعظ و نصیحت دوسروں ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ نبیؐ اپنی دعوت میں مخلص ہے، خود اُس پر عمل کرتا ہے اور اپنے عزیزوں کو اس پر عمل کی تلقین کرتا ہے۔ (۳)

قریش کے تمام خاندانوں کو دعوت

اس کے بعد تیسرا قدم آپؐ نے یہ اُٹھایا کہ ایک روز صبح سویرے صفا کے سب سے اُونچے مقام پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے پکارا یا صباحاہ (ہائے صبح کا خطرہ)، اَے قریش کے لوگو، اَے بنی کعب بن لُوَی اَے بنی مُرّہ، اَے آلِ قُصَیّ، اَے بنی عبدِ مناف، اَے بنی عبد شمس، اَے بنی ہاشم، اَے آلِ عبدالمطلب۔ اِسی طرح قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپؐ نے آواز دی۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب صبح تڑکے کسی اچانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اُس کا پتہ چل جاتا وہ اِسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے۔ چنانچہ حضورؐ کی اِس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے اور جو خود نہ آسکا اُس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا: "لوگو، اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اِس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے؟" سب نے کہا: "ہاں، ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو۔" آپؐ نے فرمایا: "اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اُس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے کر آئیں اور تم لوگ دُنیا کا وبال سر پر اُٹھائے ہوئے آؤ۔ اُس وقت تم پکارو گے یا محمدؐ، مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے مُنہ

پھیروں۔ البتہ دنیا میں میرا اور تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلہ رحمی کروں گا۔" (اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی، اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت زُہیر بن عَمروؓ اور حضرت قَبیصہؓ بن مُخارِق سے مروی ہیں)۔ ⑤

ابن عباسؓ سے متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایت محدثین نے نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپؐ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپ نے صبح سویرے کوہِ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا: یا صباحاہ (ہائے صبح کی آفت)۔ عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لیے آتے دیکھ لیتا تھا۔ حضورؐ کی یہ آواز سُن کر لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کون پکار رہا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے۔ اِس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپؐ کی طرف دوڑ پڑے۔ جو خود آسکتا تھا وہ خود آیا، اور جو نہ آسکتا تھا اُس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے لے کر پکارا "اے بنی ہاشم، اے بنی عبدالمطلب، اے بنی فِہر، اے بنی فلاں، اے بنی فلاں، اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے؟" لوگوں نے کہا "ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔" آپؐ نے فرمایا "تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے۔" اِس پر قبل اِس کے کہ کوئی اور بولتا، حضورؐ کے اپنے چچا ابولہب نے کہا تَبًّا لَّكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ "ستیاناس جائے تیرا، کیا اِس لیے تُو نے ہمیں جمع کیا تھا؟" ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اُس نے پتھر اٹھایا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھینچ مارے (مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر وغیرہ)۔ ⑥

ابن سعد نے ابن عباسؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ کوہِ صفا پر حضورؐ نے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ "اللہ نے مجھے اپنے قریب ترین عزیزوں کو خبردار کر دینے کا حکم دیا ہے، اور تم قریش کے لوگ میرے اقارب ہو۔ میں تم کو اللہ سے کچھ دلوانے اور آخرت میں تمہیں کسی حصہ سے بہرہ ور کرنے کا اختیار نہیں رکھتا الا یہ کہ تم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے قائل ہو جاؤ۔ تب میں تمہارے رب کے ہاں تمہارے حق میں اس کی شہادت دوں گا، اور اِس کلمہ کی بدولت عرب تمہارے تابع اور عجم تمہارے مطیع ہو جائیں گے۔" اس پر ابولہب بول اٹھا "ناس جائے تیرا، کیا اِس لیے تُو نے ہمیں جمع کیا تھا؟"

ابولہب کا کردار

اِس طرح ابولہب[1] نے اوّل روز ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر باندھ لی اور آگے ہم

---

[1] اِس شخص کا اصل نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا، اور اس کی کنیت ابوعُتبہ تھی، لیکن اس کے چمکتے ہوئے سُرخ و سفید

بلکہ وہ آپؐ کے ساتھ، اور آپؐ کی وجہ سے خود اپنے خاندان کے ساتھ ایسی شدید دشمنی کرتا رہا جو کوئی بدتر سے بدتر دشمن کر سکتا تھا۔ اگرچہ بنی ہاشم میں سے ایک اور شخص ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب بھی حضورؐ کا مخالف ہو گیا تھا، مگر اوّل تو اس کی مخالفت اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ ۲۰ سال تک آپؐ کی اور آپؐ کے اصحاب کی ہجو میں اشعار کہتا رہا، اور ہجرت کے بعد لڑائیوں میں آپؐ کے خلاف شریک ہوتا رہا۔ دوسرے، اس میں اور ابولہب میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ آخر کار اُس کا دل اسلام کا قائل ہو گیا، چنانچہ قبل اس کے کہ مکہ فتح ہوتا وہ خود اپنے بال بچوں کو لے کر ابواء کے مقام پر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر لی (رضی اللہ عنہ)۔[۶] لیکن ابولہب کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے نہ صرف انسانیت کی بلکہ عرب کی معروف و مسلّم اخلاقی روایات کی بھی ساری حدیں توڑ ڈالیں اور حضورؐ کی دشمنی میں آدمیت و شرافت سے گزر کر کمینہ پن پر اُتر آیا، درانحالیکہ آپؐ کا اور اس کا خون کا رشتہ تھا اور اس رشتہ داری کی وجہ سے اس کی مخالفت، دوسروں کی مخالفت کی بہ نسبت دین کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن رہی تھی۔ (۷)

یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کے تمام اَعدائے اسلام میں سے صرف ابولہب ہی ایک شخص ہے جس کا نام لے کر قرآن مجید میں اُس کی مذمّت کی گئی ہے حالانکہ مکہ میں بھی اور ہجرت کے بعد مدینے میں بھی بہت سے ایسے لوگ تھے جو اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں اُس سے کسی طرح کم نہ تھے۔ سوال یہ ہے

۵۔ رنگ کی وجہ سے یہ ابولہب (شعلہ رُو) مشہور ہو گیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ خود عبدالمطلب اسے ابولہب کہتے تھے اس لیے یہ نام ایسا مشہور ہُوا کہ اصل نام اِس کے نیچے دب گیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

۶۔ طبقات ابن سعد طبع بیروت، جلد ۴ صفحہ ۴۹-۵۰۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ صاحب حضورؐ کے چچازاد بھائی بھی تھے اور حلیمہ سعدیہ کا دودھ پینے کی وجہ سے دودھ شریک بھائی بھی۔ جاہلیت کے زمانے میں آپؐ سے بڑی محبت کرتے تھے مگر بعثت کے بعد سخت مخالف ہو گئے تھے۔ بلاذری نے انساب الاشراف (جلد اوّل صفحہ ۲۷ طبع مصر) میں بھی قریب قریب یہی کچھ لکھا ہے۔ البتہ اس میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت عباس کی سفارش پر حضورؐ نے ان کو معاف فرمایا۔ نیز اُس میں ابواء پر ان کی حاضری کو ایک کمزور قول کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے، اور ترجیح اس قول کو دی گئی ہے کہ یہ عفو تقصیر کی درخواست لے کر ثنیّۃ العُقاب (مکہ اور مدینے کے درمیان جحفہ کے قریب ایک مقام) پر حاضر ہوئے تھے۔ یاقوت نے بھی مُعجم البلدان میں یہی روایت نقل کی ہے۔

(حاشیہ از مؤلف)

کہ اس شخص کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر قرآن میں اس کا نام لے کر اس پر اظہارِ غضب کیا گیا ؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت کے عربی معاشرے کو سمجھا جائے اور اس پس منظر میں ابولہب کے کردار کو دیکھا جائے ۔

قرآن میں ابُولَہَب کا نام لے کر اس کی مذمّت کرنے کی وجہ

قدیم زمانے میں چونکہ پورے ملکِ عرب میں ہر طرف بدامنی ، غارت گری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی ، اور صدیوں سے حالت یہ تھی کہ کسی شخص کے لیے اُس کے اپنے خاندان اور خونی رشتہ داروں کی حمایت کے سوا جان و مال اور عزّت و آبرو کے تحفّظ کی کوئی ضمانت نہ تھی ، اس لیے عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلۂ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک) کو بڑی اہمیّت حاصل تھی ، اور قطعِ رحمی کو بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا ۔ عرب کی اِنہی روایات کا یہ اثر تھا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جب اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضورؐ کی شدید مخالفت کی مگر بنی ہاشم اور بنی المُطّلب (ہاشم کے بھائی مُطّلب کی اولاد) نے نہ صرف یہ کہ آپؐ کی مخالفت نہیں کی ، بلکہ وہ کھلم کھلا آپ کی حمایت کرتے رہے ، حالانکہ اُن میں سے اکثر لوگ آپؐ کی نبوّت پر ایمان نہیں لائے تھے ۔ قریش کے دوسرے خاندان خود بھی حضورؐ کے اِن خونی رشتہ داروں کی حمایت کو عرب کی اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے ، اِسی وجہ سے انہوں نے کبھی بنی ہاشم اور بنی المُطّلب کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم ایک دوسرا دین پیش کرنے والے شخص کی حمایت کر کے اپنے دینِ آبائی سے منحرف ہو گئے ہو ۔ وہ اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو وہ کسی حالت میں اُس کے دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتے ، اور اُن کا اپنے عزیز کی پشتیبانی کرنا قریش اور اہلِ عرب ، سب کے نزدیک بالکل ایک فطری امر تھا ۔

اس اخلاقی اصول کو جسے زمانۂ جاہلیّت میں بھی عرب کے لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے ، صرف ایک شخص نے اسلام کی دشمنی میں توڑ ڈالا ، اور وہ تھا ابولہب بن عبد المُطّلب ۔ یہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا چچا تھا حضورؐ کے والدِ ماجد اور یہ ایک ہی باپ کے بیٹے تھے ، اگرچہ مائیں دونوں کی مختلف تھیں ۔ عرب میں چچا کو باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا ، خصوصاً جبکہ بھتیجے کا باپ وفات پا چکا ہو تو عربی معاشرے میں چچا سے یہ توقّع کی جاتی تھی کہ وہ بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا ۔ لیکن اس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبّت میں ان تمام عربی روایات کو پامال کر دیا ۔

حضورؐ کا بدترین ہمسایہ

مکہ میں ابولہب حضورؐ کا قریب ترین ہمسایہ تھا۔ دونوں کے گھر ایک دیوار بیچ واقع تھے۔ اس کے علاوہ حکم بن عاص (مروان کا باپ)، عُقبہ بن ابی مُعیط، عدی بن حمراء الثقفی اور ابن الاصداء الہُذلی بھی آپؐ کے ہمسائے تھے[1]۔ یہ لوگ گھر میں بھی حضورؐ کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ آپؐ کبھی نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اُوپر سے بکری کا اوجھ آپ پر پھینک دیتے۔ کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے۔ حضورؐ باہر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے "اے بنی عبد مناف یہ کیسی ہمسائگی ہے؟" ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل (ابوسُفیان کی بہن) نے تو یہ مستقل وتیرہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ راتوں کو آپؐ کے گھر کے دروازے پر خاردار جھاڑیاں لا کر ڈال دیتی تاکہ صبح سویرے جب آپؐ یا آپؐ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چبھ جائے (بیہقی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ابن عساکر، بلاذری، ابن ہشام)۔

حضورؐ کی صاحبزادیوں کو ابولہب کا اپنے بیٹوں سے طلاق دلوانا

ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عُتبہ اور عُتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں[2]۔ نبوت کے بعد جب حضورؐ نے اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی تو اس شخص نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ اور عُتیبہ تو جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز حضورؐ کے سامنے آکر اس نے کہا کہ میں اَلنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی اور اَلَّذِیْ دَنَا فَتَدَلّٰی کا انکار کرتا ہوں، اور یہ کہہ کر اس نے حضورؐ کی طرف تھوکا جو آپ پر نہیں پڑا۔ حضورؐ نے فرمایا خدایا، اس پر اپنے کتوں میں سے

---

[1] ابن سعد کا بیان ہے کہ ان میں سے بھی ابولہب اور عُقبہ زیادہ قریبی ہمسائے تھے۔ چنانچہ وہ حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا میں دو بدترین ہمسایوں کے درمیان تھا، ایک ابولہب، دوسرے عُقبہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کا مکان مکہ میں ان دونوں کے گھروں کے درمیان واقع تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] طبرانی میں قتادہ کی روایت ہے کہ حضرت اُمِّ کلثومؓ کا نکاح عُتیبہ سے اور حضرت رُقیہؓ کا عُتبہ سے ہوا تھا۔ ابن قُتیبہ نے المعارف میں اور سُہیلی نے روض الانف میں بھی یہی لکھا ہے مگر ابن اسحاق نے شک کے ساتھ بیان کیا ہے کہ عُتبہ کا نکاح حضرت رُقیہؓ کے ساتھ ہوا تھا یا حضرت اُمِّ کلثومؓ کے ساتھ۔ ابن قُتیبہ نے معارف میں اور زرقانی نے شرح مواہب میں اور طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ابھی رخصتی کی نوبت نہ آئی تھی کہ ابولہب نے دونوں صاحبزادیوں کو طلاق دلوا دی۔ اس کے بعد حضورؐ نے حضرت رُقیہؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

ایک کتے کو مسلط کر دے۔ اس کے بعد عتیبہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دوران سفر میں ایک ایسی جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھی اہلِ قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو، کیونکہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بددعا کا خوف ہے[1]۔ اس پر قافلے والوں نے عتیبہ کے گرد ہر طرف اپنے اونٹ بٹھا دیے اور پڑ کر سو رہے۔ رات کو ایک شیر آیا اور سارے شتروں کے حلقے میں سے گزر کر اس نے عتیبہ کو پھاڑ کھایا (الاستیعاب لابن عبدالبر، الاصابہ لابن حجر، انساب الاشراف للبلاذری، دلائل النبوۃ لابی نعیم الاصفہانی، روض الانف للسہیلی۔ روایات میں یہ اختلاف ہے کہ بعض راوی طلاق کے معاملے کو اعلانِ نبوت کے بعد کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ کے نزول کے بعد پیش آیا تھا۔ اس امر میں بھی اختلاف کیا گیا ہے کہ یہ ابولہب کا لڑکا عتبہ تھا یا عتیبہ۔ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ فتح مکہ کے بعد عتبہ نے اسلام قبول کر کے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ لڑکا عتیبہ تھا)۔

حضورؐ کے صاحبزادے کی وفات پر اظہارِ مسرت کرنا

اس کے خبثِ نفس کا یہ حال تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسمؓ کے بعد دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کا بھی انتقال ہو گیا تو یہ اپنے بھتیجے کے غم میں شریک ہونے کے بجائے خوشی خوشی دوڑا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور ان کو خبر دی کہ لو آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بے نام و نشان ہو گئے۔

دعوتِ اسلامی کے کام میں رکاوٹیں ڈالنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے، یہ آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپ کی بات سننے سے روکتا۔ ربیعہ بن عباد (یا عباد) الدیلی[2] بیان کرتے ہیں کہ میں نوعمر تھا جب اپنے باپ کے ساتھ ذوالمجاز کے بازار میں گیا۔ وہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کہہ رہے تھے "لوگو، کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، فلاح پاؤ گے۔" آپ کے پیچھے پیچھے ایک شخص کہتا جا رہا تھا کہ "یہ جھوٹا ہے، دینِ آبائی سے پھر گیا ہے۔" میں نے پوچھا یہ کون شخص ہے؟ لوگوں

---

[1] اس کے معنی یہ ہیں کہ کم بخت دل میں آپ کی بزرگی کا بھی قائل تھا اور ڈرتا تھا کہ آپ کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی بددعا رائگاں نہیں جا سکتی۔ (حاشیہ از مترجم)

[2] ابن اسحاق نے عباد اور ابن ہشام نے عَبّاد لکھا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

نے کہا یہ اِن کا چچا ابُولہب ہے (مُسند احمد، طبرانی، بیہقی)۔ دوسری روایت انہی حضرت ربیعہ سے یہ ہے کہ میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں "اے بنی فلاں، مَیں تمہاری طرف اللہ کا رسُول ہُوں، تمہیں ہدایت کرتا ہُوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تم میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو تاکہ مَیں وہ کام پُورا کروں جس کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے"۔ آپ کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ "اے بنی فلاں، یہ تم کو لات اور عُزّیٰ سے پھیر کر اُس بدعت اور گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے جسے یہ لے کر آیا ہے۔ اس کی بات ہرگز نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو"۔ مَیں نے اپنے باپ سے پُوچھا یہ کون ہے۔ انہوں نے کہا یہ اِن کا چچا ابولہب ہے (مُسند احمد، طبرانی، ابنِ ہشام، طبری)۔ طارق بن عبداللہ المحاربی کی روایت بھی اسی سے ملتی جُلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں مَیں نے ذوالمجاز کے بازاروں میں دیکھا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آوازِ بلند پکارتے جا رہے ہیں کہ "لوگو، لا الٰہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے"۔ اور پیچھے پیچھے ایک شخص چل رہا ہے جو آپ کو پتھر مارتا جاتا ہے، یہاں تک کہ آپ کی ایڑیاں خون سے تر ہو گئی ہیں، اور وہ کہتا جاتا ہے کہ "یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ مانو"۔ مَیں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابُولہب ہے (ابنِ ابی شیبہ، ابو یعلیٰ، ابنِ حِبّان، حاکم، طبرانی۔ اس روایت کو نسائی اور ابنِ ماجہ نے بھی مختصراً نقل کیا ہے)۔

شعبِ ابی طالب کے محاصرے میں اس کا رویّہ

نبوّت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی المطّلب کا معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور یہ دونوں خاندان رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہُوئے شعبِ ابی طالب میں محصُور ہو گئے تو تنہا یہی ابُولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے کفارِ قریش کا ساتھ دیا۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا اور اس دوران میں بنی ہاشم اور بنی المطّلب پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ مگر ابُولہب کا حال یہ تھا کہ جب مکّہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شعبِ ابی طالب کے محصُورین میں سے کچھ لوگ خوراک کا سامان خریدنے کے لیے اُس کے پاس جاتے تو یہ تاجروں سے پکار کر کہتا کہ ان سے اِتنی قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، تمہیں جو خسارہ بھی ہو گا اسے میں پُورا کروں گا۔ چنانچہ وہ بے تحاشا قیمت طلب کرتے اور خریدار بیچارے اپنے بھوک سے تڑپتے ہُوئے بال بچّوں کے پاس خالی ہاتھ پلٹ جاتا۔ پھر ابُولہب انہی تاجروں سے وہی چیزیں بازار کے بھاؤ خرید لیتا (ابنِ سعد و ابنِ ہشام)۔

اس کی مخالفت دعوتِ اسلامی کے کام میں کیا رکاوٹ ڈال رہی تھی

مکّہ سے باہر کے اہلِ عرب حج کے لیے آتے، یا مختلف مقامات پر لگنے والے بازاروں میں جمع ہوتے

اُن کے سامنے جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اپنا چچا آپ کے پیچھے لگ کر آپ کی مخالفت کرتا، تو وہ عرب کی معروف روایات کے لحاظ سے یہ بات خلافِ توقع سمجھتے تھے کہ کوئی چچا بلا وجہ دوسروں کے سامنے خود اپنے بھتیجے کو بُرا بھلا کہے اور اسے پتھر مارے اور اس پر الزام تراشیاں کرے۔ اس وجہ سے وہ ابولہب کی بات سے متاثر ہو کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں شک میں پڑ جاتے اور کہتے کہ آپ کے رشتہ دار آپ کو زیادہ جانتے ہیں۔ (۸)

اس کی بیوی کا رویّہ

ابولہب کی بیوی جسے سورۂ لہب میں حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ (لکڑیاں ڈھونے والی، یا لگائی بجھائی کرنے والی) کہا گیا ہے بنی اُمیّہ میں سے ابوسفیان کی بہن تھی۔ اصل نام اس عورت کا اَروٰی تھا اور اُمّ جمیل اس کی کُنیت تھی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ عداوت میں یہ اپنے شوہر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ جب سورۃ اللّھب نازل ہوئی اور اُمّ جمیل نے اس کو سُنا تو وہ بھری ہُوئی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تلاش میں نکلی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھی بھر پتھر تھے تاکہ ان سے آپ کو مارے اور وہ آپ کی ہجو میں اپنے ہی کچھ اشعار پڑھتی جاتی تھی۔ حرم میں پہنچی تو وہاں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضورؐ تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ، یہ آرہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر یہ کوئی بیہودگی کرے گی۔ حضورؐ نے فرمایا یہ مجھ کو نہیں دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا کہ آپؐ کے موجود ہونے کے باوجود وہ آپؐ کو نہ دیکھ سکی اور اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ میں نے سُنا ہے تمہارے صاحب نے میری ہجو کی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا، اس گھر کے خدا کی قسم اُنہوں نے تو تمہاری کوئی ہجو نہیں کی۔ اس پر وہ واپس چلی گئی (ابن ابی حاتم، ابن ہشام۔ بزار نے حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی اس سے ملتا جلتا واقعہ نقل کیا ہے)۔ (۹)

ابُولہب کا انجام

اگرچہ قرآن مجید میں سورۂ لہب کے نزول پر ابولہب اور اس کی بیوی اور اس کے گھر والے بہت بلبلائے، مگر اس میں جو کچھ فرمایا گیا تھا وہ پتھر کی لکیر تھا۔ فرمایا گیا "ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ" یہ ایک پیشین گوئی تھی جو صیغۂ ماضی میں اس لیے بیان کی گئی کہ اس کا پُورا ہونا ایسا یقینی تھا جیسے کہ وہ پُوری ہو چکی۔ ہاتھ ٹوٹنے سے مراد جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں بلکہ کسی شخص کا اپنے اُس مقصد میں قطعی ناکام ہو جانا ہے جس کے لیے اس نے اپنا پُورا زور لگا دیا ہو۔

ہ حضرت ابوبکرؓ کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ ہجو تو اللہ تعالیٰ نے کی ہے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے نہیں کی۔ (حاشیہ از مرتّب)

چنانچہ واقعی یہی ہُوا کہ حضور کی مخالفت شروع کرنے کے بعد چند سال ہی کے اندر ابولہب ایسی ناکامی سے دوچار ہُوا جو سخت عبرتناک تھی۔ جنگِ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام کی دشمنی میں اس کے ساتھی تھے۔ مکّہ میں اِس شکست کی خبر پہنچی تو اُس کو اتنا رنج ہُوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ موت بھی اس کو عَدَسَہ (Malignant Pustule) نامی بیماری سے آئی جو طاعون جیسی چھوت کی بیماری ہے۔ اُس کے گھر والوں تک نے اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا کیونکہ انہیں چھُوت لگنے کا ڈر تھا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور اس کی بُو پھیلنے لگی۔ آخر جب لوگوں نے اُس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے تو ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے کچھ حبشیوں کو اُجرت دے کر اس کی لاش اُٹھوائی اور انہی مزدوروں نے اُسے دفن کیا۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اُسے ڈھانک دیا۔ پھر اُس کی مزید اور مکمل شکست اِس طرح ہُوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اُسی دین کو اس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی دُرَّہؓ ہجرت کر کے مکّہ سے مدینے پہنچیں اور اسلام لائیں۔ پھر فتح مکّہ کے موقع پر اس کے دونوں بیٹے عُتبہؓ اور مُعتّبؓ حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضورؐ کے سامنے پیش ہُوتے اور ایمان لا کر انہوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ (۱۰)

تبلیغِ عام

اپنے خاندان، اور قبیلے کے لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچانے سے فارغ ہو کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مکّے اور عرب کے لوگوں میں عام تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور جب تک آپؐ مکّہ میں مقیم رہے، دس سال مسلسل ہر حال میں اور ہر جگہ لوگوں کو قرآن سُناتے اور اللہ کا دین قبول کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ نجی مجلسوں میں بھی، برسرِ عام بھی، حرم میں بھی، آپؐ نے یہ کام جاری رکھا اور کوئی طاقت آپؐ کو اس سے باز نہ رکھ سکی۔ باہر سے جو لوگ تجارت، یا عُمرہ و زیارت یا کسی اور غرض سے مکّے آتے ان سے بھی آپؐ ملاقاتیں کرتے رہے۔ عُکاظ، مَجَنّہ اور ذِی المَجاز[1] کے میلوں میں بھی جا جا کر قبائل کے لوگوں کو دینِ حق کی طرف بُلاتے رہے۔ اور حج کے زمانے

---

[1] منیٰ کے علاوہ یہ تین مقامات ایسے تھے جہاں عرب کے ہر حصّے کے لوگ آتے اور بڑے بڑے میلے لگتے تھے۔ سب سے بڑا میلہ عُکاظ کے مقام پر لگتا تھا جو (اُونٹ کی رفتار کے مطابق) طائف سے ایک دن اور مکّہ سے تین دن کی مسافت پر واقع تھا۔ یہاں شوال کے آغاز سے آخر تک بہت بڑا اجتماع ہوتا تھا جس میں صرف خرید و فروخت ہی نہ ہوتی تھی بلکہ شاعر و خطیب اور قبائل کے سردار سب ہی آتے تھے۔ شاعری اور خطابت کے مقابلے ہوتے تھے۔ قبائل کے آپس کے جھگڑے بھی طے ہوتے تھے اسیروں کی

میں جب لوگ منیٰ میں قیام کرتے تھے اُس وقت بھی آپ ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے اور خاص و عام سب کو پیغامِ حق پہنچانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے تھے خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے، خاموشی سے سن لے یا تلخ جواب دے دے، سختی سے پیش آئے یا اشقیائے قریش آپ کی مزاحمت کریں، آپ کو اپنے کام سے کام تھا اور اس سے کوئی آپ کو نہ روک سکا۔

ابن جریر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں، اور ابن اثیر نے بھی یہی لکھا ہے کہ قریش کے معاشی و معاشرتی مقاطعے اور شعبِ ابی طالب کی محصوری کے سخت ترین زمانے میں بھی آپ دعوت و تبلیغ سے باز نہ رہے بلکہ خفیہ اور علانیہ، شب و روز دعوت دیتے رہے، قرآن مجید کی سورتیں اور آیتیں، جو اس دور میں بارش کی طرح برس رہی تھیں، انہیں آپ علی الاعلان سناتے رہے، مخالفوں کی تجویزوں کا توڑ کرتے رہے، ان کے شبہات و اعتراضات کے جوابات دیتے رہے، اور انہیں حق کا قائل کرنے کی کوشش آپ نے برابر جاری رکھی۔

ابن سعد نے لکھا ہے کہ خفیہ دعوت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد دس سال تک آپ کا یہ طریقہ رہا کہ آپ منیٰ، عکاظ، مجنّہ اور ذی المجاز میں ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر تشریف لے جاتے اور فرماتے یا ایّھا النّاس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا و تملکوا بھا العرب و تذل لکم العجم واذا اٰمنتم کنتم ملوکا فی الجنّۃ "لوگو، کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فلاح پاؤ گے اور اسی کلمے کی بدولت عرب کے حاکم بن جاؤ گے اور عجم تمہارا مطیع ہو جائے گا، اور جب تم ایمان لے آؤ گے تو جنت میں تم بادشاہ ہو گے"۔ پیچھے پیچھے ابولہب آکر جب آپ کی مخالفت کرتا تو لوگ کہتے کہ تمہارے اپنے خاندان، قبیلے اور بستی کے لوگ تم کو زیادہ جانتے ہیں جب انہوں نے تمہاری پیروی قبول نہ کی تو ہم کیسے کریں۔ یہ جواب سن کر حضور بس یہ کہہ کر رہ جاتے اللّٰھم لو شئت لم یکونوا ھکذا "خداوندا، اگر تو چاہتا تو یہ ایسے نہ ہوتے"۔

طبرانی نے حُریث بن الحرث اور منیب الازدی سے قریب قریب ایک ہی مضمون کی روایتیں نقل کی ہیں جن میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے ایک جگہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو توحید کی دعوت دے رہے ہیں اور فرماتے جاتے ہیں کہ لوگو، کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فلاح پاؤ گے۔ اس پر لوگ آپ کو اذیتیں

چھڑانے کے لیے فدیے بھی ادا کیے جاتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے خلاف لوگوں کے دعوے بھی پنچایتوں کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ پھر یکم ذی القعدہ سے مرّ الظہران (موجودہ وادیِ فاطمہ) میں لوگ جمع ہونے شروع ہوتے اور ذی القعدہ کے آخری دس دنوں میں مجنّہ نامی پہاڑ کے قریب میلہ لگتا، پھر ذی الحجہ کے پہلے آٹھ دنوں میں منیٰ اور عرفات کے درمیان ذی المجاز کا آخری میلہ لگتا تھا جس کے بعد ایامِ حج شروع ہو جاتے اور منیٰ میں تمام ہونے تک ملک بھر کے قبائل جمع رہتے تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

دے رہے ہیں۔ کوئی تھوک رہا ہے اور کوئی آپ پر خاک پھینک رہا ہے اور کوئی آپ کو گالیاں دے رہا ہے یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی اور وہ لوگ چلے گئے۔ پھر ایک لڑکی پانی کا ایک بڑا پیالہ اور رومال لیے ہوئے آئی جس کا گلا سامنے سے کھلا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی پیا اور وضو فرمایا۔ پھر لڑکی سے کہا بیٹی، اپنا گلا ڈھانکو۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ ان کی صاحبزادی زینبؓ ہیں۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضورؐ ہر میلے اور اجتماع میں تشریف لے جاتے اور اپنی دعوت پیش کرتے تھے۔ اسی طرح مکہ میں جو قابلِ ذکر شخص بھی عرب کے کسی مقام سے آتا آپ اس سے ملتے اور اسے خدا کا دین پہنچاتے تھے۔

ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں کہ حضورؐ شب و روز خفیہ اور علانیہ دعوت دیتے رہے اور کسی کے روکے نہ رُکے۔ لوگوں کی مجلسوں اور محفلوں اور مجمعوں میں جاتے اور دعوت دیتے۔ میلوں اور حج کی اقامت گاہوں میں جاتے اور دعوت دیتے۔ آزاد و غلام، ضعیف، قوی، غنی، فقیر غرض ہر طبقے کے لوگوں سے ملتے اور اللہ کی طرف بلاتے۔

ان تاریخی بیانات کی پوری تائید قرآن مجید کی مکی سورتوں سے ہوتی ہے جو قریش کے اعتراضات و الزامات کے جوابوں سے بھری پڑی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کھلم کھلا اُن کو نہ سنایا گیا ہوتا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت تسلیم کرنے کی دعوت علی الاعلان اُن کو نہ دی ہوتی تو وہ آپ پر، قرآن پر، آخرت پر، اور اسلام کی تعلیمات پر اعتراضات، الزامات اور شبہات کی بوچھاڑ کیسے اور کیوں کرتے؟ اور پھر اُن کے جوابات قرآن میں دینے کا حاصل کیا تھا اگر وہ معترضین کو سنائے نہ جاتے؟

حضورؐ کا اخلاقی رُعب

سوال یہ ہے کہ آخر وہ بات کیا تھی جس کی وجہ سے قریش کے لوگ نہ حضورؐ کو حرم میں نماز پڑھنے سے روک سکے اور نہ علانیہ قرآن سنانے سے باز رکھ سکے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں ہی اُن کو سخت ناگوار تھیں، اور کوئی دوسرا مسلمان ان میں سے کوئی فعل کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، یا جرأت کرتا تو سخت مار کھائے بغیر نہ رہ سکتا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اصل وجہ صرف یہی نہ تھی کہ بنی ہاشم اور بنی المطلب حضورؐ کی حمایت میں کٹ مرنے کے لیے تیار تھے اور قریش کے لوگ اس کی وجہ سے خائف تھے۔ بلکہ اس کا سبب حضورؐ کا وہ زبردست رُعب بھی تھا جو قریش کے لوگوں پر طاری تھا۔ وہ آپ کی دعوت پر بُری طرح پیچ و تاب کھاتے تھے، گالیاں دیتے تھے، پتھر مارتے تھے، ہر طرح سے آپ کی دل آزاری کرتے تھے، مگر اس رُعب نے ان کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا تھا کہ وہ آپ کو رسالت کے کام سے روک دینے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

اس رُعب کے کئی وجوہ تھے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ بچپن سے مسلسل آپ کے متعلق ایسی باتیں اُن کے علم و مشاہدے اور تجربے میں آئی رہی تھیں جن کے باعث پُوری قوم آپ کے متعلق پہلے سے یہ جانتی تھی کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت ہے جو اُن کے ہاں پیدا ہُوئی ہے۔ اسی بنا پر نبوّت سے پہلے بھی آپؐ کا بڑا احترام مکّے میں پایا جاتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ آپؐ کی زبانِ مبارک سے کبھی کوئی غلط بات لوگوں نے نہ سُنی تھی، اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو بات آپؐ کے منہ سے نکلتی ہے وہ پُوری ہو کر رہتی ہے۔ اسی لیے وہ ڈرتے تھے کہ کہیں آپؐ کی زبان سے اُن کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو اُن کی شامت لے آئے۔ ابھی چند سطور پہلے یہ قصہ گزر چکا ہے کہ ابُولہب جیسے دشمن نے جب اپنے بیٹے کے حق میں حضورؐ سے بددُعا کا کلمہ سُنا تو وہ خوف زدہ ہوگیا۔ شام کے سفر میں اپنے ساتھیوں سے اُس نے کہا کہ اس لڑکے کی حفاظت میں میری مدد کرو، کیونکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے متعلق جو بات کہی ہے اس کی وجہ سے مجھے اس کی جان کا ڈر ہے۔ مگر اس کی ساری احتیاطیں لاحاصل ثابت ہوئیں اور اس لڑکے کو واقعی خدا کے ایک شیر نے اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر پھاڑ کھایا۔

تیسری وجہ حضورؐ کا بے داغ کردار تھا جس پر حرف رکھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ آپؐ کا بلند ترین اور پاکیزہ ترین اخلاق تھا جس کی ساری قوم معترف تھی، آپؐ کا حُسنِ سلوک تھا جس سے مکّے اور اطرافِ مکّہ کے سیکڑوں لوگ فیضیاب ہو چکے اور ہو رہے تھے، آپؐ کی صداقت، دیانت اور امانت تھی جس کی وجہ سے دُشمن بھی آپؐ پر اعتماد کرتے تھے، حتیٰ کہ مدینہ کی طرف ہجرت کرتے وقت تک بھی ابنِ جریر کے بقول حالت یہ تھی کہ مکّے میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنی کسی قیمتی چیز کی حفاظت کا خواہشمند ہو اور وہ اس امانت کی حفاظت کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر بھروسہ کر سکتا ہو۔

اس اخلاقی رُعب کی وجہ سے آپؐ کے بدترین دشمن بھی آپؐ کے مقابلے میں اکڑ سی گُم کر بیٹھتے تھے اور آپؐ کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ اس کا اندازہ ان واقعات سے کیا جا سکتا ہے جو ابوجہل جیسے شدید اور جری دشمن کے ساتھ آپؐ کو پیش آتے۔ (۱۴)

ابوجہل کی مرعُوبیت کا ایک واقعہ

ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ ایک دفعہ اراش[1] کا ایک شخص کچھ اُونٹ لے کر مکّہ آیا۔ ابوجہل نے اُس کے اُونٹ خرید لیے اور جب اُس نے قیمت طلب کی تو ٹال مٹول کرنے لگا۔ اراشی نے تنگ آکر ایک روز حرمِ کعبہ میں قریش کے سرداروں کو جا پکڑا اور مجمعِ عام میں فریاد شروع کر دی۔ دوسری طرف حرم کے ایک گوشے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سردارانِ قریش نے اُس شخص سے کہا کہ "ہم کچھ نہیں کر سکتے، دیکھو، وہ صاحب جو اُس کونے میں بیٹھے ہیں، اُن سے جا کر کہو، وہ تم کو تمہارا روپیہ دلوا دیں گے۔" اراشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا، اور

[1] یہ ایک مقام کا نام ہے جہاں کا ... کا نام بھی اراش ہی ہے (حاشیہ زرقانی)

قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا "آج لطف آئے گا"۔ اراشی نے جا کر حضورؐ سے اپنی شکایت بیان کی آپؐ اُسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اُسے ساتھ لے کر ابوجہل کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرداروں نے پیچھے ایک آدمی لگا دیا کہ جو کچھ گزرے اس کی خبر لاکر دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ابوجہل کے دروازے پر پہنچے اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس نے پوچھا "کون؟" آپؐ نے جواب دیا "محمدؐ"۔ وہ حیران ہو کر باہر نکل آیا۔ آپؐ نے اُس سے کہا "اس شخص کا حق ادا کر دو"۔ اس نے جواب میں کوئی چون و چرا نہ کی، سیدھا اندر گیا اور اُس کے اونٹوں کی قیمت لاکر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ قریش کا مخبر یہ حال دیکھ کر حرم کی طرف دوڑا اور سرداروں کو سارا ماجرا سنا دیا اور کہنے لگا کہ واللہ آج وہ عجیب معاملہ دیکھا ہے جو کبھی نہ دیکھا تھا، حکم بن ہشام (ابوجہل) جب نکلا تو محمد کو دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا اور جب محمد نے اُس سے کہا کہ اس کا حق ادا کر دو تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُس کے جسم میں جان نہیں ہے (ابن ہشام، جلد ۲، ص ۲۹-۳۰۔ بلاذری نے بھی اَنساب الاشراف، جلد اول میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ ص ۱۲۸-۱۲۹) (۴۳)

دوسرا واقعہ

دوسرا واقعہ قاضی ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب اَعلام النُّبوّۃ میں لکھا ہے۔ ابوجہل ایک یتیم کا وصی تھا۔ وہ بچہ ایک روز اِس حالت میں اُس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اُس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اسے کچھ دے دے۔ مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہِ شرارت اُس سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر شکایت کر، وہ ابوجہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بے چارہ ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے کیا تعلق ہے اور یہ بدبخت اُسے کس غرض کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضورؐ کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپ سے بیان کیا۔ آپؐ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپؐ کو دیکھ کر اس نے آپؐ کا استقبال کیا اور جب آپ نے فرمایا کہ اس بچے کا حق اِسے دے دو تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لاکر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزیدار جھڑپ کی امید کر رہے تھے۔ مگر جب انہوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے اور اُسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے؟ اس نے کہا خدا کی قسم میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دائیں اور بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا اگر میں نے ذرا بھی ان کی مرضی کے خلاف حرکت کی۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیسا زبردست رعب آپ کے دشمنوں تک پر طاری تھا۔ (۱۳)

تیسرا واقعہ

بلاذری کا بیان ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاص مسجد حرام میں تشریف فرما تھے کہ بنی زبید کا ایک آدمی آیا اور اس نے کہا، قریش کے لوگو، تمہارے ہاں کون تجارتی مال لانے کی ہمت کرے گا جبکہ باہر سے آنے والوں کو تم لوگ لوٹ لیتے ہو؟ حضور نے پوچھا تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟ اس نے کہا ابو الحکم (یعنی ابوجہل) نے۔ اس نے میرے تین بہترین اونٹ خریدنے کی خواہش ظاہر کی اور ان کی قیمت بہت کم لگائی۔ اب اس کے مقابلے میں کوئی شخص ان اونٹوں کی اس کی لگائی ہوئی قیمت سے زیادہ پر خریدنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور اس قیمت پر بیچ دوں تو سخت نقصان اٹھاؤں۔ حضور نے اس سے تینوں اونٹ خود خرید فرما لیے۔ ابوجہل دور بیٹھا ہوا خاموشی سے یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ حضور اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا خبردار جو تم نے پھر کسی کے ساتھ ایسی حرکت کی جو اس غریب بدو کے ساتھ کی ہے، ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا۔ وہ کہنے لگا آئندہ میں کبھی ایسا نہ کروں گا۔ اس پر امیہ بن خلف اور دوسرے مشرکین جو وہاں موجود تھے، ابوجہل کو شرم دلانے لگے کہ تم نے محمدؐ کے سامنے ایسی کمزوری دکھائی کہ شبہ ہوتا ہے، شاید تم ان کی پیروی اختیار کرنے والے ہو۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں ان کی کبھی پیروی نہ کروں گا۔ مگر میں نے دیکھا کہ ان کے دائیں اور بائیں کچھ نیزہ بردار کھڑے ہیں اور میں ڈرا کہ میں نے محمدؐ کے حکم کی ذرا سرتابی کی تو وہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ (انساب الاشراف۔ جلد اول۔ ص ۱۳۰)

مخالفین آپؐ کی صداقت کے معترف تھے

اس کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ حضورؐ کے شدید ترین مخالفین بھی دلوں میں حضورؐ کی صداقت کے معترف تھے، اور اپنے آپ کو جھوٹا جانتے تھے۔ مگر ضد، ہٹ دھرمی، جاہلانہ حمیت، دین آبائی کے تعصب، اور اپنی اغراض کی خاطر مخالفت کر رہے تھے۔ یہ کمزوری جن لوگوں کے دلوں میں موجود تھی، وہ آپ کی راہ روکنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر سکتے تھے، مگر آپ کو سچا اور اپنے آپ کو جھوٹا جانتے ہوئے ان کے اندر آپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس سلسلے میں متعدد تاریخی مثالیں ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ یہاں صرف ابوجہل کے متعلق ہم بتانا چاہتے ہیں کہ حضور کا یہ سب سے بڑا دشمن کس طرح بار بار آپ کی صداقت کا اعتراف کر چکا تھا، اور اپنی مخالفت کے اصلی وجوہ کس بھونڈے طریقے سے بیان کرتا تھا۔

بیہقی نے زید بن اسلم کے حوالے سے حضرت مغیرہ بن شعبہ کا بیان نقل کیا ہے کہ اپنے زمانۂ شرک میں ایک

مرتبہ اُن کی ملاقات حضورؐ سے کس طرح ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اور ابوجہل مکہ کے ایک راستے سے گزر رہے تھے۔ اِتنے میں حضورؐ ہمیں مل گئے۔ آپؐ نے ابوجہل سے فرمایا "اے ابوالحکم، آؤ اللہ اور اس کے رسول کی طرف، میں تمہیں اللہ کی طرف بُلاتا ہوں"۔ وہ بولا "اے محمدؐ کیا تم ہمارے معبودوں کی بُرائی کرنے سے باز آتے ہو؟ تم یہی چاہتے ہو نا کہ ہم اِس بات کی شہادت دے دیں کہ تم نے بات پہنچا دی؟ تو ہم شہادت دیے دیتے ہیں کہ تم نے بات پہنچا دی۔ مگر خدا کی قسم اگر میں جانتا کہ تم حق پر ہو تو میں تمہاری پیروی اختیار کر لیتا"۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے روانہ ہو گئے۔ پھر ابوجہل میری طرف پلٹا اور بولا "خدا کی قسم، میں جانتا ہوں کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وہ حق ہے، لیکن ایک چیز مجھے روکتی ہے۔ قُصَیّ کی اولاد نے کہا کہ حجابت ہم میں رہے گی۔ ہم نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا سقایت بھی ہم میں رہے گی۔ ہم نے اس کو بھی مان لیا۔ انہوں نے کہا ندوہ بھی ہم ہی میں ہو گا۔ ہم نے اسے بھی تسلیم کیا۔ پھر انہوں نے کہا لِوا بھی ہمارے ہی پاس رہے گا۔ ہم نے اس پر بھی ہاں کر دی۔ پھر انہوں نے بھی کھانے کھلائے اور ہم نے بھی کھلائے یہاں تک کہ جب ہمارے گھٹنے اُن کے گھٹنوں سے ٹکرانے لگے تو وہ کہتے ہیں ہم میں ایک نبی ہے۔ خدا کی قسم یہ میں نہیں مانوں گا"۔

ابن ابی حاتم نے ابویزید مدنی کے حوالہ سے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ابوجہل سے حضورؐ کی ملاقات ہوگئی اور اس نے آپؐ سے مصافحہ کیا۔ ایک شخص نے اس سے کہا کہ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں کہ تم اس صابی (بے دین) سے پھرے ہوئے آدمی سے مصافحہ کر رہے ہو؟ ابوجہل نے علیحدگی میں اُس سے کہا "بخدا میں جانتا ہوں کہ واقعی یہ نبی ہیں، مگر ہم کب سے بنی عبد مناف کے تابع ہوئے ہیں"۔

امام سفیان ثوری، ترمذی، اور حاکم نے حضرت علیؓ کی روایت بیان کی ہے کہ ابوجہل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "ہم تمہیں جھوٹا قرار نہیں دیتے، مگر جو کچھ تم پیش کر رہے ہو اسے جھٹلاتے ہیں"۔

بیہقی اور ابن ہشام نے ابن اسحاق سے اور انہوں نے امام زہری سے یہ دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک روز رات کو ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق الگ الگ نکلے تاکہ رات کی نماز میں حضورؐ جو قرآن پڑھتے ہیں اسے سنیں۔ تینوں کو ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ صبح ہوئی تو انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا، باہم ملامت کی اور عہد کیا کہ پھر ایسا نہ کریں گے، کیونکہ اگر لوگوں نے ہمیں اس طرح قرآن سنتے دیکھ لیا تو ان کے دلوں میں یہ بات گھر کر جائے گی۔ دوسرے روز پھر ایسا ہی ہوا اور صبح ایک دوسرے کو دیکھ کر انہوں نے پھر عہد کیا کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے۔ تیسرے روز جب پھر وہی کچھ ہوا جس کے نہ کرنے کا انہوں نے عہد کیا تھا تو اخنس اپنی لاٹھی سنبھال کر پہلے ابوسفیان کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ "ابوحنظلہ، مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ جو کچھ تم نے سنا ہے اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" اس نے کہا "ابوثعلبہ، واللہ میں نے وہ باتیں

سنتی ہیں جنہیں میں سمجھتا ہوں، اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ان سے مراد کیا ہے، اور کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن کے معنی و مراد کو میں نہیں سمجھتا۔" اخنس نے کہا "میرا بھی یہی حال ہے"۔[1] پھر وہ ابوجہل کے پاس گیا اور کہا "ابوالحکم، جو کچھ تم نے محمدؐ سے سُنا ہے اُس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" اس نے کہا "سُنا کیا ہے؟ ہم میں اور بنی عبد مناف میں مقابلہ تھا کہ کون شرف میں بڑھ کر ہے۔ انہوں نے بھی کھانے کھلائے اور ہم نے بھی۔ انہوں نے بھی ذمہ داریوں کے بار اٹھائے اور ہم نے بھی اٹھائے۔ انہوں نے بھی مال دیے اور ہم نے بھی دیے۔ یہاں تک کہ جب ہم اور وہ برابر کی ٹکر ہو گئے تو وہ کہنے لگے کہ ہم میں ایک نبی ہے جس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ اب یہ ہم کہاں سے لائیں۔ خدا کی قسم ہم اسے نہیں مانیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے۔" تقریباً یہی بات ابوجہل نے اخنس بن شریق سے اُس وقت بھی کہی جب وہ جنگ بدر کے موقع پر اُس سے تنہائی میں ملا تھا۔ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں سُدّی کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ اخنس نے اُس سے کہا "اِس وقت میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا نہیں ہے۔ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ محمدؐ صادق ہیں یا کاذب؟" اس نے جواب دیا "خدا کی قسم محمدؐ صادق ہیں، وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے ہیں، مگر جب بنی قُصَیّ لِواء اور حجابت اور سقایت کے ساتھ نبوت بھی لے جائیں تو باقی قریش کے لیے کیا رہ گیا؟" یہ جب ابوجہل جیسے سخت معاند کا حال تھا، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باقی دشمنانِ اسلام کا کیا حال ہوگا؟

---

[1] اِصابہ میں حافظ ابن حجرؒ نے امام زہری کی جو روایت اِس قصّے کے متعلق حضرت سعید بن المُسَیَّب سے نقل کی ہے اس میں یہ ہے کہ ابوسفیان نے اخنس سے پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ اُس نے کہا کہ میں تو اسے حق سمجھتا ہوں۔ اِس کی مزید تائید حضرت معاویہؓ کی اُس روایت سے ہوتی ہے جسے طبرانی نے اوسط میں نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے باپ ابوسفیان میری ماں ہند کو اپنے ساتھ ایک گدھی پر بٹھائے ہوئے اپنے صحرائی علاقے کی طرف جا رہے تھے اور میں ایک گدھی پر ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں راستے میں مل گئے۔ میرے والد نے مجھ سے کہا، معاویہ، تم اُتر جاؤ تاکہ محمدؐ تمہاری گدھی پر سوار ہو جائیں۔ چنانچہ میں اُتر گیا اور آپؐ اس پر سوار ہو گئے۔ پھر آپؐ نے میرے والد اور والدہ کو مخاطب کر کے فرمایا "اے ابوسُفیان، اور اے ہند بنت عُتبہ، خدا کی قسم تم سب لوگ ایک وقت مرو گے، پھر دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے، پھر جو نیک ہے وہ جنت میں جائے گا اور جو بد ہے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔" پھر آپؐ نے سورۂ حٰم السجدہ کی ابتدائی گیارہ آیات ان کو سنائیں۔ اس کے بعد آپؐ گدھی پر سے اُتر گئے اور میں سوار ہو گیا۔ راستے میں میری ماں نے میرے باپ سے کہا اِس ساحر کذاب کے لیے تم نے میرے بیٹے کو سواری سے اُتارا تھا؟ باپ نے کہا خدا کی قسم، یہ شخص نہ ساحر ہے نہ کذاب۔

(حاشیہ از مؤلف)

حضورؐ کے متعلق قریش کا اعتقاد

اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ قریش کے وہی لوگ جو آپ کی مخالفت میں سرگرم تھے، اپنے دلوں میں حضورؐ کی بزرگی کے بھی قائل تھے، چنانچہ عین اُس زمانے میں جبکہ آپ سے اور مسلمانوں سے اُن کی سخت کشمکش برپا تھی مکہ میں ایک ہولناک قحط پڑا جس سے ساری آبادی چیخ اٹھی۔ اُس وقت مکہ کے سربرا حضورؐ ہی کے پاس حاضر ہوتے تھے کہ آپ اپنی قوم کو اِس آفت سے نجات دلانے کے لیے دُعا فرمائیں۔ امام بخاری اور بیہقی نے تھوڑے سے لفظی اختلافات کے ساتھ مسروق کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ قریش آپ کے مقابلے میں سرکشی پر تُلے ہوئے ہیں تو آپ نے دُعا کی کہ خدایا یوسف علیہ السلام کے سات سالہ قحط کی طرح ان کے لوگوں کے مقابلے میں میری بھی سات برس کے قحط سے مدد فرما۔ اس پر ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے مُردار اور ہڈیاں اور جانوروں کی کھالیں تک کھا ڈالیں۔ آخر کار ابوسفیان اور مکہ کے دوسرے متعدد لوگ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "اے محمدؐ، آپ تو کہتے ہیں کہ میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور حال یہ ہے کہ آپ کی قوم ہلاک ہوئی جا رہی ہے۔ آپ اس کے حق میں دعا کریں"۔ اس پر آپ نے دُعا کی اور خوب بارش ہوئی یہاں تک کہ لوگ کثرتِ باراں کی شکایت لے کر آئے۔ تب آپ نے دُعا فرمائی اَللّٰھُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا (خدایا ہمارے گرد و پیش ہو، ہم پر نہ ہو)۔ اس کے بعد بادل چھٹ گئے۔ امام بخاری نے ابن عباسؓ سے بھی یہ روایت نقل کی ہے کہ ابوسفیان حضورؐ کے پاس بھوک کی فریاد لے کر آیا، کیونکہ قحط کے مارے لوگوں نے جب کچھ نہ پایا تو صوف تک کھانے لگے تب حضورؐ نے دُعا فرمائی اور اللہ نے قحط کی مصیبت دُور فرما دی۔

اِن واقعات سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ قریش کے سردار براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹکرانے اور آپ کو تبلیغ عام سے زبردستی روک دینے کی کبھی ہمت نہ کر سکتے تھے لیکن اس کے ساتھ اُن کو یہ بھی کسی طرح گوارا نہ تھا کہ یہ تبلیغ ہوتی رہے۔ ان کے دینِ آبائی کی بیخ کنی ہوتی رہے، ان کے نظامِ زندگی کے بالکل برعکس ایک دوسرا نظام فروغ پاتا رہے، اور لوگ اسلام قبول کرتے رہیں۔ اس لیے ان کا فیصلہ بہر حال یہی تھا کہ اس دعوت کو کسی طرح چلنے نہیں دینا ہے اور ہر قیمت پر اسے زک دینی ہے۔ اسی غصّے میں وہ کبھی حضورؐ پر بھی دست درازی کر بیٹھتے تھے، جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ (۱۴)

حوالہ جات باب (۷)

(۱) اضافہ از مؤلف
(۲) تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۃ العلق
(۳) اضافہ از مؤلف
(۴) تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، خلاصہ حاشیہ ۳۵
(۵) 〃 〃 〃 〃 〃 〃
(۶) 〃 ، جلد ششم، دیباچہ سورۃ اللہب
(۷) اضافہ از مؤلف
(۸) تفہیم القرآن، جلد ششم، خلاصہ دیباچہ سورۃ اللہب
(۹) 〃 〃 〃 〃 اللہب حاشیہ ۳
(۱۰) 〃 〃 〃 〃 〃 خلاصہ حاشیہ ۱
(۱۱) اضافہ از مؤلف
(۱۲) تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء حاشیہ ۵
(۱۳) 〃 ، جلد ششم، الماعون حاشیہ ۵
(۱۴) اضافہ از مؤلف

باب (۸)

دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے قریش کی تدبیریں

اس بحث سے پہلے ابتدا ہی میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ سارے قبیلۂ قریش کا رویہ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں یکساں نہ تھا، بلکہ لوگ مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔

ایک طبقہ شدید ترین مخالفین کا تھا جو زیادہ تر بڑے بڑے سرداروں پر مشتمل تھا۔ ابن سعد نے طبقات میں ان لوگوں کے نام یہ لکھے ہیں: ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبدیغوث (یہ بنی زہرہ میں سے حضورؐ کا ماموں زاد بھائی تھا)۔ حارث بن قیس بن عدی (جو بنی سہم میں سے تھا اور ابن الغیطلہ کے نام سے مشہور تھا)، ولید بن مغیرہ (بنی مخزوم میں سے)، اُمیہ بن خلف اور اُبی بن خلف (بنی جمح میں سے)، ابوقیس بن فاکہ بن مغیرہ (بنی مخزوم میں سے)، عاص بن وائل سہمی (یہ عمرو بن العاص کا باپ تھا)، نضر بن الحارث (بنی عبدالدار میں سے)، منبہ بن الحجاج (بنی سہم میں سے)، زہیر بن ابی امیہ (بنی مخزوم میں سے۔ یہ ام سلمہؓ کا باپ شریک بھائی تھا)، سائب بن صیفی بن عابد (بنی مخزوم میں سے)، اسود بن عبدالاسد مخزومی، عاص بن سعید بن العاص (بنی امیہ میں سے)، ابوالبختری عاص بن ہشام (بنی اسد میں سے)، عقبہ بن ابی مُعیط (بنی امیہ میں سے)، ابن الاصدی (یا الاصداء) الہذلی، حکم بن ابی العاص (بنی امیہ میں سے، یہ مروان کا باپ تھا)، عدی بن حمراء الثقفی۔

دوسرا طبقہ اُن بہت سے سرداران قریش کا تھا جو دشمن تو ضرور تھے، مگر ایسے دشمن نہ تھے کہ متقدم الذکر گروہ کی طرح ہاتھ دھو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے ہوں۔ البتہ اسلام کے خلاف جو کارروائیاں کی جاتی تھیں ان میں وہ دشمنوں کا ساتھ دیتے تھے۔ ابن سعد نے عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ (بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے) اور ابوسفیان بن حرب (بنی امیہ میں سے) کو ایسے ہی دشمنوں میں شمار کیا ہے۔ تاہم جو لوگ سے کم مخالف تھے ان کا طرز عمل بھی قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ (ہود: ۵) "دیکھو، یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اُس سے چھپ جائیں"۔ یعنی یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی دعوت سے ایسے بیزار ہیں کہ آپ سے کتراتے ہیں، کہیں آپ کو بیٹھے دیکھتے ہیں تو اُلٹے پھر جاتے ہیں، کبھی آپ کو سامنے سے آتے دیکھتے ہیں تو رُخ بدل لیتے یا کپڑے کی اوٹ میں مُنہ چھپا لیتے ہیں، تاکہ آمنا سامنا نہ ہو جائے اور آپ انہیں مخاطب کر کے کچھ بات نہ کرنے لگیں۔

رہے عام اہلِ مکہ، تو ان میں سے کچھ غیر جانبدار رہے، کچھ دلوں میں اسلام کے قائل ہو گئے تھے مگر اپنا اسلام چھپائے ہوئے تھے، کچھ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، اور ایک بڑی تعداد اپنے سرداروں کے بھڑکانے سے دینِ آبائی کی حمیت میں مبتلا ہو کر اُن شرارتوں میں شریک ہو جاتی تھی جو اسلام کے خلاف کی جاتی تھیں۔

اب ہم اُن تدابیر کو الگ الگ بیان کرتے ہیں جو مخالفین نے اسلام کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے اختیار کیں۔

حضورؐ سے مصالحت کی کوششیں

چونکہ مخالفین حضورؐ کی غیر معمولی شخصیت اور قرآن کی بے پناہ تاثیر کو محسوس کرتے تھے، اِس لیے انہوں نے بار بار یہ کوشش کی کہ آپ سے بات چیت کر کے آپ کو دین کے معاملہ میں کسی نہ کسی طرح مصالحت پر راضی کر لیں۔ اِس غرض کے لیے ان کے متعدد وفود بھی آپ سے ملے اور خاص خاص اشخاص نے بھی مل کر بات کی۔

عُتبہ بن رَبیعہ کی آپؐ سے ملاقات

اِن ملاقاتوں میں سے ایک اہم ملاقات عُتبہ بن ربیعہ کی تھی جس کو مختلف محدثین نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے، مگر ماحصل میں زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن عمرؓ سے اور عبد بن حُمید، ابو یعلیٰ اور بیہقی نے جابرؓ بن عبداللہ انصاری سے روایت کیا ہے کہ ایک روز قریش کے کچھ لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھو، تم میں کون سب سے زیادہ سحر، کہانت اور شعر کا جاننے والا ہے۔ وہ اِس شخص کے پاس جائے جس نے ہماری جماعت میں پھوٹ ڈال دی ہے، ہمارے معاملات میں خرابی برپا کر دی ہے اور ہمارے دین کو عیب لگایا ہے، اور اس سے بات کر کے دیکھے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ایسا آدمی ہمارے نزدیک عُتبہ بن ربیعہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ سب نے کہا ابوالولید، تم یہ کام کرو، اور وہ آپ کے پاس گیا۔ (۱)

دوسری روایت محمد بن اسحاق اور بیہقی نے محمد بن کعب القرظی سے نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجدِ حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے ایک دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہؓ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اِس موقع پر عُتبہ بن ربیعہ (ابو سفیان کے خُسر) نے سردارانِ قریش

سے کہا کہ صاحبو، اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں، شاید کہ وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آجائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ "ابوالولید تم پر پورا اطمینان ہے، ضرور جا کر اُس سے بات کرو۔" عتبہ اُٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اُس نے کہا "بھتیجے، ہمارے ہاں تم کو جو عزت حاصل تھی وہ تم خود جانتے ہو۔ اور نسب میں بھی تم ایک شریف ترین گھرانے کے فرد ہو۔ تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو؟ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بے وقوف ٹھیرایا۔ قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی بُرائی کی۔ اور ہمارے باپ دادا جو مر چکے ہیں، ان سب کو تم نے کافر اور گمراہ ٹھیرایا۔ اب تم ذرا میری بات سنو۔ میں کچھ تجویزیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ ان پر غور کرو۔ شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابوالولید آپ کہیں، میں سنوں گا۔" اُس نے کہا "بھتیجے یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے، اس سے تمہارا مقصد اگر مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دیے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں، کسی معاملے کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو اور تمہیں سوتے اور جاگتے میں واقعی کچھ نظر آنے لگا ہے تو ہم بہترین اطبا بلواتے ہیں اور سب مل کر اپنے خرچ پر تمہارا علاج کراتے ہیں۔" عتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضورؐ خاموش سُنتے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا "ابوالولید آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے یا ابھی اور کچھ کہنا ہے؟" اُس نے کہا "بس جو کچھ کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔" آپؐ نے فرمایا "اچھا، اب میری سنیے۔" اس کے بعد آپؐ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورۃ حٰم السجدہ کی تلاوت شروع کی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سُنتا رہا۔ آیت سجدہ (آیت ۳۸) پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا "ابوالولید، میرا جواب آپ نے سُن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔" عتبہ اٹھ کر سردارانِ قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دُور سے اُس کو دیکھتے ہی کہا، خدا کی قسم، عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے، یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔ پھر جب وہ آ کر بیٹھا تو لوگوں نے کہا "کیا سُن آئے؟" اُس نے کہا "بخدا، میں نے ایسا کلام سُنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سُنا تھا۔ خدا کی قسم، نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے نہ کہانت۔ اے اہلِ قریش، میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو، اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی، اور اس کی عزت تمہاری عزت ہی ہو گی۔" سردارانِ قریش اُس کی یہ بات سُنتے ہی بول اُٹھے "ولید کے ابا، آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔"

عتبہ نے کہا "میری جو رائے تھی وہ میں نے تمہیں بتا دی، اب تمہارا جو جی چاہے کرتے رہو۔"

بیہقی نے اس واقعہ کے متعلق جو روایات جمع کی ہیں ان میں یہ اضافہ ہے کہ جب آپؐ سورۂ حم السجدہ کی آیت فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ (اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں نے تم کو اسی طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈرا دیا ہے جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا) پر پہنچے تو عتبہ نے بے اختیار آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہنے لگا کہ "ایسی بات نہ کہو" اور اپنی اس حرکت کا سبب اس نے لوگوں کو یہ بتایا کہ "تم لوگ جانتے ہو کہ محمدؐ جب کوئی بات کہتے ہیں تو وہ جھوٹی نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے عذاب کا خوف ہوا۔" (۲)

ایک اور وفد کی ملاقات

محمد بن اسحاق ابن عباسؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، نضر بن حارث، ابوالبختری بن ہشام، اسود بن المطلب، زمعہ بن الاسود، ولید بن مغیرہ، ابوجہل، عبداللہ بن ابی امیہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل، اور حجاج سہمی کے بیٹے نبیہ اور منبہ غروب آفتاب کے بعد کعبہ کے پاس جمع ہوئے اور آپس میں کہا کہ محمدؐ کو بلا کر بات کرو اور ان سے بحث کر کے اپنی حجت پوری کر دو۔ چنانچہ حضورؐ کو پیغام بھیجا گیا کہ آپؐ کی قوم کے اشراف جمع ہوئے ہیں تاکہ آپؐ سے بات کریں۔ حضورؐ چونکہ ان لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے خود بے چین تھے اس لیے آپ فوراً تشریف لے آئے۔ ان لوگوں نے کہا "محمدؐ، ہم نے تم کو اس لیے بلایا ہے کہ تمہارے معاملہ میں اپنی طرف سے حجت پوری کر دیں۔ واللہ، ہم نہیں جانتے کہ عرب میں سے کسی شخص نے اپنی قوم میں وہ فتنہ ڈالا ہو جو تم نے اپنی قوم میں ڈالا ہے۔ تم نے باپ دادا کو برا کہا، دین میں عیب نکالا، لوگوں کو بے وقوف ٹھیرایا، معبودوں کی برائی کی، جماعت میں پھوٹ ڈال دی، اور کوئی قبیح بات ایسی نہ رہی جو تم ہمارے اور اپنے درمیان نہ لے آئے۔ اگر تم یہ سب کچھ مال کی طلب میں کر رہے ہو تو ہم اپنے مال جمع کر کے تم کو اتنا دے دیں گے کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ اگر تم ہم میں اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ حتیٰ کہ ہم کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے)۔ اور اگر تم بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تم کو بادشاہ بنائے لیتے ہیں لیکن اگر یہ کوئی جن تم پر آتا ہے جو تم پر مسلط ہو گیا ہے تو ہم اپنے مال صرف کر کے تمہارے علاج کا بندوبست کرتے ہیں تاکہ تم اس کی گرفت سے چھوٹ جاؤ، یا کم از کم ہماری طرف سے عذر پورا ہو جائے۔" جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ "مجھے وہ کوئی مرض لاحق نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو، نہ میں جو چیز تمہارے پاس لایا ہوں وہ اس لیے لایا ہوں کہ تم سے تمہارے مال طلب کروں، یا تم میں شرف حاصل کروں، یا تمہارا بادشاہ بن جاؤں۔ بلکہ اللہ نے

مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر ایک کتاب نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے لیے بشیر (ایمان لانے پر خوشخبری دینے والا) اور نذیر (ایمان نہ لانے پر ڈرانے والا) بنوں۔ چنانچہ میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیے اور تمہیں نصیحت کر دی۔ اب اگر تم اس چیز کو قبول کرو جو میں تمہارے پاس لایا ہوں تو وہ تمہارے لیے دنیا اور آخرت میں خوش نصیبی ہے۔ اور اگر تم اسے رد کرتے ہو تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔" اس پر کفار کے سرداروں نے حضورؐ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کیا (جن کا ذکر جگہ جگہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے اور جن کا جواب بھی قرآن ہی میں دے دیا گیا ہے اس لیے یہاں ہم ان کو درج نہیں کر رہے ہیں)۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق سے اس واقعہ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ معجزات کے یہ مطالبے سن کر حضورؐ نے فرمایا "میں ان کاموں کے لیے تمہارے پاس نہیں بھیجا گیا ہوں۔ میں نے وہ باتیں تمہارے سامنے پیش کر دی ہیں جن کے لیے مجھے اللہ نے بھیجا ہے"۔ آخرکار ان لوگوں نے حضورؐ کو یہ دھمکی دی کہ واللہ ہم تم کو اور تمہاری ان کارروائیوں کو جو تم ہمارے درمیان کر رہے ہو یونہی نہیں چھوڑیں گے تا آنکہ یا ہم تمہیں ختم کر دیں یا تم ہمیں ختم کر دو۔ (۳)

مصالحت کی چند اور کوششیں

اس کے علاوہ بھی متعدد مواقع پر قریش کے سردار حضورؐ کے سامنے متعدد تجویزیں پیش کرتے رہے کہ آپ کسی بات پر راضی ہو جائیں اور آپ کی اور ان کی کشمکش ختم ہو جائے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ کو اتنا مال دیے دیتے ہیں کہ آپ مکے کے سب سے زیادہ مالدار آدمی بن جائیں۔ آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کیے دیتے ہیں۔ ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں، تو ہم ایک اور تجویز آپ کے

---

۳ مثال کے طور پر قرآن میں فرمایا گیا: وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الانعام آیت ۷)۔ "اگر ہم تیرے اوپر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی کتاب نازل کر دیتے اور یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جن لوگوں نے نہیں مانا وہ کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے"۔ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ (الحجر آیت ۱۴-۱۵)۔ "اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ اس میں چڑھنے لگتے تو یہ کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے"۔

سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔ حضورؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عزیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا ٹھیرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔ اس پر وحی نازل ہوئی، قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ، لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ۔ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۞ کہدو کہ اے کافرو، میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔" اور یہ کہ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْۤنِّيْۤ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ (الزمر، آیت ۶۴)۔ "ان سے کہو: اے نادانو، کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کروں؟" (ابن جریر (فی التفسیر والتاریخ)، ابن ابی حاتم، طبرانی)۔

ابن عباسؓ کی ایک اور روایت یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے حضورؐ سے کہا "اے محمدؐ، اگر تم ہمارے معبودوں کو چوم لو تو ہم تمہارے معبود کی عبادت کریں گے۔" اس پر یہ سورۂ کافرون نازل ہوئی۔ (عبد بن حمید)

سعید بن میناء (ابوالبختری کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن المطلب اور اُمیہ بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپؐ سے کہا "اے محمدؐ، آؤ ہم تمہارے معبود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو، اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمہیں شریک کیے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز جو تم لے کر آئے ہو اُس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے تو ہم تمہارے ساتھ اس میں شریک ہوں گے اور اپنا حصہ اُس سے پالیں گے۔ اور اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے اُس سے بہتر ہوئی جو تم

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی درجہ میں بھی اس تجویز کو قابلِ قبول کیا معنی قابلِ غور بھی سمجھتے تھے، اور آپؐ نے معاذ اللہ کفار کو یہ جواب اس امید پر دیا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی منظوری آ جائے۔ بلکہ دراصل یہ بات بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی ماتحت افسر کے سامنے کوئی بے جا مطالبہ پیش کیا جائے اور وہ جانتا ہو کہ اس کی حکومت کے لیے یہ مطالبہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ مگر وہ خود صاف انکار کر دینے کے بجائے مطالبہ کرنے والوں سے کہے کہ میں آپ کی درخواست اوپر بھیج دیتا ہوں، جو کچھ وہاں سے جواب آئے گا وہ آپ کو بتا دوں گا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ ماتحت افسر اگر خود ہی انکار کر دے تو لوگوں کا اصرار جاری رہتا ہے، لیکن اگر وہ بتائے کہ اوپر سے حکومت کا جواب ہی تمہارے مطالبہ کے خلاف آیا ہے تو لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

لائے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گئے اور اس سے اپنا حصہ پا لو گے"۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمائی کہ قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ (ابن جریر۔ ابن ابی حاتم۔ ابن ہشام اور بلاذری نے بھی اِس واقعہ کو نقل کیا ہے)۔

وَہب بن مُنَبِّہ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کہا اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں (عبد بن حمید۔ ابن ابی حاتم)۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفارِ قریش نے حضورؐ کے سامنے اس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دوٹوک جواب دے کر ان کی اِس امید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم دین کے معاملہ میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر ان سے کوئی مصالحت کر لیں گے۔ (۳)

۲۔ جناب ابوطالب پر دباؤ ڈالنے کی کوششیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کو روکنے کے لیے قریش کی دوسری تدبیر یہ تھی کہ پے درپے ابوطالب سے مل کر ان پر بھی دباؤ ڈالیں کہ وہ آپؐ کی حمایت چھوڑ دیں، اور ان کے ذریعہ سے حضورؐ پر بھی دباؤ ڈلوائیں کہ آپ اپنے کام سے باز آ جائیں۔

پہلا وفد

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ قریش نے جب دیکھا کہ ابوطالب حضورؐ کی حمایت کر رہے ہیں اور آپ کو اُن باتوں سے نہیں روکتے جو انہیں سخت ناگوار ہیں تو اشرافِ قریش کا ایک وفد ان کے پاس گیا جس میں بنی عبدِ شمس بن عبدِ مناف میں سے عُتبہ بن ربیعہ اور شَیبہ بن ربیعہ، بنی اُمیّہ میں سے ابوسفیان، بنی اسد بن عبدالعُزّیٰ میں سے ابوالبَختری عاص بن ہشام اور اَسوَد بن المُطّلب، بنی مخزوم میں سے ابوجہل اور وَلید بن مُغیرہ، بنی سَہم میں سے حجاج کے بیٹے نُبَیہ اور مُنَبِّہ اور اُنہی میں سے عاص بن وائل شامل تھے۔ انہوں نے کہا کہ "اے ابوطالب، آپ کے بھتیجے نے ہمارے معبودوں کی بُرائی کی، ہمارے دین میں عیب نکالا، ہماری عقلوں کو حماقت قرار دیا، ہمارے باپ دادا کو گمراہ ٹھیرایا۔ اب یا تو آپ اسے ہماری دل آزاری سے روکیں، یا ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جائیں، کیونکہ آپ خود بھی تو ہماری طرح اس کے لائے ہوئے دین کے خلاف ہیں۔ پھر ہم اُس سے نمٹ لیں گے"۔ ابوطالب نے ان کو بہت نرم جواب دے کر اور اچھی اچھی باتیں کر کے ٹھنڈا کیا اور وہ چلے گئے (ابن ہشام، طَبَری)۔

البدایہ والنہایہ)۔

دوسرا وفد

پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کام جاری رکھا اور قریش کے سردار اس پر اُبلتے رہے تو آخر ان سے صبر نہ ہو سکا اور ایک دوسرا وفد لے کر وہ ابوطالب کے پاس گئے اور کہا کہ اے ابوطالب، آپ ہمارے درمیان سن رسیدہ بزرگ ہیں، شرف اور قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپ اس کی حمایت سے باز آ جائیں، مگر آپ باز نہ آئے۔ ہم سے اپنے باپ دادا کی بُرائی اور اپنی عقلوں کی توہین اور اپنے معبودوں کی عیب چینی برداشت نہیں ہو سکتی۔ اب یا تو آپ اسے روکیں، یا پھر ہمارا اور آپ کا مقابلہ ہوگا یہاں تک کہ فریقین میں سے کوئی ایک ہلاک ہو جائے۔ اس کے بعد روایات میں اختلاف ہے۔

امام بخاریؒ نے تاریخ میں اور حافظ ابویعلیٰ نے اپنی مُسند میں عقیل بن ابی طالب کی جو روایت نقل کی ہے اُس میں یہ ہے کہ ان لوگوں کی موجودگی ہی میں میرے والد نے مجھ سے کہا کہ جا کر محمدؐ کو بلا لاؤ۔ میں جا کر گیا میں ان کو تلاش کر کے لے آیا۔ آپؐ تشریف لائے تو ابوطالب نے کہا کہ بھتیجے تمہارے بنی عم مجھ سے تمہارے متعلق یہ شکایت کر رہے ہیں کہ تم انہیں ان کی مجلسوں میں اور مسجد (یعنی مسجد حرام) میں اذیت دیتے ہو تم ان کو اذیت دینا بند کر دو۔ اس پر حضورؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور قریش کے سرداروں سے فرمایا آپ لوگ یہ سورج دیکھ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا جس طرح یہ سورج آپ لوگوں سے اپنے شعلے روک دینے پر قادر نہیں ہے اسی طرح میں بھی اس کام کو چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں۔ یہ جواب دے کر آپؐ اٹھ گئے اور آپؐ کے جانے کے بعد ابوطالب نے کہا میرے بھتیجے نے کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں کہی ہے، لہٰذا آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ طبرانی نے اَوسط اور کبیر میں بھی یہ روایت نقل کی ہے اور ابویعلیٰ نے بھی اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

ابن ہشام، طبری، بیہقی اور بلاذری نے یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُلا کر کہا "بھتیجے تمہاری قوم نے آ کر مجھ سے یہ یہ باتیں کہی ہیں۔ تم میرے لیے بھی اور اپنے لیے بھی جینے کی کچھ گنجائش باقی رہنے دو اور مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ نہ میں اُسے اٹھا سکوں اور نہ تم اٹھا سکو۔ لہٰذا اپنی قوم سے ایسی باتیں کہنا چھوڑ دو جو انہیں ناگوار ہیں"۔ ابوطالب کی یہ بات سُن کر حضورؐ نے محسوس کیا کہ چچا کے لیے اب میری حمایت کرنا مشکل ہو گیا ہے اور وہ اِس سے دست بردار ہونے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ تب آپؐ نے فرمایا "چچا جان، اگر سورج میرے سیدھے ہاتھ پر اور چاند بائیں ہاتھ پر بھی رکھ دیا جائے تو میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ یا تو اللہ اِسے کامیاب فرما دے یا میں اِس راہ میں

ہو جاؤں ۔ پھر آپ رنجیدہ ہو کر رو دیئے اور اُٹھ کر جانے لگے۔ ابو طالب نے یہ دیکھ کر کہ حضورؐ پر اِس بات کا کیسا سخت اثر ہوا ہے آپؐ کو پکارا۔ آپ پلٹ کر آئے تو انہوں نے کہا اپنا کام جاری رکھو اور جو کچھ کرنا چاہو کرو، خدا کی قسم میں کسی چیز کی وجہ سے بھی تمہیں دشمنوں کے حوالے نہ کروں گا۔

ابوجہل حضورؐ کے قتل کا ارادہ کرتا ہے

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ ابوجہل نے قریش کے لوگوں سے کہا " اے گروہِ قریش، تم نے دیکھ لیا کہ محمدؐ نے کس طرح صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ ہمارے دین کی بُرائی کرنے، ہمارے باپ دادا کو گمراہ کہنے، ہماری عقلوں کو بے عقلی قرار دینے اور ہمارے معبُودوں کو گالیاں دینے سے باز نہ آئیں گے۔ اب میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ کل میں ایک پتھر لے کر بیٹھوں گا اور جب وہ نماز میں سجدہ کریں گے تو ان کا سر کچل ڈالوں گا، پھر بنی عبد مناف جو چاہیں کریں"۔ دوسرے روز صبح کو وہ پتھر لے کر آپؐ کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ حضورؐ حسبِ عادت تشریف لاتے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ قریش کے لوگ بھی اپنی مجلسوں میں جمع ہو گئے کہ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ حضورؐ جب سجدے میں گئے تو ابوجہل پتھر لے کر آگے بڑھا، مگر یکایک وہ آپؐ کے قریب پہنچ کر پلٹا۔ وہ سخت خوفزدہ تھا، اُس کا رنگ فق تھا، اور پتھر بھی اُس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ قریش کے لوگ اُٹھ کر اُس کے پاس گئے اور پوچھا ابوالحکم، یہ تمہیں کیا ہو گیا ؟ اُس نے کہا " میں وہی کام کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا جو میں تم سے کہہ چکا تھا، مگر جب میں قریب پہنچا تو میرے آگے ایک ایسا زبردست اُونٹ آ گیا کہ میں نے کبھی اتنے بڑے سر اور ایسی گردن اور ایسی کچلیوں والا اُونٹ نہ دیکھا تھا۔ اور وہ مجھے چبا ڈالنے کے لیے تیار ہو گیا"۔ بعد میں حضورؐ نے فرمایا کہ وہ جبرئیلؑ تھے۔

تیسرا وفد

ابن سعد نے لکھا ہے کہ قریش کے شیوخ پھر ایک دفعہ ابوطالب کے پاس آتے اور اُن سے کہا کہ آپ ہمارے بڑے اور سردار ہیں، ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرتے ہیں اور آپ بھی ہمارے اور اس کے درمیان انصاف کریں۔ اپنے بھتیجے کو بلایئے اور اُس سے کہیے کہ وہ ہمارے معبُودوں کی بُرائی چھوڑ دے اور ہم اُسے اور اُس کے معبُود کو اُس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس پر ابوطالب نے حضورؐ کو بلایا اور کہا "بھتیجے، یہ تمہارے اعمام اور تمہاری قوم کے اشراف اور شیوخ آئے ہیں اور تم سے ایک انصاف کی بات طے کرنا چاہتے ہیں۔ حضورؐ نے کہا آپ لوگ فرمایئے میں سُنتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ تم ہمیں اور ہمارے معبُودوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور اُن کی بُرائی کرنے سے باز آ جاؤ۔ ہم تمہیں اور تمہارے معبُود کو تمہارے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ابوطالب نے کہا یہ تو انہوں نے انصاف کی بات کہی ہے، اسے مان لو۔ حضورؐ نے فرمایا، چچا جان، کیا میں اِس سے بہتر

چیز کی طرف انہیں نہ بلاؤں"۔ ابوطالب نے پوچھا وہ کیا بات ہے؟ حضورؐ نے فرمایا "مَیں انہیں ایک ایسے کلمے کی طرف بلاتا ہوں جس کے اگر یہ قائل ہو جائیں تو عرب کے فرمانروا بن جائیں اور عجم ان کا تابع ہو جائے"۔ ابوجہل بولا "یہ تو بڑے نفع کا سودا ہے، تمہارے باپ کی قسم ہم ایک نہیں دس ایسے کلمات کہنے کے لیے تیار ہیں"۔ حضورؐ نے فرمایا کہو لا الٰہ الا اللہ۔ اس پر وہ سب غضبناک ہو کر نفرت کے ساتھ جھٹک گئے اور کہنے لگے اِصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِھَتِکُمْ، اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ (ص۔ آیت ۶)۔ "اپنے معبودوں کی عبادت پر ڈٹے رہو، اس بات سے تو کچھ اور ہی مراد ہے"۔ (۵)

اس واقعہ کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں اور طبری نے تاریخ میں اسے زمانے کے تعیّن کے بغیر بیان کیا ہے۔ ابن اسحاق نے اسے حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد کا واقعہ بیان کیا ہے اور اسی کو زمخشری، رازی اور نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ لیکن متعدد دوسری روایات میں اسے اُس وقت کا واقعہ لکھا ہے جب ابوطالب مرضِ وفات میں مبتلا تھے۔ امام احمد، نسائی، ترمذی، بیہقی، ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم، اور ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں جو واقعہ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوطالب بیمار ہوئے اور قریش کے سرداروں نے محسوس کیا کہ اب یہ ان کا آخری وقت ہے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ چل کر شیخ سے بات کرنی چاہیے۔ وہ ہمارا اور اپنے بھتیجے کا جھگڑا چکا جائیں تو اچھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا انتقال ہو جائے اور ان کے بعد ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کریں اور عرب کے لوگ ہمیں طعنہ دیں کہ جب تک شیخ زندہ تھا، یہ لوگ اس کا لحاظ کرتے رہے اب اس کے مرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کے بھتیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا اور تقریباً ۲۵ سرداران قریش، جن میں ابوجہل، ابوسفیان، اُمیہ بن خلف، عاص بن وائل، اَسوَد بن المطلب، عُقبہ بن ابی مُعَیط، عُتبہ اور شَیبہ شامل تھے، ابوطالب کے پاس پہنچے۔ ان لوگوں نے پہلے تو حسبِ معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی شکایات بیان کیں، پھر کہا ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرنے آئے ہیں۔ آپ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اُسے اُس کے دین پر چھوڑے دیتے ہیں۔ وہ جس معبود کی عبادت کرنا چاہے کرے، ہمیں اس سے کوئی تعرّض نہیں۔ مگر وہ ہمارے معبودوں کی مذمت نہ کرے اور یہ کوشش نہ کرتا پھرے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ اس شرط پر آپ ہم سے اُس کی صلح کرا دیں۔ ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بُلایا اور آپؐ سے کہا کہ بھتیجے، یہ تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک منصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو تاکہ تمہارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ پھر انہوں نے وہ بات حضورؐ کو بتائی جو سرداران قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے جواب میں فرمایا، چچا جان، میں تو اِن کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہ مان لیں تو عرب ان کا تابع فرمان اور عجم ان کا باج گزار ہو جائے۔ یہ سُن کر پہلے تو وہ لوگ سنسٹ پٹا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیا کہہ کر ایسے ایک مفید کلمے کو رد کر دیں۔ پھر کچھ سنبھل کر بولے، تم ایک کلمہ کہتے ہو، ہم ایسے دس کلمے کہنے کو تیار ہیں، مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ کلمہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ۔ اس پر وہ سب یک بارگی اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ باتیں کہتے ہوئے نکل گئے جو سورۂ ص کے ابتدائی حصّہ میں (آیت ۴ سے ۸ تک) بیان ہوئی ہیں (۶)

چوتھا وفد

ابن ہشام، ابن جریر طبری، ابن سعد، بلاذری اور ابن کثیر نے لکھا ہے کہ قریش نے جب دیکھا کہ ابوطالب کسی طرح حضورؐ کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے اور وہ قوم کی عداوت اور اُس سے جدائی تک اپنے بھتیجے کی خاطر مول لینے پر تیار ہیں تو وہ ولید بن مُغیرہ کے بیٹے عُمارہ بن ولید کو اُن کے پاس لے گئے اور کہا کہ "اے ابوطالب یہ عُمارہ بن ولید قریش کا نہایت نام آور اور خوبصورت جوان ہے، اس کو لے کر بیٹا بنا لو اور اس کے بدلے اپنے اس بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دو جس نے تمہارے آبا و اجداد کے دین کی مخالفت کی اور تمہاری قوم میں پھوٹ ڈال دی اور ہم سب کو احمق قرار دیا۔ ہم ایک آدمی دے کر دوسرا لیتے ہیں تاکہ اسے قتل کر ڈالیں۔" ابوطالب نے جواب دیا، "واللہ تم نے بدترین سودا مجھ سے کیا۔ اپنا بیٹا مجھے دیتے ہو کہ میں اُسے پالوں، اور میرا بیٹا مجھ سے مانگتے ہو کہ تم اسے قتل کر ڈالو۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" مُطعم بن عدی نے جو ہاشم کے بھائی نوفل کی اولاد

لہ حضورؐ کے اس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا اُرِیدُھم علیٰ کلمۃٍ واحدۃٍ یقولونہا تدین لھم بہا العرب وتؤدّی الیھم بہا العجم الجزیۃ۔ دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: أدعوھم إلی ان یتکلموا بکلمۃ تدین لھم بہا العرب ویملکون بہا العجم۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے ابوطالب کے بجائے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم۔ اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: أرأیتکم ان اعطیتکم کلمۃ تکلمتم بھا ملکتم بھا العرب ودانت لکم بھا العجم۔ ان لفظی اختلافات کے باوجود مدّعا سب کا یکساں ہے، یعنی حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کروں جسے قبول کر کے تم عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر بات ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمہاری بھلائی اس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اس میں کہ جس حالت میں تم پڑے ہو اُسی میں تم کو پڑا رہنے دوں اور بس اپنی جگہ آپ ہی اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں؟ (۷)

سے تھا، کہا کہ "واللہ اُسے ابوطالب تمہاری قوم نے تو تمہارے ساتھ انصاف کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ جس مشکل کا پتہ تم چلے گئے ہو اس سے تم نکل جاؤ۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم ان کی کوئی بات قبول نہیں کرتے۔" ابوطالب نے جواب دیا کہ "واللہ انہوں نے مجھ سے کوئی انصاف نہیں کیا، مگر تم مجھے چھوڑ کر میرے خلاف اِن کا ساتھ دیتے رہتے ہو، اچھا کرو جو تمہارا جی چاہتا ہے۔" ابنِ اسحٰق کا بیان ہے کہ اس پر بات بڑھ گئی، اور لڑائی ٹھن گئی اور لوگوں نے ایک دوسرے کے مقابلے کا فیصلہ کر لیا۔

ابوطالب کا بنی ہاشم اور بنی المطّلب کو جمع کرنا

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اس کے بعد ابوطالب نے بنی ہاشم اور بنی المطّلب کو جمع کیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ سب متفق ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حمایت و حفاظت کریں گے۔ اس بات کو سب نے قبول کر لیا اور ابوطالب کا ساتھ دینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ صرف ابولہب اِس سے الگ رہا۔

قریش کو ابوطالب کی دھمکی

ابن سعد نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت زور و شور پر ہو رہی تھی اور ابھی ہجرتِ حبشہ واقع نہ ہوئی تھی، ایک روز ابوطالب اور دوسرے اہلِ خاندان حضورؐ کے مکان پر آئے اور آپ کو وہاں نہ پایا۔ ابوطالب کو شبہ ہوا کہ حضورؐ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے اسی وقت بنی ہاشم اور بنی المطّلب کے نوجوانوں کو جمع کیا اور اُن سے کہا کہ "ایک ایک خنجر یا کوئی اور ہتھیار لے کر کپڑوں میں چھپا لو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ جب میں مسجدِ حرام میں داخل ہوں تو دیکھو کہ قریش کی کونسی مجلس میں ابن الحنظلیّہ (یعنی ابوجہل) بیٹھا ہے۔ بس اُس مجلس کے کسی شخص کو جیتا نہ چھوڑنا کیونکہ لامحالہ اُسی پارٹی نے محمدؐ کو قتل کیا ہو گا۔" اس ارادے سے ابوطالب چلے۔ اتنے میں حضرت زید بن حارثہؓ مل گئے اور ان سے معلوم ہوا کہ حضورؐ بخیریت ہیں۔ دوسرے روز ابوطالب صبح کے وقت حضورؐ کے مکان پر آئے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر بنی ہاشم اور بنی المطّلب کے نوجوانوں سمیت قریش کے سرداروں کی مجلس میں پہنچے اور اُن سے کہا کہ اَے قریش کے لوگو! تمہیں کچھ معلوم ہے کہ میں نے کیا ارادہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ ابوطالب نے سارا ماجرا بیان کیا اور اپنے نوجوانوں سے کہا کہ ذرا اپنی چادریں ہٹاؤ۔ جب انہوں نے چادریں ہٹائیں تو لوگوں نے دیکھا کہ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تیز ہتھیار ہے۔ پھر ابوطالب نے کہا خدا کی قسم، اگر تم نے محمدؐ کو قتل کر دیا تو میں تم میں سے ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑوں گا یہاں تک کہ ہم لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں۔" اس واقعہ نے قریش کو احساس دلا دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور سب سے زیادہ ابوجہل کے لیے یہ واقعہ سخت ہمت شکن تھا۔

۴۔ قریش کی چھچھوری اور ذلیل حرکات

حضورؐ کے خلاف قریش کے لوگ جو حرکات کر رہے تھے ان میں سے بعض نہایت اوچھی اور چھچھوری تھیں جن سے مقصود آپ کی دل شکنی کرنا اور آپ کو تنگ کرنا تھا۔

حضرت زینبؓ کو طلاق دلوانے کی کوشش

ان میں سے ایک حرکت یہ تھی کہ قریش کے لوگوں نے حضورؐ کے داماد ابوالعاص بن الربیع پر دباؤ ڈالا کہ وہ آپ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو بھی اُسی طرح طلاق دے دیں جس طرح ابولہب نے اپنے بیٹوں سے آپ کی صاحبزادیوں حضرت رقیہؓ اور اُمِّ کلثومؓ کو طلاق دلوائی تھی۔ یہ ابوالعاص بنی عبدالعُزّٰی بن عبد شمس میں سے تھے، ان کی ماں ہالہ بنت خُویلد حضرت خدیجہؓ کی بہن تھیں، مکّہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے، اپنے مال، اپنی تجارت اور اپنی امانت کے لحاظ سے ان کا شمار شہر کے گنے چنے لوگوں میں ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کا نکاح ہو چکا تھا اور حضرت خدیجہؓ ان کو بالکل اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی تھیں۔ نبوت کے بعد اگرچہ یہ مسلمان نہ ہوئے اور اپنے شرک ہی پر قائم رہے لیکن انہوں نے قریش کے کسی دباؤ کو قبول نہ کیا اور حضرت زینبؓ کو طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا۔[1] بلاذری نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ سرداران قریش نے اُن سے کہا تم زینب کو طلاق دے دو، قریش کی جس عورت کو تم پسند کرو اس سے ہم تمہاری شادی کرائے دیتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا "خدا کی قسم میں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑوں گا، وہ بہترین بیوی ہے" یہی بات طبری اور ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے لکھی ہے، اور مزید یہ بھی بیان کیا ہے کہ قریش کے لوگ ابولہب کے بیٹے عُتبہ کے پاس گئے اور کہا کہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو چھوڑ دے، قریش کی جس عورت سے تو چاہے گا ہم تیری شادی کر دیں گے۔ اس نے کہا کہ تم سعید بن عاص، یا اس کے بیٹے اَبان کی لڑکی مجھے دلوا دو تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔ چنانچہ اس کی مرضی کی لڑکی اسے دلوا دی گئی اور اس نے حضورؐ کی صاحبزادی کو طلاق دے دی قبل اس کے کہ رخصتی کی نوبت آتی۔

آپؐ کے صاحبزادے کی وفات پر اظہار مسرت

اس سے بھی زیادہ کمینہ حرکت یہ تھی کہ حضورؐ کے پہلے صاحبزادے القاسمؓ کے کمسنی میں وفات پا جانے کے بعد

---

[1] واضح رہے کہ حضرت زینبؓ اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ ہی مسلمان ہو چکی تھیں، لیکن چونکہ اُس زمانہ میں مشرک و مومن کے درمیان نکاح کی حُرمت کا کوئی حکم نہ آیا تھا اس لیے وہ ابوالعاص کے نکاح میں رہیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

جب آپؐ کے دوسرے صاحبزادے عبداللہ کا بھی کمسنی ہی میں انتقال ہو گیا تو قریش کے لوگوں نے آپؐ کے ساتھ اس ہمدردی کا اظہار بھی نہ کیا جو شرافت و انسانیت کا کم سے کم تقاضا تھا بلکہ اُلٹی اس پر خوشیاں منائیں اور آپؐ کو اَبتر کہنا شروع کر دیا یعنی جڑ کٹا آدمی جس کے بعد اس کا کوئی نام لیوا نہ ہو۔ (۸)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ابن سعد اور ابن عساکر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے صاحبزادے حضرت قاسمؓ تھے، ان سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں اُمّ کلثومؓ، فاطمہؓ اور رقیہؓ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا پھر حضرت عبداللہ نے بھی وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا "ان کی نسل ختم ہو گئی، اب وہ اَبتر ہیں" (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی ہے)۔ بعض روایات میں اس پر مزید اضافہ یہ ہے کہ عاص نے کہا ان محمداً ابتر، لا ابن لہ یقوم مقامہ بعدہ فاذا مات انقطع ذکرہ واسترحتم منہ "محمدؐ ابتر ہیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے جب وہ مر جائیں گے تو تمہارا ان سے پیچھا چھوٹ جائے گا" عبد بن حمید نے ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے صاحبزادے عبداللہ کی وفات پر ابوجہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ شمر بن عطیہ سے ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضورؐ کے اس غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی کمینہ پن کا مظاہرہ عقبہ بن ابی مُعَیط نے بھی کیا تھا۔ عطاء کہتے ہیں کہ جب حضورؐ کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضورؐ کا اپنا چچا ابولہب (جس کا گھر بالکل حضورؐ کے گھر سے متصل تھا) دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ "خوشخبری" دی کہ بَتِرَ محمدٌ اللّیلۃ "آج رات محمدؐ لاولد ہو گئے یا ان کی جڑ کٹ گئی"۔

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضورؐ پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپ سے بگڑے تھے کہ آپؐ صرف اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرتے تھے اور ان کے شرک کو آپؐ نے علانیہ رد کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ و مقام آپؐ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپؐ سے چھین لیا گیا اور آپؐ گویا برادری سے کاٹ پھینکے گئے تھے۔ آپؐ کے چند مٹھی بھر ساتھی بھی سب بے یار و مددگار تھے اور مارے کھدیڑے جا رہے تھے۔ اس پر مزید آپؐ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی وفات سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس موقع پر عزیزوں رشتہ داروں، قبیلے اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت کے بجائے وہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور وہ باتیں بنائی جا رہی تھیں جو ایک ایسے شریف انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنے تو اپنے، غیروں تک سے ہمیشہ انتہائی نیک سلوک کیا تھا۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ کوثر میں فرمایا: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ "اے نبیؐ، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے" یہ محض کوئی جوابی حملہ نہ تھا بلکہ درحقیقت یہ قرآن کی بڑی اہم پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بحرف

صحیح ثابت ہوئی جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس وقت لوگ حضورؐ ہی کو ابتر سمجھ رہے تھے اور کوئی تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے ابتر ہو جائیں گے جو نہ صرف مکّہ میں بلکہ پورے ملک عرب میں نامور تھے، کامیاب تھے، مال و دولت اور اولاد ہی کی نعمتیں نہیں رکھتے تھے بلکہ سارے ملک میں جگہ جگہ ان کے اعوان و انصار موجود تھے، تجارت کے اجارہ دار اور حج کے منتظم ہونے کی وجہ سے تمام قبائل عرب سے ان کے وسیع تعلقات تھے لیکن چند سال نہ گزرے پائے تھے کہ حالات بالکل پلٹ گئے۔ یا تو وہ وقت تھا کہ غزوہ احزاب ۵ ہجری کے موقع پر قریش بہت سے عرب اور یہودی قبائل کو لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے اور حضورؐ کو محصور ہو کر شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی۔ یا تین ہی سال بعد وہ وقت آیا کہ ۸ ہجری میں جب آپ نے مکّہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا اور انہیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر پورا ملک عرب حضورؐ کے ہاتھ میں تھا، ملک کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفود آ کر بیعت کر رہے تھے، اور آپؐ کے دشمن بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ اُن کی اولاد اگر دُنیا میں باقی رہی بھی تو ان میں سے آج کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ابوجہل یا ابولہب یا عاص بن وائل یا عُقبہ بن ابی مُعیط وغیرہ اَعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اُس کے اَسلاف یہ لوگ تھے۔ اِس کے برعکس رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی آل پر آج دُنیا بھر میں درُود بھیجا جا رہا ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو آپؐ سے نسبت پر فخر ہے۔ لاکھوں انسان آپؐ ہی سے نہیں بلکہ آپؐ کے خاندان اور آپؐ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک سے اَنتساب کو باعثِ عزّ و شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سیّد ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے، کوئی صدّیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زبیری اور کوئی انصاری۔ مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اَبتر حضورؐ نہیں بلکہ آپؐ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔ (۹)

قرآن کی آواز سُنتے ہی شور مچا دینا

ایک اور ذلیل حرکت جو انہوں نے اختیار کر رکھی تھی وہ یہ تھی کہ جب قرآن پڑھا جاتا تو وہ شور مچانے اور ہر طرف سے دوڑ پڑتے تھے تاکہ اسے نہ خود سُنیں نہ دوسروں کو سُننے دیں۔ اس کا ذکر قرآن میں کئی جگہ کیا گیا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔

(حٰمٓ السجدہ۔ آیت ۲۶)

"یہ منکرینِ حق کہتے ہیں اس قرآن کو ہرگز نہ سُنو اور جب یہ سُنایا جائے تو اس میں خلل

ڈالو، شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ۔"

یہ کفارِ مکہ کے اُن منصوبوں میں سے ایک تھا جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کو ناکام کرنا چاہتے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ قرآن اپنے اندر کس بلا کی تاثیر رکھتا ہے، اور اس کو سنانے والا کس پائے کا انسان ہے، اور اس شخصیت کے ساتھ اُس کا طرزِ ادا کس درجہ موثر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے عالی مرتبہ شخص کی زبان سے اس دل کش انداز میں اس بے نظیر کلام کو جو سنے گا وہ آخر کار گھائل ہو کر رہے گا۔ اس لیے انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ اس کلام کو نہ خود سنو، نہ کسی کو سننے دو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی اُسے سنانا شروع کریں، شور مچاؤ، تالی پیٹ دو، آوازے کسو، اعتراضات کی بوچھاڑ کر دو، اور اتنی آواز بلند کر دو کہ اُن کی آواز اس کے مقابلے میں دب جائے۔ اس تدبیر سے وہ یہ اُمید رکھتے تھے کہ اللہ کے نبی کو شکست دے دیں گے۔ (۱۰)

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ (المعارج آیات ۳۶-۳۷)۔

"پس اے نبی کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے گروہ در گروہ تمہاری طرف دوڑے چلے آتے ہیں؟"

یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر مذاق اُڑانے اور آوازے کسنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے۔ (۱۱)

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل۔۱۱۰)

"اور اپنی نماز نہ بہت بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے۔ ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔"

مسند احمد میں ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ مکہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے گھر میں یا دارِ ارقم میں) نماز پڑھتے وقت بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے تو کفار شور مچانے لگتے اور بسا اوقات گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ اس پر حکم ہوا کہ نہ تو اتنے زور سے پڑھو کہ کفار سن کر ہجوم کر آئیں اور نہ اس قدر آہستہ پڑھو کہ تمہارے اپنے ساتھی بھی نہ سن سکیں۔ (۱۲)

قرآن کو اُلٹے معنی پہنا کر لوگوں کو بہکانا

کفارِ مکہ کی اس تدبیر کا ذکر بھی قرآن میں کیا گیا ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا أَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ أَمْ مَّنْ

يَأْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ (حٰم السجدہ آیت ۴۰)

"جو لوگ ہماری آیات کو اُلٹے معنی پہناتے ہیں وہ ہم سے کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو، تمہاری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے۔"

اِلحاد کے معنی ہیں اِنحراف، سیدھی راہ سے ٹیڑھی راہ کی طرف مڑ جانا، کج روی اختیار کرنا۔ اللہ کی آیات میں الحاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالنے کی کوشش کرے۔ آیاتِ الٰہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب تو نہ لے، باقی ہر طرح کے غلط معنی اُن کو پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے۔ کفارِ مکہ قرآنِ مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے جو چالیں چل رہے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کی آیات سن کر جاتے اور پھر کسی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر، کسی آیت میں لفظی تحریف کرکے، کسی فقرے یا لفظ کو غلط معنی پہنا کر طرح طرح کے اعتراضات جڑتے اور لوگوں کو بہکاتے پھرتے تھے کہ لو سنو آج ان نبی صاحب نے کیا کہہ دیا ہے۔

(۱۳) مسلمانوں کو فضول بحثوں میں اُلجھانا

قرآن مجید میں کفار کے اِس رویّہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُحَاۗجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔ (الشوریٰ۔ آیت ۱۶)

"اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے دین کے معاملے میں جھگڑے کرتے ہیں اُن کی حجّت بازی اُن کے رب کے نزدیک باطل ہے۔"

یہ اشارہ ہے اُس صورتِ حال کی طرف جو مکّے میں اُس وقت آئے دن پیش آ رہی تھی۔ جہاں کسی کے متعلق لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ مدتوں اس کی جان ضیق میں کیے رکھتے، نہ گھر میں اُسے چین لینے دیا جاتا نہ محلّے اور برادری میں۔ جہاں بھی وہ جاتا ایک نہ ختم ہونے والی بحث چھڑ جاتی جس کا مدعا یہ ہوتا کہ کسی طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر اُسی جاہلیت کی طرف پلٹ آئے جس سے وہ نکلا ہے۔

(۱۴) مسلمانوں کی تضحیک و تذلیل

قرآن مجید میں کفار کے اس رویّے کا بھی ذکر کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَکِهِیْنَ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۔ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حٰفِظِیْنَ (المطففین۔ آیات ۲۹ تا ۳۳)۔

"مجرم لوگ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے اور جب اُن کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے تھے، اور جب اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے، اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں۔ حالانکہ وہ اُن پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے"۔

مزے لیتے ہوئے پلٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد جب وہ اپنے گھروں کی طرف جاتے تو یہ خیال کرتے ہوئے جاتے تھے کہ آج تو مزا آگیا، ہم نے فلاں مسلمان کا مذاق اڑا کر اور اس پر آوازے اور پھبتیاں کس کر خوب لطف اٹھایا اور لوگوں میں اس کی اچھی گت بنی۔ (۱۵)

بلاذری نے انساب الاشراف میں حضرت عروہ بن زبیر کی روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمار بن یاسر، خبابؓ بن الارت، صہیبؓ بن سنان، بلالؓ بن رباح، ابو فکیہہؓ اور عامرؓ بن فہیرہ جیسے لوگوں کو قریش کے سردار مسجد حرام میں بیٹھے دیکھتے تھے تو مذاق اڑاتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ ہیں اِس شخص کے ساتھی، کیا ہمارے درمیان صرف یہی لوگ اللہ کے فضل کے مستحق رہ گئے تھے؟

ناواقف لوگوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنا

اس کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّکُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (النحل: آیت ۲۴)

"اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے، تو کہتے ہیں "اجی وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا جب اطراف و اکناف میں پھیلا تو مکے کے لوگ جہاں کہیں جاتے تھے اُن سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارے ہاں جو صاحب نبی بن کر اٹھے ہیں وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اس کے مضامین کیا ہیں؟ وغیرہ۔ اس طرح کے سوالات کا جواب کفارِ مکہ ہمیشہ ایسے الفاظ میں دیتے تھے جن سے سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی کتاب کے متعلق کوئی نہ کوئی شک بیٹھ جاتے، یا کم از کم اُس کو آپؐ سے اور آپؐ کی نبوت کے معاملے سے دلچسپی باقی نہ رہے۔

۴۔ "ثقافتی" پروگرام

ان گھٹیا تدبیروں کے علاوہ ایک اور تدبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے یہ بھی کی گئی کہ لوگوں کو قصوں کہانیوں اور گانے بجانے اور عیش و عشرت میں غرق کر کے اس قابل ہی نہ رکھا جائے کہ وہ ان سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کر سکیں جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے سامنے پیش فرما رہے تھے۔

ابن ہشام نے سیرت میں محمد بن اسحاق کی روایت نقل کی ہے کہ بنی عبدالدار کے نضر بن الحارث بن کلدہ نے قریش کے ایک مجمع میں کہا "تم لوگ محمدؐ کا مقابلہ جس طرح کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ وہ جب تمہارے درمیان نوعمر جوان تھا تو تمہارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا، سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا۔ اب جبکہ اس کے بال سفید ہونے کو آگئے اور وہ تمہارے پاس وہ چیزیں لے کر آیا جو وہ لایا ہے تو تم کہتے ہو یہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ بخدا وہ ساحر نہیں ہے، ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے اور ان کی جھاڑ پھونک سے ہم واقف ہیں۔ بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کی تک بندیاں سنی ہیں اور جیسی گول مول باتیں وہ کیا کرتے ہیں اُن کا ہمیں علم ہے۔ بخدا وہ شاعر بھی نہیں ہے، شعر کی تمام اصناف سے ہم واقف ہیں اور اس کا کلام ان میں سے کسی صنف میں نہیں آتا۔ بخدا وہ مجنون بھی نہیں ہے، مجنون کی جو حالت ہوتی ہے اور جیسی بہکی بہکی باتیں وہ کرتا ہے کیا اس سے ہم بے خبر ہیں؟ اے سردارانِ قریش، کچھ اور بات سوچو، جس چیز کا مقابلہ تمہیں درپیش ہے وہ اس سے زیادہ بڑی ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اسے شکست دے سکو"۔ اس کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی کہ عجم سے رستم و اسفندیار کے قصے لا کر پھیلائے جائیں تاکہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں اور وہ انہیں قرآن سے زیادہ عجیب معلوم ہوں۔ چنانچہ کچھ دنوں اس پر عمل کیا گیا اور خود نضر نے داستان گوئی شروع کر دی۔ (۱۷)

یہی روایت اسباب النزول میں واحدی نے کلبی اور مقاتل سے نقل کی ہے۔ اور ابن عباسؓ نے اس پر مزید اضافہ کیا ہے کہ نضر نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کسی کے متعلق وہ سنتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے اُس پر اپنی کوئی لونڈی مسلط کر دیتا اور اس سے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا اور گانا سنا تاکہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل اُدھر سے ہٹ جائے۔ (۱۸)

۵۔ جھوٹ کی مہم اور اُس کے اثرات

ان تدبیروں کے ساتھ قریش نے حضورؐ کی دعوتِ عام شروع ہوتے ہی ہر طرف آپ کے خلاف جھوٹ کی ایک مہم بھی چلا دی تاکہ لوگوں کو آپ سے بدگمان اور متنفر کیا جائے۔ اس مہم میں چونکہ صداقت کا کوئی سوال نہ تھا بلکہ

محض بدنام کرنا اور لوگوں کو آپ سے دور بھگانا مقصود تھا اس لیے جس کے منہ میں جو آتا وہ کہتا پھرتا تھا کوئی کہتا کہ آپ شاعر ہیں۔ کوئی کہتا کہ آپ کاہن ہیں۔ کوئی کہتا ساحر (جادوگر) ہیں۔ کوئی کہتا سحرزدہ ہیں یعنی کسی نے آپ پر جادو کر دیا ہے۔ کوئی کہتا کہ آپ مجنون ہیں غرض کوئی ایک بات نہ تھی جو لوگ آپ کے متعلق کہتے ہوں۔ یہ چرچے صرف مکہ کے ہر گلی کوچے میں کیے جاتے تھے بلکہ اسی قسم کی باتیں ہر اُس شخص سے کی جاتی تھیں جو مکہ میں زیارت یا تجارت یا کسی اور غرض سے آتا تھا اور کوشش کی جاتی تھی کہ کوئی آپ کی بات کسی طرح سے سننے ہی نہ پائے جس سے اس کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ (19)

پہلے حج کے موقع پر قریش کی مشاورت

چند مہینے اس حال پر گزرے تھے کہ حج کا زمانہ آ گیا اور مکے کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قافلوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر ان بھولے حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور حج کے اجتماعات میں جگہ جگہ کھڑے ہو کر قرآن جیسا بے نظیر اور مؤثر کلام سنانا شروع کر دیا، تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متاثر ہو جائے۔ ابن اسحاق، حاکم، اور بیہقی نے عمدہ سند کے ساتھ یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اس موقع پر قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اس پر اتفاق ہو جانے کے بعد ولید بن مغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لیجیے جسے سب بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا نہیں، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہیں، ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے، جیسی باتیں وہ گنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں، قرآن کو اس سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بولے، انہیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ مجنون بھی نہیں ہیں، ہم نے دیوانے اور پاگل دیکھے ہیں۔ اس حالت میں آدمی جیسی بہکی بہکی باتیں اور اُلٹی سیدھی حرکات کرتا ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ کون باور کرے گا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانے کی بڑ ہے یا جنون کے دورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے؟ لوگوں نے کہا اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ بولے، تو پھر ان کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ ساحر بھی نہیں ہیں۔ جادوگروں کو ہم جانتے ہیں اور اپنے جادو کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی محمد پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا تم ان باتوں میں سے جو بات بھی کہو گے لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔

خدا کی قسم اس کلام میں بڑی حلاوت ہے، اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں عکرمہ کی روایت سے یہ اضافہ کیا ہے کہ اس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا تمہاری قوم تم سے راضی نہ ہوگی جب تک تم محمدؐ کے بارے میں کوئی بات نہ کہو۔ ولید نے کہا اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادوگر ہے، یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو اس کے باپ، بھائی، بیوی بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کر لیا پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انہوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفرقہ ڈال دیتا ہے اس سے ہوشیار رہنا۔ (۲۰)

اس واقعہ پر قرآن کا تبصرہ

ولید بن مغیرہ کی اسی حرکت پر سورۂ مدثر آیات ۱۱ تا ۲۵ میں یہ تبصرہ فرمایا گیا ہے:

"چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو" یعنی اس سے میں ہی نمٹ لوں گا، تمہیں اس کی فکر کی ضرورت نہیں "جسے میں نے اکیلا پیدا کیا" یعنی وہ کچھ ساتھ لے کر دنیا میں نہیں آیا تھا "بہت سا مال اس کو دیا اور اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے" یعنی اس کو دس بارہ جوان جوان لڑکے دیئے، جو سب نامور ہیں، مجلسوں میں اس کے ساتھ حاضر رہتے ہیں (خالدؓ بن ولید جیسے لائق فرزند بھی ان میں شامل تھے) "اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اس کو اور زیادہ دوں۔ ہرگز نہیں میں تو عنقریب اسے ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی۔ تو خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔

ہاں، خدا کی مار اس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر لوگوں کی طرف دیکھا پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخرکار بولا تو یہ کہ یہ قرآن کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آ رہا ہے، یہ تو ایک انسانی کلام ہے"

اوپر جس واقعہ کا ہم ذکر چکے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ولید دل میں قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اپنی قوم میں اپنی ریاست و وجاہت کو بچانے کے لیے اپنے ضمیر سے جس طرح وہ لڑا، اور جس شدید ذہنی کشمکش میں کافی دیر تک مبتلا رہنے کے بعد آخرکار اس نے قرآن کے خلاف ایک بات بنائی اس کی تصویر ان آیات میں کھینچ دی گئی ہے۔ (۲۱)

دائمی اور وسیع پیمانے پر جھوٹ

یہ جھوٹ کی مہم صرف حج ہی کے موقع پر نہیں چلتی تھی بلکہ سال کے بارہ مہینے، اور مہینوں کے ۳۰ دن شب و روز

اس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مکہ کے عوام کو بھی ہر وقت آپ کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا۔ باہر سے آنے والوں کو بھی آپ سے خبردار رہنے اور آپ کے قریب نہ جانے کی تاکید کی جاتی تھی۔ عرب کے میلوں، عکاظ، مجنّہ اور ذوالمجاز میں بھی قریش کے وفد پھیل جاتے تھے اور آپ کے خلاف ہر طرح کے وسوسے لوگوں کے دلوں میں ڈالتے تھے۔ اور خاص طور سے ہر سال حج کے موقع پر قرآن کے وفد حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جاتے اور ہر وہ ممکن بات آپ کی مخالفت میں پھیلاتے تھے جس سے لوگ آپ کی بات سننے سے پرہیز کرنے لگیں اور آپ کی ذات کو اپنے لیے ایک خطرہ سمجھنے لگیں۔

مکہ سے باہر اسلام کی اشاعت

قریش اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو زک دے دیں گے لیکن دراصل اس طرح انہوں نے خود ہی عرب کے گوشے گوشے تک آپ کا اسم گرامی پہنچا دیا۔ آپ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی وہ قریش کی اس مہم سے تھوڑی مدت ہی میں ہو گئی۔ عام لوگ چاہے اس سے بدگمان ہی ہو گئے ہوں، مگر بہت سے دلوں میں آپ سے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو وہ کونسا ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا ہو رہا ہے، اور بہت سے لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ وہ بات سنی تو جائے جس سے ہم کو اتنا خوف دلایا جا رہا ہے۔ اس طرح مکہ سے باہر عرب کے دوسرے علاقوں میں اسلام کے پہنچنے کا راستہ کھل گیا۔

طفیل بن عمرو دوسی کا اسلام

یہ قبیلہ دوس کے ایک بڑے سردار اور اس کے اشراف میں سے تھے۔ ابن اسحاق اور ابن سعد نے ان کے اسلام لانے کا قصہ خود ان کی روایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلہ دوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف خوب میرے کان بھرے۔ یہاں تک کہ میں آپ سے سخت بدگمان ہو گیا اور میں نے طے کر لیا کہ آپ سے بچ کر ہی رہوں گا۔ دوسرے روز میں نے حرم میں حاضری دی تو آپ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ میرے کانوں میں چند جملے جو پڑے تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو بڑا اچھا کلام ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ایک شاعر ہوں جوان مرد ہوں، عقل رکھتا ہوں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ صحیح اور غلط میں تمیز نہ کر سکوں، آخر کیوں نہ اس شخص سے مل کر معلوم کروں کہ یہ کیا کہتا ہے چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر واپس چلے تو میں آپ کے پیچھے ہو لیا اور آپ کے مکان پر پہنچ کر میں نے عرض کیا کہ آپ کی قوم نے آپ کے متعلق مجھ سے یہ کچھ کہا تھا اور میں آپ سے اس قدر بدگمان ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی تاکہ آپ کی آواز نہ سننے پاؤں لیکن ابھی

جو چند کلمے مَیں نے آپ کی زبان سے سنے ہیں وہ مجھے کچھ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ مجھے ذرا تفصیل سے بتایئے آپ کیا کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں مجھ کو قرآن کا ایک حصّہ سُنایا اور مَیں اس سے اس قدر متاثر ہُوا کہ اُسی وقت ایمان لے آیا۔ پھر جب مَیں گھر واپس گیا تو میرے بوڑھے باپ آئے۔ مَیں نے کہا ابّا جان مجھ سے دُور رہیے۔ نہ مَیں آپ کا کوئی ہوں نہ آپ میرے کوئی۔ اُنہوں نے پُوچھا کیوں؟ مَیں نے کہا مَیں مسلمان ہو گیا ہوں اور مَیں نے دینِ محمدؐ کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ اُنہوں نے کہا بیٹا جو تیرا دین سو میرا دین۔ مَیں نے کہا جا کر غسل کیجیے اور کپڑے پاک کیجیے پھر میرے پاس آیئے تاکہ مَیں آپ کو اُس دین کی تعلیم دُوں جو مَیں سیکھ کر آیا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مسلمان ہو گئے۔ پھر میری بیوی آئی۔ مَیں نے اس سے بھی وہی بات کہی جو اپنے باپ سے کہی تھی۔ اس نے کہا میرے ماں باپ تم پر قربان یہ کیا کہہ رہے ہو؟ مَیں نے کہا میرے اور تیرے درمیان اسلام نے تفریق کر دی ہے اور مَیں دینِ محمدؐ کا پیرو ہو گیا ہوں۔ اُس نے کہا تو مجھے اپنا دین بتاؤ۔ مَیں نے کہا جا ذو الشریٰ (قبیلہ دوس کے بُت) کے حِمٰی؎ میں جا اور وہاں پہاڑ سے گرنے والے چشمے سے غسل کر۔ اُس نے کہا "ذو الشریٰ سے میرے بچوں کو تو کوئی خطرہ نہ ہو گا؟" مَیں نے کہا "نہیں مَیں اس کا ذمّہ لیتا ہُوں۔" وہ گئی اور غسل کر کے آ گئی۔ مَیں نے اُس کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ بھی مسلمان ہو گئی۔ پھر مَیں نے دَوس میں اسلام کی تبلیغ شروع کی، مگر وہ قبول کرنے میں متامّل تھے۔ مَیں حضورؐ کے پاس پھر مکّہ واپس گیا اور عرض کیا کہ دَوس پر غفلت طاری ہے جو میری راہ میں حائل ہو رہی ہے۔ آپ ان کے حق میں دُعا فرمائیں۔ حضورؐ نے دُعا فرمائی کہ خدایا دَوس کو ہدایت دے۔ اور مجھے نصیحت فرمائی کہ جا کر اپنی قوم کو تبلیغ کرو اور ان سے نرمی کے ساتھ پیش آؤ۔ چنانچہ مَیں دَوس میں دعوت کا کام کرتا رہا یہاں تک کہ جب ہجرت پر سال کے ۷۰۔۸۰ گھرانوں کو لے کر پہنچا۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ کا اسلام

یہ قبیلہ بنی غفار سے تھے جو رہزنی کے لیے مشہور تھا۔ اور خود حضرت ابو ذرؓ ایک زمانہ میں ایسے زبردست ڈاکو تھے کہ اکیلے کسی قافلے پر اس طرح جا پڑتے تھے جیسے کوئی درندہ ٹوٹ پڑتا ہے۔ مگر اسلام لانے سے تین سال پہلے ان کا دل پلٹ گیا تھا اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح کی نماز پڑھنی شروع کر دی تھی۔ مسند احمد اور ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ مَیں تین سال پہلے ہی سے اللہ کے لیے جس طرف بھی رُخ ہوتا تھا

؎ حِمٰی اس رقبے کو کہتے ہیں جو کسی سردار، رئیس یا دیوتا کے لیے مخصوص ہو اور جس میں داخل ہونا گویا اس کے مالک کا غضب مول لینا ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

پڑھا کرتا تھا۔" اُن کا اصل نام جُندُب بن جُنادہ تھا۔ بخاری کی روایت ہے کہ جب حضورؐ کی بعثت کی خبر پہنچی تو اُنہوں نے اپنے بھائی کو (جن کا نام مُسند احمد میں اُنَیس بیان کیا گیا ہے) بھیجا کہ مکہ جا کر اُس شخص کے متعلق معلومات حاصل کریں جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں۔ وہ گیا اور واپس آکر اُس نے اطلاع دی کہ وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں اور ایسا کلام پیش کرتے ہیں جو شعر نہیں ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے کہا میں جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا وہ تم نہیں لائے۔ پھر وہ خود مکہ گئے اور مسجد حرام میں حضورؐ کو تلاش کرنے لگے مگر حضورؐ آپؐ کو پہچانتے نہ تھے اور کسی سے پوچھنا بھی نہ چاہتے تھے، اس لیے مل نہ سکے۔ حضرت علیؓ نے ان کو دیکھا کہ یہ کوئی اجنبی مسافر ہیں، مگر ان سے کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ تیسرے دن حضرت علیؓ نے کہا کیا چیز تمہیں لائی ہے؟ انہوں نے کہا اگر تم وعدہ کرو کہ مجھے میرے مقصود تک پہنچا دو گے تو میں تمہیں بتاؤں کہ کیوں آیا ہوں۔ حضرت علیؓ نے وعدہ کیا، تب انہوں نے اپنا مقصد بیان کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا وہ یقیناً حق پر ہیں اور اللہ کے رسول ہیں۔ کل صبح تم میرے پیچھے پیچھے آنا۔ اگر میں چلتا رہوں تو تم بھی چلتے رہنا اور جہاں میں داخل ہوں تم وہاں داخل ہو جانا۔ اور اگر میں نے کوئی ایسی بات دیکھی جس سے مجھے تمہارے حق میں خطرہ محسوس ہوا تو میں اس طرح کھڑا ہو جاؤں گا جیسے پانی گرا رہا ہوں۔ یہ دیکھ کر تم رُک جانا۔ غرض اس طرح حضرت ابوذرؓ حضورؐ کی خدمت میں پہنچے، آپؐ کا کلام سُنا اور اُسی وقت مسلمان ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا "اب تم اپنی قوم میں واپس جاؤ اور لوگوں کو دین سے باخبر کرتے رہو، یہاں تک کہ تمہیں میرے حال کی اطلاع ملے۔" حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا کہ جس خدا نے آپؐ کو بھیجا ہے اُس کی قسم میں اہلِ مکہ کے درمیان حق کا اظہار کر کے رہوں گا۔ چنانچہ وہ مسجد حرام پہنچے اور پکار کر کہا أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وأشهد أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ یہ سُنتے ہی لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور اتنا مارا کہ وہ گر پڑے۔ یہ حال دیکھ کر حضرت عباسؓ ان کے اور لوگوں کے درمیان حائل ہو گئے اور کہا کم بختو، تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ یہ بنی غفار میں سے ہے جو تمہارے شام کے تجارتی راستے پر رہتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے ابوذرؓ کو ان سے چھڑایا۔ دوسرے روز انہوں نے پھر یہی کیا، اور پھر لوگوں نے ان کو مارا اور پھر حضرت عباسؓ نے ان کو چھڑایا۔

امام احمدؒ نے مُسند میں خود حضرت ابوذرؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں اور میرا بھائی اُنیس اور میری ماں مکّے کے باہر ٹھیرے ہوئے تھے۔ اُنیس نے کہا میں ذرا مکّہ ہو کر آتا ہوں، تم میرا انتظار کرو۔ پھر وہ بڑی دیر کے بعد آیا تو میں نے پوچھا اتنی دیر کہاں لگی؟ اُس نے کہا میں ایک شخص سے ملا جو کہتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور اللہ نے اُسے اُسی دین پر بھیجا ہے جو تمہارا دین ہے (یعنی شرک کا انکار اور توحید کا اقرار)۔ میں نے پوچھا کہ لوگ اسے کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، کاہن ہے، ساحر ہے۔ اُنیس

خود شاعر تھا۔ اُس نے کہا میں نے کاہنوں کی باتیں بھی سُنی ہیں، شعر بھی جانتا ہُوں۔ مگر اُس کی باتوں کا ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا کی قسم وہ سچا ہے اور لوگ جھُوٹے ہیں۔ میں نے کہا تم میرے پیچھے دیکھ بھال کرو گے تاکہ میں خود وہاں جاؤں؟ اُس نے کہا ہاں، مگر اہلِ مکّہ سے ہوشیار رہنا کیونکہ وہ اس کی مخالفت پہ تُلے ہوئے ہیں۔ میں مکّہ پہنچا اور ایک شخص کو کمزور سا پاکر اس سے پُوچھا کہ وہ شخص کہاں ہے جسے لوگ صابی (دین سے پھرا ہُوا) کہتے ہیں۔ اِس پر اُس شخص نے میری طرف اشارہ کر دیا اور لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور جو ہاتھ میں آیا مجھ پر دے مارا، یہاں تک کہ میں غش کھا کر گر پڑا۔ ہوش میں آکر حرم میں گیا۔ زمزم کا پانی پیا، زخم دھوئے، اور تیس دن تک کعبے کے پردوں کے پیچھے چھُپا رہا۔ اِس پُوری مدّت میں زمزم کے سوا میری کوئی غذا نہ تھی جس سے نہ صرف یہ کہ میری بھُوک مٹ جاتی تھی بلکہ میں پہلے سے کچھ زیادہ ہی موٹا ہو گیا۔

اس کے بعد حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک روز رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت ابوبکرؓ حرم میں آئے، حجرِ اَسود کو بوسہ دیا، طواف کیا اور نماز پڑھی۔ میں نے نکل کر پہلی مرتبہ اُن کو اسلامی طریقہ پر سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا علیک السّلام۔ پھر پوچھا تم کون ہو؟ میں نے کہا بنی غفار میں سے ہُوں۔ پُوچھا یہاں کب سے ہو؟ میں نے کہا تیس شب و روز سے۔ پُوچھا تمہیں کھلاتا کون تھا؟ میں نے کہا زمزم کے سوا میری کوئی غذا نہ تھی، اُس سے نہ صرف میری بھُوک مٹی بلکہ میں کچھ موٹا ہی ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا وہ برکت والا پانی ہے اور پانی ہی نہیں غذا بھی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا مجھے اجازت دیجیے کہ آج رات یہ میرے ہاں کھانا کھائیں۔ حضورؐ نے اجازت دے دی۔ آپؐ تشریف لے گئے اور میں ابوبکرؓ کے ساتھ اُن کے ہاں گیا اور انہوں نے مجھے طائف کی کشمش کھلائی۔ پھر میں کچھ مدّت تک ٹھیرا رہا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا "مجھے ایک ایسی سرزمین کی طرف نشان دہی کی گئی ہے جہاں نخلستان ہیں اور میں سمجھتا ہُوں کہ وہ جگہ یثرب کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ کیا تم میرا پیغام اپنی قوم میں پہنچاؤ گے؟ شاید کہ وہ ان کو فائدہ بخشے اور تمہیں بھی اس کا اجر ملے"۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ پھر میں اپنے بھائی اُنیس کے پاس واپس پہنچا۔ انہوں نے پُوچھا کیا کر آئے؟ میں نے کہا اسلام لے آیا اور تصدیق کی۔ اُنیس نے کہا میں بھی تمہارے دین سے الگ نہیں رہنا چاہتا، میں نے بھی اسلام قبول کیا اور تصدیق کی۔ ہماری ماں بولیں میں بھی تم دونوں کے دین سے الگ نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے بھی اسلام قبول کیا اور تصدیق کی۔ اس کے بعد ہم اپنی قوم غِفار میں پہنچے اور ان میں سے کچھ لوگ حضورؐ کی مدینہ تشریف آوری سے پہلے ہی مسلمان ہو گئے۔ اُن کو خُفاف بن اِیماء بن رَحَضَۃ الغِفاری نماز پڑھایا کرتے تھے کیونکہ وہی قوم کے سردار تھے۔ پھر ہجرت کے بعد باقی بنی غِفار بھی مسلمان ہو گئے۔ (مُسلم نے بھی یہ قصّہ اسی طرح روایت کیا ہے۔ طَبَرانی نے اَوسط میں اس قصّے کی زیادہ تفصیلات نقل کی ہیں)۔

ابن سعد کی روایت میں بھی اگرچہ یہ قصہ اسی طرح درج ہے جس طرح اُوپر گزرا، مگر اس کے بیچ میں حضرت ابوذرؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ جب میں کعبے کے پردوں کے پیچھے چھپا ہُوا تھا اور طواف میں دو عورتوں کے سوا کوئی نہ تھا تو میں نے سُنا کہ وہ اساف اور نائلہ کا ذکر کر رہی ہیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہا ان دونوں کا نکاح کرادو۔ اس پر وہ بہت بگڑیں اور کہنے لگیں، کاش یہاں ہمارے آدمیوں میں سے کوئی یہاں ہوتا۔ اُدھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور ابوبکرؓ پہاڑی سے اُترتے ہوئے تشریف لا رہے تھے۔ یہ عورتیں شاید اُن کو جانتی نہ تھیں۔ انہوں نے پوچھا تم کیوں ناراض ہو رہی ہو؟ وہ کہنے لگیں ایک صابی (یعنی بدمذہب) کعبے کے پردوں میں چھپا ہُوا ہے۔ حضورؐ نے پوچھا اُس نے تمہیں کیا کہا؟ کہنے لگیں ایسی بُری بات کہہ دی جو مُنہ سے نکالنے کے قابل نہیں۔

عَمرو بن عَبَسہ سُلَمی کا اسلام

یہ بنی سُلیم میں سے تھے۔ اِن کا خیال تھا کہ یہ چوتھے مسلمان ہیں۔ مگر جو واقعہ انہوں نے خود اپنے مسلمان ہونے کا بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعوتِ عام شروع ہونے کے بعد حضورؐ کا ذکر سُن کر مسلمان ہوئے تھے۔ ابن سعد کی ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ عکاظ کے بازار میں حضورؐ سے ملے اور وہیں مسلمان ہوئے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ اُس وقت تبلیغی دَورے شروع کر چکے تھے۔ دوسری روایت جو ابن سعد اور مسلم نے ابواُمامہ باہلی سے نقل کی ہے اس میں عَمروؓ بن عبسہ خود کہتے ہیں کہ میں جاہلیت میں لوگوں کو گمراہی پر سمجھتا تھا اور بُتوں کو ہیچ خیال کرتا تھا پھر میں نے سُنا کہ مکّہ میں ایک شخص ہے جو کچھ خبریں دیتا اور کچھ باتیں بیان کرتا ہے۔ چنانچہ میں مکّہ گیا اور میں نے دیکھا کہ حضورؐ چھپے ہوئے ہیں اور قوم آپؐ کے معاملہ میں دو حصّوں میں منقسم ہے۔ میں احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ آپ تک پہنچا اور آپؐ سے پوچھا آپ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا نبی۔ میں نے پوچھا نبی کیا ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ کا رسول۔ میں نے پوچھا کیا اللہ نے آپ کو بھیجا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں۔ میں نے پوچھا کس تعلیم کے ساتھ بھیجا ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ کہ صرف اللہ کو معبود مانا جائے۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ بُتوں کو توڑ دیا جائے۔ اور صلۂ رحمی کی جائے۔ میں نے آپؐ سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا آزاد بھی ہیں اور غلام بھی۔ اس وقت ابوبکرؓ اور بلالؓ موجود تھے (اِسی سے اُن کو غلط فہمی ہُوئی کہ چوتھے وہ ہیں)۔ میں نے عرض کیا میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آپؐ نے فرمایا اِس زمانے میں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ جب تم سنو کہ میں ظاہر ہو گیا ہوں تو مجھ سے آملنا۔ چنانچہ میں اپنے لوگوں میں واپس چلا گیا۔

ضمادؓ الازدی کا اسلام

یہ اَزدِ شنوءہ یمن سے تھے اور جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر اور حافظ ابن حجر اور حافظ ابن حبّان کا بیان ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں یہ حضورؐ کے دوست تھے۔ مسلم، نسائی، بیہقی اور ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ مکّہ آئے تو یہاں کے اوباشوں نے ان سے کہا کہ محمدؐ مجنون ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہیں، شاید اللہ میرے ہاتھ سے آپؐ کو شفا دے دے۔ چنانچہ وہ آپؐ کے پاس آئے اور کہا میں جھاڑ پھونک کا کام کرتا ہوں اور میرے ہاتھ سے اللہ جس کو چاہتا ہے شفا دے دیتا ہے۔ آئیے میں آپؐ کا علاج کر دوں۔ حضورؐ نے پہلے کلمہ شہادت ادا کیا، پھر اللہ کی حمد کی اور اس کے بعد کچھ کلمات ارشاد فرمائے۔ ضماد کو یہ باتیں بہت پسند آئیں اور انہوں نے کہا پھر فرمایئے۔ آپؐ نے تین مرتبہ ان کا اعادہ کیا۔ ضماد نے کہا میں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا۔ میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے۔ شاعروں کا کلام سنا ہے، ساحروں کا کلام سنا ہے مگر ایسا کلام نہیں سنا۔ یہ تو سمندر کی تہ تک پہنچتا ہے۔ پھر انہوں نے اسلام قبول کیا اور اپنی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کا اسلام

یہ بھی یمن سے آکر مکّہ میں اسلام لائے تھے۔ پھر واپس جاکر اپنے بھائیوں ابوبُردہ اور ابورُہم اور تقریباً ۵۰ آدمیوں کو مسلمان کیا۔ اس کے بعد یہ سب مسلمان ایک کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تھے اور ہوا نے ان کو حبش کے ساحل پر لا پھینکا جہاں یہ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور دوسرے مہاجرین سے مل گئے۔ یہ ابن سعد اور ابن عبدالبر کا بیان ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ حبش نہیں گئے تھے بلکہ جب یہ مکّہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو ان کی کشتی ان مہاجرین حبشہ کی کشتی کے ساتھ مل گئی جو مدینہ کی طرف جا رہے تھے اور ایک ساتھ حضورؐ کے پاس خیبر پہنچے۔

مُعَیقیبؓ بن ابی فاطمۃ الدَّوسی کا اسلام

ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ بھی قبیلہ دَوس کے تھے اور مکّہ میں اسلام لائے تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ مسلمان ہو کر یہ اپنے وطن واپس چلے گئے تھے اور دوسری روایت کے مطابق دوسری ہجرتِ حبشہ میں یہ بھی شامل تھے۔ ابن حجر اور ابن عبدالبر نے ان کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جو مکّہ میں اسلام لائے تھے اور ہجرتِ حبشہ ثانیہ میں شریک ہوئے تھے۔

جُعالؓ بن سُراقہ

یہ بھی ضَمرہ یمن سے تھے۔ ابن سعد اور ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ یہ بھی مکّہ میں اسلام لائے۔

عبداللہ اور عبدالرحمٰن کنانی

ابنِ سعد کا بیان ہے کہ یہ دونوں بھائی بنی کنانہ کے ایک شخص عُجَیب کے بیٹے تھے اور انہوں نے بھی مکّہ میں اسلام قبول کیا۔

بُریدہ بن الحُصَیبؓ کا اسلام

ابنِ سعد اور ابنِ عبدالبَر کا بیان ہے کہ یہ بنی خُزاعہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو خزاعہ کے خاندانوں سے الگ ہو گئی تھی۔ ہجرت کے وقت جب حضورؐ مکّہ سے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے اُس وقت غمیم کے مقام پر یہ آپؐ سے ملے اور ان کے ساتھ ۸۰ گھرانوں نے اسلام قبول کیا۔ یہی ابنِ حجر نے اصابہ میں لکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے سے یہ لوگ اسلام سے متاثر ہو چکے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ محض سفر میں چلتے چلتے ایک ہی ملاقات کا نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے گھر مسلمان ہو جائیں۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے اگرچہ حضورؐ کے خلاف جھوٹ کی مہم چلا کر پورے عرب کے لوگوں کو آپؐ سے بدظن کر دینے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، لیکن اِسی ذریعہ سے نہ صرف یہ کہ انہوں نے خود ہی آپؐ کو عرب میں مشہور کر دیا، بلکہ بہت سی سعید روحوں کو آپؐ کی طرف متوجہ بھی کر دیا۔ مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ اِسی مہم کی وجہ سے جستجو کرتے ہوئے آپؐ کی طرف راغب ہوتے تھے اور اِس طرح مکّہ سے باہر دوسرے قبائل میں اسلام پہنچ گیا۔ یہی بات ہے جس کے متعلق سُورۂ الم نشرح میں فرمایا گیا ہے کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ یعنی آپ اِس جھوٹے پروپیگنڈے سے دل شکستہ کیوں ہوتے ہیں، ہم نے تو آپ کے دشمنوں ہی کے ذریعہ سے آپ کا آوازہ بلند کر دیا ہے۔

۶۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم

مخالفت و مزاحمت کی دوسری تدبیروں کے ساتھ کفارِ قریش کی ایک نہایت سنگدلانہ تدبیر یہ تھی کہ جس جس کے متعلق اُن کو معلوم ہوتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، یا جس نے بھی کسی طرح اپنے اسلام کا اظہار کیا، اُس پر اُنہوں نے بے تحاشا ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا، اور اس کو اسلام سے پھیرنے کے لیے دباؤ ڈالنے کا کوئی ممکن طریقہ استعمال کرنے سے ذرا دریغ نہ کیا۔ اوّل اوّل تو یہ طریقہ رہا کہ اسلام قبول کرنے والوں میں سے جو لوگ کچھ عزت اور خاندانی شرف و وجاہت رکھتے تھے ان سے مل کر ان کو ملامت کی جاتی کہ تم نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ تم سے زیادہ بھلائی اور بُرائی کی سمجھ رکھنے والے تھے، اب اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں ذلیل و خوار کریں گے، تمہیں احمق ٹھیرائیں گے اور تمہاری عزت خاک میں

لا دین ہو گئے۔ جو لوگ کوئی تجارتی کاروبار یا صنعتی پیشہ کرتے تھے ان کو دھمکیاں دی جاتیں کہ یا تو اسلام چھوڑ دو، نہیں تو تمہاری تجارت برباد کر دی جائے گی اور تمہارے پیشے کو نہیں چلنے دیا جائے گا یہاں تک کہ تم بھوکے مرنے لگو گے۔ رہے بے سہارا اور کمزور لوگ تو ان کو سخت عذاب دیئے جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ نوبت یہ آگئی کہ عزت دار اور خاندانی لوگوں تک کو مارا پیٹا اور باندھا جانے لگا۔

خاندانی لوگوں پر مظالم

ابن اسحاق اور طبری نے حضرت عُروہ بن زُبیر کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ قریش کے سرداروں نے باہم طے کیا کہ اُن کے بیٹوں، بھائیوں اور قبیلے کے لوگوں میں سے جس جس نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کی ہے اس پر جبر و ظلم کر کے اُسے زبردستی اِس دین سے پھیرنے کی کوشش کریں۔ اِس کے بعد مکہ میں حضورؐ کے پیروؤں پر ایک فتنۂ عظیم برپا ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ جیسے معزز آدمی کو نَوفل بن خُویلد بن العَدَویّہ نے، جو اَسَدِ قریش (قریش کا شیر) کہلاتا تھا، پکڑ کر حضرت طلحہؓ کے ساتھ باندھ دیا، اور اُن کے خاندان بنو تیم نے اُن کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اِسی پر حضورؐ نے دُعا فرمائی کہ اللّٰھم اکفنا شرّ ابن العدویۃ "خدایا، ابن العدویّہ کے شر سے ہم کو بچانے کا تو ہی ذمہ لے لے" (بیہقی۔ ابن سعد)۔ حضرت زُبیر بن العوّام کو ان کا چچا ایک چٹائی میں لپیٹ کر لٹکا دیتا تھا اور نیچے سے دھونی دیتا اور کہتا جاتا تھا کہ اسلام سے رجوع کر، مگر وہ برابر یہی جواب دیئے جاتے کہ میں کبھی کُفر نہ کروں گا۔ (ابن سعد۔ طبرانی)۔ حضرت عثمانؓ کو ان کے چچا حَکَم (مروان کے باپ) نے باندھ دیا اور کہا تم باپ دادا کا دین چھوڑ کر محمدؐ کا دین قبول کرتا ہے، میں تجھے نہیں کھولوں گا جب تک تو اس دین کو چھوڑ نہ دے۔ انہوں نے جواب دیا میں اسے نہیں چھوڑوں گا خواہ کچھ ہو جائے (ابن سعد)۔ حضرت مُصعَب بن عُمیر کو ان کے چچا زاد بھائی عثمان بن طلحہ (کلید بردارِ کعبہ) نے سخت اذیتیں دیں، اور اُن کے اہلِ خاندان نے اُن کو قید کر دیا یہاں تک کہ وہ بھاگ نکلے اور پہلی ہجرتِ حبشہ کے موقع پر مہاجرین کے ساتھ چلے گئے (ابن سعد)۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور ان کے بھائی عامر کو ان کی ماں نے بے حد تنگ کیا، مگر وہ اپنے دین سے نہ ہٹے (ابن سعد)۔ انہی کے متعلق مُسند احمد، مُسلم، ترمذی، ابو داؤد اور نسائی میں آیا ہے کہ حضرت سعدؓ کی ماں حَمنہ بنت سفیان بن اُمیّہ (ابو سفیان کی بھتیجی) نے ان سے کہا "جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے گا میں نہ کھاؤں گی، نہ پیوں گی، نہ سائے میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کرے گا"۔ وہ اس پر سخت پریشان ہوئے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت اُتری وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا

فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ وَالْعَنْکَبُوْتُ۔ ۸) "اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی ہے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات نہ مان"۔

حضرت خالدؓ بن سعید کی سرگذشت

حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص کو جب پتہ چلا کہ ان کے باپ ابو اُحَیحہ کو اُن کے مسلمان ہونے کا علم ہو گیا ہے تو وہ اُس کے ڈر سے چھپ گئے۔ مگر اُس نے ان کو تلاش کر کے پکڑوا بلایا اور سخت سست کہنے کے بعد ان کو اتنا مارا کہ وہ لکڑی ٹوٹ گئی جس سے وہ انہیں مار رہا تھا۔ پھر کہا کہ تو نے محمدؐ کی پیروی اختیار کر لی، حالانکہ تو دیکھ رہا ہے کہ وہ اپنی قوم کی مخالفت کر رہا ہے، دینِ آبائی میں عیب نکال رہا ہے اور اُن اسلاف کو گمراہ قرار دے رہا ہے جو اس دین کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ حضرت خالدؓ نے کہا خدا کی قسم وہ سچے ہیں اور میں ان کا پیرو ہوں۔ ابو اُحیحہ نے ان کو پھر مارا اور گالیاں دیں اور کہا کہ نالائق، جہاں تیرا جی چاہے چلا جا، میرے گھر میں تجھے کھانا نہیں ملے گا۔ انہوں نے کہا آپ میرا رزق بند کر دیں گے تو اللہ مجھے رزق دیگا۔ پھر وہ حضورؐ کے پاس آ گئے اور آپ ہی کے ساتھ رہنے لگے۔ ایک روز مکہ کے نواح میں کسی سنسان جگہ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابو اُحیحہ کو اس کی خبر پہنچ گئی۔ اُس نے بلا کر ان سے کہا دینِ محمدؐ چھوڑ دے۔ انہوں نے جواب دیا میں مرتے دم تک یہ دین نہیں چھوڑوں گا۔ یہ جواب سُن کر ابو اُحیحہ نے ان کے سر پر لکڑی مارنی شروع کی یہاں تک کہ لکڑی ٹوٹ گئی۔ پھر انہیں قید کر دیا اور تین دن تک بھوکا پیاسا بند رکھا۔ مکہ کی گرمی میں حضرت خالدؓ یہ عذاب بھگتتے رہے۔ آخر موقع پا کر گھر سے بھاگ نکلے اور مکہ کے نواح میں پھرتے رہے، یہاں تک کہ حبشہ کی طرف پہلی ہجرت ہوئی اور یہ اُن مہاجرین کے ساتھ چلے گئے (ابن سعد۔ بیہقی نے بھی مختصراً اس واقعہ کا ذکر کیا ہے)۔

حضرت ابوبکرؓ پر ظلم عظیم

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ دارِ ارقم سے نکل کر مسجد حرام تشریف لے گئے۔ وہاں یکایک حضرت ابوبکرؓ نے اٹھ کر تقریر شروع کر دی اور لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح کسی نے حرم میں علی الاعلان دعوتِ اسلام دی۔ مشرکین یہ تقریر سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ پر ٹوٹ پڑے اور ان کو گرا کر پاؤں سے روندا اور عُتبہ بن ربیعہ نے اُن کے منہ پر اتنے جوتے مارے کہ سارا منہ سوج گیا اور ناک اس میں چھپ گئی۔ یہ حال دیکھ کر ان کے قبیلے والے (بنو تیم) آگے بڑھے اور کفار سے ان کو چھڑا کر اُن کے گھر لے گئے۔ انہیں اس امر میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ یہ اب مر جائیں گے، اس لیے وہ پلٹ کر پھر مسجد میں آ گئے اور کہا کہ خدا کی قسم، اگر ابوبکرؓ مر گئے تو ہم عُتبہ کو جیتا نہ چھوڑیں گے۔ شام تک حضرت ابوبکرؓ بے سُدھ پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو اُن کا پہلا سوال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلّم کا کیا حال ہے ؟ اِس پر عتبہ نے ان کو بُرا بھلا کہا، ملامت کی۔ آخر کہ چلے گئے تو اُن کی والدہ اُمّ الخیر سے کہہ گئے کہ انہیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ ماں بیٹے جب تنہا رہ گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنی والدہ سے پھر وہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا بخدا مجھے تمہارے دوست کا کچھ حال معلوم نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا جاکر اُمّ جمیل بنت خطّاب (یعنی فاطمہؓ بنت خطّاب، حضرت عمرؓ کی بہن) سے جاکر پوچھو۔ وہ اُس وقت مسلمان ہوچکی تھیں مگر انہوں نے اپنا اسلام چھپا رکھا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی والدہ نے جب جاکر ان سے کہا کہ ابوبکر محمدؐ بن عبداللہ کا حال پُوچھ رہے ہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نہ محمدؐ بن عبداللہ کو جانتی ہوں نہ ابوبکرؓ کو، البتہ آپ چاہیں تو میں ابوبکرؓ کے پاس چلتی ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں، چلو۔ وہاں پہنچ کر ابوبکرؓ کو یہ حال میں دیکھ کر چیخ اُٹھیں کہ خدا کی قسم، جن لوگوں نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ کافر اور فاسق ہیں اور میں امید رکھتی ہوں کہ اللہ ان سے تمہارا انتقام لے گا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا رسُول اللہؐ کا کیا حال ہے ؟ انہوں نے چپکے سے کہا آپ کی ماں سُن رہی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ان کی فکر نہ کرو، ان سے کوئی خوف نہیں ہے۔ تب اُمّ جمیل نے کہا حضورؐ بالکل خیریت سے ہیں۔ پُوچھا کہاں ہیں ؟ انہوں نے کہا دارِ ارقم میں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا واللہ، میں نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا جب تک اُن کے پاس نہ جاؤں۔ اُمّ جمیل نے کہا ذرا ٹھیر جائیے۔ پھر جب شہر میں سکون ہوگیا تو وہ اور اُمّ الخیر اُن کو سہارا دے کر دارِ ارقم لے گئیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر اُن کا حال دیکھ کر رقّت طاری ہوگئی۔ آپؐ ان پر جھکے اور ان کو چُوم لیا۔ دوسرے مسلمان بھی جو وہاں موجود تھے ان پر جھکے اور اُن کی حالت دیکھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا "میرے ماں باپ آپؐ پر قربان مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہے سوائے اُس تکلیف کے جو اُس فاسق نے میرے مُنہ پر جُوتے برسا کر پہنچائی۔ یہ میری ماں اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ بابرکت ہیں۔ اِن کو اللہ کی طرف دعوت دیجیے اور دُعا فرمائیے کہ اللہ ان کو آگ سے بچالے"۔ چنانچہ حضورؐ نے ان کے لیے دُعا کی اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دی اور وہ مسلمان ہوگئیں۔ یہ واقعہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں حافظ ابوالحسن خیثمہ بن سلیمان الاطرابلسی کی کتاب فضائل الصحابہؓ سے تفصیل نقل کیا ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ

لے طبرانی نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت خطّاب کی کُنیت اُمّ جمیل تھی۔ عبدالرزاق نے المصنّف میں امام زہری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی بہن اُمّ جمیل کے گھر میں قرآن سُن کر ایمان لائے تھے۔ اور دوسری روایات میں اِن خاتون کا نام فاطمہ بنت خطّاب آیا ہے۔ اِس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی اپنی بہن کا نام فاطمہؓ تھا اور انہی کی کنیت اُمّ جمیل تھی (حاشیہ از مؤلف)۔

میں اسے مختصراً اہم الخیر کے حالات میں بیان کیا ہے ۔ (۴۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو بُری طرح مارا جاتا ہے

ابن اسحاق حضرت عُروہ بن زُبیر سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک روز صحابۂ کرام نے آپس میں کہا کہ قریش نے کبھی کسی کو یعنی ہم میں سے کسی کو، علانیہ بآواز بلند قرآن پڑھتے نہیں سُنا ہے، ہم میں کون ہے جو ایک دفعہ اُن کو یہ کلام پاک سُنا ڈالے ؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا میں یہ کام کرتا ہوں۔ صحابہؓ نے کہا ہمیں ڈر ہے کہ وہ تم پر زیادتی کریں گے۔ ہمارے خیال میں کسی ایسے شخص کو یہ کام کرنا چاہیئے جس کا خاندان زبردست ہو تاکہ اگر قریش کے لوگ اس پر دست درازی کریں تو اس کے خاندان والے اس کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوں ۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا مجھے یہ کام کر ڈالنے دو، میرا حافظ اللہ ہے۔ پھر وہ دن چڑھے حرم میں پہنچے جبکہ قریش کے سردار اعیان اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ حضرت عبداللہ نے مقام ابراہیم پر پہنچ کر پورے زور سے سُورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی۔ قریش کے لوگ پہلے تو سوچتے رہے کہ عبداللہ کیا کہہ رہے ہیں پھر جب انہیں پتہ چلا کہ یہ وہ کلام ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کلام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں تو وہ اُن پر ٹوٹ پڑے اور اُن کے مُنہ پر تھپڑ مارنے لگے۔ مگر حضرت عبداللہ نے پروا نہ کی۔ پٹتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب تک اُن کے دَم میں دَم رہا قرآن سناتے چلے گئے ۔ آخر کار جب وہ اپنا سُوجا ہوا منہ لے کر پلٹے تو ساتھیوں نے کہا ہمیں اسی چیز کا ڈر تھا ۔ انہوں نے جواب دیا آج سے بڑھ کر یہ خدا کے دشمن میرے لیے کبھی ہلکے نہ تھے، تم کہو تو کل پھر انہیں قرآن سناؤں۔ سب نے کہا۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ جو کچھ وہ نہیں سُننا چاہتے تھے وہ تم نے انہیں سنا دیا ۔ (ابن ہشام۔ جلد اوّل، ص ۳۳۶) (۴۳)

بے کس غلاموں، لونڈیوں اور موالی پر ظلم

سب سے زیادہ دردناک مظالم اُن غلاموں، لونڈیوں اور موالی پر توڑے گئے جو اسلام لے آئے تھے اور جن کا مکہ میں کوئی پُشت پناہ نہ تھا۔ اس کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں۔

حضرت بلالؓ

ان میں سے ایک حضرت بلالؓ بن رَباح تھے جو بنی جُمَح میں سے کسی کے غلام تھے اور غلامی کی حالت ہی میں اُن کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ مشہور یہ ہے کہ وہ حبشی تھے، جیسا کہ طَبرانی وغیرہ نے حضرت اَنسؓ سے نقل کیا ہے۔ ان کے اسلام لانے کا حال جب کھلا تو اُمَیّہ بن خَلَف جُمَحی نے ان کو طرح طرح کے عذاب دیئے۔ ابن ہشام اور بلاذری نے لکھا ہے کہ وہ دوپہر کو سخت گرمی کے وقت انہیں نکال کر لے جاتا، مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر ایک بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا اور کہتا کہ خدا کی قسم تو اسی طرح پڑا رہے گا

جب تک محمدؐ کا انکار کر کے لات اور عُزّیٰ کی عبادت نہ کرے۔ مگر وہ جواب میں اَحد اَحد ہی کہے چلے جاتے۔ بلاذری نے حضرت عمرو بن العاص کی روایت نقل کی ہے کہ میں نے بلالؓ کو ایسی سخت تپتی ہوئی زمین پر لیٹے دیکھا ہے جس پر اگر گوشت رکھ دیا جاتا تو وہ پک جاتا۔ مگر وہ اس حالت میں بھی صاف کہہ رہے تھے کہ میں لات اور عُزّیٰ کا انکار کرتا ہوں۔ حضرت حسانؓ بن ثابت کا آنکھوں دیکھا حال بلاذری نے نقل کیا ہے کہ میں حج یا عمرے کے لیے مکہ گیا تو دیکھا کہ بلالؓ ایک رسی میں بندھے ہوئے ہیں اور لڑکے ان کو گھسیٹے پھر رہے ہیں، مگر وہ کہے جا رہے ہیں کہ میں لات اور عُزّیٰ اور ہُبل اور اساف اور نائلہ اور بوانہ، سب کا انکار کرتا ہوں۔ خود حضرت بلالؓ کا بیان بلاذری میں یہ ہے کہ مجھے ایک دفعہ ایک دن اور ایک رات پیاسا رکھا گیا اور پھر تپتی ہوئی ریت پر لے جا کر ڈال دیا گیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ گلے میں رسی باندھ کر ان کو لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا اور وہ مکے کی گھاٹیوں میں انہیں گھسیٹتے لیے پھرتے، پھر تپتی ہوئی ریت پر لا کر اوندھے منہ لٹا دیتے اور ان پر پتھروں کا ڈھیر لگا دیتے۔ ایسے ہی اور سخت عذاب دے دے کر ان سے کہا جاتا کہ تمہارے رب لات اور عُزّیٰ ہیں، مگر وہ اَحد اَحد ہی کہتے رہتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا گھر بنی جمح کے محلے ہی میں تھا۔ وہ یہ ظلم دیکھتے دیکھتے تنگ آ گئے۔ ابن اسحاق کی روایت ہشام بن عروہ سے یہ ہے کہ انہوں نے اپنا ایک تنومند حبشی غلام ان کے بدلے میں دے کر انہیں خرید لیا اور آزاد کر دیا۔ اور ابن ابی شیبہ نے قیس بن حازم کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے قیمت دے کر انہیں خریدا اور آزاد کیا تھا۔ اسی مضمون کی روایات ابن سعد نے بھی نقل کی ہیں۔ البتہ قیمت میں اختلاف ہے۔

حضرت عمّارؓ بن یاسر

ابن سعد کا بیان ہے کہ یاسر یمن کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے مکہ آئے اور ابو حذیفہ بن مغیرہ مخزومی سے حلیفانہ تعلق قائم کر لیا اور ابو حذیفہ نے اپنی لونڈی سُمَیّہ سے ان کی شادی کر دی۔ جب اسلام آیا تو یاسرؓ، سمیہؓ، عمارؓ اور ان کے بھائی عبداللہ سب مسلمان ہو گئے۔ اس پر یہ پورا خاندان سخت مبتلائے عذاب کر دیا گیا۔ بلاذری نے اُمِّ ہانیؓ سے اور طبرانی نے حضرت عثمانؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام سے گزر رہے تھے جہاں ان لوگوں کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ آپؐ کو اس پر سخت رنج ہوا اور آپؐ نے فرمایا: صبراً آلِ یاسر فان موعدکم الجنۃ "صبر کرو، صبر کرو اے آلِ یاسر، تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔" امام احمد اور ابن سعد نے حضرت عثمانؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضورؐ کے ساتھ اس مقام سے گزرے جہاں اس خاندان کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا "صبر کرو، یا اللہ آلِ یاسر کی مغفرت فرما دے اور تو نے تو ان کی مغفرت کر ہی دی ہے"۔ محمد بن کعب قرظی کا بیان ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت

عمارؓ کو ایک مرتبہ کُرتا اتارے ہوئے دیکھا تو ان کی پیٹھ پر داغ ہی داغ نظر آئے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ ان عذابوں کے نشانات ہیں جو مکہ کی تپتی ہوئی زمین پر مجھے دیئے جاتے تھے۔ عمرو بن میمونؒ کے حوالہ سے ابن سعد نے بیان کیا ہے کہ مشرکین نے حضرت عمارؓ کو آگ کے انگاروں سے داغا اور حضورؐ نے فرمایا "اے آگ عمارؓ پر اُسی طرح ٹھنڈی ہو جا جس طرح تو ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی ہوئی تھی"۔ آخر کار ان کے والد یاسرؓ عذاب کی سختیاں سہتے سہتے انتقال کر گئے پھر ابو جہل نے ان کی والدہ سُمیّہؓ کو قتل کر دیا۔ ان کے بھائی عبداللہؓ کو تیر مارا گیا اور وہ گر گئے۔ اب صرف حضرت عمارؓ رہ گئے تھے۔ ان کو پانی میں غوطے دیئے گئے یہاں تک کہ ان سے برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے حضورؐ کا انکار اور ان کے معبودوں کی تعریف کر کے جان چھڑائی۔ پھر روتے ہوئے حضورؐ کے پاس آئے اور یہ حال بیان کیا۔ آپؐ نے پوچھا اپنے دل کی کیا کیفیت پاتے ہو؟ عرض کیا کہ بالکل ایمان پر مطمئن۔ آپؐ نے فرمایا اگر آئندہ ایسا موقع آئے تو پھر یہی کچھ کہہ دینا۔ بیہقی، ابن سعد، ابن جریر، بلاذری، عوفی وغیرہم نے یہ واقعہ نقل کر کے متعدد مفسرین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سورۂ نحل کی آیت ۱۰۶ اسی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے، وہ اگر مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو تب تو معاف ہے، البتہ جو شرحِ صدر کے ساتھ کفر اختیار کرے اس پر اللہ کا غضب ہے اور اس کے لیے سخت عذاب ہے۔

حضرت خبابؓ بن الارتؓ

یہ اصل میں عراقی تھے۔ قبیلۂ ربیعہ میں سے ایک گروہ نے ان کو پکڑ کر غلام بنا لیا اور مکہ لا کر بنی خزاعہ کے ایک خاندان آلِ سباع کے ہاتھ بیچ دیا جو بنی زُہرہ کا حلیف تھا۔ یہ ایک کاریگر آدمی تھے۔ لوہاری کا پیشہ کرتے اور تلواریں بنایا کرتے تھے۔ مسلمان ہونے کے قصور میں پہلے تو انہیں پیٹ کی مار دی گئی۔ مُسند احمد، بخاری اور مسلم میں خود ان کا بیان نقل ہوا ہے کہ میرا کچھ قرض عاص بن وائل سہمی پر آتا تھا۔ میں اس کے پاس تقاضے کے لیے جاتا تو وہ کہتا کہ میں تجھے کچھ نہ دوں گا جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے۔ میں اس کو جواب دیتا کہ میں ہرگز ان کا انکار نہ کروں گا خواہ تو مرے اور پھر زندہ ہو۔ ابن سعد میں ہے کہ اس پر عاص کہتا کہ "اچھا تو مرنے کے بعد پھر جب میں اپنے مال اور اولاد کی طرف پلٹوں گا تو ادا کر دوں گا"۔ ابن ہشام نے یہ واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ عاص نے ان سے بہت سی تلواریں بنوائیں اور قرض بڑھتا چلا گیا۔ انہوں نے جب تقاضا کیا تو اس نے کہا کہ "تیرا یہ صاحب جس کے دین پر تو ہے، کہتا ہے کہ جنت میں بہت سونا چاندی کپڑا اور خدمت گار ہیں۔" انہوں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا تو پھر مجھے قیامت تک مہلت دے۔ وہاں میں ادا کر دوں گا کیونکہ وہاں تو اور تیرا صاحب محمدؐ مجھ سے زیادہ مقبول نہ ہوں گے۔ اس طرح پیٹ کی مار دینے سے بھی جب ظالموں کا دل نہ بھرا تو انہوں نے ان کو

سخت عذاب دینے شروع کیے۔ ابن سعد اور بلاذری نے شعبیؒ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں انہوں نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی جو بالکل برص کے مریض کی کھال جیسی ہو رہی تھی، اور حضرت عمرؓ سے کہا کہ مشرکین نے آگ جلا کر مجھے اس پر گھسیٹا، پھر ایک شخص میرے سینے پر کھڑا ہو گیا اور میری چربی کے پگھلنے سے آگ بجھ گئی۔ (۲۴)

حضورؐ سے حضرت خبابؓ کی فریاد اور آپؐ کا جواب

انہی مظالم کے زمانہ کا وہ واقعہ ہے جو امام احمد بن حنبل، بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے خود حضرت خبابؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں مشرکین کی سختیوں سے ہم بری طرح تنگ آئے ہوئے تھے، ایک روز میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی دیوار کے سائے میں تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ، اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپ ہمارے لیے دعا نہیں فرماتے؟" یہ سن کر آپ کا چہرہ مبارک تمتما اٹھا اور آپؐ نے فرمایا تم سے پہلے جو اہلِ ایمان گزر چکے ہیں اُن پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کو گڑھا کھود کر بٹھایا جاتا اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے جاتے، اور کسی کے جوڑوں پر لوہے کے کنگھے گھسے جاتے تھے تاکہ وہ ایمان سے باز آجائے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا، یہاں تک کہ ایک وقت آنے گا جب ایک شخص صنعاء سے حضرموت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہو گا۔ مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔ (۲۵)

حضرت ابوبکرؓ کا مظلوم غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا

اس ظلم و ستم کے دور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بے تحاشا دولت خرچ کر کے متعدد مظلوم غلاموں اور لونڈیوں کو خرید خرید کر آزاد کر دیا۔ ابن ہشام نے ایسے سات افراد کے نام لیے ہیں لیکن بیہقی، ابن اسحاق، ابن عبدالبرؒ اور ابن حجرؒ وغیرہ نے جو نام گنائے ہیں ان کو جمع کرنے سے جملہ ۹ افراد کی تعداد بنتی ہے۔

(۱) حضرت بلالؓ جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

(۲) اُن کی والدہ حمامہ۔ ابن عبدالبرؒ نے بیان کیا ہے کہ ان کو بھی راہِ خدا میں عذاب دیا جاتا تھا۔

(۳) عامر بن فُہیرہ، ابن سعد، طبری اور بلاذری نے لکھا ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ کے ماں جائے بھائی طفیل بن الحارث کے غلام تھے اور اُن مظلوموں میں شامل تھے جنہیں عذاب دیا جاتا تھا۔

(۴) ابو فُکَیہہ۔ ان کے متعلق ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اُمیّہ بن خلف ان کو سخت عذاب دیتا تھا۔ اور طبقات ابن سعد اور اُسد الغابہ میں ہے کہ بنی عبدالدار کے کچھ لوگ، جن کی غلامی میں یہ تھے، انہیں

دوپہر کے وقت سخت گرمی میں نکالتے، لوہے کی بیڑیاں پہنا کر ان کو تپتی ہوئی زمین پر اوندھا لٹا دیتے اور ان کی پیٹھ پر بھاری پتھر رکھ دیتے، یہاں تک کہ یہ بیہوش ہو کر گر پڑتے۔

(۵) لبینہ یا لبیبہ۔ بلاذری نے ان کا نام لکھا ہے اور ابن ہشام نے نام لیے بغیر ان کا ذکر بنی مؤمل (بنی عدی کی ایک شاخ) کی لونڈی کی حیثیت سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ عمر بن الخطاب اپنے زمانۂ کفر میں ان کو خوب مارتے اور جب مارتے مارتے تھک جاتے تھے تو کہتے کہ میں نے صرف تھک جانے کی وجہ سے تجھے چھوڑا ہے، اور یہ جواب دیتیں کہ اللہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی کرے۔

(۶-۷) نہدیہ اور ان کی بیٹی۔ یہ دونوں بنی عبدالدار کی ایک عورت کی لونڈیاں تھیں۔ ان کی مالکہ بھی ان پر ظلم کرتی تھی۔

(۸) زنیرہ (استیعاب میں ان کا نام زنبرہ لکھا ہے)۔ ابن اثیر نے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ یہ بنی عدی کی لونڈی تھیں اور عمر بن خطاب ان کو عذاب دیتے تھے۔ اور دوسری روایت یہ کہ بنی مخزوم کی لونڈی تھیں اور ابوجہل ان کو عذاب دیتا تھا، یہاں تک کہ ان کی بینائی جاتی رہی۔ ابوجہل نے کہا لات اور عزیٰ نے تجھے اندھا کر دیا۔ انہوں نے کہا لات اور عزیٰ کو تو خبر بھی نہیں کہ انہیں کون پوج رہا ہے یہ فیصلے تو آسمان سے ہوتے ہیں اور میرا رب اس پر قادر ہے کہ میری بینائی واپس دے دے۔ چنانچہ دوسرے روز وہ اٹھیں تو اللہ نے ان کی بینائی بحال کر دی تھی یہی بلاذری کی روایت ہے۔ مگر ابن ہشام نے اس کے برعکس یہ لکھا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا تو ان کی بینائی جاتی رہی۔ قریش کے لوگوں نے اس پر کہنا شروع کیا کہ لات و عزیٰ نے اسے اندھا کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ بیت اللہ کی قسم یہ لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ لات و عزیٰ کسی کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی بحال فرما دی۔

(۹) اُمّ عُبیس (بعض نے عُنَیس اور بعض نے عُبَیس لکھا ہے)۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ یہ بنی زہرہ کی لونڈی تھیں اور اسود بن عبد یغوث ان پر ظلم ڈھاتا تھا۔ (۴۹)

حضرت ابوبکرؓ کے والد کا اعتراض اور آپ کا اُن کو جواب

ابن اسحاق، ابن جریر اور ابن عساکر نے حضرت عامر بن عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اس طرح ان غریب غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی پر روپیہ خرچ کرتے دیکھ کر ان کے والد ابوقحافہ نے (جو اُس وقت مشرک تھے) ان سے کہا کہ بیٹا، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کرا رہے ہو، اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہی روپیہ خرچ کرتے تو وہ تمہارے لیے قوت بازو بنتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ "ابا جان میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے"۔ یہ واقعہ سورۂ لیل کی اس آیت کا بہترین

مصداق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "جہنم کی اس آگ سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار آدمی جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے، اُس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اُسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے ربِّ برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے" (آیات ۱۷ تا ۲۰) یعنی وہ اپنا مال جن لوگوں پر صرف کرتا ہے ان کا کوئی احسان پہلے سے اس پر نہ تھا کہ وہ اس کا بدلہ چکانے کے لیے، یا آئندہ ان سے مزید فائدہ اٹھانے کے لیے ان کو ہدیے اور تحفے دے رہا ہو اور ان کی دعوتیں کر رہا ہو، بلکہ وہ اپنے ربِّ برتر کی رضا جوئی کے لیے ایسے لوگوں کی مدد کر رہا ہے جن کا نہ پہلے اس پر کوئی احسان تھا، نہ آئندہ ان سے وہ کسی احسان کی توقع رکھتا ہے۔ (۲۷)

ظلم کے نتائج

قریش نے مسلمانوں پر ظلم ڈھا کر بظاہر یہ فائدہ اٹھانا چاہا تھا کہ لوگوں پر خوف طاری کر کے اسلام کے پھیلاؤ کو روک دیں لیکن اس کے جو نتائج فی الواقع نکلے وہ ان کی توقعات کے بالکل خلاف تھے۔ اول تو اس سے یہ بات بالکل کھل کر سامنے آگئی کہ اسلام جو اخلاق اور دلائل لے کر آیا ہے اُن کا کوئی جواب کفر کے پاس ان خلافِ انسانیت حربوں کے سوا نہیں ہے۔ دوسرے اس بے رحمی و سنگدلی کو دیکھ کر ہر نیک سرشت انسان کی فطرت کفر اور اس کے علمبرداروں سے نفرت کرنے لگی اور جس صبر و استقامت کے ساتھ مسلمانوں نے اس بے جا ظلم کو برداشت کیا اس کی وجہ سے تمام غیر متعصب دلوں میں ان کے لیے ہمدردی بھی پیدا ہوئی اور قدر و منزلت بھی۔ بلکہ درحقیقت اُس نے اسلام کی دھاک بٹھا دی کہ یہ کیسے ہی کے معاشرے میں سے اس کو ایسے پختہ، اولوالعزم اور زبردست قوتِ ایمانی رکھنے والے انسان مل گئے ہیں جو کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں، صرف حق کی خاطر بڑی سے بڑی مصیبت جھیل سکتے ہیں۔ پھر کفار کے یہ حربے اسلام کے پھیلاؤ کو بھی نہ روک سکے۔ اس ظلم کے باوجود ایسے اللہ کے بندے نکلتے ہی رہے جنہوں نے کفار کے علی الرغم اسلام قبول کیا اور بہت سے لوگ دل میں ایمان لے آئے مگر اس کا اظہار انہوں نے نہیں کیا جس کی وجہ سے اعدائے اسلام بھی یہ صحیح اندازہ نہ کر سکے کہ اُن کے درمیان اس دین کے کتنے حامی چھپے ہوئے ہیں جن کی پوشیدہ حمایت کفر کے حصار میں شگاف ڈال سکتی ہے۔ سب سے بڑا فائدہ اس ظلم کا اسلام کو یہ پہنچا کہ اس بھٹی سے گزر کر جو لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آتے وہ نسلِ آدم کے بہترین انسان تھے۔ اس حالت میں کوئی کمزور سیرت و کردار کا آدمی اس طرف کا رُخ بھی نہ کر سکتا تھا (۲۸)

ایک اور نیا فتنہ

اللہ تعالیٰ کی حکمت کے کام بھی نرالے ہیں جنہیں عقلِ نارسا کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ عین اُس زمانہ میں جبکہ کفر و اسلام

کی باہمی کشمکش اس شدت کو پہنچی ہوئی تھی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر زندگی کا ایک ایک لمحہ سخت گزر رہا تھا بظاہر تو اس بات کا مقتضی تھا کہ حضورؐ پر وحی کا نزول پیہم جاری رہتا جس میں ہر روز پیش آنے والے نت نئے حالات میں رہنمائی بھی ہوتی، نبیؐ و اصحابؓ نبی کے لیے تسلی اور ہمت افزائی بھی ہوتی، اور کفار کے لیے ان مظالم پر تہدید بھی۔ لیکن اسی زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکایک نزولِ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا، جس پر حضورؐ بھی سخت پریشان ہوتے اور کفار کو بھی باتیں بنانے کا خوب موقع ملا۔

اس فترۂ وحی کا زمانہ ٹھیک کتنا تھا، یہ تو معلوم نہیں ہے مگر اس سلسلہ میں جو روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں ان سے بھی، اور خود ان دو سورتوں کے مضمون سے بھی جو اس فترہ کے خاتمہ پر نازل ہوئیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعوتِ عام شروع ہو جانے اور کارزارِ کفر و اسلام کا میدان گرم ہو جانے کے بعد پیش آیا تھا۔ مختلف روایات میں اس فترہ کی مدت مختلف بیان کی گئی ہے۔ ابن جُریج نے ۱۲ روز نقل کیے ہیں، ابن عباس نے ۲۵ روز، سُدّی اور مُقاتل نے ۴۰ روز اس کی مدت بیان کی ہے۔ بہر حال یہ زمانہ اتنا طویل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر سخت غمگین ہو گئے تھے، اور مخالفین بھی آپؐ کو طعنے دینے لگے تھے کیونکہ حضورؐ پر جو نئی سورۃ نازل ہوتی تھی، اسے آپؐ لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ اس لیے جب اچھی خاصی مدت تک آپؐ نے نئی وحی لوگوں کو نہ سنائی تو مخالفین نے سمجھ لیا کہ وہ سرچشمہ بند ہو گیا ہے جہاں سے یہ کلام آتا تھا۔ جُندُب بن عبد اللہ البَجَلی کی روایت ہے کہ جب جبریل علیہ السلام کے آنے کا سلسلہ رک گیا تو مشرکین نے کہنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے رب نے چھوڑ دیا ہے (ابن جریر، طَبَرانی، عَبد بن حُمید، سعید بن منصور، ابن مَردُوْیہ)۔

دوسری روایات میں مذکور ہے کہ ابو لہب کی بیوی اُمِّ جمیل نے، جو حضورؐ کی چچی ہوتی تھی اور جس کا گھر حضورؐ کے مکان سے متصل تھا، آپؐ سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے"۔ عَوفی اور ابن جریر نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ کئی روز تک جبریل کی آمد رک جانے سے حضورؐ پریشان ہو گئے اور مشرکین کہنے لگے کہ ان کا رب ان سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ قَتادہ اور ضَحّاک کی مُرسَل روایات میں بھی قریب قریب یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اس صورتِ حال میں حضورؐ کے شدید رنج و غم کا حال بھی متعدد روایات میں آیا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ محبوب کی طرف سے بظاہر عدمِ التفات، کفر و ایمان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے بعد اُسی ذریعۂ طاقت سے بظاہر محرومی جو اس جانگسل کشمکش کے منجدھار میں آپؐ کے لیے واحد سہارا تھا، اور اس پر مزید دشمنوں کی شماتت، یہ ساری چیزیں مل جل کر لامحالہ حضورؐ کے لیے سخت پریشانی کی موجب ہوتی ہوں گی اور آپؐ کو بار بار یہ شبہ گزرتا ہو گا کہ کہیں

مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا ہے کہ میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہو اور اس نے مجھے حق و باطل کی اس لڑائی میں تنہا چھوڑ دیا ہو۔

سورۂ ضحیٰ کا نزول

اس پر سورۂ ضحیٰ نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا:

وَالضُّحٰی ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰی ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی ۔ (آیت ۱-۳)

"قسم ہے روزِ روشن کی اور رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جاتی ہے۔ اے نبیؐ تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔"

یعنی جس طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریکی اور سکون لیے ہوئے چھا جانا کچھ اس بنا پر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ دن کے وقت لوگوں سے خوش اور رات کے وقت ان سے ناراض ہو جاتا ہے، بلکہ یہ دونوں حالتیں ایک عظیم حکمت و مصلحت کے تحت طاری ہوتی ہیں، اسی طرح کبھی تم پر وحی بھیجنا اور کبھی اس کو روک لینا بھی حکمت و مصلحت کی بنا پر ہے، اس کا کوئی تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ جب اللہ تم سے خوش ہو تو وحی بھیجے اور جب وہ وحی نہ بھیجے تو اس کے معنی یہ ہوں کہ وہ تم سے ناخوش ہے اور اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ دن کی روشنی اگر مسلسل آدمی پر طاری رہے تو وہ اسے تھکا دے۔ اس لیے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ دن کے بعد رات آئے تاکہ اس میں انسان کو سکون ملے۔ اسی طرح وحی کی روشنی اگر تم پر پے در پے پڑتی رہے تو تمہارے اعصاب اس کو برداشت نہ کر سکیں گے، اس لیے وقتاً فوقتاً فترۃ (وحی بند رہنے کا ایک زمانہ) بھی اللہ تعالیٰ نے اس مصلحت کی بنا پر رکھا ہے کہ نزولِ وحی سے جو بار تم پر پڑتا ہے اس کے اثرات زائل ہو جائیں اور تمہیں سکون حاصل ہو جائے۔

لے نزولِ وحی کا بار حضورؐ پر کس قدر شدید پڑتا تھا اس کا اندازہ اُن روایات سے ہوتا ہے جو اس کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اس حالت میں نازل ہوئی کہ آپ اپنا زانو میرے زانو پر رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ میرے زانو پر اس وقت ایسا سخت بوجھ پڑا کہ معلوم ہوتا تھا اب ٹوٹ جائے گا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سخت سردی کے زمانے میں حضورؐ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، آپ کی پیشانی سے اس وقت پسینہ ٹپکنے لگتا تھا (بخاری، مسلم، مالک، ترمذی، نسائی)۔ ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی آپ پر اس حالت میں وحی نازل ہوتی کہ آپ اونٹنی پر بیٹھے ہوتے تو اونٹنی اپنا سینہ زمین پر ٹکا دیتی تھی اور اس وقت تک حرکت نہ کر سکتی تھی جب تک نزولِ وحی کا سلسلہ ختم نہ ہو جاتا (مسند احمد، حاکم، ابن جریر)۔

اس کے بعد فرمایا

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۔ (آیت ۴)

"اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے"

یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جبکہ چند مٹھی بھر آدمی آپؐ کے ساتھ تھے۔ ساری قوم مخالفت پر تُلی ہوئی تھی۔ بظاہر کامیابی کے آثار دُور دُور تک کہیں نظر نہ آ رہے تھے، اسلام کی شمع مکے ہی میں ٹمٹما رہی تھی، اور اس کو بجھانے کے لیے ہر طرف طوفان اُٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ ابتدائی دَور کی مشکلات سے آپؐ ذرا پریشان نہ ہوں، ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے آپ کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔ آپؐ کی قوّت، آپؐ کی عزّت و شوکت اور آپؐ کی قدر و منزلت بڑھتی چلی جائے گی اور آپؐ کا نفوذ و اثر پھیلتا جائے گا۔ اور یہ وعدہ دنیا ہی تک کے لیے نہیں ہے بلکہ آخرت آپؐ کے لیے دنیا سے بھی بہتر ہوگی۔

پھر فرمایا:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۔ (آیت ۵)

"اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"

یعنی اگرچہ دینے میں کچھ دیر تو لگے گی، لیکن وہ وقت دُور نہیں ہے جب تم پر تمہارے رب کی عطا و بخشش کی وہ بارش ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ یہ وعدہ حضورؐ کی زندگی ہی میں اس طرح پورا ہُوا کہ سارا ملکِ عرب جنوب کے سواحل سے لیکر شمال میں سلطنتِ رُوم کی شامی اور سلطنتِ فارس کی عراقی سرحدوں تک، اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر مغرب میں بحرِ احمر تک آپؐ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ضابطہ کی تابع ہو گئی۔ جو طاقت بھی اس سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو کر رہ گئی۔ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے وہ پورا ملک گونج اٹھا جس کے مشرکین اور اہلِ کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دم تک ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے۔ لوگوں کے صرف سر ہی اطاعت میں نہیں جھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مسخر ہو گئے اور عقائد، اخلاق اور اعمال میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ پوری انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ایک قوم صرف ۲۳ سال کے اندر اتنی بدل گئی ہو۔ اس کے بعد حضورؐ کی برپا کی ہوئی تحریک اس طاقت کے ساتھ اٹھی کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر چھا گئی اور دُنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُول کو دُنیا میں دیا۔ اور آخرت میں جو کچھ دے گا

اس کی عظمت کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ (۳۰)

سُورۃ اَلَم نَشرَح کا نزول

اسی کے قریب زمانے میں جبکہ دعوتِ اسلامی کے آغاز کی مشکلات حضورؐ کے لیے سخت پریشان کُن ثابت ہو رہی تھیں، آپؐ کی تسلی کے لیے سُورۃ اَلَم نَشرَح نازل ہُوئی جس کے بعض متعلقہ اجزاء یہاں مع تشریح نقل کیے جاتے ہیں۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (آیت ۱)

"(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟"

اس سوال سے کلام کا آغاز، اور پھر بعد کا مضمون خود صاف ظاہر کرتا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اُس زمانے میں اُن شدید مشکلات پر سخت پریشان تھے جو علی الاعلان دعوتِ اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد ابتدائی دور میں آپؐ کو پیش آ رہی تھیں۔ اِن حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مخاطب کر کے تسلی دیتے ہُوئے فرمایا کہ اَے نبی، کیا ہم نے یہ اور یہ عنایات تم پر نہیں کی ہیں؟ پھر اِن ابتدائی مشکلات پر تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سینہ کھولنے کا لفظ قرآن مجید میں جن مواقع پر آیا ہے اُن پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں:

(۱) سورۂ انعام آیت ۱۲۵ میں فرمایا فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ "پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔" اور سُورۂ زمر آیت ۲۲ میں فرمایا اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ "تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو پھر وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہو . . . ." ان دونوں مقامات پر شرحِ صدر سے مراد ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردّد سے پاک ہو کر اِس بات پر پُوری طرح مطمئن ہو جانا ہے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی عقائد، وہی اصُولِ اخلاق و تہذیب و تمدّن اور وہی احکام و ہدایات بالکل صحیح ہیں جو اسلام نے انسان کو دیے ہیں۔

(۲) سُورۂ شعراء آیت ۱۲-۱۳ میں ذکر آیا ہے کہ حضرت مُوسیٰ کو جب اللہ تعالیٰ نبوت کے منصب عظیم پر مامور کر کے فرعون اور اس کی عظیم سلطنت سے جا ٹکرانے کا حکم دے رہا تھا تو انہوں نے عرض کیا رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ وَيَضِيْقُ صَدْرِیْ "میرے رب، مَیں ڈرتا ہُوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے۔" اور سُورۂ طٰہٰ آیات ۲۵-۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسی موقع پر حضرت مُوسیٰ نے

اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ "میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے"۔ یہاں سینے کی تنگی سے مراد یہ ہے کہ نبوّت جیسے کارِ عظیم کا بار سنبھالنے اور تن تنہا کفر کی ایک جابر و قاہر طاقت سے ٹکر لینے کی آدمی کو ہمّت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرحِ صدر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بلند ہو جائے، کسی بڑی سے بڑی مُہم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو انجام دینے میں بھی اسے تامّل نہ ہو، اور نبوّت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی اُس میں ہمّت پیدا ہو جائے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اِس آیت میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں ہی معنی مُراد ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت سے پہلے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکینِ عرب، نصاریٰ، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے، اور اُس حنیفیت پر بھی مطمئن نہ تھے جو عرب کے بعض تاملین توحید میں پائی جاتی تھی، کیونکہ یہ ایک مُبہم عقیدہ تھا جس میں راہِ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی (اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۵ میں کر چکے ہیں)، لیکن آپؐ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہِ راست کیا ہے، اس لیے آپ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا تھے۔ نبوّت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اِس خلجان کو دُور کر دیا اور وہ راہِ راست کھول کر آپ کے سامنے رکھ دی جس سے آپؐ کو کامل اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وہ حوصلہ، وہ ہمّت، وہ اولوالعزمی اور وہ وسعتِ قلب عطا فرما دی جو اِس منصبِ عظیم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ آپؐ اُس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپؐ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سما نہ سکتا تھا۔ آپؐ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دُور کرنے اور سنوار دینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ آپ اِس قابل ہو گئے کہ جاہلیت میں مستغرق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اکھڑ معاشرے میں کسی سر و سامان اور ظاہر اً کسی پُشت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جائیں، مخالفت اور دشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے سے بھی نہ ہچکچائیں، اِس راہ میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پیش آئیں اُن کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں، اور کوئی طاقت آپؐ کو اپنے موقف سے نہ ہٹا سکے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ "اے نبیؐ، یہ شرحِ صدر کی بے بہا دولت جب اللہ نے آپ کو عطا کر دی ہے تو آپ اُن مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغازِ کار کے اس مرحلے میں پیش آ رہی ہیں؟"[1]

---

[1] بعض مفسرین نے شرحِ صدر کو شقِّ صدر کے معنی میں لیا ہے اور اس آیت کو اُس معجزۂ شقِّ صدر کا ثبوت قرار

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (آیت ۴) -

"اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا"۱؎

یہ بات اُس وقت فرمائی گئی تھی جب کہ قریش کے سارے دشمنانِ اسلام حضورؐ کو بدنام کرنے میں لگے ہوئے تھے اور خاص طور پر حج کے زمانہ میں ولید بن مُغیرہ کی تجویز کردہ اسکیم کے مطابق (جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں) حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جا کر آپؐ کے خلاف ایسی باتیں پھیلائی جا رہی تھیں جن سے لوگ آپؐ سے بدگمان ہو کر آپؐ سے دُور بھاگنے لگیں۔ پھر اس حالت میں یہ آپؐ کے رفعِ ذکر کی خوشخبری کیسی تھی؟

سب سے پہلے آپؐ کے رفعِ ذکر کا کام اللہ تعالیٰ نے خود آپؐ کے دشمنوں ہی سے لیا۔ کفارِ مکہ نے آپؐ کو زک دینے کے لیے جو طریقے اختیار کیے تھے ان کی وجہ سے آپؐ کا اسمِ گرامی عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا اور مکہ کے گوشۂ گمنامی سے نکال کر خود دشمنوں ہی نے آپؐ کو تمام ملک کے قبائل سے متعارف کرا دیا۔ اس کے بعد یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ شخص ہے کون؟ کیا کہتا ہے؟ کیسا آدمی ہے؟ اس کے "جادو" سے متاثر ہونے والے لوگ کیسے ہیں اور اُن پر اس کے "جادو" کا آخر کیا اثر پڑا ہے؟ کفارِ مکہ کا پروپیگنڈا جتنا جتنا بڑھتا چلا گیا لوگوں میں یہ جستجو بڑھتی چلی گئی۔ پھر جب اس جستجو کے نتیجے میں لوگوں کو آپؐ کے اخلاق اور آپؐ کی سیرت و کردار کا حال معلوم ہوا، جب لوگوں نے قرآن سُنا اور انہیں پتہ چلا کہ وہ تعلیمات کیا ہیں جو آپؐ پیش فرما رہے ہیں، اور جب دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ جس چیز کو جادو کہا جا رہا ہے اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگیاں عرب کے عام لوگوں کی زندگیوں سے کس قدر بلند اور پاکیزہ ہو گئی ہیں، تو وہی بدنامی نیک نامی سے بدلنی شروع ہو گئی، حتیٰ کہ ہجرتِ مدینہ کا زمانہ آنے تک نوبت یہ پہنچ گئی کہ دور و نزدیک کے عرب قبائل میں شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو جس میں کسی نہ کسی شخص نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو، اور جس میں کچھ نہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپؐ کی دعوت سے ہمدردی و دلچسپی رکھنے والے پیدا نہ ہو گئے ہوں۔ یہ حضورؐ کے رفعِ ذکر کا پہلا مرحلہ تھا جو اس سورہ کے

---

* دیا ہے جو احادیث کی روایات میں بیان ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معجزے کے ثبوت کا مدار احادیث کی روایات ہی پر ہے، قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرحِ صدر کو کسی طرح بھی شقِ صدر کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ حمل الشرح فی الآیۃ علی شق الصدر ضعیف عند المحققین "محققین کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شق پر محمول کرنا ایک کمزور بات ہے" (۳۱)

۱؎ اس سے پہلے آیات ۲-۳ کی تشریح گزر چکی ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

نزول کے وقت گزر رہا تھا اور سب اس کے اثرات دیکھ رہے تھے۔

اس کے چند ہی سال بعد اس کے دوسرے مراحل پیش آتے ہیں کہ اس وقت کوئی بھی نہ دیکھ سکتا تھا، نہ ان کا تصور کر سکتا تھا۔ بس اللہ ہی ان کا علم رکھتا تھا، اور اسی نے ان کی بشارت حضورؐ کو دی۔ ہجرت کے بعد منافقین، یہود، اور عرب کے تمام اکابر مشرکین ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے، اور دوسری طرف مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست خدا پرستی و خدا ترسی، زہد و تقویٰ، طہارتِ اخلاق، حسنِ معاشرت، عدل و انصاف، انسانی مساوات، مالداروں کی فیاضی، غریبوں کی خبر گیری، عہد و پیمان کی پاسداری اور معاملات میں راستبازی کا وہ عملی نمونہ پیش کر رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتا چلا جا رہا تھا۔ دشمنوں نے جنگ کے ذریعہ سے حضورؐ کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی کوشش کی، مگر آپؐ کی قیادت میں اہلِ ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے اپنے نظم و ضبط، اپنی شجاعت، اپنی موت سے بے خوفی، اور حالتِ جنگ تک میں اخلاقی حدود کی پابندی سے اپنی برتری اس طرح ثابت کر دی کہ سارے عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ ۱۰ سال کے اندر حضورؐ کا رفعِ ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپؐ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا، اس کا گوشہ گوشہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی صدا سے گونج اٹھا۔ پھر خلافتِ راشدہ کے دور سے آپؐ کا نامِ مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور وہاں دن میں پانچ مرتبہ اذان میں بآواز بلند محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں حضورؐ پر درود نہ بھیجا جا رہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپؐ کا ذکرِ خیر نہ کیا جاتا ہو، اور سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن اور دنوں کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب روئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ حضورؐ کا ذکرِ مبارک نہ ہو رہا ہو۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اسے نبیؐ، اس وقت کے شدائد و مصائب سے تم کیوں پریشان ہوتے ہو، تمہارے رفعِ ذکر کا تو ہم نے وہ انتظام کیا ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔ حدیث میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جبریلؑ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا میرا رب اور آپؐ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کس طرح تمہارا رفعِ ذکر کیا؟ میں نے عرض کیا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا" (ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابو یعلیٰ، ابن المنذر، ابن حبان، ابن مردویہ، ابو نعیم)۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (آیات ۵ : ۶)

"پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔"
اس بات کو دو مرتبہ دہرایا گیا ہے تاکہ حضورؐ کو پوری طرح تسلی دے دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپ اس وقت گزر رہے ہیں یہ زیادہ دیر رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد قریب ہی اچھے حالات چلے آ رہے ہیں۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہو کیونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں۔ لیکن تنگی کے بعد فراخی کہنے کے بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کیے گئے ہیں کہ فراخی کا دور اس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی لگا چلا آ رہا ہے۔ (۳۲)

حوالہ جات باب (۸)

۱. اضافہ از مؤلف
۲. تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، خلاصہ حاشیہ ۵ و جلد چہارم خلاصہ دیباچہ حٰم السجدہ۔
۳. اضافہ از مؤلف
۴. تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورہ الکٰفرون۔
۵. اضافہ از مؤلف
۶. تفہیم القرآن، جلد چہارم، خلاصہ دیباچہ سورہ صٓ
۷. دیباچہ سورہ صٓ
۸. اضافہ از مؤلف
۹. تفہیم القرآن، جلد ششم، خلاصہ دیباچہ سورہ کوثر، حاشیہ ۴
۱۰. " ، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ ۳۰
۱۱. " ، جلد ششم، المعارج، حاشیہ ۲۴
۱۲. " ، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۲۴
۱۳. " ، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ ۴۹
۱۴. " " ، الشوریٰ، حاشیہ ۳۱
۱۵. " ، جلد ششم، المطففین، حاشیہ ۱۷
۱۶. " ، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۲۲
۱۷. " ، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷
۱۸. " ، جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۹
۱۹. اضافہ از مؤلف
۲۰. تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورہ مدثر

(۴۱) تفہیم القرآن ، جلد ششم تفسیر سورۂ مدثر

(۴۲) اضافہ از مؤلف

(۴۳) تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، دیباچہ الرحمٰن

(۴۴) اضافہ از مؤلف

(۴۵) تفہیم القرآن ، جلد سوم ، دیباچہ سورۂ مریم و سورۂ عنکبوت حاشیہ ۱

(۴۶) اضافہ از مؤلف

(۴۷) تفہیم القرآن ، جلد ششم ، اللیل ، خلاصہ حاشیہ ۱۰

(۴۸) اضافہ از مؤلف

(۴۹) تفہیم القرآن ، جلد ششم ، الزلزال ، حاشیہ ۵

(۵۰) 〃 〃 〃 ، الضحیٰ ، حواشی ۳ تا ۵

(۵۱) 〃 〃 〃 ، الم نشرح حاشیہ ۱

(۵۲) 〃 〃 〃 ، حواشی ۱ - ۳ - ۴

باب (۹)

ہجرتِ حبشہ

دین میں ہجرت کی اہمیت

قرآن مجید میں جہاد کے بعد دوسری اہم ترین چیز جس کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ہجرت ہے۔ اس ہجرت کی اسلام میں کیوں اتنی اہمیت ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ اہم اگر کوئی چیز ہے تو وہ نہ اس کا اپنا وطن ہے، نہ اس کی قوم ہے، نہ اس کی روزی ہے، نہ اس کا پیٹ ہے، بلکہ اس کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ جن اصولوں پر وہ ایمان لایا ہے ان کے مطابق وہ زندگی بسر کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکے۔ اگر وہ اُن اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکے تو اس کے لیے آزادی کیا خود زندگی ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خدا کی راہ میں قربان کر دینا زیادہ بہتر سمجھے گا بہ نسبت اس کے کہ اُن اصولوں کو قربان کرے جن پر اس کے ایمان کا انحصار ہے اور جن کے متعلق وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اصول حق ہیں اور خدا اور رسول کے دیے ہوئے ہیں۔

عرب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن پیروؤں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی وہ اسی بنا پر کی تھی۔ عرب اور قریشی اور مکی ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنے ملک، اپنے قبیلے اور اپنے شہر میں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، لیکن کوئی آزادی اگر حاصل نہیں تھی تو صرف مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے وطن کو چھوڑا اور ایک دوسرے ملک میں چلے گئے جہاں ایک دوسری قوم آباد تھی اور ایک دوسری قوم کے ہاتھ میں حکومت تھی۔ اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو کیوں کی؟ آپ مکہ کے باشندے تھے۔ مکہ میں آپ کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو مکہ کے کسی شہری کو حاصل ہو سکتے تھے۔ آپ کے ساتھیوں کو بھی وہ تمام حقوق حاصل تھے جو کسی قریشی کو قریشی ہونے کی بنا پر حاصل ہوتے تھے، لیکن جس چیز کی وجہ سے آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے گھر بار چھوڑا، رشتہ داروں کو چھوڑ دیا، جائدادیں چھوڑ دیں اور تن کے کپڑوں میں نکل کھڑے ہوئے وہ چیز یہ تھی کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے

ان کو آزادی میسّر نہیں تھی۔ اسی آزادی کے لیے انہوں نے وطن چھوڑ دیا اور ایک دوسرے شہر میں جا کر آباد ہو گئے۔ (۱)

قرآن میں مسلمانوں کو ہجرت کے لیے تیار کیا جاتا ہے

مکّہ میں جب مسلمانوں پر ظلم کی حد ہو گئی تو قرآن مجید میں اُن کو ہجرت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا گیا۔ ارشاد ہوا:-

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ
الْمَوْتِ ۔ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ
الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا
وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۔ وَکَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۔ اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَاِیَّاکُمْ وَهُوَ
السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (العنکبوت - ۵۶ تا ۶۰)

"اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی بندگی بجالاؤ۔ ہر متنفّس کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنّت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے ــــ اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی اُن کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی، اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

پہلی آیت میں اشارہ ہے ہجرت کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مکّے میں خدا کی بندگی کرنا مشکل ہو گئی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے، جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ۔ تم کو قوم و وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ اِس میں یہ تلقین کی گئی کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے۔ اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے۔ جو سچا مومن ہے وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم، وطن اور ملک کو لات مار دے گا۔ جو جھوٹا مدعیِ ایمان ہے وہ ایمان کو چھوڑ دیگا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا۔ اِس میں صراحت کے ساتھ مسلمانوں کو بتا دیا گیا کہ ایک سچا خدا پرست انسان محبِّ قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست

نہیں ہو سکتا۔ اُس کے لیے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے جس پر وہ دنیا کی ہر چیز کو قربان کر دے گا مگر اُسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ تم جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے۔ ہمیشہ رہنے کے لیے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لہٰذا تمہارے لیے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائقِ فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کیے جائیں۔ آخر کار تمہیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے۔ اگر دنیا میں جان بچانے کے لیے ایمان کھو کر آئے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہو گا اور ایمان بچانے کے لیے جان کھو کر آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہو گا۔ پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے، جان پر قربان کیا ہُوا ایمان؟ یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان؟

تیسری اور چوتھی آیت میں بتایا گیا کہ اگر تم ایمان اور نیکی کے راستے پر چل کر بالفرض دنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دنیوی نقطۂ نظر سے سراسر ناکام بھی رہے تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہر حال ہو گی اور نری تلافی ہی نہ ہو گی بلکہ بہترین اجر نصیب ہو گا۔ جو لوگ ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے ہوں، جنہوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جان پر جھیلا ہو اور منہ نہ موڑا ہو، جنہوں نے ترکِ ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور ان کی طرف ذرہ برابر التفات نہ کیا ہو، جنہوں نے کفار و فساق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا ہو اور ان کی دولت و حشمت پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالی ہو، جنہوں نے بھروسا اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار اور اپنے کنبے قبیلے پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا ہو، جو اسبابِ دُنیوی سے قطع نظر کر کے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ سہنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کے لیے تیار ہو گئے ہوں اور وقت آیا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہوں، ایسے مومن و صالح بندوں کا اجر ان کے رب کے ہاں ہرگز ضائع نہ ہو گا۔ وہ اس دُنیا میں بھی ان کی دستگیری فرمائے گا اور آخرت میں بھی ان کے عمل کا بہترین اجر دے گا۔

آخر میں یہ تلقین کی گئی کہ ہجرت کرنے میں فکرِ جان کی طرح فکرِ روزگار سے بھی تمہیں پریشان نہ ہونا چاہیے۔ آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو ہوا اور خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں، ان میں سے کون اپنا رزق اُٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو ان سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا اہلِ ایمان یہ سوچ سوچ کر ہمت نہ ہاریں کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے انہیں بھی دے گا۔

دعوتِ حق کی راہ میں ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جس میں ایک حق پرست آدمی کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ عالمِ اسباب کے تمام سہاروں سے قطع نظر کر کے محض اللہ کے بھروسے پر جان جوکھوں کی بازی لگا دے۔ ان حالات میں وہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور قدم اٹھانے سے پہلے جان کے تحفظ اور رزق کے حصول کی ضمانتیں تلاش کرتے ہیں۔ درحقیقت اس طرح کے حالات بدلتے ہی اُن لوگوں کی طاقت سے ہیں جو سر ہتھیلی پر لے کر اُٹھ کھڑے ہوں اور ہر خطرے کو انگیز کرنے کے لیے بے دھڑک تیار ہو جائیں۔ انہی کی قربانیاں آخر کار وہ وقت لاتی ہیں جب اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے اور اُس کے مقابلے میں سارے کلمے پست ہو کر رہ جاتے ہیں۔ (۲)

دوسری جگہ فرمایا:

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۔ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۔ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ (الزمر۔ آیت ۱۰)

"(اے نبیؐ) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو۔ جن لوگوں نے اس دُنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے۔ اور خدا کی زمین وسیع ہے صبر کرنے والوں کو تو اُن کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔"

یہاں بھی اہلِ ایمان کو ہدایت فرمائی گئی کہ اگر اللہ کی بندگی کے لیے ایک جگہ تنگ ہو گئی ہے تو اُس کی زمین وسیع ہے، اپنا دین بچانے کے لیے کسی اور طرف نکل کھڑے ہو۔ اس کے ساتھ اُن کو یہ خوشخبری بھی دی گئی کہ ان کے لیے دُنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے۔ ان کی دُنیا بھی سُدھرے گی اور آخرت بھی، کیونکہ انہوں نے دین کو دُنیا اور اس کے عیش و آرام و آسائش پر ترجیح دی ہے۔ محض دین کی خاطر گھر سے بے گھر، در سے بے در، وطن سے بے وطن ہو کر دوسرے شہر یا علاقہ میں ہجرت کی ہے۔ ایک شہر یا علاقہ یا ملک جب اللہ کی بندگی کرنے کے لیے تنگ ہو گیا تو وہ دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے بے حساب اجر ہے جو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلنے میں ہر طرح کے مصائب و شدائد برداشت کر لیں اور راہِ حق سے نہ ہٹیں۔ یہ بے حساب اجر کا وعدہ صرف ہجرت کرنے والوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ اُن لوگوں کے لیے بھی ہے جو ظلم کی سرزمین میں جم کر ہر آفت کا سامنا کرتے چلے جائیں۔ (۳)

ہجرت کے موقع پر ہدایات

قرآن مجید میں مکہ کے مظلوم مسلمانوں کو صرف ہجرت کی تلقین ہی نہیں کی گئی، بلکہ دو قسم کی ہدایات بھی دی گئیں۔

چونکہ مسلمان ہجرت کرکے ایک عیسائی ملک کی طرف جا رہے تھے اس لیے اِس موقع پر سورۂ مریم نازل کی گئی جس کے ابتدائی دو رکوعوں میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السّلام کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزیں گروہ کی حیثیت سے جا رہے تھے، مگر اِس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے اُن کو دین کے معاملہ میں ذرّہ برابر مُداہنت کرنے کی تعلیم نہ دی بلکہ چلتے وقت زادِ راہ کے طور پر یہ سورۃ ان کے ساتھ کی تاکہ عیسائیوں کے ملک میں عیسیٰ علیہ السّلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور اُن کے ابن اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کر دیں، خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو۔

دوسری ہدایت یہ کی گئی کہ

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَھۡلَ الۡکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡھُمۡ وَقُوۡلُوۡٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیۡٓ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَاُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَاِلٰـھُنَا وَاِلٰـھُکُمۡ وَاحِدٌ وَّنَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ ۔(العنکبوت)

"اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے، سوائے اُن لوگوں کے جو ظالم ہوں اور اُن سے کہو کہ ہم ایمان لاتے ہیں اُس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اُس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اُسی کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔"

یعنی اہلِ کتاب (عیسائیوں) سے جب سابقہ پیش آئے تو اُن میں سے جو ظالم ہیں ان سے تو اُلجھنے کی ضرورت نہیں، مگر جو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تیار ہوں اُن سے نہایت معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں اور افہام و تفہیم کے انداز میں بحث کرو۔ ان کو بتاؤ کہ ہم کوئی متعصب گروہ نہیں ہیں جو اپنے ہاں آئی ہوئی کتاب کو مانتے ہوں اور تمہارے ہاں آئی ہوئی کتابوں کو نہ مانتے ہوں۔ ہم تو حق کے پرستار ہیں۔ خدا کی طرف سے جو کچھ ہمارے ہاں آیا ہے اسے بھی برحق مانتے ہیں اور جو تمہارے ہاں آیا تھا اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا جُدا جُدا نہیں ہے بلکہ ایک ہی خدا ہے جس کے ہم بھی ماننے والے ہیں اور تم بھی۔ ہم نے اُسی ایک خدا کی بندگی و اطاعت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ (۴)

ہجرتِ حبشہ اُولیٰ

حالات جب ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۵ عام الفیل (۵ بعد بعثت) میں حضورؐ نے اپنے اصحابؓ سے فرمایا کہ لَوْ خَرَجْتُمْ اِلَی اَرْضِ الْحَبَشَۃِ فَاِنَّ بِھَا مَلِکًا لَا یُظْلَمُ عِنْدَہٗ اَحَدٌ وَھِیَ اَرْضُ صِدْقٍ حَتّٰی یَجْعَلَ اللہُ لَکُمْ فَرَجًا مِّمَّا اَنْتُمْ فِیْہِ "اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ جب تک اللہ

تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ کرے تم لوگ وہاں ٹھیرے رہو۔" اس ارشاد کے مطابق حبش کی طرف پہلی ہجرت ہوئی جس میں ۱۱ مرد اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی۔ قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا مگر خوش قسمتی سے شُعَیبہ کے بندرگاہ پر ان کو بروقت حبش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ (۵)

پہلی ہجرت کے مہاجرین

ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے اس پہلی ہجرت کے مہاجرین کی جو فہرست دی ہے وہ یہ ہے:۔

(۱) بنی اُمیّہ میں سے حضرت عثمانؓ بن عفّان۔

(۲) ان کی بیوی حضرت رُقیّہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ اُن کے ساتھ اُمّ ایمنؓ بھی گئی تھیں)۔

(۳) بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے حضرت ابو حُذَیفہ بن عُتبہ بن ربیعہ۔

(۴) اُن کی بیوی حضرت سَہلہ بنت سُہَیل بن عَمرو (جو بنی عامر بن لؤی میں سے تھیں)۔

(۵) بنی اَسَد بن عبد العُزّٰی بن قُصَیّ میں سے حضرت زبیرؓ بن العوّام۔ (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی)

(۶) بنی عبد الدار بن قُصَیّ میں سے حضرت مُصعَبؓ بن عُمیر۔

(۷) بنی زُہرہ بن کلاب میں سے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔

(۸) بنی مخزوم میں سے حضرت ابو سلمہؓ بن عبد الاسد۔

(۹) اُن کی بیوی اُمِّ سلمہ (یہ بھی بنی مخزوم میں سے تھیں اور ابوجہل کی سگی چچا زاد بہن تھیں)

(۱۰) بنی جُمَح میں سے حضرت عثمان بن مَظعُون (اُمّ المومنین حضرت حفصہؓ کے ماموں)

(۱۱) حُلَفائے بنی عَدِی میں سے عامرؓ بن ربیعۃ العنزی (حلیف آلِ خطّاب)

(۱۲) اُن کی بیوی لیلیٰ بنت ابی حَثمہ۔ (یہ خود بنی عدی میں سے تھیں)۔

(۱۳) بنی عامر بن لؤی میں سے ابو سبرہؓ بن ابی رُہم۔

(۱۴) بنی الحارث بن فہر میں سے سُہیل بن بیضاء۔

ابن سعد نے واقدی کے حوالے سے اِن پر دو ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ حاطبؓ بن عمرو بن عبد شمس اور عبداللہ بن مسعودؓ حلیف بنی زُہرہ۔ ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ بعد میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب بھی اُن سے جا ملے تھے۔ مگر موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں بیان کیا ہے کہ وہ پہلی ہجرت میں نہیں بلکہ

دوسری ہجرت میں گئے تھے۔ اور ابن اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود پہلی ہجرت کے مہاجرین میں سے نہیں بلکہ دوسری ہجرت کے مہاجرین میں سے تھے۔ نیز زرقانی نے بعض سیرت نگاروں کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ابو سبرہ کے ساتھ اُن کی بیوی اُم کلثوم بھی گئی تھیں جو سہیل بن عمرو کی دوسری بیٹی تھیں بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ان میں سب سے پہلے نکلنے والے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے اور ان کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کی ہے۔

مہاجرین کے ساتھ حبشہ میں سلوک

ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ حبشہ قریش کی پرانی تجارت گاہ تھی جہاں وہ خوب رزق کماتے اور تجارت میں اچھے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اسی وجہ سے مہاجرین کو وہاں کوئی زحمت پیش نہ آئی۔ مہاجرین کا اپنا قول یہ ہے کہ ہم وہاں بہت اچھی طرح رہے، اپنے دین کے معاملہ میں پورے امن سے تھے، اللہ کی عبادت کرتے تھے، کوئی اذیت ہم کو نہ دی جاتی تھی اور نہ کوئی بات ہمیں ایسی سننی پڑتی تھی جو ہمیں ناگوار ہو۔

قریش کا وفد اُن کے پیچھے جاتا ہے

قریش نے جب دیکھا کہ یہ لوگ حبشہ میں امن کے ساتھ رہنے لگے ہیں تو انہوں نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ نجاشیؔ کے پاس (جس کا نام بخاری میں اصحمہ لکھا ہے) بھیجا تاکہ انہیں واپس لائیں لیکن نجاشی نے ان کی بات نہ مانی اور انہیں ناکام واپس کر دیا۔ اس وفد کے متعلق روایات میں اختلاف ہے بعض روایات میں ہے کہ ان دونوں کے ساتھ عمارہ بن ولید بن مغیرہ بھی بھیجا گیا تھا اور بعض میں یہ ہے کہ عمرو بن العاص تو پہلی اور دوسری ہجرت، دونوں کے موقع پر نجاشی کے پاس بھیجے گئے تھے، مگر پہلے وفد میں ان کے ساتھ عمارہ تھا اور دوسرے وفد میں عبداللہ۔ مگر ابن اسحاق نے دونوں موقعوں پر عبداللہ ہی کا نام لیا ہے۔ (٦)

مہاجرین کی واپسی اور اس کا سبب

اسی سال رمضان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی خبر حبش میں مہاجرین کو اس شکل میں پہنچی کہ کفارِ مکہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم پاک میں، جہاں قریش کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا، یکایک تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی زبان مبارک

؎ نجاشی (Negus) شاہان حبشہ کا لقب تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

پر سُورۂ نجم جاری فرما دی۔ کلام کی شدّتِ تاثیر کا حال یہ تھا جب آپؐ نے اسے سنانا شروع کیا تو مخالفین کو اس پر شور مچانے کا ہوش تک نہ رہا، اور خاتمہ پر جب آپؐ نے سجدہ فرمایا تو سب حاضرین سجدہ میں گر گئے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ "یہ قرآن مجید کی پہلی سُورۃ تھی جسے حضورؐ نے قریش کے مجمع عام میں (اور ابن مَردُویہ کی روایت کے مطابق حرم میں) سنایا تھا۔ مجمع میں کافر و مومن سب موجود تھے۔ آخر میں جب آپؐ نے آیتِ سجدہ پڑھ کر سجدہ فرمایا تو تمام حاضرین آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے اور مشرکین کے وہ بڑے بڑے سردار تک، جو مخالفت میں پیش پیش تھے سجدہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ میں نے کفار میں سے صرف ایک شخص اُمیّہ بن خَلَف کو دیکھا کہ اُس نے سجدہ کرنے کے بجائے کچھ مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالی اور کہا میرے لیے بس یہی کافی ہے۔" اِس واقعہ کے دوسرے عینی شاہد حضرت مطّلبؓ بن ابی وَدَاعہ ہیں جو اُس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ نسائی اور مُسند احمد میں اُن کا اپنا بیان یہ نقل ہُوا ہے کہ "جب حضورؐ نے سُورۂ نجم پڑھ کر سجدہ کیا اور سب حاضرین آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے تو میں نے سجدہ نہ کیا اور اُسی کی تلافی اب میں اِس طرح کرتا ہوں کہ اس سُورہ کی تلاوت کے وقت سجدہ کبھی نہیں چھوڑتا۔" ابن سعد نے واقدی کی سند سے بیان کیا ہے کہ ولید بن مُغیرہ نے بھی مُٹھی بھر مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی پر لگالی تھی، کیونکہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ سجدہ نہ کر سکتا تھا، اور ابواُحَیحہ سعید بن العاص نے بھی اسی طرح مٹی اپنی پیشانی پر لگالی تھی کیونکہ وہ بھی بوڑھا تھا۔

اِسی سے یہ خبر مشہور ہو کر حبشہ تک اِس شکل میں پہنچی کہ مُشرکینِ قریش مسلمان ہو گئے ہیں مگر اصل صورتِ حال دوسری ہی تھی۔ قرآن کی شدّتِ تاثیر سے متاثر ہو کر سجدہ کرنے والے اُس وقت تو سجدہ کر بیٹھے مگر بعد میں اُنہیں سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ ہم سے کیا کمزوری سرزد ہو گئی۔ اور لوگوں نے بھی ان کو مطعون کرنا شروع کیا کہ دوسروں کو تو یہ کلام سُننے سے منع کرتے تھے، آج خود اسے کان لگا کر سنا ہی نہیں بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ سجدہ بھی کر لیا۔ آخر کار انہوں نے یہ بات بنا کر اپنا پیچھا چھڑایا کہ صاحب ہم نے تو اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی کے بعد محمدؐ کی زبان سے یہ الفاظ سُنے تھے کہ تلک الغرانقۃ العُلیٰ وانّ شفاعتھن لترجیٰ (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے)، اس لیے ہم نے سمجھا کہ محمد ہمارے طریقے پر آ گئے ہیں۔ حالانکہ کوئی پاگل آدمی ہی یہ سوچ سکتا تھا کہ سورۂ نجم کے اِس سیاق و سباق میں اُن فقروں کی بھی کوئی جگہ ہو سکتی ہے جو اُن کا دعویٰ تھا کہ اُن کے کانوں نے حضورؐ کی زبان سے سُنے ہیں۔ (۷)

قصۂ غرانیق کی حقیقت

لیکن افسوس یہ ہے کہ خود ہمارے ہاں کے مفسرین و محدثین میں بعض ایسی روایات مشہور ہو گئیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کفار نے حضورؐ کی زبان مبارک سے جو فقرے سننے کا دعویٰ کیا تھا وہ فی الواقع حضورؐ کی زبان سے نکلے تھے، اور اس تمنا کی وجہ سے نکلے تھے کہ کسی طرح آپؐ کے اور کفار کے درمیان منافرت دُور ہو، اور شیطان نے آپؐ کی اس تمنا سے فائدہ اٹھا کر یہ کلمات آپؐ کی زبان پر جاری کرا دیے تھے۔

قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش قرآن میں کوئی ایسی بات نازل ہو جائے جس سے اسلام کے خلاف کفارِ قریش کی نفرت دُور ہو اور وہ کچھ قریب آجائیں۔ یا کم از کم ان کے دین کے خلاف ایسی سخت تنقید نہ ہو جو انہیں بھڑکا دینے والی ہو۔ یہ تمنا آپؐ کے دل ہی میں تھی کہ ایک روز قریش کی ایک بڑی مجلس میں بیٹھے ہوئے آپؐ پر سورۂ نجم نازل ہوئی اور آپؐ نے اسے پڑھنا شروع کیا جب آپؐ أَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى پر پہنچے تو یکایک آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے تلك الغرانقة العُلیٰ وان شفاعتهن لترتجیٰ (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے)۔ اس کے آگے پھر آپؐ سورۃ کی آیات پڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ جب اختتام سورہ پر آپؐ نے سجدہ کیا تو مشرک اور مسلمان سب سجدے میں گر گئے۔ کفارِ قریش نے کہا کہ اب ہمارا محمدؐ سے کیا اختلاف باقی رہ گیا۔ ہم بھی تو یہی کہتے تھے کہ خالق و رازق اللہ ہی ہے، البتہ ہمارے یہ معبود اُس کے حضور میں ہمارے شفیع ہیں۔ شام کو جبریلؑ آئے اور انہوں نے کہا یہ آپؐ نے کیا کیا؟ یہ دونوں فقرے تو میں نہیں لایا تھا۔ اس پر آپؐ سخت مغموم ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے وہ آیت نازل کی جو سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۸ میں ہے کہ وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ...... ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا۔ یعنی "اے نبیؐ، ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اُس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ ...... پھر ہمارے مقابلہ میں تم کوئی مددگار نہ پاتے"۔ یہ چیز برابر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و غم میں مبتلا کیے رہی یہاں تک کہ سورۂ حج کی آیت ۵۲ نازل ہوئی جس میں آنحضرتؐ

---

[1] ایک مغربی مستشرق نے کمال بددیانتی کے ساتھ یہ بات اپنی طرف سے گھڑ کر لکھ دی ہے کہ "وہ شیطانی آیتیں منسوخ کر کے ان کی جگہ سورۂ نجم کی آیات ۲۱ تا ۲۳ نازل کر دیں"۔ حالانکہ یہ قطعی بلاثبوت بات ہے جس کے لیے کوئی حوالہ اس مصنف نے دیا ہے، نہ وہ دے سکتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کو تسلی دی گئی کہ تم سے پہلے بھی انبیاء کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کسی نبی نے کوئی تمنا کی تو شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اِس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ اُن کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔

اُدھر یہ واقعہ کہ قرآن سُن کر آنحضرتؐ کے ساتھ قریش کے لوگوں نے بھی سجدہ کیا، مہاجرین حبشہ تک اِس رنگ میں پہنچا کہ آنحضرتؐ اور کفارِ مکّہ کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے مہاجرین مکّہ واپس آ گئے۔ مگر یہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ صلح کی خبر غلط تھی، اسلام اور کُفر کی دشمنی جُوں کی تُوں قائم ہے۔

یہ قصہ ابنِ جریر اور بہت سے مُفسّرین نے اپنی تفسیروں میں، ابن سعد نے طبقات میں، الواحدی نے اسبابُ النّزول میں، مُوسیٰ بن عُقبہ نے مَغازی میں، ابنِ اسحاق نے سیرت میں اور ابن ابی حاتم، ابن المُنذِر، بزّار، ابنِ مَرْدُوْیَہ اور طَبَرانی نے اپنے احادیث کے مجموعوں میں نقل کیا ہے۔ جن سندوں سے یہ نقل ہُوا ہے وہ محمد بن قیس، محمد بن کَعْب قُرَظی، عُروَہ بن زُبَیر، ابو صالح، ابوالعالیہ، سعید بن جُبَیر، ضحّاک، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارِث، قتادہ، مجاہد، سُدّی، ابن شہاب زُہری، اور ابن عباسؓ پر ختم ہوتی ہیں (ابن عباسؓ کے سوا ان میں سے کوئی صحابی نہیں ہے)۔ قصے کی تفصیلات میں چھوٹے چھوٹے اختلافات کو چھوڑ کر دو بہت بڑے اختلافات ہیں۔ ایک یہ کہ بُتوں کی تعریف میں جو کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کیے گئے ہیں وہ قریب قریب ہر روایت میں دوسری روایت سے مختلف ہیں۔ ہم نے اُن کا اِستقصاء کرنے کی کوشش کی تو دس عبارتیں الگ الگ الفاظ میں پائیں۔ دوسرا بڑا اختلاف یہ ہے کہ کسی روایت کی رُو سے یہ الفاظ دورانِ وحی میں شیطان نے آپؐ پر القا کر دیے اور آپؐ سمجھے کہ یہ بھی جبریلؑ لائے ہیں۔ کسی روایت میں ہے کہ یہ الفاظ اپنی اِس خواہش کے زیرِ اثر سہوًا آپؐ کی زبان سے نکل گئے۔ کسی میں ہے کہ اُس وقت آپؐ کو اُونگھ آ گئی تھی اور اِس حالت میں یہ الفاظ نکلے۔ کسی کا بیان ہے کہ آپؐ نے یہ قصداً کہے مگر اِستفہامِ انکاری کے طور پر کہے۔ کسی کا قول ہے کہ شیطان نے آپؐ کی آواز میں آواز ملا کر یہ الفاظ کہہ دیے اور سمجھا یہ گیا کہ آپؐ نے کہے ہیں۔ اور کسی کے نزدیک کہنے والا مشرکین میں سے کوئی شخص تھا۔

ابنِ کثیر، بَیہقی، قاضی عیاض، ابنِ خُزَیمہ، قاضی ابوبکر ابن العربی، امام رازی، قُرطُبی، بدرالدین عَینی، شَوکانی، آلوسی وغیرہ حضرات اس قصّے کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں۔ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں کہ "جتنی سندوں سے یہ روایت ہُوا ہے، سب مُرسَل اور مُنقطع ہیں، مجھے کسی صحیح مُتّصِل سند سے یہ نہیں ملا"۔ بیہقی کہتے ہیں کہ "از روئے نقل یہ قصّہ ثابت نہیں ہے"۔ ابنِ خُزَیمہ سے اس کے متعلق پُوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ "یہ زنادقہ کا گھڑا ہُوا ہے"۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ "اس کی کمزوری اِسی سے ظاہر ہے کہ صحاحِ ستّہ کے مؤلفین میں سے کسی نے بھی اس کو اپنے

ہاں نقل نہیں کیا اور نہ یہ کسی صحیح متّصل بے عیب سند کے ساتھ ثقہ راویوں سے منقول ہُوا ہے۔" امام رازی، قاضی ابوبکر اور آلوسی نے اس پر مفصّل بحث کر کے اسے بڑے پُر زور طریقے سے رد کیا ہے لیکن دوسری طرف حافظ ابنِ حجر جیسے بلند پایہ محدّث اور ابوبکر جصّاص جیسے نامور فقیہ اور زمخشری جیسے عقلیت پسند مفسّر اور ابن جریر جیسے امامِ تفسیر و تاریخ و فقہ اس کو صحیح مانتے ہیں اور اسی کو سُورۂ حج کی آیت ۵۲ کی تفسیر قرار دیتے ہیں۔ ابنِ حجر کا محدّثانہ استدلال یہ ہے کہ:

> "سعید بن جُبیر کے طریق کے سوا باقی جن طریقوں سے یہ روایت آئی ہے وہ یا تو ضعیف ہیں یا منقطع، مگر طریقوں کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کوئی اصل ہے ضرور۔ علاوہ بریں یہ ایک طریقہ سے متصلاً بسندِ صحیح بھی نقل ہُوا ہے جسے بزّار نے نکالا ہے (مراد ہے یُوسف بن حمّاد عن اُمیّہ بن خالد عن شُعبہ عن ابی بِشر عن سعید بن جُبیر عن ابن عباس) اور دو طریقے سے یہ اگرچہ مُرسَل ہے مگر اس کے راوی صحیحین کی شرط کے مطابق ہیں۔ یہ دونوں روایتیں طبری نے نقل کی ہیں۔ ایک بطریق یونس بن یزید عن ابن شہاب۔ دوسری بطریق مُعتمر بن سلیمان و حمّاد بن سلمہ عن داؤد بن ابی ہند عن ابی العالیہ۔"

جہاں تک موافقین کا تعلق ہے، وہ تو اسے صحیح مان ہی بیٹھے ہیں۔ لیکن مخالفین نے بھی بالعموم اس پر تنقید کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ایک گروہ اسے اس لیے رد کرتا ہے کہ اس کی سند اس کے نزدیک قوی نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر سند قوی ہوتی تو یہ حضرات اس قصّے کو مان لیتے۔ دوسرا گروہ اسے اس لیے رد کرتا ہے کہ اس سے تو سارا دین ہی مشتبہ ہُوا جاتا ہے اور دین کی ہر بات کے متعلق شک پیدا ہو جاتا ہے کہ نہ معلوم اور کہاں کہاں شیطانی اغوا یا نفسانی آمیزشوں کا دخل ہو گیا ہو۔ حالانکہ اس نوعیت کا استدلال اُن لوگوں کو تو مطمئن کر سکتا ہے جو ایمان لانے کے عزم پر قائم ہوں، مگر دوسرے لوگ جو پہلے ہی شکوک میں مبتلا ہیں یا جو اب تحقیق کر کے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں، ان کے دل میں تو یہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ جن جن چیزوں سے یہ دین مشتبہ قرار پاتا ہو انہیں رد کر دیں۔ وہ تو کہیں گے کہ جب کم از کم ایک نامور صحابی اور بکثرت تابعین و تبعِ تابعین، اور متعدد معتبر راویانِ حدیث کی روایت سے ایک واقعہ ثابت ہو رہا ہے تو اسے صرف اس بنا پر کیوں رد کر دیا جائے کہ اس سے آپ کا دین مشتبہ ہُوا جاتا ہے؟ اس کے بجائے آپ کے دین کو مشتبہ کیوں نہ سمجھا جائے جبکہ یہ واقعہ اسے مشتبہ ثابت کر ہی رہا ہے؟

اب دیکھنا چاہیے کہ تنقید کا وہ صحیح طریقہ کیا ہے جس سے اگر اس قصّے کو پرکھ کر دیکھا جائے تو یہ

ناقابلِ قبول قرار پاتا ہے، چاہے اس کی سند کتنی ہی قوی ہو، یا قوی ہوتی۔

پہلی چیز خود اس کی اندرونی شہادت ہے جو اسے غلط ثابت کرتی ہے۔ قصے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ہجرتِ حبشہ اُولیٰ واقع ہو چکی تھی اور اس واقعے کی خبر پا کر مہاجرین میں سے ایک گروہ مکّہ واپس آ گیا۔ اب ذرا تاریخوں کا فرق ملاحظہ کیجیے۔

___ ہجرتِ حبشہ معتبر تاریخی روایتوں کی رُو سے رجب ۵ نبوی بعدِ بعثت میں واقع ہوئی اور مہاجرینِ حبشہ کا ایک گروہ مصالحت کی غلط خبر سُن کر تین مہینے بعد (یعنی اُسی سال تقریباً شوال کے مہینے میں) مکّے واپس آ گیا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ یہ واقعہ لامحالہ ۵ نبوی بعدِ بعثت کا ہے۔

___ سُورۂ بنی اسرائیل جس کی ایک آیت کے متعلق بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل پر بطورِ عتاب نازل ہوئی تھی معراج کے بعد اُتری ہے اور معراج کا زمانہ معتبر ترین روایات کی رُو سے ۱۱ یا ۱۲ نبوی بعدِ بعثت ہے۔ اس کے معنی یہ ہُوئے کہ اس فعل پر پانچ چھ سال جب گزر چکے تب اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا۔

___ اور سُورۂ حج کی آیت ۵۲، جیسا کہ اس کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے، ۱ ہجری میں نازل ہُوئی ہے یعنی عتاب پر بھی جب مزید دو ڈھائی سال گزر لیے تب اعلان کیا گیا کہ یہ آمیزش تو القائے شیطانی سے ہو گئی تھی، اللہ نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔

کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی باور کر سکتا ہے کہ آمیزش کا فعل آج ہو، عتاب چھ سال بعد، اور آمیزش کی تنسیخ کا اعلان ۹ سال بعد؟

پھر اِس قصے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ آمیزش سُورۂ نجم میں ہُوئی تھی اور اِس طرح ہُوئی کہ ابتدا سے آپ اصل سُورہ کے الفاظ پڑھتے چلے آ رہے تھے، یکایک مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی پر پہنچ کر آپ نے بطورِ خود یا شیطانی اِغوا سے یہ فقرہ ملا دیا، اور آگے پھر سُورۂ نجم کی اصل آیات پڑھتے چلے گئے۔ اس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ کفارِ مکّہ اِسے سُن کر خوش ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ اب ہمارا اور محمدؐ کا اختلاف ختم ہو گیا۔ مگر سُورۂ نجم کے سلسلۂ کلام میں ذرا اِس اِلحاقی فقرے کو شامل کر کے تو دیکھیے:

"پھر تم نے کبھی غور بھی کیا، اِن لات اور عُزّیٰ پر اور تیسری ایک اور دیوی (مناۃ) پر؟ یہ بلند پایہ دیویاں ہیں، اِن کی شفاعت ضرور متوقع ہے۔ کیا تمہارے لیے تو ہوں بیٹے اور اُس (یعنی اللہ) کے لیے ہوں بیٹیاں؟ یہ تو بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل

نہیں کی۔ لوگ محض گمان اور من مانے خیالات کی پیروی کر رہے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے صحیح رہنمائی آ گئی ہے۔"

دیکھیے، اِس عبارت میں خط کشیدہ فقرے نے کیسا صریح تضاد پیدا کر دیا ہے۔ ایک سانس میں کہا جاتا ہے کہ "واقعی تمہاری یہ دیویاں بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے"۔ دوسرے ہی سانس میں پلٹ کر ان پر چوٹ کی جاتی ہے کہ "بے وقوفو، یہ تم نے خدا کے لیے بیٹیاں کیسی تجویز کر رکھی ہیں؟ اچھی دھاندلی ہے کہ تمہیں تو ملیں بیٹے اور خدا کے حصے میں آئیں بیٹیاں۔ یہ سب تمہاری من گھڑت ہے جسے خدا کی طرف سے کوئی سند اعتبار حاصل نہیں ہے"۔ تھوڑی دیر کے لیے اِس سوال کو جانے دیجیے کہ یہ صریح بے تکی باتیں کسی مردِ عاقل کی زبان سے نکل بھی سکتی ہیں یا نہیں۔ مان لیجیے کہ شیطان نے غلبہ پا کر یہ الفاظ زبان سے نکلوا دیے تھے۔ مگر کیا قریش کا وہ سارا مجمع جو اُسے سُن رہا تھا، بالکل ہی پاگل ہو گیا تھا کہ بعد کے فقروں میں اُن تعریفی کلمات کی کھلی کھلی تردید سُن کر بھی وہ یہی سمجھتا رہا کہ ہماری دیویوں کی واقعی تعریف کی گئی ہے؟ سورۂ نجم کے آخر تک کا پورا مضمون اِس ایک تعریفی فقرے کے بالکل خلاف ہے۔ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ اسے آخر تک سُننے کے بعد یہ پکار اٹھے ہوں گے کہ بس آج ہمارا اور محمدؐ کا اختلاف ختم ہو گیا؟

یہ تو ہے اِس قصے کی اندرونی شہادت جو اس کے سراسر لغو اور مہمل ہونے کی گواہی دے رہی ہے۔ اس کے بعد دوسری چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ اس میں تین آیتوں کی جو شانِ نزول بیان کی جا رہی ہے آیا قرآن کی ترتیب بھی اس کو قبول کرتی ہے؟ قصے میں بیان یہ کیا جا رہا ہے کہ آمیزش سورۂ نجم میں کی گئی تھی، جو سنہ ۵ بعد بعثت میں نازل ہوئی۔ اس آمیزش پر سورۂ بنی اسرائیل والی آیت میں عتاب فرمایا گیا، اور پھر اس کی تنسیخ اور واقعہ کی توجیہ سورۂ حج کی آیت میں کی گئی۔ اب لامحالہ دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت پیش آئی ہو گی۔ یا تو عتاب اور تنسیخ والی آیتیں بھی اُسی زمانے میں نازل ہوئی ہوں جبکہ آمیزش کا واقعہ پیش آیا، یا پھر عتاب والی آیت سورۂ بنی اسرائیل کے ساتھ اور تنسیخ والی آیت سورۂ حج کے ساتھ نازل ہوئی ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ دونوں آیتیں سورۂ نجم ہی میں نہ شامل کی گئیں بلکہ عتاب والی آیت کو چھ سال تک یونہی ڈالے رکھا گیا اور سورۂ بنی اسرائیل جب نازل ہوئی تب کہیں اُس میں لا کر چسپاں کر دیا گیا، پھر تنسیخ والی آیت مزید دو ڈھائی برس تک پڑی رہی اور سورۂ حج کے نزول تک اُسے کہیں نہ چسپاں کیا گیا۔ کیا قرآن کی ترتیب اِسی طرح ہوئی ہے کہ ایک موقع کی نازل شدہ آیتیں الگ الگ بکھری پڑی رہتی تھیں اور برسوں کے بعد کسی کو کسی سورت میں اور کسی کو کسی دوسری سورت میں ٹانک دیا

جاتا تھا؟ لیکن اگر دوسری صورت ہے کہ عتاب والی آیت واقعہ کے ۹ سال بعد اور تنسیخ والی آیت آٹھ نو سال بعد نازل ہوئی تو علاوہ اُس بے تکے پن کے جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ حج میں ان کے نزول کا موقع کیا ہے؟

یہاں پہنچ کر نقدِ صحیح کا تیسرا قاعدہ ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی یہ کہ کسی آیت کی جو تفسیر بیان کی جا رہی ہو اسے دیکھا جائے کہ آیا قرآن کا سیاق و سباق بھی اسے قبول کرتا ہے یا نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کا آٹھواں رکوع پڑھ کر دیکھیے اور اُس سے پہلے اور بعد کے مضمون پر بھی نگاہ ڈال لیجیے۔ اِس سلسلۂ کلام میں آخر کیا موقع اِس بات کا نظر آتا ہے کہ چھ سال پہلے کے ایک واقعہ پر نبی کو ڈانٹ بتائی جائے؟ قطع نظر اِس سے کہ آیت وَاِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَکَ میں نبی پر کوئی ڈانٹ ہے بھی یا نہیں اور آیت کے الفاظ کُفّار کے فتنے میں نبی کے مبتلا ہو جانے کی تردید کر رہے ہیں یا تصدیق؟ اِسی طرح سورۂ حج پڑھ کر دیکھیے۔ آیت ۵۲ سے پہلے کا مضمون پڑھیے اور بعد کا بھی دیکھیے۔ کیا کوئی معقول وجہ آپ کی سمجھ میں آتی ہے کہ اِس سیاق و سباق میں یکایک یہ مضمون کیسے آگیا کہ "اے نبی ۹ سال پہلے قرآن میں آمیزش کر بیٹھنے کی جو حرکت تم سے ہو گئی تھی اس پر گھبراؤ نہیں، پہلے انبیاء سے بھی شیطان یہ حرکتیں کراتا رہا ہے، اور جب کبھی انبیاء اس طرح کا فعل کر جاتے ہیں تو اللہ اس کو منسوخ کر کے اپنی آیات کو پھر محکم کر دیتا ہے"؟

ہم اِس سے پہلے بھی بارہا کہہ چکے ہیں، اور یہاں پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ کوئی روایت، خواہ اس کی سند آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو، ایسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جبکہ اس کا متن اُس کے غلط ہونے کی کھلی کھلی شہادت دے رہا ہو اور قرآن کے الفاظ، سیاق و سباق، ترتیب، ہر چیز اُسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہو۔ یہ دلائل تو ایک متشکک اور بے لاگ محقق کو بھی مطمئن کر دیں گے کہ یہ قصہ قطعی غلط ہے۔ رہا مومن، تو وہ اسے ہرگز نہیں مان سکتا جبکہ وہ علانیہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ روایت قرآن کی ایک نہیں بیسیوں آیتوں سے ٹکراتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ مان لینا بہت آسان ہے کہ خود اس روایت کے راویوں کو شیطان نے بہکا دیا، بہ نسبت اس کے کہ وہ یہ مان لے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی خواہشِ نفس سے قرآن میں ایک لفظ بھی ملا سکتے تھے، یا حضورؐ کے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال آ سکتا تھا کہ توحید کے ساتھ شرک کی کچھ آمیزش کر کے کفار کو راضی کیا جائے، یا آپ اللہ تعالیٰ کے فرامین کے بارے میں کبھی یہ آرزو کر سکتے تھے کہ کاش اللہ میاں ایسی کوئی بات نہ فرمائیں جس سے کفار ناراض ہو جائیں، یا یہ کہ آپؐ پر وحی کسی ایسے غیر محفوظ اور مشتبہ طریقے سے آتی تھی کہ جبریلؑ کے ساتھ شیطان بھی آپ پر کوئی لفظ اِلقا کر جائے

اور آپؐ اس غلط فہمی میں رہیں کہ یہ بھی جبریلؑ ہی لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک بات قرآن کی کھلی کھلی تصریحات کے خلاف ہے اور اُن ثابت شدہ عقائد کے خلاف ہے جو ہم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رکھتے ہیں۔ خدا کی پناہ اِس روایت پرستی سے جو محض سند کا اتصال یا راویوں کی ثقاہت یا طُرُق روایت کی کثرت دیکھ کر کسی مسلمان کو خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے بارے میں ایسی سخت باتیں بھی تسلیم کرنے پر آمادہ کر دے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں اُس شک کو بھی دُور کر دیا جائے جو راویانِ حدیث کی اتنی بڑی تعداد کو اس قصّے کی روایت میں مبتلا ہوتے دیکھ کر دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص سوال کر سکتا ہے کہ اگر اس قصّے کی کوئی اصلیت ہی نہیں ہے تو نبیؐ اور قرآن پر اتنا بڑا بہتان حدیث کے اتنے راویوں کے ذریعہ سے جن میں بعض بڑے نامور ثقہ بزرگ ہیں، اشاعت کیسے پا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب کا سراغ ہم کو خود حدیث ہی کے ذخیرے میں مل جاتا ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، اور مُسند احمد میں اصل واقعہ اس طرح آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سُورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، اور خاتمے پر جب آپؐ نے سجدہ کیا تو تمام حاضرین، مسلم اور مشرک سب، سجدے میں گر گئے۔ واقعہ بس اتنا ہی تھا، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اوّل تو قرآن کا زورِ کلام اور انتہائی پُرتاثیر اندازِ بیان، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس کا ایک عجیب شان کے ساتھ ادا ہونا، اُس کو سُن کر اگر پتھر سے بھی پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہو، اور آپؐ کے ساتھ سارا مجمع سجدے میں گر گیا ہو تو کچھ بعید نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز تھی جس پر قریش کے لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قریش کے لوگ اپنے اس وقتی تاثر پر کچھ پشیمان سے ہونے لگے اور ان میں سے کسی نے یا بعض لوگوں نے اپنے اِس فعل کی یہ توجیہ کی ہو گی کہ صاحب ہمارے کانوں نے تو محمدؐ کی زبان سے اپنے معبُودوں کی تعریف میں کچھ کلمات سُنے تھے اس لیے ہم بھی ان کے ساتھ سجدے میں گر گئے[1]۔ دوسری طرف یہی واقعہ مہاجرینِ حبشہ تک اِس شکل میں پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح ہو گئی ہے کیونکہ دیکھنے والے نے آپؐ کو اور مشرکین و مومنین سب کو ایک ساتھ سجدہ کرتے دیکھا تھا۔ یہ افواہ ایسی گرم ہوئی کہ مہاجرینِ حبش یا اُن میں سے اکثر مکّے واپس آ گئے۔ ایک صدی کے اندر

---

[1] یاقوت نے مُعجم البلدان میں لفظ عُزّٰی کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ قریش کے لوگ کعبے کا طواف کرتے ہوئے یہ الفاظ کہا کرتے تھے: وَاللّٰت والعُزّی، ومَنٰوۃ الثّالثۃ الاُخریٰ، فانھنّ الغرانیق العُلیٰ، وان شفاعتھنّ لترتجیٰ۔ اس سے یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی زبان سے لات و عزّیٰ کا ذکر سُنتے ہی کسی شخص نے آپؐ کی آواز میں آواز ملا کر یہ الفاظ کہہ دیے ہوں اور دُور سے سُننے والوں کو اس سے غلط فہمی لاحق ہوئی ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

یہ تینوں باتیں، یعنی قریش کا سجدہ، اُس سجدے کی بد توجیہ، اور مہاجرین حبشہ کی واپسی، مل جل کر ایک قصے کی شکل اختیار کر گئیں اور بعض نقد لوگ تک اس کی روایت میں مبتلا ہو گئے۔ انسان آخر انسان ہے۔ بڑے سے بڑے نیک اور ذی فہم آدمی سے بھی بسا اوقات لغزش ہو جاتی ہے اور اس کی لغزش عام لوگوں کی لغزش سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ عقیدت میں بے جا غلو رکھنے والے ان بزرگوں کی صحیح باتوں کے ساتھ ان کی غلط باتوں کو بھی آنکھیں بند کر کے ہضم کر جاتے ہیں، اور بد طینت لوگ چھانٹ چھانٹ کر ان کی غلطیاں جمع کرتے ہیں اور انہیں اس بات کے لیے دلیل بناتے ہیں کہ سب کچھ جو ان کے ذریعے سے ہمیں پہنچا ہے، نذرِ آتش کر دینے کے لائق ہے۔ (۹)

واپس آنے والے مہاجرین پر کیا گزری

اہلِ مکہ کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر شوال ۵ بعد بعثت میں مہاجرین حبش سے مکہ کی طرف واپس ہو گئے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ سب واپس آ گئے، اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بعض واپس آئے اور بعض وہیں ٹھیرے رہے۔ بلاذری نے نہ صرف یہ کہ پہلی ہجرت حبشہ کے تمام مہاجرین کی واپسی کا ذکر کیا ہے، بلکہ ان کی پوری فہرست دے کر یہ بھی بتایا ہے کہ کون کس کی پناہ میں داخل ہوا۔ مکہ کے قریب پہنچے تو پتہ لگا کہ ایک شخص ملا جس سے انہوں نے قریش کا حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ "محمدؐ نے ان کے معبودوں کا بھلائی کے ساتھ ذکر کیا تو لوگ ان کے ساتھ ہو گئے، پھر وہ ان کے معبودوں کی حسبِ سابق برائی کرنے لگے تو لوگ بھی پہلے کی طرح ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگے، اور ہم نے اسی حال پر ان کو چھوڑا ہے۔" اس پر مہاجرین نے باہم مشورہ کیا کہ حبش واپس چلے جائیں یا اب واپس آ ہی گئے ہیں تو کیوں نہ مکہ میں داخل ہو جائیں پھر دیکھیں کہ کیا کرنا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کی پناہ لے کر شہر میں داخل ہوا، سوائے ابن مسعودؓ کے، کہ وہ بلا پناہ داخل ہوئے تھے اور کچھ مدت ٹھیر کر حبش واپس چلے گئے۔ ابن مسعودؓ کے متعلق یہ بات ابن سعد اور بلاذری اور بعض دوسرے لوگوں نے لکھی ہے، مگر ابن القیم نے زاد المعاد میں کہا ہے کہ وہ مکہ ہی میں ٹھیرے رہے، اور ابن اسحاق کا یہ قول ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ وہ اس ہجرت میں گئے ہی نہ تھے۔

بلاذری نے تفصیل بیان کی ہے کہ مکہ میں داخل ہوتے وقت واپس آنے والے مہاجرین میں سے کس نے قریش کے سرداروں میں سے کس کی پناہ حاصل کی تھی:

(۱) حضرت عثمانؓ کو پناہ دینے والا ابو اُحیحہ سعید بن العاص۔

(۲) حضرت ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ " " اُمیہ بن خلف

(۳) حضرت زبیرؓ بن العوام کو پناہ دینے والا زمعہ بن الاسود،
(۴) حضرت مصعبؓ بن عمیر " " نضر بن الحارث بن کلدہ (یا ابوعزیز بن عمیر)
(۵) حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف " " اسود بن عبد یغوث
(۶) حضرت عامرؓ بن ربیعہ " " عاص بن وائل سہمی
(۷) حضرت ابو سبرہؓ بن ابی رُہم " " اخنس بن شریق
(۸) حضرت حاطبؓ بن عمرو " " حُوَیطب بن عبدالعُزّٰی
(۹) حضرت سہیلؓ بن بیضاء " " ان کے قبیلے کا کوئی شخص (اور یہ روایت بھی ہے کہ وہ کچھ دن مکے میں چھپے رہے، پھر حبش واپس چلے گئے)

بلاذری نے واقدی کے حوالہ سے اور کچھ اختلافات کے ساتھ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ بن مظعون نے ولید بن مغیرہ کی پناہ لی تھی، مگر جب انہوں نے دیکھا کہ دوسرے مسلمانوں پر سخت ظلم ہو رہے ہیں اور وہ ولید کی پناہ میں آرام سے چل پھر رہے ہیں تو انہیں اس پر شرم محسوس ہوتی اور وہ اپنے دل میں سوچنے لگے کہ میرا ایک مشرک کی پناہ میں رہنا، جبکہ میرے ساتھی اہلِ دین مصائب میں مبتلا ہیں، میرے نفس کی بڑی کمزوری ہے۔ چنانچہ ولید کے پاس جا کر انہوں نے کہا "آپ مجھے اپنی پناہ سے بری کر دیجیے۔" اس نے کہا "بیٹا کیا تم نے میری پناہ میں بھلائی کے سوا کچھ اور دیکھا ہے؟ کیا کسی نے تمہارے ساتھ کوئی بُرا سلوک کیا ہے؟" حضرت عثمانؓ نے اس کے جواب میں کوئی شکایت نہیں بیان کی، بس یہ کہا کہ "میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، اُس کے سوا کسی دوسرے کی پناہ میں رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔" ولید نے کہا "تو پھر حرم میں چل کر اُسی طرح میری پناہ سے براءت کا اعلان کرو جس طرح میں نے اپنی پناہ کا اعلان کیا تھا۔" حضرت عثمانؓ بخوشی اس کے لیے تیار ہو گئے۔ ولید اور وہ ایک ساتھ حرم میں گئے۔ ولید نے کہا "یہ عثمانؓ میری پناہ واپس کرنے کے لیے آئے ہیں۔" حضرت عثمانؓ نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں نے ولید کو ایک شریف اور باوفا آدمی کی پناہ پایا ہے، مگر میں اب اللہ کے سوا کسی کی پناہ میں نہیں رہنا چاہتا، اس لیے ان کی پناہ میں نے واپس کر دی ہے۔" اُسی زمانہ میں عرب کا مشہور شاعر لبید بن ربیعہ مکہ آیا اور اپنے اشعار سناتے ہوئے اس نے یہ مصرع پڑھا:

الاَ کل شيء ما خلا اللّٰہ باطلٌ

خبردار رہو، اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے

حضرت عثمانؓ بن مظعون پکار اُٹھے، "تم نے سچ کہا!" پھر اس نے جب دوسرا مصرع پڑھا:

... وكل نعيم لا محالة زائل

اور ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے

تو انہوں نے کہا "یہ جھوٹی بات ہے، جنت کی نعمت زائل ہونے والی نہیں ہے" لبید اس پر بگڑ بیٹھا اور قریش کے لوگوں سے کہنے لگا "خدا کی قسم، آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھنا کبھی موجب ننگ و عار نہیں رہا ہے، اور نہ بدتمیزی کبھی آپ لوگوں کی شان رہی ہے" اس پر بنی مغیرہ میں سے ایک شخص نے اٹھ کر حضرت عثمان کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا جس سے ان کی آنکھ نیلی ہو گئی۔ ولید نے طنز کے انداز میں ہنس کر ان سے کہا "بیٹے، اس سے تمہیں کیا حاصل ہوا؟" انہوں نے جواب دیا "میری دوسری آنکھ بھی اسی چوٹ کی محتاج ہے جو اس کی ساتھی کو لگی ہے" ولید نے کہا "تم ایسے ذمہ میں تھے جو تمہاری حفاظت کرنے والا تھا" انہوں نے کہا "خدا کی قسم، اب میں اللہ کی پناہ کے سوا اور کسی کی پناہ نہ چاہوں گا" اسی گفتگو کے دوران میں عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ نے اس شخص کی ناک توڑ دی جس نے حضرت عثمانؓ بن مظعون کو تھپڑ مارا تھا۔

ابن اسحاق کے حوالے سے ابن ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت ابو سلمہ نے اپنے ماموں ابوطالب کی پناہ لی کیونکہ وہ ان کی بہن برّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ اس پر بنی مخزوم نے جا کر ابوطالب سے کہا "اپنے بھتیجے کو تو آپ نے اپنی پناہ میں لے رکھا ہے، مگر ہمارے آدمی سے آپ کا کیا واسطہ کہ اسے آپ پناہ دے رہے ہیں؟" انہوں نے جواب میں کہا "محمد میرا بھتیجا ہے تو ابو سلمہ میرا بھانجا ہے۔ اگر میں اپنے بھتیجے کو پناہ دے سکتا ہوں تو اپنے بھانجے کو کیوں نہیں دے سکتا؟" بنی مخزوم نے کچھ جھگڑا کرنا چاہا تو ابولہب نے اٹھ کر کہا کہ "اے اہل قریش، تم نے شیخ کے ساتھ بہت کچھ کر لیا، اور تم برابر ان پر دباؤ ڈالتے چلے جا رہے ہو کہ اپنی قوم میں جس کو وہ پناہ دیں اس کو ان کی پناہ سے نکالو۔ خدا کی قسم، یا تو تم ان کو تنگ کرنے سے باز آ جاؤ، نہیں تو میں بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا۔" بنی مخزوم ابولہب کی یہ بات سن کر گھبرا گئے اور انہوں نے کہا کہ اے ابوعتبہ، ہم تم کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔

طبری نے لکھا ہے کہ واپس آنے والوں میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان اور ان کی بیوی حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضرت ابو حذیفہ اور ان کی بیوی سہلہؓ بنت سہیل بن عمرو مکہ ہی میں رہ گئے اور مدینہ کی طرف ہجرت تک وہیں رہے۔ لیکن یہ بیان مشتبہ ہے، کیونکہ ابن اسحاق نے دوسری ہجرت حبشہ میں بھی ان کا ذکر کیا ہے اور ان کا نام ۳۳ مردوں اور آٹھ عورتوں کی اس جماعت میں بھی شامل کیا ہے جو حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے حبش سے مکہ آ گئے تھے، جن میں سے دو کا انتقال ہو گیا، سات قید کر لیے گئے اور ۲۴ نے جنگ بدر میں حصہ لیا۔

دوسری ہجرت حبشہ

جب مکہ میں ظلم شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حبش مسلمانوں کے لیے امن کی جگہ ثابت ہوا ہے، تو آپ نے پھر ہدایت فرمائی کہ یہ مظلوم لوگ حبش ہی کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ سنہ ۵ بعد بعثت کے آغاز (سنہ ۶۱۵ء) میں دوسری ہجرت واقع ہوئی۔ اگرچہ قریش نے اس ہجرت کو روکنے کی پوری کوشش کی، نکلنے والوں کو بہت تنگ کیا اور ان کے راستے میں سخت مشکلات پیدا کیں، لیکن اس کے باوجود اس موقع پر ۸۰ سے زیادہ مردوں اور ۱۸-۱۹ عورتوں نے حبش کی راہ لی اور وہاں یہ لوگ بخیریت پہنچ گئے۔ ابن سعد نے مردوں کی تعداد ۸۳ بیان کی ہے، اور عورتوں میں ۱۱ قریشی اور سات غیر قریشی خواتین کا ذکر کیا ہے۔ ۸۳ مردوں میں حضرت عمار بن یاسر کا نام لیا گیا ہے، مگر ابن اسحاق نے ان کے شریک ہونے میں شک کیا ہے اور واقدی و ابن عقبہ وغیرہ نے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ وہ ان میں شامل نہ تھے۔ اس کے برعکس ابن عبد البر نے جزم کے ساتھ کہا ہے کہ وہ ان میں شامل تھے۔ اسی طرح ان مہاجرین میں حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کا نام بھی لیا گیا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ انہوں نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی بلکہ پہلے وہ مکہ میں آ کر مسلمان ہوئے تھے، پھر یمن واپس جا کر اسلام کی اشاعت کی، اس کے بعد اپنی قوم کے کچھ لوگوں کے ساتھ (جن کی تعداد ۵۲ یا ۵۳ بتائی جاتی ہے) ایک کشتی میں یمن سے روانہ ہوئے، مگر ہواؤں نے اُن کی کشتی کو حبش کے ساحل پر لا ڈالا، اس طرح وہ مہاجرین حبشہ سے جا ملے۔ صحیحین میں خود حضرت ابو موسیٰؓ کی اپنی روایت بھی ہے اور اس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کی خبر ملی، اور ہم یمن میں تھے، تو ہم کشتی میں روانہ ہوئے، مگر ہماری کشتی نے ہمیں حبشہ پہنچا دیا اور وہاں ہم جعفرؓ بن ابی طالب کے ساتھ مل گئے، پھر فتح خیبر کے موقع پر اُن کے ساتھ خیبر پہنچے۔ ابن سعد نے حضرت ابو موسیٰؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہم یمن سے اپنی قوم کے پچاس سے زائد آدمیوں کے ساتھ نکلے اور کشتی نے ہمیں نجاشی کے علاقے میں پہنچا دیا جہاں جعفر بن ابی طالبؓ پہلے سے موجود تھے۔

مہاجرین کی فہرست

اس ہجرت کی اہمیت کا پورا اندازہ مہاجرین کی اُس فہرست سے ہوتا ہے جو ابن ہشام نے سیرت میں ابن اسحاق کے حوالے سے درج کی ہے:-

بنی ہاشم میں سے (۱) جعفرؓ بن ابی طالب

(۲) ان کی بیوی اسماءؓ بنت عُمیس خثعمیہ

بنی اُمیّہ میں سے (۳) عثمانؓ بن عفان۔

(۴) اُن کی بیوی رُقیّہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۵) عمروؓ بن سعید بن العاص (ان کے باپ سعید بن العاص کی کنیت ابواُحیحہ تھی)۔

(۶) اُن کی بیوی فاطمہؓ بنت صفوان (یہ بنی کنانہ میں سے تھیں)۔

(۷) اُن کے بھائی خالدؓ بن سعید بن العاص۔

(۸) اُن کی بیوی اُمینہؓ بنت خلف (بعض لوگوں نے ان کا نام ہمینہ لکھا ہے۔ یہ بنی خزاعہ میں سے تھیں)

حلفائے بنی اُمیّہ میں سے (۹) عبداللہؓ بن جحش (یہ بنی غنم بن دودان میں سے تھے اور اُمّ المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی تھے)

(۱۰) اُن کا بھائی عبیداللہ بن جحش (یہ شخص حبش میں عیسائی ہو کر مرا)

(۱۱) اُن کی بیوی اُمّ حبیبہؓ (یہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ حبش ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے توسط سے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا)۔

(۱۲) قیسؓ بن عبداللہ (یہ بنی اسد بن خزیمہ میں سے تھے)۔

(۱۳) ان کی بیوی برکہؓ بنت یسار (ابوسفیان کی آزاد کردہ لونڈی)۔

(۱۴) مُعَیقیبؓ بن ابی فاطمہ (یہ قبیلہ دوس میں سے تھے)۔

بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے (۱۵) ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ

حلفائے بنی نوفل بن عبد مناف میں سے (۱۶) عتبہؓ بن غزوان (یہ بنی قیس بن عیلان میں سے تھے)

بنی اسد بن عبد العزیٰ بن قصی میں سے (۱۷) زُبیرؓ بن العوام بن خویلد۔ } یہ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔

(۱۸) اَسودؓ بن نوفل بن خویلد

(۱۹) یزیدؓ بن زمعہ بن اسود بن مُطّلب

(۲۰) عمروؓ بن اُمیّہ بن حارث بن اسد۔

بنی عبد بن قصی میں سے (۲۱) طُلیبؓ بن عُمیر بن وہب (یہ حضورؐ کی پھوپھی اَروَیٰ بنت عبدالمطلب کے صاحبزادے تھے)

بنی عبدالدار بن قصی میں سے (۲۲) مُصعبؓ بن عُمیر بن ہاشم۔

(۲۳) سُوَیبطؓ بن سعد۔

(۲۴) جہمؓ بن قیس

(۲۵) اُن کی بیوی اُمّ حرملہؓ بنت عبدالاسود (یہ بنی خزاعہ میں سے تھیں)۔

(۲۶) اُن کے بیٹے عَمرو بن جَہم

(۲۷) ان کے دوسرے بیٹے خُزیمہ بن جَہم

(۲۸) ابوالرُّوم بن عُمیر بن ہاشم (حضرت مُصعب کے بھائی)۔

(۲۹) فِراس بن نَضر بن حارث بن کَلَدہ (یہ اُسی شخص کے بیٹے تھے جس نے اسلام کو زک دینے کے لیے ثقافتی پروگرام شروع کیا تھا)۔

بنی زُہرہ میں سے

(۳۰) عبدالرحمٰن بن عوف

(۳۱) عامر بن ابی وقّاص (حضرت سعد بن ابی وقّاص کے بھائی)۔

(۳۲) مُطّلب بن اَزہر

(۳۳) اُن کی بیوی رَملہ بنت ابی عَوف (یہ بنی سَہم میں سے تھیں)۔

حُلفائے بنی زُہرہ میں سے

(۳۴) عبداللہ بن مسعود (یہ قبیلۂ ھُذیل میں سے تھے)۔

(۳۵) اُن کے بھائی عُتبہ بن مسعود۔

(۳۶) مِقداد بن عَمرو (یہ مقداد بن اَسود کہلاتے تھے کیونکہ اَسود بن عبد یغوث نے ان کو بیٹا بنا لیا تھا)۔

بنی تَیم میں سے

(۳۷) حارث بن خالد۔ (یہ حضرت ابوبکرؓ کے ماموں زاد بھائی تھے)۔

(۳۸) ان کی بیوی رَیطہ بنت الحارث بن جَبلہ یا جُبَیلہ (یہ بھی بنی تیم میں سے تھیں)۔

(۳۹) عَمرو بن عثمان۔ (یہ حضرت طلحہؓ کے چچا تھے)۔

بنی مَخزوم میں سے

(۴۰) ابوسَلمہ بن عبدالاسد۔ (حضورؐ کے دودھ شریک اور پھوپھی زاد بھائی)۔

(۴۱) ان کی بیوی اُمّ سَلمہؓ (یہ بھی بنی مخزوم میں سے تھیں اور بعد میں ان کو اُمّ المومنین ہونے کا شرف نصیب ہُوا)۔

(۴۲) شَمّاس بن عثمان (یہ عُتبہ بن رَبیعہ کے بھانجے تھے)۔

(۴۳) ہَبّار بن سُفیان۔

(۴۴) ان کے بھائی عبداللہ بن سفیان۔ (بعض لوگوں نے ان کا نام عُبَیداللہ لکھا ہے)۔

(۴۵) ہِشام بن ابی حُذَیفہ بن مُغیرہ۔ (بعض لوگوں نے ان کا نام ہاشم لکھا ہے)

(۴۶) سَلمہ بن ہِشام بن مُغیرہ۔ (ابوجہل کے بھائی)

(۴۷) عیاشؓ بن ابی ربیعہ۔ (ابوجہل کے بھائی)

حلفائے بنی مخزوم میں سے (۴۸) معتقیبؓ بن عوف (یہ بنی خزاعہ میں سے تھے)۔

بنی جمح میں سے (۴۹) عثمانؓ بن مظعون۔ (حضرت عمرؓ کے برادرِ نسبتی)

(۵۰) ان کے بیٹے سائبؓ بن عثمان۔

(۵۱) ان کے بھائی قدامہؓ بن مظعون۔

(۵۲) ان کے دوسرے بھائی عبداللہؓ بن مظعون۔

(۵۳) حاطبؓ بن الحارث

(۵۴) ان کی بیوی فاطمہؓ بنت مجلل عامریہ۔

(۵۵) ان کے بیٹے محمدؓ بن حاطب۔

(۵۶) ان کے دوسرے بیٹے حارثؓ بن حاطب

(۵۷) ان کے بھائی حطابؓ بن الحارث

(۵۸) ان کی بیوی فکیہہؓ بنت یسار

(۵۹) سفیانؓ بن معمر

(۶۰) ان کے بیٹے جابرؓ بن سفیان۔

(۶۱) ان کے دوسرے بیٹے جنادہؓ بن سفیان۔

(۶۲) ان کی بیوی حسنہؓ۔ (جابر و جنادہ کی ماں)۔

(۶۳) حسنہؓ کے دوسرے شوہر سے بیٹے شرحبیلؓ بن حسنہ (یہ بنی غوث بن مر میں سے تھے)۔

(۶۴) عثمانؓ بن ربیعہ بن اُھبان۔

بنی سہم میں سے (۶۵) خنیسؓ بن حذافہ۔ (حضرت عمرؓ کے داماد۔ حضرت حفصہؓ ام المومنین کے پہلے شوہر)

(۶۶) عبداللہؓ بن حارث۔

(۶۷) ہشامؓ بن عاص بن وائل۔ (عمروؓ بن العاص کے بھائی)

(۶۸) قیسؓ بن حذافہ۔

(۶۹) ابوقیسؓ بن حارث۔

(۷۰) عبداللہؓ بن حذافہ

(۷۱) حارثؓ بن حارث بن قیس

(۷۲) معمرؓ بن حارث بن قیس

(۷۳) بشرؓ بن حارث بن قیس

(۷۴) اُن کے ماں جائے بھائی سعیدؓ بن عمرو (یہ بنی تمیم میں سے تھے)۔

(۷۵) سعیدؓ بن حارث بن قیس

(۷۶) سائبؓ بن حارث بن قیس

(۷۷) عمیرؓ بن رئاب

حلفائے بنی سہم میں سے (۷۸) محمیہؓ بن الجزء (یہ بنی زبید میں سے تھے)۔

بنی عدی میں سے (۷۹) معمرؓ بن عبداللہ بن نضلہ

(۸۰) عروہؓ بن عبدالعزیٰ۔ (بعض لوگوں نے عروہ بن ابی اثاثہ بن عبدالعزیٰ لکھا ہے)۔

(۸۱) عدیؓ بن نضلہ

(۸۲) ان کے بیٹے نعمانؓ بن عدی

حلفائے بنی عدی میں سے (۸۳) عامرؓ بن ربیعۃ العنزی (بنی عنز بن وائل میں سے تھے اور خطاب نے ان کو بیٹا بنا رکھا تھا)۔

(۸۴) ان کی بیوی لیلیٰ بنت ابی حثمہ (یہ بنی عدی میں سے تھیں)۔

بنی عامر بن لوئی میں سے (۸۵) ابو سبرہؓ بن ابی رُہم۔ (حضورؐ کی پھوپھی برّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے)

(۸۶) ان کی بیوی اُم کلثومؓ بنت سہیل بن عمرو۔

(۸۷) عبداللہؓ بن مخرمہ

(۸۸) عبداللہؓ بن سہیل بن عمرو۔

(۸۹) سلیطؓ بن عمرو۔

(۹۰) ان کے بھائی سکرانؓ بن عمرو۔ } یہ دونوں سہیل بن عمرو کے بھائی تھے

(۹۱) ان کی بیوی سودہؓ بنت زمعہ (جنہیں بعد میں اُم المومنین بننے کا شرف حاصل ہُوا)۔

(۹۲) مالکؓ بن زَمعہ (حضرت سودہؓ کے بھائی)۔
(۹۳) ان کی بیوی عَمرہؓ بنت السّعدی (بعض لوگوں نے ان کا نام عُمَیرہؓ لکھا ہے)۔
(۹۴) حاطِبؓ (یا ابوحاطِب) بن عَمرو۔
حُلفائے بنی عامر میں سے (۹۵) سَعدؓ بن خَولہ یا خَولَہ۔ (یہ یمنی تھے)۔
بنی الحارث بن فِہر میں سے (۹۶) ابوعبیدہؓ بن الجرّاح۔
(۹۷) سُہَیلؓ بن بَیضاء
(۹۸) عَمروؓ ابن ابی سَرح
(۹۹) عیاضؓ ابن زُہَیر (بعض نے ان کی جگہ ربیعہ بن ہلال کا نام لکھا ہے)۔
(۱۰۰) عَمروؓ ابن الحارث بن زُہَیر
(۱۰۱) عثمانؓ بن عبدغَنَم بن زُہَیر
(۱۰۲) سعدؓ (یا سعید) بن عبدقیس
(۱۰۳) حارثؓ بن عبدِقیس (۹)

مکّہ میں اِس ہجرت کا ردِّعمل

اِس ہجرت سے مکّے کے گھر گھر میں کُہرام مچ گیا، کیونکہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ اِن مہاجرین میں شامل نہ ہوں۔ کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد، کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن۔ ابوجہل کے بھائی سَلَمہؓ بن ہِشام، اُس کے چچازاد بھائی ہِشامؓ بن ابی حُذَیفہ اور عیّاشؓ بن ابی رَبیعہ، اور اس کی چچازاد بہن حضرت اُمِّ سَلَمہؓ، ابوسُفیان کی بیٹی اُمِّ حبیبہؓ، عُتبہ بن رَبیعہ کے بیٹے اور ہِندِ جگر خوار کے سگے بھائی ابوحُذَیفہؓ، سُہَیل بن عَمرو کے بھائی بیٹے، بیٹیاں اور داماد، اِسی طرح دوسرے سردارانِ قریش اور مشہور دشمنانِ اسلام کے اپنے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے کوئی گھر نہ تھا جو اِس واقعہ سے متأثر نہ ہُوا ہو۔ بعض لوگ اس کی وجہ سے اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے، اور بعض کے دلوں پر اس کا اثر ایسا ہُوا کہ آخر کار وہ مسلمان ہو کر رہے۔ (۱۰)

حضرت ابوبکرؓ کا ارادۂ ہجرت

اس پر قریش کو ایک چرکا اور لگا اور وہ یہ تھا کہ ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ جیسے بلند مرتبہ شخص بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے اجازت لے کر مکّہ سے نکل کھڑے ہوئے تاکہ دوسرے مہاجرین سے جا ملیں۔ بخاری میں

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ جب وہ بَرکُ الغِمادؔ[1] پہنچے (جو مکہ سے یمن کی جانب پانچ دن کی راہ پر ہے) تو قبیلۂ قارہ کا سردار ابن الدُّغُنّہ (یا ابن الدَّغِنہ) ان کو ملا۔ ابن اسحاق نے زُہری عن عُروَہ عن عائشہؓ کی سند سے بیان کیا ہے کہ مکہ سے ایک یا دو دن کی راہ گئے تھے کہ ابن الدغنہ ان کو ملا جو اس زمانے میں احابیش کا سردار تھا۔ اس نے کہا کہ ابوبکر کدھر کا ارادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، سخت اذیتیں دی ہیں، اور زندگی تنگ کر دی ہے۔" اس نے کہا "کیوں؟ ابوبکر، تم جیسا آدمی نہیں نکل سکتا اور نہیں نکالا جا سکتا۔ خدا کی قسم، تم تو معاشرے کی زینت ہو، ناداروں کو کما کر دیتے ہو، صلۂ رحمی کرتے ہو، عاجز و درماندہ کا بار اٹھاتے ہو، مہمان نوازی کرتے ہو اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہو۔ واپس چلو، میں تمہیں اپنی پناہ میں لیتا ہوں، اپنے شہر ہی میں اپنے رب کی عبادت کرو۔" پھر وہ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مکہ آیا اور اشرافِ قُریش کے پاس جا کر اس نے کہا "ابوبکرؓ جیسا آدمی نہیں نکل سکتا اور نہیں نکالا جا سکتا۔ کیا تم ایسے آدمی کو نکالتے ہو جس میں یہ یہ خوبیاں ہیں؟" ابنِ اسحاق کی روایت میں ہے کہ اس نے مکہ میں اعلان کیا کہ میں نے ابوقحافہ کے بیٹے کو پناہ دی ہے، اب کوئی اُن کے ساتھ بھلائی کے سوا کچھ اور سلوک نہ کرنے پائے۔ قُریش نے اس کی پناہ رد نہ کی، مگر یہ شرط لگائی کہ ابوبکرؓ اپنے گھر میں جس طرح چاہیں اپنے رب کی عبادت کریں اور جو چاہیں پڑھیں، لیکن ہمیں ایذا نہ دیں کہ علانیہ نماز اور تلاوت کرنے لگیں یا اپنے گھر کے باہر پڑھنا شروع کر دیں، کیونکہ اس سے ہمیں خطرہ ہے کہ ہماری عورتیں اور بچے فتنے میں پڑ جائیں گے۔ (حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حضرت ابوبکرؓ کتنی مدت تک اس طرح رہے)۔ پھر اُنہوں نے اپنے گھر کے احاطے میں ایک مسجد بنا لی اور اس میں نماز پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی قرأت میں ایسا سوز تھا، ایسی کشش تھی کہ مشرکین کی عورتیں اور ان کے بچے اور نوجوان ہجوم کر کے آتے اور قرآن سننے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ قرآن پڑھتے پڑھتے رونے لگتے اور سننے والوں پر اس کا اور زیادہ اثر ہوتا۔ اس پر مشرکین قُریش کے سردار گھبرا اُٹھے۔ انہوں نے ابن الدُّغُنّہ کو بلا بھیجا اور اس سے کہا کہ "ہم نے تمہاری خاطر یہ پناہ دی تھی تاکہ یہ اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کریں، مگر انہوں نے اپنے گھر کے احاطے میں مسجد بنا کر علی الاعلان نماز اور قرآن پڑھنا شروع کر دیا ہے جس سے ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ ہماری عورتوں اور بچوں کو فتنے میں ڈال دیں گے۔ ان کو اس سے روکو۔ یا تو یہ خاموشی سے اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کریں، یا پھر اگر انہیں علانیہ ہی یہ کام

---

[1] اس مقام کے تلفّظ میں اختلاف ہے۔ ہم نے جو تلفّظ لکھا ہے وہ فتح الباری سے ماخوذ ہے۔ معجم البلدان میں بُرکُ الغِماد لکھا ہے۔ ایک اور تلفّظ بِرکُ الغُماد بھی منقول ہوا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کرنے پر اصرار ہے تو اس سے کہو کہ تمہارا ذمّہ واپس کر دیں، کیونکہ ہم تمہارے ذمّہ کو توڑنا نہیں چاہتے۔ ابن الدغنہ نے جا کر حضرت ابوبکرؓ سے یہی بات کہی اور کہا میں نہیں چاہتا کہ عرب میں یہ بات مشہور ہو کہ میں نے ایک شخص کو پناہ دی تھی اور میری پناہ کو توڑ ڈالا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، اچھا تو میں تمہارا ذمّہ تمہیں واپس کرتا ہوں اور اللہ کے ذمّے پر راضی ہوں۔ ابن الدغنہ اُٹھا اور اُس نے قریش کے لوگوں سے جا کر کہہ دیا کہ ابوبکرؓ نے میرا ذمّہ واپس کر دیا ہے، اب تم جانو اور تمہارا آدمی۔ (۱۱)

مہاجرین کو واپس لانے کے لیے نجاشی کے پاس مشرکین کا وفد

ہجرت کے بعد قریش کے سردار سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے طے کیا کہ عبداللہ بن ابی ربیعہؓ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) اور عمرو بن عاص کو بہت سے قیمتی تحائف کے ساتھ حبش بھیجا جائے اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح نجاشی (شاہِ حبش) کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ان مہاجرین کو مکّہ واپس بھیج دے۔

حضرت اُمّ سلمہؓ کی روایت

اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ، جو خود مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں، یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرماتی ہیں، جسے ابن اسحٰق اور امام احمدؒ نے ان سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے یہ دونوں ماہر سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے۔ پہلے انہوں نے نجاشی کے اعیانِ سلطنت میں خوب خوب ہدیے تقسیم کر کے سب کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے بادشاہ پر بالاتفاق زور دیں گے۔ پھر نجاشی سے ملے اور اس کو بیش قیمت نذرانہ دینے کے بعد کہا کہ "ہمارے شہر کے چند نادان لونڈے بھاگ کر آپ کے ہاں آ گئے ہیں اور قوم کے اشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ لڑکے ہمارے دین سے بھی نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، بلکہ انہوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے۔" ان کا کلام ختم ہوتے ہی اہلِ دربار ہر طرف سے بولنے لگے کہ "ایسے لوگوں کو ضرور واپس کر دینا چاہیے۔ ان کی قوم کے لوگ زیادہ جانتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے۔ انہیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔" مگر نجاشی نے بگڑ کر کہا کہ اس طرح تو میں انہیں حوالے نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے دوسرے ملک کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا ہے اور یہاں پناہ لینے کے لیے آئے ہیں اُن سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ پہلے میں اُنہیں بُلا کر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ اُن کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس کی حقیقت

۱؎ بہت سے لوگوں نے عبداللہ بن ربیعہ لکھا ہے لیکن ابن ہشام نے بن ابی ربیعہ لکھا ہے۔ یہ حضرت عیّاشؓ بن ابی ربیعہ کا سگا بھائی تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

کیا ہے" چنانچہ نجاشی نے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے دربار میں بُلا بھیجا۔ نجاشی کا پیغام پاکر سب مہاجرین جمع ہُوئے اور اُنھوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے۔ آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے ہم تو وہی بےکم و کاست پیش کریں گے، خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے۔ دربار میں پہنچے تو چھُوٹتے ہی نجاشی نے سوال کیا کہ "یہ تم نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑا اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہُوئے۔ نہ دُنیا کے دُوسرے ادیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا؟ آخر یہ تمہارا نیا دین ہے کیا؟" اس پر مہاجرین کی طرف سے جعفرؓ بن ابی طالب نے ایک برجستہ تقریر کی جس میں پہلے عرب جاہلیت کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا ذکر کر کے بتایا کہ آپؐ کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں، پھر اُن مظالم کا ذکر کیا جو آنحضورؐ کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھا رہے تھے، اور اپنا کلام اِس بات پر ختم کیا کہ دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک کا رُخ اِس اُمید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔[1] نجاشی نے یہ تقریر سُن کر کہا کہ ذرا مجھے وہ کلام تو سُناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے

---

[1] حضرت جعفرؓ کی تقریر کے جو الفاظ ابن اسحاق نے حضرت اُمّ سلمہؓ کی روایت سے نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں: "اے بادشاہ، ہم ایک جاہلیت میں پڑی ہُوئی قوم تھے، بُت پُوجتے تھے، مُردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، ہمسائگی اور عہد و امان کا پاس کرنے میں بُرا رویّہ رکھتے تھے، اور ہم میں سے طاقت ور کمزور کو کھائے جاتا تھا۔ ہم اسی حال پر تھے کہ اللہ نے ہماری طرف خود ہم ہی میں سے ایک رسولؐ بھیجا جس کے نسب، جس کی صداقت، جس کی امانت اور جس کی پاک دامنی کو ہم جانتے تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بُلایا کہ ہم اس کی توحید کے قائل ہوں، اور اسی کی عبادت کریں اور اُن پتھروں اور بُتوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہم اور ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ اُس نے ہمیں راست گوئی، امانت داری، صلۂ رحمی، ہمسائگی اور عہد و امان کی پاسداری کا اور حرام افعال اور خونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا۔ ہم کو فواحش سے، جھُوٹ سے، مالِ یتیم کھانے سے، پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے روکا۔ ہمیں صرف اللہ واحد کی عبادت کرنے اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کرنے کی تلقین کی۔ اور ہمیں نماز پڑھنے، زکوٰۃ لینے اور روزہ رکھنے کی ہدایت کی (اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اسی طرح جعفرؓ نے اسلام کے دوسرے احکام اس کو بتائے)۔ پس ہم نے اس کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے، اور جو کچھ وہ اللہ کی طرف سے لایا تھا اُس میں اُس کی پیروی کی۔ ہم نے صرف اللہ کی عبادت کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا۔ جس چیز کو اس نے ہم پر حرام کر دیا اسے ہم نے حرام کیا اور جس کو اس نے ہمارے لیے حلال کر دیا اسے ہم نے حلال کیا۔ اِس پر ہماری قوم ہم پر ٹوٹ پڑی، اُس نے ہم کو

تمہارے نبی پر اُترا ہے۔ حضرت جعفرؓ نے جواب میں سُورۂ مریم کا وہ ابتدائی حصہ سُنایا جو حضرت یحیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہما السّلام سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سُنتا رہا اور روتا رہا یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہوگئی۔ اُس کے پادری بھی رو دیے اور اُن کے مُصاحف بھی آنسوؤں سے تر ہوگئے۔ جب حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں۔ خدا کی قسم میں تمہیں اِن لوگوں کے حوالے نہ کروں گا۔ اور قُریش کے سفیروں سے کہا، واپس جاؤ، بخدا میں ان لوگوں کو تمہارے سپرد ہرگز نہ کرونگا۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔

پھر حضرت اُمِّ سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ عبداللہ بن ابی ربیعہ ہمارے معاملہ میں کچھ نرم تھا اور چاہتا تھا کہ ہم بچ جائیں۔ مگر عمرو بن عاص نے کہا کہ خدا کی قسم، میں کل وہ بات پیش کروں گا جو ان لوگوں کی جڑ کاٹ دیگی۔ میں نجاشی کو بتاؤں گا کہ یہ عیسیٰ بن مریمؑ کو محض بندہ قرار دیتے ہیں۔ عبداللہ نے کہا ایسا نہ کرو، یہ ہمارے مخالف ہی سہی، مگر ہیں تو ہمارے ہی بھائی بند اور ان کا کچھ حق ہم پر ہے۔ عمرو بن عاص نے اُس کی ایک نہ سُنی اور دوسرے روز نجاشی سے کہا کہ "خدا اِن لوگوں کو بُلا کر ان سے یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰؑ بن مریمؑ کے بارے میں اِن کا عقیدہ کیا ہے۔ یہ لوگ اُن کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں" نجاشی نے پھر مہاجرین کو بُلا بھیجا۔ مہاجرین کو پہلے ہی عمرو بن عاص کی چال کا علم ہوچکا تھا۔ انہوں نے جمع ہو کر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دوگے؟ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے پریشان تھے۔ مگر پھر بھی اصحابِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہونا ہے ہو جائے، ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمائی اور اللہ کے رسُول نے سکھائی ہے چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں گئے اور نجاشی نے عمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال ان کے سامنے دُہرایا تو جعفر بن ابی طالب نے اُٹھ کر بلا تامّل کہا کہ ھو عبد اللہ و رسولہ و روحہ و کلمتہ القاھا الی مریم العذراء البتول " وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسُول ہیں اور اس کی طرف سے ایک رُوح اور ایک کلمہ ہیں

عذاب دیے، اور دین کے معاملہ میں ہم پر ظلم توڑے تاکہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بتوں کی طرف پھیر دے، اور ہم اُن تمام خبائث کو پھر سے حلال کرلیں جنہیں پہلے حلال کیے ہوئے تھے۔ آخر کار جب انہوں نے ہم پر سختی کی اور ظلم ڈھایا اور ہماری زندگی تنگ کردی اور ہمارے دین کے راستے میں حائل ہوگئے تو ہم آپ کے ملک کی طرف نکل آئے اور دوسروں کے بجائے آپ کے ہاں آنا پسند کیا اور آپ کی پناہ لینی چاہی، اس اُمید پر کہ اے بادشاہ آپ کے ہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا" (حاشیہ از مؤلف)

جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا تھا۔" نجاشی نے سُن کر ایک تنکا زمین سے اُٹھایا اور کہا "خدا کی قسم جو کچھ تم نے کہا ہے عیسیٰ اُس سے اِس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے"۔ اِس پر وہ پادری جو گرد و پیش بیٹھے تھے پُھنکارنے لگے۔ مگر نجاشی نے کہا واللہ بات یہی ہے خواہ تم کتنا ہی پُھنکارو۔ پھر اُس نے ہم سے کہا کہ جاؤ، تم میری زمین میں امن سے رہو۔ جو تمہیں بُرا کہے گا وہ سزا پائے گا۔ اگر مجھے سونے کا پہاڑ بھی ملے تو اُس کے عوض میں تمہیں ستانا پسند نہ کروں گا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ ان دونوں سفیروں کو ان کے ہدیے واپس کر دو، مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ نے جب میرا ملک مجھے واپس دلوایا تھا تو مجھ سے کوئی رشوت نہ لی تھی کہ میں اللہ کے معاملہ میں رشوت لوں۔ (۱۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت

اِس واقعہ کے ایک دوسرے عینی شاہد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں جو اِس مجلس میں موجود تھے۔ مُسند احمد اور طبرانی میں ان کی روایت یہ ہے کہ مہاجرین حبشہ کو جب نجاشی نے اپنے دربار میں بُلایا اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات سُنیں تو کہا "واللہ یہ لوگ اُس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے جو ہم عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہتے ہیں۔ مرحبا تم کو اور اُس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسُول ہیں، اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں، اور وہ وہی رسُول ہیں جن کی بشارت عیسیٰ ابن مریم نے دی تھی"۔ (۱۳)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں یہ ذکر بھی ہے کہ قریش کے دونوں سفیروں نے نجاشی کے دربار میں حاضر ہو کر پہلے اس کو سجدہ کیا، پھر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور کہا کہ ہمارے بنی عم میں سے کچھ لوگ آپ کے ہاں آئے ہیں اور ہم سے اور ہمارے دین سے الگ ہو گئے ہیں۔ اس پر نجاشی نے مہاجرین کو بلا بھیجا۔ حضرت جعفرؓ نے کہا آج مَیں تم سب کی طرف سے بولوں گا۔ چنانچہ سب ان کے پیچھے چلے۔ دربار میں داخل ہو کر حضرت جعفرؓ نے سلام کیا۔ درباریوں نے کہا سجدہ کیوں نہیں کرتے؟ حضرت جعفرؓ نے کہا ہم خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ اس کے بعد بات رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کی تعلیمات تک پہنچی، اور پھر حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کے متعلق مسلمانوں کے عقیدے کا ذکر آیا۔ اس روایت میں نجاشی کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ اس نے حضورؐ کی تصدیق کرنے کے بعد کہا "خدا کی قسم اگر مَیں بادشاہی کی ذمہ داریوں میں پھنسا ہُوا نہ ہوتا تو اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا، ان کی جوتیاں اُٹھاتا اور ان کو وضو کراتا"۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت

اسی سے ملتی جلتی روایت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے حافظ ابو نعیم اور بیہقی نے نقل کی ہے۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ مہاجرین کے پہنچنے سے پہلے قریش کے وفد نے نجاشی کو بھڑکانے کے لیے کہا کہ دیکھ لیجیے گا، یہ لوگ آپ کو سجدہ نہ کریں گے جب ہم دربار میں پہنچے تو پادریوں اور راہبوں نے کہا بادشاہ کو سجدہ کرو۔ حضرت جعفرؓ نے فرمایا، ہم اللہ عزوجل کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ آگے بڑھ کر جب ہم نجاشی کے سامنے پہنچے تو اس نے حضرت جعفر سے کہا تمہیں کس چیز نے مجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا؟ انہوں نے پھر وہی جواب دیا کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ آگے وہی قصہ ہے جو حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ نے بیان کیا ہے اور آخر میں یہ اضافہ ہے کہ نجاشی نے ہم لوگوں سے کہا کہ میری زمین میں تم جب تک چاہو رہو اور ہمارے لیے کھانے اور کپڑے کا حکم دیا۔

خود حضرت جعفرؓ کی روایت

حافظ ابن عساکر اور طبرانی نے خود حضرت جعفرؓ کا بیان اُن کے صاحبزادے عبداللہؓ بن جعفر کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ قریش کے وفد کی شکایت کے جواب میں جب ہم نے اپنے اور ان کے دینی اختلاف کی وضاحت کی، تو نجاشی نے قریش کے سفیروں سے پوچھا کیا یہ تمہارے غلام ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں۔ اس نے پوچھا کیا تمہارا ان پر کوئی قرض آتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا تو پھر چھوڑ دو انہیں۔ پھر حضرت جعفرؓ بھی وہی قصہ بیان کرتے ہیں جو دوسرے حضرات نے بیان کیا ہے کہ عمرو بن العاص نے نجاشی کے سامنے حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کے متعلق ہمارے عقیدے کا قصہ چھیڑا اور جب ہم نے اپنا عقیدہ بیان کیا تو اس نے اس کی تصدیق کی۔ پھر اس نے ہم سے پوچھا کہ یہاں کوئی تمہیں تکلیف تو نہیں دیتا؟ ہم نے کہا ہاں۔ اس پر منادی کرادی گئی کہ جو کوئی ان لوگوں میں سے کسی کو ستائے گا اسے چار درہم جرمانہ کیا جائے گا۔ نجاشی نے ہم سے پوچھا کیا یہ کافی ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔ تب اُس نے جرمانہ دوگنا کر دیا۔ (۱۴)

مہاجرین کا امتیازانہ کردار

اس طرح مہاجرین حبشہ نے نہ صرف یہ ثابت کر دیا کہ جس حق پر وہ ایمان لاتے ہیں اس پر ایمان رکھنے میں وہ اتنے مخلص ہیں کہ اس کی خاطر گھر بار، اعزہ و اقربا، کاروبار اور جائدادیں، اور ملک و وطن سب کو چھوڑ کر جلاوطنی کے مصائب برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے، بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ اس جلاوطنی کی حالت میں بھی جبکہ اُن کا کوئی سہارا نہ تھا، وہ حق کے معاملہ میں کوئی مداہنت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کی یہ جرأت ایمانی حیرت انگیز تھی کہ انہوں نے عین دربار شاہی میں ایسے نازک موقع پر اٹھ کر حضرت عیسیٰ کے متعلق اپنا عقیدہ

صاف صاف بیان کر دیا جبکہ نجاشی کے تمام اہلِ دربار رشوت کھا کر اُنہیں اُن کے دشمنوں کے سپرد کر دینے پر تُل گئے تھے۔ اُس وقت اِس امر کا پُورا خطرہ تھا کہ مسیحیت کے بنیادی عقائد پر اسلام کا بے لاگ تبصرہ سُن کر نجاشی بھی بگڑ جاتے گا اور ان مظلوم مسلمانوں کو قریش کے قصائیوں کے حوالے کر دے گا۔ مگر اس کے باوجود اُنہوں نے کلمۂ حق پیش کرنے میں ذرّہ برابر تأمل نہ کیا۔ اسی چیز نے دُنیا کو یہ دکھا دیا کہ اسلام کی دعوت کو کیسے مضبوط کردار کے سرفروش پیرو بہم پہنچے ہیں۔ (۱۵)

حبش سے عیسائیوں کے وفد کی آمد

مہاجرین کے اخلاق و کردار اور ان کی دعوت کا جو اثر اہلِ حبش پر پڑا اس کا اندازہ اِس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ وہاں سے ۲۰ عیسائیوں کا ایک وفد مکّہ آکر حضورؐ سے ملا۔

اس واقعہ کو ابنِ ہشام اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے ۲۰ کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیقِ حال کے لیے مکّہ معظمہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجدِ حرام میں ملا۔ (ایک روایت میں یہ ہے کہ ایک مجلس میں ملا اور کچھ سوالات کیے) قریش کے بہت سے لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر گرد و پیش کھڑے ہو گئے۔ وفد کے لوگوں نے حضورؐ سے کچھ سوالات کیے جن کا آپؐ نے جواب دیا۔ پھر آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن مجید کی آیات اُن کے سامنے پڑھیں۔ قرآن سُن کر اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انہوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ابوجہل اور اُس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستہ میں جا لیا اور انہیں سخت ملامت کی کہ "بڑے نامُراد ہو تم لوگ، تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لیے بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور اُنہیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اُس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔" اس پر انہوں نے جواب دیا "سلام ہے بھائیو تم کو۔ ہم تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو، ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔" اسی واقعہ کا ذکر سورۂ قصص میں آیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ (آیات ۵۲-۵۳)

"جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ اور

جب وہ انہیں سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے۔ ہم اس سے پہلے بھی اسی دینِ اسلام پر تھے۔"

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ، لَا نَبْتَغِى الْجٰهِلِيْنَ۝ (آیت ۵۵)

"اور جب انہوں نے بیہودہ بات سُنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔" (۱۶)

حبشہ سے واپس آنے والے مہاجرین کی پہلی قسط

اس مقام پر یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مہاجرین حبشہ میں سے ایک گروہ تو حضرت جعفرؓ کے ساتھ حبشہ ہی میں رہا اور جنگِ خیبر کے موقع پر واپس آیا۔ اور حسبِ ذیل حضرات ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق مختلف اوقات میں حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے واپس آ گئے:

حضرت عثمانؓ اور ان کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ۔ حضرت ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ اور ان کی اہلیہ سہلہؓ بنت سہیل بن عمرو۔ حضرت عبداللہ بن جحش۔ حضرت عتبہؓ بن غزوان۔ حضرت زبیرؓ بن العوام۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر۔ حضرت سویبطؓ بن سعد بن حرملہ۔ حضرت طلیبؓ بن عمیر۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ حضرت مقدادؓ بن عمرو۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود۔ حضرت ابو سلمہؓ اور ان کی بیوی حضرت امِ سلمہؓ۔ حضرت شماسؓ بن عثمان۔ حضرت سلمہؓ بن ہشام (ان کو مکہ میں قید کر لیا گیا)۔ حضرت عیاشؓ بن ابی ربیعہ (یہ مدینہ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے تھے مگر ان کے ماں جائے بھائی ابوجہل اور حارث بن ہشام دھوکہ دے کر انہیں پکڑ لائے)۔ حضرت معتبؓ بن عوف۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون اور ان کے بیٹے سائبؓ اور ان کے دونوں بھائی قدامہؓ اور عبداللہؓ۔ حضرت خنیسؓ بن حذافہ۔ حضرت ہشامؓ بن عاص بن وائل (یہ بھی مکہ میں قید کر لیے گئے)۔ حضرت عامرؓ بن ربیعہ اور ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ۔ حضرت عبداللہ بن مخرمہ۔ حضرت عبداللہؓ بن سہیل بن عمرو (انہیں مکہ میں قید کر کے ان کے باپ نے ان پر اتنا ظلم کیا کہ یہ بظاہر کافر بن گئے اور دل میں مسلمان رہے۔ جنگِ بدر کے موقع پر کفار کے ساتھ گئے اور عین حالتِ جنگ میں مسلمانوں سے جا ملے)۔ حضرت ابو سبرہؓ بن ابی رہم اور ان کی بیوی امِ کلثومؓ بنت سہیل بن عمرو۔ حضرت سکرانؓ بن عمرو (ابنِ اسحاق اور واقدی کا بیان ہے کہ ان کا انتقال مکہ آ کر ہوا، اور موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر کہتے ہیں کہ یہ حبش ہی میں انتقال کر چکے تھے)۔ حضرت سودہؓ بنت زمعہ۔ حضرت سعدؓ

بن خولہ۔ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح۔ حضرت عمروؓ بن الحارث۔ حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ۔ حضرت عمروؓ بن ابی سرح۔ (۱۴)

سورۃ رُوم کی پیشین گوئی

ہجرتِ حبشہ ہی کے زمانے میں ایک بڑا اہم واقعہ پیش آیا جو آخرکار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کا ناقابلِ انکار ثبوت بن گیا، اور کسی کے پاس اُس کی کوئی توجیہ اِس کے سوا ممکن نہ رہی کہ قرآن فی الواقع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو بذریعۂ وحی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے۔ یہ سورۂ رُوم کی ابتدائی آیات کا نزول تھا جن میں فرمایا گیا تھا کہ "رُومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنی اِس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے" (آیات ۲ تا ۴)۔ اِس کا مختصر قصہ ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصرِ روم ماریس (Maurice) کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس (Phocas) تختِ سلطنت پر قابض ہو گیا۔ اِس نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کرایا، پھر خود قیصر کو قتل کرا کے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں برسرِعام لٹکوا دیے، اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اِس واقعہ سے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو رُومی سلطنت پر حملہ آور ہونے کے لیے ایک بہترین اخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر ماریس اُس کا محسن تھا۔ اُسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہوا تھا اور اسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اِس بنا پر اُس نے اعلان کیا کہ میں غاصب فوکاس سے اِس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اس نے سلطنتِ رُوم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فوجوں کو پے درپے شکستیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں ایڈیسا (موجودہ اُرفا) تک اور دوسری طرف شام میں حلب اور انطاکیہ تک پہنچ گیا۔ رُوم کے اعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقہ کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اُس نے اپنے بیٹے ہرقل (Heraclius) کو ایک طاقتور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہرقل قیصر بنایا گیا، اور اس نے برسرِ اقتدار آ کر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اُس نے ماریس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

خسرو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے پر اُسے نئے قیصر سے صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اس جنگ کو اس نے مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو رُومی سلطنت کے سرکاری کلیسا نے ملحد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نسطوری اور یعقوبی وغیرہ) ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہوگئیں۔ اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ خسرو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہرقل آکر اس سیلاب کو نہ روک سکا تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے، ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا، کنیسۃ القیامہ (Holy Sepulchre) برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اسی پر مسیحؑ نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن (ایران کے دارالسلطنت) پہنچا دی، لاٹ پادری زکریا کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انہوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بری طرح خسرو پرویز پر چڑھا تھا اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

> "سب خداؤں سے بڑے، تمام روئے زمین کے مالک، خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام،
>
> تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا؟"

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اُردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ معظمہ میں ایک اور اس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اور شرک کے پیرو کار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء (۵ بعد بعثت) میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو رُوم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اُس وقت سلطنتِ رُوم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان

پر تھا۔ مکّے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو ایران کے آتش پرست مشرکین فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بُت پرست بھی تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآن مجید کی یہ سورہ نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ "قریب کی سرزمین میں رُومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آ جائیں گے، اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔" اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر دُور دُور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو مکّے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشینگوئی کے بعد بھی آٹھ سال تک اُن کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف رُوم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ سنہ ۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضہ میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور سنہ ۶۱۷ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون (Chalcedon) (موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابہ زنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوندِ آتش کی بندگی نہ اختیار کر لے۔" آخرکار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (Carthage) (موجودہ ٹیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض، انگریز مؤرخ گبن کے بقول "قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رُومی سلطنت ایران پر غالب آ جائے گی، بلکہ غلبہ تو درکنار، اس وقت تو کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔"[1]

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفّارِ مکّہ نے ان کا خوب مذاق اڑایا اور اُبَیّ بن خلف نے حضرت

---

[1] Gibbon. Decline and Fall of the Roman Empire Vol. II. P. 788. Modern Library, New York.

ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آگئے تو دس اونٹ میں دوں گا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن میں فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ کے الفاظ آتے ہیں، اور عربی زبان میں بِضْع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبَیّ سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ سو اونٹ دے گا۔

۶۲۲ء میں ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، اور اُدھر قیصر ہرقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحر اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہوا جہاں اس نے ایران پر پشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اِس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اُسقفِ اعظم سرجیس (Sargius) نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض دی۔ ہرقل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں آرمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے آذربیجان میں گھس کر زرتشت کے مقام پیدائش ارمیاہ (Ohromia) کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشین گوئیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہو گئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوی کی فیصلہ کن لڑائی (۶۲۷ء) میں انہوں نے سلطنتِ ایران کی کمر توڑ دی، اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دستگرد (دسکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا اور آگے بڑھ کر روم کے لشکر عین طیسفون (Ctesipon) کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف خود اس کے گھر میں بغاوت رونما ہوئی۔ وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیے گئے، اور اس کا بیٹا شیرویہ اسے قتل کر کے تخت پر قابض ہو گیا۔ یہی سال تھا جس میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی جسے قرآن فتحِ عظیم کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور یہی سال تھا جس میں شاہِ ایران نے تمام رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر "مقدس صلیب" کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المقدس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچی تھی۔ عرب کے بکثرت مشرکین اس پر ایمان لے آئے، اُبَی بن خلف کے وارثوں کو ہار مان کر شرط کے اُونٹ ابوبکر صدیق کے حوالے کرنے پڑے، اور وہ انہیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے حکم دیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ شرط اُس وقت ہُوئی تھی جب شریعت میں جوئے کی حُرمت کا حکم نہیں آیا تھا، مگر اب حُرمت کا حکم آ چکا تھا۔ اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی، مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔

(۱۸)

حوالہ جات باب (۹)

(۱) پمفلٹ "آزادی" از مؤلف صفحہ ۱۱-۱۲۔
(۲) تفہیم القرآن، جلد سوم۔ العنکبوت، حواشی ۹۴ تا ۹۹۔
(۳) " " ، جلد چہارم، الزمر، دیباچہ و حواشی ۳۰ تا ۳۲۔
(۴) اضافہ از مؤلف
(۵) تفہیم القرآن، جلد سوم، دیباچہ سورۃ مریم
(۶) اضافہ از مؤلف
(۷) تفہیم القرآن، جلد پنجم، خلاصہ دیباچہ النجم
(۸) " " ، جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹۹
(۹) اضافہ از مؤلف
(۱۰) تفہیم القرآن، جلد سوم، مریم۔ دیباچہ سورۃ مریم
(۱۱) اضافہ از مؤلف
(۱۲) تفہیم القرآن، جلد سوم، دیباچہ سورۃ مریم۔
(۱۳) " " ، جلد پنجم، الصف، ماخوذ از حاشیہ ۸۔
(۱۴) اضافہ از مؤلف۔
(۱۵) تفہیم القرآن، جلد سوم، مریم، خلاصہ حاشیہ ۲۵۔
(۱۶) " " " " ، القصص، حاشیہ ۷۲۔
(۱۷) اضافہ از مؤلف
(۱۸) تفہیم القرآن، جلد سوم، دیباچہ سورۃ روم۔

باب (۱۰)

سنہ ۶ بعد بعثت سے سنہ ۱۰ بعد بعثت تک

ہجرتِ حبشہ کے بعد مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے جن میں چند خواتین بھی تھیں۔ دشمنانِ اسلام پر اُس وقت ایک تو ہجرت کی جھنجھلاہٹ طاری تھی، اور اس پر مزید غصے کا اضافہ اِس بات سے ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو حبش میں اچھی پناہ گاہ مل گئی تھی، اور مشرکین کا وفد وہاں سے ناکام و نامراد واپس آیا تھا۔ اس حالت میں وہ خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دست درازیاں کرنے سے بھی نہ چوکے۔ (۱)

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قریش کی دست درازیاں

بخاری میں حضرت عُروہ بن زُبَیر کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عَمرو بن عاص سے پُوچھا کہ آپ نے مشرکین کا سب سے زیادہ سخت برتاؤ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا ایک روز آپؐ کعبہ کے صحن میں (اور ایک روایت میں ہے کہ حِجرِ کعبہ میں) نماز پڑھ رہے تھے۔ یکایک عُقبہ بن ابی مُعَیط آگے بڑھا اور اُس نے آپؐ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اُسے بل دینا شروع کر دیا تاکہ گلا گھونٹ کر آپؐ کو مار ڈالے۔ مگر عین وقت پر حضرت ابوبکرؓ پہنچ گئے اور انہوں نے دھکا دے کر اسے ہٹا دیا۔ حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ جس وقت ابوبکر صدیقؓ اُس ظالم سے کشمکش کر رہے تھے اس وقت اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ؟ کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟۔ ابن جریر نے اپنی تاریخ میں بھی یہ واقعہ ابو سَلَمہ بن عبدالرحمٰن کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ لیکن نسائی اور ابن ابی حاتم نے اِسے حضرت عبداللہ کے بجائے اُن کے والد حضرت عَمرو بن عاص سے کچھ لفظی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے اور اس میں عُقبہ بن ابی مُعَیط کے بجائے یہ ذکر ہے کہ قُریش کے لوگوں نے یہ حرکت کی تھی، اور حضرت ابوبکرؓ روتے ہوئے حضورؐ کو بچاتے جاتے تھے اور یہ الفاظ کہتے جاتے تھے۔ (۲)

امام بخاری نے یہ قصّہ کئی جگہ اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ کسی جگہ روایت حضرت عَمرو بن العاص سے

ہے اور کسی جگہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے[1]۔ ایک جگہ حضرت عمروؓ ابن العاص کی روایت یہ ہے کہ میں نے کبھی قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرتے نہیں دیکھا، سوائے ایک مرتبہ کے۔ وہ لوگ کعبہ کے سامنے میں بیٹھے تھے اور حضورؐ مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں اُنہوں نے ایک دوسرے کو آپؐ کے خلاف بھڑکایا۔ آخر عقبہ بن ابی مُعیط اُٹھا اور اُس نے اپنی چادر آپؐ کے گلے میں ڈال کر کھینچنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ گھٹنوں کے بل ٹیک گئے اور لوگوں میں شور مچ گیا۔ اُس وقت حضرت ابوبکرؓ دوڑتے ہوئے آئے اور آپ کا بازو پیچھے سے تھام لیا اور کہنے لگے "کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟" پھر لوگ آپؐ کے پاس سے ہٹ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر جب آپؐ قریش کے اُن لوگوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا "قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تمہاری طرف ذبح کے ساتھ بھیجا گیا ہوں"۔ اس پر ابوجہل بولا "اے محمدؐ، تم کبھی نادان نہ تھے"۔ حضورؐ نے فرمایا "اور تم انہی میں سے ہو"۔ (ابویعلیٰ، ابن حبان، طبرانی اور بیہقی نے بھی یہ قصہ حضرت عمرو بن العاص کی روایت سے نقل کیا ہے)۔

صحیح بخاری کی دوسری روایت میں یہ ہے کہ مشرکین نے حضورؐ کی داڑھی اور سر کے بال نوچ ڈالے اور اکثر بال اُکھڑ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کی حمایت کے لیے اُٹھے اور وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے کہا "چھوڑ دو انہیں اے ابوبکر، قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں اِن کی طرف ذبح کے ساتھ ہی بھیجا گیا ہوں"۔ یہ سُن کر ساری بھیڑ آپ کے پاس سے چھٹ گئی۔

ابن ہشام، ابن جریر طبری اور بیہقی نے ابن اسحاق کی سند سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ عروہ بن زُبیر نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے پوچھا کہ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت کا جو اظہار کرتے تھے اُس میں سے شدید ترین واقعہ آپ نے کیا دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا میں ایک روز قریش کی مجلس میں گیا اور ان کے سردار حجر میں جمع تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کہ اِس شخص کے معاملہ میں ہم نے جتنا صبر کیا ہے اُتنا صبر کرتے ہوئے ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ اِس نے ہماری عقلوں کو حماقت ٹھہرایا،

---

[1] صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل روایت حضرت عمرو بن عاص کی ہے، اور حضرت عبداللہؓ بن عمرو نے غالباً اپنے والد سے سنی ہوئی روایت بیان کی ہے۔ کیونکہ حضرت عبداللہؓ بن عمرو نے سنہ ۶۵ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو وہ اِس واقعہ کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ان کی پیدائش ہجرت سے سات سال پہلے یعنی سنہ ۶ بعد بعثت میں ہوئی تھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

ہمارے باپ دادا کی بُرائی کی، ہمارے دین کی عیب جوئی کی اور ہماری جماعت میں تفرقہ ڈال دیا حقیقت میں ہم نے بہت بڑی بات پر صبر کیا ہے۔ اِس اثنا میں کہ وہ یہ باتیں کہہ رہے تھے، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمودار ہوئے اور چلتے ہوئے آگے بڑھ کر آپؐ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا، پھر کعبہ کا طواف کرتے ہوئے ان کے پاس سے گزرے۔ اُنہوں نے آپ پر ایک چبھتا ہوا فقرہ کسا اور مَیں نے حضورؐ کے چہرے پر اس کا ناگوار اثر محسوس کیا۔ پھر دوسری مرتبہ آپؐ گزرے۔ اُنہوں نے پھر آوازہ چُست کیا اور مَیں نے محسوس کیا کہ آپ کو وہ ناگوار گزرا ہے۔ تیسری مرتبہ جب آپؐ گزرے اور انہوں نے یہی حرکت کی تو آپؐ رُک کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا، "قریش کے لوگو، سُنتے ہو؟ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، مَیں تمہارے پاس ذبح لے کر آیا ہُوں۔" عبداللہؓ بن عَمرو کہتے ہیں کہ حضورؐ کی اس بات پر سارے لوگ سُن ہو کر رہ گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ پھر ان میں سے جو سب سے زیادہ بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا اس نے آپؐ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایسی باتیں کرنی شروع کر دیں جو وہ اپنے نزدیک بہتر سے بہتر پاتا تھا، یہاں تک کہ اس نے کہا، "اے ابوالقاسم، اچھی طرح گزر جاؤ، خدا کی قسم، تم تو کبھی نادان نہ تھے۔" چنانچہ حضورؐ وہاں سے پلٹ گئے۔ دوسرے روز پھر یہ لوگ حِجر میں جمع ہوئے اور مَیں ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے آپس میں کہا، "کچھ یاد ہے کہ یہ شخص تمہارے معاملے میں کہاں تک بڑھ گیا ہے حتیٰ کہ اس نے وہ بات تک کُھل کر کہہ دی جو کل کہی تھی اور پھر تم نے اسے چھوڑ دیا۔" اتنے میں حضورؐ سامنے سے آتے نظر آئے۔ آپؐ کے آتے ہی سب یکبارگی آپ پر جھپٹے اور آپ کو گھیر کر کہنے لگے "تم ہی ہو جو یہ اور یہ کہتے ہو؟" آپؐ نے فرمایا، "ہاں مَیں ہی ہوں جو یہ کہتا ہُوں۔" اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک شخص نے آپؐ کی چادر کو گریبان کے پاس سے پکڑ کر مُٹھی میں لے لیا۔ اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ آپؐ کی حمایت کے لیے اٹھے وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصُور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟" اس کے بعد لوگ آپؐ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ ہے سب سے شدید ترین معاملہ جو مَیں نے قریش کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرتے دیکھا ہے۔ (مُسند احمد) میں بھی یہ قصّہ اسی طرح درج ہے۔

حضرت حمزہؓ کا اسلام

اِسی زمانے میں ایک روز ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اسلام کے دائرے میں داخل کر دیا۔ مؤرخین کے درمیان اُن کے مسلمان ہونے کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ ابنِ حجر نے اِصابہ میں سنہ ۲ بعد بعثت تاریخ لکھی ہے۔ ابن عبدالبرّ نے پہلے سنہ ۲ لکھنے کے بعد پھر لکھا ہے کہ کہا گیا ہے

کہ وہ ؁ بعد بعثت میں حضورؐ کے دارالارقم میں داخل ہونے کے بعد مسلمان ہوئے تھے، مگر ابن سعد، ابن الجوزی اور العتقی نے اس کا زمانہ قطعیت کے ساتھ ؁ بعد بعثت ہی بتایا ہے۔ ابن القیم نے بھی زادالمعاد میں اس کا ذکر ہجرت حبشۂ ثانیہ کے بعد کیا ہے، اور یہی ابن اثیر کی تاریخ الکامل میں ہے۔ علاوہ بریں جو واقعہ حضرت حمزہؓ کے اسلام کا موجب بنا وہ بھی بجائے خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ؁ بعد بعثت میں پیش نہیں آسکتا تھا، بلکہ قریش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کشمکش بہت زیادہ بڑھ جانے کے بعد ہی اس کا پیش آنا ممکن تھا۔ ؁ میں ابوجہل کی کیا مجال تھی کہ وہ آپؐ کو گالیاں دیتا تو درکنار آپؐ سے آنکھ بھی ملا سکتا۔

قصہ یہ ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقول ابن اسحاق صَفا کے پاس سے، اور بعض دوسرے اقوال کے مطابق حَجُون کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ابوجہل نے آپؐ کو بے تحاشا گالیاں دیں اور آپؐ کی اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کی شان میں بہت بُرے الفاظ استعمال کیے۔ مگر آپؐ نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اِس کی خبر ابنِ اسحاق کے بیان کے مطابق عبداللہ بن جُدعان (بنی تیم کے ایک رئیس) کی آزاد کردہ لونڈی نے، اور بقول بعض حضرت حمزہؓ کی بہن حضرت صَفیہؓ نے، اور بروایت ابن ابی حاتم دو عورتوں نے حضرت حمزہؓ کو پہنچادی۔ وہ قریش کے نہایت بہادر، طاقت ور، اور خوددار آدمی تھے۔ حضورؐ کے چچا بھی تھے، دودھ شریک بھائی بھی، اور ان کی والدہ بی بی آمنہ کی چچازاد بہن بھی تھیں۔ عمر بھی اُن کی حضورؐ سے دو چار سال ہی زیادہ تھی۔ آپؐ سے ان کو بے حد محبت تھی۔ شکار کے شوقین تھے تیر کمان لیے ہوئے واپس آرہے تھے کہ یہ قصہ سُنا۔ غصہ میں بھرے ہوئے حرم پہنچے جہاں ابوجہل بیٹھا تھا اور جاتے ہی کمان اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا، پھر کہا "تو اُن کو گالیاں دیتا ہے، میں بھی اُنہی کے دین پر ہوں اور وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں، مجھ میں ہمت ہے تو یہی گالیاں ذرا مجھے دے کر دیکھ۔" اس پر بنی مخزوم کے کچھ لوگ ابوجہل کی حمایت کے لیے اُٹھے، مگر اُس نے کہا "ابو عمارہ کو چھوڑ دو، میں نے واقعی اُن کے بھتیجے کو بُری طرح گالیاں دی تھیں۔" طَبَرانی اور ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت حمزہؓ نے فرمایا "میرا دین بھی محمدؐ کا دین ہے، مجھے اس سے روک لو اگر تم سچے ہو۔"

یُونس بن بُکیر صاحبُ المَغَازی نے ابنِ اسحاق کی سند سے اِس قصّے کی مزید تفصیل یہ دی ہے کہ حضرت حمزہؓ حمیّت میں آکر یہ کام کر تو گئے مگر جب اپنے گھر پہنچے تو دل میں کہا "تو قریش کا سردار ہے، دین سے پھرے ہوئے اِس شخص کا پیرو بن گیا اور اپنے آبائی دین کو چھوڑ گیا۔ تیرے لیے موت اُس کام سے بہتر ہے جو تُو نے کیا ہے۔" پھر اللہ سے دُعا کی کہ "خدایا، اگر یہ صحیح راستہ ہے تو اس کی تصدیق میرے دل میں

ڈال دے، ورنہ میرے لیے اس سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا فرما دے۔" اُس رات وہ وسوسۂ شیطانی سے سخت بے چین رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ پھر حضورؐ کے پاس پہنچے اور کہا "بھتیجے، میں ایک ایسے معاملہ میں پڑ گیا ہوں جس سے نکلنے کی کوئی صورت مجھے نظر نہیں آتی، اور مجھ جیسے آدمی کا کسی ایسی چیز پر قائم رہنا جس کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ راستی ہے یا گمراہی، ایک شدید بات ہے۔" حضورؐ نے ان کی یہ بات سن کر ان کو نصیحت کی، خدا کا خوف دلایا اور ایمان لانے پر بشارت دی، یہاں تک کہ اللہ نے ان کے دل میں ایمان ڈال دیا اور انہوں نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ صادق ہیں۔" (اس واقعہ کو بیہقی نے بھی بحوالۂ یونس بن بکیر ابن اسحاق سے نقل کیا ہے)۔

حضرت عمرؓ کا اسلام

اس کے بعد دوسری اور زیادہ زبردست چوٹ قریش کو یہ لگی کہ ایک روز یکایک انہیں معلوم ہوا کہ عمرؓ بن خطاب بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔ وہ قریش کی مخالفتِ اسلام کے ستونوں میں سے ایک اہم ستون تھے۔ ایمان لانے والوں پر ظلم و ستم کرنے میں پیش پیش تھے۔ قریش میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انسابِ عرب کے علم میں ان کی شہرت تھی۔ قریش کی طرف سے سفارت کے منصب پر بھی وہ بھیجے جاتے تھے۔ قبائل کے درمیان مُنافرت اور مُفاخرت کی نوبت آتی تو ان کو حَکم بنایا جاتا اور ان کا فیصلہ قبول کیا جاتا۔ قریش سے کوئی مفاخرت کرتا تو انہی کو جواب دینے کے لیے بھیجا جاتا۔ بہادر تھے۔ طاقت ور تھے۔ شہسوار تھے۔ زبان آور تھے اور ان کی قوتِ بیان کا لوہا مانا جاتا تھا۔ قریش کو یہ تصور بھی نہ تھا کہ ان جیسا آدمی بھی ایک روز ان کے مقابلہ میں اسلام کی علمبرداری کے لیے اٹھ کھڑا ہو گا۔ لیکن ایک تدریجی عمل ان کے اندر ایسا ہو رہا تھا جو بالآخر انہیں اسلام کی طرف کھینچ لے گیا۔ (۳)

اُن کا اوّلین تاثر

ان کا پہلا تاثر وہ تھا جسے مسند احمد اور طبرانی میں خود اُن کی روایت سے نقل کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے کے لیے گھر سے نکلا، مگر آپؐ مجھ سے پہلے حرم میں داخل ہو چکے تھے۔ میں پہنچا تو آپؐ نماز میں سورۂ الحاقہ پڑھ رہے تھے۔ میں آپؐ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور سننے لگا۔ قرآن کی شانِ کلام پر میں حیران ہو رہا تھا کہ میرے دل میں یکایک یہ خیال آیا کہ یہ شخص ضرور شاعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ فوراً ہی حضورؐ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ "یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو۔" (آیات ۴۰-۴۱)۔ میں نے اپنے دل میں کہا

شاعر نہیں تو پھر کاہن ہے۔ اسی وقت زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ "اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو" تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ "یہ رب العلمین کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔ (آیات ۴۲-۴۳) یہ سن کر اسلام میرے دل میں گھر کر گیا۔ (۴)

اُن پر ہجرتِ حبشہ کا اثر

ان کا دوسرا تاثر وہ تھا جسے ابن اسحاق کے حوالے سے ابن ہشام نے سیرت میں، طبری نے تاریخ میں اور ابن اثیر نے اُسد الغابہ میں حضرت لیلیٰ بنت ابی حثمہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کی قریبی رشتہ دار تھیں اور اپنے شوہر حضرت عامر بن ربیعہ العنزی کے ساتھ حبش کی طرف ہجرت کر گئی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کے لیے اپنا سامان باندھ رہی تھی اور میرے شوہر عامرؓ بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمر آئے جبکہ وہ اپنے شرک پر قائم تھے اور ہم ان کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اٹھا چکے تھے۔ مگر اُس وقت وہ کھڑے ہو کر میری مشغولیت دیکھتے رہے۔ پھر کہنے لگے "عبداللہ کی ماں، کیا بس اب روانگی ہے؟" میں نے کہا "ہاں جب تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا اور ہم پر ظلم کیا، تو اب ہم خدا کی زمین میں کہیں نکل جائیں گے جہاں خدا ہمارے لیے اس مصیبت سے بچنے کی کوئی راہ نکال دے"۔ اس پر عمرؓ نے کہا "اللہ تمہارے ساتھ ہو"۔ اُس وقت میں نے اُن پر وہ رقّت دیکھی جو کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہمارے وطن چھوڑنے پر وہ غمگین ہو کر واپس چلے گئے اس کے بعد جب عامر ہمارا مطلوبہ سامان لے کر واپس آئے تو میں نے کہا "عبداللہ کے ابا، کاش تم اس وقت عمرؓ کو اور ہمارے حال پر اُن کی رقّت اور رنج کو دیکھتے۔ ابھی ابھی وہ یہاں سے ہو کر گئے ہیں"۔ عامر نے کہا کیا تمہیں اُس کے مسلمان ہونے کی امید ہو گئی ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا جس شخص کو تم نے ابھی دیکھا ہے وہ اُس وقت تک مسلمان نہ ہو گا جب تک خطاب کا گدھا مسلمان نہ ہو جائے۔

ان کے اسلام لانے کا قصّہ

اس ذہنی کشمکش نے آخر کار ایک روز انہیں اس بات پر آمادہ کر دیا کہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں تاکہ یہ قضیہ ہی ختم ہو جائے جس نے ان کو اُلجھن میں ڈال رکھا ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ وہ تلوار لے کر اسی غرض سے نکلے۔ مگر راستے میں ان کو حضرت نُعیم بن عبداللہ النحّام مل گئے جو خود حضرت عمرؓ ہی کے قبیلے کے اشراف میں سے تھے اور خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے پوچھا کدھر کا ارادہ ہے؟ کہنے لگے

ع۱ اس واقعہ کو ابن حنبل نے بھی اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

ع۲ اُسد الغابہ اور اصابہ میں ہے کہ یہ بات انہوں نے اشارۃً یا صراحۃً فرمائی تھی کہ جب انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو اُن کی قوم نے کہا تم ہمیں بے سہارا چھوڑ کر جا رہے ہو، بخدا قسم اب تمہیں کوئی تکلیف نہ دے سکے گا، ہم تمہاری حمایت میں اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے قبیلے (بنی عدی) کی بیواؤں اور یتیموں کی مدد اور غریبوں کے ساتھ نیکی کیا کرتے تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

"میں اس صابی کو قتل کر دینا چاہتا ہوں جس نے قریش میں تفرقہ ڈال دیا ہے، ہم سب کو احمق ٹھیرایا ہے، ہمارے دین میں عیب نکالا ہے، اور ہمارے معبودوں کی برائی کی ہے۔" نعیم نے کہا "واللہ، اے عمرؓ تمہارے نفس نے تمہیں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ محمدؐ کے قتل کے بعد بنی عبد مناف تمہیں زمین پر چلتے پھرتے کے لیے جیتا چھوڑ دیں گے؟ تم ذرا پہلے اپنے گھر والوں کی تو خبر لو۔" حضرت عمرؓ نے کہا "میرے کون سے گھر والے؟" نعیم نے کہا "تمہارے بہنوئی اور چچازاد بھائی سعید بن زیدؓ اور تمہاری بہن فاطمہؓ۔ وہ دونوں مسلمان ہو گئے ہیں اور انہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کر لی ہے۔" حضرت عمرؓ پلٹ کر سیدھے بہن کے ہاں پہنچے۔ وہاں حضرت خبابؓ بن الارتؓ موجود تھے اور ان کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی وہ حضرت فاطمہؓ کو اس کی تعلیم دے رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کی آہٹ جب محسوس ہوئی تو حضرت خبابؓ گھر کے ایک حصے میں چھپ گئے اور حضرت فاطمہؓ نے صحیفے کو ران کے نیچے دبا لیا۔ لیکن حضرت عمرؓ پہلے ہی دروازے میں سے حضرت خبابؓ کی قرأت سن چکے تھے۔ انہوں نے اندر پہنچ کر کہا "یہ کیسی گنگناہٹ تھی جو ابھی میں نے سنی ہے؟" حضرت فاطمہؓ اور حضرت سعیدؓ نے کہا کہ تم نے کچھ نہیں سنا۔ انہوں نے کہا "نہیں، میں نے سنا ہے۔ واللہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم دونوں محمدؐ کے دین کی پیروی اختیار کر چکے ہو۔" پھر انہوں نے اپنے بہنوئی سعیدؓ کو مارا۔ حضرت فاطمہؓ شوہر کو بچانے کے لیے اٹھیں تو انہوں نے ان کو بھی مارا جس سے ان کا سر پھٹ گیا۔ تب دونوں میاں بیوی نے کہا کہ "ہاں، ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں، اب تمہارا جو جی چاہے کر لو۔" حضرت عمرؓ نے جب بہن کا خون بہتے دیکھا تو اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے اور اپنی جہالت سے رجوع کیا اور بہن سے کہا "وہ صحیفہ مجھے دکھا دو جسے ابھی ابھی تم لوگ پڑھ رہے تھے۔ دیکھوں تو وہ چیز کیا ہے جو محمدؐ لائے ہیں۔" حضرت عمرؓ پڑھے لکھے آدمی تھے اس لیے اسے پڑھنا چاہتے تھے۔ ان کی بہن نے کہا "ہمیں اندیشہ ہے کہ تم اسے کہیں ضائع نہ کر دو۔" انہوں نے کہا "اس کا اندیشہ نہ کرو" اور اپنے معبودوں کی قسم کھائی کہ پڑھ کر اسے واپس کر دیں گے۔ تب ان کی بہن کو کچھ امید بندھی کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا "بھائی، تم اپنے شرک کی وجہ سے نجس ہو اور اس صحیفے کو صرف پاک آدمی ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں۔" اس پر حضرت عمرؓ نے اٹھ کر غسل کیا اور حضرت فاطمہؓ نے صحیفہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ جب انہوں نے سورۂ طٰہٰ کا ابتدائی حصہ پڑھا تو کہنے لگے "کیسا عمدہ اور کیسا بلند پایہ کلام ہے یہ۔" حضرت خبابؓ بن الارتؓ ان کی یہ بات سنتے ہی باہر نکل آئے اور کہا "اے عمرؓ، مجھے امید ہے کہ اللہ نے تم کو اپنے نبی کی دعا کا مصداق بننے کے لیے چن لیا ہے۔ میں نے کل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ خدایا ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطاب کے ذریعہ سے اسلام کی تائید فرما۔ پس اے عمر اللہ کی طرف آؤ، اللہ

کی طرف آؤ۔ حضرت عمرؓ نے کہا "مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس لے چلو تاکہ میں مسلمان ہو جاؤں" حضرت خبابؓ نے کہا وہ صفا کے قریب ایک مکان (دارِ ارقمؓ) میں اپنے چند اصحابؓ کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ تلوار کمر سے باندھے ہوئے حضورؐ اور آپؐ کے اصحاب کی قیام گاہ پر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضورؐ کے اصحاب میں سے ایک صاحب نے اُٹھ کر دروازے کی جھری سے باہر جھانکا تو دیکھا کہ عمرؓ تلوار باندھے کھڑے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہو کر پلٹے اور حضورؐ کو اس کی خبر دی۔ حضرت حمزہؓ بولے "اُسے آنے دو، اگر نیک ارادے سے آیا ہے تو ہم بھی نیک معاملہ کریں گے، ورنہ اسی کی تلوار سے اسے ختم کر دیں گے" حضورؐ نے فرمایا "اُسے آنے دو۔" حکم کے مطابق عمل کیا گیا اور حضرت عمرؓ کو اندر آنے کا اِذن دے دیا گیا۔ ان کے آتے ہی حضورؐ اُن کی طرف آگے بڑھے، ان کی چادر کو مٹھی میں دبا کر شدت سے کھینچا اور فرمایا "ابن خطاب، تمہیں کیا چیز یہاں لائی ہے؟ واللہ، میں سمجھتا ہوں کہ تم باز نہ آؤ گے جب تک اللہ تم پر کوئی سخت آفت نازل نہ کر دے۔" حضرت عمرؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ، میں اللہ اور اس کے رسول پر اور رسول کی لائی ہوئی تعلیم پر ایمان لانے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔" اس پر حضورؐ نے زور سے اللہ اکبر فرمایا جس سے مکان کے سب لوگ جان گئے کہ عمرؓ مسلمان ہو گئے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کی بڑی ہمت بندھی کہ حضرت حمزہؓ کے بعد حضرت عمرؓ بھی مسلمان ہو گئے اور اب یہ دونوں اہلِ اسلام کے لیے تقویت کے موجب بنیں گے۔ ابن اسحٰقؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کے متعلق یہ اہلِ مدینہ کے راویوں کا بیان ہے۔ حافظ ابو یعلیٰ نے اسے حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کیا ہے اور بزار نے خود حضرت عمرؓ سے۔

حضرت عمرؓ کا اپنا بیان

بزار، طبرانی، بیہقی، ابن عساکر، ابو نعیم اور دار قطنی وغیرہ نے حضرات ابن عباسؓ، انسؓ بن مالک اور اسلمؓ مولیٰ عمر وغیرہم سے خود حضرت عمرؓ کا اپنا بیان بھی اپنے اسلام قبول کرنے کے متعلق نقل کیا ہے جو تفصیلات میں تھوڑے تھوڑے اختلافات کے ساتھ ابن اسحاق کی مذکورۂ بالا روایت سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔ البتہ ابو نعیم اور ابن عساکر نے حضرت عمرؓ کے بیان کی جو روایت حضرت عبداللہؓ بن عباس سے نقل کی ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں خواہ جئیں یا مریں؟" آپؐ نے فرمایا "اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم لوگ حق پر ہو، خواہ جیو یا مرو۔" میں نے عرض کیا "پھر یا رسول اللہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر، تو ہم اپنا دین کیوں چھپائیں؟" حضورؐ نے فرمایا "اے عمرؓ، ہم قلیل التعداد ہیں اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہم کن حالات سے گزر رہے ہیں۔" میں نے عرض کیا "اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے، میں

کوئی ایسی مجلس نہ چھوڑوں گا جہاں میں پہلے کفر کے ساتھ بیٹھا تھا اور اب اسلام کے ساتھ نہ بیٹھوں۔" پھر ہم لوگ دو صفوں میں نکلے۔ ایک میں میں تھا اور دوسرے میں حمزہؓ۔ یہاں تک کہ ہم مسجد حرام میں داخل ہو گئے۔ قریش نے جب ہم کو دیکھا تو اُن کو اس قدر شدید دھچکا لگا کہ پہلے کبھی نہ لگا تھا۔ اس واقعہ کو ابن الجوزی، حاکم اور ابن سعد نے ذرا مختلف طریقے سے نقل کیا ہے۔ ابن ہشام نے حضرت عمرؓ کا یہ بیان بھی روایت کیا ہے کہ جس روز میں نے اسلام قبول کیا اسی رات مجھے خیال آیا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید ترین دشمن ہو اس کو مجھے اپنے اسلام کی اطلاع دینی چاہیے۔ چنانچہ میں سیدھا ابوجہل کے ہاں گیا اور اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ نکلا تو مجھے دیکھ کر کہا خوش آمدید، میرے بھانجے، کیسے آتے؟ میں نے کہا میں یہ خبر دینے آیا ہوں کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اُس نے کہا "بُرا ہو تیرا اور اُس چیز کا جسے تو لے کر آیا ہے" اور دروازہ بند کر لیا۔

ابن عمرؓ کی روایت

ابن اسحاق نے نافع کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت بیان کی ہے کہ اسلام لانے کے بعد حضرت عمرؓ نے پوچھا قریش میں کون آدمی سب سے زیادہ خبریں پھیلانے والا ہے؟ بتایا گیا کہ جمیل بن مَعْمَر بن حبیب الجُمَحی۔ حضرت عمرؓ اس کی تلاش میں نکلے اور میں بھی ان کے پیچھے چلا۔ اُس وقت میں اس عمر کا لڑکا تھا کہ جو کچھ دیکھتا اسے سمجھتا تھا۱۔ حضرت عمرؓ نے جا کر اس سے کہا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میں نے دینِ محمدؐ قبول کر لیا ہے۔ پھر بخدا کہ اُس نے پلٹ کر کوئی بات نہ کی اور اپنی چادر گھسیٹتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔ حضرت عمرؓ اس کے پیچھے چلے اور میں ان کے پیچھے جب وہ مسجد حرام کے دروازے پر پہنچا تو بلند آواز سے چلایا "قریش کے لوگو" سرداران قریش اس وقت کعبہ کے گرد اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ اس کی آواز سن کر سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس نے کہا "سنو، عمر دین سے پھر گیا" حضرت عمرؓ نے پیچھے سے پکار کر کہا "جھوٹ کہتا ہے، میں مسلمان ہوا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں" اس پر لوگ انہیں مارنے لگے اور وہ بھی لوگوں کو مارنے لگے یہاں تک کہ سورج سر پر آ گیا۔ حضرت عمرؓ تھک کے بیٹھ گئے۔ لوگ ان کے گرد کھڑے تھے اور حضرت عمرؓ کہہ رہے تھے کہ تمہارا جو جی چاہے کر لو۔ اتنے میں قریش کا ایک شیخ آگے بڑھا اور اُس نے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے کہا عمرؓ دین سے پھر گیا ہے۔ اس نے کہا "تو

---

۱ ابن سعد نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ میں اس وقت ۶ برس کا تھا۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ اس وقت ۵ برس کے تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

پھر کیا ہُوا؟ ایک آدمی نے اپنے لیے جو کچھ چاہا اختیار کر لیا۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ بنی عدی اس طرح اپنے آدمی کو تمہارے حوالے کر دیں گے؟ ہٹ جاؤ اس کے پاس سے۔" اس پر لوگ اس طرح ہٹ گئے جیسے کسی پر سے کپڑا کھینچ لیا جاتا ہے۔ میں نے بعد میں اپنے والد سے پوچھا وہ شخص کون تھا۔ انہوں نے فرمایا "بیٹے، وہ عاص بن وائل سہمی تھا" (یعنی عمرو بن العاص کا باپ) طبرانی اور بزار نے ابن عمرؓ کی اس روایت کو مختصراً نقل کیا ہے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ اپنے گھر میں خوف زدہ بیٹھے ہوئے تھے تو عاص بن وائل جو جاہلیت کے زمانہ میں ہمارا حلیف تھا، اُن کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کیوں اس طرح بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا تمہاری قوم مجھے قتل کرنا چاہتی ہے، کیونکہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اس نے کہا کوئی تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا جبکہ مجھ سے تمہیں امان مل چکی ہے۔ پھر عاص باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ وادی میں آدمیوں کا سیلاب اُمڈا ہُوا ہے۔ اُس نے پوچھا کیا چاہتے ہو؟ لوگوں نے کہا ہم ابن خطاب کی خبر لینا چاہتے ہیں جو دین سے پھر گیا ہے۔ اس نے کہا کہ عمرؓ پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اس پر سب واپس چلے گئے۔

اسلامِ عمرؓ کی تاریخ

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ ۶ بعد بعثت کا ہے جیسا کہ امام نووی نے تہذیب الاسماء و اللغات میں اور ملا علی قاری نے اربعین نووی کی شرح میں لکھا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ حضرت حمزہؓ کے تین دن بعد ایمان لائے اور بعض ۳ ماہ بعد کہتے ہیں۔ مگر ابو نعیم اصفہانی نے حضرت عبداللہؓ بن عباس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں نے خود حضرت عمرؓ سے اُن کے اسلام لانے کا واقعہ پُوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہونے کے تین دن بعد ایمان لایا تھا۔ ابن سعد نے ایسا اسلم مولیٰ عمرؓ کے حوالے سے ذی الحجہ ۶ بعد بعثت کا واقعہ لکھا ہے لیکن غالباً یہ اس سے اچھی خاصی مدت پہلے کا واقعہ ہے۔ سُہَیلی نے لکھا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۴۰ سے کچھ زیادہ آدمی تھے۔ واحدی نے اس پر دس عورتوں کا اضافہ کیا ہے لیکن حافظ ابن حجر نے مناقب عمرؓ میں ابن ابی خیثمہ کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۳۹ آدمی تھے اور میں نے شامل ہو کر ان کو ۴۰ کر دیا۔ ممکن ہے کہ اُس وقت حضرت عمرؓ کو اتنے ہی آدمیوں کا علم ہو، کیونکہ بہت سے مسلمان اپنا ایمان چھپائے ہوئے بھی تھے۔

شعبِ ابی طالب میں محصوری

اس زمانے میں قریش کا غصّہ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف روز بروز زیادہ بھڑکتا چلا

جا رہا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی ساری کوششوں کے باوجود مکّے میں بھی اسلام اندر ہی اندر پھیلتا جا رہا ہے اور بیرونی قبائل کے لوگ بھی پے در پے مسلمان ہو رہے ہیں۔ پھر یہ معاملہ صرف عرب تک ہی محدود نہیں رہ گیا ہے بلکہ حبش تک اس کی خبریں پھیل گئی ہیں، نجاشی کھلّم کھلّا مسلمانوں کا حامی بن گیا ہے، اور وہاں سے اسلام قبول کرنے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد آنے لگے ہیں۔ اس پر مزید اُن کی آتشِ غضب کو یہ چیز بھڑکا رہی تھی کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے بہادر اور با اثر سرداروں کی شمولیت سے اُن مسلمانوں کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں جو ہجرتِ حبشہ کے بعد مکّہ میں رہ گئے تھے۔ ابن ابی شَیبَہ اور طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "واللہ، ہم بیت اللہ کے گرد نماز نہ پڑھ سکتے تھے جب تک کہ عمرؓ اسلام نہ لے آئے۔" بخاری میں انہی حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول بھی منقول ہے کہ مازلنا اعزّۃ منذ اسلم عمر۔ "عمرؓ کے مسلمان ہونے کے بعد سے ہم برابر زور آور ہی رہے۔"

ان اسباب نے مل جُل کر آخر کار قریش کی جاہلیت کو اس قدر برافروختہ کر دیا کہ انہوں نے بالاتفاق ایک دستاویز لکھی جس میں اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد کیا گیا تھا کہ جب تک بنی ہاشم اور بنی المطّلب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُن کے حوالہ نہ کر دیں اُس وقت تک اُن سے میل جول، شادی بیاہ، لین دین اور خرید و فروخت کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے گا۔ قریش کے تمام خاندانوں کے سربراہوں نے اس دستاویز کی توثیق کی اور اسے خانۂ کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔ ابن سعد اور ابن عبد البرؒ کا بیان ہے کہ یہ محرم ۷ بعد بعثت کا واقعہ ہے۔

موسیٰ بن عُقبہ نے امام زُہری کے حوالہ سے اپنی مَغازی میں لکھا ہے[1] کہ ابو طالب کو جب معلوم ہوا کہ قریش کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہیں، تو انہوں نے بنی ہاشم اور بنی المطّلب کو بُلایا اور اُن سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساتھ لے کر سب کے سب شعبِ ابی طالب[2] میں جمع ہو جائیں اور آخر وقت تک آپ کی حفاظت کریں۔ اس تجویز کو دونوں خاندانوں نے قبول کیا اور اُن کے کافر و مسلمان سب شعبِ ابی طالب میں سمٹ آئے۔ اس کے بعد قریش کے باقی خاندانوں نے آپس میں وہ معاہدہ کیا جس کا ذکر اُوپر گزر چکا ہے[3]۔

---

[1] ابن عبد البرؒ نے سیرت میں اس روایت کو موسیٰ بن عقبہ کے علاوہ محمد بن عبدالرحمٰن ابو الاسود اور یعقوب بن حمید بن کاسب کے حوالہ سے بھی نقل کیا ہے (حاشیہ از مؤلف)

[2] شِعب کے معنی گھاٹی کے ہیں۔ شعبِ ابی طالب کوہِ ابوقُبَیس کی گھاٹیوں میں سے ایک تھی جس میں ابو طالب رہتے تھے۔ اب اس کا نام شعبِ علی ہے، اور اسے سُوق اللیل بھی کہا جاتا ہے (حاشیہ از مؤلف)

[3] ابن عبد البرؒ نے موسیٰ بن عقبہ کے حوالہ سے امام زُہری کی یہ عجیب روایت نقل کی ہے کہ شعبِ ابی طالب

اِس کے برعکس ابنِ سعد نے واقدی کا اور ابنِ سعد نے ابنِ اسحاق کا بیان نقل کیا ہے کہ پہلے قُریش کے لوگوں نے بنی ہاشم اور بنی المطّلب کے مقاطعہ کا عہد نامہ لکھا، اور اس کے بعد یہ دونوں خاندان ابوطالب کی ہدایت پر شعبِ ابی طالب میں محصُور ہو کر بیٹھ گئے۔ یہی بات ابن عبدالبرّ نے بھی سیرت میں لکھی ہے۔ ابولہب اس موقع پر اپنے خاندان سے الگ رہا اور اس نے مُقاطعہ کرنے والوں کا ساتھ دیا۔ بنی عبدِ مَناف کے باقی دو خاندان، بنی عبدِشمس اور بنی نَوفل بھی اپنے ہم جد رشتہ داروں کو چھوڑ کر مقاطعہ کرنے والے دشمنوں کے ساتھ رہے۔

ابن اسحٰق کے حوالے سے ابن ہشام نے محصُوری کا زمانہ دو یا تین سال لکھا ہے۔ مگر ابن سعد اور موسیٰ بن عُقبہ نے تعیّن کے ساتھ اس کی مدّت تین سال بیان کی ہے۔ اس پورے زمانے میں قُریش کا مُحاصَرہ بڑی سختی کے ساتھ جاری رہا۔ محصُورین کی ایسی ناکہ بندی کر دی گئی تھی کہ اُن کو کھانے پینے کی چیزیں پہنچنے کے تمام راستے بند ہو گئے۔ مُوسیٰ بن عُقبہ کا بیان ہے کہ باہر کے تاجر اگر مکّے آتے تو قُریش کے لوگ جلدی کر کے ان کا سب سامان خرید لیتے تاکہ محصورین ان سے کوئی چیز نہ خرید سکیں۔ ابولہب کے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ محصُورین کو کوئی چیز خریدتے دیکھتا تو پکار کر تاجر سے کہتا کہ ان سے اتنی زیادہ قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، پھر میں وہی چیز تم سے خرید لوں گا اور تمہارا نقصان نہ ہونے دُوں گا۔ ابن سعد اور بیہقی کی روایت ہے کہ محصُورین کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ اُن کے بھُوکے بچوں کے رونے بلکنے کی آوازیں شعبِ ابی طالب کے باہر سُنی جاتی تھیں۔ یہ لوگ صرف حج کے زمانے میں نکلتے تھے اور دوسرا حج آنے تک اپنے محلّے میں بند رہتے تھے۔

اِس زمانے میں صرف حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام، اور نَضلہ بن ہاشم بن عبدِ مَناف کے بھتیجے (یعنی اُس کے ماں جائے بھائی کے بیٹے) ہشام بن عَمرو العامری، چوری چھپے صلۂ رحمی کا حق ادا کرتے رہے۔ ابن اسحاق کے حوالے سے ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل نے حکیم بن حزام کو اپنی پھوپھی صاحبہ کے لیے غلّہ لے جاتے ہوئے پکڑ لیا اور کہا "تم بنی ہاشم کے لیے خوراک کا سامان لے جا رہے ہو؟ اچھا، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا جب تک مکّہ بھر میں تم کو رُسوا نہ کر دوں۔" اتنے میں ابوالبَختری بن ہشام، جو بنی اَسَد بن عبدالعُزّیٰ بن قُصَیّ میں سے تھا اور حضرت خدیجہؓ کا قریبی رشتہ دار ہوتا تھا، وہاں پہنچ گیا اور اس نے پوچھا

۲۔ کی محصوری کے بعد حضورؐ نے مکّہ کے مظلوم مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ یہ بات معلوم و معروف روایات کے خلاف ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کیا معاملہ ہے؟ ابوجہل نے کہا یہ بنی ہاشم کے لیے غلّہ لے جا رہا ہے۔ وہ بولا چھوڑ دے اس کو۔ یہ اس کی پھوپھی کا غلّہ ہے جو وہ ان کے پاس لے جا رہا ہے۔ کیا تو ان کی اپنی چیز ان کے پاس نہیں لے جانے دیگا؟ ابوجہل نے انکار کیا۔ اس پر دونوں میں لڑائی ہوگئی اور ابوالبختری نے اسے بُری طرح رگیدا حتیٰ کہ اُونٹ کے جبڑے کی ہڈی اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اس سارے معاملے کو حضرت حمزہؓ دیکھ رہے تھے، اس لیے دونوں کافروں نے ٹھہر کر اپنا جھگڑا ختم کر دیا تاکہ بنی ہاشم اس پر خوش نہ ہوں۔ ہشام بن عمرو العامری کے متعلق بھی ابن اسحاق کی روایت ابن ہشام نے نقل کی ہے کہ وہ بھی خفیہ طریقہ سے بنی ہاشم اور بنی المطّلب کے ساتھ صلۂ رحمی کرتا رہتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اونٹ پر غلّہ لاد کر رات کے وقت شعب ابی طالب کے سرے پر لاتا اور اس کو شعب کے اندر دھکیل دیتا جسے محصورین پکڑ لیتے اور غلّہ اُتار کر اُونٹ کو واپس چھوڑ دیتے۔ قریش والوں نے اس کو بھی دھمکیاں دیں، مگر ابُوسفیان نے کہا چھوڑو اس کو۔ ایک آدمی ہے جو رشتہ داروں سے صلۂ رحمی کر رہا ہے۔

شق القمر کا واقعہ

یہ مقاطعہ پوری شدّومد کے ساتھ جاری تھا، مگر جیسا کہ ہم دعوتِ عام کے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے باوجود علی الاعلان اسلام کی تبلیغ سے ایک دن بھی باز نہ رہے، اور کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ آپ کو اس سے روک دیتا۔ مقاطعے پر ابھی دو ہی برس گزرے تھے کہ شق القمر کا عظیم الشان واقعہ پیش آگیا، جسے کفارِ مکّہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ محدّثین اور مفسّرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ ہجرت سے قبل ہجرت (یعنی سنہ ۸ بعد بعثت) کا واقعہ ہے اور یہ منیٰ کے مقام پر پیش آیا تھا۔ خود قرآن مجید میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ (القمر۔ آیت ۱-۲)

"قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔ (مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ) یہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، مُنہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو چلتا ہُوا جادو ہے۔"

بعض عقلیت پرستوں نے چاند جیسے عظیم کرّے کے پھٹنے کو بعید از امکان سمجھ کر اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کا مطلب یہ لے لیا ہے کہ "چاند پھٹ جائے گا" حالانکہ اگر اس کا ترجمہ "پھٹ گیا" کے بجائے "پھٹ جائے گا" کیا جائے تو دونوں آیتوں کا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ پہلی آیت میں چاند کے پھٹنے کو قیامت کی گھڑی قریب آنے کی علامت بتایا گیا ہے۔ اگر اسے آئندہ ہونے والا واقعہ قرار دیا جائے

تو چاند کے پھٹنے کو قیامت کے قریب ہونے کی علامت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ معنی لینے کی صورت میں آگے کی آیت تو بالکل ہی بے معنی ہو جاتی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اس سے منہ موڑ جاتے ہیں اور اسے جادو کا کرشمہ قرار دے دیتے ہیں۔ یہ سیاق و سباق تو اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے یہ معنی قطعی طور پر متعین کر دیتا ہے کہ اس وقت چاند فی الواقع پھٹ گیا تھا۔ اسی معنی کی تصدیق حدیث کی معتبر روایات کرتی ہیں۔ (۵)

یہ روایات بخاری، مسلم، ترمذی، احمد، ابو عوانہ، ابو داؤد طیالسی، عبدالرزاق، ابن جریر، بیہقی، طبرانی، ابن مردویہ اور ابو نعیم اصفہانی نے بکثرت سندوں کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حذیفہؓ بن الیمان، حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت جبیرؓ بن مطعم سے نقل کی ہیں۔ ان میں سے تین بزرگ یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ اور حضرت جبیرؓ بن مطعم تصریح کرتے ہیں کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں اور دو بزرگ ایسے ہیں جو اس کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہ ان میں سے ایک (یعنی عبداللہ بن عباسؓ) کی پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے، اور دوسرے (یعنی انسؓ بن مالک) اس وقت بچے تھے، لیکن چونکہ یہ دونوں حضرات صحابی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ انہوں نے ایسے سن رسیدہ صحابیوں سے سن کر ہی اسے روایت کیا ہو گا جو اس واقعہ کا براہ راست علم رکھتے تھے۔

تمام روایات کو جمع کرنے سے اس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً ۵ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ پھٹا اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جڑ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا دیکھو اور گواہ رہو۔ کفار نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم پر جادو کر دیا تھا اس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکا کھایا۔ دوسرے لوگ بولے کہ محمد ہم پر جادو کر سکتے تھے، تمام لوگوں پر تو نہیں کر سکتے تھے۔ باہر کے لوگوں کو آنے دو۔ ان سے پوچھیں گے کہ یہ واقعہ انہوں نے بھی دیکھا ہے یا نہیں۔ باہر سے جب کچھ لوگ آئے تو انہوں نے شہادت دی کہ وہ بھی یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔

بعض روایات جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں ان کی بنا پر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شق القمر کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ پیش آیا تھا۔ لیکن اول تو صحابہ میں سے کسی اور نے یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ دوسرے خود حضرت انسؓ کی بھی بعض روایات میں مرتین (دو مرتبہ) کے الفاظ ہیں اور بعض میں فرقتین اور شقتین (دو ٹکڑے) کے الفاظ۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید صرف ایک انشقاق کا ذکر کرتا ہے۔ اس بنا پر صحیح بات یہی ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا تھا۔ رہے وہ قصے جو عوام میں مشہور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے انگلی سے چاند کی طرف اشارہ کیا اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا، اور یہ کہ چاند کا ایک ٹکڑا حضورؐ کے گریبان میں داخل ہو کر آپؐ کی کسی آستین سے نکل گیا، سب بالکل ہی بے اصل ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی حقیقی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا جو کفارِ مکہ کے مطالبے پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا؟ یا یہ ایک حادثہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس کی طرف توجہ صرف اس غرض کے لیے دلائی کہ یہ امکانِ قیامت اور قربِ قیامت کی ایک نشانی ہے؟ علماء کرام کا ایک بڑا گروہ اسے حضورؐ کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ کفار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا۔ لیکن اس رائے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ اُن کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ فتح الباری میں ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ "یہ قصہ جتنے طریقوں سے منقول ہوا ہے اُن میں سے کسی میں بھی حضرت انسؓ کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شق القمر کا واقعہ مشرکین کے مطالبہ پر ہوا تھا" (باب انشقاق القمر)۔ ایک روایت ابونعیم اصفہانی نے دلائل النبوۃ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اس مضمون کی نقل ہے، مگر اس کی سند ضعیف ہے، اور قوی سندوں سے جتنی روایات کتبِ حدیث میں ابن عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں ان میں سے کسی میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عباس، دونوں اس واقعہ کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بخلاف اس کے جو صحابہؓ اُس زمانے میں موجود تھے، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت حذیفہؓ، حضرت جُبیرؓ بن مُطعِم، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے حضورؐ کی صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا اور اس پر شق القمر کا یہ معجزہ ان کو دکھایا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن مجید خود بھی اس واقعہ کو رسالتِ محمدی کی نہیں بلکہ قربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ البتہ یہ اس لحاظ سے حضورؐ کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپؐ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں، یہ واقعہ ان کی تصدیق کر رہا تھا۔

معترضین اس پر دو طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اوّل تو ان کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کہ چاند جیسے عظیم کُرّے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں اور سینکڑوں میل کے فاصلے تک ایک دوسرے سے دُور جانے کے بعد پھر باہم جُڑ جائیں۔ دوسرے، وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہُوا ہوتا تو یہ واقعہ دنیا بھر میں مشہور ہو جاتا، تاریخوں میں اس کا ذکر آتا، اور علمِ نجوم کی کتابوں میں اسے

بیان کیا جاتا لیکن درحقیقت یہ دونوں اعتراضات بے وزن ہیں۔ جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے، قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی، لیکن موجودہ دور میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دُور تک چلے جائیں، اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ آملیں۔ رہا دوسرا اعتراض تو وہ اس لیے بے وزن ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لحظہ کے لیے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس خاص لمحے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ اُس سے کوئی دھماکا نہیں ہُوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اس کی نہ تھی کہ لوگ اس کے منتظر ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوتے۔ اور پوری رُوئے زمین پر اسے دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا، بلکہ صرف عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اُس وقت چاند نکلا ہُوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اُس وقت تک اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مشرقی ممالک میں جن لوگوں نے اسے دیکھا ہوتا وہ اسے ثبت کر لیتے اور کسی مؤرخ کے پاس یہ شہادتیں جمع ہوتیں اور وہ تاریخ کی کسی کتاب میں ان کو درج کر لیتا۔ تاہم مالا بار کی تاریخوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ اس رات وہاں کے ایک راجہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ رہیں علمِ نجوم کی کتابیں اور جنتریاں، تو ان میں اس کا ذکر آنا صرف اس حالت میں ضروری تھا جبکہ چاند کی رفتار، اور اس کی گردش کے راستے، اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اس سے کوئی فرق واقع ہُوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی اس لیے قدیم زمانے کے اہلِ تنجیم کی توجہ اس کی طرف منعطف نہیں ہُوئی۔ اس زمانے میں رصدگاہیں اس حد تک ترقی یافتہ نہ تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتیں اور اس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔ (٦)

مقاطعہ کا کس طرح خاتمہ ہُوا

کفّارِ مکّہ کے سرپھرے اور ضدّی سرداروں نے اگرچہ وقتی طور پر غصّہ میں آکر اپنے شہر کے دو بڑے خاندانوں کا مقاطعہ باقی سب خاندانوں سے کرا لیا تھا، مگر مکہ میں کوئی خاندان بھی ایسا نہ تھا جس کی رشتہ داریاں بنی ہاشم اور بنی المطّلب کے ساتھ نہ ہوں۔ اس لیے ابتدا ہی سے متعدد لوگوں کو اپنے بھائی بندوں کا یہ مقاطعہ ناگوار تھا، اور جُوں جُوں یہ طویل ہوتا گیا، اس کے خلاف جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا، کیونکہ بنی ہاشم اور بنی المطّلب پر فاقہ کشی کی نوبت آگئی تھی، ان کے بچوں کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آس پاس کے محلوں تک پہنچ رہی تھیں، اور دوسرے خاندانوں میں اُن کے رشتہ دار، جو پڑوس ہی میں رہتے تھے، ان آوازوں کو سُن سُن کر

بے تاب ہوتے جاتے تھے۔ موسیٰ بن عُقبہ کا بیان ہے کہ تیسرے سال کے اختتام پر بنی عبدِ مناف، بنی قُصَیّ اور دوسرے اُن لوگوں نے جن کے شادی بیاہ کے رشتے بنی ہاشم سے تھے، ایک دوسرے کو ملامت کی اور صاف صاف کہنا شروع کر دیا کہ یہ قطع رحمی ہے جو ہم نے کی ہے حرکت کر کے ہم نے خاندانی حقوق کا استخفاف کیا ہے۔

طبری اور ابنِ ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے اور بَلاذُری نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آخرکار ہِشام بن عَمرو العامری اس کام کا بیڑا اٹھانے کو اٹھا کہ وہ اِس مقاطعہ کا خاتمہ کرا کے چھوڑے گا۔ سب سے پہلے وہ بنی مخزوم کے رئیس، زُہَیر بن ابی اُمَیّہ سے ملا جو حضرت اُمّ سلمہؓ کا بھائی اور حضورؐ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبد المطلب کا بیٹا تھا۔ اُس نے کہا، اے زُہیر، کیا تم اس سے خوش ہو کہ اطمینان سے کھاؤ، پیو، شادیاں کرو اور تمہاری ننہیال کے لوگ بھوکے مریں، اُن سے لین دین کا مقاطعہ کیا جائے، اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے بھی توڑ لیے جائیں؟ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر معاملہ ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) کا ہوتا، اور تم نے اس کی ننہیال کے ساتھ وہ معاملہ کرنے کی دعوت دی ہوتی جو اس نے تمہاری ننہیال کے ساتھ کرنے کی دعوت دی ہے" تو وہ ہرگز نہ مانتا۔ زُہیر نے کہا، ہشام، میں اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہوں۔ اگر کوئی اور بھی ساتھ دینے والا ہوتا تو میں مقاطعہ کی دستاویز کو پھاڑ ڈالے بغیر نہ چھوڑتا۔ ہشام نے کہا ایک آدمی ساتھ دینے والا تو میں موجود ہوں۔ زُہیر نے کہا ایک اور آدمی تلاش کرو۔

پھر ہشام بنی نَوفَل بن عبد مناف کے سردار مُطعِم بن عَدی کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اے مُطعِم کیا تم راضی ہو کہ بنی عبد مناف کے دو خاندان سے ہلاک ہو جائیں اور تم تماشا دیکھتے رہو؟ اگر ان کے معاملہ میں تم نے قریش کا ساتھ دیا اور قریش کو اس طرح اُن کا خاتمہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا تو جلدی ہی ایک دن یہی کچھ تمہارے ساتھ ہو گا۔ اس نے کہا میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ کسی اور کو ساتھ ملاؤ۔ ہشام نے کہا، ایک میں ہوں اور دوسرا زُہیر بن ابی اُمیّہ۔ مُطعِم نے کہا ایک اور ساتھی ڈھونڈو۔

اس کے بعد ہشام بنی اسد بن عبد العزّیٰ کے سردار ابوالبَختَری عاص بن ہاشم سے ملا اور اس سے بھی وہی باتیں کہیں جو مُطعِم سے کہی تھیں۔ اس نے پوچھا کوئی اور بھی ساتھ دینے والا ہے؟ ہشام نے کہا میں ہوں، زُہیر بن ابی اُمیّہ ہے، اور مُطعِم بن عدی ہے۔ اس نے کہا بس ایک اور آدمی کو ساتھ ملا لو۔ چنانچہ ہشام نے زَمعہ بن الاَسوَد بن مُطّلِب سے بات کی جو بنی اسد بن عبد العزّیٰ ہی کے سرداروں میں سے ایک تھا، اور اسے بھی اس کام کے لیے ہموار کر لیا۔

پھر یہ پانچوں آدمی رات کے وقت مکّہ کے بالائی مقام حَجُون پر ملے اور آپس میں طے کیا کہ کس طرح

مقاطعہ کی دستاویز کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ زُہیر نے کہا کہ میں بات کی ابتدا کروں گا اور تم لوگ میرا ساتھ دینا۔ دوسرے روز صبح کو یہ لوگ قریش کی مجلسوں کی طرف گئے اور زُہیر نے کعبہ کے سات طواف کرنے کے بعد مکّہ کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "اے اہلِ مکّہ! کیا ہم کھائیں پئیں اور کپڑے پہنیں اس حال میں کہ بنی ہاشم ہلاک ہو رہے ہیں؟ نہ اُن سے کچھ خریدا جاتا ہے اور نہ اُن کے ہاتھ کچھ فروخت کیا جاتا ہے۔ خدا کی قسم میں ہرگز نہ بیٹھوں گا جب تک اس ظالمانہ مقاطعہ کی دستاویز پھاڑ نہ دی جائے گی۔" ابوجہل پکار کر کہا "تم نے جھوٹ کہا، وہ ہرگز پھاڑی نہ جائیگی۔" زمعہ بولا "واللہ تم سب سے بڑھ کر جھوٹے ہو، ہم اُس وقت بھی راضی نہ تھے جب یہ دستاویز لکھی گئی تھی۔" ابوالبختری نے تائید کی "زمعہ سچ کہتے ہیں، اُس دستاویز میں جو کچھ لکھا گیا ہے، ہم اس پر ہرگز راضی نہیں ہیں اور نہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔" مُطعم بن عدی نے کہا "تم دونوں سچے ہو اور جھوٹا ہے وہ جو اس کے سوا کچھ کہتا ہے۔ ہم اللہ کے سامنے اس دستاویز سے، اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اُس سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔" ہشام بن عمرو نے بھی اس کی تائید کی۔ اس پر ابوجہل نے کہا کہ "یہ ایک سازش ہے جو رات کو کسی اور جگہ بیٹھ کر تیار کی گئی ہے۔"

قدرتِ الٰہی کا ایک عجیب کرشمہ

ابن سعد اور ابنِ ہشام اور بلاذری نے لکھا ہے کہ اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے خبر دی گئی کہ مقاطعہ کی دستاویز میں جو ظلم اور قطع رحمی کا مضمون لکھا گیا تھا اُس سب کو دیمک چاٹ گئی ہے اور صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے (ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ اور عروہ کا بیان اس کے برعکس یہ ہے کہ اللہ کا نام جہاں تھا اس جگہ کو دیمک نے چاٹ لیا ہے اور صرف ظلم اور قطع رحمی کا مضمون باقی رہ گیا ہے لیکن یہ بات قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی اور صحیح بات وہی ہے جو ابن سعد، بلاذری اور ابنِ ہشام نے لکھی ہے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر اپنے چچا ابو طالب سے کیا۔ انہوں نے پوچھا "کیا تمہارے رب نے تمہیں اس کی خبر دی ہے؟" حضورؐ نے فرمایا "جی ہاں"۔ ابو طالب نے اس کا ذکر اپنے بھائیوں سے کیا۔ اُنہوں نے کہا آپ کا کیا خیال ہے؟ ابو طالب نے کہا واللہ محمدؐ نے کبھی مجھ سے کوئی بات جھوٹی نہیں کہی ہے۔ پھر ابو طالب نے پوچھا اب کیا کرنا چاہیے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری رائے یہ ہے کہ آپ لوگ اپنے بہترین کپڑے پہن کر قریش کی طرف نکلیں اور ان کو یہ بات بتائیں۔ چنانچہ سب نکلے اور حِجر میں گئے جہاں قریش کے بڑے اور دانا لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو آتے دیکھ کر سب حاضرین کی نگاہیں ان کی طرف اُٹھ گئیں اور وہ سوچنے لگے کہ آخر یہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

اگرچہ مؤرخین نے اس بات کی تصریح نہیں کی ہے، لیکن پچھلی روایت اور اس دوسری روایت کو

ملاکر دیکھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ابوطالب اور ان کے ساتھی عین اس وقت حرم میں پہنچے ہوں گے جب زہیر اور اس کے ساتھیوں کا ابوجہل سے جھگڑا ہو رہا تھا اور قریش کے سرداروں کا مجمع اس قضیے پر غور کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ابوطالب نے وہاں پہنچتے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "ہم ایک بات لیکر آئے ہیں، اس کا وہ جواب دو جو تمہارے نزدیک درست ہو۔" سرداران قریش نے کہا "خوش آمدید، اہلاً و سہلاً، ہمارے پاس وہ بات ہے جو آپ کو خوش کرنے والی ہو۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟" ابوطالب نے کہا "میرے بھتیجے نے مجھے یہ خبر دی ہے، اور خدا کی قسم وہ کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اب تم وہ صحیفہ منگوا کر دیکھو۔ اگر میرے بھتیجے کی بات سچی ہے تو ہمارے ساتھ اپنی قطع رحمی سے باز آجاؤ اور جو کچھ اس صحیفہ میں تم نے لکھا تھا اسے ختم کر دو۔ اور اگر وہ جھوٹا ہے تو میں اسے تمہارے حوالے کیے دیتا ہوں، پھر تمہیں اختیار ہے، چاہو قتل کر دو، چاہو زندہ رہنے دو۔" انہوں نے کہا آپ نے یہ انصاف کی بات کہی ہے۔ پھر وہ صحیفہ منگوایا گیا۔ کھول کر دیکھا تو بات وہی سچی نکلی جس کی خبر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اس پر کفارِ قریش کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور ان کے سر جھک گئے۔ ابوطالب نے کہا "اب تم پر واضح ہو گیا کہ ظلم اور قطع رحمی اور بدسلوکی کے مرتکب تم ہی ہوتے رہے۔ پھر ہم کس قصور میں محبوس رکھے جائیں؟" پھر ابوطالب اپنے ساتھیوں سمیت کعبہ کے پردوں کے پیچھے گئے اور بیت اللہ کی دیواروں سے لپٹ کر انہوں نے دعا مانگی کہ "خدایا ان لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما جنہوں نے ہم پر ظلم کیا، ہم سے قطع رحمی کی اور وہ کچھ اپنے لیے حلال کر لیا جو ہمارے معاملے میں ان پر حرام تھا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ہمراہیوں کو لیے ہوئے اپنی شعب کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے اٹھتے ہی قریش کے بہت سے لوگوں نے اس ظلم پر سخت ملامت کی جو بنی ہاشم پر کیا گیا تھا۔ ان میں مُطعِم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن اسود، ابوالبختری بن ہاشم اور زہیر بن ابی امیہ پیش پیش تھے۔ پھر یہ لوگ ہتھیار بند ہو کر شعب ابی طالب میں گئے اور بنی ہاشم اور بنی المطلب سے کہا کہ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا کر آباد ہوں۔

ابن سعد، بلاذری اور ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ مقاطعہ کا خاتمہ سنہ ۱۰ بعد بعثت میں ہوا۔

حضرت خدیجہؓ اور جناب ابوطالب کی وفات

مقاطعہ اور محصوری کے خاتمے سے حضورؐ کو جو اطمینان نصیب ہوا تھا وہ بہت جلدی پے درپے صدموں سے رنج و غم میں تبدیل ہو گیا۔ یہ صدمے حضورؐ کے زبردست حامی و مددگار چچا ابوطالب اور آپؐ کی انتہائی وفادار و غمگسار بیوی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے تھے۔ اور یہ دونوں صدمے آپ کو اسی سنہ بعد بعثت میں پیش آئے جس میں مقاطعہ کا خاتمہ ہوا تھا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات ابوطالب سے پہلے ہوئی (واقدی کی روایت ۳۵ دن پہلے کی ہے)، مگر مشہور اور معتبر بات یہی ہے کہ ابوطالب کا انتقال پہلے ہوا اور اس کے تھوڑی ہی مدت بعد حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی۔ بیہقی اور ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کا یہ مجمل بیان نقل کیا ہے کہ ان دونوں کی وفات ہجرت سے تین سال پہلے ایک ہی سال میں ہوئی۔ ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ ابوطالب کی وفات شعب سے نکلنے کے ۶ مہینے بعد ہوئی اور ان کے تین دن بعد حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ ۱۵ شوال سنہ ۱۰ بعد بعثت میں ابوطالب کی وفات ہوئی اور اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ اس کے ایک مہینہ پانچ دن بعد حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی، اور اس وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ ابن اثیر نے ابوطالب کی وفات کو شوال یا ذی القعدہ سنہ ۱۰ بعد بعثت کا واقعہ بیان کیا ہے، اور مختلف اقوال میں سے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ ان کی اور حضرت خدیجہؓ کی وفات میں ۳۵ دن کا فصل تھا۔ حافظ ابوالفرج ابن الجوزی دونوں کی وفات کے درمیان صرف ۵ دن کا اور ابن قتیبہ تین دن کا فصل بتاتے ہیں۔ مواہب اللدنیہ میں قسطلانی نے لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات رمضان سنہ ۱۰ بعد بعثت میں ہوئی۔ اور بلاذری نے حکیم بن حزام کے حوالہ سے تاریخ وفات ۱۰ رمضان سنہ ۱۰ بعد بعثت لکھی ہے۔

کفار کی اذیت رسانیاں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) فرمایا کرتے تھے۔ ان دونوں حادثوں کے بعد ایک طرف آنحضورؐ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، اور دوسری طرف یکایک قریش کے لوگ یہ دیکھ کر کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پشتیبان اب کوئی نہیں رہا ہے، آپ کے مقابلے میں بہت جری ہو گئے تھے۔ ابوطالب کی زندگی میں جو اذیتیں وہ آپ کو نہ پہنچا سکتے تھے، وہ اب انہوں نے پہنچانی شروع کر دیں۔ بیہقی نے عروہ بن زبیر کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قریش ابوطالب کی وفات تک بزدل بنے رہے"۔ حاکم نے عروہ بن زبیر کی یہی روایت انہی الفاظ میں حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔

ابن اسحاق نے قریش کی بڑھتی ہوئی جسارتوں کی ایک مثال عروہ بن زبیر کے حوالہ سے بیان کی ہے کہ ایک روز قریش کے ایک اوباش نے سر بازار حضورؐ کے سر مبارک پر مٹی ڈال دی۔ آپ اسی حال میں گھر تشریف لے گئے۔ صاحبزادیوں میں سے ایک آپ کا سر دھوتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں، اور حضورؐ انہیں تسلی دینے کے لیے یہ فرماتے جاتے تھے کہ "رو نہیں میری بچی، اللہ تیرے باپ کا حامی ہے"۔

امام بخاری نے کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجزیہ، کتاب الجہاد اور کتاب المغازی میں متعدد جگہ یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کی ہے کہ حضورؐ ایک روز کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور قریش کے لوگ اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے (مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ ابوجہل نے) کہا تم میں سے کون ہے جو جا کر فلاں شخص کے گھر سے ذبح کی ہوئی اونٹنی (مسلم کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جو ایک دن پہلے ذبح کی گئی تھی) کے پیٹ کی آلائش اور اس کا اوجھ اور خون سے لتھڑی ہوئی بچہ دانی اٹھا لائے اور اس شخص کی پیٹھ پر سجدے کی حالت میں رکھ دے؟ اس پر ان کا سب سے زیادہ شقی آدمی (عُقبہ بن ابی مُعَیط) اُٹھا اور یہ گندگی لاکر اس نے سجدے کی حالت میں حضورؐ کی پیٹھ پر یا دونوں کندھوں کے درمیان رکھ دی۔ اس کے بوجھ کی وجہ سے حضورؐ سجدے ہی میں پڑے رہے، سر نہ اٹھا سکے۔ قریش کے لوگ یہ منظر دیکھ دیکھ کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتے جا رہے تھے اور ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ اتنے میں کسی نے جا کر آپؐ کے گھر میں یہ خبر پہنچا دی۔ حضرت فاطمہؓ سن کر دوڑی ہوئی آئیں، اور انہوں نے یہ گندگی کا انبار آپؐ کے اوپر سے کھینچ کھینچ کر پھینکا، اور پھر قریش کے لوگوں کو مخاطب کر کے انہیں بہت بری طرح ڈانٹا اور ان لوگوں کو بددعائیں دیں جنہوں نے یہ حرکت کی تھی (حافظ بزار نے یہ اضافہ کیا ہے کہ کفار میں سے کسی نے حضرت فاطمہؓ کو کچھ نہ کہا)۔ نماز ختم کرنے کے بعد حضورؐ نے فرمایا، خدایا! قریش سے نمٹ لے۔ کسی روایت میں یہ ہے کہ حضورؐ نے یہ بات دو مرتبہ فرمائی اور کسی میں ہے کہ تین مرتبہ فرمائی۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضورؐ کی یہ بددعا قریش کو بہت شاق گزری، اور مسلم کی روایت ہے کہ حضورؐ کی آواز سن کر اُن لوگوں کی ساری ہنسی رخصت ہو گئی اور وہ آپ کی بددعا سے خوف زدہ ہو گئے۔ ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضورؐ نے نام لے لے کر ابوجہل، عُتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ بن ربیعہ، اُمیہ بن خَلَف، عُقبہ بن ابی مُعَیط، اور عُمارہ بن ولید کو بددعا دی۔ (اس حدیث کو بخاری و مسلم کے علاوہ امام احمد، نسائی، بزار، طبرانی اور ابو داؤد طیالسی وغیرہم نے بھی نقل کیا ہے۔ طیالسی کی روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول بھی منقول ہوا ہے کہ میں نے حضورؐ کو اُس دن کے سوا کبھی ان لوگوں کے حق میں بددعا کرتے نہیں سُنا)۔

اگرچہ اس حدیث کے روایت کرنے والے محدثین نے یہ نہیں بتایا ہے کہ یہ واقعہ کس زمانے میں پیش آیا تھا۔ لیکن ایک بات اس میں ایسی ہے جو اس کا زمانہ قریب قریب متعین کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ پر بحالت سجدہ اونٹنی کا اوجھ ڈالے جانے کی اطلاع جب حضورؐ کے گھر پہنچی تو حضرت فاطمہؓ دوڑی ہوئی آئیں اور انہوں نے اسے کھینچ کر حضورؐ کے شانوں پر سے اُتارا۔ حضرت فاطمہؓ کے متعلق ابن عبدالبر نے استیعاب میں

لکھا ہے کہ وہ اُس وقت پیدا ہُوئی تھیں جب حضورؐ کا سنِ شریف ۴۱ سال تھا۔ زرقانی نے شرحِ مواہب میں اسی کو صحیح کہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے وقت حضرت فاطمہؓ کی عمر کم از کم ۹ سال کی تو ہونی چاہیے تھی، کیونکہ اس سے کم عمر کی لڑکی کے لیے یہ مشکل تھا کہ آلائش سے بھرا ہُوا اونٹنی کا اوجھا اور بچہ دان کھینچ کر اُتار سکتی۔ اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ کفار نے یہ بیہودگی اُسی زمانے میں کی تھی جب حضرت خدیجہؓ اور جناب ابوطالب کا انتقال ہو چکا تھا۔

ابوطالب کی وصیتیں

علامہ قسطلانی نے مواہب اللدنیہ میں اور علامہ زرقانی نے اُس کی شرح میں ہشام بن محمد بن السائب کلبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ابوطالب کے آخری وقت میں قریش کے سردار اُن سے ملنے کے لیے آتے تو انھوں نے قریش کی خوبیاں اور ان کے فضائل بیان کرنے کے بعد اُن سے کہا کہ دیکھو، اس خانۂ کعبہ کی تعظیم ملحوظ رکھنا کہ اسی میں رب کی خوشنودی ہے۔ صلۂ رحمی کرنا۔ ایک دوسرے پر زیادتی اور حق ماری نہ کرنا۔ دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرنا۔ سائل کی حاجت روائی کرنا۔ صداقت اور امانت کے پابند رہنا۔ پھر اسی سلسلے میں انھوں نے کہا کہ "میں تمہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں وصیت کرتا ہُوں کہ اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا، کیونکہ وہ قریش میں امین اور تمام عرب میں صادق ترین آدمی ہے، اور وہ ان تمام خوبیوں کا جامع ہے جو میں نے تم سے بیان کی ہیں۔ وہ ایسی بات لایا ہے جسے دل مانتا ہے اور زبان لوگوں کی دشمنی کے خوف سے اس کا انکار کرتی ہے۔ مگر خدا کی قسم، میں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے کنگال اور اطراف و نواح کے لوگ اور کمزور لوگ آگے بڑھ کر اُس کی دعوت قبول کر لیں گے، اس کے کلمہ کی تصدیق کریں گے، اُس کے کام کو بڑھائیں گے، اور وہ انہیں لے کر خطرات کے میدان میں کود پڑے گا، اور قریش کے سردار اور اکابر دُم چھلے بن کر رہ جائیں گے۔"

ابن سعد نے لکھا ہے کہ مرتے وقت ابوطالب نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ "تم ہمیشہ بخیر رہو گے جب تک (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سُنتے رہو گے اور اُس کے حکم کی پیروی کرتے رہو گے۔ لہٰذا اُس کا اتباع کرو اور اس کی مدد کرو، راہِ راست پر رہو گے۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا "چچا جان، آپ ان لوگوں کو تو نصیحت کرتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو کیوں چھوڑے دے رہے ہیں۔" انھوں نے جواب دیا: "مگر میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں موت کے وقت گھبرا کر اکھڑ جانے والا قرار دیا جاؤں، اور قریش یہ رائے قائم کریں کہ میں نے صحت کی حالت میں تو اس چیز کو رد کیا اور اب گھبراہٹ میں اسے اختیار کر لیا۔"

ابن سعد نے امام محمد بن سیرین کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ابوطالب کا انتقال ہونے لگا تو انھوں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر کہا "بھتیجے، جب میں مر جاؤں تو تم اپنے اخوال (یعنی اپنے دادا کی ننھیال) بنی نجار کے پاس مدینے چلے جانا، کیونکہ وہ اپنے گھر والوں کی حفاظت میں سب لوگوں سے بڑھ کر مضبوط ہیں۔"

ان وصیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالب کیسے دانا اور صاحبِ بصیرت آدمی تھے اور ان کی نگاہ کتنی دُور رس تھی۔ خصوصاً مدینہ کے معاملے میں انہوں نے ہجرت سے تین سال پہلے جو رائے دی تھی وہ بالآخر نہایت صحیح ثابت ہوئی، حالانکہ اُس وقت کسی کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ مدینہ ہی اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاں نثار بستی بنے گا اور وہیں سے حضورؐ کو وہ طاقت فراہم ہوگی جو تمام عرب کو مسخر کرے گی۔ اسی طرح قریش کے سرداروں سے جو کچھ انہوں نے اُس وقت کہا تھا وہ بھی چند ہی سال بعد حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ دوسرے لوگ حضورؐ کا ساتھ دے کر بازی لے گئے، بالآخر سردارانِ قریش پیچھے کی صفوں میں پھینک دیے گئے۔ ابن عبدالبرؒ نے استیعاب میں حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز قریش کے شیوخ، جن میں سُہیل بن عمروؓ اور ابوسفیانؓ جیسے لوگ شامل تھے امیر المؤمنین سے ملنے کے لیے آئے اور وہ اجازت کے انتظار میں باہر بیٹھے رہے۔ اس دوران میں بلالؓ اور صہیبؓ اور بعض دوسرے اہلِ بدر کو اندر بلایا جاتا رہا۔ ابوسفیان نے شکایۃً اپنے ساتھیوں سے کہا کیا وقت آیا ہے کہ ہم جیسے لوگ باہر بیٹھے ہیں اور ان غلاموں کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ اس پر سُہیلؓ بن عمرو نے کہا کہ آپ حضرات اس کا شکوہ تو اپنے آپ سے کریں۔ جب اسلام کی دعوت دی گئی تھی تو ان لوگوں نے سبقت کی اور آپ لوگ پیچھے بیٹھے رہ گئے۔

ابولہب حضورؐ کی حمایت کے لیے اُٹھتا ہے اور پھر پلٹ جاتا ہے

ابن سعد نے لکھا ہے کہ مکے میں جب حضورؐ کے ساتھ لوگوں کی بدسلوکیاں حد سے بڑھ گئیں تو ایک روز ابولہب آپؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا "اے محمدؐ، جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو کرتے رہو۔ ابوطالب کی زندگی میں جو کام تم کرتے تھے اسے جاری رکھو۔ لات اور عُزّیٰ کی قسم، میرے جیتے جی کوئی تم پر ہاتھ نہ ڈال سکے گا۔" اس کے بعد جب حضورؐ گھر سے باہر نکلے اور ابن الغَیطَلَہ[1] نے سرِ بازار آپؐ کے اوپر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی تو ابولہب اپنے گھر سے نکل آیا اور اس نے ابن الغیطلہ کی بُری طرح خبر لی۔ اس پر وہ شور مچاتا ہوا بھاگا اور بولا "اے قریش کے لوگو، سنو، ابوعُتبہ بھی دینِ آبائی سے پھر گیا۔" یہ ہنگامہ سُن کر لوگ ابولہب کے پاس آئے

---

[1] اس شخص کا اصل نام حارث بن قیس بن عدیؓ السہمی تھا۔ قیس بن عدی کی بیوی بنی مُرّہ کی ایک کاہنہ غیطلہ نامی تھی۔ اس کی ساری اولاد اسی عورت کی نسبت سے غیاطلہ کہلاتی تھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

اور ماجرا پوچھا۔ اُس نے کہا، مَیں نے عبدالمطلب کا دین نہیں چھوڑا ہے۔ مگر مَیں اب اپنے بھتیجے کی حمایت کروں گا کیونکہ اس کا کوئی سرپرست باقی نہیں رہا ہے۔ قریش کے سرداروں نے کہا " یہ تو تم نے بہت اچھا کیا کہ صلۂ رحمی کا حق ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئے " اس کے بعد کچھ روز تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بیچ میں رہے اور ابولہب کا لحاظ کر کے لوگوں نے آپ کو ستانا چھوڑ دیا۔ آخر کار ایک دن ابوجہل اور عُقبہ بن ابی مُعیط باہم صلاح مشورہ کر کے ابولہب کے پاس آئے اور اس سے کہا " ذرا اپنے بھتیجے سے یہ تو پوچھو کہ اُس کا دادا اور تمہارا باپ عبدالمطلب کہاں جائے گا؟ ابولہب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا۔ آپؐ نے جواب دیا " جہاں اُن کی قوم جائے گی وہیں وہ بھی جائیں گے " ابولہب نے اپنے دوستوں کو حضورؐ کا یہ جواب سُنا دیا۔ انہوں نے کہا " ابھی کچھ سمجھے بھی؟ اِس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا باپ جہنم میں جائے گا " ابولہب نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا " اے محمدؐ، کیا عبدالمطلب جہنم میں جائیں گے؟" آپؐ نے فرمایا " ہاں، اور جو شخص بھی اُس دین پر مرے جس پر عبدالمطلب مرے ہیں وہ جہنم میں جائے گا " یہ سُنتے ہی ابولہب بھنّا گیا اور تڑخ کر بولا " خدا کی قسم، مَیں ہمیشہ تیرا دشمن رہوں گا۔ تو سمجھتا ہے کہ عبدالمطلب جہنمی ہیں" اِس طرح چند روز کے لیے جو دشمن خدا حق کا حامی بنا تھا وہ اپنی اصلیت کی طرف پلٹ گیا۔

حضرت سَودہؓ سے نکاح

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ گھر میں صرف دو کم سن صاحبزادیاں، حضرت اُمِّ کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ رہ گئی تھیں جن کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ آپؐ اُس خطرناک زمانے میں فرائض رسالت ادا کرنے کے لیے باہر تشریف لے جاتے تو یہ صاحبزادیاں گھر میں بے سہارا رہ جاتیں۔ اس لیے آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے چند روز بعد حضرت سَودہ بنت زَمعہ سے، جو ایک سن رسیدہ خاتون تھیں اور بچیوں کی دیکھ بھال کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتی تھیں نکاح کر لیا۔[1] یہ خاتون بنی عامر بن لُوَیّ میں سے تھیں اور ان کے سابق شوہر سکران بن عَمرو ان کے ابن عم اور سُہَیل بن عَمرو کے بھائی تھے۔ دونوں میاں بیوی قدیم الاسلام تھے اور حَبشہ کی دوسری ہجرت میں شریک ہو چکے تھے۔ موسیٰ بن عُقبہ اور ابو مَعشر کا قول ہے کہ حضرت سکران کا انتقال حبشہ ہی میں ہو گیا تھا۔ مگر محمد بن اسحاق اور واقدی

---

[1] ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ نکاح رمضان سنہ ۱۰ بعد بعثت میں حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ اور قسطلانی نے مواہب اللدنیہ میں کہا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات رمضان میں ہوئی اور حضرت سَودہؓ سے نکاح شوال میں ہوا۔ (حاشیہ از مؤلف)

کہتے ہیں کہ وہ حبش سے مکہ واپس آگئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا[1]۔ ابن سعد نے واقدی سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ مذکور ہے کہ حضورؐ نے جب ان کو نکاح کا پیغام بھیجا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے معاملہ میں آپ کو ہر فیصلے کا اختیار ہے۔ آپؐ نے کہلا بھیجا کہ کسی کو اپنی طرف سے مقرر کر دو کہ وہ میرے ساتھ تمہارا نکاح کر دے۔ انہوں نے حضرت حاطبؓ بن عَمرو بن عبد شمس کو، جو سُہَیل بن عَمرو کے بھائی اور قدیم الاسلام تھے، اس غرض کے لیے مقرر کر دیا اور انہوں نے حضورؐ سے ان کا نکاح کر دیا۔

اکثر و معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد پہلی خاتون یہی تھیں جو حضورؐ کی زوجیت میں داخل ہوئیں اور ان کا نکاح حضرت عائشہؓ سے پہلے ہوا۔ ابن عبدالبر نے قَتادہ اور ابو عُبَید اور امام زُہری کے حوالہ سے یہی بات لکھی ہے۔ ابن سعد نے بھی اسی کی تصریح کی ہے اور ابن اسحاق نے حضرت علی بن حسینؓ (امام زین العابدین) کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ پہلی عورت جن سے حضرت خدیجہؓ بنت خُوَیلد[3] کے بعد حضورؐ نے نکاح کیا وہ سَودہ بنتِ زَمعہ[2] تھیں۔

حضرت عائشہؓ سے نکاح

لیکن امام احمد، طَبَرانی، ابن جریر طَبَری اور بیہقی نے ایک مفصل روایت اس سے بالکل مختلف نقل کی ہے۔ اس میں یہ ذکر ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت عثمانؓ بن مظعون کی بیوی خَولہؓ بنت حکیم السُّلَمِیّہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ شادی کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا کس سے کروں؟ انہوں نے کہا آپ کنواری چاہیں تو وہ بھی موجود ہے، بیوہ چاہیں تو وہ بھی حاضر ہے۔ حضورؐ نے پوچھا کنواری کون؟ انہوں نے کہا تمام خلق میں جو شخص آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہے اس کی بیٹی یعنی عائشہؓ بنت ابی بکرؓ۔ پھر آپؐ نے پوچھا اور بیوہ کون؟ انہوں نے عرض کیا سودہؓ بنتِ زَمعہؓ جو آپ پر ایمان لائیں اور جنہوں نے آپؐ کی پیروی کی۔ آپؐ نے فرمایا دونوں جگہ جا کر بات کرو۔

پہلے تو وہ حضرت ابو بکرؓ کے ہاں گئیں اور ان کی اہلیہ اُمّ رُومانؓ سے کہا کیسی خیر و برکت سے اللہ نے

---

[1] طَبَری اور ابن اثیر نے اپنی تاریخوں میں لکھا ہے کہ یہ مکہ سے پھر حبش واپس چلے گئے اور عیسائی ہو کر مرے لیکن بلاذری نے ابن اسحاق اور واقدی کے قول کی توثیق کی ہے، اور خود ابن اثیر نے اپنی کتاب اُسد الغابہ میں تصریح کی ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت تک مسلمان تھے۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں ان کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] یہ نام زَمعہ بھی لکھا جاتا ہے اور زَمَعہ بھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

[3] ابن ہشام اور بعض دوسرے مؤرخین نے ان کا نام خُوَیلد لکھا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

تمہیں نواز دیا ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا؟ حضرت خولہؓ نے کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہؓ کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے۔ اُم رُومان نے کہا ابوبکرؓ کو آ جانے دو۔ وہ تشریف لائے تو اُم رُومان نے ان سے کہا اللہ نے کیسی خیر و برکت سے آپ کو نواز دیا ہے۔ انہوں نے پُوچھا وہ کیا؟ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پاس عائشہؓ کے لیے پیغام بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا کیا وہ اُن کے لیے جائز ہے؟ وہ تو اُن کی بھتیجی ہے۔ خولہؓ حضورؐ کے پاس گئیں اور یہ بات آپؐ سے عرض کی۔ آپؐ نے فرمایا اُن سے کہو تم میرے دینی بھائی ہو۔ تمہاری بیٹی میرے لیے جائز ہے۔ خولہ نے یہی جواب حضرت ابوبکرؓ کو پہنچا دیا۔ انہوں نے کہا ذرا انتظار کرو۔ یہ کہہ کر حضرت ابوبکرؓ چلے گئے۔ اُم رُومان نے خولہ سے کہا مُطعِم بن عدی نے اپنے بیٹے کے لیے عائشہؓ کو مانگا تھا۔ اور خدا کی قسم ابوبکرؓ نے کبھی کسی سے وعدہ کر کے اس کے خلاف نہیں کیا۔ اُدھر حضرت ابوبکرؓ مُطعِم کے پاس گئے۔ اُس کے پاس اس کی بیوی، جو اُس لڑکے کی ماں تھی جس کے لیے مُطعِم نے پیغام دیا تھا، بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بولی اَے ابوبکرؓ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر ہم اپنے لڑکے کا بیاہ تمہارے ہاں کر دیں تو تم ہمارے لڑکے کو بھی دین سے پھیر دو گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مُطعِم سے پُوچھا "جو کچھ یہ کہہ رہی ہے یہی تمہارا قول بھی ہے؟" اُس نے کہا وہ یہی کہتی ہے۔ یہ جواب سُن کر حضرت ابوبکرؓ اس کے ہاں سے نکل آئے اور اللہ نے اُس مخمصے سے ان کو نکال دیا جس میں وہ مُطعِم سے وعدہ کر کے پھنس گئے تھے۔ پھر انہوں نے خولہ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے ہاں بلا لاؤ۔ وہ حضورؐ کو بلا لائیں اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کا نکاح آپؐ سے کر دیا۔ اس وقت وہ ۶ برس کی تھیں۔

اس کے بعد خولہ وہاں سے نکل کر حضرت سَودہؓ بنتِ زَمعہ کے ہاں گئیں اور کہا کیسی خیر و برکت ہے جس سے اللہ نے تم کو نواز دیا ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا؟ خولہؓ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا پیغام دے کر مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا میرے باپ سے اس کا ذکر کرو۔ وہ بہت بوڑھا آدمی تھا۔ خولہ اس کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقے پر اسے سلام کر کے پہلے اپنا تعارف کرایا، اور پھر کہا مجھے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سَودہ کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے۔ اس نے کہا جوڑ تو بہت اچھا ہے، مگر تمہاری سہیلی کیا کہتی ہے؟ خولہ نے کہا وہ بھی اس رشتے کو پسند کرتی ہیں۔ اُس نے حضرت سَودہؓ کو بلا کر ان کی مرضی پوچھی، اور جب انہوں نے رضامندی کا اظہار کیا تو اس نے حضورؐ کو اپنے ہاں بُلا کر آپؐ سے اُن کا نکاح کر دیا۔ بعد میں حضرت سَودہ کا بھائی عَبد بن زَمعہ حج کر کے آیا تو یہ سُن کر کہ اس کی بہن کی شادی حضورؐ سے ہو گئی ہے، اس نے اپنے سر پر خاک ڈالنی شروع کر دی۔ پھر جب یہ صاحب خود مسلمان ہو گئے تو کہتے تھے کہ میں اُس وقت کیسا بیوقوف تھا کہ اپنی بہن سے حضورؐ کے نکاح پر میں نے

اپنے سر پر خاک ڈالی۔

حضرت عائشہؓ کے نکاح کی تاریخ

اس روایت سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح حضرت سودہؓ سے پہلے ہوا تھا، بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے سنہ ۱۰ بعد بعثت کے ماہ شوال میں جب حضورؐ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا نکاح ہوا اُس وقت وہ ۶ برس کی تھیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت عائشہؓ شوال سنہ ۱۰ بعد بعثت میں ۶ سال کی تھیں، تو ہجرت کے وقت ان کی عمر ۹ سال ہونی چاہیے، اور معتبر روایات کی رُو سے جب شوال سنہ ۱ ہجری میں ان کی رخصتی ہوئی تو وہ گیارہ سال کی ہونی چاہییں، حالانکہ تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا نکاح ۶ سال کی عمر میں ہوا اور رخصتی ۹ سال کی عمر میں ہوئی۔ اس سوال کا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہجرت کے سات مہینے بعد ہوئی، اور حافظ ابن حجرؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ لیکن امام نوویؒ نے تہذیب الاسماء واللغات میں اور حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں اور علامہ قسطلانیؒ نے مواہب اللدنیہ میں قطعیت کے ساتھ کہا ہے کہ رخصتی سنہ ۲ھ میں ہوئی تھی۔ حافظ بدر الدین عینیؒ نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوۂ بدر سے واپس تشریف لانے کے بعد شوال سنہ ۲ھ میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہوئی۔ امام نوویؒ اور علامہ عینیؒ، دونوں نے اس قول کو واہی قرار دیا ہے کہ یہ رخصتی ہجرت کے سات مہینے بعد ہوئی۔ اس کے بعد لازماً دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رخصتی سنہ ۲ھ میں ہوئی تو پھر نکاح کی تاریخ کونسی تھی جو حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح ۶ سال اور بوقت زفاف ۹ سال سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس کا جواب ہم کو بخاری کی اُس حدیث سے ملتا ہے جو انہوں نے عُروہ بن زُبیرؒ کے حوالے سے نقل کی ہے۔ اس میں حضرت عُروہؒ[1] کہتے ہیں کہ ہجرت سے تین سال پہلے حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوئی، دو سال یا اس کے قریب توقف کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا جبکہ وہ ۶ سال کی تھیں، پھر ۹ سال کی عمر میں ان کی رخصتی ہوئی۔ اس سے جو حساب بالکل صحیح بیٹھتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح چھ سال کی عمر میں ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے ہوا اور زفاف سنہ ۲ ہجری میں ہوا۔ حضرت عروہؒ کی یہ روایت اگرچہ مُرسل ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ عُروہ چونکہ اس طرح کی روایات حضرت عائشہؓ سے سن کر ہی بیان کرتے تھے۔

---

[1] واضح رہے کہ حضرت عُروہ بن زُبیرؓ حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے، اس لیے اپنی خالہ صاحبہ کے متعلق جو باتیں وہ بیان کرتے تھے وہ ان سے سن کر ہی بیان کرتے تھے، خواہ روایت میں ان کا حوالہ انہوں نے دیا ہو یا نہ دیا ہو (حاشیہ از مؤلف)

کرتے ہیں، اس لیے اسے منفصل کے حکم میں سمجھنا چاہیے۔

نکاحِ عائشہؓ پر اعتراضات

چونکہ یہاں حضرت عائشہؓ کے نکاح کا ذکر آ گیا ہے اس لیے آگے پڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی جگہ اُن اعتراضات کا جواب بھی لے دیا جائے جو حضورؐ کے اِس نکاح پر کیے جاتے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ۵۰-۵۵ سال کی عمر میں ۹ سال کی ایک لڑکی سے شادی کرنا، اور ۶۳ سال کی عمر میں اسے بیوہ چھوڑ جانا، جبکہ قرآن کی رُو سے اُس کا نکاحِ ثانی بھی کسی شخص سے نہ ہو سکتا ہو، کیا یہ (معاذ اللہ) ظلم نہیں ہے؟ اور کیا اتنے سن رسیدہ آدمی کے لیے اتنی کم سن لڑکی کا نکاح (معاذ اللہ) نفس پرستی کی تعریف میں نہیں آتا؟ اور کیا ۹ سال کی عمر ایسی ہوتی ہے کہ اس میں کسی لڑکی پر ازدواجی زندگی کا بار ڈال دیا جائے؟

دراصل اس قسم کے اعتراضات صرف اُس صورت میں پیدا ہوتے ہیں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہؓ کے نکاح کو ایک عام مرد اور ایک عام لڑکی کا نکاح سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ حضورؐ اللہ کے رسول تھے جن کے سپرد انسانی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا اور معاشرے کو اس انقلاب کے لیے تیار کرنا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ ایک غیر معمولی قسم کی لڑکی تھیں جنہیں اپنی عظیم ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر اس انقلابی معاشرے کی تعمیر میں حضورؐ کے ساتھ مل کر اتنا بڑا کام کرنا تھا جتنا دوسری تمام ازواجِ مطہراتؓ سمیت اُس وقت کی کسی عورت نے نہیں کیا، بلکہ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے کسی رہنما کی بیوی بھی اپنے شوہر کے کام کی تکمیل میں ایسی زبردست مددگار نہیں بنی جیسی حضرت عائشہؓ حضورؐ کی مددگار ثابت ہوئیں۔ اُن کے بچپن میں اُن کی اِن صلاحیتوں کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ تھا۔ اسی بنا پر اپنے رسول کی بیوی کی حیثیت کے لیے اُن کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا۔ بخاری، باب تزویج عائشہؓ میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ مجھے خواب میں تم کو دو دفعہ دکھایا گیا اور کہا گیا کہ یہ آپ کی بیوی ہے۔ ترمذی، ابواب المناقب میں ہے کہ جبریلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت عائشہؓ کی تصویر سبز ریشم میں لائے اور آپؐ سے کہا کہ یہ دنیا اور آخرت میں آپ کی بیوی ہیں۔ پس یہ انتخاب حضورؐ کا اپنا نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا تھا، اور اللہ ہی کو یہ معلوم تھا کہ ۹ سال کی اس کم سن لڑکی کو اُس کے رسولِ پاک کے فیضِ تعلیم و تربیت سے سیراب ہو کر اسلامی معاشرے کی تعمیر میں کس قدر عظیم خدمت انجام دینی ہے۔

جو لوگ اس معاملہ میں حضورؐ پر نفس پرستی کا الزام لگاتے ہیں وہ خود اپنے ضمیر سے پوچھ کر بتائیں، کیا ایسا شخص نفس پرست ہو سکتا ہے جو پچیس سال کی عمر سے پچاس سال کی عمر تک صرف ایک ایسی بیوی پر قانع رہے جو عمر میں اُس سے ۱۵ برس بڑی ہو؟ جو پہلی بیوی کی وفات کے بعد ایک سن رسیدہ

بیوہ سے نکاح کرے اور چار پانچ برس تک صرف اسی پر قناعت کیے رہے؟ جو اگر نفس پرستی کی خاطر شادیاں کرنے والا ہوتا تو معاشرے میں اسے اتنی زبردست محبوبیت حاصل تھی کہ وہ جتنی اور جیسی خوبصورت باکرہ لڑکیوں سے بیاہ کرنا چاہتا ان کے والدین اسے اپنے لیے فخر و عزت سمجھ کر اس کے حضور پیش کرنے کے لیے تیار ہو جاتے؟ جو اس کے باوجود صرف ایک باکرہ لڑکی کے سوا بعد میں جتنی شادیاں بھی کرے بیوہ یا شوہر دیدہ (ثیبہ) عورتوں ہی سے کرے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس نوعیت کے اعتراضات کرنے والے اپنے ذہن میں ازدواجی زندگی کا صرف شہوانی تعیش ہی سمجھتے ہیں۔ ان کے پست ذہن اتنی بلندی تک جا ہی نہیں سکتے کہ اس عظیم انسان کے مقاصد ازدواج کو سمجھ سکیں جو ایک اعلیٰ و ارفع کام کی مصلحتیں مدِنظر رکھ کر کچھ خواتین کو اپنی شریکِ زندگی اور شریکِ کار بناتے۔

رہا ظلم کا الزام، تو اس معاملہ میں بھی معترضین بس یہ ایک سادہ سی صورت واقعہ پیش نظر رکھتے ہیں کہ ایک سن رسیدہ آدمی نے ۹ سال کی لڑکی سے شادی کر کے ۱۸ سال کی عمر میں اسے بیوہ چھوڑ دیا، جبکہ اس کے لیے نکاح ثانی کا بھی کوئی امکان نہ تھا اور اسے ساری جوانی بیوگی کے عالم ہی میں گزارنی تھی۔ اس عام سطح سے بلند تر ہو کر یہ لوگ کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اور نہیں کرنا چاہتے کہ جس کارِ عظیم کا فائدہ خلقِ خدا کو کسی محدود زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، اور کسی محدود علاقے میں بھی نہیں بلکہ دنیا بھر میں پہنچنے والا ہو، اس کام میں ہزارہا بلکہ لاکھوں انسانوں کی جانیں اور ان کے مال کھپ جانا بھی کوئی مہنگا سودا نہیں ہے کجا کہ صرف ایک خاتون کی جوانی اس میں کھپ جانے کو قربانی کے بجائے ظلم سے تعبیر کیا جائے۔ اور وہ جوانی بھی اگر قربان ہوئی تو صرف اس معنی میں کہ اس کو ازدواجی زندگی کے لطف سے محروم ہونا پڑا۔ اس کے ماسوا کسی اور نقصان کی وہ لوگ نشان دہی نہیں کر سکتے جو اس بلند پایہ خاتون کی ذات کو پہنچا ہو لیکن دوسری طرف دیکھیے کہ گھریلو زندگی کے تمام خرخشوں اور مشغولیتوں سے فارغ ہو کر اپنی پوری بقیہ زندگی کو عورتوں اور مردوں میں اسلام اور اس کے احکام و قوانین اور اس کے اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں صرف کر کے اس عظیم ہستی نے کتنی بے بہا خدمات انجام دیں۔ علم حدیث کا جس شخص نے بھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے ذریعہ سے جتنا علمِ دین مسلمانوں کو پہنچا اور فقہِ اسلامی کی معلومات حاصل ہوئیں، اس کے مقابلہ میں عہدِ نبوت کی عورتیں تو درکنار، مرد بھی کم ہی ایسے ہیں جن کی علمی خدمات کو پیش کیا جا سکے۔ اگر حضرت عائشہؓ حضورؐ کے نکاح میں نہ آتیں اور آپؐ سے تعلیم و تربیت پانے کا ان کو موقع نہ ملتا، تو اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کے علم کا کتنا بڑا حصہ امت تک پہنچنے سے رہ جاتا۔ ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں۔ اور وہ صرف احادیث روایت کرنے والی ہی نہ تھیں بلکہ فقیہ اور مفسّر اور مجتہد

اور مفتی بھی تھیں۔ انہیں بالاتفاق مسلمان عورتوں میں سب سے زیادہ فقیہ مانا جاتا ہے۔ اکابر صحابہؓ ان سے مسائل پوچھتے تھے، حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی بعض مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کا شمار مدینۂ طیبہ کے اُن چند علماء میں ہوتا تھا جن کے فتوے پر لوگوں کو اعتماد تھا۔ اس بیش بہا اجتماعی فائدے کے مقابلے میں وہ تھوڑا سا ذاتی نقصان کیا حیثیت رکھتا ہے جو حضرت عائشہؓ کو جوانی میں بیوہ ہو جانے سے پہنچا۔ اور تعجب تو یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں یہ اعتراض وہ عیسائی حضرات کرتے ہیں جن کے ہاں کسی اجتماعی سعادت کے بغیر محض بے مقصد تجرّد کی زندگی بسر کرنا راہبوں اور راہبات کے لیے صرف قابلِ تعریف ہی نہیں ہے بلکہ مذہبی خدمات بجا لانے والوں کے لیے لازم بھی ہے۔

پھر جن لوگوں کو ۹ برس کی عمر میں حضرت عائشہؓ کے زفاف پر اعتراض ہے وہ نہیں جانتے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اور فطری حیثیت سے جب ایک لڑکی کا نشوونما اتنا اچھا ہو کہ وہ اس عمر میں جسمانی طور پر بالغ ہو چکی ہو تو اس کا شوہر کے پاس جانا بالکل جائز و معقول ہے۔ صرف ایک غیر فطری اور غیر اخلاقی قانون ہی نکاح کے لیے لڑکی اور لڑکے کی ایک خاص عمر مقرر کر سکتا ہے کیونکہ یہ قید صرف جائز ازدواجی تعلق ہی پر پابندی عائد کرتی ہے، خارج از نکاح تعلقاتِ زن و مرد پر کوئی پابندی نہیں لگاتی۔ لطف کی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ایسے قوانین بنانے والوں کو عمرِ نکاح سے پہلے زنا کے ارتکاب پر کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ عملاً ان کے ہاں ۹-۱۰ سال کی لڑکیاں اور لڑکے آنا فاناً جنسی عمل کرتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں اگر کوئی لڑکی کنواری ماں بن جاتی ہے تو اُن کی ساری ہمدردیاں اُسی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اُس وقت کوئی اعتراض نہ اُس لڑکی پر ہوتا ہے جو عمرِ نکاح سے پہلے ماں بنی، اور نہ اُس لڑکے پر ہوتا ہے جس نے عمرِ نکاح سے پہلے ایک لڑکی کو ماں بنایا۔ ایسی گھٹیا اخلاقی اقدار رکھنے والے آخر کیا منہ لے کر اسلام کے اس قانون پر اعتراض کرتے ہیں کہ جسمانی طور پر جو لڑکے اور لڑکیاں بالغ ہو جائیں ان کا نکاح جائز ہے اور ان کے لیے کسی خاص عمر کی شرط نہیں ہے۔ شادی کے لیے قانوناً ایک عمر مقرر کر دینے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اس عمر کو پہنچنے سے پہلے عقدِ حلال بہر حال نہیں ہو سکتا، خواہ فعلِ حرام کتنا ہی ہوتا رہے۔

سفرِ طائف

اس ضمنی مگر موقع کے لحاظ سے ضروری بحث کے بعد اب ہم پھر سلسلۂ واقعات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اپنے خانگی معاملات سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بروایت ابن سعد و بلاذری شوال سنہ ۱۰ بعد بعثت کے آخر میں طائف کا رُخ کیا جو مکّہ سے ۵۰ میل شرقاً واقع ہے۔ اس سفر کا سبب یہ تھا کہ قریش کی اذیت رسانیوں سے آپ تنگ آ گئے تھے۔ اُن کی شدید مخالفت و مزاحمت دیکھ کر یہ

امید نہیں رہی تھی کہ یہ لوگ دعوتِ حق کو قبول کرنا تو درکنار، اُسے جاری رکھنے کی بھی کوئی گنجائش آپؐ کے لیے باقی رہنے دیں گے۔ اس لیے آپؐ چاہتے تھے کہ طائف کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں، اور وہاں کے طاقت ور قبیلے، بنی ثقیف کو کم از کم اس بات پر آمادہ کر لیں کہ وہ آپؐ کو اپنے ہاں پناہ دے اور تحریکِ اسلامی کے کام میں آپؐ کی مدد اور حمایت کرے۔ ابنِ سعد نے جُبَیر بن مُطعِم بن عَدِی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس سفر میں آپؐ کے ساتھ حضرت زیدؓ بن حارثہ گئے تھے۔ یہی ابنِ قُتَیبہ اور بلاذُری کا بھی بیان ہے لیکن مُوسیٰ بن عُقبہ اور ابنِ اسحاق کہتے ہیں کہ آپؐ تنہا تشریف لے گئے تھے۔ یہ سفر آپؐ نے پیدل کیا، کوئی سواری آپؐ کو میسر نہ تھی۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ وہاں آپؐ دس دن ٹھیرے۔ مگر حافظ مُغلطائی کہتے ہیں کہ ۲۰ دن تک آپؐ طائف کے لوگوں سے ملتے رہے، اور ۱۰ دن عبدیالیل سے ملنے کے بعد ٹھیرے۔ ابنِ قُتَیبہ نے بھی طائف کے قیام کی مدت ایک مہینہ بتائی ہے۔

اہلِ طائف کا حضورؐ پر ظلمِ عظیم

ابنِ اسحاق اور واقدی وغیرہ کا بیان ہے کہ طائف کی سرداری اُس وقت عَمرو بن عُمَیر بن عَوف کے تین لڑکوں، عبدیالیل، مسعود اور حَبِیب کے ہاتھ میں تھی، جن میں سے ایک کے گھر میں قریش کی ایک عورت صفیہ بنت مَعمَر بیاہی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملے، ان کو اللہ کی طرف دعوت دی اور اُن سے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ اسلام کے کام میں میری مدد کیجیے اور میری قوم کے جو لوگ میری مخالفت کر رہے ہیں ان کے مقابلے میں آپ لوگ میری حمایت کریں۔ اس پر ان میں سے ایک نے کہا کہ "میں کعبے کے پردے پھاڑ ڈالوں گا اگر اللہ نے تم کو رسول بنایا ہے"۔ دوسرے نے کہا "کیا خدا کو تمہارے سوا کوئی رسول بنانے کے لیے نہیں ملا؟" تیسرے نے کہا "میں تم سے ہرگز بات نہیں کروں گا، کیونکہ اگر تم واقعی اللہ کے رسول ہو تو تم اس سے بزرگ تر ہو کہ میں تمہاری بات کا جواب دُوں، اور اگر تم اللہ کا نام لے کر جھوٹ بول رہے ہو تو اس قابل نہیں ہو کہ تم سے بات کی جائے"۔ یہ سُن کر حضورؐ اُٹھ گئے اور آپؐ کو ان سے کسی بھلائی کی توقع باقی نہیں رہی۔ چلتے ہوئے آپؐ نے اُن سے کہا کہ "تمہیں جو کچھ رویّہ تم نے مجھ سے کیا سو کیا، مگر کم از کم اتنا کرو کہ میری بات کو مخفی رکھو"۔ یہ بات آپؐ نے اس لیے فرمائی کہ آپؐ کو اندیشہ تھا کہ اگر قریش تک یہ خبر پہنچے گی تو وہ اور جری ہو جائیں گے۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور اپنے چھوٹوں لفنگوں اور غلاموں کو آپؐ کے خلاف شہ دے کر بُکار دیا اور وہ آپؐ کو گالیاں دیتے اور آپؐ پر آوازے کستے لگے، یہاں تک کہ لوگ اکٹھے ہو گئے اور آپؐ کو ایک باغ کی دیوار تک پہنچا کر چھوڑا جو عُتبہ بن ربیعہ اور شَیبہ بن ربیعہ کا تھا۔

واقدی سے ابن سعد کی روایت میں یہ ہے کہ آپ ثقیف کے اشراف و رؤسا میں سے ایک ایک کے پاس گئے، مگر کسی نے آپ کی بات نہ مانی، بلکہ انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ ان کے نوجوانوں کو نہ بگاڑ دیں۔ اس لیے انہوں نے کہا "اے محمدؐ، تم ہمارے شہر سے نکل جاؤ اور زمین میں جہاں تمہارے دوست بھی ہوں اُن سے جا ملو" پھر انہوں نے اپنے اوباشوں اور غلاموں کو آپ کے خلاف اکسایا اور انہوں نے آپ کو گالیاں دیں، اور شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔ موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے تاک تاک کر آپؐ کے ٹخنوں اور ایڑیوں پر پتھر مارے۔ راستے کے دونوں جانب وہ صفیں بنائے کھڑے تھے، اور جیسے جیسے آپ قدم اٹھا کر چلتے جاتے تھے، وہ سنگباری کیے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ آپؐ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ سلیمان التیمی کا بیان ہے کہ چوٹوں کی تکلیف سے جب آپؐ بیٹھ جاتے تو وہ آپؐ کو پکڑ کر کھڑا کر دیتے تاکہ آپؐ پر پھر پتھر برسائیں۔ چنانچہ جب آپؐ مجبوراً چلنا شروع کرتے تو وہ پتھر مارتے اور ٹھٹھے لگاتے چلے جاتے تھے۔ واقدی کی روایت ابن سعد نے نقل کی ہے کہ اس موقع پر حضرت زیدؓ بن حارثہ آپؐ کو پتھروں سے بچانے کے لیے خود پتھروں کی بارش اپنے اوپر لیتے رہے یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔

حضورؐ کی رقت انگیز دُعا

آخر کار حضورؐ جب طائف سے نکل گئے، اور وہ بدمعاش لوگ جو آپؐ کا تعاقب کر رہے تھے واپس ہو گئے تو آپ زخموں سے چُور عتبہ اور شیبہ کے باغ کی دیوار سے لگ کر انگور کی ایک بیل کے سائے میں بیٹھ گئے۔ اس موقع پر آپ کا دل بھر آیا اور آپؐ نے اپنے رب کی طرف رجوع کر کے دُعا کی جس کے یہ رقت انگیز الفاظ طبرانی نے کتاب الدعاء اور معجم کبیر میں، ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے سیرت میں، طبری نے تاریخ میں ابن القیم نے زاد المعاد میں اور حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں نقل کیے ہیں:-

"خداوندا، میں تیرے ہی حضور اپنی بے بسی و بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین، تو سارے ہی کمزوروں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ سے درشتی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے حوالے جس کو تو نے مجھ پر قابو پا لینے کا یارا دے دیا ہے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں، مگر تیری طرف سے عافیت مجھے نصیب ہو جائے تو اس میں میرے لیے زیادہ کشادگی ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اس نور کی جو اندھیرے میں اجالا کرتا اور دنیا و آخرت کے معاملات کو درست کرتا ہے۔ مجھے اس سے بچا لے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عتاب کا مستحق ہو

جاؤں تیری مرضی پر راضی ہوں یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہوجائے۔ کوئی زور اور طاقت تیرے بغیر نہیں۔

حضورؐ کی شانِ رحمۃ للعالمینی

بخاری نے بدء الخلق، ذکر الملائکہ میں، مسلم نے مغازی میں اور نسائی نے بعوث میں حضرت عائشہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے حضورؐ سے پوچھا "کیا آپ پر اُحد کے معرکے سے بھی زیادہ سخت وقت کوئی آیا ہے؟" آپؐ نے جواب میں طائف کے واقعہ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ میں غم زدہ حالت میں جدھر منہ اُٹھا اُدھر چل پڑا (یعنی حیران تھا کہ کدھر جاؤں)۔ ابھی میں نے اپنی اِس حالت سے اِفاقہ بھی نہ پایا تھا کہ یکایک میں نے دیکھا کہ میں قرن الثعالب[1] کے مقام پر ہوں۔ اُوپر نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک ابر میرے اُوپر سایہ کیے ہوئے ہے۔ پھر دیکھا کہ اس میں جبریلؑ ہیں۔ انہوں نے پکار کر مجھ سے کہا کہ "اللہ نے وہ سب کچھ سُن لیا ہے جو آپؐ کی قوم نے آپؐ سے کہا اور آپؐ کی دعوت کا جو جواب آپ کو دیا۔ یہ پہاڑوں کا فرشتہ اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں اسے حکم دیں۔" پھر پہاڑوں کے فرشتے نے پکار کر مجھے سلام کیا، اور اس کے بعد مجھ سے کہا کہ "اے محمدؐ، اللہ نے آپؐ کی قوم کا قول اور آپ کی دعوت پر اُس کا جواب سُن لیا ہے۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں۔ مجھے آپؐ کے رب نے آپؐ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپؐ اپنا حکم مجھے دیں (یہ مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں۔ طبرانی میں ہے جو حکم آپؐ چاہیں دیں، اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ پھر اُس نے کہا اے محمدؐ، آپ کو اختیار ہے جو کچھ بھی آپ چاہیں)۔ اگر آپ چاہیں تو میں ان پر (یعنی قریش پر) مکہ کے دو طرفہ پہاڑوں (یعنی ابوقبیس اور قعیقعان) کو ایک ساتھ ملا کر ٹکرا دوں[2]۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب یہ دیا کہ "نہیں، میں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کریں گے۔"

عدّاس نصرانی کا قبولِ اسلام

ابن ہشام نے ابن اسحاق کا بیان نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (طائف سے) پلٹ کر عُتبہ

---

[1] اس مقام کو قرن المنازل بھی کہتے ہیں۔ یہ اہلِ نجد کی میقات ہے جہاں سے ان کو احرام باندھنا ہوتا ہے اور یہ مکہ سے اُونٹ کی سواری پر ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے (حاشیہ از مؤلف)

[2] قریش پر پہاڑوں کو ٹکرا دینے کے لیے فرشتے نے اس وجہ سے آپ کا اذن طلب کیا کہ طائف میں جو مصیبت آپ پر پیش آئی وہ انہی کے ظلم و عناد کے باعث ہی پیش آئی تھی۔ اگر وہ آپ کو حد سے زیادہ تنگ نہ کرتے تو آپ کے طائف تشریف لے جانے کی نوبت ہی کیوں آتی۔ (حاشیہ از مؤلف)

بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کے باغ کی دیوار سے لگ کر انگور کی بیل کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے، تو قریش کے ان معززین سرداروں نے آپؐ کو اس حالت میں دیکھا اور ان کی رگِ حمیت کو اس پر کچھ جوش آیا۔ یہ بھی مذکور ہوا ہے کہ بنی جمح کی جو عورت طائف کے سرداروں میں سے ایک کے گھر میں تھی وہ بھی حضورؐ سے ملی اور آپؐ نے اس سے فرمایا کہ "تمہاری سسرال والوں نے یہ کیسا سلوک ہمارے ساتھ کیا؟" عتبہ اور شیبہ نے اپنے ایک عیسائی غلام عدّاس کو بلایا اور اس سے کہا کہ "انگوروں کا ایک خوشہ طباق میں رکھ کر اس شخص کے پاس لے جا اور اس سے کہہ کر اسے کھائے۔" اس نے جب طباق لے جا کر آپؐ کے سامنے رکھا اور آپؐ سے تناول فرمانے کے لیے کہا تو آپؐ نے بسم اللہ کہہ کر (ایک روایت میں ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر) اس میں ہاتھ ڈالا۔ عدّاس بولا "خدا کی قسم اس ملک میں تو کوئی یہ کلمہ کہنے والا نہیں ہے۔" حضورؐ نے پوچھا "تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا دین کیا ہے؟" اس نے کہا "میں عیسائی ہوں، نینویٰ کا رہنے والا ہوں۔" آپؐ نے فرمایا "مردِ صالح یونس بن متّٰیؑ کی بستی کے ہو؟" اس نے پوچھا "آپ ان کو کیسے جانتے ہیں؟" فرمایا "وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔" یہ سنتے ہی عدّاس آپؐ پر جھکا اور آپؐ کے سر اور ہاتھوں اور قدموں کو چومنے لگا۔ سلیمان التیمی نے اپنی کتاب سیرت میں لکھا ہے کہ عدّاس نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔" ربیعہ کے بیٹوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ایک نے دوسرے سے کہا "لو بھئی، تمہارے غلام کو بھی اس شخص نے بگاڑ دیا۔" عدّاس واپس آیا تو انہوں نے کہا "یہ تجھے کیا ہو گیا کہ اس شخص کا سر اور ہاتھ اور پاؤں چومنے لگا؟" اس نے جواب دیا "میرے آقا، زمین میں ان سے بہتر کوئی نہیں ہے، انہوں نے مجھے ایک ایسی چیز کی خبر دی جس کو نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" انہوں نے کہا "عدّاس، اپنے دین سے نہ پھر۔ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔" (۴)

جنوں کا قرآن سُننا

طائف سے واپسی پر آپؐ چند روز نخلہ کے مقام پر جا کر ٹھہر گئے۔ پریشان تھے کہ اب کیسے مکّہ واپس جائیں۔ طائف میں جو کچھ گزری ہے اس کی خبریں وہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ اس کے بعد تو کفار پہلے سے بھی زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ انہی ایّام میں ایک روز رات کو آپؐ نماز میں قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے

لے سہیلی نے التیمی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے حضرت یونسؑ کا ذکر سُن کر عدّاس نے کہا "خدا کی قسم میں نے جب نینویٰ چھوڑا تھا اس وقت وہاں دس آدمی بھی یہ جاننے والے نہ تھے کہ متّٰی کیا ہے۔ پھر آپ ان کو کیسے جانتے ہیں، حالانکہ آپ اُمّی ہیں اور اُمّی قوم میں پیدا ہوئے ہیں۔" (حاشیہ از مؤلف)